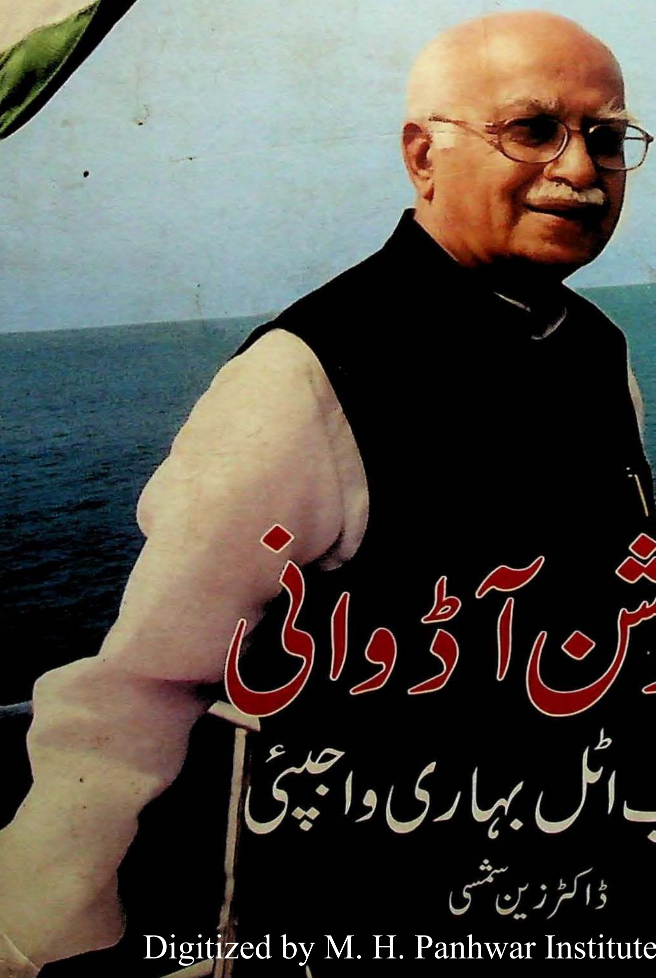
میرا وطن میری زندگی



لال کرشن آڈوانی

تقریظ جناب اٹل بہاری واجپئی

مترجم ڈاکٹر زین شمسی

"میرا وطن میری زندگی" قوم کی بے لوث خدمت میں اپنی زندگی وقف کر دینے والے 'شکھر پرش' لال کرشن آڈوانی کی خودنوشت ہے۔ موجودہ سیاسی پس منظر میں آڈوانی اپنے عزم، تفکر، واضح خیالات اور دوررس نظریہ کے لئے مقبول ہیں۔ وہ "ملک سے اوپر" کو زندگی کی بنیاد مان کر گزشتہ چھ دہائیوں سے سیاست میں سرگرم ہیں۔

1947ء میں فرقہ وارانہ فسادات کے منفی نتائج سے پیدا ہوئے دوقومی نظریہ کے اصول کی بنیاد پر تقسیم ہند کے وقت آڈوانی کو اپنی پیاری سرزمین سندھ (اب پاکستان کا حصہ) کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہنا پڑا۔ اس المیہ اور خود پر آئی مصیبتوں کو اپنی خودنوشت میں آڈوانی نے بڑے ہی دردناک الفاظ میں پیش کیا ہے۔ وطن کی خدمت اپنی طویل اور قابل فخر سفر میں آڈوانی نے آزاد ہندوستان میں وقوع پذیر تقریباً تمام سیاسی وسماجی واقعات پر باریک بینی سے نظر ڈالی ہے اور ان میں متحرک شرکت کی ہے۔ اس کتاب میں آڈوانی نے ان ہی واقعات اور قوم-سماج کے مختلف سروکاروں کی تفصیل درج کی ہے۔

اپنے سینئر اور معتمد ساتھی اٹل بہاری واجپئی کے ساتھ کاندھے سے کاندھا ملاتے ہوئے حکومت بنانے کی کانگریس پارٹی کی بالادستی کو توڑتے ہوئے بھارتیہ جنتا پارٹی کو مستحکم متبادل کے طور پر پیش کرنے میں آڈوانی نے مخصوص کردار ادا کیا، جس کا ذکر اس کتاب میں تفصیل سے درج ہے۔

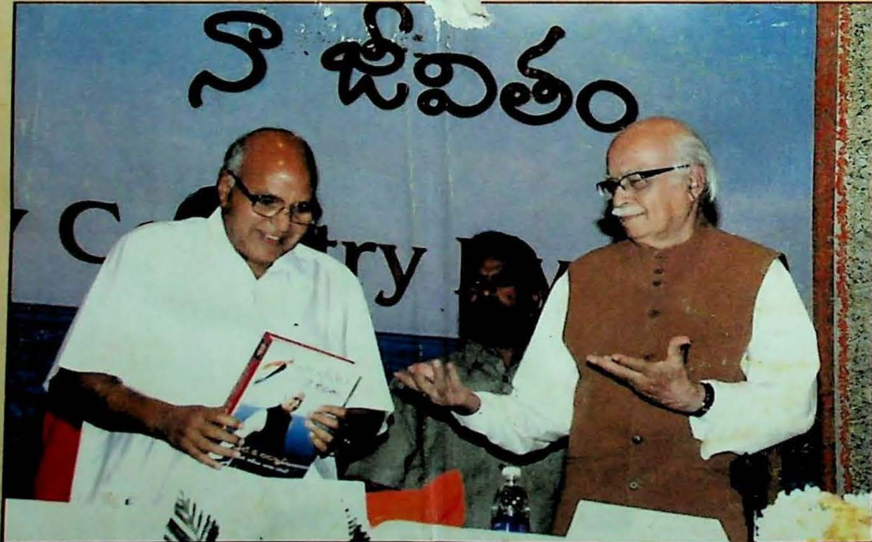
زیر نظر کتاب میں آڈوانی نے بڑے ہی مضبوط اور جذباتی لہجہ میں ایمرجنسی کے وقت جمہوریت کے لئے کی گئی ان کی جدوجہد اور اجودھیا میں رام مندر کی تعمیر کے لئے کی گئی "رام رتھ یاترا" — جو آزاد ہندوستان کی سب سے بڑی عوامی تحریک تھی اور جس نے سیکولرازم کی صحیح تشریح پر ملک گیر بحث چھیڑ دی، کا بھی بڑا ہی بہترین منظرنامہ پیش کیا ہے۔ ساتھ ہی 1998 سے 2004 تک این ڈی اے کی حکومت میں وزیر داخلہ اور پھر نائب وزیر اعظم کے عہدہ پر اپنی ذمہ داری کی کامیابی کے ساتھ ادائیگی پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

اس کتاب نے آڈوانی کی سیاسی سمجھ، خیالات ونظریہ کی شفافیت اور ناقابل یقین فیصلوں کو بھی جلا بخشی ہے، جسے ان کے مداح اور ناقدین سبھی مانتے ہیں۔

کسی بھی سیاستداں کے لئے سرگرم سیاست میں ذمہ داریوں کو نبھاتے ہوئے اپنی خودنوشت تحریر کرنا ایک جرأت مندانہ اور پُرخطر کام ہے، جسے آڈوانی نے نہ صرف کر دکھایا ہے بلکہ اس کے ساتھ انصاف بھی کیا ہے۔ لہٰذا اس کتاب کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔



بی جے پی اقلیتی کانفرنس برائے خواتین کے موقع پر آڈوانی کے ہمراہ سید شاہنواز حسین اور نجمہ ہیبت اللہ۔



تیلگو ایڈیشن کے رسم اجراء کے موقع پر لال کرشن آڈوانی کے ساتھ پی ایس راموجی راؤ۔

میرا وطن
میری زندگی

لال کرشن آڈوانی

مترجم
ڈاکٹر زین شمسی

خان پبلیکشنز

پبلشر **خان پبلیشرز**

1725، گلی تحصیلدار، کوچہ دکنی رائے،
پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی۔ 110002

طبع اوّل : 2009

قیمت : -/495

پرنٹر: پرنٹ ویل پرنٹرز
چوڑی والان، دہلی۔6

انتساب

میرے تمام ہندوستانی بھائی اور بہنوں کے لئے

●

میری پارٹی کے موجودہ اور ماضی کے معاونین اور
کارکنان کے لئے
جن کا تعاون، حمایت اور محبت نے مجھے
عوامی زندگی میں قوت و توانائی بخشی

●

دو پاک روحوں
شری راج پال پوری اور پنڈت دین دیا اُپادھیائے کے لئے
جن کے اعلیٰ اصول اور قوم پرستی نے
میری فکر اور شخصیت کو سمت دی

●

اور
میرا کنبہ
کملا، جینت، گتیکا
اور
پرتیبھا
کے لئے جن کے اتھاہ محبت اور بے لوث جذبے نے
مجھے زندگی کے تمام نشیب و فراز میں سہارا دیا۔

کچھ اہم تبصرے

''آڈوانی ایک انوکھے کہانی کار ہیں اور کیا لاجواب کہانیوں کا مجموعہ انھوں نے پیش کیا ہے۔ اکثر ان کے اندر کا دانشور ان کی سیاست پر حاوی ہوجاتا ہے اور یہی ان کے کام کی صلاحیت کو آسمان کی بلندیوں تک لے جانے کے لئے کافی ہے۔ جو مقام مہارشیوں میں بھرگو کا ہے اور پہاڑوں میں ہمالیہ کا ہے 'مائی کنٹری مائی لائف' کا وہی مقام خودنوشتوں میں ہے۔''

— ایم وی کامتھ 'آرگنائزر' میں

♓

''کچھ سیاسی یادداشت تصوراتی سچ گڑھنے کی کوشش ہوتے ہیں۔ یہ ایسا اعلامیہ ہے، جو مسکرانے والے کٹر شخص' آڈوانی جی کے تصورات سے انھیں آزاد کرتی ہے۔ ڈیل کارنیگی کی ایک کتاب 'ہاؤ ٹو ون فرینڈس اینڈ انفلوینس پیوپل' نے ان کی زندگی بدل دی۔ 'مائی کنٹری مائی لائف' میں آڈوانی جی، بغیر دلیل کو گنوائے یقینی طور پر دوستوں کو جیتیں گے اور ہندوستان کو متاثر کریں گے۔''

— آر پرسن راجن، 'انڈیا ٹوڈے' میں

♓

'''آڈوانی کی یہ خودنوشت ناول کی طرح دلچسپ ہے۔ ہندوستان کی جامع سیاست پر اتنا واضح اور دوٹوک صحیفہ کوئی دوسرا نظر نہیں آتا۔ اس کتاب میں آڈوانی نے ہندوستان کے مستقبل کا جیسا طاقتور مگر رواداری نقشہ پیش کیا ہے وہ ان کی وسیع النظری اور عزم کا غماز ہے۔ اس کتاب میں متعدد سبق آموز واقعات ہیں۔ یہ ایسی خودنوشت ہے، جس میں 'میں' کہیں نظر نہیں آتا۔''

— وید پرتاپ ویدک، سینئر صحافی

♓

'''ایک موجودہ سیاست داں، خصوصاً آڈوانی جی جیسی عظیم شخصیت کے دھنی جنھوں نے اجودھیا تحریک اور سیوڈو سیکولرازم کے انحراف سے ہندوستانی سیاست کے مقررہ پیمانوں کو بنیادی طور پر رد کیا ہے، کے لئے ایک جرأت مندانہ بات ہے۔ 'مائی کنٹری مائی لائف' مشہور سیاسی خودنوشت مصنفوں کی فہرست میں ایک عظیم یادگار ہی نہیں بلکہ آزادی کے بعد کا ایک بے مثال خاکہ ہے۔ میں تمام عالموں، مفکروں اور دانشوروں سے اسے گہرائی سے مطالعہ کی اپیل کرتا ہوں۔''

— چندن مترا، 'پائینیر' میں

♓

'''ایل کے آڈوانی کی خودنوشت دو طرح سے زیر مطالعہ ہوسکتی ہے۔ پہلی، یہ جدید ہندوستان کے ابتدائی وسیلہ کے طور پر جو ایک ایسے شخص کے ذریعہ لکھی گئی ہے، جو خود پالیسی ساز رہا۔ دوسری، اس مفصل کتاب کو ایک ایسے شخص کے ذہن کے روڈ میپ کے طور پر، جس نے ہندوستان کی سیاسی رنگت کو نئی شکل دی۔''

— سوپن داس گپتا، 'تہلکہ' میں

♓

'''لال کرشن آڈوانی ان معدودے چند سیاست دانوں میں سے ہیں جو تاریخ ہند کے حدود کو کچھ انوکھے ڈھنگ سے متاثر کرنے کا سہرا لے سکتے ہیں۔''

— پرتاپ بھانو مہتا، 'انڈین ایکسپریس' میں

♓

'''آڈوانی جی کی خوبیاں اور کمزوریاں ان کی کتاب میں پوشیدہ ہیں۔ یہ قابل مطالعہ، مفید اور اکثر ان کے سیاسی کیریئر کی تفصیل ہے۔ دل سے لکھی گئی یہ نصف خودنوشت اور نصف اعلامیہ ہے۔''

— ویر سنگھوی، 'ہندوستان ٹائمز' میں

My Country My Life* کی رسم اجرا تقریب میں اظہار خیال

''مجھے خوشی ہے کہ لال کرشن آڈوانی جی، جو موجودہ دور میں ایک معزز و مقبول شخصیت ہیں اور جن میں نظریات کی شفافیت کی اتھاہ گہرائی اور موثر مبصرانہ خصوصیات موجود ہیں، نے اپنی مکمل زندگی پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے اپنے چاروں اطراف اور وقوع پذیر مختلف واقعات پر کشادہ ذہنی کے ساتھ اظہار خیال کیا ہے۔ ان کی کتاب 'مائی کنٹری مائی لائف' ان کے 80 سالہ حیرت انگیز تجربے کا مجموعہ ہے، جو ہندوستان کے ایک ارب لوگوں کی یکساں ترقی پر دھیان مرکوز کرتے ہوئے ہندوستان کے تئیں ان کے وسیع نظریات کی تشریح کرنے میں معاون ثابت ہوگی۔ میں آڈوانی جی کی اس بات کے لئے ستائش کرتا ہوں، جب وہ کہتے ہیں 'قارئین میرے خیالات/ نظریات اور درج واقعات و موضوعات سے متفق یا غیر متفق ہو سکتے ہیں، یہ ان کا حق ہے۔ حالانکہ قارئین ایک ایسے مصنف سے روبرو ہوں گے جس نے ان واقعات کے بارے میں اور خود اپنے متعلق بے باکی اور ایمانداری سے روشنی ڈالی ہے۔''

— ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام، سابق صدر جمہوریہ



''آڈوانی نے یہ کتاب تحریر کر کے ایک جرأت مندانہ کام کیا ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ یہ کتاب سماج اور آنے والی نسلوں کے لئے انتہائی معاون ثابت ہوگی۔''

— بھیروں سنگھ شیخاوت، سابق نائب صدر جمہوریہ



''آڈوانی جی نے یہ کتاب ایک سویم سیوک کی طرح لکھی ہے۔ راشٹریہ سویم سیوک سنگھ ایک بہتر سویم سیوک مختلف میدانوں میں، جہاں وہ سرگرم ہیں، ایک قوم پرست کارکن کا کردار نبھاتا ہے۔ اجتماعی زندگی میں ایک سویم سیوک کی زندگی جینا بہت مشکل ہے، لیکن اس کو جینا ہی چاہئے اور شری آڈوانی نے یہ دونوں کام بخوبی کیا ہے۔''

— موہن راؤ بھاگوت، سرکاریہ واہ، راشٹریہ سویم سیوک سنگھ



''میں مانتا ہوں کہ آڈوانی جی آج کے ہندوستان میں سب سے زیادہ غلط طریقہ سے سمجھے جانے اور غلط ڈھنگ سے پہچانے جانے والے لیڈروں میں سے ایک ہیں۔ وہ مسجدوں کو مسمار کرنے یا ایسی باتوں سے بہت دور ہیں۔ یہ کتاب ایک رہنما ہے اور گزشتہ کئی دہائیوں کے ہندوستانی سیاست اور سماجی تاریخ میں بیش قیمت اضافہ ہے۔''

— جسونت سنگھ

★ انگریزی کتاب 'مائی کنٹری مائی لائف' کا رسم اجرا 19 / مارچ 2008 کو نئی دہلی میں سابق صدر جمہوریہ اے پی جے عبدالکلام کے دست مبارک سے ہوا۔



فہرست مضامین

چوتھا باب

پانچواں باب

خلاصہ

اظہار تشکر

'میرا وطن میری زندگی' ایک شخص کی خودنوشت ہی نہیں بلکہ یہ براہ راست ایک سیاسی آپ بیتی ہے۔ یہ کتاب میری زندگی اور میری پارٹی (بھارتیہ جنتا پارٹی) کے سفر کی روداد پیش کرتی ہے۔ وسیع معنوں میں یہ جدید ہندوستان کی روح کی تفصیل ہے۔ جب میں نے اس کام کی شروعات کی، مجھے احساس ہوا اور مزید آگے بڑھتے ہوئے یہ احساس اور بھی مضبوط ہوتا گیا کہ بہت سے لوگ اس کتاب کے تصور سے اشاعت تک کے سفر میں میرے ساتھ مصروف ہو جائیں گے۔ یہ سفر ان کشادہ دل افراد کے تعاون، سرگرم ساتھیوں، بہتر حوصلہ افزائی اور سرگرم رول کے بغیر کامیابی کے ساتھ مکمل نہیں ہو سکتا تھا۔ ان تمام کے تئیں اظہار تشکر میری ذمہ داری ہے۔

میں محترم اٹل بہاری واجپئی — اٹل جی — کے تئیں دل کی گہرائی سے شکریہ کا اظہار کرتا ہوں، جنھوں نے میرے لئے — اپنے لاتعداد مداحوں کے لئے — تقریظ لکھی۔ اس کتاب میں 1951 سے ایک یکساں مقصد کے لئے ہم دونوں کے ساتھ ساتھ کام کرنے کی داستان ہے۔ انھوں نے جو میرے بارے میں لکھا اور جو میں نے ان کے بارے میں اپنی کتاب میں لکھا ہے، وہ ہمارے نزدیکی تعلقات کی بے نظیر مثال ہے، جس کی میں بے حد تعظیم کرتا ہوں۔ میں ان کی صحت کے لئے دعاگو ہوں اور امید کرتا ہوں کہ میری پارٹی اور میں ہمیشہ ان کے مفید مشورے سے کامرانیاں حاصل کرتے رہیں گے۔

میں نے اپنے مقدمہ میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ مجھے راشٹریہ سویم سیوک سنگھ کے ساتھ اپنے سرگرم اور گہرے تعلقات پر فخر ہے، جس سے میں چودہ سال کی عمر میں منسلک ہوا۔ میں آج جو بھی ہوں، وہ خصوصاً ان سنسکاروں کی وجہ سے ہی ہوں، جو میں نے اس قوم پرست تنظیم سے حاصل کئے، اس لئے فطری طور پر یہ میری ذمہ داری ہے کہ میں سنگھ کے سرسنگھ چالک محترم کے سی سدرشن اور سہہ کارواہ محترم موہن راؤ بھاگوت اور دیگر سینئر کارکنان کا اس کتاب کی اشاعت کے موقع پر شکریہ ادا کروں۔

میں اپنے ساتھی جسونت سنگھ کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہوں گا جنھوں نے شروعات سے ہی حوصلہ افزائی کے علاوہ کتاب کی توسیع کے سلسلہ میں میری مسلسل پوچھ گچھ کی۔ انھوں نے کہا تھا کہ ہم سبھی آپ کی خودنوشت کے بغیر ادھورے رہ جائیں گے۔ یہ یقیناً قابل فخر ہے۔ پھر بھی ایک اچھے اور بہترین مصنف، جنھوں نے سیاسی کاموں کی مشغولیت کے باوجود کئی کتابیں تصنیف کی ہیں، کے اس تبصرہ نے مجھے اس سمت میں آگے بڑھنے کا حوصلہ فراہم کیا۔

اس طرح کی ایک کتاب، جس میں میں نے اپنی آپ بیتی اور جدید ہندوستان کے سفر کے سلسلہ میں ذکر کیا ہے، کے لئے گہرے ریسرچ اور مواد کی ضرورت پڑی۔ میں نے حکومت کے اندر اور باہر کئی لوگوں سے مشورہ کیا۔ میں ان تمام لوگوں کا ذکر نہیں کر سکتا، کیونکہ ان میں سے کچھ آج بھی ملازمت میں ہیں۔ پھر بھی، میں سابق کابینی سکریٹری کمل پانڈے کے ذریعہ دیے گئے تعاون کے لئے احسان مند رہوں گا،

جنھوں نے جب میں وزیر داخلہ تھا، تب میرے ساتھ کام کیا تھا۔ ساتھ ہی انٹیلیجنس بیورو کے سابق سربراہوں اجیت دووال، کے پی سنگھ اور سابق قومی سیکورٹی کے نائب مشیر ستیش چندرا کا بھی شکرگزار ہوں۔

بھارتیہ جن سنگھ اور بی جے پی کی تاریخ سے متعلق اطلاعات کا انتہائی مفید وسیلہ تھا — بی جے پی کا سارسنگرہ (اس میں سات جلد بھارتیہ جن سنگھ اور ایک جلد بی جے پی سے متعلق ہے)، جس کی اشاعت اپریل 2005 میں بی جے پی کے سلور جوبلی اجلاس کے موقع پر کی گئی تھی۔ پارٹی دستاویز کمیٹی کے سربراہ آنجہانی وشنوکانت شاستری اور اس کے کارگزار صدر دیناناتھ مشرا نے قابل اعتنا کام کیا ہے۔ میں اس موقع پر ایک مرتبہ پھر ان تمام لوگوں کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جو اس منصوبہ سے منسلک رہے تھے۔ ایسا کرتے ہوئے مجھے اپنے پیارے دوست آنجہانی راجندر ورما کی یاد آتی ہے، جنھوں نے کئی دہائیوں تک ہماری پارٹی کے پارلیمانی سکریٹری کے طور پر کام کیا۔ وہی پہلے شخص تھے، جنھوں نے پارٹی سے متعلق تمام ادب کا باریک بینی سے دستاویزاتی شکل دینے کا مشورہ دیا تھا۔

میں خاص طور سے اپنے قریبی دوست اور معاون سدھیندر کلکرنی کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گا، جنھوں نے اس خودنوشت کو لکھنے میں مجھے بیش قیمت تعاون دیا۔ یہی وہ شخص ہیں، جنھوں نے جب سے میں نے اس کتاب کو لکھنے کا فیصلہ کیا، میرے ساتھ بے انتہا محنت کی۔ یہ سدھیندر ہی ہیں جنھوں نے اس کتاب کے لئے ضروری ریسرچ کا انتظام کیا۔

اس کتاب کے لئے فوٹوگراف یکجا کرنا ایک چیلنج بھرا کام تھا۔ یہاں دوبارہ جن سنگھ اور بی جے پی کا فوٹوگرافک میوزیم جو کہ پارٹی دستاویز کمیٹی کے ذریعہ بنایا گیا تھا، بے حد معاون ثابت ہوا۔ راج پال پوری کے بیٹے روہت پوری نے اپنے والد کے بہت سے فوٹوگرافس ہمیں فراہم کئے۔ ممبئی میں میری بہن شیلا نے، کراچی میں میرے بچپن کی لی گئی انوکھی تصویر بھیجی۔ ''پانچ جنیہ'' کے سابق مدیر ترون وجے اور ''آرگنائزر'' کے مدیر آر بالاشنکر نے مجھے فوٹوگرافک اور دستاویزی اشیاء فراہم کرائیں۔ انڈین ایکسپریس کے ایگزیکیٹو ایڈیٹر راج کمل جھا اور اخبار کے آرکائیوس کے سربراہ نجے ملک اس منصوبہ کے لئے فوٹو فراہم کرانے میں بہت فراخ دل نکلے۔ ایسی ہی فراخدلی فوٹوگرافروں میں سنجے شرما چندر اور کھڑک سنگھ نے بھی دکھائی۔

میں اپنے آفس اسٹاف کے چیف دیپک چوپڑا، جو تقریباً دو دہائیوں سے میرے نجی سکریٹری ہیں اور ایڈیشنل پرائیویٹ سکریٹری پرکاش چندرا کا بھی شکرگزار ہوں، جنھوں نے مجھے بیش قیمت تعاون دیا۔ اتفاق سے کور پیج پر لگی یہ تصویر دیپک کے ذریعہ اُس وقت لی گئی تھی جب میں 2002ء میں انڈمان اور نکوبار کے سرکاری دورہ پر تھا۔ میرے طویل سیاسی سفر میں ایسی کئی مثالیں ہیں جب مجھے حکومت کے ذریعہ لگائے گئے الزامات کا سامنا کرنا پڑا۔ مثال کے لئے بنگلور ہائی کورٹ میں ایمرجنسی کی شروعات کے وقت، مجھے اپنے کیس میں خود بحث کرنی پڑی لیکن بیشتر معاملات میں کئی معروف وکلاء نے اپنی پوری صلاحیت کا استعمال کرتے ہوئے میرا دفاع کیا۔ جیسا کہ میں نے ایمرجنسی کے باب میں ذکر کیا ہے کہ بنگلور میں اٹل جی اور میری جانب سے جو پیروی کرنے کے لئے آئے تھے۔ وہ ایم سی چھاگلا، شانتی بھوشن، کے کے وینوگوپال، ایم راما جوئیس اور سنتوش ہیگڑے کی ناقابل تسخیر منڈلی تھی۔

اجودھیا ایشو سے متعلق جب بھی دہلی کی کسی عدالت میں سماعت کے لئے کیس آیا، ارون جیٹلی، روی شنکر پرساد اور سشما سوراج نے انہیں مسلسل دیکھا۔ میں ان تمام وکلاء کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔



بھارت ماتا

قومی خدمت میں وقف نصف صدی سے زائد کا ساتھ...



1952 : کوٹہ میں ایک پارٹی میٹنگ میں بھارتیہ جن سنگھ کے نوجوان کارکنان کی حیثیت سے اٹل بہاری واجپئی،
ایل کے آڈوانی اور بھیروں سنگھ شیخاوت۔

...ہندوستانی سیاست کی تاریخ میں بے جوڑ معاون



25/دسمبر 2003: کو اٹل جی کی سالگرہ پر پرائم منسٹر ہاؤس میں نائب صدر جمہوریہ بھیروں سنگھ شیخاوت، وزیر اعظم اٹل بہاری واجپئی اور نائب وزیر اعظم ایل کے آڈوانی۔

تقریظ

مجھے اپنے معتمد، معاون اور ساتھی شری لال کرشن آڈوانی کی خودنوشت کی تقریظ لکھتے ہوئے قلبی فرحت محسوس ہو رہی ہے۔ آڈوانی جی کی خودنوشت جس کا نام 'میرا ملک میری زندگی' ہے، آزاد ہندوستان کے فیصلہ کن لمحوں میں بہت گہرائی سے جھانکتی ہے، جس میں برطانوی حکومت سے ملنے والی آزادی کی خوشی کے ساتھ ساتھ ملک کے تقسیم کا سانحہ بھی شامل ہے، جو قارئین کو ان کے بارے میں اور کچھ حد تک ان غیر معمولی حالات کے بارے میں بھی یاد دلاتی ہے جن میں ان کی زندگی گزری۔ آڈوانی جی کی پیدائش کراچی میں ہوئی۔ انہوں نے اپنی زندگی کے ابتدائی 20 سال سندھ میں گذارے۔ ہندوستان اور پاکستان کی خونیں سرحد کی دونوں جانب لاکھوں لوگوں کی طرح انہیں بھی اپنے گھر سے بے گھر ہونا پڑا اور وہ ایک رفیوجی بن گئے۔ یہ ان کی شخصیت و کردار کی بے پناہ طاقت کا ثبوت ہے کہ انہوں نے اس بحران کا ویسے ہی مردانہ وار سامنا کیا جیسا کہ وہ اپنے منتخب کردہ نشان راہ کی تقلید کرتے ہوئے زندگی کی دوسری پریشانیوں کا سامنا کرتے آئے ہیں۔ اس مشکل گھڑی سے قبل ہی انہوں نے اپنی پوری زندگی مادر وطن کی خدمت میں راشٹریہ سوئم سیوک سنگھ کا پرچارک بن کر وقف کردی۔ ملک کے مختلف حالات میں خدمت کرنے کا عزم، خودسپردگی اور عزم مصمم جیسے صفات نے ہی آڈوانی جی کی زندگی کو تراشا ہے۔

آڈوانی جی 50 سال سے، جب سے انہوں نے بھارتیہ جن سنگھ کیلئے کام کرنا شروع کیا، تب سے وہ میرے گہرے دوست ہیں۔ جب میں ماضی میں جھانکتا ہوں تو انہیں کئی کرداروں میں پاتا ہوں- جب میں پہلی بار 1957 میں لوک سبھا کیلئے منتخب ہوا تھا تو وہ ہماری پارٹی کی نوزائیدہ پارلیمانی شاخ کے نوجوان سکریٹری تھے، پارٹی کی دہلی یونٹ کے ڈسپلن پر عمل کرنے والے تنظیم کار کے طور پر جب انہوں نے ملک میں ابتدائی کامیابی حاصل کی؛ 'آرگنائزر' کے دانشور اور صحافی کے طور پر، ایسی شخصیت کی شکل میں جس نے پنڈت دین دیال اپادھیائے اور بعد میں مجھے پارٹی کی تاریخ کی سب سے مشکل گھڑی میں اسے آگے بڑھانے میں مدد دی، ایمرجنسی میں جمہوریت کے سپاہی اور میرے ساتھ قیدی کے طور پر، ایک ساتھی کے طور پر جس نے جنتا پارٹی کی تشکیل کی خوشی اور اس کی جلد زوال سے قنوطی ہو جانا، دونوں ہی کو محسوس کیا، بھارتیہ جنتا پارٹی جو بہت زیادہ مضبوط ہو کر کانگریس پارٹی کی متبادل بنی، کی پارٹی کی تشکیل میں میرے ساتھی کے طور پر نیشنل ڈیموکریٹک الائنس (این ڈی اے) کی تعمیر میں، جنہوں نے میرے ساتھ شانہ بہ شانہ کام کیا اور میرے ایک بے مثال ساتھی کے طور پر 6 سال تک ملک کی باگ ڈور سنبھالی۔

ہاں، ہمارے طویل تعلقات کے دوران مختلف ایشوز اور نظریہ پر ہمارے درمیان اختلاف بھی رہے کیونکہ کسی تنظیم کے اندر نصف صدی سے زائد عرصہ تک کام کرنے والے دو افراد کی سوچ ہمیشہ پوری طرح سے یکساں نہیں ہو سکتی ہے۔ تاہم ہمارے تعلقات کی بنیاد میں اختلاف نہیں بلکہ صبر و تحمل اور کام کی یکسانیت تھی۔ افکار و نظریات میں اختلاف سے کبھی آپسی تنازع کو جنم نہیں دیا، نہ ہی وہ پارٹی کی تقسیم کی وجہ بنی۔ ایسا اس لئے ممکن ہوا کہ جن سنگھ اور بھارتیہ جنتا پارٹی دونوں اشکال میں ہماری پارٹی ایک عظیم مقصد کیلئے ساتھ ساتھ کام کرنے کے جذبہ سے متاثر

تھی۔ میں اسی سوچ کو بھارتیہ جنتا پارٹی کے اٹوٹ اور بہتر تنظیم کی بنیاد قرار دیتا ہوں۔ ہندوستان میں یہ ایک ہی نظیر ہے جہاں دیگر پارٹیوں تنظیموں کے اندر دراروں کا پیدا ہونا ایک عام بات ہو چکی ہے۔

میری نظر میں دوست اور ساتھی کے اس بنیادی جذبہ کو بی جے پی کے بتدریج فروغ اور عوام میں مقبولیت میں اضافہ کرنے کیلئے زیادہ سے زیادہ مستحکم کرنے کی ضرورت ہے۔ پارٹی اور ملک کیلئے جو کچھ بہتر ہے، اس کے پس منظر میں ایک حد سے باہر اپنے آپسی اختلافات کو نہ لے جانے کا خود احتسابی عمل کامیابی کو طویل مدت تک یقینی بنانے والا سب سے اہم عنصر ہے۔ حقیقت میں اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر میں یہ کہنا چاہوں گا کہ ساتھ ساتھ کام کرنے کی روایت کے فلسفہ کو ہمارے بھی سیاسی اور غیر سیاسی تنظیموں کے ذریعہ قبول کئے جانے اور ہماری قومی زندگی کی ایک مضبوط روایت کی دھارا کی شکل میں اپنائے جانے کی ضرورت ہے۔ یہ ہمارے قابل افتخار جمہوری نظام کو مستحکم بنانے اور اسے اتحادوں کے اس دور میں پیدا ہونے والی سیاسی رسہ کشی اور دباؤ کا سامنا کرنے میں اہل بنانے کیلئے ایک بنیادی ضرورت بن گئی ہے۔ یہ سماجی اور معاشی ترقی میں ہندوستان کے امکانات کو مکمل طور سے اور شرمندۂ تعبیر کرنے کے نظریہ سے بھی ضروری ہے، تاکہ ایک ارب سے زائد آبادی والے ملک کے ہر ایک شہری کی ضروریات وخواہشات کی تکمیل ہو سکے۔ ہندوستان غیر معمولی اور مختلف النوع جہت کا ایک عظیم ملک ہے۔ ہمیں اپنی سماجی اور سیاسی زندگی میں انہیں قبول کرنا چاہئے اور ان کا احترام کرنا چاہئے۔ پھر بھی ہندوستان کی ترقی اور حال و مستقبل کے چیلنجوں کا ڈٹ کر سامنا کرنے کی اس کی صلاحیت بنیادی طور سے اس کی مقدار پر منحصر کرتی ہے، جس مقدار میں ہم اختلافات سے اوپر اٹھ کر اتحاد کو مضبوط کرتے ہوئے ایک ذرائع میں تبدیل کرسکیں گے۔ ہمای قومی ایکتا کو 'سیکولرازم' کے منفی تصور کے ذریعہ کمزور نہیں بنانا چاہئے۔ آڈوانی جی نے حقیقت میں سیکولرازم اور ہماری قومیت بنیادی اصولوں پر عوامی بحث میں ایک مضبوط اور مستقل تعاون دیا ہے۔

آڈوانی جی کی طویل اور غیر مشتبہ واقعاتی سیاسی زندگی کے دوران ان کے بارے میں شاذ ونادر غلط فہمیاں پیدا ہوئی ہیں اور اس کے نتیجے میں وہ شبیہ اور حقیقت کے درمیان فرق کا شکار ہوئے ہیں۔ لیکن جن لوگوں نے ان کے ساتھ کام کیا ہے یا جن کا ان سے تعلق رہا ہے وہ انہیں ایک ایسی شخصیت کے طور پر جانتے ہیں انہوں نے قوم پرستی میں اپنے یقین واعتماد پر کبھی سمجھوتہ نہیں کیا، اور پھر بھی انہوں نے حالات کی مانگ کے مطابق سیاسی رویہ میں لچیلا پن اختیار کیا۔ یہ سچائی سب سے اوپر ہے کہ وہ ایسے کشادہ دل ودماغ کی شخصیت ہیں، جنہوں نے ہمیشہ مختلف ذرائع سے نئی سوچ کو اپنایا ہے۔ یہ ایک صلاحیت ہے جو کتابوں کے تئیں ان کی محبت سے حاصل ہوا ہے۔ میں ہمیشہ اس بات پر متجسس رہا کہ عوامی زندگی میں اتنا زیادہ وقت دیکر بھی وہ اپنی اس دلچسپی کو برقرار کیسے رکھے ہوئے ہیں۔ اس عمر میں بھی وہ مسلسل بغیر کسی تکان کے دورہ کرتے ہیں، پارٹی کو اور عوامی اسٹیجوں، مہموں سے خطاب کرتے رہتے ہیں، زیادہ سے زیادہ مطالعہ اور خامہ فرسائی کرتے ہیں۔

اس کتاب کے ذریعہ آڈوانی جی نے اب اپنی زندگی میں ایک دوسری خاص حصولیابی کو جوڑ دیا ہے۔ ہندوستان میں اپنی خودنوشت لکھنے والی عوامی زندگی کی مشہور شخصیتوں کا کوئی اہم رول نہیں رہا ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ 'میرا ملک میری زندگی' کو بڑی تعداد میں اور بھر پور دلچسپی کے ساتھ مختلف پس منظر کے لوگوں کے ذریعہ مقبولیت حاصل ہوگی۔ اس کتاب میں حقیقتاً ایک حساس انسان اور مخصوص ہیرو کی قابل ذکر زندگی کی کہانی ہے، جن کی سب سے بڑی حصولیابی ابھی سامنے آنی باقی ہے۔ ایسی مجھے امید ہے اور ایشور سے میری یہی دعا ہے۔

(اٹل بہاری واجپئی)

وزیر اعظم ہند (1998-2004)

دو لفظ

کتابیں وقت کی آتما ہوتی ہیں اور ورق حالات کا آئینہ، الفاظ زندگی کے رہنما اور جملے تاریخ کا سرچشمہ۔ کتابوں نے انسانوں کے دل و دماغ پر حکومت کی ہے اور یہی وجہ ہے کہ دنیا کی ترقی و توسیع میں عظیم فن پاروں نے اہم رول ادا کیا ہے۔ اسلام قرآن کے توسط سے مکمل ہوا، ہندوازم بھگوت گیتا اور رامائن کے صفحات میں اجاگر ہوا، عیسائیت بائبل کے الفاظ میں پوشیدہ ہے تو سکھ مذہب کے رموز و نکات گروگرنتھ صاحب کے ورد کی شکل میں گرودواروں میں گونجتے ہیں۔ روسی اور فرانسیسی ادب نے سماج کی صحت یابی کے لئے ایسی ایسی کتابیں فراہم کیں جو داستان پارینہ کی شکل میں آج بھی اپنی اہمیت برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ فردوسی کا شاہنامہ ہو، ہندوستانی پنچ تنتر یا عربی کی الف لیلیٰ، آج بھی اپنے دور کی ترجمانی کرتی نظر آتی ہیں۔ ظلم و جبر، استحصال و بدعنوانیوں کے خلاف کتابوں نے سب سے پہلے آواز اٹھائی ہے۔ محرومی، تنہائی اور مضمحل دلوں کو کتابوں نے ہی قرار بخشا ہے۔ مختصر یہ کہ اگر کتابیں نہیں ہوتیں تو صحت مند سماج آج معذوروں کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوتا اور اسی لئے نامور شخصیات کی بنیاد کتابوں کے ورق پر رکھی گئی ہے۔ میرے سامنے جو کتاب ابھی رکھی ہوئی ہے وہ ایک ایسے شخص کی ہے جس کے عزم و حوصلہ نے ہندوستان کے سیاست دانوں اور عوام کو اس قدر متاثر کیا کہ ان کی گنجلک شبیہ کی وضاحت، ان کی سرگرمیوں کے بل بوتے پر ایک ایسے شفاف اور پروقار دیش بھکت کی طرح ہوگئی، جس نے زمانے کی کلائیاں مروڑ ڈالیں۔

کہتے ہیں کہ ترجمہ سے تخلیق کی تقدیر بدل جاتی ہے۔ ایک بنیادی متن اپنی بنیادی زبان میں ہی الوہی تاثرات پیش کرتا ہے، لیکن یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ کئی فن پاروں کا ترجمہ اسے تاریخی حیثیت دلانے میں کامیاب رہا۔ اس زمرے میں آپ دالمیک لیپئر کی کتاب 'فریڈم ایٹ مڈنائٹ' کو رکھ سکتے ہیں، جس کے اردو ترجمہ نے اسے کئی زندگی بخشی۔ رامائن کا سب سے زیادہ ترجمہ اردو میں کیا گیا۔ ایسی کئی مثالیں ہیں جو آج بھی ترجمہ کی اہمیت و افادیت کو اجاگر کرتی ہیں۔

بات اگر مرد آہن لال کرشن آڈوانی کی ہو تو آڈوانی جی نے اپنی زندگی کی شروعات ہی کتابیں پڑھنے سے کیں۔ انھوں نے کتابوں کی ورق گردانی اور بچپن کے حسین پل سماج کی بہتری کے لئے سائیکل پر سڑکوں کی دھول پھانکتے ہوئے کی۔ ایک ایسی عمر میں جب بچے اپنی خوشی کے لئے چمکدار شئے کی طرف بھاگتے ہیں، آڈوانی جی کو کتابوں نے سکھایا کہ دوسروں کا کام کرنا ہی دراصل روح کی بالیدگی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ ڈیل کارنیگی کی کتاب 'ہاؤ ٹو وِن فرینڈس اینڈ انفلوئینس پیوپل' کا ہی اثر ہے کہ ان سے ملاقات کرنے کے بعد ہر ایک ان سے دوبارہ ملاقات کا خواہاں ہوتا ہے اور یہ صرف اس لئے نہیں کہ وہ ابھی ملک کے سب سے بڑے لیڈر ہیں بلکہ اس لئے کہ وہ ابھی ملک کے سب سے اچھے انسان ہیں اور ایسا صرف اس لئے ہے کہ انھوں نے بچپن سے ہی کتابوں سے دوستی کی۔ پال بریٹن، چارلس ڈکنس، الیگزنڈر دیوما، ونائک دامودر ساورکر، جادو ناتھ سرکار وغیرہ کی اہم اور بنیادی کتابوں کا اثر ہے کہ انھوں نے شرنارتھی کا درد ہندوستان کے درد میں سمولیا ہے اور

ہندوستان کی سیاست کے سب سے بڑے شخصیت بن چکے ہیں۔ یہ آسان نہیں ہوتا ہے۔

آڈوانی جی کی کتاب 'مائی کنٹری مائی لائف' کا ترجمہ میرے لئے اس لئے بھی اہمیت کا حامل ہے، کیونکہ بی جے پی میں مسلمانوں کی شمولیت کو آج بھی گناہ تصور کیا جاتا ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہندوستان کی خودساختہ سیکولر پارٹیوں نے مسلمانوں کی حالت دلتوں سے بھی بدتر کردی اور اب تو 'دہشت گردی' کا لیبل بھی چسپاں کیا جاچکا ہے۔ آج کا ایک ایک مسلمان ہندوستان کی اپنی زمین پر ہی اجنبی کی طرح رہنے پر مجبور ہورہا ہے۔ ایسا صرف اس لئے ہے کہ مسلمانوں کو خوف زدہ کیا گیا اور الیکشن کے وقت اسے لبھاؤنے سپنے دکھائے گئے۔

میرے دوست سید شاہنواز حسین نے جب مجھے 'مائی کنٹری مائی لائف' کا اردو ترجمہ کرنے کی پیشکش کی تو میں تذبذب میں پڑ گیا۔ میرے ذہن میں بی جے پی کے متعلق یہ تاثر تھا کہ وہ ایک ایسی سیاسی پارٹی ہے، جسے مسلمان ایک آنکھ نہیں بھاتے، یہاں تک کہ وہ مسلمانوں کو ملک میں دوئم درجہ کا شہری بنانا چاہتی ہے اور سیکولرازم پر اس کا کوئی یقین نہیں ہے، لیکن جیسے جیسے میں یہ کتاب پڑھتا گیا میری غلط فہمی دور ہوتی گئی اور اسی بی جے پی کے سب سے بڑے لیڈر آڈوانی جی کی اس کتاب میں مجھے کوئی ایسا جملہ نظر نہیں آیا، جس سے ہندوستان کے مسلمانوں کے تئیں نفرت یا کدورت کا ذرہ برابر شائبہ ملتا ہو۔ جہاں تک سیکولرازم کی بات ہے تو آڈوانی جی کا سیکولرازم ان دوسری نام نہاد سیکولر پارٹیوں کے سیکولرازم سے مختلف نظر آیا، جس کا استعمال وہ صرف ووٹ حاصل کرنے کے دوران ہی کرتی نظر آتی ہیں۔

میں نے شروع میں لکھا ہے کہ ترجمہ سے تخلیق کی تقدیر بدل جاتی ہے، میں بہت بڑا ادیب یا ماہر لسانیات نہیں ہوں، لیکن میں نے کوشش کی ہے کہ میرے ترجمے سے کتاب کے وقار کو ٹھیس نہ پہنچے۔ ویسے بھی جس کتاب کی تقریظ اٹل بہاری واجپئی جیسے دقاق دانشور وادیب نے لکھی ہو، اس کے بعد میرے یہ 'دولفظ' کی اہمیت ہی کیا ہے، پھر بھی اگر میری کوششوں کی ذرہ برابر بھی ستائش ہوئی تو مجھے اس پر فخر ہوگا۔

ڈاکٹر زین شمسی

مقدمہ

15 راگست 2007 کو تمام ہندوستانیوں نے ملک کی آزادی کی 60 ویں سالگرہ کا جشن منایا۔ درحقیقت یوم آزادی ہم سب کے لیے ایک خصوصی دن ہے۔ ہر سال اس دن صبح ہم سب کے دو پروگرام طے ہوتے ہیں۔ پہلے پروگرام میں، اطالوی پتھر سے تعمیر کی گئی دور مغلیہ کی شاہی عمارت لال قلعہ پر ہونے والے قومی پروگرام میں شامل ہونا، جہاں وزیراعظم قومی پرچم لہراتے ہیں اور قوم سے خطاب کرتے ہیں۔ اس قلعہ اور اس کے تاریخی پس منظر میں 1857 میں ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی سمیت مادر وطن کے دور قدیم سے جدید دور تک کے سفر میں آئے کئی فیصلہ کن مقامات کے پاؤں کے نشانات کو اب بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ ایک خوشگوار اتفاق یہ بھی ہے کہ ہندوستان کی آزادی کا 60 واں جشن، سال گرہ اس قابل فخر جنگ کی 150 ویں سال گرہ کے طور پر منایا جارہا ہے، جس میں ہندوؤں، مسلمانوں، راجاؤں، رانیوں اور عام لوگوں نے کندھے سے کندھا ملا کر برطانوی حکومت کے خلاف جنگ لڑی تھی۔

اسی دن میرا دوسرا کام ہوتا ہے لال قلعہ کی تقریب سے گھر لوٹ کر اپنے کنبہ، ساتھیوں، دوستوں اور آفس اسٹاف کے ساتھ اپنے گھر کے دالان میں پرچم کشائی کرنا اور قومی ترانہ پڑھنا۔ یہ پروگرام چکاچوند سے دور سادگی سے منایا جاتا ہے، لیکن یہ مجھے اطمینان بخش احساس فراہم کرتا ہے، کیونکہ یہ اپنے مادر وطن کے تئیں اظہار عقیدت کا میرا اپنا طریقہ ہے۔ اگر بھارت ماتا دیوی ہے اور جیسا کہ میں پر اعتماد ہوں کہ وہ ہے، تو میرا یہ یقین مجھے سکھاتا ہے کہ انفرادی و اجتماعی دونوں شکلوں میں اس دیوی کی عبادت کی اپنی اہمیت ہے۔

اس سال اپنے پروگراموں کو مکمل کرنے کے بعد میں نے باقی ماندہ دن کا بیشتر حصہ مختلف ٹی وی چینلوں کو دیکھنے اور اخبار کی ورق گردانی میں گزارا۔ سبھی چینلوں میں آزادی کی 60 ویں سال گرہ کو ترجیح دی گئی تھی۔ ایک ٹی وی چینل نے 'آزاد ہندوستان کی مایہ ناز حصولیابیوں کے دس باب' سرخی کے ساتھ ایک فیچر نشر کیا۔ اس میں سے دو پر پہلے سے لیے گئے میرے انٹرویو میں رکھے گئے نظریات پیش کیے گئے تھے۔ وہ تھے 77-1975 کی ایمرجنسی، 1980 کی دہائی کا اواخر اور 1990 کی دہائی کے آغاز میں چلائی گئی رام جنم بھومی تحریک۔

دیگر ٹی وی چینلوں اور اخباروں کے ذریعہ ایسے ہی فیچرز پیش کیے گئے تھے۔ میڈیا کے ذریعہ اجاگر کیے گئے کچھ دیگر اہم سیاسی واقعات تھے: (1) 1947 میں تقسیم ہند، (2) 1948 میں مہاتما گاندھی کا قتل، (3) ہندوستان کے پہلے وزیر داخلہ سردار ولبھ بھائی پٹیل کے ذریعہ 565 ریاستوں کا ہندوستان میں انضمام، (4) ہندوستان کا جمہوری آئین اپنانے کے بعد 1952 کا پہلا عام انتخاب، (5) 1962 میں ہندوستان پر چین کا حملہ، (6) 1969 میں کانگریس کی تقسیم، (7) 1971 کی ہند-پاک جنگ، جس میں بنگلہ دیش کو آزادی نصیب ہوئی، (8) پارلیمانی انتخابات میں کانگریس کی پہلی شکست، بعدازاں 1977 میں جنتا پارٹی کی حکومت، (9) 1984 میں اندرا گاندھی کا قتل، بعدازاں قومی راجدھانی میں سکھ مخالف روح فرسا فسادات، (10) بوفورس گھوٹالہ اور 1989 کے انتخابات میں راجیو گاندھی کی شکست، (11) اٹل بہاری واجپئی حکومت کے ذریعہ

مئی 1998 میں پوکھرن میں جوہری تجربہ کیے جانے سے ہندوستان کا ایٹمی طاقت بننا، (12) بی جے پی کے زیر قیادت قومی جمہوری اتحاد کی پہلی غیر کانگریسی حکومت، جس نے 6 سال (2004-1998) تک مرکز میں حکومت کی۔

جب میں نے 15 راگست کے موقع پر یہ خصوصی فیچر دیکھا تو اچانک میری توجہ اس جانب مبذول ہوئی کہ آزاد ہندوستان کے تعلق سے نشر کیے گئے اہم واقعات میں سے تقریباً تمام میں یا تو میں نے حصہ لیا تھا یا انھیں بہت نزدیک سے دیکھا تھا۔

اپنے سینئر کرم فرما محترم اٹل بہاری واجپئی اور محترم بھیروں سنگھ شیخاوت کے ساتھ ہندوستانی سیاست میں، میں ان چنندہ شخصیتوں میں سے ایک ہوں جنھوں نے 1952 سے تمام انتخابات میں حصہ لیا ہے یا تو ایک مہم جو کے طور پر یا ایک امیدوار کی شکل میں۔ آج بھی میں قوم کے سامنے قطار بند مسائل پر پارلیمنٹ کے اندر اور باہر چل رہے مباحثوں میں ایک سرگرم حصہ دار ہوں۔ ان مسائل میں ہند-امریکہ ایٹمی معاہدہ اور اس کے سبب ہماری سیکورٹی اور خارجہ پالیسی پر پڑنے والے منفی اثرات بھی شامل ہیں۔

یہ کتاب قاری کو کم از کم اتنا پیغام تو دیتی ہی ہے کہ میں نے ایک طویل اور سرگرم زندگی بسر کی ہے۔ ایک قوم، خصوصاً قدیم قوم کی تاریخ میں 1947 سے 2007 تک کی مسافت بہت طویل نہیں ہے، لیکن ایک شخص کی زندگی میں یہ کافی طویل ہے۔ میرے معاملہ میں، آزاد ہندوستان کے سیاسی سفر نے میرے نجی سفر کو خود میں مدغم کر لیا ہے، جس سے مجھے موقع فراہم ہوا کہ میں ملک کی راہ میں آنے والے واقعات کا جائزہ لے سکوں اور اپنے مؤدبانہ لہجہ میں ان کے پیش ہونے میں مثبت تعاون دے سکوں۔ میری زندگی کافی پُر حوادث رہی ہے۔ سرگرمیوں سے لبالب، کئی مدوجزر کو چھوتی ہوئی لیکن اپنی توسیع میں اطمینان بخش، دراصل یہ میری امید سے زیادہ اطمینان بخش رہی ہے۔ اس نے مجھے بہت کچھ سکھایا ہے۔ اسی نے مجھے ویسا بنایا ہے جیسا میں آج ہوں، اسی لیے کچھ وقت پہلے میرے دل میں ایک خیال کروٹ لینے لگا 'کیوں نہ اپنی خودنوشت لکھوں۔' میں سمجھتا ہوں کہ اپنے ہم وطنوں سے کہنے کے لیے میرے پاس کچھ ہے۔ میں جانتا ہوں کہ نہ تو میں ایک مؤرخ ہوں اور نہ ہی ماہر علم سیاسیات، لیکن ایک ایسے شخص کے طور پر، جس نے اپنی ساری جوانی قوم کو وقف کر دی اور تجربات کا خزانہ جمع کیا ہے۔ میں یہ دعویٰ کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میرے پاس کچھ اخلاقی اور نظریاتی شعور ہے، جو ایک جاں نثار، دوررس نظریہ رکھنے والے اور نتیجہ کی پرواہ نہ کرنے والے سیاسی کارکن کے لئے ضروری ہے۔

میں نے محسوس کیا کہ اب وقت آگیا ہے کہ میں اس تجربہ اور نظریہ کو اپنے ہم وطنوں کے ساتھ بانٹوں اور مستقبل کے ہندوستان کے بارے میں اپنے خوابوں اور مقاصد، امیدوں اور اندیشوں کو بھی، خصوصاً نوجوانوں کے ساتھ بانٹوں۔

ایک سیاست داں ہونے کے ناطے میں نے خیالات کی تشہیر، ان آدرشوں کی عمل آوری، جن پر مجھے یقین ہے، پالیسیوں کی حمایت یا مخالفت اور اپنی پارٹی کے پروگراموں کی ترویج کے لیے صفحۂ قرطاس کا سہارا لیا ہے، لیکن میں نے اپنے بارے میں کم ہی کہا یا لکھا ہے۔ میں نے کسی انٹرویو یا مضامین کے ٹکڑوں میں بھلے ہی ایسا کیا ہو لیکن منظم اور دانستگی کیا۔ اس لیے میں نے بذات خود کہا کہ کیوں نہ اپنی ساری یادوں اور خیالوں کو ایک ہی زنجیر میں پرو لیا جائے۔

صرف میں ہی ایسا نہیں سوچ رہا تھا، میری شریک حیات کملا اور بیٹی پرتبھا کے بڑھتے دباؤ سے ان خیالات کو تقویت ملنے لگی۔ کبھی کبھی یہ گمان ہوتا کہ وہ مجھ سے زیادہ پرتجسس تھے کہ مجھے اپنی خودنوشت صفحۂ قرطاس پر بکھیرنی چاہئے۔ زندگی تجربات کا دریا ہے، کیوں نہ لوگوں کو معلومات ہونی چاہیے۔ کملا نے بے شمار منتیں کیں۔ میں جانتا تھا کہ وہ اس خیال کو آواز دے رہی تھیں جو میرے دل میں خاکہ کی صورت اختیار کر رہا تھا۔

وقت معینہ پر ہی کچھ تھیں خاص ہوتا ہے۔ کئی وجوہات سے 2007 کی آمد اس کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ اوّل، ہندوستان کی آزادی کی 60ویں سالگرہ پر سندھ سے ہجرت کے بعد میری زندگی کی 6 دہائی بھی مکمل ہوئی تھیں۔ دوم، نومبر 2007 میں، میں 80 سال کا ہو گیا۔ ایک طویل العمر اور صحت مند زندگی کی سوغات دینے میں ایشور مجھ پر مہربان رہے ہیں۔ اسی برس میری سیاسی زندگی کے 55 برس بھی مکمل ہوئے۔ یہ سال ایک سویم سیوک کے طور پر آر ایس ایس سے 65 برسوں کی میری سرگرم اور اٹوٹ تعلقات کی بھی نشان دہی کرتا ہے۔ ایک ایسا رشتہ جس پر مجھے سب سے زیادہ فخر ہے۔ کملا نے اس سال 75 سال مکمل کیے اور پرتبھا نے اپنی چالیسویں سال گرہ کا جشن منایا۔ میرے بیٹے جینت اور بہو گیتکا بھی میرے لیے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ میں اپنے ملک کے لیے جو کچھ بھی کر سکا ہوں، وہ خاص طور سے اپنے کنبہ سے ملے بے پناہ پیار، دعا، تعاون اور دیکھ بھال کے سبب ہی ممکن ہوا ہے۔

کتاب کے خیال نے جلد ہی لفظوں کا جامہ پہننا شروع کر دیا۔

پیارے قارئین! اب یہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

پانچ مراحل میں زندگی کا دائرہ

کتاب کے موضوعات کا مختصر حوالہ دینا مناسب ہوگا۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ چینی رسم الخط میں 'مصیبت' لفظ کو دو حرفوں کے جوڑ سے لکھا جاتا ہے۔ پہلا حرف 'خطرہ' کو بیان کرتا ہے اور دوسرا 'موقع' کو۔ میری زندگی میں یہ حقائق بار بار سامنے آئے ہیں کہ ان دونوں خیالات کے آپسی تعلقات میں بڑی سچائی ہے۔ خواہ کوئی شخص ہو یا فرقہ، پریشانی کے حالات ایک چیلنج پیش کرتے ہیں۔ چیلنج شخص اور فرقہ میں جو کچھ بہتر ہے، اسے سطح پر لے آتی ہے۔ موقع مصیبت کا ہی دوسرا پہلو ہے، اس ناقابل فراموش سچائی سے میرا سامنا 1947 میں ہوا، جو میرے ملک اور میرے، دونوں کے لیے ناقابل فراموش تبدیلی کا سال تھا۔ وہ ہندوستان کی تاریخ اور میری اپنی زندگی میں منقسم لکیر کے طور پر شامل ہوا۔ میں نے اپنی زندگی کا ایک چوتھائی حصہ، زندگی کے پہلے 20 برس، سندھ میں بسر کی ہے، جو اب پاکستان کا ایک حصہ ہے۔ میری پیدائش 1927 میں سندھ کی راجدھانی کراچی میں ہوئی۔ 1942 میں جب میں نے اپنی زندگی کے 14 برس مکمل کیے تھے۔ راشٹریہ سویم سیوک سنگھ، ایک قوم پرست تنظیم، جو ذات، زبان اور علاقائیت کی تقسیم سے بالاتر ہندو سماج کے اتحاد اور ہندوستان کی وراثتی تہذیب وتمدن پر مبنی ہندوستان کے قومی احیاء کے تئیں وقف تھا، میں شامل ہوا۔

مادر وطن، آزادیٔ ہندوستان کا تابناک مستقبل! یہی وہ باتیں تھیں جنھوں نے اصول پرستی، جو اس عمر کی ایک انوکھی دین ہوتی ہے، کی توانائی کے ساتھ میرے نوخیز دل میں گھر بنا لیا تھا۔ وطن پرستی ان دنوں ہوا کی طرح سارے میں پھیلی ہوئی تھی، لیکن جیسے سال گزرے، ایک اور حقیقت جو کبیدہ خاطر تھی جس نے میرے دل اور کراچی میں رہنے والے سویم سیوکوں کے دل کو گرفت میں لے لیا۔ سندھ کے افق پر تقسیم کے بادل منڈلانے لگے تھے۔ وہ احتیاط برتنے کے لیے کافی تھے۔ سندھ میں اقلیت میں رہ رہے ہندوؤں میں خوف اور غیر یقینی کی صورت حال جنم لینے لگی تھی۔ ایک انوکھی سرگوشی 'دو قومی نظریہ' اور ایک انجان نام 'پاکستان' آہستگی اور فکرمند صداؤں میں گشت کر رہی تھی۔ میں نے سنا کہ ایک نیا مسلم ملک بنانے کی تیاری ہو رہی ہے۔ کیا کراچی اور سندھ ہندوستان میں نہیں رہیں گے؟ کیا ہمیں اپنا شہر، اپنا پیارا سندھ چھوڑنا ہوگا؟ یہ ایک خطرناک سوچ تھی۔

15/اگست 1947 کو یہ خیال ایک پرتشدد حقیقت میں تبدیل ہو گیا۔ مادر وطن تقسیم کر دی گئی۔ ہندوستان کی آزادی اور پاکستان کی

تشکیل، خوفناک قتل عام اور تاریخ کے سب سے بڑی سرحد پار انسانی منتقلی کے سائے میں ہوئی۔ دیوہیکل فرقہ وارانہ فسادات میں تقریباً 10 لاکھ افراد ہلاک ہوئے اور تقریباً 1.5 کروڑ لوگ شرنارتھی بنائے گئے۔ میں بھی ان میں سے ایک تھا۔ 12 ستمبر 1947 کو میں نے کراچی کو الوداع کہا۔ اپنے گھر سے ٹوٹ کر اور تقسیم کی لپٹوں سے بچے ہوئے میرے کنبہ کو اور مجھے بھارت ماں کے آنچل میں تحفظ اور سکون نصیب ہوا، حالانکہ وہ خود کراہ رہی تھی، لیکن اس نے ہمیں گھر جیسا احساس کرایا۔

غیر منقسم ہندوستان کے ان حصوں میں رہنے والے ہندوؤں کے لیے جو بعد میں پاکستان کا حصہ بنے، تقسیم ایک زبردست آفت تھی۔ شمال مغرب سرحدی خطہ اور بلوچستان کو چھوڑ کر پنجاب، بنگال اور سندھ متاثر ہونے والے دیگر اہم علاقے تھے۔ بنگال اور پنجاب کی تقسیم کے بعد ان علاقوں سے منتقل ہوئے ہندوؤں کو عارضی گھر مل گیا، لیکن مکمل سندھ ہی پاکستان کا حصہ بن گیا۔ سندھ میں تھار پر کر جیسے کچھ اضلاع تھے جو راجستھان سے ملحق تھے اور جہاں ہندو اکثریت میں تھے۔ ایک جارح اور پر عزم قیادت شاید ان اضلاع کو ہندوستان میں شامل کرانے میں کامیاب رہتی، لیکن ایسا نہیں ہوا۔

سندھ کے ہندوؤں کے لئے تقسیم کا مطلب صرف اپنے گھر و رشتہ داروں سے علاحدگی نہیں تھی بلکہ اس کے ساتھ ہی تقسیم انھیں تکلیف دہ احساس کے ساتھ اپنی تہذیب و زبان سے بھی دور لے گئی۔ کئی لوگوں کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ تقسیم کے وقت کراچی کی 4 لاکھ آبادی میں نصف سے زائد افراد ہندو تھے۔ سندھ کی تقریباً 40 لاکھ کی آبادی میں ہندوؤں کی تعداد 13 لاکھ تھی۔ ان میں سے تقریباً 11 لاکھ افراد ہندوستان منتقل ہوگئے۔ تاجر فرقہ ہونے کے سبب کراچی کی تقریباً پوری ہندو آبادی منتشر ہوگئی، حالانکہ بیشتر سندھی شرنارتھی گجرات، مہاراشٹر، راجستھان اور مدھیہ پردیش چلے گئے، لیکن شاید ہی ایسی کوئی ریاست ہوگی جہاں وہ رہائش پذیر نہ ہوگئے ہوں۔

بیشتر منتشر کنبوں کے لیے تقسیم ایک نفسیاتی اور معاشی بحران تھی۔ ان دنوں ریل گاڑیوں اور بس اڈوں پر ایسے کنبوں کے بچوں کو، جو سندھ میں کافی دولت مند تھے، ٹافیاں، کنگھے، کی-چین وغیرہ فروخت کرتے دیکھنا ایک عام منظر تھا۔ ان پریشانیوں اور مشکلات کے باوجود سندھیوں نے نہ صرف اپنا وجود برقرار رکھا بلکہ انھوں نے غیر معمولی ترقی بھی کی، جیسے ققنس (Phoenix) راکھ سے اٹھ کر کھڑا ہوا تھا، ویسے ہی سندھی فرقہ بھی تکلیف اور نظر اندازی کی گہری کھائی سے نکل کر ان لوگوں میں شامل ہوا، جنھوں نے کامرس، آرٹس، میڈیکل، انجینئرنگ اور دیگر کئی شعبہ جات میں اعلیٰ مرتبے حاصل کیے ہیں۔ غیر مقیم ہندوستانیوں میں بھی سندھیوں نے اپنی ایک علیحدہ ڈگر بنائی ہے۔ تعلیم، صحت، غریب بچوں اور سینئر شہریوں کی نگہبانی کے مقصد سے چلائی جانے والی عوامی مفادات کی سرگرمیوں میں بھی اس برادری نے خاطر خواہ تعاون دیا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اس نے مختلف مذہبی منصوبوں، خاص طور سے تیرتھ یاترا مرکزوں کے قیام میں بھی مدد کی۔ اس طرح بہت تھوڑے وقفے میں سندھیوں نے جو شرنارتھی بن کر آئے تھے، قابل ستائش کام کیے۔

سیاسی تجزیہ نگار متحیر ہیں کہ سندھ اور پنجاب سے آئے ہندو اور سکھ اتنی جلدی اور آسانی سے آزاد ہندوستان میں کیسے رچ بس گئے؟ جبکہ ہندوستان کے اس حصہ سے مغربی اور مشرقی پاکستان گئے مسلمانوں کے ساتھ دہائیوں تک ذلت آمیز 'مہاجروں' کی طرح سلوک کیا گیا؟ اس سوال کا صرف ایک ہی جواب جو میں سوچ سکتا ہوں، وہ ہے ثقافتی اتحاد کی روایتی سمجھ، جو مختلف ذاتوں، فرقوں اور علاقوں کے ہندوستانیوں کو ایک فطری قومی اکائی کی شکل میں باندھے رکھتی ہے۔ 1980 اور 1990 کی دہائیوں میں میں نے اسی خیال کو ثقافتی قوم پرستی کی شکل میں فروغ دیا اور اسے اس ملک گیر بحث کا موضوع بنا دیا کہ کون سی بات ہندوستانی قوم پرستی کی تعریف متعین کرتی ہے، اسی موضوع کی تفصیل اس کتاب کے مقصد

کا ایک اہم پہلو ہے۔

اگر میں اس بات کو اس مخصوص انداز میں بیان کر سکوں تو میں کہوں گا کہ ثقافتی قوم پرستی کا میرا پہلا تجربہ اس وقت ہوا جب میرا کنبہ سندھ چھوڑنے والا ہی تھا اور اس بات پر غور کر رہا تھا کہ ہم ہندوستان کے کس حصہ میں جائیں۔ مجھے یاد ہے کہ میری 80 سالہ دادی میرے باپ سے کہہ رہی تھیں 'مجھے کاشی لے چلو، میں اپنی باقی ماندہ زندگی گنگا کنارے گزارنا اور وہیں اپنی آخری سانس لینا چاہتی ہوں۔' میرے والد نے ان کی یہ خواہش پوری کی۔ اس طرح جب ہمیں سندھ کے قریب کا اپنا گھر چھوڑنا پڑا تو وہ گنگا میا ہی تھی جو عظیم جولانی میں بھارت ماں کی شناخت ہے جس نے ہمیں قبول کیا۔

اس سلسلہ میں دوسری سب سے بڑی چنوتی جسے میں یاد کرنا چاہوں گا وہ آزادی اور آج سے تقریباً وسط میں یعنی 1975 میں ظہور پذیر ہوئی۔ ایک بار پھر ایک مصیبت جو موقع میں تبدیل کر دی گئی، 11 رجون کو کانگریس پارٹی کا ناقابل تسخیر مانا جانے والا قلعہ گجرات منہدم ہو گیا، جب مرار جی ڈیسائی کی قیادت میں 'جنتا مورچہ' کے بینر تلے مخلوط اتحاد نے اسمبلی انتخابات میں کانگریس (آئی) کو بری طرح شکست دی۔ اسی دن راج نارائن کے ذریعہ وزیر اعظم اندرا گاندھی کے خلاف دائر انتخابی عرضی پر الہ آباد ہائی کورٹ نے اپنا فیصلہ سنایا۔ عدالت نے انتخابی خلاف ورزی کا الزام لگانے والی عرضی منظور کرتے ہوئے اندرا گاندھی کا انتخاب رد کر دیا اور انھیں 6 سالوں کے لیے ممبر پارلیمنٹ کی رکنیت کے لئے نااہل قرار دے دیا۔

ان دونوں واقعات نے مشترکہ طور پر حکومت اور کانگریس پارٹی میں سیاسی زلزلہ برپا کر دیا، جس کی سنسنی سے واقعات کا ایک سلسلہ پیدا ہوا اور جس کا خاتمہ آئین کے ایکٹ 352 کے تحت ملک میں ایمرجنسی نافذ کرنے سے ہوا۔ اس ایکٹ کا استعمال چین (1962) اور پاکستان (1965 اور 1971) سے ہوئی جنگوں کے دوران پہلے بھی کیا گیا تھا، لیکن 'داخلی خلفشار' سے نمٹنے کے لیے اس کا استعمال پہلی بار کیا جا رہا تھا۔ کثیر تعداد میں اراکین پارلیمنٹ اور ریاست کے اراکین اسمبلی سمیت مخالف پارٹیوں کے لاکھوں کارکنان اور لیڈروں کو قید کر لیا گیا۔ اس میں قابل تعظیم لوک نائک جے پرکاش نارائن بھی شامل تھے۔ اپنے سینئر ساتھی اٹل جی کے ساتھ مجھے بنگلور سینٹرل جیل میں بند کر دیا گیا جہاں میں نے 19 ماہ گزارے۔ میڈیا پر سخت سینسر شپ نافذ کر دی گئی، یہاں تک کہ پارلیمنٹ کی کارروائی کی رپورٹنگ بھی سینسر شپ کے دائرہ میں آ گئی۔ 19 ماہ سے زائد مدت کے لیے جمہوریت پر گہن لگ گیا۔

اس مدت کے دوران ایک وقت تو ایسا محسوس ہوا جیسے ہمارے ملک میں جمہوریت کی واپسی نہیں ہوگی۔ کانگریس پارٹی کے 'نیشنل ہیرالڈ' نے ایک پارٹی حکومتی نظام کی تبلیغ میں جذباتی اداریئے لکھے۔ وزیر اعظم اندرا گاندھی نے اعلان کیا کہ جمہوریت سے زیادہ اہم قوم ہے۔ آل انڈیا ریڈیو سمیت مواصلاتی وسائل کے ہتھیار کے استعمال سے لوگوں کا 'برین واش' کر کے انھیں یہ بھروسہ دلانے کی کوشش کی گئی کہ آزادی، شہری حقوق، پریس کی آزادی اور آزاد عدلیہ، یہ سبھی فضول پیمانے جن کا عام زندگی کی ترقی سے کچھ لینا دینا نہیں ہے اور یہ کہ ایمرجنسی کے ذریعہ ہندوستان کی تقدیر سنوارنے کے لیے لوگوں کو کانگریس حکومت کا شکرگزار ہونا چاہیے۔

لیکن مارچ 1977 میں بالآخر جب اس تصوراتی تشہیر کی آزمائش کا موقع آیا تو سیاسی تجزیہ کار حیرت زدہ رہ گئے۔ غیر تعلیم یافتہ رائے دہندگان بھی اس تشہیر کے جھانسے میں نہیں آئے تھے۔ یہ کہنا شاید درست نہ ہو کہ انہوں نے انجانے میں جمہوریت کو بچانے کے لیے ووٹ دیا،

لیکن اس میں شک کی گنجائش نہیں کہ اس نے پوری بیداری کے ساتھ اندرا گاندھی اور ان کی ایمرجنسی کو نامنظور کردیا۔ ووٹنگ باکس کے ذریعہ صاف ستھرے ڈھنگ سے اقتدار کی منتقلی ہوئی۔ اندرا گاندھی کے امیدواروں کا انتخابی قتل ہوا اور دہلی میں جنتا پارٹی کی حکومت برسراقتدار آئی۔ جمہوریت پر منڈلا رہا خطرہ ٹل گیا تھا اور ایک مصیبت کو موقع میں تبدیل کردیا گیا تھا۔ مجھے فخر ہے کہ اس تبدیلی میں، میں ایک چھوٹا سا کردار ادا کرسکا۔ مرارجی ڈیسائی کی حکومت میں وزیر اطلاعات ونشریات کے طور پر پریس سینسرشپ، جو ایمرجنسی کے دوران سب سے زیادہ نفرت انگیز پہلو تھا، کو توڑنا خاص طور پر میری ذمہ داری تھی۔ یہ کتاب ایمرجنسی کی دردناک اور جمہوریت کی فتح کی دلچسپ کہانی کی تفصیل بیان کرتی ہے۔ اس نے یہ بھی دکھایا ہے کہ کس طرح سے کانگریس قیادت نے جمہوریت کے بنیادی ڈھانچہ کو تباہ کرنے کی کوشش کی۔ ایک غلط کام جس کے لیے پارٹی نے کبھی بھی معافی نہیں مانگی اور نہ ہی کبھی ایمانداری سے اس پر بحث ہونے دی۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے، کہ کانگریس میں کنبہ پروری کا ایک خاص رجحان ہے، اس لیے نہرو-گاندھی کنبہ کے ذریعہ کی گئی زبردست غلطیوں کی اصلاح کرنے اور پیچھے مڑکر دیکھنے کی عادت نہیں ہے۔ اس کی خاطر خواہ قیمت ہندوستان کو مسلسل ادا کرنی پڑی۔ حقیقت میں کنبہ پروری اب کانگریس پارٹی کا بنیادی حصہ بن چکا ہے۔

ایمرجنسی کے بعد کے زمانہ میں مجھے اس وقت اپنی پارٹی کی قیادت کرنے کے لیے کہا گیا، جب ہندوستان کی سیاست میں چار تبدیلیاں رونما ہورہی تھی۔ پہلا، طویل عرصہ سے چلی آرہی تجربہ کار کانگریس پارٹی کنبہ پرور اصولوں کی غلام بن گئی تھی۔ دوسرا، پارلیمنٹ میں اس وقت کی کانگریس حکومت کے پاس واضح اکثریت ہونے کے باوجود 1986 میں شاہ بانو معاملہ میں اس نے اقلیتوں کی چاپلوسی کی غرض سے گھٹنے ٹیک دیئے۔ یہ معاملہ، جس میں سپریم کورٹ کے ذریعہ 62 سالہ بیوہ کو اس کے سابق شوہر سے نان ونفقہ پانے کے حق میں دیئے گئے فیصلہ کو راجیو گاندھی حکومت نے مقننہ کے زور پر رد کردیا تھا۔ مسلم خواتین کی جنس کی بنیاد پر انصاف کی تلاش میں میل کا پتھر بن گیا۔ تیسرا، ہندوستان میں بدعنوانی کے سب سے بڑے معاملہ میں ملوث ہونے سے حکومت کی قیادت نے خود پر سیاہی تھوپ لی تھی اور اسی سبب 1989 کے پارلیمانی الیکشن میں اسے شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ چوتھا اور آخری بھگوان رام کی جائے پیدائش اجودھیا میں ان کی عظمت کے مطابق ایک مندر کی تعمیر کے ہندوؤں کے مطالبہ کی، کچھ خود ساختہ سیکولر سیاسی پارٹیوں نے مخالفت کی۔ ان کے کچھ لیڈران ذاتی طور پر اس مطالبہ کو درست سمجھتے تھے، لیکن ووٹ بنک کا خیال کرکے اسے اجتماعی طور پر کہنے سے خوف زدہ تھے۔

مندر کی تعمیر نو کے لیے چلائی گئی تحریک میں میری پارٹی کی سرگرم شراکت نے آزاد ہندوستان کی تاریخ میں سب سے بڑی عوامی تحریک کو جنم دیا۔ ستمبر-اکتوبر 1990 میں سومناتھ سے اجودھیا تک کی میری 'رام رتھ یاترا' کو ناقابل یقین عوامی حمایت حاصل ہوئی جو میری امید سے بہت زیادہ تھی۔ جس طرح ایمرجنسی کے خلاف جدوجہد میں جمہوریت میں ہندوستان کے لوگوں کے اٹوٹ یقین نے میری آنکھ کھول دی تھی، اسی طرح اجودھیا تحریک نے پورے ملک میں تمام ذاتوں اور فرقوں کے ہندوؤں کی زندگی میں مذہب کے گہرے تاثرات کے تئیں میری آنکھیں کھول دیں۔

یہ یاد کرتے ہوئے کہ سوامی وویکانند نے ہندوستان کی قومی زندگی میں مذہب کی اہمیت کے بارے میں کیا کہا تھا، میں نے محسوس کیا کہ اگر اس مذہبیت کو ایک مثبت سمت میں موڑ دیا جائے تو قومی احیا کے لیے یہ ایک حیرت انگیز توانائی کا کام کرسکتی ہے۔ اجودھیا تحریک نے خود ساختہ سیکولرزم، جو کانگریس پارٹی، کمیونسٹوں اور کچھ دیگر پارٹیوں کے ذریعہ استعمال میں لائی جاتی ہے، کے تئیں لوگوں کی برہمی کو بھی سامنے لانے کا کام کیا ہے اور اس نے میری پارٹی بی جے پی کو سچی قوم پرستی کے علم بردار کے طور پر پیش کیا ہے۔ فرضی سیکولرزم اور اصلی سیکولرزم کے درمیان کی

لڑائی آج بھی کئی صورتوں میں سامنے آتی ہے اور وہ اس کتاب کے اہم موضوعات میں سے ایک ہے۔ میں یہ کہنے کی جرأت رکھتا ہوں کہ ہندوستان کا مستقبل کافی حد تک اس جدوجہد کے نتائج پر منحصر ہے۔

یہ کہتے ہوئے بہت درد محسوس کرتا ہوں کہ اجودھیا تحریک جس راستہ پر چلی وہ ٹھیک ویسی نہیں تھی جو میں نے تصور کیا تھا، خاص طور سے 6 دسمبر 1992 کو بابری مسجد ڈھانچہ کا گرایا جانا نہایت ہی افسوسناک تھا، جیسا کہ میں نے اسی دن کہا تھا، وہ میری زندگی کا سب سے دردناک دن تھا۔ اگر بابری انہدام کا واقعہ نہ ہوا ہوتا تو مجھے یقین ہے کہ اجودھیا تحریک زیادہ صحت مندانہ طریقہ سے آگے بڑھی ہوتی اور ایک مثبت انجام تک پہنچی ہوتی، جس سے ہندوؤں کا مطالبہ بھی پورا ہو جاتا اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی بھی قائم رہتی۔

اجودھیا تحریک نے ملک گیر پیمانے پر ایک نظریاتی بحث کو توانائی بخشنے کا کام کیا، جس سے ہندوستان کی سیاسی تاریخ اور شاید دنیا کے کسی بھی جمہوری ملک کی تاریخ میں میری پارٹی نے شاندار مظاہرہ کیا۔ بی جے پی کی اس بڑھتی طاقت کا نظارہ 1998 میں مرکز میں ہندوستان کی پہلی اور صحیح معنوں میں ایک غیر کانگریسی اتحاد، واجپئی جی کی قیادت میں بنی جو این ڈی اے حکومت کی صورت میں دیکھنے کو ملی۔ 1999 میں نئی رائے عامہ کے ساتھ اس حکومت نے پوری ایمانداری وخصوصیت کے ساتھ 6 سال تک ملک کی خدمت انجام دی۔ اس حکومت میں واجپئی کے معاون کے طور پر مجھے وزارت داخلہ کا کام سونپا گیا تھا۔ میرا رول میرے لیے قابلِ اطمینان تھا۔ قومی سلامتی اور ترقی میں این ڈی اے حکومت کی کئی کارکردگیوں پر مجھے فخر ہے۔ ان میں سے کچھ، جیسے ہندوستان کو ایٹمی طاقت سے مالامال بنانے کا دلیرانہ فیصلہ اور پاکستان کی غداری کے باوجود اس سے اپنے تعلقات کو عام فہم بنانے کے لیے ایمانداری کے ساتھ کی گئی ہماری کوشش، ملک کی تاریخ میں زندہ جاوید رہیں گے۔ یہ تاریخ میں درج ہوگا کہ واجپئی کی قیادت میں ہندوستان ایک طاقتور اور ایک پُر اعتماد ملک بنا۔ فطری طور سے اس کتاب کا ایک بڑا حصہ ہماری پارٹی کے 6 سال کے دور اقتدار کے دوران ہوئی فتح اور مشکلات کو وقف ہے۔

مئی 2004 کے پارلیمانی انتخابات میں بی جے پی کے زیر قیادت قومی جمہوری اتحاد کی غیر متوقع شکست نے میری پارٹی کے سامنے ایک نئے چیلنج کو لا کھڑا کیا۔ اس کتاب میں اس شکست کے لیے ذمہ دار اتحاد کے اپنے حصے کو میں نے قبول کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ کئی چیزیں کچھ الگ ڈھنگ سے کی جاسکتی تھیں اور انھیں غلطیوں نے کانگریس کی جیت اور بی جے پی کی شکست میں اہم کردار نبھایا ہے۔ اعداد وشمار کے حساب سے کتنے کم فرق سے وہ شکست سے ہمکنار ہوئی تھی۔

بی جے پی کی شکست بھی اس کی ایک معرکۃ الآرا حصولیابی پر پردہ نہیں ڈال سکتی، وہ ہے ہندوستان کی سیاست، جو ایک تنہا پارٹی کے دبدبہ میں ہوا کرتی تھی، اسے دو قطبی بنانے میں میری پارٹی کی کامیابی۔ ہم یہ دعویٰ تو نہیں کرتے کہ ہم نے اسے دو پارٹی سسٹم والا بنا دیا ہے، لیکن اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ وہ اب دو قطبی ہے جس میں بی جے پی اور کانگریس دو اہم قطب ہیں، جس کے اردگرد ہندوستان کا سیاسی سیارہ ظاہر اور دوبارہ ظاہر ہوگا۔ یہ کتاب اس کی کہانی بیان کرنے کی کوشش کرے گی کہ اسے کیسے حاصل کیا گیا اور ہندوستان کی جمہوریت اور ترقی میں اس کی اہمیت کیا ہے۔

جس وقت میں یہ کتاب لکھ رہا ہوں، میری پارٹی مئی 2004 سے ہی خود احتسابی کے طویل عمل سے گزر چکی ہے۔ کئی سبق سیکھنے ضروری تھے اور وہ سیکھے جا رہے تھے۔ کئی خامیوں کو دور کرنے کے تجربے ضروری ہیں اور وہ حقیقت میں کیے جا رہے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ قارئین میری

پارٹی کے اور میری اپنی سیاسی زندگی کے اس فیصلہ کن موڑ پر اس موضوع پر اپنے خیالات پیش کرنے میں شفافیت کی کمی نہیں پائیں گے۔ شفافیت کے ساتھ ہی خود اعتمادی بھی آتی ہے، کیونکہ مجھے ذرہ برابر بھی شبہ نہیں ہے کہ بی جے پی پھر اقتدار میں آئے گی۔

یہ امید کئی وجوہات پر مبنی ہے۔ پہلا ہندوستان کے سیاسی منظرنامہ کے موجودہ بحران کے باوجود ہماری جمہوریت کو دو اہم قطبوں کی طرح ہمیشہ دو مستحکم قومی پارٹیوں کی ضرورت ہوگی، جن سے دیگر چھوٹی پارٹیاں اشتراک کر سکیں۔ ایک قومی اور قوم پرست پارٹی کی شکل میں ہندوستان کی مکمل ترقی میں روشنی کے مینار کی شکل میں اور بہترین حکومت کے بانی کی شکل میں بی جے پی اس ضرورت کو پورا کرتی ہے۔

لیکن میری امید کی دوسری وجہ ہے۔ 1951 سے جب جن سنگھ کا جنم ہوا تھا، ہماری پارٹی نے مشترکہ مقاصد کے لیے ساتھ ساتھ کام کرنے کی روایت کو فروغ دیا ہے۔ یہاں مجھے 2003 میں پیش آیا ایک خوشگوار واقعہ یاد آتا ہے۔ شیخاوت جی، جو حال تک ہندوستان کے نائب صدر جمہوریہ کے عہدہ پر فائز رہے ہیں اور میں، جو اس وقت نائب وزیر اعظم تھا، ہم دونوں واجپئی جی کی سال گرہ پر مبارک باد پیش کرنے کے لیے 25 دسمبر کو ان کی رہائش گاہ پر گئے تھے۔ ایک کیمرہ مین نے ہم تینوں کا فوٹو کھینچ لیا، جس میں وہ دونوں اپنی کرسی پر بیٹھے اور میں ان کے پیچھے کھڑا تھا۔ اگلے دن ہندی اخبار 'دینک جاگرن' نے نہ صرف وہ رنگین تصویر ہی شائع کی بلکہ ایک تقریباً ویسی سفید و سیاہ تصویر جو ہماری نوجوانی کے دنوں کی یاد دلاتی ہے، اس کے ساتھ ہی شائع کر دی۔ درحقیقت وہ دوسری تصویر 1952 میں کوٹہ، راجستھان میں لی گئی تھی، جہاں نو تشکیل شدہ جن سنگھ سے منسلک لوگ ایک میٹنگ کے لیے جمع ہوئے تھے۔ 'دینک جاگرن' کی دونوں تصاویر کا ایک ہی کیپشن تھا— 'نصف صدی سے زیادہ مدت سے ساتھ ساتھ کام کرتے ہوئے'— پارٹی کے اندر واجپئی اور دیگر معاونین کے ساتھ یہ لمبا سفر میری سیاسی زندگی کا ایک قابل فخر اور بیش قیمت خزانہ ہے۔

میری یہ دلی تمنا ہے کہ مختلف سطحوں پر موجود میری پارٹی کے لیڈران آج کے اور کل آنے والے دوستی کی اس تہذیب کو سمو لیں گے اور اتحاد کے جذبہ کو بنائے رکھیں گے۔

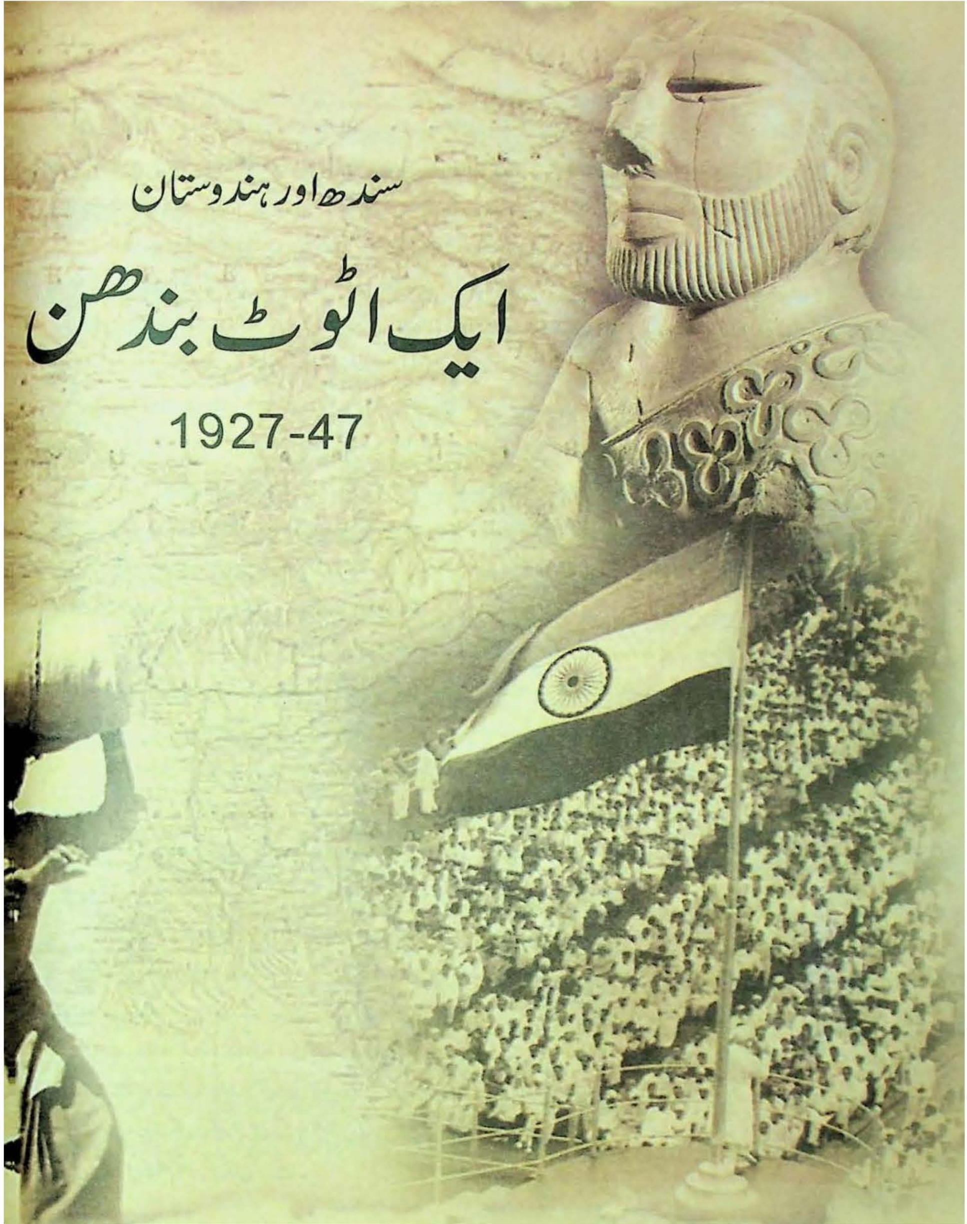
میں جب بھی پیچھے مڑ کر گزشتہ 6 دہائیوں کے ہندوستان کے سیاسی سفرنامہ پر نظر دوڑاتا ہوں تو 1947 کی نامکمل خواہشوں اور تعبیر نہ ہونے والے خوابوں کے ڈھیر کو دیکھ کر دل کی گہرائی سے اداس ہو جاتا ہوں۔ ہر سال میرے لئے سب سے زیادہ دردناک لمحہ وہ ہوتا ہے جب میں ٹرانسپرنسی انٹرنیشنل اور یونائٹیڈ نیشن کی دو سالانہ رپورٹ دیکھتا ہوں۔ ٹرانسپرنسی انٹرنیشنل کی سالانہ رپورٹ بدعنوانی کی فہرست کی بنیاد پر ممالک کو درجہ فراہم کرتی ہے جس میں دنیا کے سب سے بدعنوان ممالک میں ہندوستان کو اعلیٰ مقام حاصل ہوتا ہے اور انسانی ترقی کی فہرست پر یونائٹیڈ نیشن کی سالانہ رپورٹ ہندوستان کو ان ممالک کے ساتھ سطحی درجہ میں شمار کرتی ہے، جن کا اس معاملہ میں کمتر مظاہرہ ہوتا ہے۔ ہمارے معاشی نظام کی کچھ کامیابی نظر آنے کے باوجود انسانی ترقی کی فہرست میں ہمارا شمار دنیا کے 100 سے زیادہ ممالک سے نیچے ہے اور ترقی کے کچھ پیمانوں پر وہ ہمیں افریقہ کے سہارا خطہ کے ممالک کے درجہ میں رکھتے ہیں۔ ہم کروڑوں باشندگان ہند کو اب تک پینے کا صاف پانی میسر نہیں ہے۔ شہری اور دیہی دونوں علاقوں میں ہماری نصف سے زائد آبادی صاف ٹوائلٹ جیسی بنیادی سہولتوں سے محروم ہے۔ دیہی اور نواحی علاقوں میں بھوک ہمارے کئی باشندوں کو اب بھی شکار بنا لیتی ہے اور اس فقدان کے نتیجہ میں ہم نے اپنے غریب لوگوں کو جن میں سے بیشتر کے پاس قابل رہائش مکان بھی نہیں ہیں، ان بیماریوں کے حوالہ کر دیا ہے، جن سے بچا جا سکتا ہے، جو اکثر جان لیوا ثابت ہوتی ہیں۔ اس سے زیادہ شرم کی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ ہمارے قبائلی علاقوں میں کئی بچے قلتِ تغذیہ کے شکار ہوئے ہیں یا یہ کہ ہمارے ملک میں تقریباً 2 کروڑ لوگ جسمانی یا نفسیاتی طور پر معذور ہیں؟ اور اس سچائی سے زیادہ دل دہلا دینے والی بات کیا ہوگی کہ حالیہ برسوں میں پورے ملک میں کئی ہزار کسانوں نے خودکشی کر لی ہے؟ سماجی ناانصافی اور

خواتین پر جبر و تشدد میرے دل کو لرزہ براندام کر دیتے ہیں۔ ہمارے لاکھوں بچے، جنہیں محنت مزدوری کرنے کے لیے مجبور ہونا پڑتا ہے، جبکہ انھیں کھیلنا اور پڑھنا چاہیے، ان کا کھویا ہوا بچپن میرے دل کو اداس کر دیتا ہے۔ ہماری شہری جھگی جھونپڑیوں کی گندگی اور ہمارے کئی گاؤوں کی اجڑی ہوئی صورت مجھے شرمندہ کر دیتی ہے اور یہ یقیناً کسی بھی حساس انسان کی شرمندگی کے لیے کافی ہے کہ ہماری ترقی کے عمل میں کوئی شدید بھول ہوئی ہے۔

یہ سچ ہے کہ کچھ اچھے پیمانوں کے مطابق ہمارا معاشی نظام جن بلندیوں کو چھو رہا ہے وہ پہلے کبھی نہیں دیکھا گیا۔ آج کی اونچی عمومی گھریلو پیداوار (جی ڈی پی) شرح ترقی نے لائسنس پرمٹ-کوٹا راج جس نے ہماری صنعت کاری کا گلا گھونٹ دیا تھا، کے دور میں ہوئی دھیمی رفتار کی ترقی کو بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے، لیکن ترقی اس اعداد و شمار سے کچھ زیادہ ہونی چاہیے، جو ظاہر ہونے سے زیادہ روپوش ہوتی ہے۔ تکنیکی طور سے یہ سچ ہے کہ ترقی کی شرح 9 فیصد ہے، لیکن یہ ترقی جغرافیائی اور آبادی کے لحاظ سے اطمینان بخش نہیں ہے۔ پورے ہندوستان کی اقتصادی ترقی 9 فیصد کی شرح سے نہیں ہو رہی ہے۔ ہندوستان کا ایک چھوٹا سا حصہ 20 فیصد یا اس سے بھی زیادہ کی شرح سے بڑھ رہا ہے، لیکن ہندوستان کے بیشتر حصے میں اگر کوئی اضافہ ہو تو بھی وہ اضافہ کے سطحی عدد پر ہی لٹکا ہوا ہے۔ ترقی کا 'رساؤ اصول' اس دھرم سنکٹ کا ایک نامناسب جواب ہے اور جمہوریت میں مستقل نہیں چل سکتا، کیونکہ 'محروم' اقلیتی عوام جو ترقی کی بوندوں کے برسنے کا انتظار کر رہی ہے، واضح طور پر دیکھ رہی ہے کہ ترقی کے 'مفاد پرستوں' کے لیے اس کا جھرنا بہہ رہا ہے۔ یہ حالات پورے ہندوستان میں جدوجہد کے سنگین رجحان کو جنم دے رہے ہیں۔ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم اپنی اقتصادی پالیسی پر سخت نگاہ ڈالیں۔ ہمیں پوری ایمانداری سے خود سے پوچھنا چاہیے کہ اس (اقتصادی پالیسی) نے ہندوستان کے غریبوں کو وہ سب کیوں نہیں دیا جو اس نے امیروں کو دیا ہے؟

ہم دوسرے مورچوں پر بھی ناکام رہے ہیں۔ ہندوستانی قوم مخالف باہری طاقتوں کے ذریعہ کی جا رہی دہشت گردی جو سماجی امن اور داخلی سیکورٹی کے لیے ایک بڑا خطرہ ہے، کے تئیں اب بھی نرم رویہ اپنائے ہوئے ہیں۔ پارلیمنٹ اور عدلیہ سمیت ہمارے کئی جمہوری ادارے ہماری عوام کی امیدوں کے مطابق کام نہیں کر رہے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ہمارے یہاں مدتی انتخابات کے بعد اقتدار کی منتقلی ہمیشہ پرامن اور خوشگوار رہی ہے، لیکن دولت میں اضافہ اور طاقت کے استعمال سے الیکشن سسٹم کمزور ہو چکا ہے۔ کثیر جہتی حقیقت میں ہماری طاقت ہے، لیکن کبھی کبھی کثیر جہتی کے اس نکتہ پر یکطرفہ ڈھنگ سے زور دیا جاتا ہے کہ وہ قومی یکجہتی اور سماجی ڈھانچہ کو نقصان پہنچاتی ہے۔ میں نے ان چیزوں کا ذکر اس لیے کیا ہے، کیونکہ ایک بہتر ہندوستان کی تعمیر کی ہماری امید تبھی پوری ہو سکتی ہے جب ہم ان اُمور سے نمٹنے کی صلاحیت کو فروغ دیں گے۔ اس کتاب میں میں اس سمت میں نے مستقبل میں کیے جانے والے کاموں پر کچھ خیالات پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

قارئین کو شاید یہ واضح ہو گیا ہوگا کہ میری خود نوشت صرف ہندوستان کے ماضی کے بارے میں ہی نہیں ہے، وہ ہندوستان کے مستقبل کے بارے میں بھی ہے۔ اس کتاب کو لکھتے وقت ہندوستانی نوجوانوں، آج کے اور آئندہ نسل کے، سے گفتگو کرنے کی ضرورت کو ترجیح دی گئی ہے۔ جب میں آزادی کے 60 ویں سال سے آگے کی جانب دیکھتا ہوں تو ہندوستان کے مستقبل کے تئیں پرامید ہونے کی سب سے بڑی وجہ ہماری نوجوان نسل ہی ہے۔ 103 کروڑ کی ہماری آبادی میں سے 60 فیصد سے زیادہ لوگ 25 برس سے کم عمر کے ہیں۔ یہ ان کی صرف عددی قوت ہی نہیں بلکہ ان کے بڑھتے ہوئے ارمان اور بڑھتی ہوئی قابلیت نے مجھے یقین دلایا ہے کہ اکیسویں صدی کی آنے والی دہائیوں میں ہندوستان کی چمک اور زیادہ تابناک ہوگی، کیونکہ یہی وہ تعمیر کریں گے جو ہم نہیں کر پائے۔ یہی ان کاموں کو مکمل کریں گے جنہیں ہم پورا نہیں کر پائے اور یہ کامرانیوں کا نیا باب جوڑیں گے جس کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔


سندھ اور ہندوستان
ایک اٹوٹ بندھن
1927-47

"تقسیم سندھی ہندوؤں کے لیے دوہری آفت تھی۔ 14/15 اگست 1947 کو تقسیم ہوئے پنجاب اور بنگال سے سندھ کے حالات مختلف تھے۔ نتیجتاً ہماری اپنی کوئی زمین نہیں تھی یا یوں کہیں کہ مکمل تقسیم شدہ ہندوستان ہی ہماری زمین بن گئی۔ جب میں پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو مجھے تعجب ہوتا ہے کہ سندھی ہندو سماج اب بھی زندہ ہے اور وہ بھی بہت اچھے حالت میں، جیسے راکھ سے ققنس دوبارہ زندہ ہوتا ہے۔ اس برادری نے ساری تکلیفیں سہہ کر بھی اپنے عزم سے 'صفر سے اونچائی' کے آسمان کو چھوا ہے اور مختلف میدانوں میں اعلیٰ کامرانیاں حاصل کیں۔"



پہلا باب

1

آزادی کا جشن، تقسیم کا المیہ

''ہندوستان ایک غیرمنقسم جغرافیائی اکائی ہے۔ اس کا اتحاد اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ قدرت۔ اس جغرافیائی اکائی کے اندر تہذیبی یکجہتی اس کی پائیداری کو جذب کیے ہوئے ازل سے موجود ہے۔ اس تہذیبی یکجہتی نے سیاسی اور نسلی بھیدبھاؤ کو چنوتی دی ہے۔ پاکستان کے سلسلہ میں کسی بھی بحث میں اس سچائی کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا کہ اسے اگر مؤثر نقطہ نہ بھی کہیں تو نقطہ آغاز ہندوستان کی بنیادی یکجہتی ہی رہتا ہے۔''

— ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر، پاکستان آر دی پارٹیشن آف انڈیا

'ہم یہ مٹھائیاں نہیں کھائیں گے۔'' کراچی کے اسکول میں اس بدقسمت دن ہندو بچوں نے کہا۔ جب بچے گروپ بندی میں مٹھائیوں کو قبول کرنے سے انکار کریں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کچھ زیادہ ہی غلط ہوا ہے۔ کہا بھی جاتا ہے کہ بچپن منطق کا ابتدائی حصہ اور معصومیت کا جشن ہوتا ہے۔ ان بچوں کے لیے معصومیت کی عمر اس دن یکا یک ختم ہوگئی تھی۔

نفرت، خوف، تشویش، غصہ اور سب سے اوپر عدم اعتماد کی لکیریں ان کے چہروں پر زیادہ تھیں، لیکن میں زیادہ متحیر نہیں ہوا، جب میں موٹر سائیکل سے ایک ہندو کالونی سے دوسری میں اسی دن آمد و رفت کر رہا تھا۔ یہی دردناک جذبات ان کے ٹیچروں اور والدین کے دل میں بھی اس سوال کے ساتھ جذب ہوکر ابھرے کہ 'اب آگے کیا کریں؟' ہمسایہ پنجاب خطہ میں خوفناک قتل عام کی خبریں اور اس کے نتیجہ میں ہندو اور

مسلمانوں کی اجتماعی نقل مکانی کا چرچہ عام موضوع تھا۔ آنے والے مہینوں میں کراچی کے یہ تمام بچے اپنے والدین، ٹیچروں اور دوستوں کے ساتھ اپنے اسکول، گھر اور کھیل کے میدانوں کو ہمیشہ کے لیے الوداع کہہ دیں گے۔ خوف زدہ ہندو کنبہ گروپ بند ہو کر اس نئی کھینچی گئی سرحد لائن کے اس پار نئے شہروں کی جانب بھاگ رہا تھا۔ راہ میں ہزاروں مارے گئے اور لاتعداد اپنوں اور رشتہ داروں سے بچھڑ گئے۔ کچھ ہی وقت میں کراچی اور سندھ خطہ کے دیگر علاقوں میں پوری ہندو آبادی کا صفایا ہو جانا تھا۔

قابل احترام سندھی روحانی لیڈر سادھوٹی ایل واسوانی نے اسی دوران جذباتی ہو کر کہا کہ 'ایسی طوفانی تباہی میں کوئی نہیں جانتا تھا کہ تھکے ہوئے جسم کو آرام اور سادہ خوراک کے لیے کہاں پر جگہ ملے گی۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ اپنے دوستوں اور پیاروں سے پھر کبھی ملاقات کر پائیں گے یا نہیں۔ انسانیت کو درکنار کر کے منتقلی کے ان بھیانک حالات میں میری دو بہنیں اور میں دردناک طور پر اپنے والدین سے علیحدہ ہو گئے، جو سندھ میں ہی رہ گئے، جبکہ ہم تحفظ کی تلاش میں ہندوستان آنے پر مجبور ہوئے۔ ہماری نوجوانی پر یہ سب سے بھیانک آفت آن پڑی تھی جس سے ہمارے دل و دماغ سن رہ گئے۔'

اس المناک دن جو لوگ سندھ سے ہجرت کر گئے وہ بھی ہندوستانی تھے اور ان شرنارتھی بستیوں میں بھی مایہ ناز ہندوستانی بنے رہے جو بمبئی (اب ممبئی) کلیان، دہلی، اندور، جے پور، کلکتہ (اب کولکاتہ) اور کانڈلا کی شرنارتھی کالونیوں میں ان کا نیا آشیانہ بن گیا، لیکن ان کے خود کی جنم بھومی ایک ہی رات میں غیر ملکی قوم اور ان کا پیارا کراچی اس پرائی قوم کی راجدھانی بن گئی۔

یہ تھا 14 راگست 1947 کا دن۔

یہ وہ دن تھا جب متحدہ ہندوستان کو تقسیم کر کے پاکستان نامی علیحدہ مسلم ملک بنایا گیا تھا۔ کچھ برسوں سے میں ایک ناخوشگوار فقرہ سن رہا تھا 'دو قومی نظریہ'۔ میرے نوجوان ذہن نے اسے آسانی سے مسترد کر دیا۔ 'ہندو اور مسلمان دو مختلف قوموں کے کیسے ہو سکتے ہیں؟ کیا صرف اس لیے کہ وہ دو مختلف عقیدوں کے ہیں؟ میرے لیے اس کا کوئی مطلب نہیں تھا، خاص طور پر جب میں نے سندھ کے سماجی ڈھانچہ اور تہذیبی تانے بانے کو دیکھا، جس میں ہندو کو مسلم سے، مسلم کو ہندو سے الگ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اسی طرح سے سندھ کو بھی ہندوستان سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ نہیں، پاکستان نہیں بن سکتا۔' یہ میرا یقین محکم تھا اور اسی طرح سندھ کے بیشتر ہندوؤں کا بھی یہی خیال تھا۔ ہم ہزاروں برسوں سے ہندوستان کا حصہ رہے ہیں اور ہمیشہ ایسے ہی بنے رہیں گے۔ ہندوستان کو کبھی بھی مذہب کی بنیاد پر تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔

پھر بھی یہ ہوا۔

تقسیم جو کہ کچھ برسوں قبل تک ایک تصور کے سوا کچھ بھی نہیں تھی، اب ایک سچائی بن چکی تھی۔ مجھے یاد ہے، کراچی کے بیشتر حصے میں کوئی خوشی نہیں تھی، حالانکہ کچھ علاقوں میں آتش بازی ہوئی اور رات بھر جشن کا ماحول تھا۔ اگلے دن ہندوستان آزاد ہوا، پھر بھی شہر کے ہمارے حصہ میں کوئی جوش نہیں تھا، اس کے برخلاف ناامیدی کی لکیر کھینچی ہوئی تھی۔ ہندوستان اور پاکستان دونوں میں ہی برٹش پرچم 'یونین جیک' ہمیشہ کے لیے اتار دیا گیا، لیکن اس کی جگہ پر دو علیحدہ پرچم لہرائے گئے۔ ہندوستان میں ترنگا اور کراچی میں چاند اور ستارے والا ہرا جھنڈا۔ مجھے یاد ہے اس کے بعد کے دنوں میں، میں سوچتا تھا 'کتنی خراب قسمت ہے میری! میں نے 15 راگست کو ہندوستان کی آزادی کا جشن بھی نہیں منایا۔' حالانکہ گزشتہ 5 برسوں سے میں راشٹریہ سویم سیوک سنگھ کا سویم سیوک تھا، میں دن رات صرف اس مبارک دن کا ہی خواب دیکھتا تھا، وہ دردناک اور تلخ خیالات آنے والے کئی برسوں تک مجھے بے چین کرتے رہے۔

سندھ کانگریس سے دل برداشتہ کیوں ہوا؟

متحدہ ہندوستان کے لیے آزادی حاصل کرنا سنگھ کا مقصد تھا، جو 1942 میں سویم سیوک بننے کے بعد میرا بھی نجی مقصد بن گیا۔ جب میں سنگھ کے قومی نظریہ کی طرف متوجہ اور آدرش واد کے بنیادی اصولوں سے متاثر ہوا۔ میری زندگی کو بدلنے والے واقعات سندھ کے دوسرے سب سے بڑے شہر حیدرآباد میں وقوع پذیر ہوئے۔ دو برسوں کی کالج کی تعلیم پانے کے بعد میں کراچی لوٹ آیا اور سنگھ کا تشہیر کار بن گیا۔ سندھ کے 10 اضلاع میں کام کر رہے 75 مستقل تشہیر کاروں میں سے ایک۔ درحقیقت ہمارے خطہ میں پورے ہندوستان میں کسی بھی ضلع کے مقابلہ سب سے زیادہ تشہیر کار تھے۔ سنگھ نے اپنی سرگرمیاں سندھ میں 1939 میں شروع کی تھیں، حالانکہ تھوڑے ہی وقفہ میں وہ خطہ کے سارے شہری مراکز میں سب سے ہردلعزیز اور طاقتور تنظیم بن گئی تھی۔ ان دنوں سندھ کے تقریباً ہر شہر میں، کراچی اور حیدرآباد سمیت ہندو آبادی میں زیادہ تھے۔ وہ زیادہ دولت مند اور تعلیم یافتہ تھے اور قانون، میڈیکل اور ایڈمنسٹریٹو سروس میں زیادہ سرگرم تھے۔

سنگھ میں میری ذمہ داری میں اضافہ کر دیا گیا اور جنوری 1947 میں مجھے انچارج بنا دیا گیا۔ میری ذمہ داریوں میں سے ایک، شاکھاؤں کی دیکھ بھال کرنا تھا، جس نے ہزاروں نوجوانوں کو مرغوب کر لیا تھا اور پراثر ہندوؤں سے رابطہ بنانا تھا، حالانکہ میرا کنبہ کراچی میں رہتا تھا۔ میں اپنے ساتھی کارکنان کے ساتھ سنگھ ہیڈکوارٹر میں چلا گیا تھا۔ میرے پاس ایک موٹر سائیکل تھی، جس سے میں تنظیمی کاموں کے لیے شہر بھر میں گھومتا تھا۔ یہ سنگھ کے ذریعہ اپنے تشہیر کاروں کو دی گئی 10 گاڑیوں میں سے ایک تھی۔

زیادہ تر لوگوں کو یہ جان کر تعجب ہوگا کہ اس وقت سندھ میں سنگھ اور کانگریس کے درمیان کوئی مخالفت نہیں تھی۔ ہندوؤں کو یہ یقین تھا کہ دونوں تنظیمیں برٹش حکمراں سے ہندوستان کی آزادی کے لیے کمربستہ تھیں، حالانکہ میرے جیسے نوجوان سویم سیوک کو ہمارے سینئروں کے ذریعہ بتایا گیا تھا کہ کانگریس کی پرامن جدوجہد کی پالیسی نہ تو طاقتور برٹشوں کو ہندوستان چھوڑنے پر مجبور کر پائے گی اور نہ ہی اس کی اتحاد و سالمیت کو یقینی کر سکے گی۔ مجھے ان پر یقین تھا، پھر بھی لائحۂ عمل میں تنازعات کے سبب کانگریس کو مخالفین میں نہیں مانا، دشمن تو کبھی سمجھا ہی نہیں۔ سندھ کی پوری ہندو آبادی کانگریس کی پرزور حمایتی تھی۔ ساتھ ہی میں ایسے کانگریسی کنبوں سے شناسا تھا جنھوں نے اپنے نوجوان بیٹوں کو سنگھ کا سویم سیوک بننے کے لیے زور دیا۔ سب سے بڑی مثال آنجہانی کے آر ملکانی * ہیں، جو کہ 6 دہائیوں سے زیادہ مدت تک میرے قریبی دوست اور معاون رہے۔ ان کے بڑے بھائی پروفیسر این آر ملکانی معزز کانگریسی لیڈر تھے، جنھوں نے انھیں صلاح دی 'سنگھ میں شامل ہو جاؤ، یہ ایک اچھی تنظیم ہے جو جوانوں میں حب الوطنی اور ڈسپلن پیدا کرتی ہے۔'

میرے سنگھ کا سویم سیوک بننے کے کچھ ہی ماہ کے اندر مہاتما گاندھی نے 'بھارت چھوڑو' کی ملک گیر اپیل کی اور مجھے یاد ہے کہ کتنے جوش سے سندھ میں ہندوؤں اور قوم پرست مسلمانوں نے اس کا استقبال کیا تھا۔ ہیمو کلانی 19 سالہ ایک قوم پرست لڑکا، جسے انگریزوں نے 1943 میں پھانسی پر لٹکا دیا تھا، کی شہادت سے وہ ناراض اور متاثر ہوئے تھے۔ سندھ میں ہزاروں دیگر نوجوانوں کی طرح وہ گاندھی جی کے 'کرو یا مرو' کی اپیل پر تحریک آزادی میں کود پڑا تھا۔ پھانسی کے پھندے پر جاتے ہوئے اس نے اپنی ماں کو سسکتے ہوئے دیکھا۔ اس نے اپنی ماں سے کہا 'ماں!

★ کیول رتن مل ملکانی (2003-1921) کراچی میں سنگھ کے میرے ساتھی سویم سیوک تھے۔ تقسیم کے بعد وہ دہلی چلے آئے۔ انھوں نے کئی برسوں تک 'آرگنائزر' کے معزز ایڈیٹر کے طور پر کام کیا جہاں پر میں ان کا سب ایڈیٹر تھا۔ کئی کتابوں کے مصنف ملکانی جی بی جے پی کے نائب صدر بھی تھے اور قومی جمہوری اتحاد کے دور اقتدار میں پانڈیچری (اب پدوچیری) کے لیفٹیننٹ گورنر تھے۔

کیا تم نے مجھے بھگوت گیتا سے یہ نہیں سکھایا کہ آتما امر ہے؟ میں تمہیں وچن دیتا ہوں کہ اگر میں نے دوبارہ جنم لیا تو آئندہ کی زندگی بھی بھارت ماتا کی آزادی کے لیے نچھاور کردوں گا۔'

میرے ماموں شری رام چند ایک سرگرم کانگریسی تھے اور 1942 کی تحریک میں جیل گئے تھے۔ ان کے بیٹے موتی نے جن کا انتقال 2007 میں ہوا، تارا سے شادی کی تھی جو ایک مشہور سندھی ادیبہ تھیں۔ تارا نے حال ہی میں رام چند کی سلسلہ وار سوانح حیات تحریر کی، جس میں تحریک آزادی ہند میں ان کے کردار کی عکاسی کا خوبصورت ذکر موجود ہے۔

سندھ کے ہندوؤں اور کانگریس کے درمیان تعلقات میں کشیدگی تب پیدا ہوئی جب آسمان میں تقسیم کے سیاہ بادل منڈلانے لگے۔ ماضی میں کانگریسی لیڈروں نے یہ عزم کیا تھا کہ وہ کسی بھی حالت میں ہندوستان کی تقسیم نہیں ہونے دیں گے۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، انھوں نے یہ دلاسہ دیا کہ سندھ پاکستان کا حصہ نہیں بنے گا، اس کے بعد بھی یہ دلاسہ دیا کہ ہندو تقسیم کے بعد بھی محفوظ رہیں گے۔ اس امید کو مہاتما گاندھی کی اس اپیل سے تقویت ملی کہ مغربی پنجاب، سندھ، بلوچستان اور شمال مغربی سرحدی خطہ کے ہندو اور سکھ ہندوستان آنے کے لیے اپنا گھر نہ چھوڑیں اور اسی طرح سے مشرقی پنجاب، اتر پردیش اور بہار کے مسلمان پاکستان کی جانب ہجرت نہ کریں۔ آہ! تقسیم سے پیدا ہوئی نفرت اور تشدد سے آلودہ آندھی کو مہاتما گاندھی کا یقین بھی قابو نہیں کر سکا۔ جیسے جیسے انگریزوں کے ہندوستان چھوڑنے کی تاریخ نزدیک آرہی تھی ویسے ویسے مایوس ہندو یہ محسوس کرنے لگے کہ کانگریس نے انھیں دھوکہ دیا ہے۔ ان کی امیدیں صرف ایک تنظیم پر مرکوز تھیں — سنگھ پر۔ سنگھ کی تنظیمی طاقت نے ہندوؤں کو پھر سے پر امید کیا کہ پاکستان کی تشکیل کے باوجود وہ اپنے خطہ میں محفوظ رہ پائیں گے۔

بدقسمتی سے 1947 میں سنگھ قومی سطح پر اتنا طاقت ور نہیں تھا کہ تقسیم کے آفت کو روک سکے۔

کراچی میں ایک ہفتہ میں تین لیڈروں کی آمد

اگست 1947 کا پہلا ہفتہ کراچی میں تین اہم لیڈروں کی آمد کا شاہد بنا۔ پہلے آچاریہ جے بی کرپلانی (1982-1888) تھے، جو اس وقت کل ہند کانگریس کمیٹی کے صدر تھے۔ وہ سندھ کے مشہور و معروف آزادی کے سپاہی تھے اور گاندھی جی کے مریدوں میں سے ایک تھے۔ پہلے سندھ میں آنے والے ہر ایک کانگریسی لیڈر کا زبردست استقبال ہوتا تھا، لہٰذا ایک کانگریس صدر، وہ بھی سندھی، جو کہ اپنے آبائی خطہ میں تشریف لائے تھے اور اسی ماہ میں جب ہندوستان کو آزادی حاصل ہوئی تھی، کا شاندار استقبال ہونا چاہیے تھا، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ آچاریہ کرپلانی ہوائی اڈہ پر اپنے استقبال کے لیے آئے چند لوگوں کو دیکھ کر چونک گئے۔ مشتعل اور فریب خوردہ ہندوؤں کا کراچی میں کانگریس سے دل آزردہ ہو گیا تھا۔ کرپلانی نے آمل انسٹی ٹیوٹ کے ٹینس کورٹ میں منعقد اجلاس میں محض چار پانچ سو لوگوں سے خطاب کیا۔

اگلے دن شاید 2 یا 3 اگست کو مجھے ٹھیک سے یاد نہیں، سنگھ کے سربراہ شری مادھو سدا شیو گولوالکر ★ جنہیں احتراماً 'شری گروجی' کہا جاتا تھا، سندھ آئے۔ 1943 تک ہر سال ان کے سندھ دورہ نے ہندوؤں کے اتحاد کو قوت بخشنے میں کافی اہم کردار ادا کیا۔ ہر سال وہ خطہ میں مکمل

★ شری مادھو سدا شیو گولوالکر (1973-1906) راشٹریہ سیویم سیوک سنگھ کے بانی ڈاکٹر کیشو بلی رام ہیڈگیوار (1940-1887) کے انتقال کے بعد دوسرے سر سنگھ چالک بنے۔ ڈاکٹر ہیڈگیوار نے ہندوؤں کی ایک قومی تنظیم کے طور پر سنگھ کی تشکیل کی جو کہ ہندوستان کی آزادی، اس کے بعد ہندو احیا کے تئیں پرعزم تھی۔ شری گروجی بنیادی طور پر ایک تپسوی تھے، جو رام کرشن پرم ہنس اور سوامی وویکانند کی فلاسفی سے متاثر تھے۔ انھوں نے سنگھ کے توسط سے قوم کی خدمت کر کے روحانی بلندی حاصل کرنے کا راستہ منتخب کیا۔ خوش قسمتی سے مجھے تقسیم سے قبل اور بعد میں ان کی قربت کے لمحے نصیب ہوئے۔

دورہ کرتے تھے اور کراچی، حیدرآباد، سکھر، شکارپور اور میرپور خاص وغیرہ مقامات پر جاتے تھے۔ ان دوروں میں وہ مذہبی لیڈروں جیسے سادھوٹی ایل واسوانی اور سوامی رنگناتھ آنند، ڈاکٹر چوئتھ رام گڈوانی، پروفیسر این آر ملکانی اور دیگر کانگریسی لیڈروں سے، اہم تاجروں شورتن مہتا، لال جی مہروترا، بھائی پرتاپ اور دیگران سے، حکومت سندھ میں وزیر سرو شری نیچل داس وجیرانی، ڈاکٹر ہیمن داس وادھوانی اور مکھی گووندرام سے، ساتھ ہی مختلف دانشوروں، قانون دانوں اور دیگر صنعت کاروں سے ملاقات کرتے تھے۔ مختلف علاقوں کے مخصوص لوگوں سے ملاقات اس سچائی کا ثبوت تھا کہ سنگھ سندھ میں ہندو فرقہ کے دل و دماغ پر اپنی چھاپ چھوڑنے میں کامیاب رہا۔

سنگھ کے سبب ہی ایمل اور بھائی بند ہندو فرقہ، حیدرآبادی اور غیر حیدرآبادی شہری، دیہی سناتنی اور وہ جو آریہ سماج اور برہما سماج کے مریدین تھے، کے درمیان آئی دوری اور کھائی کو پاٹنے میں کامیاب رہا۔ خصوصی طور پر کانگریس اور ہندو مہاسبھا پریواروں کے لڑکوں کو سنگھ کی شاکھاؤں میں ایک ساتھ کھیلنے اور بھگوا جھنڈے کو 'پرچم سلامی' کرتے دیکھا جا سکتا تھا۔

لیکن شری گروجی کا 1947 کا دورہ گزشتہ برسوں کے مقابلہ بہت ہی غیر معمولی حالات اور وقت میں ہو رہا تھا۔ ملک کی تقسیم اور سندھ کا ہندوستان سے الگ ہونا طے تھا۔ سندھ کے ہندو خود کو طوفانی سمندر میں ایک کشتی میں پھنسا ہوا محسوس کر رہے تھے، جن کے بچنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں شری گروجی کو لینے ریلوے اسٹیشن گیا تھا۔ میں نے انھیں بتایا کہ آچاریہ کرپلانی جی بھی کل ہی کراچی تشریف لائے ہیں۔ انھوں نے ایک لمحہ کے لیے مجھے دیکھا، ان کے چہرے پر غصہ کی ایک ہلکی جھلک تھی۔ تلخ لہجہ میں انھوں نے کہا 'اب 'سندھ گنوا کر سندھ آئے ہیں؟'

تقسیم سے محض 10 دن قبل 5 راگست کو شری گروجی نے کراچی کی تاریخ میں ہندوؤں کے آخری اور عظیم الشان اجلاس کو خطاب کیا۔ اجلاس سے قبل شہر کی گلیوں سے ہو کر جاتے ہوئے سیوکوں کے انتظامی امور کی ذمہ داری مجھ پر تھی۔ سندھ میں سنگھ کی تاریخ کی یہ سب سے بڑی ریلی ثابت ہوئی۔ حیرت انگیز منظر تھا، 10 ہزار سویم سیوک قدم تال ملاتے ہوئے ایک ہی لباس خاکی نیکر، سفید قمیص اور کالی ٹوپی میں نیم فوجی بینڈ کی دھن پر حب الوطنی کے گیت گاتے ہوئے، پاکستان کی نئی تشکیل ہونے والی حکومت کو ایک چیلنج دیتے ہوئے اور ہندوؤں میں یقین محکم پیدا کرتے ہوئے، آخرکار جب سویم سیوک جائے اجلاس پہنچے تو وہاں ایک لاکھ لوگوں کا عظیم انسانی سیلاب ان کے استقبال کے لیے موجزن تھا۔ اجلاس کے صدر سادھوٹی ایل واسوانی نے کہا 'انتہائی تکلیف اور امتحان کی گھڑی میں سندھی ہندو سماج کے ساتھ کھڑے ہو کر سنگھ نے جو ثواب کا کام کیا ہے اس کے لیے وہ سدا سنگھ کا احسان مند رہے گا اور تاریخ اس کی گواہ رہے گی۔'

اپنی افتتاحی تقریر میں شری گروجی نے کہا کہ ہمارے مادر وطن پر ایک آفت آگئی ہے۔ ہندوستان کی تقسیم ایک گناہ ہے اور جو اس کے لیے ذمہ دار ہیں انھیں آنے والی نسلیں کبھی معاف نہیں کریں گی۔ یہ غیر فطری ہے اور اسے مسترد کرنا ہوگا، جو کچھ ہوا ہے وہ انگریزوں کی 'پھوٹ ڈالو اور راج کرو' کی حکمت عملی کا نتیجہ ہے۔ مسلم لیگ نے زور زبردستی اور تشدد سے پاکستان کو حاصل کیا ہے، جس کے آگے کانگریس قیادت نے گھٹنے ٹیک دیئے۔ مسلم اس نظریہ کے ذریعہ وہم میں مبتلا ہوئے ہیں کہ وہ ایک علیحدہ قوم ہیں، کیونکہ وہ اسلام مذہب کے پیروکار ہیں۔ انھیں یہ جاننا چاہیے کہ وہ اسی نسل کے ہندو ہیں جس نسل کے ہندو ان کے آباء واجداد تھے۔ ان کی تہذیب و تمدن ہندوستانی ہے نہ کہ عربی۔ بدقسمتی سے انھیں یہ ماننے کے لیے مجبور کیا گیا کہ اسلام کے آنے سے قبل جو کچھ تھا وہ ان کا نہیں ہے۔ یہ غیر تصوراتی عمل ہے کہ سندھ، جس سے ہو کر پاک سندھو ندی بہتی ہے، ہندوستان سے الگ ہو گئی ہے، حالانکہ ہر ایک اندوہناک تجربہ انسانی فکر کی کسوٹی ہے۔ ہندوؤں کو اپنی حفاظت خود کرنی ہوگی، کیونکہ اپنے دفاع کے لیے طاقت کی ضرورت ہوتی ہے اور طاقت اتحاد سے آتی ہے۔ ہمارے سویم سیوک سندھ میں ہندوؤں کی حفاظت

کے لئے ہر ممکن قدم اٹھائیں گے۔ وہ اپنی خوشی اور تحفظ کے بارے میں نہ سوچتے ہوئے اپنا سب کچھ قربان کرنے میں سب سے آگے ہوں گے۔ ہم سب سے بڑی طاقت پرماتما سے دعا کریں کہ وہ ہمیں اس بدقسمتی سے پار لگانے کی قوت فراہم کریں۔'
خطرناک حد تک غیر یقینی، خوف اور تناؤ کے حالات میں شری گرو جی کے ان الفاظ نے سندھ میں رہائش پذیر ہندوؤں کے دل میں ضروری خود اعتمادی پیدا کردی۔

کراچی آنے والے تیسرے لیڈروں میں مسلم لیگ کے سربراہ اور پاکستان کی تشکیل کے معمار محمد علی جناح تھے۔ وہ اپنے حامیوں کے زوردار استقبال کے درمیان 7 اگست کو دہلی سے کراچی پہنچے، حالانکہ ہندو علاقوں میں نفرت نے ان کا استقبال کیا لیکن باقی شہر 'پاکستان زندہ باد' کے نعروں سے گونج اٹھا۔ سبھی گلیاں ہرے جھنڈوں اور پوسٹروں سے سجی تھیں۔ اخبارات جناح کی تصاویر سے بھرے پڑے تھے۔ لمبا کوٹ اور کشتی کی شکل کی جھبے دار لال ترکی ٹوپی پہنے ایک پتلا، لمبا شخص، یہ تصویر عجیب و غریب تھی، کیونکہ ابھی حال تک جب وہ دہلی میں کانگریس لیڈروں اور برطانوی افسروں سے تقسیم کے تعلق سے بات چیت میں مصروف تھے، تب میں نے جو تصویر دیکھی تھی اس میں وہ پوری طرح سے انگریزی لباس میں ملبوس تھے۔

مجھے یہ کہنا ہوگا کہ جناح میرے لیے اور سندھ کے بیشتر ہندوؤں کے لیے ایک پہیلی تھے۔ 44-1943 تک میں نے ان کے بارے میں نہیں سنا تھا۔ سنگھ میں مجھے اپنے سینئر کارکنان سے یہ پتہ چلا کہ اپنے سیاسی دور کے ابتدائی مرحلہ میں وہ کٹر قوم پرست ہندوستانی تھے، لیکن بعد میں بہت ہی چالاکی سے ہندوستانی مسلمانوں کے ایک طبقہ کے علیحدگی پسند جذبات کو مشتعل کر دو قومی نظریہ کی بنیاد پر ہندوستان کی تقسیم کروادی۔ ان کی پیدائش کراچی میں 25 دسمبر 1876 کو ہوئی تھی، لیکن وہ سندھی نہیں تھے۔ ان کی ماں میٹھی بائی اور والد جناح بھائی پونجا کاٹھیاواڑ گجرات کے خوجہ مسلم تھے، وہی علاقہ جہاں مہاتما گاندھی کی پیدائش ہوئی تھی۔ وہ جناح کی پیدائش سے کچھ سال قبل ہی بہتر تجارت کی تلاش میں کراچی چلے گئے تھے۔ کراچی کے ساتھ جناح کا تعلق محض نام کا تھا، کیونکہ انھوں نے اپنی پوری تعلیم، ملازمت اور سیاسی زندگی ممبئی اور لندن میں مکمل کی۔ وہ سندھ میں نہ تو مقبول ہستی تھے اور نہ ہی زیادہ معروف۔ سندھ میں بیشتر لوگوں کو ان کے بارے میں تب پتہ چلا جب مسلم لیگ نے ان کی قیادت میں 1940 میں لاہور میں پاکستان کی تجویز* پیش کی، جس میں ہندوستانی مسلمانوں کے لیے علیحدہ ملک کا مطالبہ کیا گیا تھا، لہٰذا اگست 1947 میں کراچی آئے جناح ایک ہیرو تھے، جس نے اس تجویز کو تقریباً اپنی کوششوں سے حقیقت کی شکل دے دی تھی۔ اب 'قائداعظم' کے طور پر مشہور جناح ایک ہفتہ میں پاکستان کے پہلے گورنر جنرل بننے والے تھے۔

تقسیم — سندھ کے ہندوؤں کے لیے دوہری آفت

پاکستان کی تشکیل تک سندھ عموماً پرامن تھا، حالانکہ 1947 کے بعد پنجاب میں زبردست فرقہ وارانہ فسادات شروع ہوگئے تھے۔ اسی طرح کا تشدد اتر پردیش، بہار، راجستھان اور مشرق کے دیگر علاقوں میں بھی ہوا۔ خوفناک قتل عام کی خبر، ہندوؤں کی پنجاب سے مشرق کے لیے اجتماعی ہجرت اور ہندوستانی سرحد پر آرہی لاشوں سے بھری ریل گاڑیوں نے سندھ میں بھی خوف اور دہشت کا ماحول پیدا کردیا تھا۔ صاحب

---

* 24-22 مارچ 1940 کو لاہور میں پاکستان کی تجویز پیش ہونے کی یاد میں اس جگہ پر، جہاں تجویز پیش کی گئی تھی، اب مینار کی طرح کی عمارت 'مینار پاکستان' بنائی گئی ہے۔

ثروت کنبوں نے تقسیم کی مقررہ تاریخ سے کچھ ماہ قبل ہی سندھ چھوڑنا شروع کر دیا تھا۔ جولائی اور اگست سندھ میں سب سے زیادہ کشیدگی کے مہینے تھے۔ستمبر میں اس دیسی نقل مکانی میں یکا یک تیزی آ گئی۔ اس وقت تک اتر پردیش، بہار اور ہندوستان کے دیگر حصوں سے کراچی آنے والے مسلم مہاجروں کی تعداد میں کافی اضافہ ہو گیا تھا۔

سنگھ کے ہم سبھی کارکنان سندھ کے لوگوں کو اپنی 'جنم بھومی' نہ چھوڑنے کے لیے سمجھا بجھا رہے تھے۔ ہماری کوششوں کے کچھ نتائج سامنے آئے پھر بھی نوتشکیل شدہ پاکستان کے دیگر حصوں میں قتل عام کے واقعات ہندوؤں کو صاف اشارہ دے رہے تھے کہ بغیر کسی تاخیر کے سندھ چھوڑو۔ستمبر کے ابتدا میں ایک دن میں موٹر سائیکل سے کراچی ریلوے اسٹیشن کی سڑک پر جا رہا تھا، میں نے ایک شخص کی لاش دیکھی جس کو چھرا گھونپ کر قتل کر دیا گیا تھا۔ کچھ دوری پر میں نے ایک اور لاش دیکھی، پھر ایک تیسری... یہ منظر میرے لیے غیر فطری اور پریشان کن تھا، کیونکہ میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ سڑکوں پر لاشیں پڑی دیکھی تھیں۔

بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ دسمبر 1947 کے بعد جب میں نے بھی کراچی چھوڑ دیا تب حیدرآباد میں ہندوؤں کو زبردست فرقہ وارانہ تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔اس نے کراچی میں کھلبلی مچادی۔ ہندوؤں کے تجارتی ادارے رات میں نشان زد کیے جاتے تھے اور صبح افسروں کی ملی بھگت سے انھیں لوٹ کر ان پر زبردستی قبضہ کر لیا جاتا تھا۔سندھ کی تاریخ میں 6 رجنوری 1948 یوم سیاہ کے طور پر درج ہوگا، کیونکہ اس دن کراچی میں مذہبی تطہیر کے لیے خوفناک تشدد برپا کیا گیا۔سب سے اندوہناک واقعہ آریہ پتھ سندھی سبھا میں وقوع پذیر ہوا جہاں مندر اور ایک اسکول تھا۔ باہر سے کراچی آنے والے سندھی وہاں پر رات بھر ٹھہرتے تھے تاکہ اگلے دن بمبئی جانے والے جہاز پر چڑھ سکیں۔ایک رات وہاں حملہ کر کے تقریباً 300 ہندوؤں اور سکھوں کو ہلاک کر دیا گیا۔ان فسادات میں سندھ میں مارے جانے والے ہندوؤں کا ریکارڈ نہیں تھا، لیکن عام طور پر مانا جاتا ہے کہ یہ تعداد ہزاروں میں تھی۔

بعد ازاں ہندوؤں کو پورا یقین ہو گیا کہ سندھ میں ٹھہرنا اب ان کے لیے خطرہ سے خالی نہیں ہے۔ مشکل سے تین مہینے میں سندھ کے ہندوؤں کی 90 فیصد آبادی یعنی تقریباً 12.5 لاکھ لوگوں نے ہمیشہ کے لیے اپنی پیاری زمین کو چھوڑ دیا۔اچانک تاریخ کے سفاک ہاتھوں نے سندھ میں ان کی محفوظ پناہ گاہوں کو چھین لیا تھا جو ہزاروں برس سے ان کا گھر تھا، جو ہندوستانی تہذیب کا گہوارہ تھا، جہاں ہندو مسلم بھائی بھائی کی طرح رہتے تھے اور ایک مشترکہ تہذیب و تمدن کا فروغ ہوا، جہاں بے رحم مسلم حملہ آوروں کی ہندو و مسلم صوفیوں اور دونوں مذاہب کے پیروکاروں کے ذریعہ مشترکہ طور پر مخالفت کی گئی تھی۔ اچانک ہماری آبائی زمین ہمارے لیے ایک اجنبی بن گئی۔

بیشتر شرنارتھی بمبئی کے گرد و نواح کی سرحدوں پر آ کر بس گئے، وہ اپنے ساتھ ملک اور زندگی کی تعمیر نو کا عزم مصمم لے کر آئے تھے۔تقسیم سندھ کے ہندوؤں کے لیے دوہری آفت تھی، جسے میری بیوی کی بھابھی لتا جگتیانی نے بڑی محنت سے اپنی کتاب 'سندھی ریفلیکشن' میں قلمبند کیا ہے۔ یہ ان ہندو شرنارتھیوں کی زندگی کی دردناک اور سبق آموز کہانی ہے جنھوں نے پورے والہانہ جذبات اور تن و من سے ہندوستان کی خدمت کی ہے۔

12 رستمبر کو جب میں نے دہلی جانے کے لیے کراچی چھوڑا تو میں 20 برس کا بھی نہیں تھا، لیکن اس سے قبل کہ میں اس سفر کا درد بیان کروں، جس نے سندھ میں میری زندگی ختم کر دی، مجھے پہلے یہ بتانا چاہیے کہ یہ شروع کیسے ہوئی؟ ساتھ ہی اپنی جائے پیدائش اور اس شہر کی مختصر تاریخ کی کہانی بھی سنانی چاہیے۔

2

سندھ اور ہندوستان: ایک اٹوٹ بندھن

گنگے چے جمنے چیو گوداوری سرسوتی
نرمدا سندھو کاویری جل سمن سننڈھی کرو
پشکر ادیانی ترتھنی گزاندھا سریتاستھا
آگچھنتو یوتیرانی سنان کالے سدانم

(اپنی موجودگی سے آشیرواد دو، اے پاک ندی گنگا، جمنا، گوداوری، سرسوتی، سندھو اور کاویری! پشکر اور دیگر سبھی ندیوں کا پانی ہمیشہ میرے غسل کے لیے دستیاب ہو۔)

قومی اتحاد کے نظریہ فکر کو اُجاگر کرتی صبح کی عبادت

تاریخ میں کچھ تبدیلیاں فطری اور غیر متوقع ہوتی ہیں، جیسے ہندوستان کا برطانوی حکومت سے آزاد ہونا۔ کوئی بھی شخص مسلسل غلامی کی زندگی نہیں بسر کر سکتا، جیسا کہ ماقبل گاندھی مشہور قومی لیڈر لوک مانیہ بال گنگا دھر تلک نے الہامی الفاظ میں کہا کہ 'آزادی ہر ملک کا پیدائشی حق ہے۔' حالانکہ تاریخ میں کچھ تبدیلیاں غیر فطری اور متوقع ہوتی ہیں، جیسے ہندوستان کی تقسیم۔ فرقہ بندی کی بنیاد پر ہندوستان کی تقسیم ہماری قدیم قوم پر پڑنے والی سب سے بڑی مصیبت ہے۔ یہ نہ تو غیر متوقع تھی اور نہ ہی ضروری۔ میرے اس یقین کی جڑیں کراچی اور سندھ کی تاریخ سے جڑی ہیں جسے مختصراً بتانا چاہوں گا:

کراچی: 'فخرِ مشرق'

کراچی بحرِ عرب کے ساحل پر واقع ہے۔ اب یہ 1.4 کروڑ کی آبادی والا عظیم تاریخی شہر بن گیا ہے۔ اٹھارہویں صدی کی ابتدائی دہائیوں تک یہ دلدل والے ماہی گیروں کی بستی تھی، جسے 'کلاچی-جو-گوٹھ' (کلاچی کا گاؤں) کے نام سے جانا جاتا تھا، جو کہ ایک خاتون ماہی گیر مائی کلاچی کے نام پر پڑا تھا۔ یہ جنوبی ساحل کو چھوڑ کر دیگر سبھی سمتوں سے، جو بحرِ عرب کی جانب تھا، کالے اور بڑے ریگستان سے گھرا تھا۔ چونکہ تجارت سندھی برادری کے خون میں ہے، بھوجومل نام کے ایک تاجر نے 1729 میں اسے اپنی تجارتی سرگرمیوں کا مرکز بنایا۔ سو برسوں کے بعد

برٹش انڈیا کمپنی کے ایک جہاز کے آنے کے بعد اس گاؤں کی قسمت چمک اٹھی۔ سندھو ندی کا رخ تبدیل ہوا اور چار سال کے اندر سندھ کی راجدھانی کو ایک 110 میل دور کے شہر حیدرآباد سے کراچی میں منتقل کر دیا گیا۔

سندھ کا الحاق 1843 میں برطانوی کمانڈر ان چیف سر چارلس جیمس نیپئر (1853-1782) نے عیسائیوں کی بنیاد کو تیزی سے بڑھاتے ہوئے کیا۔ فوجی حملہ کا مقصد سندھ کے امیروں کی ملکیت کو لوٹنا تھا۔ ایسا کہا جاتا ہے کہ سندھ کے خزانے تک پہنچنے کے لیے نیپئر نے خون کی ندیاں بہادیں۔ اسے اکیلے حیدرآباد کے قلعہ سے 2 کروڑ اسٹرلنگ کی قیمت کا نسہ 1.3 کروڑ سکے اور باقی کے ہیرے جواہرات ملے۔ اسے اس کام کے لیے کمپنی کے ڈائریکٹر کے ذریعہ انعامات سے نوازا گیا، پھر بھی اس نے اپنے منتخب کرنے والوں کو بے عزت کیا اور ان کی مہم کے مفاد کا ذکر کیا۔ ''انگریز ہندوستان میں حملہ آور تھے اور ہماری ملکہ (کوئین وکٹوریہ) غلط نہیں کر سکتی تھیں، ان کے وزیر کر سکتے تھے۔ کوئی بھی نپولین پر انگریز وزراء سے بڑا الزام نہیں لگا سکتا، جنھوں نے ہندوستان اور آسٹریلیا کو فتح کیا اور زدوکوب کرنے والوں کو بچایا۔ ہندوستان میں فتح کا ہمارا مقصد صرف دولت کے لیے کی جانے والی بے رحمی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ گزشتہ نوے برسوں میں ہندوستان سے کئی کروڑ اسٹرلنگ چوس لیے گئے۔ اس کی ہر شلنگ خون سے اٹھانے کے بعد پونچھ کر قاتل کی جیب میں ڈال دی گئی تھی، لیکن کتنا بھی صاف کریں 'نفرت کے نشان کبھی نہیں مٹتے۔''

اسکول میں میری دوسری زبان لاطینی تھی، اس لیے مجھے نیپئر سے جڑے مشہور قول کو سمجھنے میں مدد ملی۔ یہ کہانی اس طرح ہے کہ امیروں کو شکست دینے کے بعد اس نے لندن میں اپنے مالک کو صرف ایک لفظ 'Peccavi' کا ٹیلی گرام بھیجا۔ یہ ایک لاطینی لفظ ہے جس کا مطلب ہے 'I have Sinned' (میں نے گناہ کیا ہے) جنہیں یہ پیغام ملا انھوں نے اس کا مطلب یوں نکالا کہ 'I have Sind' (میں نے سندھ پر قبضہ کر لیا)۔

ہندوستان کے برٹش سامراج میں شامل ہونے کے بعد باقی خطہ کے ساتھ کراچی کو بھی بمبئی پریسیڈنسی کے عدالتی حقوق کے علاقہ کے تحت لایا گیا۔ صرف 1936 میں سندھ کو الگ کیا گیا تھا، جیسے ہی نیپئر نے کراچی کے ساحل کو چھوڑا، جسے اس نے سوئیز نہر کے اس جانب ایک بہترین بندرگاہ شہر میں تبدیل کر دیا تھا، اس نے چلا کر کہا 'مشرق کا فخر!' کیا میں تمہیں پھر سے دیکھنے کے لیے آسکوں گا، کراچی؟

نیپئر کے علاوہ کراچی کی ترقی سر برٹل فریر (84-1815) کے دور میں ہوئی، جو سندھ کے چیف کمشنر اور بعد میں بمبئی پریسیڈنسی کے گورنر بنے۔ وہ 1857 میں پہلی جنگ آزادی کے بعد بنے پہلے برطانوی حکمرانوں میں سے ایک تھے، جنھوں نے اعتراف کیا کہ ہندوستان کی مذہبی اور ثقافتی وراثت کو محفوظ رکھنا چاہیے، اسے عیسائی نہیں بنانا چاہیے۔ کراچی اور بمبئی میں بنائی گئی کچھ دیدہ زیب عمارتیں اور عوامی مقامات انھیں کی تعمیر کردہ ہیں۔

انگریزوں کے ذریعہ مجوزہ شہر کے منصوبہ میں یہ یقین دہانی کی گئی کہ اس میں بڑے بڑے راستے، شاندار بندرگاہ، جس کا نام کیاماری ہے، اس کے ساتھ مدہوش کر دینے والے سمندر کے کنارے چہل قدمی کرنے کی جگہ اور کچھ بڑے آرٹ کے نمونے جیسے فریر ہال، امپیریس مارکیٹ اور سینٹ پیٹرک چرچ ان کی یوروپی خصوصیات تھیں۔ 1930 کی شروعات میں راجپوت آرٹ میں ایک دولت مند تاجر شورتن موہتا نے موہتا پیلس کی تعمیر کر کے فخریہ طور پر ہندوستانی فن تعمیر کا مظاہرہ کیا تھا۔ جب بھی میں موہتا پیلس سے گزرتا تھا، * اس کی خوبصورتی دیکھ کر مدہوش

* مئی - جون 2005 میں اپنے دورۂ پاکستان کے دوران مجھے اس وقت بے حد خوشی ہوئی جب میں نے موہتا پیلس میں ایک شاندار نمائش دیکھی، جس کا تھیم تھا 'کراچی انڈر دی راج 1947-1843' مجھے اسے دیکھنے کے لیے 'ڈان' اخبار گروپ کے حامد ہارون نے کہا تھا، جنھوں نے نہ صرف خوبصورت ڈھنگ سے پیلس کی حفاظت کی بلکہ راج نمائش بھی لگائی تھی۔ یہ کراچی کی عظمت اور ترقی میں سندھی ہندوؤں کے بے شمار کردار کو پیش کرتا ہے ...... (باقی اگلے صفحہ پر)

ہو جاتا تھا۔ اس کے چاروں طرف بڑا باغیچہ بھی مجھے متوجہ کرتا تھا۔

اپنے بچپن کے دوران ہم اکثر کلفٹن بیچ اور منورا آئی لینڈ پر کنبہ کے ساتھ گھومنے جاتے تھے جہاں دور دکھائی دینے والا خلا سمندر اور آسمان کو الگ کرتا تھا یا شاید جوڑتا تھا، ہمیشہ میرے لڑکپن کے تصور کو ولولہ خیز بناتا تھا۔ تقسیم سے قبل کے کراچی کی میری یادیں ایک صاف ستھرے شہر کی شکل میں ہیں۔ حقیقت میں غیر منقسم ہندوستان میں کراچی بنگلور کی طرح ملک کا سب سے زیادہ صاف ستھرے اور خوبصورت شہر کا اعزاز حاصل کر سکتا تھا۔

کراچی کی کاسموپولیٹن شناخت کے باوجود مجھے اس کا اصلی سندھی کردار بھی یاد ہے۔ انگریزیت اس کی باہری شکل میں نظر آتی تھی، لیکن سندھیت اس کی روح تھی۔ انیسویں صدی کے اواخر تک کراچی نے اپنا تمام مختلف فرقوں جس میں ہندو، مسلم، پارسی، عیسائی، یوروپی تاجر، ایرانی، لبنانی بھی شامل تھے، کے لوگوں سے مل جل کر رہنے والے گھر کے طور پر بنایا تھا۔ کراچی کی آبادی کا پہلا تخمینہ 1813 میں 13 ہزار لگایا گیا تھا۔ جب انگریزوں نے 1891 میں ہندوستان میں پہلی ملک گیر مردم شماری کرائی تب کراچی کی آبادی 96 ہزار تھی۔

تقسیم ہند کے وقت 1947 میں کراچی کی آبادی 4 لاکھ سے زائد تھی۔ 3 برسوں کے دوران جیسا کہ 1951 کی مردم شماری نے دکھایا کہ یہاں پر تین گنا سے زیادہ مسلم مہاجروں نے ہندوستان سے اس شہر کی جانب رخ کیا۔ کراچی اور سندھ کے تقریباً ہر حصہ میں تقسیم کے سبب بھاگ جانے والے لوگوں کے ذریعہ چھوڑی گئی زمین اور اثاثہ پر قبضہ کرنے کی اندھی دوڑ شروع ہوگئی۔

سندھو! ہندوستان کے تہذیبی تشخص کا سرچشمہ

تقسیم کے بعد کا کرب اب ایک پرانی یاد بن کر رہ گئی ہے، لیکن سندھی ہندو، خاص طور پر میری نسل کے لوگ، ابھی بھی ہندوستان سے سندھ کو علیحدہ کرنے کی بات کو قبول نہیں کر پائے ہیں۔ کئی سنسکرت بھجن یہ ثابت کرتے ہیں کہ ہندو سندھو ندی کو پاک مانتے تھے، نہ صرف سندھ میں بلکہ پورے ہندوستان میں۔ سندھ کے کئی مسلمان بھی مانتے تھے کہ سندھو کا پانی مکہ کے آب زم زم سے کم پاک نہیں ہے۔ سندھو تہذیب وادی سندھ کا نام اور شناخت ہی اس برصغیر کے تمدن کی وراثت ہے اور اس کا نام 'سندھو' ندی کے نام پر رکھا گیا ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی کتاب 'دی ڈسکوری آف انڈیا' میں لکھا ہے کہ 'ہندو' لفظ درحقیقت 'سندھو' لفظ سے ماخوذ ہے جو کہ 'انڈس' کا قدیم اور موجودہ ہندوستانی نام ہے۔ 'سندھو' سے ہی ہندو اور 'ہندوستان' مستعار لیے گئے اور اسی طرح 'انڈس' اور 'انڈیا'۔

سندھ دنیا کے سب سے قدیم تمدن کی آماجگاہ ہے، جس کے ثبوت حکومت برطانیہ کے دوران ہڑپا اور موہن جوداڑو سے ہوئی کھدائی سے حاصل ہوئے ہیں۔ لاڑکانہ سے تقریباً 20 کلومیٹر دور واقع یہ باقیات ثابت کرتے ہیں کہ یہ کتنی شاندار اور اعلیٰ سطحی شہری تہذیب تھی۔ اس کے

(گزشتہ) اور عام طور پر سندھیت کے بارے میں بھی بتاتا ہے، جس کے بارے میں نہ ہندوستان کے نوجوان سندھی اور نہ ہی اس شہر کے باشندے زیادہ جانتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ نمائش اور اس طرح کی کوشش سندھ کے آرٹ، موسیقی، ادب، فلاسفی اور تعلیم کے سیکٹر میں بھی کی جائیں جو کہ ہندوستان تک پہنچ سکیں جس سے کہ ہندوستانیوں کی نوجوان نسل جان سکے کہ 1947 سے 60 برس کا وقفہ اور کچھ نہ ہو کر صرف لاکھوں برس پرانے سندھ اور باقی ہندوستان کے تعلقات کی غیر فطری تقسیم تھی۔ تقسیم کے بعد موہتا پیلس کا استعمال پاکستان کے بانی محمد علی جناح کی بہن فاطمہ جناح کے ذریعہ 1967 تک یعنی اپنے انتقال تک رہائش گاہ کے طور پر کیا گیا۔

باشندے دیوی ماں اور دیوتا کی پوجا کرتے تھے، جیسا کہ آج بھی ہندوستان میں بیشتر لوگ کرتے ہیں۔ اتفاق سے لاڑکانہ مرحوم ذوالفقار علی بھٹو اور ان کی بیٹی مرحومہ بے نظیر بھٹو دونوں کا آبائی شہر تھا اور دونوں ہی پاکستان کے وزیر اعظم بنے۔ ہندوستان کے ماہر قانون رام جیٹھ ملانی بھی اسی شہر کے ہیں۔

دنیا بھر کے دیگر قدیم تمدنوں کی طرح سندھ تہذیب کی پرورش بھی ایک عظیم سندھو ندی نے کی۔ یہ تقریباً 3000 کلومیٹر لمبی ہے۔ یہ تبت سے ہوتی ہوئی بالائی لداخ سے گزرتی ہوئی بحرِ عرب میں جا ملتی ہے، جسے ویدک دور میں 'سندھو ساگر' کے نام سے مقبولیت حاصل تھی۔ بی جے پی میں میرے معاون اور سندھ سے آئے کنہیا لال تلریجا نے سندھ تہذیب کی ویدک جڑوں کا ذکر اپنی سبق آموز کتاب 'پرلس آف ویداز' میں تفصیلی طور پر کیا ہے۔ جب قدیم پاک رشیوں نے سندھو ندی کے ساحل پر میٹھی آواز میں وید کے منتر پڑھے، تب سندھو کی لہروں میں ترنگ پیدا ہوئی اور سندھ کی زمین اور آسمان میں ویدک منتروں کی چاشنی گونجنے لگی۔

بیشتر دانشور متفق ہیں کہ جسے سندھو تہذیب کے نام سے جانا جاتا ہے وہ حقیقت میں سندھو-سرسوتی تہذیب کا مرکز تھا۔ سرسوتی ندی * جو اب غائب ہو چکی ہے، وہ سپت سندھو کی سات ندیوں میں سے ایک تھی، جس کا ذکر رگ وید میں کیا گیا۔ یہ پورے ہندوستان کے ہندوؤں کے ثقافتی حافظہ میں جذب ہے اور جسے پریاگ (الہٰ آباد) میں تروینی سنگم کے نام سے جانا جاتا ہے۔ وہاں صرف گنگا جمنا کا ملن نہیں ہوتا، بلکہ سرسوتی کا بھی ہوتا ہے جو کہ معدوم ہے۔ پریاگ میں لگنے والا مہا کنبھ میلہ جو ہر بارہ برس بعد لگتا ہے اور جس میں لاکھوں لوگ حصہ لیتے ہیں۔ دنیا بھر میں سب سے عظیم تیرتھ یاترا میلہ ہے۔

ایک عرب حملہ آور محمد بن قاسم کی سندھ فتح کے بعد جو کہ موجودہ عراق سے 13-711ء میں آیا تھا، وہ نہ صرف سندھ بلکہ پورے ہندوستان کی تاریخ میں ایک اہم دور تھا۔ اس کی مخالفت مقامی راجہ داہر نے کی، جو لڑائی کے میدان میں ہلاک ہوا۔ پاکستان کی تقسیم کے بعد کے مؤرخوں نے اسے ایک ایسے واقعہ کے طور پر بیان کیا کہ سندھ کو 'برہمن وادی جبر' سے آزادی ملی اور اسلام کی شروعات ہوئی، حالانکہ کئی ہندو اور مسلم آج بھی مانتے ہیں کہ یہ حملہ سندھ کی مخصوص شناخت اور وقار پر حملہ تھا اور راجہ داہر کی ایک بہادر ہیرو کے طور پر ستائش کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر، معزز سندھی لیڈر جی ایم سید جنہیں 'جئے سندھ تحریک' ** کی پاداش میں جیل میں ڈال دیا گیا تھا، کی دلیل ہے کہ محمد بن قاسم کے حملہ

---

* بدقسمتی سے کچھ مغربی اور ہندوستانی مارکسوادی فلاسفروں نے سرسوتی ندی کے وجود سے انکار کیا ہے۔ حکومت ہند کو آثار قدیمہ اور دیگر انسٹی ٹیوٹ کو ہدایت دینی چاہیے جس سے کہ سرسوتی کی موجودگی کے ثبوتوں کو پختہ کیا جاسکے، کیونکہ ویدک جڑوں میں بھی اس کے اشارے ہیں۔

** 'جئے سندھ' ایک تحریک کا نام ہے، جس کی بنیاد 1973 میں غلام مرتضیٰ شاہ سید (95-1904) نے ڈالی، جس کا مقصد ایک آزاد سندھ ریاست (سندھو دیس) قائم کرنا تھا۔ سید ایک مشہور صوفی، فلاسفر اور انقلابی سیاسی کارکن تھے۔ انھیں سندھی قومیت کا بانی مانا جاتا ہے، وہ پہلے مسلم لیگ سے جڑے تھے اور یہ افسوسناک ہے کہ ان کی قیادت میں ہی سندھ اسمبلی پاکستان کے حق میں تجویز پاس کرنے والی پہلی اسمبلی بنی۔ حالانکہ تقسیم کے بعد کئی سندھی مسلمانوں اور خود انھیں سندھی تہذیب کی شناخت کا گم ہونا محسوس ہوا۔ پہلی وجہ تھی کہ اتر پردیش اور بہار سے کثیر تعداد میں ہجرت اور دوسری پاکستان کی فوج اور سرکار میں پنجابیوں کی ترجیحات۔ بعد میں یہ مانتے ہوئے کہ سندھی لوگوں کے ساتھ دغابازی ہوئی، انھوں نے ان کے حق خود اختیاری کی حمایت کرنی شروع کی، جس کے لیے وہ پاکستان کے پہلے سیاسی قیدی بنے۔ انھوں نے 30 برس جیل میں تنہا رہ کر گزارے۔ جب وہ جولائی 1987 میں ہندوستان آئے تو میں ان سے مل کر بہت خوش ہوا۔ دہلی دورے کے وقت انھوں نے سابق وزیر اعظم راجیو گاندھی سے بھی ملاقات کی۔

سے قبل سندھ ایک مذہبی رواداری اور کشادہ ذہنی کی سرزمین تھی۔ مختلف مذاہب کے لوگ پرامن رہتے تھے۔ ہندوؤں کے اپنے مندر، پارسیوں کے اپنے آتش کدہ، بودھوں کے اپنے استوپ اور عرب مسلموں، جو کہ سمندری ساحل کے پاس سکونت پذیر تھے، جیسے کہ کیرل میں ہیں، کی اپنی مساجد تھیں۔

مفتوح آبادی کی بڑے پیمانے پر تبدیلی مذہب بعد کی دہائی میں شدت پسند مسلم حکمرانوں کی وراثت کی پہچان ہے۔ اس سیاہ دور میں ہندو گرنتھوں کو نذر آتش کر دیا گیا۔ مندر منہدم کر دیئے گئے اور سندھ کی ماقبل اسلام کی تہذیب پر بات تک کرنے کی پابندی تھی۔ اس کے باوجود سندھ نے کبھی اپنے مذہبی ہم آہنگی، تکثیریت، باہمی رواداری اور پرامن بقائے باہم کو نہیں چھوڑا۔ ایسا خصوصاً دو وجوہات کی بنا پر ہوا۔ سندھی زبان اور مذہبی رواداری، جس کی تشہیر ہندو روحانی لیڈروں اور مسلم صوفی سنتوں، دونوں نے کیا۔ سندھی زبان، آرٹ، موسیقی، ادب، تہذیب اور روحانیت کی بے شمار وراثت کا خزانہ تھی۔ سبھی عظیم ہندو اور مسلم شاعروں اور سنتوں نے اپنے مؤثر نظریات سندھی کے توسط سے پیش کیے۔ ان کی تخلیقات اور ان کے اعزاز میں لکھے گئے گیت آج بھی سندھی باشندوں کی سماجی تقاریب میں ہندو اور مسلمان دونوں کے ذریعہ گائے جاتے ہیں۔ سندھی ہندوؤں کے عزت مآب قابل تعظیم جھولے لال کا ذکر اکثر مسلم گیتوں میں آتا ہے، جیسے کہ شہباز قلندر ایک معزز صوفی سنت تھے، کی تعظیم ہندو بھجنوں میں کی جاتی ہے۔ بنگلہ دیشی گلوکارہ رونا لیلیٰ کے ذریعہ گائے گئے گیت 'دمادم مست قلندر' نے جھولے لال اور شہباز قلندر کو برصغیر کے گھر گھر تک پہنچا دیا۔

مذہبی جنون سندھ میں ہندو اور مسلمان دونوں کے لیے باہری چیز تھی۔ اس کی سب سے اچھی مثال شاہ عبداللطیف 'بھٹائی' کی تعلیم میں ملتی ہے، جن کی پیدائش سترہویں صدی کے اواخر میں ہوئی اور انھیں ہر دور کا عظیم سندھی شاعر مانا جاتا ہے، خود ایک یوگی رہے ہیں۔ انھوں نے 'سر رام کلی' جو کہ ایثار پر مبنی شاعری کا مجموعہ ہے، میں لکھا کہ یوگی اپنے ساتھ کچھ بھی نہیں رکھتے، یقینی طور پر 'انا' کو بھی نہیں...انھوں نے اپنا دل ''رام'' کے لیے وقف کر دیا ہے۔ ان کے لیے خوشی بھی ویسی ہی ہے جیسے غم۔ وہ اپنے خون کے آنسوؤں سے آرتی اتارتے ہیں۔ اگر آپ ایک یوگی بننا چاہتے ہیں تو گرو کے پیروکار بنیں اور سبھی خواہشات کو بالائے طاق رکھ کر ہنگ راج کے لیے بڑھیں۔ یوگی ایک ازلی ماورائے زماں پر ردّعمل کا اظہار کرتے ہیں، جس کا ذکر اسلام میں بھی ہے۔ انھوں نے گورکھناتھ بننے کے لیے اپنا سب کچھ چھوڑ دیا۔

اس سے قبل سچل سرمست کے نام سے معروف عبدالوہاب (1829-1739) ایک عظیم مسلم سندھی شاعر تھے، جو کہتے تھے کہ میں نہ ملا ہوں، نہ برہمن، نہ میں مشرق ہوں نہ مغرب، نہ میں زمین ہوں نہ آسمان، میں ایک جوگی ہوں۔ انھوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ایک ہی ایشور کے تحت بھائی چارگی کی تلقین کی۔ ہندوؤں کا مسلم درگاہ پر جانا سندھ میں ایک عام بات تھی۔ دراصل تقسیم سے قبل سندھ میں صوفی و پیروں کے مقبروں کی تعداد مسجدوں سے زیادہ تھی۔ اسی طرح مسلم روحانیت پسند لوگ ہندو جوگیوں کے ساتھ ہندو دھاموں کی تیرتھ یاترا پر جاتے تھے۔

'سندھ کے تان سین' مانے جانے والے بھگت کنور رام (1938-1885) کے لکھے گیتوں کی موسیقی پر ہندوؤں کے ساتھ مل کر مسلمان بھی وجد میں رقص کرتے تھے۔ اپنے ایک گیت میں انھوں نے ایشور سے پوچھا کہ انھیں کس بات سے خوشی ہوتی ہے؟ کیا میں ایک مسلم بن جاؤں اور نماز پڑھوں یا میں ایک ہندو بنوں اور مندر جاؤں؟ یا میں ایک رقاص بن جاؤں اور اپنی سپردگی تال کے ساتھ پیش کروں؟ جب 1938 میں ایک مذہبی شدت پسند نے گولی مار کر انھیں ہلاک کیا تو سارا سندھ ماتم کدہ بن گیا۔ تقسیم کے بعد انسان دوستوں نے ان کے قتل کے بعد فرقہ

وارانہ ہم آہنگی کے کئی اداروں کا نام ان کے نام پر رکھا۔

میری بیوی کملا کے خاندان میں آج بھی صوفی روایت کی جڑیں بہت مضبوط ہیں۔ ان کی ماں گنگا دیوی جگ تیانی بھی مشہور صوفی سنت سائیں قطب شاہ کی مرید تھیں، جن کی حیدرآباد میں واقع درگاہ پر وہ اکثر جاتی تھیں۔ وہ صوفی کلام، گردوانی اور رام و کرشن سے منسلک گیت پورے بھگتی کے جذبہ کے ساتھ گاتی تھیں اور نوجوانوں کو بھی اس کی تعلیم دیتی تھیں۔ کملا اور اس کی بہن سرلا نے حال ہی میں اپنی ماں کے تحریر کردہ گیتوں کا انتخاب سندھی میں 'غیبی آواز' نامی کتاب میں کیا ہے۔ سرلا اور اس کے شوہر ہیرو آڈوانی جو ممبئی کے ایک کامیاب تاجر ہیں، تقریباً ہر سال سائیں ناصر فقیر کی درگاہ پر پاکستان جاتے ہیں۔ یہ خیر پور کے ایک نہایت معزز صوفی سنت کی درگاہ ہے۔

سائیں قطب شاہ کے مرید ڈاکٹر روچال داس منشارمانی خود ایک قابل تعظیم سنت تھے۔ تقسیم کے بعد وہ بمبئی کے نزدیک کلیان میں رہائش پذیر ہوئے، جہاں پر وہ لاکھوں پناہ گزیں سندھیوں کے مسیحا بن گئے۔ کملا کی ماں اپنے بچوں کو اکثر ان کے پاس لے جاتی تھیں اور انھیں سندھ میں صوفی ازم کے گرو روایت کا تسلسل مانتی تھیں۔ کملا کبھی بھی سائیں نور حسین شاہ کا دیدار کرنا نہیں بھولتیں۔ وہ تقسیم کے بعد سائیں قطب شاہ کی درگاہ کے متولی تھے۔ وہ جب بھی ہندوستان آتے ہیں، کملا ان کا دیدار کرتی ہیں۔ 2005 میں جب میں اپنی بیوی کملا، بیٹے جینت، بیٹی پرتبھا اور بہو گیتکا کے ہمراہ سائیں نور حسین شاہ سے ملاقات کرنے گیا، اس وقت وہ دبئی میں تھے اور خصوصاً میرے خاندان کو آشیرواد دینے کراچی آئے تھے۔

یہاں ایک عظیم سندھی مؤرخ بھگوان ایس گڈوانی کے الفاظ کو یاد کرنا درست ہوگا جو اب مونٹریل میں رہتے ہیں۔ وہ کراچی کے ایک معزز خاندان سے ہیں۔ ان کے والد شام داس گڈوانی سندھ میں ہندو مہاسبھا کے صدر تھے اور ان کے چچا ڈاکٹر چوئتھ رام گڈوانی سندھ خطہ کی کانگریس اکائی کے صدر تھے۔ دونوں نے ایک ہی چھت کے نیچے کام کیا۔ 1994 میں گڈوانی نے اپنی مشہور کتاب 'دی ریٹرنس آف دی آرین' شائع کی۔ یہ ایک افسانوی باز تخلیق ہے، جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ 8000 سال قبل سندھ بیسن میں آریہ تمدن کا جنم ہوا اور پورے ہندوستان کے طول و عرض میں اس کا فروغ ہوا۔ 1995 میں وہ دہلی میں مجھ سے ملے اور اپنی کتاب مجھے تحفہ میں دی، جس پر انھوں نے لکھا 'ایک ہندو کی طرف سے دوسرے ہندو کے لیے'۔

گڈوانی نے لکھا ہے کہ سندھ وہ سرزمین ہے جہاں ہمارے آباواجداد رہتے تھے، جہاں قدیم سناتن دھرم کی تشکیل 8000 عیسیٰ مسیح قبل ہوئی، جس سے ہندوازم کی جڑوں کی تشکیل ہوئی۔ یہ ہماری سندھ کی ندیوں- سندھو اور سرسوتی کے ساحل پر واقع تھا، جہاں ویدوں کی تخلیق کی گئی، جہاں پہلی مرتبہ 'اوم' منتر کا 'جاپ' کیا گیا۔ سندھ کی رہنمائی کے نتیجے میں ہی بھارت ورش اور بعد میں آریہ ورش کی تشکیل ہوئی۔ میں لطیف شاہ بھٹائی، سچل سرمست، سمیع اور دیگر صوفی سنتوں کے سبق کو کبھی نہیں بھلا سکتا۔ ہم ایک تابندہ وراثت کے وارث اور محافظ ہیں۔ اس کے وجود کی فکر کا مطلب ہمارے لیے صرف اکیلے ہی اسے ماننا نہیں ہے بلکہ یہ ہمارے بچوں اور ان کے بچوں کے لیے بھی ہے۔ یہ وہ وراثت ہے جو ہمارے آباءواجداد ان کے لیے چھوڑ گئے۔ میں نہیں چاہتا کہ سندھیت سندھ کی زمین سے فنا ہو جائے۔ اگر ایسا ہوگا تو یہ زمین بنجر، مردہ اور بے روح ہو جائے گی، جیسا کہ پاکستان چاہتا ہے۔

گڈوانی نے آگے لکھا ہے کہ سندھ میں سکھر میں واقع سادھ بیلا (ایک مشہور ہندو مندر) میں اپنی زمانہ طالب علمی میں ذوالفقار علی بھٹو * کو دیکھا، تب انھیں زلفی کے نام سے جانا جاتا تھا۔ وہ سادھ بیلا کے 'لنگر' میں شامل تھے اور میں نے انھیں تھوڑا سا حلوہ لے جاتے ہوئے بھی دیکھا، جو

★ ذوالفقار علی بھٹو (79-1928) کی ماں ایک ہندو تھی۔

کھانے کے ساتھ پرساد کے طور پر پروسا گیا تھا۔ وہ وہاں صرف مفت کے کھانے کے لیے نہیں آئے تھے، ان کے پاس پیسوں کی کوئی کمی نہیں تھی، شاید وہ کسی منت کے پورا ہونے پر شکریہ ادا کرنے یا مستقبل کے لیے آشیرواد لینے آئے تھے۔ میں ٹھیک طرح سے نہیں جانتا۔ میں ان کے ساتھ بیٹھا اور ہم نے ایک دوسرے کا استقبال کیا۔ اپنے جیسے متعدد لوگوں کی طرح میں نے بھی لاڑکانہ میں واقع ان کے گھر کی میزبانی کا لطف اٹھایا، لیکن میں ان سے پوچھ نہیں سکا کہ وہ سادھبیلا کیوں آئے تھے۔ حال ہی میں ایک جنوبی ہندوستانی دوست نے مجھ سے سوال کیا کہ کسی نے کیوں نہیں پوچھا کہ بھٹو وہاں کیوں گئے تھے؟ صرف ایک غیر سندھی ہی اس طرح کا سوال پوچھ سکتا ہے۔ ہمارے لیے سندھ میں درگاہ پر ہندوؤں کا جانا اور پاک ہندو مقامات پر مسلمانوں کا آنا ایک عام بات ہے۔ سندھی مسلم موہن جوداڑو کی قدیم وراثت کو اپنا سمجھتے ہیں، سندھی مسلمانوں نے ہی ہندوؤں کی حفاظت کی۔

رواداری اور مذہبی امتزاجیت کی عظیم روایت تقسیم کے بعد کئی سندھی شاعروں اور ادیبوں نے قائم رکھی، ان میں سب سے عظیم شیخ ایاز (1923-97) تھے۔ انھوں نے لکھا 'میں سبھی مرد، خواتین اور بچوں کے مذہب سے وابستہ ہوں۔ میں 'مدن مست' پودا ہوں، جو ہر اس مقام پر نمودار ہو جاتا ہے جہاں داہر کی بیوی لاڈی کی بے درد عربوں سے مقابلہ کرتے ہوئے خون کی بوندیں گریں۔ میں دیوی کالی کی ہزاروں مجسموں والا غار ہوں جو میں نے پتھر سے تخلیق کی اور جن کی پوجا میں ساری زندگی کرتا رہا ہوں۔

بدقسمتی سے سندھ کی تکثیریت پسند ہم آہنگی اور رواداری کی روایت پر تقسیم کے بعد زوردار حملہ ہوا۔ وہابی ازم ★ نے اس روایت کو تباہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی، جو کہ سعودی عرب کا شدت پسند فرقہ ہے، جس نے دنیا بھر میں ہندوستان سمیت مسلم سماج پر اپنا تسلط قائم کیا۔ سندھیت کے روحانی اور ثقافتی پہلوؤں کو سعودی عرب کی دولت اور سعودی عرب کے مشاق مبلغین کے ذریعہ تعمیر کردہ مدارس و مساجد کے ذریعہ خطرناک طریقہ سے ختم کیا جا رہا ہے۔ اس حملہ میں نقصان صرف سندھ کا نہیں بلکہ پوری انسانیت کے مستقبل کا ہے، جس کی بقا کا انحصار رواداری اور بین عالمی ثقافت پر ہے۔

ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں سندھ کا قابل فخر کردار

درج بالا تذکرہ یہ بتانے کے لیے کافی ہے کہ سندھ میں ہندو اور مسلمانوں کے درمیان، دوسری جانب سندھ اور باقی ماندہ ہندوستان کے درمیان، تعلقات کتنے گہرے اور مضبوط تھے، اسے ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں سندھ کے کردار کی شکل میں بھی دیکھا جا سکتا ہے، جس کو میں خود بغیر فخریہ انداز میں نہیں لکھ سکتا ہوں۔ مثال کے طور پر جیسا کہ 20 رمئی 1984 کو 'سندھ ٹائمس' نے لکھا:

> ''نادر شاہ نے ملک کو صرف ایک بار لوٹا تھا، لیکن انگریز ہمیں ہر دن لوٹ رہے ہیں۔ ہر سال 45 لاکھ ڈالر کی ملکیت ہمارا خون چوس کر جمع کی جاتی ہے اور یہ ملک سے باہر بھیج دی جاتی ہے۔ برطانیہ کو فوراً ہندوستان چھوڑ دینا چاہیے۔''

یہاں قابل غور اہم بات یہ ہے کہ یہ انڈین نیشنل کانگریس کے جنم سے ایک سال قبل اور گاندھی جی کے ذریعہ 'بھارت چھوڑو' کا نعرہ دیئے

★ وہابیت سنی اسلام کا سب سے قدامت پسند مسلک ہے، جس کی بنیاد اٹھارہویں صدی میں محمد بن عبدالوہاب نے ڈالی تھی۔ یہ اسی مذہب کے اصول کو مانتا ہے، جس کی بنیاد پر سعودی عرب کی بنیاد پڑی۔ اسے نہ صرف غیر مسلم عقائد بلکہ صوفی ازم اور دیگر اعتدال پسند مسلم مکاتب فکر کے خلاف بھی غیر رواداری کی تبلیغ کے لیے جانا جاتا ہے۔

جانے سے بہت پہلے کی بات ہے۔

جب 1908 میں بال گنگا دھر تلک کو 6 سال کی قید کے لیے برما (میانمار) کے مانڈلے جیل میں ڈال دیا گیا تو کئی سندھی نوجوانوں نے زمین پر سونا شروع کر دیا۔ جب وہ 1920 میں پہلی مرتبہ سندھ کے دورہ پر آئے تو خواتین پردہ سے باہر آئیں اور ان کی آرتی اتاری گئی۔ ایک نوجوان محب وطن، جس نے ہمیں سب سے زیادہ متاثر کیا، وہ تھے ڈاکٹر چوئتھ رام گڈوانی (1957-1889) جن کے بارے میں تلک نے اپنے اخبار 'کیسری' میں لکھا تھا کہ 'اگر ہر خطہ میں ڈاکٹر چوئتھ رام جیسے افراد ہوں تو ہم بہت جلد غلامی کی زنجیروں کو توڑ دیں گے۔' 1924 میں 'ینگ انڈیا' میں گاندھی جی نے بہت پیار بھرا اخراج عقیدت پیش کیا تھا کہ ڈاکٹر چوئتھ رام نے ہر چیز کی قربانی دی اور ایک فقیر بن گئے، صرف اپنے ملک کے لیے۔ تقسیم کے بعد انھوں نے جواہر لال نہرو کو ہندو شرنارتھیوں کو ان کی ملکیت کے نقصان کا معاوضہ دینے کے لیے رضامند کیا تھا۔

جب پرنس آف ویلس مارچ 1922 میں کراچی آئے تب عوام میں سے کوئی بھی ان کے استقبال کے لیے نہیں گیا۔ گاندھی جی کی ستیہ گرہ تحریک 1930 میں سندھ میں کافی کامیاب رہی۔ ایک پرامن احتجاجی مظاہرہ میں دو ستیہ گرہی پولس فائرنگ میں ہلاک ہوئے اور ایک اہم کانگریسی لیڈر جے رام داس دولت رام انم چندانی کو، ران میں گولی لگی۔ پورا ملک غم زدہ تھا۔ گاندھی جی نے ٹیلی گرافک پیغام بھیج کر کہا 'میں جے رام داس جیسے نیک نفس کسی دوسرے شخص کو نہیں جانتا۔ ایسے ہی ہندوستانیوں کے خون سے سوراج کا مندر تعمیر ہوگا۔' جے رام داس★ (1978-1891) ایک عظیم گاندھی وادی لیڈر تھے جو بعد میں کانگریس کے جنرل سکریٹری کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ آزادی کے بعد انھوں نے 'کمپلیٹ ورکس آف مہاتما گاندھی' کے ایڈیٹر کے طور پر کام کیا۔

1931 میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی (اے آئی سی سی) کا سالانہ اجلاس کراچی میں ہوا، جس کی قیادت سردار ولبھ بھائی پٹیل نے کی۔ یہاں پہلی مرتبہ آزاد ہندوستان میں مکمل بالغ حقوق رائے دہندگی کا وعدہ کرتے ہوئے ایک تجویز پیش کی گئی۔

سندھ کے بہت معروف مجاہد آزادی اور گاندھی جی کے سب سے معتمد پیروکار یقینی طور سے آچاریہ جے بی کرپلانی (1982-1888) تھے۔ یہاں میں سندھ کے ایک دیگر عظیم لیڈر پروفیسر این آر ملکانی (1974-1860) کا ذکر کرنا چاہوں گا، جنھوں نے گاندھی جی سے متاثر ہو کر کالج میں پروفیسر کی نوکری چھوڑ کر تحریک آزادی سے جڑ گئے۔ بعد میں انھوں نے دہلی میں ہریجن کالونی بنانے میں گاندھی جی کی مدد کی اور ایک بااثر سندھی سیاسی لیڈر اللہ بخش سومرو (43-1900) کو کھادی پہننے کے لیے تیار کیا۔ سومرو سندھ کی چنندہ شخصیات میں سے ایک تھے، جنھوں نے ہندو مسلم اتحاد کی حمایت کی اور مسلم لیگ کے ہندوستانی مسلمانوں کی قیادت کرنے والی تنہا پارٹی ہونے کے دعویٰ کی مخالفت کی۔ انھیں اس کی قیمت چکانی پڑی اور 1943 میں ان کا قتل کر دیا گیا۔

ہندوستان کی جنگ آزادی میں سندھیوں کے کردار کی سب سے موثر اور معلوماتی تفصیلات اور بیان کے آر ملکانی کی 'دی سندھ اسٹوری' میں ملتی ہیں۔ مسٹر ملکانی نے ایک دلچسپ واقعہ بیان کرتے ہوئے بتایا ہے کہ سندھیوں میں کس طرح نیتاجی سبھاش چندر بوس کے تئیں والہانہ عقیدت تھی۔ ایک مرتبہ جب نیتاجی ریل گاڑی سے حیدرآباد جا رہے تھے تب کسی نے ازراہِ مذاق مشورہ دیا کہ انھیں کسی سندھی لڑکی سے شادی کرنی چاہیے۔ اس سے وہ جہیز حاصل کر کے قوم کی تعمیر میں لگا سکیں گے۔ سبھاش چندر بوس نے کہا کہ وہ شادی کے لیے تیار ہیں، اگر چوئتھ رام

★ میں بعد میں جے رام داس دولت رام کا رشتہ دار بن گیا۔ میری بہن شیلا کی شادی ممبئی کے ایک ریلوے انجینئر سنتو بھونانی کے ساتھ ہوئی۔ سنتو کی بہن سشیلا جو میرے ساتھ حیدرآباد میں کالج میں تعلیم حاصل کر رہی تھی، اس کی شادی جے رام داس کے بیٹے سے ہوئی۔

انھیں راستہ دیں۔ بعد میں تفتیش کرنے پر پتہ چلا کہ وہاں موجود بیشتر لوگ کنوارے تھے۔ اس کے بعد سبھاش چندر بوس نے کہا کہ 'چلیے ہم ہندوستان کے کنواروں کی ایک پارٹی تشکیل دیتے ہیں۔ چوئتھ رام اس کے صدر اور میں اس کا سکریٹری رہوں گا۔ ہم اسے 'جے ہند' پارٹی کہیں گے۔ ہمارا مقصد ہوگا ملک کی خدمت کے لیے ازدواجی مسرت کی قربانی دینا۔ ظاہر ہے کہ 1942 میں انڈین نیشنل آرمی (آئی این اے) کی تشکیل سے کافی عرصہ قبل ہی 'جے ہند' ان کے دل میں تھا۔

تحریک آزادی کے سبھی لیڈروں سے زیادہ عزت سندھیوں کے دل میں گاندھی جی کے لیے تھی، جنھوں نے 1916، 1917، 1920، 1921، 1929، 1931 اور 1934 میں سات مرتبہ سندھ کا دورہ کیا۔ انھوں نے 1929 میں لکھا 'ہندوستان کی ہر چیز مجھے اپنی طرف کھینچتی ہے، لیکن جب 1916 میں میں پہلی مرتبہ سندھ گیا، اس نے مجھے خصوصی طور پر گرویدہ بنالیا اور سندھیوں اور میرے درمیان ایک رشتہ قائم ہوگیا جو کئی مرتبہ دکھ درد سہنے میں کارگر ثابت ہوا۔

جب تقسیم کے سبب سندھیوں کو ناگفتہ بہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا تب کسی دیگر قومی لیڈر سے زیادہ گاندھی جی نے ان کا ساتھ دیا۔ 1947 میں جب سندھی ہندوؤں نے نقل مکانی شروع کی تب گاندھی جی نے لکھا 'اگر ایک سندھی بھی سندھ چھوڑ کر جاتا ہے تو ایک گورنر جنرل کے طور پر مسٹر جناح کے لیے یہ شرم کی بات ہوگی۔' انھوں نے 27 رمئی 1947 کو پرارتھنا سبھا میں بتایا کہ سندھ کے باشندوں کی خواہش ہے کہ میں ان کے پاس جاؤں۔ میں کئی برسوں سے سندھ نہیں گیا ہوں، لیکن میں نے سندھی لوگوں کے ساتھ اتنے گہرے مراسم رکھے ہیں کہ ایک وقت تھا جب میں خود کو سندھی کہتا تھا۔ انھوں نے بارہا نہرو حکومت اور برطانوی افسروں سے کہا کہ شرنارتھیوں کی ہر ممکن مدد کریں۔ انھوں نے کچھ کے مہاراؤ سے بات کی اور سندھو ریسٹلمنٹ کارپوریشن کے لیے کانڈلا (کچھ، گجرات) میں زمین حاصل کی۔ اتفاق سے میرے والد کانڈلا میں رہتے تھے اور کارپوریشن میں کام کرتے تھے۔

اپنی زندگی کے آخری دن 30 رجنوری 1948 کو گاندھی جی ڈاکٹر چوئتھ رام کی قیادت میں آئے ایک سندھی وفد سے ملے۔ شرنارتھیوں کے قتل اور لوٹ مار کی کہانی سننے کے بعد انھوں نے کہا 'اگر کشمیر کے لیے جنگ ہوسکتی ہے تو پاکستان میں سندھی ہندوؤں کے حقوق کے لیے بھی جنگ ہوسکتی ہے۔ ملکانی نے اپنی کتاب میں بتایا ہے کہ ان کے بھائی نے گاندھی جی کے قتل سے ایک گھنٹہ قبل ان سے ملاقات کی تھی۔ انھیں حکومت ہند نے کراچی میں ایڈیشنل ڈپٹی ہائی کمشنر مقرر کیا گیا تھا، تاکہ وہ سندھ سے ہونے والی نقل مکانی کا سلسلہ وار طریقہ سے انتظام کرسکیں۔ گاندھی جی نے انھیں اپنا آشیرواد دیا اور کہا کہ ہر ایک فرد کو لے آؤ۔ یہ حتمی طور پر دیکھ لو کہ وہاں سے واپس آنے والے تم آخری شخص ہو اور کھوہرو* سے کہنا کہ میں قیام امن کے لیے سندھ کا دورہ کرنا چاہتا ہوں۔ وہ جناح سے مشورہ کریں اور مجھے ٹیلی گرام سے مطلع کریں۔ جب ملکانی نے انھیں بتایا کہ کیسے سندھ میں ہندوؤں کو اپنے تحفظ کے لیے 'جناح ٹوپی' پہننی پڑتی ہے اور 'ڈان' اخبار اپنے ہاتھ میں رکھنا پڑتا ہے تو انھوں نے کہا کہ وہ شام کی اپنی پرارتھنا سبھا میں اس کا ذکر کریں گے۔ حیف صد حیف سندھ دورہ میں وہاں ہو رہے ظلم دیکھنے سے قبل ہی ان کا قتل ہوگیا۔

سندھ اب پاکستان کا ایک حصہ ہے، ایک آزاد اور خودمختار مملکت۔ ایک سچائی جسے قبول کیا جانا چاہیے، لیکن تہذیبی تناظر میں نہ تو کبھی سندھ کو ہندوستان سے الگ کیا جاسکتا ہے اور نہ کبھی ہندوستان سندھ کو بھلاسکتا ہے۔

---

* محمد ایوب کھوہرو مسلم لیگ کے لیڈر تھے اور تقسیم کے وقت سندھ کے وزیراعلیٰ تھے۔

3

سندھ میں میرے پہلے 20 برس

''بچپن سے ہی اپنے ذہن میں مثبت، مستحکم اور معاون نظریات کو داخل ہونے دو، خود کو ان نظریات سے استفادہ کرنے کے لئے کھلا رکھو نہ کہ کمزور اور منجمد کرنے والے نظریات کے لئے۔''

— سوامی وویکانند

میری پیدائش 8 رنومبر 1927 کو سندھ (جواب پاکستان کا ایک حصہ ہے) کے کراچی شہر میں ہوئی۔ میرا خاندان بہت مختصر تھا۔ ماں، باپ اور میری بہن، ہم نہ تو غریب تھے اور نہ ہی بہت امیر۔ جمشید کوارٹرس نام کے محلہ میں واقع وہ مکان، جس میں ہم رہتے تھے، میری پیدائش کے فوراً بعد تعمیر کرایا گیا تھا، اس لیے اس کا نام 'لال کاٹیج' رکھا گیا۔

حالانکہ اس کا نام کاٹیج رکھا گیا تھا جبکہ وہ کافی کشادہ، خوبصورت، یک منزلہ بنگلہ تھا۔ پارسی کالونی کے نام سے مشہور جمشید کوارٹرس کے ایک حصہ میں بہت سے پارسی خاندان رہائش پذیر تھے۔ شہر میں سب سے زیادہ امیر برادری ہونے کے سبب وہ محلوں میں رہتے تھے۔ کراچی اور ممبئی میں پارسی فرقہ کی تیزی سے معدوم ہوتی آبادی کے ساتھ تکلیف دہ احساس اور کراچی کے نزدیکی تاریخی تعلقات، جس کے درمیان کئی باتوں میں مناسبت آج بھی ان محلوں کا تاریخی پس منظر بیان کرتے ہیں۔

آڈوانی کنبہ سندھی ہندوؤں کی عامل شاخ سے تعلق رکھتا تھا۔ روایتی طور سے عامل ریوینو آفیسر ہوتے تھے، جو مسلم بادشاہوں کے انتظامی امور میں منشیوں کے نائب ہوتے تھے۔ وہ لوہانہ نسل کی دو اہم شاخوں میں سے ایک تھے، جو وشیہ کہلاتی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ سندھ کی سرکاری نوکریوں میں عامل لوگوں کا دبدبہ ہو گیا۔ عام طور پر سندھ کے ہندوؤں میں سکھوں کی مقدس کتاب گروگرنتھ صاحب، گرونانک اور دیگر سکھ گروؤں کی تعظیم کی مضبوط روایت تھی۔ سکھ فرقہ کے اس مضبوط اثر کے پس پشت ایک دلچسپ کہانی ہے۔

ایسا مانا جاتا ہے کہ اٹھارہویں صدی کے وسط میں حیدرآباد شہر آتش زنی کے سبب خاکستر ہو گیا۔ سندھ کے مسلم حکمراں کو ایک ایسے شخص کی تلاش تھی جو شہر کی تعمیر نو میں مدد کر سکے۔ اس کے افسروں نے ملتان (اب پاکستان میں) کے نزدیک رہنے والے ایک شخص 'اڈیول' (آڈوانی خاندان کے مؤسس، بانی) کا ذکر کیا۔ ان کی صلاحیتوں سے مطمئن ہو کر راجا نے ایک نئی جگہ پر شہر کی تعمیر نو کے لیے انھیں خاصہ معاوضہ کی پیشکش کی۔ اڈیول

سکھوں کی پاک کتاب 'گرو گرنتھ صاحب' سے عقیدت رکھتے تھے، اس لیے انھوں نے بادشاہ سے کہا 'میں اس شہر کی تعمیر تو تبھی کروں گا جب آپ مجھے پہلے ایک گرودوارہ بنانے کی اجازت دیں، جہاں مسلمانوں کے خوف سے بے نیاز ہو کر میں 'گرنتھ صاحب' کو پڑھ سکوں۔' بادشاہ نے یہ شرط مان لی۔

کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے اڈیول نے ساتھی عاملوں گدومل (گدوانی خاندان) نام کے ایک سول انجینئر اور ایک ماہر مالیات وادھومل (وادھوانی خاندان کے) کا تعاون مانگا۔ جلد ہی حیدرآباد میں آڈوانی، گدوانی اور وادھوانی اسٹریٹس میں عاملوں کی بڑی تعداد رہائش پذیر ہوگئی۔

میرے دادا محترم دھرم داس خوب چند آڈوانی سنسکرت کے عالم تھے اور سرکاری ہائی اسکول کے پرنسپل کے طور پر مطمئن زندگی بسر کر رہے تھے۔ میری پیدائش سے قبل ان کا انتقال ہوگیا۔ میرے والد کشن چند کے چار بھائی تھے، تین ان سے بڑے اور ایک چھوٹے۔ تین بڑے بھائی — گوونِد رام، پرس رام اور رام چندر حیدرآباد میں تھے۔ میرے والد اور ان کے چھوٹے بھائی گوپال داس کراچی میں تھے۔ گوونِد رام ایک سرکاری ملازم تھے۔ وہ حیدرآباد کے ڈپٹی کلکٹر کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے۔ پرس رام ایک وکیل تھے۔ رام چند اور میرے والد تاجر تھے اور گوپال داس کراچی کے ڈی جے سندھ کالج میں کیمسٹری کے پروفیسر تھے۔

جیسا کہ میں نے بتایا، میرے والد کے تین بھائیوں کے نام تھے گوونِد رام، رام چندر اور گوپال داس، ایک عجیب اتفاق ہے کہ میرے تین ماماؤں کے بھی یہی نام تھے۔ کراچی اور حیدرآباد دونوں کی مشترکہ آبادی 6 لاکھ کے قریب تھی، جن میں بیشتر ہندو تھے، لیکن عامل برادری جس سے ہمارے کنبہ کا تعلق تھا انھیں دو مقامات پر محدود تھی اور ہمارے خاندانی مراسم بہت گہرے تھے۔ ان دنوں چھوٹے کنبہ کا تصور نہیں تھا، اس لیے جب میں پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں اور اپنے ان چچیرے ممیرے بھائی بہنوں کی شناخت کرتا ہوں، جن کے ساتھ میں بڑا ہوا تو ان کی گنتی 34 تک پہنچتی ہے۔ میرا اپنا کنبہ مختصر تھا، میرے والد، ماں گیانی دیوی اور میری چھوٹی بہن شیلا۔

گھر میں پاکیزگی کا ماحول

اپنے بچپن کی جو بات مجھے سب سے زیادہ یاد ہے، وہ یہ کہ مجھے میری دادی، نانا اور تین خالاؤں سمیت کنبہ کے سبھی لوگوں کا بھرپور پیار ملا۔ ہمیں بے پناہ پیار ملا، کیونکہ جب میں تیرہ سال کا تھا اور شیلا صرف سات سال کی تھی تو میری ماں کا انتقال ہوگیا تھا۔ ہماری ماں کے انتقال کے بعد شیلا، جو اب ممبئی میں رہتی ہے، کی پرورش تقریباً پوری طرح ہماری جمنی خالہ اور خالو چاندی رام وادھوانی نے کی۔

میرے بچپن کی بہت خوشگوار یادیں ہیں، یہاں تک کہ تقسیم کا صدمہ بھی جس نے سندھ کے لاکھوں دیگر ہندو اور سکھ خاندانوں کے ساتھ ہمارے کنبہ کو بھی غیر منقسم ہندوستان کے اس حصہ سے نقل مکانی کے لیے مجبور کر دیا تھا، ان یادوں کو مٹا نہیں سکا۔ اس کے برعکس، میری یادیں اور زیادہ گہری ہوگئیں اپنے وطن سے جبریہ علیحدگی کی وجہ سے، جہاں میں نے اپنی زندگی کے ابتدائی بیس سال گزارے۔

وہ ایک شخص، جس کا میرے بچپن میں میری شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں سب سے زیادہ اثر ہے، وہ میرے والد تھے، جن کے ساتھ میں کراچی میں رہا۔ وہ سادگی کا پیکر اور ایک دلکش شخصیت کے مالک تھے۔ غیر ضروری اُپدیش دیے بغیر انھوں نے اپنے سلوک سے مجھ میں سنسکار کو فروغ دیا۔ مجھے اپنی ماں سے بہت لگاؤ تھا، لیکن ان کے انتقال کے بعد میرے والد ہی تھے جن سے مجھے پیار اور رہنمائی نصیب ہوئی۔

میں یہ بتا چکا ہوں کہ 1936 سے قبل سندھ بمبئی پریسیڈنسی کا حصہ تھا۔ سندھ کے علاوہ اس میں گجرات، مہاراشٹر، شمالی کرناٹک اور نظام کے حیدرآباد کے کچھ حصے آتے تھے۔ ان علاقوں کے بیشتر حصوں میں یہ روایت ہے کہ کسی شخص کے پورے نام میں بیچ کا نام اس کے باپ کا ہوتا

ہے۔ مثال کے طور پر مہاتما گاندھی کے والد کا نام کرم چند تھا، موہن داس ان کا خود کا نام اور گاندھی ان کا خاندانی نام تھا۔ اسی طرح میرے معاملہ میں ایل کے آڈوانی میں لفظ 'کے' میرے والد 'کشن چند' کو ظاہر کرتا ہے۔ میرا پہلا نام صرف 'لال' ہے۔ وقت کے ساتھ میرے والد کا نام 'کرشن چند' لکھا جانے لگا اور بعد میں ان کے نام کا پہلا حصہ میرے نام کے آگے جڑ گیا اور مجھے 'لال کرشن آڈوانی' کے نام سے مخاطب کیا جانے لگا۔

جب میں پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو ہمارے خاندانی ماحول کے بارے میں جو بات علیحدہ نظر آتی ہے وہ ہے اس میں موجود پاکیزگی اور پوترتا کی فضا۔ ان دنوں کے بیشتر ہندو نانک پنتھی یعنی سکھ ازم کے بانی گرونانک کے پیروکار تھے۔ درحقیقت ہمارے گھر میں خاص 'دیوتا' گرنتھ صاحب ہی تھے۔ ہم نہ صرف ان کے سامنے عبادت کرتے تھے بلکہ میری دادی خاندان کے سبھی افراد کو روزانہ گرنتھ پڑھ کر سناتی تھیں۔ کراچی کا سب سے بڑا گردوارہ عامل کالونی میں تھا، جو جمشید کوارٹرس کے ہمارے گھر سے زیادہ دور نہیں تھا۔ گرومندر کے نام سے معروف یہ جگہ سکھوں اور ہندوؤں کی مذہبی سرگرمیوں اور تقریبات کا اہم مرکز بن گئی تھی، خاص طور پر مشہور سیج دھاری سکھ سنت دادا چلاّ رام (1904-64) کی گہری عقیدت کی وجہ سے جو گربانی گاتے تھے اور اس کی تبلیغ کرتے تھے۔ تقسیم کے بعد دادا چلاّ رام اور ان کا کنبہ دہلی آ گئے، جہاں انھوں نے 'نج ٹھاؤں' قائم کیا جو آج دہلی کے باہر بھی کئی شہروں اور قصبوں میں کئی گردواروں کی دیکھ ریکھ کرتی ہے۔

دیگر کئی سندھی کنبوں کی طرح ہمارے گھر میں بھی روزانہ میری ماں، دادی اور دیگر بزرگ گروگرنتھ صاحب کا 'پاٹھ' کیا کرتے تھے۔ سکھ رسومات ہماری خاندانی روایت کا حصہ تھیں۔ اس میں کوئی تعجب نہیں کہ ایک بچے کے طور پر بھی مجھے صرف یہی نہیں پتہ تھا کہ میری پیدائش 8 نومبر 1927 کو ہوئی تھی بلکہ زیادہ یہ یاد رہتا تھا کہ میری پیدائش گرونانک جینتی، جو کارتک پورنیا کے دن منائی جاتی ہے، کے اگلے دن ہوئی تھی۔ آج کل کیک کاٹ کر اور پارٹیاں منعقد کر کے سالگرہ منائی جاتی ہیں لیکن مجھے یاد ہے کہ میری سالگرہ پر کبھی کیک نہیں کاٹا گیا۔ اس دن گروگرنتھ صاحب کا 'اکھنڈ پاٹھ' ہوتا تھا اور فوراً بعد پرساد کے طور پر 'بھوگ' لیا جاتا تھا۔

2004 کی بات ہے، پارٹی کے ایک ساتھی میرے پاس آئے اور انھوں نے صلاح دی کہ میری رہائش گاہ پر ایک 'اکھنڈ پاٹھ' اور لنگر کا اہتمام کیا جائے، جہاں پنجاب کے کچھ بہترین راگی (سکھ شبد کے گائک) آنے کے خواہش مند تھے۔ میں نے اس مشورہ کا خیر مقدم کیا اور اپنی بیوی کملا سے پوچھا کہ کیا ہم یہ پروگرام ان کی سالگرہ 27 نومبر کو منعقد کر سکتے ہیں۔ وہ فوراً تیار ہو گئی، پھر جب میں نے اس سال کی چھٹیوں کی فہرست پر غور کیا تو مجھے پتہ چلا کہ 26 نومبر کو کارتک پورنیا تھی، اسی لیے اسی دن گرونانک جینتی بھی تھی، لہٰذا ایک خوش کن اتفاق سے گریگیرین کلنڈر کے حساب سے، کملا کا یوم پیدائش اور ہندو کلینڈر کے مطابق میرا یوم پیدائش ایک ہی دن پڑتا تھا۔

پورے کنبہ کے لیے وہ ایک یادگار تقریب تھی۔ میں نے وزیر اعظم ڈاکٹر منموہن سنگھ کو بھی دعوت دی جنھوں نے اسے بخوشی قبول کر لیا۔ رادھاسوامی* ست سنگ بیاس کے بابا گرندر سنگھ ڈھلوں نے بھی ایسا ہی کیا۔

تقریب کے کچھ دن قبل پرتبھا نے اپنی ماں سے پوچھا 'اس سال آپ مجھ سے کون سا تحفہ چاہیں گی؟' کملا نے جواب دیا 'میں چاہتی ہوں کہ کارتک پورنیا پر منعقد ہونے والے 'اکھنڈ پاٹھ' میں تم شبد گاؤ۔' اگلے کچھ دنوں کے لیے پرتبھا نے آفس جانا بند کر دیا۔ ایک تجربہ کار اور موسیقی کے ماہر استاد سے رابطہ کیا اور 'ست نام واہے گرو' کے سر میں نغمہ کے لیے پورے جذبہ کے ساتھ خود کو تیار کیا۔ اس کی نغمگی نے بیاس کے

---

* رادھاسوامی ست سنگ 1861 میں پنجاب میں بیاس ندی پر سوامی شیو دیال سنگھ کے ذریعہ شروع کیا گیا تھا۔ انھوں نے بتایا کہ 'شبد' سننے اور ایشور کا نام جپنے سے انسان 'ایشور' کو حاصل کر سکتا ہے۔ یہ فرقہ سنتوں کی سکھ 'سنت مت' سے متاثر ہے۔

شری گرو جی سمیت سبھی سامعین کو حیرت زدہ کر دیا۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم خاندان کے سبھی لوگوں کو بھی یہ پتہ نہیں تھا کہ وہ اتنا اچھا گا سکتی ہے۔

اس دن مجھے واضح طور سے سندھ کی مذہبی ہم آہنگی کی انمول روایت کا دھیان آیا۔ مندر اور گرودوارہ دونوں ہی ایشور کے گھر تھے اور سبھی ہندو وہاں عبادت کے لیے جاتے تھے۔ گرونانک جینتی اور گرو گوبند سنگھ جینتی پر گرودوارہ میں ہونے والے جشن میں ہندو شامل ہو جاتے تھے، وہیں دیوالی اور دسہرہ کے جشن بھی منائے جاتے تھے۔ میں نے یہ کبھی نہیں جانا کہ جو لوگ داڑھی رکھتے تھے اور جو نہیں رکھتے تھے، وہ الگ الگ عقیدوں کے تھے۔ ہندوؤں کے لیے صوفی سنتوں کی درگاہ پر جانا اور مسلمانوں کا ہندو تہواروں میں حصہ لینا عام باتیں تھیں۔ درحقیقت جہاں تک ہندوؤں اور سکھوں کا تعلق ہے تو تقسیم کے بعد ہندوستان کے اس حصہ میں آنے کے بعد ہی میں نے پہلی مرتبہ یہ سنا اور سمجھا کہ یہ دونوں الگ فرقے ہیں۔

یہی وہ تکثیری سنسکار ہیں جو مجھے بچپن میں حاصل ہوئے اور انہی سے میری شخصی اخلاقیات کی تشکیل ہوئی۔

سینٹ پیٹرکس ہائی اسکول میں خوشگوار ایام

کراچی میں میری اسکولی تعلیم سینٹ پیٹرکس ہائی اسکول فار بوائز میں ہوئی تھی، جو شہر کا سب سے بڑا اور سب سے اونچے درجہ کا اسکول مانا جاتا تھا۔ میں نے 1936 سے 1942 تک چھ سال تک وہاں تعلیم حاصل کی۔ اسے 1845 میں آئرلینڈ سے آئے کیتھولک مشنریز کے ذریعہ خصوصی طور سے شہر کے گوان کرسچین فرقہ کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ ہمارے اسکول کے دائیں جانب سینٹ پیٹرک کا عظیم الشان چرچ (اب کیتھیڈرل) تھا، جہاں سے پورا کلارک اسٹریٹ نظر آتا تھا۔ اس کے بائیں جانب سینٹ جوزف کانوینٹ اسکول فار گرلس تھا۔ اس اسکول کی عظمت اس کے ٹیچروں کی محبت اور ذمہ دارانہ طرز عمل، اس کے تعمیراتی حسن اور پرامن کیمپس کی وجہ سے تھی، یہ سب خصوصیات مل کر مجھے سینٹ پیٹرکس سے وابستگی پر فخر کا احساس عطا کرتی تھیں۔

اس وقت کے تعلیمی پس منظر پر مجھے کچھ کہنا چاہیے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی تعلیمی سطح میں کافی فرق تھا۔ ہندوؤں میں خواندگی تقریباً صد فیصد تھی، جبکہ اعلیٰ تعلیم کے مواقع بہت محدود تھے، صرف تین شہروں کراچی، حیدرآباد اور شکارپور میں کالج تھے اور صرف کراچی میں ایک سے زائد کالج تھے۔ لاڑکانہ، سکر، جیکب آباد اور میرپور خاص جیسے بڑے قصبوں میں بھی کالج نہیں تھے۔ اسکولوں میں مسلم طالب علموں کا داخلہ بہت کم تھا اور کالجوں میں اس سے بھی کم۔ سینٹ پیٹرکس میں بھی مسلم طلبا برائے نام تھے، جہاں تک لڑکیوں کی تعلیم کا سوال ہے وہ بالکل ہی ندارد تھیں۔

میں اپنی پڑھائی میں کافی محنتی تھا اور جہاں تک مجھے یاد ہے، میٹرک تک میں نے درجہ میں پہلا مقام حاصل کیا تھا۔ اس وجہ سے سبھی ٹیچرس مجھے جانتے تھے۔ میں اپنے درجہ میں سب سے چھوٹا بھی ہوا کرتا تھا۔ جب میٹرک پاس کیا تھا اس وقت میں صرف 14 برس کا تھا، بعد میں جب میرے ٹیچروں کو پتہ چلا کہ میں ہندوستان میں کچھ بن گیا ہوں تو وہ سب بہت خوش تھے اور نازاں بھی۔ ایک خصوصی طور سے یادگار لمحہ وہ تھا جب 1978 میں ہندوستان کے وزیر اطلاعات ونشریات کے طور پر میں کراچی کے ایک مختصر دورہ کے دوران اپنے اسکول گیا تھا۔ وہ سبھی ٹیچر جنھوں نے مجھے پڑھایا تھا اور جو اس وقت زندہ تھے، اسکول کے آڈیٹوریم میں میرے استقبال میں منعقد کی گئی خصوصی تقریب میں شامل ہوئے تھے۔ میرے وقت سے چلے آرہے نہایت محترم پرنسپل فادر ماڈیسٹائن بھی موجود تھے۔ چھتیس سال کے طویل وقفہ کے بعد میں اپنے اسکول کے احاطہ میں داخل ہوا تھا، جس کا گوشہ گوشہ مجھے بہت شدت سے یاد تھا۔

2005 میں اپنے کراچی دورہ کے دوران میں پھر اپنے اسکول گیا۔ ایک مرتبہ پھر اسکول کے پرنسپل اور ٹیچروں نے میرے اعزاز میں ایک استقبالیہ تقریب منعقد کی۔ مجھے کچھ ایسے لوگ ضرور ملے جنھوں نے میرے ساتھ تعلیم حاصل کی تھی اور بڑے ہوکر اسی اسکول میں پادری اور ٹیچر بن گئے تھے، لیکن اس مرتبہ ان میں سے ایک بھی ٹیچر نہیں ملے جنھوں نے مجھے پڑھایا تھا۔ یہ فطری ہی تھا۔ میں وہاں اپنے 1978 کے دورے کے بعد تقریباً 3 دہائیوں کے وقفہ سے گیا تھا اور 1942 میں میرے اسکول چھوڑنے کے بعد 6 دہائی سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا تھا۔ وقت نے غیر متوقع طور پر اپنی قربانی لے لی تھی اور مجھے انسانی زندگی کے وجود پر غم زدہ سوچنے کے لیے چھوڑ دیا تھا۔

اسکول کی میری خوشگوار یادیں یکا یک اس وقت پھر تازہ ہوگئیں جب پاکستان کے صدر جنرل پرویز مشرف، جو خود بھی سینٹ پیٹرکس ہائی اسکول کے طالب علم رہ چکے ہیں، 2005 کے اوائل میں ہندوستان آئے اور انھوں نے مجھے ایک انوکھا تحفہ دیا۔ یہ میرے اسکولی برسوں کے دستاویزات تھے اور فوٹو البم تھا، جس میں 1936 کا میرا اسکول داخلہ سرٹیفکیٹ، سمیت میرے ٹیچروں اور پرنسپل فادر ماڈیسٹائن کے فوٹو تھے۔ جب انھوں نے مجھے وہ البم دیا تو ہم دونوں اس اسکول کے بارے میں ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے، جس میں ہم دونوں نے تعلیم حاصل کی تھی۔ جنرل مشرف نے مجھ سے پوچھا 'آڈوانی صاحب! کیا آپ کو اسکول میں کبھی سزا ملی تھی؟'

میں نے کہا 'نہیں کبھی نہیں۔ ہمارے وقت میں تاخیر سے اسکول پہنچنے یا کوئی شرارت کرنے کی سزا ہوتی تھی کہ کلاس مانیٹر قصوروار طالب علم کو باہر لے جاتا تھا اور اس کے ہاتھ پر بینت (چھڑی) سے چار مرتبہ مارتا تھا۔'

جنرل مشرف نے کہا 'جہاں تک میرا سوال ہے، میں نے کئی مرتبہ بینت کا مزہ چکھا تھا۔'

سینٹ پیٹرکس، جو ایک انگلش میڈیم اسکول تھا، میں ہمارے پاس ایک اور زبان سیکھنے کا متبادل تھا۔ کئی طلبا نے فرنچ کا انتخاب کیا، کچھ نے فارسی لی، لیکن میں نے لاطینی کا انتخاب کیا۔ مجھے یاد ہے کہ بورڈ کے امتحان میں مجھے لاطینی میں اچھے نمبر حاصل ہوئے، لیکن زندگی بھر مجھے اس بات کا افسوس ہوا کہ میں نے اسکول میں سنسکرت نہیں سیکھی۔ کراچی کے اسکولوں میں عام طور پر سنسکرت نہیں پڑھائی جاتی تھی اور ایک کیتھولک ادارہ ہونے کے ناطے سینٹ پیٹرکس میں سنسکرت نہیں پڑھائی جاتی تھی۔

قارئین کو تعجب ہوگا کہ جب میں کراچی میں تھا تو ہندی زیادہ نہیں جانتا تھا۔ ہندی فلمیں دیکھنے کے سبب میں ہندی سمجھ لیتا تھا اور ٹوٹی پھوٹی ہندی میں کچھ بات بھی کر لیتا تھا۔ 1947 میں ہندوستان کے اس حصہ میں آنے کے بعد ہی جب میں 20 برس پورے کر چکا تھا، میں نے ہندی پڑھنا، لکھنا اور بولنا سیکھا۔ اس زبان کی غیرفہمی کی ایک دلچسپ مثال پیش کرتا ہوں جو زبان میری زندگی کے بعد کے برسوں میں میری سیاسی اور خاندانی زندگی میں مکالمہ کا اہم ذریعہ بنی۔

اپنے دور طالب علمی میں ایک مرتبہ میں نے اپنی دادی کو ایک پوسٹ کارڈ پر خط لکھتے ہوئے دیکھا۔ میں نے پوچھا 'دادی ماں! آپ یہ خط ہندی میں کیوں لکھ رہی ہیں؟'

انھوں نے جواب دیا: 'بیٹا! یہ ہندی نہیں سندھی ہے، مگر رسم الخط گرومکھی ہے۔ میں کبھی اسکول نہیں گئی، میں سندھی جانتی ہوں کیونکہ وہ مادری زبان ہے اور گرومکھی میں نے اس لیے سیکھی کہ گروگرنتھ صاحب اسی زبان میں تحریر ہے۔' جب انھوں نے مجھے وہ خط پڑھ کر سنایا تو مجھے تعجب ہوا کہ اس کی زبان تو سندھی تھی مگر وہ گرومکھی رسم الخط میں تحریر کیا گیا تھا۔ یہ مخلوط دولسانیت سندھ میں میری دادی کی عمر کی سندھی خواتین میں کافی عام تھی۔

ایک اور لسانی تحیر سے میرا سامنا ہوا۔ اس مرتبہ میرے داداجی، جو سنسکرت کے اعلیٰ درجہ کے عالم تھے، کی کتابوں کے مجموعہ کو دیکھ کر،

ایک دن میں نے ان کی الماری میں ایک بوسیدہ اور ضخیم کتاب دیکھی جس پر تحریر تھا 'انگریزی - سندھی ڈکشنری' جب میں نے اسے کھولا تو دیکھا کہ اس میں سندھی تھی ہی نہیں۔ میں نے اپنے والد سے پوچھا 'والد صاحب! یہ انگریزی سے سندھی ڈکشنری ہونی چاہیے تھی لیکن میں اس میں صرف سنسکرت دیکھتا ہوں، ایسا کیوں ہے؟'

والد صاحب نے کہا 'بیٹا! یہ سنسکرت نہیں سندھی ہی ہے۔ تم اسے پہچان نہیں سکے، کیونکہ آج کل سندھی عربی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے، لیکن پرانے زمانے میں، جب میرے والد صاحب نے مجھے یہ کتاب دی تھی، سندھی زبان دیوناگری میں لکھی جاتی تھی نہ کہ عربی رسم الخط میں۔'

تقسیم کے بعد دہائیوں تک سندھی فرقہ میں اس موضوع پر گرما گرم بحث ہوتی رہی کہ کیا تقسیم کے بعد ہندوستان کے اس حصہ میں آئے سندھیوں کو عربی رسم الخط کا استعمال جاری رکھنا چاہیے یا انھیں پھر سے دیوناگری رسم الخط اپنا لینا چاہیے؟ میں ہمیشہ سے ہی اس فکر کا حامل رہا ہوں، خصوصاً عملی وجوہات کی بنا پر کہ ہمیں پھر سے دیوناگری رسم الخط اپنا لینا چاہیے، کیونکہ سندھیوں کی نوجوان نسل اپنی مادری زبان سندھی بول تو سکتی ہے، لیکن عربی رسم الخط سے پوری طرح نابلد ہونے کے سبب نہ تو اسے پڑھ سکتی ہے اور نہ ہی لکھ سکتی ہے۔

سنیما، کرکٹ اور کتابوں سے محبت

میرے چار ماماؤں میں سب سے چھوٹے ماما میرے اچھے دوست بن گئے، حالانکہ وہ مجھ سے کافی بڑے تھے۔ ہم دونوں ساتھ ہی باہر جاتے اور اکثر ساتھ ہی فلمیں دیکھا کرتے تھے۔ مجھ میں ہندی اور انگریزی فلمیں دیکھنے کا شوق جلد ہی پیدا ہونے کا اہم سبب وہی تھے۔ بچپن میں ان کے ساتھ میں نے کئی ڈراؤنی فلمیں دیکھیں اور ان میں سے ایک فلم جو اب تک مجھے یاد ہے وہ تھی 'فرینکیسٹائن'۔

پھر 1942 سے 1956 کے درمیان ایک ایسا دور آیا جب میں نے ایک بھی فلم نہیں دیکھی۔ وہ پھر سے ایک ڈراؤنی فلم ہی تھی جس نے سنیما سے میرا اتنا لمبا پرہیز توڑا۔ 1956 میں، میں بمبئی گیا تھا اور انہی سندر ماما کے گھر ٹھہرا تھا۔ انھوں نے کہا 'چلو ایک فلم دیکھنے چلتے ہیں۔' میں نے منع کیا۔ 'میں نے تقریباً 15 برسوں سے کوئی فلم نہیں دیکھی ہے۔' میں نے کہا۔ انھیں بہت تعجب ہوا، پھر ہوا یہ کہ ایک اخبار میں خبر شائع ہوئی کہ اسٹرینڈ سنیما میں ایک تھری ڈی فلم دیکھتے ہوئے دل کا دورہ پڑنے سے ایک آدمی کی موت ہوگئی۔ وہ فلم تھی 'دی ہاؤس آف ویکس'۔ 1953 میں بنی یہ کلاسک فلم 1933 میں بنی ایک فلم کی ری میک تھی، لیکن وارنر برادرس کی بنائی ہوئی یہ پہلی تھری ڈی فلم اور وہ بھی رنگین ہونے کی وجہ سے ساری دنیا میں ہٹ ثابت ہوئی۔ اخبار کی خبر میں کہا گیا تھا کہ فلم کا 'ریئلسٹک' تھری ڈی ایفکٹ کا لطف اٹھانے کے لیے ناظرین کو مخصوص چشمہ دیا جارہا ہے۔ اس سے میرے اندر تجسس پیدا ہوا اور میں نے ماما سے کہا 'چلو یہ فلم دیکھنے کے لیے چلتے ہیں۔' اس کے بعد پھر کبھی میں نے فلم دیکھنے کا لطف لینے میں اتنا لمبا وقفہ نہیں آنے دیا۔

اسکول میں بہت سے باصلاحیت طلبا سائنس اور علم الحساب میں اچھے نمبر حاصل کرتے ہیں، اس لیے وہ سوچتے ہیں کہ وہ اچھے نمبر دلانے والے ان سبجیکٹ میں دلچسپی لیں، لیکن درحقیقت یہ سچائی نہیں ہے۔ جیسے جیسے وہ بڑا ہوتا ہے اس کی سمجھ بڑھتی ہے کہ اصل میں اس کی پسندیدگی کا موضوع کیا ہے۔ اپنے معاملہ میں کالج کے دنوں میں مجھے پتہ چلا کہ مجھے انگریزی ادب میں زیادہ دلچسپی ہے۔ 1942 میں جب میں نے حیدرآباد (سندھ) کے دیارام گرومل کالج میں داخلہ لیا، 'بھارت چھوڑو' تحریک شروع ہوچکی تھی۔ شہر کے حالات منتشر ہونے کے سبب کالج مشکل سے ہی صحیح ڈھنگ سے چل پاتا اور بیشتر طلبا اِدھر اُدھر گھومتے رہتے۔ میں اپنا بیشتر وقت کالج لائبریری میں گزارا کرتا تھا اور جس کتاب کو پڑھنے کا

دل کرتا تھا اسے پیاسے کی طرح پی جاتا تھا۔

یہیں کتابوں سے میری زندگی بھر چلنے والی محبت کا آغاز ہوا۔ میں نے 19ویں صدی کی سائنس فکشن کی مشہور فرنچ مصنفہ جولس ورن (Jules Verne) کی ساری ناولیں پڑھ ڈالیں، بشمول 'جرنی ٹو دی سینٹر آف دی ارتھ'، 'ٹوینٹی تھاؤسینڈ لیگز انڈر دی سی'، 'اراؤنڈ دی ورلڈ ان ایٹی ڈیز' وغیرہ یہ ناول ان تکنیکی ایجادوں کو بیان کرنے میں کافی دور رس اور موزوں تھے، جو کئی دہائیوں کے بعد وجود میں آئے۔ مثال کے طور پر 'پیرس ان دی ٹوئیتھ سنچری' ایئر کنڈیشننگ' ٹیلی ویژن وغیرہ کا ذکر کرتا ہے جو کہ ورن کے وقت میں وجود ہی میں نہیں تھے۔ اسی طرح ناول 'فرام دی ارتھ ٹو دی مون' تین خلائی مسافروں کے فلوریڈا سے خلا کے لیے روانہ کیے جانے اور ان کے سمندر پر اتر کر زمین پر واپس آنے کا داستان سناتی ہے، جواب 1964 کی اپولو-II کے سفر کی تقریباً پہلی 'پری ویو' ہی معلوم ہوتا ہے۔

کالج کی لائبریری میں ہی میں نے چارلس ڈیکنس، الگزینڈر ڈیوما اور یوروپ اور امریکہ کے دیگر کلاسیکی مصنفوں کی دیگر ناولیں پڑھی تھیں۔ میں ڈیکنس کے 'اے ٹیل آف ٹو سٹیز' اور ڈیوما کے 'دی تھری مسکیٹرلیں' سے خصوصی طور پر متاثر ہوا تھا۔ میرے زیر مطالعہ جو ناول ان دنوں تھے ان میں بہت سے ناولوں پر فلمیں بن چکی تھیں اور بعد کے برسوں میں انھیں دیکھنے کا موقع میں چھوڑتا نہیں تھا۔

میں اسکول میں بھی کتابوں کا مطالعہ کیا کرتا تھا، لیکن اس وقت مجھے سب سے زیادہ شوق کرکٹ کا تھا۔ میں کوئی غیر معمولی کھلاڑی نہیں تھا، لیکن اے ایف ایس تلیار خان کی ٹسٹ کرکٹ، رنجی ٹرافی اور ہندو، مسلم، پارسی، یوروپی اور ریسٹ الیون کے درمیان بمبئی میں ہونے والے نہایت مقبول پنج رخی میچوں کی ریڈیو کمنٹری بڑے انہماک سے سنا کرتا تھا۔ اس پنج رخی ٹورنامنٹ میں ہر سال فائنل میچ اکثر ہندو اور مسلم ٹیموں کے درمیان ہی ہوتا تھا اور وہ اسی دلچسپی اور جوش سے کھیلا جاتا تھا جیسے ان دنوں ہم ہندوستان اور پاکستان کی ٹیموں کو ٹسٹ یا یک روزہ کرکٹ میچ کھیلتے ہوئے دیکھتے ہیں۔

ریڈیو پر تلیار خان کی آواز جادوئی لگتی تھی اور بہت سے کرکٹ شائقین کی طرح میں کمنٹری کے ان کے انداز کا بھی اتنا ہی دلدادہ تھا جتنا کہ کرکٹ میچ کا۔ میں اکثر ان کے ذریعہ دی گئی کھیل کی تفصیل اور تجزیہ کی نقل کرکے اپنے دوستوں کی تفریح کا سامان کرتا رہتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے ایک مرتبہ اسکول سے فرار ہو کر یہ شوق پورا کیا تھا، وہ تب جب کہ ریڈیو کمنٹری سننے کے بجائے مجھے سندھ اور مہاراشٹر کی ٹیموں کے درمیان کراچی میں ہونے والے پانچ روزہ رنجی ٹرافی کا فائنل میچ دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ مہاراشٹر ٹیم کے کپتان ڈی بی دیودھر تھے، جو 100 برس تک زندہ رہے۔ اسی میچ میں میں نے وجے مرچنٹ، وینو مانکنڈ اور سندھ کے ناؤمل اور ایم جے مبید جیسے عظیم کھلاڑیوں کو کھیلتے دیکھا۔

مجھے یاد نہیں کہ میں اسکول میں کبھی شرارتی رہا، لیکن جب 1943 میں ہم حیدرآباد میں تھے تب اپنی دادی ماں کے ساتھ ایک شرارت کی تھی۔ سندھ کے اس حصہ میں گرمی کے مہینے میں درجہ حرارت بہت زیادہ ہوتا تھا اور خواتین اپنے گھروں کے احاطے میں روایتی جھولوں پر سوتی تھیں۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ درجہ حرارت 119 فارن ہائٹ تک پہنچ گیا تھا۔ دوپہر میں میری دادی ہاتھ میں پنکھا لے کر خود کو گرمی سے نجات دلانے کی کوشش کرتیں اور سونے کے مقصد سے جھولے پر نیم خوابیدہ ہو جاتیں۔ ایک دن وہ نیند کی آغوش میں جانے ہی والی تھیں کہ میں نے خاموشی سے پنکھا ان کے ہاتھ سے چھڑا لیا اور اس کی جگہ پر ان کے ہاتھ میں ایک داتون پکڑا دی۔ ان کا ہاتھ پہلے کی طرح چلتا رہا، لیکن جب انھیں ٹھنڈک کا احساس نہیں ہوا تو وہ اچانک بیدار ہو گئیں اور میری شرارت پکڑی گئی۔ اس دن وہ مجھ سے بہت ناراض ہوئیں۔ مجھے بھی یہ بہت برا لگا اور ایسی شرارت میں نے دوبارہ کسی کے ساتھ نہیں کی۔

اسکول جانا مجھے کبھی خراب نہیں لگا، اس لیے کہ میں اس طرح کا طالب علم نہیں تھا جو کسی غیر متوقع چھٹی کے سبب اسکول بند ہو جانے پر خوشی سے ناچ اٹھتے ہیں، پھر بھی ایک وجہ سے، سال میں ایک موسم ایسا تھا جب اسکول بند ہو جانے پر موج مستی کرنے کے اپنے لڑکپن کی جبلت کو میں روک نہیں پاتا تھا۔ کراچی میں بارش بہت کم ہوتی تھی۔ زیادہ سے زیادہ سال میں پانچ انچ، مانسون کے دوران بادل گھر آتے تھے، لیکن وہ بادل برستے بہت کم تھے، اس لیے جب کبھی بارش کی ہلکی بوندیں بھی پڑتیں تو ہم سبھی لڑکے خوب مستی کرتے تھے اور بھی زیادہ اس لیے کہ اسکول مینجمنٹ اس دن کی چھٹی کا اعلان کر دیتا تھا، تا کہ طلبا لطف اندوز ہو سکیں۔ میں روزانہ سائیکل سے اسکول جایا کرتا تھا۔ تقریباً دو میل کی دوری 20-15 منٹ میں طے ہوتی تھی۔ ان دنوں جب شہر کو کبھی کبھی ہلکی بارش کا تحفہ ملتا تھا، یہ جانتے ہوئے بھی کہ اسکول بند ہوگا، میں سائیکل سے سینٹ پیٹرکس جایا کرتا تھا، صرف اس اعلان کا لطف لینے کے لیے جو فرنٹ گیٹ پر بڑے الفاظ میں بورڈ پر تحریر ہوتی تھی 'بارش کی وجہ سے آج اسکول بند ہے۔'

14 برس کی عمر میں راشٹریہ سویم سیوک سنگھ کا سویم سیوک بننا

سب کے بچپن میں ایک لمحہ ایسا آتا ہے جب دروازہ کھلتا ہے اور مستقبل کی آہٹ سنائی دیتی ہے۔ میرے معاملہ میں مستقبل میں داخل ہونے کا وہ لمحہ اچانک کھیل کھیل میں ہی آ گیا، جب میں نے راشٹریہ سویم سیوک سنگھ میں داخلہ لیا۔ اس وقت میں صرف چودہ برس اور کچھ ماہ کا تھا۔ میرے میٹریکولیشن کرنے کے بعد میرے والد کراچی سے حیدر آباد (سندھ) منتقل ہو گئے تھے۔ کالج میں داخلہ لینے سے قبل گرمی کی چھٹیوں میں میں نے ٹینس کھیلنا شروع کر دیا۔ ٹینس کورٹ میں میرے مستقل جوڑی داروں میں سے ایک میرا دوست تھا مرلی مکھی، جو میری ہی عمر کا تھا۔ ایک دن ٹھیک کھیل کے دوران وہ بولا 'میں جا رہا ہوں۔' نہایت استعجاب سے میں نے اس سے پوچھا کہ تم سیٹ مکمل کیے بغیر اس طرح کیسے جا سکتے ہو تو اس نے جواب دیا 'کچھ دنوں قبل میں آر ایس ایس کا سویم سیوک بن گیا ہوں۔ میں شاکھا میں تاخیر سے نہیں پہنچ سکتا، کیونکہ اس تنظیم میں وقت کی پابندی بہت ضروری ہے۔'

تب پہلی مرتبہ میں نے آر ایس ایس کا نام سنا تھا۔

'یہ سنگھٹن (تنظیم) ہے کیا چیز؟' میں نے اس سے پوچھا۔

میرے دوست نے مجھے کچھ سمجھایا اور بولا 'تم بھی میرے ساتھ شاکھا چلا کرو۔' میں نے یہ کہہ کر اسے منع کر دیا کہ آج تو میں ٹینس کھیلوں گا، پھر کسی اور دن دیکھیں گے۔ وہ لمحہ بہت جلد آ گیا۔ دو چار دن بعد میں اس کے ہمراہ 'شاکھا' گیا اور آج بھی مجھے وہ جگہ اچھی طرح سے یاد ہے۔ ان دنوں سندھ میں مارشل لا نافذ تھا اور اجتماعی مقامات پر قواعد ممنوع تھی، اس لیے میں 'شاکھا' میں پہلی مرتبہ ایک بڑے بنگلے کی چھت پر گیا جو سنگھ کے ایک خاص سویم سیوک رام کرپلانی ★ کا تھا۔ آخر میں سبھی سویم سیوکوں نے قطار بند ہو کر 'ساوَدھان' کی شکل میں مادر وطن کی 'وندنا' کے لیے سنگھ

★ تقسیم کے بعد میرا رام کرپلانی سے رابطہ ٹوٹ گیا، کیونکہ وہ ترینداڈ اور ٹوبیگو میں جا کر بس گئے، جہاں ہندوستانی نژاد لوگ بڑی تعداد میں ہیں۔ 2007 میں ترینداد اور ٹوبیگو کے ہائی کمشنر نے دیوالی جشن میں حصہ لینے کے لیے مجھے دعوت نامہ دیا جس میں ان کے ملک کی عظمت، نوبل پرائز سے سرفراز مصنف سر ودیا ساگر سورج پرساد نائپال بھی آنے والے تھے۔ ہائی کمشنر نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں کبھی ترینداد و ٹوبیگو گیا ہوں؟ میں نے کہا: نہیں، لیکن کراچی میں میرے ساتھ رہے رام کرپلانی کو جانتا ہوں، جو آپ کے ملک میں رہائش پذیر ہیں۔ اس کے جواب میں انھوں نے کہا 'رام کرپلانی، وہ تو ہمارے ملک کے خاص بزنس مین اور فراخ دل شخص ہیں۔'

پرارتھنا 'نمستے سدا وتسلے ماتر بھوی' گایا۔ تب سے اب تک 65 برس کے طویل عرصہ میں مجھے اس بات کا فخر ہے کہ میں سنگھ کا پرجوش، وقف اور فخر کرنے والا سویم سیوک ہوں۔

راشٹریہ سویم سیوک سنگھ (سنگھ) میں شامل ہونے کے بعد جلد ہی میں پرانت پرچارک (کل وقتی صوبہ جاتی آرگنائزر اور محرک) شری راج پال پوری کے رابطہ میں آیا۔ ان کی مشفقانہ اور متحرک کرنے والی شخصیت میرے دل پر ایک گہری چھاپ چھوڑ گئی۔ بلاواسطہ انھوں نے میرے اقداری نظام کو شکل دی اور میرے دل میں حب الوطنی کی شمع روشن کی۔ اگر کوئی مجھ سے یہ پوچھے کہ وہ کون لوگ ہیں جنھوں نے زندگی میں آپ کو سب سے زیادہ متاثر کیا ہے؟ تو اپنے والدین کے علاوہ میں بلا تامل دو افراد کا نام لوں گا۔ راج پال پوری اور ہندوستان کے اس حصہ میں آنے کے بعد پنڈت دین دیال اپادھیائے، جو کہ اس بھارتیہ جن سنگھ کے قائد، رہنما اور نظریہ ساز تھے، جو بعد میں بھارتیہ جنتا پارٹی بن گئی۔

یہاں مجھے اس بات کا ذکر کرنا چاہیے کہ کس بات نے مجھے آر ایس ایس میں شامل ہونے کے لیے متحرک کیا؟ جب تک میں اسکول میں تھا، میری دنیا میرے گھر اور پڑھائی تک محدود تھی۔ اسکول میں میں نے وہ ساری تعلیم حاصل کر لی تھی جو مجھے اپنے ٹیچروں اور درسی کتابوں سے ملی تھی۔ گھر پر میں نے وہ سارا پیار، لاڈ اور سنسکار سیکھ لیے تھے جو مجھے اپنے خاندان سے ملے تھے اور جس نے میری شخصیت کی تشکیل کی۔ یہی وہ پونجی تھی جو میں نے اپنے بچپن میں جمع کی تھی، لیکن میں اس عظیم الشان دنیا کے بارے میں بہت کم جانتا تھا جو میرے گھر اور اسکول کی دیواروں کے باہر تھی۔ ہندوستان اور دنیا میں رونما ہونے والے اہم سیاسی واقعات سے میرا واسطہ تبھی پڑا جب میں نے سنگھ کی شاکھا میں جانا شروع کیا۔ ایک دن، جب میں دیگر سویم سیوکوں کے ساتھ بیٹھ کر شیام داس ★ کے بودھک (علمی گفتگو) سن رہا تھا، انھوں نے ہمارے سامنے ایک سوال رکھا 'آپ لوگ سماج سے اتنا کچھ پاتے ہیں لیکن اس کے بدلے سماج کو کیا دیتے ہیں؟ کیا آپ کا یہ فرض نہیں ہے کہ آپ ایسا کریں؟ ہندوستان ابھی غیر ملکی حکمرانوں کے قبضہ میں ہے۔ کیا یہ ہماری ذمہ داری نہیں ہے کہ ہم اپنے مادر وطن کو آزاد کرائیں؟' ان کے الفاظ نے میرے دل میں آہستگی سے ایک نیا دروازہ کھولنے اور مجھے خود احتسابی کی راہ پر لے جانے کا کام کیا۔

راج پال جی پوری اور شاکھا کے دیگر معمر لوگوں نے ہندوستان میں تحریک آزادی کی توسیع کے بارے میں وضاحت کی کہ مہاتما گاندھی کی قیادت میں کانگریس نے 'عدم تشدد' کا راستہ اپنا لیا تھا اور کیسے نیتا جی سبھاش چندر بوس جیسے انقلابیوں نے اپنی راہ الگ بنالی تھی۔ ان کے رویہ میں کانگریس کے تئیں ناپسندیدگی کے جذبات نہیں تھے، لیکن میں نے کانگریس کی اختیار کردہ حکمت عملی سے نااتفاقی ضرور محسوس کی۔ 'کانگریسی لیڈروں کو یقین ہے کہ برٹش حکومت کو میمورنڈم اور عرضی بھیجنے سے ہندوستان کو آزادی مل جائے گی۔' سنگھ کے معمر لوگ ہم سے کہتے 'ہم نہیں سوچتے کہ انگریز اتنی آسانی سے چلے جائیں گے۔'

میں یہ بھی بتادوں کہ سنگھ کے بزرگ ارکان آزادی حاصل کرنے کی کانگریسی حکمت عملی کی جس طرح مذمت کرتے تھے اس طرح بھگت سنگھ جیسے انقلابیوں کے اختیار کردہ طریق کار سے بھی اتفاق نہیں رکھتے تھے۔ یہ کہتے ہوئے 'اگر کچھ محبان وطن ہاتھ میں بندوق لے کر انگریزوں کا مقابلہ کریں تو بھی انگریز جانے والے نہیں ہیں۔' یقینی طور پر ان دونوں کے انداز فکر کی مذمت کرنے کے باوجود سنگھ کے بزرگ لیڈران مہاتما گاندھی اور شہید بھگت سنگھ دونوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

اب میرے دل میں سوال اٹھا 'کس طرح انگریزوں کو بھارت چھوڑنے پر مجبور کیا جاسکتا ہے؟' سنگھ کے سینئرس سے اس کا کوئی واضح اور

★ تقسیم کے بعد شیام داس جے پور میں رہائش پذیر ہوئے جہاں انھوں نے سنگھ اور بھارتیہ جن سنگھ کے لیے سرگرم طریقہ سے کام کیا۔

سیدھا جواب نہیں ملتا تھا۔'اس وقت تو ہمارا پہلا کام سارے ملک میں اس طرح کی شاکھاؤں کو منظم کرنا ہے تاکہ ہم حب الوطنی، آدرش وادی، منظم اور بے لوث ہندوستانیوں کی سویم سیوی فوج تیار کرسکیں، جو مادرِ وطن کی آزادی کے لیے اپنا سب کچھ نچھاور کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار ہو۔ یہ طاقت ہندوستان کی آزادی حاصل کرنے کے لیے ٹھیک سے کب اور کیا کرے گی، ان سوالوں کا ابھی جواب دینا ضروری نہیں ہے۔ وقت کے ساتھ ہمیں ان سوالوں کے جواب مل جائیں گے۔ ابھی اس وقت ہمیں اتنا یاد رکھنا چاہیے کہ قربانی کے جذبے سے سرشار اور باکردار افراد کی رضا کارانہ فوج اور منظم آبادی کے بغیر کوئی بھی ٹھوس نتائج حاصل نہیں کیے جاسکتے۔' میرے کچے من کے لیے یہ تشریح کافی حد تک اطمینان بخش تھی۔

سنگھ کے معمر لوگوں سے مجھے مسلم لیگ اور پاکستان نام کے ایک علیحدہ مسلم ملک کے قیام کے مقصد سے ہندوستان کو تقسیم کرنے کے اس کے منصوبہ کا بھی پتہ چلا۔ جب دو قومی نظریہ کا فقرہ پہلی مرتبہ میرے کانوں میں پڑا تو مجھے لگا جیسے میں نے برقی تار چھولیا ہو اور مجھے بجلی کا جھٹکا لگا ہو۔ اسی لمحہ مجھے یہ نظریہ قابل نفرت لگا۔ میں اس نظریہ کو قبول کر ہی نہیں سکتا تھا، جس میں بھارت، میرا مادرِ وطن کسی دن ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے اور میرا ہوم لینڈ پاکستان کا ایک حصہ بن جائے۔ میں نے خود سے کہا 'یہ صحیح ہے کہ ہندوستان میں برطانوی سامراج کا خاتمہ ہو لیکن کیا آزادی حاصل کرنے کی قیمت تقسیم ہوگی؟ کتنی بدقسمتی ہے۔' مجھے قبول کرنا چاہیے کہ سنگھ کے تئیں میرا کمٹمنٹ اس وقت گہرا ہو گیا جب مجھے مسلم لیگ کے اس عیارانہ مطالبہ کا پتہ چلا۔

یہاں مجھے کراچی کے وقت کے اپنے تین ساتھی سویم سیوکوں کا ذکر ضرور کرنا چاہیے جنھوں نے زندگی بھر سماج کے لیے بے حد کام کیا۔ جھمٹ مل ٹی وادھوانی، جو بھارتیہ سندھو سبھا کے صدر اور بعد میں بھارتیہ جن سنگھ کے قومی خزانچی بنے۔ مہشو آڈوانی، جنھوں نے بمبئی میں وویکانند ایجوکیشن سوسائٹی قائم کی، مہاراشٹر میں جن سنگھ کے اہم ستون تھے اور بعد میں ریاست کے وزیر مالیات بھی بنے۔ منہر مہتا، جو ملک کی سب سے بڑی مزدور تنظیم بھارتیہ مزدور سنگھ کے صدر رہے۔

حب الوطنی کا ابتدائی اثر

شاکھا میں جانے اور قومی و بین الاقوامی مسائل پر سینئرز سے تبادلہ خیال کرنے کا مجھ پر ایک اور فوری اثر پڑا۔ اس نے کتابوں کے تئیں میری دلچسپی کو ایک نیا جوش، اہمیت اور مقصد فراہم کیا۔ میں نے ہندوستانی تاریخ، خاص طور پر چھترپتی شیواجی، مہارانا پرتاپ اور گرو گوبند سنگھ جیسے عظیم مجاہدین کی تاریخ کی دستیاب کتابوں کا مطالعہ شروع کر دیا۔ ایک بار میں نے مشہور برطانوی مؤرخ ڈینس کنکیڈ کی 'دی گرینڈ ریبل' سمیت شیواجی پر لکھی پانچ کتابیں لگاتار پڑھ ڈالیں۔ شیواجی کی بہادری اور حب الوطنی کے علاوہ اس کتاب کی جس بات نے مجھے متاثر کیا وہ تھا کنکیڈ کے ذریعہ لکھا گیا یہ جملہ کہ 'گرو رام داس کے آشیرواد کے ذریعہ مغلیہ حکومت کے خلاف شیواجی کی طویل جدوجہد کو ایک دھرم یدھ کی شکل دیئے جانے کے باوجود یہ ایک عجیب بات ہے کہ شیواجی نے کس قدر کم مذہبی منافرت یا رواداری کا مظاہرہ کیا۔ کیتھولک پادریوں کے تئیں ان کی فراخ دلی، پرتگالیوں کے ہندوستانی اور مراٹھا علاقوں میں ہندو پجاریوں کے نکالے جانے سے ایک خوش گوار تضاد کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ ان کے دشمنوں نے بھی علماء، مساجد اور قرآن پاک کے تئیں ان کے تعظیمی رویے کا ذکر کیا ہے۔ جب بھی انھیں قرآن دیا جاتا، انھوں نے اسے وہی عقیدت و احترام دیا جو وہ اپنے مذہبی گرنتھوں کو دیتے تھے۔ جب بھی ان کی فوج مسلم خواتین کو گرفتار کرتی تھی، شیواجی اپنے رشتہ داروں کی طرح ان کی دیکھ ریکھ تب تک کرتے تھے جب تک وہ اپنے کنبے میں واپس نہیں جاتی تھیں۔' یہاں یہ قابل ذکر ہے کہ یہ صدی یوروپ، جرمنی، اٹلی اور

آئرلینڈ میں کرام ویل کے کارناموں کی وجہ سے موضوع بحث تھا۔

میں نے بنگال کے عظیم مؤرخ جادوناتھ سرکار، جن کی کتابیں حکومت مغلیہ کے زوال اور اس عظیم مراٹھا حکمراں کے زیر نگیں قومی جذبات کے عروج کی تفصیل پیش کرتی ہیں، کی کتابیں 'اورنگ زیب' اور 'شیواجی' کا بھی مطالعہ کیا۔

میں 1943 میں سنگھ میں شامل ہونے کے ایک سال بعد سنگھ شکشا ورگ (آرگنائزیشن آفیسرز ٹریننگ کیمپ) [OTC] کا پہلا سال مکمل کرنے کے لیے میں اندور گیا تھا۔ واپسی میں کچھ دن راجستھان کا سفر کرنے کے لیے میں نے راستہ تبدیل کرلیا۔ جب سے میں نے کرنل جیمس ٹاڈ کی دو جلدوں میں لکھی انیسویں صدی کی کلاسک کتاب 'اینلس اینڈ اینٹی کویٹیز آف راجستھان' پڑھی تھی، بہادروں اور شہیدوں کی اس سرزمین سے مجھے لگاؤ پیدا ہوگیا تھا۔ چتوڑ گڑھ کا قلعہ اور اودے پور شہر دیکھنے کے لیے میں نے سامان سفر باندھا۔ میں ہلدی گھاٹی بھی گیا، جہاں مہارانا پرتاپ نے ایک تاریخی یا رزمیہ جنگ میں مغل بادشاہ اکبر سے مقابلہ کیا تھا۔ چتوڑ گڑھ کے قلعہ کی دیواروں پر نہ ہی متعصب مسلم حملہ آوروں کے ذریعہ تباہ کی گئی ہندو دیوی دیوتاؤں کی ہزاروں مورتیوں کو دیکھ کر تکلیف دہ احساس ہوا۔ ان میں سے ایک بھی صحیح سلامت نہیں تھی۔

یہ سب تجربے میرے اندر ایک عجیب سی تبدیلی لا رہے تھے۔ ہندوستان نے کیوں اور کیسے اپنی آزادی کھوئی؟ یہ سوال میرے نوخیز ذہن کو مشتعل کرنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی حب الوطنی کے آدرشوں سے بھرا میرا کچا من ہندوستان کو مستقبل میں ایک آزاد ملک کے طور پر دیکھنے کے خواب سجانے لگا۔ جب خوابوں کو آدرش واد اور تاریخ بدل دینے والے مشن سے متعلق نظریوں کے پر لگ جاتے ہیں تو وہ بہت دور اور اونچے اڑنے لگتے ہیں۔ ہندوستان کی تاریخ کی عظیم شخصیتوں کے سبق آموز کارناموں کے بارے میں پڑھ کر مجھے ایسا لگنے لگا جیسے کسی بھی پہاڑ کی چوٹی پر پہنچنا اور زندگی میں کوئی بھی مقصد حاصل کرنا ناممکن نہیں ہے۔ ہندوستان کی آزادی کا حصول آسان لگنے لگا اور نزدیک بھی۔

یقینی طور پر ان افکار میں ایک بچے کی سی معصومیت بھی تھی، جو سامنے کھڑے کاموں کو اتنا آسان بنا دیتا تھا جتنے وہ حقیقت میں نہیں تھے، لیکن یہی معصومیت مشکل کام ہاتھ میں لینے کی ہمت اور طاقت بھی دیتی ہے۔ میرے معاملہ میں اس نے مجھے تنظیم کے تجربہ کار لوگوں کا نزدیکی بنایا جنھوں نے اہم سرگرمیوں میں مجھے شامل کرنا شروع کردیا۔

ایک سویم سیوک کو تنظیم میں کوئی ذمہ داری کا عہدہ دیئے جانے سے قبل اسے افسری تجربہ کاری کی تربیت سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ تربیت سنگھ کے ہیڈ کوارٹر ناگپور میں تیسرے سال کا کورس ختم کرنے کے بعد پوری ہوتی ہے۔ میں نے 1946 میں یہ کیا۔ اس سے قبل میں اپنے دوسرے سال OTC احمد آباد میں کر چکا تھا۔ اس طرح گجرات سے میرا تعلق شروع ہوا جو آج تک جاری ہے۔ ان دنوں سنگھ کے پرانت پرچارک محترم مدھوکر راؤ بھاگوت تھے، جو سنگھ کے موجودہ کارگزار سربراہ محترم موہن راؤ بھاگوت کے والد صاحب تھے۔

میں جب سترہ برس کا تھا تب میں نے ایک ٹیچر کے طور پر کراچی کے ماڈل ہائی اسکول میں زندگی کی پہلی پیشہ ورانہ ملازمت کی تھی۔ میں نے پانچویں اور چھٹی کلاس کے طلبا کو انگلش، تاریخ، حساب اور سائنس پڑھایا۔ ان دنوں ٹیچر بننے کے لیے ڈپلوما یا گریجویشن کی ڈگری ہونی لازمی نہیں تھی، تب میں کافی چھوٹا تھا۔ میرے کئی شاگرد تقریباً ہم عمر تھے۔ جس بات نے مجھے ٹیچر بننے کے لیے راغب کیا وہ سنگھ سے میرا تعلق ہی تھا۔ سنگھ نے مجھے سکھایا تھا کہ طلبا کے دل میں حب الوطنی کا آدرش اتارنا، اعلیٰ کردار فروغ دینا، ان کے علم کی بنیاد کو وسعت دینا اور سماج کی خدمت کے لیے ایک فطری جذبہ فروغ دینا چاہیے۔ ایک سویم سیوک کے طور پر میری خواہش تھی کہ زیادہ سے زیادہ نوجوان 'شاکھا' میں شامل ہوں اور سنگھ سے بہترین سلوک واخلاق حاصل کریں۔ اس سلسلہ میں راج پال پوری کی رہنمائی نے میری بہت مدد کی اور میں ٹیچر بن گیا۔

'لوگوں کو کیسے اپنا دوست بنائیں اور متاثر کریں'

راج پال جی کی جو بات مجھے پسند تھی، وہ تھی نئے نظریات سے شناسائی اور شخصیت کے ارتقا کے لیے مجھ میں نئی خوبیاں پیدا کرنے کے تئیں ان کی خصوصی دلچسپی۔ ایک دن انھوں نے مجھ سے پوچھا 'کیا تمھیں کتابوں کے مطالعہ سے دلچسپی ہے؟' میں نے کہا 'یقینی طور پر۔'

انھوں نے میرے ہاتھ میں ایک کتاب تھمائی اور کہا 'اسے پڑھو۔' وہ کتاب تھی ڈیل کارنیگی کی 'ہاؤ ٹو ون فرینڈس اینڈ انفولینس پیوپل' میں اسے اپنی اب تک کی پڑھی ان پانچ چھ کتابوں میں سے ایک مانتا ہوں، جو زندگی کو یکسر تبدیل کر دیتی ہیں۔ یقینی طور پر اگر اس کتاب کو میں اب پڑھوں تو اس کے بارے میں میری رائے کافی الگ ہوگی اور میں غالبًا اسے ایک نہایت عام کتاب کہوں گا، لیکن اس وقت جب میں صرف ساڑھے چودہ برس کا تھا، اس کتاب نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ زیادہ سننا اور کم بولنا سیکھئے، اپنی رائے کو واضح اور مختصر لفظوں میں بیان کریں، لیکن یہ جانتے ہوئے بھی کہ سامنے والا شخص غلط ہے، بحث میں ایک نکتہ کے بعد دیگر لوگوں کو چیلنج نہ کیجئے۔ یہ اور اسی طرح کے چھوٹے چھوٹے مشورے بہت کارآمد تھے اور ان کی روشنی میں میں نے اپنا کردار اسی کے مطابق ڈھالنا شروع کر دیا تھا۔

مجھے ڈیل کارنیگی کی دی ہوئی وہ مثال خاص طور سے یاد ہے جس میں دو دوستوں کے درمیان چل رہی گفتگو میں ان میں سے ایک اقتباس پیش کرتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ شیکسپیئر کا ہے۔ اس کا دوست کہتا ہے کہ نہیں یہ بائبل سے مستعار ہے۔ تنازع بڑھ جاتا ہے، لیکن کوئی بھی جھکنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ کارنیگی کہتے ہیں 'جب ایک بار آپ نے اپنی بات کہہ دی اور آپ کا دوست اس سے متفق نہیں ہے تو اس بحث کو طول دینے کا کیا فائدہ؟ اس سے آپ کی دوستی میں دراڑ ہی پڑے گی۔ اگر آپ اپنی بات اس سے منوا نہیں سکتے تو بس خاموش رہیے۔ اگر آپ کا دوست آپ کی معلومات کے بارے میں آپ کے ذہن میں شک پیدا کر دیتا ہے تو آپ اس کے حوالہ یا ذریعہ تک جا کر اس کی تصدیق کر سکتے ہیں، لیکن غیر ضروری بحث نہ کریں'۔ اس کتاب کا یہ نظریہ مجھے اب تک یاد ہے۔

''کوئی شخص مجبوری میں کوئی بات قبول کر بھی لے تو اس معاملہ میں اس کی رائے تب بھی وہی رہے گی۔''

کتاب میں سمجھائے گئے 'کیا کرو اور کیا نہ کرو' کا منتر مجھے بہت معنی خیز لگا۔ اس کتاب میں دی گئی ایک مثال مجھے ازبر ہے۔ نیویارک شہر کے 'ٹو گن کراولے' نامی خطرناک ڈاکو کا، اس نے کئی خون کیے تھے اور اپنے دونوں ہاتھوں میں بندوق لے کر لوگوں کو خوف زدہ کرنا اس کا روز کا معمول تھا۔ جب اسے موت کی سزا ہوئی اور وہ پھانسی کے لیے لے جایا جا رہا تھا تو اس نے غصہ میں شکایت کی 'دیکھو، میں نے جو کچھ بھی سماج کے لیے کیا ہے اس کے بدلے میں وہ میرے ساتھ کیا کر رہا ہے؟ یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ اس جیسا ڈاکو بھی یہ سوچتا تھا کہ سماج اس کے ساتھ ناانصافی کر رہا ہے، کارنیگی کہتے ہیں 'انسانی فطرت اپنی غلطیاں قبول کرنے سے تامل کرتی ہے، اس لیے دوسروں کی خامیاں مت نکالو، بس اپنی غلطیاں درست کرو۔'

عوام کے ساتھ میرے رویے اور معاملات پر اس مشورہ کا بہت اثر ہوا۔ بعد میں میری سیاسی و تنظیمی سرگرمیوں پر واضح طور پر یہ اثر نظر آنے لگا۔ کبھی کبھی میرے نزدیکی دوست بھی، کچھ خاموشی کے ساتھ ہم سے پوچھتے ہیں 'آڈوانی جی! آپ جب یہ جانتے ہیں کہ پارٹی کے کسی شخص کا رول مشتبہ ہے، آپ اس کی سرزنش کیوں نہیں کرتے، تاکہ وہ اپنی حد سے باہر نہ جا سکے اور خود کو سدھار لے، اس پر بھی زور نہیں دیتے۔ ایسا کیوں؟' میرا جواب ہمیشہ یہی ہوتا تھا 'انسان جس ڈھنگ سے زندگی گزارتا ہے، اسے وہ کسی کی صلاح سننے کے بعد بدل نہیں لیتا۔ اپنے میں

تبدیلی کی ضرورت انھیں خود محسوس کرنی چاہیے۔'

لوگوں کی نکتہ چینی کرنے کے بجائے ہمیں انھیں سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ہمیں یہ جاننے کی کوشش کرنی چاہیے کہ جو وہ کرتے ہیں، کیوں کرتے ہیں۔ یہ مذمت کرنے کے مقابلہ میں زیادہ مفید ثابت ہوگی اور اس سے جذبات، استقلال اور فراخ دلی میں اضافہ ہوتا ہے۔ سب کو جاننے کے لیے سب کو معاف کرو۔ ایشور خود کسی شخص کے آخری وقت تک اسے پرکھنے کے لیے بے صبر نہیں ہوتا، پھر ہم اور آپ کیوں ہوں؟

ایک دوسری کتاب، جس نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا، وہ تھا پال برنٹن کا مشہور سفرنامہ 'اے سرچ ان سیکرٹ انڈیا' برطانوی مصنف برنٹن (1981-1898) بیسویں صدی میں مشرق کی روحانی روایت کے اولین تلاش کار تھے۔ یہ کتاب دورۂ ہند کے دوران جوگیوں، رشی منیوں اور مذہبی گروؤں کے ساتھ ان کے تجربات کا دلکش بیان پیش کرتی ہے۔ ساتھ ہی کیسے انھیں بالآخر تمل ناڈو کے ارونا چلا میں مشہور سنت شری رمن مہارشی (1950-1879) کے قدموں میں 'میں کون ہوں' جیسے مشکل سوال کا جواب ملا۔ جس نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا، وہ تھا برنٹن کے ذریعہ شری رمن کی خاموشی کی تحیر خیز طاقت کا بیان، ان کے مریدان کی پاک موجودگی سے ہی ولولہ خیز ہو جاتے تھے، حالانکہ اس کتاب میں بیان کردہ ان کے صوفیانہ تجربات کو نہیں سمجھ پایا۔ مگر انھوں نے میرے نوجوان دل کو ہندوستانی ورثہ کی نئی جہتوں سے متعارف کرایا۔

شری راج پال پوری نے اس وقت ایک اور کتاب سے میری شناسائی کرائی، جس نے مجھے سب سے زیادہ متحرک کیا، وہ تھی ونائک دامودر ساورکر کی کتاب '1857 - دی وار آف انڈیپنڈنس'۔ وہ برطانوی حکومت کے ذریعہ ممنوعہ تھی اور اسی لیے دستیاب نہیں تھی، لیکن مجھے کہا گیا تھا کہ میں اسے ایک شخص سے حاصل کر سکتا ہوں جو ممنوعہ ادب فروخت کرتا ہے۔ میں نے اپنے جیب خرچ سے بچائی گئی اٹھائیس روپے کی رقم سے وہ کتاب خریدی، جو اس وقت ایک بڑی رقم تھی۔

کتاب ★ برطانوی حکومت کے خلاف ہندوستان کی پہلی قومی بغاوت کی سبق آموز داستان پیش کرتی ہے۔ اس سے مجھے اپنی زندگی کو ملک و قوم کے کاز کے لیے وقف کرنے کے جذبہ کو تقویت ملی۔ ساورکر لکھتے ہیں کہ وہ بھی کیا دن تھے جب ہندوؤں اور مسلمانوں کا مشترکہ اعلامیہ تھا کہ ہندوستان ان کا اپنا ملک ہے اور وہ سب بھائی بھائی ہیں۔ اس وقت ہندو اور مسلمان ایک ساتھ دہلی میں قومی آزادی کا پرچم اٹھاتے تھے۔ وہ عظیم دن ہندوستان کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیں گے۔ اگر وہ رانی لکشمی بائی، نانا صاحب پیشوا اور تاتیا ٹوپے کی بہادری اور شجاعت کی تعریف کرتے تھے تو مولوی احمد شاہ اور عظیم اللہ خاں کے کردار کو بھی ترجیحات کے ساتھ پیش کرتے تھے۔ یہ انتہائی افسوس ناک ہے کہ ساورکر جیسی عظیم

★ جب ہندوستان پہلی جنگ آزادی کی 150 ویں سال گرہ منا رہا تھا تب میرا 10 مئی 2007 کو 'انڈین ایکسپریس' میں ایک مضمون شائع ہوا۔ ساورکر کی کتاب کو دھیان میں رکھتے ہوئے میں نے لکھا کہ کتاب کے مسودہ کے سفر کی کہانی ہندوستان سے انگلینڈ، فرانس، جرمنی، ہالینڈ اور واپسی اور اس کی اشاعت کے بعد انقلابیوں کو سرگرم کرنے میں کتاب کا کردار اتنا ہی دلچسپ تھا جتنا کہ 1857 میں لڑی گئی کوئی بھی لڑائی۔ ساورکر نے اسے لندن میں لکھا جہاں وہ وکالت پڑھنے گئے تھے، لیکن صرف 25 سال کی عمر میں ہی وہ انقلابی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگے۔ اس کا اوریجنل متن مراٹھی میں 1907 میں 1857 کی پچاسویں سال گرہ کے موقع پر مکمل ہو چکا تھا اور اسے خفیہ طور پر ہندوستان بھیج دیا گیا تھا، لیکن ہندوستان میں اس کی اشاعت نہیں ہو سکی، کیونکہ جن برطانوی افسروں کو اس کی جانکاری ملی، انھوں نے پرنٹنگ پریس پر چھاپہ مارا۔ معجزاتی طور پر مسودہ کو بچا لیا گیا اور اسے واپس ساورکر کے پاس پیرس بھیج دیا گیا۔ ان کے ساتھی انقلابیوں نے اس کا ترجمہ انگریزی میں کیا، لیکن انگلینڈ یا فرانس میں کوئی بھی اس کی اشاعت کے لیے تیار نہیں تھا۔ آخر کار 1909 میں اس کی اشاعت ہالینڈ میں ہوئی اور اس کی کاپیاں اسمگلنگ کے ذریعہ ہندوستان لائی گئیں، لیکن مصنف کو 1910 میں لندن میں گرفتار کر لیا گیا۔ (جاری)

انقلابی شخصیت اور تحریک آزادی کے مردِ مجاہد کے خلاف ہمارے نظریاتی مدمقابل کانگریس اور کمیونسٹوں نے ایک نفرت آمیز مہم چھیڑ رکھی ہے۔

حالانکہ میری ملاقات ساورکر (1966-1883) سے ایک مرتبہ نومبر 1947 میں کراچی سے ہجرت کے فوراً بعد ہوئی۔ میں دو روزہ دورہ پر ممبئی میں تھا۔ میرے میزبان نے مجھ سے پوچھا کہ میں کون سا تاریخی و قابل دید جگہ دیکھنا پسند کروں گا۔ میں نے کہا' مجھے ویر ساورکر کے گھر لے چلو... جب میں شیواجی پارک میں واقع ان کی رہائش گاہ پر ان کی پرکشش موجودگی میں حیران کن بیٹھا تھا، انھوں نے تقسیم کے بعد سندھ اور ہندوؤں کے حالات کے بارے میں مجھ سے سوالات کیے۔

ساورکر کے پوچھے گئے سوالات سے سرشار کراچی کے دوستوں میں سے ایک گہرے دوست کی افسوسناک یاد میرے ذہن میں سرایت کرگئی۔ وہ ہیرا سنگھ میرا کلاس فیلو تھا، ایک سکھ جو کراچی میں میرے گھر کے نزدیک ہی رہتا تھا، وہ 'شاکھا' میں زیادہ وقت دینے والے سویم سیوکوں میں سے ایک تھا۔ تقسیم سے قبل تیزی سے منتشر ہو رہے حالات میں جب شہر میں فرقہ وارانہ فسادات شروع ہوئے تو اس کے کنبہ کو بھاری قیمت چکانی پڑی۔ اپنے بال کٹوا کر اور داڑھی منڈوا کر ہی وہ اپنی جان بچاسکا۔ اس واقعہ سے اسے اتنا صدمہ پہنچا کہ وہ طویل عرصہ تک نفسیاتی ہیجان کا شکار رہا۔ میں اس سے کئی مرتبہ بمبئی میں ملا مگر اب بھی ابتلا و اذیت کے داغ اس کے دل پر تھے۔

سوامی رنگناتھ آنند کے پاک قدموں میں

کراچی میں اپنی زندگی کے آخری تین برسوں میں ایک اور تبدیلی میری زندگی میں وقوع پذیر ہوئی۔ 'بھگوت گیتا' پر سوامی رنگناتھ آنند کے پروچن سننے کے لئے میں ہر اتوار کی شام کو رام کرشن مشن جانے لگا۔ میں سوامی جی کی شخصیت سے جتنا متاثر تھا، اتنا ہی متاثر ان کے مہابھارت کی جنگ کے میدان میں، واضح اور مؤثر زبان میں، بہادر ارجن سے بھگوان کرشن کے کارآمد نظریاتی بیان سے تھا۔

سوامی جی اس وقت کراچی میں جہاں پر انھوں نے 6 سال تک رام کرشن پرم ہنس اور ان کے شاگرد و مرید سوامی وویکانند کی تعلیم کی تشہیر کی، رام کرشن مشن کے سربراہ تھے۔ وہ کئی برس تک نواحی برما (اب میانمار) میں واقع رام کرشن مشن کی خدمت کرنے کے بعد کراچی آئے تھے۔ وہ کیرل کے رہنے والے تھے۔ سوامی جی، جنھوں نے بہت چھوٹی سی عمر سے ہی سچائی کی جستجو اور انسانی خدمت کا راستہ اختیار کرلیا تھا، نہایت سادہ لوح اور ملنسار شخص تھے۔ کچھ ہی دنوں میں انھیں مجھ سے گہری رغبت ہوگئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان کے مقصد، موقف اور دانش مندی سے مزین عظیم

(گزشتہ) ان پر غداری کا الزام لگایا گیا اور ہندوستان لا کر دو عمر قید کی سزا سنائی گئی اور انھیں 'کالا پانی' بھیج دیا گیا، جو جزائر انڈمان نکوبار میں نہایت ہیبت ناک سیلولر جیل ہے۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں انگریزوں نے 1857 کی بغاوت میں حصہ لینے والے ہزاروں محبان وطن کو منتقل کیا تھا۔ ساورکر نے تقریباً 11 سال اکیلے اس ایک کال کوٹھری میں گزارے جہاں پر قیدیوں کو عموماً پھانسی کے تختے پر چڑھایا جاتا تھا۔ پابندی کے باوجود کتاب کے کئی ایڈیشن منظر عام پر آتے گئے۔ میڈم بھیکا جی کاما نے یورپ میں اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کرایا۔ انقلابی غدر پارٹی کے لیڈر لالہ ہردیال نے امریکہ میں اس کا ایڈیشن شائع کرایا۔ نیتاجی سبھاش چندر بوس اور راس بہاری بھاس نے اسے 1944 میں جاپان میں شائع کرایا اور یہ انڈین نیشنل آرمی کے سپاہیوں کے لیے تقریباً ایک نصابی کتاب بن گئی تھی، لہٰذا یہ ایک معمولی مؤرخ کی ایسی کتاب نہیں تھی جو ہر طرح کے آرام، تحفظ اور علمی تعاون کے ڈھانچہ کی مدد سے لکھی جاتی ہے۔ یہ کتاب ایک ایسے انقلابی کی تحریر کردہ تھی جس نے اپنی سرگرمیوں کے لیے ناقابل تصور تکالیف سہیں اور اس کے بدلے انھوں نے ہندوستان کی آزادی کے اپنے ہدف کے لیے بے شمار دیگر انقلابیوں کو متاثر اور متحرک کیا۔

شخصیت سے میں ان کی جانب کھنچتا چلا گیا۔

شروع میں گیتا پروچن کے سامعین کی تعداد تقریباً 50 سے 100 کے درمیان تھی، لیکن اس تعداد میں ہفتہ در ہفتہ اضافہ ہوتا گیا اور ان کی تعداد 1000 تک پہنچ گئی، چونکہ آشرم مسلم بستی میں واقع تھا۔ کچھ مسلمانوں، عیسائیوں اور پارسیوں، جن میں جمشید جی نوشیروان جی مہتا، جو کراچی کے سابق میئر تھے، نے بھی حصہ لینا شروع کر دیا۔ آشرم سماجی خدمت کا ایک ایسا مقام بن گیا جہاں لوگ خود بخود سماج کی خدمت کے لیے اپنی پیشکش کرنے لگے۔ میں بھی ان میں سے ایک تھا۔ مجھے 1943 میں بنگال کی قحط سالی کی یاد آگئی، جس میں لاکھوں لوگوں کی جانیں انگریزوں کی جنگی پالیسی کے تحت تلف ہوگئیں۔ سوامی جی نے ایک اپیل جاری کر کے قحط سالی سے متاثر لوگوں کے لیے خوراک و دیگر راحت رسانی کا انتظام کیا۔ اس کا بہترین اثر ہوا اور جلد ہی تقریباً 5 لاکھ روپے جمع ہو گئے۔ سوامی جی نے ان روپیوں سے چاول کی خریداری کی اور سندھ کی حکومت سے مؤدبانہ اپیل کی کہ انھیں اسٹیمر سے بذریعہ سری لنکا بنگال جانے کی اجازت دی جائے۔ ایک افسر نے انہیں بتایا کہ آپ کو انتظار کرنا ہوگا، مسلم لیگ بھی اس مقصد سے ایکسپورٹ کوٹہ چاہتی ہے۔ ہم ان کا کوٹہ ختم ہونے کے بعد آپ کو کوٹہ دیں گے۔ کچھ ہفتہ بعد افسر نے سوامی جی کو بتایا کہ مسلم لیگ نے صرف 6 ٹن چاول بھیجا ہے، باقی کوٹہ آپ کا ہے۔ آشرم نے 1240 ٹن چاول بھیجا۔

سوامی جی کئی معزز ہستیوں کو آشرم کا دورہ کرنے کی دعوت دیتے تھے۔ مجھے عظیم مفکر ڈاکٹر ایس رادھا کرشنن ★ کا ایک یادگاری دورہ یاد آتا ہے۔ وہ اکتوبر 1945 میں بنارس ہندو یونیورسٹی (بی ایچ یو) کے وائس چانسلر تھے۔ انھوں نے دو لیکچرس دیئے، ایک آشرم میں اور دوسرا ڈی جے سنگھ کالج میں۔ دونوں میں ہی بڑی تعداد میں لوگ جمع ہوئے۔ ڈاکٹر رادھا کرشنن نے سوامی جی سے اپیل کی کہ وہ بی ایچ یو کے لیے کچھ چندہ جمع کریں۔ کراچی کے باشندوں نے انھیں 50 ہزار روپے دیئے، جو ان دنوں بہت بڑی رقم تھی۔

میں نے ستمبر 1947 میں کراچی چھوڑ دیا تھا، جبکہ سوامی جی مزید کچھ وقت اور مقیم رہے۔ جب اس شہر میں رام کرشن مشن کی سرگرمیاں چلانا ناممکن ہوگیا، دل پر پتھر رکھ کر انھوں نے مشن بند کر دیا اور 1948 کی ابتدا میں کراچی چھوڑ دیا۔ ان سے میرا تعلق 98 سال کی عمر میں فروری 2005 میں تقریباً ان کے انتقال تک جاری رہا۔ 60 کی دہائی میں جب وہ دہلی میں رام کرشن مشن کے سربراہ تھے اور اس عرصہ میں بھی، جب اس کے بعد طویل مدت تک وہ حیدرآباد میں مشن کے سربراہ رہے، میں ان سے عموماً ملتا رہا۔ ان سے میری آخری ملاقات 2003 میں ہوئی تھی، جب میں کسی تقریب میں حصہ لینے کے لیے کولکاتہ گیا تھا اور سوامی جی رام کرشن مشن کے آل انڈیا صدر بننے کے بعد شہر میں مشن کے ہیڈ کوارٹر بیلور مٹھ میں رہ رہے تھے۔

اس آخری ملاقات میں ہماری بات چیت کا مرکز کراچی میں گزارے وقت، تقسیم سے پیدا ہوئے دردناک واقعات اور محمد علی جناح کا کردار رہا۔ سوامی جی نے خصوصی طور پر میرا دھیان 11 راگست 1947 کو پاکستان کی کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی میں جناح کی تاریخی تقریر کی جانب مبذول کرایا اور کہا کہ 'سیکولرازم' کے مطلب کی صحیح وضاحت اس تقریر میں پائی جا سکتی ہے۔ مئی- جون 2005 میں جب میں پاکستان گیا تھا تب جناح پر کیے گئے میرے تبصرہ کے پیچھے میرے ذہن میں سوامی جی کے ساتھ ہوئی آخری بات چیت کا اثر رہا۔

★ ڈاکٹر سروپلی رادھا کرشنن (1975-1888) بین الاقوامی شہرت یافتہ ہندوستان کے بیسویں صدی کے ایک عظیم مفکر اور ماہر تعلیم تھے۔ وہ ہندوستان کے پہلے نائب صدر جمہوریہ (62-1952) اور ہندوستان کے صدر جمہوریہ (67-1962) تھے۔

سوامی رنگناتھ آنند ہمارے دور میں ہندوستانی سماج کو روشن کرنے والے سب سے زیادہ چمکنے والے ستاروں میں سے ایک تھے۔ وہ ایک عظیم روح تھے اور ایک ایسے شخص جس نے اپنی زندگی کی شروعات رام کرشن مٹھ میں ایک رسوئی اور برتن دھونے والے کے طور پر کی۔ ترقی کرتے ہوئے رام کرشن اور وویکانند کی تعلیمات کا ہندوستان اور بیرون ممالک میں تشہیر کرنے والے سب سے زیادہ بااحترام شخصیات میں سے ایک بنے۔ وہ ایک روایتی روحانی پیغامبر نہیں تھے۔ وہ فرد کی خودی کی تلاش میں جھکاؤ نہیں رکھتے تھے۔ ان کا آدرش قول تھا 'الہامی جوش کو انسانی محبت میں بدلنا' ان کا تا حیات مشن تھا 'دنیا کو یہ بتانا کہ ان کے سامنے آنے والی رکاوٹوں کے پہاڑ اور چنوتیوں کا سامنا صرف انسانی معاملوں میں بنیادی روحانی بالیدگی سے کیا جا سکتا ہے۔'

سوامی جی بولنے اور لکھنے دونوں میں مشاق تھے۔ اس سادھو نے ہندوستان اور دنیا بھر کے شہروں میں ہزاروں لکچرز دیئے۔ ایک روحانی پیشوا جو مکمل طور پر مادی دنیا سے بیگانہ تھا۔ ان کی تقاریر اور تصانیف میں مختلف موضوعات، جن میں ٹیچروں، منتظمین، سائنس دانوں اور تاجروں کو قوم کی تعمیر میں کیا کردار نبھانا چاہیے، یہ سب شامل تھا۔ انھوں نے مختلف النوع پس منظر والے سیاسی وسماجی لیڈروں سے بھی مناظرہ کیا اور ان سبھی پر مثبت اثر چھوڑا۔ ان کے ذریعہ چار جلدوں میں لکھی گئی کتاب 'ایٹرنل ویلیوز فار اے چیلینجنگ سوسائٹی' میں انھوں نے تمام مذاہب کی تعلیمات کا ذکر کیا ہے۔

میں نے حال ہی میں سوامی جی کی 'بھگوت گیتا' پر چار باب پر مشتمل ایک مختصر کتابچہ کا مطالعہ کیا۔ 'دی چارم اینڈ پاور آف دی گیتا' نامی کتاب میں انھوں نے سوامی وویکانند کے ذریعہ دیئے گئے بیان، انسانی تعمیر اور قومی تعمیر کے لیے گیتا کے تئیں نئے نظریات اور روایتی نظریہ کے درمیان کے فرق بتانے کے لیے ایک مثال پیش کی ہے۔ سوامی جی نے لکھا ہے کہ ماضی میں بیشتر لوگ گیتا کو ایک مقدس کتاب کے طور پر اور دل کی تسلی کے لیے پڑھتے تھے، لیکن ہم نے اس کتاب کی اخلاقی گہرائی کو کبھی محسوس نہیں کیا۔ ہم نے گیتا کی تعلیم کی اخلاقی گہرائی کے استعمال کو کبھی نہیں سمجھا۔ اگر ہم نے ایسا کیا ہوتا تو ہمیں ہزاروں برسوں تک بیرونی حملے، داخلی وذاتی جدوجہد، جاگیردارانہ ظلم اور غریبی کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ ہم نے گیتا کو کبھی سنجیدگی سے نہیں لیا، لیکن اب ہمیں ایسا کرنا پڑے گا۔ ہمیں ایسی فلاسفی کی ضرورت ہے جو ہمیں ایک نئی فلاحی برادری کی تعمیر و تشکیل میں مدد دے سکے، جو انسانی عظمت، آزادی اور اتحاد پر مبنی ہو۔ گیتا کی یہ اہمیت، یہ اخلاقی اہمیت، پہلی مرتبہ موجودہ وجدید دور میں سوامی وویکانند نے فراہم کی۔

ستمبر 2007 میں مجھے کیرل کے ترچور ضلع کے پرناٹ نکارا میں واقع رام کرشن مٹھ، جو کہ ان کی جائے پیدائش سے زیادہ دور نہیں تھا، میں سوامی رنگناتھ آنند کی 'سوانح حیات' کی رسم رونمائی کرنے کے لیے مدعو کیا گیا۔ اس 'سوانح حیات' میں میں نے ڈاکٹر ٹی آئی رادھا کرشنن کے ذریعہ تحریر کردہ ایک مضمون پڑھا۔ وہ سوامی جی کے دیرینہ ساتھی تھے۔ اس میں ان سے متعلق ایک دلچسپ واقعہ درج تھا۔ ایک مرتبہ سوامی جی جب کراچی میں اسلام اور پیغمبر محمدؐ پر لکچر دے رہے تھے، تب ایک شخص ہال میں آیا اور آخری قطار میں دراز ہو گیا۔ وہ محمد علی جناح تھے۔ اس لکچر کے بعد مسٹر جناح تیزی سے اسٹیج کی جانب آئے اور کہا 'سوامی جی اب تک میرا ماننا تھا کہ میں ایک سچا مسلمان ہوں۔ آپ کی تقریر سننے کے بعد میں نے سمجھا کہ میں ایسا نہیں ہوں، لیکن آپ کے آشیرواد سے میں ایک سچا مسلمان بننے کی کوشش کروں گا۔' اس مضمون کے مصنف نے کہا کہ سوامی جی کو ایسا ہی تجربہ اس وقت بھی ہوا جب وہ 'دی کرائسٹ ایڈور' پر خطبہ دے رہے تھے۔

سندھ سے رخصتی

میں نہیں جانتا کہ جناح اپنے عقیدہ اور آیام میں کتنے سچے مسلمان تھے، لیکن تاریخ گواہ ہے کہ انگریزوں کے بعد فرقہ وارانہ بنیاد پر ہندوستان کی تقسیم کرنے والے کلیدی مصور وہی تھے۔ 1940 میں انھوں نے اعلان کیا تھا کہ ہندو اور مسلم دو علیحدہ قوم ہیں جو ایک ساتھ نہیں رہ سکتے۔ ساتھ ہی اس بات کے کافی ثبوت ہیں کہ ایک مرتبہ پاکستان کی تشکیل کے بعد ان کے اپنے ہی کام پر ان کا پورا کنٹرول نہیں رہا۔ ڈاکٹر اجیت جاوید کے مطابق، جنھوں نے جناح پر گہرائی سے ریسرچ کے بعد ایک اہم کتاب لکھی ہے 'وہ ایک بیمار اور اداس انسان تھے۔ انھوں نے درد سے کراہتے ہوئے کہا تھا کہ میں نے پاکستان کی تشکیل کر کے بہت بڑی بھول کی ہے۔ میں دہلی جا کر نہرو سے کہنا چاہتا ہوں کہ وہ ماضی کی ساری دشمنی کو بالائے طاق رکھ کر پھر سے دوست بن جائیں۔ انھوں نے لیاقت علی خاں سے بھی نفرت کرنی شروع کر دی تھی، جس کی اپیل اور پشت پناہی پر وہ 1937 میں انگلینڈ سے ہندوستان واپس آنے اور مسلم لیگ کی قیادت سنبھالنے پر راضی ہوئے تھے۔

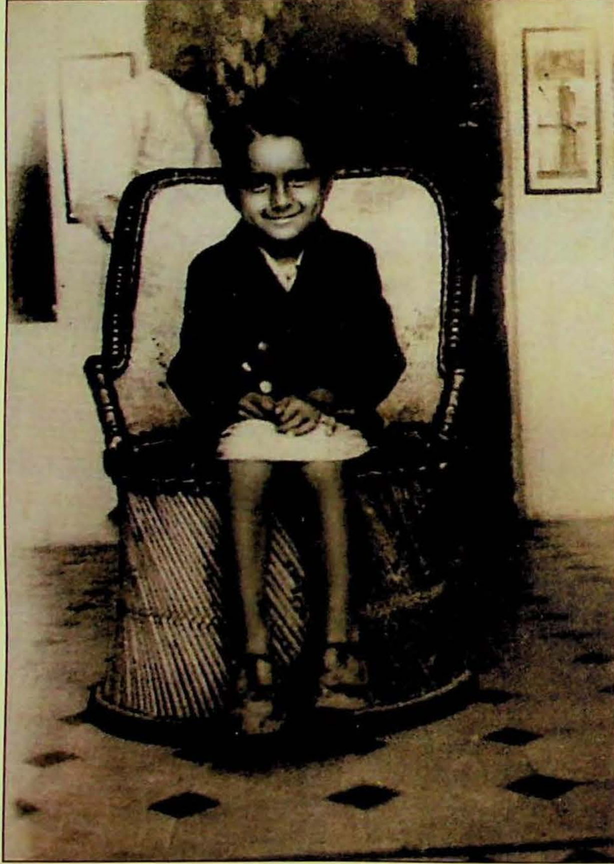
ایم ایس ایم شرما جو تقسیم کے وقت کراچی کے 'ڈیلی گزٹ' کے ایڈیٹر اور جناح کے نہایت قریبی تھے، نے جناح کی زندگی کے آخری ایام کے مختلف پوشیدہ واقعات کا انکشاف کیا۔ ان میں بتایا گیا ہے کہ بگڑتی صحت کے ساتھ یہ ایک نہایت ناامید شخص کی شبیہ پیش کرتا ہے، جو داخلی انتشار میں مبتلا تھے۔ وہ ہندو-مسلم اتحاد کے اپنے پرانے کردار میں لوٹنا چاہتے تھے۔ انھوں نے تجویز پیش کی تھی کہ وہ پاکستان میں اقلیتوں کے حمایتی کے طور پر کام کرنا چاہتے ہیں، جو وہ برسوں سے ہندوستان میں اقلیتوں کے لیے کر رہے تھے، یہاں تک کہ انھوں نے شرما کو بتایا 'میرے پیارے دوست، اب میں خود کو پاکستان میں ہندوؤں کا محافظ بنانا چاہتا ہوں۔' مختلف مصنفوں کے مطابق جب انھوں نے کراچی میں ایک ہندو کیمپ کا دورہ کیا تب ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

جیسا کہ میں نے پہلے باب میں ذکر کیا ہے، نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ پاکستان میں حالات بالکل مختلف تھے۔ پاکستان کی تشکیل کے بعد جناح کے کچھ بھی کہنے یا کرنے سے کراچی اور سندھ کے دیگر حصوں میں رہ رہے ہندوؤں میں بڑھتے خوف اور دہشت میں کوئی کمی نہیں آئی، لہٰذا سندھ میں میرے آخری دن بدامنی اور بے چینی سے بھرے تھے۔ سنگھ کے ذریعہ 5 راگست کو کراچی میں منعقد عظیم ریلی، جسے شری گروجی نے خطاب کیا تھا، بے شک حوصلہ افزا تھی، لیکن یہ تقسیم کے سبب پیدا شدہ نفرت اور فرقہ وارانہ تشدد کو نہیں روک سکی۔

تقریباً اسی دوران ایک غیر متوقع واقعہ ہوا، جس نے سندھ میں میرے دنوں کا خاتمہ کر دیا۔ 9 رستمبر 1947 کو کراچی کے مضافات شکار پور کالونی میں بم دھماکہ ہوا۔ اس دھماکہ کے تحت سنگھ کے سنگھ چالک کھان چند گوپال داس اور سنگھ کے دیگر اہم انیس سویم سیوکوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ راج پال جی سنگھ کے علاقائی تشہیر کاروں کی قومی میٹنگ میں شرکت کے لئے دہلی گئے ہوئے تھے۔

مجھے دھماکہ کے بارے میں کوئی جانکاری نہیں تھی، پھر بھی چونکہ مقامی پریس نے سنگھ کے خلاف سنگین الزام لگانے شروع کر دیئے تھے، میرے ساتھیوں نے مجھے کراچی چھوڑنے کی صلاح دی۔ اس کے مطابق میں 12 رستمبر کو طیارہ سے دہلی کے لیے روانہ ہوا۔ میرے ساتھ ایک سویم سیوک مرلی دھر بھی تھے۔ میں ایک برٹش اوورسیز ایئر ویز کارپوریشن (بی او اے سی) کے پروپیلر ایئر کرافٹ میں سوار ہوا۔ ہوائی جہاز سے یہ میرا پہلا سفر تھا اور یہ اس بات سے اور بھی یادگار تھا کہ میں پاکستان سے ایک شرنارتھی کے طور پر سفر کر رہا تھا، لاکھوں دیگر لوگوں کی طرح سر چھپانے کی چاہت اور منقسم بھارت میں ایک نئی شروعات کرنے کے لیے۔

سندھ میں زندگی



▲ پانچ سال کی عمر میں، کراچی کے اپنے آبائی مکان لال کاٹیج میں ''لال''۔





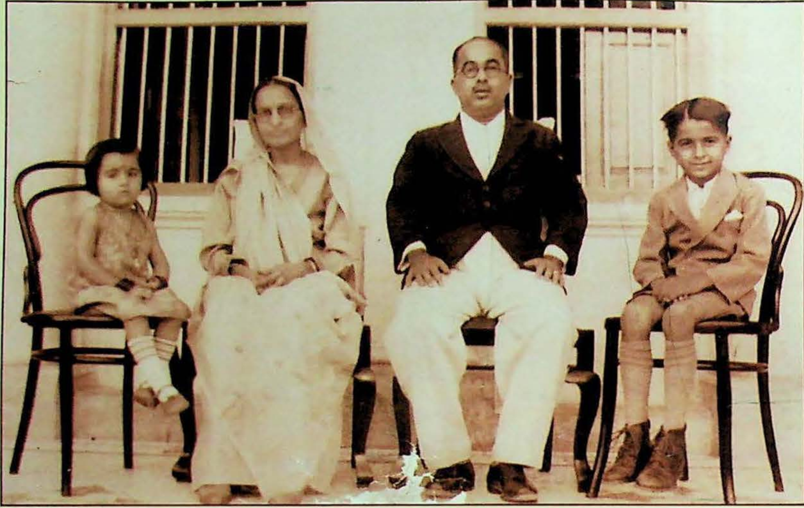




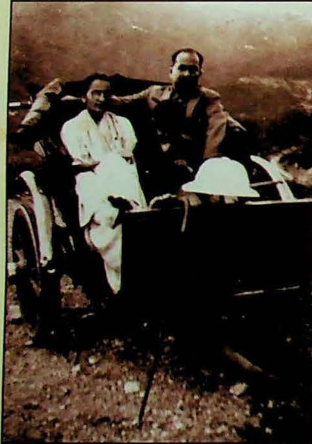
▲ اپنی چھوٹی بہن شیلا کے ساتھ

(دائیں اوپر سے نیچے) کراچی میں آر ایس ایس کے نوجوان پرچارک آڈوانی

اہلیہ کملا کی والدہ گنگا دیوی اور والد پریم چند جگت یانی



▲ والدہ گیانی دیوی، والد کشن چند اور چھوٹی بہن کے ساتھ لال۔



▲ اپنے والدین کے ساتھ



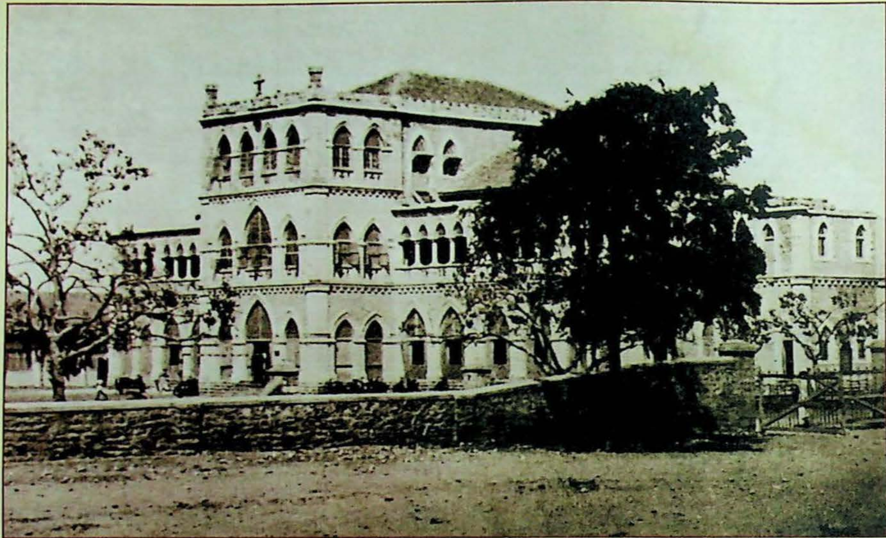
◀ بہن شیلا کے ساتھ طالب علم لال کرشن



◀ والد کشن چند کے ساتھ بہن شیلا

▼ 2005ء میں کراچی میں قیام کے دوران پورا کنبہ لال کاٹیج میں 'لال' کے بچپن کے پلنگ پر بیٹھے ہوئے۔ (بائیں سے) اہلیہ کملا، بیٹی پرتیبھا، بیٹا جینت اور بہو گیتکا کے ساتھ لال کرشن آڈوانی۔





▲ کراچی کے سینٹ پیٹریکس اسکول کی عمارت۔

School's Register

General Register of Pupils Attending St. Patrick's High School, Karachi 1936

No. / Name	Race & Religion	Place of Birth	Date of Birth according to the Christian era. (Day Mth. Year)	Father's Name	Last School Attended	ADDRESS	Date of Admission	Class and Division into which admitted	Progress	Conduct	Date of Leaving
	...ian	Karachi	18 1 30		St Joseph Convent ~~St. Patrick's~~		28 10 36	Infants			31-3=
656 Ross Joseph	Anglo Indian	Karachi	15-12-'27				28-10-'36	I			31-3
657 D'Souza Sylvester Rafael	Goan	do	20-6-'2[illegible]				11-5-'36	I			31 3
658 Jikandas Sundar M	Hindu	do	26 10 27				12-5-'36	II			31-3
659 Advani Lal Kishinchand	do	do	8-11-'27				12-5-'36	III			
660 Mukerji Budhanath	do	Bengal	10-1-'28				3-11-'36	I			15-6
661 D'Cruz Ronald	Anglo Indian	Sukkur	24-8-30				3-11-'36	Junior			31-

Photos By SI Imran I/C Madadgar 15 Hyd

▲ درجہ سوئم کا اسکول رجسٹر جس میں آڈوانی کا نام درج ہے۔



▲ اسکول کی کرکٹ ٹیم کے ارکان، لال پہلی صف میں بالکل بائیں۔



► 1978ء میں بطور مرکزی وزیر اطلاعات ونشریات کراچی دورے کے دوران اپنے اسکول کے پرنسپل فادر موڈیسٹین (درمیان میں) اور دیگر اساتذہ کے ساتھ لال کرشن آڈوانی۔



► 2005 میں پاکستان کے دورے پر آئے ہوئے سینٹ پیٹرکس اسکول کراچی میں آڈوانی خاندان۔



▲ تمدن سندھ کی علامت آساں جوابانو ورسو (ہمارے آباءواجداد کی وراثت)



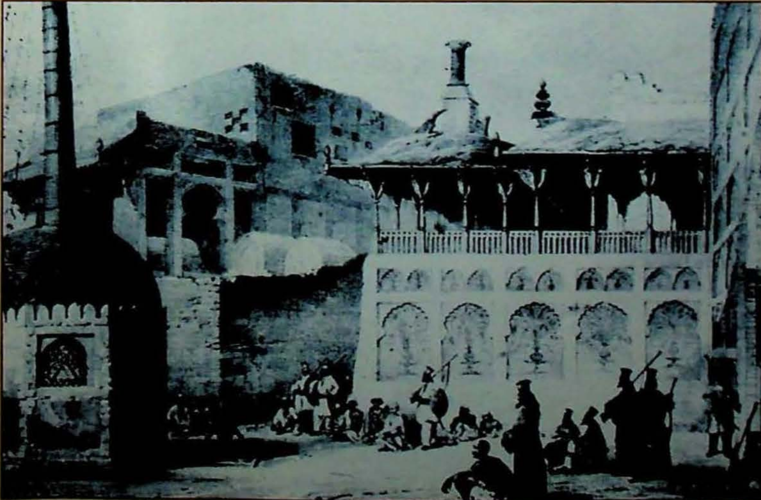
▲ سندھ کے آخری ہندو حکمراں راجہ داہر۔

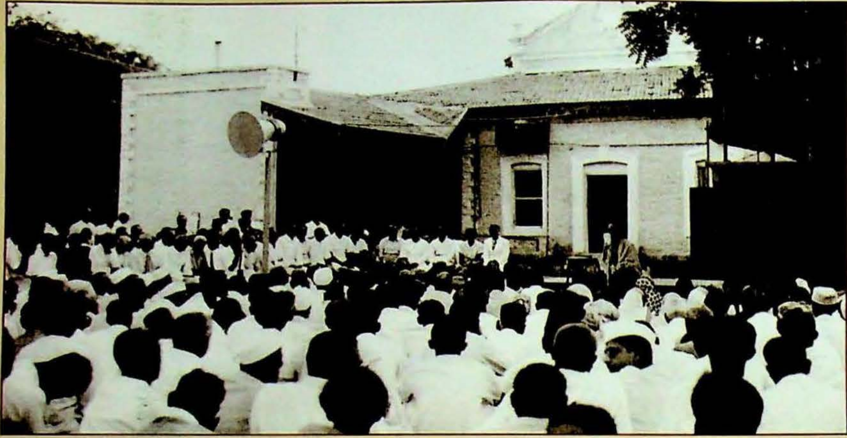


▲ سندھی قوم کے مقدس گرو جھولے لال۔

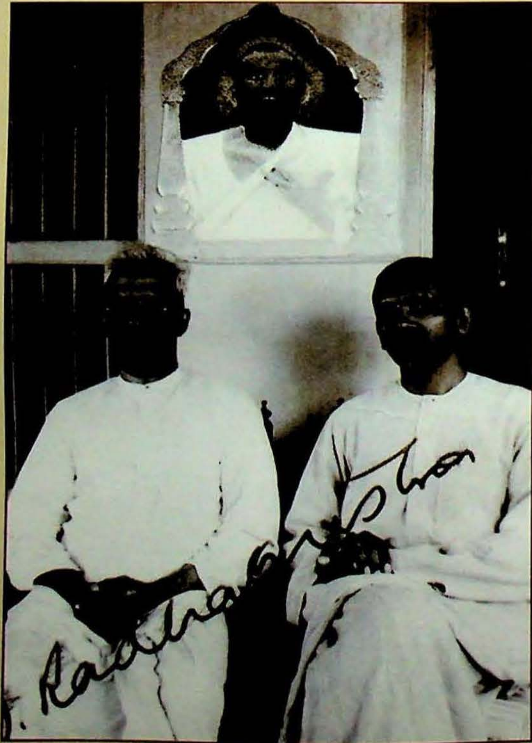


سندھ میں ہندو مسلم روحانی اتحاد کی علامت۔
شاہ عبداللطیف کی درگاہ (نیچے) سہوان اور
لال شہباز قلندر کے مقبرے کا داخلی دروازہ۔





▲ کراچی کا رام کرشن مشن جہاں نوجوان آڈوانی ہر اتوار کو سوامی رنگناتھ آنند کا شریمد گیتا پران کے ارشادات سننے آتے تھے۔

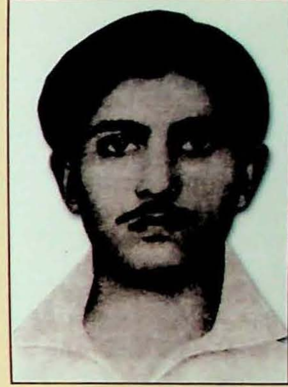


▶ ہندوستان کے سابق صدر ڈاکٹر سروپلّی رادھا کرشنن رام کرشنن مشن کی کراچی شاخ کے سربراہ ونگناتھ آنند تھانند کے ساتھ۔

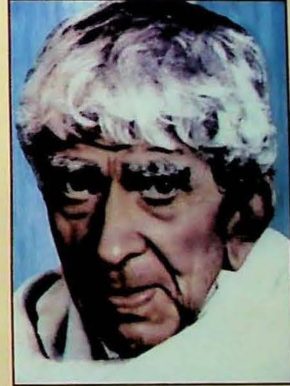


▲ 1925 میں آر ایس ایس کے بانی ڈاکٹر کیشو بلی رام ہیڈ گیوار۔









(اوپر بائیں) سندھ کے تان سین کے طور پر مشہور بھگت کنور رام، جنہیں 1938 میں کچھ مذہبی شدت پسندوں نے قتل کر دیا تھا۔ (اوپر دائیں) 1942 کی بھارت چھوڑو تحریک میں اپنی جان نچھاور کرنے والے شہید ہیمو کلانی۔ (نیچے بائیں) سنگھ کے صوبہ سندھ کے صدر شری راجپال پوری، جن کا لال کرشن آڈوانی پر گہرا اثر پڑا۔ (نیچے دائیں) محترم روحانی گرو سادھو ٹی ایل واسوانی۔

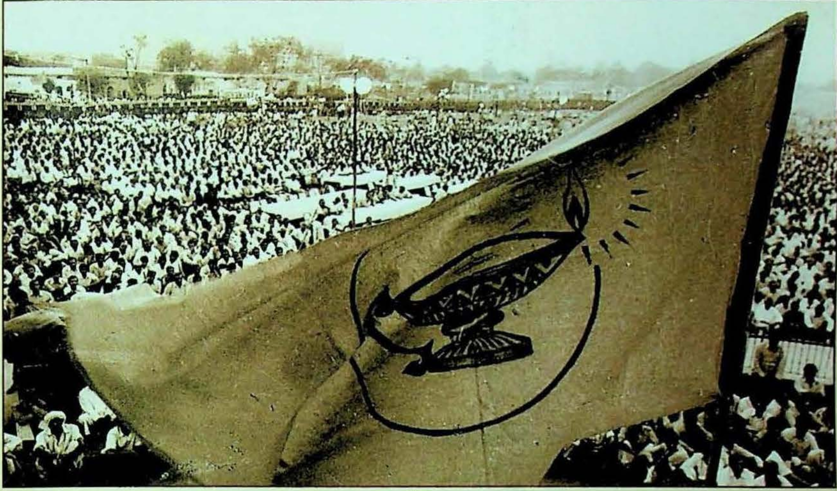
آزاد ہندوستان میں



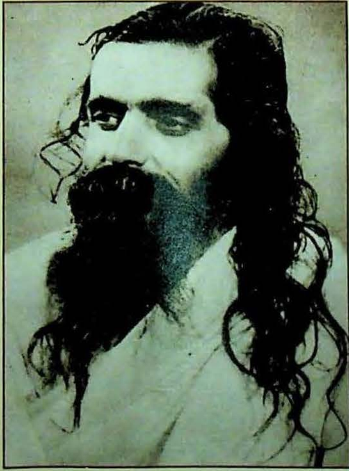
▲ پنڈت جواہر لعل نہرو، مہاتما گاندھی اور سردار پٹیل کی تری موتی۔



◄ ہندوستانی آئین کی اساسی شخصیت
ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر 1946 میں پاکستان پر لکھی
اُن کی کتاب بیحد دھاردار تھی۔



▲ بھارتیہ جن سنگھ کا پرچم۔



▲ 1940 سے 1973 کے درمیان سنگھ کے سر سنگھ چالک
مادھو سداشیو گولوالکر المعروف 'گرو جی'۔



◄ مجاہد آزادی اور بھارتیہ جن سنگھ کے بانی
ڈاکٹر شیاما پرساد مکھر جی۔



▲ راجستھان میں سنگھ کے نوجوان پرچارک آڈوانی (درمیانی قطار میں بالکل بائیں)







▲ بی جے پی کا بنیادی نظریہ ''ایکاتم مانو واد'' پیش کرنے والے پنڈت دین دیال اُپادھیائے۔ (دائیں درمیان میں) بھارتیہ جن سنگھ کے سابق صدر شری بلراج مدھوک۔

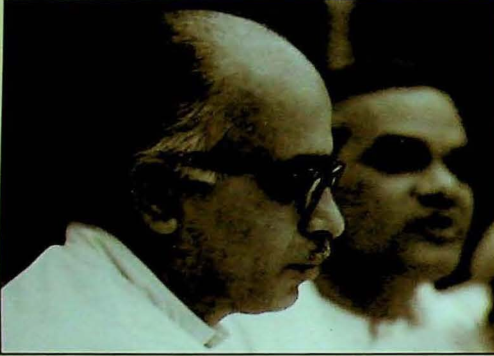
◀ کراچی میں سنگھ کے معاون کارکن اور آرگنائزر کے مدیر کے آر ملکانی۔



▲ پچاسویں دہائی کے نصف میں کشمیری ایکتا آندولن کے رہنما پریم ناتھ ڈوگرا کا پنڈت دین دیال اُپادھیائے کی قیادت میں سنگھ کے کارکنوں کی طرف سے اعزازی خیر مقدم۔



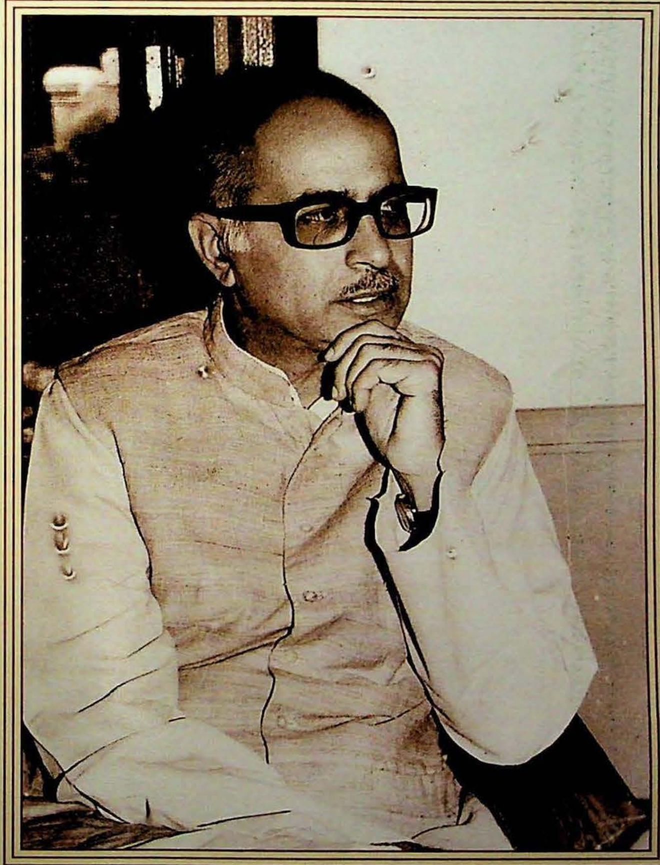
◄ جن سنگھ کے دو اہم ستون: پنڈت دین دیال اُپادھیائے اور اٹل بہاری واجپئی۔ (تصویر 1967)



◄ پارٹی اجلاس میں اٹل جی کے ساتھ۔

▼ کشابھاؤ ٹھاکرے (بالکل دائیں) جو بعد میں
بی جے پی کے قومی صدر بنے اور اٹل جی کے ساتھ
ایل کے آڈوانی۔





یہ امر مسلم ہے کہ اب سندھ پاکستان کا حصہ ہے لیکن تہذیبی پس منظر میں سندھ کو ہندوستان سے الگ نہیں کیا جا سکتا
اور نہ ہی ہندوستان کبھی سندھ کو فراموش کر پائے گا۔

4

تقسیم: ذمہ دار کون؟

وہ وقت گیا وہ دور گیا، جب دو قوموں کا نعرہ تھا
وہ لوگ گئے اس دھرتی سے، جن کا مقصد بٹوارہ تھا
(ساحر لدھیانوی، مشہور نغمہ نگار)

بی او اے سی کا ایئر کرافٹ، جس سے میں کراچی سے دہلی آیا، آج کے جہازوں سے اتنا مختلف تھا کہ جدید پیمانوں کے مطابق اسے دور قدیم کا کہا جائے گا، لیکن اس وقت کی پروازوں میں وہ ایک جدید ترین جہاز تھا۔ عام حالات میں میرے جیسا 20 سال کا ایک نوجوان پہلے ہوائی سفر کی خوشی میں مسرور رہتا، لیکن ان غیر معمولی حالات کے سبب، جو 12 رستمبر 1947 کی صبح مجھے کراچی سے دہلی لے جارہے تھے، میں اس خوشی سے محروم تھا۔

جب میرا ہوائی جہاز اڑان بھر رہا تھا، مجھے بالکل پتہ نہیں چلا کہ کب میں نے پاکستان کی فضائی سرحد چھوڑی اور کب ہندوستان کی سرحد میں داخل ہوا، لیکن جو آسمان سے نظر نہیں آرہا تھا، زمین پر وہ سرحدی لکیر خون سے کھینچی جارہی تھی۔ حکومت برطانیہ سے آزادی کی خوشی کی جگہ پر فرقہ وارانہ ہلاکتوں کی چیخیں اور دونوں سمتوں میں لاکھوں خوف زدہ کنبوں کی بے تحاشہ منتقلی ہورہی تھی۔ دہلی بھی اس کشیدگی اور انتشار سے کسی طرح آزاد نہیں تھی۔ پنجاب سے آئے بیشتر ہندو اور سکھ شرنارتھی سیلاب کے پانی کی مانند قومی راجدھانی میں داخل ہورہے تھے۔

ہوائی سفر کے دوران میری فکر میرے نجی مسائل پر ہی مرکوز تھی۔ میں دہلی میں کس سے ملوں گا؟ ہم سندھ سے آنے والے لوگوں کی حفاظت کیسے یقینی بنائیں گے اور انھیں کہاں بسائیں گے؟ کراچی میں گرفتار شدہ سویم سیوکوں کی رہائی کے لیے ہم کیا کریں گے؟ میرے لیے ان پیچیدہ مسائل کے بارے میں سوچنا مشکل تھا، جس کا شکار میں خود بھی تھا، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ میں نے اس ایک سوال کے بارے میں کئی مرتبہ سوچا ہے، جو سرحد کی دونوں جانب کے افراد اپنے آپ سے پوچھتے تھے۔ کیا اس بحران سے بچا جاسکتا تھا؟

ہم یہ نہ بھولیں کہ یہ کوئی معمولی بحران نہیں تھا۔ تقسیم سے جڑے فسادات میں جلد بازی میں کھینچی گئی سرحدی لکیر کے دونوں جانب تقریباً 10 لاکھ ہندو، سکھ اور مسلمان قتل کردیئے گئے۔ انسانی تاریخ میں آبادیوں کی اب تک کی سب سے بڑی منتقلی میں حکومت برطانیہ کے ذریعہ کھینچی گئی سرحد میں کی گئی جلد بازی اور مفاد کا بڑا ہاتھ تھا۔ تقریباً 6 ماہ کے اندر ایک کروڑ سے زائد لوگ شرنارتھی بن گئے، خواہ وہ ہندو تھے یا مسلم یا سکھ، ان کا درد ایک

جیسا تھا۔ تقسیم تو بری تھی ہی لیکن جس بیدردی سے اس پر عمل کیا گیا اس نے اسے بدترین بنادیا، جس کی غم زدہ یادیں طویل عرصہ تک بنی رہیں۔

بیشتر مہاجر یہی سوچ رہے تھے کہ ملک سے انگریزوں کی بے دخلی، کیوں ان کے آبائی مکانوں اور گاؤوں سے، جہاں ان کا کنبہ صدیوں سے رہائش پذیر تھا، ان کے لیے اجنبی بن گیا۔ تقسیم پر لکھے گئے ادبی صحیفے، جو میرے زیر مطالعہ رہے ہیں، میں سے دو مہاجروں کے ذریعہ کیا گیا تبصرہ میری روح میں سرایت کر گیا۔ اس ملک نے کئی حکومتوں کو بدلتے دیکھا ہے۔ پنجاب کے ایک ضعیف دہقانی مسلم نے کہا' کئی حکمراں آئے اور چلے گئے، لیکن یہ پہلی مرتبہ ہوا ہے کہ حکومت کے بدلنے کے ساتھ ہی عوام کو بھی بدلنا پڑ رہا ہے۔' اسی طرح ایک بزرگ ہندو خاتون نے پنڈت نہرو سے یہ سوال کیا کہ ہر کنبہ میں بٹوارہ ہوتا ہے، املاک تقسیم ہو جاتی ہے، لیکن یہ سب پر امن طریقہ سے ہوتا ہے، پھر یہ قصائی پن، لوٹ اور اغوا کیوں؟ کیا آپ اسے تھوڑی سمجھ سے نہیں کر سکتے، جیسا بٹوارہ کے وقت کنبہ کرتا ہے۔'

اس عظیم ہندوستانی کنبہ کی تقسیم اور اس کے ساتھ کے قصائی پن کے لیے کون ذمہ دار تھا؟ میں اس کے لیے خاص طور پر مسلم لیگ کو قصوروار مانتا ہوں۔ ایک الگ 'مسلم ملک' کے طور پر پاکستان کی تشکیل کے اپنے مطالبہ کو درست ٹھہرانے کے لیے اس کے ذریعہ پیش کی گئی دو قومی نظریہ اس کی بنیاد تھی، جیسا کہ میں نے اس کتاب میں کئی جگہوں پر درج کیا ہے، اس کی حقیقت میں کوئی بنیاد، سماجی، ثقافتی یا روحانی نہیں تھی۔ یہ نظریہ کہ ہندو اور مسلمان دو قوم ہیں، ایک ہزار برس سے زیادہ کی ان کی مشترکہ تاریخ کی بے عزتی کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ مسلم لیگ کے اس مطالبہ کا اثر ان پر تشدد وسائل کے سبب اور بھی بدتر ہو گیا، جن سے وہ حاصل کیا جانا تھا۔ 16 اگست 1946 کو مسلم لیگ کے ذریعہ کی گئی 'براہ راست کارروائی' ★ کی اپیل کے نتیجہ میں کولکاتہ میں 6 ہزار سے بھی زیادہ بے گناہ ہلاک ہوئے، جن میں بیشتر ہندو تھے، جسے 'لمبے چاقوؤں کا ہفتہ' کے نام سے جانا گیا۔ کولکاتہ کے قتل عام سے پیدا ہوئی دہشت نواحی کراچی میں بھی محسوس کی جا سکتی تھی۔ ویسے تو بہت کم لوگوں کو اندیشہ تھا کہ کولکاتہ میں ہوئی خونریزی، تقسیم کے فوراً پہلے اور بعد میں جو کچھ ہونے والا تھا، اس کی ایک جھلک تھی، لیکن تقسیم کی خوفناک بھول کے لیے کیا مسلم لیگ تنہا ہی ذمہ دار تھی؟ میں ایسا نہیں سوچتا۔ ہم برطانوی حکومت کی غلطیوں کو بھی نہیں بھول سکتے، جو نہ صرف 1857 کی جنگ آزادی کے بعد منظم طریقہ سے چلائی گئی 'پھوٹ ڈالو اور راج کرو' کی پالیسی سے، بلکہ ان طریقوں سے بھی واضح تھے، جن سے بالآخر انھوں نے ہندوستان کو تقسیم کر ڈالا۔ تقسیم کو ایک خونی دائرہ تک لے جانے میں حکومت برطانیہ کے شامل ہونے کا یقین کی حد تک تفصیلات مجھے اسٹینلے وولپرٹ کی کتاب 'شیم فل فلائٹ: دی لاسٹ ایرس آف دی برٹش امپائر ان انڈیا' میں ملی۔ یہ عظیم امریکی مؤرخ، جنھوں نے ہندوستان اور پاکستان پر کئی قابل ستائش کتابیں تصنیف کی ہیں، 1998 میں نئی دہلی میں مجھ سے ملاقات کرنے کے بعد میرے اچھے شناسا بن گئے۔ وہ اپنے ساتھ اپنی نئی کتاب 'انڈیا' لائے تھے، جو ہمارے ملک کے بارے میں ان کے اس خوشگوار بیان سے شروع ہوتی ہے 'ہندوستان دنیا کی سب سے قدیم تہذیب و تمدن ہے، پھر بھی وہ اس کے سب سے نوجوان ممالک میں سے ایک ہے۔ ہر جگہ پائی جانے والی اس غیر یکسانیت کا ایک بڑا حصہ اس کی اس قدیم اور نوجوان سوچ کی پیداوار ہے۔' ★★

★ ''براہ راست کارروائی''، مسلم لیگ کے ذریعہ پاکستان کے مطالبہ کو فوری طور پر منظور کرانے کے لیے چلائی گئی مہم تھی۔ یہ 16 اگست 1946 کو شروع ہوئی، جب لیگ کے اکسانے پر کولکاتہ، بنگال اور بہار کے سرحدی علاقوں میں بھیانک فسادات ہوئے۔ 72 گھنٹے کے اندر 6 ہزار سے زائد لوگ مارے گئے۔ 20 ہزار سے زیادہ لوگ سنگین حالت میں زخمی ہوئے اور ایک لاکھ سے زائد باشندگان کولکاتہ بے گھر ہو گئے۔

★★ اسٹینلے وولپرٹ نے مجھے ایک کاپی تحفہ میں عنایت کی، اس پر لکھا 'ان کے لیے جن کی قیادت نے ہندوستان کی پارٹی کو مرکزی اقتدار میں بٹھایا۔

'شیم فل فلائٹ' (2007) میں اسٹینلے وولپرٹ اس بھیانک انسانی بحران، جو پنجاب اور بنگال کی تقسیم کے لیے بنائے گئے غیر مفکرانہ ٹائم ٹیبل کا نتیجہ تھی، کے لیے ہندوستان کے آخری وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو خصوصاً قصوروار ٹھہراتے ہیں۔ برطانوی وزیر اعظم کلیمنٹ ایٹلی نے 20 رفروری 1947 کو اعلان کیا تھا کہ ہز میجسٹی کی حکومت ایک غیر منقسم اور منقسم ہندوستان کو جون 1948 تک اقتدار منتقل کرنے کی منشا رکھتی ہے۔ پاگل بنادینے والی 5 ماہ کی ایک چھوٹی سی مدت میں اس بات کی پرواہ کیے بغیر کہ جلد بازی سے پُر اس کارروائی کا کیا نتیجہ ہوگا، ماؤنٹ بیٹن نے ہندوستان کی تقسیم کا کام اگست 1947 میں مکمل کرلیا۔

وولپرٹ بتاتے ہیں کہ ممکنہ تشدد اور اس سے نمٹنے کے لیے ایک پراثر منصوبہ کے فقدان کے بارے میں ماؤنٹ بیٹن اچھی طرح واقف تھے۔ سرل ریڈکلف کے ذریعہ بنائے گئے ہندوستان اور پاکستان کے نقشے نہایت خفیہ رکھے گئے تھے اور ان علاقوں میں رہنے والے لوگوں کو نقشوں کے بارے میں کچھ پتہ نہیں تھا، جو سرحد کے گرد ونواح میں پڑنے والے تھے۔ فطری طور پر اس سے ان کے دلوں میں غیر یقینی صورت حال پیدا ہوگئی۔ غیر یقینی ہمیشہ شبہ پیدا کرتی ہے، جو پڑوسی کو پڑوسی سے نبرد آزما کرتی ہے، خاص طور سے فرقہ وارانہ طور سے ایک کشیدگی کے ماحول میں اس سے اور ساتھ ہی برطانوی قانون وانتظامیہ کے اچانک رک جانے سے، وہ تشدد اور بھی شدید ہوگیا۔ اس شرمناک اخراج سے پیدا ہوئی تلخی اور نفرت اس نمناک واقعہ کے بعد آج بھی ہندوستان اور پاکستان کے رشتوں کے لیے بددعا بنی ہوئی ہے۔

حالانکہ یہ بھی اتنا ہی سچ ہے کہ لاتعداد ایسی تفصیلات بھی تھیں، جہاں پڑوسی نے پڑوسی کی حفاظت کی ہو اور ایسے متحرک کرداروں نے لوگوں میں امید کی کرن کو درندگی کے خوفناک طوفان میں پوری طرح بجھنے سے بچالیا، پھر بھی یہ مثالیں تقسیم کے فسادات کے سبب ہوئی ہلاکتوں، غم اور درد کو کم نہیں کرسکتیں۔ خود تقسیم سے بچا جاسکتا تھا یا نہیں، یہ ایک ایسا سوال ہے جس نے تاریخ دانوں کو الجھن میں ڈال دیا ہے، لیکن مجھے اس میں شک نہیں ہے کہ کافی حد تک تقسیم کے بحران سے بچا جاسکتا تھا۔

تقسیم کے بحران پر میری بات ادھوری ہی رہے گی، اگر میں کانگریسی قیادت کے رول پر اپنے خیالات کا اظہار نہ کروں۔ ہندوستان کی جدوجہد آزادی کے سپاہیوں کے تئیں ہر ایک حب الوطن ہندوستانی کے دل میں جو عزت اور احسان مندی کا جذبہ ہے، اسے میں بھی تقسیم کرنا چاہتا ہوں۔ پھر بھی، ایک ملک کی زندگی میں آئے دیو قامت بحران کے سامنے ایک پُر تجسس دل کے لیے یہ سوال پوچھنا فطری ہے کہ ایک خون میں نہائی تقسیم کو ٹالنے کے لیے کیا ہمارے لیڈر کچھ مختلف رول نبھا سکتے تھے یا انھیں نبھانا چاہیے تھا؟ اس سوال کا جواب دینے کے لیے میں معزز سماج وادی لیڈر ڈاکٹر رام منوہر لوہیا، جن سے میں بعد میں خوب اچھی طرح واقف ہوگیا، کے تجزیہ کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ اپنی کتاب 'دی گلٹی مین آف پارٹیشن' میں ڈاکٹر لوہیا کہتے ہیں کہ 'مہاتما گاندھی کو چھوڑ کر کانگریس کے بیشتر لیڈر طویل جدوجہد کے بعد 'تھک' گئے تھے اور اپنی زندگی میں ہی ہندوستان کو آزاد دیکھنا چاہتے تھے۔ گاندھی جی کی صلاح کے برعکس وہ تقسیم کے لیے تیار ہوگئے، کیونکہ انھیں سابق وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے یقین دہانی کرائی تھی کہ ہندو مسلم تنازع کا سب سے اچھا اور مثبت حل یہی ہے۔ واضح طور سے غلطی ان کے دل میں تھی نیت میں نہیں۔'

خود پنڈت نہرو نے بعد میں ان الفاظ میں اپنی غلطی قبول کی 'جب ہم نے تقسیم پر فیصلہ لیا تو میں نہیں سمجھتا کہ ہم میں سے کسی نے بھی یہ سوچا ہوگا کہ تقسیم کے بعد اتنا خطرناک قتل عام ہوگا، بلکہ ایک طرح سے ہم نے اس سے بچنے کے لیے تقسیم کا فیصلہ لیا تھا۔ اس طرح سے ہم نے اس کی دوگنی قیمت ادا کی۔ پہلا آپ کہہ سکتے ہیں سیاسی اور نظریاتی، دوسرا جسے ہم ٹالنا چاہتے تھے، وہی درحقیقت ہوگئی۔' سردار پٹیل نے بھی بعد میں کہا کہ انھیں تقسیم کے لیے کبھی حامی نہیں بھرنی چاہیے۔ 'آپ سمندر کو یا ندی کے پانی کو تقسیم نہیں کرسکتے۔'

صرف مہاتما گاندھی نے آخر تک تقسیم کو قبول نہیں کیا۔ دیگر تمام باتوں سے قطع نظر، انھیں یقین تھا کہ فرقہ وارانہ بنیاد پر ہندوستان کی تقسیم میں ایشور کی رضامندی شامل نہیں تھی۔ آخر میں انھوں نے اپنی منظوری دے دی۔ انھوں نے ایسا اس امید پر کیا کہ تقسیم مسلسل ہو رہے قتل عام پر روک لگا دے گی۔ نفرت اور تشدد کی لپٹوں کے درمیان امن اور بھائی چارگی کا پیغام پھیلانے میں انھوں نے اپنی ساری اخلاقی قوت صرف کر دی۔ وہ کامیاب بھی ہوئے، لیکن صرف لمحاتی اور مقامی طور سے، جیسے نواکھالی میں جہاں انھوں نے پدیاترا کی۔ دیگر مقامات پر وہ بھی قتل اور شرناتھیوں کے دونوں جانب کی آمد و رفت کو روکنے میں ناکام رہے۔ صاف طور سے تقسیم اور اس کے خطرناک نتائج کو روک پانا کسی کے بس میں نہیں تھا۔

جب ہم پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں تو واقعات کی ممکنہ منفی شکل کا قبل از وقت تجزیہ کرنے میں جدوجہد آزادی کے ہمارے لیڈروں کی اجتماعی ناکامی اور اسی لیے ان واقعات کی لازمیت کو روکنے کی کوششوں کے فقدان پر دھیان مرکوز ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ ان کی ناکامی کو اس طرح بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ وہ بھی آخر کار انسان تھے اور غلطیاں انسانوں سے ہی ہوتی ہیں۔

بیشتر ایسا ہی ہوتا ہے کہ انسان اپنی تاریخ کو قابو میں نہیں رکھ پاتا۔ یہ بات کہنے کے بعد میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اگر کسی ملک کے عوام اور لیڈر بہتر سمجھ اور مضبوط اتحاد پیدا کریں اور اس طرح ملک کے لائحۂ عمل کو فعال بنانے میں زیادہ قوت صرف کریں تو وہ اس کی بہتر طریقے سے خدمت کر پائیں گے۔ اس کے لیے ہمیں، اس میں عوام اور لیڈر دونوں شامل ہیں، ہندوستان کے ماضی کے بارے میں زیادہ بہتر جانکاری اور اس کے مستقبل کی صحیح حکمت عملی کی ضرورت ہے۔ ہمیں پتہ ہونا چاہیے کہ ایک قوم کے طور پر ہم کہاں سے چلے ہیں اور ہمیں کہاں پہنچنا ہے۔ ہمیں یہ بھی جاننا چاہیے کہ ہندوستان کی سالمیت کی بنیاد کیا ہے، جس سے ہم اس کی تقسیم کی بنیادی وجہ کو سمجھ سکیں۔ میری سمجھ سے، یہی وہ سبق ہے، جو ہندوستان کی تاریخ میں اگست 1947 میں ہوئی عہد ساز تبدیلی سے ہمیں سیکھنا چاہیے۔

دو عظیم ہستیوں کے دوررس اور مثبت نظریئے

اتفاق سے یا منصوبہ بند طریقے سے یہ سطریں ہندوستان کی آزادی کی 60 ویں سال گرہ کے ماقبل لکھی جا رہی ہیں۔ 14 راگست 1947 کو ہندوستان کو تقسیم کر کے پاکستان کی تشکیل ہوئی تھی۔ گزشتہ صفحات میں میں نے سندھ میں اپنے ابتدائی برسوں میں خود پر پڑے کراچی میں رام کرشن مشن کے سربراہ سوامی رنگناتھ آنند کے ذریعہ بوئے گئے بیج کے اثر کا تذکرہ کیا ہے، میری ہی طرح وہ اور ان کی تنظیم بھی تقسیم سے متاثر تھے۔ شدت پسند ہجوم کے ذریعہ رام کرشن مٹھ میں توڑ پھوڑ کی گئی تھی اور نہ چاہتے ہوئے نہایت مجبور ہو کر سوامی جی نے 9 راگست 1948 کو کراچی چھوڑ دیا۔

جب سوامی رنگناتھ آنند کراچی میں ہی تھے، انھوں نے ہندوستان کے ماضی، حال اور مستقبل پر اظہار خیال کرتے ہوئے 15 راگست 1947 کو طویل مضمون لکھا تھا۔ میں اسے اور آزادی کے ماقبل مہارشی اروند کے ذریعہ ریڈیو پر قوم سے کیے گئے خطاب کو ہندوستان کی قومیت کا سب سے زیادہ گہرا فلسفیانہ پیغام مانتا ہوں۔ ان دونوں کو پڑھ کر مجھے ایسا لگتا ہے جیسے ہندوستان کی روح بول رہی ہو۔ دونوں ہندوستان کے قدیم رشی روایت سے تعلق رکھتے تھے اور دونوں نے پیشین گوئی کی ہے کہ ہندوستان کی تقسیم ہمارے قدیم ملک کی تاریخ میں موجودہ حتمی نہیں ہے۔

سوامی رنگناتھ آنند لکھتے ہیں 'جب مشتعل جذبات اور شدید نفرت سے بھرے موجودہ حالات سے غیر یقینی کے بادل چھٹ جائیں گے اور بھارتیہ آکاش صاف ہوگا، تب ملک کو یقین اور نظریہ کے درست ہونے کا احساس ہوگا۔ آج جو چنندہ لوگوں کا اعتماد ہے کل وہی بیشتر لوگوں

کا جذبہ بنے گا۔ جومنتشر ہوئے حصوں کا میل ملاپ اور دوبارہ ملن کرے گا اور عوامی رائے کے ذریعہ ایک قائم حقیقت کو غیر مستحکم کرنے کی جانب قدم بڑھائے گا۔'

اسی طرح مہارشی اروند بھی کہتے ہیں 'ہندوؤں اور مسلمانوں کا پرانا فرقہ وارانہ لگاؤ اب ملک کی ایک مستحکم سیاسی تقسیم کی شکل میں سخت بن گیا معلوم ہوتا ہے۔ یہ امید کی جاتی ہے کہ اس قائم حقیقت کو سدا کے لیے قائم یا عبوری حل سے زیادہ نہیں مانا جائے گا۔ ایسا قطعی نہیں ہونا چاہیے۔ تقسیم کوختم ہونا ہوگا۔ ہمیں امید کرنی چاہیے کہ ایسا فطری طور پر ہی ہوگا، وہ نہ صرف امن اور یکجہتی بلکہ ایک ساتھ کام کرنے کی ضرورت کے بڑھتے ہوئے احساس کے ذریعہ، ان مشترکہ سرگرمیوں کو سامنے لانے اور اس مقصد کے حصول کے لیے وسائل فروغ دینے سے ہی ہوگا۔ اس راستہ سے آخر میں کسی نہ کسی شکل میں اتحاد قائم ہوسکتا ہے۔ اس مستقل شکل کی فطری نہ کہ بنیادی اہمیت ہوسکتی ہے، لیکن کسی بھی حل سے، کسی بھی طریقہ سے تقسیم کوختم ہونا ہی چاہیے۔ اتحاد ضروری ہے اور اسے حاصل کیا جائے گا، کیونکہ ہندوستان کے مستقبل کی عظمت کے لیے یہ لازمی ہے۔'

میں ان تحریروں کو خلاصہ کے طور پر من وعن پیش کرنے میں قارئین کا تعاون چاہوں گا۔ یہاں اتنا کہنا بجا ہے کہ مہایوگی اروند اور سوامی رنگناتھ آنند کی امید میری بھی امید ہے۔ یہ وہی امید ہے جو پنڈت دین دیال اپادھیائے اور معروف سماج وادی لیڈر ڈاکٹر رام منوہر لوہیا نے 1964 کے اپنی تاریخی مشترکہ بیان میں ظاہر کی تھی کہ ہندوستان اور پاکستان کا ایک عظیم وفاق بننا چاہیے۔ یہ وہی امید ہے جو میں نے اکثر عظیم وفاق کے التزام، جس میں بنگلہ دیش بھی شامل ہونا چاہیے کو شامل کرنے کے لیے ظاہر کی ہے۔ اس کتاب میں بعد میں ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کے ایک عظیم وفاق کے التزام پر بحث کرتے وقت میں اس کی اور وضاحت کروں گا۔

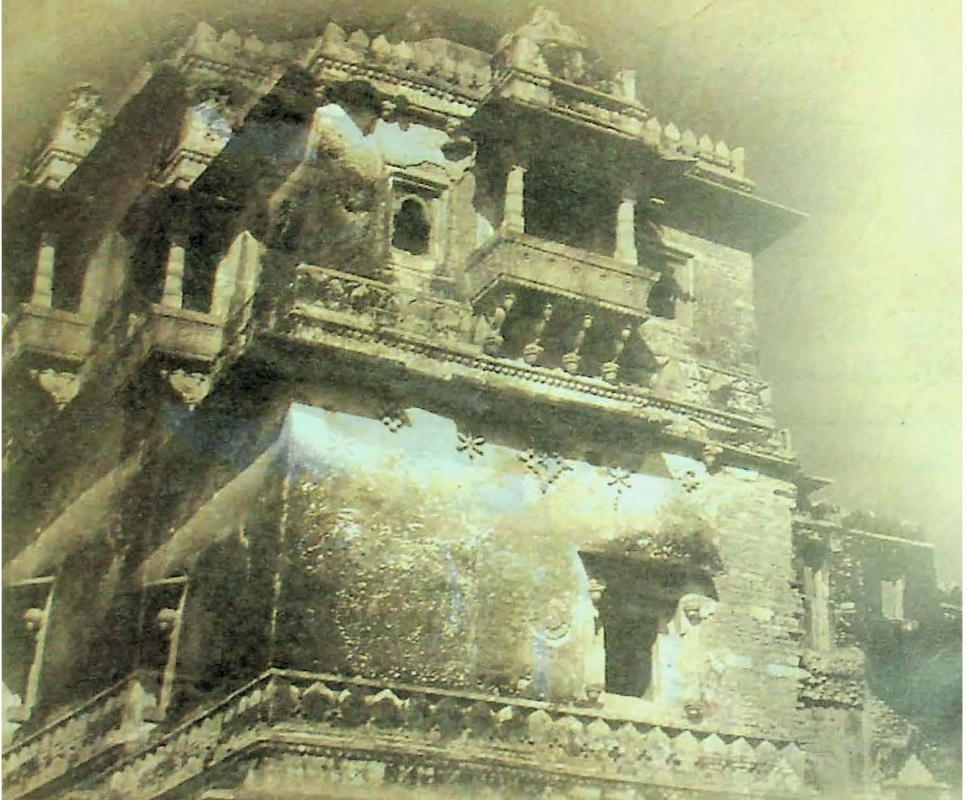
میں نے تقسیم کی مشکلات، وہ لوگ جو اس کے لیے ذمہ دار تھے اور مستقبل میں اس کے برے نتائج کو ہم کیسے مٹا سکتے ہیں، کے بارے میں اوپر جو کچھ لکھا ہے، واضح طور سے وہ ایک ایسا نظریہ ہے جو میں نے بعد کی دہائیوں میں مشاہدات سے حاصل کیا ہے۔ یہ ہندوستان میں ایک سیاسی کارکن کی شکل میں میری زندگی کے دوران کیے گئے مطالعہ اور فکر کا نتیجہ ہے، جب ہر گزرتے سال کے بعد سندھ سے میری رخصتی ایک دور کی یاد بنتی جارہی تھی۔ پھر بھی جیسا کہ میں نے پہلے ذکر کیا تھا، ایک بی او اے سی فلائٹ سے جب میں کراچی سے روانہ ہوا تھا، اس وقت کے میرے خیالات میرے پہلے کے سروکاروں کے متعلق تھے، اس لئے مجھے اس ایشو پر لوٹ آنا چاہیے۔

سندھ سے راجستھان کا سفر

1947-57



''راشٹریہ سویم سیوک سنگھ کے پرچارک کے روپ میں راجستھان میں گزارے دس برسوں نے مجھے بیحد روحانی قوت عطا کی۔ انہوں نے مجھے زندگی کی ان سنگین حقیقتوں کے تئیں بیدار کیا جن کے زیر اثر میرے کروڑوں ہم وطن اس طرح کی زندگی جینے کا عذاب جھیل رہے ہیں۔ یہاں زندگی مادی عیش و آرام کے لحاظ سے بیحد سخت تھی۔ 1952 میں ایک دن جب میں راجستھان میں مقیم تھا، پنڈت دین دیال اُپادھیائے نے مجھے ریاست میں جن سنگھ کی تنظیمی ذمہ داری لینے کے لیے کہا۔ اس طرح ایک سیاسی کارکن کے روپ میں میرا سفر شروع ہوا۔''



دوسرا باب

1

سندھ سے راجستھان روانگی

لڈیندا ونجن تھاپکھی، دیش پہنجو چھڑندا ونجن تھا

(پرندے نقل مکانی کرر ہے ہیں، پرندے اپنی زمین چھوڑ کر جار ہے ہیں)

— سندھی گلوکار ماسٹر چندر کے ایک گیت سے

جب بی اوا ے سی(BOAC) کی فلائٹ دہلی کے پالم ایئر پورٹ پر اتری تو اس وقت تقریباً دن کے بارہ بجے تھے۔ کراچی سے دہلی کا سفر، جواب تقریباً 90 منٹ کا ہے، 6 گھنٹے میں مکمل ہوا تھا۔ نہ میں اور نہ ہی میرے ساتھی اور ہم سفر مرلی دھر دہلی میں کسی کو جانتے تھے۔ ہم شہر کے ہی بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ ہمارا پہلا اور ابتدائی کام سندھ کے علاقائی تشہیر کار شری راج پال جی سے ملنا تھا، جو سنگھ کی اہم میٹنگ کے لیے دہلی آئے ہوئے تھے، لیکن ہمیں کچھ پتہ نہیں تھا کہ وہ ہمیں کہاں ملیں گے۔ میں نے دہلی کے صرف دو ناموں کے بارے میں سنا تھا۔ شری وسنت راؤ اوک، جو سنگھ کے مضافاتی تشہیر کار تھے اور لالہ ہری چند دہلی کے سنگھ چالک، جو سیتارام بازار میں کہیں رہتے تھے۔ ہمارے دہلی آنے کے دو مقاصد تھے۔ پہلا، راج پال جی سے صلاح کرنا کہ اس نئی صورت حال میں ہمیں کیا کرنا چاہیے اور دوسرا، ان سے گزارش کرنا کہ وہ سندھ واپس نہ جائیں، کیونکہ وہاں ان کی گرفتاری کا خدشہ تھا۔

جب ہم نزدیک کے دہلی کنٹونمنٹ ایریا میں داخل ہوئے تو ہم نے کسی سے پوچھا 'کیا آپ یہاں سنگھ کے کسی کارکن کو جانتے ہیں؟'

اس نے کہا 'آپ اس دکان پر چلے جائیں۔ وہ سنگھ کا آدمی ہے۔'

ہم نے دکاندار سے کہا 'ہمیں سیتارام بازار کے سنگھ دفتر میں جانا ہے۔'

اس نے ہمیں حیرت سے دیکھا اور بولا 'وہ یہاں سے بہت دور شہر میں ہے۔ یہی نہیں، آپ وہاں نہیں جاسکتے۔ فسادات کے سبب وہاں

کرفیو نافذ ہے۔

ہمارا اس سے دوسرا سوال تھا 'کیا آپ اس علاقہ کے کسی سنگھ لیڈر کو جانتے ہیں، جہاں کرفیو نہیں لگا ہو؟'

اس نے پھر سے ہمیں دھیان سے دیکھا اور بولا 'فکر نہ کرو، ایک لمبے سفر سے آپ تھکے ہوئے لگتے ہیں۔ آپ میرے گھر چلو، غسل کرو، کھانا کھاؤ، میں آپ کو صحیح آدمی کے پاس لے چلوں گا۔'

اس کے ذریعہ ہم وسنت راؤ اوک سے ملے، جنھوں نے ہمیں بتایا کہ راج پال جی جودھپور چلے گئے ہیں، جہاں سے وہ کراچی جائیں گے۔ اس خبر نے میری ہمت توڑ دی۔ مجھے کسی بھی طرح راج پال جی سے رابطہ قائم کر کے انھیں سندھ واپس جانے سے روکنا تھا، اس لئے میں اور مرلی دھر اسی رات ان سے ملنے کے لئے جودھپور جانے والی ٹرین میں سوار ہو گئے۔

جودھپور پہنچنے پر مجھے بتایا گیا کہ میرے لیے کراچی سے پیغام آیا ہے کہ میں واپس سندھ نہ جاؤں۔ اس کے علاوہ سندھ سے آئے سنگھ کے سبھی تشہیر کاروں اور سینئر لیڈروں سے جودھپور میں جمع ہونے کے لیے کہا گیا تھا، جہاں کچھ دنوں بعد آنے والے دنوں میں جو کام کیے جانے ہیں، ان کے بارے میں ہدایات دی جائیں گی۔

اس دوران کراچی میں ہوئے واقعات سے بالکل بے خبر راج گوپال جی ٹرین سے کراچی جانے کے لیے جودھپور سے روانہ ہو چکے تھے۔ کراچی سے 220 کلومیٹر پہلے میر پور خاص ریلوے اسٹیشن پر ہی انھیں ضروری جانکاری موصول ہو سکی۔ انھوں نے فوراً سفر ختم کیا، مقامی سویم سیوکوں سے رابطہ کیا اور کار سے کراچی کی جانب چل پڑے۔ انھوں نے سندھ میں ہندو برادری کے تحفظ کو یقینی بنانے کو اپنی نجی ذمہ داری سمجھا۔ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ پولس سے بچتے ہوئے ان کا وہ کراچی جانا کتنا دشوار تھا۔

پاکستان سے آئے سویم سیوکوں کو سنگھ کے لیڈروں کی ہدایت تھی کہ ہمیں پاکستان سے آرہے شرنارتھیوں کے سفر کو آسان اور منظم بنانے میں مدد کرنی چاہیے۔ شرنارتھیوں کی راحت اور باز آبادکاری کے کاموں میں مدد دینے کا کام بھی ہمیں سونپا گیا تھا۔ ہم اس کام میں پوری لگن کے ساتھ مصروف ہو گئے۔

ان دنوں ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں کے مابین قیدیوں کے تبادلہ کے لئے ایک معاہدہ تھا۔ اس معاہدہ کے تحت پاکستانی جیلوں میں بند ہندو قیدیوں کا تبادلہ، جو ہندوستان جانا چاہتے تھے، پاکستان جانے کے خواہش مند ہندوستانی جیلوں میں مسلمان قیدیوں سے تھا۔ معاہدہ میں یہ التزام بھی تھا کہ ادلا بدلی کے بعد سیاسی قیدی چھوڑ دیئے جائیں گے، لیکن مجرمانہ سرگرمیوں کے لئے سزا یافتہ قیدیوں کو منتقلی کے بعد اپنی سزا کی باقی مدت جیل میں ہی گزارنی ہوگی۔ ایسا ہی ایک دوفریقی سمجھوتہ ذہنی طور پر معذور لوگوں کے تبادلہ کے لیے بھی تھا۔ مشہور اردو افسانہ نگار سعادت حسن منٹو نے اس موضوع پر ایک دلخراش کہانی لکھی تھی— ٹوبہ ٹیک سنگھ۔

مجھے ان قیدیوں کو لانے کے لئے فیروز پور جانے کے لئے کہا گیا، جن کی ادلا بدلی ہو رہی تھی۔ ان بیس سنگھ کارکنان کو، جو شکار پور کالونی بم دھماکہ کیس میں 9 ستمبر 1947 کو گرفتار کیے گئے تھے، جب ٹرین وہاں پہنچی تو میں صرف کھان چند گوپال داس کو ہی دیکھ پایا، جو ان کے لیڈر تھے۔

'دوسرے لوگ کہاں ہیں؟' فکر مند لہجہ میں ان سے سوال کیا۔

وہ اتنے ہی حیرت زدہ اور حساس تھے۔

'میں نہیں جانتا۔ انھوں نے کراچی میں مجھے ٹرین پر بٹھادیا اور بولے کہ دیگر لوگ دوسرے کمپارٹمنٹ میں بیٹھے ہیں۔' واضح تھا کہ پاکستانی افسران کوئی کھیل کھیل رہے تھے۔

ہم دہلی میں شری گروجی سے ملے اور کراچی کے 19 سنگھ قیدیوں کی انجان قسمت کے بارے میں انھیں اطلاع دی۔ انھوں نے فوراً وزیر داخلہ سردار پٹیل سے رابطہ کرنے کی کوشش کی، لیکن وہ دستیاب نہیں تھے۔ پھر انھوں نے شرنارتھی کے معاملوں کے انچارج این وی گاڈگل سے رابطہ کیا۔

گاڈگل نے کہا 'آپ فکر نہ کریں۔ پاکستان میں گرفتار کیے گئے تمام سنگھ کارکنان کی رہائی کو یقینی بنانا میری ذمہ داری ہے۔'

ایک ہفتہ کے اندر ہمارے باقی تمام 19 ساتھی کراچی سے بحفاظت آگئے۔

ان میں سے ایک لچھمن راج ادھانے دہلی میں اپنی سیاسی سرگرمیاں جاری رکھیں اور بعد میں جن سنگھ کی شہر اکائی کے جنرل سکریٹری بن گئے۔ ان میں سے بیشتر بمبئی میں رہائش پذیر ہو گئے۔ ان میں شری نند بدلانی (جن کے کراچی میں واقع گھر میں بم دھماکہ ہوا تھا، جس میں دو لوگ مارے گئے تھے) اور ڈاکٹر رام ہنگورانی اہم تھے۔

آر ایس ایس کے سویم سیوکوں کا قابل ستائش راحتی اور بازآبادکاری کام

ان دنوں سنگھ کے سامنے پہلا اور ضروری کام تھا، فساد سے متاثرہ علاقوں میں ہندوؤں اور سکھوں کو تحفظ فراہم کرانا اور نوتشکیل شدہ پاکستان کے پنجاب اور دیگر حصوں سے آئے شرنارتھیوں کے سیلاب کے لیے راحت رسانی کا کام کرنا۔ یہاں مجھے بتانا چاہیے کہ سنگھ کو یہ ذمہ داری اپنے اوپر کیوں لینی پڑی۔ ہندوؤں اور سکھوں کو کانگریس کے لیڈروں سے بڑی امیدیں تھیں کہ وہ فرقہ وارانہ خطوط پر ملک کو تقسیم کرنے کی مسلم لیگ کی مہم کو ناکام کر دیں گے۔ لیکن مہاتما گاندھی کو چھوڑ کر کانگریس کے بیشتر لیڈروں نے اس تباہ کن فیصلے کو اپنی خاموش منظوری دے دی تھی۔

منقسم پاکستان میں رہنے والے ہندوؤں اور سکھوں کے لیے یہ ایک زبردست مصیبت تھی۔ فرقہ واریت کی آگ میں جھلسے پاکستان سے بھاگ رہے بے گھروں کو کوئی تحفظ فراہم نہیں تھا۔ انھیں اور ہندوستان کے اس حصہ میں پیدا ہوئے ہندوؤں اور سکھوں کو بھی تحفظ کی ضرورت تھی اور حکومت ہند سے امید بھی، کیونکہ تقسیم اب ایک حقیقت بن گئی تھی۔ فرقہ وارانہ تشدد اتنے بڑے پیمانے پر اور بھی خطرناک شکل اختیار کرتا جا رہا تھا۔ ہندوستان کے وزیر داخلہ سردار پٹیل نے اعلان کیا کہ حکومت ہر شخص کی جان اور عزت کی حفاظت کرنے کی حالت میں نہیں ہے۔ ایسے پریشان کن حالات میں سنگھ کو یہ فرض نبھانے کے لیے آگے آنا پڑا۔

بعد میں سردار پٹیل نے سنگھ کے بچاؤ اور راحت کے کاموں کی سچ مچ ستائش کی۔ 7 جنوری 1948 کے 'دی ہندو' کی رپورٹ تھی۔ 'سردار پٹیل نے محسوس کیا کہ وہ (سنگھ) مفاد پرستی سے متاثر نہیں تھے۔ اس وقت کے حالات کا تقاضا تھا کہ وہ حکومت کے ہاتھ مضبوط کریں اور امن بنائے رکھنے میں مدد کریں ان کی پارٹی کے کچھ لوگوں کے لیے ان کی دھمکی تھی کہ کانگریس کے جو لوگ برسراقتدار ہیں وہ یہ سوچتے ہیں کہ اپنی حکمرانی کے زور پر وہ سنگھ کو کچل پائیں گے۔ آپ ڈنڈے کے استعمال سے ایک تنظیم کو کچل نہیں سکتے۔ ڈنڈا چوروں اور ڈاکوؤں کے لئے ضروری ہے۔ سنگھ کے لوگ چور اور ڈاکو نہیں ہیں، وہ اپنے ملک سے محبت کرنے والے محبان وطن ہیں۔'

2

سنگھ کے تشہیر کار کے طور پر میرا کام

نمستے سدا وتسلے ماتر بھومی

— راشٹریہ سویم سیوک سنگھ کی شاکھاؤں میں کی جانے والی حب الوطنی سے سرشار دعا

جودھپور میٹنگ کے خاتمہ پر سندھ سے آئے ہم تمام لوگوں کو سنگھ کی سرگرمیاں جاری رکھنے کے لئے راجستھان کے مختلف حصوں میں بھیجا گیا۔ اگلے دس برسوں تک راجستھان، جو ایک ساتھ ہی خوبصورتی اور چیلنج آمیز دونوں تھا، میری کرم بھومی رہی۔ پہلے صرف سنگھ کے تشہیر کار کے طور پر اور پانچ برس بعد بھارتیہ جن سنگھ کے کل وقتی کارکن کے طور پر۔

راجستھان کی سرزمین، جو لاکھوں محبان وطن کی قربانی سے پاک ہوگئی تھی، پر پیر رکھنے سے قبل ہی میرے دل میں اس ریاست کے تئیں کشش تھی۔ بہادر راجپوت، جاٹ، بھیل، اہیر، گرجر، مینا اور دیگر قبائلی لوگوں کی اس زمین نے بار بار ہونے والے مسلم حملوں کو جھیلا ہے۔ راجستھان کے بیشتر قلعے، ان کی انوکھی عظمت خود ہی ان راجاؤں کی بہادری کی کہانیاں کہتے ہیں، جنھوں نے انھیں تعمیر کیا تھا۔ یہ قلعے راجستھان کی تاریخ کے عروج و زوال کے شاہد ہیں۔ یہیں پر میواڑ کے رانا سانگا نے بابر سے کھانوا کی جنگ (1527) لڑی تھی۔ عہد وسطیٰ کے ہندوستان کا یہ شیر، جس نے میدان جنگ میں اپنی ایک آنکھ، ایک پیر اور ایک ہاتھ گنوا دیئے تھے اور جس کے جسم پر زخموں کے 80 نشان تھے، پھر بھی جب وہ جنگ کے میدان میں اترتا تو مغل فوج میں دہشت پیدا کر دیتا تھا۔ یہیں پر مہارانا پرتاپ نے ہلدی گھاٹی (1576) میں اکبر کی مغل فوج کا سامنا کیا تھا جو ایک مثال بن چکا ہے۔ میں چتوڑ گڑھ قلعہ کی داستان سے خصوصی طور سے متاثر تھا، جس پر دہلی کے سلطان علاء الدین خلجی (1296-1316) نے تین مرتبہ حملہ کیا تھا اور وہاں کی خوبصورت رانی پدمنی کے تئیں اس کا ناپاک منصوبہ رانی کے جذبہ قربانی 'جوہر' کے سبب کامیاب نہیں ہوسکا۔

یہ سبق آموز کہانیاں میں حیدرآباد اور کراچی میں پڑھ چکا تھا اور اب جبکہ تقدیر مجھے راجستھان میں کام کرنے کے لئے لے آئی تھی، تب میں نے محسوس کیا کہ کئی طرح سے سنگھ کا کام ریاست کی حب الوطنی اور بے لوث خدمت کی شاندار روایت کا تسلسل ہے۔

شروع میں میں نے الور شہر سے سنگھ کی سرگرمیوں کو انجام دیا۔ بعد میں پورے ضلع کی ذمہ داری مجھے سونپ دی گئی۔ اس کے بعد میرے کام کا حلقہ پردیس کے بھرت پور ضلع تک بڑھا دیا گیا۔ سبھی 19 ریاستوں کا ایک متحدہ یونٹ راجستھان میں انضمام کا عمل کافی مشکل تھا، جس کے سات مرحلے تھے اور جسے پورا ہونے میں 8 برس (56-1948) لگے۔ 1948 میں پہلے مرحلہ میں متسیہ راج نامی ایک مضافات کی تشکیل کی گئی۔ اس میں

الور، بھرت پور، کرولی اور دھول پور کی ریاستیں تھیں۔ علاقہ کے تشہیر کار کے طور پر ان چاروں ریاستوں کی ذمہ داری مجھ پر تھی۔ میرے تنظیمی عمل میں دو کام شامل تھے۔ موجودہ شاکھاؤں کی سرگرمیوں کو مضبوط بنانا اور دوسرا نئی شاکھائیں کھولنا۔ ان کاموں کے لیے مجھے مسلسل سفر میں رہنا پڑا تھا۔ کئی مقامات پر بس سے جانا پڑتا تھا۔ اس وقت کی سڑکیں آج کے مقابلے بہت خستہ حال تھیں اور کئی مقامات تو ایسے تھے جہاں صرف سائیکل یا اونٹ کی ہی سواری کی جا سکتی تھی۔ الور ضلع کا ایک گاؤں نارائن پور مجھے یاد ہے، جہاں میں اکثر جایا کرتا تھا۔ الور سے چلنے والی بس صرف تھانہ غازی تک جاتی تھی، جہاں سے نارائن پور 12 میل دور تھا۔ وہاں صرف اونٹ پر سوار ہو کر پہنچا جا سکتا تھا۔

نصف صدی سے زیادہ مدت کے بعد مجھے اس تجربہ کو یاد کرنے اور پھر سے جینے کا موقع ملا۔ 2001 میں ایک مرتبہ، جب میں مرکزی وزیر داخلہ تھا، بارڈر سیکورٹی فورس (BSF) کی اگلی قطار کے معائنہ کے لیے راجستھان کے جیسلمیر گیا تھا۔ ریاست کے ریگستانی علاقہ میں واقع جیسلمیر ضلع پاکستان کی سرحد سے ملحق ہے۔ علاقہ میں دور دور تک ریت کے لہردار ٹیلوں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا، جو اس پورے پس منظر کو ایک انوکھی خوبصورتی سے مسحور کر دیتا ہے۔ یہاں بارڈر سیکورٹی فورس (بی ایس ایف) کے جوانوں کو اونٹ پر سفر کرنے کی تربیت دی جاتی ہے جو راجستھان کے کئی مقامات پر ٹرانسپورٹ کا واحد وسیلہ ہے۔ میرے دورے کے دوران ایک بی ایس ایف افسر نے مجھ سے پوچھا 'سر! کیا آپ اونٹ کی سواری کرنا پسند کریں گے؟' میں نے کہا 'کیوں نہیں'۔ جب میں اس نہایت نیک جانور کی پشت پر بیٹھا تو مجھے الور ضلع کے اپنے تشہیر کار دور اور اونٹ کے ذریعہ نارائن پور گاؤں کے سفر یاد آ گئے۔

راجستھان میں سفر کرنا ہمیشہ ایک ایڈونچر رہا ہے۔ بھرت پور ضلع جہاں پر ہندوستان کا سب سے مشہور چڑیا گھر ہے، سے لوٹتے ہوئے ایک ناقابل فراموش واقعہ مجھے یاد آیا۔ ایک دن مجھے سنگھ کے کسی کام کے لیے سیکری نام کے ایک چھوٹے سے قصبہ میں جانا تھا۔ اس سفر میں مجھے ایک بس بھرت پور سے کاماں تک کی لینی تھی اور سیکری جانے کے لئے کاماں سے بس بدلنی تھی۔ کاماں پہنچنے کے بعد مجھے پتہ چلا کہ بارش کے سبب سیکری جانے والی بس رد ہو گئی تھی، لیکن چونکہ وہاں ایک اہم فنکشن تھا، جس کو میں چھوڑ نہیں سکتا تھا، میں نے اس سفر کو پیدل ہی پورا کرنے کا فیصلہ کیا اور 45 کلومیٹر کی مسافت طے کرتے ہوئے میں وقت مقررہ پر سیکری پہنچ گیا۔ اس سفر میں مجھے کئی گھنٹے لگے اور سنگھ کے تشہیر کار کے طور پر ایسی کئی لمبی پد یاترا میں یہ سب سے لمبی تھی۔

سنگھ شاکھاؤں کی عام سرگرمیوں کے انتظام و انصرام کے علاوہ نوجوان رضا کاروں کو تعلیم دینے میں میں خاص دلچسپی لیتا تھا، جس سے کراچی میں پروان چڑھا میرا شوق خطابت یہاں بھی جاری رہا۔ بیشتر رضا کار انگریزی اور انگریزی میں پڑھائے جانے والے موضوعات کو سیکھنے کے خواہش مند تھے۔ اب بھی کبھی کبھی الور سے لوگ آکر مجھے بتاتے ہیں کہ میں نے فلاں فلاں سبجیکٹ انھیں پڑھائے تھے۔

محنت اور ڈسپلن کا سبق

سنگھ کا ایک تشہیر کار بہت سادگی سے زندگی گزارتا ہے۔ وہ صبر اور سخت محنت کرنے والا ہوتا ہے۔ میں معمول کے مطابق اپنے کپڑے دھوتا تھا، کبھی کبھی کھانا بھی بناتا تھا۔ کھانا، پیسہ، سفر یا راجستھان کی سخت آب و ہوا کی مشکلات نے مجھے کبھی اپنی راہ سے نہیں ڈگمگایا، لیکن —— اور یہ قارئین کو عجیب محسوس ہوگا کہ میں ایک چیز سے خوف زدہ رہتا تھا، بچھوے سے۔ جولائی 1949 میں سنگھ پر سے پابندی ہٹنے پر مجھے ریاست کے ہاڑوتی علاقہ میں کام کرنے کے لئے کہا گیا، جس میں کوٹا، بوندی اور جھالواڑ —— یہ تین اضلاع شامل تھے، یہاں روزانہ شاکھا میں کسی نہ کسی کو بیر

میں پٹی باندھے دیکھ کر میں متعجب ہوتا۔ مجھے بتایا گیا کہ وہ سب 'نروا' کے شکار تھے، پانی سے پیدا ہونے والے پیر کے کیڑوں کی بیماری میں مبتلا۔

اس پورے علاقہ میں صرف کوٹہ شہر میں پانی کی سپلائی ہوتی تھی۔ دیگر سبھی مقامات پر لوگ پینے اور دیگر ضرورتوں کے پانی کے لیے تالابوں اور کنوؤں پر منحصر تھے، کیونکہ ان کی دیکھ بھال ٹھیک ڈھنگ سے نہیں ہوتی تھی اور وہ کبھی کبھی ہی صاف کیے جاتے تھے۔ وہ ایک عجیب سی بیماری کا ذریعہ بن گئے تھے جس کے بارے میں میں بالکل انجان تھا۔ جب یہ کیڑا متاثر شخص کے پیر پر نظر آتا تو وہ اپنا پیر پانی میں ڈال دیتا تھا، جس سے وہ کیڑا اس پیر میں اور زیادہ اندر داخل ہو جاتا تھا۔ پھر وہ شخص بہت صبر کے ساتھ اور دھیرے سے لکڑی کی چھوٹی سی 'سینک' سے اسے جسم سے باہر نکال دیتا تھا، لیکن اس عمل میں اگر کیڑا ٹوٹ جائے تو فوراً ہی پھر سے جسم میں داخل ہو جاتا اور پیر میں کسی اور جگہ سے نکل آتا تھا۔ اس بیماری سے نجات پانے میں مریض کو دردناک لمحوں سے گزرنا پڑتا تھا، اس لئے جتنے سال میں نے اس علاقہ میں کام کیا، جب بھی میں کسی سویم سیوک کے پیر میں پٹی بندھی ہوئی دیکھتا تو خوف زدہ ہو کر خود سے پوچھتا 'اگر مجھے بھی نروا ہو جائے تو؟'

ایسا ہی ایک خوفناک تجربہ مجھے تب ہوا جب میں چتوڑ ضلع کے ایک گاؤں میں گیا۔ میں رات کو ایک سویم سیوک کے گھر ٹھہرا تھا۔ جب میں صبح سو کر اٹھا تو اس نے مجھ سے پوچھا 'بھائی صاحب، کیا آپ تالاب میں نہانا پسند کریں گے یا آپ کے غسل کے لئے پانی یہیں لے آؤں؟' مجھے تیرنا اچھا لگتا تھا، اس لئے میں نے کہا کہ میں تالاب میں ہی نہانا پسند کروں گا۔ جب ہم وہاں پہنچے تو میں نے دیکھا، وہاں تالاب تو نہیں، ایک چھوٹی سی 'باوڑی' ضرور تھی۔ جب میرے ساتھی نے میرے چہرے پر مایوسی کا شائبہ دیکھا تو وہ بولا 'فکر مت کرو، بس کود پڑو، آپ کو مزہ آئے گا'۔ میں نے ویسا ہی کیا اور جتنا میں کر سکتا تھا، پانی میں خوب ہاتھ پیر چلائے اور کچھ دیر بعد پانی سے باہر آیا۔ جب میں نے باوڑی کو دوبارہ دیکھا تو میرے ہوش اڑ گئے۔ پانی کے اوپر سیکڑوں سانپ گھوم رہے تھے، جو پہلے شاید دیوار سے سٹے بیٹھے ہوں گے، لیکن صاف طور پر میرے تیرنے سے متحرک ہو گئے تھے۔ جیسے ہی میں وہاں سے بھاگا، میرے میزبان نے لاپروائی سے کہا 'ڈرنے کی کوئی بات نہیں، یہ میٹھے پانی کے بڑے سیدھے سانپ ہیں'۔

جہاں تک میری بات تھی، اس دن کے غسل نے میرے جسم پر ایک 'رینگتا سا' احساس کرا دیا تھا۔

اپنے راجستھان کے دنوں کا ایک اور پریشان کن تجربہ مجھے یاد ہے۔ مجھے ایک نہایت ضروری کام سے اچانک دہلی جانا پڑ گیا۔ شام ہو چکی تھی اور صبح ہونے تک مجھے دہلی پہنچنا ہی تھا۔ میں اس وقت جہاں تھا، وہاں سے کوئی بس یا سواری گاڑی مہیا نہیں تھی، لیکن ایک دھیمی مال گاڑی ضرور تھی، جو جلد ہی وہاں پہنچنے والی تھی۔ میرے پاس بس یہی ایک متبادل تھا کہ گارڈ کی اجازت سے مجھے کسی طرح اس مال گاڑی میں جگہ مل جائے۔ گارڈ ایک فراخ دل انسان تھا اور اس نے مجھے ازراہ مذاق کہا کہ آپ نمک کے اس بستر پر آرام کیجئے۔ اس ٹرین میں کھلے مال ڈبوں میں نمک لے جایا جا رہا تھا۔ دسمبر کا مہینہ تھا، جو پورے شمالی ہند کے سب سے سرد مہینوں میں سے ایک ہوتا ہے۔ میرا سفر اور زیادہ آرام دہ بنانے کے لئے سردیوں کے کہرے نے نمک کے ڈھیر پر ایک نمدار کمبل سا بچھا دیا تھا نمک کے اس بستر پر، اور اوڑھنے کے لئے کچھ بھی نہ ہونے سے، میں نے دہلی تک کا سفر سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے طے کیا۔

راجستھان میں گزارے دس برسوں میں اس طرح کے تجربات نے مجھے مضبوط بنا دیا۔ ان تجربات نے زندگی کے ان تلخ حقائق سے مجھے آشنا کر دیا، جو میرے کروڑوں ہم وطن روز جھیلتے رہتے ہیں۔ انھوں نے میری روزمرہ کی عادتوں میں خوش آئند ڈسپلن پیدا کر دیا۔ میں نے تھوڑے میں گزارا کرنا سیکھ لیا۔ میرے نجی خرچ کچھ بھی نہیں تھے۔ بلاشبہ اس سلسلہ میں میں مستثنیٰ نہیں تھا۔ جسمانی آسائش کے معاملے میں سبھی سنگھ تشہیر کاروں کی زندگی سخت تھی، لیکن نفسیاتی اور روحانی تسکین کے معاملے میں بہت مفید تھی۔

3

مہاتما گاندھی کا المناک قتل

آنے والی نسلوں کو مشکل سے یقین ہوگا کہ کبھی گوشت پوست کا ایسا شخص اس زمین پر ہوا کرتا تھا۔

— عظیم سائنس داں البرٹ آئنسٹائن کا مہاتما گاندھی کو خراج عقیدت

راجستھان میں میری زندگی کی ابتدا میں ہی سنگھ کو اپنی تاریخ کے مشکل ترین 'اگنی پریکشا' کا سامنا کرنا پڑا۔ میں اس وقت الور میں تھا، جب 30 رجنوری 1948 کی شام کو یہ افسوسناک خبر ملی کہ مہاتما گاندھی جب روز کی طرح دہلی میں اپنی سرو دھرم پرارتھنا سبھا میں جا رہے تھے، تب ان کا قتل ہو گیا۔ یہ سن کر میں بدحواس ہو گیا۔

ہندوستان کی آزادی کے حصول کے گاندھی جی کے انداز فکر سے سنگھ کے کچھ اختلافات تھے، لیکن نظریاتی بنیاد پر یہ اختلاف معمولی تھا۔ سنگھ کے لوگوں کے دل میں گاندھی جی کے تئیں جو احترام تھا وہ ان تنازعات کے سبب کبھی کم نہیں ہوا۔ میں اپنی بات کہوں تو اپنی عوامی زندگی کے اس شروعاتی دور میں بھی میرے دل میں ان کے تئیں گہری عقیدت کا جذبہ پروان چڑھ گیا تھا اور وہ جذبہ وقت گزرنے کے ساتھ اور مضبوط ہوتا گیا۔ مجھے گاندھی جی کی جس بات نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ تھی ان کی پوری ایمانداری اور شخصیت کی شفافیت۔

وہ شخص جس نے اس گناہ کا ارتکاب کیا تھا وہ مہاراشٹر کا رہنے والا ہندو مہاسبھا کا ایک رکن ناتھورام ونائک گوڈسے تھا۔ وہ کبھی سنگھ کا سویم سیوک رہا تھا، لیکن سنگھ کے ساتھ گہرے نظریاتی اختلافات ہونے کے سبب پندرہ برس پہلے ہی تنظیم چھوڑ چکا تھا۔ یہ الزام لگاتے ہوئے کہ 'سنگھ نے ہندوؤں کو نپنسک بنا دیا ہے'، وہ حقیقت میں اس کا سخت نقاد بن گیا تھا۔ سنگھ سے اس کی خاص شکایت یہ تھی کہ اس نے ہندوؤں کی 'عسکری روح' کو نرم کر دیا تھا، جس سے وہ کوئی جارحانہ کارروائی کرنے کے قابل نہیں رہ گئے تھے۔ سنگھ کے ذریعہ کردار سازی پر زور دینے کا وہ مذاق اڑایا کرتا تھا۔ مراٹھی میگزین 'اگرنی' میں 1933 اور اس کے بعد شائع اس کے مضامین ظاہر کرتے ہیں کہ اس کے دل میں سنگھ کے تئیں کتنی کڑواہٹ تھی۔

سنگھ کے سربراہ شری گروجی اس وقت مدراس میں تھے، جب انھیں گاندھی جی کے قتل کی خبر ملی۔ انھوں نے وزیراعظم نہرو، نائب وزیراعظم سردار پٹیل اور مہاتما جی کے بیٹے دیوداس گاندھی کو فوراً ٹیلی گرام بھیجا، جس میں ایک عظیم شخص پر اس سفاکانہ قاتلانہ حملے پر اظہار غم کیا گیا تھا۔ اسی دن انھوں نے یہ ہدایت جاری کرتے ہوئے سنگھ کی سبھی اکائیوں کو بھی ایک ٹیلی گرام بھیجا کہ 'صد احترام مہاتما جی کی افسوسناک موت پر

ہندو رسم و رواج کے مطابق وہ تیرہ دنوں تک 'شوک' منائیں۔' ہم سبھی کو بھی 'شوک' کی اس مدت میں تنظیم کے سبھی کاموں کو ملتوی کرنے کی ہدایت جاری کی گئی۔

وزیر اعظم نہرو کو اگلے دن ناگپور سے بھیجے گئے خط میں شری گرو جی نے مزید سخت اور غیر مشتبہ الفاظ میں گوڈسے کے جرم کی مذمت کی۔ ایک جنونی اور غیر انسانی دل رکھنے والے شخص کے ذریعہ کیے گئے اس قابل مذمت کام نے دنیا کی نظروں میں ہمارے سماج کے ماتھے پر سیاہ داغ لگا دیا تھا۔ اگر دشمن ملک کے کسی آدمی نے یہ کام کیا ہوتا تو بھی یہ غلط ہوتا، کیونکہ قابل احترام مہاتما جی کی زندگی کسی مخصوص سماج کی سرحدوں میں قید نہیں تھی بلکہ انسانیت کے فلاح کے لیے وقف تھی، لیکن چونکہ اس گناہ کا مرتکب ہمارے ملک کا ہی ہے، اس میں کوئی تعجب نہیں کہ تمام قوم پرستوں کا دل آج نا قابل برداشت درد سے بھرا پڑا ہے۔ جب سے میں نے یہ خبر سنی ہے میرے داخلی وجود میں خلا پیدا ہو گیا۔ ایک کامیاب لیڈر پر حملہ، جو مختلف نظریوں کے لوگوں کو ایک ساتھ لاکر انھیں ایک ہی راستہ پر چلا سکتا تھا، سچ مچ غداری ہے نہ صرف مہاتما جی بلکہ پورے قوم کے ساتھ۔ انھوں نے مہاتما جی کے قاتل سے 'ٹھیک طرح سے نمٹنے' کے لئے وزیر اعظم سے اپیل کی۔ اس کے ساتھ کتنی بھی سختی کا سلوک کیوں نہ کیا جائے وہ ہمارے غم کے سامنے نرم ہی ظاہر ہوگا۔

گاندھی جی اور راشٹریہ سویم سیوک سنگھ: ایک باہمی قابل احترام رشتہ

میں نے شری گرو جی کے خط کو تفصیل سے اس لئے لکھا کہ وہ اس جھوٹ کا پردہ فاش کرتا ہے جو آج بھی ہمارے مخالفین کہتے نہیں تھکتے ہیں کہ سنگھ گاندھی جی کے تئیں نفرت سے بھرا ہوا تھا اور ان کے قتل میں اس کا بھی ہاتھ تھا۔ یہاں پر سنگھ اور گاندھی جی کی آپسی احترام کے رشتے پر کچھ اور کہنا ضروری ہے۔ اپنے 'اکاتمتا اشروت' میں جو ہندوستان کے قومی اتحاد کا دلکش گیت ہے، سنگھ مہاتما جی کو سحر کے وقت یاد کرنے والے شخص میں سے ایک مانتا ہے اور ایسا نہیں ہے کہ ان کا نام بعد میں جوڑا گیا ہو۔ 1946 میں جب گاندھی جی باحیات تھے، سنگھ کے شکشا ورگ طبقہ کو خطاب کرتے ہوئے شری گرو جی نے انھیں 'عالمی سطح پر محترم' بتایا تھا۔

گاندھی جی 25 دسمبر 1934 کو مہاراشٹر کے وردھا جہاں انھوں نے اپنا ایک آشرم قائم کیا تھا، میں پہلی مرتبہ سنگھ کے کیمپ میں گئے تھے۔ گاندھی جی وردھا آئے ہوئے تھے اور یہ جان کر کہ تقریباً 1500 سویم سیوک شہر میں جمع ہوئے ہیں، انھوں نے کیمپ کو دیکھنے کی خواہش کی۔ ان کے ساتھ میرا بین اور مہادیو ڈیسائی بھی تھے۔ انھیں پھولوں کا ہار پہنایا گیا اور گارڈ آف آنر پیش کیا گیا۔

اس ملاقات کے بارے میں گاندھی جی نے کہا 'میں بے حد متاثر ہوا ہوں'۔

آزادی کے فوراً بعد، جب فرقہ وارانہ تشدد اور ہندو-مسلمانوں کے درمیان آپسی اعتماد کے فقدان سے ملک کے حالات خراب ہو گئے تھے، گاندھی جی نے ایک پیغام بھیجا کہ وہ شری گرو جی سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ 'شری گرو جی' 12 ستمبر 1947 کو ان سے ملنے کے لئے فوراً برلا ہاؤس گئے۔ گاندھی جی نے ان سے سنگھ کے بارے میں کولکاتہ اور دہلی سے ملی مختلف شکایتوں کا ذکر کیا۔ شری گرو جی نے انھیں یقین دلایا کہ وہ ہر ایک سویم سیوک کے بہترین کردار کی سند نہیں دے سکتے، سنگھ کی حکمت عملی مکمل طور پر ہندوؤں اور ہندو مذہب کی خدمت کرنا ہے۔ انھوں نے واضح کیا کہ وہ کسی دیگر فرقے کو نہیں دھمکاتے ہیں۔ سنگھ عدم تشدد میں یقین نہیں رکھتا، لیکن وہ جارحیت کا بھی حامی نہیں ہے۔

گاندھی جی اور شری گرو جی کی اس ملاقات میں دونوں اس بات پر متفق تھے کہ فرقہ وارانہ پاگل پن کو فوراً روکنے کے لئے سبھی طرح کی

کوشش ہونی چاہیے۔اس دن کی پرارتھنا سبھا میں گاندھی جی نے شری گرو جی سے ہوئی بات چیت کو ذکر کیا اور سامعین سے کہا کہ چاروں اطراف میں پھیلے بدترین تشدد سے سنگھ سربراہ بہت غم زدہ تھے اور وہ امن اور حالات کو معمول پر لانے کے لئے ایک اپیل جاری کریں گے۔ وہ اپیل اخبارات میں شائع ہوئی اور آل انڈیا ریڈیو سے بھی نشر کی گئی۔

اسی ملاقات میں گاندھی جی نے شری گرو جی سے کہا کہ وہ سنگھ کے کارکنان کے ایک اجلاس کو خطاب کرنا چاہتے ہیں۔اس کے مطابق 16 رستمبر 1947 کو وہ دہلی کی بھنگی کالونی میں جمع ہوئے سنگھ کے تقریباً 500 سویم سیوکوں سے ملاقات کرنے آئے۔ وہاں انھوں نے تیرہ برس قبل وردھا کے سنگھ کیمپ میں اپنے دورہ کی بات بتائی۔ ' کچھ برس قبل جب سنگھ کے بانی زندہ تھے، میں آپ لوگوں کے کیمپ میں گیا تھا۔ میں وہاں ڈسپلن کا جذبہ، چھوت چھات سے پاک اور سادگی سے بھری روزمرہ کی زندگی دیکھ کر کافی متاثر ہوا۔کوئی بھی تنظیم، جو خدمت اور جذبہ ایثار کے اونچے آدرشوں سے بھری ہو، اپنی طاقت کی توسیع کئے بغیر نہیں رہ سکتی'

درج بالا تذکرہ سے یہ وضاحت ہو جانی چاہیے کہ کچھ ایشوز پر گاندھی جی سے اختلاف ہونے کے باوجود سنگھ ان کا بہت احترام کرتا تھا اور گاندھی جی نے بھی اس مثبت رویہ کا جواب ویسے ہی دیا، اس لئے سنگھ کے لئے ان کے قتل کی بات سوچنا بھی خطرناک اور گناہ کا ارتکاب کرنا ہوتا، لیکن افسوس! ایک قوم کی زندگی میں جھوٹ کئی مرتبہ سچ سے جیت جاتا ہے۔اس طرح مہاتما گاندھی کے قتل میں سنگھ کا کوئی کردار نہیں ہونے پر بھی، ایک ایسا سچ جو بعد میں حکومت کے ذریعہ مقرر کی گئی تفتیشی کمیشن کی رپورٹ سے بھی ثابت ہوا، کچھ عناصر کے ذریعہ زور وشور سے سنگھ پر پابندی لگانے کا مطالبہ کیا گیا۔

یہاں تک کہ کانگریس کے وہ لوگ بھی جو دل ہی دل میں سنگھ سے ہمدردی رکھتے تھے، اس شرانگیز مہم سے، جو خاص طور پر کمیونسٹوں کے ذریعہ شروع کی گئی تھی، بچ نہ سکے۔انھوں نے 'مہاتما کو سیکورٹی فراہم کرنے' میں ناکامی کے لئے اجتماعی طور سے سردار پٹیل کا 'استعفیٰ' طلب کیا اور ایک 'فرقہ پرست تنظیم' سے تعلق ہونے کی وجہ سے ڈاکٹر شیاما پرساد مکھرجی کو مرکزی کابینہ سے ہٹانے کا بھی مطالبہ کیا۔انھوں نے اس سچائی کو بھی نظرانداز کردیا کہ خود مہاتما گاندھی کے زور دینے پر ہی پنڈت جواہر لال نہرو نے ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر اور ڈاکٹر مکھرجی کو، جو کہ دونوں ہی کانگریس کے رکن نہیں تھے، اگست 1947 کے بعد تشکیل کردہ پہلی کابینہ میں شامل کیا تھا۔گاندھی جی نے وزیر اعظم کو یہ مشورہ اس لئے دیا تھا کہ وہ ہندوستان کی پہلی حکومت کو اپنے کردار میں قومی اور نمائندگی میں وسیع تر بنیادوں پر دیکھنا چاہتے تھے۔

3 مہینوں کے لئے الور جیل میں

سنگھ پر پابندی لگانے کے بائیں بازو کا مطالبہ گرمانے سے حکومت 4 رفروری 1948 کو اس کے آگے جھک گئی۔اس سے 3 دن قبل ایک ملک گیر کارروائی میں بیشتر تشہیر کاروں کے ساتھ ہزاروں سویم سیوک جیل میں بند کردیئے گئے۔ مجھے الور سینٹرل جیل میں قیدی بنایا گیا تھا۔سنگھ کے دیگر کارکنان کے ساتھ عام مجرموں کے درمیان اس جیل میں میں نے اگلے 3 ماہ گزارے۔

بعد میں مجھے پتہ چلا کہ حکومت نے راجستھان میں خصوصی طور سے سنگھ کارکنان کو نشانہ کیوں بنایا۔ بے بنیاد اور نفرت آمیز افواہ یہ تھی کہ پاکستان میں سندھ سے ہجرت کرکے آئے سنگھ کے بیشتر کارکنان راجستھان میں پابہ عمل ہیں اور مہاتما گاندھی کے قتل کی سازش کے پس پشت ان کا ہاتھ ہے۔بدقسمتی سے ان افواہوں نے 5 رفروری 1948 کو وزیر اعظم نہرو کے ذریعہ سردار پٹیل کو تحریر کردہ ایک خط سے زور پکڑا— ''ایسا لگتا

ہے کہ بڑی تعداد میں سنگھ کے ممبران ریاست کے کئی حصوں، خصوصی طور سے بھرت پور اور الور میں بسے ہیں۔ انھوں نے وہاں مختلف النوع سودے بھی کیے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ وہاں پر اپنی بنیاد منظم کر کے اپنے مقاصد کے لئے دیگر مقامات پر خفیہ کاروائیاں انجام دیں۔''

جیل کی زندگی مشکل ترین تھی۔ وہاں کا کھانا ہماری پریشانی کی سب سے بڑی وجہ تھی، جس میں دو موٹی روٹیاں اور بے مزہ دال ہوتی تھی، جو دن میں 2 مرتبہ دی جاتی تھیں۔ سبزی کبھی نہیں دی جاتی تھی۔ جیل کے کھانے سے بے دلی نے ایک دن دلچسپ واقعہ کو جنم دیا۔ جیلر نے مجھے بلایا اور کہا کہ جیل کے دوسرے قیدی مہا شیوراتری ★ کے موقع پر کل شام تک برت رکھیں گے۔ کیا آپ اور آپ کے ساتھی اس برت میں ان کے ساتھ شامل ہوں گے؟

میں نے کہا کہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ بات کر کے بتاؤں گا۔ جب میں نے ان سے پوچھا تو سبھی بولے 'ہرگز نہیں۔ یہاں جس طرح کا کھانا مل رہا ہے، ہم اور بھوک سے مر رہے ہیں۔ ہمیں اور کوئی اپواس (روزہ) نہیں رکھنا ہے، خواہ شیوراتری ہو یا کچھ اور۔'

میں نے یہ فیصلہ جیلر تک پہنچا دیا۔ وہ بولا 'ٹھیک ہے، کل صبح آپ کو آپ کے معمول کی خوراک دی جائے گی۔'

دن کے 11 بجے لنچ کے لئے گھنٹی بجی اور ہم نے اپنا معمول کا بے مزہ کھانا کھایا، لیکن جب شام کو 5 بجے جیل کی گھنٹی پھر بجی تو ہمیں تعجب ہوا۔ کھانے کا ابھی وقت نہیں ہوا ہے، پھر انھوں نے گھنٹی کیوں بجائی؟ ہمیں جلد ہی پتہ چلا کہ دیگر قیدی اس وقت اپنا شیوراتری کا اپواس (روزہ) توڑ رہے تھے اور جیل افسروں نے ان کے لئے خصوصی حلوہ کا انتظام کیا تھا۔ اس سے ہمیں بہت ناامیدی اور حسد کا احساس ہوا۔

ہم نے آپس میں صلاح کی اور اگلی صبح جیلر کے پاس پہنچے اور بولے 'ہم آج برت رکھیں گے۔ اس کے لئے برائے مہربانی آپ ضروری انتظام کریں۔'

اس نے تعجب سے کہا 'لیکن شیوراتری برت تو کل تھا۔ آپ لوگ آج کس لئے برت رکھ رہے ہیں؟'

ہم میں سے ایک تیز طرار قیدی کے پاس جواب تیار تھا 'کل شیو برادری کی شیوراتری تھی، ویشنوں کی آج ہے۔'

جیلر نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ ہماری جانب دیکھا اور بولا 'اگر آپ لوگ شام کو حلوہ کھانا چاہتے ہیں تو میں اس کا انتظام کر دوں گا۔ اس کے لئے آپ کو 'اپواس' کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'

اور جیل میں ہماری طویل رہائش میں وہ اکلوتی مٹھائی ہمیں ملی۔

اگست 1948 میں جیل سے رہائی کے بعد میں نے اگلے چار پانچ ماہ اپنے ایک ساتھی سویم سیوک دیویندر سوروپ کے ساتھ انڈرگراؤنڈ رہ کر گزارے۔ یہ میرے سینئروں کا حکم تھا، جنھیں اندیشہ تھا کہ سنگھ کی اہم سرگرمیوں کا سنچالن کرنے کے سبب مجھے دوبارہ گرفتار نہ کر لیا جائے۔ انڈرگراؤنڈ ہو کر زندگی گزارنا میری زندگی کا سب سے دلخراش تجربہ تھا۔ سب سے بڑا چیلنج اپنے لئے سر چھپانے کے لئے بسیرا تلاش کرنا تھا۔ کسی کے گھر میں کچھ دن رہنے کے بعد ہمیں وہی کہانی سننے کو ملتی تھی 'معاف کیجئے، ہم آپ کو اب اور یہاں نہیں رکھ سکتے۔ آپ کے یہاں رہنے سے ہمارے گھر میں لڑائی ہو رہی ہے۔' مکان مالک پولس کے چھاپوں کے سبب خوف زدہ تھے، جو کہ پردیس میں سنگھ کارکن کے چھپے ہونے کے اندیشہ سے تلاش میں مصروف تھی۔ جلد ہی میں گنتی بھول گیا کہ ہم نے کتنے گھر تبدیل کیے۔ تب ہم الور اور بھرت پور ضلع میں بھٹک رہے تھے۔

★ مہا شیوراتری ایک ہندو تہوار ہے جو کہ بھگوان شیو کے پاروتی سے شادی کے دن کو ظاہر کرتا ہے۔ اس تہوار میں اپواس کے بعد ہونے والی تقریب رات میں ہوتی ہے۔ شیو دیوی تری شکتی کے سنہارک ہیں دو ہیں برہما (خالق) - بھگوان (وشنو)، (محافظ)۔

ہماری مشکلات راجستھان کا سخت موسم مزید بڑھا رہا تھا۔ الور سب سے گرم مقام تھا جہاں پر میں بھی رہا ہوں۔ بھرت پور میں نل میں پانی نہیں آتا تھا، لہٰذا ہر صبح ہمیں نہانے کے لئے شہر کے باہر واقع تالاب میں جانا پڑتا تھا۔

اگنی پریکشا سے آر ایس ایس کا باعزت باہر آنا

12 ؍جولائی 1949 کو سنگھ پر سے پابندی ہٹالی گئی۔ شری گروجی کی قیادت میں یہ تنظیم صبر وتحمل، اپنے مقاصد اور آدرشوں میں دوگنے یقین کے ساتھ اس اگنی پریکشا سے باہر آئی۔ پابندی کے جواز کا مکمل فقدان اس زندہ سچائی سے واضح تھا کہ مہاتما گاندھی کے قتل کے معاملہ میں سنگھ کے ایک بھی سویم سیوک کو سزا ملنی تو دور، اس پر فرد جرم داخل نہیں ہوئی۔ اس سے یہ ثابت ہوگیا کہ پابندی اور سنگھ کے کارکنان کی قید پوری طرح سیاست سے متاثر الزامات پر مبنی تھی۔ پٹیل اور نہرو کے مابین ہوئی خط وکتابت سے بھی یہ بات ظاہر ہوتی ہے۔ اس معاملہ میں سنگھ کے ملوث ہونے کی تفتیش کی اپیل کرتے ہوئے وزیراعظم کے ذریعہ لکھے گئے خط کا پراعتماد جواب دیتے ہوئے پٹیل نے گاندھی جی کے قتل کے ایک مہینہ کے اندر 27 ؍فروری 1948 کو بھیجے گئے ایک خط میں لکھا 'میں تقریباً روزانہ باپو کے قتل کے معاملہ میں چل رہی تفتیش کی پیش رفت پر نظر رکھے ہوئے ہوں۔ تمام اہم ملزمین اپنی سرگرمیوں کے بارے میں طویل اور وضاحتی بیان دے چکے تھے۔ ان تفصیلات سے یہ صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ سنگھ کا اس معاملہ میں کوئی ہاتھ نہیں تھا۔'

اس کے باوجود 13 ؍نومبر 1948 کی رات کو خوفناک بنگال ایسٹ پر یزنرس ایکٹ کے تحت شری گروجی کو پھر سے گرفتار کرلیا گیا۔ یہ وہی ایکٹ تھا، جسے آزادی سے قبل نہرو نے ایک 'کالا قانون' بتایا تھا۔ اپنی گرفتاری کے بعد شری گروجی نے جلد ہی سبھی سویم سیوکوں کو ایک خط لکھا — ''یہ حالات ہتک آمیز ہیں۔ اس غیرانسانی جبر کے سامنے مجبوری کے ساتھ جھکتے چلے جانا آزاد ہندوستان کے شہریوں کی عزت کے ساتھ کھیلنا اور ہماری مہذب آزاد ریاست کی عظمت پر حملہ ہے، اس لئے میری آپ سے اپیل ہے کہ اپنے مقصد کے حصول کے لئے سینہ سپر ہوں۔''

انھوں نے 9 ؍دسمبر 1948 کو ملک گیر ستیہ گرہ کی اپیل کی۔ ستیہ گرہوں کا اہم نعرہ نہرو حکومت کے لئے صاف چیلنج تھا کہ 'سنگھ کے خلاف الزام ثابت کرو یا پابندی ہٹاؤ۔'

ملک گیر پیمانہ پر ستیہ گرہ کامیاب رہی۔

حکومت نے جلد ہی سمجھ لیا کہ شری گروجی کی غیرقانونی گرفتاری سے رائے عامہ اس کے خلاف جارہی تھی، اس لئے پیش قدمی ختم کرنے کے مقصد سے سردار پٹیل نے ایک خط کے توسط سے شری گروجی سے اپیل کی کہ وہ سنگھ کا ایک تحریری آئین تیار کرواکر اسے حکومت کے جائزہ کے لئے بھیجیں۔ اس وقت تک سنگھ تحریری یا زبانی آئین کے بغیر ہی کام کررہا تھا۔ شری گروجی نے اس صلاح کو فوراً منظور کرلیا اور سنگھ کے آئین کا مسودہ جون 1949 میں حکومت کو بھیج دیا گیا۔ اس سے 12 ؍جولائی 1949 کو سنگھ پر سے پابندی ہٹانے اور اگلے دن شری گروجی کو رہا کرنے کا راستہ صاف ہوگیا۔ اس موقع پر سردار پٹیل کے ذریعہ شری گروجی کو لکھے گئے خط میں ایک دردناک تبصرہ کیا گیا تھا۔ میرے قریبی لوگ ہی جانتے ہیں کہ سنگھ پر سے پابندی ہٹنے سے مجھے کتنی مسرت ہوئی۔ میری جانب سے آپ کو تہہ دل سے مبارک باد۔

پابندی ختم ہونے کے بعد شری گروجی نے اگست 1949 کو پورے ہندوستان کا دورہ شروع کیا۔ وہ 6 ماہ تک ملک کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک سفر کرتے رہے۔ جہاں جہاں وہ گئے، ان کا پرجوش خیرمقدم کیا گیا۔ 23 ؍اگست 1949 کو دہلی کی ایک عظیم عوامی ریلی

میں جس جوش وخروش سے ان کا استقبال ہوا، اس کی جانب پوری دنیا مرکوز ہوئی۔ برٹش براڈ کاسٹک کارپوریشن (بی بی سی) ریڈیو کی رپورٹ تھی۔'شری گروجی ہندوستانی افق پر ابھرا ایک درخشاں ستارہ ہیں۔ ان کے علاوہ اگر کوئی ہندوستانی اتنی عظیم عوامی ریلی کو متوجہ کرسکتا ہے تو وہ ہے وزیراعظم نہرو۔'

اپنے خطابات میں فراخ دلی اور توازن سے انھوں نے سنگھ کے باہر کے لوگوں کا بھی دل جیت لیا۔'اب ہمیں سنگھ پر لگی پابندی کے باب کو ختم کردینا چاہیے۔' انھوں نے سویم سیوکوں اور سنگھ کے حامیوں سے کہا 'اپنے دل میں ان لوگوں کے تئیں نفرت کا جذبہ نہ آنے دیں، جنہیں آپ سمجھتے ہیں کہ انھوں نے آپ کے ساتھ ناانصافی کی ہے۔ ہمارے دانت کبھی کبھی زبان کو کاٹ لیتے ہیں تو کیا ہم انھیں توڑ دیتے ہیں؟ جنھوں نے ہمارے ساتھ ناانصافی کی ہے وہ بھی ہمارے ہی ہیں، اس لئے ہمیں وہ سب بھول کر انھیں معاف کردینا چاہیے۔'

گاندھی قتل معاملہ میں کپور کمیشن کے ذریعہ آر ایس ایس بری الذمہ

نہرو حکومت کی 4 رفروری 1948 کے نوٹیفکیشن میں سنگھ پر پابندی لگانے کی کئی وجوہات دی گئی تھیں، جن میں گاندھی جی کے قتل میں سنگھ کے ملوث ہونے کا الزام اہم تھا۔ اس میں کہا گیا کہ یہ پتہ چلا ہے کہ ملک کے کئی حصوں میں سنگھ کے کئی ممبران آگ زنی، لوٹ، ڈکیتی، قتل جیسے کئی تشدد آمیز کاموں میں شامل رہے ہیں اور انھوں نے غیر قانونی ہتھیار اور گولہ بارود جمع کیے ہیں۔ انھیں لوگوں کو دہشت گردانہ طریقہ اپنانے کی اپیل کرنے والے پرچے تقسیم کرنے، آتشیں اسلحے جمع کرنے، لوگوں کے دل میں حکومت کے تئیں نفرت پیدا کرنے اور پولس اور فوج میں مجرمانہ دراندازی کا قصوروار پایا گیا ہے۔ یہ سرگرمیاں خفیہ طور سے چلائی جارہی ہیں۔ سنگھ کی یہ قابل اعتراض اور نقصان دہ سرگرمیاں من وعن جاری ہیں اور سنگھ کی سرگرمیوں سے متاثر اور ان کے اشارے پر ہوئے تشدد میں کئی افراد ہلاک ہوگئے ہیں۔ حال ہی میں خود گاندھی جی تشدد کی اس سوچ کے شکار ہوئے ہیں۔

یہ تعجب کی بات ہے کہ اسی حکومت نے جب پابندی ہٹائی تب اس کے نوٹیفکیشن میں ان الزامات کا کہیں ذکر نہیں تھا، جس میں سب سے سنگین تھا گاندھی جی کے قتل کی سوچ کا ذریعہ بننا۔ ان کی جگہ پر نوٹیفکیشن میں دعویٰ کیا گیا کہ چونکہ سنگھ نے اپنے لیے ایک تحریری آئین کی منظوری دے دی ہے، اس لئے اس تنظیم کو کام کرنے کی اجازت دی جارہی ہے۔

سنگھ کے خلاف چلائی جارہی مذمتی مہم کا یہیں خاتمہ نہیں ہوا۔ تقریباً دو دہائی بعد اس وقت اندرا گاندھی کی قیادت والی حکومت نے 1966 میں مہاتما گاندھی کے قتل کے منصوبہ کی گہرائی سے جانچ کے لیے ایک عدالتی کمیشن کی تشکیل کی۔ اس کمیشن کے صدر تھے سپریم کورٹ کے ریٹائرڈ جسٹس جے ایل کپور۔ کمیشن نے 100 سے زائد گواہوں سے پوچھ گچھ کی اور اپنی رپورٹ 1969 میں پیش کی۔ کپور کمیشن کے مطابق ''ملزمین کا سنگھ کا رکن ہونا ثابت نہیں ہوا ہے اور نہ ہی قتل میں اس تنظیم کا ہاتھ ہونا پایا گیا ہے۔ (جلد 1 صفحہ 186)، اس نے یہ بھی بیان دیا کہ دہلی میں بھی اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ ایک تنظیم کے طور پر سنگھ مہاتما گاندھی یا کانگریس کے اعلیٰ لیڈروں کے خلاف پرتشدد سرگرمیوں میں ملوث تھا۔ (جلد 1 صفحہ 66)

جو بات میرے لئے باعث تکلیف ہے وہ یہ کہ حکومت کے ذریعہ تشکیل کردہ کمیشن کے ذریعہ مہاتما جی کے قتل کے معاملہ میں سنگھ کو اتنے یقینی اور فیصلہ کن طور سے بے قصور ثابت کرنے کے بعد بھی ہمارے کئی مخالفین، خاص طور پر بائیں بازوؤں کی جماعتیں، اب بھی سنگھ کو بدنام

کرنے میں لگی ہیں۔ وہ گوبیلس (Goebbels) کے اس اصول میں یقین کرتے نظر آتے ہیں کہ 'اگر ایک جھوٹ کو 100 مرتبہ دوہرایا جائے تو وہ سچ بن جاتا ہے۔

یہاں یہ ذکر کرنا موضوع سے الگ نہ ہوگا کہ کانگریس کا ایک بڑا طبقہ، جو سنگھ کی حب الوطنی کا قائل تھا اور جو گاندھی جی کے قتل کے معاملہ میں اس کے بے قصور ہونے پر مطمئن تھا، اس بات کے لئے آمادہ تھا کہ کانگریس اور سنگھ مل کر کام کریں۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی نے 7 اکتوبر 1949 کو سنگھ کے ممبروں کو کانگریس میں شمولیت کی اپیل کرنے کا فیصلہ بھی لے لیا تھا۔ اس فیصلہ سے فوراً بعد ہی ایک تنازع پیدا ہوگیا۔

اے جی کھیر، جو اتر پردیش حکومت میں وزیر اور سردار پٹیل کے نزدیکی تھے، نے یہ سوال پوچھ کر مخالفین کو ٹھیس پہنچائی کہ کچھ کانگریسی سنگھ کے ممبروں کے داخلہ کی مخالفت کیوں کر رہے ہیں، جبکہ آریہ سماج اور جمعیۃ العلماء کے ممبر بھی اس کا حصہ ہیں؟ اس کی وجہ یہ نہیں ہوسکتی کہ وہ گاندھی جی کے قتل میں شامل تھے، کیونکہ وہ قانونی عدالت کے ذریعہ اس الزام سے بری کیے جاچکے ہیں۔ کھیر نے یہ بھی کہا کہ انھیں فاشسٹ بتانے، گالیاں دینے، بے عزت کرنے اور پرانے الزامات کو بار بار دہرانے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا اور نہ ہی یہ کوئی گاندھی وادی طریقہ ہے۔

بدقسمتی سے پنڈت نہرو سنگھ کے بارے میں اپنے تعصبات سے کبھی آزاد نہیں ہوسکے اور 15 دسمبر 1950 کو سردار پٹیل کے انتقال کے بعد کانگریس پارٹی میں ایسا کوئی نہیں بچا جو مختلف اہم ایشوز پر نہرو کے منفی نظریات کے خلاف آواز اٹھا سکے۔

سیکولرازم کا میرا پہلا سبق

میں راجستھان میں ایک تشہیر کار کے طور پر کام کر رہا تھا۔ یہاں رہ کر سنگھ سے متعلق ان مباحثوں اور واقعات پر جتنا ممکن تھا اتنی باریکی سے نظر رکھ رہا تھا۔ ایک دن سنگھ سے متعلق کسی کام سے میں دہلی آیا ہوا تھا۔ شری گروجی بھی وہاں تھے۔ میں ان سے ملنے کے لئے بارہ کھمبا روڈ میں واقع لالہ ہنس راج کے گھر گیا۔ میں نے ان سے اس سوال کے بارے میں رہنمائی کی اپیل کی جس سے میں دل برداشتہ تھا۔ حالانکہ گاندھی جی کے قتل میں سنگھ شامل نہیں تھا۔ اخبارات کہہ رہے ہیں کہ سنگھ پر پابندی دو وجوہات سے نہیں ہٹ سکتی۔ پہلی، سنگھ ایک خفیہ تنظیم ہے جس کا کوئی تحریری دستور تک نہیں ہے اور دوسرے وہ سیکولرازم میں یقین نہیں رکھتا۔ آخر کار آزاد ہندوستان کا آئین، جو اس وقت تیار کیا جا رہا ہے، ایک سیکولر آئین ہوگا۔ ہم اس اعتراض کا کیا جواب دیں؟

> شری گروجی نے میرے سوال کے دونوں حصوں کا یوں جواب دیا کہ صرف اس لئے کہ ہمارا کوئی تحریری دستور نہیں ہے، ہمیں ایک خفیہ تنظیم کیسے مانا جاسکتا ہے؟ جبکہ برطانیہ جیسے ملک کا بھی کوئی تحریری آئین نہیں ہے۔ اس وجہ سے وہاں کی حکومت ایک خفیہ حکومت تو نہیں بن جاتی؟ آئین کا نہ ہونا کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ سنگھ ایک رسمی آئین بنانے کے لئے تیار ہے، اگر ہماری تنظیم کے ساتھ حکومت کا صرف یہی مسئلہ ہے۔
>
> جہاں تک تمہارے سوال کے دوسرے حصہ کا تعلق ہے۔ انھوں نے کہنا جاری رکھا۔ یہ ایک بدقسمتی ہی ہے کہ جس حکومت نے ایک مذہبی میکانزم ریاست کی شناخت 'اشوک چکر' کو ہندوستان کی قومی شناخت کے طور پر منتخب کیا ہے وہی ہم سے سیکولرازم کی بات کر رہی ہے۔ ہندو روایت کے مطابق، ایک ریاست کو سیکولر ہونا چاہیے۔ اس نے تھیوکریسی کو کبھی منظور نہیں کیا ہے۔ وہ ہر شخص کو اپنی پسند کی عبادت کی پوری آزادی دیتا ہے۔ وہ نہ تو سماج میں اور نہ شہریوں کے ساتھ ریاست کے تعلقات میں کسی کے مذہب کی بنیاد پر اس سے بھید بھاؤ کا

رشتہ رکھتا ہے۔ اس نے کسی ایک عبادت کو کبھی ریاست کی شناخت نہیں بنائی، جبکہ سمراٹ اشوک نے اپنی ریاست کو بدھ ریاست قرار دیا۔ اگر ہم کچھ مسلمانوں کے کردار پر اعتراض کرتے ہیں تو اس لئے نہیں کہ وہ اسلام کے ماننے والے ہیں بلکہ ہندوستان کے تئیں ان کی بے وفائی کے سبب، اس لئے سنگھ کو سیکولرازم کا مخالف کہنا، سیکولرازم کے مفہوم اور سنگھ کی سوچ، دونوں سے نابلد ہونے کا اشارہ دیتا ہے۔

سیکولرازم پر یہ میرا پہلا درس تھا اور اس وقت میں اکیس برس کا تھا۔

میں یہاں وضاحت کرنا چاہوں گا کہ سنگھ کا آئین تیار کرنے میں میری بھی چھوٹی سی کاوش ہے جس کا سہرا ان دو لیڈروں کے سر جاتا ہے، جن کا میری سیاسی زندگی پر سب سے زیادہ اثر پڑا ہے۔ شری راج پال پوری اور پنڈت دین دیال اپادھیائے۔ میں دین دیال جی سے پہلی مرتبہ 1947 میں دہلی میں ملا تھا، لیکن وہ ملاقات بہت مختصر تھی۔ 1948 کے بعد سے ہی وہ میری زندگی پر نظریاتی، سیاسی اور اخلاقی اثرات کا وسیلہ بن گئے۔

اس وقت تک سنگھ پر سے پابندی ختم نہیں ہوئی تھی۔ شری گرو جی نے سردار پٹیل کا مشورہ مان لیا تھا کہ سنگھ کو ایک تحریری آئین اپنالینا چاہیے۔ انھوں نے آئین بنانے کا کام چار ممبروں والی ایک کمیٹی کو سونپ دیا تھا۔ کمیٹی کے ممبر تھے دین دیال جی، راج پال پوری، ایس ایس آپٹے اور ایکنا تھ راناڈے۔ راج پال جی مجھے میرے سندھ کے دنوں سے ہی نزدیک سے جانتے تھے۔ چودہ برس کی عمر میں 1942 میں جب میں نے سنگھ میں داخلہ لیا تھا، تب وہ سندھ کے علاقائی تشہیر کار تھے۔ جب انھوں نے مجھے دہلی میں دیکھا، جہاں میں الور سے کسی کام سے آیا تھا تو فوراً مجھ سے بولے 'تم یہاں آجاؤ اور ہمارے کام میں حصہ لو'۔

سنگھ کے لیڈروں کے ذریعہ حکومت کو تحریری آئین دکھانے کے بعد انھیں اس کی منظوری لینے میں کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ ساری کہانی ایک تکنیکی رسم نبھانے سے زیادہ نہیں تھی۔ اگر حکومت سنگھ سے اتنا ہی چاہتی تھی تو اس پر پابندی لگانے کی کیا ضرورت تھی اور مہاتما گاندھی کے قتل سے جوڑ کر سنگھ کو بدنام کیوں کیا گیا؟

4

ڈاکٹر مکھر جی اور بھارتیہ جن سنگھ کا قیام

ہمیں یہ ظاہر کرنے کی اہلیت ہونی چاہئے کہ ہندوستان نہ صرف تصور میں بلکہ حقیقت میں ایک ایسا ملک ہے جہاں ہندو، مسلم، عیسائی اور سب لوگ بلا کسی خوف کے اور مساوی حقوق کے ساتھ رہتے ہیں۔ یہی وہ آئین ہے جس کی ہم نے تشکیل کی ہے اور جسے ہم ایمانداری اور سختی کے ساتھ نافذ کرنے کے لئے پابند عہد ہیں۔

— ڈاکٹر شیاما پرساد مکھرجی کی کشمیر مسئلہ پر، اگست 1952 میں پارلیمنٹ میں کی گئی تقریر۔

راجستھان میں میری کارکردگی کے دوران ایک اہم سیاسی واقعہ رونما ہوا، جس نے میری نجی زندگی کو بنیادی طور سے متاثر کیا۔ دو آزاد مگر ایک ساتھ وقوع پذیر واقعہ نے ایک نئی پارٹی کو جنم دیا، جس نے ہندوستانی سیاست کی خمیر اور سمت کو فیصلہ کن طریقہ سے تبدیل کر دیا تھا۔

ان میں سے پہلا واقعہ بنگال کے عظیم راشٹروادی لیڈر ڈاکٹر شیاما پرساد مکھرجی (1901-53) سے متعلق تھا۔ ان کے والد سر آشوتوش مکھرجی ایک معزز ماہر تعلیم اور محبِ وطن تھے، جو کولکاتہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور کولکاتہ ہائی کورٹ کے ایک جج کے طور پر تمام لوگوں کے لئے قابل احترام تھے۔ بنگالی سماج میں ان کا احترام اس بات سے اور بھی زیادہ ہو گیا کہ ان کے بیٹے بھی 33 برس کی عمر میں کولکاتہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر بنے، ہندوستانی یونیورسٹی کی تاریخ میں سب سے جوان وائس چانسلر۔

مسلم لیگ کی فرقہ پرست سیاست جو واضح طور پر بنگال کی تقسیم کے اندیشہ کی جانب اشارہ کر رہی تھی، سے محتاط ہو کر ڈاکٹر مکھرجی جلد ہی بنگال کی نیشنلسٹ سیاست میں آگئے۔ وہ خود ایک غیر فرقہ وارانہ طرز فکر کے حامل تھے، جو کرشک پرجا پارٹی کے فضل الحق اور بنگال کے عظیم شاعروں میں سے ایک قاضی نذر الاسلام سے ان کی گہری دوستی سے واضح ہے، لیکن ڈاکٹر مکھرجی ہندوستان کے اتحاد و سالمیت پر منڈلاتے خطرات اور ملک کے مشرقی حصہ میں ہندوؤں کے تیزی سے حاشیہ پر آنے سے فکر مند تھے۔ ان کا یہ اندیشہ ہی ہندو مہاسبھا سے ان کی قربت کا باعث بنا، جو اس وقت ویر ساورکر کی قیادت میں سرگرم تھی۔ 1939 میں وہ اس کے کارگزار صدر بن گئے اور متحدہ ہندوستان کی مکمل اور فوری

آزادی کو اپنی پارٹی کا نصب العین قرار دیا۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ان کے ہندو مہا سبھا میں شامل ہونے کا مہاتما گاندھی نے یہ کہتے ہوئے خیر مقدم کیا تھا کہ 'مدن موہن مالویہ جی کے بعد ہندوؤں کی قیادت کرنے کے لئے کوئی چاہئے تھا۔' گاندھی جی کو ڈاکٹر مکھرجی کے قوم پرستانہ نقطہ نظر پر پورا یقین تھا اور ان کے ہندو مہا سبھا سے منسلک ہونے پر آشیرواد دیتے ہوئے انھوں نے ڈاکٹر مکھرجی سے کہا کہ پٹیل ایک ہندو ذہن کانگریسی ہے، آپ ایک کانگریسی ذہن کا ہندو سبھائی بنئے۔

جیسا پہلے بتایا جا چکا ہے کہ گاندھی جی نے ہی نہرو کی پہلی مابعد آزادی کابینہ میں ڈاکٹر مکھرجی کو شامل کرنے پر زور دیا تھا۔ ہندوستان کے پہلے وزیر صنعت کے طور پر انھوں نے بنگلور کے ہندوستان ایرونوٹکس، چترنجن لوکوموٹیو فیکٹری اور سندھری فرٹیلائزر پلانٹ جیسے کئی بڑی عوامی یونٹوں کی بنیاد رکھی تھی۔ ایک وزیر کے طور پر قلیل مدتی دور میں غیر معمولی حصولیابیوں سے ان کے وژن اور انتظامی اہلیت کا پتہ چلتا ہے۔

حکومت میں پنڈت نہرو کے ساتھ کام کرنے کے باوجود ان کے ساتھ ڈاکٹر مکھرجی کے سیاسی اختلافات کم نہیں ہوئے۔ کشمیر ایشو پر نہرو کے طرز عمل سے وہ خوش نہیں تھے۔ نہرو نے ★ 1950 میں پاکستان کے وزیر اعظم لیاقت علی خاں کے ساتھ جو معاہدہ کیا، اسے ڈاکٹر مکھرجی مشرقی پاکستان کے ہندو مفادات کے ساتھ غداری مانتے تھے۔

وہ مشرقی پاکستان میں لاکھوں ہندو شرنارتھیوں کی آمد کے لئے پاکستان کو براہ راست ذمہ دار ٹھہرانا چاہتے تھے۔ ان کا موقف تھا کہ ان کی آمد مذہبی استحصال اور حکومت کے ذریعہ اسپانسر تشدد کا نتیجہ تھی۔ معاہدہ پر دستخط ہونے سے بچانے میں ناکام ہونے پر انھوں نے کابینہ سے استعفیٰ دے دیا اور 19 اپریل 1950 کو لوک سبھا میں ایک مسحور کن تقریر کے ذریعہ ملک کو اپنے نظریہ سے آگاہ کرا دیا۔ آزاد ہندوستان کی تاریخ کی عظیم ترین تقاریر میں سے ایک اس تقریر نے 'شیر پارلیمنٹ' کے طور پر ان کی مقبولیت کو مستحکم کر دیا۔ انھوں نے کہا:

> ''جب ہمارے ملک کی تقسیم یقینی ہو گئی تب میں نے بنگال کی تقسیم کے حق میں رائے عامہ بنانے میں ایک اہم کردار نبھایا۔ مجھے لگتا تھا کہ اگر ایسا نہیں کیا گیا تو پورا بنگال اور شاید آسام بھی، پاکستان میں چلا جائے گا۔ اس بات کی معلومات نہ ہوتے ہوئے بھی کہ میں دیگر لوگوں کے ساتھ مرکزی کابینہ میں شامل ہوں گا، میں نے مشرقی بنگال کے ہندوؤں کو یہ کہتے ہوئے یقین دلایا کہ اگر وہ آئندہ کی پاکستان حکومت کے ذریعہ ستائے جاتے ہیں، اگر انھیں شہریت کے بنیادی حقوق سے محروم کیا جاتا ہے، اگر ان کی زندگی یا وقار پر حملہ کیا

★ مکھن لال کی کتاب 'سیکولر پالیٹکس کیپٹل ایجنڈا' (انڈیا فرسٹ فاؤنڈیشن کے ذریعہ شائع) میں 1950 میں نہرو-لیاقت کے درمیان ہوئے مذاکرہ کی تفصیل پیش کی گئی ہے۔ (صفحہ 208-207) انھوں نے مرکزی حکومت میں عوامی کام اور پناہ گزیں باز آبادکاری کے وزیر این وی گاڈگل کی سوانح حیات سے اخذ کرتے ہوئے کہا ہے کہ ہند-پاک معاہدہ کا خاکہ جو نہرو نے منظوری کے لئے کابینہ کے سامنے رکھا، اس میں مسلمانوں کو سرکاری ملازمتوں اور ہندوستان کی ریاستوں کی رہنما اکائیوں میں ان کی آبادی کی بنیاد پر ریزرویشن دینے کے التزامات تھے، چونکہ بیشتر وزراء نے اپنی زبان بند رکھی، گاڈگل نے کہا 'یہ التزام کانگریس کے نظریہ کو ختم کر دیں گے۔ ملک کو علیحدہ الیکٹورل ڈویژن کو قبول کرنے کا خمیازہ تقسیم کی شکل میں بھگتنا پڑا ہے۔ آپ اسے وہ زہر دوبارہ پینے کے لئے کہہ رہے ہیں۔' کابینہ میں مکمل طور پر غور و خوض کے بعد اگلے دن ریزرویشن کے پورے التزام کو ہٹا دیا گیا۔ جب پاکستان کے وزیر اعظم نے سردار پٹیل سے ملاقات کی اور مسلمانوں کے لئے محفوظ نوکریوں وسیٹوں کا موضوع اٹھایا، تب پٹیل نے واضح طور پر کہہ دیا '(میری) پارٹی اسے منظور نہیں کرے گی اور ملک اس تلخ گولی کو نہیں نگلے گا۔ ہم نے ایک پاکستان بننے دیا، یہ ضرورت سے زیادہ ہے۔' یہ سب کچھ واضح کرتا ہے کہ ڈاکٹر مکھرجی کیوں نہرو سے پاکستان کے ایشو پر ناراض تھے اور انھوں نے وزارتی کونسل سے استعفیٰ دینے کا فیصلہ کیوں لیا؟

جاتا ہے تو آزاد ہندوستان محض تماشائی بن کر نہیں رہے گا اور اس کام کے لیے حکومت ہند اور ہندوستانی عوام دونوں جرأت مندانہ اقدام کریں گے۔ پاکستان کے تئیں ہمارے رویے سے بھی خوشی نہیں ہوئی۔ یہ رویہ کمزور، غیر مستحکم اور لڑکھڑانے والا رہا۔ ہماری شرافت اور بے عملی کو پاکستان نے ہماری کمزوری سمجھا۔ اس نے پاکستان کو اور بھی زیادہ شدت پسند بنا دیا۔''

نہرو کابینہ سے رضا کارانہ طور سے نکلنے کے بعد ڈاکٹر مکھرجی کو ایک بہتر قوم پرست سیاسی اسٹیج کی ضرورت محسوس ہوئی، جہاں سے وہ کانگریس حکومت کی غلط پالیسیوں کو چیلنج دے سکیں۔ اس وقت تک ہندو مہا سبھا سے ان کی دلچسپی ختم ہو چکی تھی، اس لئے انھوں نے ایک نئی سیاسی پارٹی کی تشکیل کا فیصلہ لیا، جو ذات، نسل اور لسانی امتیازات سے پاک ایک عام قوم پرست اور جمہوری اسٹیج پر سبھی ہندوستانیوں کو متحد کر سکے۔ انھوں نے اس کا نام رکھا ''بھارتیہ جن سنگھ۔''

ایک آزاد مگر ساتھ ساتھ ہونے والے واقعہ میں سنگھ کے کئی لوگ نیشنلسٹ سیاسی پلیٹ فارم کے قیام کی ضرورت پر زور دینے لگے تھے۔ یہ ضرورت مہاتما گاندھی کے قتل کے بعد تنظیم پر لگائی گئی پابندی کی آگنی پریکشا، کانگریس اور کمیونسٹ لیڈروں کے ذریعہ مشتہر کیے جانے والے طویل اور بے بنیاد، لیکن مکمل مذمتی مہم اور مستحکم سیاسی عناصر میں سے کہیں سے بھی حمایت کے فقدان کے سبب محسوس کی گئی تھی۔ سنگھ کے اعلیٰ عہدیداران کے درمیان ایک گہرے غور وخوض کے دوران ان لوگوں نے جو ایک نئی سیاسی پارٹی کے قیام کے حامی تھے، اپنے موقف کا اظہار کیا۔ ہمارے پاس ذہنی ہم آہنگی رکھنے والی ایک سیاسی پارٹی ہونی چاہئے، جو قومی مفادات کے تحفظ اور سیاسی میدان میں سنگھ کے قوم پرستانہ نظریہ کو اجاگر کر سکے۔ بھارتیہ جن سنگھ قوم پرستانہ شناخت والے ایک مقبول لیڈر کے ذریعہ قائم کی گئی تنظیم ہے، اس لئے اس نئی پارٹی کا دائرہ بڑھانے اور اسے مضبوط کرنے میں سنگھ کو اہم کردار نبھانا چاہیے۔

ابتدا میں شری گروجی سیاسی پارٹیوں اور یقینی طور پر کسی ایک پارٹی سے سنگھ کا تعلق نہیں چاہتے تھے۔ سیاست سے دور رہنے کی ان کی روش کبھی غیر دلچسپ لگتی تھی۔ ان کا یقین تھا کہ سنگھ کا خاص مقصد سماجی اتحاد، انفرادی کردار سازی اور ہندوستان کی درخشاں تہذیب اور روحانی وراثت پر مبنی ہندوستان کے قومی نشاۃ ثانیہ میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ ان کا نظریہ تھا کہ سیاست کا مقابلہ جاتی اور تفریقی فطرت اس کوشش کو نقصان پہنچائے گی۔ ان کا یہ بھی ماننا تھا کہ اقتدار کی سیاست اس کے کارکنان کو بدعنوانی کی جانب لے جاتی ہے۔ اقتدار کے یہ کھلاڑی اگر گہری سچائی کے مالک نہیں ہیں تو وہ اپنے خود غرضانہ مفادات کی تکمیل کے لئے قومی تشکیل کے اونچے آدرشوں کو بھلا دیں گے۔

شری گروجی پختہ عزائم کے شخص تھے اور ایک نئی سیاسی پارٹی کے حامیوں کے لئے انھیں اپنے موقف کو تبدیل کرنے کے لئے رضامند کرنا آسان نہیں تھا۔ اگر آخر میں وہ اس بات پر راضی ہو گئے کہ سنگھ بھارتیہ جن سنگھ سے تعاون کرے تو یہ صرف خصوصی طور سے ڈاکٹر مکھرجی کی عظیم شخصیت کے تئیں ان کی تعظیم کے سبب ہوا۔ جلد ہی ڈاکٹر مکھرجی اور شری گروجی کے مابین ہم آہنگی ہو گئی۔ ڈاکٹر مکھرجی ایک قومی لیڈر تھے، لیکن ان کی اپنی تنظیمی بنیاد نہیں تھی۔ سنگھ کو ذہنی ہم آہنگی والے ایک سیاسی اسٹیج کی تلاش تھی۔ اس طرح ڈاکٹر مکھرجی اور سنگھ کے مابین اچھا تال میل بنا۔ سنگھ کے کچھ اہل کارکنان کا جن سنگھ کے لئے کام کرنے کے ڈاکٹر مکھرجی کے مطالبہ کو شری گروجی نے قبول کر لیا۔ انھوں نے اپنے سب سے معتمد ساتھی پنڈت دین دیال اپادھیائے اور کچھ دیگر پرچارکوں کو جن سنگھ کی تشکیل میں ڈاکٹر مکھرجی کی مدد کرنے کا کام سونپا۔

21 اکتوبر 1951 کو نئی دہلی میں بھارتیہ جن سنگھ کا قیام عمل میں آیا۔ اس موقع پر ڈاکٹر مکھرجی نے اپنی صدارتی تقریر کا اختتام کرتے ہوئے کہا:

''ہمارے کارکنان ہمیشہ یہ یاد رکھیں۔صرف قربانی اور والہانہ خدمت سے ہی لوگوں کی حمایت اور اعتماد کو حاصل کیا جاسکتا ہے۔ہم ہندوستان کے نشاۃ ثانیہ اور تشکیل نو کی مہم کے لئے پرعزم ہیں۔ بھارت ماتا اپنے بچوں کو پکار رہی ہے۔ہم اپنی ذات، طبقہ اور مذہب کے فرق کو ایک جانب رکھ دیں اور بھارت ماتا کی خدمت میں مصروف ہوجائیں۔ ہمارا حال خواہ کتنا بھی تاریک ہو، ہمارا مستقبل تابناک ہے اور ہندوستان کو دنیا میں کئی بڑے کام کرنے ہیں۔ ہماری پارٹی کا سمبل 'لیمپ' ہے۔وہ امید اور اتحاد، عزم اور بہادری کی روشنی پھیلا رہا ہے۔ہم اس روشنی کو اپنے ہاتھوں میں لے کر چلیں اور اس تاریکی واداسی کو دور کریں، جس نے تقسیم کے بعد ہمارے ملک کو ڈس لیا ہے۔ ہمارے طویل سفر کی محض یہ ابتدا ہے۔سروشکتی مان ایشور ہمیں طاقت اور ہمت عطا کرے، تا کہ ہم سدا صحیح راہ پر چل سکیں۔خوف ہمیں گھبرا نہ سکے اور عیش وعشرت ہمیں للچا نہ سکے تا کہ روحانی اور طبعی دونوں شکلوں میں ایک عظیم اور طاقتور ہندوستان کی تشکیل نو میں ہم پوری طاقت سے اپنا تعاون دے سکیں، اور تا کہ مکمل بیدار ہندوستان عالمی امن کے تحفظ اور عالمی ترقی کے لئے ایک پراعتماد اور مقدس ذریعہ بنے۔''

آزاد ہندوستان میں کتنی مرتبہ ایک سیاسی اسٹیج سے ایسے مضبوط اور سبق آموز لفظ بولے گئے ہیں؟

جن سنگھ کا قیام میری زندگی کا ایک نقطہ انقلاب تھا۔ایک دن راجستھان کے دورے کے وقت پنڈت دین دیال جی نے مجھ سے ریاست میں پارٹی کی تنظیمی ذمہ داری کو سنبھالنے کے لئے کہا۔ میں نے ایسا 1952 میں اپنے سینئر ساتھی سندر سنگھ بھنڈاری کے ہمراہ کیا، جو بعد میں قومی سطح پر بھارتیہ جن سنگھ اور بی جے پی کے اہم ستون بن گئے۔جیسے جیسے میرا تنظیمی کام بڑھا، میں نے اپنا مرکز کوٹہ سے ریاست کی راجدھانی جے پور منتقل کرلیا۔

اس طرح ایک سیاسی کارکن کے طور پر میرا سفر شروع ہوا، جو بغیر کسی رکاوٹ کے مسلسل 56 برسوں سے چل رہا ہے۔

فروری 1953 میں کانپور میں پارٹی کا پہلا اجلاس ہوا۔راجستھان کے اپنے وفد کے ساتھ میں اجلاس میں شرکت کے لئے وہاں گیا تھا، جہاں میں ڈاکٹر مکھرجی، اٹل بہاری واجپئی، ناناجی دیشمکھ اور پارٹی کے دیگر کئی لیڈروں کے نزدیکی رابطے میں آیا۔جلد ہی ڈاکٹر مکھرجی کو پتہ چل گیا کہ دین دیال جی کتنے غیر معمولی دانشور اور منتظم تھے۔

بھارتیہ جن سنگھ کا کانپور اجلاس جموں وکشمیر کے ہندوستانی فیڈریشن میں مکمل طور پر انضمام کے لئے کل ہند تحریک چھیڑنے کے فیصلہ کے لئے ہمیشہ یاد کیا جائے گا۔سردار پٹیل کے ذریعہ شروع کیا گیا ریاستوں کے انضمام کا عمل پورے ملک میں کامیابی کے ساتھ نافذ کیا جا چکا تھا، صرف جموں وکشمیر ہی اس سے مستثنیٰ تھا۔یہ ہندوستان کی یکجہتی، اتحاد اور تحفظ کے لئے بھاری خطرہ تھا۔وزیر اعظم نہرو نے اس مسئلہ کو اقوام متحدہ میں لے جانے کی لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی صلاح مان کر اسے غیر ضروری طور پر بین الاقوامی مسئلہ بنا کر الجھا دیا تھا۔سردار پٹیل نے مضبوطی سے ایسا نہ کرنے کی صلاح دی تھی۔فطری طور پر اس بات پر لوگوں میں غیر اطمینانی، فکر اور غصہ تھا۔

بھارتیہ جن سنگھ نے اس حب الوطنی کے جذبہ کا برملا اظہار اس نعرہ کے توسط سے کیا تھا، جو جلد ہی بے حد مقبول ہوگیا۔''ایک دیش میں دو ودھان، دو پردھان اور دو نشان نہیں چلیں گے، نہیں چلیں گے۔'' آزاد ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں سب سے پرجوش نعروں میں سے ایک کے طور پر اسے یاد کیا جائے گا۔کئی لوگوں کو اب اس بات کی جانکاری نہیں ہوگی کہ وہ زمانہ ایسا تھا جب ریاست جموں وکشمیر کے کسی بھی حصہ میں ترنگا نہیں لہرایا جاسکتا تھا۔اس سے بھی زیادہ تشویش ناک سچائی یہ تھی کہ ریاست جموں وکشمیر سے باہر رہنے والا شخص خصوصی اجازت کے بغیر اس

ریاست میں داخل نہیں ہوسکتا تھا۔ نہ تو سپریم کورٹ، نہ الیکشن کمیشن، نہ CAG، یہاں تک کہ صدر جمہوریہ کو بھی ریاست جموں وکشمیر میں کوئی اختیار حاصل نہیں تھا۔ اگست 1952 میں جموں میں ایک عظیم الشان جلسہ کو خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر مکھر جی نے اعلان کیا:

''میں آپ کو ہندوستانی آئین دلواؤں گا یا اس کے لئے اپنی جان قربان کردوں گا۔''

اگلے سال ہندوستانی آئین جموں وکشمیر میں نافذ نہ ہونے کی مخالفت میں مرد متحرک ڈاکٹر مکھر جی نے ایک ملک گیر تحریک کی قیادت کی۔ 2005 میں جب بھارتیہ جنتا پارٹی نے اپنی سلور جبلی منائی اور اپنے جن سنگھ کے دنوں سے لے کر اب تک ہونے والے واقعات کا پھر سے مظاہرہ کیا تو پٹھان کوٹ پل کی دوسری جانب منعقد ایک خاص جلسہ کو خطاب کرنے کے لئے مجھے مدعو کیا گیا۔ یہی وہ مقام تھا جہاں 11 رمئی 1953 کو ڈاکٹر مکھر جی کو گرفتار کیا گیا تھا۔ جموں وکشمیر پولس نے اس وقت انھیں حراست میں لے لیا، جب وہ اس ریاست میں بغیر اجازت کے داخل ہوئے۔ اپنے پارٹی صدر کے ساتھ پورے ملک سے آئے ہزاروں جن سنگھ کارکنان بھی جموں وکشمیر میں بغیر اجازت داخل ہوئے۔ ان سبھی نے گرفتاریاں دیں۔ پولس کی بربریت کا سامنا کیا اور ہندوستان کی یکجہتی اور سالمیت کے لئے قربانیاں دیں۔ پٹھان کوٹ پل کے پاس ہوئی ریلی میں مجھے اس ضعیفہ کو اعزاز بخشنے کا فخر حاصل ہوا، جس کے شوہر پل پار کرکے ترنگا لہرانے کے وقت پولس کی گولیوں سے شہید ہوئے تھے۔

لیکن کشمیر ستیہ گرہ میں سب سے بڑی قربانی ڈاکٹر مکھر جی کی تھی۔ ان کی گرفتاری کے بعد انھیں سری نگر کے باہری علاقہ میں ایک مکان میں نظر بند کر دیا گیا۔ وہاں وہ شدید بیمار ہو گئے اور 23 رجون 1953 کو پراسرار حالات میں ان کا انتقال ہو گیا۔ حراست میں ہوئی موت نے کئی اندیشوں کو جنم دیا۔ ایک آزادانہ تفتیش کا مطالبہ کیا گیا۔ ان کی ماں یوگ مایا دیوی نے وزیر اعظم نہرو کو ایک خط لکھا، لیکن کوئی تفتیشی کمیشن نہیں بٹھایا گیا۔ ڈاکٹر مکھر جی کی شہادت کے بعد حکومت نے نفرت آمیز 'پرمٹ سسٹم' ختم کر دیا۔ اس نے ہندوستانی جمہوریت کے اداروں کے اختیارات پر جموں وکشمیر میں لگی ہوئی پابندی کو بھی ختم کر دیا۔ اس طرح الیکشن کمیشن اور CAG کے اختیارات کو جموں وکشمیر تک بڑھا دیا گیا، پھر بھی 'دو ودھان' سے متعلق ہماری فکرمندی، خصوصی طور پر دفعہ 370 کا نصف صدی سے زیادہ عرصہ تک بھی حل نہیں نکل سکا۔

حالانکہ میں ڈاکٹر مکھر جی سے تین یا چار مرتبہ ملا تھا، ان کے ساتھ میرے نجی تعلقات محدود تھے۔ ایسا اس لئے تھا کہ وہ دہلی میں رہتے تھے اور میں راجستھان میں، لیکن میں جب بھی ان سے ملا یا اپنے دہلی قیام کے دوران پارلیمنٹ میں ان کی تقریر سنی تھی، ان کے مضامین، خاص طور پر تعلیم اور جمہوریت پر، پڑھا تو ان کی شخصیت اور خیالات کی عظمت سے بے حد متاثر ہوا۔ جب میں پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں اور خود سے پوچھتا ہوں کہ میں نے اپنے متحرک اور متاثر کرنے والے ذرائع سے کیا سیکھا تو مجھے یہ جواب ملتا ہے کہ آر ایس ایس سے سماج کی منظم خدمت اور حب الوطنی، پنڈت دین دیال اپادھیائے سے میں نے آدرش واد اور عوامی زندگی میں خلوص اور ایمانداری حاصل کی ہے۔ ڈاکٹر مکھر جی سے میں نے قومی تعمیر کے ذریعہ کے طور پر اقدار پر مبنی جمہوریت کی اہمیت سیکھی ہے۔

5

پہلے لوک سبھا الیکشن میں حصہ لینے کا انبساط

بھارت انسانی برادری کی ماتر بھومی تھی اور سنسکرت یوروپی زبانوں کی جننی تھی، یہ ہمارے فلاسفی کی جننی تھی، جننی تھی عربوں کے توسط سے، ہمارے بیشتر اراضی کی، جننی تھی بدھ کے توسط سے، عیسائیت میں موجود آدرشوں کی، جننی تھی دیہی برادی کے توسط سے، خودمختاری اور جمہوریت کی بھارت ماتا کئی معنوں میں ہم سبھی کی جننی ہے۔

— ول ڈورانٹ، امریکی مؤرخ اور 'دی اسٹوری آف فلاسفی' کے مصنف

راجستھان میں گزارے میرے ابتدائی برسوں میں 1946 میں تشکیل شدہ آئین کمیٹی میں ہندوستان کے مستقبل آئین کے مواد پر بحث چل رہی تھی۔ ایسی بحثوں میں مجھے گہری دلچسپی تھی اور چھوٹے قصبوں میں جو بھی اخبار مہیا تھے ان میں دی گئی مختصر رپورٹوں کو میں دلچسپی کے ساتھ پڑھتا تھا۔ 26 رجنوری 1950 کو آئین کی منظوری اور ہندوستان کو ایک جمہوریت قرار دیا جانا ہمارے قدیم ملک کا ایک تاریخی دن تھا، تقریباً اتنا ہی اہم جتنا 15 راگست 1947۔ اس دن میں الور میں تھا۔ راجاؤں اور مہاراجاؤں کی سرزمین راجستھان میں، جہاں کا اقتدار عوام کے ہاتھوں میں آ گیا تھا، جشن کا ماحول تھا۔

آئین سازی کے بعد جلد ہی یہ اعلان کر دیا گیا کہ پہلا عام انتخاب 1952 میں ہوگا۔ اس سے ملک کی سیاسی سرگرمی میں تیزی سے اضافہ ہوا۔ اس نے مجھے بھی جمہوریت کے سب سے بڑے جشن 'الیکشن' میں حصہ لینے کا موقع دیا۔ پہلے عام انتخابات میں میں نے بھرت پور میں کام کیا اور 1957 میں کوٹا، بوندی، جھالاواڑ علاقوں میں 'انتخابی جنگ' کی دیکھ ریکھ کی۔ تب سے اب تک میں نے ہر ایک عام انتخاب میں حصہ لیا ہے، جس میں 2004 کا عام انتخاب بھی شامل ہے، جس نے چودھویں لوک سبھا کو منتخب کیا۔

وقت گزرنے کے ساتھ حالات کتنے بدل گئے ہیں۔ 1952 میں انتخابی سرگرمیوں کی دیکھ ریکھ کرنے میں آنے والی مشکلات کے بارے میں بیشتر لوگ آج تصور بھی نہیں کر سکتے، کیونکہ پہلے کبھی الیکشن نہیں ہوئے تھے، یہاں تک کہ الیکشن کمیشن بھی ناتجربہ کار تھا۔ پورے ملک

میں اب صرف ایک یا دو دن میں اسمبلی الیکشن پورا کرالینا آج ایک عام بات ہے۔ اس کے برعکس، مجھے یاد ہے کہ پہلے عام انتخابات میں صرف ایک اسمبلی حلقہ میں الیکشن مکمل کرانے میں تین ہفتے لگ جاتے تھے۔ پانچ پولنگ مراکز پر الیکشن کرانے میں پورا دن صرف ہو جاتا تھا اور ایک دن چھوڑ کر پھر اگلے پانچ پولنگ مراکز لئے جاتے تھے اور یہ سلسلہ چلتا ہی رہتا تھا، اس لئے اگر کسی اسمبلی حلقہ میں 65-60 پولنگ مراکز ہوں، جو کہ اوسطاً تھیں تو پورے عمل میں 25-20 دن لگ جاتے تھے۔ پانچ پولنگ مراکز پر الیکشن کرانے کے بعد انتظامی ٹیم سبھی بیلٹ باکس اور دیگر ساز و سامان کو اگلے پانچ مقامات پر لے جاتی تھی۔ ہم کارکنان بھی اپنا سامان باندھتے، ٹرک پر سوار ہوتے اور سرکاری عملہ کے ساتھ اگلے ٹھکانے پر پہنچ جاتے تھے۔

ان دنوں تو کسی نے الیکٹرانک ووٹنگ مشین کا نام تک نہیں سنا تھا، بلکہ پورا ووٹنگ عمل ہی بالکل علیحدہ تھا۔ بیلٹ پیپر پر نہ تو امیدواروں کے نام ہوتے تھے، نہ انتخاب میں حصہ لے رہی پارٹیوں کا انتخابی نشان۔ بیلٹ پیپر پر 'ٹھپہ' تک نہیں لگایا جاتا تھا۔ اس کے بجائے پولنگ بوتھ پر ہر امیدوار کے لئے ایک الگ بکس ہوتا تھا، جس پر اس کا نام اور سیاسی پارٹی کا انتخابی نشان درج ہوتا تھا۔ رائے دہندگان کو بیلٹ پیپر- کاغذ کے ایک ٹکڑے کو، جو سائز میں ایک روپے کے نوٹ (اب ناپید) سے بڑا نہیں تھا، اپنی پسند کے امیدوار کے بکس میں ڈالنا ہوتا تھا۔

انتخابی ہیرا پھیری کا 'سائنس' پہلے عام انتخابات میں ہی جنم لے چکا تھا اور ووٹنگ میکانزم کی کمیوں کا فوری فائدہ بھی اٹھایا گیا۔ کچھ امیدواروں کے ایجنٹ پولنگ بوتھ کے باہر کھڑے ہو کر رائے دہندہ سے کہتے 'اپنا ووٹ بکسے میں مت ڈالنا، اسے جیب میں ڈال کر ہمارے پاس لے آؤ۔ اس کے عوض میں ہم تمہیں ایک روپئے کا نوٹ دیں گے۔' ان دنوں ایک روپیہ ایک بڑی رقم ہوا کرتی تھی۔ ایسے 30-25 بیلٹ پیپر جمع کرنے کے بعد ایجنٹ کا کوئی آدمی اندر جا کر اپنے امیدوار کے بکسے میں ڈال دیتا تھا۔

1952 کے ووٹنگ سسٹم میں ایک اور کمی تھی، چونکہ انتخابی نشان انتخابی حلقہ کے مطابق الاٹ کیے جاتے تھے۔ یہ ممکن تھا کہ ایک ہی انتخابی نشان مختلف انتخابی حلقوں میں مختلف پارٹیوں کے امیدواروں کو الاٹ کر دیا جاتا ہو۔ 1962 کے تیسرے عام انتخابات میں ہی کئی بیلٹ باکس کی جگہ پر ایک ہی باکس کا استعمال کیا گیا اور بیلٹ پیپر پر 'ٹھپہ' لگانے کا سسٹم شروع کیا گیا۔ یہ سب ہونے کے باوجود 1952 کے تجربہ میں سبھی کے سیکھنے کے لئے بہت کچھ تھا۔ سیاسی پارٹیوں، لیڈروں، امیدواروں، انتظامیہ، الیکشن کمیشن اور بلاشبہ خود رائے دہندگان کے لئے۔

پہلے عام انتخابات میں کمیشن نے 14 پارٹیوں کو 'قومی پارٹی' اور 60 کو 'ریاستی سطح کی پارٹیوں' کے طور پر منظوری دی۔ کوئی پیمانہ گزشتہ الیکشن میں بظاہر فراہم نہیں تھا، جس کا استعمال کیا جاسکتا تھا۔ ہر ایک قومی پارٹی کا ایک انتخابی نشان تھا، جو پورے ملک میں اس کے امیدواروں کے لئے محفوظ تھا۔ دیگر سبھی امیدواروں کو اپنے لئے 'آزاد' انتخابی نشان کی فہرست میں سے ایک کو منتخب کرنا ہوتا تھا۔

پہلے عام انتخابات کے بعد جن چار پارٹیوں کو ملک گیر لوک سبھا انتخابات میں 3 فیصد سے زیادہ ووٹ ملے، انھیں 'قومی پارٹیوں' کا درجہ دیا گیا۔ 12 پارٹیوں کو ریاستی اسمبلی انتخاب میں 3 فیصد سے زیادہ ووٹ حاصل ہوئے اور انھیں متعلقہ ریاستوں میں علاقائی پارٹیوں کے طور پر منظوری ملی۔

پہلے عام انتخابات کے دوران چیف الیکشن کمشنر سوکمارسین ایک ایماندار اور ہونہار افسر تھے۔ ہندوستان جیسے عظیم ملک میں اتنے بڑے پیمانے پر انتخابات مکمل کرانے کے لئے ساری مشکلات اور مشقت سے بھرپور زمینی تیاریاں کرنے کا سہرا انھیں کو جاتا ہے۔ ملک میں اتنی

زبردست تعلیمی پسماندگی کے سبب صرف نام کی بنیاد پر لوگوں سے رائے دہی کروانا ایک بڑا مسئلہ تھا۔ امیدواروں کو انتخابی نشان الاٹ کرنے کا آئیڈیا ماسٹر سین کا ہی تھا۔

انتخابات کے دو بنیادی حقائق سے میرا پہلا سامنا

1952 کے پہلے عام انتخابات کے بعد جلد ہی کوٹ پتلی انتخابی حلقہ میں اسمبلی کا ایک ضمنی انتخاب ہوا۔ دہلی - جے پور شاہراہ پر جے پور سے 45 کلومیٹر دور کوٹ پتلی راجستھان کا ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ اس ضمنی انتخاب میں مجھے ایک دلچسپ تجربہ ہوا، جس نے ہندوستانی انتخابات میں ایک رائے دہندہ کی پسند کو متاثر کرنے والے دو اہم اسباب کے بارے میں مجھے ابتدائی شعور عطا کیا۔

میری پارٹی نے کوٹ پتلی میں الیکشن مہم کی دیکھ ریکھ کی ذمہ داری مجھے سونپی تھی۔ میں نے حلقہ کے مسائل کا جائزہ لے کر کچھ مواد تیار کیا، جس میں یہ سمجھایا گیا تھا کہ اگر لوگوں نے ہمارے امیدوار کو ووٹ دیا تو جن سنگھ ان مسائل کا حل کیسے کرے گا۔ میں اپنے ساتھ راجستھان کے لئے پارٹی کا مینی فیسٹو بھی لایا تھا۔

میں پولنگ سے تقریباً ایک ماہ قبل انتخابی حلقہ میں پہنچ گیا اور جب تک انتخاب کا مکمل عمل ختم نہ ہو جائے، وہیں رہنے کا عہد کیا۔ جب میں جے پور سے لائے انتخابی لٹریچر کو گاڑی سے اتار رہا تھا تو میں نے اپنے امیدوار رام کرن سنگھ کو دیکھا، جو تھوڑی دور کھڑے عجیب نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ اس وقت میں ان سے آدھی عمر کا تھا، لیکن انھوں نے مجھے بہت احترام سے مخاطب کیا:

'آڈوانی جی، کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں اور میرے کارکنان اس لٹریچر کو علاقہ میں تقسیم کریں؟ لیکن کیوں؟ یہ مینی فیسٹو اور یہ پرچے ہماری انتخابی حکمت عملی کے لئے بالکل بے کار ہیں۔ انھیں تقسیم کرنے میں ہمارا بہت وقت ضائع ہوگا اور محنت بھی۔ آپ کہیں گے تو ہم انھیں تقسیم کر دیں گے، لیکن ہمیں ایک بھی اضافی ووٹ نہیں ملے گا۔'

انھوں نے مزید کہا 'آڈوانی جی، میں آپ سے ایک بات کہوں گا۔ اس انتخاب میں مجھے کوئی نہیں ہرا سکتا۔ یہ ایک گوجر اکثریتی علاقہ ہے اور اس الیکشن میں میں اکیلا گوجر ہوں۔' انھوں نے آگے جو کچھ کہا اس سے ہندوستان میں انتخابی حقائق کے بارے میں میری سمجھ میں اور اضافہ ہوا۔ 'سب سے پہلے تو ہر ایک گوجر ووٹر ہمیں ہی ووٹ دے گا، کیونکہ میں ایک گوجر ہوں۔ دوسرے، غیر گوجروں میں سے بھی بیشتر مجھے ہی ووٹ دیں گے، کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اس علاقہ میں، میں ہی الیکشن جیتوں گا۔ وہ ایک ہارنے والے امیدوار کو ووٹ دے کر اپنا ووٹ ضائع نہیں کریں گے۔'

پہلی وجہ ذات یعنی ذات ہندوستان کی ایک انوکھی چیز ہے۔ ہر شخص ایک ساتھ ہی اپنی کئی شناخت کو لے کر پیدا ہوتا ہے، جیسے اس کا ملک، اس کی جائے پیدائش، اس کا مذہب، اس کی زبان، اس کا کنبہ، لیکن ہندوستان میں، خاص طور سے ہندوؤں میں سب سے مؤثر کن شناخت ذات کی ہی ہے۔ سندھ میں ایسا نہیں تھا۔ 1947 میں سندھ سے راجستھان آنے کے بعد مجھے یاد ہے کہ جہاں کہیں بھی میں نے اپنا نام اور سندھ سے آیا ہوا شخص بتایا، تقریباً ہمیشہ ہی سامنے والے کا اگلا سوال ہوتا تھا 'آپ کیا ہیں؟' جس کا براہ راست مطلب تھا 'آپ کس ذات کے ہیں؟'

جہاں تک رام کرن سنگھ کی بتائی ہوئی دوسری وجہ کا تعلق ہے، مغرب کے ماہرین سیاست اسے 'بینڈ ویگن فینومینن' (فتح کے گھوڑے پر سوار ہو جانا) کہتے ہیں۔ کئی رائے دہندہ اپنا ووٹ اس طرح دینا چاہتے ہیں، جس سے وہ فتح کے رتھ پر سوار ہو کر دھوم مچا سکیں۔ یہی سبب ہے کہ

کچھ جمہوری ممالک میں 'اوپینین پول' پر قانونی پابندی لگادی گئی ہے۔

اوپینین پول کس طرح انتخابی نتائج کو متاثر کرتے ہیں، اس کی ایک زندہ مثال 1948 میں امریکی صدارتی انتخاب ہے۔ انتخابی مقابلہ ڈیموکریٹک ہیری ٹرومن اور ریپبلکن تھامس ڈیولے کے مابین تھا۔ تمام خاص اوپینین پول نے اندازہ لگایا تھا کہ ڈیوے 15 فیصد ووٹوں کی برتری کے ساتھ آسانی سے جیت جائیں گے۔ نتائج آنے پر ریپبلکن کے ہوش اڑ گئے۔ ٹرومن 4 فیصد سے زائد ووٹوں کی برتری سے کامیاب ہوئے۔ مشہور انتخابی ماہر جارج گیلپ جونیئر نے بعد میں صفائی دی 'ہم نے ووٹنگ سے کچھ ہفتہ قبل ہی اوپینین پول کرالیے۔ ہم یہ سوچ کر بے خبر ہو گئے تھے کہ انتخابی مہم کے آخری ہفتوں میں رائے دہندگان کے رجحان میں بہت زیادہ تبدیلی نہیں ہوتی ہے۔'

یہ واقعہ ظاہر کرتا ہے کہ اوپینین پول رائے دہندہ کے کردار کو کس طرح متاثر کر سکتے ہیں۔ 1948 کی اس شرمندگی کے بعد ماہرین انتخاب نے اپنے طریقوں میں کچھ اصلاح کیے۔ پہلا تو یہ کہ وہ ووٹنگ کے دن تک رائے دہندگان کی رائے لینے لگے۔ دوسرے، انھوں نے ہارنے اور جیتنے والے امیدوار کی پہچان کرنے کی صلاحیت میں اضافہ کیا۔

جاگیرداری نظام کے خاتمہ پر اصول پسندانہ موقف

ہماری پارٹی نے راجستھان کی پہلی قانون ساز اسمبلی میں 8 سیٹیں حاصل کی تھیں، جس میں اس وقت 160 ممبران ہوتے تھے۔ امکانات کے مطابق ہی کانگریس نے اکثریت حاصل کرلی تھی اور حکومت کی تشکیل کرلی تھی۔ جلد ہی جن سنگھ کے قانون ساز ڈویژن میں سیاسی طور سے اہم بغاوت ہوگئی اور پارٹی قیادت کو 8 میں سے 6 ممبران اسمبلی کو پارٹی سے نکالنا پڑا۔ آزادی سے قبل راجستھان 19 متحدہ اضلاع کی سرزمین تھی۔ یہ اور ملک کی دیگر سبھی ریاستوں کا انضمام سردار پٹیل کی دوررس مہم کے سبب 1950 سے پہلے ہی ہندوستانی فیڈریشن میں ہو چکا تھا۔

پھر بھی زمینی ملکیت کا جاگیردارانہ نظام، جس کے تحت جاگیردار خاندان سیکڑوں یا ہزاروں ایکڑ زرعی زمین کے مالک ہو سکتے تھے، یہ اب بھی جاری تھا۔ ڈاکٹر مکھرجی اور پنڈت دین دیال اپادھیائے کی اپیل سے پارٹی نے سماجی برابری کی جانب قدم بڑھانے کے مقصد سے اپنے اعلامیہ میں جاگیردارانہ نظام کو ختم کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ اتفاق سے جن سنگھ کے ٹکٹ پر منتخب تمام 8 ممبران اسمبلی خود جاگیردار تھے۔ انتخابات کے بعد جب پارٹی کے اعلامیہ میں کیے گئے وعدے کی عمل آوری کے لئے حکومت پر دباؤ ڈالنے کا فیصلہ لیا گیا تو ان میں سے 6 ممبران اسمبلی نے اس کی مخالفت کی۔ صرف بھیروں سنگھ شیخاوت اور ایک دیگر ممبر اسمبلی جگت سنگھ جھالا نے جاگیردارانہ نظام کے خاتمہ کی حمایت کی۔ جب ان 6 ممبران اسمبلی کی بغاوت کی اطلاع پارٹی کی مرکزی قیادت کو دی گئی تو ڈاکٹر مکھرجی اور پنڈت دین دیال اپادھیائے دونوں جے پور آئے اور انھوں نے ہر ایک ممبر اسمبلی سے اس موضوع پر تبادلہ خیال کیا۔ جب وہ نہیں تیار ہوئے تو ہمارے لیڈروں نے کہا 'انھیں پارٹی سے برخاست کردو۔ ہم اصولوں کے ساتھ سمجھوتہ نہیں کر سکتے۔'

جلد ہی شیخاوت راجستھان میں پارٹی کے ایک کرشمائی لیڈر بن کر ابھرے اور آگے چل کر تین مرتبہ ریاست کے وزیر اعلیٰ بنے۔ 2002 میں وہ ہندوستان کے نائب صدر جمہوریہ بھی بنے۔ میں تو کہوں گا کہ جاگیردارانہ نظام کے خاتمہ کے ایشو پر 1952 میں لیے گئے ان کے جرأت مندانہ اور اصول پرست فیصلہ نے ان کے سیاسی عروج میں بنیادی کردار ادا کیا۔

1952 کے پہلے عام انتخابات سے قبل الیکشن کمیشن نے تقریباً 2 درجن مختلف سیاسی پارٹیوں کو مکمل طور سے کل ہند پارٹیوں کا درجہ عطا کیا

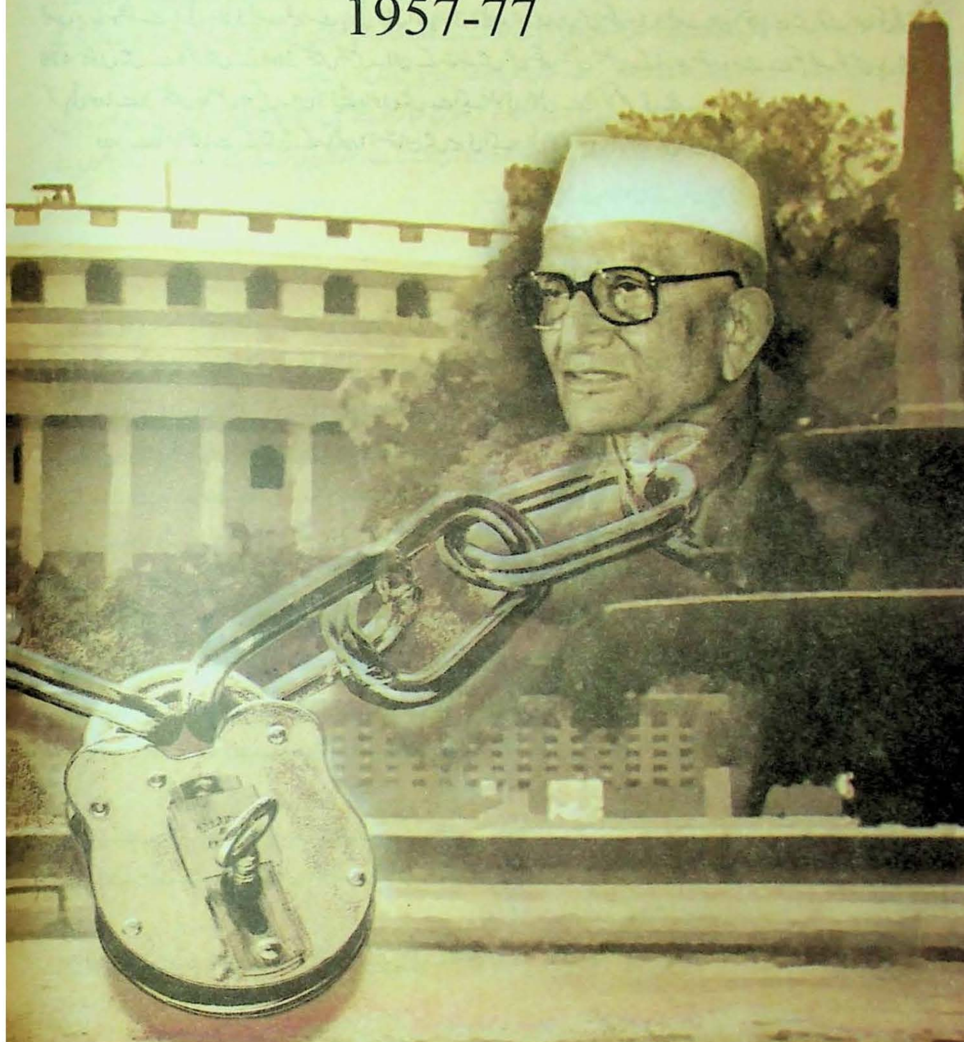
تھا۔ اس نے یہ بھی اعلان کیا تھا کہ کل ہند پارٹیوں کو تسلیم کیے جانے کا فیصلہ انتخاب مکمل ہونے کے بعد ہی کیا جائے گا۔ یہ کل ہند پارٹی کی حیثیت سے صرف انھیں پارٹیوں کو تسلیم کیا جائے گا جنھوں نے ڈالے گئے کل ووٹوں میں سے کم از کم 3 فیصد ووٹ حاصل کیے ہوں۔

اس کسوٹی پر 1952 کے لوک سبھا الیکشن میں صرف 4 پارٹیاں کل ہند پارٹیوں کے طور پر ابھریں۔ یہ تھیں انڈین نیشنل کانگریس-45.0 فیصد، پرجا سوشلسٹ پارٹی-5.8 فیصد، کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا-3.3 فیصد اور بھارتیہ جن سنگھ-3.1 فیصد۔ ان انتخابات میں لوک سبھا کی کل 479 سیٹوں میں سے کانگریس نے 364 سیٹیں جیتیں۔ اس کے مقابلہ میں جن سنگھ الیکشن کمیشن کے ذریعہ مقررہ سب سے کم فیصد کو بس پار ہی کر پائی اور اسے 3 سیٹیں حاصل ہوئیں۔ ان 3 جیتنے والوں میں سے ایک مغربی بنگال سے ڈاکٹر مکھرجی تھے۔

دوسرے عام انتخابات کے نتائج کے ساتھ راجستھان میں میری ایک دہائی کا کام پورا ہوا اور میں دہلی آ گیا۔

قومی سیاست میں داخلہ

1957-77



جمہوریت پابہ زنجیر

''آزاد ہندوستان نے مضبوط عزائم کے ساتھ دنیا کی سب سے بڑی جمہوریہ ہونے کے وقار کا تحفظ کیا ہے۔ پھر بھی اس کامیابی کو اُس وقت عارضی طور پر گہن لگ گیا جب جون 1975ء میں وزیر اعظم اندرا گاندھی نے ہندوستان میں ایمرجنسی نافذ کر کے جمہوریت کو بیڑیوں میں جکڑ دیا۔'' کانگریس پارٹی کی تاناشاہی حکومت کے خلاف لوگوں کی قابل فخر تحریک کے نتیجے میں 19 ماہ بعد یہ گہن ختم ہوا۔ اگر ایمرجنسی کا دور، ہندوستان کا سب سے تاریک دَور تھا تو جمہوریت کے دوبارہ قیام کے لیے کی گئی منصفانہ جدوجہد بھی یقیناً سب سے زیادہ روشن اور تابناک تھی۔''



تیسرا باب

1

راجستھان سے دہلی آمد

طبقہ اور فرقہ وارانہ لڑائی اور علاقائی برتری کے محدود جذبات، ہمارے دل سے دور ہوجائیں۔ میرے لئے میری پیاری مادر وطن سب سے بالاتر ہے۔ جو بھی کہا یا کیا جائے، اسے اس اوّلین نظریہ سے پرکھا جانا چاہیے۔ کیا وہ ہماری پاک مادر وطن کے قدموں میں پیش کرنے کے لائق ہے یا نہیں۔ ہندوستان کی جدوجہد کو قابل فخر بلندی تک لے جانے کے لئے ہمارا عزم پیہم اور یقین محکم ہونا چاہیے۔

— ڈاکٹر شیاما پرساد مکھرجی

زندگی ایک مسلسل تغیر پذیر، رواں واقعات کی لہر ہے۔ اس کرۂ ارض کا خالق، جو ہر جاندار کے محدود سفر کا کنٹرولر ہے، وہ افراد اور کنبوں کی تقدیر بدلتے ہوئے ان صورتوں میں مسلسل ردّوبدل کرتا رہتا ہے۔ کئی مرتبہ تبدیلی اتنی ڈرامائی اور اتنی بڑی ہوتی ہے، جو ایک قوم کی تقدیر تک بدل دے، فرد کی مستحکم بنیادوں میں دراڑ ڈال دے، اسے ماضی سے اچانک توڑ کر علیحدہ کردے۔

1947 میں ہندوستان کی تقسیم اور میرے کنبہ کا بحالت مجبوری کراچی چھوڑنا ایسی ہی ایک غیر متوقع تبدیلی تھی۔ اس کے بعد آئندہ 10 سال تک راجستھان میرا میدان عمل رہا، لیکن جیسے ہی ایک دہائی مکمل ہونے کو آئی کہ قسمت نے میری زندگی میں ایک اور تبدیلی سے سامنا کرایا۔ اب دہلی میرا میدان عمل بنا۔ یہ تبدیلی گزشتہ تبدیلیوں کی طرح دہلا دینے والی نہیں تھی۔ درحقیقت راجستھان میں ایک سیاسی رکن کے طور پر میری زندگی کی یہ ایک فطری ترقی تھی۔

پہلی لوک سبھا میں بھارتیہ جن سنگھ کے قائد کے طور پر ہمارے پاس ڈاکٹر شیاما پرساد مکھرجی جیسی شخصیت تھی۔ 1953 میں کشمیر میں حراست کے دوران ان کی بے وقت موت نے پارلیمانی میدان میں پارٹی کے سامنے ایک خلا پیدا کردیا۔ یہی سبب تھا کہ پنڈت دین دیال اپادھیائے، جو پارٹی کے تنظیمی جنرل سکریٹری تھے، نے یہ فیصلہ لیا کہ اٹل بہاری واجپئی 1957 کا لوک سبھا الیکشن لڑیں۔ انھوں نے واجپئی جی کو تین انتخابی حلقوں لکھنؤ، بلرام پور اور متھرا (تمام اتر پردیش میں) سے اتارا۔ یہ ایک ایسی چال تھی، جس میں اس شدید خواہش کا اظہار ہوتا تھا کہ اٹل جی کم از کم ایک جگہ سے جیت کر پارلیمنٹ میں پارٹی کی قیادت کریں۔ بعد کے برسوں میں اٹل جی از راہ مذاق کہتے تھے۔ 'ایک حلقہ (متھرا) میں میں نے ضمانت گنوائی، دوسرے (لکھنؤ) میں بہت کم فرق سے ہارا اور تیسرے (بلرام پور) میں شان سے جیتا۔'

پارٹی نے تین مزید سیٹیں بھی جیتیں — ایک اتر پردیش میں اور 2 مہاراشٹر میں۔ 1952 کے مقابلہ 1957 میں جن سنگھ نے صرف ایک سیٹ میں اضافہ کیا۔ اسے حاصل ہوئے ووٹوں کا فیصد پانچ برسوں میں بڑھ کر تقریباً دوگنا 5.9 فیصد ہوگیا۔ ملک کی سب سے زیادہ آبادی والی ریاست اتر پردیش میں یہ فیصد دوگنا سے بھی بڑھ کر 15 فیصد ہوگیا۔ 1957 کے انتخابات کا ایک قابل توجہ پہلو یہ تھا کہ ہندو مہاسبھا اور رام راجیہ پریشد نے بھی ہماری مخالفت کی تھی، جس سے سرشار ہوکر کچھ سیاسی مبصرین نے جن سنگھ کے خاتمہ کی خبر بھی تیار کرلی تھی۔ دین دیال جی نے انھیں خود اعتمادی سے بھرپور جواب دیا تھا 'ڈاکٹر شیاما پرساد مکھرجی کے انتقال کے بعد سیاسی حلقوں میں یہ مان لیا گیا تھا کہ جن سنگھ اب ختم ہوجائے گا۔ گزشتہ پانچ برسوں سے ہم اس افواہ سے نبرد آزما رہے ہیں۔ دوسرے عام انتخابات کے نتائج نے یہ ثابت کردیا ہے کہ جن سنگھ نہ صرف زندہ ہے بلکہ وہ ترقی کی طرف گامزن ہے۔'

پارلیمانی کام کا ہنر سیکھنا

یہی وہ دور تھا جب دین دیال جی نے اٹل جی اور دیگر نومنتخب جن سنگھی پارلیمانی اراکین کو ان کے پارلیمانی کاموں میں تعاون دینے کے لئے مجھے راجستھان سے دہلی طلب کیا۔ تبھی سے دہلی میری تمام سیاسی سرگرمیوں کا اہم مرکز بن گئی۔ میری اس ذمہ داری نے مجھے پارلیمنٹ اور حکومت کی ورکنگ میکانزم سمجھنے کے علاوہ تفصیلات کا خاکہ بنانے، سوال تیار کرنے اور پارٹی کے تشہیری نکات کی نشان دہی کرنے میں اپنی اہلیت میں اضافہ کرنے کا موقع دیا۔ جب پارلیمنٹ کا سیشن چل رہا ہوتا تھا تب میں اس کی کارروائی دیکھنے کے لئے مسلسل وہاں جایا کرتا تھا۔ اس وقت لوک سبھا اور راجیہ سبھا دونوں میں مباحثوں کی سطح آج کے مقابلہ میں بہت معیاری ہوتی تھی اور برسراقتدار اور حزب مخالف دونوں فریقین کے ماہرین سیاست کو بحث میں حصہ لیتے دیکھنا، سننا میرے لئے ایک سبق آموز تجربہ تھا۔ خاص طور پر اس لئے کہ فن تقریر میں تب میں نوزائیدہ ہی تھا۔ میرے لئے خصوصاً وہ لمحہ بہت دلچسپ ہوتا تھا جب اٹل جی ایک غیر معمولی مقرر کے طور پر پارلیمنٹ میں اپنا سکہ جماتے تھے۔

1952 میں منتخب پہلی لوک سبھا کے سب سے بہترین مقرر مکھرجی ہی تھے۔ جن سنگھ کے ڈاکٹر شیاما پرساد مکھرجی اور کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے ہیرین مکھرجی۔ پانچ برس بعد منتخب کی گئی دوسری لوک سبھا کے بہترین مقرر تھے جن سنگھ کے اٹل جی اور آزاد آریہ سماجی ڈاکٹر پرکاش ویر شاستری۔ مقررین کے پہلے جوڑے کا انگریزی پر پورا عبور حاصل تھا تو دوسرے جوڑے کے لئے یہی بات ہندی کے بارے میں کہی جاسکتی تھی۔

ان ابتدائی برسوں میں پارلیمنٹ کے دونوں ایوان کے اسپیکر وقت کے الاٹمنٹ کے معاملہ میں بہت سخت ہوا کرتے تھے۔ چونکہ لوک سبھا میں جن سنگھ کے صرف چار ہی ممبران تھے، اس لئے ہمارے ممبران پارلیمنٹ کو الاٹ کیا گیا وقت بہت مختصر ہوا کرتا تھا۔ اکثر کسی بحث کے لئے

کافی تیاریاں کرنے کے باوجود اٹل جی تک کو بولنے کا موقع نہیں مل پاتا تھا۔ ایک مرتبہ جب وہ خارجہ پالیسی پر چل رہی بحث کے دوران بول رہے تھے، وزیراعظم پنڈت نہرو بھی ان کے تخاطب سے بہت متاثر تھے۔ ایوان کے لیڈر ہونے کے ناطے نہرو نے اسپیکر سے کہا کہ وہ پارلیمانی مباحثہ میں جن سنگھ کے اس نوجوان ممبر پارلیمنٹ کا مزید رول پسند کریں گے۔

1962 میں چینی حملہ کے افسوسناک نتائج پر بحث کے دوران اٹل جی کے پارلیمانی کاموں میں تعاون دینا میرے اپنے سب سے زیادہ اطمینان بخش رول میں سے ایک تھا۔ برطانیہ کے ہاؤس آف کامرس کی کارکردگی کے مطالعہ سے مجھے معلوم ہوا تھا کہ کوئی ممبر کسی اہم فوجی ایشو پر حکومت سے اہم معلومات سے بھرپور ایک وہائٹ پیپر کا مطالعہ کر سکتا ہے۔

میں نے اٹل جی کو صلاح دی کہ وہ ہندوستان کی خارجہ پالیسی اور ماقبل جنگ کی فوجی تیاریوں کے اہم حقائق سے متعلق حکومت سے چینی حملے پر وہائٹ پیپر کا مطالبہ کریں۔ اٹل جی اور میں نے اس موضوع پر کافی ریسرچ کی۔ پارلیمنٹ کی تاریخ میں حکومت سے وہائٹ پیپر کا مطالبہ کرنے والے وہ پہلے ممبر پارلیمنٹ بنے۔ وزیراعظم نہرو نے یہ مطالبہ منظور کرلیا اور اٹل جی کی تقریر کو اجتماعی طور پر پارلیمانی تاریخ کے سب سے بہترین تقاریر میں سے ایک کے طور پر ستائش کی گئی۔ اس سے پورے ملک میں جن سنگھ کے تئیں عوام میں احترام کا جذبہ پیدا ہوا۔

لوک سبھا کے سابق اسپیکر ایم اننت شینم اینگر نے پارلیمنٹ کے زیریں ایوان کے پہلے چیئرمین جی وی ماؤلنکر کی اچانک ہوئی موت سے پیدا خلا کو بھر دیا۔ میں نے ماؤلنکر کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا۔ انھوں نے اسپیکر کے طور پر دس برسوں (56-1946) میں پارلیمانی اداروں پر اتنا گہرا اثر چھوڑا کہ انھیں 'لوک سبھا کے بانی' کے طور پر پہچانا جانے لگا۔ ایوان کو قابل ذکر ڈسپلن، شفافیت اور غیر جانبداری کے ساتھ چلانے کے علاوہ انھوں نے اور ان کے جونیئر معاون کار اینگر نے اصول، عمل، کنونشن اور قاعدے قائم کیے، جس کی ستائش میں نے تب کی جب میں نے خود اپنی سیاسی زندگی شروع کی۔ اس وقت راجیہ سبھا میں جن سنگھ کا کوئی ممبر نہیں تھا، پھر بھی میں اکثر آڈینس گیلری سے کارروائی دیکھنے جاتا تھا اور ہندوستان کے پہلے نائب صدر جمہوریہ اور ایوان بالا کے چیئرمین ڈاکٹر رادھا کرشنن جیسی دانشور شخصیت کی خصوصی طور پر ستائش کرتا تھا، جو وہاں ہونے والے بحث و مباحثہ کی رہنمائی کرتے تھے۔ اپنی تربیت کے ان ابتدائی دنوں میں میں نے وقفہ سوالات، معطل تجاویز، بلوں، قائمہ کمیٹی، توجہ دلاؤ تحریک، اراکین کے خصوصی اختیارات وغیرہ کے موضوعات سیکھے، جواب ہندوستانی پارلیمنٹ کی عمل پذیرائی بنیادی حصہ ہیں۔ یہ وہ وقت تھا جب حزب اختلاف بنچوں پر بیٹھے بے خوف لوگ اپنے قد اور قابلیت میں برسراقتدار لوگوں سے بالکل الگ نہیں لگتے تھے اور اسپیکر اس وقت حزب اختلاف کے حقوق کے سچے محافظ کے طور پر کام کرتا تھا۔ یہی شاندار روایت، جسے مشترکہ طور پر عہدہ بردار افسروں اور پارلیمانوں نے قائم کی، نے ہندوستان کی نوتشکیل جمہوریت میں جوش بھرا اور اس کی بین الاقوامی عظمت میں اضافہ کیا۔

کمیونسٹوں کے ساتھ اتحاد کی سیاست کا پہلا تجربہ

مخلوط سیاست سے میرا پہلا تجربہ دہلی میونسپل کارپوریشن میں ہوا۔ دہلی، جو اس وقت ایک مرکز کے زیراقتدار ریاست تھی، میں میونسپل کارپوریشن کا قیام 1958 میں ہوا۔ کئی چھوٹی چھوٹی نگر پالیکاؤں جو شہر کے مختلف علاقوں میں سرگرم تھیں، کو ملا کر اس کی تشکیل کی گئی تھی۔ ان سبھی میں جن سنگھ کو اچھی حمایت حاصل تھی، اس لئے کارپوریشن کی تشکیل سے پارٹی کو ملک کی راجدھانی سے شہری انتظامیہ میں ایک اہم کردار نبھانے کا موقع ملا۔ ہمارا اندازہ تھا کہ یہ ملک کے دیگر حصوں میں جن سنگھ کی ترویج میں مثبت نتائج لے کر آئے گا۔

اس لئے پارٹی کی پارلیمانی شاخ میں کام کرنے کے علاوہ پنڈت دین دیال جی نے جنرل سکریٹری کے طور پر مجھے جن سنگھ کی دہلی اکائی کا کام دیکھنے کے لئے کہا۔ میرے سامنے پہلا چیلنج تھا 1958 میں ہونے والے میونسپل کارپوریشن کے پہلے انتخاب کا سامنا کرنے کے لئے پارٹی کو تیار کرنا۔ ہمارا مقابلہ کانگریس پارٹی سے تھا، جس کا سیاسی دبدبہ اس وقت پورے ہندوستان میں تھا۔ دہلی میں پہلی مرتبہ جن سنگھ کی انتخابی طاقت کا امتحان ہونا تھا اور اس نے اس میں اہم کامیابی درج کی۔ 80 ممبروں والے کارپوریشن میں ہم نے کانگریس سے صرف 2 سیٹیں کم یعنی کل 27 سیٹوں پر جیت درج کی۔ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے 8 ممبران تھے۔ آج کئی لوگوں کو یہ جان کر تعجب ہوگا کہ مخلوط سیاست میں جن سنگھ کا پہلا تجربہ کمیونسٹوں کے ساتھ ہوا، جن کے پاس میونسپل کارپوریشن میں اتنی سیٹیں تھیں کہ وہ کانگریس یا جن سنگھ کسی کی حکومت بنا سکتے تھے، لیکن ایسا کچھ ڈرامائی واقعات کے بعد ہی ہوا۔

انتخابات کے بعد جلد ہی سی پی آئی نے جن سنگھ کو اقتدار سے دور رکھنے کے لئے کانگریس کے ساتھ گٹھ جوڑ بنانے کی تجویز پیش کی، بشرطیکہ کانگریس اس کی ایک خاتون ممبر، آزادی کی سپاہی اور بھارت چھوڑو تحریک کی ستارہ ارونا آصف علی کو دہلی کی پہلی میئر بنانے کے لئے تیار ہو جائے۔ کانگریس نے یہ شرط مان لی، لیکن داخلی انتشار کے سبب یہ گٹھ جوڑ ایک سال کے اندر ہی ٹوٹ گیا۔ 1959 میں نہرو کابینہ کے ذریعہ کیرل میں ای ایم ایس نمبودریپاد کی قیادت میں بنی ملک کی پہلی کمیونسٹ حکومت کو برخاست کیے جانے سے ان کے درمیان کشیدگی میں اضافہ ہو گیا۔

یہاں ہماری پارٹی کے لئے کارپوریشن کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لینے کے لئے کمیونسٹوں سے ایک ڈپلومیٹک ساجھے داری کرنا موقع بھی تھا اور چیلنج بھی۔ یہ گٹھ جوڑ کو دین دیال جی کی حمایت سے کامیاب رہی۔ سی پی آئی کے علاوہ ہندو مہاسبھا کے تن تنہا رکن اور کچھ آزاد امیدواروں کو ہم اپنی جانب لانے میں کامیاب رہے۔ جن سنگھ اور سی پی آئی کے درمیان معاہدہ ہوا کہ میئر اور ڈپٹی میئر کے عہدے دونوں پارٹیوں کو یکے بعد دیگرے دیئے جائیں گے۔ اس کے مطابق پہلے سال کے لیے ارونا آصف علی کو میئر ہونا تھا اور ڈپٹی میئر کے عہدہ کے لیے کمیونسٹ کیدار ناتھ ساہنی، جو بعد میں جن سنگھ اور بی جے پی کے ایک اہم لیڈر بنے، کی امیدواری کی حمایت کرتے، دوسرے برس کے لئے ساہنی میئر بنتے اور ڈپٹی میئر کے عہدہ کے لئے جن سنگھ سی پی آئی کے کسی امیدوار کی حمایت کرتی۔

یہ الگ بات ہے کہ ارونا آصف علی کا دور اقتدار مکمل ہوتے ہی سی پی آئی نے یہ معاہدہ ختم کر دیا، پھر بھی سیاسی قیادت اور حکمت عملی بنانا میرے لئے ایک بہت مفید ابتدائی سبق ثابت ہوا۔ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ مخلوط سیاست میں یہ میری ابتدائی تعلیم تھی، جو آئندہ برسوں اور دہائیوں میں کئی مواقع پر میرے کام آئی۔ سی پی آئی اور سی پی آئی (ایم) کے ان لیڈروں، جو بی جے پی کو اب اچھوت سمجھتے ہیں، سے میں یہ سوال پوچھنا چاہوں گا، پھر آپ نے 1958 میں دہلی میونسپل کارپوریشن میں جن سنگھ سے کیوں ہاتھ ملایا تھا؟ 1967 کے اسمبلی انتخابات کے بعد بہار میں مشترکہ اسمبلی حکومت بنانے کے لئے جن سنگھ۔سی پی آئی کا ایک اور گٹھ جوڑ ہوا تھا، لیکن اس کا ذکر میں بعد میں کروں گا۔

دہلی بلدیاتی الیکشن کے لئے پارٹی کارکنان کو تیار کرتے وقت میں نے سماجی تفرقات کے مینجمنٹ سے پہلا سبق سیکھا۔ ان دنوں دہلی میں پاکستان سے آئے ہندو اور سکھ شرنارتھی بڑی تعداد میں تھے۔ وہ لوگ سنگھ اور جن سنگھ کے پرزور حامی تھے۔ ہمارے حامیوں میں ایک دیگر اہم برادری مقامی تاجروں اور صنعت کاروں کی تھی، لیکن ان شرنارتھیوں اور مقامی لوگوں میں کچھ تنازع پیدا ہو گیا تھا اور انتخاب سے قبل یہ تنازع خطرہ کا اشارہ تھا۔ میں نے دونوں فریقوں سے صبر آزما بات کر کے دونوں کی شکایتیں سن کر اور تنظیم کے مکمل مفادات کی یاد دلا کر ان میں بھائی چارگی

پیدا کر کے اس مسئلہ کو بڑھنے سے پہلے ہی دبا دیا۔

اس تجربہ نے مجھے سکھایا کہ اگر قومی لیڈر عدم تشدد اور یکجہتی پیدا کرنے میں کامیاب ہونا چاہتا ہے تو اسے 6 بنیادی اوصاف کو فروغ دینا چاہیے۔عوام سے مسلسل رابطہ بنائے رکھ کر اس کی نبض پر نظر رکھنا، غیر جانبداری، عزم، صبر، انصاف پروری اور استحکام۔

اٹل جی اور دین دیال جی کے ساتھ گزاری گئی زندگی

راجستھان سے دہلی آنے کے بعد میری پہلی رہائش گاہ 30، راجندر پرساد روڈ میں واقع اٹل جی کا سرکاری بنگلہ تھی، جہاں وہ مہاراشٹر کے چیلون انتخابی حلقہ سے جن سنگھ کے ممبر پارلیمنٹ پریم جی بھائی آشر کے ساتھ قیام پذیر تھے۔ان دنوں جن سنگھ کی یہ خصوصیت تھی کہ پوری پارٹی ایک وسیع کنبہ کی طرح مشترکہ کام کرتی تھی۔آشر کی بیوی ہم سب کے لئے کھانا بناتی تھیں اور ہم بھی گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹایا کرتے تھے۔اٹل جی بھی کھانا بنانے میں ماہر تھے اور کبھی کبھی اپنے بنائے ذائقہ دار کھانوں سے ہمیں لطف اندوز کیا کرتے تھے۔

30، راجندر پرساد روڈ پر رہنے کا ایک دلچسپ نتیجہ یہ تھا کہ اپنی دیگر ذمے داریوں کے ساتھ میں دولسانی بھی بن گیا۔ہوا یہ کہ آشر کی بیوی نہ ہندی جانتی تھی اور نہ انگریزی، وہ صرف کچھی یا مراٹھی بول سکتی تھیں، ایسا اس لئے کہ آشر بنیادی طور پر کچھ کے رہنے والے تھے، لیکن وہ مہاراشٹر کے رتن گیری ضلع میں بس گئے تھے۔ایک دن میں نے انھیں اپنے شوہر سے کچھی میں بات کرتے سنا تو مجھے وہ زبان مانوس لگی۔کچھ اور سندھ کی جغرافیائی نزدیکیوں کے سبب کچھی اور میری مادری زبان سندھی میں قدرے یکسانیت تھی، اس لئے جب بھی ضرورت ہوتی میں گھر کی مالکہ اور وہاں رہنے والے لوگوں کے درمیان مترجم کا کام کرتا تھا۔

میں اٹل جی کے ساتھ ایک برس سے کچھ زیادہ مدت تک رہا۔دہلی میونسپل کارپوریشن کی تشکیل کے بعد جب دین دیال جی نے مجھ سے شہر میں پارٹی کا تنظیمی کام دیکھنے کے لئے کہا تو میں پرانی دہلی کے اجمیری گیٹ میں واقع جن سنگھ کے مرکزی دفتر میں رہنے لگا۔یہ ایک پرامن اور چھوٹی جگہ تھی، جس میں ایک پارٹی 'کمیون' کی طرح میں، دین دیال جی، کیدار ناتھ ساہنی اور ایک دیگر کارکن جگدیش پرساد ماتھر، جنھوں نے 1951 سے ہی بڑی لگن کے ساتھ جن سنگھ اور بی جے پی دونوں کی ہی خدمت کی، رہتے تھے۔زندگی نہایت سادگی سے بھری تھی لیکن ایک انوکھا احساس دلاتی تھی۔

میری رہائش گاہ اور کام تبدیل ہو جانے کے باوجود اٹل جی کے ساتھ نجی اور سیاسی طور سے میرے بہترین رشتے بنے رہے۔میں دہلی میں پارٹی کی سرگرمیوں میں مصروف تھا، لیکن تقدیر میری سرگرم زندگی اور بعد میں میری نجی زندگی میں بھی ایک اہم تبدیلی کا منصوبہ بنا رہی تھی۔ دہلی میں پارٹی کے تنظیمی سکریٹری کے طور پر تین برس سے زائد کام کرنے کے بعد اب وقت آ گیا تھا کہ سنگھ کے ہفتہ واری ترجمان 'آرگنائزر' میں شامل ہو کر ایک صحافی کی حیثیت سے اپنی عوامی زندگی کے ایک نئے باب کی شروعات کروں۔

اور یہی وہ وقت بھی تھا جب میں نے اپنی نجی زندگی میں بھی نئے باب کا آغاز کیا۔

2

آرگنائزر کے برس

آزاد پریس اچھی بھی ہوسکتی ہے اور بری بھی، لیکن یقینی طور پر بغیر آزادی کے پریس کبھی بھی بری کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوسکتی۔

— البرٹ کامیو، نوبل انعام یافتہ فرانسیسی ناول نگار

ایک سیاسی کارکن کے لئے عوامی زندگی کے اپنے عزائم اور کنبہ کی ذمہ داریوں کے درمیان توازن برقرار رکھنا بہت کم معاملوں میں آسان ہوتا ہے۔ میں ایسے کئی لیڈروں اور کارکنان کو جانتا ہوں، جنھوں نے اپنے کنبہ کی ذمہ داریوں کو نظرانداز کیا اور خاص طور پر اپنی سیاسی زندگی کے آخری برسوں میں پچھتائے۔ یہ احساس فرد کے دل میں تکلیف اور جرم کا احساس تو پیدا کرتا ہی ہے، ساتھ ہی وہ اس کی عوامی زندگی کے کام کو بھی کسی نہ کسی طرح سے متاثر کرتا ہے۔ اپنے خود کے اور دیگر کئی سیاسی کارکنان کے تجربہ سے میں نے یہ سبق حاصل کیا ہے کہ عوامی زندگی میں ہماری کارکردگی لازمی طور پر ہمارے خاندانی تعلقات کے استحکام، گہرائی اور خوشیوں کی طرز پر منحصر کرتی ہے۔ خانگی زندگی میں اور عوامی زندگی میں بھی خوشیاں اس بات پر اتنی منحصر نہیں ہوتیں کہ آپ دوسروں سے کیا پاتے ہیں جتنی اس بات پر کہ آپ دوسروں کو کیا دیتے ہیں۔

ہندوستانی اور مغربی طرز زندگی میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ ہندوستان میں خوشیاں ایک شخص کے حقوق سے اتنی قریب نہیں ہیں جتنی اس کے فرائض سے۔ ایک بالغ شخص کی پہلی ذمہ داری اپنے والدین کی خدمت کرنی ہے۔ 1947 میں میرے کنبہ کے سندھ سے ہندوستان آنے کے بعد کے گزرے سالوں میں یہی احساس میرے دل میں تھا۔

میں نے بچپن میں اپنی ماں کو کھودیا تھا۔ میرے والد نے بڑے لاڈ و پیار سے میری پرورش کی تھی۔ میری دادی اور دیگر نزدیکی رشتہ داروں نے اس کام میں ان کی مدد کی تھی۔ اس طرح کراچی میں جس خاندانی ماحول میں میری پرورش ہوئی، اس نے نہ صرف مجھے بے حد آرام و خوشی دی بلکہ ہندو سنسکاروں کی جڑیں بھی فراہم کیں۔ یہ سچ ہے کہ تقسیم نے ہماری زندگی کو بنیاد سے اکھاڑ پھینکا تھا، لیکن میرے کنبہ میں کسی نے بھی ہم سب کے دل میں تلخیوں یا ناامیدی کا احساس نہیں پنپنے دیا۔ ہمارا کنبہ ویسے ہی متحد رہا جہاں ہر شخص ایک دوسرے کا خیال رکھتا تھا۔ پھر بھی، ایک بات میری فکرمندی میں اضافہ کررہی تھی — میں نے پہلے راجستھان اور پھر دہلی میں جب سے ایک مہم جو سیاسی کارکن کے طور پر زندگی گزارنے کا فیصلہ لیا تھا۔ اپنے والد، جو تقسیم کے بعد کچھ (گجرات) میں رہائش پذیر ہوگئے تھے، کو کبھی کبھی ہی دیکھا تھا۔ میں انھیں اور دیگر

رشتے داروں کو ہمیشہ خط لکھتا تھا، لیکن ان سے ملاقات بہت کم ہو پاتی تھی۔

کچھ میں آ کر میرے والد نے کانڈلا کے پاس آدی پور میں سندھور یسٹلمنٹ کارپوریشن میں کام کیا۔ وہ اب ریٹائر ہونے والے تھے۔ اب مجھے ان کی دیکھ ریکھ کرنی ہی تھی۔ ان کے علاوہ میری چچازاد بڑی بہن رادھی، جو آدی پور میں ہی رہتی تھیں، کا بھی مجھے دھیان رکھنا تھا۔ میں ایک بیٹے کا فرض کیسے نبھاؤں؟ اس سوال کا جواب نہ دے پانا میرے دل کو خیرہ خیرہ کر رہا تھا۔ ایک دن میں نے اپنی پریشانی دین دیال جی کو بتائی۔ وہ ایسے لیڈر تھے، جن کا دل اپنے پارٹی کارکنان کے تئیں جذباتی تھا۔ انھوں نے مجھے 'آرگنائزر' میں نوکری کرنے کی صلاح دی۔ 'یہ ہمارا اپنا جرنل ہے۔' انھوں نے مجھ سے کہا 'اور تمھیں وہاں کام کرنا اچھا لگے گا، کیونکہ تمھیں تخلیق سے ہمیشہ دلچسپی رہی ہے۔ جرنل کو بھی تم جیسے شخص کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ تمھیں اس بات کی بھی آزادی ہوگی کہ تم اپنا سیاسی کام جاری رکھو۔' اس طرح 1960 میں ایک سب ایڈیٹر کے طور پر میں نے 'آرگنائزر' میں نوکری کر لی۔

کئی قلمی ناموں والا کالم

1947 میں قائم کردہ 'آرگنائزر' کی اشاعت کی تعداد بہ نسبت کم تھی، لیکن دانشورانہ حلقہ اور سیاسی حلقوں میں اس کا نظریہ اور اثر بہت زیادہ تھا۔ اس کے ایڈیٹر کے آر ملکانی بہت اچھے مضمون نگار تھے اور تقسیم سے قبل سندھ میں میری ہی طرح سنگھ کے ایک متحرک لیڈر تھے۔ ہم دونوں نے ایک ساتھ 1946 میں ناگپور سے سنگھ ایجوکیشن درجہ پاس کیا تھا۔ ان کے بڑے بھائی پروفیسر این آر ملکانی سندھ کے ایک معروف کانگریسی لیڈر تھے۔ ایک ایماندار کانگریسی ہونے کے باوجود وہ ایک قومی تنظیم ہونے کے سبب سنگھ، جو نوجوانوں میں حب الوطنی اور ڈسپلن کے معاملہ کی عمل آوری کرتا تھا، کی ستائش کرتے تھے۔ حقیقت میں انھوں نے ہی کے آر ملکانی کو سنگھ کا سویم سیوک بننے کے لئے قائل کیا۔

ملکانی کی کامیاب ایڈیٹرشپ میں 'آرگنائزر' سنگھ اور جن سنگھ کے حلیفوں اور مخالفوں کے حلقہ میں دلچسپی سے پڑھا جانے لگا۔ وہ مجھے کراچی کے دنوں میں ایک مہم جو کے طور پر ہی نہیں بلکہ راجستھان میں 'آرگنائزر' کے نمائندہ کے طور پر بھی جانتے تھے۔ میں ریاست میں ہو رہی سیاسی سرگرمیوں اور اسمبلی کی کارروائی کی رپورٹ روزانہ ہفتہ واری کو بھیجا کرتا تھا۔ چونکہ اب میں جرنل کا ایک سب ایڈیٹر تھا، اس لئے ملکانی نے مجھے مختلف موضوعات پر اپنے خیالات کا اظہار کرنے کی پوری آزادی دے دی تھی۔ جلد ہی میں تین کالم الگ الگ قلمی ناموں سے لکھنے لگا۔ ایسا کچھ تو میری دلچسپی کے سبب اور کچھ اس لئے بھی کہ ان دنوں مضمون نگار بہت کم ہوا کرتے تھے۔

میری اجرت زیادہ نہیں تھی، صرف 350 روپئے فی ماہ، ایسا اس لئے تھا کہ 'آرگنائزر' پروفیشنل جرنل نہیں تھا۔ اس کے علاوہ آزادی کے بعد ایک طویل عرصہ تک میڈیا کی قومی دھارا میں بھی اجرت کافی کم ہوا کرتی تھی۔ آمدنی کے مدنظر سے ان دنوں صحافت آج کی طرح قابل توجہ اور فائدہ مند کیریئر کا متبادل نہیں تھا۔ اس میں عام طور سے دو طرح کے لوگ جاتے تھے۔ ایک وہ جو مضمون نگاری میں زیادہ دلچسپی رکھتے تھے اور قدرتی صلاحیت کی دولت سے سرفراز تھے، یا وہ جو آدرش وادی اور کسی نظریہ کے حامی تھے اور جنھیں اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے لئے کسی اسٹیج کی تلاش تھی۔

چونکہ میری ضروریات زندگی بہت محدود تھی، اس لئے میری آمدنی میرے لئے کافی تھی۔ اس پیشہ سے اصلی فائدہ مجھے 1962 میں آر کے پورم (رام کرشن پورم) کی ایک سرکاری رہائش گاہ کے طور پر ہوا، جو میرے ایک منظور شدہ صحافی بننے کے بعد چار صحافیوں کے کوٹہ میں سے

مجھے ملی تھی۔ ویٹنگ لسٹ میں میرا نام بہت نیچے درج تھا اور اس لئے اس سال میں رہائش پانے کا حقدار نہیں تھا، لیکن رام کرشن پورم ایک نوتعمیر کالونی تھی اور جو رہائش کے حقدار تھے، انھوں نے یہ کہہ کر وہاں جانے سے انکار کر دیا کہ 'اتنی دور رہنے کے لئے کون جائے گا؟' یہ بیان آج مضحکہ خیز لگے، کیونکہ اب دہلی چاروں سمت میں اتنی پھیل چکی ہے کہ آر کے پورم میں ایک سرکاری فلیٹ پانے والے سے کئی لوگوں کو حسد ہوگا۔

آرگنائزر میں نوکری کرنے سے میرے ملبوسات مختلف ہو گئے۔ جب سے میں نے سنگھ کے تشہیر کار کے طور پر راجستھان میں کام کرنا شروع کیا تھا، میں نے پینٹ شرٹ پہننا چھوڑ کر ہندوستانی طرز کی دھوتی اور کرتا اپنا لیا تھا، لیکن جب میں 'آرگنائزر' میں آیا تو میرے ہم پیشہ کہنے لگے 'دھوتی کرتا تو لیڈروں کا لباس ہے' یہ صحافیوں پر نہیں جچے گا۔ میں ان خیالات کا حامی کبھی نہیں رہا کہ مغربی طرز لباس جدیدیت کی پہچان ہے۔ میں نے ہمیشہ خود کو دھوتی کرتے میں آرام دہ محسوس کیا ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی ان معاملوں میں میں کبھی ضدی نہیں رہا۔ اپنے ہم پیشوں کی صلاح مجھے ٹھیک لگی اور میں نے پھر پینٹ شرٹ زیب تن کر لیا۔

ایک دن ادارتی جائزہ میٹنگ میں اجتماعی طور پر یہ محسوس کیا گیا کہ ہمارا جرنل بہت ہی غیر دلچسپ ہے اور صرف سیاسی موضوعات پر ہی لکھتا ہے۔ ایڈیٹر ملکانی نے کہا کہ یہ سچ ہے، ہمیں زندگی کے دیگر دلچسپ پہلوؤں، جیسے فلم پر بھی لکھنا چاہئے، لیکن فلموں پر لکھے گا کون؟ یہ کام میں نے قبول کیا اور 'نیتر' کے قلمی نام سے سنیما پر ایک مسلسل مضمون لکھنے لگا۔

فلم تجزیہ کار کی حیثیت سے مجھے بین الاقوامی فلم تقاریب اور نئی فلموں کے پریمیئر میں جانے کا موقع ملا۔ کئی سال بعد مرارجی ڈیسائی کی حکومت میں جب میں نے وزیر اطلاعات ونشریات کے طور پر عہدہ سنبھالا اور مشہور فلم پروڈیوسروں سے تبادلہ خیال کا موقع ملا تو ان میں سے کم از کم دو، خواجہ احمد عباس اور پرتھوی راج کپور نے مجھ سے کہا 'میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے، لیکن یاد نہیں آرہا ہے کہ کہاں۔' میں نے انھیں بتایا کہ 'آرگنائزر' کے فلم تجزیہ کار کے ناطے میں نے ان کی نئی فلموں کی نمائش کے موقع پر پریس کانفرنس میں حصہ لیا تھا اور ان دونوں نے الگ الگ یہی تبصرہ کیا کہ 'مجھے یہ جان کر مسرت آمیز تعجب ہوا کہ ہمارے ایک وزیر ایسے بھی ہیں جو کبھی فلم تجزیہ نگار بھی ہیں ہوں۔'

'آرگنائزر' میں کام کرنے کے دوران میری اپیل پر دین دیال جی نے ایک ہفتہ واری کالم 'پالیٹکل ڈائری' لکھنا شروع کیا۔ وہ ہفتہ کا ایک اہم واقعہ یا موضوع منتخب کر لیتے تھے اور اس پر گہرائی سے غور وفکر کرنے کے بعد تبصرہ کرتے تھے۔ جلد ہی وہ کالم ہمارے قارئین میں مقبول ہوا۔ (اسی عنوان سے ان کالم نگاروں کا ایک صحیفہ بعد میں ایک کتاب کی شکل میں بھی شائع ہوا)۔ ایک دن میں نے ان سے کہا 'دین دیال جی، آپ اس کالم کو ایک ڈائری کی شکل میں کیوں نہیں لکھتے، جس میں آپ کے نجی دوروں، مشاہدوں اور لوگوں کے ساتھ ہوئے لین دین کا ذکر ہو۔' انھوں نے کہا 'نہیں، میں ایسا نہیں کر سکتا، کیونکہ اس میں 'میں' کی فراوانی ہوگی، جو میں پسند نہیں کرتا۔' جب میں نے یہ کہہ کر اپیل کی کہ قارئین براہ راست ان کے نظریات، تجربات کا استقبال کریں گے تو انھوں نے عدم دلچسپی کے ساتھ 'ہاں' کر دی۔

اس طرز کے دو کالم لکھنے کے بعد دین دیال جی میرے پاس آئے اور بولے 'لال، میں اسے جاری نہیں رکھ سکتا، اس طرح سے لکھنا میری فطرت نہیں ہے۔ میں موضوعات کے تعلق سے ہی لکھوں گا، نہ کہ اپنے بارے میں۔' دین دیال جی کے نرم رویہ اور خودستائش کے تئیں ان کی عدم دلچسپی پر بعد میں بولتے ہوئے میں نے کئی مرتبہ اس واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ خود کے بارے میں سوچنے تک سے پرہیز ان کی شخصیت کا ایسا پہلو تھا، جو دور حاضر میں تصور سے پرے ہے۔

1962 کا چینی حملہ

اکتوبر 1961 میں ملکانی کو ہاورڈ یونیورسٹی سے ایک فیلوشپ مل گئی اور وہ دو برسوں کے لئے امریکہ چلے گئے۔ میں ان کی غیر موجودگی میں 'آرگنائزر' کا کارگزار ایڈیٹر بن گیا۔ اس مدت میں ہفتہ در ہفتہ ہم نے جو بڑے موضوعات بڑی شدت سے اٹھائے، ان میں سے ایک تھا۔ 1962 کا چینی حملہ، جن سنگھ ہندوستان کے تمام پڑوسی ممالک کے ساتھ پر امن تعلقات کا بہی خواہ تھا، لیکن 1950 کے آغاز سے ہی وزیر اعظم نہرو اپنی بین الاقوامی امیج کے لئے جس انداز میں چین سے دوستی بڑھا رہے تھے، اس سے ہماری پارٹی اندیشوں میں گھری تھی۔ اکتوبر 1950 میں چین کے تبت پر اچانک قبضہ کر لینے سے چین کے ساتھ ہندوستان کی طویل پہاڑی سرحد کی حفاظت پر ہم پہلے ہی کافی متفکر تھے۔ جب تک نائب وزیر اعظم سردار پٹیل زندہ رہے، انھیں بھی یہی فکر ستاتی رہی۔ درحقیقت اپنی موت سے پانچ ہفتہ قبل 7 نومبر 1950 کو سردار پٹیل نے وزیر اعظم نہرو کو لکھے ایک دوررس خط میں لکھا تھا: ★

> ''چین کی حکومت نے پر امن منشا کی تاریکی میں ہمیں دھوکہ دینے کی کوشش کی جبکہ ہم خود کو چین کا دوست مانتے ہیں، لیکن چینی ہمیں اپنا دوست نہیں مانتے تھے۔ جو ہمارے ساتھ نہیں ہیں وہ ہمارے مخالف ہیں، یہ کیمونسٹوں کی ذہنیت رہی ہے، جسے ہمیں دھیان میں رکھنا چاہیے۔''

تبت میں چین کے قبضے کی وضاحت کرتے ہوئے پٹیل نے لکھا:

> ''ہمیں یہ غور کرنا چاہیے کہ ہم جس نئی صورت حال کا سامنا کر رہے ہیں، وہ تبت کے معدوم ہونے کا نتیجہ ہے اور چین کی توسیع تقریباً ہمارے دروازہ تک آپہنچی ہے۔ تاریخ میں ہمیں کبھی کبھی ہی اپنی شمال-مشرق سرحد کے لئے فکرمند ہونا پڑا ہے، لہٰذا پہلی مرتبہ ہندوستان کے تحفظ کے لئے دو موروچوں پر ایک ساتھ دھیان مرکوز کرنا پڑا ہے۔ ہمارا دفاعی پیمانہ اب تک پاکستان کی ترجیحات پر مبنی تھا۔ اعداد و شمار میں اب ہمیں کیمونسٹ چین کو بھی شامل کرنا ہوگا، جس کی متعینہ خواہشات اور مقاصد ہیں اور جو کسی بھی طرح ہمارے تئیں دوست نظر نہیں آتا۔ میرے خیال میں حالات ایسے ہیں کہ ہم نہ تو مطمئن ہو سکتے ہیں نہ ہی اس پر غیر سنجیدہ رویہ اختیار کر سکتے ہیں۔''

ان معاملات کو 'آرگنائزر' کے اداریے، رپورٹوں میں اور جن سنگھ کے عزائم اور بیانات میں زور و شور سے اور بار بار اٹھایا گیا۔ دراصل پارلیمنٹ میں اٹل جی کی ایک یادگار تقریر تبت پر ہی مشتمل تھی۔ یہ بدقسمتی ہے کہ سابق وزیر دفاع وی کے کرشن مینن ہندوستان کی فوجی قوت بڑھانے کے حق میں نہیں تھے۔ نہرو جی کو ان پر پورا یقین تھا۔ اپنے اس یقین کی بنیاد پر کہ چین ہندوستان پر کبھی حملہ نہیں کرے گا، انھیں چین پر بھی بھروسہ تھا۔ ان دنوں 'ہندی-چینی، بھائی بھائی' کا نعرہ عروج پر تھا، جسے سرکاری وسائل کی زبردست تشہیر نے نہرو کی خارجہ پالیسی کی عظیم کامیابی کا نتیجہ بتایا تھا، لیکن اکتوبر 1962 میں جب چین نے ہندوستان پر اچانک حملہ کر دیا تو نہرو کا دل ٹوٹ گیا۔ انھوں نے اسے ایک دوست کی غداری کے طور پر دیکھا، لیکن ان کے غلط مینجمنٹ کے سبب ہندوستان جنگ کے لئے تیار نہیں تھا اور اسے اس کی بھاری قیمت چکانی پڑی۔ 1962 کی جنگ میں شکست اور چین کے ذریعہ ہندوستانی زمین پر قبضہ کر لئے جانے کی تلخ یاد تقریباً نصف صدی گزر جانے کے بعد بھی

★ پٹیل کے ذریعہ نہرو کو تحریر کردہ خط کی تفصیلات کو جسونت سنگھ کی کتاب 'اے کال ٹو آنر' روپا اینڈ کمپنی 2006، صفحہ 400-394 میں دوبارہ لکھا گیا ہے۔

ہندوستانیوں کے ذہن سے نہیں نکل پائی ہے۔

25 دسمبر 1962 کو جنگ ختم ہو جانے کے فوراً بعد ہی حکومت کے ذریعہ اسپانسرڈ ایک دورہ پر بارہ ممبروں والے صحافیوں کی ٹیم کے ایک رکن کے طور پر میں لداخ گیا۔ ٹیم کے 6 ارکان غیر ملکی رپورٹرس تھے اور باقی ہندوستانی۔ لیہہ اور اس کے گرد و نواح کے ہماری چار روزہ دورہ نے اس نہایت پیچیدہ جغرافیائی اور ماحولیاتی صورت حال کے بارے میں میری آنکھیں کھول دیں، جس میں ہماری فوج کو ہندوستان کی سرحدوں کی حفاظت کرنے کے لئے کہا گیا تھا۔ ہم چوشول، جو سب سے زیادہ 15,000 فٹ کی بلندی پر بسا ہوا تھا، سمیت کئی مقامات پر گئے۔ اتنی زیادہ اونچائی پر ہوا کا دباؤ کم تھا، جس سے وہاں سانس لینا مشکل تھا۔ سردیوں میں درجہ حرارت صفر سے بھی نیچے چلا جاتا تھا۔ وزارت دفاع کے افسروں نے ہماری ٹیم کی سہولت کے لئے بہتر انتظامات کئے تھے۔ ہم تمام لوگوں کو ڈبہ بند غذا، خصوصی جوتے اور ٹوپی و سردلہر سے دفاع کے لئے موٹے اونی بستر دیئے گئے تھے، لیکن مجھے یہ دیکھ کر نہایت افسوس ہوا کہ ہمارے جوانوں کے پاس ڈھنگ کے گرم کپڑے اور جوتے بھی نہیں تھے۔ میرا دل مجرمانہ جذبہ کی طرح دھڑک گیا۔

چینی حملہ کے بعد کاراکورم درّہ سے ہندوستان، نیپال اور چین کی مشترکہ سرحد کے پاس واقع لیپولیکھ درے تک 2,115 کلومیٹر لمبی ہمالیائی سرحد کے لئے حکومت ہند نے انڈو-تبت بارڈر پولس (آئی ٹی بی پی) کی تشکیل کی۔ کئی برسوں بعد ہندوستان کے وزیر داخلہ کے طور پر آئی ٹی بی پی سمیت کئی نیم فوجی دستوں سے میرا تعلق رہا۔ جموں و کشمیر معاملہ کی طرح 1962 میں ہوئے چینی حملے نے بھی ہندوستانی خارجہ اور دفاعی پالیسیوں کی سنگین خامیاں اجاگر کر دیں۔ اس نے بھارتیہ کیمونسٹوں کے ہندوستانی موقف کو بھی اجاگر کر دیا۔ انھوں نے دوران جنگ اور ہندوستان کی شکست کے بعد بھی چین کی حمایت کی۔ اس کے نتیجے میں حکومت کو کئی سینئر کیمونسٹ لیڈروں کو جیل میں بند کرنا پڑا۔ اس کے برعکس، جن سنگھ اور سنگھ کی قوم پروری کی نہ صرف سرکاری حلقوں بلکہ اس سے بھی زیادہ عام لوگوں میں بھرپور ستائش کی گئی۔ سنگھ کے سویم سیوکوں اور جن سنگھ کے کارکنان نے ملک گیر پیمانہ پر خون کا عطیہ اور چندہ جمع کرنے کی مہم چلائی۔ انھوں نے کئی طرح کی سرگرمیوں کے توسط سے عام لوگوں میں حب الوطنی کا جذبہ بیدار کرنے کے لئے سخت مشقت کی۔ سنگھ کی بڑھتی مقبولیت کی واضح نشانی کے طور پر نہرو حکومت نے سنگھ کے سویم سیوکوں کے ایک دستہ کو 26 جنوری 1963 کے یوم جمہوریہ پریڈ میں حصہ لینے کے لئے مدعو کیا۔

نہرو دور کا خاتمہ

مابعد آزادی 1962 کا چینی حملہ کئی معنوں میں ہندوستان کی تاریخ کا ایک فیصلہ کن موڑ تھا۔ جنگ کے نتائج نے پنڈت نہرو کے حوصلہ کو توڑ کر رکھ دیا تھا، جس سے وہ کبھی پوری طرح نہیں نکل سکے۔ 27 مئی 1964 کو ان کے انتقال کے ساتھ ہی ہندوستانی سیاست کے ایک اہم دور پر پردہ گر گیا۔ جب وہ زندہ تھے تب ان کے بارے میں میرے دل میں مختلف النوع جذبات تھے اور اتنے برسوں میں ان کی شخصیت اور وراثت کے بارے میں میرا نظریہ زیادہ نہیں بدلا ہے۔

بلاشبہ نہرو ایک عظیم محب وطن تھے۔ ہندوستان کی آزادی کے لئے انھوں نے سخت جدوجہد اور قربانیاں پیش کیں۔ مہاتما گاندھی کے ذریعہ سردار پٹیل، یہ یاد رکھنا ضروری ہوگا کہ پورے ملک کے کانگریسی لیڈروں میں سے بیشتر لوگوں کی پسند تھے، کی جگہ نہرو کو ترجیح دیئے جانے کے سبب 1947 میں ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم بننے کے بعد انھوں نے ملک کو خود پر انحصار اقتصادی ترقی کو ایک مضبوط بنیاد فراہم کیا۔

آزادی کے ابتدائی برسوں میں لازمی طور پر ہندوستان کی صنعت کاری میں پبلک سیکٹر کو اہم رول ادا کرنا تھا، لیکن سوویت یونین سے متاثر ہونے کے سبب ایک قانونی لائسنس، کوٹہ پرمٹ راج، جس نے ہندوستان میں نجی صنعت کاری کی ترقی میں رکاوٹ پیدا کی، کے قیام کے لئے بھی نہرو ہی ذمہ دار تھے۔ ان کی بیٹی اندرا گاندھی، نے ہندوستان کی اقتصادی ترقی پر خامیوں سے بھرپور سوویت ماڈل کا شکنجہ مزید کس دیا اور انھوں نے سیاسی مفاد حاصل کرنے کے لئے ہی ایسا کیا۔ میں نے کئی مواقع پر اپنی تقاریر میں ہندوستان میں پارلیمانی جمہوریت کے قیام اور اس کی مضبوطی میں نہرو کے رول کی ستائش کی ہے، پھر بھی ان میں جارحیت کی ایک مضبوط فطرت بھی نہاں تھی۔ اپنے ان معاونین، جنھیں وہ پسند نہیں کرتے تھے، کے تئیں ان کا حسد ان غیر فراخ دلانہ کردار کا عکاس تھا۔ ہندوستان کے پہلے صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرساد جو اپنے اعلیٰ ترین جمہوری عہدہ اور جنگ آزادی میں اپنے خصوصی کردار کے سبب جس احترام کے قابل تھے، کے تئیں بھی نہرو نے ویسے احترام کا مظاہرہ نہیں کیا۔

ڈاکٹر شیاما پرساد مکھرجی، جنھوں نے بھارتیہ جن سنگھ کے قیام کے لئے ان کی وزارت ٹھکرا دی تھی، کے تئیں نہرو کے نجی اختلافات کے بارے میں سب جانتے تھے، تمام لوگوں کی رائے میں مکھرجی پارلیمنٹ میں نہرو سے کہیں اچھے مقرر تھے۔ ایک دن پارلیمنٹ میں نہرو گرجے 'میں جن سنگھ کو کچل دوں گا۔' ڈاکٹر مکھرجی نے فوراً جواب دیا 'اور ہم وزیر اعظم کی اس کچلنے کی ذہنیت کو کچل دیں گے۔'

تاریخ 1948 میں پاکستان اور 1962 میں چین کے ساتھ ہوئی جنگوں کی غیر ماہرانہ قیادت کو نہرو کی دو سب سے بڑی ناکامیوں کی شکل میں درج کرے گی۔ جب پاکستان نے کشمیر کو چھیننے کی جرأت مندانہ کوشش کی، اگر وہ پراعتماد طور پر پرعزم ہوتے تو یہ مسئلہ ہمیشہ کے لئے حل ہو جاتا اور بعد کی دہائیوں میں ہندوستان کو جو درد اور نقصان پہنچا، اس سے بلاشبہ بچا جا سکتا تھا۔ اسی طرح چین سے متعلق اپنی پالیسیوں میں اگر نہرو اتنے پراعتماد نہیں ہوتے تو بیجنگ سے ہمارے رشتے حقیقی بنیادوں پر بنتے اور شاید جنگ میں شکست کھائے بغیر سرحدی تنازع کا کوئی حل نکل آتا۔

1965 کا ہند-پاک جنگ

نہرو کے دور اقتدار کے آخری برسوں میں 'نہرو کے بعد کون؟' موضوع بحث تھا۔ اس کا جواب ایک بے لوث کانگریسی لیڈر، جو اپنی سادگی، نرمی اور صاف و شفاف عوامی زندگی کے لئے مشہور تھے، لال بہادر شاستری کی شکل میں ملا، جو نہرو کے بعد وزیر اعظم بنے۔ ان کی انفرادی خصوصیتوں نے جلد ہی انھیں ملک کا چہیتا بنا دیا۔ نہرو کی طرح ان میں جن سنگھ اور سنگھ کے تئیں کوئی نظریاتی بغض نہیں تھا۔ وہ قومی مسائل پر تبادلہ خیال کے لئے شری گروجی کو اکثر مدعو کیا کرتے تھے۔ 'آرگنائزر' کے ایک ترجمان کے طور پر میں کئی مرتبہ ان کے ساؤتھ بلاک میں واقع دفتر میں ان سے ملاقات کی غرض سے گیا اور ہر مرتبہ چھوٹے قد اور بڑے دل والے اس وزیر اعظم کی شخصیت سے متاثر ہو کر واپس آیا۔

شاستری کے وزیر اعظم بننے کے ایک سال کے اندر ہی جن سنگھ کو 1965 کے 'کچھ' معاہدہ کے خلاف ایک ملک گیر ستیہ گرہ شروع کرنا پڑا۔ جب ہندوستان کی تقسیم عمل میں آئی تو سندھ پاکستان کا ایک حصہ بن گیا، لیکن پوری کچھ ریاست کے ہندوستان میں انضمام ہونے کے بعد بھی پاکستان اپنی اس ضد پر قائم رہا کہ دونوں ممالک کے درمیان کی سرحدی لکیر کچھ کے ان کے وسط سے گزرتی ہے۔ تنازع تقریباً 3500 مربع میل میں پھیلے علاقہ کو لے کر تھا۔

اپریل 1965 میں پاکستانی فوج نے 'کچھ' میں ایک غیر متوقع اور اچانک حملہ کر دیا اور ہمارے علاقہ کے ایک حصہ پر قبضہ کر لیا۔ حکومت

برطانیہ کی ثالثی سے ہوئی جنگ بندی کے بعد سرحد پر جاری تصادم ختم ہوا۔ دونوں فریق کے مابین ہوئے معاہدہ کے تحت متنازع ایشو کے مستقل حل کے لئے کسی مستحکم بین الاقوامی اکائی کے سامنے لے جایا جانا تھا۔ اس معاہدہ سے جن سنگھ کی مخالفت اس بات پر تھی کہ اس سے ہندوستان کی علاقائی سالمیت پر پاکستان کے ذریعہ کیے گئے فوجی حملہ کو تقویت ملتی تھی۔ ہماری پارٹی کی فکرمندی اس بات میں پوشیدہ تھی کہ اس موضوع کو بین الاقوامی ثالثی کے حوالے کرنے کا مطلب ہندوستان کے ذریعہ کچھ کو ایک متنازع علاقہ کے طور پر قبول کر لینے کے مترادف ہوگا اور یہ بات کشمیر کے مسئلہ کے حل میں ایک غلط مثال پیش کرے گی۔ اس ملک گیر کچھ ستیہ گرہ کا اختتام 16 راگست 1965 کو دہلی میں ہونے والے ایک اجلاس کی صورت میں ہونا تھا۔

جن سنگھ کی دہلی اکائی کے سکریٹری ہونے کے ناطے اجلاس کی تیاری کے لئے سویم سیوکوں کی ایک بڑی فوج کو منظم کرنا میری ذمہ داری تھی۔ مقررہ دن پر 5 لاکھ سے زائد سویم سیوکوں نے پارلیمنٹ کی جانب کوچ کیا اور پارلیمنٹ اسٹریٹ پر جمع ہوئے۔ 'دی اسٹیٹس مین' اخبار نے اسے راجدھانی میں ہوئی اب تک کی سب سے بڑی 'ریلی' بتایا۔ بی بی سی اور دیگر مغربی میڈیا نے اسے 'وراث'، 'ہوش ربا' اور 'انوکھا' کا نام دیا۔ جس بات کی سبھی نے تعریف کی، وہ تھی تحریک کاروں کا منظم اور ڈسپلن پر مبنی رویہ۔ اس اجلاس کے سبب پورے ملک میں جن سنگھ کے وقار میں کافی اضافہ ہوا۔

'کچھ' پر چھاپہ مار کارروائی ستمبر 1965 میں کشمیر پر کیے گئے پاکستانی حملہ کی محض مشق تھی۔ اسلام آباد کے فوجی حکمراں اس غلط فہمی میں تھے کہ 1962 میں چین سے شکست کھانے کے بعد ہندوستانی فوج اپنا دفاع نہیں کر پائے گی۔ شاستری جی نے اس مشکل کا سامنا قوت ارادی سے کیا۔ 'طاقت کا مقابلہ طاقت سے ہی کیا جائے گا۔' انھوں نے ملک کو یقین دلایا۔ 'آگے بڑھو اور حملہ کرو۔' یہ فوجی طاقتوں کو ان کی ہدایت تھی۔ انھوں نے 'جے جوان، جے کسان' کا امر نعرہ دے کر اور ملک کے سامنے منھ پسارے اناج کے فقدان کے مسئلہ سے نمٹنے کے لئے لوگوں سے ہفتہ میں ایک دن 'اپواس' رکھنے کی اپیل کر کے ملک میں حب الوطنی کی مشعل جلا دی۔ اس اپیل کی زبردست پذیرائی ہوئی۔ ہندوستانی فوج، جو تقریباً لاہور کے باہری علاقہ تک پہنچ گئی تھی، کے لئے لوگوں کی حمایت حاصل کرنے میں سنگھ اور جن سنگھ کے کارکنان ایک مرتبہ پھر پہلی قطار میں تھے۔

تین ہفتہ سے جاری جنگ، جس میں پاکستان ایک شرمناک شکست کے دہانے پر تھا، پر بین الاقوامی دباؤ کے سبب جنگ بندی نافذ کر دی گئی۔ اس کے بعد جنوری 1966 میں سابق سوویت یونین کے تاشقند شہر میں وزیراعظم شاستری اور پاکستان کے صدر جنرل ایوب خان کے درمیان ایک سربراہ کانفرنس میں تبادلہ خیال ہوا۔ سوویت یونین کے وزیراعظم ایلکسی کوسی جن نے ثالث کا فرض نبھایا۔ تاشقند مذاکرات کی جن سنگھ نے مخالفت کی۔ اٹل بہاری واجپئی کی قیادت میں ہماری پارٹی کے وفد نے شاستری جی سے سربراہ کانفرنس میں حصہ نہ لینے کی اپیل کی۔ ہمیں خوف تھا کہ بین الاقوامی دباؤ ہندوستانی موقف کو پاک مقبوضہ کشمیر میں ہندوستانی فوج کے ذریعہ فتح کی گئی دو اہم چوکیوں، حاجی پور اور ٹھوا کو واپس کرنے کے لئے مجبور کر سکتا ہے۔

شاستری کے تاشقند روانہ ہونے کے کچھ ہفتہ قبل 'آرگنائزر' کے انٹرویو کے لئے میں ان سے ان کے دفتر میں ملا۔ میں نے لوگوں کے دل میں پوری طرح سمائے اس خوف کے بارے میں انھیں بتایا کہ حاجی پور اور ٹھوا کی چوکیاں پاکستان کو واپس دینے کے لئے ہندوستان پر دباؤ ڈالا جا سکتا ہے۔ وزیراعظم کا جواب بالکل واضح تھا 'آپ مطمئن رہیں ایسا نہیں ہوگا۔'

بدقسمتی سے جب شاستری نے جنرل ایوب خان کے ساتھ معاہدہ پر دستخط کیے تو ایسا ہی ہوا۔ باشندگان ہند کو امید تھی کہ وہ پاکستان کے

ساتھ ایک مضبوط پوزیشن میں بات کریں گے، کیونکہ جنگ کے میدان میں ہندوستانی فوجیوں نے اپنی بہادری پہلے ہی ثابت کردی تھی۔ آخر تک انھوں نے کسی بھی مصلحت انگیزی پر مبنی معاہدہ کی مخالفت کی تھی۔ ایک نکتہ پر، جب کوسیگن نے ان سے کہا 'آپ کو حاجی پور اور ٹتھوا چھوڑ نے پڑیں گے۔' تو شاستری جی نے یہ سخت جواب دیا تھا 'اس حالت میں آپ کو کسی اور وزیراعظم سے بات کرنی ہوگی۔'

پھر بھی ایک طویل بات چیت کے بعد، پوشیدہ حالات میں، پاکستان کے اس غیرواضح یقین کے بدلے کہ دوفریقی مسائل کے حل کے لئے مستقبل میں وہ طاقت کا استعمال نہیں کرے گا، شاستری ان دونوں چوکیوں سے ہندوستانی فوج کو ہٹانے کے لئے راضی ہوگئے۔ سربراہ کانفرنس کا یہ نتیجہ ان کے من کے مطابق نہیں تھا اور اپنے من پر شاید وہ اس کا بھاری بوجھ لئے ہوئے تھے۔ مشترکہ معاہدہ پر دستخط کرنے کے کچھ گھنٹوں کے اندر ایک زبردست ہارٹ اٹیک سے 11 رجنوری کو تاشقند میں ہی ان کا انتقال ہوگیا۔

اس خبر سے سارا ملک حواس باختہ تھا۔ بہت ہی کم مدت میں شاستری نے لوگوں کی نظروں میں بلند مقام بنالیا تھا۔ اُن کی بے وقت موت نے کانگریس پارٹی کے اندر ہوئی رسہ کشی کو بہت متاثر کیا۔

'آرگنائزر' سے منسلک ہونے کے بعد دہلی میں میری زندگی بہت اطمینان بخش تھی۔ ایک صحافی کے طور پر مجھے جے پرکاش نارائن، ڈاکٹر رام منوہر لوہیا★ اور مرار جی ڈیسائی جیسے معزز و مقبول قومی لیڈروں سے ملنے کا موقع حاصل ہوا۔ اس جرنل نے مجھے اپنے پسندیدہ تحریری کام میں مصروف رہنے کا موقع اور آزادی دی۔ اس کے ساتھ ہی جن سنگھ کے ایک سیاسی کارکن کے طور پر بھی میری مہم جاری رہی۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ مجھے 'آرگنائزر' اور میری پارٹی دونوں کے سبھی معاونین کا پیار اور اعتماد حاصل ہوا۔

زندگی کے اس خوشگوار موڑ پر میری زندگی میں ایک تبدیلی آئی، جس نے مجھے مزید خوشیاں اور قرار سے نوازا۔

★ ڈاکٹر رام منوہر لوہیا (67-1910) ایک فائر برانڈ آزادی کے سپاہی، دانشور اور عظیم سماج وادی لیڈر تھے۔ وہ مہاتما گاندھی کے سچے مرید تھے۔ نوجوانی میں وہ نہرو کے دوست تھے، لیکن بعد کے برسوں میں نہرو کے سخت ناقد بن گئے۔ انھوں نے ہندوستانی سیاست میں کانگریس کی ایک جماعتی فوقیت کو ختم کرنے کا عہد کیا۔ اس سے وہ جن سنگھ کے قریب آئے۔ وہ سنگھ کے بھی ستائشی تھے، لیکن انھوں نے محسوس کیا کہ یہ اپنی وسیع تر تنظیمی صلاحیت کا بہترین استعمال کرنا نہیں جانتی ہے۔ لوہیا نے ایک مرتبہ مجھ سے کہا تھا 'اگر میرے پاس بے لوث کارکنان اور ڈسپلن سویم سیوکوں کی فوج ہوتی، جیسی کہ سنگھ کے پاس ہے، تو میں اب تک ہندوستان میں ایک سیاسی انقلاب برپا کر کانگریس کی برتری کو ختم کر چکا ہوتا۔'

3

ازدواجی زندگی کی خوشی

دنیا کو راہ راست پر لانے کے لئے ہمیں پہلے ملک کو صحیح راستے پر گامزن کرنا ہوگا، ملک کو صحیح راہ پر لانے کے لئے ہمیں پہلے کنبہ کو صحیح راستے پر لانا ہوگا اور کنبہ کو صحیح راستے پر لانے کے لئے ہمیں پہلے اپنی نجی زندگی کو خوش حال بنانا ہوگا۔ اس کے لئے سب سے پہلے ہمیں اپنے دل کو صحیح راستہ پر لانا ہوگا۔

کنفیوشیس، چینی فلاسفر (479-551 قبل مسیح)

سنگھ میں تشہیری میکانزم کئی طرح سے انوکھی ہے۔ مثال کے طور پر، ایک تشہیر کار کوئی نوکری یا بزنس نہیں کر سکتا۔ اسے سنگھ کے ذریعہ دیئے جانے والے قلیل عطیہ پر گزارہ کرنا ہوتا ہے اور مالی معاملوں میں ضرورت سے زیادہ ایمانداری برتنی پڑتی ہے۔ دوسرے، سنگھ عموماً یہ چاہتا ہے کہ اس کے تشہیر کار ایک غیر شادی شدہ زندگی گزاریں۔ اس کے پس پشت یہ سوچ کارفرما ہے کہ ایک سویم سیوک جس نے اپنی مرضی سے مہم جو بننا قبول کیا ہے، قوم کی خدمت غیر منقسم ذہن سے کر سکے۔ دوسرے لفظوں میں اس کی 'شادی' قوم کے مقاصد اور آدرشوں کے ساتھ ہو جاتی ہے۔

سنگھ کے کئی سبق آموز آدرش اقوال میں سے ایک ہے 'راشٹریہ سواہا۔ ادن نہ مم۔ ادن راشٹریہ' اس کا ایک آزاد ترجمہ ہوگا۔ 'میں اپنا سب کچھ قوم کی نذر کرتا ہوں۔ یہ سب کچھ میرا نہیں، قوم کا ہی ہے۔'

چودہ برس کی عمر میں جب کراچی میں میں سنگھ میں شامل ہوا تھا، تبھی میں نے اس آدرش قول کو اپنا لیا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ اور خاص طور سے ہندوستان کی تقسیم کے سبب سندھ چھوڑنے کے بعد اس جذبہ میں میرا یقین محکم ہوتا گیا۔ اس لئے جب میں راجستھان میں کام کرتا تھا اور دہلی آنے کے بعد بھی میرے دل میں سنجیدگی سے کبھی شادی کا خیال نہیں آیا تھا اور چونکہ میں جن سنگھ کے کئی شار ممبروں، جن میں سے کئی سنگھ کے تشہیر کار بھی تھے، کے ساتھ رہتا اور کام کرتا تھا، اس لئے بغیر شادی کیے میں خود کو الگ سا محسوس نہیں کرتا تھا، لیکن جب میں 'آرگنائزر' میں شامل ہوا، معاشی طور سے آزاد ہوا اور اپنے نجی مکان میں رہنے لگا تو حالات میں تبدیلی آگئی۔ میں اب مہم جو نہیں رہ گیا تھا۔

1957 میں میری چھوٹی بہن شیلا سنتو بھاونانی سے شادی کر کے بمبئی میں ہی بس گئی تھی۔ اسی نے مجھ سے گزارش کی کہ میں بھی شادی

کر کے اپنا گھر بساؤں۔ وہ مجھے بار بار یاد دلاتی تھی کہ میں تیس برس پار کر چکا ہوں۔ آہستہ آہستہ مجھے بھی اس کی بات اچھی لگنے لگی، چونکہ میں نے اپنی زندگی میں خاتون دوست نہیں بنائی تھی، لہٰذا اُن کا یہ مشورہ کہ وہ میرے لئے ایک مناسب شریک حیات تلاش کرلے گی، میں رضامند ہوگیا۔

1965 کے اوائل میں جن سنگھ کے ایک اجلاس میں حصہ لینے کے لئے میں آندھرا پردیش کے وجے واڑہ شہر میں گیا تھا۔ اس وقت میں پارٹی قومی ورکنگ کمیٹی کا ایک ممبر تھا۔ دریں اثنا یہ بتادوں کہ پنڈت دین دیال اپادھیائے نے اپنا فلاسفانہ ایجنڈا 'ایکاتم مانو واد' پارٹی کی ورکنگ کمیٹی کے سامنے پہلی مرتبہ یہیں پر پیش کیا تھا۔ واپسی میں کچھ دنوں کے لئے بمبئی میں رکا۔ شیلا نے کملا جگتیانی، جو میری ہی طرح کراچی سے بے دخل ایک سندھی لڑکی تھی، سے میری ملاقات طے کردی تھی۔ میں اس ملاقات کے لئے فوراً تیار ہوگیا۔ کملا کے ساتھ اس دن کی مختصر ملاقات ہماری ایک ساتھ گزرنے والی زندگی کی شروعات تھی۔

کملا کے کنبہ والے میرے کام کے بارے میں اتنا ہی جانتے تھے کہ میں ایک صحافی اور سیاسی کارکن بھی تھا۔ دونوں کنبہ والوں کی جب ایک دوسرے سے ملاقات ہوئی تو اسی وقت ایک شخص اس دن کے 'ٹائمس آف انڈیا' کی ایک کاپی لے کر آئے اور مجھ سے پوچھنے لگے 'اس اخبار میں آپ کا نام شائع ہوا ہے؟' وجے واڑہ سے خبر دیتے ہوئے 'ٹائمس' نے جن سنگھ میں آئین کی ترمیم کے مقصد سے پارٹی کے ذریعہ تشکیل کردہ چار رکنی ٹیم کے ایک رکن کے طور پر میرے نام کا ذکر کیا تھا۔ جب میں نے اس کا جواب 'ہاں' میں دیا تو میرے آس پاس کھڑے لوگوں کے چہروں پر تعجب کا شائبہ نظر آیا۔ انھوں نے شاید سوچا ہوگا کہ 'ایسا لگتا ہے کہ اس قومی پارٹی میں اس آدمی کی کوئی حیثیت ہے۔'

25 رفروری 1965 کو بمبئی میں میں اور کملا ازدواجی زندگی کے بندھن میں بندھ گئے۔ ویدک رسم ورواج سے مکمل ہوئی وہ ایک سادہ تقریب تھی۔ استقبالیہ تقریب چرچ گیٹ کے پاس کے سی کالج، دو عظیم سندھی شخصیات، پرنسپل کے ایم کندنانی اور بیرسٹر ہوت چند آڈوانی کے ذریعہ قائم کیا گیا تھا، کی چھت پر منعقد کی گئی تھی۔ کملا کراچی کے ایک امیر اور معزز خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ میرے کنبہ کے برعکس ان کا کنبہ بڑا تھا۔ ان کے چار بھائی اور ایک بہن تھی۔ تقسیم کے بعد ان کے کنبہ کو نہایت کسمپرسی کے حالت میں ہندوستان آنا پڑا تھا اور جب وہ بمبئی پہنچے تو ان کے پاس کچھ بھی محفوظ نہیں تھا۔ کملا کے والد پریم چند جگتیانی ایک پاک روح تھے، جنھوں نے حکومت سے اپنی تباہ شدہ ملکیت کے لئے کوئی معاوضہ نہیں لیا۔ 1952 میں ان کا انتقال ہوگیا تھا، اس کے بعد کملا نے اپنے کنبہ کی پرورش کی ذمہ داری اپنے کاندھوں پر لے لی۔ پہلے انھوں نے آٹھ برسوں تک دہلی کے گول ڈاک خانہ کے جنرل پوسٹ آفس میں اور پھر بمبئی کے وی ٹی اسٹیشن کے پاس نو سال تک کام کیا۔

اس طرح، میری ہی طرح کملا بھی زندگی کی پریشانیوں سے آگاہ تھیں، اس لئے یہ ممکن ہوسکا کہ کم آمدنی میں بھی دہلی میں ہم پر مسرت رہ سکے۔ ہماری شادی کے بعد کے کچھ مہینوں تک مجھے اپنے کپڑے دھوتے دیکھ کر انھیں تعجب ہوتا تھا۔ وہ اسے پسند نہیں کرتی تھیں۔ 'آپ ایسا کیوں کرتے ہیں؟' انھوں نے مجھ سے پوچھا۔ میں نے کہا 'میں جب سے راجستھان میں ایک تشہیر کار کے طور پر کام کرتا تھا تبھی سے یہ کررہا ہوں۔'

'نہیں، اب میں آپ کو یہ سب نہیں کرنے دوں گی۔ آپ کے کپڑے اب میں دھوؤں گی۔' انھوں نے کہا اور مجھے وہ کام چھوڑنا پڑا۔

زندگی ایشور کے تحائف سے بھرپور ہے۔ زندگی کی سب سے قیمتی تحائف میں سے ایک ہے اولاد کا سکھ۔ کملا اور میری پہلی اولاد جینت کی پیدائش 18 رفروری 1966 کو ہوئی۔ 6 رستمبر 1967 کو جب پرتبھا کی پیدائش ہوئی تو ہماری خوشی دوگنی ہوگئی۔ دونوں کی پیدائش بمبئی میں ہوئی۔ پرتبھا کچھ برسوں تک بمبئی میں اپنی نانی کے ساتھ رہی اور اپنی بنیادی تہذیب اس سنت جیسی خاتون سے حاصل کیں۔

اپنے بچوں کو بڑے ہوتے دیکھنا میرے لئے نہایت خوشی کی بات تھی۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بچے کے طور پر جینت ہر شام مجھ سے کہتا تھا،

میں اسے 'پانی میں بتی' دکھانے کے لئے لے جاؤں۔ وہ دلی کے انڈیا گیٹ کے روشن فواروں کا ذکر کرتا تھا۔ جلد ہی جینت اور پرتھما کو ہمایوں روڈ میں واقع رگھوویر سنگھ جونیئر ماڈرن اسکول میں داخلہ کرایا گیا اور میں انھیں اپنی ہرے رنگ کی نئی فیٹ کار میں اسکول چھوڑتا تھا۔ میں ان کے ہوم ٹاسک میں ان کی مدد کرتا تھا اور ان کے کھیل اور ثقافتی پروگراموں میں شامل ہوتا تھا۔ عام طور پر جینت کے کرکٹ میچوں میں اور پرتھما کے ڈانس ڈراموں اور فن تقریر۔کے پروگراموں میں۔

فروری 1977 میں کسی وقت پرتھما نے اپنے اسکول کے دعائیہ اجلاس میں ایک تقریر کی تھی، جسے میں فخر سے یاد کرتا ہوں۔ جنوری میں ایمرجنسی ختم ہوئی تھی اور سیاسی قیدیوں کو رہا کر دیا گیا تھا۔ میں انیس مہینے بنگلور سنٹرل جیل میں رہنے کے بعد واپس دہلی آیا تھا۔ وزیر اعظم اندرا گاندھی کو مجبوراً پارلیمانی انتخاب کرانے پڑے تھے۔ جے پرکاش نارائن کی بہترین قیادت میں کئی اپوزیشن پارٹیوں نے مشترکہ طور پر ایک اسٹیج تیار کیا، جسے 'جنتا پارٹی' کہا گیا۔ یہ پارٹی ہندوستان کے دوسرے جدوجہد آزادی کے ایک ماڈل کے طور پر ابھری۔ پرتھما تب صرف 10 سال کی تھی اور اس نے اپنی تقریر میں کہا تھا:

''مارچ میں ہمارا ملک نئی لوک سبھا کو منتخب کرنے جارہا ہے۔ اہم مقابلہ کانگریس اور جنتا پارٹی کے درمیان ہوگا۔ جنتا پارٹی کا مختصر نام جے پی ہے۔ اس کا قیام جے پرکاش نارائن کی کوششوں سے ہوا ہے۔ انھیں بھی جے پی کے نام سے جانا جاتا ہے۔ مجھے یہ کہنے کی اجازت دی جائے کہ میرے بھائی کا نام جینت ہے اور میرا پرتھما، اس لئے ہم بھی مل کر جے پی بنتے ہیں۔''

اپنے بچوں پر میں نے کبھی بھی اپنے خیالات نہیں تھوپے۔ میں نے انھیں ان کی فطری صلاحیتوں کو آزادانہ طریقہ سے فروغ ہونے دیا۔ ہمارے کنبہ کا پس منظر ایسا تھا کہ حب الوطنی اور کردار سازی کے بنیادی اثر جینت اور پرتھما میں بہت چھوٹی عمر میں بیٹھ گئے۔ بچے بڑوں کے مقابلہ جلدی سیکھتے ہیں، وہ اپنے والدین کے رویہ اور سماج کے دیگر لوگوں سے باہری دنیا کے مقابلہ میں زیادہ سیکھتے ہیں۔ لبنانی شاعر خلیل جبران کے ذریعہ لکھی ایک خوبصورت نظم ہے 'چلڈرن' (بچے)، جسے میں تمام والدین کو پڑھنے کے لئے زور دوں گا۔

آپ کے بچے آپ کے بچے نہیں ہیں،
یہ زندگی کے خود کے تئیں چاہت کی بیٹے اور بیٹیاں ہیں
وہ آپ کے توسط سے آئے ہیں، لیکن آپ کے ذریعہ نہیں آئے ہیں،
حالانکہ وہ آپ کے ساتھ ہیں، لیکن وہ آپ کے نہیں ہیں
آپ انھیں اپنا پیار دے سکتے ہیں لیکن اپنے نظریات نہیں،
ان کے لئے ان کے اپنے نظریات ہیں
آپ ان کے جسم کو گھر میں رکھ سکتے ہیں، لیکن روح کو نہیں،
ان کی روح کل کے گھر میں رہائش پذیر ہے
جس میں آپ اپنے خوابوں میں بھی نہیں جاسکتے
آپ ان کے جیسے ہونے کی کوشش کر سکتے ہیں
لیکن انھیں اپنے جیسا بنانے کی کوشش نہ کریں

کیونکہ زندگی پیچھے نہیں چلتی، نہ ہی گزرا ہوا کل آج سے چپکا رہتا ہے
آپ کمان ہیں جس سے آپ کے بچے
زندہ تیر کی شکل میں چھوڑے جا چکے ہیں
تیر انداز نے لامتناہی راہوں میں اُن کے نشان دیکھے ہیں
اور اس نے اپنی طاقت سے آپ کو جھکا دیا ہے،
جس سے اس کے تیر تیز رفتاری سے دور جائیں
چلو، تیر انداز کے ہاتھوں ہمارے جھکنے کو اپنی خوشی مانیں،
چونکہ وہ جتنا اڑتے تیروں سے پیار کرتا ہے
وہ اتنا ہی اس کمان کو بھی پیار کرتا ہے، جو قائم ہے

ایک کہاوت ہے کہ خواتین نصف آسمان کو اپنے کاندھوں پر اٹھائے ہوئے ہیں۔ میں سوچتا ہوں کہ جہاں تک ہندوستانی ماؤں کا تعلق ہے، یہ سچ نہیں ہے۔ میرے معاملہ میں، میرا کنبہ چلانے کا مکمل سہرا کملا کو ہی جاتا ہے۔ بڑھتی ہوئی سیاسی ذمہ داریوں اور اکثر ملک کے تمام حصوں کا دورہ کرتے رہنے کے سبب میں اپنے کنبہ کو کافی وقت نہیں دے پایا۔ کچھ تو اپنے برتاؤ کے سبب اور کچھ میرا پس منظر ایک تشہیر کار کی ہونے کے سبب، پیسوں سے منسلک معاملوں میں میں بالکل انجان رہا ہوں۔ اس سے کملا کی ذمہ داری میں اور اضافہ ہو گیا۔ جیسے جیسے سال گزرتے گئے، میں ان کی صبر آزما حوصلہ مندی، سخت محنت کرنے کی غیر محدود صلاحیت، کنبہ کے مالی مینجمنٹ پر ان کی گہری نظر اور سب سے اوپر میری اور بچوں کی شفقت آمیز دیکھ ریکھ سے ہمیشہ حیرت زدہ ہوتا رہا ہوں۔ بلاشبہ وہی ہمارے کنبہ کی اہم ستون رہی ہیں۔

ایک سیاسی کارکن کا گھر مشکل سے ہی پرامن رہ پاتا ہے۔ روزانہ ملنے والوں کی قطار لگی رہتی ہے۔ اس معاملہ میں بھی کملا سدا ہی ایک پرجوش میزبان رہی ہیں★۔ سنگھ یا جن سنگھ کے سینئر لیڈر اکثر غیر رسمی طریقہ سے یا کسی مقررہ کام سے ہمارے چھوٹے سے گھر میں آتے رہے ہیں۔ بلاتفریق انھیں گھر کا ماحول اپنائیت سے بھرپور لگا ہے۔ ان میں سے کئی ہمارے کنبہ کے رکن جیسے ہی بن گئے۔ دین دیال جی اور اٹل جی کے علاوہ اس میں دتوپنت ٹھینگڑی بھی شامل تھے، جنھوں نے بھارتیہ مزدور سنگھ کا قیام عمل میں لایا اور اسے ہندوستان کی سب سے بڑی ٹریڈ یونین بنایا۔ راجندر شرما، جنھوں نے کئی برسوں تک پارٹی کے پارلیمانی دفتر کو چلایا۔ سندر سنگھ بھنڈاری، راجستھان کے دنوں میں میری پارٹی کے معاون اور این ایم (آپا) گھٹاٹے★★ ایک نوجوان وکیل اور پارٹی کارکن اور ان کی اہلیہ شیلا۔ یہ تمام لوگ میرے لئے کنبہ کے رکن کے برابر تھے۔ ٹھینگڑی جی کے ساتھ میں نے خاص طور سے بہت نزدیکی نجی تعلقات بنائے، پھر بھی میں سیاست اور سیاسی پارٹیوں کے سلسلہ میں ان کی ناقدانہ رائے سے متفق نہیں تھا۔ ان تمام لوگوں نے ہمیشہ ماحول کو جوشیلا بنایا۔

ایسے ہی ایک شخص کے بارے میں میں یہاں تفصیل سے بات کرنا چاہوں گا، جنھوں نے قومی احیا کی ایک اہم پروجیکٹ کی قیادت کی تھی۔

★ پرتھما اور میں کملا کو 'ان پورنا' کہتے ہیں، کیونکہ انھیں مہمانوں کو اپنے ہاتھ سے کھانا کھلانے میں بے حد خوشی ہوتی ہے۔

★★ اپا گھٹاٹے 17 ویں لاء کمیشن کے نائب چیئر مین رہے۔ ناگپور میں ان کے کنبہ نے سنگھ کے کام میں بہترین کردار ادا کیا۔ شیلا نے کچھ سال میرے پارلیمانی کام میں تعاون دیا۔

ایکناتھ راناڈے: ایک سچے عمل پرور

سنگھ کے ایک عام لیڈر، جن کے ساتھ میں نے اپنے 'آرگنائزر' کے دنوں میں کام کیا تھا اور جن کی شخصیت نے مجھ پر گہرا اثر ڈالا تھا، وہ تھے ایکناتھ راناڈے۔ وہ نہ صرف ایک فلاسفی تھے بلکہ اتنے ہی باعمل شخص بھی تھے۔ ایسا اتفاق کبھی کبھی دیکھا جاتا ہے۔ وہ جب کچھ کرنے کا عہد کر لیتے تھے تو اسے مکمل کیے بغیر چین سے نہیں بیٹھتے، خواہ ان کی راہ میں کتنی بڑی رکاوٹ حائل کیوں نہ ہو۔

اس بات کا سب سے بڑا ثبوت تھا کنیا کماری۔ وہ مقام جہاں گاندھی جی کے الفاظ میں 'تین سمندر مل کر بھارت ماتا کے پاؤں دھوتے ہیں' میں وویکانند اسمارک شلا کی تعمیر، جس کا تصور انھوں نے کیا تھا۔ یہ وہی شلا تھی جس پر بیٹھ کر سوامی وویکانند جنوبی ہند کے اپنے طویل مدتی دورے پر دسمبر 1892 میں تین دن تک گہری فکر میں غرق رہے۔ انھوں نے بعد میں کہا تھا کہ انھوں نے وہاں ہندوستان کے ماضی، حال اور مستقبل پر غور وخوض کیا تھا۔ اس سے اگلے سال 11 ستمبر 1893 کو شکاگو میں منعقد بین مذاہب کی عالمی پارلیمنٹ میں سوامی وویکانند کے عالمی برادری اور بین مذہبی احترام کے تاریخی پیغام کے طور پر اس گہری فکرمندی کا اظہار ہوا تھا۔

یہ ایکناتھ جی کا خواب تھا کہ قوم کے اس محب وطن سادھو، جنھیں مہارشی اروند، ''آدمیوں میں شیر''، کہتے تھے، کا اعزاز کنیا کماری میں ان کا ایک مکمل اسمارک بنا کر کرنا چاہیے۔ شری گروجی اور دیگر، جن سے انھوں نے اس موضوع پر بات کی، سبھی نے اس خیال پر فوراً رضامندی کا اظہار کیا۔ 1963 میں وویکانند اسمارک شلا کمیٹی کے تنظیمی سکریٹری کے طور پر انھوں نے عہدہ اختیار کیا۔ اس کمیٹی کی شاخیں ملک کے کئی شہروں میں قائم کی گئیں۔ دہلی کمیٹی کا تنظیمی سکریٹری مجھے بنایا گیا۔ اس سے مجھے ایکناتھ جی کے ساتھ نزدیک سے کام کرنے اور ان کی بے پناہ توانائی کا کچھ حصہ جذب کرنے کا موقع ملا۔

شروع سے ہی اس پروجیکٹ کو کئی رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ایکناتھ جی نے وویکانند اسمارک شلا کی تعمیر کی اجازت دینے کے لئے وزیراعظم اندرا گاندھی کو ایک خط لکھا تھا۔ یہ معاملہ سابق وزیر تعلیم وثقافت ہمایوں کبیر کو سونپ دیا گیا۔ کبیر نے اس بنیاد پر اس تجویز کو نامنظور کر دیا کہ کنیا کماری میں پانی کے درمیان واقع اس شلا پر کیا گیا کوئی بھی تعمیری کام اس جگہ کی انوکھی خوبصورتی کو تباہ کر دے گی۔

ایکناتھ جی کو مایوسی ہوئی، لیکن وہ رکنے والوں میں سے نہیں تھے۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا 'اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟' میں نے انھیں مشورہ دیا کہ وہ پروجیکٹ کی ضرورت اور اس کی قومی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے تمام ارکان پارلیمنٹ کو خط لکھیں اور ان سے مدد مانگیں۔ 'ایک بڑی تعداد میں ارکان پارلیمنٹ کی حمایت کے ساتھ وزیراعظم سے نئے سرے سے گزارش کی جاسکتی ہے۔' میں نے کہا۔

'تم کیا سوچتے ہو، ہمیں کتنے دستخط مل جائیں گے؟' انھوں نے مجھ سے پوچھا۔

میرا جواب تھا 'میں کہہ نہیں سکتا، لیکن کوشش کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔'

ہم اس کام میں تن من سے مصروف ہو گئے اور کئی سیاسی پارٹیوں کے لیڈروں سے ملاقات کی۔ ہمیں خود کو متحیر کرتے ہوئے 300 سے زائد ممبران پارلیمنٹ کے دستخط مل گئے، جن میں سے بیشتر کانگریس پارٹی کے تھے اور کئی تو سی پی آئی اور سی پی آئی (ایم) کے بھی تھے اور حوصلہ افزا حمایت کا سہارا لے کر ہم نے اندرا گاندھی کو ایک میمورنڈم دیا۔ انھوں نے اس پروجیکٹ کے لئے منظوری دے دی۔

اس پروجیکٹ کی راہ میں متعدد رکاوٹیں تھیں، لیکن وہ بڑی نہیں تھیں اور ان سے آسانی سے نمٹا جاسکتا تھا۔ مثال کے طور پر تمل ناڈو کے

عیسائیوں نے کہا کہ یہ وویکانند نہیں، سینٹ فرانسس زیویرس راک ہیں اور اس لئے وہاں پر اسپین کے سولہویں صدی کے اس سینٹ کا اسمارک بنایا جانا چاہیے۔ تمل ناڈو حکومت نے ان کے اس مطالبہ کو مسترد کردیا۔

شروع سے ہی ایکناتھ جی اس پروجیکٹ کے لئے تمام پارٹیوں اور سماج کے تمام طبقات کی حمایت چاہتے تھے۔ ان کا پس منظر سنگھ کا ہونے کے باوجود اندرا گاندھی اور مختلف نظریوں کو ماننے والے دیگر لیڈروں سے ان کے اچھے اور نجی تعلقات تھے۔ اس سچائی کے سبب کہ انھوں نے کئی سال بنگال میں کام کیا تھا اور روانی کے ساتھ بنگلہ زبان بول سکتے تھے، وہ کئی کمیونسٹ لیڈروں کے بھی پسندیدہ تھے۔

جس ایمانداری اور عزم کے ساتھ وہ گفتگو کرتے تھے اور جس طرح سے سوامی وویکانند کے آدرشوں، قربانیوں اور خدمت کو انھوں نے اپنایا تھا، اس سے سبھی لوگ متاثر تھے۔ اپنی اس کوشش میں انھیں ہندوستان کے تمام مذہبی لیڈروں کی بھی حمایت اور تعاون حاصل تھی۔ دو ایسے معزز شخص جنھوں نے اس پروجیکٹ کو ہر مرحلہ میں اپنا آشیرواد اور رہنمائی دی، وہ تھے سوامی رنگناتھ آنند اور کانچی کے جگت گرو سوامی جی شری چندر شیکھر سرسوتی۔ یہ ایکناتھ جی کی غیر معمولی قیادت اور تنظیمی صلاحیت کا ہی نتیجہ تھا کہ اسمارک شلا مشن کسی بھی مرحلہ میں کبھی متنازع موضوع نہیں بن سکا۔

ایکناتھ جی پروجیکٹ کی 1.25 کروڑ روپے کی تخمینہ لاگت کا بیشتر حصہ امیروں سے نہیں بلکہ عام لوگوں سے ایک یا دو روپے فی کس چندہ کے ذریعہ جمع کرنے کے لئے وہ پابند عہد تھے۔ اس سے ملک بھر میں لاکھوں سویم سیوکوں کو سوامی وویکانند کا پیغام عام لوگوں تک پہنچانے کا موقع ملا۔ چونکہ یہ ایک قومی یادگار تھی، ایکناتھ جی مرکزی اور ریاستی حکومتوں کے رول کے خواہش مند تھے۔ حکومت ہند نے 10 لاکھ روپے کی محدود رقم کی امداد کی تھی۔ ایک کو چھوڑ کر تمام ریاستی حکومتوں سے چندہ حاصل ہوا۔ ایکناتھ جی اس مستثنیٰ کا ذکر واضح الفاظ میں کرتے ہیں:

> ''تمام سیاسی پارٹیوں کے لیڈر، خواہ وہ برسراقتدار ہوں یا حزب اختلاف کے ہوں، کنیا کماری میں راک میموریل کی تعمیرات میں رضا کارانہ حصہ دار بننا چاہتے تھے۔ اسمارک شلا فنڈ کے لئے بغیر کوئی مدد کئے بغیر خالی ہاتھ واپس کرنے والے صرف ایک سابق وزیر اعلیٰ تھے۔ کیرل کے کامریڈ ای ایم ایس نمبودری پاد۔ ان کے ساتھ ہوئی بے نتیجہ گفت وشنید کے بارے میں اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ وہ ایک مورت کے ساتھ بات کرنے جیسا تھا۔ تمام تر میں تنہا ہی بولتا رہا۔ ایک بے جان نظر کے سوائے مجھے دوسرے فریق سے کچھ بھی نہیں ملا۔''

ایکناتھ جی دوسروں سے کام لینے میں سخت تھے۔ اسمارک کی تعمیر میں لگنے والے چھ برسوں 1964 سے 1970 کی مدت میں وہ میرے رام کرشن پورم کے چھوٹے سے فلیٹ میں کئی بار قیام پذیر ہوئے۔ کبھی کبھی تو وہ رات کے 2 بجے آکر مجھ سے کہتے 'لال، اس اپیل کا مسودہ ہمیں ابھی تیار کرنا ہے۔' بالآخر اس شاندار اسمارک کا افتتاح 2 ستمبر 1970 کو ہندوستان کے سابق صدر جمہوریہ وی وی گری نے کیا۔ جدید ہندوستان کے عظیم سنتوں میں سے ایک اس عظیم الشان یادگار کی تعمیر حقیقت میں ایک سبق آموز کہانی ہے۔ اس قومی پروجیکٹ میں حصہ لینے کے لئے میں خود کو باعث فخر محسوس کرتا ہوں۔ وویکانند اسمارک شلا کی تعمیر کے بعد ایکناتھ جی ان کے آدرشوں کو ہندوستان کی قومی زندگی میں جذب کرنے کے لئے ایک 'نظریاتی اسمارک' بنانے میں مصروف ہوگئے۔

اس طرح 1972 میں کنیا کماری میں 'وویکانند سینٹر' کی مخالفت ہوئی۔ یہ روحانی خدمت مشن مردوں اور عورتوں، خاص طور سے نوجوانوں کو قومی تعمیر کے مختلف شعبہ جات میں پورے انہماک کے ساتھ کام کرنے کی تربیت دیتا ہے۔ ایکناتھ جی نے وویکانند سینٹر کی شاخیں قائم کرنے

کے لئے دور دراز تک کی مسافت طے کیں۔ خاص طور سے شمال مشرق اور انڈمان، نکوبار جزیرہ کے دور دراز کے قبائلی اکثریتی علاقوں میں۔

وہ ایک سچے مرد میدان تھے، جو تقریباً ہر وقت یہاں تک کہ اپنی موت تک بے پناہ کام کرتے رہے۔ بلڈ پریشر، جس نے انھیں شدید طور پر معذور بنا دیا تھا، سے نکلنے کے بعد بھی۔ جو لوگ انھیں آرام کرنے کی صلاح دیتے تھے، ان سے وہ کہتے تھے، کچھ ماہ کے لئے میں مر ہی گیا تھا، میں نے اپنی آنکھ بند کر لی تھی، لیکن اب میں واپس آ گیا ہوں تو اس کا مطلب ہے کہ ایشور چاہتا ہے کہ میں اب بھی کام کرتا رہوں۔ میں آرام کر کے اپنے جسم کو زنگ نہیں لگانا چاہتا۔ مجھے جو وقت دان میں دیا گیا، اسے میں مزید کام کر کے اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے میں صرف کروں گا۔ بغیر کام کئے زندہ رہنا مجھے موت کے مساوی لگتا ہے۔ ایشور کی جب خواہش ہوگی تب تک وہ مجھے زندہ رکھے گا، مجھے اپنا کام کرنے دیجئے۔

22 اگست 1982 کو ایکنا تھ جی نے آخری سانس لی۔

4

دہلی میٹرو پولیٹن کونسل میں داخلہ

ہر شخص یہ بتائے کہ کس طرح کی حکومت کی وہ عزت کرے گا
اور یہ اسے پانے کی سمت میں ایک قدم ہوگا۔

ہنری ڈیوڈ تھورو (1817-1862) امریکی فلاسفر

1967 میں 'آرگنائزر' میں 7 برسوں کی میری سرگرمی ختم ہوگئی۔ ایسا اس لئے ہوا کہ ایک طویل وقفہ کے بعد مجھے دہلی کی سیاست میں ایک اہم ذمے داری نبھانے کے لئے واپسی کرنی پڑی۔ 1952 میں دہلی کی ریاست کا درجہ ختم کردیا گیا۔ اسے مرکزی حکومت کے تحت ریاست قرار دے دیا گیا، جس میں تھی۔ نئی دہلی میونسپل کارپوریشن (این ڈی ایم سی) جو اس وقت تقریباً مکمل طور پر مرکزی حکومت کے دفاتر اور رہائشی کالونیوں تک محدود تھی اور نئی دہلی کی شہری ضروریات کی سہولیات فراہم کرتی تھی اور دہلی میونسپل کارپوریشن (ایم سی ڈی) جو پرانی دلی اور شہر کے کچھ نئے علاقوں، جن میں بیشتر گزشتہ دو تین دہائیوں میں وجود میں آئے ہیں، ان کی شہری سہولیات کی نگہبانی کرتی تھی۔

دہلی کا ریاست کا درجہ ختم کیا جانا اس کے شہریوں کو پسند نہیں آیا۔ جن سنگھ نے ان کے جذبات کی نمائندگی کی اور وہ قومی راجدھانی کو مکمل ریاست بنائے جانے کا مطالبہ کرنے والی پہلی پارٹی بن گئی۔ پارٹی نے اس موضوع پر ایک عوامی تحریک چلائی۔ اس مطالبہ سے نیم رضامندی کے طور پر مرکزی حکومت دتی میٹرو پولیٹن کونسل، جسے ایک ریاستی اسمبلی کا مساوی درجہ دیا گیا تھا، کی تشکیل کے لئے رضامند ہوگئی۔ اس نے یہ اعلان بھی کیا کہ مارچ 1967 میں ہونے والے عام انتخابات کے ساتھ ہی اس نئی کونسل کے لئے بھی الیکشن کرائے جائیں گے۔ یہ پیش رفت لوگوں کی امید پر پوری نہیں اتری اور اس لئے حکومت کو اکتوبر 1966 میں ایک عبوری دتی میٹرو پولیٹن کونسل کے قیام کے لئے مجبور ہونا پڑا۔ ایم سی ڈی میں مختلف پارٹیوں کے ارکان کی تعداد کے مطابق اس کونسل کے رکن ان پارٹیوں کے ذریعہ نامزد کیے گئے۔ جن سنگھ نے کونسل کے لئے مجھے نامزد کیا اور میں اس میں حزب اختلاف کا لیڈر بن گیا۔

پانچ مہینوں کے اندر دتی میں تقریباً ایک ساتھ تین انتخابات ہوئے۔ لوک سبھا، ایم سی ڈی اور دتی میٹرو پولیٹن کونسل کے لئے — جن سنگھ تینوں میں کامیاب ہوئی۔ ہماری پارٹی نے 7 لوک سبھا سیٹوں میں سے 6، میونسپل کارپوریشن کی 100 سیٹوں میں سے 52 اور کونسل کی 56 سیٹوں میں 33 پر کامیابی حاصل کی۔ قومی راجدھانی میں اس شاندار جیت، کے ساتھ ہی 1962 کی 14 لوک سبھا سیٹوں کے مقابلہ میں 1967

میں کل 35 سیٹوں پر قبضہ کر کے جن سنگھ ہندوستانی سیاست کے ایک فیصلہ کن طاقت کے طور پر نمودار ہوا۔

میں نے میٹروپولیٹن کونسل کا الیکشن نہیں لڑا تھا، کیونکہ مجھ پر تینوں انتخابات کے لئے پارٹی کی شہری اکائی کو مستحکم و منظم کرنے کی ذمہ داری تھی۔ دلّی میٹروپولیٹن کونسل ایکٹ کے تحت مرکزی وزارت داخلہ کونسل کے لئے پانچ اراکین کو نامزد کرسکتا تھا۔ اس التزامات کا استعمال کرتے ہوئے اٹل جی نے کونسل کے لئے مجھے نامزد کرنے کے لئے سابق مرکزی وزیر داخلہ شری وائی بی چوہان کو راضی کرلیا، پھر پارٹی نے کونسل کے چیئرمین کے عہدہ کے انتخاب کے لئے مجھے امیدوار بنانے کا فیصلہ لیا۔ میں نے الیکشن جیتا اور میٹروپولیٹن کونسل کا چیئرمین بن گیا۔

چیئرمین کا کردار خاص طور سے لوک سبھا کے اسپیکر کی طرز پر قانون سازوں کا کام کاج دیکھنے کا تھا۔ یہ ایک ایسا عہدہ تھا، جو سیاسی سرگرمیوں میں میری مصروفیت کم کرنے کا مطالبہ کرتا تھا، جس سے مجھے پارلیمانی جمہوریت کی عمل آوری سے منسلک کئی موضوعات، اسپیکر کے کردار اور ذمہ داری کے بارے میں مطالعہ کرنے کے لئے کافی وقت حاصل ہوا۔ یہی وہ وقت تھا جس میں دین دیال جی کے کہنے پر میں نے مختلف انتخابی اصول وقواعد پر جتنا ممکن ہوسکا اتنی کتابوں کا مطالعہ شروع کر دیا۔ خاص طور سے میں نے یونائیٹڈ کنگ ڈم میں انتخابی اصلاحات کی تاریخ کے موضوع پر کتابیں پڑھیں۔

اپنے نئے عہدہ کے مطابق غیر جانبدارانہ رویہ کا اظہار کرنے کے لئے میں نے اپنی رضامندی سے پارٹی کی بنیادی رکنیت کو چھوڑ کر اس کے سبھی عہدوں سے استعفیٰ دے دیا۔ میں نے 'آرگنائزر' کے سب ایڈیٹر کا عہدہ بھی چھوڑ دیا۔ دلی میٹروپولیٹن کونسل کا چیئرمین بننے پر مجھے مبارکباد دینے والے لوگوں میں ایڈیٹر کے آر ملکانی بھی شامل تھے۔ مجھے اندیشہ میں گرفتار کردینے والے ستائشی الفاظ میں انھوں نے 'جرنل' میں لکھا 'لال کے دشمن تو دور، کوئی ناقد بھی نہیں ہے۔ عوامی زندگی میں وہ بہت آگے جائیں گے۔ مادر وطن کی خدمت میں ان کے خوش قسمت ہونے کی دعا کرتے ہوئے 'آرگنائزر' کو مسرت ہورہی ہے۔'

نیلم سنجیوا ریڈی ان دنوں لوک سبھا کے اسپیکر تھے۔ دلّی میٹروپولیٹن کونسل چیئرمین کے طور پر میری نئی ذمہ داری مجھے ان کے قریب لے آئی۔ ان کے ذریعہ منعقد ریاستی اسمبلیوں کے پریزائڈنگ آفیسروں کے سبھی اجلاس میں میں نے حصہ لیا۔ میرے لئے یہ اجلاس ہندوستان کی جمہوریت کی پارلیمانی میکانزم کے عمل کو باریکی سے سمجھنے میں مفید ثابت ہوئے۔

تمام پارٹیوں کے ارکان کو اظہار رائے کا پورا موقع دیتے ہوئے مکمل غیر جانبداری کے ساتھ کونسل کی کارروائی چلانے میں مجھے بہت محتاط رہنا پڑتا تھا۔ اس نوتشکیل اکائی میں ایک صحت مند روایت قائم کرنے کے لئے اپنی ذمہ داریوں کے تئیں بیدار رہ کر میں نے ایوان میں ہونے والے بحث و مباحثہ کو تعمیری اور مثبت سمت دینے کی پوری کوشش کی۔ کبھی کبھی میری دی گئی رولنگ کو حکومت میں موجود میری اپنی ہی پارٹی کے اراکین نے پسند نہیں کیا۔ ایک مرتبہ ان میں سے کچھ ممبروں نے اس کانگریس رکن کو کونسل سے برخاست کرنے کی اپیل کی، جو ایوان میں مسلسل غیر حاضر رہے تھے۔ ان کے غیر حاضر رہنے کی مدت کا شمار من مانے ڈھنگ سے کیا جارہا تھا۔ میں نے کہا 'ایسا کرنا درست نہیں ہے۔ میں اس کی اجازت نہیں دوں گا۔' 17 مارچ 1970 کو جب میں نے عہدہ کو خیرباد کہا تو پوری کونسل نے مجھے جذباتی الوداع کہا، جس نے میرے دل کو چھولیا۔

کونسل کے چیئرمین کے طور پر میری تقریباً 3 سال کی مدت نسبتاً گہما گہمی سے مبرا رہی۔ کونسل میں میری کوئی عملی ذمہ داری تھی اور نہ ہی پارٹی میں تنظیم کی۔ میں نے اس وقت کا استعمال ان تمام موضوعات کا گہرائی سے مطالعہ کرنے میں صرف کیا، جن میں میری دلچسپی تھی۔ کئی برسوں بعد میں اپنی کتابی محبت میں غرق ہوگیا تھا۔ ایک اور دلچسپی میری محبت کا پیش خیمہ بنی۔ اسٹیج ڈرامہ اور جلسہ موسیقی۔

ان تین برسوں کی مدت میں دہلی کے لیفٹیننٹ گورنر آدتیہ ناتھ جھا تھے، جو اس وقت شاید آخری آئی سی ایس (انڈین سول سروس) افسر رہے ہوں گے۔ جب اندرا گاندھی 1964 میں پہلی مرتبہ شاستری کی کابینہ میں وزیر اطلاعات ونشریات کے طور پر شامل ہوئیں، جھا وزارت میں سکریٹری تھے۔ ایک سینئر نوکرشاہ کے طور پر اپنے طویل مدتی تجربہ کے سبب ان سے رسمی بات چیت ہمیشہ خوشگوار رہی۔ ایک مرتبہ جب شری جھا اور میں وزراء اور افسر شاہی کے تعلقات پر تبادلہ خیال کر رہے تھے، جھا نے ایک دلچسپ قصہ سنایا۔ یہ ایک کنکھجورے کے بارے میں تھا، جو گٹھیا سے متاثر تھا۔ فطری طور پر یہ بیماری کنکھجورے کے لئے نہایت تکلیف دہ تھی۔ اس کا کنبہ اپنی ماں کو اس تکلیف دہ حالت میں نہیں دیکھ سکا۔ انھیں قریب میں درخت پر رہنے والے دانشور الو سے صلاح کا مشورہ دیا گیا۔ کنکھجورا الو کے پاس پہنچا۔ کنکھجورے کی تکلیف سننے کے بعد دانشور الو نے اعلان کیا' تمہارا مسئلہ ہے کہ تمہارے بہت سارے پیر ہیں، علاج آسان ہے، خود کو ایک کوے میں بدل دو، درد اپنے آپ کم ہو جائے گا۔ کنکھجورا فرط مسرت سے گھر واپس آیا اور دانشور الو کے ذریعہ مختص علاج بچوں کے سامنے رکھا۔ ان میں سے چھوٹے بچے نے پوچھا، لیکن آپ خود کو کوے میں کیسے تبدیل کریں گے؟ کنکھجورا حیرت زدہ رہ گیا، اس نے کہا' میں یہ پوچھنا بھول گیا' اور پھر دانشور الو کے پاس گیا۔

جھا کی یہ کہانی اس طرح مکمل ہوئی کہ دانشور الو کا ردعمل بالکل ایک وزیر کی طرح تھا۔ میرا کام پالیسی بنانا ہے، اس کی عمل آوری کیسے ہوگی، یہ آپ کا کام ہے۔

میں اس وقت تک پنڈارا روڈ میں واقع ایک نئے مکان میں منتقل ہو گیا تھا۔ دلی میٹرو پولیٹن کونسل کے چیئرمین کی حیثیت سے میں ایک بڑے بنگلہ کا حقدار تھا، لیکن میں نے اس کے بجائے ایک منظور شدہ صحافی کو دیئے جانے والے فلیٹ میں رہنا زیادہ پسند کیا۔ بنگلہ کے تئیں کوئی رجحان نہ ہونے کے علاوہ میرے دل میں ایک خوف بھی تھا۔ کونسل میں میرا کام غیر مستقل ہے۔ میں نے بذات خود سرگوشی کی' مجھے کبھی بھی ' آرگنائزر' واپس جانا پڑ سکتا ہے، اس لئے ایسے فلیٹ میں رہنا بہتر ہے جو صحافیوں کے حصہ میں آتا ہو۔

60 کی دہائی کے اواخر کے ساتھ ہی دلی میٹرو پولیٹن کونسل میں میری مدت بھی ختم ہو گئی۔ زندگی کے کسی بھی مرحلہ کا خاتمہ ایک نئے مرحلہ کی شروعات سے ہوتا ہے۔ میرے معاملہ میں یہ میری پارلیمانی اننگز کی شروعات تھی۔ پارٹی چاہتی تھی کہ میں راجیہ سبھا میں شامل ہو جاؤں۔ اپریل 1970 میں میں اس کے لئے منتخب ہو گیا۔

ہندی پر تقسیمی بحث

اس سے قبل کہ 70 کی دہائی پر تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھوں، میں 60 کی دہائی کو یاد کرنا چاہتا ہوں، جس نے ہماری قومی زندگی میں ہندی کے درجہ پر تقسیمی بحث کو دیکھا۔ آئین ہند 26 جنوری 1950 کو وجود میں آیا۔ ہندی اور انگریزی کو پندرہ برس کے لئے مرکزی حکومت کی سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہوا، جس کے بعد ہندی کی ہندوستان کی تنہا قومی زبان کے طور پر جگہ لینے کی امید تھی۔ ابتدا میں اس پالیسی کے خلاف کوئی تعطل نہیں تھا۔ 1965 جیسے جیسے نزدیک آنے لگی، اس نے تمل ناڈو (سابق ریاست مدراس) میں سخت مخالفت کا سامنا کیا۔ جنوبی اور شمالی ہندوستان دونوں ریاستوں میں کچھ لوگوں نے سخت رخ اپنا لیا، جس سے قومی اتحاد اور سالمیت کو خطرہ پیدا ہونے لگا۔ نتیجتاً حکومت کے اس اعلان پر کہ ہندی اور انگریزی دونوں ہی مرکزی حکومت کی سرکاری زبانیں ہوں گی، ہندی مخالف مظاہرے سرد ہوئے۔

اس بحث نے جن سنگھ کے سامنے عجیب کشش و پیچ کی حالت پیدا کر دی۔ ہمارے بیشتر حامی شمالی ریاستوں میں تھے، اس لئے ہندی کے

حق میں اتحاد کو سمجھا جاسکتا ہے۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہندی کو قومی زبان کی منظوری ملنی چاہئے تھی، چونکہ مختلف ریاستوں کو ایک ہی دھاگے میں پرونے میں اس کا کردار واضح تھا۔ حالانکہ ہماری پارٹی غیر ہندی زبان بولنے والے لوگوں کے تئیں بھی حساس تھی، لیکن اس سے بھی زیادہ قومی اتحاد کو بنائے رکھنا زیادہ ضروری تھا۔ اس نازک حالت میں دین دیال جی نے پارٹی کی رہنمائی کی ذمہ داری اپنے سر لی، جو ایک ہی وقت پر ہندی کی حوصلہ افزائی کے عزائم اور دیگر زبانوں کے تئیں ہمارے احترام اور انگریزی کی اہمیت کی ستائش کو ظاہر کرتا تھا۔ اٹل جی نے تمل ناڈو کے کرشمائی اور پہلے غیر کانگریسی وزیر اعلیٰ سی این انا درائی (69-1909) کے ساتھ اچھے نجی تعلقات قائم کئے تھے۔ اس نے بھی جن سنگھ کو ایک متوازن لسانی پالیسی کی ترویج میں مدد کی۔

ہندوستان کے لئے درست لسانی پالیسی کے سلسلہ میں کوئی شخص انگریزوں کی اس منظم سازش کو نظر انداز نہیں کرسکتا، جس نے ہندوستانیوں کو اپنی زبان اور ثقافت کو کمتر سمجھنے کے لئے تیار کیا تھا۔ یہاں مجھے 2 رفروری 1835 کو لارڈ میکالے کی پارلیمنٹ سے خطاب کی یاد آتی ہے:

''میں نے پورے ہندوستان کا سفر کیا اور ایسا شخص نہیں دیکھا جو کہ فقیر ہو یا ایک چور ہو۔ اس طرح کی ملکیت میں نے اس ملک میں دیکھی ہے، اتنے اونچے اخلاقی اقدار، لوگوں کی بہترین صلاحیت، مجھے نہیں لگتا کہ کبھی ہم اس ملک کو جیت سکتے ہیں، جب تک کہ ہم اس ملک کی ریڑھ کو نہیں توڑ دیتے، جو کہ اس کی تہذیب اور روحانی وراثت میں پنہاں ہے۔ اس لئے میں تجویز پیش کرتا ہوں کہ ہمیں اس کے قدیم تعلیمی نظام اور تہذیب کو تبدیل کرنا ہوگا۔ اس کے لئے اگر ہم ہندوستانیوں کو یہ سوچنا سکھادیں کہ جو بھی غیر ملکی ہے اور انگریز ہے، وہ اس کے لئے اچھے اور بہتر ہیں، تو اس طرح سے وہ اپنی خودداری کھو بیٹھیں گے، اپنی تہذیب بھلا بیٹھیں گے اور وہی بن جائیں گے جیسا ہم چاہتے ہیں، ایک بالکل غلام ملک۔''

میکالے کے ذریعہ اپنائی گئی پالیسی انگریزوں کے ذریعہ نافذ تعلیمی نظام میں پنہاں تھی★ اس کا اثر آزادی کے بعد بھی قائم ہے۔ وہ لوگ جو صرف ہندی یا کوئی ہندوستانی زبان بولتے ہیں اور اچھی انگریزی نہیں بول پاتے، انھیں ہمارے ملک میں دانشور نہیں سمجھا جاتا ہے۔ میں نے اکثر اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے اپنی مثال پیش کی ہے۔ میں اپنی زندگی کے ابتدائی بیس سالوں میں، جو میں نے سندھ میں گزارے، بہت کم ہندی جانتا تھا۔ راجستھان آنے کے بعد میں نے پوری لگن کے ساتھ اس کا مطالعہ کیا، لیکن مجھے 1957 میں دہلی آنے پر یہ تجربہ ہوا کہ انگریزی ہندوستان میں اعلیٰ مقام رکھتی ہے۔ مثال کے لئے جب بھی ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی تھی اور میں اسے اٹھاتا تھا، میرا پہلا جملہ ہوتا تھا 'ہاں جی' جس کے جواب میں اکثر دوسری جانب سے پوچھا جاتا تھا 'صاحب گھر میں ہیں؟' اور میں ان سے کہتا تھا اور جو آج بھی ہے کہ 'آپ کو آڈوانی سے بات کرنی ہے تو بول رہا ہوں۔'

میں نے ہندوستان میں لسانی بحث کے سلسلہ میں اس بات کی حمایت کی ہے کہ ہماری مخالفت انگریزی سے نہیں بلکہ انگریزیت سے ہے، جو لوگوں میں اپنی جڑوں اور تہذیب کے تئیں احساس کمتری پیدا کرتی ہے۔ میں یہ کہتے ہوئے جلد بازی کر رہا ہوں کہ ہندوستان کی ترقی میں ایک عالمی زبان کے طور پر انگریزی کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ بدقسمتی سے اس سلسلہ میں ماضی میں کچھ غلطیاں سرزد ہوئی ہیں، خاص طور سے جب 1960 میں کئی ہندوستانی ریاستوں میں اشتراکی اسمبلی پارٹی کی حکومتیں بنیں اس وقت جن سنگھ اشتراک اسمبلی پارٹی کا حصہ تھا اور سوشلسٹ پارٹی بھی۔ اسی حکومت نے اسکولوں کے نصاب میں انگریزی کو متبادل سبجیکٹ کے طور پر شامل کیا۔ یہ ایک بھول تھی، جس نے ہندی بولنے والے

★ ڈاکٹر رام منوہر لوہیا ہندی کے پرزور حمایتی تھے۔ وہ کہتے تھے کہ انگریزوں نے 'بندوق کی گولی اور انگریزی کی بولی' سے ہندوستان پر حکومت کی۔

لوگوں کو انگریزی سیکھنے کے تئیں عدم دلچسپی پیدا کی، جو بعد میں ان کے لئے سودمند ثابت نہیں ہوئی۔

دفتروں اور حکومت کے زیر اثر میڈیا میں استعمال ہونے والی ہندی 60 کی دہائی میں لسانی بحث کا عجیب ایشو بن گیا تھا۔ مثال کے طور پر پنڈت نہرو اکثر آکاش وانی پر نشر ہونے والی ہندی کے سلسلہ میں شکایت کرتے تھے کہ پروگراموں میں مشکل ترین ہندی کا استعمال ہوتا ہے، جو عام لوگوں کی سمجھ سے بالاتر ہے۔ ان کا مطالبہ تھا کہ 'آسان ہندی' کا استعمال کیا جانا چاہئے۔ ان کا اشارہ اردو کے زیادہ استعمال سے تھا، کیونکہ ان کے مطابق شمالی ہندوستان میں اردو زیادہ سمجھی جاتی تھی۔

وزیراعظم نہرو کے ان خیالات کی سخت مذمت ہوئی۔ ایک صحافی ہونے کے ناطے یہ میرا دلچسپ موضوع تھا۔ ایک مرتبہ میں نے سینئر کانگریس لیڈر این.جی رنگا سے اسی موضوع پر تبادلہ خیال کرنے کے لئے ملاقات کی۔ وہ بولے 'جب پنڈت نہرو آسان ہندی کی بات کرتے ہیں تو وہ عموماً لکھنوی پس منظر سے متاثر ہوتے ہیں۔ میرے لئے نہرو کے مقابلہ واجپئی اور پرکاش ویر شاستری کو سمجھنا آسان ہے۔' جب میں نے ان سے اس بارے میں مزید جاننے کی کوشش کی تو تیلگو زبان بولنے والے رنگا نے سمجھایا کہ 'شمال، مغرب اور جنوبی ہندوستان کی بیشتر زبانوں اور جنوبی ہندوستان کی چار میں سے کم از کم تین زبانوں تیلگو، کنڑ اور ملیالم میں سنسکرت کے متعدد ایسے الفاظ ہیں جو ہندی میں خوب استعمال میں آتے ہیں۔' دراصل وہ ہندی کے کل ہند خاکہ کی نشان دہی کر رہے تھے۔

اسی دوران میں ڈاکٹر رگھو ویر کے رابطہ میں آیا۔ وہ ایک معروف ماہر قواعد و لسانیات تھے اور ہندی سے سنسکرت آمیز الفاظ کو نکال دینے کے کٹر مخالف تھے۔ میں نے اس موضوع پر ان سے بحث کی اور ان کی دی ہوئی مثال سے انتہائی متاثر ہوا۔ انھوں نے کہا 'ہم اپنے وزیر قانون کو 'ودھی منتری' کہتے ہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ 'وزیر قانون' کیوں نہ کہا جائے۔

ان کا مطلب تھا کہ 'ودھی' کے مقابلہ 'قانون' لفظ زیادہ لوگ، خصوصاً شمالی ہندوستانی سمجھ سکتے ہیں، لیکن ہمیں یہ سمجھنا چاہیے کہ جب ہم حکومت کے استعمال کے لیے ایک زبان کو فروغ دے رہے ہیں، جہاں ایک بنیادی لفظ سے مختلف معنی خیزی کے ساتھ قابل استعمال الفاظ سازی کرنی ہو تو ہمیں ایسے بنیادی لفظ کا استعمال کرنا چاہیے، جس میں یہ سب کرنا ممکن ہو۔ اب 'لا' (Law) ایسا واحد لفظ نہیں ہے جس کا ہمیں تجزیہ کرنا ہے۔ جہاں لوگ 'ودھی' کے مقابلہ میں 'قانون' سے زیادہ شناسا ہیں۔ ہمیں لیگل (Legal)، 'لافل' (Lawful) اور لیجی ٹمیٹ (Legitimate) جیسے مساوی الفاظ کے سٹیک ترجمے کے بارے میں بھی سوچنا ہوگا۔ جہاں 'ودھی' سے 'ودھوت'، 'ویدھانک' اور 'ویدھ' لفظ نکلتے ہیں جو عموماً استعمال میں اور آسانی سے سمجھے جاتے ہیں، وہیں اس کے برعکس 'قانون' سے نکلنے والے لفظ عجیب، غیر شناسا اور غیر فطری ہوں گے۔

آکاش وانی کے ذریعہ عام بول چال کے الفاظ کے بجائے سنسکرت آمیز ہندی الفاظ کے استعمال کی بار بار مذمت ہوتی تھی۔ اس سلسلہ میں بھی ڈاکٹر رگھو ویر کے خیالات بے حد معروضی اور منطقی تھے۔ انھوں نے کہا 'بلاشبہ لوگ امیدیں وابستہ کرتے ہیں کہ ہندی نیوز ریڈروں کی لفظی معنویت انگریزی نیوز ریڈروں کی طرح ہی سٹیک ہو۔ مثال کے لئے ایک انگریزی خبر بلیٹن لیجیے: "The president today issued an ordinance on such and such subject"، ہندی نیوز ریڈر اس خبر کو پڑھے گا 'آج راشٹرپتی نے ایک ادھیادیش جاری کیا، جس کے انوسار..................' کچھ لوگ پوچھ سکتے ہیں کہ ہندی خبر میں 'ادھیادیش' جیسے مشکل لفظ کا استعمال نہیں کیا جائے۔ 'آدیش' کیوں نہیں، 'حکم' کیوں نہیں؟ اب اگر انگریزی نیوز ریڈر 'Ordinance' کی جگہ زیادہ استعمال ہونے والے 'Order' لفظ کا استعمال کرے تو یہ مضحکہ خیز ہوگا اور

اس کے بارے میں جواب طلب کیا جائے گا۔

یہ سہل مثالیں تھیں، لیکن ان سے میرے ذہن پر لسانی بحث کے سلسلہ میں خصوصی اثر پڑا۔ میں نے محسوس کیا کہ ہم نے کیسے اور اب بھی مسلسل سنسکرت کی معنویت اور گہرائی پر اعتراض کیا ہے، تبھی میں نے سمجھا کہ کیوں تمام ہندوستانی زبان کی پاکیزگی اور عظمت کا تحفظ ہمارا مذہب ہے۔

یوں تو ڈاکٹر رگھو ویرا یک اہم کانگریسی تھے، پھر بھی ان میں جن سنگھ کے نظریہ فکر اور تنظیمی تہذیب و ہنرمندی کے تئیں احترام تھا۔ جلد ہی وہ وقت آ گیا جب انھوں نے جن سنگھ کی رکنیت حاصل کرنے کا فیصلہ لیا۔ چینی حملہ اور پنڈت نہرو کے ساتھ متعدد قومی موضوعات پر ان کے اختلافات نے انھیں یہ فیصلہ لینے کے لئے مجبور کیا، حالانکہ وہ کانگریس میں تھے تب بھی جن سنگھ کے تمام ممبران ان کا احترام کرتے تھے۔ 1963 میں پارٹی نے انھیں قومی صدر منتخب کیا، لیکن بدقسمتی سے کچھ ہی ماہ بعد اتر پردیش میں ایک ضمنی انتخاب میں پارٹی کی تشہیر کے دوران ایک حادثہ میں ان کا انتقال ہو گیا۔

5

پنڈت دین دیال اپادھیائے
بہترین مفکر، منتظم اور لیڈر

زندگی میں ہمیں کئی لوگ ملتے ہیں، کچھ عظیم ہوتے ہیں،
کچھ اچھے ہوتے ہیں لیکن ایسے لوگ بہت کم ہی ہوتے ہیں،
جو عظیم اور اچھے دونوں ہوتے ہیں۔
— چارلس سلیب کاٹن، اٹھارویں صدی کے انگریز مصنف

میں اپنی سیاسی زندگی میں بہت جلد ہی سمجھ گیا تھا کہ سیاست ہندوستان میں ایک ایسا نیم کاروبار ہے، جس میں ملوث لوگوں کو ملنے والی شہرت، طاقت، عزت اور شناخت کا ان کے فطری کردار سے اکثر کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ کسی شخص کے سیاست میں داخل ہوتے ہی اسے 'لیڈر' مان لیا جاتا ہے۔ جلد ہی میڈیا میں اس کی اتنی باتیں ہونے لگتی ہیں کہ دیگر پیشوں میں لگے لوگوں، جو ان سے کہیں زیادہ قابل ہیں اور سماجی خدمت میں جن کا ریکارڈ ان سے بہتر رہا ہو، کے حسد کا سبب بن جائے۔ اگر کوئی شخص ایک لیڈر ہونے کے ساتھ ساتھ بھیڑ کو اکسانے یا دنگا فساد کرانے کی قابلیت بھی رکھتا ہے تو اس کا اور زیادہ مقبول ہو جانا یقینی ہے، کیونکہ بدنامی بدقسمتی سے سیاست میں یقینی طور پر فائدہ مند ثابت ہوتی ہے۔ میں یہ اعتراف کرتا ہوں کہ سیاست میں بیشتر لوگ ایسے نہیں ہیں، پھر بھی ایسے لوگ پورے سیاسی طبقے کی جو تصویر پیش کرتے ہیں، اس سے لوگ اکثر سوچنے لگتے ہیں کہ کیا آدرش اور تعلیم یافتہ افراد بھی کبھی سیاست میں رہے ہیں یا ہو سکتے ہیں؟

یہ باب ایسے ہی ایک آدرش سیاسی لیڈر کے متعلق ہے۔ یہ ایک ایسے لیڈر کے بارے میں ہے، جنھیں شہرت سے عدم دلچسپی تھی اور اپنے بارے میں بات تک کرنا انھیں باعث شرم محسوس ہوتا تھا۔ وہ جس بات کی تعلیم دیتے تھے اسے خود اپنے اوپر نافذ کرتے تھے۔ سیاسی سرگرمیوں میں ہی نہیں، نظریات و خیالات کے رو سے بھی وہ ایک لیڈر تھے اور ان کی اس نظریاتی رہنمائی کی جڑیں، فطرت، انسانیت، قومیت اور شخصیت سبھی کو سمیٹنے لن کی وسیع تر فلاسفی میں پنہاں تھی۔ وہ ایک ایسے سیاسی لیڈر تھے جنھیں اقتدار میں کوئی دلچسپی نہیں تھی، لیکن پھر بھی اپنے لاکھوں حامیوں کے دلوں پر جن کا مکمل اخلاقی اقتدار قائم تھا، انھیں کے ساتھ مل کر انھوں نے اس پارٹی کی ایک مضبوط بنیاد رکھی، جسے کچھ ہی دہائیوں میں اپنے نئے

اوتار میں، کانگریس کا ایک بہترین متبادل بن کر ابھرتا تھا۔

یہ باب میرے سیاسی گرو پنڈت دین دیال اپادھیائے کو میری خراج عقیدت ہے۔

دین دیال جی نے مجھے کیسے متاثر کیا؟

جیسا کہ میں نے پہلے بھی اس کتاب میں ذکر کیا ہے، دو افراد — شری راج پال پوری اور پنڈت دین دیال اپادھیائے — نے میری عوامی زندگی میں مجھ پر سب سے زیادہ اثر ڈالا ہے۔ ان دونوں میں سے راج پال جی نے میرے لڑکپن، ایک ایسا دور، جس میں جو خیالات اور آدرش دل میں نقش کر جائیں، وہ دیرپا ہو جاتے ہیں، میں میری کردار سازی کی تھی۔ انھوں نے ہی مجھے حب الوطنی کا درس دیا اور قوم کی بے لوث خدمت کی رہنمائی کی۔ یہ سچائی کہ تقسیم ہند سے قبل کے انتشار سے بھرے دور میں میں نے ان کے ساتھ کراچی میں کام کیا تھا، جس نے مجھ پر بڑے اثرات میں ایک جذباتی کشش پیدا کر دی تھی۔ یہ وہ دور تھا جب واقعات کے سنامی میں حالات کسی کے کنٹرول میں نہیں تھے اور میرا اپنا شہر میرے لئے پردیس بننے والا تھا، اس سرزمین کو، جہاں میں کھیلا، پڑھا اور سیر کی، ایک نیا اور اجنبی نام دیا جانا تھا — پاکستان۔ تباہی کے اس موڑ پر راج پال جی میری زندگی میں آئے، مجھے حب الوطنی اور آدرش واد کی جانب گامزن کیا اور اپنی مادر وطن کی خدمت کرنے کے میرے عزم کو دوبالا کیا۔ مجھے دین دیال جی سے موصول بنیادی سنسکار اس مرحلہ کی ہی ایک زنجیر تھے۔ اس نے ایک سیاسی رکن کے لئے میری زندگی میں مضبوط بنیاد قائم کی۔

سیاست قوم کی خدمت کرنے کا ایک اہم اور ضروری وسیلہ ہے، لیکن سیاست پرآلود بھی ہو سکتی ہے۔ کچھ متعینہ بنیادی اصولوں کے فقدان میں وہ سیاست دانوں اور جس سماج میں وہ کام کر رہے ہیں، دونوں کو کمترین درجہ کا بنا دیتی ہے۔ اقتدار کی سیاست تاریکی، غیر اصولی، مقابلہ جاتی اور پرکشیدہ ہو سکتی ہے۔ اکثر وہ ایسا اکھاڑہ بن جاتی ہے، جہاں سیاسی پارٹیاں اپنے محدود اور غیر دوررس مقاصد کے لئے وسیع النظر قومیت اور سماجی مفادات کو پژمردہ کر دیتے ہیں۔ نجی خواہشات کے لئے آدرشوں کو قربان کر دیا جاتا ہے، اپنے ہی معاونین سے سازش کر کے اخلاقیات کا گلا گھونٹ دیا جاتا ہے اور عوامی مفاد کے بلند و بالا الفاظ نجی حرص کو پورا کرنے کی تصویر بن جاتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ یہ منفی پہلو ہندوستانی سیاست میں 50 اور 60 کی دہائیوں میں اتنے واضح نہیں تھے جتنے آج ہیں۔

عوام کے سامنے کانگریس پارٹی کا ایک بہتر متبادل پیش کر کے ہندوستان کے جمہوری نظام کو مضبوط بنانے کے لئے جن سنگھ کی تشکیل کی گئی تھی، لیکن اس کے بانی ڈاکٹر شیاما پرساد مکھرجی اور پنڈت دین دیال اپادھیائے، جو اس کے خاص مفکر اور تنظیمی سربراہ تھے، دونوں ہی اس بات پر متفق تھے کہ 'کیسے بھی وسائل' سے اقتدار حاصل کرنا ہمارا مقصد نہیں ہوگا۔ یہ نئی پارٹی دوسری پارٹیوں سے بالکل مختلف ہوگی اور یہ اختلاف صرف اس کے نظریات اور پالیسیوں میں ہی نہیں بلکہ اس کے کارکنان اور لیڈروں کے سلوک میں بھی نظر آئے گی۔ پھر بھی دین دیال جی ان امکانات سے اچھی طرح واقف تھے کہ جن سنگھ بھی ہندوستانی سیاست کی ابھرتی ہوئی تہذیب (یا گندگی) کا شکار بن سکتی ہے۔ اس لئے مابعد آزادی معدوم ہوتی جا رہی حوصلہ مندی اور عزم کے ساتھ وہ ڈسپلن اور وقف کا جذبہ نظریات اور آدرش واد کے ایک بالکل جدید بنیاد پر پارٹی کو مضبوط بنانے کے لئے نکل پڑے۔ میں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ میں نے اپنے سیاسی سفر کا آغاز اس آدرش لیڈر کی نگہبانی میں کیا۔

معمولی پس منظر، غیر معمولی حصولیابیاں

دین دیال جی کی پیدائش 25 ستمبر 1916 کو متھرا کے نزدیک ایک گاؤں میں ایک معمولی برہمن کنبہ میں ہوئی تھی۔ ان کے بچپن اور نوجوانی میں قسمت نے انھیں کئی المناکیوں، دردناکیوں اور مشکلات کا سامنا کرایا۔ تمام مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے انھوں نے پلانی کے برلا کالج سے امتیازی نمبروں کے ساتھ انٹرمیڈیٹ بورڈ امتحان، کانپور سے بی اے اور آگرہ سے ایم اے پاس کیا۔ لیکن ان کا نوکری کرنے اور گھر بسانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ سنگھ سے متاثر 1937 میں وہ اس میں شامل ہوگئے اور فیصلہ کرلیا کہ سنگھ کے تشہیر کار کے طور پر وہ اپنی ساری زندگی صرف کردیں گے۔ 1942 میں اپنے چچا کو مخاطب کرتے ہوئے ایک قابل ذکر خط میں انھوں نے لکھا:

> ''ایشور نے ہمارے کنبہ کو بہت کچھ دیا ہے۔ کیا ہم اپنا ایک رکن بھی قوم کی خدمت میں وقف نہیں کرسکتے؟ مجھے تعلیم، اخلاقیات اور تمام طرح کی حصولیابی سے نوازکر کیا آپ مجھے سماج، جس کے ہم اتنے قرض دار ہیں، کی خدمت میں نہیں لگا سکتے؟ یہ کوئی قربانی نہیں بلکہ ایک سرمایہ کاری ہی ہوگی۔ یہ سماج کی صورت میں کھیت میں کھاد ڈالنے کے مساوی ہوگا۔ ہم آج کل صرف فصل کاٹنے میں ہی دلچسپی لیتے ہیں اور کھاد ڈالنا بھول گئے ہیں۔ اس سے ہماری زمین کے بنجر اور قحط زدہ بن جانے کا خطرہ ہے۔ کیا ہم اپنے سماج کے تحفظ اور مفاد و مذہب کے لئے اپنی کچھ کمترین خواہشات کو قربان نہیں کرسکتے، جس کے لئے رام جنگل میں چلے گئے، کرشن نے لاتعداد مشکلات برداشت کیں، رانا پرتاپ جنگلوں میں بھٹکتے رہے، شواجی نے اپنا سب کچھ داؤ پر لگادیا اور گرو گوبند سنگھ نے اپنے ننھے بچوں کو زندہ دفن ہوجانے دیا۔''

اگر دین دیال جی کا یہ خط چھوٹی عمر میں ہی مادر وطن کی خدمت میں اپنی زندگی صرف کردینے کے عزم کی جھلک دکھاتا ہے تو ناناجی دیشمکھ، جو ایم اے کے برسوں میں آگرہ میں ان کے روم میٹ تھے اور جو بعد میں جن سنگھ کے ایک اہم لیڈر رہے، کے ذریعہ سنائے گئے اس واقعہ سے ان کی شخصیت کی فطری اخلاقیات کا پتہ چلتا ہے۔

> ''ایک دن ہم دونوں بازار گئے اور دو پیسے کی سبزی خرید کر واپس آئے، گھر پہنچنے ہی والے تھے کہ دین دیال جی اچانک رک گئے۔ ان کا ہاتھ ان کی جیب میں تھا اور وہ بولے 'نانا، کچھ غلطی ہوئی ہے۔' جب میں نے پوچھا تو انھوں نے جواب دیا 'میری جیب میں چار سکے تھے اور ان میں سے ایک کھوٹا تھا۔ میں نے وہ کھوٹا سکہ سبزی بیچنے والی اس ضعیفہ کو دے دیا۔ وہ کیا کہے گی۔ چلو واپس چل کر اسے دوسرا سکہ دے دیتے ہیں۔
>
> ان کے چہرے پر مجرمانہ عکس عیاں تھا۔ ہم سبزی بیچنے والی کے پاس پہنچے اور وہ بات بتائی۔ اس نے کہا کہ 'اب میں تمہارا کھوٹا سکہ کہاں تلاش کروں؟ تم جاؤ، تم نے جو سکہ دیا تھا، وہ بھی ٹھیک ہے'، لیکن دین دیال جی سننے کے لئے تیار نہیں تھے۔ انھوں نے اس ضعیفہ کے سکوں کے ڈھیر میں سے وہ کھوٹا سکہ تلاش کرلیا۔ جب انھوں نے اسے صحیح سکہ دے دیا، تبھی ان کے چہرے پر چین اور سکون کی چمک پیدا ہو پائی۔ اس ضعیفہ کی آنکھیں نم ہوگئیں اور وہ بولی 'بیٹا، تم ایک اچھے لڑکے ہو، بھگوان تمہیں سکھی رکھے۔''

اگر مجھے تین اور دین دیال مل جائیں...

اکتوبر 1951 میں، جب جن سنگھ کا قیام عمل میں آیا، دین دیال جی پہلے بیچ کے ان تشہیر کاروں میں سے ایک تھے جنہیں اس نئی پارٹی کو

مضبوط بنانے کے مقصد سے شری گروجی نے پارٹی کے بانی ڈاکٹر شیاما پرساد مکھرجی کی مدد کے لئے منتخب کیا تھا۔ جنوری 1953 میں کانپور میں ہوئے پارٹی کے پہلے قومی اجلاس میں ڈاکٹر مکھرجی نے انھیں پارٹی کا کل ہند جنرل سکریٹری بنا دیا۔ دراصل اس پینتیس سالہ پراعتماد معاون سے وہ اتنے متاثر تھے کہ انھوں نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا 'اگر مجھے دو یا تین مزید دین دیال مل جائیں تو میں ہندوستان کا پورا سیاسی نقشہ ہی تبدیل کر دوں۔'

افسوس کا لمحہ تھا کہ کچھ ہی ماہ کے اندر قسمت نے ڈاکٹر مکھرجی کو ہم سے چھین لیا اور پارٹی سے ایک عظیم لیڈر چھن گیا۔ اس کے دیگر تمام عہدیداران کم عمر اور غیر تجربہ کار تھے۔ اس سے کئی سیاسی مبصرین جن سنگھ کے خاتمہ کی خبر لکھنے کے لئے کمربستہ ہو گئے۔ اداسی اور مایوسی کے اس دور میں دین دیال جی نے پارٹی کی کمان سنبھالی اور پندرہ برسوں کی شدید محنت اور کوشش کے بعد پارٹی کو اس مقام پر لے آئے، جہاں سیاسی مبصرین کے ایک نئے گروپ نے مستقبل قریب میں اسے کانگریس کے ایک یقینی متبادل کے طور پر دیکھنا شروع کر دیا۔ یہ سچ ہے کہ 1953 اور 1967 کے درمیان کئی افراد جن سنگھ کے صدر رہے۔ ایسا اس لئے ہوا، کیونکہ آئین میں صدر کی کارگزار مدت ایک سال ہی رکھی گئی تھی، پھر بھی تمام لوگ یہ جانتے تھے کہ پارٹی میں تنظیمی جنرل سکریٹری ہونے کے ناطے دین دیال جی ہی اس کے دماغ، دل اور روح تھے۔ سچائی تو یہ تھی کہ وہ پارٹی کے تنظیمی سربراہ سے بھی زیادہ کچھ تھے۔ پارٹی کے مفکر، رہنما اور مقلد تینوں اوتار انھیں میں سمائے ہوئے تھے۔

پارٹی کا صدر نہ بن کر نسبتاً گمنام رہ کر چھوٹی سے چھوٹی بات پر بھی دھیان دیتے ہوئے صبر کے ساتھ پارٹی کو مضبوط بنانا ان کا اپنا فیصلہ تھا۔ اپنی قابل تقلید تقاریر سے ہزاروں نوجوانوں اور لڑکیوں کو تربیت دینے، قوم کی خدمت میں جدوجہد اور قربانی کی زندگی گزارنے کے لئے ان میں جذبہ پیدا کرنے، نئے لیڈر تیار کرنے اور سیاسی، اقتصادی اور سماجی موضوعات پر اپنی پارٹی کو صحیح سمت عطا کرنے کے لئے وہ ملک گیر دورہ کرتے تھے۔ وہ ایسے پارٹی منتظمین نہیں تھے، جو باقی سماج سے دور رہنا پسند کرتا ہو۔ وہ تمام طبقات اور نظریات کے لوگوں سے ملاقات پسند کرتے تھے، ان کی باتوں کو انہماک سے سنتے اور اپنے نظریہ کو پیش کرتے تھے۔ اس طرح سیاسی اسٹیج پر وہ سبھی کے چہیتے بن گئے۔

پارٹی کی خدمت میں دین دیال جی کے ریکارڈ اور قومی سیاست میں ان کے بڑھتے قد کو دیکھتے ہوئے قومی سطح پر ان کے معاونین اور ریاستی سطح کے لیڈران سے ہر سال پارٹی صدر بننے کا مطالبہ کرتے اور وہ ہمیشہ انکار کر دیتے۔ خود احتسابی کی ان کی عادت اتنی شدید تھی کہ پارٹی صدر کے طور پر اپنی شناخت سے وہ بے اطمینانی محسوس کرتے تھے۔ اقتدار اور تکبر کی کسی بھی نشانی سے لگاؤ ان کی شخصیت کے برعکس تھا۔

جن سنگھ کا تاریخی کالی کٹ اجلاس

1967 کے آخری ایام میں ہی، جب گزشتہ برس بلراج مدھوک کی صدارت نے پارٹی کے استحکام کے لئے سنگین مسئلہ پیدا کر دیا تھا، دین دیال جی پورے ملک میں پھیلے اپنے پارٹی کارکنان کے دباؤ کو نظرانداز نہیں کر سکے۔ دسمبر 1967 میں کیرل کے کالی کٹ میں منعقد اجلاس میں وہ پارٹی صدر منتخب کر لیے گئے۔ اس بارے میں شری گروجی نے بعد میں لکھا 'وہ حقیقت میں یہ اعلیٰ ترین عہدہ نہیں چاہتے تھے اور میں بھی ان پر یہ ذمہ داری نہیں تھوپنا چاہتا تھا، لیکن حالات کا تقاضا تھا کہ مجھے ان سے صدارت قبول کرنے کے لئے کہنا پڑا۔ ایک سچے سویم سیوک کی طرح انھوں نے اس حکم کی تعمیل کی۔'

جن سنگھ کی تاریخ میں کالی کٹ اجلاس ایک عہد ساز واقعہ تھا، جس نے پارٹی کے ممبروں اور حامیوں کے دل میں ایک نئی خود اعتمادی اور امید کی کرن پیدا کی اور کانگریس کی تنہا برتری والی سیاست میں تبدیلی کے امکان پیدا کئے۔ میں کالی کٹ میں دی گئی ان کی صدارتی تقریر کو آزاد ہندوستان کی سیاسی تاریخ کے سب سے اہم دستاویزات میں سے ایک مانتا ہوں۔

60 کی دہائی میں ملک کے مختلف حصوں میں بڑے احتجاجی مظاہرے ہوئے۔ کانگریس کی حکومت کے ذریعہ لوگوں کی امیدوں و خواہشوں کی تکمیل کرنے میں ناکام رہنے کے سبب ایسا ہوا۔ جن سنگھ میں کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ پارٹی کو متحرک سیاست سے خود کو نہیں جوڑنا چاہیے۔ دین دیال جی نے اپنی صدارتی تقریر میں اس خیال کی تردید کی اور کہا 'لوگوں کی تحریک تیزی سے تغیر پذیر سماجی نظام میں فطری اور لازمی ہے۔ سچائی یہ ہے کہ یہ سماج میں نئی بیداری کا مینی فیسٹو ہے، لہٰذا ہمیں ان کے ساتھ مل کر انھیں قیادت فراہم کرنا چاہیے۔ وہ لوگ جو سیاسی اور سماجی صورت حال کو حسب حال بنائے رکھنا چاہتے ہیں، وہ لوگوں کے مظاہروں سے خوف زدہ ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ ہم ان لوگوں کی حمایت نہیں کر سکتے، وہ وقت کی گردش روکنا چاہتے ہیں۔ وہ ہندوستان کی پہلے سے متعین تقدیر کی گردش روکنا چاہتے ہیں، جو ناممکن ہے۔'

اپنے قابل تقلید خطاب میں دین دیال جی نے اپنے دوررس نظریہ کا ایک اور ثبوت فراہم کیا۔ 'ہم ہندوستان کے مایہ ناز ماضی کی تابناکی سے آگاہ ہیں، لیکن ہم اسے اپنی قومی زندگی کی سب سے شاندار بلندی نہیں مانتے۔ ہمیں حال کی سچائی کا علم ہے، لیکن حال کے ساتھ ہم بندھے ہوئے نہیں ہیں۔ ہماری آنکھوں میں ہندوستان کے تابناک مستقبل کا سنہرا سپنا ہے، لیکن ہم نہ تو سونے کے اور نہ آرام کرنے کے عادی ہیں۔ ہم عمل پرور ہیں اور ان خوابوں کو حقیقت میں تبدیل کرنے کے لئے پابند عہد ہیں۔ ہم ہندوستان کے شاندار ماضی، رفتار پذیر حال اور بہترین مستقبل کے خواہاں ہیں۔ فتح کے یقین کے ساتھ ہم اس سمت میں کوشش کرنے کا عہد لیں۔

مغل سرائے میں نفرت انگیز اور بہیمانہ قتل

لیکن ایشور کے کھیل کو کوئی نہیں جان سکتا۔ ٹھیک اس وقت، جب جن سنگھ اپنے عروج پر تھا اور آنے والے دور میں کامیابی کی ایک اور اونچائی چھونے والا تھا، تب ایک اور ناگہانی آفت اس پر ٹوٹ پڑی۔ پارٹی صدر بننے کے دو ماہ کے اندر ہی تقدیر کے بے رحم ہاتھوں نے دین دیال جی کو ہم سے چھین لیا۔ 11 رفروری 1968 کو جب وہ رات کی ٹرین سے لکھنؤ سے پٹنہ کا سفر کر رہے تھے تب کچھ نامعلوم حملہ آوروں نے ان کا قتل کر دیا۔ مغل سرائے ریلوے اسٹیشن کی پٹریوں کے پاس ان کی لاش ملی۔

میں اس المناک حادثہ سے حواس باختہ ہو گیا اور شاید ہی کسی حادثہ نے اس سے قبل مجھے اتنی تکلیف پہنچائی تھی۔ درحقیقت پورا ملک سکتہ میں تھا۔ ان کا قتل آج تک نہ سلجھنے والا ایک راز بنا ہوا ہے، حالانکہ اس وقت سرسری نظر میں وہ ایک عام جرم کی طرح ہی نظر آیا۔ تمام پولس چھان بین، یہاں تک کہ جسٹس وائی وی چندر چوڑ کی قیادت میں تشکیل دی گئی تفتیشی کمیشن نے جو رپورٹیں پیش کیں، ان سے کوئی بھی مطمئن نہیں ہوا۔ بھارتیہ جن سنگھ کے ہم تمام لوگ ایک ناامیدی کے ماحول سے گھر گئے۔ پندرہ سالوں سے کم وقفہ میں دوسری مرتبہ ہماری اس نوجوان پارٹی پر قہر ٹوٹ پڑا تھا۔ پہلی مرتبہ 1953 میں جن سنگھ کے بانی ڈاکٹر مکھرجی کی موت ایسے ہی خفیہ حالت میں پولس حراست میں ہوئی تھی، جب وہ جموں و کشمیر کا ہندوستانی فیڈریشن میں مکمل انضمام کے مطالبہ پر تحریک کی قیادت کر رہے تھے۔

ریل کا سفر دین دیال جی کی سیاسی زندگی کا ایک اٹوٹ حصہ تھا۔ ایک تپسوی کی طرح جینے والے یہ لیڈر مسافر گاڑیوں کے جنرل ڈبوں میں سفر کرتے تھے اور ہوائی جہاز سے تو وہ کبھی کبھی ہی۔ 'اس سے مجھے دو فائدے ہوتے ہیں' وہ کہتے تھے۔ 'پہلا تو یہ کہ اس سے مجھے عام لوگوں سے ملنے کا موقع ملتا ہے، دوسرے مجھے پڑھنے اور لکھنے کا وقت ملتا ہے۔' وہ بہت کم سامان لے کر سفر کرتے تھے۔ ایک چھوٹا سا سوٹ کیس، جس میں ایک یا دو جوڑے کپڑے ہوتے تھے (جنھیں وہ خود دھوتے تھے) بستر اور ایک جھولا، جس میں کتابیں، کاپیاں اور خط ہوتے تھے۔ یہ جھولا ہی ان کا سب سے بھاری سامان ہوتا تھا۔

برسوں بعد، 1980 میں بمبئی میں ہوئے بھارتیہ جنتا پارٹی کے قائمہ اجلاس میں اٹل جی نے اپنے انوکھے انداز میں ڈاکٹر مکھرجی اور دین دیال جی کے نقصان کو یاد کیا۔ نوزائیدہ پارٹی کے عہدیداران، جنھیں دوہری رکنیت کے بناوٹی ایشوز پر بلاوجہ جنتا پارٹی سے نکال دیا تھا اور کارکنان کو ان کے سامنے آنے والے مشکل مرحلوں کے بارے میں آگاہ کرتے ہوئے انھوں نے کہا 'ڈاکٹر مکھرجی اور دین دیال جی ہمارے دو قابل تقلید لیڈر تھے۔ ایک کی موت جیل میں ہوئی اور دوسرے کی ریل میں سفر کرتے وقت، ہمارا پورا سیاسی سفر جتنی مشکلات اور قربانیوں سے پر ہے، اسے ایک جملہ میں یوں کہا جا سکتا ہے 'ایک پیر ریل میں اور ایک پیر جیل میں' لیکن ہمیں کوئی نہیں روک سکتا۔ ہم نے ارادہ کیا ہے کہ ہم ان تین نکاتی منصوبہ کی بنیاد پر پارٹی کو پھر سے مضبوط بنائیں گے، تنظیم، جدوجہد اور تشکیل۔'

دین دیال جی جیسے 'آجات شترو' شخص کے قتل کے پیچھے کسی کا کیا مقصد ہو سکتا ہے؟ اس خبر سے پیدا ہوئی ابتدائی المناکیوں سے باہر آ کر میں نے خود سے پوچھا۔ مجھے اس سوال کا جواب اب تک نہیں ملا ہے۔ میں یہاں یہ اندازہ لگا سکتا ہوں کہ یہ جرم ایک شخص کے خلاف اتنا نہیں تھا جتنا ایک قوم کے خلاف تھا، کیونکہ دین دیال جی آئیڈیل سیاست کی ہندوستانی وراثت کو شرمندۂ تعبیر کرتے تھے اور 60 کی دہائی کے آخری عشرے کے سب سے زیادہ ہونہار لیڈر تھے۔ موت کے وقت انھوں نے اپنی عمر کے 52 برس بھی پورے نہیں کیے تھے۔

قومی مفاد میں نظریاتی لچیلا پن

دین دیال جی کی شخصیت عزم، سچائی اور اخلاقی سلوک کا انوکھا سنگم تھی۔ اس کی مثال دینے کے لئے میں 1967 میں جن سنگھ کے کالی کٹ اجلاس میں ہوئے ایک واقعہ کا ذکر کروں گا۔ ایک مسئلہ جو سب سے زیادہ موضوع بحث رہا وہ یہ تھا کہ کیا جن سنگھ کو 1967 میں بہار اور پنجاب میں مخلوط اسمبلی کی حکومتوں کی تشکیل کے لئے کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا سے ہاتھ ملانا چاہیے تھا؟ کئی ترجمانوں نے دلیل دی کہ سی پی آئی سے اتحاد کرنا جن سنگھ کی غلطی تھی، خاص طور سے ترجمانوں نے دین دیال جی کی رائے کے خلاف ایک تمل زبان بولنے والے، جن کا کنبہ پنجاب میں رہائش پذیر تھا، وشوناتھن کی زوردار تقریر سنی۔ وہ اس وقت کے پر اثر مقرروں میں سے ایک تھے۔ انھوں نے کہا 'جن سنگھ کو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے کہ کمیونسٹوں کے ساتھ کام کرنے سے ہم انھیں بدل پائیں گے۔' اپنے اس بنیادی خیال کو مزید پختہ کرنے کے لئے انھوں نے ایک مشہور کہاوت کا استعمال کیا 'خربوزہ چاقو پر گرے یا چاقو خربوزے پر، کٹے گا تو خربوزہ ہی۔'

بحث کے اختتام پر دین دیال جی نے جواب دیا۔ اس دن ان کی تقریر دانشوری سے پر تھی۔ وہ نہ صرف اجلاس میں چل رہے مباحثوں کے موضوع سے متعلق تھی بلکہ پارٹی کے لئے آج تک ایک روشنی کے مینار کے طور پر کام کر رہی ہے۔ انھوں نے کہا 'ملک کی سیاسی صورت حال کا یہ ایک افسوسناک پہلو ہے کہ جہاں سماجی میدان میں چھوت چھات کو ایک برائی گردانا جاتا ہے، سیاسی میدان میں کبھی کبھی اس کی ستائش کی جاتی

ہے۔ اگر کوئی پارٹی سیاسی میدان میں اپنے مدمقابل سے چھوا چھوت کا سلوک نہیں کرنا چاہتی تو اسے غلط قرار دے دیا جاتا ہے۔ بلاشبہ ہم جن سنگھ کے لوگ کمیونسٹوں کی حکمت عملی، لائحہ عمل اور ان کی سیاسی کلچر سے اتفاق نہیں رکھتے ہیں، لیکن اس سے ان کے ساتھ چھوا چھوت کا رویہ درست نہیں ہو جاتا۔ اگر وہ ایشوز کی بنیاد پر یا ایک مشترکہ پروگرام کے تئیں پابند عہد حکومت کے ایک حصہ دار کے طور پر ہمارے ساتھ کام کرنے کے لئے تیار ہیں تو میں اس میں کچھ غلط نہیں دیکھتا۔ یہ مخلوط حکومتیں اسی سیاسی چھوا چھوت کو ختم کرنے کی سمت میں اٹھایا گیا ایک قدم ہے۔ شدید تنازعات کے باوجود ایک دوسرے کے تئیں احترام کا جذبہ جمہوریت کے لئے مثبت پہل ہے۔

دین دیال جی کی اس جذباتی صلاح نے ایمرجنسی حکومت (77-1975) کے خلاف ہماری جدوجہد اور ایمرجنسی کے بعد کے دور میں بھی ہماری رہنمائی کی۔ اسی بنیاد پر 1989 میں ہم نے وی پی سنگھ حکومت کو باہر سے حمایت دینے کا فیصلہ لیا۔ اس حکومت نے ایک طرف تو بی جے پی کی باہر سے حمایت لی اور دوسری طرف کمیونسٹوں کی۔ دراصل جن سنگھ اور بعد میں بی جے پی کے ذریعہ اپنائی گئی مخلوط حکومت کی پالیسیوں میں یہی حکمت عملی ہمارا رہنما اصول رہا ہے۔

ہند-پاک وفاق کے نظریات کی بحث

دین دیال جی کی تعمیری اور مفکرانہ سوچ کی دوسری مثال ہند-پاک وفاق کا وہ اہم مشترکہ بیان ہے، جو انھوں نے مقبول و معروف سماج وادی لیڈر ڈاکٹر رام منوہر لوہیا، جو کچھ نظریاتی موضوعات پر نا اتفاقی کے باوجود ان کے اچھے دوست تھے، کے ساتھ 12 اپریل 1964 کو جاری کیا تھا۔

> ''مغربی پاکستان میں بڑے پیمانے پر ہوئے فسادات نے 2 لاکھ سے زائد ہندوؤں اور دیگر اقلیتوں کو ہندوستان آنے پر مجبور کیا ہے۔ مغربی بنگال میں ہوئے واقعات سے فطری طور پر ہندوستانیوں میں غم و غصہ ہے۔ حالات کو قابو میں رکھنے اور اس مرض کے صحیح علاج کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کا صحیح ڈھنگ سے حل نکالا جائے گا اور نفسیاتی تکلیف کے اس دور میں بھی ہماری قومی زندگی کے بنیادی اقدار بھلائے نہیں جانے چاہئے۔ ہمارا یہ عزم ہے کہ پاکستان کے ہندوؤں اور دیگر اقلیتوں کی زندگی و ملکیت کے تحفظ کی گارنٹی دینا حکومت کی ذمہ داری ہے۔ اس معاملہ میں محض قانونی نظریہ اپناتے ہوئے یہ کہنا کہ پاکستان میں رہنے والے ہندو پاکستانی شہری ہیں، خطرناک ہوگا اور اس سے دونوں ممالک میں کم یا زیادہ تعداد میں قتل اور تشدد کا بازار گرم ہوگا۔ جب حکومت ہند پاکستان کی اقلیتوں کے تئیں اپنی ذمہ داری نبھانے میں ناکام رہتی ہے تو لوگوں کا غصہ ہونا فطری ہے۔ عوام سے ہماری اپیل ہے کہ وہ اپنا غصہ حکومت پر ظاہر کریں اور کسی بھی حالت میں ہندوستانی مسلمانوں کو اس کا شکار نہ بنائیں۔ اگر عوام آپس میں لڑتی ہے تو اس سے حکومت کو اپنی کاہلی اور نااہلی چھپانے، عوام کو بدنام کرنے اور اس پر ظلم ڈھانے کا موقع ملتا ہے۔''
>
> جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے، ہمارا یہ ماننا ہے کہ دیگر تمام شہریوں کو مساوی، تمام حالات میں، ان کی زندگی اور ملکیت کا تحفظ لازمی ہے۔ کوئی بھی واقعہ یا دلیل اس سچائی سے سمجھوتے کو درست نہیں ٹھہرا سکتے۔ ایک ریاست، جو اپنے شہریوں کو زندگی کے حق کی گارنٹی نہیں دے سکتی اور ایسے شہری، جو اپنے پڑوسیوں کا تحفظ یقینی نہیں بنا سکتے، بربریت کی مورت ہی کہلائیں گے۔ خواہ ان کا مذہب کوئی بھی ہو۔

ہر شہری کو آزادی اور تحفظ فراہم کرنا حقیقت میں ہندوستان کی ایک پاک وراثت رہی ہے۔ اس سلسلہ میں ہم تمام ہندوستانی مسلمانوں کو دوبارہ یقین دلاتے ہوئے ہر ہندو گھر میں یہ پیغام پہنچانے کی نیک خواہشات کا اظہار کرتے ہیں کہ اس یقین دہانی کو پورا کرنا ان کی شہری اور قومی ذمہ داری ہے۔

ہمارا یہ ماننا ہے کہ دو مختلف ممالک کے طور پر ہندوستان اور پاکستان کا وجود ایک غیر فطری عمل ہے۔ دونوں حکومتوں کے تعلقات میں من مٹاؤ، غیر متوازی نظریہ اور ٹکڑوں میں بات کرنے کی عادت کا نتیجہ ہے۔ دونوں حکومتوں کے درمیان چلنے والے مذاکرات ٹکڑے میں نہ ہو کر غیر جانبداری کے ساتھ ہونے چاہئے۔ ایسے کھلے دل سے ہونے والی بات چیت سے مختلف مسائل کا حل نکل سکتا ہے، بھائی چارگی پیدا ہوسکتی ہے اور اسی طرح ہند-پاک وفاق بنانے کی راہ ہموار ہوسکتی ہے۔''

ہندوستان اور پاکستان کے ایک فیڈریشن کا خیال دین دیال جی اور ڈاکٹر لوہیا کے مابین ہوئی بات چیت میں گہری سوچ کا نتیجہ تھی۔ اس کا آغاز ڈاکٹر لوہیا کے اس موقف کہ 'غیر منقسم ہندوستان' کے التزام میں جن سنگھ اور سنگھ کا یقین پاکستان کو خوف زدہ کر دیتا ہے اور ہند-پاک تعلقات میں اصلاح کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ ڈاکٹر لوہیا نے دین دیال جی سے کہا 'کئی پاکستانی سوچتے ہیں کہ اگر جن سنگھ دہلی میں اقتدار میں آجائے تو وہ زبردستی پاکستان کو ہندوستان میں ملا لے گا۔' دین دیال جی نے جواب دیا 'ہمارا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے اور ہم پاکستانیوں کو اس فکر سے بری الذمہ کرنے کے لئے تیار ہیں۔'

یہ اہم مکالمہ ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں دو مختلف نظریہ فکر، لیکن قومی مفاد کے تئیں ایک سا عزم رکھنے والے دو لیڈروں کے مابین تعاون اور اتفاق بنانے کی بہترین مثال میں سے ایک ہے۔ اس بات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دین دیال جی اور ڈاکٹر لوہیا دونوں ہی اپنے دور سے کتنا آگے سوچتے تھے۔ بعد کے برسوں میں ان دو عظیم لیڈروں کے مشترکہ بیان کا حوالہ دیتے ہوئے ہند-پاک فیڈریشن کے اس التزام کو اکثر میں نے دوہرایا ہے۔

یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ دین دیال جی کسی مسئلہ کو نظریاتی پہلو سے نہیں دیکھتے تھے اور کسی صورت حال کا تجزیہ دیگر تمام متعین نظریوں کو چھوڑ کر کسی ایک نظریہ سے نہیں کرتے تھے، میں ایک تیسری مثال پیش کروں گا۔ جب عرب-اسرائیل جنگ شروع ہوئی اور جن سنگھ کے تقریباً تمام لیڈر اسرائیل حامی بن گئے تو دین دیال جی نے اس معاملہ میں احتیاط برتنے کی صلاح دی۔ ''صرف اس لئے کہ کانگریس آنکھ موند کر عرب حامی بنی ہوئی تھی۔ ہمیں آنکھ موند کر اسرائیل حامی نہیں بن جانا چاہئے۔ ہمیں دنیا کو ایسے نہیں دیکھنا چاہئے جیسے وہ دیوتاؤں (فرشتوں) اور راکششوں (شیطانوں) میں تقسیم ہے۔ ہمیں تمام موضوعات کا تجزیہ صحیح اور غلط کی بنیاد پر کرنا چاہئے۔''

زبان کے سوال پر بھی ان کے رخ میں وہی اصول پسندانہ لچیلا پن تھا اور کثیر الجہت مفاد کی خاطر اپنے سابق نظریہ میں ترمیم کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ جن سنگھ کے ان دنوں کے بیشتر لیڈروں کی طرح دین دیال جی بھی ہندی کے پرزور حامی تھے، لیکن 60 کی دہائی کے وسط میں جب تمل ناڈو (جو اس وقت مدراس کہلاتا تھا) میں ہندی مخالف تحریک تشدد زدہ ہوگئی اور تحریک کے کچھ بااثر لیڈر اس مسئلہ پر ہندوستانی یونین سے الگ ہونے کی دھمکی دینے لگے تو وہ ریاستی زبان کے طور پر انگریزی کو جاری رکھنے کے لئے تیار ہوگئے۔ ایسا کرنے کے لئے پارٹی کے کئی شمالی ہند لیڈروں نے ان کی مذمت کی لیکن وہ اپنے نظریات پر اڑے رہے۔ اس کے علاوہ، جن سنگھ کی روایت کو توڑتے ہوئے انھوں نے کالی کٹ میں دیئے اپنے خطاب کو ایک ہی کتابچہ میں آمنے سامنے کے صفحات پر ہندی اور انگریزی دونوں زبانوں میں شائع کیا۔ اس سے قبل،

صدارتی تقریر کا بنیادی متن پہلے ہندی میں اور بعد میں ہی انگریزی میں شائع ہوتا تھا۔

تقریباً ان ہی دنوں ایک اور مسئلہ میڈیا میں گرما گرم بحث کا موضوع تھا— کیا آئی اے ایس کا امتحان انگریزی کو چھوڑ کر صرف ہندی یا دیگر ہندوستانی زبانوں میں کرایا جانا چاہیے؟ اس بحث نے ہندی بمقابلہ علاقائی زبانوں کے ٹکراؤ کی شکل اختیار کرلی۔ جب اس موضوع پر دین دیال جی کی رائے مانگی گئی تو انھوں نے کہا 'اس سوال کا حل خود امتحان میں بیٹھنے والوں کو کرنے دو۔ جو اپنی ریاست سے باہر ہندوستان کی کسی ریاست میں نوکری کرنا چاہتے ہیں، وہ فطری طور سے ہندی کو منتخب کریں گے دیگر افراد اپنی علاقائی زبان کا انتخاب کریں گے۔'

صرف ایک مرتبہ 1963 میں دین دیال جی نے انتخابی گھمسان میں حصہ لیا، جب انھوں نے اتر پردیش کے جون پور حلقہ سے لوک سبھا کا ایک ضمنی انتخاب لڑا اور شکست سے ہمکنار ہوئے۔ اپنی شکست میں بھی انھوں نے خود کو ایک اصول پسند لیڈر ثابت کیا۔ جون پور اور مشرقی اتر پردیش کے دیگر انتخابی حلقوں میں بلاشبہ انتخابات ذات کی بنیاد پر، خصوصاً راجپوتوں اور برہمنوں کے درمیان لڑا جاتا تھا۔ چونکہ دین دیال جی ایک برہمن کنبہ میں پیدا ہوئے تھے، کانگریس نے ایک راجپوت امیدوار کھڑا کیا اور راجپوت ووٹروں کو لبھانے کے لئے جارحانہ مہم چلائی۔ جب جن سنگھ کے کچھ مقامی لیڈروں نے برہمن کارڈ کھیلنا چاہا تو دین دیال جی نے انھیں دھمکی دی 'اگر آپ لوگ ذات کی بنیاد پر انتخاب جیتنا چاہتے ہیں تو میں فوراً الیکشن سے ہٹ جاؤں گا۔'

کچھ ذاتی یادداشت

میں پنڈت دین دیال اپادھیائے سے پہلی مرتبہ دہلی میں 1947 کے آخری عشرے میں ملا۔ وہ ایک مختصر ملاقات تھی۔ 1948 کے بعد ہی ان کے نزدیکی رابطہ میں آیا اور وہ میری زندگی پر نظریاتی، سیاسی اور اخلاقی اثر ڈالنے والے سب سے اہم وسیلہ کار بن گئے۔ ہمارے تعلقات کی شروعات ایسے دور میں ہوئی جو سنگھ کے ہم سب لوگوں کے لئے انتہائی مشکل کا دور تھا۔ 30 رجنوری 1948 کو مہاتما گاندھی کے قتل کے بعد سنگھ پر پابندی عائد کردی گئی تھی۔ میں اس وقت راجستھان میں ایک مہم جو تھا، جیل سے رہائی کے بعد ایک دن میں دہلی آیا تھا۔ سنگھ سربراہ شری گرو جی بھی وہیں تھے۔ میں ان سے ملاقات کی غرض سے بارہ کھمبا روڈ میں واقع لالہ ہنس راج کی رہائش گاہ پر گیا، جہاں وہ عارضی طور پر رہائش پذیر تھے، وہیں پر میں دین دیال جی سے ملا، جو کم سخن تھے اور چشمہ لگاتے تھے اور دھوتی کرتہ میں بہت پر وقار لگتے تھے۔

جیسے جیسے دین دیال جی کے ساتھ میرا رشتہ بڑھا، مجھے احساس ہوا کہ اس معمولی باہری شباہت کے اندر ایک غیر معمولی شخصیت پوشیدہ ہے۔ وہ جس سے بھی ملتے، انتہائی پیار سے بات کرتے تھے۔ وہ بلاشبہ تمام لوگوں کی عزت کرتے تھے، خواہ اس کا طبقہ یا سماجی پس منظر کچھ بھی ہو۔ اتنے نرم رویہ کے باوجود جو بھی ان کے رابطہ میں آتے تھے، ان کی شخصیت میں ایک اندرونی ابال محسوس کرتے تھے۔ ان کا بنیادی وجود ایک مفکر کے طور پر سامنے آتا تھا۔ جب بھی وہ بولتے تھے، ان کے الفاظ، علم اور دانشوری سے بھرے ہوتے تھے۔

میرا دھیان اس بات پر بھی گیا کہ دین دیال جی اپنی سوچ میں بہت مثبت تھے اور کسی مسئلہ یا موضوع پر اپنی رائے کو آخری نہیں مانتے تھے، جس کا از سرنو جائزہ یا ترمیم نہ کی جاسکے۔ یہ ماننا کہ بڑے نظریے لازمی طور پر درست ہوتے ہیں، ان کے لئے بے معنی تھے۔ اسی طرح بڑے لوگوں کے اعتماد پر سوال اٹھانے والے چھوٹے ممبروں پر برس پڑنے والوں سے انھیں نفرت تھی۔ ایک مرتبہ انھوں نے مجھ سے پوچھا 'ایک قول ہے جس کے مطابق آج کی نئی نسل کے دل میں بزرگوں کے تئیں عزت کا جذبہ نہیں ہے۔ وہ ماضی کی وراثت کو آگے نہیں لے جا رہے ہیں۔

وہ بدعنوان ہور ہے ہیں۔ جب ہم جوان تھے، سب کچھ کتنا اچھا تھا۔ بتاؤ، یہ قول کس کا ہے؟' میں نے کہا کہ یہ سقراط کا قول ہے۔ اس پر دین دیال جی نے کہا' تو تم دیکھ سکتے ہو کہ نئی نسل سے شکایت دو ہزار برسوں سے چلی آرہی ہے اور مستقبل میں بھی یہ جاری رہے گی'۔

وہ پنڈارا روڈ پر واقع ہمارے گھر پر مسلسل آتے اور بالکونی میں گھنٹوں بیٹھ کر مطالعہ کرتے یا لکھتے رہتے۔ ان کی انگریزی اچھی تھی، لیکن اطلاعات بہم کی فطری زبان ہندی ہی تھی۔ میں ان کی ہندی تقاریر اور بیانات کا انگریزی میں ترجمہ کر دیتا تھا۔

دین دیال جی ایک بہترین رائٹر تھے، جو مقبول عام محاوراتی زبان اور مفکرانہ خیالات کا استعمال کرتے تھے۔ مثال کے طور پر، ایک مرتبہ انھوں نے نوراتری کے موقع پر ایک ہندی جرنل کے خصوصی شمارہ کے لئے ایک مضمون لکھا۔ نوراتری کے موقع پر اکثر کنبوں میں روایتی ہندوستانی کھیل جوا کھیلا جاتا ہے (مہابھارت میں کوروں اور پانڈوں کے درمیان یہی کھیل ہوا تھا) یہ خصوصی طور پر ویشیہ کنبوں میں کھیلا جاتا ہے، جنہیں تجارت میں کامیاب ہونے کے لئے خطرہ اٹھانے پڑتے ہیں اور جوا کھیلنا پڑتا ہے۔ دین دیال جی نے اپنے مضمون 'داؤ لگاؤ زندگی پر' میں پاسوں کے کھیل کی دلچسپ تاریخ بتانے کے بعد قارئین کو سبق دیا 'بغیر کسی مقصد اور سمت کے جیسے بغیر بے جان زندگی کا کوئی مطلب نہیں ہے۔ زندگی میں کچھ حاصل کرنے کے لئے آپ کو اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دینا چاہئے اور اپنے یقین کے زور پر چھلانگ لگانی چاہئے'۔ سیاست کے معاملہ میں کوئی بھی لازمی فیصلہ لینے میں خطرہ ہونے پر میں دین دیال جی کی یہ صلاح ہمیشہ یاد رکھتا ہوں۔

''ایکاتم مانو واد''

آج کے قارئین کو دین دیال جی کی فلاسفی سے روشناس کرائے بغیر ان کے تئیں کوئی خراج عقیدت پوری نہیں ہو سکتی۔ تاریخ انھیں صرف جن سنگھ کا اہم مصور ہی نہیں بلکہ ایک بہترین بنیادی کتاب 'ایکاتم مانو واد' کے مصنف کے طور پر بھی یاد رکھے گا۔ آزادی کے بعد کے ہندوستان میں ایسے لیڈر بہت زیادہ نہیں ہوئے جو سیاست کے فلاسفر بھی رہے ہوں۔ وہ ان کچھ بہترین میں سے ایک تھے۔

1951 میں جن سنگھ کے قیام کے ساتھ ہی اسے ایک مخصوص اور مکمل طور پر نظریہ فکر کی بنیاد دیئے جانے کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی۔ پارٹی کے اعلیٰ لیڈر کے طور پر ڈاکٹر مکھرجی کا دور اقتدار اتنا مختصر اور پر حوادث تھا کہ وہ یہ کام نہیں کر پائے۔ ان کے انتقال کے بعد ایک رہنما نظریہ کی ضرورت دین دیال جی کے دل میں ہمیشہ قائم رہی۔ یہ وہ وقت تھا جب دنیا دو باہمی مخالف نظریات، پونجی واد اور سامراجیت سے نبرد آزما تھی۔ آزادی کے بعد کے ہندوستانی سیاسی فکر پر بھی اس بحث کا دبدبہ رہا اور مختلف سیاسی پارٹیاں کم یا زیادہ تعداد میں ان میں سے ایک نظریہ سے متاثر رہی۔

دین دیال جی کا خیال تھا کہ پونجی واد اور سامراجیت دونوں ہی نظریئے قابل مسترد ہیں، کیونکہ وہ انسان اور سماج کو صرف طبعی نظریہ سے دیکھتی ہے۔ ایک انسان کو مفاد پرست جاندار مانتی ہے جو پیسے کے پیچھے پاگل ہے، جسے ایک ہی اصول معلوم ہے۔ زبردست مقابلہ کا اصول، تمام عناصر میں جنگل کا اصول جبکہ دوسرے اسے ایک کمزور بے جان چیز کے طور پر دیکھتی ہے۔ دونوں میں ہی اقتصادی اور سیاسی طاقت مرکوز ہے، چونکہ وہ انسانی زندگی کو مکمل طور پر نہیں سمجھ سکی، اس لئے فطری طور سے وہ انسانی ضروریات کو جواز فراہم نہیں کرتی۔ وہ سماج کے ایک طبقہ کو دوسرے طبقہ سے اور انسان کو فطرت کے خلاف کھڑا کر دیتی ہے۔ یہی دنیا میں لامتناہی غریبی، ناانصافی، جدوجہد اور تشدد کی بنیادی وجوہات میں سے ایک ہے، اس لئے دونوں ہی انسان کو غیر انسانی بنا دیتی ہے۔

اس کے برخلاف دین دیال جی کے مطابق، انسانی خواہشات کو چار شکلوں★ مذہب، دولت، کام اور موکش، میں دیکھنے اور ایک شخص کی زندگی کو اسی کے مطابق چار سو پانوں (آشرموں) برہمچاریہ، گرہستھ، وان پرستھ اور سنیاس، میں تقسیم کرنے کا ہندوستانی نظریہ شخص اور سماج دونوں کو متوازی ترقی فراہم کرتا ہے۔ دین دیال جی کا کہنا تھا کہ 'زندگی کو مکمل طور سے دیکھنا ہی ہندوستانی تہذیب کا بنیادی عنصر ہے۔' ہندوستانی تہذیب کی بنیاد دین دیال جی کے مطابق 'یہ زندگی کی ناقابل تسخیر سچائی ہے۔ انسان ایشور کی سب سے بہترین مصوری ہے، جو اپنی شناخت کھو رہا ہے۔ ہمیں پھر سے اسے اس کا وہی مقام دلانا ہوگا۔ اسے اس کی عظمت، اس کی اہلیت کو پھر سے بیدار کرنے کی اہمیت سمجھنی ہوگی اور اسے اس کی شخصیت کی پوشیدہ الوہی بلندی کو حاصل کرنے کے لئے تیار کرنا ہوگا۔'

1964 میں گوالیار میں منعقدہ چار روزہ کیمپ، جس میں جن سنگھ کے تقریباً 500 کارکنان نے حصہ لیا، میں پہلی مرتبہ اس موضوع پر دین دیال جی نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ انھوں نے اسی فلسفہ کی توسیعی شکل 1965 میں وجے واڑہ میں ہوئی پارٹی کی میٹنگ میں پیش کی۔ اس سے کچھ عرصہ بعد ممبئی میں اپنی مرحلہ وار چار تقاریر میں اس کی آخری شکل پیش کی گئی۔ اس فلسفہ کا عنوان 'ایکاتم مانو واد' انھوں نے ایک زمانہ کے مقبول عام کیمونسٹ لیڈر ایم این رائے کے اصول 'تغیر پذیر انسانیت' کے مقابلہ جان بوجھ کر رکھا تھا۔ میں گوالیار اور وجے واڑہ دونوں مقامات پر شریک تھا۔ ان میں مجھے دین دیال جی کی ایک نئی شبیہ سے روشنائی ہوئی۔

'ایکاتم مانو واد' کی اہمیت اس کے ایک مسئلہ کے کامیاب حل میں نہاں ہے، جس نے ہمارے دور کے کئی سیاسی ماہرین کے سامنے چیلنج پیش کیا ہے۔ عملی طور پر فرد اور سماج دونوں کے اندر امن اور رابطہ قائم کرنے کے لئے کون سے خیالات پر اثر ہوں گے۔ اس لئے (سامیہ واد کے مطابق) طبقاتی جدوجہد کے اصول کو خارج کرتے ہوئے وہ سماج کے مختلف طبقوں کے باہمی انحصار کو اہمیت دیتے ہیں، جس میں سبھی کی ترقی کے لیے یہ طبقہ مشترکہ طور پر کام کرتے ہیں۔ اسی طرح (پونجی واد کے مطابق) فرد اور سماج میں کسی اندرونی مخالفت کے اصول کو خارج کرتے ہوئے وہ ان دونوں کے باہمی تال میل پر زور دیتے ہیں۔ ایک پھول اپنی پنکھڑیوں کے سبب ہی پھول کہلاتا ہے اور پنکھڑیوں کی اہمیت بھی پھول کے ساتھ رہنے اور اس کی خوبصورتی میں اضافہ کرنے سے ہی ہے۔

پھر بھی دین دیال جی محض اصول پرست نہیں تھے۔ وہ مغربی طرز زندگی کی اندھی تقلید کے سخت مخالف تھے، حالانکہ وہ یہ اعتراف کرتے تھے کہ 'مغربی طرز انسانی افکار میں ہونے ایک انقلاب کا نتیجہ ہے اور اسے نظر انداز کرنا درست نہیں ہوگا۔' ان کے نزدیک مغرب کی سیاست اور اقتصادی نظریوں کی مذمت انھیں پوری طرح خارج نہیں کرتی ہے۔ وہ انھیں صرف لا حاصل ثابت کرتی ہے۔ قومیت، جمہوریت، سماجیت، عالمی امن اور عالمی اتحاد جیسے موضوعات، جن پر 60 کی دہائی میں ہندوستان میں گرما گرم بحث ہوئی، کے بارے میں وہ کہتے ہیں 'یہ سبھی اونچے آدرش ہیں اور انسان کی بالاتر خواہشات کو ظاہر کرتے ہیں، لیکن مغرب نے ان نظریوں کو جس طرح سے پیش کیا ہے، اس سے ایسا لگتا ہے جیسے ان میں تمام باقی نظریوں کی مخالفت ہے۔

★ ہندوستانی فلاسفی میں زندگی کے تمام پہلوؤں اور ضرورتوں کا جائزہ لیا جاتا ہے، جس میں نجی اور سماجی دونوں پہلو شامل ہیں۔ چار پروشارتھ انسان کی زندگی کے چار مقاصد مقرر کرتے ہیں۔ مذہب، ثروت، کام اور موکش۔ اسی طرح زندگی کے چار مرحلے، جنہیں آشرم کہا جاتا ہے، سبھی کی ذمہ داریاں اور ضروریات ہوتی ہیں۔ وہ ہیں برہمچاریہ (زندگی کے پہلے 20 برس، زمانہ طالب علمی میں برہمچاریہ کا نفاذ کرنا) گرہستھ (خانگی زندگی 50-25 سال) وان پرستھ (دھیان اور روحانی مطالعہ 75-50 برس) اور سنیاس (سادھو کی طرح زندگی گزار کر ایشوریہ چیتنا کو بیدار کرنا 100-75 برس)

ان لوگوں کو جنھوں نے غیر منصفانہ اور روایت پسند کہہ کر ہندو مذہب پر نکتہ چینی کی ہے، دین دیال جی نے جیسا جواب دیا ہے، وہ ایک سماجی انقلابی کو ہی زیب دیتا ہے۔'ایکاتم مانوواد' ان سبھی بیہودہ رسموں (چھوا چھوت، ذات پات، جہیز، خواتین کا استحصال) جو ہمارے سماج کے غیر صحت مند ہونے کی علامت ہیں، کو ختم کرنے کی اپیل کرتا ہے۔ وہ یہ کہہ کر ہندوستانی سماج کے خود اصلاح پسندی کی عادت کی تصدیق کرتے ہیں 'ہمیں اپنی قدیم تہذیب کی جانکاری ہے، لیکن ہم قدامت پرست نہیں ہیں۔ ایک بھاری بھرکم آثار قدیمہ کے رکھوالے بننے کا ہمارا کوئی ارادہ نہیں ہے۔'

ان کے تصور کا دھرم راجیہ (جو کسی تھیوکریٹک یا بین مذہبی ریاست کا نہیں بلکہ صرف ایک قانونی ریاست اور ذمہ دارانہ شہریت کا مجاز ہے) گاندھی جی کے 'رام راجیہ' کے اصول سے ملتا جلتا ہے۔ مذہب قوم کی بنیاد ہے۔ اگر مذہب نہیں رہا تو ملک بھی نہیں بچے گا۔

کیا بین مذہبی قوم کا تصور جمہوریت مخالف ہے؟ ہرگز نہیں، دین دیال جی ابراہم لنکن کے بیان کو اور تعمیری توسیع دیتے ہیں۔ عوام کی عوام کے ذریعہ اور عوام کے لئے حکومت کی شکل میں جمہوریت کی تعریف میں 'کی' کا مطلب ہے خود مختاری 'کے ذریعہ' کا مطلب ہے عوام کی حکومت اور 'کے لئے' مذہب کی نشانی ہے۔ یہ تمام اصول 'بین مذہبی قوم' میں سمائی ہوئی ہے۔

'ایکاتم مانوواد' کا ایک انوکھا اصولی رول یہ ہے کہ وہ قدیم رشیوں کی تصانیف میں سے 'قومیت' کے دو مثالی جذبوں کا احیا کرتا ہے، جنہیں چیتی (قوم کی روح) اور وراٹ (وہ قوت جو قوم کو توانائی بخشتی ہے) کہتے ہیں: قوم کے آدرش اس کی چیتی سے تعبیر ہوتے ہیں، جو ایک فرد کی روح کے مساوی ہی ہے۔ ایک ملک ثقافتی طور سے جس سمت میں گامزن ہوتا ہے اس کا فیصلہ چیتی ہی کرتا ہے۔ وہ سب کچھ، جو چیتی کے مطابق ہے، قوم کی تہذیب میں شامل کرلیا جاتا ہے۔ اس چیتی کے زور سے ہی ایک قوم طاقتور اور مرد مجاہد بن کر ابھرتی ہے۔ ایک قوم کی تمام تر عظیم شخصیات کے کاموں میں اس چیتی کی ہی نمائش ہوتی ہے۔

ایکاتم مانوواد ایک قوم کی زندگی میں 'وراٹ' کا موازنہ انسانی جسم کے تحت 'جان' سے کرتا ہے۔ جس طرح سے 'جان' جسم کے مختلف حصوں میں توانائی پیدا کرتی ہے، اس کی ذہنیت کو تابندہ بنائے رکھتی ہے اور جسم و روح کو متحد رکھتی ہے۔ وہی 'وراٹ' قوم کے ساتھ کرتا ہے۔ 'وراٹ' کے طاقتور ہونے سے ہی جمہوریت کامیاب اور حکومت مؤثر ہوسکتی ہے۔ تب ہماری قوم کی اختراع ہمارے قومی اتحاد میں رکاوٹ نہیں بنتی۔ جب وراٹ بیدار ہوتا ہے تب اختراع جدوجہد کو جنم نہیں دیتی اور لوگ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے ہیں، جیسے جسم کے مختلف حصہ یا ایک کنبہ کے مختلف ارکان کرتے ہیں۔ ہمیں اپنے قوم کے 'وراٹ' کو بیدار کرنے کا کام کرنا ہوگا۔ اپنی وراثت کے تئیں فخر کا جذبہ، اپنے زمانۂ حال کی حقیقت کا جائزہ اور مستقبل کے منصوبہ کے ساتھ ہم اس کام پر گامزن ہوں۔ ہم نہ تو اس ملک کو کسی ماضی بعید کا سایہ بنانا چاہتے ہیں اور نہ روس یا امریکہ کی نقل۔

دین دیال جی اپنے تصور کا اختتام نہایت خوداعتمادی اور عزائم کے ساتھ کرتے ہیں۔ عالمی تعلیم اور اپنی بنیاد کی مدد سے ہم ایک ایسے ہندوستان کی تعمیر کریں گے، جو ماضی کی تمام جرأت مندانہ داستانوں سے بھی زیادہ مایہ ناز ہوگا اور جو تمام شہریوں کو ان کے کثیرالجہت امکانات کو فروغ دینے کا موقع فراہم کرے گا اور پوری کائنات سے الگ ہوکر انسان کی ایسی بہترین مثال پیش کرے گا، جس سے وہ نر سے نارائن میں منتقل ہوسکے۔ تہذیب کی یہ الوہی صورت ہے۔ ایک چوراہے پر کھڑی انسانیت کے لئے یہی ہمارا پیغام ہے۔ اپنے اس مقصد کی کامیابی میں ایشور ہماری مدد کرے۔

جن سنگھ نے 1965 میں پارٹی کے وجے واڑہ اجلاس میں 'ایکاتم مانوواد' کو اپنے رہنما نظریہ فکر کے طور پر اپنالیا۔ اسی طرح، اپنے آئین میں بھی بی جے پی نے پارٹی کے بنیادی اصول کے طور پر اس کو قائم کیا۔ پھر بھی اس اصول کو فروغ دینے میں دین دیال جی کا بنیادی مقصد انسانیت تھا، نہ کہ کسی خاص پارٹی کو فائدہ پہنچانے کے محدود معنی میں سیاست۔ اسی لئے ان کے پیغام کی اپیل اس کا سیاسی دائرہ سے باہر جاکر مثبت سوچ والے دنیا کے ہر شخص کے دل کو چھوتی ہے۔

میں نے ایک ایسے شخص کی زندگی پر اتنے صفحات کیوں صرف کئے ہیں، جو تقریباً چالیس برس قبل اس دنیا سے رخصت ہو گیا؟ ایسا کرنے کے دو اسباب ہیں۔ پہلا، دین دیال جی میری سیاسی زندگی میں ایک مرکزی کردار تھے اور اب بھی ہیں۔ دوسرا، میرا یہ عزم مصمم ہے کہ آج کے — اور کل کے بھی — ہندوستان کے لئے انھیں اور ان کی فلاسفی کو جاننا اتنا ہی ضروری ہے جتنا ان کی زندگی میں تھا۔ یہ سچ ہے کہ ان چار دہائیوں میں ہماری قومی زندگی میں بہت کچھ تبدیل ہو چکا ہے۔ آج کی اقتصادی اور سیاسی سچائیاں اس وقت سے بہت مختلف ہیں، پھر بھی، جو نہیں بدلا ہے وہ زندگی کے کچھ بنیادی سوالات کے جوابات کی ہماری تلاش، جواب بھی جاری ہے۔ ایکاتم مانوواد کو بھلے ہی ویسی اہمیت نہ دی گئی ہو جیسا مارکسواد کے مختلف اصولوں اور دیگر مغربی سیاسی نظریوں کو، لیکن مجھے شبہ نہیں ہے کہ سنجیدہ اور غیر جانبدارانہ سچائی کا پجاری اسے مشعل راہ اور سبق آموز پائے گا اور اسے مہاتما گاندھی اور ڈاکٹر رام منوہر لوہیا، جن کے ساتھ دین دیال جی کا کئی معاملوں میں اتفاق تھا، کی تصانیف کے سامنے رکھنے کے قابل سمجھے گا۔

6

پارلیمانی زندگی کی شروعات

جمہوریت کی عام طور پر عادت ہوتی ہے کہ وہ برسراقتدار لوگوں سے
پریشان کن لمحوں پر پوچھتی ہے کہ کیا وہ اقتدار میں رہنے کے قابل ہیں؟
جیمس رسیل لاویل (91-1819)
ایک مشہور امریکی شاعر، مضمون نگار اور سفارت کار

اپنی طویل مدتی زندگی میں ایک سچ سے میرا بار بار سامنا ہوا کہ انسانی زندگی اور فطرت، دونوں میں تبدیلی ہی ایک سچائی ہے۔ تبدیلی کبھی آہستہ اور ناقابل دید ہوتی ہے تو کبھی اچانک تیز اور قابل توجہ بھی ہو سکتی ہے۔ میرے بچپن کے دنوں میں کراچی میں تبدیلی موسم میرے لئے فرط مسرت کا سامان تھا۔ سمندر کو دن میں کسی ایک لمحہ میں پرسکون اور مستحکم دیکھنا اور دوسرے لمحہ اپنی زبردست لہروں کے ساتھ گرجنا میرے لئے ایک تحیر آمیز چیز تھی۔ یہ میرے اندر خوف بھی پیدا کرتی تھی۔ جیسے جیسے میں بڑا ہوا تو محسوس ہوا کہ عروج وزوال، شکست وفتح اور فائدہ ونقصان زندگی کا حصہ ہیں۔ انسان کو تمام حالات کا سامنا کرنے کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ اس سے میرے اندر خوداعتمادی کے جوہر نکھرے۔ جب مصیبت آتی ہے اور حادثہ ہوتا ہے۔ ایسا کسی بھی وقت ہو سکتا ہے اور اس شکل میں بھی ہو سکتا ہے جیسا کہ ہم کبھی سوچ بھی نہیں سکتے۔ اس کے سبب مایوس نہ ہونا میں نے سیکھا ہمت، خوداعتمادی اور مسلسل کام کرنے کی عادت کو فروغ دینا۔ میں نے اپنی زندگی میں یہ تجربہ کیا کہ بے پناہ تکلیف اور مایوسی کی حالت کا خاتمہ ضرور ہوتا ہے اور روشنی اور امید کے ساتھ ایک نئے سفر کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ بات انسان اور تنظیم دونوں کے سلسلہ میں سچ ہے۔

جن سنگھ کی کمان واجپئی جی کے ہاتھوں میں

فروری 1968 میں دین دیال جی کی بے وقت موت نے ہماری پارٹی کو تاریکی اور مایوسی سے ہمکنار کر دیا تھا۔ ہمارا غم کہیں زیادہ گہرا تھا، کیونکہ ان کے قتل کا راز ہفتے اور مہینوں گزر جانے کے بعد بھی نہیں بتایا جا سکا۔ کس نے ایسا کیا؟ اس کے پس پشت کن لوگوں کا ہاتھ ہو سکتا ہے اور کس لئے؟ پارٹی میں اوپر سے نیچے تک کے تمام لوگ بار بار یہی سوال پوچھ رہے تھے، لیکن جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔ کسی عزیز کو کھو دینے کے غم سے بھی زیادہ غم ہوتا ہے ان کے کھونے کی وجہ سمجھ میں نہ آنا۔

اس دردناک صورت حال میں پارٹی نے قیادت کے لئے اٹل جی کی جانب دیکھا۔ انھیں تینتالیس سال کی عمر میں پارٹی کا صدر منتخب کیا گیا۔ ایک بہترین مقرر اور پارلیمان کے طور پر پہلے سے مشہور واجپئی جی سے اب پارٹی میں نئی جان پھونکنے کے لئے مطالبہ کیا گیا۔ انھوں نے اس مطالبہ کو خندہ پیشانی سے قبول کیا۔ تھامس کلائیل (1881-1795)، دوروکٹوریہ کے عظیم مورخ کہتے ہیں 'مصیبت وہ ہیرے کی کنی ہے جس سے ایشوراپنے گوہر کو چمکاتے ہیں۔' اٹل جی وہی گوہر نایاب تھے، جو قومی منظرنامہ میں 1968 سے جگمگانے لگے۔

پارٹی صدر کے طور پر اٹل جی نے فوراً دو چنوتیوں کا سامنا کیا۔ پہلا دین دیال جی کے قتل سے پیدا ہوئی مایوسیوں سے پارٹی کو باہر نکالنا اور دوسرا مختلف ریاستوں میں اتحادی قانون ساز پارٹیوں کی حکومت کے اندر داخلی گروپ بندی کے مسئلہ کا حل نکالنا۔ ان حکومتوں میں جن سنگھ بھی شامل تھا۔ 14 رجون 1968 کو پارٹی مجلس عاملہ نے ایک تجویز پیش کی، جس میں تمام حلیف پارٹیوں کو صلاح دی گئی کہ وہ قابل قبول کم از کم مشترکہ پروگرام تک ایماندارانہ طور پر محدود رکھیں، اپنے نظریہ کے مطابق پوری حکومت کو ڈھالنے سے پرہیز کریں اور آپسی گروپ بندی سے بچیں۔

اٹل جی کی قیادت کے ابتدائی دن مسائل سے بھرپور تھے۔ بہار، اترپردیش اور پنجاب میں مشترکہ قانون ساز پارٹی کی حکومت حلیف پارٹیوں کے مابین آپسی گروپ بندی کے سبب خطرہ میں تھی، حالانکہ جن سنگھ نے رابطہ بنانے کی بھرپور کوشش کی، پھر بھی کامیابی نہیں ملی۔ نتیجتاً ہم لوگ بھی سیاسی عدم اطمینان کے شکار ہوگئے۔ جب 1969 کے اوائل میں ان ریاستوں میں اسمبلی کے لیے نئے انتخابات ہوئے تو پارٹی کو زبردست شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

اٹل جی کو پارٹی کے اندر ایک دیگر اہم مسئلہ کا سامنا کرنا پڑا۔ پارٹی کے سابق صدر بلراج مدھوک ہر موڑ پر ان کی مخالفت کرتے تھے۔ مدھوک دین دیال جی اور اٹل جی کی اقتصادی پالیسیوں سے اتفاق نہیں رکھتے تھے، کیونکہ انھیں لگتا تھا کہ ان کا جھکاؤ بایاں بازو کی طرف ہے۔ 'زمین کاشت کاروں کی' کے اصول کے تئیں ہمارے عزم کے تحت زرعی زمین حدبندی قانون کو پراثر ڈھنگ سے نافذ کرنے کے مطالبہ کو دین دیال جی کی حمایت، جو پارٹی کی ورکنگ کمیٹی نے بھی پاس کردیا تھا، پر انھیں اعتراض تھا۔ اندرا گاندھی کے ذریعہ بینکوں کے قومیانے جیسے عوامی مقبولیت والے اعلانات پر ان دنوں پارٹی بہت محتاط ہوکر ردعمل کا اظہار کرتی تھی۔ ہم ان اقدام کی براہ راست مخالفت نہیں کرتے تھے۔ اس سے مدھوک ناراض ہوگئے۔ وہ سیاسی اور اقتصادی موضوعات پر آزاد پارٹی کے ساتھ اتحاد کرنے کے حق میں تھے اور بعد میں انھوں نے جن سنگھ اور آزاد پارٹی، جو ہندوستان کی ترقی کے لئے ایک آزاد بازار کے ماڈل کی حامی تھی، کے انضمام کی بھی اپیل کی۔ بہت بڑی تعداد میں جن سنگھ کے لیڈر اور کارکنان مدھوک کے اس خیال سے متفق نہیں تھے۔ اٹل جی کا واضح نظریہ تھا کہ جن سنگھ کی پہچان 'ایک عام آدمی کی پارٹی' کے طور پر ہونی چاہئے، نہ کہ امیروں اور صاحب ثروت لوگوں کی۔ ساتھ ہی انھوں نے دونوں کمیونسٹ پارٹیوں کو سوویت روس اور چین کی ترقی کے ماڈل کے خلاف جن سنگھ کی مخالفت کو بھی واضح طور پر بیان کیا۔ مدھوک کے ذریعہ یہ اور ایسے متعدد نکات پر کیے گئے اعتراضات پر پارٹی متحد ہوکر اٹل جی کی قیادت کے پیچھے صف آرا ہوگئی تھی۔

اٹل جی ملک میں دورہ کرکے پارٹی کارکنان اور نیک خواہشات رکھنے والوں کے ساتھ بات چیت کرکے اور عظیم الشان ریلیوں کو خطاب کرکے پارٹی میں نئی توانائی پیدا کرنے لگے — نانا جی دیشمکھ، سندر سنگھ بھنڈاری، کیلاش پتی مشرا، کشا بھاؤ ٹھاکرے، جگناتھ راؤ جوشی جیسے مخلص ساتھیوں اور دیگر لوگوں کا انھیں مکمل تعاون حاصل تھا اور ان ساتھیوں کے ساتھ انھوں نے بے پناہ محنت کی۔ اٹل جی کے ساتھ اپنے نجی تعلقات

کے سبب اس امتحان کی گھڑی میں میں انھیں تعاون دے سکا۔

اٹل جی کی نئی کوشش تھی درج فہرست ذات، درج فہرست قبائل اور دیگر پسماندہ طبقات کے درمیان پارٹی کی بنیاد کو مضبوط بناتا۔ مہاراشٹر اور گجرات سمیت جنوبی اور مشرقی ہند میں، جہاں پارٹی کمزور تھی، وہاں اسے مضبوطی فراہم کرنے کے لئے دین دیال جی کے پروگرام کو انھوں نے جاری رکھا۔ پارٹی کی ریاستی اکائیوں کو عام آدمی، خصوصاً کسانوں کی، علاقائی مسائل کو اٹھانے کے لیے اور پرامن جدوجہد کرنے کے لئے کہا گیا۔ ان کی ان کوششوں کی وجہ سے مرکز اور ریاست دونوں سطحوں پر پارٹی لیڈر مسلسل کوشش کرتے نظر آئے۔

1969: اندرا گاندھی کے ذریعہ کانگریس کی تقسیم

یہ وہ وقت تھا جب کانگریس پارٹی آزاد ہندوستان کی تاریخ میں سب سے مشکل دور سے گزر رہی تھی۔ جنوری 1966 میں لال بہادر شاستری کے انتقال کے بعد کانگریس پارٹی کے سینئر لیڈروں نے جواہر لال نہرو کی بیٹی اندرا گاندھی کو وزیر اعظم منتخب کیا، حالانکہ ان کا انتخاب نہ تو فطری تھا اور نہ ہی پر جوش۔ پارٹی میں ان سے کئی سینئر لیڈر موجود تھے، جن میں مرار جی ڈیسائی، کے کامراج اور جگ جیون رام خاص طور پر اہم تھے۔ یقینی طور سے وہ لوگ اندرا گاندھی سے زیادہ تجربہ کار تھے۔ چونکہ وہ متفق ہو کر ایک امیدوار کا انتخاب نہیں کر سکے تھے، اس لئے انھوں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اندرا گاندھی کی تاج پوشی کی۔ انھیں یقین تھا کہ اندرا گاندھی ان لوگوں کے قابو میں رہیں گی، لیکن وہ یہ نہیں سمجھ پائے کہ اس فیصلہ کا کتنا خمیازہ انھیں بھگتنا پڑے گا۔ وزیر مالیات مرار جی ڈیسائی کو نائب وزیر اعظم بنایا گیا۔

1967 کے لوک سبھا الیکشن میں کانگریس مرکز میں اقتدار پر قابض ہونے میں کامیاب رہی۔ اسے لوک سبھا کے 515 سیٹوں میں سے 283 سیٹوں پر کامیابی ملی، جو کہ 1962 کے الیکشن میں ملی 361 سیٹوں کے مقابلہ میں کہیں کم تھی۔ شمالی ہندوستان کے بیشتر ریاستوں میں پارٹی کو اقتدار سے ہاتھ دھونا پڑا۔ جس سے کانگریس کے اندر شدید اقتدارانہ رسہ کشی کے لئے اسٹیج تیار ہو گیا، جس میں اپنی جارحیت، سفاکیت، چالاکی اور عوامی لبھاونے نعروں کے سہارے اندرا گاندھی کی آخر کار جیت یقینی تھی۔ انھوں نے سابق راجا، مہاراجاؤں کی اجارہ داری ختم کرنے، بینک، بیمہ کمپنیوں اور نجی سیکٹروں کے کئی پلانٹوں کو قومیانے، درآمدات، برآمدات تجارت پر ریاست کا کنٹرول، نجی سیکٹر کی تجارت پر پہلے سے زیادہ سخت کنٹرول، زیادہ سے زیادہ زمین کی حد بندی کا قانون اور لازمی خوردنی اشیاء کے لئے عوامی تقسیم سسٹم جیسے پروگراموں کا سلسلہ شروع کیا۔ ان تمام پروگراموں میں ان کے نعرے 'غریبی ہٹاؤ' کی جھلک ملتی تھی۔ اس نعرہ نے عام آدمی کو اپنی جانب متوجہ کیا۔ اندرا گاندھی نے مرار جی ڈیسائی کو کابینہ سے برخاست کر دیا اور وزارت مالیات اپنے پاس رکھ لیا۔

1969 میں صدارتی انتخاب کے وقت وہ اس لڑائی کو اعلیٰ سطح تک لے گئیں۔ سابق صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین کے انتقال کے سبب اس وقت الیکشن کرانا پڑا تھا۔ 'سنڈیکیٹ' گروپ نے نیلم سنجیوا ریڈی کو اپنے امیدوار کے طور پر میدان میں اتارنے کا فیصلہ کیا اور وہ کانگریس ورکنگ کمیٹی سے اس فیصلہ کی حمایت لینے میں بھی کامیاب رہے۔ نتیجتاً نیلم سنجیوا ریڈی برسر اقتدار پارٹی کے اجتماعی امیدوار ہوئے۔ ان کا بہ آسانی انتخاب ہو سکتا تھا، کیونکہ صدارتی انتخاب کے پیش نظر رائے دہندگان کے لئے کانگریس کو واضح اکثریت حاصل تھی، لیکن اندرا گاندھی نے ان کی امیدواری کی مخالفت کی اور ہندوستان کے سابق نائب صدر جمہوریہ وی وی گری کو آزاد امیدوار کے طور پر میدان میں اتارا۔ جب انھوں نے اپنی پارٹی کے ممبران پارلیمنٹ اور ریاست کے ممبران اسمبلی کو گری کے حق میں ضمیر کی آواز پر ووٹ دینے کی اپیل کی تو واضح ہو گیا کہ کانگریس

پارٹی تقسیم کے دہانہ پر کھڑی ہے۔

مجھے یاد ہے کہ برسراقتدار پارٹی میں چل رہی اس کش مکش پر میں نے ایک مضمون لکھا تھا۔ میں نے لکھا کہ برطانوی پارلیمانی نظام میں پارٹی کے فیصلہ کے مطابق ممبران اسمبلی کو ووٹ کا حکم دینے کے لئے وہپ کا التزام نہیں تھا اور انھیں اپنی حساسیت کے مطابق ووٹ کا حکم دینے کی چھوٹ تھی، حالانکہ ایک برطانوی ماہر قانون کی مثال دیتے ہوئے میں نے اپنا نظریہ اس طرح ظاہر کیا 'ضمیر کی آواز کا شخصی پہلو ایک خاصیت ہے لیکن اجتماعی طور پر اس کا استعمال ایک سازش ہے۔ یہ اجتماعی طور پر بدانتظامی میں ملوث ہونے جیسا ہے۔'

یہاں ایک وزیراعظم کے ذریعہ بدانتظامی سلوک روا رکھنے اور اپنی پارٹی کے ممبروں کو بھی ایسا کرنے کے لئے زور دینے کا معاملہ تھا۔ حالانکہ ڈسپلن، خود پر کنٹرول اور پارٹی اتحاد جیسے نظریات کی اندرا گاندھی کے لئے کوئی اہمیت نہیں تھی، جو اس وقت جنگ کے موڈ میں تھیں اور اس لئے وہ یقین کرتی تھیں کہ جنگ میں سب کچھ جائز ہے۔

یہاں میں ایک خوشگوار معاملہ کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ یہ معاملہ جن سنگھ کے اہم ستونوں میں سے ایک جگن ناتھ راؤ جوشی سے وابستہ ہے۔ ان کی شخصیت میں دو لائق تحسین خصوصیات تھیں۔ غیر مفاد پرستی اور قابل توجہ پرمسرت عادت، جن سنگھ اور غیر کمیونسٹ اپوزیشن پارٹی صدارتی الیکشن کے لئے اپنے مشترکہ امیدوار کے انتخاب کے عمل میں تھے۔ (آخرکار ریزرو بینک آف انڈیا کے پہلے ہندوستانی گورنر اور نہرو کابینہ میں وزیر مالیات رہ چکے ڈاکٹر سی ڈی دیشمکھ کا مشترکہ امیدوار کے طور پر انتخاب ہوا) ایک دن جوشی جی، جو اس وقت راجیہ سبھا کے رکن تھے، اپنے ساتھی ممبر پارلیمنٹ کے ساتھ پارلیمنٹ کے سینٹر ہال میں بیٹھے ہوئے تھے۔ عام طور پر سینٹرل ہال میں غیر رسمی میٹنگ اور ممبر پارلیمنٹ اور صحافیوں کے ساتھ عام بات چیت کیا کرتے تھے۔

ایک ساتھی نے جوشی جی سے پوچھا 'جگن ناتھ راؤ جی، آپ صدر کیوں نہیں بن جاتے؟ تاعمر غیر شادی شدہ رہنے کا فیصلہ لے چکے سنگھ کے تشہیر کار جوشی جی نے فوراً ازراہ مذاق جواب دیا 'مجھے راشٹر پتی کون بنائے گا، جب کوئی مجھے معمولی پتی (شوہر) کے طور پر قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہے؟'

کانگریس کی اندرونی رسہ کشی کے سبب وی وی گری صدارتی انتخاب میں بہت کم ووٹوں کے فرق سے کامیاب ہوئے۔ چار ماہ کے داخلی خلفشار کے بعد دسمبر 1969 میں آل انڈیا کانگریس ورکنگ کمیٹی کے بنگلور اجلاس میں کانگریس پارٹی رسمی طور پر تقسیم ہوگئی۔ یہ المیہ ہی ہے کہ یہ سال مہاتما گاندھی کے یوم سال گرہ صدی کا تھا، جسے کانگریس کے دو دھڑوں نے تقسیم اور بکھراؤ کے طور پر منایا۔ اندرا گاندھی کے مخالفین نے خود کو کانگریس (او) کے طور پر تشکیل کیا، جس میں 'او' کے معنی آرگنائزیشن یعنی تنظیم ہیں، حالانکہ عوام 'او' کا مطلب 'اولڈ' یعنی پرانے لیڈروں کی قیادت سمجھتی تھی۔ کانگریس کی نوجوان نسل نے اندرا گاندھی کی حمایت کی۔ کانگریس (او) کے ساتھ صرف ایک چوتھائی ممبر پارلیمنٹ تھے، پھر بھی پارلیمنٹ میں اندرا گاندھی کی حکومت اقلیت میں آگئی۔ وہ اشتراکیت اور ڈی ایم کے کی حمایت سے حکومت میں تقریباً ایک سال تک بنی رہی، حالانکہ وسط مدتی انتخاب ناگزیر تھا اور یہ فروری 1971 میں ہوا۔

انتخابی مہم میں اندرا گاندھی نے اپنی غریب دوست شبیہ کا بہت احتیاط سے استعمال کیا۔ انھوں نے اپنے مخالفین کو کیپٹل ازم حامی کہہ کر مذمت کی اور خود کو سوشلسٹ کی تنہا حمایتی کے طور پر مشتہر کیا۔ عوام کے درمیان ان کی بڑھتی مقبولیت کو دیکھ کر جن سنگھ، کانگریس (او)، سوتنتر پارٹی اور مشترکہ سوشلسٹ پارٹی جیسی غیر کمیونسٹ پارٹیوں نے ایک بڑا اتحاد بنایا، لیکن ان سب کا عوام پر کچھ اثر نہیں ہوا، جنھوں نے اندرا گاندھی کو

لوک سبھا میں دو تہائی ووٹ (518 سیٹوں میں سے 352) دے کر کامیاب بنایا۔ وزیراعظم کے حق میں 'غریبی ہٹاؤ' لہر کی اثر کی وجہ سے جن سنگھ کو صرف 22 سیٹیں ملیں، جو کہ 1967 کے مقابلہ 13 سیٹ کم تھی۔

اندرا گاندھی کی فتح سے ملی آگاہی

کانگریس پارٹی کی تقسیم اور اس کا ہندوستان کے معاشی نظام، سیاست اور سماج پر جو اثر ہوا: اس سلسلہ میں میں اپنے نظریات پیش کرنا چاہوں گا۔ میں ایسا اس لئے کر رہا ہوں کہ یہ صرف ایک پارٹی کا اندرونی معاملہ نہیں تھا بلکہ ملک پر اس کے دوررس اثرات پڑے۔

سیاست کا دریا ہمیشہ موجزن رہتا ہے، یہ بہتا رہتا ہے اور اس کی رفتار جمہوریت کے تحرک کی نشانی ہے۔ دو دہائی سے زیادہ مدت تک اقتدار میں رہنے اور اس کی برتری کو چنوتی دینے والی کسی مضبوط پارٹی کے نہ ہونے کے سبب 60 کی دہائی کے آخری سالوں میں کانگریس پارٹی یقینی طور پر منجمد اور داخلی کشیدگی کی حالت میں پہنچ گئی۔ 1967 کے لوک سبھا الیکشن میں اس کے خراب مظاہرہ سے خطرہ کی گھنٹی بج چکی تھی کہ ہندوستان کے عوام اس کے مظاہرہ سے غیر مطمئن تھے اور ایک متبادل کی تلاش میں تھے۔ اس چنوتی کا ردّعمل کانگریس قیادت نے نہ تو مکمل طور پر جمہوری اصولوں کے نفاذ اور نہ ہی ملک کے طویل مدتی مفادات کے مطابق ظاہر کیا۔ اس کے لئے دونوں دھڑے ذمہ دار تھے۔

'سنڈیکیٹ' گروپ کے لیڈر کا قصور اتنا تھا کہ وہ اندرا گاندھی کو ہندوستان کا وزیراعظم منتخب کرنے کے بعد ان کے اثر کو کم کرنے میں مصروف تھے۔ وہ اس بات کو نہیں سمجھ سکے کہ کانگریس کی سماجی بنیاد کمزور ہوگئی ہے۔ ملک کی ترقی میں عام آدمی کی حصہ داری پر بڑھ رہی امیدوں کو اب یہ پارٹی پورا نہیں کر پا رہی تھی۔ سست رفتاری سے اقتصادی ترقی سے نہ تو خوش حالی اور نہ ہی روزگار فراہم ہو رہا تھا۔ کیمونسٹ تحریک کے گرم دل، جن کا اس وقت دنیا کے مختلف حصوں میں کافی اثر تھا، نے کانگریس پارٹی پر زمینداروں اور پونجی پتیوں کا محافظ ہونے کا الزام لگایا تھا۔

اپنے تمام مخالفین سے زیادہ ہوشیار اندرا گاندھی اس بات کو جانتی تھیں۔ وہ ہندوستان اور دنیا کے ممالک کو اچھی طرح سے سمجھتی تھیں۔ ایک جانب لیفٹ پارٹی اور گرم لیفٹ حامیوں کے عوام پر اثرات کو ختم کرنے کے لئے 'سوشلسٹ' کا پتہ پھینکتی تھیں تو دوسری جانب کانگریس پارٹی میں اپنے مخالفین کو 'رائکسٹ ریکشنری' کہہ کر مذمت کرتی تھیں۔ ساتھ ہی ان کے 'غریبی ہٹاؤ' تدبیر کی بعد میں کیے گئے تجزیہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کسی متفکرانہ نظریہ پر منحصر نہیں تھے بلکہ وہ پارٹی کے اندر مخالفین کو ختم کرنے اور تنظیم و ملک دونوں پر اپنی بالادستی قائم کرنے کے لئے ان کی پالیسی کے ہتھیار تھے۔ لائسنس، پرمٹ، کوٹہ راج کو سخت بنانے جیسے ان کے کچھ فیصلوں کا معاشی نظام پر اس کے برخلاف اثر پڑا۔ معاشی نظام میں تیزی لانے اور غریبی ہٹانے کے بدلے حقیقت میں ان باتوں کے برخلاف اثر پڑا۔ ترقی کی رفتار دھیمی ہوگئی۔ معاشی نظام میں روزگار کے مواقع کم ہوگئے، بدعنوانی میں اضافہ ہوگیا، لال فیتہ شاہی کو تقویت ملی اور اس نے ہندوستانی عوام کی صنعتی لہر کو کمزور کردیا۔ اندرا گاندھی کی سیاست سے متاثر فرضی سماجی معاشی پالیسیوں کے منفی اثرات کو ختم کرنے کے لئے 1990 کے بعد کے دور میں نرسمہا راؤ اور واجپئی حکومت کو معاشی اصلاحات کی ضرورت محسوس ہوئی۔

اندرا گاندھی کا اس سے بڑا جرم وہ تھا جو انھوں نے اپنی پارٹی کے اندر کے مخالفین کو نیچا دکھانے کے لئے کیا۔ درحقیقت انھوں نے 1975 میں ملک میں جمہوریت کو کچلنے کے لئے جو کیا وہ اس کی پہلی جھلک تھی۔ پارٹی اور ملک کے سامنے موجود چیلنجوں سے پارٹی کے کارکنان کو آگاہ کرانے اور متحد ہوکر اس کا حل نکالنے کے بجائے انھوں نے اپنے مفاد کو پارٹی سے بالاتر رکھا۔ جمہوری اصولوں اور اپنی پارٹی میں اتحاد کی

قیمت پر اس وقت کے حالات کا استعمال انھوں نے ملک پر اپنی بالا دستی قائم کرنے کے لئے کیا۔

جمہوری طریقہ سے تبادلہ خیال کرنے اور فیصلہ لینے کے کام کو نظر انداز کرنا خود نہرو جی کے دور میں ہی شروع ہو گیا تھا۔ وہ اکثر پارٹی کے فیصلوں پر نکتہ چینی کرتے تھے۔ ایک مرتبہ 1951 میں تو انھوں نے پرشوتم داس ٹنڈن کے کانگریس صدر منتخب ہونے کے خلاف کانگریس ورکنگ کمیٹی سے استعفیٰ بھی دے دیا تھا۔ نہرو نے ہی اپنی بیٹی کو سوچ سمجھ کر اپنے جانشیں کے طور پر تیار کر کے کنبہ پروری کا بیج بویا تھا۔

'حکومت کرنے کے لئے پیدا لینے کی روایت' راج شاہی میں ایک خصوصیت ہو سکتی ہے، لیکن جمہوریت میں نہیں۔ کانگریس کی تقسیم سے قبل اور بعد کے تمام فیصلوں میں اندرا گاندھی کی یہی دلچسپی تھی۔ انھوں نے اپنے مخالفین پر جیت حاصل کی، لیکن اس عمل میں کانگریس پارٹی کے اندر جمہوریت کا گلا گھونٹ دیا۔ اس کے بعد پارٹی میں مخالفین کا خیر مقدم نہیں کیا گیا اور پارٹی کے سینئر لیڈر کے خلاف کسی شخص کا چیلنج قبول نہیں کیا گیا، سوائے اس کے جو اس کے لئے بھاری قیمت ادا کرنے کے لئے تیار تھے۔

1971 کے پارلیمانی انتخاب میں کانگریس (آئی) کو بھاری اکثریت ملی، حالانکہ پارٹی کی جیت کے سلسلہ میں کسی کو کوئی شک نہیں تھا، لیکن جتنے فرق سے اسے کامیابی ملی وہ واضح طور پر کئی مقامات پر بوتھ لوٹنے سمیت انتخابی بدعنوانی کی وجہ سے ہی۔ اس سے قبل کبھی بھی برسراقتدار پارٹی کے امیدواروں کو فتح یاب کرنے کے لئے سرکاری مشینری اور وسائل کا اتنا زیادہ ناجائز استعمال نہیں کیا گیا تھا۔

جن سنگھ کو اس بات کا شدید اندیشہ تھا کہ اندرا گاندھی کو پارلیمنٹ میں دو تہائی اکثریت ملنے سے ملک اور اس کے جمہوری اداروں پر کیا اثر ہوگا۔ الیکشن کے فوراً بعد مارچ 1971 میں پارٹی کی قومی ورکنگ کمیٹی میں ایک تجویز پیش کی گئی، جس میں ملک کو آگاہ کیا گیا—

> ''اس بات کا خطرہ ہے کہ اندرا گاندھی کی پارٹی کو مکمل اکثریت ملنے سے کانگریس پارٹی جمہوری عمل اور پیمانوں کو پہلے سے زیادہ نظر انداز کرے گی۔ الیکشن کے بعد وزیر اعظم کے سپریم کورٹ کے سلسلہ میں دیئے گئے پہلے بیان سے عوام کا اندیشہ صحیح ثابت ہو گیا ہے کہ برسراقتدار حکومت عدلیہ کے آزاد وجود کو کمزور کرنا چاہتی ہے۔ پارلیمنٹ کے اندر اور باہر کے تمام جمہوریت پسندوں کو ان عادتوں کے تئیں محتاط رہنا چاہئے اور ایسی تمام کوششوں کی مخالفت کرنی چاہئے۔''

یہ وارننگ جلد ہی سچ ہونے جا رہی تھی۔

راجیہ سبھا میں میرا داخلہ

جہاں قومی زندگی میں ایسے یادگار حادثے وقوع پذیر ہو رہے تھے وہیں میری ذاتی زندگی میں ایک اہم تبدیلی رونما ہونے جا رہی تھی۔ میں اپریل 1970 میں دہلی میٹرو پولیٹن کونسل کے چیئرمین کے دفتر سے نکل کر ہندوستان کی پارلیمنٹ میں داخل ہوا۔ فیڈرل ریاستی خطہ دہلی سے راجیہ سبھا کے رکن مسٹر اندر کمار گجرال کا دور مکمل ہونے سے راجیہ سبھا میں ایک جگہ خالی ہوئی تھی۔ پارٹی نے مجھے امیدوار کے طور پر میدان میں اتارا اور کونسل میں جن سنگھ کی اکثریت ہونے کے سبب میں الیکشن میں کامیاب رہا۔

مجھے یاد ہے کہ راجیہ سبھا میں شروع میں میں نے جو تقریر کی تھی، دراصل ان موضوعات کو میں گزشتہ چار دہائیوں کے دوران اٹھاتا رہا۔ یہ موضوعات تھے، ملک کے اتحاد اور سالمیت کا استحکام، جمہوری اداروں کی حفاظت کو مزید مؤثر بنایا جانا، برسراقتدار پارٹی کی جانب سے حزب اختلاف کی عزت افزائی کی اہمیت اور مرکز - ریاست کے تعلقات کو مستحکم اور پرکیف بنانا۔ میں نے جو ایک مخصوص مطالبہ کیا تھا، وہ یہ تھا کہ مرکز

اور ریاستوں کے مابین تنازعات کو سلجھانے کے لئے بین ریاستی کونسل کی تشکیل کی جانی چاہئے۔ آئین کی شق 263 صدر جمہوریہ کو بین ریاستی کونسل کی تشکیل کا حق فراہم کرتا ہے، جو فیڈرل ریلیشن اور اخوت کو بڑھانے میں تعاون دینے کے ساتھ ساتھ شق 263 کو نافذ کرنے کے حق میں ہمیشہ سے رہا۔ ہمارے نظریہ کی تصدیق تب ہوئی جب مرکز۔ ریاست تعلقات پر تشکیل کردہ سرکاریہ کمیشن نے اس کی پرزور حمایت کی۔ بالآخر 1990 میں اس کونسل کی تشکیل ہوئی۔

افسوسناک بات ہے کہ اس کے فوراً بعد ہی بین ریاستی کونسل غیر موثر ہوگئی۔ 1996 تک اس نے ایک بھی میٹنگ منعقد نہیں کی تھی۔ مجھے خوشی ہے کہ اٹل جی کی حکومت میں وزیر داخلہ کے طور پر میں نے اسے پھر جلا بخشی اور ہر سال اس کی میٹنگ طلب کی۔ اس کونسل نے دوررس اہمیت کے حامل کئی فیصلے لئے۔

انتخابی اصلاحات کے لئے مہم

60 کی دہائی کے وسط سے انتخابی اصلاحات میرا پسندیدہ موضوع رہا ہے۔ ملک کے دیگر جمہوریت پسند سیاسی کارکنان کی طرح میں بھی ہندوستانی انتخابی سسٹم کو کمزور بنانے والی دو اہم خامیوں کے تئیں فکرمند تھا۔ دل بدل اور پیسہ کی طاقت کا بڑھتا اثر۔ 1967 میں دہلی میٹروپولیٹن کونسل کا چیئرمین بننے پر اپنی تقریر میں میں نے کہا تھا 'دل بدل ہندوستان کی سیاسی زندگی کو آلودہ کر رہا ہے، اس لئے دل بدل پر پابندی لگائی جانی چاہئے۔' برسر اقتدار پارٹی کے ذریعہ اپنی خواہش کے مطابق دل بدل کو انجام دیئے جانے کے سبب سیاسی مباحثہ میں 'آیارام، گیارام' محاورہ کا جم کر استعمال ہوتا تھا۔ راجیہ سبھا میں شرکت کے بعد میں نے انتخابی اصلاحات پر گہرائی سے ریسرچ شروع کی اور 1970 میں لوک سبھا میں اس ایشو کو اٹھائے جانے میں اٹل جی کو تعاون دیا تھا۔

دل بدل کے علاوہ ہندوستان کے انتخابی سسٹم کو آلودہ کرنے والا دوسرا مسئلہ تھا، پیسہ کی طاقت کا وافر اور بدعنوانیت سے بھرپور اثر، جس کی ہم لوگوں نے پہچان کی۔ 1952 کے پہلے لوک سبھا الیکشن کے مقابلہ میں پارلیمانی اور اسمبلی الیکشن لڑنے کے اخراجات میں کافی اضافہ ہوگیا۔ مقررہ لاگت اور اصل خرچ کے درمیان کا فرق بڑھتا ہی جارہا تھا۔ اس نے اٹل جی کو لوک سبھا میں اپنے تقریر کے دوران یہ کہنے کے لئے مجبور کیا 'افسوسناک پہلو یہ ہے کہ تمام ممبران پارلیمنٹ اپنی پارلیمانی زندگی کی شروعات انتخاب میں ہوئے خرچ کے سلسلہ میں بالکل جھوٹا بیان دے کر کرتے ہیں۔' اس طرح انھوں نے نہ صرف خرچیلے انتخابات میں ہونے والی مالی بدعنوانی کی جانب ملک کا دھیان متوجہ کیا، بلکہ منتخب نمائندوں کے ذریعہ انتخابی خرچ کے سلسلہ میں جھوٹا اعلان نامہ پیش کرنے جیسے غیر اخلاقی کام کی جانب بھی اشارہ کیا تھا۔

اٹل جی نے انتخابی اصلاحات پر گہرے ریسرچ کے لئے مشترکہ پارلیمانی کمیٹی کی تشکیل کا مطالبہ کیا۔ اس مطالبہ کی دیگر اپوزیشن پارٹیوں نے حمایت کی، لہٰذا حکومت کو مجبوراً 1970 میں انتخابی اصلاحات پر پہلی مشترکہ پارلیمانی کمیٹی تشکیل کرنی پڑی۔ لوک سبھا سے اٹل جی اور راجیہ سبھا سے مجھے اس کمیٹی میں نامزد کیا گیا، حالانکہ 1971 میں لوک سبھا تحلیل کئے جانے سے یہ کمیٹی بھی تحلیل ہوگئی۔

1971 میں لوک سبھا الیکشن کے بعد ہم نے اس مطالبہ کو پھر سے اٹھایا اور ایک نئی مشترکہ پارلیمانی کمیٹی کی تشکیل ہوئی۔ اس مرتبہ بھی ہم دونوں اس کمیٹی کے ممبر تھے۔ بحث کے دوران رائے دہندہ کی عمر 21 برس سے گھٹا کر 18 برس کئے جانے جیسی ہماری کئی تجاویز کو منظور کیا گیا۔ اس سلسلہ میں بہت بعد میں بل بھی لایا گیا۔ ہم نے مطالبہ کیا تھا کہ سیاسی پارٹیوں کے انتخابی خرچ کو منظر عام پر لایا جائے گا، حالانکہ اس سلسلہ

میں برسراقتدار پارٹی سخت معترض تھی۔ ہمارے پرزور مطالبہ کے مدنظر مشترکہ پارلیمانی کمیٹی نے اپنی آخری رپورٹ میں مندرجہ ذیل رپورٹ پیش کی:

''عام طور سے یہ مانا جاتا ہے کہ انتخابی خرچ کی مقررہ حد کا شاید ہی کبھی نفاذ کیا جاتا ہے اور امیدوار کے ذریعہ خرچ کئے گئے حقیقی خرچ مقررہ حد سے تجاوز کرجاتے ہیں۔ امیدوار کے ذریعہ خرچ کی گئی موٹی رقم کے سلسلہ میں سچائی تو کم وبیش قابل قبول ہے۔ کسی امیدوار کے ذریعہ ان التزامات کا کامیابی کے ساتھ اور بے روک ٹوک خلاف ورزی کئے جانے کو روکنے کے لئے بنائے گئے قانون کا بلاشبہ فقدان ہے۔ حالانکہ کمیٹی کا ماننا ہے کہ انتخابی اخراجات کے مسئلے، جس نے نہ صرف امیدواروں کے دل اور سیاسی سمجھ کو بے اصول بنادیا ہے بلکہ عام لوگوں کو بھی، کا حل صرف اصولی طور سے یہ اعتراف کرنے سے ہوسکتا ہے کہ انتخاب کا خرچ اجتماعی خزانہ سے ہو اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے کوشش کی جائے۔ کمیٹی یہ محسوس کرتی ہے کہ موجودہ صورت حال میں جو قابل فہم اخراجات امیدوار اور پارٹی اٹھارہی ہیں، اسے آہستہ آہستہ ریاست کو اٹھانا چاہئے۔''

اٹل جی اور میں اس غیرواضح اور عام رپورٹ سے مطمئن نہیں تھے، اس لئے ہم نے اس رپورٹ پر نااتفاقی کا اظہار اس بیان کے ساتھ کیا:

''آج جیسے حالات ہیں اس میں خرچ کا تعین ایک مذاق بن گیا ہے۔ بیشتر ممبر پارلیمنٹ سراسر جھوٹ کی بنیاد پر اپنی پارلیمانی زندگی کی شروعات کرتے ہیں۔ انتخابی خرچ کے سلسلہ میں جھوٹا بیان پیش کرتے ہیں۔ ان تشویشناک حقائق سے عموماً کمیٹی اتفاق رکھتی ہے، لیکن اسے خوف ہے کہ انتخابی خرچ کے تعین کو ہٹادینے سے سیاست میں وافر خرچ کی برائی اور پیسہ کی طاقت کے ناجائز استعمال میں اضافہ ہوجائے گا۔ اس ڈر کے پس پشت کوئی وجہ نہیں ہے، لیکن یہ انتخاب میں زیادہ خرچ پر لگام کسنے کے لئے سخت تدابیر کی عمل آوری میں اس کی ناکامی کو ظاہر کرتا ہے، یعنی حسب حال صورت قائم رکھنا، جو کہ بلاشبہ غلط ہے۔ کمیٹی نے اسے قبول کرکے اصولاً اچھا کام کیا ہے کہ تمام اخراجات کے معقول انتخابی خرچ کی ذمہ داری سرکاری خزانہ سے ہو اور حال میں جو معقول خرچ امیدوار اور سیاسی پارٹیوں کے ذریعہ کی جاتی رہی ہے اس کی ذمہ داری آہستہ آہستہ ریاست پر ڈالنی چاہئے، لیکن اس تبدیل نما اصول کو نافذ کرنے کے لئے جو تدابیر سامنے آئی ہیں، وہ کمزور اور متزلزل ہیں۔ انتخاب میں دولت کے زور کا برا اثر بڑے پیمانے پر ہو رہا ہے۔ اس مرض کے علاج کے لئے سخت اقدام کی ضرورت ہے۔ نیم رضامندی سے کیے گئے اقدام مثبت نہیں ہوں گے۔ اس سلسلہ میں ہم اس تجویز پر غور کرتے ہیں کہ گزشتہ انتخاب میں رجسٹریشن کی بنیاد پر منظور شدہ پارٹیوں کو قبل از انتخاب انتخابی گرانٹس کا ایک حصہ دیا جائے اور الیکشن کے بعد باقی رقم دے دی جائے، اس پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہئے۔''

پارلیمنٹ کے باہر بھی انتخابی اصلاح کو قومی سطح پر بحث کا ایشو بنائے جانے کے سلسلہ میں جن سنگھ کی کوشش کے تحت میں نے سرگرمی سے حصہ لیا۔ 1972 میں ہماری پارٹی ایسی پہلی سیاسی پارٹی تھی، جس نے یہ تجویز پیش کی کہ منظور شدہ سیاسی پارٹیوں کا انتخابی خرچ ریاست اپنے سر لے۔ اسی تجویز میں پارٹی نے اشارے دیئے۔

''دراصل حالیہ انتخابی سسٹم کے جائزہ کی اشد ضرورت ہے۔ اس سسٹم کے تحت پارٹی کے ذریعہ اسمبلی میں حاصل کی گئی سیٹوں اور اس کے عوامی رابطہ کے درمیان کوئی عام تعلق نہیں ہے۔ اسی لئے پارٹی کے نظریہ سے اوپر اٹھ کر تمام جمہوریت پسندوں کو اس سوال پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہئے اور عوامی خواہشات کی سچے معنوں میں عکاسی کرنے والے انتخابی سسٹم بنانے کے لئے پیش رفت کرنا چاہئے۔''

میری سیاسی زندگی کی ایک مایوس کن سچائی یہ ہے کہ ہمارا سیاسی سسٹم ہمارے جمہوری میکانزم کو فعال بنانے والی بہت سی خامیوں کو دور کرنے کے لئے نئی طرح کے بہتر انتخابی اصلاح کو نافذ کرنے میں ناکام رہا ہے۔ میں نے جس مشترکہ پارلیمانی کمیٹی کا ذکر کیا ہے، اس کے علاوہ کئی کمیٹیوں نے بعد میں بھی اس سوال پر غور وخوض کیا ہے اور اس سلسلہ میں اہم مشورے دیئے ہیں۔ ان میں اہم ہیں: تارکنڈے کمیٹی (1974)، دنیش گوسوامی کمیٹی (1990)، وی آر کرشنن ایئر کمیٹی (1994) اور اندرجیت گپتا کمیٹی (1998)۔ پندرہویں لاء کمیشن نے بھی عوامی رہنمائی ایکٹ 1951 کا مفصل مطالعہ کیا ہے اور اس سلسلہ میں اہم مشورے دیئے۔ قومی جمہوری اتحاد حکومت نے بھی انتخابی اصلاحات پروگرام کو مثبت کوششوں کے ساتھ آگے بڑھایا، حالانکہ میں دعویٰ نہیں کرسکتا کہ ہم کوئی بہت زیادہ تبدیلی لاسکے★

1971: پاکستان کے ساتھ دوسری جنگ اور بنگلہ دیش کا جنم

جنوبی ایشیا کی تاریخ میں 70 کی دہائی کی شروعات ایک یادگار واقعہ سے ہوئی۔ جس واقعہ کی شروعات پاکستان میں انتخابی تنازع سے ہوئی، اس کا خاتمہ اس ملک کی تقسیم کے بعد ہی ہوسکا۔ بنگلہ دیش کی تشکیل سے پچیس سال میں دوسری مرتبہ برصغیر کا نقشہ بدلا۔ اس ملک کا جنم مکتی سنگرام کے توسط سے ہوا، جس میں ہندوستان کو نہ چاہتے ہوئے بھی شامل ہونا پڑا۔

مجھے ضرور اعتراف کرنا چاہئے کہ 1947 میں تقسیم کے بعد اس برصغیر کا نقشہ بدلا اور اس کا حصہ ہونے کے سبب جب دسمبر 1971 میں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جنگ ہوئی اور بنگلہ دیش ایک علیحدہ ملک کے طور پر نمودار ہوا، اس میں میں نے خصوصی دلچسپی لی۔ جب یہ جنگ ختم ہوگئی تب میں نے کارل مارکس کا ایک مشہور مقولہ بیان کرکے آگاہ کیا 'تاریخ خود کو دہراتی ہے، پہلی مرتبہ کسی افسوسناک واقعہ کی شکل میں اور دوسری مرتبہ کسی مضحکہ خیزی کی صورت میں۔' حالانکہ کسی بھی صورت میں بنگلہ دیش کا جنم ایک مضحکہ خیز واقعہ نہیں مانا جاسکتا ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ مارکس کے مقولہ کو اس طرح ترمیم دی جاسکتی ہے۔ 'تاریخ خود کو دہراتی ہے، پہلی مرتبہ کسی افسوسناک واقعہ کی شکل میں اور دوسری مرتبہ ایک سزا کی صورت میں۔'

1947 میں پاکستان کی تشکیل ایک تاریخی جھوٹ سے متاثر ہوکر جارحانہ اور نفرت آمیز تحریک کے نتیجہ میں ہوئی تھی۔ تاریخی جھوٹ یہ تھا کہ غیر منقسم ہندوستان میں ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قوم تھے اور اس لئے مسلمانوں کو علیحدہ ملک چاہئے۔ اس تاریخی جھوٹ کا لبادہ اوڑھنے کے علاوہ پاکستان ایک جغرافیائی استعجاب کا بھی سنگم تھا۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان 1200 میل کی دوری تھی اور اس کے درمیان ہندوستان موجود تھا۔ عالمی تاریخ میں کسی بھی قوم کی ایسی مثال نہیں ہے، سوائے کچھ نوآبادیاتی طاقتوں کے جو دو حصوں میں تقسیم ہوں اور ایک دوسرے سے اتنی دور واقع ہوں۔

جولائی 1971 میں اودے پور کے قومی اجلاس میں جن سنگھ نے ایک تجویز پیش کی، وہ نظریہ جو مانتی تھی کہ ڈھاکہ خود کو اسلام آباد کے زیادہ نزدیک محسوس کرے گا اور مشرقی بنگال کے شہری مغربی پنجاب کے شہریوں کو خود سے زیادہ نزدیک محسوس کریں گے، بجائے اپنے پڑوسی

★ بی جے پی صدر کے طور پر میں نے 1997 میں 'تاحیات ڈونیشن منصوبہ' نامی ایک پہل کی شروعات کی، جس کے تحت ان لوگوں کے چھوٹے مگر معمولی (سالانہ) امداد کو جمع کیا جاتا تھا، جو زندگی بھر کے لئے پارٹی سے منسلک ہونا چاہتے ہیں۔ اس کا مقصد پارٹی کی سرگرمیوں کے لئے بذات خود مالی التزام کی اہلیت کو فروغ دینا ہے۔

غیر مسلم بنگالی کے۔ اتنا ہی دلیل سے انحراف، غیر سائنسی اور غیر معقول ہے جتنا کہ یہ مضحکہ خیز ہے۔

اگر پاکستان کی تشکیل تاریخ اور جغرافیہ دونوں کی ہتک تھی تو جس من مانے ڈھنگ سے مغربی پاکستان کی کارگزار حکومتوں نے مشرقی پاکستان کے عوام کی منصفانہ امیدوں کو نظر انداز کیا اور ان کی بے عزتی کی، وہ بھی مساوی قومیت کے تصور کی بے عزتی تھی۔ اس کا آخری منظر تب سامنے آیا، جب جنرل یحییٰ خان کی فوجی تاناشاہی نے مشرقی پاکستان کے مجیب الرحمٰن کو حکومت بنانے سے منع کر دیا، باوجود اس کے شیخ کی پارٹی عوامی لیگ نے دسمبر 1970 کے نیشنل اسمبلی الیکشن میں مغربی پاکستان کے ذوالفقار علی بھٹو کی پاکستان پیوپلس پارٹی سے زیادہ سیٹوں پر جیت درج کی تھی۔ تشویشناک صورت حال تب پیدا ہوئی جب فوجی حکمراں نے مجیب الرحمٰن کو قیدی بنالیا اور مشرقی پاکستان میں جمہوری مظاہرے کا پرتشدد خاتمہ شروع کیا۔ اس بربریت نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ اپنے ہی نواحی مشرقی خطہ پر نوآبادیاتی طاقت جیسا سلوک کر رہا ہے۔ اس دوران گھروں کو نذر آتش کیا گیا۔ کنوؤں میں زہر ملا دیا گیا اور محلوں کو جلا کر تباہ کر دیا گیا۔ جنگی جرائم کے مرحلہ میں دل دہلا دینے والی تعداد میں خواتین کے ساتھ زنا بالجبر کا سفاکانہ عمل ہوا۔

مشرقی پاکستان میں فوجی مہم شروع کرتے وقت یحییٰ خان نے اپنے اعلیٰ افسروں کو کہا '40-30 لاکھ لوگوں کو جان سے مار دو، باقی اپنے آپ راہ پر آجائیں گے۔' ان کی ہدایت پر عمل کیا گیا۔ اس قتل عام میں 30 لاکھ لوگوں کی جانیں تلف ہوئیں۔ جبر واستبداد کے ان شیطانوں نے جس بات کو نہیں سمجھا، وہ یہ تھی کہ جس دوقومی نظریہ پر پاکستان کی تشکیل ہوئی تھی، اس کی بھی انھوں نے قربانی دی۔ بنگلہ دیش کی تشکیل پاکستانی حکمرانوں کی ضد اور غیر انسانی سلوک کی وجہ سے ہوئی۔

پاکستانی فوجیوں کے ظلم سے بے حال ہو کر 1971 تک تقریباً 1.5 کروڑ بنگلہ دیشیوں نے ہندوستان میں پناہ لی تھی۔ تقریباً ایک لاکھ بہادروں، جس میں بیشتر غیر فوجی تھے، سے تشکیل کردہ مکتی واہنی پاکستانی فوج کے خلاف جنگ لڑ رہی تھی۔ فوجی نظریہ سے کمزور ہوتے ہوئے بھی مکتی واہنی کی خود اعتمادی عروج پر تھی اور دنیا بھر کے، خصوصاً انھیں ہندوستان کے آزادی نوازوں کی بھرپور حمایت حاصل تھی۔ اس میں وزیر اعظم اندرا گاندھی نے دنیا کے اہم ممالک کے لیڈروں کو صحیح سمت میں سمجھانے اور پڑوسی ملک پر آئے تشویشناک انسانی بحران کا ہندوستان پر پڑنے والے براہ راست اثر کو سمجھنے کی بھرپور کوشش کی۔ افسوسناک بات یہ تھی کہ امریکہ کی نکسن حکومت نے اس صورت حال کو سرد جنگ کے نظریہ سے دیکھا اور پاکستان کو اپنی سیاسی اور فوجی حمایت جاری رکھی۔ اس نے بحر ہند میں اپنے ساتویں بیڑے کو ہندوستان کو خوف زدہ کرنے کے لئے خلیج بنگال میں داخل ہونے کی ہدایت دی۔ اس وقت میں نے پاکستان کو فوجی مدد دیئے جانے کے خلاف چانکیہ پوری، نئی دہلی میں واقع امریکی سفارت خانہ کے سامنے پارٹی کارکنان کے مظاہرہ کی قیادت کی۔

قومی آزادی کے لئے چھڑی جنگ میں بنگلہ دیش کے بھائی بہنوں کو دی جانے والی ہندوستانی عوامی حمایت میں جن سنگھ سب سے آگے تھا۔ اٹل جی نے اس دوران کئی دانشورانہ تقاریر کی جو ہندوستانی پارلیمنٹ میں ابھی تک کی سب سے پراثر تقاریر میں شامل ہیں۔

1971 کے ان تمام واقعات کے پیچھے ہندوستان کے خلاف پاکستان کے ذریعہ ایک اور نئی جنگ چھیڑنے کی آرزو پنہاں تھی اور 3 ردسمبر کو شروع ہوئی اس جنگ کا نتیجہ پاکستان کی شکست اور بنگلہ دیش کی آزادی کے ساتھ ہوا۔ اعلیٰ سطحی فوجی منصوبہ اور اس کی عملی کارگزاریوں کی عظیم نمائش سے ہندوستانی فوج نے ڈھاکہ کو صرف 10 دنوں میں گھیر لیا اور تقریباً 93 ہزار پاکستانی فوجیوں کو جنگی قیدی بنالیا۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد یہ سب سے بڑی فوجی خودسپردگی تھی۔ 16 ردسمبر کو پاکستان نے اپنی شکست قبول کی اور غیر مشروط خودسپردگی کر دی۔

1971 کے جنگ میں فتح یابی ہندوستانی فورس کی تاریخ میں ایک لائق تحسین واقعہ ہے۔ پوری قوم فتح کے جشن میں جھوم اٹھی۔ بلاشبہ اس جنگ کے دو بڑے ہیرو جنرل سیم مانک شا اور لیفٹیننٹ جنرل جے ایس اروڑہ تھے، جن کے سامنے پاکستانی لیفٹیننٹ اے اے کے نیازی نے خود سپردگی کے کاغذات پر دستخط کیے، لیکن اس جنگ میں ایک تیسرے ہیرو بھی تھے — لیفٹیننٹ جنرل اروڑہ کے چیف آف اسٹاف میجر جنرل جے ایف آر جیکب، جو بعد میں بی جے پی میں شامل ہوئے اور گوا اور پنجاب کے گورنر کے طور پر بہت ہی بہترین خدمات انجام دیں۔

جنگ ختم ہونے کے بعد ایک پرعزم اور بہادرانہ قیادت کے لئے اندرا گاندھی کی کافی ستائش ہوئی، چونکہ جن سنگھ یعنی ہم لوگ قومی مسئلہ کو، خصوصاً قومی سلامتی سے متعلق ایشوز کو، محدود سیاسی نظریہ سے نہ دیکھنے کے لئے تربیت یافتہ تھے، اس لئے ہم لوگوں نے 1971 کی اس مدت میں حکومت کی کھل کر حمایت کی۔ قومی فخر کے اس لمحہ میں ہماری پارٹی اندرا گاندھی کی تعریف کرنے میں پیچھے نہیں رہی۔ پارلیمنٹ کے سینٹرل ہال میں پارلیمنٹ کے خصوصی اجلاس میں اٹل جی نے فراخ دلی کے ساتھ اندرا گاندھی کی تعریف کی۔

اب بھی بہت سے لوگ مانتے ہیں کہ 1971 کی جنگ میں کامیاب قیادت کرنے کے بعد اٹل جی نے اندرا گاندھی کی 'درگا' سے تشبیہ دی تھی، حالانکہ جہاں تک مجھے یاد ہے، انھوں نے کبھی ایسا نہیں کہا تھا۔ یہ ضرور ہوا تھا کہ جنگ شروع ہونے کے کچھ ماہ قبل 1971 میں جن سنگھ کا قومی اجلاس غازی آباد میں منعقد ہوا۔ مشرقی بنگال پر پاکستان کے جبر سے پورے ملک کے لوگ ناراض تھے۔ اس میٹنگ میں ورکنگ کمیٹی کے صدر اور وزیراعظم کے بہت بڑے خیر خواہ وی جی دیش پانڈے نے اپنی تقریر میں کہا 'اندرا جی، ملک کی قیادت بہادری کے ساتھ کریں، ہم تمام لوگ آپ کے ساتھ ہیں۔ اگر آپ بنگلہ دیش کو آزاد کرانے میں معاون ہوتی ہیں تو آنے والی نسلیں آپ کو 'درگا' کے طور پر یاد رکھیں گی۔

شملہ معاہدہ اور 1971 کی جنگ کا درس

پاکستان کے ساتھ اس سے قبل 1948 اور 1965 میں ہندوستان کو جو جنگیں کرنی پڑی تھیں، بدقسمتی سے ایک رسم و روایت کی شروعات ہوئی۔ میدان جنگ میں ہمارے جوانوں کے ذریعہ کی گئی حصولیابی کو ہمارے سیاسی حکمراں کچیلی ڈپلومیسی کے سبب گنوا دیتے تھے۔ 1948 میں جب تقریباً طے ہو گیا تھا کہ ہندوستانی فوج پوری طرح سے پاکستان حامی قبائلی دراندازوں کو بری طرح مات دے کر پاکستان مقبوضہ جموں و کشمیر خطہ کو آزاد کرالے گی، تب نہرو جی نے معلوم نہیں کیوں کشمیر معاملہ کو اقوام متحدہ میں لے جانے کا فیصلہ لے لیا۔ اسی طرح 1965 کی جنگ میں جیسا کہ پہلے کے باب میں، میں نے ذکر کیا کہ پاکستان مقبوضہ کشمیر کے حاجی پیر اور ٹھتھوا کو اپنے قبضہ میں لے کر ہندوستانی فوج نے جو حصولیابی کی تھی، اسے تاشقند معاہدہ میں گنوا دیا گیا۔ قابل افسوس ہے کہ بنگلہ دیش مکتی سنگرام میں ہندوستان کی فیصلہ کن جیت کے بعد بھی یہی روایت قائم رہی۔

جولائی 1972 میں اندرا گاندھی اور ذوالفقار علی بھٹو (جو یحییٰ خان کے ہٹنے کے بعد پاکستان کے وزیراعظم منتخب ہوئے تھے) چوٹی کانفرنس کے لئے شملہ میں جمع ہوئے۔ مارچ 1972 میں ہماری پارٹی کی ورکنگ کمیٹی کے ذریعہ ایک تجویز پیش کی گئی:

> ''پاکستان کے ساتھ چودہ دن کی جنگ کے خاتمہ کے بعد سے ہی، یہ جانے بغیر کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان امن معاہدہ ہوگا یا نہیں، ہندوستان پر دباؤ ڈالا جارہا ہے کہ پاکستانی جنگی قیدیوں کو رہا کیا جائے اور پاکستانی خطہ سے ہندوستانی فوج کو واپس بلایا جائے۔ 1948 کی جنگ بندی کی طرح ہندوستانی فوجیوں کو واپس بلانے کی کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کی تجویز کو سوویت یونین کے نظریہ کے

مظاہرہ کے طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ پاکستان کے مطابق مسائل کا ٹکڑوں میں حل غلط، غیر مدلل اور ہندوستان کے بہتر مفاد کے برخلاف ہوگا۔ ہندوستانی فوجیوں کی واپسی کا کوئی سوال تب تک نہیں آنا چاہئے جب تک سبھی زیر التوا معاملوں کا نمٹارہ نہ کرلیا جائے اور ہندوستان و پاکستان کے درمیان مستقل امن کے لئے معقول انتظام نہیں کرلیا جاتا۔"

پارٹی صدر کے طور پر اٹل جی نے وزیر اعظم اندرا گاندھی سے شملہ میں ملاقات کی اور ان سے جنگی قیدیوں کو تب تک واپس نہ بھیجنے اور ہندوستانی فوجیوں کو تب تک واپس نہ بلانے کی اپیل کی جب تک پاکستان کے ساتھ مسئلہ کشمیر کا مستقل حل نہیں ہو جاتا۔ افسوس کہ شملہ معاہدہ بھی ایک اور وشواش گھات ثابت ہوا۔ حکومت ہند تمام پاکستانی جنگی قیدیوں کو واپس کرنے، ہندوستانی فوج کے قبضہ والے 9000 مربع کلومیٹر علاقہ کو واپس کرنے اور تمام جنگی مجرموں (جن پر بنگلہ دیش مقدمہ چلانے کا مطالبہ کر رہا تھا) کو چھوڑنے پر رضامند ہوگئی۔ اس کے بدلے میں پاکستان نے بہت حقیر اور عریاں وعدہ کیا، جسے کبھی بھی توڑا جاسکتا تھا—اور بغیر کسی بھاری نقصان کے اس نے ایسا کیا بھی۔

اپنی کتاب 'سرینڈر رایٹ ڈھاکہ: برتھ آف اے نیشن' میں جنرل جیکب نے دوران جنگ اندرا گاندھی کی ستائش کی، لیکن اظہار افسوس بھی کیا کہ 'شملہ معاہدہ کے معاملہ میں وہ گمراہ ہوگئی تھیں۔ بنگلہ دیش کی دلدل زمین اور دھان کے کھیتوں میں ہم نے فیصلہ کن جنگ جیتی۔ ہم نے 93 ہزار فوجیوں کو قیدی بنایا، پھر بھی ہم شملہ معاہدہ مذاکرات میں پاکستان کے ساتھ موجودہ مسائل کا مستقل حل تلاش کرنے میں ناکام رہے۔ جنگ میں جو کامرانیاں حاصل ہوئی تھیں، اسے شملہ معاہدہ میں گنوا دیا گیا۔' جیکب لکھتے ہیں کہ 'بھٹو ہندوستان اور پاکستان کی کنٹرول لائن کو مستقل سرحد میں بدلنے کے لئے اصولی طور سے تیار ہوگئے تھے، لیکن ہندوستانی فریق اس اہم موضوع کو سرکاری شکل دینے میں ناکام رہا۔'

اس وقت نئی دہلی کے ایک اجتماعی اجلاس میں میں نے کہا 'اندرا گاندھی نے کورے لفظی جال میں پھنس کر ایک سنہری موقع گنوا دیا۔

ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ہوئی 1971 کی جنگ نے ہمیں بہت ہی اہم سبق سکھایا۔ پہلا اور نہایت اہم کہ کسی بھی حالت میں اپنے ملک کی سیکورٹی کو پوری طرح آزاد اور اہل ہونا ضروریات میں شامل ہونا چاہئے۔ میں ایسا اس لئے کہتا ہوں کہ جیسے ہی جنگ لازمی لگنے لگی، ویسے ہی ہندوستان نے خود کو ایک ایسے حالات میں پایا کہ پاکستان کے ساتھ مسائل کے مستقل حل کے لئے ہندوستان کی کوشش میں بین الاقوامی سطح پر کوئی بھی اہم ملک اس کا پکا حامی نہیں رہا۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے، امریکہ پاکستان کی حمایت کے باوجود معاملہ سے پوری طرح اپنے آپ کو انجان ظاہر کرنے لگا۔ صدر نکسن کے ذریعہ ایٹمی ہتھیار سے لیس ساتواں بیڑہ بھیجنے کے فیصلہ سے جن سنگھ کے اس مطالبہ کی تصدیق ہوئی، جس میں اس نے 1966 میں کہا تھا کہ ہندوستان کو ایٹمی اسلحہ کو فروغ دینا چاہئے۔ تب اس مطالبہ کا برسراقتدار پارٹی کے لیڈروں نے مذاق اڑایا تھا۔

ساتویں بیڑے کے تجربہ کے بعد 1974 میں پوکھرن (راجستھان کا ریگستان) میں ایٹمی تجربہ کرکے اندرا گاندھی نے جرأت مندانہ قدم اٹھایا۔ اس قدم کی جن سنگھ نے بھرپور حمایت کی۔ دونوں کمیونسٹ پارٹیوں نے، جیسا کہ اندیشہ تھا، اس کارروائی کی مخالفت کی، مئی 1998 میں واجپئی حکومت کے ذریعہ پوکھرن II کی بھی انھوں نے مخالفت کی تھی۔

میں یہاں تشکرانہ لہجہ میں 1971 کے جنگ کے دوران سوویت یونین کے ذریعہ ہندوستان کو دی گئی سفارتی اور فوجی امداد کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ پاکستان کو امریکہ کی جانب سے حمایت دینے کے براہ راست نتیجہ میں ہندوستان اور سوویت یونین کے درمیان 20 سالہ تعاون معاہدہ ہوا۔ جہاں تک یہ معاہدہ چل سکتا وہ قابل ستائش تھا، لیکن یہ قومی سلامتی کو خود کفیل بنانے کی سمت میں کوئی متبادل نہیں تھا۔ بعد کے برسوں میں

ماسکو کے کیونسٹ حکمرانوں نے ہندوستان کے داخلی معاملوں میں مداخلت کرنے کے لئے اس معاہدہ کا استعمال کیا۔ 1975 میں اندرا گاندھی کی ایمرجنسی کی حمایت کرنا، جے پرکاش نارائن کی مذمت کرنا اور جمہوریت کے لئے ان کی تحریک کو 'فاشزم' اور 'ریکشنزم' کہنا اس کی سب سے بڑی مثال ہے۔

1971 کی جنگ کا ہمارے لئے دوسرا سبق بنگلہ دیش میں ہندوؤں کی سلامتی سے متعلق تھا۔ آج شاید اس بات کو بھلا دیا گیا ہے کہ پاکستانی فوج نے خصوصی طور سے ہندوؤں کو اپنا ہدف بنایا تھا۔ ہندوستان میں پناہ لینے والے بیشتر بنگالی پناہ گزیں ہندو تھے۔ بڑے پیمانے پر ہندو خواتین کے ساتھ زنا بالجبر کیا گیا۔ پاکستانی فوج کے ذریعہ جونسل کشی کی گئی، ان میں سے بیشتر ہندو ہی متاثرین تھے، اس کی وجہ معلوم کرنی ضروری ہے۔ پاکستانی حکمراں واضح طور سے مذہبی اور ثقافتی صفائی کی پالیسی کو نافذ کرنا چاہتے تھے۔ وہ مشرقی پاکستان کی بنگلہ تہذیب کو ہندو تہذیب کے طور پر دیکھتے تھے۔ مثال کے طور پر وہ کبھی بھی اس سچائی کا اعتراف نہیں کر سکے کہ ہندوستان کے قومی شاعر رویندر ناتھ ٹیگور کی مشرقی بنگال میں نہ صرف مقبولیت ہے بلکہ وہ پوجنے کے لائق بھی ہیں۔ بنگلہ دیش نے اپنی آزادی کے بعد ٹیگور کے گیت' آمار سونار بنگلہ...'' کو قومی ترانہ قرار دیا۔ اسی طرح پاکستان کے مسلم حکمرانوں کو اس بات پر سخت اعتراض تھا کہ قاضی نظرالاسلام، جنہیں بعد میں بنگلہ دیش کے قومی شاعر کے طور پر نوازا گیا، نے درگا، رام اور کرشن جیسے ہندو دیوی دیوتاؤں کی تعریف میں گنگا، سندھو اور سرسوتی، جنہیں ہندو پاک ندیاں تسلیم کرتے ہیں، کی تعریف میں کئی نظمیں تحریر کی تھیں۔ وہ مشرقی پاکستان کے مسلم ماحول سے تمام طرح کے ہندوستانی اثرات کو مٹانا چاہتے تھے، چونکہ اس کام میں انھیں مغربی پاکستان میں کافی کامیابی نصیب ہوئی تھی۔

مابعد جنگ مارچ 1972 میں اسمبلیوں کے انتخابات ہوئے۔ پہلی لوک سبھا انتخاب 1952 کے بعد یہ پہلا موقع تھا، جب لوک سبھا انتخاب کے بعد اسمبلی الیکشن ہو رہے تھے۔ جنگ میں فتح کی لہر کے اثر سے کانگریس نے کئی ریاستوں میں بھاری اکثریت سے کامیابی حاصل کی۔ جن سنگھ کو بھاری شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ پارٹی صدر کے طور پر اٹل جی نے اس کی اخلاقی ذمہ داری قبول کی اور نا قابل اعتبار فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انھوں نے پارٹی کے سینئر نائب صدر بھائی مہاویر کو مئی 1972 میں بھاگل پور میں منعقد قومی اجلاس کی قیادت کرنے کے لئے کہا۔ انھوں نے اس موقع پر کہا 'میں نے ایسا اس لئے کیا ہے کہ غیر جانبدارانہ بحث ہو اور قائد قیادت پر نکتہ چینی کرنے کے لئے خود کو آزاد محسوس کرے۔'

حالانکہ اٹل جی کے دل کے ایک کونے میں پارٹی کو قیادت فراہم کرنے کے لئے کسی نئے شخص کی تلاش کرنے کی خواہش تھی۔ دین دیال جی کے انتقال کے بعد وہ تقریباً پانچ برسوں تک پارٹی کے صدر رہ چکے تھے۔ صدر کی تلاش آخر کار طویل عرصہ کے بعد مجھے قیادت فراہم کرنے کے بعد پوری ہوئی۔

اس کے ساتھ ہی میری زندگی میں ایک نیا موڑ آیا۔

7

کانپور سے کانپور تک کا سفر

''آج سیاست وسیلہ نہیں رہ گیا ہے، یہ خود ایک ذریعہ بن گئی ہے۔ آج ہمارے پاس ایسے لوگ ہیں، جو سیاسی طاقت کے توسط سے کچھ بلند سماجی اور قومی مقاصد کو حاصل کرنے کے بجائے اقتدار کی سیاست میں مصروف رہتے ہیں۔''

—— پنڈت دین دیال اپادھیائے

کانپور کا ہندوستانی جن سنگھ کی تاریخ اور میری سیاسی زندگی دونوں میں مخصوص مقام ہے۔ دسمبر 1952 میں پارٹی کے اجلاس کی صدارت ڈاکٹر شیاما پرساد مکھر جی نے کی تھی۔ اس سیشن کو جموں وکشمیر کے ہندوستانی یونین میں انضمام کے لئے ملک گیر ستیہ گرہ شروع کرنے کے لئے فیصلہ لینے کے لئے ہمیشہ یاد کیا جائے گا۔ یہ مہم جن سنگھ اور بھارتیہ جنتا پارٹی کی تاریخ میں سب سے زیادہ قابل فخر ابواب میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہ ہماری پارٹی کی تاریخ کے افسوسناک لمحوں میں سے بھی ہے، کیونکہ ڈاکٹر مکھر جی اسی جدوجہد میں شہید ہوئے۔

میں نے راجستھان سے ایک مندوب کے طور پر 1952 کے کانپور اجلاس میں پچیس برس کی عمر میں حصہ لیا۔ اس سیشن کے سلسلہ میں مجھے جو یاد ہے، وہ یہ کہ ہماری پارٹی اس وقت نوخیزی کے عالم میں تھی پھر بھی اس کی قیادت وہ لیڈر کر رہے تھے، جو اس وقت قومی لیڈروں کے درمیان عظیم شخصیت کے مالک تھے۔ ڈاکٹر مکھر جی کی شخصیت قابل توجہ تھی، وہ خود اعتمادی اور اصول پسندی کی مورت تھے۔ ان کا انگریزی میں فن تخاطب حیرت انگیز تھا۔ اس نے مجھ جیسے نوجوان پارٹی کارکنان کو پارٹی کے مستقبل کے تئیں کافی پرامید بنا دیا تھا۔

اس وقت میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ بیس سال بعد فروری 1973 کے دوسرے ہفتہ میں مجھے صدر منتخب کرنے کے لئے یہ پارٹی کانپور میں اپنا سربراہ اجلاس منعقد کرے گی۔ کانپور سے کانپور تک کا یہ سفر پارٹی اور میرے، دونوں کے لئے ولولہ خیز تھی اور نہایت چیلنجنگ بھی۔

پہلی مرتبہ پارٹی صدر منتخب ہونا

مجھے پارٹی صدر بننے میں بہت ہچکچاہٹ ہو رہی تھی۔ پارٹی صدر بننے کی ذمہ داری مجھ پر کیسے آئی، یہ ایک دلچسپ کہانی ہے، جو یہاں بیان کرنے کے قابل ہے۔ میں نے گزشتہ باب میں ذکر کیا ہے کہ فروری 1968 میں پنڈت دین دیال اپادھیائے کی افسوسناک موت کے بعد اٹل، جی پارٹی صدر منتخب ہوئے۔ وہ 1971 کے انتخاب کے بعد پارٹی صدر کا عہدہ چھوڑنے پر سنجیدگی سے غور کر رہے تھے۔ 1972 کی شروعات

میں اٹل جی نے مجھ سے کہا 'اب آپ پارٹی کے صدر بن جائیں۔' اس کی وجہ دریافت کرنے پر انھوں نے کہا 'میں اس عہدہ پر اپنی چار سال کی مدت مکمل کر چکا ہوں۔ اب وقت ہے کہ کوئی نیا شخص اس ذمہ داری کو قبول کرے۔'

میں نے ان سے کہا 'اٹل جی، میں کسی عوامی اجلاس میں تقریر بھی نہیں کر سکتا، پھر میں پارٹی صدر کیسے ہو سکتا ہوں؟' ان دنوں میں عوام کے درمیان بولنے کے بھی اہل نہیں تھا اور مجھے بولنے میں ہچکچاہٹ محسوس ہوتی تھی۔ میں یہ ضرور اعتراف کرتا ہوں کہ میرے اندر اس کمزوری کے پنپنے کی ایک بہت بڑی وجہ اٹل جی کے ساتھ میرے نزدیکی تعلقات تھے، جو اپنی کرشمائی تقریر سے سامعین کو مسحور کر دیتے تھے۔

اٹل جی نے زور دے کر کہا 'لیکن اب تو آپ پارلیمنٹ میں بولنے لگے ہیں، پھر یہ ہچکچاہٹ کیسی؟'

میں نے ان سے کہا 'پارلیمنٹ میں بولنا ایک بات ہے اور ہزاروں لوگوں کے سامنے تقریر کرنا الگ بات ہے۔ اس کے علاوہ پارٹی میں کئی سینئر لیڈر ہیں، ان میں سے کسی کو پارٹی صدر بنایا جا سکتا ہے۔'

اٹل جی نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا 'لیکن دین دیال جی بھی مقرر نہیں تھے، باوجود اس کے لوگ انھیں بہت دھیان سے سنتے تھے، کیونکہ ان کے الفاظ گہرے افکار پر مبنی ہوتے تھے، لہٰذا پارٹی کو رہنمائی فراہم کرنے کے لئے بہت بڑا مقرر ہونا ضروری نہیں ہے۔'

میں اس بات سے متفق نہیں ہوا۔ میں نے کہا 'نہیں، نہیں، میں پارٹی صدر نہیں بن سکتا۔ برائے مہربانی کسی دیگر شخص کو تلاش کریں۔'

انھوں نے کہا 'دوسرا شخص کون ہو سکتا ہے؟'

میں نے کہا 'راج ماتا کیوں نہیں؟'

وجے راجے سندھیا کو گوالیار کی راج ماتا★ کے طور پر جانا جاتا تھا۔ ہندوستان کے عظیم تر اور صاحب ثروت راجہ رجواڑوں میں سے گوالیار ایک تھا۔ اس ریاست کے مہاراج کے ساتھ ان کی شادی ہوئی تھی۔ اپنے شوہر کی موت کے بعد 1962 میں کانگریس کے ٹکٹ پر وہ پارلیمنٹ کی رکن نامزد ہوئیں۔

پانچ سال کے بعد اپنے اصول پسندانہ خیالات پر وہ کانگریس چھوڑ کر جن سنگھ میں شامل ہو گئیں۔ ایک راج شاہی گھرانہ سے وابستہ ہوتے ہوئے بھی وہ اپنی ایمانداری، سادگی اور عزائم کے سبب پارٹی میں سب کی پسندیدہ بن گئیں۔ جلد ہی وہ پارٹی میں طاقت کے ستون کی شکل میں سامنے آئیں، بعد میں ایمرجنسی کے دوران انھیں قیدی بنایا گیا۔

اٹل جی میرے مشورہ سے متفق ہو گئے اور ہم دونوں راج ماتا کو جن سنگھ صدر بننے کے لئے راضی کرنے کے مقصد سے گوالیار گئے۔ دراصل انھیں کافی منانا پڑا، بالآخر وہ رضامند ہو گئیں۔ ہمیں راحت اور خوشی کا احساس ہوا۔ منظوری کے لئے ہم نے انھیں مبارک باد دی، پھر انھوں نے فوراً کہا 'مگر برائے مہربانی انتظار کریں۔ اپنی آخری رضامندی کے لئے آپ کو مجھے ایک دن کا اور وقت دینا ہوگا، جیسا کہ آپ جانتے ہیں، میں اپنی زندگی میں کوئی بھی اہم فیصلہ دتیا میں رہنے والے اپنے شری گرو جی کی اجازت اور آشیرواد کے بغیر نہیں لیتی ہوں۔' اسی دن وہ مدھیہ پردیش کے اس چھوٹے سے شہر دتیا گئیں، لیکن دوسرے دن واپس آ کر انھوں نے افسوسناک خبر سنائی 'میرے شری گرو جی نے اس کی اجازت نہیں دی۔'

★ راج ماتا کے اکلوتے بیٹے مادھوراؤ سندھیا نے جن سنگھ سے اپنی سیاسی زندگی کی شروعات کی تھی، لیکن بعد میں وہ کانگریس میں شامل ہو گئے تھے۔ راج ماتا کی بیٹی وسندھرا راجے بی جے پی کی نوجوان نسل کی لیڈروں میں سے ایک ہیں اور راجستھان کی وزیر اعلیٰ بنیں۔ ان کی دوسری بیٹی یشودھرا مدھیہ پردیش میں بی جے پی کی ممبر پارلیمنٹ ہیں۔

اب ہمیں کیا کرنا چاہئے؟ اٹل جی نے پوچھا۔

میں نے کہا 'ہم لوگ مہاویر جی کو کیوں نہیں مناتے ہیں۔ جدوجہد آزادی کے مشہور سپاہی بھائی پرمانند* کے بیٹے ڈاکٹر بھائی مہاویر جن سنگھ کے سینئر نائب صدر اور اس وقت راجیہ سبھا کے رکن تھے۔

اٹل جی اس سے متفق ہوگئے اور ہم دونوں جگن ناتھ راؤ جوشی کے ساتھ مہاویر جی سے ملنے ان کے پنت مارگ، نئی دہلی میں واقع رہائش گاہ پر گئے۔ بغیر کسی حیلہ وحجت کے وہ رضامند ہوگئے۔ ہم اپنے مشن کی کامیابی پر راحت محسوس کرنے لگے کہ انھوں نے کہا 'برائے مہربانی ایک لمحہ انتظار کریں۔ اس سلسلہ میں میں اپنی بیوی سے صلاح کرنا چاہوں گا۔'

وہ گھر کے اندر گئے اور کچھ دیر بعد بری خبر کے ساتھ واپس آئے — 'میری بیوی اس سے اتفاق نہیں رکھتی۔'

جب ہم ان کے گھر سے باہر نکلے تو اٹل جی نے مجھ سے کہا 'اب اور ناکام کوشش نہیں۔ اب آپ کے پاس متبادل نہیں ہے، بلکہ میں جو کہتا ہوں اس پر 'ہاں' کہنا ہے۔' اس طرح رسماً مجھے دسمبر 1972 میں بھارتیہ جنتا پارٹی کا صدر منتخب کیا گیا۔ اس کے فوراً بعد میں نے کانپور میں پارٹی کے اٹھارہویں سالانہ اجلاس کی صدارت کی۔

جب میں پیچھے مڑکر دیکھتا ہوں تو کچھ پہلوؤں پر تعجب ہوتا ہے کہ مجھ جیسے نوجوان اور قومی سیاست میں دوسروں کے مقابلہ ناتجربہ کار شخص کو پارٹی کا صدر منتخب کیا گیا۔ سب سے پہلے اپنے تئیں اٹل جی کے اعتماد سے میں پھولے نہیں سمایا۔ دوسری بات، میں اس وجہ سے بھی نامنظور نہیں کرسکا کہ ناناجی دیشمکھ، سندر سنگھ بھنڈاری، کشا بھاؤ ٹھاکرے اور جگن ناتھ راؤ جوشی جیسے مجھ سے عمر اور تجربہ میں بڑی شخصیتیں میرے نام پر فوراً رضامند ہوگئیں۔ یہ تمام سنگھ کے مہم جو تھے اور کبھی بھی اقتدار یا عہدہ میں دلچسپی نہیں رکھتے تھے، حالانکہ جب بھی میں اس بات کو یاد کرتا ہوں تو اس سچائی سے پریشان ہوجاتا ہوں کہ دوستی اور آپسی اعتماد سازی کا یہ جذبہ پارٹی کے کام کے تئیں آدرش، بغیر کسی مفاد کے مقصد کی جستجو کا نظریہ گزشتہ برسوں میں بہت کم ہوگئے ہیں۔

نہ بایاں نظریہ، نہ دایاں نظریہ، صرف ترقیاتی نظریہ

میں کانپور اجلاس کی اپنی پہلی صدارتی تقریر کے دو نکات کو یہاں یاد کرنا چاہوں گا — یہ اعتراف کرتا ہوں کہ یہ اس دور میں بی جے پی کے لئے کافی اہم ہے۔ اس وقت میڈیا میں جن سنگھ کے 'لیفٹ' یا 'رائٹ' ہونے کے سلسلہ میں بہت سی خبریں شائع ہوتی تھیں۔ اس بحث کے

★ بھائی پرمانند ہندوستانی تحریک آزادی کی سب سے مقبول اور قابل احترام شخصیت تھے۔ سنگھ میں اپنے شروعاتی برسوں میں میں نے ان کی کتاب 'ہندو تنظیم' کا مطالعہ کیا۔ ایک ویدک مشنری، جو آریہ سماج تحریک سے جڑے تھے، بھائی پرمانند انقلابی غدر پارٹی کے بھی رکن تھے۔ انھوں نے بیسویں صدی کے شروعاتی برسوں میں لالہ ہردیال، جو ایک ساتھی انقلابی تھے، کے ساتھ مشترکہ طور پر پورے ہندوستان کا دورہ کیا اور ہندوستان کی آزادی کو مشتہر کیا۔ انھوں نے مہاتما گاندھی سے ملاقات کرنے کے لئے جنوبی افریقہ کا سفر کیا اور ان کے آشرم میں رہے۔ انھیں پہلے لاہور سازش کیس میں انگریزوں کے ذریعہ گرفتار کرلیا گیا تھا اور انڈمان میں واقع جیل میں ڈالا گیا تھا۔ 1947 میں اس وقت دل کا دورہ پڑنے سے ان کا انتقال ہوگیا، جب ہندوستان کی تقسیم ہوئی۔ ان کے بیٹے ڈاکٹر بھائی مہاویر جو آزادی سے قبل لاہور میں تھے، سنگھ کے سینئر کارکن اور اس وقت جنرل سکریٹری بنے جب جن سنگھ کا قیام عمل میں آیا۔ بعد میں 1998-2003 تک وہ مدھیہ پردیش کے گورنر رہے۔

سلسلہ میں میں نے کہا:

''میری پارٹی کسی بھی لفظی 'ازم' سے بندھی ہوئی نہیں ہے اور 'دائیں' اور 'بائیں' جیسے لفظ ہندوستانی پس منظر میں مروج نہیں ہیں۔ میں سوچتا ہوں کہ جو بیانات ہماری شناخت بنانے کے لئے دیے جاتے ہیں، ان کے مقابلہ ہم کہاں ہیں، اس بات کے تجزیہ کی ضرورت ہے۔ مغربی جمہوری سیاست میں 'لیفٹ ازم' کا مطلب موٹے طور پر ویسے نظام سے ہے جو ریاست کے کنٹرول کے حق بجانب ہو۔ مغرب میں لیفٹ - رائٹ تنازع کے دو اہم پیمانے ہیں۔ مساوات کے تئیں نظریہ اور تبدیلی کے تئیں نظریہ۔ پہلا پیمانہ یعنی ریاست کے کنٹرول کی بنیاد پر جن سنگھ کو رائٹسٹ تنظیم کہا جاسکتا ہے، حالانکہ دو دیگر پیمانوں کی بنیاد پر جن سنگھ کو لیفٹسٹ پارٹیوں کے قطار میں رکھا جاسکتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ نہ تو رائٹسٹ ہے اور نہ ہی لیفٹسٹ۔ یہ ایک ایسی پارٹی ہے، جس کی نظر سیدھی اور آگے کی جانب ہے۔''

پہلی صدارتی تقریر میں میرا دوسرا نقطہ جن سنگھ اور اب بی جے پی کے دو بنیادی نظریوں سے جڑا ہوا تھا — قومیت اور ترقیاتی جمہوریت، اس پر میرا ردعمل یہ تھا:

''کانپور سے کانپور تک کا سفر میرے لئے ایک یادگار سفر ہے۔ ان بیس برسوں کے دوران بھارتیہ جن سنگھ عوام کے دل میں ایک قوم پرست پارٹی کے طور پر اپنا مقام بنا چکی ہے۔ مادر وطن کے تئیں حب الوطنی کے جذبہ سے سرشار اور ڈسپلن سے مامور کارکنان کی پارٹی کے طور پر اس پارٹی کا ہندوستانی کردار غیر متنازع طور پر قائم ہو گیا ہے۔ قوم پرستی کے ساتھ ساتھ جن سنگھ کا دوسرا بنیادی فلسفہ سیاسی اور اقتصادی جمہوریت ہے۔ ہمارا سنگھ نہ صرف ایک بھارتیہ سنگھ ہے بلکہ یہ ایک جن سنگھ ہے۔ جنتا کی پارٹی، عوام کی پارٹی۔ مستقبل میں ہماری پارٹی کے اس کردار کو اور زوردار ڈھنگ سے ملک میں مشتہر کرنے کی ضرورت ہے۔''

پارٹی صدر منتخب ہوتے ہی جو ایک کام مجھے کرنا پڑا، وہ حقیقت میں تکلیف دہ تھا۔ پارٹی کی مجلس عاملہ کے ذریعہ لئے گئے فیصلہ کے مطابق مجھے جن سنگھ کے سابق صدر بلراج مدھوک کو پارٹی کی خلاف ورزی کے لئے پارٹی سے برخاست کرنا تھا۔ یہ قدم تکلیف دہ اس لئے تھا، کیونکہ میں نے ان کے ساتھ بہت قریب سے کام کیا تھا۔ انھوں نے شکایت کی کہ میں نے برخاستگی کے سلسلہ میں شری گروجی سے مشورہ نہیں لیا، حالانکہ شری گروجی پارٹی کے فیصلہ سے اتفاق رکھتے تھے۔ کانپور اجلاس سے ٹھیک پہلے وہ ایک مختصر دورہ پر دہلی آئے تھے اور اس وقت میں ان سے ملنے کے لئے ہوائی اڈہ گیا تھا۔ پارٹی صدر منتخب ہو جانے کے بعد ان سے میری یہ پہلی ملاقات تھی۔

انھوں نے مجھ سے پوچھا 'اب بلراج جی کا سلوک کیسا ہے؟'

میں نے ان سے کہا 'حالات دن بدن خراب ہی ہوتے جا رہے ہیں اور پارٹی انھیں برخاست کرنے کے بارے میں سوچ رہی ہے۔'

تب شری گروجی نے مجھ سے کہا 'ڈسپلن کی خلاف ورزی کی صورت میں تنظیم کی صحت مندی کے تحفظ کے لئے جو بھی ضروری قدم ہو، اسے اٹھانا چاہئے۔ کسی کو بھی، یہاں تک کہ کسی سابق صدر کو بھی، اس سلسلہ میں چھوٹ نہیں دی جانی چاہئے۔'

مدھوک کے خلاف کی گئی کارروائی کا خیر مقدم کیا گیا، خاص طور سے جن سنگھ کے وقار میں کافی اضافہ ہوا کہ یہ پارٹی ڈسپلن کو کافی اہمیت دیتی ہے، حالانکہ میں یہاں تکلیف دہ اور رنجیدہ ہو کر کہہ رہا ہوں کہ بعد کی دہائیوں میں بی جے پی ویسا وقار بنانے کے قابل نہیں رہ سکی۔

کرم یوگی سنیاسی 'شری گرو جی' کا انتقال

پارٹی کے کانپور اجلاس کے کچھ ماہ بعد ہی کینسر سے نبرد آزما اپنی طویل اور جرأت مندانہ جدوجہد کے بعد 5 جون 1973 کو ناگپور میں شری گرو جی کا انتقال ہوگیا۔ جب مجھے یہ خبر ملی تب میں اندور تھا۔ وہاں میں مدھیہ پردیش اور راجستھان کے اپنے اہم دورہ کے تحت گیا تھا۔ میں فوراً کار سے ناگپور کے لئے روانہ ہوگیا، جہاں مجھے ہزاروں سویم سیوکوں اور شری گرو جی کے حامیوں کے ساتھ ان مہاتما کو گلہائے عقیدت پیش کرنی تھی۔

آزاد ہندوستان کی تاریخ میں شری گرو جی ایسی شخصیت ہیں جنہیں بہت سے لوگوں نے ٹھیک سے نہیں سمجھا۔ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ وہ جتنے عظیم تھے، ان کے متعلق غلط فہمی اور منظم گمراہ کن تشہیر اتنی ہی زیادہ تھی۔ وہ اس کے شکار بنے۔ ان کی شخصیت کا بنیادی عنصر ایک سنیاسی کا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے اپنی جوانی میں رام کرشن مشن میں سنیاسی ہونے کا فیصلہ لیا تھا اور رام کرشن پرم ہنس کے شاگرد اکھنڈانند سے دکشا بھی لی تھی، جنھوں نے شری گرو جی کی زندگی کو ایک مختلف روحانی آیام دے دیا تھا۔ اگر 1937 کے شروع کے واقعہ کے ایک ماہ کے اندر ان کے گرو کا انتقال نہ ہوا ہوتا تو شری گرو جی اپنی باقی ماندہ زندگی ایک سنیاسی کے طور پر گزارتے۔ اس واقعہ کے تین برس کے بعد، جب وہ 34 برس کے تھے، اس وقت سنگھ کے بانی ڈاکٹر کیشو بلی رام ہیڈگوار کے انتقال کے بعد سنگھ کے سرسنگھ چالک بنے۔

جن 33 سالوں تک وہ سنگھ کے سربراہ رہے، وہ سخت امتحانات اور مصائب سے دوچار رہے۔ اس مدت کے دوران سنگھ نے ایک ننھے پودے سے بڑھ کر گھنے درخت کی صورت اختیار کرلی تھی۔ دراصل میں یہ کہنے کی جرأت کروں گا کہ آزاد ہندوستان کی تاریخ میں کسی دیگر لیڈر کی مثال ایسی نہیں ملتی جو اتنے مصائب کے بعد اتنی منظم اور مستحکم تنظیم بنانے میں کامیاب رہا ہو اور قومیت کے اصول کے تئیں پابند عہد رہا ہو، جیسا کہ شری گرو جی رہے۔ سنگھ کی زندگی میں شدید چیلنج مہاتما گاندھی کے قتل کے بعد پیدا ہوا، جیسا کہ ہم نے پہلے دیکھا ہے، یہ اگنی پریکشا میں کامیاب ہوکر نکلا۔ اس کا سہرا اس کے لیڈر کے جوش، صبر، خود اعتمادی سے سرشار شخصیت کے سر ہے۔ ایک جانب خود اور اپنی تنظیم پر پابندی اور کارکنان کے جیل میں بند ہونے سے جو تکلیف ہوئی اور دوسری جانب جو گمراہ کن پروپیگنڈے کا زہر پینا پڑا، اس سے کانگریس کی قیادت کے تئیں شری گرو جی کا ذرا بھی دل میلا نہیں ہوا۔ ان کا گاندھی جی سے اختلاف تھا، حالانکہ سخت مخالف پروپیگنڈے کے برعکس گاندھی جی سے قتل کے پہلے اور بعد میں مہاتما جی کے تئیں ان کے احترام اور وقار میں کمی نہیں آئی۔

جب کبھی قوم مصیبتوں سے گھری ہوئی تھی تو شری گرو جی سنگھ سویم سیوکوں کو مہابھارت میں درج دھرم راج یدھشٹر کے اعلیٰ اصولوں پر عمل کرنے کی ہدایت دیتے تھے۔ جب کورو پانڈوں کو بے عزت کرنے کے پراگندہ منشا کے تحت آئے تھے، لیکن گاندھرو کے ذریعہ خود قیدی بنا لیے گئے تب یدھشٹر نے ارجن کو کوروں کو آزاد کرانے کا حکم دیا تھا۔ انھوں نے کہا 'الگ رہتے ہوئے ہم پانچ اور وہ سو ہیں، لیکن ہم دشمن کے سامنے 105 ہیں۔ جب جموں و کشمیر کا انضمام ہندوستانی یونین کے لئے مسئلہ پیدا کر رہا تھا، اس وقت شری گرو جی نے مہاراجا ہری سنگھ سے بلا تاخیر ہندوستانی یونین میں شامل ہونے کی اپیل کی۔ انھوں نے پاکستان کے ناپاک ارادے سے مہاراج کو آگاہ کیا اور جموں و کشمیر کو ایک آزاد ریاست بنائے جانے کی ضرورت پر زور دیا۔ 1962 کی چین جنگ کے دوران سنگھ کے ذریعہ قومیت کی عظیم نمائش کا اثر نہرو پر بھی پڑا۔ انھوں نے 26 جنوری 1963 کی یوم جمہوریہ تقریب میں شرکت کے لئے سنگھ کے 3000 سویم سیوکوں کو دعوت دی۔ جب 1965 میں پاکستان نے ہندوستان پر حملہ کیا تب وزیر اعظم لال بہادر

شاستری نے سنگھ کے شری گروجی کو آل لیڈر کانفرنس میں حصہ لینے کے لئے مدعو کیا اور انھوں نے حکومت کو سنگھ کا پورا تعاون دیا۔ اس طرح یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت کے کانگریسی لیڈر سنگھ کے تئیں اتنا محدود نظریہ نہیں رکھتے تھے جتنا آج کے رکھتے ہیں۔

شری گروجی نے سنگھ کے سربراہ کے طور پر وشو ہندو پریشد، اکھل بھارتیہ ودیارتھی پریشد، بھارتیہ مزدور سنگھ، ونواسی کلیان آشرم، ودیا بھارتی اور سرسوتی ششو مندر جیسی شاخوں کو قائم کرنے کے لئے رہنمائی کی۔ ان تمام تنظیموں نے اپنے اپنے میدانوں میں قوم کی اعلیٰ اور بے لوث خدمت کی ہے۔ جب کسی لیڈر کی قومی یقین کی جڑیں سماج کی روحانی اور ثقافتی وراثت سے جڑی ہوتی ہیں اور جب وہ خود اعلیٰ کردار والا شخص رہتا ہے تو وہ جس کسی تحریک کی قیادت کرتا ہے اس کے مکمل کردار کو بلند کرنے میں وہ فطری طور پر اہل ہوتا ہے۔

تقریباً نصف درجن ہندوستانی زبانوں پر عبور اور داڑھی، چشمہ پہنے ہوئے شری گروجی قربانی کی زندہ مثال تھے، جن کے چاروں اطراف رفتار پذیری کی رونق جلوہ افروز تھی۔ ان کی موجودگی میں ہمیشہ یہ احساس ہوتا تھا کہ یہاں ایک شخص ہے جو دنیا سے کاہلی اور کمتری کو مٹا دینا چاہتا ہے اور اسی بات کو ترجیح دیتا ہے جو کرم یوگ کے ان کے اصول کے مطابق ہے۔ میں سویم سیوکوں کے لئے دیئے گئے ان کے لکچرز میں شامل ہوا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ ایک مؤثر مقرر، دانشور اور باوقار شخص تھے، لیکن عوامی زندگی میں وہ ان معدوم شخصیتوں میں سے تھے، جو اپنے فن خطاب یا زندگی کی کسی خارجی نمائش کے سبب دوسروں کو متاثر نہیں کرتے تھے، بلکہ اپنی پاکیزگی اور روحانی شبیہ کے سبب دوسروں کو متاثر کرتے تھے۔ سنگھ پریوار سے باہر کے متعدد شخص نجی طور سے ان سے ملنے پر ان کی شخصیت کی اصلیت اور۔ یا سی درجہ کے ایک طبقہ کے ذریعہ قائم کی گئی ان کی شبیہ کے درمیان کے فرق کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ جاتے تھے۔ ان کی شبیہ ایک شیطانی تنظیم کو قیادت فراہم کرنے والے سخت لیڈر کی بنادی گئی تھی۔

اس اصلیت سے حیرت زدہ ہونے والوں میں سے ایک تھے 'السٹریٹیڈ ویکلی' کے سابق ایڈیٹر خشونت سنگھ، انھوں نے نومبر 1972 میں سنگھ کے سر سنگھ چالک کا ایک انٹرویو شائع کیا، جس کی شروعات انھوں نے ان الفاظ سے کی 'کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جنھیں ہم جانے بغیر ان سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی میری فہرست میں شری گروجی کا نام سرفہرست ہے۔'

خشونت سنگھ کا ایک سوال یہ تھا 'مسلم موضوعات پر آپ کا کیا خیال ہے؟' اس سوال پر شری گروجی کا جواب بہت سے حقائق کی وضاحت کرتا ہے 'مجھے اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ مسلمانوں کی ہندوستان اور پاکستان کے درمیان تقسیم ہوئی وفاداری کے پس پشت تاریخی وجوہات ہیں۔ ساتھ ہی اس کے لئے مسلم اور ہندو دونوں برابر کے قصوروار ہیں۔ کچھ لوگوں کی غلطی کے لئے پورے فرقہ کو قصوروار ٹھہرانا درست نہیں ہے۔ ہمیں محبت کے ساتھ مسلمانوں کی وفاداری کو جیتنا ہوگا۔ میں پرامید ہوں اور مجھے یقین ہے کہ ہندو مذہب اور اسلام ایک دوسرے کے ساتھ رہنا سیکھ جائیں گے۔' جو انھیں سیکولرازم مخالف اور فرقہ پرست مانتے ہیں، انھیں عربی دانشور ڈاکٹر سیف الدین جیلانی کو دیئے گئے ایک دوسرے انٹرویو میں ہندوستانی مسلمانوں کے سلسلہ میں ان کے خیالات کا مطالعہ کرنا چاہیے:

''ہمارے مذہبی نظریہ اور فلسفہ کے مطابق، ایک مسلمان اتنا ہی اچھا ہوتا ہے جتنا کہ ایک ہندو، صرف ہندو 'پرم دیوتو' حاصل نہیں کرے گا، سبھی کو اپنے نظریہ کے مطابق اپنی راہ پر چلنے کا حق ہے۔ اپنے اپنے مذہب پر عمل کریں۔ مسلم، عیسائی اور ہندو کے ایک ہی ایشور ہیں اور ہم سبھی ان کے بھکت ہیں۔ لوگوں کو اسلام کا صحیح علم دیں، لوگوں کو ہندوتو کا صحیح علم دیں، انھیں تعلیم یافتہ کریں کہ سبھی مذہب انسان کو غیر مفاد پرست، پاک اور مذہبی ہونا سکھاتے ہیں۔ ہندوستانیت کا مطلب سبھی کو ہندو بنانا نہیں ہے۔''★

★ مادھو سداشیو گولوالکر کی تحریر کردہ 'بنچ آف تھاٹس'

اس میں کوئی شک نہیں کہ شری گروجی ہندوستانی مسلمانوں کے علیحدگی پسند طبقہ کے نکتہ چیں تھے۔ مسلمان حملہ آوروں اور سخت گیر مسلم حکمرانوں کی ستائش کرنے کی عادت کی بھی وہ مذمت کرتے تھے، خاص طور سے فرقہ واریت کی بنیاد پر، دوقومی نظریہ کے اصول کی بنیاد پر، پاکستان کی تشکیل کے بعد۔ وہ ہندوستانی مسلمانوں کے ہندوستانیت کے پرزور حامی تھے۔ درحقیقت جوانہیں اسلام مخالف اور اسلام کے خلاف نفرت پھیلانے والا مانتا ہے، اس کی رائے سراسر غلط ہے۔

جب کبھی ملک کے سامنے تقسیم کرنے والی پیچیدگیاں پیدا ہوئی تو ہمیشہ شری گروجی کا نظریہ اخلاقی، دوررس اور قوم پرستی کا رہتا تھا۔ جب 60 کی دہائی کے شروعاتی سالوں میں پنجاب میں پنجابی بمقابلہ ہندی کا تنازع کھڑا ہوا تب سنگھ کو جو رہنماہدایت انھوں نے دی، اس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے۔ پنجابی کو ریاست کی زبان قرار دیئے جانے کی کچھ ہندوؤں نے مخالفت کی۔ اپنی مادری زبان پنجابی ہوتے ہوئے بھی انھوں نے اپنی مادری زبان ہندی قرار دینے پر زور دیا۔ فطری طور سے سکھوں کے مابین اس کی مخالفت ہوئی۔ شری گروجی کو اندیشہ تھا کہ اس سے ہندو-سکھ اتحاد کمزور ہو جائے گا اور ملک کی سالمیت خطرہ میں پڑ جائے گی۔

ان کی رہنماہدایت کے مطابق سنگھ نے پنجاب میں ہندوؤں کو اس بات کے لئے رضامند کرلیا کہ وہ ہندی کی جگہ پنجابی کو اپنی مادری زبان قرار دیں۔★

آج بیشتر لوگ قطعی یہ یقین نہیں کریں گے کہ وہ اپنے رویہ سے سیاست سے بالکل مختلف تھے، خصوصاً اقتدار کی سیاست سے۔ دراصل کسی پالیسی پر مبنی اصول کے نجی مفاد کے لئے کی جانے والی سیاست سے انھیں حددرجہ نفرت تھی۔ حالانکہ، انھوں نے سیاست کو قومی زندگی کے اہم اور لازمی حصہ کے طور پر قبول کیا تھا، پھر بھی انھوں نے سنگھ کو اس سے پوری طرح علیحدہ رکھا، سنگھ کے تشہیرکاروں اور سویم سیوکوں پر سیاست کی ذمہ داری چھوڑ دی۔ ان کے لئے سنگھ کی ذمہ داری اس صورت میں الگ، وسیع تر اور بنیادی اقدار کے لئے تھی، جس میں کافی تعداد میں نسل درنسل، اعلیٰ اخلاقی اقدار کے پاسدار، بھارت ماتا پر سب کچھ نچھاور کردینے والے بےلوث افراد سماج کے تمام میدان میں سرگرم ہوں اور سب کے لئے آئیڈیل بنیں۔ 1951 میں جن سنگھ کے قیام کے بعد وہ بائیس سالوں (1973) تک زندہ رہے۔ اس دوران انھوں نے کبھی بھی پارٹی کی سرگرمیوں میں دخل اندازی نہیں کی اور نہ ہی اس کی سیاست اور پروگراموں پر انگشت نمائی کی۔ انھیں ڈاکٹر مکھرجی اور پنڈت دین دیال جی کی قیادت پر پورا بھروسہ تھا۔

'بلٹز' کے مشہور ایڈیٹر آر کے کرنجیا نے ان کے لئے بہترین خیالات کا اظہار کیا— 'ان کے دل میں ذرا بھی انتقام کا جذبہ نہیں تھا اور اپنے اصولوں کے لئے ان کے دل میں کسی کے لئے نفرت نہیں تھی۔ ان کے الفاظ میں نقاہت نہیں تھی۔ ان کی پیشانی پر تھکن کا شائبہ تک نہیں تھا۔ اگر دیگر سیاسی لیڈران کی زندگی کی مثال سے سبق لینے اور ان کے حامیوں کی عزت اور یقین پانے کے لئے کچھ کوشش کرتے تو یہ بہتر ہوتا۔'

میں یہاں ضرور بیان کرنا چاہوں گا کہ کرنجیا کا یہ ہفت روزہ کھلے طور پر سامراجیوں اور کانگریس کا حامی تھا اور انھوں نے جن سنگھ اور بی جے پی کو فرقہ پرست کہا تھا، لیکن بعد میں ان کے خیالات میں تبدیلی آئی۔ وہ ایودھیا تحریک کے ایک بڑے حامی بن گئے اور 1990 میں مجھے مبارکباد دینے کے لئے میرے گھر آئے۔ 1994 میں بنگلور میں منعقد بی جے پی کے قومی اجلاس میں انھوں نے شرکت کی۔

★ اس کا خوش نما ذکر یہاں بیان کرنے کے قابل ہے۔ ان دنوں پنجاب میں دو اہم اخبارات 'پرتاپ' اور 'ملاپ' تھے۔ دونوں کے قارئین کی تعداد کافی زیادہ تھی۔ ریاست کی زبان کے تنازع میں 'پرتاپ' ہندی کی حمایت کررہا تھا اور 'ملاپ' پنجابی کا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ دونوں اردو میں شائع ہو رہے تھے۔

میں نے شری گرو جی کی شخصیت کے سلسلہ میں مفصل ذکر اس لئے کیا، کیونکہ خصوصی طور سے سنگھ کے اور عام طور پر بی جے پی کے تئیں سالوں سے غلط خیالات کی تشہیر کی جاتی رہی ہیں، انھیں دور کرنا بھی اس کتاب کے مقاصد میں سے ایک ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ شری گرو جی اور ان کے عالمی نظریہ کے سلسلہ میں واضح اور وسیع اطلاعات پر مبنی بحث مباحثہ ہو۔ سامراجیوں کے ذریعہ سنگھ اور اس کے عظیم آدرشوں کی شبیہ خراب کرنے کی منظم غلط افواہوں کے سبب ایسا ابھی تک ممکن نہیں ہو سکا۔ میں نے اس تپسوی کو اپنی گلہائے عقیدت پیش کی ہے، جنھوں نے کسی جنگل یا پہاڑ پر تپسیا نہیں کی تھی بلکہ گاؤں اور شہروں میں انھوں نے تپسیا کی تھی اور رام کرشن مشن، جس میں وہ شامل نہیں ہو سکے، کی پروقار روایت ہندوستانی قوم کے احیا میں ان کا مقصد پنہاں تھا۔

جے پرکاش نارائن: نوجوان دل کو بیدار کرنے والے ضعیف

بھارتیہ جن سنگھ کے صدر کے طور پر میں جب 1970 کے وسط کو یاد کرتا ہوں تو ایک شخص، جس نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا اور جس کے ساتھ مجھے ایک مشترکہ قومی مہم میں کام کرنے کا خوش قسمتی سے موقع ملا، وہ عظیم سماج وادی لیڈر جے پرکاش نارائن تھے۔ اپنے حامیوں اور مداحوں کے درمیان جے پی کے طور پر مشہور جے پرکاش نارائن (79-1902) نے گاندھی وادی آدرش کی تجدید کر کے 70 کی دہائی کو اتنا امر بنا دیا جتنا کہ آزادی کے بعد کسی نے نہیں کیا۔ دراصل 1947 کے بعد سیاسی تاریخ میں کوئی بھی ایسا اہم شخص نہیں ہے، جس نے اتنا وسیع اصولی و بامقصد دورہ کیا ہو، پھر بھی جو زندگی کے ہر موڑ پر اپنے اصول پر قائم رہا ہو، جس نے اقتدار میں بغیر عہدہ حاصل کئے گاندھی جی کی راہ اپناتے ہوئے قومی سیاست کو اتنے نتیجہ خیز طور پر متاثر کیا ہو۔

تحریک آزادی کی 30 اور 40 کی دہائی کے گرم دل کے نوجوان لیڈروں میں سے ایک جے پرکاش جی 70 کی دہائی میں ہندوستان کے دوسری تحریک آزادی — ایمرجنسی کی تاناشاہی سے آزادی — کے آئیڈیل اور تنظیم کار بنے۔ اس وقت ان کی عمر 70 سال سے زیادہ تھی، پھر بھی جمہوریت کی بحالی کے لئے جدوجہد میں شامل ہونے کے لئے بیس سے چالیس سال کی عمر کے لاکھوں نوجوانوں کو بیدار کیا۔

60 کی دہائی کے آخری سالوں تک جے پرکاش جی سنگھ اور جن سنگھ کے شدید مخالف تھے۔ میں اسے اپنی سیاسی زندگی کی نہایت قابل اطمینان حصولیابیوں میں سے ایک مانتا ہوں کہ میں نے اپنے نزدیکی کارکنان اٹل جی اور نانا جی دیشمکھ کے ساتھ انھیں اپنی پارٹی اور تحریک کے نزدیک لانے میں اہم کردار ادا کیا۔

اپنی نوجوانی میں کٹر کمیونسٹ رہے جے پرکاش جی یہ مانتے تھے کہ گاندھی جی کے قتل میں سنگھ کا ہاتھ تھا۔ 1948 میں دہلی میں 'آرگنائزر' دفتر کے سامنے سنگھ کی مخالفت میں انھوں نے ایک مظاہرہ بھی کیا، اس لئے ان جیسے شخص کے لئے جن سنگھ سے ہاتھ ملانا آسان نہیں تھا، پھر بھی ان دو اہم وجوہات کی بنا پر یہ ممکن ہو سکا۔ وہ قومی مفاد میں، خاص طور سے جمہوریت کے تحفظ کے لئے تمام غیر کانگریسی طاقتوں کو ایک اسٹیج پر لانے کے لئے پابند عہد تھے۔ دوسری جانب وہ ایک عظیم باوفا دانشور شخص تھے اور سیاست میں موقع پرستی سے نفرت کرتے تھے، اس لئے کھلے مذاکرات کے توسط سے سنگھ اور بی جے پی کے تئیں اپنے اندیشوں کا حل پہلے چاہتے تھے۔ اس سلسلہ میں ہم انھیں مکمل طور پر مطمئن کرنے میں کامیاب ہوئے۔

جے پرکاش جی سے میرا تعارف 'آرگنائزر' کے دنوں سے تھا۔ درحقیقت انھوں نے جمہوریت اور انتخابی اصلاح پر میرا کوئی آرٹیکل پڑھا

تھا اور مجھے فون کیا تھا کہ 'کیا آپ آکر مجھ سے مل سکتے ہیں؟' میں فوراً تیار ہو گیا۔ اس کے بعد میں نے ان سے کئی بار ملاقات کی۔ جب انھوں نے جسٹس وی ایم تارکنڈے کی قیادت میں انتخابی اصلاح پر مطالعہ کرنے کے لئے ایک کمیٹی کی تشکیل کی تو انھوں نے اس میں مدد دینے کے لئے کہا۔ میں نے مباحثہ نامہ تیار کر کے اس میں تعاون دیا۔ اس تعارف نے ان کے ساتھ نزدیکی اور مستحکم سیاسی تعلق بنانے میں اس وقت مدد کی، جب میں جن سنگھ کا صدر بنا۔

1973 کی شروعات میں ایک دن جے پرکاش جی نے مجھے اپنے گھر مدعو کیا اور کہا 'میں گاندھی جی کے قتل میں سنگھ کے رول کے بارے میں ہمیشہ سنتا رہا ہوں۔ میں اس موضوع کا مفصل مطالعہ کرنا چاہتا ہوں اور چاہوں گا کہ آپ مجھے اپنی جانب سے تمام طرح کی اطلاعات فراہم کرائیں۔' میں نے ان کے تمام سوالات کا جواب دیا اور تحریری شواہد کے ساتھ تمام پہلوؤں کے سلسلہ میں انھیں مکمل اطلاعات بھیجیں۔ گاندھی جی کے قاتل ناتھورام گوڈسے نے 1933 میں ہی سنگھ کے ساتھ اپنا رابطہ توڑ لیا تھا، کس طرح وہ سنگھ کی سخت اور کھلے عام تنقید کرنے لگا تھا۔ راشٹریہ سویم سنگھ پر سے پابندی ہٹانے کا نہرو حکومت کا فیصلہ، سردار پٹیل اور شری گروجی کے مابین خط و کتابت، جسٹس کپور کمیشن کے سامنے سماعت اور کمیشن کا آخری فیصلہ وغیرہ۔ جے پرکاش جی نے کچھ دنوں کے بعد مجھے اپنے پاس بلایا اور کہا 'میں نے اس ایشو کا گہرائی سے مطالعہ کر لیا ہے، میں اس بات سے اتفاق رکھتا ہوں کہ گاندھی جی کے قتل میں سنگھ ملوث نہیں تھا۔

جے پرکاش جی کو جن سنگھ کے نزدیک لانے کی دوسری ایک وجہ اور بھی کارفرما تھی — ان کا یہ نظریہ کہ سیاست میں اصول سے زیادہ آدرش واد کی اہمیت ہوتی ہے۔ جب وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ جن سنگھ کا اصول ان کے خیالات کے مطابق نہیں ہے تب بھی وہ اس کے کارکنان کے آدرش واد کی ستائش کرتے تھے۔ وہ سچ مچ یقین رکھتے تھے کہ جن سنگھ کے لیڈر اور کارکنان ایماندار ہیں، دیش بھکت ہیں اور جنھیں بدعنوان قطعی نہیں کہا جا سکتا۔

1971 کے لوک سبھا الیکشن میں اندرا گاندھی کو جو دو تہائی اکثریت ملی تھی، اس سے جے پرکاش جی کانگریس پارٹی میں بڑھ رہی بدعنوانی اور تاناشاہی کے عمل دخل سے رنجیدہ خاطر ہو گئے تھے۔ مارکسزم سے اپنا موہ بھنگ ہونے کے بعد جے پرکاش جی سیاست اور حکومت و انتظامیہ میں شفافیت کے گاندھی جی کے آدرشوں کے تئیں زیادہ نزدیک ہو گئے تھے۔ 50 اور 60 کی دہائی میں انھوں نے اپنا بیشتر وقت کئی گاندھی وادی تنظیموں میں غیر سیاسی سماجی خدمت گزاری کے لئے وقف کیا۔ کبھی کبھی انھوں نے کشمیر اور ناگالینڈ جیسے قومی مسائل کو سلجھانے کی کوشش میں مدد کی۔ نہرو وادی سماج واد سے وہ دل برداشتہ ہو گئے تھے۔ وہ اندرا گاندھی کے 'غریبی ہٹاؤ' نعرہ کو کافی شک کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ وہ مانتے تھے کہ اس میں اصلیت کچھ بھی نہیں ہے بلکہ یہ سیاسی بہکاوا ہے۔

سب سے بڑھ کر، وہ مرکز اور ریاستوں میں کانگریسی حکومتوں میں بڑھ رہی بدعنوانیوں کی بدبو کو برداشت نہیں کر سکے۔ ان دنوں لوگ ماروتی کار پلانٹ کو اراضی الاٹمنٹ کرنے اور بینک کی مالی مدد کا التزام کرنے کے سلسلہ میں مشکوک ہو گئے تھے۔ اس سے وزیراعظم اندرا گاندھی بے چین ہونے لگی تھیں۔ ریزرو بینک آف انڈیا، دیگر متعدد بینکوں اور ہریانہ کی سابق کانگریس حکومت نے سوالات سے گھرے اس پروجیکٹ کے حق میں کئی قواعد و ضوابط کو پامال کر دیا۔ یہ بعد میں انکشاف ہوا کہ جو افسران ماروتی پروجیکٹ سے جڑی اطلاعات یکجا کر رہے تھے ان پر بھی پولس نگرانی رکھ رہی تھی کہ کہیں یہ لوگ اپوزیشن لیڈروں کو اطلاعات مہیا تو نہیں کرا رہے ہیں۔ ایک مرتبہ ایک رپورٹر نے جے پرکاش جی سے پوچھا 'وزیراعظم نے کہا ہے کہ وہ بدعنوانی کا مقابلہ کرنا چاہتی ہیں۔ بدعنوانی ختم کرنے کے آپ کے طریقہ

اوران کے طریقۂ کار میں کیا فرق ہے؟' ان کا جواب مثبت تھا 'ممکن ہے وہ زیریں سطح پر موجود بدعنوانی کے تئیں فکرمند ہیں اور میں اعلیٰ سطح پر موجود بدعنوانی سے لڑنا چاہتا ہوں'۔

اس وقت کے دو اہم واقعات سے جے پرکاش جی اس نتیجہ پر پہنچے کہ اعلیٰ سطح پر موجود بدعنوانی کو بے رحم اور عیار حکومت کے سامنے اپیل کرنے اور عرضی دینے سے نہیں لڑا جاسکتا۔ پہلا تھا 74-1973 میں گجرات میں مختلف طلبا تنظیموں کی تحریک کی ابتدا، جو چمن بھائی پٹیل کی قیادت والی مطلق العنان کانگریسی حکومت کو برخاست کرنے کا مطالبہ کررہے تھے۔ طلبا نے اپنی تحریک میں جے پرکاش جی کی مدد طلب کی اور جے پرکاش جی اس کے لئے تیار ہوگئے۔ احتجاجی مظاہرہ سے ریاست کا نظام درہم برہم ہوگیا۔ بالآخر کانگریس قیادت کو تحریک کاروں کے مطالبہ کے سامنے جھکنا پڑا۔ اس کے فوراً بعد دوسری بات یہ ہوئی کہ 'بہار طلبا جدوجہد کمیٹی' کے نام سے طلبا اور نوجوانوں کی تنظیموں کے مشترکہ مورچہ نے بے روزگاری اور بدعنوانی سمیت کئی مسائل کے حل کے سلسلہ میں تحریک چھیڑدی۔ یہاں بھی طلبا لیڈروں نے جے پرکاش جی سے رہنما ہدایت دینے کی اپیل کی۔

ان دونوں تحریکوں میں سنگھ کے ذریعہ قائم کردہ تنظیم اکھل بھارتیہ ودیارتھی پریشد نے اہم رول نبھایا۔ دراصل بہار طلبا تحریک کے دوران اے بی وی پی لیڈر کے این گووندا چاریہ سے میں پہلی مرتبہ ملا۔ ان کی سرگرمیوں سے میں متاثر ہوا اور ایک دہائی بعد میں نے انھیں پارٹی جنرل سکریٹری کے طور پر بی جے پی میں شامل کرلیا۔

'اگر جن سنگھ فاشسٹ ہے تو میں بھی فاشسٹ ہوں'

گجرات کی طرح بہار میں بھی کانگریس حکومت نے اپنی جبریہ طاقت سے پرامن تحریک کو کچلنے کی کوشش کی، جس سے مجبور ہوکر تحریک کاروں کو وزیراعلیٰ عبدالغفور کی برخاستگی اور اسمبلی تحلیل کرنے کا مطالبہ کرنا پڑا۔ 4 نومبر 1974 کو پٹنہ میں مختلف احتجاجی پدیاتراؤں میں سے ایک کی قیادت کرتے وقت جے پرکاش نارائن اور ان کے حامیوں پر پولس نے بے دردی کے ساتھ لاٹھی چارج کیا۔ اس میں جے پرکاش نارائن زخمی ہوکر زمین پر گرگئے۔ انھیں شدید چوٹ لگنے سے بچانے کے لئے ناناجی دیشمکھ آگے آگئے اور فوراً ان کے لئے ڈھال بنتے ہوئے خود پر لاٹھی کا حملہ جھیلتے رہے۔

جے پرکاش جی نے کہا 'اس طرح سے پہلے کبھی میری پٹائی نہیں کی گئی۔ میں نہیں جانتا کہ کبھی مہاتما گاندھی پر آنسو گیس کے گولے چھوڑے گئے، لیکن مجھے پہلی مرتبہ دونوں کا تجربہ ہوا۔ تحریک آزادی کے اس ہیرو کے ساتھ انتہائی ناروا سلوک نے قوم کے ضمیر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اٹل جی اور میں ان سے ملاقات کے لئے پٹنہ گئے۔ وہاں سے واپس لوٹ کر ہم نے پارلیمنٹ میں اس ایشو کو اٹھایا۔ 8 نومبر کو جے پرکاش جی کی قیادت میں پٹنہ کے گاندھی میدان میں ایک احتجاجی ریلی کا انعقاد کیا گیا، جس میں تقریباً 10 لاکھ لوگوں نے حصہ لیا۔ جن سنگھ کی جانب سے میں نے اس میں حصہ لیا۔ پٹنہ کی ریلی سے یہ واضح ہوگیا کہ جے پی تحریک بہار تک ہی محدود نہیں رہے گی، بلکہ اس میں ملک کے سیاسی ایجنڈے کی تبدیلی کا امکان ہے۔ یہ 'وسیع تر انقلاب' کے نئے ہدف سے بھی واضح ہوگیا تھا، جسے جے پرکاش جی نے ملک کے سامنے رکھا تھا۔

اس تحریک کے دوران جے پرکاش جی سمجھ گئے تھے کہ کسی ایک غیر سیاسی طلبا تنظیم یا کسی ایک غیر کانگریسی پارٹی کے بس کی بات نہیں ہے کہ وہ تنہا بدعنوانی اور جبر و استبداد کے سسٹم کے خطرہ کے خلاف جدوجہد کرے۔ اس سوچ نے انھیں تمام اپوزیشن پارٹیوں کے ساتھ ایک مشترکہ

جمہوریت حامی اور بدعنوانی مخالف مشترکہ اسٹیج کے قیام کے مقصد سے بات چیت کرنے کے لئے آ گیا۔ وہ کئی غیر کانگریسی پارٹیوں، خاص طور سے سامراجیوں کے دل میں جن سنگھ کے تئیں جو نفرت تھی، اس سے آشنا تھے۔ حالانکہ تب تک انھوں نے تہیہ کرلیا تھا کہ کانگریس حکومت کے خلاف طویل جدوجہد میں جن سنگھ کو شامل ہونے کے لئے مدعو کیا جائے۔ ایک دن انھوں نے اٹل جی اور مجھ سے بات کی اور کہا 'مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ آپ کو میری تحریک میں شامل ہونا چاہئے۔'

میں نے جے پرکاش جی کی تجویز پر بحث کے لئے پارٹی کے سینئر لیڈروں کی حیدرآباد میں میٹنگ طلب کی۔ دراصل میں نے جے پی تحریک کے توسط سے پورے ملک میں جن سنگھ کی مقبولیت اور عوامی رابطہ پھیلانے کا موقع دیکھا۔ میں نے اپنے افتتاحی تقریر میں کہا:

''ملک کو کانگریس کی مطلق العنان حکومت سے ضرور آزادی ملنی چاہئے، حالانکہ کوئی ایک پارٹی اس مقصد میں کامیاب ہونے کی حالت میں نہیں ہے۔ ہم جن سنگھ کے لوگ اپنے سیاسی سفر میں اس نکتہ پر پہنچ چکے ہیں، جہاں آگے ہمارا فروغ اور کانگریس کی بالادستی کا خاتمہ تبھی ممکن ہے جب ہم دوسرے ان لوگوں کو اپنے ساتھ ملائیں، جن کے مقاصد وہی ہیں، لہٰذا اگر ہم سیاسی نظریہ سے آگے بڑھنا چاہتے ہیں اور اس اہم موڑ پر ملک کی خدمت کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں جے پرکاش جی کی تجویز منظور کر لینی چاہئے۔''

حیدرآباد اجلاس میں اس تجویز کو منظور کر لیا گیا، جس کے نتیجہ میں جن سنگھ پہلی مرتبہ قومی سطح پر کئی غیر کانگریسی اور غیر کیمونسٹ پارٹیوں کے ساتھ نزدیکی تعلقات بنانے کی اہل ہوئی۔ اس دوران ان پارٹیوں کے کئی بڑے لیڈروں کے ساتھ میں نجی طور پر نزدیکی رابطہ بنا کر بات چیت کرنے میں کامیاب ہوا، وہ تھے جارج فرنانڈیز، مدھو لیمئے، مدھو ڈنڈوتے، چرن سنگھ، رام کرشن ہیگڑے، دیوگوڑا، کرپوری ٹھاکر وغیرہ۔

جے پرکاش جی نے جن سنگھ کو اپنی تحریک میں شامل ہونے کے لئے مدعو کیا اور ہم نے ان کی تجویز منظور کر لی۔ اس کا سی پی آئی اور سی پی آئی (ایم) میں تلخ ردعمل ہوا۔ سی پی آئی کا اعتراض سمجھ میں آنے والی بات تھی، کیونکہ یہ تو صرف نام کی غیر کانگریسی پارٹی تھی۔ ماسکو کے اشارے پر وہ اندرا گاندھی کے تئیں اتنی وفادار تھی جتنا کوئی اپنے راجا کے تئیں بھی نہیں ہوتا ہوگا۔ یہ اندرا گاندھی حکومت کی پالیسی اور کام کی حمایت کرتی تھی، جیسے تحریک آزادی کے وقت مشترکہ کیمونسٹ پارٹی نے کس طرح گاندھی جی، نہرو اور دیگر قوم پرست لیڈروں کو 'انگریزوں کا چاپلوس' قرار دیا تھا، ویسے ہی سی پی آئی نے جے پی تحریک کو 'امریکی سامراجیت' کا کام کہنا شروع کر دیا تھا۔

اس کے برخلاف سی پی آئی (ایم) کا برسراقتدار پارٹی سے ذرا اختلاف تھا، کیونکہ یہ مغربی بنگال اور کیرالا★ میں کانگریس کی مخالف تھی،

★ سی پی آئی (ایم) کے ایک خاص لیڈر، جو کہ ایمرجنسی کے سخت مخالف بھی رہے تھے، اے کے گوپالن (77-1904) ایک عظیم ایماندار اور آدرش وادشخص تھے۔ انھوں نے ایمرجنسی لگائے جانے کے خلاف پارلیمنٹ میں زوردار تقریر کی۔ میرے معاون آنجہانی جنا کرشنا مورتی کے مطابق (جو سال 2001 میں بی جے پی کے صدر بنے) جو کہ ایک زیرز میں کارکن کے طور پر گوپالن سے ان کی زندگی کے آخری مرحلہ میں اسپتال میں اکثر ملتے رہتے تھے۔ اس کیمونسٹ لیڈر نے ایمرجنسی کے خلاف جن سنگھ کی پرجوش مخالفت کی ستائش کی۔ کرشنا مورتی کے مطابق انھوں نے کہا 'میں چاہتا ہوں کہ ہم کیمونسٹ بھی اندرا گاندھی کے اقتدار کی مخالفت اتنی ہی مضبوطی سے کر پاتے جتنا کہ آپ کی پارٹی کر رہی ہے۔ کچھ ایسے عظیم نظریہ ہیں، جو اس طرح کے جرأت مندانہ کاموں اور قربانیوں کے لئے وقف کرنے کے قابل ہیں۔' ایمرجنسی کے دوران تمام قیدیوں اور ستیہ گرہیوں میں تقریباً 80 فیصد جن سنگھ سے تھے۔

ایک دیگر کیمونسٹ لیڈر، جن کا میں مداح رہا، وہ تھے پروفیسر ہیرین مکھرجی (2004-1907) وہ ایک بہترین ممبر پارلیمنٹ، ماہر تعلیم اور سینئر سی پی آئی لیڈر تھے۔ انھوں نے 11 رفروری 1968 کو جن سنگھ کے صدر پنڈت دین دیال اپادھیائے کے قتل کے بعد خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے.....(جاری)

لیکن جب اس نے بھی جے پرکاش جی کی مذمت اس لئے کی کہ انھوں نے جن سنگھ کو ہندوستان کے سیاسی نوتعمیراتی کام کے لئے اپنے اسٹیج میں شامل کرلیا تھا تو یہ واضح ہوگیا کہ سی پی آئی (ایم) کانگریس کے تئیں کم اور جن سنگھ سے زیادہ متفکر تھی۔ اچانک پورے کولکاتہ میں پوسٹر اور دیوار پر نعرے لکھے ہوئے دیکھے جاسکتے تھے، جن میں لکھا ہوا تھا' جے پی جن سنگھ ایک آشے (جے پی اور جن سنگھ ایک جیسے ہیں) سی پی آئی (ایم) کے سابق جنرل سکریٹری ای ایم ایس نمبودری پاد، جے پرکاش جی سے ملنے گئے اور انھوں نے کہا' اپنی تحریک میں شامل ہونے کے لئے آپ جن سنگھ جیسی رائٹسٹ اور فرقہ پرست پارٹی کو مدعو کیسے کرسکتے ہیں؟ آپ سے ہمیں ایسی امید نہیں تھی۔ سب سے اہم یہ کہ کیا آپ کو یاد نہیں، 1948 میں گاندھی جی کے قتل کے بعد جن سنگھ پر پابندی لگانے کا مطالبہ کرنے والی مہم میں آپ سرفہرست تھے؟ آپ نے 'آرگنائزر' کے دفتر کے سامنے سنگھ کے خلاف مظاہرہ کی قیادت بھی کی تھی۔ یہ ایک دھوکہ ہے۔'

6 / مارچ کو جے پی نے بہار تحریک کے ایک سال مکمل ہونے کے موقع پر پارلیمنٹ تک احتجاجی ریلی نکالنے کی اپیل کی۔ یہ کافی کامیاب رہی۔ جے پرکاش جی نے تمام حصہ لینے والی پارٹیوں کو اپنے الگ جھنڈے کے نیچے جمع ہونے کے بجائے ایک بینر کے نیچے آنے پر زور دیا تھا۔ اس وقت کی ان کی تقریر میں بے باک پیغام تھا:

> ''ہندوستان میں جیسے حالات پیدا ہو رہے ہیں، اگر ویسی صورت حال دنیا کے دیگر ممالک میں ہوتیں تو آسانی سے پرتشدد انقلاب آسکتا تھا، لیکن یہاں پر کانگریس حکمرانوں کے ذریعہ عوام کے اعتماد کے ساتھ مسلسل کھلواڑ کئے جانے کے بعد بھی صرف پرامن ڈھنگ سے عوام احتجاجی ریلی کا انعقاد کررہی ہے۔ ہندوستانی جمہوریت کے مستقبل کے لئے یہ بہتر ہے، حالانکہ میں امید کرتا ہوں کہ وزیراعظم پارلیمنٹ تک اس مارچ کے پیغام کو سمجھنے کی کوشش کریں گی۔ میں ان سے کہتا ہوں، اب تم اپنا طریقہ کار تبدیل کرو ورنہ بے شمار عوام تمہیں اقتدار سے بے دخل کردیں گے۔''

پارلیمنٹ تک کے احتجاجی مارچ میں جن سنگھ کو شامل کرکے جے پرکاش جی نے ظاہر کردیا تھا کہ مارکسواد کے اعتراض پر انھوں نے توجہ نہیں دی، لیکن اگلے دن جن سنگھ میں اپنے یقین کے اظہار میں انھوں نے کچھ مزید بیباکی کا اظہار کیا، جس نے ہماری پارٹی کے مخالفین اور دوستوں سبھی کو حیرت زدہ کردیا۔ 7 / مارچ کو ہماری پارٹی نے دہلی میں قومی اجلاس طلب کیا تھا، جس میں تمام ریاستوں سے اس کے تقریباً

(گزشتہ کا بقیہ) دہلی کے رام لیلا میدان میں کل جماعتی میٹنگ میں ایک دل کو چھو لینے والی تقریر کی۔ ان کا نام 1982 کے صدارتی انتخاب میں کانگریس پارٹی کے گیانی ذیل سنگھ کے خلاف مشترکہ امیدوار کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔ اس پر جب بی جے پی کی رائے مانگی گئی تو میں نے کہا' ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے، چونکہ ہم پروفیسر مکھرجی کی عزت کرتے ہیں۔' میرے مثبت جواب نے کمیونسٹ گلیاروں میں لوگوں کو حیرت زدہ کردیا۔ ان کی امیدواری ممکن نہیں ہوسکتی تھی، کیونکہ ان کا نام ووٹر لسٹ میں نہیں تھا، تب ہم نے جسٹس ایچ آر کھنہ کو ایک عام امیدوار کے طور پر منتخب کیا، جو ایمرجنسی کے ایک ہیرو تھے۔

یہاں میں بیان کرنا چاہوں گا کہ تری دیو چودھری، جو کہ ریولیشنری سوشلسٹ پارٹی کے ایک معزز لیڈر تھے، کو 1974 کے صدارتی انتخاب میں کانگریس کے فخرالدین احمد کے خلاف مشترکہ اپوزیشن امیدوار بنایا گیا۔ جن سنگھ کے صدر کے طور پر میں نے چودھری کے ساتھ ریاست کی راجدھانیوں کا دورہ کیا تاکہ غیر کانگریسی ممبران پارلیمنٹ کی حمایت کو متحد کیا جاسکے۔ ایک دن انھوں نے مجھے بتایا' مجھے جن سنگھ کے تئیں خاصا لگاؤ ہے، کیونکہ میری نوجوانی کے دوران مجھے سنگھ کے بانی ڈاکٹر کیشو بلی رام ہیڈگوار سے ملاقات کرنے کا موقع ملا، جو کہ بنگال کی انوشیلن کمیٹی (جدوجہد آزادی کے لئے لڑنے والا ایک انقلابی گروپ) کے ایک ممبر تھے۔ میں ان کی حب الوطنی سے نہایت متاثر تھا۔'

40 ہزار رہنما پورے دن کے اس خصوصی اجلاس میں حصہ لے سکیں۔ اس سیشن کے شروع ہونے سے قبل 23 رفروری کو مجھے جن سنگھ کا دوسری مرتبہ صدر بنایا گیا۔ میں نے اپنے سینئر ساتھیوں کو مشورہ دیا کہ ہمیں اس سیشن میں جے پرکاش جی کو وی آئی پی کے طور پر شرکت کے لئے مدعو کرنا چاہئے۔

لیکن انھوں نے کہا 'کیا جے پرکاش جی آئیں گے؟' میں نے کہا 'ہم کوشش کیوں نہیں کرتے؟' اٹل جی اور میں جے پرکاش جی سے ملنے گئے اور ہم نے اپنا مطالبہ ان کے سامنے رکھا۔ وہ بآسانی تیار ہو گئے۔

یہ خبر ملک کے سیاسی گلیاروں میں بجلی کی طرح کوندگئی۔ کئی لوگوں نے انھیں ایسا کرنے سے روکنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا 'جے پرکاش جی، آپ جن سنگھ جیسی فاشسٹ پارٹی کے بہت نزدیک ہوتے جا رہے ہیں۔' انھوں نے جن سنگھ کے اس اجلاس میں اپنے ناقدین کے سوال کا جواب دیتے ہوئے پرزور الفاظ میں کہا 'میں اس سیشن میں ملک کو یہ بتانے کے لئے آیا ہوں کہ جن سنگھ نہ تو فاشسٹ پارٹی ہے اور نہ ہی ری ایکشنری۔ اس بات کا میں جن سنگھ کے فلیٹ فارم سے ہی اعلان کرنا چاہتا ہوں۔ اگر جن سنگھ فاشسٹ ہے تو جے پرکاش نارائن بھی ایک فاشسٹ ہے۔' اگلے دن انھوں نے جو کچھ کہا وہ حقیقت میں سچ تھا۔ فاشسٹ کا سورج طلوع ہو رہا ہے۔ دراصل برسراقتدار پارٹی میں تیز رفتاری سے فاشزم کا سورج طلوع ہو رہا تھا۔

8

دو واقعات: جنھوں نے تاریخ بدل دی

مطلق العنان حکومت ہر جگہ خود کو قائم کرلیتی ہے اور اجتماعی مفاد کے نام پر خود کو اقتدار میں بنائے رکھتی ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ آئینی تاناشاہی یقینی طور پر مکمل مطلق العنان حکومت کو جنم دیتی ہے۔

کے سبا راؤ (ہندوستان کے سابق چیف جسٹس
15/مارچ 1975 کو نئی دہلی میں ایک سمینار سے خطاب کرتے ہوئے)

اگست 1974 میں وی وی گری کے صدر کے طور پر پانچ سال کی مدت مکمل کرنے پر صدارتی انتخاب ہوئے۔ پارلیمنٹ اور ریاستی اسمبلیوں میں کانگریس کی اکثریت کے مدنظر اس کے امیدوار فخرالدین علی احمد کا انتخاب طے تھا۔

اس الیکشن سے قبل اس انتخاب کے لئے ووٹر لسٹ کے خاکہ پر اپنی پارٹی کی جانب سے سپریم کورٹ میں مجھے بحث کرنے کا ایک موقع ملا۔ مدت پوری کرنے والے صدر وی وی گری نے دفعہ 143 کے تحت سپریم کورٹ سے مشورہ طلب کیا کہ ووٹر لسٹ کے نامکمل رہتے ہوئے کیا صدارتی انتخاب کروائے جاسکتے ہیں؟ یہ مسئلہ نوتشکیل کمیٹی کے اہم مطالبہ کی حمایت میں کانگریس (او) کے لیڈر مرار جی ڈیسائی کے مارچ 1974 میں غیر معینہ بھوک ہڑتال کئے جانے کے بعد گجرات اسمبلی تحلیل کئے جانے سے پیدا ہوئی تھی۔

عدالت نے مختلف سیاسی پارٹیوں سے اپنی رائے رکھنے کے لئے کہا۔ اس نے جن سنگھ کے لئے ایک چھوٹا سا مسئلہ پیدا کردیا کہ کس وکیل سے سپریم کورٹ میں اپنے حق میں بحث کرنے کے لئے کہا جائے؟ اٹل جی مجھ سے بولے 'یہ کام آپ خود کیوں نہیں کرلیتے؟ آخر آپ نے بھی قانون پڑھا ہے اور آپ اس معاملہ کو کسی دوسرے کے مقابلہ خود زیادہ اچھی طرح سے جانتے ہیں۔' دراصل میں نے گورنمنٹ لا کالج، بمبئی سے ایل ایل بی کی تعلیم حاصل کی تھی، لیکن کبھی بھی پیشہ کے طور پر قانونی میدان کو میں نے نہیں اپنایا تھا اور نہ ہی تب تک کسی عدالت میں کسی معاملہ میں بحث کی تھی۔ پھر بھی، میں اٹل جی کے مشورہ سے راضی ہوگیا۔

اس طرح، اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ 7 ججوں والی کسی مخصوص ڈویژن بنچ کے سامنے میں نے بحث شروع کی۔ جب میں نے ایک گھنٹہ تک بولنے کے بعد اپنی بحث کو روکا تو ڈویژن بنچ کے جج نے مجھ سے پوچھا 'کیا آپ وکیل ہیں؟ آپ نے اپنا موقف بہت ہی بہتر ڈھنگ سے

پیش کیا ہے۔'

میں نے جواب دیا 'نہیں مائی لارڈ، میں نے قانون کی پڑھائی کامیابی کے ساتھ مکمل کی ہے۔ میں ایک سیاسی کارکن ہوں اور کسی عدالت میں وکیل کے طور پر میں پہلی مرتبہ پیش ہوا ہوں۔' ہندوستان کے چیف جسٹس این این رے اور جسٹس ایچ آر کھنہ اور جسٹس وائی وی چندر چوڑ وہاں موجود تھے۔

سپریم کورٹ کے ایک مایہ ناز وکیل فالی نریمن نے مجھ سے بعد میں کہا 'آڈوانی جی، میں آپ کی بحث سے بہت متاثر ہوں۔ اگر آپ کبھی سیاست چھوڑنے کا فیصلہ لیتے ہیں تو آپ کے سامنے ایک متبادل پیشہ ہے۔' اس کیس میں جن سنگھ کی بات نہیں چل پائی، کیونکہ سپریم کورٹ نے فیصلہ دیا کہ کسی اسمبلی کا تحلیل ہونا صدارتی انتخاب میں رکاوٹ نہیں ہے۔ پھر بھی، اس معاملہ نے مجھے خوداعتمادی دی کہ میں کسی قانونی معاملہ پر بھی بحث کرسکتا ہوں۔

مرار جی ڈیسائی اور کانگریسی برتری کے خلاف منظم سیاسی کارروائی کا آغاز

زندگی میں کسی سلسلہ پر آپ کسی شخص سے ملتے ہیں تو شاید ہی جانتے ہیں کہ بعد میں کسی بالکل ہی مختلف تناظر میں غیر متوقع طور سے آپ دونوں انھیں ایشوز پر ایک دوسرے کے نزدیک ہوجائیں گے، جنھیں آپ دونوں مکمل کرنا چاہتے ہیں۔ ہندوستانی فلسفہ سے متاثر سوئس ماہر نفسیات کارل جونگ کی ایک کتاب میں میں نے اس سلسلہ میں پڑھا تھا۔ اسے انھوں نے 'سنکرونیسیٹی' کہا ہے۔ جونگ کہتے ہیں 'یہ لوگوں کے درمیان بامقصد ایک ملن ہے، جو کہ حیثیت اور تعلقات کی ایک اندرونی بحر ہے، جو شروع میں نظروں سے اوجھل ہوتی ہے اور جسے براہ راست مقاصد کے تناظر میں واضح بھی نہیں کیا جاسکتا ہے۔ ایسی اہم، اکثر زندگی کو بدل دینے والی، ملاقات ہر شخص کی زندگی میں ہوتی ہے۔'

میں اپنی زندگی میں جے پرکاش نارائن سے پہلی ملاقات کو 'سنکرونیسیٹی' کا نمونہ مانتا ہوں۔ ایسا دوسرا واقعہ ہے 'آرگنائزر' کے صحافی کے طور پر 60 کی دہائی کے وسط میں مرار جی ڈیسائی کے ساتھ پہلی ملاقات، اس وقت مجھے نہیں معلوم تھا کہ ایک دہائی بعد میں جے پرکاش جی کی حوصلہ افزائی سے جن سنگھ اور مرار جی ڈیسائی کی پارٹی کانگریس (او) کے مابین نزدیکی رشتہ قائم کرنے کے لئے ان کے ساتھ نہایت قریب سے کام کروں گا اور کچھ یادگار سالوں کے دوران میں ان کی وزارت عظمیٰ میں ایک وزیر کے طور پر کام کروں گا۔ پرعزم گاندھی وادی مرار جی ڈیسائی کے دل میں بھی 50 اور 60 کی دہائیوں میں جن سنگھ کے تئیں منفی جذبات تھے۔ یہ میرے لئے بہت ہی پراطمینان بات ہے کہ میں سنگھ اور جن سنگھ کے تئیں ان کا موقف تبدیل کرنے میں کامیاب رہا۔

اپنے ساتھیوں کے درمیان 'مرار جی بھائی' کے طور پر مقبول مرار جی ڈیسائی نے گجرات میں جلد اسمبلی الیکشن کرائے جانے کے مطالبہ کو لے کر تا مرگ بھوک ہڑتال کر کے عوام کے درمیان اپنی عظمت قائم کر لی تھی۔ گجرات اسمبلی کو مقررہ مدت سے ایک سال قبل ہی تحلیل کردیا گیا۔ ان کے دو دیگر مطالبے بھی بہت اہم تھے۔ 1971 میں بنگلہ دیش جنگ کے دوران لگائی گئی خارجی ایمرجنسی، جو اس وقت بھی جاری تھی، کو ختم کرنا اور اندرا گاندھی کی حکومت سے یہ یقین دہانی کرانا کہ وہ سیاسی مخالفین کے خلاف 'میسا' (مینٹینینس آف انٹرنل سیکورٹی ایکٹ) کے تحت قانون کا استعمال نہیں کریں گی۔ جب انھوں نے بھوک ہڑتال شروع کی تھی، اس وقت وہ اسی برس کے ہوچکے تھے۔ ان کی بھوک ہڑتال کے ساتویں دن اندرا گاندھی کو جھکنا پڑا اور گجرات اسمبلی کے الیکشن کے لئے 9 رجون کی تاریخ مقرر کی گئی۔

جے پرکاش جی کی رہنمائی میں چار پارٹیوں کانگریس (او)، جن سنگھ، سوشلسٹ پارٹی اور لوک دل نے گجرات میں جنتا مورچہ کے نام سے ایک پرچم تلے الیکشن لڑنے کا فیصلہ لیا۔ ریاست میں کانگریس (او) اہم پارٹی تھی۔ نئے انتخاب کرانے کی جدوجہد میں بھی اس پارٹی کے لیڈر آگے تھے۔ فطری طور پر ہم نے مرارجی کی قیادت میں الیکشن لڑنے کا فیصلہ لیا۔

جن سنگھ کے صدر کے طور پر سیٹوں کی تقسیم اور الیکشن سے متعلق دوسرے اُمور پر مجھے مرارجی بھائی کے ساتھ معاہدہ کرنا پڑا تھا۔ میں نے انھیں بہت ہی واضح اور عمل پسند پایا۔ اس عرصہ میں ان کے ساتھ جو نزدیکی روابط رہے اور باہمی اعتماد میں اضافہ ہوا تھا، وہ دو سالوں کے بعد جب جنتا پارٹی کی حکومت کی تشکیل ہوئی تو بہت معاون رہے۔

ان دنوں جے پرکاش جی اور ان کے کچھ نزدیکی ساتھیوں کا خیال تھا کہ تمام غیر کمیونسٹ پارٹیوں کا ایک سیاسی پارٹی میں انضمام ہوجانا چاہئے۔ اس ایشو پر جن سنگھ کا نظریہ تھا کہ فوری طور پر انضمام نہ تو ممکن ہے اور نہ ہی سودمند، حالانکہ مکمل طور سے انضمام کے لئے اتفاق رائے اور کوشش کرنے کی سمت میں پیش رفت اور یقینی قدم اٹھانے کے ہم لوگ حق میں تھے۔ نومبر 1974 میں جموں میں پارٹی کی قومی مجلس عاملہ نے مشورہ دیا کہ جے پی تحریک میں حصہ لینے والی تمام پارٹیوں کے الیکشن کو جدوجہد کی سیاست کی توسیع کے طور پر ماننا چاہئے اور اس کے لئے اس سے منسلک انتخابی حکمت عملی پر کام کرنا چاہئے۔ آنے والے تمام ضمنی انتخاب میں انھیں ایک مشترکہ امیدوار میدان میں اتارنا چاہئے۔ امیدوار کا اس کی اپنی پارٹی کا انتخابی نشان ہوسکتا ہے، لیکن انھیں خود کو 'جنتا امیدوار' کے طور پر مشتہر کرنا چاہئے۔

جن سنگھ نے اس حکمت عملی کی عمل آوری بھوپال کے ضمنی انتخاب میں کی۔ بابولال گوڑ، جو بعد میں مدھیہ پردیش کے وزیر اعلیٰ منتخب ہوئے، تمام غیر کمیونسٹ پارٹیوں کے مشترکہ امیدوار بنے۔ انھیں اس ضمنی انتخاب میں زبردست کامیابی حاصل ہوئی۔ اس کے بعد جبل پور لوک سبھا سیٹ کے لئے ضمنی انتخاب ہوا۔ یہاں پر سوشلسٹ امیدوار شرد یادو کو مشترکہ جنتا امیدوار کے طور پر میدان میں اتارا گیا۔ شرد یادو ابھی جنتا دل (یو) کے صدر ہیں، وہ بھی کامیاب ہوئے۔ جلد ہی ہریانہ میں ضمنی انتخاب ہوئے، جس میں یہی حکمت عملی اپنا کر اپوزیشن نے کامیابی حاصل کی۔

> مارچ 1975 میں جن سنگھ کے سربراہ اجلاس میں، میں نے اپنی صدارتی تقریر میں جن سنگھ کے کردار کی وضاحت اس طرح کی:
> ''ہندوستانی سیاسی پس منظر آج کل رفتار پذیر ہے۔ تمام اپوزیشن پارٹیوں کو متحد کرنے میں جے پی تحریک کا بہت توانائی بخش اثر رہا ہے۔ ایسا اس لئے ہوا کہ اس تحریک کا اہم ایشو پارٹی نظریہ نہیں ہے۔ اس تحریک کی حصہ دار تمام سیاسی پارٹیاں اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ جب تک یہ تحریک ایسا مستحکم اور منظم نظام قائم نہیں کرتیں، جسے عوام ملک میں متبادل حکومت بنانے والی پارٹی مان سکیں، تب تک اس تحریک کے مقصد کو مکمل طور پر حاصل نہیں کیا جاسکتا۔
>
> ایک نظریہ یہ ہے کہ تحریک میں شامل تمام پارٹیوں کا اپنی علیحدہ شناخت مسترد کرکے جلد ہی ایک پارٹی کی صورت میں انضمام ہوجانا چاہئے اور کانگریس پارٹی کو اقتدار سے بے دخل کرنے پر دھیان مرکوز کرنا چاہئے۔ یہ نظریہ اس لئے پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکا، کیونکہ صرف کانگریس واد کی مخالفت دیگر پارٹیوں کو متحد کرنے کی مضبوط بنیاد نہیں ہے۔ ہم سوچتے ہیں کہ اخلاقی اتحاد ضروری ہے، لیکن کسی پارٹی کے لئے کثیر جہتی مقاصد کی تبدیلی کا قائد بننے کے لئے، جو کہ اخلاقی اتحاد سے بھی زیادہ اہم ہے، نچلے سطح سے لے کر اعلیٰ سطح تک دوستی اور باہمی اعتماد کا جذبہ پیدا کرنا ضروری ہے۔

اس یقین اور خود اعتمادی کو ایک ساتھ کام کر کے اور ایک ہی مقصد کے لئے جدو جہد کر کے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ بہار تحریک اور اس کے دیگر ریاستوں میں اثر پھیلنے سے اس مقصد کو حاصل کرنے کا ہمیں ایک بہترین موقع ملا ہے، لہٰذا ہم اس تحریک کو توسیع دیں اور اس کی رفتار کو تیز کریں۔ اس طرح پارلیمنٹ میں ایک مشترکہ گروپ بنانے، کم از کم مشترکہ پروگرام پر مبنی، مقصد پر مبنی انتخابی حکمت عملی، مشترکہ جنتا امیدوار اور مشترکہ انتخابی نشان ایسی تدابیر ہیں، جن کے سہارے ہم مانتے ہیں کہ ہم کانگریس کا ایک منظم متبادل فراہم کر سکتے ہیں۔''

گجرات الیکشن کے نتائج کا اعلان 12 رجون کو کر دیا گیا۔ جنتا مورچہ نے کانگریس کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔ آزادی کے وقت سے گجرات کانگریس کا نا قابل تسخیر قلعہ تھا، لیکن مرار جی ڈیسائی کی قیادت میں جنتا مورچہ کے ہاتھوں وہ مسمار ہوا۔ کانگریس (او) کے سینئر لیڈر بابو بھائی پٹیل کو گجرات کا نیا وزیر اعلیٰ منتخب کیا گیا۔

اگر اس خبر کے نظریہ سے یہ ایک اہم دن تھا تو 12 رجون اس سے بھی اہم ایک اور واقعہ کے لئے یاد کیا جائے گا، جو حقیقت میں سیاسی زلزلہ لانے والی خبر تھی۔ یہ کیا تھی؟ قابل افسوس ہے کہ اس بات کے لئے ستاروں کے اشارے پہلے ہی مل چکے تھے۔ آگے کی کہانی پڑھیں۔

'پنڈت جی آپ کے ستارے کیا کہتے ہیں؟'

میں نے عوامی زندگی میں کئی سیاسی لیڈروں کو دیکھا ہے جو علم نجوم پر شدت سے یقین رکھتے ہیں۔ میں نے بہت سے اصلی اور نقلی جیوتشوں کو بھی دیکھا ہے جو سیاسی لیڈروں کے دروازہ پر دستک دیتے رہتے ہیں۔ جب جنتا حکومت میں آپسی رنجش کی شروعات ہوئی تو میں نے اقتدار کی ہوس رکھنے والے سیاسی لیڈروں کو مشتعل کرتے اور انھیں ایک دوسرے سے لڑاتے ہوئے جیوتشیوں کو دیکھا ہے۔

اس لئے عام طور پر میں نے خود کو جیوتشیوں سے دور رکھا، حالانکہ ایک ایسا واقعہ ہوا، جس نے جیوتش اور جیوتشیوں کے تئیں جو میرے دل میں جو زبردست غیر یقینی تھی، اسے ہلا کر رکھ دیا۔ ہماری پارٹی کے ایک کارکن ڈاکٹر وسنت کمار پنڈت بمبئی کے ایک مشہور پیشہ ور جیوتشی تھے۔ وہ علم نجوم میں پی ایچ ڈی تھے۔ وہ مہاراشٹر اسمبلی کونسل کے 18 سالوں تک رکن رہے اور اس کے بعد 1977 سے 1984 تک راج گڑھ، مدھیہ پردیش سے لوک سبھا کے رکن بھی رہے۔

12 رجون 1975 کو دو واقعات رونما ہوئے، جو ملک میں سیاست کی سمت تبدیل کرنے والے تھے، جیسا کہ میں نے ابھی ذکر کیا ہے، گجرات اسمبلی انتخاب کے نتائج کا اعلان ہوا تھا اور اس میں کانگریس زبردست شکست سے دوچار ہوئی تھی۔ دوسرا واقعہ بلاشبہ تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ سماج وادی لیڈر راج نارائن کے ذریعہ دائر عرضی پر الٰہ آباد ہائی کورٹ نے فیصلہ سنایا، جس میں جسٹس جگموہن لال سنہا نے وزیر اعظم اندرا گاندھی کو انتخابی خلاف ورزی کا قصوروار قرار دیا۔ انھیں تین بنیادوں پر قصوروار پایا گیا۔ بے ایمان انتخابی حرکتیں، حد سے متجاوز انتخابی خرچ اور پارٹی مفاد کے لئے سرکاری مشنری اور افسروں کا ناجائز استعمال۔ جسٹس صاحب نے نہ صرف رائے بریلی سے ان کے لوک سبھا انتخاب کو مسترد قرار دیا بلکہ ان پر 6 سالوں تک لوک سبھا الیکشن لڑنے پر بھی پابندی عائد کر دی۔

ان دو واقعات سے، خاص طور پر دوسرے سے کانگریس پارٹی میں مایوسی کی لہر دوڑ گئی، جبکہ غیر کانگریسی پارٹیوں میں خوشی کا ماحول۔ اس کے فوراً بعد ماؤنٹ آبو میں جن سنگھ کی قومی مجلس عاملہ کی میٹنگ طلب کی گئی۔ ظہرانہ کے بعد قیلولہ کرتے وقت میں نے مہاراشٹر سے مجلس عاملہ کے

ممبر ڈاکٹر پنڈت سے سرسری طور پر پوچھا' پنڈت جی، آپ کے ستارے کیا کہتے ہیں؟'

ان کا جواب سنتے ہی میں سنجیدہ ہو گیا۔ انھوں نے کہا' آڈوانی جی، صاف طور سے میں نہیں جانتا، میرے خود کے تجزیہ نے ہی مجھے الجھن میں ڈال رکھا ہے۔'

ان کی باتوں سے حیرت زدہ ہو کر میں نے پوچھا' آپ کے کہنے کا مطلب کیا ہے؟'

ان کا جواب اشاریہ تھا' میں جو ستاروں کے اشارے سمجھ پاتا ہوں، اس سے لگتا ہے کہ ہم لوگ دو سالوں کے لئے بے دخل ہونے والے ہیں۔'

میں مزید الجھن کا شکار ہو گیا۔' اس میں بے دخلی کی بات کہاں سے آ گئی، پنڈت جی؟ سب کچھ کانگریس کے خلاف جا رہا ہے۔ وزیر اعظم نے پارلیمنٹ کی اپنی رکنیت کھو دی ہے۔ ان کی پارٹی گجرات میں الیکشن ہار گئی ہے۔ آپ جو کہہ رہے ہیں، وہ بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے؟'

انھوں نے کہا' آڈوانی جی، میں بھی نہیں سمجھ رہا ہوں، لیکن ستاروں کے اشارے ایسے ہی ہیں۔'

جون کے خاتمہ سے پہلے ہی ہماری بے دخلی شروع ہو گئی تھی — انیس ماہ کی قید کے طور پر۔

مارچ 1975: ایک دوررس سمینار — 'ایمرجنسی ہٹاؤ'

میں پوری ایمانداری سے نہیں کہہ سکتا کہ ہم میں سے کوئی جانتا تھا کہ ہمیں ایمرجنسی کی صورت میں جیل میں مصائب کا شکار ہونا پڑے گا، بلکہ ہم میں سے بیشتر' خارجی ایمرجنسی' پر متفکر تھے، جو اس وقت جاری تھی۔' داخلی ایمرجنسی' کا اعلان ہونے سے 3 ماہ قبل مارچ 1975 میں دین دیال جی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نے نئی دہلی میں ایک سمینار کا انعقاد کیا۔ اس کا عنوان' ایمرجنسی ہٹاؤ' میں ایک رازدارانہ دور اندیشی تھی۔ اس سمینار کا انعقاد' خارجی ایمرجنسی' کے خلاف رائے عامہ تیار کرنے کے مقصد سے کیا گیا تھا۔' خارجی ایمرجنسی' کا اعلان 1971 میں بنگلہ دیش مکتی سنگرام کے دوران کیا گیا تھا، جس کی اب ضرورت نہیں رہ گئی تھی۔ اس سلسلہ میں ہم میں سے کوئی کچھ بھی نہیں جانتا تھا کہ اس خارجی ایمرجنسی کو ہٹانا تو دور، اندرا گاندھی کی حکومت جلد ہی داخلی ایمرجنسی کی شکل میں انتہائی جابر جمہوریت مخالف حکمرانی نافذ کرنے والی ہیں۔

عہد جنگ میں حکومت کے ہاتھ میں جو غیر معمولی طاقت آ گئی تھی، اس کے جاری رہنے سے ہندوستان کی سیاسی، عدالتی اور دانشور طبقوں میں کئی لوگ محتاط ہو گئے تھے۔ جے پی تحریک اور 1974 کی تاریخی ریل ہڑتال جیسی کئی جدوجہد کے دوران کانگریس حکومت کے انتہائی پرتشدد لائحہ عمل کے مدنظر انھوں نے محسوس کیا کہ ہندوستان میں جمہوریت پر لگام کسنے کے لئے خارجی ایمرجنسی کے قانون کو جاری رکھنا جائے گا، لہٰذا سمینار بہت کامیاب ثابت ہوا۔ اس کا افتتاح ہندوستان کے سابق چیف جسٹس کے سباراؤ نے کیا۔ اس میں جے پی، ناناجی دیشمکھ، جسٹس گرودور، جسٹس کے ایس ہیگڑے اور رپی جیسی جیسے چنندہ شخصیت نے حصہ لیا۔

سمینار میں اپنے لکچر میں میں نے کہا کہ خارجی ایمرجنسی کو ہٹانے کے لئے عدالتی کوششوں کے مقابلہ میں پارلیمنٹ اور صدر جمہوریہ کی جانب سے زیادہ سرگرمی کی ضرورت ہے۔ میں نے کہا کہ آئین میں ترمیم کی جا سکتی ہے۔ جس طرح ریاست میں صدر راج نافذ کرنے پر اسے وقت بہ وقت جائزہ کے تحت رکھا جاتا ہے، اسی طرح ایمرجنسی کے اعلان کے تحت قانون بنائے جا سکتے ہیں۔ بعد کے سلسلہ وار واقعات نے یہ ثابت کر دیا کہ مقننہ اور ماہر آئین آنے والے دنوں میں بدعنوان حکومت کے خلاف جدوجہد میں جو اہم کردار نبھاتے، وہ میری توقعات سے کم تھے۔

ملک کی سیاسی صورت حال کے تجزیہ میں میں نے کہا 'برسر اقتدار پارٹی اس کشمکش میں ہے کہ اگر آج الیکشن ہوں تو وہ ہار جائے، لہٰذا کانگریس پارٹی دفعہ 83(2) کا استعمال کر سکتی ہے، جو لوک سبھا کی مدت میں اضافہ کے سلسلہ میں ہے۔ اس طرح موجودہ لوک سبھا کی مدت 1976 سے آگے بڑھ سکتی ہے۔ الیکشن سے بچنے کے لئے حکومت کے پاس یہی راستہ نظر آ رہا ہے۔ بنگلہ دیش کی طرح ہندوستان میں ایک پارٹی اقتدار کا نظام نافذ کرنے کی کوشش کی جا سکتی ہے۔ ایمرجنسی جاری رہنے کو ایک علیحدہ واقعہ کے طور پر نہیں دیکھا جا سکتا ہے۔ اسے منصوبہ بند طریقہ سے جمہوری اداروں کو کچلنے کی مہم سے جوڑ کر دیکھنا چاہئے جو گزشتہ کئی سالوں سے جاری و ساری ہے۔'

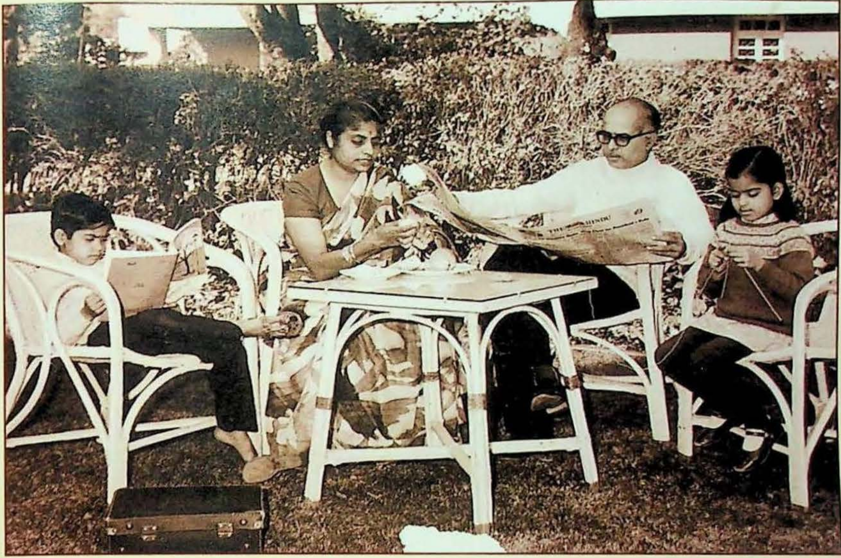
میں نے پرزور الفاظ میں کہا کہ 'جے پی تحریک کو حیرت انگیز طریقہ سے پذیرائی اس سچائی کے سبب ملی ہے کہ ملک میں جمہوری اقدار کا کافی نقصان ہوا ہے، لہٰذا جے پی تحریک کو مضبوط بنانے اور مطلق العنان حکومتی نظام کے خلاف جدو جہد میں ساتھ دینا کا ہر شہری کا فرض ہے۔ رائے عامہ کتنی بھی کمزور اور نحیف کیوں نہ ہو، پھر بھی برسر اقتدار پارٹی کی تاناشاہی حکمت عملی سے چھٹکارا پانے کی وہی بہتر ترکیب ہے۔'

یہ تاناشاہی حکمت عملی 25/جون 1975 کی آدھی رات کو اپنا زہریلا دانت دکھانے والی تھی۔

نئے دور کا آغاز



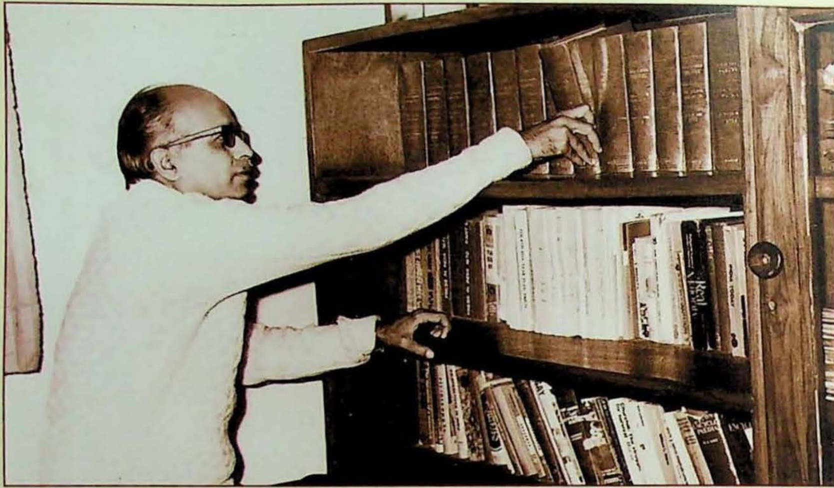
▲ فروری 1965ء میں شادی کے دن اہلیہ کملا کے ساتھ آڈوانی۔



▲ 1973ء میں پنڈارا پارک میں واقع اپنی رہائش گاہ میں اہلیہ کملا اور بچوں جینت اور پرتبھا کے ساتھ۔



◄ مشفق والد اور استاد، آڈوانی اپنے بچوں کو پڑھاتے ہوئے۔



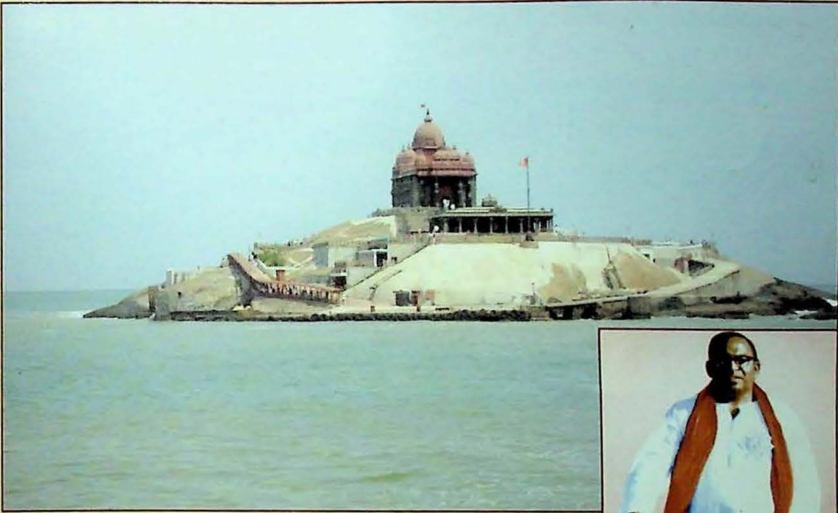
▲ کتابوں کے شوقین اڈوانی پنڈارا پارک میں واقع اپنی لائبریری میں



▲ دس سالہ بیٹی پرتبھا کی بنائی ہوئی قلمی تصویر



◄ اہلیہ کملا کے ساتھ خوشگوار لمحے



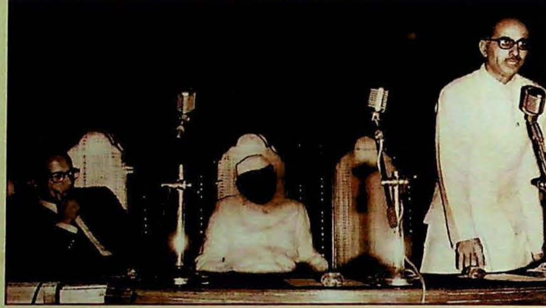
▲ کنیا کماری میں بین الاقوامی شہرت یافتہ مشہور عالم وویکانند یادگار شلا (انسیٹ) اس کے قائم کرنے والے شری ایکناتھ راناڈے۔ یادگار کی تعمیر کے لئے عوامی حمایت وتعاون حاصل کرنے دلّی میں قائم کمیٹی کے سکریٹری کے طور پر آڈوانی نے تعاون دیا۔

▼ (بائیں سے دائیں) سماج وادی رہنما ڈاکٹر رام منوہر لوہیا اور جن سنگھ کے مقتدر رہنما پیتامبر داس، پنڈت دین دیال اُپادھیائے اور نانا جی دیش مکھ۔





▲ 1967 میں سابق وزیراعظم اندرا گاندھی اور ساتھی پارٹی لیڈر و سابق چیف ایگزیکیوٹو کونسلر وجے کمار ملہوترا کے ساتھ۔



◀ برسرکار افسران کی قومی کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے آڈوانی۔ ہمراہ ہیں سابق لوک سبھا اسپیکر ڈاکٹر نیلم سنجیوا ریڈی جو بعد میں صدر جمہوریہ بنے۔



▲ دلی میٹروپولیٹن کونسل کے ساتھیوں کے ساتھ۔ 1967ء میں آڈوانی کونسل کے صدر بنے۔



▲ 1973 میں کانپور میں جن سنگھ کے صدر کی حیثیت سے چراغ روشن کرتے ہوئے آڈوانی۔



▲ کانپور میں جن سنگھ کے صدر منتخب ہونے کے بعد آڈوانی کا پر جوش استقبال



▲ 1973ء میں جن سنگھ کے کانپور اجلاس میں
پارٹی کارکنوں کی ضیافت کرتے ہوئے آڈوانی۔



◄ کانپور میں اٹل جی اور دیگر پارٹی کارکنان کے
ذریعہ آڈوانی کا خیر مقدم



◄ ایک پارٹی میٹنگ کی صدارت کرتے ہوئے آڈوانی
اور دائیں جانب پرانے ساتھی جگناتھ جوشی۔



▲ نئی دہلی کے بوٹ کلب پر ایک ریلی میں آڈوانی۔ ساتھ میں مدن لال کھرانہ (دائیں) اور کیدار ناتھ ساہنی (بائیں)



◄ ایک میٹنگ میں اٹل جی کے ساتھ تبادلۂ خیال کرتے ہوئے آڈوانی۔

▼ پارٹی کی جانب سے منعقد مظاہرے میں کنور لال گپتا اور دہلی پردیش جن سنگھ کے رہنماؤں کے ساتھ اڈوانی، بالکل دائیں جانب جگدیش پرساد





▲ 1974ء میں ایمرجنسی سے کچھ عرصہ قبل اندرا گاندھی کی مطلق العنان حکومت کو چیلنج کرتے ہوئے راج ماتا وجے راجے سندھیا اور اٹل جی کے ساتھ۔

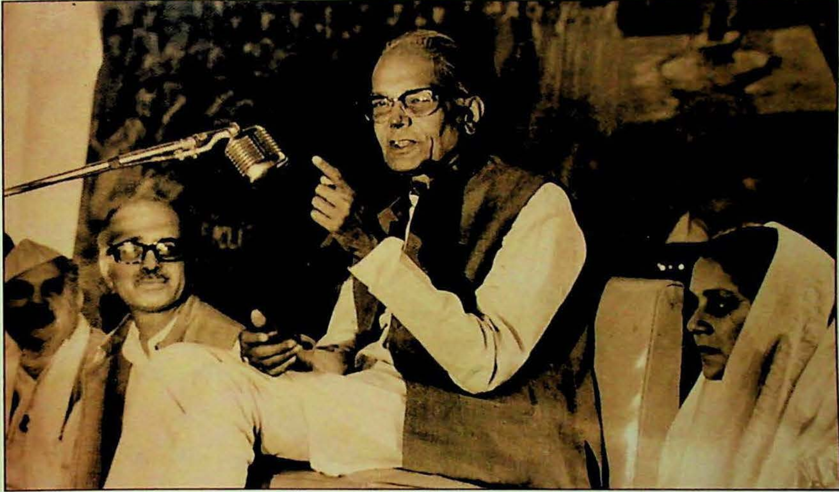


◄ جن سنگھ کے اجلاس کو خطاب کرتے ہوئے آڈوانی، ہمراہ ہیں اٹل جی اور ڈاکٹر بھائی مہاویر۔

▼ سابق سرسنگھ چالک بالا صاحب دیورس ناگپور میں سالانہ وجے دشمی تقریب میں آر ایس ایس کارکنان کو خطاب کرتے ہوئے۔



جمہوریت کے لئے جدوجہد



▲ 1975 میں لوک نائک جے پرکاش نارائن ایک عوامی جلسے کو خطاب کرتے ہوئے، اس موقع پر انہوں نے کہا تھا ''اگر جن سنگھ فاسشٹ ہے تو میں بھی فاسشٹ ہوں۔''



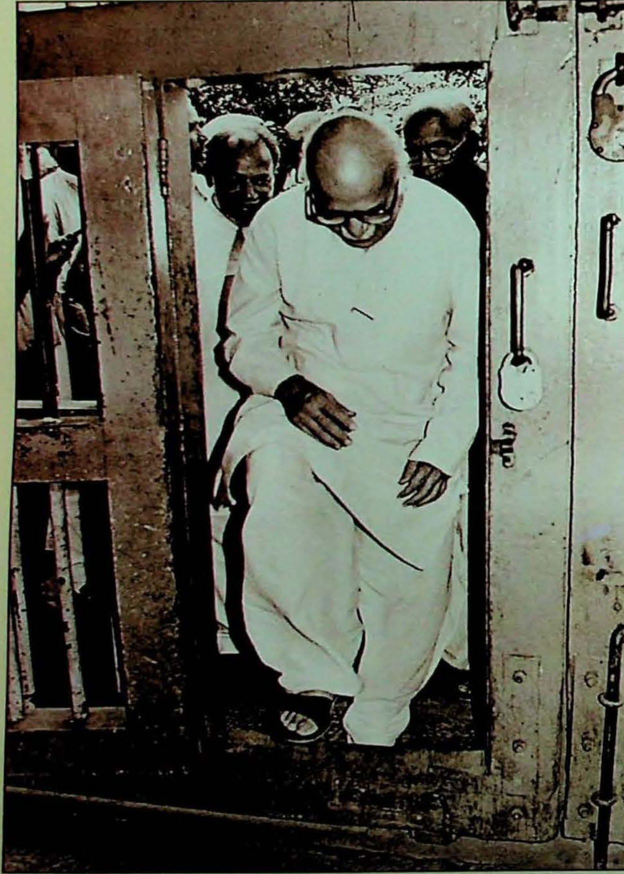
▲ 1974 میں جے پرکاش نارائن نے مطلق العنان تاناشاہی کے خلاف عوامی بیداری مہم کے تحت سارے ملک میں تحریک چلائی۔



▲ ایمرجنسی کے دوران حکومت کی منشا کے مطابق فیصلہ نہ دینے کی پاداش میں سپریم کورٹ کے چیف جسٹس ہنسراج کھنہ کو بہت ستایا گیا۔



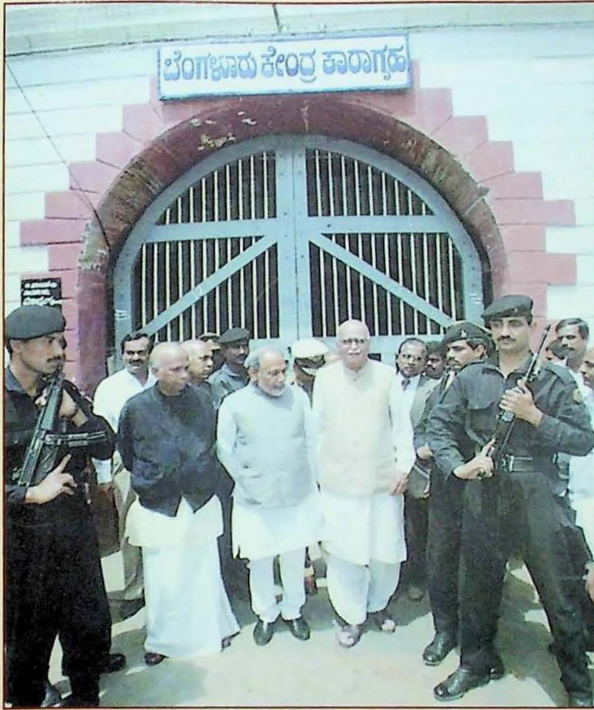
▲ سنگھ کے مقتدر رہنما دتوپنت ٹھینگری جنہوں نے ایمرجنسی کے خلاف روپوش (انڈرگراؤنڈ) مہم چلائی۔

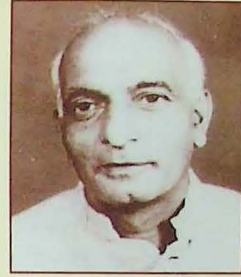


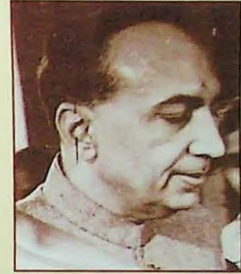
▲ 2000 میں ایمرجنسی کی پچیسویں سالگرہ کے موقع پر آڈوانی بنگلور سنٹرل جیل میں داخل ہوتے ہوئے جہاں ایمرجنسی کے دوران انہیں اُنیس مہینے قیدی بنا کر رکھا گیا تھا۔



▲ ایمرجنسی کے خلاف خفیہ مہم کے ایک اہم رہنما جارج فرنانڈیز ہتھکڑی سے بندھے عدالت لے جاتے ہوئے۔







▲ ایمرجنسی کے دو ہیرو مدھو دنڈوتے اور ایس این مشرا بھی بنگلور جیل میں آڈوانی کے ساتھ قید میں تھے۔

▲ کرناٹک کے دو سابق وزرائے اعلیٰ رام کرشن ہیگڑے اور جے ایچ پٹیل کے ساتھ بنگلور سینٹرل جیل کے سامنے آڈوانی۔ یہ دونوں بھی ایمرجنسی میں آڈوانی کے ساتھ اسی جیل میں تھے۔



◄ مشہور کارٹونسٹ ابو ابراہام کا مشہور عالم کارٹون جس میں ہندوستان کے سابق صدر جمہوریہ فخرالدین علی احمد کو باتھ ٹب میں غسل کرتے ہوئے ایمرجنسی کے نفاذ کے حکم نامے پر دستخط کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔



▲ 1977ء میں ایمرجنسی ہٹنے کے بعد جنتا پارٹی مختلف غیر کانگریسی جماعتوں کو متحد کرنے کا وسیلہ بنی۔ تصویر میں آڈوانی کے ساتھ مرارجی ڈیسائی،
آچاریہ جے بی کرپلانی، مدھو دنڈوتے، راج نارائن و دیگر مقتدر رہنما۔



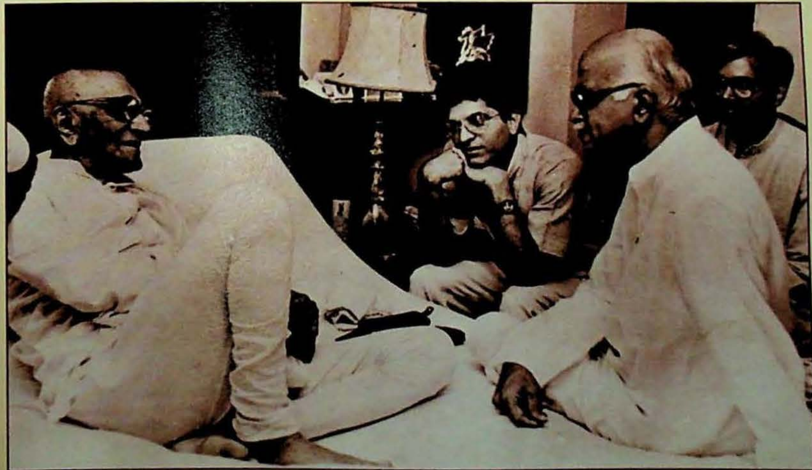
▲ نئی دہلی کے بوٹ کلب پر منعقد ایک ریلی میں آڈوانی کے ساتھ ملائم سنگھ یادو، ہیم وتی نندن بہوگنا، رام دھن، این ٹی راماراؤ اور دیگر سیاسی رہنما۔



◄ جے پرکاش نارائن اپنے ساتھی اور جن سنگھ کے اہم رہنما نانا جی دیشمکھ کے ساتھ۔ (درمیان میں) 1977 میں جنتا پارٹی کی تاریخی کامیابی کے بعد وزیراعظم مرار جی ڈیسائی کے ساتھ آڈوانی۔

▼ ممبئی میں مرار جی کی رہائش گاہ پر آڈوانی۔







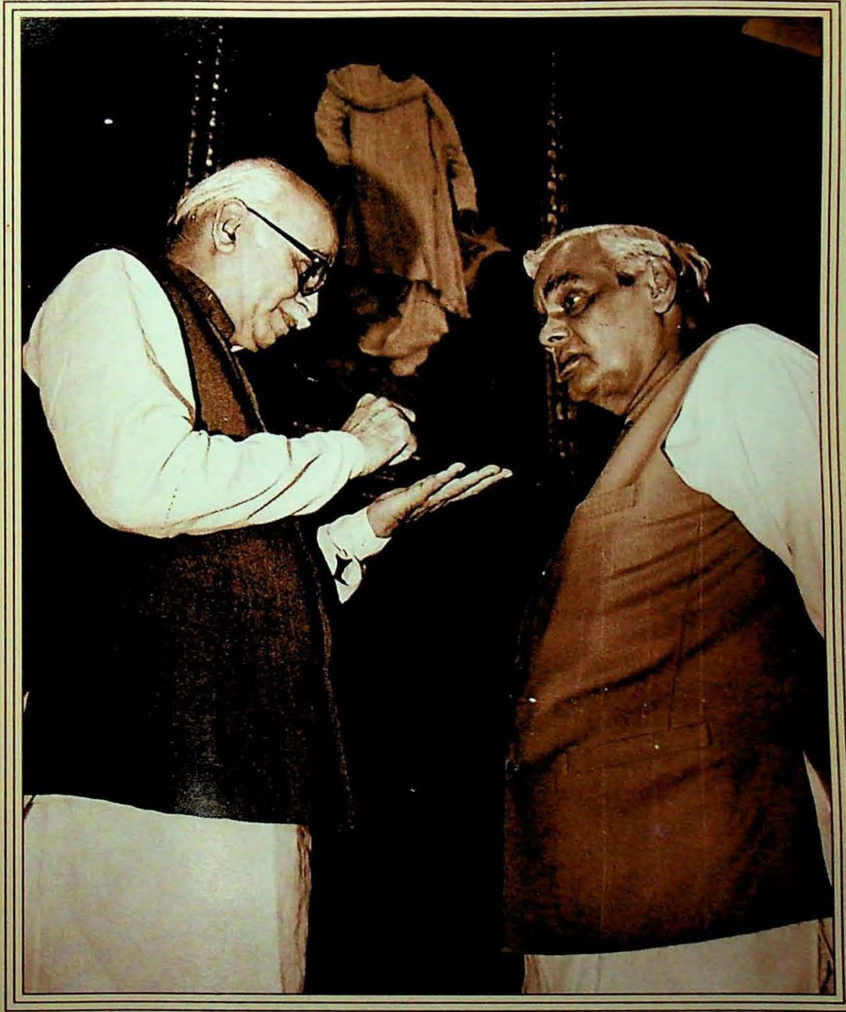
▲ جگدیش پرساد ماتھر اور راج ماتا وجے راجے سندھیا
کے ساتھ آڈوانی۔



◀ ایمرجنسی کے خلاف آل انڈیا ودیارتھی پریشد کی
جدوجہد کے دو سرگرم رہنما ارُون جیٹلی اور ایم وینکیا نائڈو
یہ دونوں اصحاب بی جے پی کے نہایت اہم لیڈر ہیں۔



▲ 1988 میں غیر کمیونسٹ حزب اختلاف کے رہنما بیجو پٹنائک، وی پی سنگھ، این ٹی راما راؤ، رام کرشن ہیگڑے، اٹل بہاری واجپئی،
چندر شیکھر، ہیم وتی نندن بہوگنا اور دیوی لال۔



سیاسی زندگی میں خوشگوار اور طویل المدت تعلقات باہمی اعتماد، احترام کے جذبے اور مشترکہ عظیم مقاصد کے لیے خلوصِ نیت کی بنیاد پر قائم ہو سکتے ہیں۔ اقتدار کی سیاست ٹکراؤ پیدا کرتی ہے اور مسابقت و مقابلہ کو جنم دیتی ہے۔ لیکن نظریاتی اور ذہنی ہم آہنگی پر مبنی بااُصول سیاست کی بات ہی الگ ہے۔

9

ایمرجنسی: جیل میں جمہوریت

آزادی میری زندگی کا ایک روشن مینار ہے اور یہ ہمیشہ سے ایسا ہی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ آزادی صرف میرے ملک کی آزادی سے آگے بڑھ کر ہر مقام پر شخص کی، ہر طرح کے بندھنوں سے آزادی کا منتر بن گئی ہے۔ میرے لئے اس کا مطلب ہے انسانی وجود کی آزادی، ذہن کی اور روح کی آزادی، یہ آزادی میری زندگی کی سانس بن گئی ہے اور میں روٹی، سلامتی، ترقی، ملک کے وقار یا کسی بھی دیگر چیز کے لئے اس سے سمجھوتہ نہیں کرسکتا۔

— لوک نائک جے پرکاش نارائن

تاریخ کا ہر دور کسی بڑے نظریات کا معالج ہوتا ہے، جسے کئی سائنسدانوں اور سیاسی مفکروں نے 'اجتماعی دل' کہا ہے۔ جب یہ نظریات بیشتر لوگوں کے دل و دماغ پر حاوی ہو جاتے ہیں، تب وہ تاریخ کی طاقت بن جاتی ہے۔ اس نظریہ سے دیکھنے پر پتہ چلے گا کہ بیسویں صدی کی بیشتر تحریک باہمی طور پر دو بڑے نظریات سے متاثر تھی، آزادی اور جمہوریت۔

آزادی کی تلاش میں کئی غلام قوموں نے نوآبادیاتی حکومت کے خلاف جدوجہد کیا، حالانکہ قوم کی آزادی کے لئے ان میں سے بیشتر جدوجہد کی شروعات اٹھارویں اور انیسویں صدی میں ہوئی، لیکن ان کے نتائج خاص طور سے بیسویں صدی میں حاصل ہوئے۔ قوم کی آزادی کے ساتھ دیگر خواہشات اور امیدوں نے بھی جنم لیا، جیسے راج شاہی، فوجی تاناشاہی، بدانتظام کیونسٹ پارٹی اور دیگر طرح کے جارح نظام کے خلاف عوامی حکومت کی امیدیں۔ قومی آزادی کے لئے جدوجہد تو بیرونی طاقت کے خلاف کرنا پڑی، لیکن جمہوریت کے لئے جدوجہد داخلی حکمراں نظام کے خلاف کرنا پڑی۔ کئی ممالک میں قوم کی آزادی کے لئے مہم جتنی مشکل تھی تقریباً اتنی ہی مشکل جمہوریت کے لئے جدوجہد تھی — اور اسے اتنے ہی پرتشدد طریقہ سے کچل دیا گیا۔ آنے والے تاریخ نویس یہ درج کریں گے کہ دو عالمی جنگ اگر بیسویں صدی کے افق پر داغ ہیں تو آزادی اور جمہوریت کی جیت اس دور کی مایہ ناز کامرانیاں ہیں۔

ہندوستان میں ہم لوگ خوش قسمت رہے کہ ہمارے پڑوسی ممالک اور دنیا کے دیگر ممالک کی طرح 1947 میں برطانوی حکومت سے آزاد

ہونے کے بعد ہمیں جمہوریت کے لئے علیحدہ جنگ نہیں لڑنی پڑی۔ ہندوستان کی آزادی میں جمہوریت اتنے ہی آسان طریقہ سے آئی جیسے کہ یہاں پر سیکولرازم فطری طور پر تھا، اس سلسلہ میں، میں بعد میں بات کروں گا۔ ان دونوں نظریات کی فطری منظوری خاص طور سے ہندوستان کے ہندوازم کے سبب ہوئی۔ انسانی تاریخ میں ہمیشہ ایسی مثال رہی ہے کہ کوئی نظریات کتنی بھی روادار کیوں نہ ہو اور ان کی جڑیں ملک کی ثقافتی، روحانی زمین کتنی ہی گہری کیوں نہ ہوں، لیکن ایسا نہیں ہوا ہے کہ وہ غرور اور اقتدار کے ہوس پرستوں کے حملہ سے ہمیشہ بچ گئی ہوں۔ جب ایسا حملہ ہوتا ہے تو جس نظریہ پر حملہ ہوتا ہے، کچھ دیر کے لئے اس پر گہن لگ جاتا ہے، لیکن گہن کے اس وقت کا دور ہی تاریکی کو دور کرنے کے لئے جدوجہد کے تئیں اور غیر تباہ کن نظریہ کی نہ ختم ہونے والی روشنی کو بکھیرنے کے لئے عظیم عوامی سیلاب کو حوصلہ فراہم کرتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ قوم کو معقول سبق دینے اور اس کے توسط سے اس نظریہ کے لئے اپنے عزائم بحال کرنے کے لئے تاریخ جان بوجھ کر ایسی اگنی پریکشا کے حالات پیدا کرتی ہے۔

یہی سب کچھ جون 1975 میں ہندوستان میں ہوا، جب وزیراعظم اندرا گاندھی نے ہندوستان پر ظالمانہ ایمرجنسی حکومت کا اطلاق کر کے جمہوریت پر گہن لگا دیا۔ انیس ماہ کے بعد کانگریس پارٹی کی تاناشاہی کے خلاف ہندوستانی عوام کی مایہ ناز تحریک کے نتیجہ میں یہ گہن ختم ہوا۔ اگر ایمرجنسی آزاد ہندوستان کی تاریخ میں ایک تاریک دور تھی تو جمہوریت کی بحالی کے لئے کی گئی فاتح تحریک سب سے روشن باب۔ میں اپنے ہزاروں ہم وطنوں کی طرح ایمرجنسی کے مکمل انیس ماہ کی مدت جیل میں گزارنے کے سبب اس کا گنہگار اور ایمرجنسی کے خلاف جنگ میں جیت حاصل کرنے والی جمہوری فوج کا ایک سپاہی — دونوں صورتوں میں تھا۔

جون 1975 کے دو مایوس کن واقعات

ہندوستان کی آزادی کے ساٹھ سالوں پر نظر ڈالنے پر پتہ چلتا ہے کہ ان چھ دہائیوں میں دو تاریخیں ایسی ہیں جنہیں کبھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے اور یہ دونوں جون 1975 سے جڑی ہوئی ہیں۔

ان میں سے ایک ہے — 12 رجون۔ تمام سیاسی ماہرین کو حیرت میں ڈالتے ہوئے گجرات اسمبلی انتخابات میں اندرا کانگریس کو زبردست شکست ہوئی۔ دوسری، اسی دن الٰہ آباد ہائی کورٹ نے رائے بریلی سے اندرا گاندھی کی لوک سبھا کی رکنیت کو رد کر دیا اور اس کے ساتھ ہی انتخابات میں بدعنوانی پھیلانے کی بنیاد پر انھیں 6 سالوں کے لئے الیکشن لڑنے کا نااہل قرار دے دیا۔

دوسری تاریخ ہے — 25 رجون۔ جمہوریت نوازوں کے لئے یہ تاریخ آزاد ہندوستان کی تاریخ میں سب سے سیاہ دنوں میں سے ایک کے طور پر یاد رکھی جائے گی۔ اس بدقسمتی سے بھری تاریخ سے واقعات کا ایک سلسلہ پھوٹ پڑا، جس نے دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کو دنیا کی دوسری سب سے بڑی تاناشاہی میں تبدیل کر دیا۔

دہلی میں جون کے مہینے میں سب سے زیادہ گرمی ہوتی ہے، لہٰذا جب دل بدل کے خلاف مجوزہ قانون سے متعلق مشترکہ پارلیمانی کمیٹی نے باغیچوں کے شہر بنگلور، جو کہ موسم گرما میں بھی اپنی خوشنما آب و ہوا کے لئے مشہور ہے، میں 27-26 جون کو اپنی میٹنگ کرنے کا فیصلہ لیا تو مجھے کافی خوشی ہوئی۔ ہم دونوں — اٹل جی اور میں — اس کمیٹی کے رکن تھے، جس کے کانگریس (او) کے لیڈر شیام نندن مشرا بھی رکن تھے۔ حالانکہ جب 25 جون کی صبح میں دہلی کے پالم ہوائی اڈہ پر بنگلور جانے والے طیارہ پر سوار ہوا تو مجھے اس بات کا ذرا بھی خیال نہیں تھا کہ یہ سفر دو سال کی طویل مدت کے لئے میرے 'نرواسن' کی شروعات ہے، جس کے سلسلہ میں ماؤنٹ آبو میٹنگ کے دوران پارٹی ممبر پارلیمنٹ اور مشہور جیوتش

ڈاکٹر وسنت کمار پنڈت نے 'پیشین گوئی' کی تھی۔

لوک سبھا کے افسروں نے بنگلور ہوائی اڈہ پر میرے ہم سفر مشرا اور میری رہنمائی کی۔ ریاستی اسمبلی کی عظیم عمارت کے پاس واقع ایم ایل اے ہوسٹل پر ہمیں لے جایا گیا۔ اٹل جی ایک دن پہلے ہی وہاں پہنچ چکے تھے۔ اس مشترکہ پارلیمانی کمیٹی کے صدر تھے کانگریس پارٹی کے دربارا سنگھ، جو بعد میں پنجاب کے وزیر اعلیٰ کے عہدہ پر فائز ہوئے۔

26 رجون کو صبح 7:30 بجے میرے پاس جن سنگھ کے مقامی دفتر سے ایک فون آیا۔ دہلی سے جن سنگھ کے سکریٹری رام بھاؤ گوڈ بولے کا ضروری پیغام تھا۔ وہ کہہ رہے تھے کہ آدھی رات کے فوراً بعد جے پرکاش نارائن، مرارجی ڈیسائی اور دیگر اہم لیڈروں کو گرفتار کرلیا گیا ہے۔ گرفتاری جاری ہے۔ پولس جلد ہی اٹل جی اور آپ کو گرفتار کرنے کے لئے پہنچنے والی ہوگی۔ میں نے یہ خبر شیام بابو کو دی۔ اس کے بعد ہم لوگ ایک ساتھ اٹل جی کے کمرے میں گئے۔ اس سلسلہ میں مختصر بات چیت کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ ہم لوگ گرفتاری سے بچنے کی کوشش نہیں کریں گے۔

8:00 بجے آکاش وانی سے خبر سننے کے لئے میں نے ریڈیو چلایا۔ مجھے آکاش وانی نیوز ریڈر کی جانی پہچانی آواز کی جگہ پر اندرا گاندھی کی غمگین آواز سنائی دی۔ یہ ان کی قوم کے نام خطاب کی جانے والی خصوصی نشریات تھی۔ اس خبر کے ساتھ کہ صدر جمہوریہ نے آئین کی دفعہ 352 کے تحت ایمرجنسی کا اعلان کردیا ہے۔ انھوں نے یہ بھی وضاحت کی کہ داخلی بدامنی سے نمٹنے کے لئے ایمرجنسی نافذ کرنا ضروری تھا۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں ہوا، جب میں نے انھیں یہ کہتے ہوئے سنا کہ اپوزیشن کی بہت بڑی سازش سے ملک کو بچانے کی ضرورت ہے، اس کے ساتھ ہی ان کا خود ساختہ الزام یہ تھا کہ کچھ ایسے عناصر ہیں جو جمہوریت کے نام پر ہندوستان کی جمہوریت کو مٹانے کے لئے کوشاں تھے اور اسے روکنے کی ضرورت تھی۔

اٹل جی اور میں نے مشترکہ پریس ریلیز تیار کی، جس میں جے پرکاش★ اور دیگر لیڈروں کی گرفتاری کی مذمت کی گئی۔ ایمرجنسی پر نکتہ چینی کی گئی اور اعلان کیا گیا کہ 26 رجون 1975 کی وہی تاریخی اہمیت ہوگی جو آزادی سے قبل 9 راگست 1942 کی ہے، جب مہاتما گاندھی نے برطانوی حکمرانوں سے کہا تھا 'بھارت چھوڑ دو' حالانکہ یہ ریلیز ایک ناکام کوشش تھی۔ لوگوں تک اس پیغام کو پہنچانے کا کوئی وسیلہ ہی نہیں تھا، کیونکہ ایمرجنسی کے اعلان کے ساتھ ہی حکومت نے تاناشاہی کی جانی پہچانی روایت کے مطابق پریس پر سنسر شپ نافذ کردی تھی۔ آزادی کے بعد پہلی مرتبہ پریس پر مکمل طور پر سنسر شپ★★ نافذ کی گئی تھی۔

★ اندرا گاندھی کے ذریعہ ایمرجنسی نافذ کئے جانے کے فیصلہ کے خلاف اور اپوزیشن لیڈروں کو جیل میں ڈالنے کی مخالفت میں سب سے سخت بیان جے پرکاش نارائن کا ہے۔ انھوں نے کہا 'جب عقل کام نہیں کرتی تو تباہی آتی ہے۔

★★ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ ایک تصوراتی جمہوریت نواز نے جذباتی انداز میں 'ٹائمس آف انڈیا' کے 27 رجون 1975 کے شمارہ میں 'اوبی چیوریز (موت کی خبریں) کے حصہ میں درج ذیل بیان شائع کیا:

(D'Ocracy-D.E.M. beloved husband of T.ruth, loving father of L.I, Bertie, brother of Faith, hope, justice expired on 26th June)

'جمہوریت، سچائی جس کا پیارا خاوند ہے، آزادی جس کے والد ہیں اور یقین، امید اور انصاف جس کے بھائی ہیں، کا 26 رجون 1975 کو انتقال ہوگیا'

پولس ہم لوگوں کو گرفتار کرنے کے لئے صبح 10:00 بجے آئی۔ مشہور سماج وادی لیڈر مدھو دنڈوتے بھی ایک دیگر پارلیمانی کمیٹی کی میٹنگ میں شرکت کے لئے بنگلور میں موجود تھے، انھیں بھی گرفتار کرلیا گیا۔ ہم چاروں کو بنگلور سنٹرل جیل لے جایا گیا۔ اس دن میری ڈائری★ میں درج ہے '26 ر جون 1975 کا دن ہندوستانی جمہوریت کی تاریخ کا آخری دن ہوسکتا ہے۔ امید کرتا ہوں کہ میرا یہ خوف غلط ثابت ہو۔'

کیسے سیاسی زلزلہ نے دہلی کو ہلایا؟

اگلے انیس ماہ تک جیل ہی میری رہائش گاہ تھی۔ مجھے اس وقت تک اس بات کی جانکاری نہیں تھی کہ 25 ر جون کے اس بدقسمت دن کو قومی راجدھانی میں کس طرح وہ سیاسی زلزلہ آیا، یہاں تک کہ اس سلسلہ میں کابینہ کی منظوری لئے بغیر اور اس میں بحث کئے بغیر وزیر اعظم اندرا گاندھی نے ایمرجنسی کے اعلان سے متعلق نوٹیفکیشن جاری کرنے کے لئے صدر جمہوریہ فخر الدین علی احمد کے دستخط لے لئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی دفعہ 14 (قانون کی نظر میں مساوات کے حقوق)، دفعہ 21 (زندگی اور انفرادی آزادی کے حقوق) اور دفعہ 22 (مخصوص معاملوں میں گرفتاری اور قید کے خلاف سیکورٹی) کے تحت بنیادی حقوق کی عمل آوری کے لئے عدالت میں اپیل کرنے کے حق کو صدر جمہوریہ نے دفعہ 359 کے تحت سلب کرنے کی ہدایت جاری کی۔ اس طرح جمہوریت کا گلا گھونٹنے کا فیصلہ نہایت غیر جمہوری طریقہ سے لیا گیا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اندرا گاندھی اور ان کے نزدیکی صلاح کار آئینی ضابطوں کو کس طرح نظرانداز کرتے تھے۔

یقیناً 26-25 جون کے واقعات کا بہترین خاکہ بشن این ٹنڈن کی 'پی ایم او (پرائم منسٹر آفس) ڈائری' میں کھینچا گیا ہے، جسے ایمرجنسی کے خاتمہ کے 25 سالوں بعد شائع کیا گیا۔ بہترین آئی اے ایس افسر مسٹر ٹنڈن اس وقت وزیر اعظم دفتر میں جوائنٹ سکریٹری تھے اور پنڈارا پارک میں وہ میرے پڑوسی ہوا کرتے تھے۔ بعد میں ان کے بھائی گوپال ٹنڈن وزارت اطلاعات ونشریات میں میرے خصوصی معاون بنے۔ اتفاق سے 1996 میں واجپئی جی کے تیرہ دن کے وزیر اعظم دور کے دوران بشن ٹنڈن کو ان کا چیف سکریٹری مقرر کیا گیا۔ وزیر اعظم دفتر میں پیش ہونے والی 1975 کی روزمرہ کے واقعات کے سلسلہ میں مسٹر ٹنڈن کی ڈائری سے اس وقت کی سیاسی کارفرمائیوں پر روشنی ڈالی جاسکتی ہے، جہاں خوف اور بزدلی نہ صرف کانگریس پارٹی کے نچلی سطح کے کارکنان میں موجود تھی بلکہ حیرت انگیز طریقہ سے مرکزی کابینہ اور عزت مآب صدر جمہوریہ دفتر میں بھی۔ وہ لکھتے ہیں★★:

> ''جب میں دفتر سے نکل رہا تھا، اس وقت وزیر اعظم کے چیف انفارمیشن سکریٹری شاردا پرساد نے فون کرکے مجھے بتایا 'تم نے ضرور سنا ہوگا، سب کچھ ختم ہوگیا۔' ان کی آواز میں کافی مایوسی جھلک رہی تھی۔ دفتر پہنچ کر میں سیدھے شاردا کے کمرے میں گیا۔ وہ جو کچھ جانتے

★ انیس ماہ تک جیل میں رہنے کے دوران اپنے معمولات زندگی، خیالات اور ساتھی قیدیوں کے ساتھ ہوئی بات چیت کو میں اپنی ڈائری میں درج کرتا تھا۔ اس ڈائری کے اندراجات کو ملاکر اسے ایمرجنسی ختم ہونے کے بعد 1977 میں 'اے پریزنرس اسکریپ بک' کے نام سے کتاب کی شکل میں شائع کیا گیا۔ بعد میں اس کتاب کا ہندی ترجمہ 'نظر بند لوک تنتر' کے نام سے پربھات پرکاشن نے شائع کیا۔ اس کتاب میں جمہوریت کے تحفظ میں نکالے گئے پانچ پرچے بھی ہیں، جن کا استعمال تاناشاہی مخالف کارکنان نے ایمرجنسی کے دوران زیرزمین ادب کے طور پر کیا تھا۔ کتاب کا پیش لفظ سابق وزیر اعظم آنجہانی مرارجی ڈیسائی کے ذریعہ لکھا گیا ہے۔ اس باب میں کئی جگہوں پر میں نے اپنی اس ڈائری کا مضمون درج کیا ہے۔

★★ بشن ٹنڈن کی تحریر کردہ پی ایم او ڈائری-1، پری لیوڈ ٹو دی ایمرجنسی، کونارک پبلشر، 2003، صفحہ 16-414

تھے اس سلسلہ میں مجھے گوش گزار کرایا۔ گزشتہ رات 10:00 بجے دیوکانت بروا اور سدھانت شنکر رے وہاں پر موجود تھے، جب پروفیسر ڈی پی دھر اور شاردا پرساد وہاں پہنچے تو وزیراعظم نے ان سے کہا 'میں نے ایمرجنسی نافذ کرنے کا فیصلہ لے لیا ہے۔ اس پر صدر جمہوریہ رضامند ہو گئے ہیں۔ کل میں اس کی اطلاع کابینہ کو دوں گی۔' یہ کہتے ہوئے انھوں نے ایمرجنسی کے اعلان نامہ سے متعلق خاکہ پروفیسر ڈی پی دھر کے ہاتھ میں تھما دیا۔ وہ اور شاردا حیرت زدہ رہ گئے۔ انھیں صرف یہ مطلع کرنے اور بعد کی افواہی تشہیر کے سلسلہ میں ان کی صلاح کے لئے وہاں طلب کیا گیا تھا۔ وزیراعظم نے انھیں قوم سے خطاب کرنے کے لئے ایک تقریر تیار کرنے کے لئے کہا۔ رات کے 1:00 بجے تک وہ وزیراعظم کی رہائش گاہ پر تھے۔ صبح 6:00 بجے کابینہ کی میٹنگ ہونے والی تھی۔

کابینہ کی میٹنگ میں ایک بھی وزیر نے ایمرجنسی کی مخالفت نہیں کی۔ یہ نہایت ہی تشویشناک بات ہے۔ دفعہ 77 کے تحت درج ضابطوں کے مطابق صدر جمہوریہ کے ذریعہ ایمرجنسی کا اعلان جاری کرنے سے قبل کابینہ کی میٹنگ لازمی ہے، لیکن قاعدوں کے تحت یہ بھی فراہم کیا گیا ہے کہ اگر وزیراعظم ایسا کرنا ضروری سمجھتے ہوں تو اس سلسلہ میں وہ کابینہ سے صلاح لئے بغیر فیصلہ لے سکتے ہیں، لیکن سوال یہاں پر یہ ہے کہ کیا ایمرجنسی کے سلسلہ میں بحث کرنے کے لئے کابینہ کی میٹنگ طلب نہیں کی جاسکتی تھی؟ وزیراعظم نے اکیلے یہ فیصلہ لیا۔ ایسا کیوں ہوا؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ صدر جمہوریہ نے ان حالات میں وزیراعظم کی صلاح کیوں مانی؟ وہ کوئی غیر آئینی کام نہیں کرتے، اگر وہ وزیراعظم سے کہتے کہ وہ اس سلسلہ میں پوری کابینہ کی صلاح لینا چاہتے ہیں اور ان کی رائے جاننا چاہتے ہیں۔ میری جانکاری میں یہ پہلا موقع ہے جب اتنا اہم فیصلہ صدر جمہوریہ نے صرف وزیراعظم کی صلاح پر لے لیا ہو۔''

مشہور صحافی ڈی آر مانلیکر، جنہیں میں جانتا تھا اور جن کے تئیں میرے دل میں کافی عزت تھی، کے ذریعہ ایمرجنسی ہٹنے اور اس کے بعد لوک سبھا انتخابات میں کانگریس کی شرمناک شکست کے فوراً بعد ایک کتاب 'ڈکلائن اینڈ فال آف اندرا گاندھی' تحریر کی گئی۔ یہ کتاب بشن ٹنڈن کی کتاب کے علاوہ مزید جانکاریاں فراہم کرتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ وزیراعظم کے فیصلہ کے سلسلہ میں وزیر داخلہ برہمانند ریڈی کو بھی اندھیرے میں رکھا گیا تھا۔ مانلیکر لکھتے ہیں 'جیسے ہی تاریکی مسلط ہوگئی (25 جون کو) 8:30 بجے رات میں محترمہ اندرا گاندھی، سدھارتھ شنکر رے (جو اس وقت کابینہ رکن بھی نہیں تھے، لیکن مغربی بنگال کے وزیر اعلیٰ تھے) کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر داخلی ایمرجنسی کا اعلان کرنے کے اپنے اہم فیصلے کے سلسلہ میں صدر جمہوریہ کو غیر رسمی طور پر اطلاع دینے کے لئے گئی تھیں۔ رات کے 11:00 بجے ان کے فیصلہ سے آگاہ کرانے کے لئے ریڈی کو وزیراعظم کی رہائش گاہ پر طلب کیا گیا... اوم مہتا (جو اس وقت وزارت داخلہ میں نائب وزیر تھے) جو وزیراعظم کی رہائش گاہ کی تمام سرگرمیوں سے واقف رہنے والے شخصیت تھے، کو چھوڑ کر کسی دیگر کابینہ وزیر کو اس رات اس بات کا پتہ نہیں چلا۔ اگلے دن صبح 6:00 بجے ہی ملک میں ایمرجنسی کے نفاذ کے فیصلہ سے آگاہ کرانے کے لئے کابینہ کی میٹنگ طلب کی گئی۔

کابینہ کی میٹنگ صرف پندرہ منٹ تک چلی۔ وہاں موجود وزراء ششدر رہ گئے۔ کچھ منٹ بعد سورن سنگھ نے کچھ وضاحت طلب کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے کہا کہ خارجی ایمرجنسی کی تجویز تو موجود ہے۔ اس پر وزیراعظم نے زور ڈالتے ہوئے ان کا دھیان گزشتہ رات کے جے پرکاش نارائن کی تقریر کی طرف متوجہ کیا۔ ایسی خبر تھی کہ اس تقریر میں جے پرکاش جی نے وزیراعظم کے گھر کو گھیرنے کی دھمکی دی تھی۔ (ان کی پارلیمانی رکنیت کو نااہل قرار دینے کے سلسلہ میں الہ آباد ہائی کورٹ کے فیصلہ پر غیر مشروط روک لگانے کے سلسلہ میں سپریم کورٹ سے کی گئی اپیل ٹھکرائے جانے کے بعد ان کا استعفیٰ طلب کرنے کے لئے)۔

1973: عدلیہ پر کستا شکنجہ

کوئی بھی جرم اپنے پیچھے اپنا نشان چھوڑ جاتا ہے اور نشان نظر آنا شروع ہو جاتا ہے۔ جب پہلی مرتبہ اس جرم کا خیال مجرم کے دماغ میں آتا ہے۔ اس لئے پیچھے مڑکر دیکھنے پر ایسا لگتا ہے کہ شروع سے ہی ایمرجنسی کا نفاذ اپنی دفاع کے لئے کی گئی ایک کوشش تھی۔ جب اندرا گاندھی کی 1971 میں لوک سبھا کی رکنیت کو الہ آباد ہائی کورٹ میں چیلنج کیا گیا تھا، تبھی سے خطرہ کے بادل منڈلانے لگے تھے۔ مسٹر ٹنڈن کی کتاب میں واضح ثبوت دیئے گئے ہیں کہ ایمرجنسی کے اعلان سے دو برس قبل ہی عدلیہ کی آزادی کی خلاف ورزی کی ان کی کوشش شروع ہوگئی تھی اور اس کی بنیاد انتخابی بدعنوانی کے معاملہ میں اپنے حق میں فیصلہ کرانے کی ان کی ناکام کوشش میں پڑ چکی تھی۔

اس سمت میں اندرا گاندھی کے ذریعہ اٹھائے گئے متنازعہ اقدامات میں سے ایک انتہائی اہم قدم تھا 1973 کا وہ فیصلہ، جب حکومت نے جے ایس شیلات، کے ایس ہیگڑے اور اے این گروور جیسے تین سینئر ججوں کی سینئرٹی کو نظرانداز کرتے ہوئے اے این رائے کو سپریم کورٹ کا چیف جسٹس مقرر کیا۔ اتفاق سے اے این رے، سدھارتھ شنکر رے کے نزدیکی رشتہ دار تھے۔ سدھارتھ شنکر رے اس وقت مغربی بنگال کے وزیر اعلیٰ تھے، جو جمہوریت کو کچلنے میں وزیر اعظم اندرا گاندھی کے سب سے خاص قانونی مشیر بنے۔ تین ججوں کی سینئرٹی کو نظرانداز کرنے والا فیصلہ 'مستحکم عدلیہ' کے نظریہ کو دھیان میں رکھ کر لیا گیا، جس کے حق میں ان دنوں کانگریس اور بائیں بازو کے لیڈر پرجوش دلائل دیتے تھے۔ صدر وی وی گری کے اعتراض کے باوجود یہ فیصلہ لیا گیا۔ ٹنڈن بیان کرتے ہیں — اس معاملہ میں ان (گیری) کو نظرانداز کیا گیا۔ وزیر قانون گوکھلے نے کہا کہ وزیر اعظم اپنے فیصلہ پر اٹل ہیں۔ انھوں نے کہا— آخر میں سب رضامند ہوگئے کہ وزیر اعظم کے فیصلہ کے سلسلہ میں کوئی خطرہ نہیں اٹھایا جائے اور نہ ہی ہیگڑے پر 'یقین' کیا جائے۔

مسٹر ٹنڈن کے مطابق، الہ باد ہائی کورٹ کے فیصلہ سے نو دن قبل، 23 جون 1975 کو گوکھلے اندرا گاندھی سے ملے اور اس کے بعد ان کے معاملہ کے تعلق سے اے این رے کے ساتھ تبادلہ خیال کیا۔ ہندوستان کے چیف جسٹس نے ان سے کہا 'اگر الہ آباد ہائی کورٹ کوئی مثبت فیصلہ دیتا ہے تو اس پر مکمل طور پر اسٹے آرڈر کے سلسلہ میں کوئی پریشانی نہیں ہونی چاہئے۔' مسٹر ٹنڈن کا خیال ہے کہ 'میں سوچتا رہا، اگر ہیگڑے یا ان تینوں میں سے کوئی چیف جسٹس ہوتا تو کیا گوکھلے کی اس سلسلہ میں بات کرنے کی ہمت ہوتی؟'

میں نے پہلے ہی جن سنگھ کی اس پیشین گوئی کا ذکر کیا ہے، جسے مارچ 1971 میں جاری کیا گیا تھا، جس میں کہا گیا تھا کہ پارلیمنٹ میں اندرا گاندھی کی دو تہائی اکثریت ہونے سے کانگریس پارٹی جمہوری سسٹم اور اصولوں کا پہلے سے زیادہ ہتک کرے گی۔ ایمرجنسی کو جاری رکھنے میں وزیر اعظم ایک کے بعد ایک جمہوری ادارے کے تئیں ہتک آمیز رویہ کا مظاہرہ کرنے لگیں اور ایسا کرنے کی ان کی اپنی دلیل تھی، جو سمجھ سے بالاتر تھی۔ بدعنوانی سے بھرپور انتخابی عمل کے سلسلہ میں الہ آباد ہائی کورٹ میں دائر عرضی پر سماعت کے ساتھ ساتھ انھیں بڑھ رہی بدعنوانی، گھوٹالہ سے اپنی حکومت کا دفاع کرنا تھا۔ للت نارائن مشرا★ کے لائسنس گھوٹالہ کے سلسلہ میں عوام کی مخالفت زور پکڑ رہی تھی، جس سے اس کی تفتیش کے لئے ایک غیر جانبدارانہ پارلیمانی انکوائری تشکیل کرنے کا اپوزیشن کا مطالبہ بھی زور پکڑنے لگا تھا۔

★ للت نارائن مشرا بہار کے ایک بااثر لیڈر اور اندرا گاندھی حکومت میں 75-1973 تک وزیر ریل تھے۔ ان کا انتقال جنوری 1975 میں بم دھماکہ میں ہوا، جو آج بھی ایک راز ہے۔

نٹذن لکھتے ہیں کہ 9/دسمبر 1974 کو پارلیمانی امور کے وزیر کے وی رگھورمیا نے وزیراعظم کی ہدایت پر تفتیش کے حق میں فیصلہ نہ دینے کا مطالبہ کرنے کے لئے لوک سبھا اسپیکر سے ملاقات کی۔ لوک سبھا اسپیکر آگ بگولہ ہوگئے۔ انھوں نے رگھورمیا کو ڈانٹ پلائی اوران سے کہا کہ وہ اپنا فیصلہ تبدیل نہیں کریں گے۔ جب رگھورمیا نے اندرا گاندھی کواس ملاقات کے نتائج سے آگاہ کیا تو وہ مایوس ہوگئیں۔ وہ ڈی پی دھر (وزیراعظم کے چیف سکریٹری) سے بولیں کہ وہ اپنا استعفیٰ دینے جارہی ہیں اور وہ فوراً اس کا خاکہ تیار کریں۔ وہ بولیں 'میں براہ راست صدر جمہوریہ سے ملاقات کرنے جارہی ہوں'۔ مزید برہم ہوکرانھوں نے کہا'— یا تو ایک نیا وزیراعظم ہوگا یا ایک نیا لوک سبھا اسپیکر۔ لوک سبھا اسپیکر صورت حال کو سمجھنے کی کوشش قطعی نہیں کررہے ہیں۔ وہ میری بات کو نظرانداز کرنے کی ہمت کیسے کرسکتے ہیں'۔ آخرکار لوک سبھا اسپیکر کو جھکنا پڑا۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ کیسے خودکواقتدار میں بنائے رکھنے کے اندرا گاندھی کے ڈکٹیٹرانہ جذبہ سے 1969 میں کانگریس کی تقسیم کے بعد پارٹی کے اندر جمہوری سسٹم کا منظم طریقہ سے خاتمہ کیا گیا اور جون 1975 میں بے رحمی کے ساتھ ایمرجنسی نافذ کردی گئی۔

جیل کے اندراور باہر کی زندگی

قید کی مدت کے دوران ہم نے محسوس کیا کہ بغیر کسی استثناء کے قانونی برادری کے حلقہ کے سبھی لوگوں کی ہمدردی ہمارے ساتھ تھی۔ حکومت کے فیصلہ سے تمام لوگوں میں ناراضگی تھی۔ داخلی سلامتی بحالی ایکٹ، مینٹینس آف انٹرنل سیکورٹی ایکٹ (MISA) کے تحت جے پرکاش نارائن، مرارجی ڈیسائی، اٹل بہاری واجپئی اور چندرشیکھر جیسے محبان وطن سمیت اپوزیشن کے ہزاروں سیاسی کارکنان کوقومی سلامتی کے لئے خطرہ بتانے اورانھیں جیل میں ڈال دینے کا واقعہ غیریقینی طور پر تکلیف دہ تھا۔ ایمرجنسی کے دوران کی گئی زیادتی اوراستحصال کی تفتیش کے لئے بعد میں مرارجی ڈیسائی کی حکومت کے ذریعہ تشکیل کردہ شاہ کمیشن نے درج کیا کہ میسا کے تحت 34988 لوگوں اور ڈیفنس آف انڈیا رولز (.D.I.R) کے تحت 75818 لوگوں کوگرفتار کیا گیا۔

برطانوی حکومت میں بھی انڈین پریس پراتنی بے رحم سنسرشپ کاشکنجہ نہیں کسا گیا جتنا کہ ایمرجنسی کے دوران، یہاں تک کہ ان دنوں کچھ شائع کرنا جرم تھا اور جوجہاں، جس طرح اور جیسے لکھتے تھے ان تمام لوگوں کوگرفتار کرلیا گیا۔ ان دنوں لوگوں تک اطلاع پہنچانے کا تنہا وسیلہ سخت حکومت کے زیرکنٹرول میڈیا ہی تھا۔ وسیع پہنچ رکھنے والے آکاش وانی سمیت اطلاعات عامہ کے تمام نیٹ ورک کواس طرح سے اپنے مطابق ڈھالا گیا کہ لوگوں کو یہ سمجھایا جائے کہ آزادی، شہری حقوق، آزادی پریس، عدلیہ کی آزادی، سبھی اشرافیہ کے التزامات ہیں اور عام آدمی کی ترقی سے ان کا کچھ لینا دینا نہیں ہے اور ہندوستان پرایمرجنسی نافذ کرنے کے لئے ملک کوکانگریس حکومت کے تئیں احسان مند ہونا چاہئے۔

یہاں میں نامورصحافی کلدیپ نائر کی مثال پیش کرنا چاہوں گا، جنہیں جولائی 1975 میں 'میسا' کے تحت گرفتار کیا گیا تھا۔ حکومت اس بات سے ناراض تھی کہ انھوں نے سنسرشپ کے خلاف اعتراضات درج کرنے کے لئے صحافیوں کی ایک میٹنگ منعقد کی تھی۔ اس کے علاوہ انھوں نے ایمرجنسی لگائے جانے کے بعد مسلسل چاپلوس نوازی کی سخت نکتہ چینی اپنے مضامین میں جاری رکھی، خواہ یہ پاکستان یا امریکہ ہو یا کسی دیگر ممالک کے سلسلہ میں ہو۔ اس کے اشارہ کونظرانداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ نائر کی اہلیہ نے دہلی ہائی کورٹ میں ہیبس کارپس (Habes Corpus) عرضی دائر کی تھی۔ سماعت میں یہ پایا گیا کہ وہ افسر جس نے نائر کی نظر بندی کے احکام پر دستخط کئے تھے، جس سے امید کی جارہی تھی کہ وہ خوداس بات سے مطمئن ہوں کہ ان کی نظر بندی ملک کی سلامتی کے لئے ضروری ہے۔ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ ایک صحافی ہیں۔ نائر کی

نظر بندی کو غیر قانونی قرار دے دیا گیا۔ حکومت نے سماعت کے دوران ہی عدالت کے موقف کو محسوس کر لیا تھا، اس لئے حکومت نے اپنے دفاع کے لئے مسٹر نائر کو فیصلہ آنے سے چار دن قبل ہی آزاد کر دیا اور تب عدالت سے اپیل کی کہ عدالت فیصلہ صادر نہ کرے، کیونکہ قیدی کو پہلے ہی آزاد کیا جا چکا ہے۔ ہائی کورٹ نے حکومت کی ستائش سے منع کر دیا اور رسمی طور پر نظر بندی کے احکام کو مسترد کر دیا۔

اب اس کا مکمل ثبوت ہے کہ اندرا گاندھی نے جمہوریت کے کثیر جماعتی پارلیمانی نظام کی جگہ پر ایک پارٹی کی برتری والے صدارتی نظام قائم کرنے کے امکانات تلاش کرنے کے لئے سرگرمی کے ساتھ کوشش کی۔ کانگریس پارٹی کے اپنے روزنامہ اخبار 'نیشنل ہیرالڈ' نے اپنے اداریہ میں اس کی وضاحت اس طرح کی کہ کثیر جماعتی سسٹم کے نتیجہ میں مرکز اور ملک کمزور ہوئے ہیں۔ اس میں تنزانیہ جیسے افریقی ممالک میں نافذ ایک جماعتی سسٹم کی ستائش کی گئی۔

اس اخبار میں لکھا گیا:

> "ضروری نہیں کہ ویسٹ منسٹر ماڈل سب سے بہترین ماڈل ہو اور کئی افریقی ممالک نے اس بات کو واضح کر دیا ہے کہ جمہوریت کی باہری شکل کچھ بھی ہو، عوام کی آواز کی اہمیت ہمیشہ بنی رہے گی۔ ایک مضبوط مرکز کی ضرورت پر زور دے کر وزیر اعظم نے ہندوستانی جمہوریت کی طاقت کی جانب اشارہ کیا ہے۔ ایک کمزور مرکز ہونے سے ملک کے اتحاد، یکجہتی اور آزادی کے تحفظ کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ انھوں نے بے حد اہم سوال اٹھایا ہے۔ اگر ملک کی آزادی قائم نہیں رہ سکتی تو جمہوریت کیسے قائم رہ سکتی ہے؟"

دیگر مطلق العنان حکمرانوں کی طرح اندرا گاندھی نے بھی قومی مفاد کی قربانی دے کر اپنے ذاتی مفاد کو پانے کی کوشش کی۔ ایمرجنسی نافذ کرنے کے اپنے فیصلہ کو درست ٹھہراتے ہوئے انھوں نے ایک مرتبہ کہا تھا 'ملک جمہوریت سے زیادہ اہم ہے۔'

اقتدار کے تئیں اپنی بے پناہ بھوک کے لئے حمایت جتانے کے سلسلہ میں اندرا گاندھی کسی 'غیر ملکی طاقت' سے ہندوستان کے وجود کے خطرہ کا موضوع اکثر اٹھایا کرتی تھیں۔ 'دی ٹائمز آف انڈیا' کو دیئے گئے ایک انٹرویو میں انھوں نے کہا 'اپوزیشن پارٹیوں کا مقصد واضح تھا۔ یہ تھا حکومت اور تمام قومی سرگرمیوں کو معذور بنا دینے اور ملک کے 'بدن' پر اقتدار کا سفر طے کرنا... اس طرح کے کچھ اور اقدامات سے ہندوستان تقسیم ہو سکتا تھا، جس سے غیر ملکی خطرے کے سامنے ہم کھوکھلے ثابت ہو جاتے۔'

ملک پر ایمرجنسی تھوپ کر اندرا گاندھی کتنی بے باک ہو گئی تھیں، اس کا اندازہ ان کے 11 نومبر 1975 کے قوم کے نام خطاب سے لگایا جا سکتا ہے۔ انھوں نے واضح طور پر کہا کہ 'ایسا سخت فیصلہ اس لئے لیا، کیونکہ ہم نے محسوس کیا کہ اس ملک میں ایک مرض پھیل گیا ہے اور اگر اس مرض کا جلد علاج کیا جانا ہے تو دوا کی ایک خوراک دینی ہوگی۔ اگر دوا تلخ بھی ہو تب بھی دینی ہوگی۔ کتنا بھی پیارا بچہ کیوں نہ ہو، اگر ڈاکٹر نے اس کے لئے کڑوی گولی کی صلاح دی ہے تو اس کے علاج کے لئے اسے کڑوی گولی دینی ہوگی۔ بچہ رو سکتا ہے اور ہم اسے کہہ سکتے ہیں 'یہ دوا لے لو ورنہ تم صحت مند نہیں ہو پاؤ گے' اس لئے ہم نے ملک کو یہ کڑوی دوا دی... جب بچہ کو تکلیف ہوتی ہے تو ماں کو بھی تکلیف ہوتی ہے، لہٰذا ہم ایسا قدم اٹھانے سے بہت خوش نہیں ہیں۔ ہم بھی غمگین ہیں، ہم لوگ متفکر ہیں، لیکن ہم نے دیکھا کہ اس نے ایسا ہی کام کیا جیسے کہ ڈاکٹر کی خوراک کام کرتی ہے۔'

یہ بدقسمتی ہی ہے کہ ان دنوں اطلاعات کے جو معتبر ذرائع تھے، وہ بی بی سی، وائس آف امریکہ، وائس آف جرمنی اور ریڈیو آسٹریلیا تھے۔ یہ چار غیر ملکی اسٹیشن میرے چھوٹے سے ٹرانزسٹر ریڈیو کی پکڑ میں آ پاتے تھے، ہاں اس کے علاوہ ریڈیو ماسکو بھی لگ پاتا تھا، لیکن یہ خبر رساں ادارہ

سے زیادہ اندرا گاندھی حکومت کے لئے غیر ملکی پروپیگنڈہ آرگن کے طور پر کام کرتا تھا۔ سیاسی قیدیوں کے درمیان مختص ہوئے کام کے تحت میں نے ریڈیو سے خبریں سننے اور اس خبر کو اپنے ساتھیوں تک پہنچانے کی ذمہ داری اپنے سر لی۔

ایک دن بی بی سی نے یہ خبر نشر کی کہ حکومت ہند نے سنگھ، جماعت اسلامی اور آنند مارگ سمیت چھبیس تنظیموں پر پابندی عائد کردی ہے۔ سنگھ کے بہت سے سویم سیوکوں، جماعت اسلامی کے بہت سے ممبروں اور دیگر تنظیموں کے ممبروں کو 'میسا' کے تحت قید کرلیا گیا ہے۔ جیل انتظامیہ نے آنند مارگ کے ممبروں کو سنگھ کے سویم سیوکوں کے ساتھ رکھ دیا، لیکن جماعت کے لوگوں کو اسمگلنگ کے الزام میں COFEPOSA* کے تحت قیدی بنائے گئے مسلم قیدیوں کے ساتھ رکھا۔ جماعت کے لوگوں نے مذہبی تعصب کو بنیاد بنا کر اس درجہ بندی کی مخالفت کی اور اپیل کی کہ انھیں سنگھ کے سویم سیوکوں کے ساتھ رکھا جائے۔

> 5 رجولائی 1975 کی اپنی ڈائری میں میں نے لکھا 'یہ دلچسپ ہے کہ ایک حکومت جو سیکولرازم کو بڑھاوا دینے کا دعویٰ کرتی ہے، اس نے اپنی تمام سرگرمیوں سے مذہبی اور دیگر بنیاد پر منافرت پھیلائی ہے۔ یہاں اس کی زندہ مثال ہے۔ تمام سیاسی قیدیوں کو ایک ساتھ رکھنے کے بجائے اس نے مذہبی بنیاد پر بھید بھاؤ کیا ہے، جس سے مجرمانہ سرگرمیوں کے شبہ میں گرفتار کیے گئے قیدیوں کے ساتھ سیاسی قیدیوں کو رہنا پڑا۔ یہ اس کی ہندو اور مسلمانوں کے درمیان پھوٹ ڈالنے کی پالیسی تھی، جس سے خود ساختہ سیکولرازم کو بڑھاوا ملا۔'

ہم لوگوں کو آمنے سامنے واقع دو بڑے کمروں میں رکھا گیا۔ شیام بابو اور ڈنڈوتے ایک کمرے میں تھے اور اٹل جی اور میں دوسرے کمرے میں۔ ہم لوگ جلد ہی وہاں کے عادی ہوگئے۔ جیل افسروں نے ہمیں کھانا پکانے کے برتن، چینی مٹی کے برتن، خوردنی اشیا، اناج اور سبزی دیئے، جو جیل کے قاعدہ کے تحت تھا۔ اٹل جی نے خواہش کے مطابق کھانا پکانے کی ذمہ داری قبول کی۔ 'لوک سبھا ہوز ہو' میں ان کی دلچسپی کے تحت 'کھانا پکانا' دیا گیا ہے۔ وہ جو کھانا پکاتے تھے وہ سادہ لیکن غذائیت سے بھرپور ہوتا تھا۔

بہترین جرائم پر مبنی ناول کے علاوہ جیل تن تنہا ایک ایسی جگہ ہے جہاں انسان زندگی کی نہفتہ سچائیوں کو جان پاتا ہے۔ اس میں مجرموں کی زندگی اور ان کا انسانی پہلو بھی شامل تھا۔ میں ان میں سے کئی لوگوں سے ملا، لیکن جس سے میں اور میرے ساتھی قیدی سب سے زیادہ متاثر ہوئے وہ ایک دس سالہ لڑکا تھا، ایک پیشہ ور جیب تراش، جو ہمیشہ خوش رہتا اور باتونی تھا۔ وہ ہم سبھی کے لئے تفریح کا سامان تھا۔ وہ تفصیل سے بتاتا تھا کہ کیسے وہ ایک چھوٹے تقریباً نہ دکھائی دینے والی انگلی کے ساتھ لگی بلیڈ سے بس اسٹینڈ، ریلوے اسٹیشن اور دیگر پرہجوم مقامات پر لوگوں کی جیب کاٹتا تھا۔ 'اگر میں پکڑا جاتا ہوں تو میرا سیٹھ جانتا ہے کہ مجھے پولس اور کورٹ سے کیسے رہا کرانا ہے۔' ایک دن میں نے اس سے پوچھا 'تم اتنے ذہین ہو، پھر جیب کیوں کاٹتے ہو؟ کیا تم نے کبھی اسکول جانے یا کوئی کام کرنے کے بارے میں نہیں سوچا؟' اس نے جواب دیا 'اور کون سا کام مجھے اتنے پیسے دے گا، جتنا میں اس کام سے کماتا ہوں؟ اپنے سیٹھ کو حصہ دینے کے بعد مجھے اپنے غریب والدین کو بھیجنے کے لئے اور اپنے لئے بہت پیسہ بچ جاتا ہے۔'

تمام قیدی ستیہ گرہیوں کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، کیونکہ وہ ایمرجنسی کے خلاف ان کی لڑائی کی وجہ سے جیل آئے تھے۔ اتنی عزت کرتے تھے کہ کوئی بھی قیدی، جس کی سزا ختم ہو رہی ہوتی تھی اور جسے رہا کیا جاتا تھا، وہ ہمارے بلاک میں ضرور آتا تھا اور پوچھتا تھا 'کیا آپ کے پاس باہر کسی کو پیغام بھیجنے کے لئے کچھ ہے؟' اس طرح سے ہم باہری دنیا سے خاص طور سے انڈر گراؤنڈ کام کر رہے پارٹی کے ساتھیوں سے رابطہ رکھ پاتے تھے۔

The Conservation of Foreign Exchange and Prevention of Smuggling Activities Act 1974 *

قیدی بنائے جانے کے بعد بھی اپوزیشن کے کچھ لیڈر یہ نہیں مانتے تھے کہ ایمرجنسی طویل مدت تک چلے گی۔ ان میں سے ایک تھے شیام بابو، انھوں نے ترچھی نظر ڈالتے ہوئے کہا 'ہم لوگ دو تین ماہ میں جیل سے باہر ہو جائیں گے۔' میں نے ان سے وہی کہا جو مجھے ڈاکٹر وسنت پنڈت نے کہا تھا۔ اس پر مشرا جی نے کہا 'بکواس'۔

جیل کے اندر سے ہماری قانونی جدوجہد

'میسا' کے تحت بنگلور سینٹرل جیل میں قید کیے جانے کے فوراً بعد ہم چاروں نے اپنے قیدی بنائے جانے کو کرناٹک ہائی کورٹ میں چیلنج کرنے کا فیصلہ لیا۔ تین ماہرین قانون — بنگلور سے این سنتوش ہیگڑے، ایم راما جائس اور دہلی سے این ایم گھٹاٹے کی مدد سے ہم لوگوں نے کرناٹک ہائی کورٹ کے سامنے عرضی دائر کی۔ ضروری نکات درج کر کے ہم نے عدالت کے سامنے اس طرح عرضی دی:

1. دسمبر 1971 میں ہندوستان اور پاکستان کے مابین جنگ ختم ہو جانے اور شملہ معاہدہ پر دستخط ہو جانے کے بعد بھی خارجی ایمرجنسی کو جاری رکھنے کو غیر آئینی قرار دیا جائے اور اسے رد قرار دیا جائے۔
2. 25 رجون 1975 کو لگائی گئی داخلی ایمرجنسی کو غیر آئینی قرار دیا جائے اور اسے مسترد کر دینا چاہیے۔
3. قیدی بنائے جانے کے حکم نامہ کو رد کرنا۔

14 رجولائی کو عرضی کو ابتدائی سماعت کے لئے بھیجا گیا۔ عدالت کا کمرہ وکلاء اور دیگر لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس سے ٹھیک ایک دن قبل اٹل جی بہت بیمار ہو گئے اور انھیں وکٹوریہ اسپتال میں داخل کروانا پڑا، جہاں ان کے اپینڈیسائٹس کا آپریشن ہوا۔ آپریشن ختم ہونے کے بعد ہی پتہ چلا کہ اپنڈکس بالکل ٹھیک ہے اور جو زبردست درد ہو رہا تھا وہ اپینڈیسائٹس کی وجہ سے نہیں تھا۔ بعد میں انھیں نئی دہلی کے ایمس میں منتقل کیا گیا، جہاں جانچ کے بعد درد کی وجہ سلپ ڈسک بتایا گیا۔ اس کے لئے ان کا بڑا آپریشن کیا گیا۔

اس لئے اس دن مشرا جی، ڈنڈوتے جی اور مجھے عدالت کے کمرہ میں لایا گیا۔ عدالت کے باہر ہم لوگوں کو دیکھنے اور ہمارا استقبال کرنے کے لئے لوگوں کا سیلاب امڈ پڑا تھا۔ مجھے اس دن ایک خوشگوار حیرت بھی ہوئی۔ وہاں میرے انتظار میں میری اہلیہ کملا، دس سالہ بیٹا جینت اور آٹھ سالہ بیٹی پرتبھا کھڑے تھے۔ انھیں پتہ چلا تھا کہ ہماری ہیبس کارپس عرضی پر سماعت کے لئے کرناٹک ہائی کورٹ نے 14 رجولائی کی تاریخ مقرر کی ہے، اس لئے وہ صرف مجھ سے ملاقات کی غرض سے دہلی سے بنگلور پہنچے تھے۔

ہم تینوں نے اپنے معاملے میں خود بحث کی تھی اور عدالت کا دھیان اس جانب متوجہ کیا کہ پارلیمنٹ کا آئندہ اجلاس 21 رجولائی 1975 کو طلب کیا گیا ہے۔ ہمارے معاملے کی سماعت ہائی کورٹ کے چیف جسٹس شنکر بھٹ اور جسٹس بی وینکٹ سوامی کر رہے تھے۔ ہم نے ان سے اپیل کی کہ ہمارے معاملہ پر سماعت اس تاریخ سے قبل کی جائے، تاکہ ہم پارلیمنٹ کے آئندہ اجلاس میں حصہ لے سکیں۔ ہم لوگوں کی بات سننے کے بعد عدالت نے استغاثہ کو نوٹس جاری کرنے کا فیصلہ لیا۔ ریاست کے چیف پبلک پروسکیوٹر اور حکومت ہند کی جانب سے معاملہ میں بحث کرنے والے سینئر وکیل نے اعتراض درج کرنے کے لئے دو ہفتہ کی مہلت طلب کی۔ عزت مآب چیف جسٹس کا موقف تھا کہ انگلینڈ میں ہیبس کارپس پر سماعت اڑتالیس گھنٹے کے اندر کی جاتی ہے۔ ہیبس کارپس عرضی سے فرد کی آزادی جڑی ہوتی ہے۔ اس میں حکومت کو اپنے اعتراضات جلد درج کرانے چاہئیں۔ عدالت نے مانا کہ پارلیمنٹ کا آئندہ اجلاس 21 رجولائی سے شروع ہونے والا ہے، اس لئے اس معاملہ

کو اس تاریخ سے پہلے سلجھانا ضروری ہے، لہٰذا عدالت نے اگلی سماعت کے لئے 17 رجولائی کی تاریخ مقرر کی۔

حالانکہ 17 رجولائی کو ہم بالکل ہی مختلف طرح کی ڈرامائی سرگرمیاں دیکھنے والے تھے۔

صبح تقریباً 6:00 بج رہے ہوں گے جب ڈپٹی جیل سپرنٹنڈنٹ ڈیسائی نے ہم سب کو بیدار کیا اور چلنے کے لئے تیار ہونے کے لئے کہا۔ انھوں نے ہم سے کہا 'آپ تمام لوگوں کو رہا کیا گیا ہے۔ جیل سپرنٹنڈنٹ جلد ہی آپ کے پاس اس سلسلہ کی تفصیل پیش کرنے کے لئے آرہے ہوں گے۔' ڈیسائی اپنی آواز کی چہک چھپانے کی کوشش نہیں کررہے تھے۔ جلد ہی جیل سپرنٹنڈنٹ ایچ ایل چھملانی مسکراتے ہوئے آپہنچے۔ انھیں علی الصباح بیدار کیا گیا اور بتایا گیا کہ اٹل جی سمیت ہم تمام لوگوں کو رہا کیا جانا ہے۔ اٹل جی اس وقت بھی آپریشن کے بعد اسپتال میں ہی تھے۔

یہ خبر سن کر ہم حیرت زدہ تھے اور زیادہ الجھن محسوس کررہے تھے۔ ہم لوگوں کو تین طرح کے امکانات نظر آئے:

1. پارلیمنٹ کے آئندہ سیشن کے لئے تمام ممبران پارلیمنٹ کو رہا کیا جارہا ہے۔
2. ہمیں پھر سے قیدی بنائے جانے کی وجہ سے رہا کیا جارہا ہے، کیونکہ پہلی مرتبہ قیدی بنائے جانے کے عمل میں کچھ واضح غلطیاں ہیں۔
3. ہیبیس کارپس عرضی کی ابتدائی سماعت کے دوران کرناٹک ہائی کورٹ کے رویے سے حکومت ہند الجھن میں پڑ گئی ہے اور اس لئے ہمیں دہلی یا دیگر مقام پر، جو اس ہائی کورٹ کے دائرۂ اختیار سے باہر ہے، وہاں قیدی بنا کر رکھنا چاہتی ہے (ہمارا یہ تیسرا اندازہ درست ثابت ہوا)

ہم نے اپنا سامان درست کرنے کے لئے تھوڑا وقت لیا اور آرام سے ناشتہ کیا۔ جب تک شیام بابو یوگ آسن سمیت روزمرہ کی ضروریات سے فارغ ہوئے تب تک 9 بج چکے تھے۔ ہمارے ساتھی قیدی کرشن اپا، وینکٹ راؤ اور شنکر لال، جنہیں ہمارے وارڈ میں خدمت گار کے طور پر لگایا گیا تھا اور جو ہم لوگوں سے نجی طور پر قریب ہو گئے تھے، ہمیں الوداع کہنے کے لئے آئے اور انھوں نے اظہار مسرت کیا کہ ہماری جیل کی زندگی ختم ہوئی۔

میں نے سرگوشی میں کہا 'کون جانتا ہے، ہم جلد واپس آسکتے ہیں۔'

اور ٹھیک ایسا ہی ہوا۔ ڈیسائی نے ہمارے لئے ٹیکسی منگائی، لیکن جیسے ہی ٹیکسی جیل کیمپس سے باہر نکلی اور خاص سڑک پر بائیں جانب روانہ ہوئی، ہم نے راستہ روکے پولس قافلہ کو دیکھا۔ پولس قافلہ سڑک پر قطار بند کھڑا تھا۔ ہمیں بعد میں پتہ چلا کہ وہ صبح 6:30 بجے سے ہمارا انتظار کررہے تھے۔ اسسٹنٹ پولس کمشنر نائک نے، جو بعد میں کئی مرتبہ ہمارے ساتھ رہے، آگے بڑھ کر ہم لوگوں سے کہا 'مجھے معاف کریں، مجھے ایک مرتبہ پھر سے آپ لوگوں کو گرفتار کرنے کا یہ ناپسندیدہ کام کرنا پڑ رہا ہے۔' نائک نے تب ہم لوگوں سے پولس کار میں بیٹھنے کی اپیل کی اور تب ٹیکسی والے سے اپنی کار کے پیچھے تھانہ تک آنے کی ہدایت دی۔

تھانہ میں نائک نے 'میسا' کے تحت حکومت ہند کے ذریعہ جاری اور وزارت داخلہ میں ڈپٹی سکریٹری اے. جی. سین کے ذریعہ دستخط شدہ نیا گرفتاری کا حکم نامہ دکھایا۔ ایک علیحدہ خط ہمیں دیا گیا، جس میں درج تھا کہ ایمرجنسی سے مؤثر طریقہ سے نمٹنے کے لئے ہماری گرفتاری ضروری تھی۔ دونوں ہدایت نامہ ہمیں پولس سپرنٹنڈنٹ نے دیئے، پہلی گرفتاری کو رد کرنے کی ہدایت بھی، جس پر 16 رجولائی درج تھا۔ اس طرح نئی گرفتاری وارنٹ ہمیں اس وقت دیا گیا جب ہم گرفتار ہی تھے۔ 'میسا' کی دفعہ 16 اے کے مطابق، اس حکم میں ہماری گرفتاری کی وجہ ہمیں بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔

تمام رسمی خانہ پری پندرہ یا بیس منٹ میں مکمل کرلی گئی اور دوبارہ ہم لوگوں کو واپس جیل منتقل کردیا گیا۔ ہمارے سامان کو گاڑی سے

اتارنے کے بعد ہمیں بتایا گیا کہ دن میں ساڑے 10 بجے ہم لوگوں کو ہیبس کارپس عرضی پر سماعت کے لئے ہائی کورٹ میں حاضر کیا جانا ہے، اس طرح اس دن کے مضحکہ خیز ڈرامہ کا ایک سین ڈراپ ہوا۔

کرناٹک ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کا کمرہ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ناظرین گلیارے اور سڑک کی جانب جانے والی سیڑھیوں پر بھرے ہوئے تھے۔ ہم لوگوں کے وہاں پہنچنے پر وہاں موجود عوامی سیلاب نے ہمارا پرجوش استقبال کیا، لیکن نہ تو وہ اور نہ ہی ہمارے وکیل جانتے تھے کہ جن قیدیوں کو 26 رجون کو کرناٹک حکومت نے گرفتار کیا ہے، انھیں چھوڑ دیا گیا اور اب ہم حکومت ہند کے مہمان تھے، حالانکہ ہم بنگلور میں تھے۔

قیدی کے طور پر ہمارے درجہ میں تبدیلی کے سلسلہ میں عدالت کو سرکاری سطح پر سینئر ایڈوکیٹ نیرین ڈے نے اطلاع دی، وہ گزشتہ رات کو ہی بنگلور پہنچ چکے تھے، جیسا کہ اندیشہ تھا وہ نئی دہلی سے نئی گرفتاری وارنٹ لائے تھے، جیسے ہی سماعت شروع ہوئی، نیرین ڈے نے اٹھ کر ججوں سے اپیل کی کہ انھیں ایک بیان دینا ہے۔ مسٹر ڈے نے عدالت سے کہا کہ 26 رجون 1975 کا گرفتاری وارنٹ، جسے عدالت میں چیلنج کیا گیا تھا، اسے حکومت ہند نے رد کر دیا ہے، نیا گرفتاری وارنٹ جاری کیا گیا ہے اور اس پر عمل ہو چکا ہے، لہٰذا زیر التوا عرضی مسترد ہو چکی ہے اور اسے خارج کر دینا چاہئے۔

ایم راما جائس کے ساتھ ہم لوگوں نے حکومت کے اس رویے کی مخالفت کی اور اپیل کی کہ واقعہ میں نیا موڑ آنے کے سبب ہمیں اپنی عرضی میں ترمیم کی اجازت دی جائے۔ جائس نے واضح کیا کہ عرضی دہندہ کے ذریعہ جو راحت مانگی گئی تھی، وہ صرف گرفتاری وارنٹ کو خارج کئے جانے تک محدود نہیں تھی بلکہ اس کے دائرہ میں دو ایمرجنسی کے اعلانات کو غیر قانونی قرار دیئے جانے اور 'میسا' کو ترمیم کرنے کے لئے ہدایت جاری کرنے کا بھی مطالبہ تھا۔ مشتبہ گرفتاری کو مسترد کرنے کی اپیل کے سلسلہ میں ہی گرفتاری ہدایت نامہ کو خارج کیا گیا ہے۔ اس کے دیگر موضوعات حسب دستور ہیں۔

چیف جسٹس نے کہا کہ اس حالت میں نئی عرضی دائر کرنا ہی ایک معقول تدبیر ہوگی۔ جب ان کے سامنے یہ وضاحت کی گئی کہ قیدیوں کو قانونی مدد حاصل کرنے میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے تو انھوں نے کہا کہ اس سلسلہ میں ضروری ہدایت جاری کی جاسکتی ہے۔ سینئر ایڈوکیٹ کی جانب دیکھ کر انھوں نے کہا 'میں سمجھتا ہوں کہ انھیں ضروری قانونی مدد فراہم کروانے میں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔' سینئر ایڈوکیٹ نے کہا 'نہیں، انھیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔'

اس کے بعد چیف جسٹس نے پہلی عرضی کو خارج کر دیا اور بنگلور سینٹرل جیل سپرنٹنڈنٹ کو ہدایت دی کہ نئی عرضی دائر کرنے کے سلسلہ میں ان چاروں قیدیوں کو اپنے وکیل سے صلاح ومشورہ کے لئے پوری سہولت مہیا کرائی جائے۔

عدالت سے واپس آنے کے فوراً بعد جیل سپرنٹنڈنٹ کے دفتر میں جیل افسروں کے ساتھ ہمارے لئے کافی کا انتظام کیا گیا تھا۔ وہاں جیل چیف سپرنٹنڈنٹ ملیا نے کہا کہ انھیں افسوس ہے کہ ہم لوگوں کو بنگلور سے منتقل کیا جائے گا۔ انھوں نے کہا 'میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا، لیکن مجھ سے اوپر کے افسروں نے پوچھا کہ کیا اٹل جی لے جائے جانے کی حالت میں ہیں؟ اس سے میں محسوس کر رہا ہوں کہ منتقلی کی تیاری چل رہی ہے۔

درحقیقت، ایسا لگتا ہے کہ سینئر ایڈووکیٹ اپنے ساتھ ایک ٹرانسفر آرڈر بھی لے آئے تھے اور جب وہ عدالت کے سامنے قیدیوں کو قانونی مدد دیئے جانے کے سلسلہ میں بنگلور کے جیل سپرنٹنڈنٹ کو عدالت کی جانب سے ہدایت جاری کئے جانے پر کوئی اعتراض نہ ہونے کے سلسلہ میں عدالت کی یقین دہانی میں مصروف تھے، اس وقت وہ عدالت کو گمراہ کرکے اس کی خلاف ورزی کر رہے تھے۔

دوسرے ہی دن اٹل جی کی جانب سے ہائی کورٹ میں دائر ایک درخواست میں اس سچائی کو اجاگر کیا گیا۔ اس میں کہا گیا کہ ان کے سلسلہ میں ٹرانسفر آرڈر جاری نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ ڈاکٹر اس کی اجازت نہیں دیں گے۔ جب ہائی کورٹ کے سامنے درخواست آئی تو اس طرح کی سرگرمی پر عدالت نے سخت رخ اپنایا اور اٹل جی کی منتقلی کرنے سے حکومت کو روکنے کے لئے فوراً ہدایت جاری کی۔

ظہرانہ کے وقت تک منتقلی کی ہدایت پہنچ چکی تھی۔ اس میں درج تھا کہ ہمیں ہوائی راستہ سے روہتک کے لئے منتقل کیا جانا چاہئے۔

فضائیہ کے مخصوص طیارہ سے ہم تینوں کو دہلی لایا گیا۔ ہم لوگوں کے ساتھ جیل سپرنٹنڈنٹ چھبلانی، ضلع سرجن سداشیو ریڈی اور اسسٹنٹ پولس کمشنر نائک بھی تھے۔ طیارہ نے فضائیہ ہوائی اڈہ یلہنکا (Yelhanka) سے علی الصباح ساڑھے 4 بجے پرواز کیا۔ یہ ایک ڈکوٹا طیارہ تھا۔ موسم بہت خراب تھا، اس لئے وہ پرواز ہچکولوں سے بھری ہوئی تھی۔ رات ساڑھے 11 بجے کے قریب دہلی کے پالم ٹکنیکل ایریا میں طیارہ نے لینڈ کیا۔

دہلی میں مرکزی حکومت نے جس طرح سے ہمارا خیر مقدم کیا۔ وہ کرناٹک حکومت کے الوداعیہ سے بالکل برعکس تھا۔ ہمارے ساتھ بنگلور سے آنے والے ان تین افسروں کو یہ بڑا ہی عجیب لگا ہوگا۔ دہلی انتظامیہ کے ایک پولس انسپکٹر کو اس روکھی ہدایت کے ساتھ ہوائی اڈہ بھیجا گیا تھا کہ تینوں قیدیوں کو پالم سے ہریانہ کے روہتک شہر میں بھیج دیا جائے۔ اندر جیت سنگھ نام کے اس انسپکٹر نے بعد میں ہمیں بتایا کہ اس وقت انھیں ذرا بھی پتہ نہیں تھا کہ وہ قیدی کون ہیں؟ اور وہ کس درجہ کے ہیں؟ انھیں ایسا لگ رہا تھا کہ 3 ملزم اسمگلروں کو منتقل کیا جانا ہے۔

جیسے ہی ہم ہوائی جہاز سے اترے، اس افسر نے آگے بڑھ کر ہم لوگوں سے نرم لہجہ میں پوچھا 'کون کون آئے ہیں؟' جیسے ہی ہم لوگ تھوڑے نزدیک آئے۔ اس نے مجھے پہچان لیا اور تھوڑے الگ لہجہ میں کہا 'آڈوانی صاحب کو تو میں جانتا ہوں—اور کون صاحب ہیں؟'

میں نے شیام بابو اور ڈنڈوتے کا تعارف کرایا، تب اس نے ایک خستہ ٹرک پر ہمیں سوار ہونے کے لئے کہا، جسے وہ اپنے ساتھ لایا تھا۔

ہم نے اس سے پوچھا 'کیا ہم لوگ روہتک آج رات جائیں گے یا کل؟'

اس نے جواب دیا 'مجھے نہیں معلوم' اور مزید کہا کہ پہلے ہم لوگ پالم تھانہ جائیں گے اور وہاں ہمیں آگے کے لئے ہدایت دی جائے گی۔ پہلے ٹرک پر سوار ہو جائیں۔

کرناٹک میں ہمارے ساتھ جس طرح کا بہتر اور گرم جوشی سے بھرا سلوک کیا گیا، اس کے مقابل نئی دہلی میں افسروں کا سلوک نازیبا تھا۔ ہمارے علاوہ کرناٹک سے ساتھ آئے افسروں نے بھی یہ محسوس کیا۔ شیام بابو خاص طور پر رنجیدہ تھے۔ پولس انسپکٹر پر اپنا غصہ اتارتے ہوئے انھوں نے اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ انھوں نے روکھے پن سے کہا 'میں آج رات نہیں جاسکتا۔ میری صحت اس بات کی اجازت نہیں دیتی ہے۔ تمہیں کسی دوسری گاڑی کا انتظام کرنا چاہئے۔ ہم لوگ اس سے سفر نہیں کریں گے۔ ہم لوگ عام قیدی نہیں ہیں، سیاسی قیدی ہیں۔' (بعد میں ان کی اس آخری بات چیت کا ذکر ڈنڈوتے اکثر خوشگوار موڈ میں کرتے تھے۔)

ظاہر ہے اندر جیت سنگھ نہ تو ہمارے ساتھ اور نہ ہی اپنے افسروں کے ساتھ الجھنے کی حالت میں تھا، لیکن مسئلہ سے نمٹنے کا اس کا طریقہ

سیدھا نہیں تھا۔ اگر پالم تھانہ تک ہم لوگوں کو لے جانے کا اس کا جذبہ سچا ہوتا تو وہ شیام بابو کے دلی جذبات کو سمجھ کر یہ کام چھوڑ دیتا۔ ہم لوگوں کو مطلع کئے بغیر اس نے آہستہ سے ڈرائیور کو سیدھے روہتک کی جانب گاڑی بڑھانے کے لئے کہا۔ بعد میں وہ اس کے لئے معافی کا خواستگار تھا، لیکن اس نے اسے اس طرح سے سمجھانے کی کوشش کی کہ اگر ہم لوگ تھانہ گئے ہوتے اور کسی متبادل انتظام کی کوشش کی ہوتی تو وہ بے معنی ہوتی۔ ہم سبھی کو رات بھر جاگنا پڑتا۔

نہ تو وہ افسر اور نہ ہی اس کے ساتھ کے تینوں کانسٹبل روہتک سے آشنا تھے، اس لئے انھیں جیل کے بارے میں کئی مقامات پر پوچھنا پڑا۔ پورے راستے بارش کی ہلکی بوندیں پڑتی رہیں۔ فطری طور پر اس موسم میں گلیاں سونی تھیں، لہٰذا روہتک پہنچنے کے بعد بھی جیل کی تلاش میں تھوڑا وقت لگا۔ رات کے تقریباً 2 بجے ہم لوگ بالآخر وہاں پہنچے۔

جیل افسروں کے ساتھ روہتک میں ہمارا پہلا سامنا خوشگوار نہیں رہا۔ جیل کے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ، جس کا نام سینی تھا، نے ہمارے داخلہ کے سلسلہ میں رسمی خانہ پری کے لئے ایک مجرم وارڈن سے ہمارے سامان کی جانچ پڑتال کرنے کے لئے کہا۔ وہ بھی کیسی جانچ پڑتال، ہمارے کپڑوں اور کتابوں کو دیکھنے کے بعد مایوسی ہاتھ لگنے پر وارڈن نے ہماری چپلوں کے تلے کی تلاشی شروع کی کہ ہم نے وہاں کوئی خفیہ کاغذات تو نہیں چھپائے ہیں۔ تکلیف دہ سفر اور رات بھر کی بیداری سے شیام بابو کا دبا ہوا غصہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پر پھوٹ پڑا۔ مدھو ڈنڈوتے نے خوش خلقی کے ساتھ ان پر تبصرہ کیا 'شریمتی گاندھی نے ضرور ہی انھیں Soul-Searching (روح کی تلاشی) کے لئے کہا ہے، لیکن وہ Soul (روح) کی تلاشی ہے نہ کہ Sole (جوتے کے تلے) کی تلاشی۔

رات 3:00 بجے کے قریب ہم لوگ بالآخر چھاؤنی پہنچے، جہاں بیجو پٹنائک اور دیگر لوگ پہلے سے قیدی بنا کر رکھے گئے تھے، جہاں ہم لوگ اگلے دس ہفتہ تک قیام کرنے والے تھے۔ وہاں موجود دوستوں کو اس بات کی اطلاع تھی کہ تین یا چار قیدیوں کے آنے کا امکان ہے، لیکن انھیں یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ کون ہیں یا کس جیل سے انھیں منتقل کیا جا رہا ہے، پھر وہ نئے قیدی ہیں۔

جب میں روہتک جیل میں تھا، کملا نے وزارت داخلہ سے اپیل کی کہ اسے اور ہمارے دونوں بچوں کو مجھ سے ملنے دیا جائے۔ وزارت داخلہ نے پاس جاری کئے، جن پر درج تھا 'صرف دو لوگوں کے لئے' ممبر پارلیمنٹ جگناتھ راؤ جوشی، جنھیں تب تک گرفتار نہیں کیا گیا تھا، نے نجی طور پر دخل اندازی کر کے اپیل کی کہ پاس تین لوگوں کے لئے ہونا چاہئے۔ عدالت کا جواب تھا 'قانون کا نفاذ کیا جائے' ہمارے وکیل این ایم گھٹاٹے نے کملا کو بتایا کہ 'دونوں بچوں کو لے کر چلو' روہتک میں جیل سپرنٹنڈنٹ نے پاس دیکھ کر کہا 'آپ تمام لوگ اندر جا سکتے ہیں'۔

بعد میں جب بھی کانگریسیوں کے ذریعہ یہ دلیل دی جاتی ہے کہ اونچے عہدہ پر بیٹھے لوگوں کے ذریعہ نہیں بلکہ نچلی سطح کے ملازمین کے ذریعہ ظلم کیا گیا تو میں اس مثال سے ان کی بات کو غلط ثابت کرتا ہوں۔

ایسے کیس کے لئے میں اگر بستر مرگ پر بھی ہوتا تو آجاتا

اگست 1975 میں ایک مرتبہ پھر ہم نے ایک عرضی تیار کی۔ اس مرتبہ یہ پہلے سے زیادہ مفصل تھی، چونکہ دوسری مرتبہ بھی ہمیں بنگلور میں ہی گرفتار کیا گیا تھا، اس لئے ہم نے ایک مرتبہ پھر عرضی کو کرناٹک ہائی کورٹ بھیجنے کا فیصلہ لیا، جلد ہی ایم راما جائس نے ہم لوگوں کو مطلع کیا کہ ہماری عرضی پر سماعت کی تاریخ 29 ستمبر 1975 طے کی گئی ہے۔ 8 ستمبر کو ہم نے چیف جسٹس کو ٹیلی گرام بھیج کر سماعت کے دوران وہاں حاضر

رہنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ عدالت کے سامنے ہدایت کے لئے ہماری اپیل کو 10 ستمبر کو لایا گیا۔ عدالت نے حکم دیا کہ ان تینوں قیدیوں کو 26 ستمبر سے قبل بنگلور لایا جائے۔

اس دوران کرناٹک کے اطلاعات ونشریات محکمہ کے 29 ستمبر کا ایک اہم خط سبھی اخبارات اور خبر رساں ایجنسی کے ایڈیٹروں کو موصول ہوا۔ خط اس طرح تھا:

پیارے ایڈیٹر،

خاص سنسر سے موصول پیغام کو اطلاع اور ضروری کارروائی کے لئے دوبارہ پیش کیا جاتا ہے۔ مہربانی کے ساتھ یہ یقین کریں کہ مسٹر اٹل بہاری واجپئی، مدھوڈنڈوتے، ایل کے آڈوانی اور شیام نندن مشرا کو قیدی بنائے جانے کے خلاف کرناٹک ہائی کورٹ میں دائر عرضی کی سماعت سے متعلق خبر کسی اخبار میں شائع نہ ہو۔

شکریہ

آر ایس پرندھرے

اس تاریخی معاملہ کی سماعت کے لئے 29 ستمبر کو جسٹس ڈی ایم چندر شیکھر اور عزت مآب جسٹس بی وینکٹ سوامی کے سامنے لایا گیا۔ قیدیوں کی جانب سے عدالت میں مقدمہ لڑنے کے لئے بمبئی میں واقع ملک کے مشہور و معروف وکیل محمد کریم چھاگلا کے آنے کی خبر کے سلسلہ میں سبھی وکلاء اور کچھ لوگوں کو پتہ چل گیا تھا۔ ہماری جانب سے عدالت میں ان کی موجودگی ہی ایمرجنسی کے خلاف شدید مذمت تھی۔ سب سے بڑھ کر وہ ایک شفاف شخصیت کے مالک تھے۔ بمبئی ہائی کورٹ کے سابق چیف جسٹس، امریکہ میں ہندوستان کے سفیر اور برطانیہ میں ہندوستان کے ہائی کمشنر رہے مسٹر چھاگلا نہرو جی کی کابینہ میں وزیر تعلیم اور اندرا گاندھی کی کابینہ میں وزیر خارجہ رہ چکے تھے۔ فطری ہی تھا، 29 ستمبر کو عدالت کا کمرہ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ شہری آزادی اور جمہوری حقوق کے اس بہادر محافظ کو سننے کے لئے لوگ بے چین تھے۔

مسٹر چھاگلا نے معاملہ کی شروعات کرتے ہوئے کہا، حالانکہ میں نے وکالت چھوڑ دی ہے اور عدالتوں میں میری حاضری منقطع ہو گئی ہے، پھر بھی میں خاص طور سے بمبئی سے بنگلور آیا ہوں، کیونکہ میں محسوس کرتا ہوں کہ ایسا کرنا ایک قومی فریضہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ وہ محض ایک معاملہ میں بحث کرنے کے لئے یہاں نہیں آئے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ 3 دسمبر 1971 کو جاری خارجی ایمرجنسی اب بھی جاری ہے جبکہ پاکستان سے جنگ بندی ہو چکی ہے۔

مسٹر چھاگلا نے مزید کہا کہ 25 جون کو نافذ ایمرجنسی کا مقصد آئین کی دفعہ 352 کے تحت صدر جمہوریہ کو دیئے گئے اختیارات کے مطابق نہیں تھا بلکہ اس کا پوشیدہ مقصد تھا— اندرا گاندھی کو وزیر اعظم کے عہدہ پر برقرار رہنے کو یقینی بناتا— اس وقت انھوں نے ہندوستانی عدلیہ کی آزادی اور بے خوفی کی علامت کے طور پر الٰہ آباد ہائی کورٹ کے جج جگموہن لال سنہا کی ستائش کی۔ انھوں نے کہا کہ 12 جون، جس دن انھوں نے اندرا گاندھی کے انتخاب کو مسترد کرنے کا فیصلہ دیا، آزاد ہندوستان کی تاریخ میں ایک یادگار دن ہے۔

مسٹر چھاگلا نے کہا کہ قانونی تنازع سے الگ ہو کر سپریم کورٹ کے ذریعہ عہدہ پر بنے رہنے کے مشروط حکم دیئے جانے کے بعد سپریم کورٹ کے اس سلسلہ میں فیصلہ آنے تک وہ وزیر اعظم کے طور پر بنی رہ سکتی تھیں یا نہیں، کے باوجود جمہوری اصولوں اور روایتوں کا لحاظ کرتے ہوئے اور عدلیہ کے فیصلہ کو مانتے ہوئے تمام شہریوں کے لئے آدرش بننے کے لئے اندرا گاندھی کو فوراً استعفیٰ دے دینا چاہئے تھا۔ پہلے ایک موقع

پر خود انھوں نے اس بات پر زور دیا تھا۔ جب چینا ریڈی کے لوک سبھا الیکشن کو غیر قانونی قرار دیا گیا تھا تب ریڈی نے مرکزی کابینہ سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ ڈی پی مشرا کے معاملہ میں بھی اندرا گاندھی کا رویہ اسی طرح کا تھا۔ دونوں نے استعفیٰ دے دیا تھا، لیکن جب خود ان کا معاملہ آیا تو انھوں نے ان صحت مند جمہوری قدروں کو نظر انداز کیا اور استعفیٰ دینے سے انکار کر دیا۔ دوسری جانب، انھوں نے عہدہ پر قائم رہنے کے لئے سرکاری مشنری اور آئینی طاقتوں کا غلط استعمال کیا۔

جے پرکاش نارائن اور مرار جی ڈیسائی اور ان معاملوں کے عرضی دہندگان جیسے اہم اپوزیشن لیڈروں کی گرفتاری پر تبصرہ کرتے ہوئے مسٹر چھاگلا نے کہا کہ 'ان لیڈروں کی حب الوطنی اور قومی خدمت کے بے لوث جذبہ پر کوئی سوال نہیں اٹھایا جاسکتا۔' انھوں نے کہا 'یہ تمام ممتاز ممبر پارلیمنٹ ہیں۔ 'میسا' کی ظالمانہ دفعات کے تحت انھیں گرفتار کرنا میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ 'میسا' کے تحت صرف انہی افراد کو گرفتار کیا جاسکتا ہے جو آئینی طور سے تشکیل کردہ حکومت کو تشدد آمیز طریقوں سے گرانے کی سرگرمیوں میں ملوث ہوں۔ جمہوری نظام میں اپوزیشن کے لیڈروں کا یہ حق ہی نہیں بلکہ فرض بھی ہے کہ وہ ایسے حالات میں وزیر اعظم سمیت کسی بھی شخص کے استعفیٰ کا مطالبہ کریں۔ اگر اپوزیشن کے یہ لیڈر اندرا گاندھی کے لوک سبھا الیکشن کو غیر قانونی ٹھہرائے جانے کے بعد وزیر اعظم عہدہ سے ان کے استعفیٰ کا مطالبہ نہیں کرتے تو یہ اپوزیشن کے لیڈر بننے کے اہل نہیں ہوتے۔

مسٹر چھاگلا کی بحث اگلے دن بھی جاری رہی۔ ہمیں بعد میں معلوم ہوا کہ 30 ستمبر کو ان کی سال گرہ تھی اور جب انھوں نے اپنے رشتہ داروں کو یہ کہا کہ اس دن بھی وہ بنگلور میں رہیں گے تو رشتہ داروں کو کافی تکلیف ہوئی۔ کنبہ کے لوگوں نے انھیں واپس بلانے کی کافی کوشش کی، لیکن ان کا حتمی جواب تھا 'عوام کی آزادی اور شہری حقوق کے لئے جدوجہد کرنے سے بہتر طریقہ یوم پیدائش منانے کا اور کیا ہوسکتا ہے۔'

دراصل ہمارے معاملہ میں بحث کے دوران مسٹر چھاگلا بہت جذباتی ہو گئے، ان کی بحث کی شانتی بھوشن اور وینو گوپال نے بہت ہی بہتر طریقہ سے حمایت کی۔

جب ہم قیدیوں نے انھیں تہہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ آپ نے اپنی ضعیفی عمر اور خرابی صحت کے باوجود اس معاملہ کے لئے بنگلور آنے کی تکلیف اٹھائی، تو انھوں نے کہا 'اگر میں بستر مرگ پر بھی ہوتا تو اس طرح کے کیس کے لئے آجاتا۔' انھوں نے ملک کے گھٹن بھرے ماحول پر اظہار تشویش کیا۔ مثال کے طور پر انھوں نے کہا کہ ان کے کچھ دوستوں نے بمبئی میں گاندھی جینتی منانے کے لئے اجازت دینے کے لئے درخواست دی تھی، لیکن حکومت نے اجازت نہیں دی۔ اس پر مدھوڈنڈوتے نے ازراہ مذاق کہا 'اگر اندرا گاندھی جینتی ہوتی تو اجازت مل جاتی۔' بعد میں ہمیں پتہ چلا کہ دہلی اور دیگر مقامات پر گاندھی جینتی منانے والے لوگوں کو ڈیفنس آف انڈیا رولس (ڈی آئی آر) کے تحت گرفتار کیا گیا۔ گاندھی سمادھی راج گھاٹ پر بھی جب آچاریہ جے بی کرپلانی جیسے گاندھی وادی نے دعائیہ جلسہ کا اہتمام کرنے کی کوشش کی تو انھیں پولس نے گرفتار کر لیا۔ آچاریہ کرپلانی کے ساتھ جن لوگوں کو گرفتار کیا گیا، ان میں گاندھی جی کے پوتے راج موہن گاندھی اور سماج وادی لیڈر راج دی کامت تھے۔

اس اہم ہیبس کارپس معاملہ میں کرناٹک ہائی کورٹ نے سینئر ایڈووکیٹ نیرین ڈے کے ذریعہ اٹھائے گئے حکومت ہند کی جانب سے شروعاتی اعتراضات کو خارج کر دیا۔ ان کا اعتراض تھا کہ ہماری عرضی کو براہ راست خارج کر دیا جائے۔ اس طرح بنگلور میں ہائی کورٹ کی سطح پر ملک کے دیگر حصوں میں 'میسا' کے تحت قیدی بنائے گئے لوگوں نے پہلی جنگ جیت لی، لیکن جب اس معاملہ کو چیف جسٹس اے این رے کی

قیادت والی ملک کی سب سے بڑی عدالت عظمیٰ میں لایا گیا تو وہاں عدالت عالیہ کے فیصلہ کو سرے سے خارج کر دیا گیا اور کہا گیا کہ ایمرجنسی کے دوران 'زندگی اور آزادی کے بنیادی حق' کو معطل کر دیا گیا ہے اور اس وجہ سے کوئی بھی عدالت ہبس کارپس کی عرضی کو قبول نہیں کر سکتی ہے۔

عدالت عظمیٰ میں سینئر ایڈوکیٹ نے بحث کی کہ صدر جمہوریہ دفعہ 359 کے تحت اپنے اختیارات کا استعمال کرتے ہوئے اگر ایک مرتبہ دفعہ 21 کے ذریعہ دی گئی زندگی اور آزادی کے بنیادی حق کے التزام کو معطل کر دیتے ہیں تو کسی شہری کو اپنی گرفتاری کو چیلنج کرنے اور عدالت کے دروازے پر دستک دینے کا کوئی حق نہیں رہتا۔ انھوں نے اس بات پر زور ڈالا کہ یہاں تک کہ گرفتاری کا حکم اگر قانون کے لازمی التزام کے مطابق نہیں ہے اور یہ شیطانی خیالات سے متاثر ہے، تب بھی عدالت کو ہبس کارپس عرضی کو سرے سے خارج کر دینا چاہئے۔

مجھے بعد میں پتہ چلا کہ جسٹس ایچ آر کھنہ★ نے جو سپریم کورٹ کی پانچ ججوں کی بنچ کے رکن تھے، سینئر ایڈوکیٹ سے براہ راست سوال کیا کہ دفعہ 21 میں شہریوں کو آزادی کا ہی نہیں بلکہ زندگی کا بھی حق دیا گیا ہے۔ اگر ایمرجنسی کے دوران قیدی بنائے گئے کسی شخص کی نجی وجوہات سے برسراقتدار شخص گولی مار کر قتل کر دیتا ہے تو کیا آپ یہ مشورہ دیں گے کہ اس کے رشتہ داروں کو انصاف نہیں ملنا چاہئے؟ ایسا پتہ چلا کہ سینئر ایڈوکیٹ نے اس کا جواب دیا 'مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی کا احساس نہیں ہو رہا ہے، لیکن قانونی طور پر حالات کچھ ایسے ہی ہیں۔' جسٹس کھنہ نے اس پر اپنا علیحدہ فیصلہ دیا، جس پر 'دی نیویارک ٹائمز' نے ان کا استقبال اس طرح سے کیا کہ 'ایک جج کے طور پر ان کا نام سنہرے لفظوں میں لکھا جائے گا۔'

اپنے ایک فیصلہ میں جسٹس ایچ آر کھنہ نے کہا کہ گرفتاری حکم کے خلاف کسی عرضی کو قانون کی لازمی ضرورتوں، جن کے تحت اسے نافذ کیا گیا، کے موافق ہونے کی بنیاد پر اور غلط جذبہ کی بنیاد پر قبول نہ کرنا دفعہ 359 کے دائرہ سے باہر ہے۔ یہ دفعہ صدر جمہوریہ کو بنیادی حقوق کو معطل کرنے کا اختیار دیتی ہے۔ جسٹس کھنہ نے فیصلہ دیا کہ صدر جمہوریہ کو 'قانون کے نظام' کو معطل کرنے کا حق نہیں ہے۔ اپنے کام کو ذمہ دارانہ اور قانون کے مطابق کرنے کے لئے تمام ملازمین کو قانون کے نظام کی ضرورت ہوتی ہے۔

جیسا کہ میں نے پہلے ہی ایک نوجوان ایڈوکیٹ راما جائس کا ذکر کیا تھا، وہ پہلے دن سے ہی ہمارے قانونی امور کو دیکھ رہے تھے۔ وہ بنگلور کے ہی باشندہ تھے۔ جب ہبس کارپس عرضی پر سپریم کورٹ میں سماعت چل رہی تھی، تب وہ اس معاملہ میں اپنے فطری تجسس کے سبب کارروائی سننے کے لئے دہلی آ گئے تھے۔ وہ 15 سے 19 دسمبر 1975 کو سپریم کورٹ میں تھے۔ جب 22 دسمبر کو بنگلور جیل کے سپرنٹنڈنٹ نے ہمارے پاس پیغام بھیجا کہ راما جائس آ گئے ہیں تو میں نے سوچا کہ دہلی میں جو کچھ بھی ہوا، اس کے سلسلہ میں وہ ہمیں اطلاع دینے کے لئے آئے

★ جسٹس ہنس راج کھنہ کا، جو بعد میں میرے قریبی دوست بن گئے، پچانوے سال کی عمر میں 25 فروری 2008 کو انتقال ہو گیا۔ یہ قابل اعتراض فیصلہ دیتے ہوئے کہ زندگی کا حق ایک بنیادی حق ہے۔ وہ جانتے تھے کہ اس سے انہیں اندرا گاندھی کے غصہ کا نشانہ بننا پڑے گا۔ حکومت نے 1977 میں چیف جسٹس عہدہ کے لئے ان کی سینئرٹی کو نظر انداز کرتے ہوئے جسٹس مرزا حمید اللہ بیگ کو مقرر کیا۔ جسٹس بیگ نے ایمرجنسی کے دوران جنہیں قیدی بنایا گیا تھا، ان کے بارے میں کہا 'ہم سمجھ سکتے ہیں کہ ریاستی افسروں نے قیدی بنائے گئے لوگوں کی فلاح کے لئے بہت دھیان دیا۔ انہیں اچھی خوراک دی جاتی تھی اور اس کے ساتھ بہتر سلوک روا رکھا جاتا تھا۔ ان کی دیکھ ریکھ ایک ماں کی طرح سے کی گئی، یہاں تک کہ والدین بھی ان بچوں کے خلاف تادیبی کارروائی کرتے ہیں، جو اپنے ہی گھر کو جلانا چاہتے ہیں۔' جسٹس کھنہ کے بارے میں 'نیویارک ٹائمز' نے 30 اپریل 1976 کو اپنے اداریہ میں لکھا۔ اگر ہندوستان کبھی پیچھے مڑ کر اپنی آزادی اور جمہوریت کو دیکھے گا، جس نے ایک آزاد قوم کے طور پر پہلے اٹھائیس سالوں میں جو قابل فخر کامرانیاں حاصل کی ہیں تو یقینی طور پر کوئی عدالت عظمیٰ کے جج جسٹس ایچ آر کھنہ کا اسمارک ضرور بنوائے گا۔

ہیں۔ میں جیل سپرنٹنڈنٹ کے دفتر میں گیا اور جائس کو ایک ایڈووکیٹ کی شکل میں نہیں بلکہ ایک قیدی کی صورت میں دیکھ کر مجھے نہایت افسوس ہوا۔ وہ وہاں ایک 'میسا' قیدی کے طور پر لائے گئے تھے۔ بہادر، پرعزم، قابل شخص جائس نے بعد میں کافی ترقی کی اور پنجاب و ہریانہ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس بنے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد انھیں بہار اور جھارکھنڈ کا گورنر مقرر کیا گیا، لیکن جب میں پیچھے کی طرف دیکھتا ہوں تو انگریزی حکومت کے دوران بھی اس کے متوازی کوئی معاملہ نہیں پاتا ہوں، جہاں کسی شخص کو اس طرح سے بے رحمی کے ساتھ اس لئے سزا دی گئی ہو کہ اس نے حکومت کے سیاسی مخالفین کے وکیل کی ذمہ داری نبھائی تھی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ حکومت کو ہر جگہ سازش اور سازش کار ہی نظر آتے تھے۔

اپنی مشہور سوانح حیات 'روز یز ان دسمبر' میں مسٹر چھاگلا کے اکتوبر 1975 میں احمد آباد میں کل ہند شہری آزادی اجلاس میں دیئے گئے لکچر★ کے سلسلہ میں لکھتے ہیں — 'میں نے ذکر کیا کہ جس سازش کے سلسلہ میں اندرا بات کرتی ہیں وہ سازش اپوزیشن نے نہیں رچی تھی بلکہ وہ سازش جمہوریت کو ختم کرنے اور تاناشاہی حکومت کو قائم کرنے کے لئے خود ان کے ذریعہ رچی گئی تھی۔ میں نے اپنے لکچر کا اختتام ان الفاظ میں کیا 'جب رات میں گہری تاریکی چھائی ہو تو سویرا ہونے میں تاخیر نہیں ہوتی اور ہم نے ہزاروں برسوں سے حملوں اور تمام طرح کے مسائل کو جھیلا ہے، تو ہم اندرا اور ان کی تاناشاہی دونوں کا سامنا کرلیں گے۔' اس تقریر کو گجراتی جرنل 'بھومی پتر' میں شائع کیا گیا، جس کی ایڈیٹنگ مہاتما گاندھی کے سکریٹری مہادیو ڈیسائی کے بیٹے نارائن ڈیسائی نے کی تھی۔ مرکزی حکومت نے ایمرجنسی قانون کے تحت ڈیسائی کے پریس کی ضبطی کے لئے کارروائی شروع کردی۔

کوئی حکومت جو چھاگلا اور ڈیسائی جیسی شخصیتوں کے پیچھے پڑسکتی ہے، یہ بات ایمرجنسی کے گرے ہوئے کردار کے سلسلہ میں ایک معقول مثال ہے۔ تمام تاناشاہ طاقت کے نشے میں مدہوش ہوجاتے ہیں اور اس نشہ کی حالت میں اس کے کام غیر معقول ہوتے ہیں، یہاں تک کہ وہ وہم کی حالت میں پہنچ جاتی ہے۔ ایک دن اخبارات میں خبر شائع ہوئی کہ اندرا گاندھی کہہ رہی تھیں، جو قدم انھوں نے اٹھایا، اگر ویسا نہیں کرتیں تو جیسا بنگلہ دیش★★ میں ہوا ویسا ہندوستان میں بھی ہوتا۔ مجھے یقین نہیں ہوا کہ ہندوستان کی وزیراعظم اتنا جارح اور طفلانہ جھوٹ بول سکتی ہیں۔ جنتا تحریک کے چاروں اعلیٰ لیڈر جے پرکاش جی، مرارجی، چرن سنگھ اور اٹل جی تشدد سے براہ راست نفرت کرتے تھے، اس لئے اس سلسلہ میں اشارہ بھی کرنا کہ وہ ایک خونیں انقلاب کا منصوبہ بنا رہے تھے، لائق مذمت، غیر اخلاقی اور نفرت انگیز بیان ہے۔

میرا انڈر گراؤنڈ جمہوریت نواز ادب

بنگلور جیل میں مجھے اپنی زندگی کا ایک تنہا دور دان جو حاصل ہوا، وہ تھا تنہائی اور اس کا مطلب تھا، اس کا بہتر استعمال کرنا۔ ایک اچھی لائبریری اور پرسکون اسٹڈی روم کے علاوہ جیل میں ایک بیڈمنٹن کورٹ اور ٹیبل ٹینس ہال تھا، جہاں میں مسلسل کھیلتا تھا۔ اصل میں جینت نے جو کہ اب ایک بہترین ٹیبل ٹینس کھلاڑی ہے، سب سے پہلے اس کھیل کے تئیں میری دلچسپی اس وقت پیدا کی جب وہ کملا اور پرتھما کے ساتھ پہلی

★ شہری آزادی اجلاس ان دنوں احمد آباد میں اس لئے منعقد کیا جاسکا، کیونکہ گجرات میں اس وقت بابو بھائی پٹیل کی قیادت والی غیر کانگریسی حکومت تھی۔

★★ 15 راگست 1975 کو بنگلہ دیش میں فوجی تختہ پلٹ ہوا جس میں فوجی افسروں نے صدر کی رہائش گاہ پر ٹینک سے حملہ کیا اور شیخ مجیب الرحمٰن، ان کے پورے کنبہ اور نجی اسٹاف کا قتل کردیا۔ صرف ان کی بیٹی شیخ حسینہ واجد اور شیخ ریحانہ بچ گئیں، کیونکہ وہ غیر ممالک میں تھیں۔ شیخ حسینہ واجد بعد میں بنگلہ دیش کی وزیراعظم بنیں۔

مرتبہ مجھ سے بنگلور جیل میں ملنے آیا تھا، چونکہ میرے کئی ساتھی قیدی کرناٹک سے تھے، میں نے کنڑ سیکھنا شروع کردیا اور اخبارات کی اہم خبریں پڑھنے اور کچھ ابتدائی جملہ بولنے میں کافی مہارت حاصل کرلی★۔ وقت گزارنے کا میرا پسندیدہ وسیلہ یقینی طور پر لائبریری کی کتابیں تھیں۔ کئی دیگر کتابوں میں سے مجھے ولیم شیئرر کی تحریر کردہ 'دی رائز اینڈ فال آف دی تھرڈ رائخ' کی یاد آتی ہے، جس میں ایڈولف ہٹلر کی حکومت کے تحت نازی جرمنی کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کتاب نے مجھے وہ کتابچہ لکھنے کے لئے نہایت قیمتی مواد فراہم کیا، جس کا عنوان تھا 'اے ٹیل آف ٹو ایمرجنسیز' جمہوریت نواز کارکنان کے لئے انڈر گراؤنڈ ادب کے طور پر میرا یہی رول تھا، جس کا استعمال جے پی کے ذریعہ قائم کی گئی لوک سنگھرش کمیٹی کے ذریعہ کیا جاتا تھا۔ ہٹلر نے جو جرمنی میں کیا تھا، وہی کانگریس حکومت ہندوستان میں کررہی تھی۔

جب سال 1919 میں وائمر آئین کو اپنایا گیا، اسے بیسویں صدی کا اپنی طرح کا 'سب سے روادار اور جمہوری دستاویز' مانا جاتا ہے۔ شیئرر نے اسے تکنیکی طور پر مکمل بہترین، پرستائش آلہ کہا ہے، جو کہ پاک جمہوریت کے کام کی گارنٹی کے برابر ہے، لیکن وائمر آئین، جیسا کہ ہمارا ہے، اس میں بھی ایمرجنسی کا التزام ہے، جو اس کے بانیوں نے پورے اعتماد کے ساتھ شامل کئے تھے۔ انھیں بھروسہ تھا کہ ان کا استعمال جنگ جیسے سنگین حالت کے دوران کیا جائے گا۔ مضمون میں میں نے لکھا:

> ''ہر دوسرے دن اندرا گاندھی اور ان کے ساتھی ہٹ دھرمی کے ساتھ کہتے رہے کہ گزشتہ کچھ ماہ سے جو کچھ وہ کررہے ہیں، وہ 'آئین کے دائرہ' کے اندر ہی ہے۔ یہ دلیل دی گئی کہ ان کے خلاف اپوزیشن اور مغربی پریس کے ذریعہ لگایا گیا یہ الزام کہ انھوں نے جمہوریت کو تباہ کردیا ہے، کی حمایت نہیں کی جاسکتی ہے۔ نازی جرمنی کی تاریخ یقیناً ظاہر کرتی ہے کہ آئین کے مطابق جو کچھ بھی کیا جاتا ہے، وہ ضروری نہیں ہے کہ جمہوری بھی ہو۔ ہٹلر ہمیشہ یہ مشتہر کرتا تھا کہ اس نے کچھ بھی غیر قانونی یا غیر آئینی نہیں کیا ہے۔ دراصل اس نے جمہوری آئین کو تاناشاہی کا ایک آلہ بنایا—''

شی شیئرر نے کہا' حالانکہ وائمر جمہوریت تباہ ہوچکی ہے، وائمر آئین کو کبھی بھی ہٹلر کے ذریعہ رسمی طور پر رد نہیں کیا جاسکا۔ اصل میں المیہ یہ ہے کہ ہٹلر نے اپنے قانون کو جمہوری آئین کے ہتک پر منحصر نہیں کیا۔ ایک پراثر اپوزیشن، ایک آزاد پریس اور ایک آزاد عدلیہ جمہوریت کے تین اہم ستون ہیں۔ یہ ادارہ جاتی رکاوٹیں ہیں، جو ایک جمہوری سیاست میں مقننہ کو آمریت سے بچاتے ہیں، ساتھ ہی قانون سازی کو بھی بدنظم اکثریت (پارٹی) کے ہاتھ کی کٹھ پتلی بننے سے روکتے ہیں۔ ہٹلر کے سامنے اپوزیشن کا کوئی مطلب نہیں تھا، نہ ہی اندرا گاندھی کے لئے، جو اپوزیشن پارٹیوں کو 'اکثریتوں کی خواہشات کی مخالفت کرنے والی اقلیتوں کا گروپ' کہنے سے تھکتی نہیں تھیں۔

ایمرجنسی کے خلاف کام کررہے کارکنان نے نئی دہلی میں منعقد دولت مشترکہ کانفرنس کے باہر پمفلٹ تقسیم کئے، حکومت اس سے ناراض ہوگئی۔ کچھ افسروں کو بنگلور، ریاستی حکومت اور جیل عملہ سے یہ تفتیش کرنے کے لئے بھیجا گیا کہ کیا وہ ہماری جیل سے گئے تھے۔ ایسا اس لئے ہوا کہ کچھ دن پہلے میں نے ٹائپنگ سیکھنے کی خواہش کا اظہار جیل سپرنٹنڈنٹ سے کیا تھا کہ مجھے باہر سے ٹائپ رائٹر خریدنے کی اجازت دی جائے۔ انھوں نے ایسا کرنے سے منع کردیا، اس لئے جب دہلی سے آئے افسروں نے ان سے پمفلٹ کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے

★ جون 2000 میں میں بنگلور میں ایمرجنسی لگائے جانے کی پچیسویں سال گرہ کی تقریب میں حصہ لینے کے لئے گیا۔ میں دیگر لوگوں رام کرشن ہیگڑے اور جے ایچ پٹیل کے ساتھ بنگلور سینٹرل جیل گیا۔ وہ دونوں ہی بعد میں کرناٹک کے وزیراعلیٰ بنے۔ اس موقع پر اپنی تقریر میں میں نے کہا 'اگر اندرا گاندھی نے مجھے کچھ وقت اور یہاں (جیل میں) رکھا ہوتا تو میں اتنی اچھی طرح سے کنڑ بولنا سیکھ جاتا کہ آج آپ سے آپ کی زبان میں بات کرپاتا۔'

صاف کہہ دیا کہ اس جیل سے کسی نے بھی یہ نہیں لکھا ہے۔

لیکن بعد میں یہی جیل سپرنٹنڈنٹ اور کچھ دیگر افسر میرے پاس آئے اور کہا' جہاں تک دہلی سے تفتیش کا سوال ہے، ہمیں یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ یہ ختم ہو چکی ہے، لیکن اگر پمفلٹ واقعی یہیں سے لکھے گئے ہیں تو کیا ہمیں اس کی ایک کاپی ملے گی؟ ہم اسے پڑھنا چاہیں گے؟' میں مسکرایا اور انھیں ایک کاپی دے دی۔ اصل میں میں نے جیل میں پانچ پمفلٹ لکھے اور ان میں سے سبھی کو ایمرجنسی کے دوران خفیہ ادب کے طور پر شائع کیا گیا۔ بعد میں انھیں میری کتاب 'اے پریزنرس اسکریپ بک میں شامل کیا گیا'۔

اخبارات اور رسائل میں یہ پڑھ کر مجھے بے حد غصہ آیا کہ جیل میں ہم کیسے قید ہوئے۔ ایمرجنسی کے حامیوں نے اس کا تابندہ خاکہ پیش کیا کہ کیسے ریل گاڑیاں جو کہ تاخیر سے چلنے کے لئے بدنام تھیں، اب وقت پر چلنے لگی ہیں اور کیسے مظاہرے ختم ہو گئے ہیں اور کیسے چاروں طرف ڈسپلن قائم ہو گیا ہے۔ مطلق العنانیت کو اس پر دلائل طریقہ سے درست ٹھہرانے کی تردید کرنا میرے ایک دیگر خفیہ پمفلٹ 'اناٹومی آف فاشزم' کا موضوع تھا۔ میں نے لکھا— 'اندرا گاندھی نے کبھی بھی اپنے مخالفین کو فاشسٹ کہنے کی کوشش نہیں کی۔ ظاہر ہے اندرا گاندھی نے سوچا کہ بار بار دہرانے سے لوگ ان پر یقین کرنے لگیں گے، لیکن فاشسٹ کا ایک مخصوص معنی اور اشارہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کا تاریخی تجربہ بھی ہے کہ کیسے فاشزم نے سلوک کیا اور فاشزم کا کیا مقصد ہے۔ میں یہ اجاگر کر سکا کہ ہندوستان میں اصلی فاشسٹ کون ہے؟ اندرا گاندھی یا ان کے مخالفین۔

اس مضمون میں میں نے مشہور ماہر تعلیم ماریہ مانٹیسری کا بیان قلم بند کیا 'ڈسپلن آزادی کے ساتھ آنی چاہئے، ہم اس شخص کو پر نظم نہیں مان سکتے جو فرضی طور پر خاموش ہے اور وہ انفرادی طور پر غیر جذباتی ہے، نہ کہ منظم۔ اندرا گاندھی کے ذریعہ ڈسپلن کی بات جمہوری حقوق کو دبانے، عدلیہ کو زنجیروں میں کسنے اور آئین کو کمزور کرنے کا ایک بہانہ ہے۔

آئین درہم برہم، عدلیہ معذور

سنجیدہ اور طویل بحث کے بعد جب جنوری 1950 میں آئینی اجلاس نے آئین کو اختیار کر لیا تھا تب اسے اس بات کا ذرا بھی گمان نہیں رہا ہوگا کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا جب خود حکومت ہی آئین کو درہم برہم کرے گی اور جمہوریت کو خطرہ میں ڈال دے گی—اس کے ساتھ ہی دانشور اور دوررس آئین سازوں نے مستقبل میں ناکارہ حکمرانوں کے حملہ کے خلاف اسے ایک قابل یقین ڈھال بنانے کے لئے بہت سی دفاعی تدابیر کے التزامات کئے۔ وزیر اعظم اور ان کے نزدیکی چاپلوس صلاح کار اس حقیقت سے بہتر طریقہ سے آشنا تھے، اس لئے ایمرجنسی نافذ ہونے کے فوراً بعد انھوں نے آئین کے تحفظ کرنے والے جمہوری التزامات کو ایک ایک کر کے ختم کرنا شروع کر دیا۔

1975 میں پارلیمنٹ کے اس پہلے مضحکہ خیز مانسون سیشن میں حکومت نے 39ویں آئینی ترمیم بل پیش کروالیا۔ (نافذ ہونے پر یہ 38ویں ترمیم ہے) اس نے ایمرجنسی کے اعلان کو عدلیہ میں زیر غور کے قابل بھی نہیں رکھا اور عدالتی جانچ میں صدر جمہوریہ کے 'اطمینان بخش' کے التزام سے دفاع کیا نہ صرف دفعہ 352 (ایمرجنسی کا اعلان) کے سلسلہ میں بلکہ دفعہ 123 (ہدایت جاری کرنے) اور دفعہ 356 (ریاست میں صدر راج نافذ کرنے) کے سلسلہ میں بھی۔ اسی طرح دفعہ 213 کے تحت ہدایت جاری کرنے کے لئے گورنر کے اختیارات کی بھی حفاظت کی۔ دفعہ 359 کے تحت شہریوں کے بنیادی حقوق کی معطلی کو بھی تحفظ فراہم کیا گیا۔ واضح طور سے حکومت ناکارہ سسٹم کی بنیاد رکھ رہی تھی، جس میں اس کے سیاسی کار فرما (وزیر اعظم) نے پہلے صدر جمہوریہ کو ربراسٹامپ کے طور پر تبدیل کر دیا اور صدر جمہوریہ اور خود کو عدلیہ کے تئیں جواب دہی سے بچا لیا۔

'میسا' کو زیادہ خطرناک بنانے کے لئے اس میں ترمیم کی گئی۔ کسی قیدی کو اس کے قیدی بنائے جانے کی وجہ کو واضح کرنے کی حکومت کی ذمہ داری کو نظرانداز کر دیا گیا۔ ترمیم شدہ ایکٹ کے تحت گرفتار کسی بھی فرد کو ضمانت یا مچلکہ کی بنیاد پر رہا نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بنگلہ دیش مکتی سنگرام کے دوران لگائی گئی خارجی ایمرجنسی کی دین ہے۔ ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ (ڈی آئی اے)، 1971/75 کے داخلی ایمرجنسی میں اس کے سخت التزامات کا استعمال کرنے کے لئے اس میں بھی ترمیم کی گئی۔

لیکن کچھ اور نفرت انگیز واقعہ وقوع پذیر ہونے والا تھا۔ عوامی نمائندگی ایکٹ اور انڈین پینل کوڈ کے خصوصی التزامات کو بدلنے کے لئے حکومت نے 4 راگست کو انتخابی قانون (ترمیم) ایکٹ پیش کیا۔ میں آکاش وانی سے صبح کو نشر ہونے والی پنجابی بلیٹن سن رہا تھا، جس میں خبر نشر کی گئی کہ وزیر قانون گوکھلے نے لوک سبھا میں آگاہی اثرات سے دوبارہ تعریف کرنے کے لئے ایک بل پیش کیا ہے، جو ان حقائق پر مبنی ہے:

(الف) جب کوئی فرد کسی الیکشن میں امیدوار بنتا ہے،

(ب) اسے کسی سرکاری افسر سے کس طرح کی مدد حاصل ہونے سے بدعنوان مانا جائے گا اور

(ج) کسی سرکاری ملازم کا استعفیٰ کب مؤثر ہوگا۔

میں جلد ہی سمجھ گیا کہ کوئی بہت بڑا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ میں نے کیا سنا، اس بات کی تصدیق کے لئے فوراً میں نے آکاش وانی کا اردو بلیٹن سنا، جس میں اس خبر کو دوبارہ نشر کیا گیا۔ جیل میں موجود تمام سیاسی قیدی برہم اور محتاط ہو گئے۔ اس دن اپنی ڈائری میں میں نے لکھا— 'کوئی بھی سمجھ سکتا ہے کہ اس بل سے کیا حاصل کرنے کا مقصد ہے۔ اندرا گاندھی کی انتخابی بدعنوانی کے سلسلہ میں الٰہ آباد ہائی کورٹ کے ہدایت نامہ کو ختم کرنے کی یہ بے شرم کوشش ہے۔ یہ کسی کھیل کے قاعدہ میں ترمیم کرنے جیسا ہے اور نئے قانون کے مقابلہ میں اس جذبہ کے ساتھ استعمال کرنا ہے کہ شکست خوردہ پارٹی کو فتح یاب قرار دیا جائے۔ الٰہ آباد ہائی کورٹ کا فیصلہ یا نجی طور پر اندرا گاندھی سے ایمرجنسی کا کچھ بھی لینا دینا نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں کی گئی زوردار مخالفت کو خود حکومت نے ہی اس بل کو لا کر خارج کر دیا ہے۔'

بغیر کسی بحث ومباحثہ کے پارلیمنٹ کے دونوں ایوان میں کچھ ہی دنوں میں اس بل کو پاس کر دیا گیا۔

7 راگست کو حکومت نے 40واں آئینی ترمیم بل پیش کیا۔ یہ پارلیمنٹ میں بحث کے لئے رکھے گئے آج تک کے تمام بل میں اپنی طرح کا سب سے انوکھا بل تھا۔ صدر جمہوریہ، نائب صدر جمہوریہ اور وزیر اعظم، لوک سبھا اسپیکر اور منتخب ممبران پارلیمنٹ کو چیلنج دینے والی عرضی پر سماعت کرنے سے عدالت کو روکنا اس کا مقصد تھا۔ آئین میں یہ التزام تھا کہ ان انتخابات کو چیلنج صرف پارلیمنٹ کے ذریعہ تشکیل کردہ بنچ میں ہی دیا جا سکتا ہے۔ بل کی دفعہ (4) میں سب سے نفرت انگیز التزام تھا، جس میں کہا گیا کہ ان چار معزز ہستیوں کے الیکشن کے سلسلہ میں کسی بھی ہائی کورٹ کے تمام فیصلوں کو غیر مؤثر مانا جائے گا۔ اس طرح ترمیم کرنے کی اپنی طاقت کے پس پردہ پارلیمنٹ نے عدلیہ کے اختیارات کو منہدم کر دیا۔

درج ذیل واقعات کا سلسلہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ ہندوستان کی تاریخ میں جلد بازی میں پیش کی جانے والی آئینی ترمیم تھی۔

☆ 7 راگست 1975 لوک سبھا میں پیش

☆ 7 راگست 1975 دو گھنٹہ کی بحث کے بعد لوک سبھا میں پاس

☆ 8 راگست 1975 راجیہ سبھا میں پیش

☆ 8 راگست 1975 — راجیہ سبھا میں پاس
☆ 9 راگست 1975 — ریاستی اسمبلیوں کے ذریعہ ایک ہی دن میں پاس
☆ 10 راگست 1975 — صدر جمہوریہ کی منظوری

صرف ایک فاشسٹ ریاست ہی اس طرح آئین کو تباہ کرسکتی ہے۔ المیہ یہ ہے کہ جو لوگ یہ جرم کرر ہے تھے، وہ الٹے جن سنگھ اور جے پرکاش جی کے دیگر حامیوں پر فاشزم کا الزام لگا رہے تھے۔

کانگریس پارٹی نے اتنی جلد بازی میں ترمیم کیوں کی؟ اس لئے کہ عدالت عظمیٰ 11 راگست 1975 کو اندرا گاندھی کی انتخابی عرضی کی سماعت کرنے جا رہی تھی۔ 7 رنومبر کو عدالت عظمیٰ نے اندرا گاندھی کے انتخاب کو قانونی قرار دیا۔ اس نے آئینی ترمیم کو بھی مؤثر ڈھنگ سے قانونی قرار دے دیا۔

اس سے ملحق ایک دیگر دلچسپ سوال بھی تھا۔ انتخابی قانون میں ترمیم کر کے اندرا گاندھی کے انتخابی معاملہ میں الٰہ آباد عدالت عالیہ کے فیصلہ کو درکنار کرنے کے علاوہ عدالت عظمیٰ کے پاس کوئی چارہ بھی نہیں رہ گیا تھا، پھر بھی حکومت کو یہ اضافی تدبیر تلاش کرنے پر کیوں مجبور ہونا پڑا؟ جب ہم جیل کے تمام ساتھی ان آئینی ترمیمات کے سلسلہ میں تبادلہ خیال کرر ہے تھے، تبھی ڈاکٹر بھائی مہاویر نے ایک پرلطف کہانی سنائی۔ مغربی تہذیب میں ساس مزاحیہ کردار ہوا کرتی ہے۔ ایک شخص کے پاس ٹیلی گرام آیا کہ اس کی ساس کی اچانک موت ہوگئی ہے۔ ساس اس کے کنبہ کے ساتھ رہتی تھی، لیکن اس درمیان کچھ رشتہ داروں سے ملنے گئی تھی۔ اس ٹیلی گرام میں آگے لکھا ہوا تھا 'کیا اسے جلایا جائے یا دفن کر دیا جائے؟ ہدایت کا انتظار ہے۔' ایک پل بھی گنوائے بغیر غمزدہ داماد نے واپس ٹیلی گرام بھیجا 'موقع نہ گنوائیں، دونوں کام کر دیں۔' مہاویر جی نے تبصرہ کیا کہ وزیر قانون گوکھلے قانون ختم کرنے کا کوئی موقع بھی نہیں گنوار ہے ہیں۔

8 راگست کو میں نے اپنی ڈائری میں لکھا— 'اصولی طور سے ہندوستانی آئین کی شکل ابھی جمہوری ہے، حالانکہ تمام عملی مقاصد کے لئے قانون کو بگاڑا جار ہا ہے تاکہ انگلینڈ کی مہارانی کی طرح اندرا گاندھی کو بھی مہارانی بنایا جائے۔ آئینی طور طریقہ سے اپنی کسی بھی غلطی کے لئے ان پر کوئی بھی قانونی کارروائی نہ کی جاسکے۔ 'اندرا گاندھی غلطی نہیں کرسکتیں' اس پر آئینی مہر لگانے کے لئے مزید کیا کیا جانا چاہئے؟

اگلے دن، جو راجیہ سبھا سیشن کا آخری دن تھا۔ وزیر قانون گوکھلے نے نہایت غیر مدلل 41 ویں آئینی ترمیم بل پیش کی۔ دفعہ 361 کو ترمیم کرنے کا خاص مقصد یہ تھا کہ سبھی معلوم معاملات میں وزیراعظم کو ان کے خلاف جرائم کارروائیوں میں عدالت کی پہنچ سے باہر رکھنا۔ اس پر میں نے اپنے غصہ کا اظہار کرتے ہوئے ڈائری میں لکھا—

> "ایسا قدم اٹھائے جانے کا خیال ہی اپنے آپ میں ٹھیس پہنچانے والا ہے۔ یہ ہمارے آئین کے وفاقی ڈھانچہ کو تباہ کرتا ہے۔ ضروری قانونی کارروائی سے وزیراعظم کو بچانے کے لئے یہ ان کے تمام جرائم کو قانونی ٹھہرانے کی کوشش کرر ہا ہے۔ ایسا ہی تحفظ صدر جمہوریہ اور گورنروں کو دیا گیا ہے۔ موجودہ حالت میں آئین کی دفعہ 361 کے تحت صدر جمہوریہ اور گورنر کو ہی مجرمانہ یا سول کارروائیوں سے چھوٹ ہے، لیکن ان کے عہدہ پر قائم رہنے کے دوران ایسی کوئی بھی چھوٹ وزیراعظم اور وزرائے اعلیٰ کو نہیں دی گئی ہے، کیونکہ وہ لازمی طور سے سیاسی افسر ہیں اور وہ قانون کے تئیں اتنے ہی جواب دہ ہیں کہ دیگر شہری، قانون کے سامنے مساوات جمہوریت کا لازمی عنصر ہے۔ صدر جمہوریہ اور گورنروں کو تحفظ دیئے جانے کے پیچھے دلیل یہ ہے کہ وہ صرف ریاست کے آئینی سربراہ ہیں، جو کہ کاز کے عمل دخل

کا اہتمام نہیں کرتے، یہاں تک کہ چھوٹ انھیں صرف عہدہ پر قائم رہنے کی مدت کے دوران ہی ہے۔ کئی ترمیم صدر جمہوریہ اور گورنروں کو ان کے ذریعہ عہدہ قبول کرنے سے قبل اور عہدہ چھوڑنے کے بعد کیے گئے جرائم سے انھیں چھوٹ دینا چاہتی ہے۔ وزیر اعظم کے عہدہ داران کو چھوٹ کے مقصد سے ان کے برابر رکھا گیا ہے۔''

جب میں اس دن ڈائری میں درج کیے گئے مضمون پر غور کرتا ہوں تو پاتا ہوں کہ میں کتنے غصہ میں تھا۔

1976 میں حکومت نے پارلیمنٹ میں 44ویں ترمیم بل پیش کی، جو کہ منظور ہو جانے کے بعد 42ویں ترمیم بن جاتی اور اس سے لوک سبھا اور اسمبلی کے کام کاج کو 6 سال کا کئے جانے کے ساتھ ساتھ شہریوں کے حقوق میں تخفیف کرنے اور عدلیہ کی آزادی میں سیندھ لگانے کی حکومت کی مراد پوری ہو جاتی۔ تقریباً تمام قانون اور حکومت کے کام کاج کو عدالت میں چیلنج نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس میں خاص طور سے دو خطرناک التزامات تھے—(1) یہ صدر جمہوریہ کو ایک ورکنگ منڈیٹ کے توسط سے دو سال کے لئے آئین میں ترمیم کرنے کا اختیار دیتا تھا۔ (2) یہ پارلیمنٹ میں کورم کی ضرورت کو ختم کرتا تھا، جس کا مطلب ہے کہ صرف دو یا چار لوگ ہی ملک کے لئے قانون بنا سکتے تھے۔ جب حکومت نے اس بل کو پارلیمنٹ میں پیش کیا تو اس پر سوشلسٹ پارٹی کے لیڈر ایچ وی کامت نے تلخ ردِّعمل کا اظہار کیا 'یہ بل آئین میں ترمیم کرنے کے لئے نہیں بلکہ آئین کا خاتمہ کرنے کے لئے ہے۔'

قانون کے ساتھ کیے گئے کھلواڑ نے مجھے ایک دیگر انڈر گراؤنڈ پمفلٹ 'ناٹ اے ایمنڈمنٹ، اٹس اے نیو کانسٹی ٹیوشن' (یہ ترمیم نہیں بلکہ نیا آئین ہے) لکھنے کے لئے اکسایا۔ میں نے لکھا 'ایمرجنسی خود غیر آئینی ہے اور اس کا اعلان جاری ہے۔ اس کے علاوہ ایک لوک سبھا، جس نے ایمرجنسی کے سبب اپنی مدت میں توسیع کی ہے وہ بنیادی طور سے ایک کارگزار پارلیمنٹ ہے، جو سیاسی نظریہ سے صرف معمولی بلوں پر غور کرنے کی اہل ہے۔ اس طرح کا اہم آئینی کام کاج یقینی طور پر اس کی دسترس سے باہر ہے۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ پارلیمنٹ کے تیس سے بھی زائد سینئر ممبر★ جیل میں بغیر مقدمہ کے قیدی ہیں۔ انھیں یہ پتہ نہیں ہے کہ وہ جیل میں کیوں بند ہیں؟ وہ عدالت میں بھی نہیں جا سکتے تھے۔ صرف ایک وجہ، جس کا وہ اندازہ لگا سکتے تھے، وہ تھی ایک خطرناک ایمرجنسی نامی چالاکی کو لوگوں پر تھوپا جا سکتا تھا جب پارلیمنٹ، پریس اور عدلیہ کو قیدی بنا دیا جائے۔ کچھ دن پہلے جب اندرا گاندھی سے یہ پوچھا گیا کہ کتنے ممبر پارلیمنٹ جیل میں ہیں؟ انھوں نے کہا 'تعداد زیادہ نہیں ہے، شاید بیس بھی نہیں...' یہ بھی تعجب خیز ہے کہ اندرا گاندھی کو اس کا علم نہیں تھا۔

'44ویں آئینی ترمیم بل' پر میں نے انتباہ کیا تھا کہ 'یہ آئین میں موجود تمام سرحدوں اور بندھنوں کو تباہ کرنے کی ایک منظم کوشش ہے، سوائے مقننہ کو چھوڑ کر دیگر تمام اداروں کے دائرہ میں دخل اندازی کی گئی تھی۔ اس قدم کا مطلب ہے کہ وزیر اعظم ایک آئینی تاناشاہ بننے جا رہی ہیں۔'

اگر پارلیمنٹ اس بل کو پاس کر دیتی ہے تو ہندوستان کے لوگوں نے 26 رجنوری 1950 کو جو آئین مرتب کیا تھا، وہ کہیں دفن ہو جائے گا اور ایک نیا آئین اس کی جگہ لے لے گا۔'

ہر تاناشاہی حکومت کی پہچان ہوتی ہے، عوام کے ساتھ کبھی بھی شفافیت اور ایماندارانہ رویہ اختیار نہ کرنا، مثال کے طور پر میں ایک اور

★ میرے پہلے درج کردہ ناموں کے علاوہ کچھ اور اہم قیدی ممبر پارلیمنٹ تھے رام دھن، جنہیں برسر اقتدار پارٹی سے معطل کر دیا گیا تھا، سوشلسٹ پارٹی کے معمر لیڈر شمر گوہا اور مدھو لمئے، بھارتیہ لوک دل کے ربی رے اور راج نارائن، انقلابی کانگریس لیڈر موہن دھاریہ، ڈی ایم کے لیڈر مراسولی مارن اور سی پی آئی (ایم) کے تیز طرار ممبر پارلیمنٹ جیوتی بسو۔

انڈرگراؤنڈ مضمون کا ذکر کرنا چاہوں گا، جس کا عنوان ہے 'ناٹ پراپرٹی، بٹ ڈیموکریسی از ہر بگ بیئر'۔ اس میں یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ کس طرح سے کانگریس حکومت اپنے اقتصادی مورچہ پر ناکامی کے دفاع کے طور پر آئین کو قربانی کا بکرا بنانا چاہتی ہے اور اس کے لئے وہ اس کے بنیادی ڈھانچہ کو مسمار کر رہی ہے۔ چنڈی گڑھ میں 1975 کے اپنے اجلاس میں اے آئی سی سی نے آئین پر 'از سرنو غور کرنے' کا اعلان کیا۔ حکومت میں ایک سینئر وکیل اوماشنکر دکشت نے اعلان کیا کہ اگر ترمیم کے سلسلہ میں پارلیمنٹ کے حدود متعین نہیں کئے جاتے تو ایک نئے آئینی اجلاس کی تشکیل کر کے نئے آئین کی تخلیق کی جائے گی۔ حکومت کے ایک دیگر اہم لیڈر سدھارتھ شنکر رے (جو 25رجون کو ایمرجنسی کا اعلان کرنے پر صدر جمہوریہ کی رضامندی حاصل کرنے کے لئے اندرا گاندھی کے ساتھ راشٹرپتی بھون گئے تھے) نے سرعام کہا تھا کہ پارلیمنٹ کے فیصلوں کا عدالتی تجزیہ ایک نئے معاشی نظام کو ابھرنے سے روکتا ہے۔

ان لوگوں کو یہ سننے میں عجیب احساس ہو سکتا ہے، جو ایمرجنسی کے بعد کی نسل کے ہیں کہ اس وقت کانگریس پارٹی سوویت یونین کے کیمونزم کے زیر اثر تھی اور ملک میں یہ تشہیر کر رہی تھی کہ ہندوستان میں غریبی کا اہم سبب ہے آئین کے ذریعہ ملکیت کے حقوق کی گارنٹی۔ سالوں تک عدالت عظمیٰ کے ذریعہ گولکناتھ مقدمہ کے فیصلہ کو اقتصادی ترقی کی راہ میں اہم رکاوٹ کے طور پر مشتہر کیا جاتا تھا۔ 1967 میں دیئے گئے اس فیصلہ میں کہا گیا تھا کہ پارلیمنٹ کو دفعہ 368 میں درج آئینی ترمیم کے عمل کے توسط سے کسی بھی بنیادی حقوق کو رد کرنے یا کم کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ اس میں کہا گیا کہ بنیادی حقوق کو آئین میں ایک 'خصوصی مقام' حاصل ہے۔ اس وجہ سے پارلیمنٹ یا آئین کے تحت کام کرنے والا کوئی بھی انفرااسٹرکچر ان میں ترمیم نہیں کر سکتا۔ پارلیمنٹ کی ترمیم کے اختیار پر عدالتی کنٹرول نے ملکیت کے حق کو محفوظ رکھا۔ حکومت نے بھی اس فیصلہ کے خلاف انتہائی زور لگایا اور کہا کہ تمام غریب حامی منصوبے اسی وجہ سے ناکام رہے ہیں۔

تب آئی 24ویں آئینی ترمیم، جو گولک ناتھ فیصلہ کو رد کرتی تھی۔ ترمیمات پارلیمنٹ کے آئین کے کسی بھی التزام کو، جس میں بنیادی حق بھی شامل ہیں، ترمیم کرنے کا اختیار دیتا تھا۔ بحث کے دوران ہم نے اپوزیشن کے طور پر اس ترمیم کے توسط سے پارلیمنٹ کو غیر محدود اختیارات دینے کی مخالفت کی۔ ہمارا مشورہ تھا کہ جب پارلیمنٹ کو دفعہ 31 کے تحت ملکیت کے حقوق کو رد کرنے یا کم کرنے کا اختیار حاصل ہو گیا ہے تو اظہار رائے کی آزادی اور مذہب کی آزادی وغیرہ بنیادی اختیارات کو خلاف ورزی کے دائرہ میں رکھا جائے۔ اس ترمیم کی حیثیت کو چیلنج کیا گیا۔ یہ معاملہ، جس کے نتیجہ کے طور پر یہ ہوا، وہ تھا کیشوانند بھارتی مقدمہ، جس میں اپریل 1973 میں فیصلہ دیا گیا۔ یہ اب ہندوستان کی آئینی تاریخ میں سنگ میل بن گیا ہے۔ عدالت نے ایک لکشمن ریکھا کھینچتے ہوئے کہا کہ پارلیمنٹ کے ترمیم کے اختیارات وسیع مگر محدود ہیں۔ پارلیمنٹ آئین کی بنیادی خصوصیت کو رد یا کم کرنے کا اختیار نہیں رکھتی، تب سے اسے آئین کے بنیادی ستون کے طور پر جانا جاتا ہے۔

اگر حکومت ایمانداری سے یہ مانتی ہے کہ ملکیت کا حق اس کے بہبودی پیمانوں میں رکاوٹ کا کام کر رہا ہے تو بغیر مزید غور وفکر کئے اسے رد کر دینا چاہئے تھا۔ ملک کے اعلیٰ ترین عدالتی ادارہ نے ضروری وضاحت دے دی۔ حکومت نے اس طرح کا کوئی کام نہیں کیا۔ اس نے محض اتنا کیا کہ ایک نئی مہم چلا کر مشتہر کیا کہ کیشوانند بھارتی فیصلہ ایک نئی بدروح ہے، جو اندرا گاندھی کی حکومت کے لوگوں پر معاشی تحائف کی برسات کو روک سکتا ہے۔

کیشوانند بھارتی مقدمہ کی سماعت کے دوران حکومت کے وکیل اس بنچ کے ذریعہ کیے گئے اس سوال کی تلاش میں مصروف تھے کہ ان کے ذریعہ پارلیمنٹ کی ترمیم کرنے کے بے روک ٹوک اختیار کے ان کے دعویٰ کا حقیقی مطلب کیا ہے۔ حکومت کے وکیلوں نے ایک

دکھاوا کیا اور پندرہ روز میں اپنے جواب دیئے۔ ان کے مطابق اس میں یہ اختیارات بھی شامل تھیں: (1) اس ملک کی خود مختاری کو تباہ کر کے اسے کسی دوسرے ملک کے پیچھے چلنے والا ملک بنانا۔ (2) جمہوری حکومت کو تاناشاہی حکومت میں تبدیل کرنا۔ (3) پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کی مدت کار کو غیر معینہ مدت کے لئے بڑھانا اور (4) ترمیم کے اختیارات کو اس طرح جامع بنانا کہ آئین کو قانونی طور پر یا کسی طور طریقہ سے غیر ترمیم شدہ بنانا۔

عدالت عظمیٰ نے اس دلیل کو قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ ایسا محسوس کیا گیا کہ یہ حکومت کو آئین کے ختم کرنے کی طاقت دینے جیسا ہے، اگر ممبران پارلیمنٹ میں اس کے پاس ضروری اکثریت ہو۔ اس وقت کے جسٹس ہیگڑے اور مکھرجی نے کیس کے دوران کہا، ایک سطح پر یونین اور ریاستوں کے فریق دفاع نے بے دلی سے مان لیا تھا کہ دفعہ 368 کے تحت موصول اختیارات کا استعمال آئین کو رد کرنے کے لئے نہیں کیا جا سکتا، لیکن بعد میں ہم میں سے کئی لوگوں کے ذریعہ سوال کئے جانے پر انھوں نے اپنا موقف بدل لیا اور کہا کہ رد کرنے سے ان کا مطلب تھا آئین کو ختم کرنا۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ ان کا دفعہ 368 میں موجود اختیارات سے کیا مطلب نکالا جائے، جس کا استعمال آئین کو رد کرنے میں نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے جواب میں انھوں نے کہا کہ آئین میں ترمیم کرتے ہوئے کم از کم ایک دفعہ کو بنائے رکھا جائے گا۔ دیگر تمام دفعات یا آئین کا حصہ، جس میں تجاویز بھی شامل ہیں، ہٹایا جا سکتا ہے۔ مختصراً ان کا مطالبہ تھا کہ جب تک 'آئین ہند' اس آزادی رائے کو بنائے رکھا جائے تو اس کے تمام دفعات یا حصہ کو تبدیل کیا جا سکتا ہے۔

سوال کے اس پہلو پر جسٹس ایچ آر کھنہ، جن کا اس معاملہ پر دیا گیا فیصلہ فیصلہ کن تھا، نے نہایت مختصر مثال پیش کی۔ دفعہ 368 (ترمیمات کے عمل سے متعلق دفعہ) کو آئین کی موت لانے کا اختیار نہیں دیا جا سکتا یا اسے آئین کی قانونی 'ردوبدل' کرنے کی اجازت فراہم نہیں کی جا سکتی۔

حکومت اس فیصلہ سے نہ صرف بے حد ناامید ہوئی بلکہ فوراً ناراض ہوگئی۔ حکومت کی اس ناراضگی کو اکتوبر 1975 میں سرکاری طور پر پیش کیا گیا، جب حکومت کے ذریعہ منتخب ہندوستان کے چیف جسٹس اے این رے نے اعلان کیا کہ ہندوستان کے ماہر قانون کے ذریعہ کی گئی اپیل کے نفاذ میں انھوں نے فیصلہ کیا ہے کہ کیشوانند بھارتی فیصلہ کے جائزہ کے لئے ایک ڈویژن بنچ کی تشکیل کی جائے۔ اس اعلان سے تمام لوگ حیران تھے۔ بار کے ارکان کے لئے یہ نہایت عجیب وغریب فیصلہ تھا کہ ایک جائزہ کمیٹی کی تشکیل صرف اس لئے کی گئی، کیونکہ حکومت ایسا چاہتی ہے، لیکن اگر بنچ کی تشکیل تعجب خیز تھی تو اس کے بننے کے دو دن بعد ہی اس کو یکا یک بند کر دینا اور بھی تعجب خیز تھا۔

آئین کے بنیادی ڈھانچہ کے تحفظ کے لئے ماہرین قانون کی جدوجہد ہندوستان کی تاریخ میں ایک قابل فخر باب ہے۔ اپنے 44ویں آئینی ترمیم بل کی طرز پر ہی حکومت نے ایمرجنسی نافذ کرنے کے کچھ ہی ماہ بعد سپریم کورٹ سے اپیل کی کہ اسے کیشوانند بھارتی معاملہ میں 1973 کے اپنے فیصلہ کو رد کر دینا چاہئے۔

اس جدوجہد کے ہیرو بمبئی کے مشہور وکیل نانی پالکی والا تھے۔ ایمرجنسی سے قبل وہ اندرا گاندھی کے خلاف الٰہ آباد ہائی کورٹ کے فیصلہ کو خارج کرنے کے لئے سپریم کورٹ میں دائر از سرنو جائزہ عرضی میں اندرا گاندھی کے وکیل کے طور پر بحث کرنے کے لئے رضامند ہو گئے تھے، لیکن ایک مرتبہ ایمرجنسی نافذ کیے جانے کے بعد انھوں نے کیس واپس کر دیا اور تاناشاہی کے سخت نکتہ چیں بن گئے۔ ان کے قانونی جوہر اور جمہوریت کے تئیں عزم پیہم کا اظہار تب ہوا جب 1975 میں حکومت کے چہیتے چیف جسٹس اے این رے نے جلد بازی میں تیرہ ججوں کی ڈویژنل بنچ تشکیل

دی۔خودان کی قیادت میں تشکیل کردہ اس بنچ کا کام تھا کہ کس حد تک اس بل نے ترمیم کے بنیادی ڈھانچہ کی خلاف ورزی کی۔

نانی پالکی والا نے حکومت کے ذریعہ کیشوانند بھارتی فیصلہ پر از سرِ نو غور کرنے کے لئے دائرعرضی کے خلاف زوردار بحث کی۔ان کے دلائل اتنے مستحکم اور پراثر تھے کہ ڈویژنل بنچ کے کچھ ججوں نے انہیں پہلے دن ہی منظور کر لئے، دیگر ججوں نے اسے دوسرے دن مانا۔دوسرے دن کے اختتام تک چیف جسٹس ڈویژنل بنچ میں تن تنہا ہو گئے۔اگلے دن چیف جسٹس نے ڈویژنل بنچ کو ختم کر دیا۔اس طرح ہمارے آئین کے بنیادی ڈھانچہ کو بدلنے کی شرمناک کوشش کا خاتمہ ہوا۔

جسٹس ایچ آر کھنہ کی جمہوریت کے تحفظ میں جرأت مندانہ کردار کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں۔انھوں نے اس معاملہ میں نانی پالکی والا کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ سماعت کے دوران نانی پالکی والا نے علمیت کی جس بلندی کو سر کیا، وہ انوکھا تھا اور سپریم کورٹ کی تاریخ میں کوئی ان کی برابری نہیں کر سکا۔

میں نے اپنے مضمون میں دستور ہند کے اہم مصور ڈاکٹر باباصاحب امبیڈکر کو یاد کیا ہے جنہوں نے دفعہ 32 کے معاملہ میں کیا کہا ہے، جس میں عدالت کے رٹ پٹیشن سے متعلق التزام ہے۔9 دسمبر 1948 کو آئینی اجلاس میں بولتے ہوئے انھوں نے دفعہ 32 کی ستائش ان الفاظ میں کی 'اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ آئین کے سب سے زیادہ اہم دفعہ کا نام بتائیں، جس کے بغیر یہ آئین صفر ہوتا، تو میں کسی بھی دیگر دفعہ کے بجائے اس کا ذکر کرتا۔ یہ دستور ہند کا دل اور روح ہے، جسے کانگریس حکومت نے تباہ کرنے کی کوشش کی۔

میں نے بنگلور میں جیل سے متعدد خطوط لکھے، جو میرے وکیل اپا گھٹاٹے اور نئی دہلی میں اٹل جی کے لئے تھے۔ان کو لکھے گئے خط اور ان کے ذریعہ بھیجے جانے والے خط مسلسل کھولے جاتے اور اکثر من مانے طریقہ سے جیل افسروں کے ذریعہ سنسر کر دیئے جاتے تھے۔

جیل میں چونکہ خود گفتاری کا تنہا وسیلہ مضمون نگاری ہی تھا، میں اپنے زیرِ مطالعہ جرنلوں اور اخبارات پر بھی تبصرہ کرتا تھا۔اپا کو اسی خط میں میں نے لکھا کہ آج کل اخبارات غیر دلچسپ اور بےکار ہو گئے ہیں۔ان میں بے وجہ کے مواد ہوتے ہیں۔درمیان میں ابو ابراہیم کا کارٹون ایک نخلستان میں کھڑا محسوس ہوتا ہے۔برائے مہربانی انہیں فون کر کے میری جانب سے ستائشی مبارک باد پیش کر دیں۔انھیں مطلع کریں کہ یہاں ہم سب ان کی ہر تخلیق سے لطف اندوز ہوتے ہیں، خواہ وہ 'بیئرفٹ ہیومر' ہو یا 'باتھ ٹب ہیومر'★ کل کے ہی سنڈے اسٹینڈ میں ایک طوطے کی لن ترانی تھی، یہ لطف اندوز تھا۔

میں نے یہ بھی لکھا 'میں نے ابھی ڈومنیک لیپرَ اور لیری کالنس کے ذریعہ تحریر کردہ مشہور کتاب 'فریڈم ایٹ مڈنائٹ' ختم کی ہے۔صرف مطالعہ کی غرض سے یہ اچھی ہے۔ایک بہترین تصور ہے، اس پر ترس اس لئے آتا ہے کہ یہ تصوراتی ہے اور پھر بھی تاریخی ہونے کا دعویٰ کرتی ہے۔

جیل کے دوران میرے خوش کن لمحے وہ ہوتے تھے جب مجھے یا تو کملا یا میرے بچے کے ذریعہ لکھے گئے خط موصول ہوتے تھے اور مجھ سے ملنے بنگلور آتے تھے۔ مجھے پتہ چلا کہ لیڈی ٹیچر اکثر پرتبھا اور جینت سے پوچھتی — 'پاپا واپس آئے؟' میرے بچوں کو یہ کہتے ہوئے بہت

★ 'باتھ ٹب ہیومر' ابو ابراہیم کے اس کارٹون کو کہا گیا، جو کہ فخرالدین علی احمد کے ذریعہ اندرا گاندھی کے صدر راج نافذ کئے جانے کی تجویز پر منظوری دینے کا سب سے زیادہ پریشان کن فرد جرم تھا۔ یہ ظاہر کرتا ہے کہ احمد نے ایمرجنسی کے اعلان نامہ پر راشٹرپتی بھون کے باتھ ٹب سے دستخط کئے تھے۔اس کی تفصیل اس کتاب میں پیش کی گئی ہے۔

تکلیف ہوتی تھی — 'نہیں ابھی نہیں' مجھے اپنی جیل کی زندگی کا کوئی بھی پچھتاوا نہیں ہوا، چونکہ یہ جمہوریت کے تحفظ کی بقا کے لئے لازمی قیمت تھی، پھر بھی، کوئی بھی ایسی بات جو میرے بچوں کو تکلیف دے، مجھے پشیمان کر دیتی تھی۔

ایک اجنبی سے میرا ڈرامائی سامنا

ایمر جنسی کے خلاف جدو جہد کا کوئی بھی ذکر تب تک مکمل نہیں ہوسکتا جب تک کہ کئی دیگر لوگوں، خاص کر جارج فرنانڈیز کے ذریعہ چلائی گئی مشہور انڈر گراؤنڈ تحریک کا ذکر نہ کیا جائے۔ حکومت نے ان کے اور دیگر لوگوں پر (مشہور صنعت کار ویریَن شاہ، جو بعد میں بی جے پی کے نائب صدر اور بنگال کے گورنر بنے) سرکاری تنظیموں اور ریلوے کو اڑانے کے لئے ڈائنامائٹ کی اسمگلنگ کا الزام لگایا۔ بعد میں اسے 'بڑودہ ڈائنامائٹ کیس' کے نام سے جانا گیا۔ اس معاملہ نے جارج فرنانڈیز کی، جنہیں جون 1976 میں گرفتار کیا گیا تھا، ایمر جنسی کے خلاف تحریک کا ہیرو بنایا۔ اصل میں انھوں نے جیل میں بغیر مقدمہ کے قید رہتے ہوئے بہار سے 1977 میں لوک سبھا کا الیکشن لڑا اور بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئے۔ ان کے حامیوں نے ان کی تشہیر ان کے اس فوٹو سے کی، جس میں ان کے ہاتھوں میں ہتھکڑی لگی ہوئی تھی۔ جنتا پارٹی حکومت، جس میں وہ وزیر صنعت بنے، نے ان کے اور دیگر تمام لوگوں کے خلاف کیس واپس لے لیا۔

ایمر جنسی کے دوران کئی سیاسی قیدی جسمانی صعوبتوں کے بھی شکار ہوئے۔ جارج فرنانڈیز کے بھائی لارنس فرنانڈیز کا معاملہ دلخراش ہے، اس سے بھی زیادہ دردناک واقعہ اسنیہ لتا ریڈی کا ہے۔ اسنیہ لتا ایوارڈ یافتہ کنڑ فلم 'سنسکار' کی کلیدی کردار تھیں۔ اسنیہ لتا سوشلسٹ پارٹی کے لیڈر جارج فرنانڈیز کی ساتھی تھیں۔ فرنانڈیز ایمر جنسی کے دوران انڈر گراؤنڈ ہو گئے تھے۔ جارج فرنانڈیز کے بارے میں اطلاع نہ دینے کی وجہ سے اسنیہ لتا کو گرفتار کر لیا گیا اور ان سے ہماری جیل میں آٹھ ماہ تک پوچھ گچھ کی گئی، جہاں وہ شدید طور پر بیمار پڑ گئیں۔ جنوری 1977 میں جیل سے رہا ہونے کے پانچ دنوں کے بعد ہی ان کا انتقال ہو گیا۔

اس طرح کے زدوکوب میں کوئی کمی نہیں تھی، پھر بھی خبریں میڈیا سے دور رہیں۔ لوگوں کو مہینوں گزر جانے کے بعد اس کی اطلاع ملتی تھی اور اس طرح کی جانکاری سے حکومت کے تئیں ناامیدی، غصہ اور منفی خیالات اجاگر ہوتے تھے۔

صعوبتوں سے استحصال کی سب سے خراب شکل اجاگر ہوتی ہے، لیکن کئی مرتبہ زدوکوب کا معاملہ استحصال کرنے والوں کو سامنے بھی لے آتا ہے۔ جیل میں ایک اجنبی کے ساتھ ڈرامائی سامنا ہونے سے میں نے یہ محسوس کیا۔ ایمر جنسی نافذ ہوئے ایک برس گزر چکا تھا اور ایسا نہیں لگ رہا تھا کہ اس کا اختتام ہونے والا ہے۔ ہم لوگ جیل میں رہتے ہوئے باہری دنیا کی خبر سے آشنا تھے۔ ہمیں معلوم ہوا کہ عوام کے درمیان سیاسی نقطہ نظر سے بیدار ایک طبقہ میں بے چینی اور غصہ برابر بڑھتا جا رہا ہے۔ انھیں حالات میں جون 1976 میں ایک دن ایک بزرگ جیل میں آئے اور انھوں نے جیل افسروں سے کہا کہ وہ بھارتیہ جن سنگھ کے صدر سے ملنا چاہتے ہیں۔

میں ان سے ملاقات کے لئے گیا۔ وہ دراز قد اور جسمانی طور پر کمزور شخص تھے، ان کے چہرے پر مونچھیں تھیں۔ ان کے چہرہ سے سنجیدگی جھلک رہی تھی، لیکن میں جلد ہی سمجھ گیا کہ ان کی سنجیدہ شخصیت کے اندر غصہ سے بھرا ایک لاوا دہک رہا ہے۔

باہمی سلام وکلام کے بعد وہ عرض مدعا پر آ گئے۔ انھوں نے کہا 'میں پینسٹھ سال کا ہوں۔ وہ جو کر رہی ہے اسے میں برداشت نہیں کر سکتا۔ میں نے زندگی میں جو کچھ حاصل کرنا چاہا، اسے حاصل کیا۔ میرے پاس اب اور جینے کے لئے کچھ بھی نہیں ہے۔ مجھے بتائیے کہ میں کیا کروں؟

پرامن طریقہ سے کام نہیں چلے گا۔ میں مرنے کے لئے تیار ہوں۔ پارلیمنٹ کا آئندہ اجلاس شروع ہونے سے پہلے میں جا سکتا ہوں...میرے پاس لائسنس شدہ ایک ریوالور ہے، لیکن میں دہلی سے ناآشنا ہوں، مجھے نہیں معلوم کہ وہ کہاں ملے گی؟'

مجھ سے بات چیت کرنے والے وہ شخص تعلیم یافتہ، سمجھدار اور بزرگ تھے۔ جس روانی سے وہ اپنی بات رکھ رہے تھے، وہ ہلا کر رکھ دینے والا تھا۔ وہ کوئی پاگل یا سرپھرے آدمی نہیں تھے، لیکن وہ ایماندارانہ طور پر اس نتیجہ پر پہنچ چکے تھے کہ وہ جو صلاح دے رہے ہیں، جمہوریت کے دفاع کا محض ایک واحد راستہ ہے۔ میں نے دیکھا کہ ان کی بیوی دور کھڑی تھی اور متفکر ہو کر ہم دونوں کو دیکھ رہی تھی۔

میں نے جلد ہی ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا 'نہیں آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہئے۔ یہ منفی سوچ ہے اور آپ کے دل میں جو کرنے کا خیال ہے وہ اس مقصد کو ایسا نقصان پہنچائے گا، جس کی بھرپائی ناممکن ہوگی۔ ایسے منصوبہ سے خواہ جو کچھ حاصل ہو، لیکن یقینی طور پر وہ جمہوریت نہیں ہوگی۔

انھوں نے کہا کہ جیل کے اندر کے لوگوں کو باہر کے لوگوں میں ایمرجنسی کے خلاف پیدا ہو رہے غصے کا صحیح علم نہیں ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ یہ افواہ گرم ہے کہ جیل میں بند سیاسی پارٹی کے لیڈران کمزور ہو گئے ہیں۔ ان کے پاس اندرا گاندھی کی تاناشاہی کے خلاف تحریک چھیڑنے کے لئے کوئی واضح منصوبہ نہیں ہے۔

میں نے ان سے کہا کہ کسی بھی تاناشاہی کا خاتمہ تشدد سے نہیں ہوا ہے۔ جس سسٹم کے خلاف تشدد کا سہارا لیا جاتا ہے، اس سے بھی خراب ہوتے ہیں جھٹ پٹ تشدد کے نتائج۔ عام لوگوں کے پاس جمہوری توسط سے تحریک کرنے اور جمہوریت کو قائم رکھنے کے لئے انتظار کرنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں ہے۔

کچھ دیر بعد ان کی بیوی آئی اور مجھ سے بولیں 'میں راحت محسوس کر رہی ہوں کہ آپ کے پاس جو معقول مشورہ تھا، آپ نے انھیں دیا۔'

میں نہیں جانتا کہ اس بزرگ نے میرے جواب کے بارے میں کیا سوچا، میں نے دوبارہ انھیں نہ کبھی دیکھا اور نہ ہی کبھی سنا۔

اس دن میں نے اپنی ڈائری میں لکھا— آج کا واقعہ آشیش نندی کے اس مضمون سے مسابقت رکھتا ہے، جسے انھوں نے 'کیوئسٹ' (نومبر-دسمبر 1975) کے لئے لکھا تھا۔ مجھے تعجب ہے کہ سنسر نے اس مضمون کو کیسے نہیں دیکھا۔ یقیناً نہیں دیکھا۔ اگر وہ اسے دیکھ لیتے تو میگزین پر پابندی لازمی تھی اور پبلشر اور رائٹر کو جیل میں ڈال دیا جاتا۔ وہ مضمون تو یقیناً ڈائنامائٹ کی طرح ہے۔ یہ اندرا گاندھی کو کئی لہجہ میں وارننگ دیتا ہے کہ آپ جو کر رہی ہیں اگر اسے جاری رکھیں گی تو آپ کا قتل کر دیا جائے گا۔ 'کیوئسٹ' کا یہ شمارہ ان کتابوں اور میگزینوں میں سے ایک تھا، جنھیں جیل کے باہر کے ہمارے دوست ہمیں پڑھنے کے لئے بھیجا کرتے تھے۔ اس مضمون کے کچھ حصہ کو یہاں درج کرنا بہتر ہوگا۔ براہ راست عنوان تھا 'انوٹیشن ٹو اے بی ہیڈنگ: اے سائیکلو جسٹ گائڈ ٹو اسیسی نیشن ان دی تھرڈ ورلڈ'۔

ایک قاتل کا اپنے شکار سے بڑا گہرا اور مضبوط رشتہ ہوتا ہے۔ یہ درست ہے کہ استحصالی تاناشاہ ہوتے ہیں، جو ملک کے تمام لوگوں کو اپنا ممکنہ قاتل بنا لیتے ہیں اور اس کے برخلاف کچھ لیڈر لوگوں کے دماغوں میں اپنے برتاؤ سے کچھ ایسا اثر ڈالتے ہیں کہ ان کے ممکنہ قاتلوں کی تعداد صفر ہو جاتی ہے اور ان کے ایسے ممکنہ قاتل نفسیاتی مریضوں اور بھاڑے کے لوگوں میں ہی ہوتے ہیں۔

'سمراٹ نیرو پہلے درجہ میں تھا اور مارٹن لوتھر کنگ دوسرے درجہ میں' ایسے حکمرانوں کے مخصوص معاملے بھی ہیں جو کافی تعداد میں ملک میں استحصال کا شکار ہوئے ہیں۔ انھیں اپنے اپنے ملک کے باہر مارے جانے کے 'موقع' ملتے ہیں۔ ان کا مرض ایک کے قتل کے بجائے اجتماعی

خودکشی کی طرف بڑھتا ہے۔اوڈولف ہٹلراس طرح کے لوگوں کی عام لیکن واضح مثال ہے۔

لیکن ایسے لیڈر حکمراں ہی خاص ہوتے ہیں۔اصل میں لامحدود حالت میں جہاں لیڈر مقبول ہیں لیکن اپنے داخلی جبروستم کے کردار سے اپنے قتل کی بنیاد رکھتے ہیں۔ایسے معاملوں میں فرد اپنے درد کی رفتار سے اپنی نفسیات کے مطابق ریاست کو جس ڈھنگ سے ڈھالنا چاہتا ہے، اس کا ممکنہ قاتل کی تعمیر سے براہ راست تعلق ہوتا ہے۔

ایسے حکمراں کی پہلی خصوصیت یہ ہوتی ہے، پوری طرح کسی پر اعتبار کرنے کی نااہلی، خواہ باہری دنیا میں اس کا جارح طرز ادا لوگوں کو کچھ وقت تک غلط فہمی میں محصور رکھے، لیکن اپنی داخلی دنیا میں وہ غیر یقینی کرداروں کے مابین گھرا محسوس کرتا ہے۔اب وہ کسی پر اعتماد بھی کرتا ہے تو کچھ وقت کے لئے، اس کے اعتماد میں چڑھنے اور چڑھے رہ کر نظر سے گرجانے والے سپہ سالاروں کا لامتناہی سلسلہ ریل کے ڈبوں کی طرح چلتا رہتا ہے۔

حکمراں صرف اپنے کنبہ کے لوگوں پر غیر اعتمادی کو معطل کرتا ہے۔باہر کی سیاست سے بھرتی کیے گئے سیاسی لیڈر، جن کی اپنی کوئی سیاسی بنیاد نہیں ہوتی، پوری طرح ان پر منحصر کرتے ہیں۔

اس طرح اقتدار حکمراں کے ہاتھ میں مرکوز رہتی ہے۔قابل تشویش یہ ہے کہ اسے سب سے زیادہ طاقت والا تصور کیا جاتا ہے، جس کے نتیجہ میں تمام شکایتیں بالترتیب اس کی طرف مرکوز ہو جاتی ہیں۔پھر کچھ عرصہ بعد درمیان میں کوئی نہیں بچتا، جسے وہ برسر اقتدار پارٹی میں سازشی یا انقلابی کہہ کر ہٹا سکے اور خود کو بچا سکے....

رچرڈ نکسن کے ذریعہ چلائی گئی حکومت نے بہت سے ممکنہ سیاسی قاتلوں کو جنم دیا ہوگا، جنھوں نے شوروغل مچا کر نکسن کو نکال دیا۔انھوں نے نکسن کو قاتلوں سے بچالیا۔بنگلہ دیش میں شیخ مجیب کی حکومت بھی اسی طرح کی حکومت کی مثال ہے۔

صرف یہ نہیں ہوتا کہ حکمرانی اور ریاست متحد ہو جاتے ہیں بلکہ ایسا بھی ہے کہ ریاست کے اندر بہت سے خواہش مند لوگوں کی مقابلہ آرائی کے راستے بند ہو جاتے ہیں۔

پھر بھی کوئی حکمراں نفسیاتی طور پر اپنے کو بچا نہیں سکتا۔ایسا صرف اصولی طور پر سوچنے یا آدرش طریقہ سے سوچنے پر ہی ممکن ہو سکتا ہے۔ انتہائی سختی سے بھری داخلی حکمرانی بھی اس شخص کے لئے کھلی ہے جس کے اصول سیاسی مقابلہ کے لئے انقلابی، ملک سے بغاوت یا قتل کرنے کی اجازت دیتے ہیں۔

ان میں سے انقلاب کے لئے زبردست منصوبہ، مستحکم تنظیم، اول درجہ کی چالاکی اور آبادی کے ایک بڑے حصہ کی نبض سمجھنے کی ذہنیت کا ہونا ضروری ہے۔بغاوت اور تختہ پلٹنے کے لئے بھی کم وبیش مقدار میں انقلاب جیسی تیاری کی ہی ضرورت ہوتی ہے۔

دوسری جانب قتل ان چاروں راستوں میں سب سے آسان اور سستا ہے۔اس میں کم از کم منصوبہ اور تنظیم کی ضرورت ہوتی ہے اور عوام کے کسی بھی طبقہ کی رضامندی اس کے لئے ضروری نہیں ہوتی۔تیسری دنیا میں اس وسیلہ کو مفید اور بہتر مانا جانا سمجھ میں آتا ہے۔سچ تو یہ ہے کہ ایسے حکمراں کا قتل کرنا، کچھ ممالک میں سیاسی جانشینی کے فیصلہ کا پیمانہ بن گیا ہے۔لاطینی امریکی ممالک میں ایسے قتل کی مقبولیت سانڈ کی لڑائی سے کچھ کم ہی ہے۔

قتل کے شکار ایسے حکمرانوں کا المیہ یہ ہے کہ وہ اس بدقسمتی کی جانب قدم رنجا ہونے سے اپنے کو بچا سکتے ہیں، لیکن ہوتا یہ ہے کہ وہ اس

جانب ڈھکیل دیئے جاتے ہیں۔ اپنے قاتل کی طرح وہ بھی اپنے ہی خود کے ایک حصہ سے بغاوت کرتے ہیں۔ عقل مندی کے ساتھ خود کا تحفظ چاہتے ہیں اور عوام کی حقیقی دنیا سے وابستہ ہونا چاہتے ہیں۔

اندرا گاندھی: خود کے عدم تحفظ کی شکار

اس واقعہ کا ذکر اوماوا سودیو کی کتاب 'ٹو فیسز آف اندرا گاندھی' میں بھی ہے۔ ایمرجنسی کی کالی کرتوتوں کا مکمل، جامع اور اکثر خوف پیدا کرنے والا حساب کتاب پیش کرتی ہے۔ صحافی اوماوا سودیو ایمرجنسی ہٹنے کے فوراً بعد میرا انٹرویو لینے آئیں۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا 'کیا اس وقت اندرا گاندھی کے خلاف انتہائی غصہ تھا؟ کیا آپ سوچتے ہیں کہ اس وقت بظاہر ان کا قتل ہو گیا ہوتا یا بعد میں اقتدار میں پھر سے لوٹنے میں کامیاب ہو جاتیں؟'

میں نے جواب دیا 'جس حد تک وہ گئی تھیں، اگر یہ کوئی دوسرا ملک ہوتا تو یقیناً ایسا ہو جاتا، لیکن ہندوستان میں ایسی بات نہیں ہوتی۔ یہاں کے لوگوں کا مزاج ایسا نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ہی جن سیاسی پارٹیوں کے لیڈروں نے ان کی مخالفت کی، وہ مثبت طریقہ سے اس طرح کے رویہ کے بھی مخالف ہیں۔ وہ پرتشدد رویوں کی مذمت کرتے ہیں۔ امن کے تئیں ہم پابند عہد ہیں۔'

ایمرجنسی کے اعلان سے قبل اندرا گاندھی کے ذریعہ وقت بے وقت ایسے اشارے دیئے جانے کہ ان کی زندگی کو خطرہ ہے، سے یقینی طور پر اپوزیشن پارٹیوں کے لوگ ناراض تھے۔ ایک مرتبہ انھوں نے بھارتیہ جن سنگھ پر براہ راست الزام لگایا 'جن سنگھ میرے قتل کا منصوبہ بنا رہا ہے۔' ہم نے محسوس کیا کہ انھیں جن سنگھ جیسی ذمہ دار سیاسی پارٹی پر اتنا گھٹیا اور بے بنیاد الزام لگانے کے لئے اتنے نچلی سطح تک نہیں آنا چاہئے۔ ہم نے ان سے ملاقات کا فیصلہ لیا۔ ہماری ملاقات کے دوران انھوں نے اپنے الزام کے حق میں نہ تو کوئی ثبوت پیش کیا اور نہ ہی اپنے الزام کو واپس لیا۔ انھوں نے یہ بھی نہیں کہا کہ ان کے بیان کو غلط ڈھنگ سے پیش کیا گیا۔ درحقیقت وہ کچھ نہیں بولیں۔

اس میٹنگ نے مجھے بے چین کر دیا۔ ساتھ ہی اس نے مجھے اندرا گاندھی کا تجزیہ کرنے پر مجبور کیا کہ ان کی ناکام شخصیت کے دو پہلو ہیں —— عدم تحفظ اور غرور، ان کی سیاسی زندگی میں لحہ بہ لحہ یہ خصوصیت کم و بیش اجاگر ہوتی رہتی تھی۔

1969 میں کانگریس پارٹی کی تقسیم کر کے اپنی بالادستی قائم کرنے کے فیصلہ کے پس پشت اہم وجوہات میں سے ایک عدم تحفظ کا احساس بھی تھا۔ عدم تحفظ اور غیر یقینی کا یہ جذبہ کئی مرتبہ وہم کی شکل اختیار کر لیتا تھا۔ جن سنگھ پر ان کے قتل کے الزام کے جواب میں اندرا گاندھی کے ساتھ ہوئی غیر نتائج اور مایوس کن میٹنگ سے میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ وہ اقتدار کی لالچی تھیں، جو خود کو جواب دہ اور ضمیر کے عام پیمانہ سے بھی اوپر مانتی تھیں۔ تاریخ میں تمام ناکام حکمرانوں میں ایسی خصوصیت پائی گئی ہے۔

انھیں نزدیک سے جاننے والے لوگوں سمیت جدید ہندوستانی تاریخ کے کئی ماہرین نے ان کی شخصیت میں موجود بنیادی عدم تحفظ کا ذکر کیا ہے، جو ان کے والد کے انتقال کے بعد ان کے سیاسی نقطہ نظر پر چھا گئی تھی۔ مشہور صحافی اور مصنف خشونت سنگھ، جو ایمرجنسی کے دوران اندرا گاندھی کے زبردست حامی تھے، کو بعد میں کہنا پڑا 'اپنے عدم تحفظ کے جذبہ سے خوف زدہ ہو کر انھوں نے جمہوری نظام کو تباہ کیا۔ انھوں نے پارلیمنٹ کو اپنے حامیوں سے بھر دیا، جن میں قابلیت سے زیادہ چاپلوسی تھی۔ ججوں کے حقوق کی پامالی کی، سول سروس کو تہہ و بالا کیا۔ جانب داری ان کا سب سے بڑا ہتھیار بن گئی تھی۔ وہ کسی کو سہارا دیتی تھیں اور جب سمجھ جاتی تھیں کہ اس کا قد بہت بڑھ گیا ہے تو اسے کسی اعلیٰ عہدہ پر تقرر

کرنے کے بجائے اس کے کسی نزدیکی ساتھی کو اس عہدہ پر براجمان کردیتی تھیں، کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ اس سے دونوں کے درمیان تنازع پیدا ہوگا۔ جیسا کھیل وہ کھیلتی تھیں وہ مستقبل میں ملک کے لئے مفید نہیں تھا۔'

ایمرجنسی کے بعد خشونت سنگھ کے ساتھ میرے اچھے تعلقات بن گئے تھے۔ میں نے ان کے مضامین اور بہت سے موضوعات پر ان کی دانشوری کی ستائش کی۔ انھوں نے ایمرجنسی کے خلاف تحریک میں اور بعد میں 1984 میں دہلی میں سکھوں کے قتل عام میں سکھ فرقہ کی مدد کرنے میں ہماری پارٹی کے کردار کی تعریف کی، حالانکہ ایودھیا تحریک کے بعد ہمارے تعلقات میں استحکام نہیں رہ پایا، انھوں نے میری کافی سرزنش کی۔

'انیمل فارم' اور 'نائنٹین ایٹی فور' کا احیا

40 کی دہائی کے آخری اور 50 کی دہائی کے شروعاتی برسوں میں جنہوں نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز کیا تھا، ان کا سیاسی نظریہ کمیونسٹ یا غیر کمیونسٹ ہوتا تھا۔ سنگھ سے حاصل ہوئے قابل فخر اور حب الوطنی کے سنسکاروں نے میرے اندر اس تنظیم کے تئیں ایک اندیشہ پیدا کردیا، جو اپنے مادر وطن کو نظر انداز کرکے کسی بیرونی قوت کے تئیں اپنے عہد و پیاں کا بے شرمی کے ساتھ مظاہرہ کرتا تھا۔

ان دنوں میں نے جارج اورویل کا مشہور ناول 'انیمل فارم' پڑھا، جو کمیونزم کے خلاف ایک طنزیہ کہانی ہے اور ان ہی کی کتاب 'نائنٹین ایٹی فور' پڑھی جو کہ دنیا کو انسانی اقدار پر سب سے بڑے تاناشاہی اقتدار کے تباہ کن اثرات کے تئیں انتباہ کرتی ہے۔

جب اندرا گاندھی نے ایمرجنسی کا اعلان کیا تب ہندوستان کو اس تباہی کا مختصر لیکن دردناک احساس ہوا۔ 1977 میں ان کو اور ان کی پارٹی کو جس انتخابی شکست کا مزہ چکھنا پڑا، بلاشبہ اس کا ہندوستان کی سیاست اور سیاسی لیڈروں پر خوشگوار اثر ہوا، لیکن اقتدار کے سسٹم میں جو عادتیں راہ پاگئی تھیں، وہ بنی رہیں۔

'نائنٹین ایٹی فور' ایک تاناشاہ حکمرانی سسٹم کے موضوع پر منحصر ہے، جس میں بگ برادر (بڑے آقا) ٹیکنالوجی کی مدد سے ترقی یافتہ ٹیلی اسکرین کے توسط سے اپنی ریاست کی سرگرمیوں پر باریک بینی سے نظر رکھتے ہیں۔ موجودہ دور میں اطلاعات ٹیکنالوجی کے سیکٹر میں ہوئی ترقی نے اورویل کی پیشین گوئی کو غلط ثابت کردیا ہے۔ کمیونسٹ تاناشاہی میکانزم کے خاتمہ کے ساتھ ساتھ پرسنل کمپیوٹر، ای میل، انٹرنیٹ وغیرہ کے سیکٹر میں تعجب خیز ترقی ہونے سے ہی ایسا ممکن ہوا۔

لیکن ہندوستان میں، جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا ہے، ایمرجنسی کا دور حکومت اپنی کچھ مضر باقیات چھوڑ گیا ہے، جسے پوری طرح مٹانے کی ضرورت ہے۔ ان میں سے ایک ہے فون ٹیپ کرنا۔

ایمرجنسی نافذ ہونے کے دس برس کے بعد یعنی 1985 میں ایک دلچسپ شخص سے میری ملاقات ہوئی۔ ایک دن صبح میرے گھر ایک اجنبی آیا، جس کے بریف کیس کاغذات سے بھرے ہوئے تھے۔ اس نے کہا کہ اس بریف کیس میں 'ڈائنامائٹ' ہے جو اس حکومت کو اڑا دے گی۔ اس نے بریف کیس کھول کر تقریباً 200 صفحات دکھائے، جس میں کئی اہم لوگوں کی ٹیلی فون گفتگو تفصیل سے نوٹ کی گئی تھی۔

میں نے ان کاغذات کی جانچ کی، وہ اتنے دھماکہ خیز نہیں تھے جتنا کہ وہ شخص انھیں مان رہا تھا، لیکن وہ یقیناً حیرت زدہ کرنے والا اور بہت ہی دلچسپ تھا۔ میں نے اٹل بہاری واجپئی اور خود کے درمیان ٹیلی فون پر ہوئی بات چیت کو پڑھا۔ اس سے ہمارے اس اندیشہ کو تقویت ملی

کہ 'بڑے آقا' ہم پر نگرانی رکھ رہے ہیں، لیکن اس میں جو چیز حیرت زدہ کرنے والی تھی، وہ یہ تھی کہ نہ صرف اپوزیشن کے لیڈروں بلکہ مشہور صحافیوں اور کچھ بہت ہی معروف و معزز شخصیتوں کا بھی فون ٹیپ کیا گیا تھا۔

25 رجون 1985 کو ایمرجنسی کی دسویں سال گرہ تھی۔ پریس سے ملاقات کرتے ہوئے اٹل جی نے کہا 'میں بہت دنوں سے جانتا ہوں کہ میرے اور پارٹی میں میرے ساتھی آڈوانی جی کے فون کی نگرانی رکھی جا رہی ہے، لیکن بعد میں مجھے پتہ چلا کہ چودھری چرن سنگھ، جگ جیون رام اور چندر شیکھر جیسے سینئر لیڈروں اور جی کے ریڈی، ارون شوری، کلدیپ نیر اور جی ایس چاؤلہ جیسے صحافیوں کے فون مسلسل ٹیپ کیے جاتے ہیں، لیکن مجھے جس بات نے حیرت میں ڈال دیا، وہ یہ کہ انٹلیجنس بیورو صدر جمہوریہ اور چیف جسٹس کے فون کو ٹیپ کرنے کی جرأت بھی کر رہا تھا۔ یہ کام سیاسی نظریہ سے غیر اخلاقی ہی نہیں بلکہ غیر آئینی اور غیر قانونی بھی ہے۔

دنیا کے کئی جمہوری ممالک میں فون ٹیپ کرنے کا جواز اور اس کی حد بحث کا موضوع رہے ہیں۔ امریکہ میں واٹر گیٹ معاملہ، ایسا ہی قابل اعتراض موضوع تھا۔ مشتعل عوامی رائے اور فرد جرم کے خوف سے صدر رچرڈ نکسن کو استعفیٰ دینا پڑا تھا۔ ان کے جانشین جیرالڈ فورڈ نے انھیں پوری طرح معافی دے دی، لیکن تین برس کے بعد ٹیلی ویژن پر ڈیوڈ فراسٹ کو دیئے گئے ایک انٹرویو (19 رمئی 1977) میں نکسن نے ایک سنسنی خیز بیان دیا۔ انھوں نے کہا 'چوری یا دیگر جرائم غیر قانونی نہیں ہیں، اگر ان کی ہدایت صدر دیتے ہیں۔'

1977 میں صدر جمی کارٹر نے امریکی کانگریس سے ایک منصوبہ پر منظوری کی پیشکش کی، جو کسی کو عدالتی اختیارات کے بغیر عوام کی ذاتی زندگی میں دخل اندازی کرنا ناممکن کر دے۔ کارٹر نے کہا کہ اس سے قومی سلامتی اور شہریوں کے راز و نیاز کے بنیادی حقوق کے درمیان چل رہے 'مسلسل تنازع' کا حل نکلے گا، لہٰذا بل نافذ کر دیا گیا، جس کے تحت ایف بی آئی (فیڈرل بیورو آف انوسٹی گیشن) سمیت سبھی سیکورٹی ایجنسیوں کو کسی بھی طرح کے فون ٹیپ کرنے سے قبل عدالت کی اجازت حاصل کرنا ضروری ہو گیا۔

برطانیہ میں ٹیلی فون ٹیپ کرنے پر کنٹرول کے لئے کوئی قانون نہیں ہے، لیکن کئی پارلیمانی کمیٹیوں نے اس سوال پر سنجیدگی کے ساتھ غور کیا ہے۔ 1957 میں پریوی کونسل کے نارمن برکیٹ کی قیادت والی سہ رکنی کمیٹی کی تشکیل بات چیت ٹیپ کرنے کی تفتیش کے لئے کی گئی۔

برکیٹ کمیٹی نے فون ٹیپنگ اور اس طرح کے ذاتی مواصلات کے ٹیپ کو انتہائی قابل اعتراض بتایا، لیکن محسوس کیا کہ معقول سیکورٹی کے ساتھ واضح طور سے بنائے گئے فارمولہ کے تحت کچھ حد تک اس کی اجازت دی جا سکتی ہے۔ اس نے واضح کیا کہ جرم کی جانچ کرنے اور سازشی یا جاسوسی سرگرمیوں کی جانچ کرنے کے لئے ہی پولس اور سلامتی ایجنسیوں کو اس کام کی اجازت دی جائے۔ اس سیکٹر میں بھی کمیٹی نے سخت رہنما ہدایات طے کیے۔ آج تک برطانیہ میں کسی نے بھی اپنی حکومت پر ان اختیارات کا غلط استعمال کرنے کے لئے نکتہ چینی نہیں کی ہے۔

اس سلسلہ میں لازمی یہ ہے کہ اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں کی جانچ کے لئے برکیٹ کمیٹی کی طرز پر ایک پارلیمانی کمیٹی کی تشکیل دی جائے۔ ماضی بن چکے انڈین ٹیلی فون ایکٹ 1885 کو ختم کر دیا جائے اور اس کی جگہ پر نئے قانون بنائے جائیں، جو اس مذمتی کام کو صرف جرم، سازش اور جاسوسی جیسے کاموں میں ہی فون ٹیپ کرنے کے اختیار کو منظوری دے، لیکن اس میں آئینی تحفظ کا التزام ہو، جو حکومت کو سیاسی کارکنان اور صحافیوں کے خلاف حکومت کے اختیارات کے ناجائز استعمال کو ناممکن بنا دے۔

ایمرجنسی پر شاہ کمیشن کی مذمت

ایمرجنسی سے متعلق اس باب کے خاتمہ سے قبل یہاں یہ ذکر کرنا ضروری ہے کہ حکومت کے ذریعہ تشکیل کردہ تفتیشی کمیشن نے ہندوستانی تاریخ کے اس سیاہ دور کے بارے میں کیا کہا۔ 1977 میں حکومت ہند نے جسٹس جے سی شاہ کی قیادت میں ایک پارلیمانی کمیشن کی تشکیل کی۔ جسٹس شاہ سپریم کورٹ کے ریٹائرڈ جج تھے۔ اسے ایمرجنسی کے دوران ہوئے استحصال کی تفتیش کرنے کے لئے تشکیل دیا گیا تھا۔ ایمرجنسی کو 'صدر کے ساتھ دھوکہ، کابینہ کے ساتھ دھوکہ اور عوام کے ساتھ دھوکہ' بتاتے ہوئے شاہ کمیشن نے اپنی رپورٹ کے آخر میں ذکر کیا—

''سرکاری اعداد و شمار اور کئی ذمہ دار سرکاری ملازمین سے موصول شواہد کی بنیاد پر کہا جاسکتا ہے کہ ایمرجنسی کے دوران بے ایمانی اور افواہ پر مبنی تشہیر حکومت کا طرز عمل بن گیا تھا، جیسا کہ رابرٹ فراسٹ نے کہا: ہم زندگی میں جو بیشتر تبدیلیاں چاہتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ سچ یا تو ہمارے حق میں ہے یا ہمارے موافق ہے۔ اگر انتظامی میکانزم کو ہمارے ملک میں اپنے بچوں کے لئے محفوظ رکھنا ہے تو خدمات کو ایماندار اور اہل انتظامیہ پر مبنی اصولوں کے لئے کھڑے ہوکر خود کو بہتر بنانا ہوگا۔ اس سے ہماری خدمات کے تئیں جو عوام کا بھروسہ ختم ہوگیا ہے اسے دوبارہ قائم کیا جاسکتا ہے۔ اگر ہمیں آئندہ نسلوں کو کوئی جمہوری وراثت دینی ہے تو ہمیں اپنے مقننہ میں اپنے ملک کے سماجی، سیاسی اور اقتصادی سسٹم میں سچ کا دوبارہ عمل دخل کرنا ہوگا۔ یہ کوئی ناممکن یا سنگین کام نہیں ہے۔ یہ ایک آسان انسانی پیغام ہے۔''

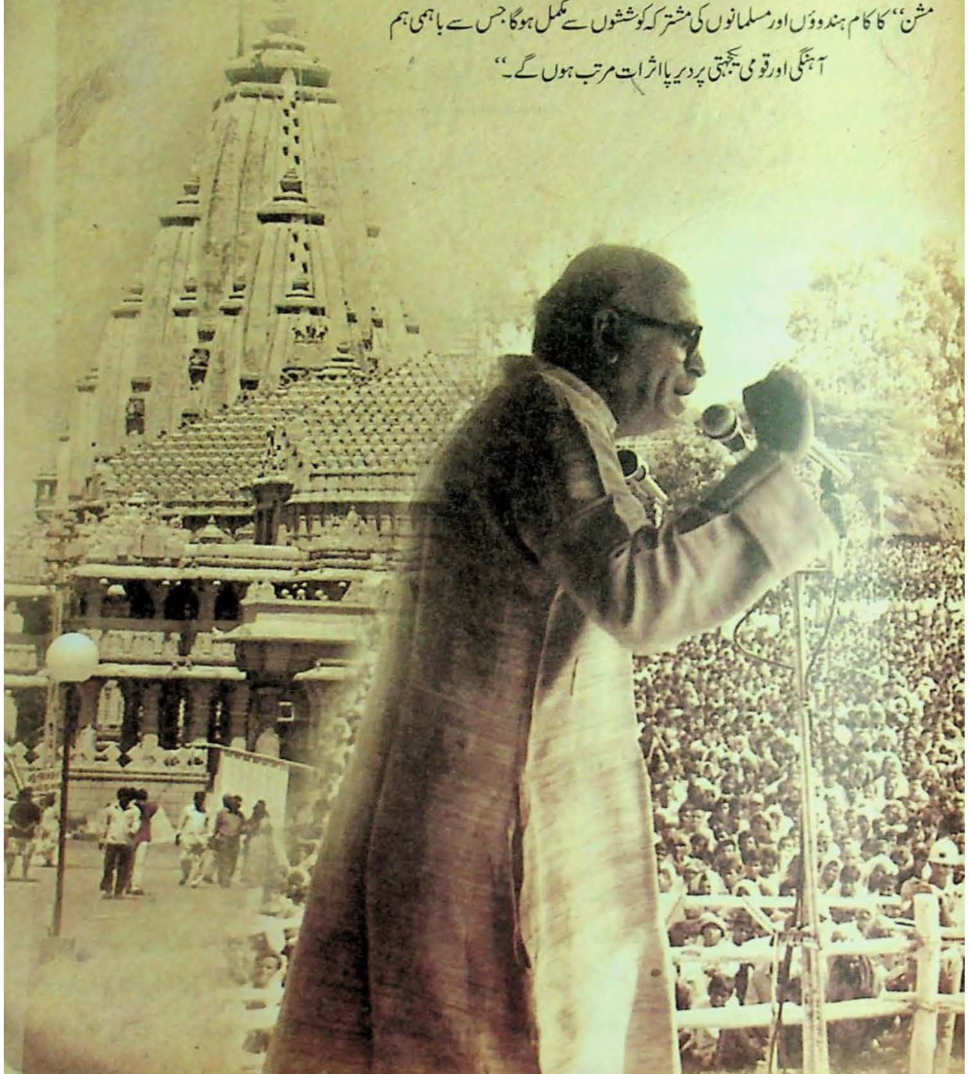
اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ 1980 میں اندرا گاندھی کے اقتدار پر قابض ہونے کے بعد شاہ کمیشن کی رپورٹ کو قصداً ممنوع کردیا گیا۔



بی جے پی کا کرشمائی طلوع

1977-97

''آزاد ہندوستان کی سب سے بڑی عوامی تحریک ''اجودھیا تحریک'' میرے سیاسی سفر کا سب سے فیصلہ کن اور انقلابی واقعہ تھا، بدقسمتی سے رام مندر کی تعمیر کا مسئلہ جسے پُر امن طریقے سے سلجھایا جاسکتا تھا وہ ہندو بنام مسلم تنازعہ بن گیا۔ مجھے پورا یقین ہے کہ ''اجودھیا مشن'' کا کام ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ کوششوں سے مکمل ہوگا جس سے باہمی ہم آہنگی اور قومی یکجہتی پر دیرپا اثرات مرتب ہوں گے۔''



چوتھا باب

1

ہندوستانی تاریخ کے سب سے تاریک دور کا خاتمہ

''ایک تاناشاہ کو ہر وقت ہر شخص کو بے وقوف بنانا پڑتا ہے اور ایسا کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ وہ خود کو بھی بے وقوف بنائے۔''

— ولیم سمرسیٹ مام، انگریزی ناول نگار اور ڈراما نویس

1976 کے غروب ہوتے ہوتے اس بات کے اشارے ملنے لگے تھے کہ ایمرجنسی کا سورج بھی غروب ہوگا۔ اندرا گاندھی کی غیر مقبولیت میں ملک اور بین الاقوامی سطح پر اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ ان کا تن تنہا حامی سوویت یونین اور کمیونسٹ گروپ کے کٹھ پتلی حکمراں تھے۔ سخت پریس سنسرشپ کے باوجود ان کی حکومت کے ذریعہ کئے جارہے ظلم واستحصال کی خبر پورے ملک اور بیرون ممالک میں اتنی تیزی کے ساتھ گشت کررہی تھی کہ اس نے وزیراعظم کو پریشان کردیا۔ میں ہمیشہ زبانی تشہیر کی طاقت سے حیران ہوتا رہا ہوں، جس کے سلسلہ میں تاناشاہ اشاعتی الفاظ سے زیادہ خوف زدہ ہوتے ہیں، لیکن سنسر اس کے سامنے بالکل معذور ہوتا ہے۔ ایمرجنسی کی سچائی کی معلومات دینے کے لئے اطلاعات ونشریات کا سب سے قدیم طریقہ سب سے زیادہ مؤثر ہوگیا تھا۔

نتیجہ میں، اندرا گاندھی اور ان کے بیٹے سنجے گاندھی کے وقار کو، خاص طور سے شمالی ہند میں، اتنا نقصان کسی نے نہیں پہنچایا جتنا کہ زبردستی نسبندی کئے جانے کے واقعات نے پہنچایا۔ حکومت کے فیملی پلاننگ پروگرام کے ایک حصہ کے طور پر سرکاری ملازمین کو ایک ہدف دے دیا گیا، جسے انھیں ہر حال میں مکمل کرنا تھا۔ انھوں نے کئی مقامات پر دیہی علاقوں میں غریب اور ناخواندہ لوگوں کو نشانہ بنا کر بڑے پیمانہ پر ویسکٹامی (مردنسبندی) اور ہسٹریکٹامی (خواتین نسبندی) مہم چلائی۔ بلاشبہ ہندوستان جیسے ملک میں آبادی کنٹرول ؟ایک قابل ستائش کارنامہ تھا، لیکن یہاں یہ ایک مثبت نظریہ کا کنٹرول سے باہر ہوجانے کا پیش خیمہ بنا اور نتیجہ میں اس کے زبردستی نافذ کئے جانے کے سبب یہ بدنام ہوگیا۔

اگر نسبندی نے عام لوگوں کو برہم کیا تو ہندوستانی خواندہ طبقہ، کانگریس میں وزیر اعظم اور ان کے بیٹے کی بے شرمی کے ساتھ چاپلوس نواز ہونے کے سبب حیران تھے۔ کانگریس کے اس وقت کے صدر دیوکانت بروا کا دیا گیا نعرہ 'اندرا از انڈیا اینڈ انڈیا از اندرا' (اندرا ہی ہندوستان ہے اور ہندوستان ہی اندرا ہے) نے لوگوں کے حب الوطنی کے جذبہ کو ٹھیس پہنچایا۔ بروا نے ایمرجنسی کے دوران ایک مرتبہ اعلان کیا تھا کہ ملک بغیر اپوزیشن کے چل سکتا ہے۔ ہندوستان کی تاریخ میں حزب اختلاف بے معنی ہیں۔

اندرا گاندھی کے لئے صورت حال اس وقت مزید خراب ہوگئی، جب کانگریس اور سی پی آئی کے مابین الحاق میں دراڑ پیدا ہوگئی۔ نومبر 1975 میں سی پی آئی حامی ہفتہ وار 'مین اسٹریم' نے اپنے معزز ایڈیٹر نکھل چکرورتی کے مذمتی بیانات شائع کئے۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ ایک مسودہ پیش کیا گیا ہے، جس میں ہندوستانی آئین میں بنیادی تبدیلی کی پیش کش کی گئی ہے اور ان میں حکومت کا صدارتی سسٹم بھی شامل ہے۔ یہ مسودہ، جسے 'اہم کانگریسیوں' کا آشیرواد حاصل تھا، ملک میں شدید ردعمل کی صورت اختیار کر گیا۔ خاص طور پر قانونی برادری میں، اس کے خلاف ردعمل اتنا پرزور اور فطری تھا کہ حکومت نے بلا تاخیر یہ تجویز واپس لیتے ہوئے کہا کہ اس مسودہ سے حکومت کا کوئی سرکاری تعلق نہیں ہے۔ اس دستاویز کی تشہیر کے بعد جو 'ہنگامہ برپا ہوا' اس سلسلہ میں چکرورتی نے اداریہ میں لکھا، اس کے بعد کانگریس کو اپنے ہی دماغ کی پیداوار کو قربان کرنا پڑا۔ حکومت کی اس مذمت کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں 'مین اسٹریم' کی اشاعت معطل کرنی پڑی۔

1976 کے وسط میں سنجے گاندھی کی سامراجیت کی سرعام نکتہ چینی نے ملک کے کئی لوگوں کو حیران کر دیا۔ جولائی 1978 میں صحافی اوما واسودیو کو دیئے گئے ایک طویل انٹرویو میں انھوں نے اپنی ماں کی حکومت میں لیفٹ متاثرہ اقتصادی پالیسیوں کی مذمت کی اور کہا 'میرے خیال سے پبلک سیکٹر کو صرف پرائیویٹ سیکٹر کے مقابلہ کے ساتھ ہی چلایا جانا چاہئے اور جہاں پر یہ پرائیویٹ سیکٹر کا مقابلہ نہیں کر سکتا، اسے اپنی فطری موت مرنے دینا چاہئے۔' ان کے مختلف ایشوز پر اظہار خیال اتنے پیچیدہ اور حیرت انگیز تھے کہ پی ٹی آئی (پریس ٹرسٹ آف انڈیا) اور یو این آئی (یونائیٹڈ نیوز آف انڈیا) کے ذریعہ اس انٹرویو کے حصہ کو شائع کرنے کے فوراً بعد وزیر اعظم نے اپنے اسٹاف کو ہدایت دی کہ وہ خبر رساں ایجنسیوں سے یہ انٹرویو واپس لینے کے لئے کہیں، لیکن کچھ اخبارات اسے پہلے ہی شائع کر چکے تھے۔

سنجے گاندھی کی اپنی ماں کی اقتصادی پالیسیوں کی نکتہ چینی کے کچھ مثبت پہلو بھی تھے۔ اس کا ثبوت اس بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ 90 کی دہائی کے آغاز میں اقتصادی شرح نمو کو روکنے والے سوویت ماڈل کے شکنجہ سے نکلنے کے لئے ہندوستانی معاشی نظام کی رواداری کے لئے بڑے پیمانہ پر اصلاحات شروع کیے گئے۔ یہاں پر بھی ایک اچھی منشا سیاسی ہیروازم سے بگڑ گئی۔ جمہوریت، جو کہ تمام اچھے نظریات کا پارس پتھر ہے اور یہ خود ایک آدرش وسیلہ اور ایک پاک صلہ ہے، یہ ماں اور بیٹے دونوں کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔

1976 کے اواخر میں اندرا گاندھی نے یہ محسوس کیا کہ وہ تیزی سے کنارہ کش ہوتی جا رہی ہیں۔ وہ جانتی تھیں کہ ایمرجنسی غیر معینہ مدت تک جاری نہیں رہ سکتی۔ پانچویں لوک سبھا کا مدت کار پہلے ہی سال 1976 کے وسط میں ختم ہو چکا تھا، لیکن ایک آئینی ترمیم کے توسط سے وزیر اعظم نے لوک سبھا کی مدت ایک برس کے لئے بڑھا دی تھی، جس سے وہ 1977 کے آخر تک حکومت کر سکتی تھیں۔ ان کے سامنے تین متبادل تھے (1) ایمرجنسی کو اور پارلیمنٹ کے مدت کار کو مزید آگے بڑھا کر 1977 کے بعد بھی اقتدار میں بنے رہنا۔ (2) ایمرجنسی کی حالت میں ہی نئے پارلیمانی الیکشن کرانا اور (3) ایمرجنسی کے کچھ سخت ضوابط میں نرمی دینا، مخالفین کو جیل سے چھوڑنا اور فوراً پارلیمانی الیکشن کروا کر اقتدار کے لئے دوبارہ منتخب ہونا اور ہیرو پرست حکومت کو ایک نئی شکل میں جاری رکھنا۔

اندرا گاندھی اچھی طرح آگاہ تھیں کہ پہلے دو متبادل کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، ان میں سے کسی کو بھی اختیار کرنے سے ملک میں ایمرجنسی حکومت کے خلاف تشدد آمیز بغاوت میں تیزی آجائے گی اور یہ ان کی حکومت کو عالمی برادری کے سامنے برہنہ کر کے پابندی لگا سکتی ہے، خواہ کچھ بھی ہو، وہ اپنے والد کی قابل ستائش پارلیمانی جمہوریت کی پرورش کی وراثت کو نو آزاد ہندوستان میں نظرانداز نہیں کر سکتی تھیں۔ انھوں نے تیسرے متبادل پر بھروسہ کیا۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ اپوزیشن 1975 کے وسط سے ہی کسی بھی طرح کی کارروائی سے کنارہ کش تھی، وہ 1977 کی شروعات میں انتخابی عمل سے اقتدار پر قابض ہو سکتی ہیں۔ تمام تاناشاہوں کی طرح انھوں نے بھی خود کو انتہائی تشہیر کے بھروسہ رکھا، جو کہ ان کی حکومت کے زیر کنٹرول میڈیا کے ذریعہ ان کی 'بیس نکاتی پروگرام' کی کامیابی کے بارے میں مشتہر کیا جا رہا تھا۔ اس میں سنجے گاندھی نے اپنا 'پانچ نکاتی پروگرام' کو جوڑ دیا۔ ان کے ناقابل تسخیر ہونے کا جذبہ ان کی ہاں میں ہاں ملانے والی منڈلی کے سبب اور بھی پختہ ہو گیا تھا، جس سے وہ ہمیشہ گھری رہتی تھیں۔

مجھے کوئی شک نہیں کہ نیا سال مثبت ترقی کا پیامبر ثابت ہوگا۔ قیدی کے طور پر تحریر کردہ میری ڈائری میں 31 دسمبر کو درج تھا 'سال کا آخری دن خاص طور سے ہماری جیل کے اندر خوشی کی سوغات لے کر آیا ہے۔ مدھو ڈنڈوے کی قید ختم کر دی گئی ہے۔ انھیں جوشیلی اور پیار بھری ودائی دی گئی۔'

بنگلور میں بطور قیدی میں ملک بھر کی چالیس سے بھی زائد جیلوں کے سیاسی قیدیوں سے مسلسل رابطہ میں تھا۔ اکثر ان کے خطوط کوڈ ورڈس میں ہوتے ہیں۔ 7 جنوری کو مجھے اس طرح کے پیغام والا ایک ٹیلی گرام موصول ہوا۔

'مشترکہ پریوار کے اہم ممبروں سے نیا گھر بنانے کے سلسلہ میں ملا۔ داداجی کو دیکھنے کے لئے آج جا رہا ہوں۔'

——مدھو بالا آڈوانی

میں جانتا تھا کہ یہ ٹیلی گرام مدھو ڈنڈوتے کا ہے اور میں نے اس کو ڈی کوڈ کیا۔ میں خوش تھا کہ وہ جیل سے چھوٹنے کے بعد مختلف اپوزیشن پارٹیوں سے رابطہ کر پا رہے ہیں اور ان کے ساتھ ایک نئی سیاسی پارٹی بنانے پر غور و خوض کر رہے ہیں اور اب وہ اس ایشو پر جے پرکاش نارائن کی رہنمائی حاصل کرنے کے لئے پٹنہ جا رہے ہیں۔

16 جنوری کو میں نے ڈائری میں لکھا 'انڈین ایکسپریس میں اہم خبر ہے کہ لوک سبھا الیکشن مارچ کے آخر اور اپریل کے شروع میں ہوں گے اور اس سلسلہ میں رسمی اعلانات پارلیمنٹ کے اگلے اجلاس کی شروعات میں کر دیئے جائیں گے۔' اس کے دو دن بعد 18 جنوری 1976 کو وزیر اعظم اندرا گاندھی نے لوک سبھا تحلیل کیے جانے کا اعلان کیا۔

انھوں نے 60 کروڑ لوگوں کی آزادی چھینی، لیکن وہ ان کی امیدوں کو ختم نہیں کر سکیں

18 جنوری کی صبح کچھ دلچسپ واقعات ہوئے، جس کی جانکاری مجھے بعد میں ملی۔ موجودہ واقعہ کے بارے میں کوئی جانکاری نہ ہونے کے سبب میری اہلیہ کملا جنوری کے شروعات میں بچوں کے ساتھ بنگلور آئیں۔ وہ اس بات کے لئے متفکر تھیں کہ میری قید و بند کی زندگی کا خاتمہ کب ہوگا اور میں کب گھر واپس آؤں گا؟ 17 جنوری کو ان کے ایک رشتہ دار، جن کے گھر میں وہ رہائش پذیر تھیں، نے ان سے کہا کہ آپ بہت بے چین لگ

رہی ہیں۔ آپ وہائٹ فیلڈ جا کر ستیہ سائیں بابا★ کے درشن کیوں نہیں کرتیں، جو آج کل یہاں قیام پذیر ہیں۔ آپ کے دل کو قرار ملے گا۔

کملا، جو بابا سے کبھی نہیں ملی تھیں، اگلے دن وہاں جانے کے لئے رضامند ہو گئیں۔ علی الصباح وہ کار سے اپنے دونوں بچوں کے ساتھ بنگلور کے سب سٹی علاقہ وہائٹ فیلڈ پہنچیں، جہاں پر بابا کا آشرم تھا۔ جیسا کہ اکثر ہوتا ہے کہ وہاں پر بڑی تعداد میں عقیدت مند بابا کے درشن کے لئے جمع ہوئے تھے۔ بابا ایک بڑے ہال کے ایک کونہ میں کرسی پر براجمان تھے۔ کملا اپنے رشتہ دار اور بچوں کے ساتھ دور بھیڑ میں کھڑی تھیں۔ انھیں بے حد تعجب ہوا، جب کوئی شخص ان کے پاس آیا اور بولا کہ 'بابا آپ کو بلا رہے ہیں'۔ وہ بابا کے پاس گئیں اور انھیں نمسکار کیا۔ بابا نے ان کے سر پر ہاتھ رکھا اور کہا 'تمہارا شوہر جیل سے بہت جلد رہا ہو جائے گا'۔

کملا حیران تھیں۔ وہ بابا سے پہلے کبھی نہیں ملی تھیں اور نہ ہی انھوں نے بابا کو میرے بارے میں کچھ بتایا تھا۔ ان کا دل زوروں سے دھڑک رہا تھا۔ وہ اپنے رشتہ دار کے گھر واپس آئیں، جہاں پر منتظر پولس افسر نے ان کا خیر مقدم کیا اور کہا 'آڈوانی جی جلد ہی سینٹرل جیل سے رہا ہو جائیں گے۔ کیا آپ ان کا استقبال کرنا چاہیں گی؟' جیسے ہی میں نے جیل سے باہر قدم رکھا، میرا استقبال کملا، جینت اور پرتبھا نے کیا۔ وہ میری زندگی کا یادگار لمحہ تھا۔ میں آزاد ہندوستان کے ایک سیاسی قیدی کے طور پر انیس ماہ جیل میں گزارنے کے بعد آزاد ہونے پر خوش تھا۔ حالانکہ جیل سے باہر آنے میں راحت کا احساس نہیں ہو رہا تھا، کیونکہ تقریباً 100 دیگر سیاسی کارکنان کو 'میسا' کے تحت بنگلور سینٹرل جیل میں رکھا گیا تھا اور انھیں آزاد نہیں کیا گیا۔ کملا نے مجھے بھروسہ دلایا کہ 'اگر انھوں نے آپ کو چھوڑ دیا ہے تو وہ انھیں بھی یقیناً چھوڑ دیں گے'۔

ڈائری میں درج آخری تبصرہ، جو 18 جنوری کو میرے آزاد ہونے سے کچھ قبل لکھی گئی تھی، اس طرح ہے——

''دوپہر سے تقریباً 1:30 بجے جیل سپرنٹنڈنٹ چمیلانی میرے کمرے میں آئے اور کہا کہ ایک وائرلیس پیغام دہلی سے موصول ہوا، جو میرے قید کے خاتمہ کے سلسلہ میں ہے۔ میں نے دو یا تین گھنٹے دوسرے وارڈ میں گزارے۔ یہاں وداعی تقریب بھی منعقد کی گئی۔ نہ جانے کیوں، جیل سے چھوٹنے کی خبر سے مجھے خوشی نہیں ہوئی۔ جیل میں ابھی بھی بیشتر قیدی ایسے تھے جو جن سنگھ کے کارکنان تھے۔ حکومت صرف اپنی ستائش کے لئے لیڈر یا ممبران اسمبلی کو رہا کر رہی تھی۔ حقیقت میں ایک تنظیم کے سربراہ کے طور پر میں کبیدہ خاطر ہو رہا تھا کہ مجھے چھوڑا جا رہا ہے اور میرے قریبی ساتھی ابھی بھی قیدی کی صورت میں موجود ہیں... شام 5:30 بجے جب میں اپنے کمرہ میں واپس آیا تو اپنی میز پر خطوط کا انبار پایا۔ ان کی تعداد 600 سے بھی زیادہ تھی اور یہ تمام خطوط بیرون ممالک سے آئے تھے، جو کہ ایمنسٹی انٹرنیشنل کے ممبروں یا ساتھیوں کے تھے۔ ان میں سے بیشتر کرسمس اور نئے سال کے مبارک باد کے سلسلہ میں تھے لیکن ہر ایک میں ایک یا دو لائنیں درج تھیں، جدوجہد میں شامل تمام لوگوں کو طاقت، خود اعتمادی اور حوصلہ فراہم کرتی تھیں۔ مثال کے طور پر، ایمسٹرڈم سے لاری ہارڈنگس کے کرسمس پیغام جس میں انھوں نے لکھا تھا:

آزادی اور ارمان ساتھ ساتھ نہیں چلتے۔ وہ آپ کی آزادی چرا سکتے ہیں لیکن آپ کے ارمان نہیں چھین سکتے۔''

ہاں انھوں نے 60 کروڑ لوگوں کی آزادی چرالی، لیکن وہ ان کی امیدوں کو ختم نہیں کر سکے۔

★ ست سائیں بابا ہندوستانی روحانی شخصیتوں میں سب سے زیادہ قابل تعظیم ہیں۔ ان کا خاص آشرم آندھرا پردیش کے پٹ پرتھی میں ہے۔ دنیا بھر کے 114 ممالک میں ست سائیں بابا کے 1200 سے زائد مراکز ہیں، جہاں ان کے لاکھوں مرید ہیں، جو روحانی اور انسانی سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔ بابا کا آدرش قول ہے—— 'سبھی سے پریم کرو، سبھی کی سیوا کرو'۔

انتخابات کا اعلان اور جنتا پارٹی کا جنم

بنگلور میں ایک دن گزارنے کے بعد میں مدراس (چنئی) چلا گیا، جہاں سے میں نے 20 رجنوری کو دہلی کے لئے پرواز کی۔ کملا اور بچے ریل گاڑی سے گھر واپس گئے۔ اس وقت اٹل جی بھی رہا ہو چکے تھے۔ اس سے قبل انھیں دہلی کے ایمس اسپتال بھیج دیا گیا تھا۔ جہاں وہ سلپ ڈسک آپریشن کے بعد آرام کر رہے تھے۔ مرار جی بھائی کو تاوڑو (ہریانہ) کے جیل سے آزاد کیا گیا۔ تین دن بعد 23 رجنوری کو اندرا گاندھی نے مارچ میں الیکشن کرائے جانے کا اعلان کیا۔ اس اعلان کے بعد کئی دیگر سیاسی قیدیوں کو رہا کر دیا گیا۔

ملک میں سیاسی واقعات بجلی کی تیزی سے بدلے۔ جس دن نئے الیکشن کا اعلان ہوا، اسی دن جے پرکاش جی نے جنتا پارٹی کے قیام کا اعلان کیا اور 28 رکنی نیشنل ورکنگ کمیٹی کی تشکیل کی، جس میں مرار جی ڈیسائی کو صدر اور چرن سنگھ کو نائب صدر بنایا گیا۔ اس کے ارکان چار پارٹیوں— جن سنگھ، کانگریس (او)، سوشلسٹ پارٹی اور لوک دل سے تھے، جنھوں نے انضمام کے بعد ایک نئی پارٹی کو جنم دیا۔ مدھو لمئے، رام دھن اور سریندر موہن کے ساتھ میں اس کے چار جنرل سکریٹریوں میں سے ایک تھا۔

جنتا پارٹی کے جنم سے ملک میں سیاسی صورت حال بالکل تبدیل ہوگئی۔ ایسا لگتا تھا کہ یہ ایک عظیم اور قومی مفاد پر مبنی طاقت ہے، جو ہندوستان کو 19 ماہ کی مطلق العنان حکومت سے آزادی دلائے گی۔ حالانکہ الیکشن ہونے میں ابھی کچھ ہفتے باقی تھے اور لوگوں کو ابھی ایمرجنسی پر اپنا فیصلہ دینا تھا، لیکن ماحول میں تاناشاہی پر جمہوریت کی فتح کی لہر سما چکی تھی۔ مجھے لگتا تھا کہ ہندوستان ایک ڈرامائی تبدیلی کی بلندی پر کھڑا ہے، جو ایک عہد کے خاتمہ اور ایک نئے دور کے طلوع کا اشارہ ہے۔ اس کا موازنہ تین دہائی قبل 1947 میں ہندوستان کے ذریعہ حد بندی کے سلسلہ میں کیے گئے تجربہ سے کی جاسکتی تھی۔ یقیناً ہندوستان میں یہ دوسری جنگ آزادی کی کامرانی تھی۔

یہاں میں واضح کرنا چاہوں گا کہ جن سنگھ، جس نے ایمرجنسی کے اعلان سے قبل جے پرکاش جی کے ذریعہ ایک تنہا غیر کمیونسٹ سیاسی پارٹی کے قیام کی تجویز کو مشروط حمایت دی تھی، جو کہ کانگریس کا ایک پر اعتماد متبادل ہو سکتا تھا، نے اب اس خیال کی پر جوش حمایت کی۔

ایمرجنسی کے زخم اور درد نے جن سنگھ میں تمام لوگوں کو یہ احساس دلایا کہ کانگریس کو بغیر کسی بڑی اپوزیشن یونٹ کے ہرایا نہیں جاسکتا۔

ایک اہم وجہ، جو ہم لوگوں پر اثر انداز ہوئی، وہ تھی جے پرکاش جی کے ذریعہ ایمرجنسی سے قبل اور اس دوران اور بعد میں جن سنگھ اور سنگھ میں ان کا یقین۔ دراصل انھوں نے قیدی بنائے جانے پر اعلان کیا تھا کہ جن سنگھ پارٹی کے تئیں ایماندار اور پر اعتماد کارکن نانا جی دیشمکھ لوک سنگھرش کمیٹی کی پوری ذمہ داری سنبھالیں گے، جس کا قیام جے پی نے 1974 میں برسر اقتدار پارٹیوں سے لڑنے کے لئے ایک مضبوط اسٹیج کے طور پر کی تھی۔ میں نے پہلے ہی ذکر کیا ہے کہ انھوں نے کس طرح مارچ 1975 میں دہلی میں جن سنگھ کی قومی ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں حصہ لینے پر رضامندی دی تھی اور اعلان کیا تھا کہ 'اگر جن سنگھ فاشزم ہے تو جے پرکاش نارائن بھی فاشسٹ ہے۔' اس کے لئے انھیں سامراجیت کی سخت مذمت کا سامنا کرنا پڑا، لیکن وہ اپنے افکار پر مضبوطی سے قائم رہے۔

ہم لوگوں میں جے پی کے تئیں ایمرجنسی سے قبل جو عزت تھی، اس میں کئی گنا اضافہ ہو گیا، کیونکہ انھوں نے جمہوری تحریک کو مضبوط، دوررس اور پر اثر قیادت ایسے وقت میں فراہم کی، جب وہ خود قید میں تھے اور ان کی صحت مسلسل گرتی جارہی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ سنگھ کے تیسرے سر سنگھ چالک بالا صاحب دیورس نے یکم دسمبر 1974 میں پہل کی، تب اٹل جی، میں اور جن سنگھ کے دیگر ارکان کو اپنی پارٹی کو تحلیل کر کے ایک نئی

پارٹی بنانے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کی۔ ایسا ہی جذبہ دیگر مساوی نظریہ والی پارٹیوں کے ہمارے دوستوں میں دیکھنے کو ملا، جو جنتا پارٹی میں شامل ہونے کے لئے راضی ہو گئے۔

جنتا پارٹی کے قیام نے اندرا گاندھی کی حکومت کے کئی وزراء کی حوصلہ افزائی کی، جو ایمرجنسی اور وزیراعظم کی طرز حکومت سے خوش نہیں تھے، لیکن اپنی خواہش کا اظہار نہیں کر پا رہے تھے۔ 2 رفروری کو وزیراعظم کو اس وقت گہرا دھچکا لگا جب ان کی وزارت کے ایک سینئر رکن اور کانگریس کے بڑے دلت لیڈر جگ جیون رام نے استعفیٰ دے دیا، جو آزادی کے بعد نئی دہلی کی تمام حکومتوں میں وزیر رہے تھے اور پنڈت نہرو کی 1946 کی عبوری حکومت میں بھی وزیر بنے تھے۔ اندرا گاندھی کے خلاف بغاوت کرنے کے بعد انھوں نے ایک نئی پارٹی 'کانگریس فار ڈیموکریسی' بنائی۔ اس میں ان کے ساتھ ایک وقت اندرا گاندھی کے سب سے قریب رہے ہیم وتی نندن بہوگنا اور نندنی ستپتھی بھی شامل تھیں۔ کانگریس فار ڈیموکریسی کا جلد ہی جنتا پارٹی میں انضمام ہو گیا، جس نے ملک گیر پیمانہ پر ایمرجنسی مخالف طاقتوں کو اخلاقی حمایت دی۔

لوک سبھا الیکشن کی تیاری کے لئے بہت کم وقت بچا تھا جو 16 رمارچ کو متوقع تھے۔ ایک مضبوط سیاسی اسٹیج تیار کرنے کا فیصلہ لینے کے بعد جنتا پارٹی کے مجوزہ پرچم پر تبادلہ خیال ہوا۔ جنوری کے آخر میں حلیف پارٹیوں کے درجنوں لیڈر مرار جی ڈیسائی کے گھر پر ملے۔ اٹل جی اور میں وہاں جن سنگھ کے ترجمان کے طور پر موجود تھے۔ آزاد پارٹی کے لیڈر پیلو مودی نے سب سے پہلے اپنی رائے کا اظہار کیا اور کہا کہ 'جھنڈا نیلا ہونا چاہئے' اس پر چرن سنگھ نے کہا کہ 'میں اس بات سے اتفاق رکھتا ہوں کہ جھنڈا کا رنگ ایک ہی ہونا چاہئے، لیکن نیلا نہیں ہرا۔ ہرا رنگ زراعت کو ظاہر کرتا ہے اور کسانوں کے تئیں ہمارے عزم کو ظاہر کرے گا، جو کہ ہمارے سماج کی ریڑھ ہے۔' سکندر بخت، جو اس وقت کانگریس (او) میں تھے، نے اس پر سخت ردعمل کا اظہار کیا اور کہا کہ 'آپ کا جھنڈا ہرا کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ پاکستان کے جھنڈے کا رنگ ہے۔' میں نے مشورہ دیا کہ جھنڈا زعفرانی رنگ کا ہونا چاہئے اور مثال پیش کی کہ کانگریس جھنڈا کمیٹی نے بھی 1931 میں ایک نیلے چرخہ کے ساتھ زعفرانی جھنڈے کی صلاح دی تھی۔'

بالآخر مرار جی بھائی نے کہا 'نہ صرف ہرا اور نہ صرف زعفرانی، بلکہ دونوں کو رکھتے ہیں، تب یہ فیصلہ لیا گیا کہ جھنڈے کا دو تہائی حصہ بھگوا اور ایک تہائی ہرا ہوگا۔ دو حصوں میں، جس کے بھگوا حصہ میں حل چلانے والے کسان کی تصویر ہوگی۔' کسان کی تصویر ہمارا انتخابی نشان بن گیا۔

ایک خاموش اور پرامن بیلٹ باکس انقلاب

حالانکہ میں نے 1952 میں ہوئے پہلے اور 2004 میں ہوئے چودھویں پارلیمانی انتخابات میں ایک امیدوار یا ایک مہم جو کے طور پر حصہ لیا، لیکن میں بغیر کسی ہچکچاہٹ کے کہہ سکتا ہوں کہ 1977 کا الیکشن میرے لئے سب سے زیادہ یادگار ہے۔ دیگر کسی بھی موقع پر ہندوستانی جمہوریت کا وجود الیکشن کے نتائج پر منحصر نہیں تھا۔ اسی طرح کوئی بھی دوسرا الیکشن اس انتخاب کی طرح ہندوستانی رائے دہندگان کی جمہوری دانشوری کا عظیم شاہد نہیں بنا۔ 1977 کا لوک سبھا الیکشن ایک خاموش اور پرامن بیلٹ باکس انقلاب تھا، جو ہندوستان کے غریب ووٹروں نے ممکن کر دکھایا۔

جنتا پارٹی کو انتخابی مہم کی شروعات سے ہی کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ہمارا جھنڈا اور انتخابی نشان نئے تھے، اسی لئے رائے دہندگان اس سے کم واقف تھے۔ اس کے برعکس، عوام کانگریس کے انتخابی نشان چرخہ سے اچھی طرح شناسا تھے۔ ہماری پارٹی کے پاس وسائل کا فقدان تھا، جبکہ کانگریس کے پاس وافر مقدار میں رقم موجود تھی۔ کانگریس کے پاس حکومت کے زیر کنٹرول میڈیا بھی تھا۔ چونکہ ایمرجنسی ابھی بھی رسمی طور سے نافذ تھی، لوگ عام طور پر خوف زدہ اور اندیشہ میں گرفتار تھے۔ وہ کھلے طور پر اس پر بات کرنے کے لئے تیار نہیں تھے کہ وہ اپنا ووٹ کسے دیں

گے، لیکن یہ سچ ہے کہ جنتا پارٹی کی انتخابی ریلی میں کافی بھیڑ جمع ہوتی تھی، لیکن ابتدائی دنوں میں کانگریس مخالف لہر کا کوئی ماحول نظر نہیں آتا تھا۔ دراصل کانگریس کے جھنڈے گاؤوں اور قصبوں دونوں میں جنتا پارٹی سے بہت زیادہ تعداد میں نصب تھے۔

پھر بھی ہوا میں تبدیلی کا ایک جھونکا آ رہا ہے۔ ایک انتخابی زلزلہ کے قبل کی کپکپی کا احساس ہو رہا تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ انتخابی ریلی، جسے میں نے امیٹھی (اتر پردیش) میں انتخابی مہم کے دوران خطاب کیا تھا، جب میں خاص بازار سے گزر رہا تھا تب میں نے دیکھا کہ تمام دکانوں میں صرف کانگریس کے جھنڈے لہرا رہے ہیں۔ میں ایک چھوٹی دکان میں گیا اور اس کے مالک سے بات کرنے لگا۔ پہلے وہ الیکشن کے بارے میں کسی طرح کی بات چیت کرنے کے لئے تیار نہیں ہوا، لیکن جب اسے مجھ پر اعتبار ہوا، تب میں نے پوچھا 'اس پارلیمانی حلقہ سے کون جیتے گا؟' مجھے اس کے جواب پر حیرانی ہوئی 'یقیناً جنتا پارٹی کا امیدوار، اس میں کوئی شک نہیں ہے۔' میں نے کہا 'تم اتنے پرامید کیسے ہو؟ مجھے تو یہاں ایسا کوئی نشان نظر نہیں آتا کہ کانگریس کی شکست ہوگی، یہاں تک کہ آپ کی دکان میں کانگریس کا پرچم لہرا رہا ہے؟'

'بھائی صاحب، آپ نے صرف جھنڈا دیکھا ہے۔ یہ مت بھولئے کہ اس میں ڈنڈا بھی ہے، جس پر یہ لگا ہے۔ ہم ڈنڈے سے ڈرتے ہیں، اس لئے ہم نے کانگریس کا جھنڈا لگایا ہے۔'

ایک پل میں میں نے جمہوریت کا ایک عظیم ترین سبق سیکھا— کبھی بھی عام آدمی کی سیاسی سمجھ بوجھ یا جمہوریت کے تئیں اس کے جذبہ کو کم کر کے نہیں دیکھنا چاہئے۔ ہندوستان کے ووٹر ناخواندہ یا نیم خواندہ ہو سکتے ہیں، وہ ذات اور مذہب کے بہاؤ میں بہہ سکتے ہیں، لیکن جب جمہوریت یا آزادی جیسے بڑے آدرشوں کے دفاع کا وقت آتا ہے، تب وہ ایک مضبوط مشترکہ طاقت کی شکل میں سامنے آتے ہیں۔ یہ صاف طور پر ثابت ہو گیا، جب 20 / مارچ کو انتخابی نتائج کا اعلان ہوا۔

کانگریس آزادی کے بعد پہلی مرتبہ شکست سے ہمکنار ہوئی تھی۔ جنتا پارٹی کو 542 رکنی سیٹوں میں 295 سیٹوں کے ساتھ واضح اکثریت ملی۔ کانگریس محض 154 سیٹوں تک محدود ہو کر رہ گئی۔ ووٹوں کے تناسب کے معاملہ میں بھی جنتا پارٹی نے حیرت انگیز طریقہ سے 41.32 فیصد ووٹ حاصل کئے، جبکہ کانگریس کو 34.52 فیصد ووٹ ملے، جس میں تقریباً 7 فیصد کا فرق تھا۔ برسراقتدار پارٹی کے لئے یہ شکست اس وقت مزید شرمناک ہو گئی جب یہ خبر پھیلی کہ اندرا گاندھی رائے بریلی سے اور ان کے بیٹے سنجے گاندھی امیٹھی سے الیکشن ہار گئے ہیں۔ یہ دونوں ان کے اپنے انتخابی حلقے تھے۔

سرکاری میڈیا نے کانگریس کی شکست کی خبر کو دبانے کی کوشش کی، خاص کر وزیراعظم اور ان کے بیٹے کی۔ اس سے کئی طرح کی قیاس آرائیاں اور افواہوں کا بازار گرم ہوا۔ بعد میں مجھے اس دن کیا ہوا تھا، اس سلسلہ میں جانکاری ایک پی ٹی آئی رپورٹر کے پی کرشنن انی کے ایک 'خودنوشت' سے ملی۔ ایک مرتبہ جب ووٹوں کی گنتی نے یہ ظاہر کرنا شروع کر دیا کہ جنتا پارٹی ایک عظیم فتح کی جانب گامزن ہے، تب کرشنن انی نے ایک خبر ٹائپ کی، جس کی سرخی تھی 'کانگریس کی تیس سالہ حکمرانی کا خاتمہ اور جلد ہی ایک غیر کانگریسی کابینہ اپنا کام کاج سنبھالے گا...' انھیں حیرانی ہوئی کہ اس کے ایڈیٹر نے اس خبر کو روکنے کے لئے کہا۔ کرشنن انی کے مطابق، انھوں نے بتایا کہ اندرا گاندھی تینوں فوجی سربراہوں سے مل کر یہ جاننے کی کوشش کی کہ اگر وہ الیکشن نتائج کے برخلاف اقتدار پر قابض رہتی ہیں تو کیا وہ ان کی حمایت کریں گے؟ ایک مرتبہ یہ پتہ لگ جانے کے بعد کہ فوجی سربراہان نے گاندھی کے اقتدار میں بنے رہنے کی خواہش کو خارج کر دیا ہے، ایڈیٹر نے وہ خبر جاری کر دی۔

ایمرجنسی سرکاری طور پر 23 / مارچ 1977 کو ختم ہو گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ہندوستانی جمہوریت کی تاریخ کا سب سے تاریک دور کا خاتمہ ہو گیا۔

2

وزارت اطلاعات ونشریات میں میری مدت کار

مکمل احتیاط آزادی کی قیمت ہے.

تھامس جیفرسن، امریکہ کے تیسرے صدر

1977 کے لوک سبھا الیکشن میں جنتا پارٹی کی فتح کا مقبول عام ردعمل اپنے جوش اور ولولہ میں مسحور کن تھی۔ ملک بھر میں فتح ریلیاں منعقد کی گئیں، جس میں جنوبی ہندوستان بھی شامل تھا، جہاں کانگریس اپنے قلعے بچانے میں کامیاب رہی تھی۔ انتخاب میں تمام طبقوں، ذاتوں اور برادریوں کے لوگوں نے حصہ لیا۔ آزادی کے بعد ہندوستان میں تفرقات سے آگے بڑھ کر جمہوری پلیٹ فارم پر ایسا اتحاد کبھی نہیں دیکھا گیا تھا، نہ ہی اس کے بعد کسی الیکشن میں یہ جوش دیکھا گیا۔

اس سب کے برعکس ملک میں چل رہے فتح کے جشن کے درمیان جنتا پارٹی کے اتحاد نے ہی کشیدگی کے ابتدائی اشارے دینے شروع کر دیئے۔ جیسے ہی واضح ہوا کہ جنتا پارٹی نئی دہلی میں آئندہ حکومت کی تشکیل کرے گی، ایک پیچیدہ سوال یہ پیدا ہوا کہ وزیراعظم کون؟ نومنتخب ممبران پارلیمنٹ کی بڑی تعداد جن سنگھ (93)، اس کے بعد چرن سنگھ کی قیادت والی لوک دل (71) اور مرار جی ڈیسائی کی قیادت والی کانگریس (او) کا مقام (44) پر تھا۔ سوشلسٹ پارٹی کے 28 ممبران پارلیمنٹ تھے اور اتنی ہی تعداد کانگریس فار ڈیموکریسی، جو جگ جیون رام کی قیادت میں کانگریس سے ٹوٹ کر بنایا گیا گروپ تھا، کی تھی، لیکن وزیراعظم کا فیصلہ جنتا پارٹی کے حلیفوں کی تعداد کی بنیاد پر نہیں ہونا تھا۔ انھوں نے نئی پارٹی میں اپنی نجی شناخت مٹادی تھی۔ ہم جو جن سنگھ کے پس منظر کے تھے، نے یہ واضح کر دیا تھا کہ وزیراعظم کا انتخاب صرف قابلیت اور ملک کے مفاد پر منحصر ہوگا اور اس سے بھی اہم یہ ہے کہ فیصلہ عام رضامندی سے لیا جائے گا۔

جنتا پارٹی میں اتحاد اور رضامندی کو استحکام بخشنے کی بڑی ذمہ داری فطری طور پر جے پرکاش جی کے کاندھوں پر تھی۔ ایمرجنسی کے دوران جیل میں ان کی صحت خراب ہوگئی تھی۔ ان کے گردے نے کام کرنا بند کر دیا تھا اور نومبر 1976 میں جسلوک اسپتال میں صحیح وقت پر ہوئے آپریشن نے ان کی جان بچائی۔ وہ باقی زندگی ڈائیلاسس پر رہے۔ اس نازک صورت حال میں بھی انھوں نے جنتا پارٹی کی انتخابی مہم میں اپنی اخلاقی حمایت دی۔ جب انتخابی نتائج کا اعلان ہوا، اس وقت وہ ممبئی میں زیر علاج تھے۔ حالانکہ جنتا پارٹی کی جیت کے وہ اہم ستون تھے، لیکن اقتدار کی دوڑ میں وہ کبھی بھی شامل نہیں ہوئے۔ مہاتما گاندھی کی طرح، جن کے وہ سچے مرید تھے، جے پی نے اقتدار کی سیاست سے خود کو الگ

رکھا، جس نے ملک میں ان کے اخلاقی قد کو بلندی عطا کی۔

حیرت کی بات نہیں ہے کہ اب تمام نگاہیں 75 سالہ سنت پر مرکوز تھیں، جو نئے وزیراعظم کے انتخاب میں فیصلہ کن کردار نبھانے والا تھا۔ جے پی 23 / مارچ کو دہلی واپس آئے اور اگلے ہی دن انھوں نے غیر معمولی کام کیا۔ انھوں نے تمام لیڈروں اور جنتا پارٹی کے نو منتخب ممبران پارلیمنٹ کو کنارے واقع گاندھی سمادھی 'راج گھاٹ' پر طلب کیا۔ وہاں پر اپنی وہیل چیئر پر بیٹھ کر ہی انھوں نے تمام لوگوں کو اتحاد اور ملک کی خدمت کا حلف دلایا۔ اس وقت کھینچی گئی تصویر کو آزاد ہندوستان کی سب سے اہم تاریخی تصاویر میں سے ایک مانا جاتا ہے۔ اس موقع پر چرن سنگھ کی غیر موجودگی واضح تھی۔ ان کی غیر موجودگی کی وجہ طبیعت کی ناسازی تھی، لیکن نئی پارٹی کے لئے اسے ایک 'بدشگون' مانا گیا۔

مرار جی ڈیسائی وزیراعظم کیسے بنے؟

جنتا پارٹی کی کامیابی کے فوراً بعد اٹل جی، میں اور جن سنگھ کے کچھ دوست وزیراعظم کے مسئلہ پر غور وخوض کرنے کے لئے جمع ہوئے۔ 3 ناموں پر غور کیا گیا تھا — مرار جی ڈیسائی، جگ جیون رام اور چرن سنگھ۔ پہلے دو خاص امیدوار تھے، دونوں کے حق میں خیالات مساوی تھے۔ دونوں میں بہترین قابلیت تھی، دونوں مجاہدین آزادی کی نسل کے تھے۔ دونوں سیاست اور انتظامیہ کا گہرا تجربہ رکھتے تھے۔ مرار جی بھائی مسلسل 1969 میں، کانگریس کی تقسیم سے پہلے بھی، اندرا گاندھی کی قیادت کے خلاف لڑ رہے تھے۔ وہ ان پہلے سیاسی لیڈروں میں سے ایک تھے، جنھوں نے ان کی تاناشاہی کی مخالفت کی۔ گجرات میں ان کی قیادت میں جون 1975 میں جمہوریت حامی تحریک کے نتیجہ میں کانگریس کی زبردست شکست ہوئی۔ دوسری جانب جگ جیون رام نے جنوری 1977 میں پارلیمنٹ کی تحلیل کے بعد اور انتخابات کا اعلان ہونے پر کانگریس چھوڑی۔ ہم اس بات پر رضامند تھے کہ ان کے کانگریس چھوڑنے سے برسراقتدار پارٹی کو خاص طور پر شمالی ہندوستان میں زبردست دھچکا پہنچا تھا۔ ہم ایک ایسے منتظم کے طور پر بھی ان کا احترام کرتے تھے جو فیصلہ لینے میں تاخیر ہونے سے نفرت کرتے تھے۔

میں ذاتی طور پر مرار جی ڈیسائی کے حق میں تھا، لیکن سابق جن سنگھ کے بیشتر ساتھی جگ جیون رام کے حق میں تھے۔ وہ ایک اہم نظریہ سے متاثر تھے۔ ایک درج فہرست ذات کا وزیراعظم، جس میں سیاسی بصیرت اور بہترین انتظامی جوہر ہے، کے ذریعہ سماجی اصلاح اور انصاف کا پرزور پیغام دیا جاسکے گا۔ سابق سوشلسٹ لیڈر جارج فرنانڈیز اور مدھو ڈنڈوتے کے بھی یہی خیالات تھے۔ اس کے علاوہ ہم یہ مان رہے تھے، چونکہ چرن سنگھ کے مرار جی ڈیسائی سے اچھے مراسم نہیں تھے، وہ جگ جیون رام کو قبول کرلیں گے، لیکن ہم غلط تھے۔

جنتا پارٹی کے تمام ممبران پارلیمنٹ کو 24 / مارچ کو ظہرانہ کے بعد وزیراعظم کے انتخاب کے سلسلہ میں مرکزی ہال میں جمع ہونا تھا۔ جیسے ہی چرن سنگھ کو پتہ چلا کہ نئی پارٹی میں اتفاق رائے جگ جیون رام کے حق میں بن رہی ہے، انھوں نے مقامی اسپتال میں جے پرکاش جی کو ایک خط لکھا، جس میں درج تھا کہ وہ اس عہدہ کے لئے مرار جی ڈیسائی کی پرزور حمایت کرتے ہیں۔ جے پی اور آچاریہ جے بی کرپلانی★ جنھیں لیڈروں اور جنتا

★ آچاریہ (جیوت رام بھگوان داس) کرپلانی (1982-1888) ایک معزز گاندھی وادی - سماج وادی تھے، جو 1947 میں ہندوستان کی آزادی کے مشکل ترین دور میں آئی این سی کے صدر رہے۔ سندھ میں پیدا ہوئے کرپلانی نے اپنے زمانہ طالب علمی میں تحریک آزادی میں حصہ لیا۔ نہرو کی پالیسیوں کے مخالف آچاریہ کرپلانی نے 1963 میں پارلیمنٹ میں پہلی مرتبہ عدم اعتماد تحریک پیش کی، جب حکومت چینی حملہ کا جواب دینے میں ناکام رہی تھی۔ 1970 میں انھوں نے جے پرکاش نارائن کے ساتھ مل کر اندرا گاندھی کی تاناشاہی کی مذمت کی۔ انھیں اس کی قیمت چکانی پڑی۔ (جاری)

پارٹی کے نومنتخب ممبران پارلیمنٹ سے تبادلہ خیال کرنے کے بعد وزیر اعظم کا انتخاب کرنے کا اختیار دیا گیا تھا، نے آخرکار مرار جی ڈیسائی کے نام کا اعلان کر دیا۔ بعد میں چرن سنگھ نے جے پی کو مسلسل خط لکھ کر دعویٰ کیا کہ انھوں نے ہی مرار جی بھائی کو وزیر اعظم کی کرسی پر بٹھایا۔

مایوس جگ جیون رام کی ناامیدی میں اس وقت مزید اضافہ ہو گیا، جب چرن سنگھ کو نائب وزیر اعظم بنا دیا گیا اور انھیں وزارت داخلہ دے دیا گیا۔ نتیجتاً جگ جیون رام نے کابینہ میں شرکت سے انکار کر دیا۔ انھیں اپنا موقف تبدیل کرنے کے لئے ہمیں بہت محنت کرنی پڑی۔ اس غیر مبارک واقعات کے نئی حکومت پر برے اثرات آنے والے مہینوں میں ظاہر ہونے لگے۔

میری پسندیدہ وزارت

مرار جی ڈیسائی نے 24 / مارچ 1976 کو ہندوستان کے پانچویں وزیر اعظم کے طور پر حلف برداری کی۔ دو دن بعد انیس رکنی کابینہ نے بھی حلف لیا۔ میں اس وقت جن سنگھ کے ان تین لوگوں میں سے ایک تھا، جو نئی حکومت میں شامل تھے۔ اٹل بہاری واجپئی کو وزیر خارجہ بنایا گیا، جبکہ برج لال ورما کو وزیر صنعت کا عہدہ سنبھالنے کے لئے کیا گیا۔ وزیر اعظم نے مجھ سے پوچھا کہ میں کون سی وزارت چاہتا ہوں؟ بغیر کسی جھجھک کے میں نے فوراً کہا 'اطلاعات ونشریات'۔ جب انھوں نے پوچھا کہ 'کیوں؟' میں نے انھیں بتایا کہ '1960 میں ایک صحافی کے طور پر کام کرنے سے مجھے میڈیا سے گہری دلچسپی ہو گئی ہے۔ میں نے مسلسل اندرا گاندھی اور ان کی پارٹی کے زیر نگیں میڈیا کے جانبدارانہ استعمال کی مخالفت میں لکھا ہے۔ راجیہ سبھا میں میں نے آکاش وانی اور دوردرشن کو خود مختاری فراہم کرنے کے لئے آواز اٹھائی ہے، لیکن سب سے بڑی وجہ ایمرجنسی کے دوران کانگریس حکومت کا خصوصاً پریس کی آزادی پر حملہ ہے۔ اب سنسرشپ کے قانونی اور انتظامی ڈھانچہ کو گرانے کی ضرورت ہے، جسے ایمرجنسی نظام میں مضبوط کیا گیا تھا، اس لئے نئی حکومت کے سامنے آنے والے چیلنجز کے طور پر بھی اطلاعات ونشریات کی وزارت میرے لئے اہم محکمہ ہے۔' مرار جی ڈیسائی نے کہا 'میں آپ سے اتفاق رکھتا ہوں۔ میں اس نازک وزارت میں آپ کو چاہتا ہوں'۔

حلف لینے کے فوراً بعد میں اپنے دفتر شاستری بھون کی پہلی منزل پر واقع وزارت اطلاعات ونشریات میں گیا — ایک نوتعمیر دفتر، جو پارلیمنٹ سے زیادہ دور نہیں تھا۔ شاستری بھون میں حکومت ہند کی کئی وزارت ہیں۔ اس میں ساؤتھ بلاک اور نارتھ بلاک کی عظمت اور خوبصورتی کا فقدان ہے۔ یہ دونوں عمارتیں دور برطانیہ میں رائے سینا ہل پر راشٹرپتی بھون کے نزدیک تعمیر کی گئی تھی۔ اس میں وزیر اعظم کا دفتر اور داخلہ، مالیات، دفاع اور وزارت خارجہ واقع ہیں۔ اس کے مقابلہ شاستری بھون، جو 60 کی دہائی میں تعمیر ہوا تھا، کی جگہ بہت ہی معمولی ہے۔ میں اس کی وجہ عوامی زندگی میں آئی تبدیلی کو دیکھتا ہوں جو بعد کی دہائیوں میں اور بڑھتی گئی۔

وزیر اطلاعات ونشریات کے طور پر میرا پہلا کام تھا، ایمرجنسی کے دوران عوامی تشہیر کے وسائل کے ناجائز استعمال پر ایک وہائٹ پیپر جاری کرنا۔ ایمرجنسی کے خلاف عوام کے ذریعہ حاصل ہوئی پرزور حمایت کے بعد ہندوستان کے عوام کو یہ جاننے کا اختیار تھا کہ پریس سنسرشپ کے سائے میں کتنے استحصال کیے گئے، کس طرح اسے قانونی ٹھہرانے کی کوشش کی گئی اور کیسے اس کی مخالفت کی گئی۔ لوگوں کو بہت کم معلومات تھیں کہ میڈیا کے ساتھ کیسا ناروا سلوک کیا گیا اور ان صحافیوں کو کس طرح پریشان کیا گیا جو ان کے سامنے گھٹنے ٹیکنے سے انکار کرتے تھے، لیکن

(گزشتہ کا بقیہ) نواسی سال کی عمر میں ایمرجنسی کے اعلان کے بعد 1975 میں انھیں سلاخوں کے پیچھے ڈال دیا گیا۔ ان کی بیوی سچیتا کرپلانی بھی ایک اہم کانگریسی لیڈر تھیں، جنھوں نے کئی مرکزی وزارت میں کام کیا اور اتر پردیش کی پہلی خاتون وزیر اعلیٰ بنیں۔

انھیں میڈیا پر ہوئے حملے کی شدت اور نقصانات کی جانکاری نہیں تھی۔ دراصل یہ شہریوں کے حقوق اطلاعات پر براہ راست ضرب تھی۔ اسے عوام کے سامنے ایک سرکاری اور گہرے ریسرچ کے ذریعہ پیش کیا جاسکتا تھا، اس لئے میں نے جلد ہی ایک خصوصی کمیٹی تشکیل دی، جس کی صدارت میری وزارت کے سابق سکریٹری نے کی۔ کمیٹی نے اپنا کام ریکارڈ وقت میں مکمل کرلیا اور میں نے اگست 1977 میں ایوان کے ٹیبل پر وہائٹ پیپر رکھا۔ اس میں درج حقائق واعداد وشمار چونکانے والے تھے۔

ایمرجنسی کے دوران 253 صحافیوں کو گرفتار کیا گیا۔ ان میں سے 110 کو 'میسا' کے تحت قیدی بنایا گیا۔ ہندوستان میں 29 غیر ملکی صحافیوں کے داخلہ کو ممنوع قرار دیا گیا، جن میں مارک ٹلی بھی شامل ہیں، جو بی بی سی کے انتہائی مقبول رپورٹر ہیں۔ حکومت نے 51 غیر ملکی صحافیوں کی منظوری رد کردی اور ان میں سے 7 کو باہر نکال دیا۔

تمام اخبارات اور خبررساں ایجنسیوں میں ایک 'سنسر' ہوتا تھا۔ ایک سرکاری افسران کے احاطہ میں بیٹھتا تھا۔ اپنے ہاتھ میں وہ لال پنسل رکھتا تھا اور تمام رپورٹ، اداریہ اور خصوصی مضمون پڑھتا تھا۔ کئی مرتبہ اشتہارات تک کی تفتیش کی جاتی تھی کہ اس میں کوئی پیغام تو نہیں شائع ہوا ہے۔ زیادہ تر سنسر یہ کام کرنے میں نااہل تھے اور اس لئے بغیر کسی سمجھ بوجھ کے لال پنسل کا استعمال کرتے تھے۔

ان کی حالت 'چوہے کو ملی کترن بن بیٹھا بزاز' جیسی ہوگئی تھی۔ ساتھ ہی ان میں بھی پیدائشی عدم تحفظ کا احساس گھر کرگیا تھا۔ ان دونوں وجوہات سے وہ ایڈیٹروں کو کمتر سمجھتے تھے۔ اپنے سیاسی آقاؤں کے لئے فکرمندی کا باعث ہونے والی کسی بھی چیز کی اجازت سے خوف زدہ یہ لوگ احتیاط سے کام کرتے تھے اور ہر اس چیز کو تکلیف دہ سمجھتے، جو انھیں سیاسی طور پر غلط اور خطرناک محسوس ہوتی تھی۔

ایمرجنسی لگانے اور پریس سنسرشپ لگانے کے فوراً بعد اندرا گاندھی نے اطلاعات ونشریات کی وزارت میں ایک اہم تقرری کی۔ اندر کمار گجرال (جو کہ 1997 میں ہندوستان کے وزیراعظم بنے) اندرا گاندھی کی رائے میں نہایت کم سخن اور ڈپلومیٹ تھے، جبکہ نئے حالات میں چالاکی کی ضرورت تھی، لہٰذا وہ اپنے پراعتماد سپہ سالار ودیا چرن شکلا کو سامنے لائیں۔ انھوں نے ایک سلسلہ وار طریقہ سے ہندوستان کی مشہور آزاد پریس کو کمزور بنانے کی مہم کا آغاز کیا۔ ایمرجنسی نافذ ہونے کے باوجود پریس کو پارلیمنٹ میں ہوئے بحث ومباحثوں کی رپورٹنگ کرنے کی آزادی تھی۔ متنازعہ طریقہ سے یہ ایک قانون کے سبب تھا، جو کہ فیروز گاندھی★ کی اپیل پر پیش ہوا تھا۔ قانون نے پارلیمانی کارروائی کی رپورٹوں کو کسی بھی طرح کی خلاف ورزی کے خلاف سیکورٹی فراہم کی ہوئی تھی۔ شکلا نے اندرا گاندھی کی ہدایت پر 1975 کے اواخر میں اسے رد کردیا۔

اخبارات کے سرکار حامی مالکوں اور ایڈیٹروں کی مدد سے — اور ایسے لوگوں کی کوئی کمی نہیں تھی — شکلا نے پریس کے لئے ایک نیا ضابطہ اخلاق بنایا اور نافذ کیا۔ اس پر 'انڈین ایکسپریس' کے چیف ایڈیٹر کے نرسمہن نے ایک سخت ردعمل دیا۔ وہ ایمرجنسی کے خلاف آواز بلند کرنے والے سب سے جرأت مند صحافیوں میں سے ایک تھے۔ نرسمہن نے اپنے کالم میں لکھا 'کیا یہ اتفاق ہی ہے کہ ضابطہ اخلاق میں کہیں بھی 'آزادی' لفظ کا استعمال نظر نہیں آتا۔' انڈین ایکسپریس کے مالک بلند ہمت رام ناتھ گوئنکا تھے، جو ایمرجنسی کے خلاف مضبوطی سے ڈٹے رہے۔ ایمرجنسی کے قبل سے ہی ان کی جو حکومت مخالف رائے تھی وہ بنی رہی اور حکومت نے گوئنکا کو اپنے راستہ پر لانے کے لئے ہر طرح سے پریشان

★ فیروز گاندھی (60-1912) ایک پارسی تھے، جنھوں نے 1942 میں اندرا گاندھی سے شادی کی۔ وہ کانگریس پارٹی کے لوک سبھا ممبر پارلیمنٹ کے طور پر 1952 اور 1957 میں منتخب ہوئے تھے۔ پارلیمنٹ میں وہ اکثر اپنے سسر کی حکومت کی مذمت کرتے تھے۔ انھیں ان کے ذریعہ بدعنوانی کے خلاف چلائی گئی مہم کے لئے یاد کیا جاتا ہے، جس کے نتیجہ میں اس وقت کے وزیر مالیات ٹی ٹی کرشن مچاری کو استعفیٰ دینا پڑا تھا۔

کیا۔ ایک کانگریس حامی صنعت کار کا استعمال کرتے ہوئے، جو ایک مدمقابل اخبار کا مالک تھا، انھوں نے ان سے 'انڈین ایکسپریس' کے مالکانہ حقوق چھیننے کی بھی کوشش کی۔ ان سب کا مضبوط ارادہ والے گوئنکا پر کوئی اثر نہیں پڑا اور وہ جے پرکاش نارائن اور ان کے جمہوریت نواز تحریک کی حمایت میں مضبوطی سے کھڑے رہے۔

دیگر لوگوں، جنھوں نے پریس کی آزادی کی مشعل ایمرجنسی کے دوران جلائی، ان میں سے کچھ اہم نام بی جی ورگیز، جنہیں فروری 1975 میں 'ہندوستان ٹائمز' کے ایڈیٹر کے عہدہ سے ہٹا دیا گیا۔ (میں نے یہ ایشو راجیہ سبھا میں اٹھایا)، سی آر ایرانی 'اسٹیٹس مین' کے ایڈیٹر، چنی بھائی وید 'بھومی پتر' (گجراتی میں شائع ہونے والا ایک جرنل) کے ایڈیٹر، میرے دوست اور ساتھی کے آر ملکانی ('آرگنائزر' اور مدر لینڈ کے ایڈیٹر) اور کئی غیر انگریزی اشاعتوں کے ایڈیٹر، جو سنگھ سے متاثر ہیں۔ مجھے خاص طور سے 'مین اسٹریم' میں سی ایل آر شاستری کے ذریعہ لکھا گیا مفکرانہ مضمون یاد آتا ہے، جس کا عنوان تھا 'آن سے انگ نو'۔ اس نے ملک میں ہاں میں ہاں ملانے والے لوگوں کی توسیع پر نوحہ کیا تھا اور نا کہنے والوں کی پرزور حمایت کی تھی۔ شاستری نے لکھا— 'آج کل اس طرح کے مضمون زیادہ نظر نہیں آتے ہیں۔' رائٹر اور پبلشر دونوں میں اس طرح کی مضمون نگاری کی ہمت ہونی چاہئے۔ اظہار رائے کی آزادی چار مخصوص آزادیوں میں سے اوّل ہے اور میرے خیال میں جتنا 'ہاں' کہنے کے خیال کی ستائش کی جاتی ہے، اتنا ہی 'نا' کہنے کے نظریہ کی بھی ستائش کی جانی چاہئے۔ میں آگے بڑھ کر مضبوطی سے کہنا چاہوں گا کہ 'نا' کہنے کی ستائش 'ہاں' کی مناسبت میں زیادہ کی جانی چاہئے۔ میرے لئے 'نا' موسیقیت ہے، اپولو کی وینا کی طرح۔'

میں 'شنکرس ویکلی' کو کیسے بھول سکتا ہوں، جس کا قیام آنجہانی کیشو شنکر پلئے نے کیا تھا۔ وہ سیاسی کارٹون اور مزاحیہ تصویر بنانے میں ماہر تھے۔ اس مقبول میگزین نے سبھی کی نقل اتاری، لیکن کسی نے بھی شکایت نہیں کی، کیونکہ شنکر اپنے فن کا استعمال اچھی طرح سے بغیر کسی غلط جذبہ کے ساتھ کرتے تھے۔ پنڈت نہرو نے ایک مرتبہ عوامی اجلاس میں ان سے کہا تھا 'مجھے مت چھوڑنا شنکر، مجھ پر بھی زوردار حملہ کرنا۔' لیکن شنکر ایمرجنسی سنسر سے نہیں بچ سکے۔ میں نے اپنی جیل ڈائری میں 31 راگست 1975 کو لکھا— 'شنکرس ویکلی' نے اسے بند کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ آخری شمارہ میں اداریہ کا عنوان تھا 'رخصتی'۔ اداریہ میں 'ایمرجنسی' لفظ کو جگہ نہیں دی گئی تھی، لیکن ایمرجنسی پر اس سے زیادہ خطرناک الزام نہیں ہو سکتا تھا۔ شنکر نے اپنے اداریہ میں لکھا تھا 'اپنے پہلے اداریہ سے ہم نے یہ طے کیا تھا کہ ہمارا کام اپنے قارئین کو سفید پوش لیڈروں، دھوکہ بازوں اور کمزوروں پر ہنسانا ہے، لیکن صرف وہی لوگ طنز و مزاح کو فروغ دے سکتے ہیں جو اخلاقی اقدار کے پاسبان ہوں اور جن میں صبر و ہمدردی کا جذبہ ہو۔ تاناشاہی طنز و مزاح کو سہن نہیں کر سکتی، کیونکہ لوگ تاناشاہ پر ہنس سکتے ہیں اور یہ وہ برداشت نہیں کر سکتے۔ ہٹلر کے دور اقتدار میں کوئی بھی اچھا طنز، اچھا کارٹون یا اچھا مزاح اور اچھی نقل نہیں تھی۔'

سنجیدہ و دانشورانہ بحث کے لئے وقف ایک مقبول عام ماہنامہ 'سیمنار' کے گاہک کے طور پر مجھے 23 رجولائی 1976 کو ایک خط موصول ہوا، تب میں جیل میں تھا۔ اس کے ایڈیٹر رومیش تھاپر نے لکھا تھا 'سیمنار کا کوئی اور شمارہ شائع کرنا اب ممکن نہیں ہے۔ 16 رجولائی کو صبح ہمارے ماہنامہ پر سنسرشپ تھوپ دی گئی۔ اس کا مطلب ہے کہ سنسر کے پاس ان دانشوروں اور ماہرین تعلیم کے تجزیوں اور خیالات میں کاٹ چھانٹ کرنے کا اختیار ہوگا، جو کہ مفکرانہ بحث و مباحثہ پر مبنی ہے، اپنے اظہار رائے کے حق کی اس طرح خود سپردگی نہیں کی جا سکتی۔'

اس طرح کے بے خوف صحافیوں اور دانشوروں نے بڑا خطرہ اٹھا کر ایمرجنسی کے دوران پریس کی آزادی کی مشعل کو جلائے رکھا، لیکن بدقسمتی سے ان کی تعداد خصوصاً جرأت مند میڈیا مالکوں کی تعداد کافی کم تھی—

'جھکنے کے لئے کہا تو بیشتر رینگنے لگے'

وزارت اطلاعات ونشریات میں اپنے ابتدائی دنوں میں میں نے نئی دہلی میں انڈین اینڈ ایسٹرن نیوز پیپر سوسائٹی کی عمارت میں ایڈیٹروں، بیورو چیف اور مختلف میڈیا تنظیموں سے منسلک سینئر رپورٹروں کی ایک میٹنگ طلب کی۔ میں نے ان سے کہا کہ ایمرجنسی کے دوران کے اپنے تجربات کو آزادانہ طریقہ سے ظاہر کریں۔ بس، اس کے بعد شکایتوں اور پریشانیوں کا سیلاب آ گیا کہ کیسے انھیں حکومت کی رائے ماننے کے لئے مجبور کیا گیا اور دباؤ ڈالا گیا۔ ان کی بات سننے کے بعد میں نے اپنی رائے رکھی۔ یہ ایک ایسی بات تھی، جو میں نے کئی جگہوں پر دوہرائی:

> ''سماج کے تین طبقے ایمرجنسی سے براہ راست متاثر تھے۔ سیاسی کارکنان، صحافی اور قانون برادری، میری سب سے بڑی امید اپوزیشن پارٹیوں کے سیاسی کارکنان سے تھی۔ میں اپنے نظریاتی پریوار کی دکھائی گئی مخالفتوں سے مطمئن تھا، لیکن کل ملا کر اپوزیشن کا ریکارڈ مایوس کن تھا۔ ہمیں مزید جوش وجدوجہد سے کام لینا چاہئے۔ جہاں تک صحافیوں کا تعلق ہے وہ پیشہ ور ہوتے ہیں۔ سیاسی کارکنان کے لئے سیاست ایک مشن ہے۔ یہ اصول صحافیوں پر نافذ نہیں ہوتا ہے۔ ان سے صرف پیشہ کے تئیں ایماندار رہنے کی امید کی جاتی ہے، لیکن میں اس حقیقت سے مایوس ہوں کہ جہاں حکومت نے آپ کو صرف جھکنے کے لئے کہا، وہاں آپ رینگنے کے لئے تیار ہو گئے۔''

میں نے یہ بھی کہا کہ ایمرجنسی سے متاثر تیسرے طبقے (قانونی پیشہ وروں) نے خود کو سب سے بہتر طریقہ سے ثابت کیا۔ وکلا سے زیادہ عدلیہ کا جرأت مند طبقہ اس زخم سے کامیابی سے ابھرا کہ ملک کو ان پر ناز ہے۔ ساتھ ہی میٹنگ میں میں نے کہا کہ حکومت برطانیہ کے دور میں کسی بھی وکیل کو قیدی نہیں بنایا گیا، کیونکہ وہ کسی اور کو بچانے میں مصروف ہوتے تھے، جو حکومت کے خلاف متحرک ہوتے تھے۔ ایسا تو انقلابی بھگت سنگھ کے معاملہ میں بھی نہیں ہوا، جنھیں پھانسی کی سزا سنائی گئی، لیکن ایمرجنسی کے دوران بنگلور میں ہمارے وکیل ایم راما جائس کو 'میسا' کے تحت گرفتار کر لیا گیا۔ ان کا جرم بس اتنا تھا کہ وہ ہمارا کیس لڑ رہے تھے۔ میں نے کہا 'ہندوستان میں پریس کو ایک پاسبان، ایک ٹیچر اور ایک سماج سدھارک ہونا چاہئے۔ اسے یہ تمام کردار ایک ساتھ نبھانا چاہئے۔' بعد میں میں نے اسے تفصیل سے 'ہندوستان میں پریس کی آزادی کا اعلان' میں درج کیا۔ یہ رپورٹ میں نے سرکاری طور پر نومبر 1977 میں جاری کی۔

ایمرجنسی کے قانونی ڈھانچہ کی انہدامی

جہاں تک ہندوستانی میڈیا پر ایمرجنسی کی نفرت انگریز وراثت کے اثر کا سوال تھا، میں اسے بالکل پاک کر دینا چاہتا تھا۔ مرارجی ڈیسائی نے مجھے پورا تعاون دیا۔ وزیراعظم کے طور پر اپنی پہلی ہی پریس کانفرنس میں انھوں نے پریس کو بغیر خوف وخطر، سنسرشپ ختم کئے جانے کا انتظار کئے بغیر بے باک رہنے کے لئے کہا۔ وزیر اطلاعات ونشریات کے طور پر میرا اہم کام یہ دیکھنا تھا کہ ایمرجنسی کے دوران پریس پر لگائی گئی تمام پابندی اور کنٹرول ہٹا لیے گئے ہیں یا نہیں۔ اس کے لئے میں نے تین اہم اقدامات کئے۔ سب سے پہلے، پریس سنسرشپ کے لئے جاری کی گئی تمام ہدایات واپس لینا، مثال کے طور پر جیل میں بند لوگوں کے نام اور تعداد کی اشاعت پر مضحکہ خیز حکم امتناعی نافذ تھی، ایسی تمام پابندیاں ہٹالی گئیں۔ ساتھ ہی کئی قانون میں بھی ترمیم کی گئی۔ نئی حکومت بننے کے پندرہ روز کے اندر لوک سبھا میں دو بل پیش کیے گئے۔ ایک میں قابل اعتراض مواد کی اشاعت سے بچاؤ بل کو رد کرنا، دوسرے کا مقصد تھا پارلیمانی کارروائی (اشاعت کا تحفظ) بل، جسے عموماً 'فیروز گاندھی بل' کے طور پر جانا جاتا تھا، اسے حسب حال قائم کرنا۔ یہ دونوں بل انتہائی جوش کے ساتھ پیش کیے گئے۔

ایمرجنسی دور کے سخت قوانین کو رد کرنے کے قانون کو لوک سبھا میں پاس کرانا مشکل نہیں تھا، جہاں پر جنتا پارٹی اور اس کے حلیفوں کی اکثریت 364 سیٹیں تھیں، لیکن راجیہ سبھا میں جنتا پارٹی کی صرف 26 سیٹیں تھیں۔ ہمارے حلیفوں کو ملا کر بھی صرف ہمارے 36 ممبران پارلیمنٹ تھے۔ جب مرار جی بھائی نے مجھے راجیہ سبھا میں ایوان کا لیڈر بنایا تب میرے دل میں کافی گھبراہٹ تھی کہ میں کیسے جمہوریت مخالف التزامات کو ختم کرنے کے لئے ضروری بلوں کو پاس کرواسکوں گا۔ مجھے خود تعجب ہوا کہ مجھے اپنے کام میں کافی کم رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا۔ شاید ایسا اس لئے تھا کہ کانگریسی خیمہ الیکشن کے بعد ہوئی شکست سے پوری طرح مایوس ہو چکا تھا یا پارٹی قیادت کو چھوڑ کر پوری کانگریس کو شرمندگی اور پچھتاوے کا احساس ہو رہا تھا۔ ہمیں ایمرجنسی کے دوران کی گئی قانونی زیادتیوں کو دور کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ اس میں سب سے زیادہ قابل اعتراض 42ویں آئینی ترمیم بھی تھی۔

42ویں ترمیم کو ختم کر کے آئین کا تحفظ

ایمرجنسی کے دوران کی گئی تمام آئینی ترمیمات میں سے 42ویں ترمیم 1976، سب سے زیادہ متنازعہ تھی۔ اپنے دائرہ اور اہمیت میں یہ تقریباً آئین کے بنیادی ڈھانچہ تبدیل کرنے کے مساوی تھا۔ آئین کے تقریباً تمام حصوں میں اس ترمیم کے توسط سے تبدیلی کی گئی تھی۔ جنتا پارٹی حکومت کی ایک اہم حصولیابی آئین کی برتری اور پاکیزگی کو 44ویں ترمیمی بل کے توسط سے از سر نو قائم کرنا تھا۔ اسے 1978 میں وزیر قانون شانتی بھوشن نے پیش کیا، جنھوں نے ایمرجنسی کا بے خوف مقابلہ کیا تھا۔ اس ترمیم کے توسط سے سب سے اہم تبدیلی یہ لائی گئی کہ مقننہ سے داخلی تنازع کا سبب بتا کر ایمرجنسی نافذ کرنے کا اختیار چھین لیا گیا تھا۔ اپنے مقاصد اور وجوہات کی رپورٹ میں بل نے یہ یقینی بنایا کہ دفعہ 352 کے تحت ایمرجنسی کا اعلان حقیقت میں آئین میں ترمیم کے مساوی ہے۔ اس میں اس مدت کے دوران ریاستی نظام قائم ہو جاتا ہے، جس میں شہری اپنے بنیادی حقوق کو نافذ کروانے کے لئے عدالت میں نہیں جاسکتے۔ ان کی زندگی اور آزادی کے حق کو سلب کر دیئے جاتے ہیں، اس لئے یہ یقینی کرنے کے لئے کہ اس اختیار کا صحیح استعمال ہو اور اس کا غلط استعمال نہ کیا جاسکے، سیکورٹی پیمانہ ہونا لازمی ہے۔ اس کے لئے یہ تجویز دی گئی کہ ایمرجنسی کا اعلان تبھی ہو جب ہندوستان کی سیکورٹی اور اس کے خطہ کے کسی حصہ پر جنگ یا باہری حملہ یا فوجی بغاوت کا خطرہ ہو۔ داخلی انتشار، جو کہ فوجی بغاوت جیسا نہ ہو، کو ایمرجنسی نافذ کرنے کی وجہ نہیں مانی جائے گی۔

جس طرح سے صدر جمہوریہ فخر الدین علی احمد نے وزیر اعظم اندرا گاندھی کو خوش کرنے کے لئے اپنے من مطابق اور خاموش رضامندی سے ایمرجنسی کا اعلان بغیر کابینہ کے ذریعہ رسمی تجویز کے دستخط کر دیئے تھے، اسے روکنے کے لئے اس بل میں تجویز دی گئی تھی۔ ایمرجنسی کا اعلان صرف کابینہ کے ذریعہ تحریری صلاح و مشورہ کی بنیاد پر ہی کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ ایمرجنسی کا نفاذ حقیقت میں آئینی ترمیم کے مساوی ہے، اس لئے یہ التزام کیا جاتا ہے کہ اعلان نامہ کو پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں میں منظوری حاصل کرنی ہوگی۔ اس کے لئے اتنی ہی اکثریت کی ضرورت ہوگی جتنی آئین میں ترمیم کرنے کے لئے ضروری ہے اور اس طرح کی منظوری کو ایک ماہ کی مدت کے اندر حاصل کرنا ہوگا۔ ایسا کوئی بھی اعلامیہ صرف 6 ماہ کی مدت کے لئے ہوگا اور اسے آگے جاری رکھنے کے لئے اسی اکثریت کے ساتھ تجویز پیش کرنی ہوگی۔ اس اعلامیہ کو اس حالت میں روک دیا جائے گا۔ اگر لوک سبھا کے ذریعہ اعلامیہ کو جاری رکھنے سے غیر رضامندی کا اظہار کرنے کی تجویز پیش کر دی جائے۔ لوک سبھا کے 10 فیصد یا اس سے زائد ممبران اعلامیہ کو نامنظور کرنے کی تجویز پر غور کرنے کے لئے ایک خصوصی میٹنگ بلانے کی اپیل کر سکتے ہیں۔

کسی بھی طرح کے امکانات سے یہ جمہوریت کے تحفظ کے لئے سب سے بہتر آئینی محافظ ثابت ہوا۔

ایک عام بل کے معاملہ میں اگر یہ راجیہ سبھا میں پاس نہیں ہوتا، تو اسے پارلیمنٹ میں ایوانوں کے مشترکہ سیشن میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ آئینی ترمیم کے معاملہ میں دونوں ایوانوں میں علیحدہ علیحدہ مجوزہ بل کو پیش کرنا ہوتا ہے۔ وہ بھی خصوصی اکثریت کے ساتھ، راجیہ سبھا میں کمزور ہونے کے باوجود ہم ہیرو پرست قانونی ڈھانچہ، جو ایمرجنسی کے دوران قائم کیا گیا تھا، کو گرانے میں کامیاب رہے۔ یہ یقیناً جنتا پارٹی حکومت کی ایک اہم حصولیابی تھی۔

اس وقت لوک سبھا میں اپوزیشن کے لیڈر یشونت راؤ چوہان تھے اور راجیہ سبھا میں ان کے ہم منصب ایک سینئر کانگریسی لیڈر کملاپتی ترپاٹھی تھے۔ جب بھی کملاپتی جی کے پاس ایمرجنسی مخالف بل کی تجویز لے کر جاتا تھا، وہ اپنا ہاتھ ہلاتے اور کہتے 'ارے بھائی، آپ کو جو کرنا ہے کرو، ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔'

میں یہ بھی دکھانا چاہتا تھا کہ آکاش وانی اور دوردرشن اب حکومت یا برسر اقتدار پارٹی کی تشہیر کے وسائل نہیں رہ گئے ہیں، لہٰذا نئے وزیر اعظم کے ذریعہ قوم کے نام رسمی خطاب کے اگلے دن میں نے لوک سبھا میں اپوزیشن کے لیڈر کو طلب کیا اور آکاش وانی اور دوردرشن کے توسط سے ملک میں ان کے خیالات نشر کئے جانے کی اجازت دی۔ ان تنظیموں کا اعتماد حاصل کرنے کے لئے میں نے ان کے ایڈیٹروں اور پروڈیوسروں کو ہدایت دی کہ وہ حکومت کی دخل اندازی کے بغیر آزادانہ طور پر کام کر سکتے ہیں، لیکن صرف ایک شرط ہوگی کہ ان کے پروگرام غیر جانبدارانہ، قیاس آرائیوں سے مبرا اور متوازن ہوں۔ پہلی مرتبہ تمام قومی اور ریاستی سطح کی سیاسی پارٹیوں کو انتخابی مہم کے تحت اپنی اپنی اپیل نشر کرنے کی اجازت فراہم کی گئی۔ اس کے لئے تمام پارٹیوں کو یکساں وقت دیا گیا۔ میں یہاں یہ ذکر کرنا چاہوں گا کہ میں نے خاص طور سے آکاش وانی اور دوردرشن کی ادارہ جاتی خودمختاری پر سنجیدہ بحث کی اپیل کی۔ اس مقصد سے بی جی ورگیز کی قیادت میں ایک ورکنگ کمیٹی کی تشکیل کی گئی۔ پرسار بھارتی کا التزام، جو کہ ان دنوں میڈیا تنظیموں کو ایک خودمختار کونسل کے ذریعہ چلائے جانے کے لئے تھی، وہ اسی کمیٹی کی سفارش تھی۔ میں نے پارلیمنٹ میں 1977 میں پرسار بھارتی (ہندوستانی نشریات کونسل) بل پیش کیا۔ یہ راجیہ سبھا میں پاس نہیں ہوسکا، کیونکہ ایوان میں کانگریس کی اکثریت تھی اور وہ اس کے حق میں نہیں تھی۔

اپنے دور اقتدار کے میں میں نے گزشتہ حکومت کے تمام سخت فیصلوں کو ختم کردیا، جو پریس کو پریشان کرتے تھے، لہٰذا ان تمام اخبارات کے ساتھ انصاف کیا گیا، جن کا نیوز پرنٹ کوٹہ اور سرکاری اشتہارات کم کردیئے گئے تھے اور صحافیوں، جن کی منظوری ختم کردی گئی تھی۔ ان منظور شدہ صحافیوں کو رہائشی سہولت پھر سے فراہم کی گئی۔ ایمرجنسی کے دوران کئی روزنامہ،، ہفت روزہ اور ماہنامہ کی اشاعت روک دی گئی تھی۔ میں نے وزارت کے افسروں کو ہدایت دی کہ وہ تمام معاملوں کو دیکھیں اور اسے درست کریں۔ میڈیا پیشہ وروں کے ساتھ اپنی بات چیت میں میں نے زور دیا کہ پریس کی آزادی کا مطلب مالک کی آزادی نہ ہوکر ایڈیٹر اور دیگر صحافیوں کی آزادی ہے۔

گزشتہ حکومت کے ایک ناکام قدم میں 4 آزاد خبر رساں ایجنسیاں — یو این آئی، پی ٹی آئی، ہندوستان سماچار اور سماچار بھارتی، جسے ملا کر ایک ایجنسی 'خبر' بنانا شامل تھی۔ اس نے ان ایجنسیوں میں کام کررہے صحافیوں اور ان کے گاہک اخبارات میں رنجش کو جنم دیا۔ میں نے کلدیپ نیر کی قیادت میں 'سماچار' کے مستقبل کی تفتیش کرنے کے لئے ایک کمیٹی تشکیل دی۔ اس کی سفارشات کے مطابق چار آزاد خبر رساں ایجنسیوں کو پھر سے الگ الگ کرنے کا اعلان کیا۔ یہ پورا عمل شفافیت سے بھرا تھا، جس میں حکومت کی دخل اندازی صفر کے برابر تھی اور میڈیا

برادری کی پوری حصہ داری تھی۔ فطری طور پر آخری فیصلہ کا سبھی کے ذریعہ خیر مقدم کیا گیا۔

اس اصلاح کی کارروائی کے ایک حصہ کے طور پر میری وزارت نے پریس کونسل آف انڈیا کی از سرِ نو تشکیل کی، جسے ایمرجنسی کے دوران بند کر دیا گیا تھا۔ برسر اقتدار پارٹی کے اٹوٹ دوستوں کی جگہ پر میں نے پریس کونسل میں ان ممبروں کو نامزد کیا، جنھیں ان کی پیشہ وارانہ قابلیت اور آزادی کے لئے جانا جاتا تھا۔ یہاں میں بتانا چاہوں گا کہ میری پارٹی کے کچھ لوگوں نے ہی نکھل چکرورتی کے انتخاب پر سوال کھڑے کئے تھے 'آپ انھیں پریس کونسل میں کیسے نامزد کر سکتے ہیں؟ کیا وہ لیفٹسٹ نہیں ہیں؟' میں نے کہا 'ان کا لیفٹسٹ ہونا نہ تو کوئی قابلیت ہے اور نہ ہی نااہلیت۔ جہاں تک میرا تعلق ہے، میں ان کا ایک صحافی کے طور پر احترام کرتا ہوں اور خاص طور سے اس لئے، کیونکہ انھوں نے ایمرجنسی کے خلاف آواز اٹھانے کی ہمت کی تھی۔'

جب میں نے وزارت اطلاعات ونشریات کی ذمہ داری سنبھالی، تب ایک دلچسپ واقعہ رونما ہوا۔ مرار جی ڈیسائی کے وزیر اعظم بننے کے بعد انھوں نے مرکزی حکومت کے تمام سکریٹریوں کا ردو بدل کیا۔ اس کے لئے انھوں نے متعلقہ وزراء سے بات چیت کی۔ ایسا اس بنیاد پر کیا گیا تھا کہ بہت سے نوکرشاہوں نے جانے انجانے ایمرجنسی حکومت کے ذریعہ اپنے آپ کے غلط استعمال ہونے کی اجازت دی تھی۔ وزارت اطلاعات ونشریات کے سکریٹری ایک مسلم افسر تھے، جن کا نام برنی تھا۔ ایک دن نرمل مکھرجی، جو سول سروس کے ایک ایماندار افسر تھے، جنھیں نیا کابینہ سکریٹری منتخب کیا گیا تھا، نے مجھ سے کہا 'وزیر اعظم نے مجھ سے یہ پتہ لگانے کے لئے کہا ہے کہ کیا آپ اپنی وزارت کے سکریٹری کو بدلنا چاہتے ہیں؟' میں نے پوچھا 'کیوں؟'

انھوں نے کہا 'وزیر اعظم کو محسوس ہوتا ہے کہ آپ صرف اس لئے جھجک رہے ہیں، کیونکہ وہ مسلم ہیں۔' مکھرجی نے جواب دیا۔

یہ سچ ہے کہ برنی اس وقت حکومت ہند کے تنہا مسلم سکریٹری تھے، حالانکہ میں نے مکھرجی کو بتایا کہ 'میں انھیں اپنی وزارت سے باہر کیوں کرنا چاہوں گا، صرف اس لئے کہ وہ ایک مسلم ہیں؟ مجھے کوئی اطلاع نہیں ہے کہ انھوں نے ایمرجنسی کے دوران غیر جانبدارانہ کام کیا ہے۔ یقینی طور پر یہ الگ بات ہے کہ اگر کوئی تصدیق شدہ اطلاع ملتی ہے، جس سے معلوم ہو کہ گزشتہ 2 سالوں میں انھوں نے پیشہ ور جانبداری سے کام کیا ہے۔' بات وہیں رہ گئی۔

کچھ ہفتہ بعد کے کے داس، جنھیں میں نے اس کمیٹی کا سربراہ بنایا تھا، جو ایمرجنسی کے دوران عوامی رابطہ کے وسائل کے ناجائز استعمال کے سلسلہ میں وہائٹ پیپر تیار کر رہی تھی، میرے پاس ایک موٹی فائل لے کر آئے۔ انھوں نے بتایا کہ 'سر، اس میں اطلاع ہے کہ حال کے کچھ برسوں میں آپ کی وزارت کے سکریٹری نے کس طرح کام کیا ہے۔' مجھے یہ جان کر حیرانی ہوئی کہ سکریٹری نے اندرا گاندھی کی تعریف میں نظمیں لکھیں اور انھوں نے وزارت کے لوگوں کو ہدایت دی کہ وہ حکومت کے ایمرجنسی تشہیر کے سلسلہ میں پوری مدد دیں۔ میں نے فوراً کابینہ سکریٹری سے رابطہ کیا اور برنی کی منتقلی کے لئے مشورہ مانگا۔

فلمی دنیا سے میرا تعارف

ہندوستان میں فلم صنعت ہمیشہ آزاد رہی ہے، لیکن وزارت اطلاعات ونشریات اس میں خصوصی دخل اندازی سنسر بورڈ کے توسط سے کر سکتا ہے، جو فلموں کو عوام کو دکھائے جانے کی منظوری فراہم کرتا ہے۔ یہ وزارت کے تحت کام کرتا ہے۔ ایمرجنسی حکومت نے اس صنعت کی بھی

تکمیل کرنے کی کوشش کی۔

ہندی فلم 'قصہ کرسی کا' ایک مشہور معاملہ ہے۔ یہ کہانی ایک بدعنوان اور برے لیڈر کی ہے، جس پر ایمرجنسی حکومت نے پابندی عائد کر دی تھی۔ اس کے تمام پرنٹوں کو ضبط کر لیا گیا تھا۔ فلموں کی سمجھ اور 60 کی دہائی میں 'آرگنائزر' میں اپنے کام کے دوران فلم تجزیہ نگار ہونے کے سبب میں نے فلمی دنیا کے مسائل، ضرورتوں اور امیدوں کو جاننے میں گہری دلچسپی لی۔

اگست 1947 میں میں نے فلمی صنعت کے ترجمانوں کے سامنے ایک روادار پالیسی کا خاکہ پیش کیا، جو کہ سنسر بورڈ کے فیصلہ کے خلاف اپیل سننے کی حکومت کے قانونی اختیار کو کم کرتا تھا۔ فلموں میں تشدد اور فحاشی کی نمائش روکنے کے لئے کسی باہری اکائی کے قیام کے خلاف میں نے صنعت کے ذریعہ خود کے اصول پر زور دیا۔ صنعت کے مطالبہ کے ردعمل کے طور پر میں نے ایمرجنسی کے دوران بیرون ممالک میں فلموں کی شوٹنگ پر لگی پابندی کو ختم کیا۔ دس برس پرانی فلموں کو پھر سے سرٹیفکیٹ دینے کے اصول کو بھی رد کر دیا گیا۔

بمبئی کے اپنے ایک دورہ میں میں نے مشہور و مقبول فلم ڈائریکٹروں، پروڈیوسروں اور اداکاروں کی ایک میٹنگ منعقد کی۔ دیگر چیزوں کے علاوہ میں نے ان سے ہمارے مہا کاویوں 'رامائن' اور 'مہابھارت' پر مبنی فلم بنانے کی اپیل کی۔ میں بچپن سے ہی فلموں کا شوقین رہا ہوں۔ میں نے ان سے کہا 'مجھے لگتا ہے، بائبل کی کہانی پر مبنی بہترین ہالی ووڈ فلم ایک تجربہ کار ڈائریکٹر سیسل بی ڈیمل نے بنائی ہے، جنھوں نے سب سے زیادہ کامیاب فلم 'دی ٹین کمانڈمینٹس' بھی بنائی ہے۔ اس فلم میں ہالی ووڈ کے بہترین اداکاروں نے کام کیا ہے۔ میں نے یہ بھی کہا کہ ہمارے پاس ہمارے مہا کاویہ اور دیگر ہم عصر اہمیت کی قدیم داستانوں میں کبھی نہ ختم ہونے والا خزانہ ہے۔ پھر بھی، ان پر ابھی تک بنی فلمیں معمولی رہی ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ہم سمجھ نہیں پا رہے ہیں کہ ان کہانیوں کا ہندوستانی دل پر کتنا گہرا اثر پڑے گا۔ ان کہانیوں پر بنی اچھی فلمیں نہ صرف آرٹ کے لئے کارآمد ہوں گی بلکہ پیشہ وارانہ نظریہ سے بھی مفید ہوں گی۔

میں نے اس وقت جو کہا تھا، اس کی سچائی ہندوستان میں 1980 کی شروعات میں کیبل ٹی وی کے آنے سے ثابت ہوئی۔ رامانند ساگر کا ٹی وی سیریل 'رامائن' سنگ میل ثابت ہوا۔ جب اتوار کی صبح دوردرشن پر اس کو نشر کیا جاتا تھا تب پورا دیش سارے کام چھوڑ کر اسے دیکھنے بیٹھ جاتا تھا۔ صرف کچھ لیفٹ دانشوروں نے اعتراض کیا تھا کہ حکومت 'رامائن' جو ایک ہندو مذہبی صحیفہ ہے، کی نشریات قومی ٹیلی ویژن پر کیوں کر رہی ہے۔

مجھے اس سیریل کی مقبولیت کا حیرت انگیز احساس تب ہوا، جب میں رات کی ریل گاڑی سے بھوپال سے دہلی جا رہا تھا۔ ریل گاڑی کو صبح 7 بجے پہنچنا تھا اور وہ ایک گھنٹہ تاخیر سے چل رہی تھی۔ میں نے ایک ریل ملازم سے پوچھا 'اور تاخیر ہوگی؟' اس کا جواب تھا 'فکر مت کیجئے، ڈرائیور کو بھی 'رامائن' دیکھنا ہے، اس لئے ضرور جلدی پہنچائے گا'۔

اس مدت کے دوران کئی فلمی ہستیوں سے میرا تعارف ہوا۔ ان میں راج کپور، دیو آنند، منوج کمار، مالا سنہا، میوزک ڈائریکٹر جے دیو اور گلوکارہ پناج مسانی۔ مجھے خاص طور سے عظیم فلم پروڈیوسر ستیہ جیت رے سے ملاقات کا موقع ملا، جن کی حقائق پر مبنی اور انتہائی جذباتی بنگالی فلموں نے پہلے ہی بین الاقوامی شہرت حاصل کر لی تھی۔ میں نے ان کی تقریباً تمام فلمیں دیکھیں اور ان کے کام کی بھرپور ستائش کی۔ ان کی فلم سے میری آشنائی کا قصہ بے حد دلچسپ ہے۔ 1956 یا 1957 میں میں بھارتیہ جن سنگھ کی ایک میٹنگ میں حصہ لینے کے لئے کولکاتہ گیا تھا، جس میں پارٹی کے سبھی سینئر لیڈران موجود تھے۔ میٹنگ کے آخری دن مقامی کنوینروں نے لیڈروں سے ستیہ جیت رے کی فلم 'پاتھور پنچالی' دیکھنے کی تجویز رکھی، جو حال ہی میں ریلیز ہوئی تھی۔ میرے بیشتر ساتھیوں نے کہا کہ ارے بھئی، ہم تو بنگالی نہیں سمجھیں گے، پھر بھی انھوں نے فلم دیکھنے کا

تہیہ کرلیا۔ تب میں بھی بنگالی نہیں جانتا تھا، لیکن جب ہم فلم دیکھ کر باہر آئے تو میں فلم کی عالمی انسانی اقدار سے متاثر ہو کر بولا 'یہ اب تک بنی سب سے عظیم ترین فلموں میں ایک ہوگی۔' مجھے کافی خوشی ہوئی جب اس نے کئی قومی اور بین الاقوامی ایوارڈ حاصل کئے۔ (2005 میں اسے 'ٹائم' میگزین کی ہم عصر 100 فلموں کی فہرست میں شامل کیا گیا۔)

بعد میں میں نے اپنے بارے میں سوچا کہ مجھے اچھی فلموں کی سمجھ ہے۔ یہی ایک وجہ تھی کہ میں نے اپنی خواہش سے 'آرگنائزر' میں فلم تجزیہ کار کا کام کرنا پسند کیا۔ میں نے یہ واقعہ ستیہ جیت رے کو وزیر اطلاعات ونشریات کے طور پر گوش گزار کیا، جب میں نے دہلی میں 'پاتھور پنچالی' کی خصوصی اسکریننگ کا انعقاد کرایا۔

یادگار بیرونی دورہ

وزیر اطلاعات ونشریات کے طور پر میرا پہلا بیرونی دورہ 1977 میں ماسکو میں منعقد ماسکو فلم میلہ میں شرکت کے سبب ہوا۔ اس وقت اندر کمار گجرال سوویت یونین میں ہمارے سفیر تھے۔ ایمرجنسی کے دوران اور اس سے قبل کے برسوں میں ماسکو کے کیونسٹ حکمرانوں نے کانگریس کی پرزور حمایت کی۔ انھوں نے کانگریس کے شدید نکتہ چیں جے پرکاش نارائن اور ان کے حامیوں کی سخت مذمت بھی کی۔ ماسکو کے ذریعہ واضح طور پر ہندوستان کے داخلی معاملوں میں دخل اندازی براہ راست شامل تھی، جب انھوں نے جے پی تحریک پر فاشزم کا لیبل چسپاں کردیا۔ میری سرکاری میٹنگ سے قبل ہوئی بریفنگ میں گجرال نے مجھے بتایا کہ جنتا پارٹی کی جیت اور کانگریس کی شکست سے یو ایس ایس آر کے حکمرانوں کو گہرا دھچکا لگا ہے۔ وہ درست تھے، ماسکو کے ساتھ میری تمام سرکاری میٹنگوں میں مجھے صاف نظر آرہا تھا کہ وہ کچھ زیادہ ہی اپنی غلطی محسوس کررہے ہیں اور جلد ہی تعلقات سنوارنا چاہتے ہیں۔

1978 میں میں کیونسٹ کے زیر اقتدار مشرقی جرمنی★ کے دورہ پر گیا، اسے اس وقت 'جرمن ڈیموکریٹک ریپبلک' کے نام سے جانا جاتا

★ یہاں پر میں اپنے پہلے دورہ کا دلچسپ قصہ سناتا ہوں۔ 1970 میں ایک پارلیمانی وفد کے ممبر کے طور پر ہم ایک دیگر کیونسٹ زیر اقتدار ملک میں گئے، جو سوویت گروپ کا ایک حصہ چیکوسلواکیہ تھا۔ 1968 میں سوویت یونین نے وہاں پر اصلاح پسند لیڈر الیگزنڈر ڈوبچک کے ذریعہ چلائی جارہی جمہوری اصلاحات کو فوجی حملہ سے روک دیا۔ زوردار تشہیری مہم کے باوجود سوویت حملہ کے بعد سب کچھ درہم برہم ہی تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ لوگ غصہ اور اداسی کی حالت میں ہیں۔ ایک دولسانی، جسے ہمارے وفد کی مدد کے لئے رکھا گیا تھا اور اچھی ہندی بول سکتا تھا، میرے پاس آیا۔ تب میں اکیلا تھا، وہ بولا 'کیا آپ جن سنگھ سے ہیں؟' میں نے کہا 'ہاں' وہ گویا ہوا 'میں آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں، لیکن میں ہوٹل میں ایسا نہیں کرسکتا۔ برائے مہربانی آپ میرے باس سے کہیں کہ آپ کچھ خریداری کرنا چاہتے ہیں اور آپ کو ہندی بولنے والے دولسانی شخص کی ضرورت ہے۔ وہ مجھے آپ کے ساتھ بھیج دیں گے۔' میں نے ویسا ہی کیا، جیسا اس نے مجھ سے کہا تھا۔ جب ہم بازار پہنچے، تب اس نے کہا 'میں آپ سے اس لئے بات کرنا چاہتا ہوں، کیونکہ ہندوستان میں آپ کی تنہا پارٹی ہے، جس نے سوویت یونین کے ذریعہ ہمارے ملک پر حملے کی مذمت کی ہے۔ مجھے ہندوستان پر اور آپ کی پارٹی پر فخر ہے، کیونکہ یہ ایک جمہوری ملک ہے۔ میں آپ کو اور ہندوستان کے لوگوں کو بتانا چاہتا ہوں کہ چیکوسلواکیہ میں حالات بالکل اچھے نہیں ہیں۔ یہاں انتہائی غصہ ہے، لیکن سوویت ٹینکوں کی موجودگی کے سبب خوف بھی ہے۔' میں نے پوچھا 'بیرونی تسلط کی عوامی مخالفت کیوں نہیں کی جارہی۔' اس کا جواب دوررس تھا 'چیکوسلواکیہ سوویت گروپ کا تنہا ملک ہے، جس نے ترقی کی وہی سطح حاصل کرلی ہے جو مغربی یوروپ کی ہے۔ ترقی کے ساتھ آرام بھی میسر ہوتا ہے، جس نے ہمارے ملک کے لوگوں کے انقلابی جذبہ کو پامال کردیا ہے۔'

تھا۔اس کے کئی حصوں کا دورہ کرنے کے بعد میں برلن میں قیام پذیر رہا۔ میں نے اس وقت شہر میں چل رہے ایک ثقافتی ڈرامہ کو دیکھا۔میری رخصتی سے کچھ قبل ہی ایک دلچسپ واقعہ رونما ہوا۔ میں نے برلن میں اپنے سفیر سے کہا کہ کیا وہ فرینکفرٹ (جو مغربی جرمنی میں ہے) سے دہلی کا سفر ایئر انڈیا کے طیارہ سے کرنے کا انتظام کرسکتے ہیں۔

سفیر نے کہا 'میں ایسا کرسکتا ہوں،لیکن آپ کے میزبان اسے پسند نہیں کریں گے۔اس کے بجائے میرا مشورہ ہے کہ آپ یہاں سے لندن یا ایمسٹرڈم جائیں اور وہاں سے ایئر انڈیا کا طیارہ لیں۔'لہٰذا میں برلن سے بذریعہ ہالینڈ ہندوستان پہنچا۔

میں نے بعد میں اس بات کو کئی مرتبہ دہرایا ہے تاکہ بتا سکوں کہ کس طرح ان ممالک میں جنہیں ایک دوسرے سے رنجش ہے، وہ اپنی پرانی باتوں سے ابھرنے کی کوشش کررہے ہیں، تاکہ وہ اپنی تاریخ میں ایک نیا باب جوڑ سکیں، جیسا کہ دونوں جرمنی کررہے ہیں۔ میں نے این ڈی اے حکومت کے وزیر داخلہ کے طور پر 2000 میں متحدہ جرمنی کا دورہ کیا۔ برلن کی دیوار تب تاریخ بن چکی تھی اور اس مرتبہ میں برلن اور فرینکفرٹ اور کئی دیگر مقامات پر ایک ساتھ گیا۔

تقسیم کے بعد کراچی کا میرا پہلا دورہ نومبر 1978 میں پاکستان کے سفر کے دوران تھا۔ میں پیرس سے واپس لوٹ رہا تھا، جہاں میں یونیسکو کے اجلاس میں شرکت کے لئے گیا تھا۔ یہ دو دنوں کا قلیل مدتی دورہ تھا، کیونکہ پارلیمنٹ سیشن شروع ہونے والا تھا اور مجھے جلد دہلی واپس آنا تھا۔ اتفاق سے کرکٹ مجھے کراچی لے گیا۔ پہلی مرتبہ دوردرشن ہند-پاک میچ نشر کررہا تھا اور مجھے وزیر اطلاعات ونشریات کے طور پر مدعو کیا گیا تھا۔فطری طور پر میں بہت مسرور تھا۔ میں اس دورہ سے صرف دو چیزیں چاہتا تھا—اپنے گھر اور اسکول جانے کا موقع۔ میرے لئے یہ خوشنما احساس تھا کہ فادر موڈیسٹن، جو میری طالب علمی کے زمانہ میں سینٹ پیٹرکس ہائی اسکول کے پرنسپل تھے اور اب ریٹائر ہوگئے تھے، خیر مقدم کرنے کے لئے دروازہ پر موجود تھے۔ اتفاق سے 1978 میں کراچی میں پہلی مرتبہ ایم جے اکبر سے ملاقات ہوئی، جو ایک مشہور ایڈیٹر اور کالم نویس تھے اور جن سے آج تک میری دوستی برقرار ہے۔ وہ ان دنوں 'سنڈے' میگزین کے لئے کالم لکھا کرتے تھے اور مجھے یاد ہے انھوں نے کرکٹ میچ کی رپورٹ میں میری 'گھر واپسی' کو کور کیا تھا۔

کراچی میں ہی میں پاکستان کے فوجی حکمراں جنرل ضیاءالحق سے ملاقات ہوئی، جنھوں نے محض دو ماہ قبل ہی وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کو بے دخل کرکے جیل میں ڈال دیا تھا۔ کچھ ہی ماہ میں بھٹو کو پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔ جنرل ضیاء پورے دن میچ میں موجود رہے۔ چونکہ ہم ساتھ ساتھ بیٹھے تھے، اس لئے ہم نے آپس میں سلام کلام کیا۔ انھوں نے گرم جوشی کے ساتھ میرا استقبال کیا، لیکن مجھے ایسا محسوس ہوا کہ ان کا رویہ بناوٹی ہے۔

میرا وزیر کے طور پر تجربہ بہت قلیل مدتی تھا۔ تقریباً 2 سالوں کا، لیکن مجھے اس سے جو اطمینان حاصل ہوا وہ بہت زیادہ تھا۔

3

عوام کے ساتھ دھوکہ

جنتا پارٹی حکومت کا زوال، اندرا گاندھی کی واپسی

بھگوان مجھے میرے دوستوں سے بچانا، دشمنوں سے میں خود کو بچالوں گا۔
— ایک کہاوت

جب جنوری 1977 میں جنتا پارٹی نے جے پرکاش نارائن کی اپیل پر حکومت تشکیل کی تو یہ ہندوستان کے جمہوریت نوازوں کی امیدوں اور خواہشات کی عکاسی تھی۔ ملک میں بیشتر لوگ جے پی کو دوسرا مہاتما مانتے تھے، جن کی قیادت میں ہندوستان کی 'دوسری جنگ آزادی' لڑی گئی تھی۔ چار اہم اپوزیشن پارٹیوں کے ایک ساتھ آنے سے لوگوں میں اعتماد کی شمع روشن ہوئی تھی کہ وہ پارلیمانی الیکشن کے توسط سے ایمرجنسی حکومت کو شکست فاش دے دیں گے۔ جنتا پارٹی کی فتح نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ تاناشاہی کو جمہوری اور پرامن طریقہ سے ختم کیا جا سکتا ہے۔

بدقسمتی سے جنتا حکومت کی حصولیابی قلیل مدتی رہی۔ پارٹی کے اندر زبردست آپسی رنجشوں نے اسے نصف مدت کار مکمل کرنے سے قبل ہی اس کا خاتمہ کر دیا۔ مرار جی ڈیسائی نے 15 رجولائی 1979 کو استعفیٰ دے دیا۔ نائب وزیر اعظم چرن سنگھ نے اندرا گاندھی کی حمایت سے وزیر اعظم کے عہدہ کی حلف لی، جن کے خلاف 1977 میں لوگوں نے فیصلہ کن منڈیٹ دیا تھا۔ اندرا گاندھی چرن سنگھ کی دوست نہیں تھیں، انھوں نے ان کا استعمال جنتا پارٹی کو توڑنے اور 6 ماہ سے بھی کم عرصہ میں ان کی حکومت سے حمایت واپس لے کر حکومت گرانے میں کیا۔ اس طرح ایک دھوکہ کے بعد دوسرا دھوکہ ہوتا گیا۔

اس کے بعد ملک نے ایک اور بدقسمت واقعہ کو دیکھا۔ چرن سنگھ کے استعفیٰ کے بعد جنتا پارٹی نے جگ جیون رام کی قیادت میں اگلی سرکار بنانے کا دعویٰ پیش کرنے کا فیصلہ لیا۔ ہندوستان کے اس وقت کے صدر ڈاکٹر نیلم سنجیوا ریڈی نے جگ جیون رام کی حکومت بنانے کی قانونی حق تلفی کی اور انھیں حکومت بنانے کے لئے مدعو نہیں کیا اور 22 راگست 1979 کو لوک سبھا تحلیل کر دی، لہٰذا جنوری 1980 میں ملک پر وسط مدتی انتخاب کا بوجھ ڈال دیا گیا۔ رائے دہندگان نے اقتدار کی کشمکش سے مشتعل ہو کر اور جنتا پارٹی میں دراڑ کے سبب اندرا گاندھی کو واپس اقتدار میں لانے کے لئے ووٹ دے دیا۔

تاریخ میں ایسے مواقع کم ہی دیکھنے کو ملتے ہیں، جب حکومت کو اس طرح کا موقع اور لوگوں کا اعتماد حاصل ہوتا ہے، جیسا جنتا پارٹی کو ملا۔ اسی طرح ایسی مثال بھی کافی کم ہی ملتی ہے۔ تاریخ میں جب حکومت اس موقع کو کھو دیتی ہے اور لوگوں کے یقین کے ساتھ کھلواڑ کرتی ہے، لہٰذا اگر جمہوریت بچانے میں جنتا پارٹی کی حکومت کا جنم ایک سبق تھا تو اس کا خاتمہ ایک دردناک سبق تھا کہ اقتدار کے بھوکے لیڈر ایک مقبول عام جمہوری تحریک کے فائدہ کو کس طرح گنوا بیٹھے ہیں۔

اپنی کتاب 'دی پیوپل بٹریڈ' میں میں نے تفصیل سے جنتا سرکار کے عروج وزوال سے منسلک خوشی اور درد کا ذکر کیا ہے، چونکہ یہ مرار جی ڈیسائی حکومت کے غیر مستحکم ہونے کے فوراً بعد اور 1980 کے انتخابات سے قبل لکھی گئی تھی۔ کتاب میں واقعات کا تسلسل اسی طرح ہے جیسے وہ رونما ہوگئے۔ جب میں ماضی میں جھانکتا ہوں تب یہ احساس ہوتا ہے کہ میں نے اس وقت جو نتیجہ اخذ کیا تھا وہ آج بھی حسب دستور ہے، اس لئے میں اس واقعہ کو یہاں مختصراً دہرانا چاہوں گا۔

'ڈینجرس کارنر': ہندوستانی سیاست کو نمایاں کرنے والا ایک برطانوی ڈرامہ

ہم سبھی لوگ اپنی زندگی میں کبھی نہ کبھی اس بات پر حیران ہوتے ہیں کہ اگر چیزیں دوسری طرح سے ہوتیں تو کیا ہوتا، خصوصاً اس وقت جب واقعات امیدوں کے برخلاف رونما ہوتے ہیں۔ جنتا پارٹی حکومت کی تشکیل اور بعد میں اس کا زوال ایسا ہی پراسرار واقعہ تھا، جس نے ہم سبھی کو اپنا احتساب کرنے کے لئے مجبور کیا۔

اس سوال سے میرا من متزلزل تھا، تب میں نے ایک قابل ذکر ڈرامہ 'ڈینجرس کارنر' کو یاد کیا، جسے میں نے کچھ سال پہلے نئی دہلی کے 'فائن آرٹس تھیٹر' میں دیکھا تھا۔ اسے برطانیہ کے مشہور ڈرامہ نگار جے بی پرسلے (1984-1894) نے لکھا تھا۔ چونکہ ان کے ڈرامے ہمیشہ صحیح بمقابلہ غلط کی جدوجہد میں صحیح کے حق میں بولتے تھے، اس وجہ سے دوسری عالمی جنگ کے مشکل ترین دور میں بھی برطانوی لوگوں کا اخلاقی معیار بلند رہا۔ 'ڈینجرس کارنر' ایک بہترین پراسرار کہانی ہے۔ اس کی شروعات ایک چہل پہل والی ڈنر پارٹی سے ہوتی ہے، جس میں دوست اور معاونین شرکت کرتے ہیں۔ وہاں سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا کہ ایک معمولی تبصرہ کے سبب رنگ میں بھنگ پڑ گیا۔ ناٹک کے پہلے سین میں ایک کردار ایک سگریٹ کیس کو، جو دوسرے کے ہاتھ میں ہے، کسی تیسرے کی ہیں، ایسے بتاتا ہے۔ دوسرا شخص پہلے کے دعویٰ کی تردید کرتا ہے۔ بحث اچانک الزام تراشی کا رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ ایک جھوٹ کی وجہ سے دوسرا جھوٹ سامنے آتا ہے۔ ایک شرمناک راز سے پردہ اٹھنے کے بعد دوسرا سامنے آتا ہے۔ کہانی تیزی سے آگے بڑھتی ہے اور دھڑکنیں روک دینے والے اختتام پر پہنچتی ہے۔ آخر میں ڈرامہ کے سبھی کردار جھوٹے، لالچی، سازش کار اور مفاد پرست شخصیتوں کی شکل میں سامنے آتے ہیں۔

یہ دکھانے کے بعد پرسلے ہمیں واپس پارٹی کے پہلے سین میں لے جاتا ہے۔ کھیل دوبارہ شروع ہوتا ہے، لیکن ایک موڑ کے ساتھ۔ پہلا کردار یہ مانتا ہے کہ یہ سگریٹ کا ڈبہ تیسرے شخص کا ہے، لیکن جب دوسرا شخص پہلے کے دعویٰ پر سوال اٹھاتا ہے تو پہلا شخص خاموشی سے اس بات کو تسلیم کر لیتا ہے۔ پارٹی آرام سے چلنے لگتی ہے اور اس میں پہلے کے دلائل کو دوہرایا نہیں جاتا اور تمام کرداروں کا باہری روپ برقرار رکھا جاتا ہے۔ پریسلے نے پہلے کردار کے اس فیصلہ کو، جب وہ دوسرے کردار سے بحث شروع کرتا ہے، کو 'ڈینجرس کارنر' (خطرناک موڑ) کے طور پر پیش کیا ہے، جس سے ڈرامہ کے تمام کرداروں کی زندگی متاثر ہوتی ہے۔

مجھے ہمیشہ حیرانی ہوئی ہے کہ وہ کون سا 'ڈینجرس کارنر' تھا جہاں حکومت نے ایک خطرناک موڑ اختیار کیا۔ مثال کے طور پر، جون- جولائی 1978 میں جب چرن سنگھ اور راج نارائن کو مرار جی ڈیسائی حکومت سے باہر کر دیا گیا، کیا ہوتا اگر میں نے اور اٹل جی نے اس فیصلہ کی مکمل حمایت کی ہوتی اور یہ کامیاب کوشش نہیں کی ہوتی کہ چرن سنگھ کو واپس کابینہ میں لایا جائے؟ اور کچھ ہوتا یا نہ ہوتا، لیکن ہمارے کئی ساتھیوں کے قابل احترام خارجی شخصیت کو بہرحال محفوظ کیا جاسکتا تھا۔

جنتا حکومت کو گرانے میں ایک سسپنس تھریلر کے تمام حلیف موجود تھے۔ 29/جون 1978 کو وزیراعظم ڈیسائی نے اپنی رہائش گاہ پر کابینہ کی ایمرجنسی میٹنگ طلب کی۔ اس کام کی فہرست میں ایک پیچیدہ سوال تھا۔ وزیر داخلہ چرن سنگھ کے خلاف ڈسپلن شکنی کارروائی کرنا، جنھوں نے گزشتہ شام کو ایک غیر مناسب پریس بیان جاری کر کے حکومت کی مذمت کی اور کہا کہ حکومت سابق وزیراعظم (اندرا گاندھی) کو جیل میں ڈالنے میں اب تک ناکام رہی ہے۔ ان کے مطابق اس 'ناکامی' سے لوگوں نے نتیجہ اخذ کیا ہے کہ 'ہم حکومت کے لوگ نامرد ہیں، جو ملک کی حکومت نہیں چلا سکتے۔ پریس نوٹ میں کہا گیا—

> ''ایمرجنسی کے کئی متاثرین میرے پاس آئے اور انھوں نے بار بار اپیل کی کہ نہ صرف مسز گاندھی کو فوراً گرفتار کیا جائے بلکہ انھیں چنڈی گڑھ میں انھیں حوالات میں رکھا جائے، جن میں لوک نائک جے پرکاش نارائن کو رکھا گیا تھا... مجھے کوئی شبہ نہیں ہے کہ اگر حکومت میں ہم اس صلاح کو مان لیتے اور منظور کر لیتے تو سیکڑوں ایمرجنسی سے متاثر مائیں اس موقع کو ایک اور دیوالی کے جشن کے طور پر مناتیں۔ یقینی طور پر کسی دوسرے ملک میں انھیں تاریخی نیوز بمبرگ عدالتی کارروائی کے مساوی کارروائی کا سامنا کرنا پڑتا۔''

غور طلب ہے کہ اس دھاکہ کے کچھ ہی وقت بعد چرن سنگھ نے اندرا گاندھی کے ساتھ گٹھ جوڑ کیا، جو ڈیسائی حکومت کے گرنے کا سبب بنا۔ 28/جولائی 1979 کو اپنی زندگی بھر کی وزیراعظم بننے کی خواہش کو اسی شخص کی مدد سے پورا کیا، جسے گرفتار نہ کئے جانے پر انھوں نے اجتماعی طور پر مرار جی ڈیسائی کی مذمت کی تھی۔ اس حکومت کے وزیر داخلہ کے طور پر وہ کبھی بھی اندرا گاندھی کی ایمرجنسی کے دوران کی گئی زیادتیوں کے سبب گرفتاری سے متعلق کوئی بھی تجویز کابینہ کے سامنے نہیں لائے۔ یہ الگ بات ہے کہ کابینہ نے اس کے حق میں اپنی رائے نہیں دی ہو۔ نہ صرف جے پرکاش جی بلکہ حکومت میں ہم میں سے بیشتر لوگوں نے پہلے ہی اندرا گاندھی کو مناسب سزا دے دی تھی۔

چرن سنگھ نے خود اپنے لئے اور حکومت کے لئے مصیبت پیدا کر دی، جب انھوں نے اکتوبر 1977 میں اندرا گاندھی کو اس الزام میں کہ انھوں نے گزشتہ پارلیمانی الیکشن میں استعمال کے لئے ایک صنعتی گھرانہ سے جیپیں لی ہیں، گرفتار کرانے کی کوشش کی۔ اسے انتقام کے جذبہ سے کی گئی کارروائی کے طور پر لوگوں نے دیکھا۔ چرن سنگھ کی غلط اور جانبدارانہ کارروائی وہ مرکزی نقطہ تھا، جہاں سے اندرا گاندھی کو اپنی سیاسی عروج حاصل کرنے کا بہترین موقع نصیب ہوا۔

چرن سنگھ کے پاس جنتا پارٹی کے اپنے لوک دل کے دھڑے میں حمایت کے لئے بہت کم لوگ رہ گئے تھے، جب انھوں نے وزیراعظم ڈیسائی اور اپنے کابینہ کے دیگر ساتھیوں کے خلاف نازیبا لفظ کا استعمال کرتے ہوئے انھیں 'نامردوں کا گروپ' کہا۔ جب مرار جی بھائی نے وزیر داخلہ کے اس بیان کے بارے میں ردّعمل جاننے کے لئے کابینہ کی میٹنگ طلب کی، ہم سبھی نے ایک رائے سے اپنے غصہ کا اظہار کیا۔ ہم سب نے وزیراعظم کو نائب وزیراعظم کے خلاف مناسب فیصلہ لینے کا اختیار سونپ دیا۔ ایک دیگر وزیر اور چرن سنگھ کے حامی، جن کے خلاف کارروائی کی سفارش کی گئی تھی، وہ تھے راج نارائن۔ ڈیسائی نے ان دونوں وزراء سے استعفیٰ طلب کیا۔ بات یہاں پر ختم ہو جانی چاہئے تھی، لیکن

اس ڈینجرس کارنز' پرائل جی اور میں نے غلط موڑ لیا۔ نوزائیدہ پارٹی کے اتحاد کے بارے میں ہمارے جذباتی لگاؤ نے ہمارے سیاسی فیصلہ کو متاثر کیا اور ہم نے چرن سنگھ اور وزیراعظم کے درمیان از سر نو تعلقات استوار کرنے کا فیصلہ لیا اور چرن سنگھ کو واپس حکومت میں شامل کروانا یقینی کیا۔ انھیں دوبارہ حکومت میں شامل کرنا ہی پارٹی کی تباہی کا سبب بنا۔

کانتی ڈیسائی تنازعہ مہنگا ثابت ہوا

وزیراعظم اور نائب وزیراعظم کے عزائم اور طرز عمل میں واضح فرق تھا۔ مرارجی بھائی پورے انہماک کے ساتھ حکمرانی کے ایشوز پر مرکوز تھے۔ اپنی عمر کے باوجود — وہ تراسی سال کے تھے، جب وزیراعظم بنے — وہ تمام وزارت کے اہم پہلوؤں پر دھیان مرکوز کرتے تھے۔ دوسری جانب چرن سنگھ، مرارجی بھائی کے خلاف غیر اطمینانی کا ماحول پیدا کرنے میں مصروف رہتے تھے۔ یہ بہ آسانی دیکھا جاسکتا تھا کہ وہ وزیراعظم کو نیچا دکھانے اور حکومت کے لئے پریشانی پیدا کرنے والے ایشوز کی جستجو میں مصروف رہتے۔ وہ اکثر حکومت کی مذمت والے پریس نوٹس جاری کرتے تھے یا وزیراعظم کو خط لکھتے تھے اور انھیں میڈیا میں لیک کردیتے تھے۔ ایک مرتبہ اپریل 1978 میں چرن سنگھ کو دل کا دورہ پڑا اور انھیں ایمس میں داخل کرایا گیا۔ مرارجی بھائی کو اسی دن یو ایس اے (متحدہ ہائے امریکہ) کے سرکاری دورہ پر جانا تھا۔ وہ اپنے ساتھی کو دیکھنے اسپتال گئے، وہاں کچھ وقت گزارا۔ اسی شام کو چرن سنگھ نے ایک پریس نوٹس جاری کرکے حکومت کی اقتصادی پالیسی کی مذمت کی۔ انھوں نے شکایت کی کہ سابق کانگریسی حکومت کی طرح نئی حکومت بھی زراعت کو نظرانداز کررہی ہے اور اس نے 'بھاری صنعت پہلے' پالیسی کے سامنے خودسپردگی کی ہے۔ اس حملہ کا ہدف جتنا وزیراعظم تھے اتنا ہی وزیر صنعت جارج فرنانڈیز اور وزیر مالیات ایچ ایم پٹیل بھی تھے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ چرن سنگھ زرعی شعبہ کی ترقی کا بہت دھیان رکھتے تھے۔ جن سنگھ کے ممبران بھی اس کی حمایت کرتے تھے۔ ہم سبھی ان کے ذریعہ اپنی ہی حکومت کی اجتماعی طور پر مذمت کرنے سے مایوس تھے۔ یہ نہ صرف کابینہ کی اجتماعی ذمہ داری کے خلاف تھا بلکہ یہ اپنی اہمیت کھوچکی کانگریس پارٹی میں جان پھونکنے کا آلہ تھا۔

جس ایشو نے ہماری حکومت کو سب سے زیادہ ذلیل وخوار کیا وہ تھا وزیراعظم کے اکلوتے بیٹے کانتی ڈیسائی پر لگے بدعنوانی کے الزام سے پیدا ہوا تنازع، یہاں پر بھی چرن سنگھ نے منفی کردار نبھایا۔ انھوں نے الزام کی تفتیش کے لئے ایک کمیشن کی تشکیل کا مطالبہ کیا۔

میرے خیال سے، ان پر لگے الزام شدید معنویت نہیں رکھتے تھے اور یقیناً اس کے لئے کمیشن کے ذریعہ تفتیش کی ضرورت نہیں تھی۔ سچائی یہ تھی کہ کانتی ڈیسائی، جو کہ اپنے والد کے ساتھ وزیراعظم کی رہائش گاہ پر قیام پذیر تھے، اپنے والد کے سیاسی مدمقابل کے نشانہ پر تھے۔ بدقسمتی سے انھوں نے اپنے والد کے لئے چیزوں کو اور سنگین اس لئے بنادیا کہ انھوں نے اس سیاسی دوری اور احتیاط کا مظاہرہ نہیں کیا، جس کی ان سے توقع تھی۔

تفتیش کے مطالبہ نے سیاسی گلیاروں میں ہنگامہ برپا کردیا۔ چرن سنگھ نے وزیراعظم کے خلاف مورچہ کھول دیا۔ 11 سے 29 /مارچ 1978 کے درمیان وزیراعظم اور ان کے درمیان 6 خط اس ایشو پر لکھے گئے۔ مرارجی بھائی نے وزیر داخلہ کے ذریعہ اٹھائے گئے سبھی ایشوز کا جواب دیا، لیکن سچائی یہ تھی کہ حکومت کے اعلیٰ سطحی لیڈر خطوط کی لڑائی میں الجھے ہوئے تھے اور اس نے حکومت کے اعتماد اور وزیراعظم کے وقار کو ٹھیس پہنچائی۔

جب کانتی ڈیسائی تنازعہ شباب پر تھا، تب گرما رہے حالات نے مجھے اس میں اس طرح دھکیل دیا کہ مجھے انتہائی تکلیف کا احساس ہوا۔ چونکہ خود ایک سینئر وزیر وزیراعظم کے بیٹے پر لگائے گئے الزامات پر یقین کر رہے تھے، کانگریس پارٹی نے مصیبت میں پھنسی حکومت میں انتشار پیدا کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ کانگریس نے اس کے لئے جس اسٹیج کا استعمال کیا وہ تھا راجیہ سبھا، جہاں اس کی اکثریت تھی۔ کانگریس نے کانتی ڈیسائی کا مدعا زور وشور سے اٹھا کر ایوان کی کارروائی کو متاثر کیا۔ میں راجیہ سبھا میں ایوان کا لیڈر تھا اور اس حیثیت سے مجھے اس تنازعہ کا دفاع کرنا تھا۔ کانگریس پارٹی نے مطالبہ کیا کہ وزیراعظم اور نائب وزیراعظم کے درمیان کانتی ڈیسائی ایشو پر ہوئے خطوط کی لین دین کو پارلیمنٹ میں پیش کیا جائے۔ مجھے لگتا تھا کہ اس پر حکومت کا ردعمل پراعتماد اور سیاسی ہونا چاہئے نہ کہ صرف تکنیکی۔

مرارجی بھائی تکنیکی طور پر درست تھے کہ دو وزراء کے درمیان ہوئے رازدارانہ خط وکتابت کو ایوان کے ٹیبل پر رکھنا غلط اور بنے ہوئے قاعدے کے خلاف ہے۔ مجھے لگتا تھا کہ چونکہ چرن سنگھ کے خط سیاست سے متاثر تھے اور رازدارانہ نہیں تھے — کیونکہ انھیں پریس میں لیک کیا جاچکا تھا — ان کو وزیراعظم کے ذریعہ دیئے گئے جوابات کو ایوان میں پیش کرنے سے اپوزیشن کے مطالبہ کو مان کر خاموش کیا جاسکتا ہے۔ کافی سمجھانے بجھانے کے بعد وزیراعظم اس بات پر رضامند ہو گئے کہ اگر کوئی ممبر پارلیمنٹ کانتی ڈیسائی کے خلاف تحریری شکایت دیتا ہے تو وہ اسے ہندوستان کے چیف جسٹس کو بھیج دیں گے۔ اس سے کانگریس اور دیگر اپوزیشن مطمئن نہیں تھے۔ انھوں نے راجیہ سبھا کی کارروائی میں رکاوٹ ڈالنا جاری رکھا۔

اس ایشو پر تعطل دور کرنے کے لئے میں نے ایوان کے تمام اپوزیشن پارٹیوں سے اس پر تبادلہ خیال کیا۔ میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ کانگریس اس ایشو کو برقرار رکھنے کا کھیل کھیل رہی ہے۔ دیگر جن میں کمیونسٹ پارٹی بھی شامل تھی، وہ اس ایشو پر خود کو کانگریس سے الگ کرنا چاہتے تھے۔ اگر کسی ممبر پارلیمنٹ کے ذریعہ تحریری شکایت پر زور دینے کے بجائے حکومت اس ایشو پر میمورنڈم لیتے ہوئے ایوان کی بحث کو ہندوستان کے چیف جسٹس کے سامنے پیش کرنے پر راضی ہو جائے۔ راجیہ سبھا سے جنتا پارٹی کے اراکین کا ایک وفد وزیراعظم سے ملا اور انھیں اس بات کے لئے تیار کرنے کی کوشش کی کہ یہ اس پیچیدہ معاملہ کا ایک مناسب حل فراہم کرے گا۔ مرارجی بھائی نے انکار کر دیا۔ اس سے مجھے مایوسی ہوئی۔ ایوان کے لیڈر کے طور پر میں وزیراعظم کو اس بات کے لئے تیار نہیں کر سکا، جسے بیشتر اراکین درست مانتے تھے۔ اس سلسلہ میں میں نے سوچا کہ حکومت سے استعفیٰ دینا ہی صحیح اور ضروری ہے۔ کابینہ نے مداخلت کی اور کارروائی کے لئے سفارش کے لئے ایک عبوری کمیٹی کی تشکیل کی۔ اس کمیٹی نے اسی قدم کی حمایت کی، جو میں نے پہلے رکھی تھی۔ بعد میں میں نے اپنا استعفیٰ واپس لے لیا۔

آپ سندھ سے ہیں، آپ ذات پات کی پیچیدگیاں کہاں سمجھیں گے؟

چرن سنگھ کے ساتھ میرے تعلقات بہتر تھے۔ میں اکثر ملاقات کی غرض سے ان کے پاس جاتا تھا۔ ان کے ساتھ بات چیت کے بعد مجھے سمجھ میں آیا کہ ہندوستانی سیاست میں ذات پات کی لکیر کتنی گہری ہے اور یہ کتنا اہم کردار نبھاتی ہے۔ انھیں وزارت سے بے دخل کرنے کے کچھ وقت بعد ہی، جب انھوں نے وزارتی معاونین کے خلاف سخت بیان دیا، میں ان سے ازراہ ہمدردی ملاقات کے لئے گیا۔ انھوں نے مجھے طویل لکچر پلایا، چونکہ وہ جاٹ ہیں، اس لئے ان کے خلاف سیاسی سازش رچی گئی۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ آپ سندھ سے ہیں اور ملک کے اس حصہ کی ذات پات کی پیچیدگیوں کو آپ نہیں سمجھ سکتے۔ وہ اپنے موقف میں درست تھے۔ سندھ کے ہندو سماج میں ذات ایک غیر اہم پہلو تھا، لیکن

آگے انھوں نے جو کہا اس سے مجھے ان کی تلخی کی سطح کا احساس ہوا 'چودھری چرن سنگھ کو حکومت سے باہر کیا جاتا ہے، اٹل بہاری واجپئی کو نہیں، کیونکہ وہ برہمن ہیں اور میں جاٹ۔' میں نے انھیں سمجھانے کی بھرپور کوشش کی کہ انھیں نکالنے کا ان کی ذات سے کوئی تعلق نہیں ہے، لیکن وہ مجھے میری سندھی پس منظر کی یاد دلاتے رہے۔

یہ سچ ہے کہ میرے سندھی پس منظر کے نظریہ کے مضبوط اثرات کے سبب میں فطری طور پر سیاسی ایشو پر سوچتے ہوئے ذات پات کی معنویت پر دھیان نہیں دیتا تھا، لیکن کئی برسوں کے تجربہ کے بعد مجھے ذات پات کی پیچیدگیوں اور ہندوستان میں پہچان پر مبنی سیاست میں اس کی اہمیت کی اچھی جانکاری ہوگئی۔

چرن سنگھ کے سیاسی کارناموں سے متاثر ہونے کے باوجود میں ہمیشہ شمالی ہندوستان میں، خصوصاً کسانوں کے درمیان، ان کی زبردست مقبولیت سے حیرت زدہ تھا۔ ہندوستان میں زرعی سیکٹر کے مسائل اور مواقع کے بارے میں ان کا مطالعہ بہت گہرا تھا۔ ان میں کسان اس لیڈر کو دیکھتے تھے، جو ان کی فکر اور خواہشات کو آواز دیتا تھا اور جس نے انھیں مضبوط ہونے کا احساس کرایا تھا۔ ماضی پر نگاہ ڈالنے پر مجھے احساس ہوتا ہے کہ اگر وہ چاہتے تو اس طاقت کا استعمال جنتا پارٹی کے استحکام کو مضبوطی فراہم کرانے کے لئے کر سکتے تھے۔

جنتا پارٹی کے اقتدار کے دوران جو لوگ کسانوں کے مفاد کی پرجوش حمایت کے لئے چرن سنگھ کی ستائش کرتے تھے، انھیں بھی لگا کہ راج نارائن کے ذریعہ ان کی شناخت کو پامال کیا جارہا ہے۔ ان کے خاص سپہ سالار نے چندر شیکھر کے خلاف ایک انتقامی اور مذمتی بحث چھیڑ دی۔ انھوں نے پارٹی کے قیام سے ایک سال بعد ہی صدر کے طور پر ان کے قانونی جواز پر سوالیہ نشان لگا دیا۔ وہ اکثر جگ جیون رام پر بھی حملہ کرتے تھے۔ اس داخلی رنجش نے جنتا پارٹی کے کارکنان اور حامیوں میں وہم و مایوسی پیدا کی۔ راج نارائن ایک ماڈل تھے کہ عوامی رویہ کیسا نہیں ہونا چاہئے۔ ایک مرتبہ 'دی ٹائمز آف انڈیا' نے انھیں یونانی دساتیر کے سات دیووں میں سے ایک بتایا تھا۔ اپنے اداریہ میں ان کا ذکر 'غیر مہذب' کے طور پر کرتے ہوئے 'انڈین ایکسپریس' نے لکھا 'لوک دل کو جو نقصان راج نارائن نے پہنچایا ہے ہمیں اس کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم سبھی کے لئے باعث فکر یہ ہے کہ سیاسی اخلاقیات کے تمام پیمانوں کی خلاف ورزی بغیر کسی چیلنج کے کی جارہی ہے۔

ایک اصول کے سبب میں ان ناخوشگوار واقعات کے بارے میں تبصرہ کرنے سے بچتا رہا۔ ایک مرتبہ اپریل 1978 میں تریوندرم میں میڈیا کو خطاب کرتے ہوئے میں نے اس تو تو، میں میں کو وزیراعظم عہدہ کے لئے جاری لڑائی کہا۔ دہلی واپس آنے کے بعد ایک مرتبہ میں چرن سنگھ سے ملنے کے لئے ان کی رہائش گاہ پر گیا، چونکہ وہ اس وقت بیمار تھے۔ انھوں نے میرے تریوندرم کے بیان کا ذکر کرتے ہوئے معصومیت سے کہا 'آپ تو بہت سنجیدہ ہیں، آپ بھی ایسا کہتے ہیں؟' انھوں نے مزید کہا 'میں وزیراعظم نہیں بننا چاہتا۔ مرار جی بھائی کو پوری زندگی وزیراعظم بنے رہنے دیجئے۔' یہ بات چیت مئی 1979 کے آخر میں ہوئی اور اس کے 6 ہفتہ سے بھی کم مدت میں انھوں نے اندرا گاندھی کی مدد سے وزیراعظم کی کرسی پر قبضہ کرلیا۔

صدر جمہوریہ ڈاکٹر نیلم سنجیوا ریڈی کا مشتبہ کردار

صدر جمہوریہ ڈاکٹر نیلم سنجیوا ریڈی نے 28 رجولائی کو جب چرن سنگھ کو ہندوستان کے چھٹے وزیراعظم کے طور پر حلف دلائی، تب ان کے ساتھ لوک سبھا میں صرف 64 ممبران پارلیمنٹ تھے اور وہ تمام جنتا پارٹی کے دل بدلو تھے۔ کانگریس پارٹی اور اس کے حلیفوں کے ذریعہ باہر سے

دی گئی حمایت کتنی غیر مشروط تھی، اس کا پتہ تب چلا، جب اندرا گاندھی کے کہنے پر نئی حکومت بننے کے بعد پہلی مرتبہ لوک سبھا سیشن سے ایک دن قبل ہی حمایت واپس لے لی گئی۔ چرن سنگھ نے استعفیٰ دے دیا اور جنوری 1980 میں نئے الیکشن ہوئے۔ دیگر الفاظ میں کہیں، تو وزیراعظم کے طور پر اپنے 6 ماہ کے دور اقتدار میں انھوں نے کبھی لوک سبھا کا سامنا نہیں کیا۔

مرارجی ڈیسائی کی حکومت کے زوال کے فوراً بعد چرن سنگھ حکومت کے گرنے سے اندرا گاندھی کے سیاسی عروج کو تقویت ملی۔ 1978 میں لوک سبھا کے ضمنی انتخاب میں کرناٹک کے چکمنگلور پارلیمانی حلقہ سے ان کی جیت نے نیم مردہ پارٹی میں جان پھونک دی۔ جنتا پارٹی کے ذریعہ کیا گیا 'ہاہاکار' نے لوگوں کو یہ ماننے پر مجبور کردیا کہ اندرا گاندھی واپسی کے راستے پر ہیں۔

صدر جمہوریہ ڈاکٹر نیلم سنجیوا ریڈی نے اندرا گاندھی کی اقتدار میں واپسی میں اہم کردار نبھایا۔ چرن سنگھ کے ذریعہ 20 راگست 1979 کو استعفیٰ دیئے جانے کے بعد تمام ماہرین آئین اس بات پر متفق تھے کہ جنتا پارٹی کو حکومت بنانے کا ایک اور موقع دیا جانا چاہئے۔ دل بدل کے باوجود پارلیمنٹ میں یہ سب سے بڑی پارٹی تھی۔ دراصل چرن سنگھ کے استعفیٰ دینے کے کچھ ہی گھنٹوں بعد جگ جیون رام راشٹرپتی بھون گئے اور انھوں نے صدر جمہوریہ نیلم سنجیوا ریڈی کو مطلع کیا کہ وہ حکومت بنانے اور ایوان میں اکثریت ثابت کرنے کی حالت میں ہیں۔ پھر بھی مسٹر ریڈی نے 22 راگست کو لوک سبھا تحلیل کر کے ملک کو ایک جھٹکا دیا۔ ان کے فیصلہ کے کئی مشتبہ پہلو تھے۔ پہلا تھا، راشٹرپتی بھون نے ایوان کو تحلیل کرنے کی کوئی وجہ نہیں بتائی۔ دوسری، مرارجی ڈیسائی کے 15 جولائی کو استعفیٰ دینے کے بعد ریڈی نے چرن سنگھ کو حکومت بنانے کے امکانات تلاش کرنے کے لئے تیرہ دن کا وقت دیا، جو اندرا گاندھی کی مدد کرنے کے لئے کیا گیا تھا، جبکہ جگ جیون رام کے دعویٰ کی سچائی کو جانتے ہوئے انھوں نے اسے نامنظور کرنے کے لئے دو دن کا بھی انتظار نہیں کیا۔ جگ جیون رام کے پاس جنتا پارٹی کے 202 ممبران پارلیمنٹ کی حمایت کے باوجود یہ قدم مشتبہ تھا۔ اس کے علاوہ اٹل جی کی پہل سے تمل ناڈو میں آل انڈیا انادراوڑ منت کژگم کے ایم جی رام چندرن، جن کے لوک سبھا میں 18 ممبران اسمبلی تھے، نے جگ جیون رام کی حمایت کا وعدہ کیا۔ یہ بھی امکان تھا کہ کانگریس سے دلبرداشتہ لیڈران، جن کی قیادت یشونت چوہان کررہے تھے، وہ بھی جگ جیون رام کی حکومت کو حمایت دینے کے خواہاں تھے۔ اس پس منظر کے برعکس، ریڈی کے ایوان کو تحلیل کرنے کے فیصلہ نے اس اندیشہ کو مزید تقویت فراہم کی کہ انھوں نے پہلے ہی یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ جگ جیون رام کو حکومت بنانے کے لئے مدعو نہیں کریں گے۔

یہاں مجھے ایک خاص مذاکرہ کی یاد آتی ہے، جو ریڈی اور جنتا پارٹی کے صدر چندر شیکھر کے مابین ہوئی۔ 21 راگست کو چندر شیکھر راشٹرپتی بھون گئے اور اطلاع دی کہ جنتا پارٹی حکومت بنانے کی حالت میں ہے۔ ریڈی نے طنزیہ انداز میں کہا کہ 'آپ ایسا کیسے کریں گے؟ دل بدل کو بڑھاوا دے کر؟' جس کے جواب میں چندر شیکھر نے اظہار برہمی کرتے ہوئے کہا 'ایک دل بدلو کو وزیراعظم نامزد کرنے والے آپ کو دل بدل پر اعتراض کیوں ہے؟'

اس پوری مدت میں ریڈی کے کردار میں استحکام، شفافیت اور ایمانداری کا فقدان نظر آیا۔ اسے ثابت کرنے کے لئے ایک مثال کافی ہے۔ 22 راگست کو تقریباً 10:15 بجے صبح چندر شیکھر حکومت کی تشکیل سے متعلق ایشو پر تبادلہ خیال کرنے کے لئے میرے گھر آئے۔ انھیں 11 بجے جگ جیون رام کا فون آیا کہ صدر جمہوریہ نے ان دونوں کو 11 بجے ملاقات کے لئے راشٹر بھون میں طلب کیا ہے۔

ہم نے سوچا کہ یہ ہماری حکومت بنانے کے دعوے کے سلسلہ میں ہے۔ انھوں نے اس بات کی بھی جانچ کی تھی کہ جگ جیون رام کے

پاس حکومت بنانے کے لئے کتنی حمایت ہے۔ چندر شیکھر نے انھیں مطلع کیا تھا کہ جنتا پارٹی اور اس کے نئے حلیف جس طرح سے صدر جمہوریہ کی خواہش ہو، ایوان میں یا ممبران پارلیمنٹ کی دستخط شدہ فہرست سونپ کر، اپنی اکثریت ثابت کر دیں گے۔ اس کے جواب میں صدر جمہوریہ نے کہا کہ انھیں کوئی جلد بازی نہیں ہے۔

راشٹرپتی بھون سے جگ جیون رام اور چندر شیکھر پارلیمنٹ میں جنتا پارٹی کے دفتر گئے اور ہم سبھی کو صدر ریڈی کے ساتھ ہوئی بات چیت سے آگاہ کیا۔ تمام لوگ اپنے دعویٰ کو حمایت دینے والے ممبران پارلیمنٹ کی فہرست تیار کرنے میں مشغول ہو گئے۔ ہمیں یقین تھا کہ شام تک ہم آسانی سے ممبران پارلیمنٹ کی واضح اکثریت حاصل کر لیں گے، جو 275 سے 280 کے درمیان ہوں گی اور جو لوک سبھا میں جگ جیون رام کی حکومت کی حمایت کریں گے۔

دوپہر کے کچھ دیر بعد ہی خبر آئی کہ صدر نے پارلیمنٹ تحلیل کر دی ہے۔

یقیناً ریڈی نے غیر جانبدارانہ اور غیر ایماندارانہ رویہ اپنایا تھا۔ ایسا کرتے ہوئے انھوں نے ملک اور عوام کے ساتھ دھوکہ کیا، جنھوں نے انھیں ہندوستان کے پروقار عہدہ پر فائز کیا تھا۔ سب سے سنگین بات یہ تھی کہ جب وہ لوک سبھا کے اسپیکر (69-1967) تھے، تب انھوں نے جو اصول بنایا تھا، اسی کی انھوں نے خلاف ورزی کی۔ 1968 میں دہلی میٹروپولیٹن کونسل کے چیئرمین کے طور پر مجھے پریزائڈنگ افسروں کی کل ہند کانفرنس میں حصہ لینے کا موقع حاصل ہوا، جسے ریڈی نے طلب کیا تھا۔ اس میں گورنر کا اختیار موضوع بحث تھا۔ ریڈی نے کہا تھا 'کسی بھی حالت میں گورنر کو یہ تعین نہیں کرنا چاہئے کہ وزیر اعلیٰ کو اراکین کی اکثریت حاصل ہے یا نہیں، یہاں تک کہ اراکین تحریری طور پر بھی گورنر کو اپنی رائے بتائیں، تب بھی نہیں۔'

اس ایشو کے تعین کا اختیار صرف ایوان کو ہے۔ ہندوستان کے صدر (82-1977) کے طور پر انھوں نے اس ضابطہ کی خلاف ورزی کی، جبکہ انھیں یہ تعین کرنا تھا کہ جگ جیون رام کے پاس لوک سبھا میں اکثریت کی حمایت ہے یا نہیں۔ ریڈی کے جانبدارانہ رویہ سے تمام لوگ اتنے رنجیدہ ہوئے کہ چندر شیکھر نے تو ان پر مواخذہ کی تحریک کا مطالبہ کیا۔

مرار جی ڈیسائی — ایک جائزہ

جنتا پارٹی کے تین اعلیٰ سطح کے لیڈر، جن کے ساتھ میں نے بہت قریب سے کام کیا، ان میں مرار جی ڈیسائی اپنی باوقار شخصیت کے لحاظ سے چرن سنگھ اور جگ جیون رام سے میلوں آگے تھے۔ انھوں نے قومی قد اور حکمرانی کے تجربہ کے معاملہ میں باقی دونوں کو کافی پیچھے چھوڑ دیا۔ جو لوگ انھیں نزدیک سے نہیں جانتے تھے، ان کا ماننا تھا کہ مرار جی ایک ضدی اور سخت مزاج کے حامل شخص ہیں، لیکن میرا تجربہ اس کے برعکس تھا۔ جن موضوعات پر ان کے اصولوں سے ٹکراؤ نہیں ہوتا تھا، ان پر وہ اپنے ساتھیوں کے خیالات سننے اور وجہ جاننے کے لئے تیار رہتے تھے۔ بلاشبہ جسے وہ صحیح مانتے تھے، اس پر کسی طرح کے سمجھوتہ کے وہ سخت مخالف تھے۔ مثال کے طور پر، وہ ہندوستان کو ایک ایٹمی صلاحیت والا ملک بنانے کے جن سنگھ کے مطالبہ کے بالکل خلاف تھے، لیکن انھوں نے جن سنگھ کی حب الوطنی، آدرش واد اور ڈسپلن کی ستائش میں کوئی کمی نہیں کی۔ انھوں نے اٹل جی کی پرزور حمایت کی، جو وزارت خارجہ سنبھال رہے تھے اور ہندوستان اور پاکستان کے ساتھ تعلقات استوار کرنے کی کوشش میں مصروف تھے۔

مرارجی بھائی کے ساتھ میرے تعلقات بہتر تھے۔ میں ان کی شخصیت کا مداح تھا۔ میں ہمیشہ اس اصول پر کارفرما رہا کہ ایک اصول پسند شخص کو، خواہ وہ کسی نظریہ کا قائل ہو، اسے لائق احترام سمجھنا چاہئے نہ کہ اس سے بغض رکھنا چاہئے۔ خصوصاً میں ان کا احترام ان کی ایمانداری، سچائی اور جرأت مندی کے لئے کرتا تھا۔ انھوں نے دلی لگاؤ سے ایمرجنسی کے دوران جمہوریت کی بحالی کے لئے کمر کسی۔ 3 جلدوں میں تحریر کردہ ان کی خودنوشت، جس کا عنوان 'دی اسٹوری آف مائی لائف' ہے، ان کے ذریعہ طویل عرصہ تک ملک کی خدمت کرنے کا ایک مؤثر نسخہ ہے۔ میں قارئین کے لئے اس کتاب کے درج ذیل اقتباسات پیش کرنا چاہوں گا۔

''انھوں نے (اندرا گاندھی) ایمرجنسی کو ختم کرنے کے سلسلہ میں کئی شرائط لگائیں۔ اس میں ستیہ گرہ کرنے کا اختیار ختم کرنا بھی شامل ہے۔ میں اس پاک اور علیحدہ نہ کئے جانے والے حقوق انسانی اور فرائض سے سبکدوش ہونے کے بجائے موت کو پسند کروں گا۔ میں ایمرجنسی جیسے حالات میں وزیر اعظم بننے کے مقابلہ زندگی بھر جیل میں رہنا پسندوں کروں گا۔ میرے خیال میں، ملک اور سماج کے مستقبل کی امید تب تک ہے جب تک کچھ لوگ آزادی کی مشعل جلائے رکھنے کے لئے بھاری جرمانہ بھرنے کے لئے تیار ہیں۔ اس ملک کا کوئی مستقبل نہیں ہے، جہاں کے لوگ خوف زدہ رہتے ہیں۔ انسانی آزادی کے بغیر مادی اور جسمانی فروغ صرف بہتر غذا حاصل کرنے والے گھریلو جانوروں اور جانداروں کے لئے کافی ہے، یہ انسانوں کے لئے نہیں ہے۔''★

مرارجی بھائی کا ایشور میں پورا یقین تھا۔ اس سلسلہ میں انھوں نے اپنی خودنوشت میں جو لکھا ہے وہ تمام لوگوں کے لئے بہتر رہنما ثابت ہوسکتا ہے۔

''میری قید نے ایشور میں میرے یقین کو اور پختہ کرنے میں مدد کی۔ یہی یقین تھا، جس کی مدد سے میں دنیا کے طوفانوں کے درمیان سکون سے رہ سکا۔ میں نے خود احتسابی کی، میں خود کو کیسے بہتر کرسکتا ہوں؟ میں مسلسل خود سے یہ سوال پوچھتا رہا۔ میں نے محسوس کیا کہ فکر کوئی مدد نہیں کرتی۔ اس کے برخلاف، یہ فیصلہ میں رکاوٹ ڈالتی ہے۔ یہ شخص کو دوسروں کی مدد کرنے سے روکتی ہے اور ترقی کو پامال کرتی ہے۔ میں خود کو پوری طرح سے ایشور کی خواہش پر چھوڑ کر اپنی تمام نفسیاتی الجھنوں سے آزاد ہوجاتا ہوں۔ میرا ماننا ہے کہ سب کچھ ایشور کی خواہش سے ہوتا ہے۔ وہ مہربان ہے نہ کہ جابر۔ شخص کے ساتھ جو کچھ بھی ہو رہا ہے، اسی کی مرضی ماننا چاہئے۔ کسی فرد کی زندگی میں اس اصول کے مطابق جو بھی وقوع پذیر ہوتا ہے، اسے اس کی خواہش ماننا چاہئے، تبھی کوئی بھی شخص ہر حالت میں سکون کی زندگی بسر کرسکتا ہے۔''★★

مرارجی بھائی میں صرف ایک بات تھی کہ انھیں اپنے بیٹے پر مکمل بھروسہ تھا۔ ایک مرتبہ میں نے ان سے کہا تھا کہ آپ دلیل کے ساتھ کانتی ڈیسائی کا دفاع کیوں کررہے ہیں؟ اس سوال سے ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ انھوں نے مجھے کنبہ میں پہلے کسی شخص کے ذریعہ کی گئی خودکشی کی دردناک کہانی سنائی۔ ان سے بات چیت کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ انھیں یہ ڈر ستا رہا تھا کہ کہیں ان کے بیٹے کے ساتھ سختی کرنے کا نتیجہ ایک تکلیف دہ واقعہ کا غماز نہ ہو۔

میں جنتا سرکار کے گرنے کے بعد بھی مرارجی ڈیسائی سے مسلسل رابطہ میں رہا۔ سمندر کے سامنے ممبئی کے نریمن پوائنٹ میں واقع ان کی

★ مرارجی ڈیسائی 'دی اسٹوری آف مائی لائف' جلد III، ایس چند اینڈ کمپنی لمیٹڈ، 1979، صفحہ 131-130

★★ مرارجی ڈیسائی 'دی اسٹوری آف مائی لائف' جلد III، ایس چند اینڈ کمپنی لمیٹڈ، 1979، صفحہ 137-136

رہائش گاہ میں ان کی زندگی انتہائی سادہ اور قابل فخر تھی، جہاں 10/اپریل 1995 کو انھوں نے آخری سانس لی۔ وہ 99 سال کی عمر میں بھی ذہنی طور پر چست تھے، جو ان کی سادگی، ڈسپلن اور وقف کردینے والی زندگی کا شاہد تھا۔

جب جنتا پارٹی اپنے ہی ذریعہ لائے گئے طوفان سے گزر رہی تھی، تب ہم میں سے کئی لوگ جے پرکاش نارائن کی رہنمائی کی کمی کا احساس کررہے تھے۔ وہ جمہوریت نواز ان ہزاروں کارکنان میں سے عظیم تر تھے، جنھیں اس وقت گرفتار کرلیا گیا تھا، جب اندرا گاندھی نے جمہوریت کی شمع گل کردی۔ جیل میں اپنی ناسازی طبع، کمزور جسم اور کڈنی کے بیکار ہوجانے پر بھی وہ مسلسل دھرم یدھ لڑتے رہے اور ایمرجنسی حکومت کو ختم کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ بالآخر ملک کی حسیات کو بیدار رکھنے والے اس سپوت نے 8/اکتوبر 1979 کو آخری سانس لی۔ شاید سب سے زیادہ جذباتی خراج عقیدت انھیں اٹل جی نے پیش کی۔ انھوں نے کہا 'جے پی صرف ایک شخص کا نام نہیں تھا، وہ انسانیت کی مثال تھا۔ جب لوگ انھیں یاد کرتے ہیں تو ان کے دل میں دو تصاویر ابھرتی ہے۔ ایک شرشیا (بستر مرگ) پر لیٹے بھیشم پتامہ کی یاد دلاتی ہے۔ بھیشم پتامہ اور جے پی میں صرف ایک فرق تھا۔ پتامہ نے مہابھارت کی لڑائی کوروں کے لئے لڑی تھی، جبکہ جے پی نے ایمرجنسی کے خلاف جنگ میں انصاف کے لئے لڑائی لڑی۔ دوسری تصویر جو یاد آتی ہے، وہ صلیب پر چڑھے عیسیٰ مسیح کی ہے، جے پی کی زندگی عیسیٰ مسیح کی قربانیوں کی یاد دلاتی ہے۔

خودکش 'دوہری رکنیت' تنازعہ

1980 کے پارلیمانی الیکشن میں جنتا پارٹی کی شکست کا اندازہ مجھے پہلے سے ہی تھا۔ یہ شکست انتہائی سنگین تھی۔ اس نے ظاہر کیا کہ رائے دہندگان 1977 کی عوامی رائے کے ساتھ دھوکہ دہی کے لئے پارٹی کو سزا دینا چاہتے ہیں۔ 1977 میں 298 سیٹوں کے مقابلہ پارٹی کو صرف 31 سیٹیں حاصل ہوئیں۔ ان میں جن سنگھ کی سیٹیں 1977 میں 93 کے مقابلہ محض 16 تھیں۔ دوسری جانب اندرا گاندھی کے زیر قیادت کانگریس (آئی) شاندار طریقہ سے واپس آئی اور 1977 کے 153 سیٹوں کے مقابلہ 1980 میں 351 سیٹوں پر جیت درج کرسکی، جو 542 رکنی ایوان میں تقریباً دوتہائی اکثریت تھی۔

بعد میں کہنے کو کچھ لوگ کہہ سکتے ہیں کہ تمام حلیف پارٹیوں کے انضمام کی جگہ پر ان کا اتحاد بننا زیادہ مفید ثابت ہوتا۔ ایمرجنسی کے دوران جو ذہنی حالت تھی، اس سے ایسا محسوس ہورہا تھا کہ تمام جمہوری پارٹیوں کا ایک اسٹیج ہی کانگریس پارٹی کو شکست سے ہمکنار کرسکتا ہے۔ جے پرکاش بھی ایک طاقتور سیاسی ڈھانچہ کے خواہش مند تھے۔

حالانکہ انضمام کا فیصلہ غلط نہیں تھا، لیکن دو وجہ سے یہ جنتا پارٹی کے لئے نقصان دہ ثابت ہوا۔ پہلا کچھ انتہائی خواہشات سے پُر لیڈروں کا خود پر مرکوز ہونا اور غیر ڈسپلن رویہ اختیار کرنا، جس کی وجہ سے انھوں نے تاناشاہی کے خلاف اتنی مشکل سے ملے فائدہ کو مضبوط کرنے کے بجائے اپنے انفرادی مفاد کو اہمیت دی۔ دوسری وجہ، کچھ لیڈروں کو یہ خوف کھائے جارہا تھا کہ اس وقت کے جن سنگھ کے لیڈران جلد ہی جنتا پارٹی پر اپنا تسلط قائم کرلیں گے۔ اس وجہ سے جب ممبرشپ مہم شروع کرنے اور تنظیمی الیکشن کرانے کی بات آئی تب انھوں نے 'دوہری ممبرشپ' کا ایشو اٹھایا۔

خاص طور پر 'دوہری ممبرشپ' کا خیال مدھو لمیئے کا ذہنی اختراع تھا، جس کا مقصد جنتا پارٹی کے ان ممبروں کو کمزور کرنا تھا، جو پہلے جن سنگھ کا

حصہ تھے اور مسلسل سنگھ سے جڑے ہوئے تھے۔ جب جنتا پارٹی کی تشکیل کو ایک سال بھی نہیں ہوا تھا تب لمیئے، جو پارٹی کے جنرل سکریٹری تھے، نے اس بات پر زور دیا کہ جنتا پارٹی کا کوئی بھی ممبر ایک ہی ساتھ سنگھ کا بھی رکن نہیں ہو سکتا۔ حالانکہ لمیئے ایک تیز دماغ اور دانشور شخص تھے، لیکن جن سنگھ کے تئیں ان کے اندیشہ نے سیاسی منظر نامہ کو متاثر کیا۔ دراصل انھوں نے اپنے کئی نزدیکی دوستوں کو یقین دلایا تھا کہ جنتا پارٹی کا ٹوٹنا ایک 'تاریخی ضرورت' ہے جسے انھوں نے اسے اپنا 'ذاتی مشن' بنا لیا ہے۔

لمیئے کا مطالبہ اس وقت کے جن سنگھ ممبران پارلیمنٹ کو پریشان، کمزور اور پیچھے دھکیلنے کی ایک غیر اخلاقی کوشش تھی، جو جنتا پارٹی کا سب سے بڑا حصہ دار تھا۔ لوک سبھا میں اس کے ایک تہائی ممبران پارلیمنٹ تھے، پھر بھی جب مرارجی ڈیسائی نے اپنی 19 رکنی کابینہ میں ہمیں صرف 3 مکھے دیئے، ہم نے پھر بھی اس کی شکایت نہیں کی۔ کوئی بھی ہماری نوتشکیل پارٹی اور اتحاد کو بنائے رکھنے کے ہمارے عزم پر سوالیہ نشان نہیں لگا سکتا۔ بدقسمتی سے ہماری صرف ایک ہی 'غلطی' تھی کہ جن سنگھ، جنتا پارٹی کے تمام پانچ حلیفوں کانگریس (او)، لوک دل، سوشلسٹ پارٹی اور جگ جیون رام کی کانگریس فارڈیموکریسی (سی ایف ڈی)، میں سے زمینی سطح پر سب سے زیادہ منظم تھا۔ نوتشکیل شدہ جنتا پارٹی کا اپنا کوئی تنظیمی نیٹ ورک نہیں تھا۔ نوتشکیل پارٹی میں قومی قد کے کچھ ہی لیڈر تھے، لیکن جن سنگھ نے پارٹی کارکنان کی لمبی فوج تیار کی تھی۔ اس کے ڈسپلن کیڈر کی جڑیں ملک کے بڑے حصوں میں پھیلی تھی، جسے جنتا پارٹی کے تمام حلیفوں کو، جو اپنی پرانی شناخت کوئی پارٹی کی شناخت میں تحلیل کر چکے تھے، اپنی مضبوطی کے وسیلہ کے طور پر استعمال کر سکتے تھے۔

بدقسمتی سے مدھو لمیئے اور کچھ دیگر لیڈر اسے خطرہ کی شکل میں دیکھتے تھے۔ انھوں نے اندازہ لگایا کہ ممبرشپ مہم کی شروعات میں اور ضلع، ریاست اور قومی سطح پر تنظیمی الیکشن میں ہم جن سنگھ والے پارٹی کا کنٹرول اپنے ہاتھوں میں لے لیں گے۔ یہ بے بنیاد خوف 'دوہری ممبرشپ' تنازع کی بنیادی جڑ تھا۔ پارٹی میں دیگر لوگوں کو اس خوف سے آگاہ کرنے کے لئے لمیئے اور ان کے دوستوں نے ایک 'کانا پھوسی مہم' کا آغاز کیا کہ جنتا پارٹی مسلم ووٹروں کو دور کر دے گی★ اگر جن سنگھ والوں کو سنگھ کے ساتھ اپنے تعلقات بنائے رکھنے کی اجازت دی جائے گی۔

★ 1974 کے خاتمہ کے وقت نئی دہلی میں وٹھل بھائی پٹیل ہاؤس میں اہم واقعہ رونما ہوا۔ جے پی نے مختلف اپوزیشن پارٹیوں کے لیڈروں اور مقبول عام جمہوریت نوازوں کی ایک میٹنگ طلب کی، جس میں یہ بحث کی جا سکے کہ کس طرح سے اندرا گاندھی کی تاناشاہی حکومت کے خلاف تحریک کو مزید مضبوط بنایا جا سکتا ہے۔ وہاں موجود ممبروں کو خطاب کرتے ہوئے جموں وکشمیر سے ایک ممبر پارلیمنٹ شمیم احمد شمیم نے یہ گزارش کی کہ مسلم فرقہ جے پی تحریک کے تئیں جن سنگھ کے سبب متوجہ نہیں ہے۔ اس پر اٹل جی نے فوراً ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے کہا 'جن سنگھ چاہتا ہے کہ سماج کا ہر طبقہ جے پی تحریک سے وابستہ ہو، پھر بھی اگر جن سنگھ کی موجودگی کے سبب رکاوٹ پیدا ہوتی ہے تو ہم باہر رہنے کے لئے تیار ہیں۔' اٹل جی کی دخل اندازی کا مطلب دھمکی دینا نہیں تھا اور نہ ہی اس سے یہ احساس ہوا، پھر بھی اس ہال میں موجود تقریباً تمام لوگوں نے ایک آواز میں کہا کہ 'جن سنگھ کے باہر ہونے کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ ہم اس تحریک میں آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو چاہتے ہیں۔'

یہ غلط نظریہ کہ جن سنگھ کے جے پی تحریک میں شامل ہونے سے یہ 'فرقہ وارانہ' ہو جائے گا اور مسلمانوں کو دور کر دے گا، 1977 کے لوک سبھا الیکشن کے نتائج سے صاف ہو گیا۔ کانگریس کے ذریعہ پھیلائی گئی افواہ کے باوجود کہ جنتا پارٹی کو ووٹ دینے کا مطلب ہے جن سنگھ کو ووٹ دینا، ہندو مسلم دونوں نے مل کر پورے جوش کے ساتھ جنتا پارٹی کے امیدواروں کو ووٹ دیے۔

اٹل جی، نانا جی دیشکھ اور میں نے فطری طور پر خود کو سنگھ سے علیحدہ کرنے کے مطالبہ کی شدید مخالفت کی۔ جو بھی ہو، ہم نے جن سنگھ کے ساتھ دیرینہ تعلقات کو جے پرکاش نارائن اور 'جمہوریت بچاؤ' مہم کے دیگر لیڈروں کے سامنے جنتا پارٹی کے قیام سے قبل ہی واضح کر دیا تھا، اس لئے ہم نے لمیئے اور دیگر لیڈروں کی مخالفت کرتے ہوئے یہ سوال کیا کہ 'آپ جنتا پارٹی کی تشکیل کے بعد دوہری ممبرشپ کا سوال کیسے اٹھا سکتے ہیں؟ ہم، جنھوں نے تقریباً اپنی ساری زندگی سنگھ کے سویم سیوکوں کے طرز پر گزاری ہے، کیسے اچانک اس سے سارے رشتے منقطع کر دیں، وہ بھی اس پارٹی کے لئے، جس سے ہم کچھ ہی ماہ قبل جڑے ہیں—؟'

ہم نے دلیل دی کہ 'سنگھ ایک غیر سیاسی تنظیم ہے، جو ہماری تعلیم، تہذیب اور اقدار کی بنیاد پر ہندوستان کی قومی بیداری کے لئے پرعزم ہے۔' ہم نے بتایا کہ 'یہ ایک اصلاحی تنظیم ہے، جو چھوا چھوت جیسی برائیوں، جو کہ ہندو سماج پر برا اثر ڈال رہی ہے، کو ہٹانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اگر ہم سنگھ سے جڑے ہیں تو جنتا پارٹی میں دوسرے لوگ بھی ہیں، جو کسی دیگر سیاسی پارٹی سے جڑے ہیں۔ مثال کے طور پر، چرن سنگھ ایک کٹر آریہ سماجی تھے۔ آریہ سماج کا ایک اہم عنصر ہے 'شدھی' یا 'بنیادی مذہب میں دوبارہ واپسی'۔ کیا اس بنیاد پر انھیں جنتا پارٹی کی رکنیت سے ہٹایا جا سکتا ہے، کیونکہ کچھ لوگوں کے لئے 'شدھی' عذاب ہے۔

2 ستمبر 1979 کو جنتا پارٹی کی قومی مجلس عاملہ کی میٹنگ کے بعد میں نے بچپن سے سنگھ کے ساتھ اپنے تعلقات کے بارے میں کہا 'مجھے حب الوطنی اور عوامی سلوک کی ٹریننگ سنگھ سے ملی۔ ملک میں دوسری کوئی تنظیم نہیں ہے، جس کے پاس وقف شدہ اور غیر مفاد پرست لوگوں کا اتنا بڑا اجتماع ہو اور جس میں تعمیری کام کرنے کی اہلیت ہو۔ سنگھ میرے لئے اپنے اسکول کے مساوی ہے اور مجھے اس کے ساتھ اپنی وابستگی پر فخر ہے۔ کتنی بھی مذمت کیوں نہ کی جائے، میں سنگھ کے ساتھ اپنا رشتہ منقطع نہیں کروں گا۔'

میں نے یہ بھی دھمکی دی کہ 'سنگھ کے سلسلہ میں وہم پیدا کرنے کا مطلب ہے ایک 'خودکش رویہ' اور کانگریس کے ہاتھ کی کٹھ پتلی بننا۔ لمیئے اور ان کے ساتھی کچھ مہینوں میں ہی وہ کام کرنے میں کامیاب ہوں گے، جو اندرا گاندھی کئی برسوں میں کرنے میں ناکام رہیں۔ میری بات سچ ثابت ہوئی۔ 'دوہری ممبرشپ' تنازعہ نے اور کچھ کیا ہو یا نہ کیا ہو، جنتا پارٹی کے اتحاد کو تباہ ضرور کر دیا اور اس کی تقسیم کو بھی یقینی بنا دیا۔

دوہری رکنیت کے ایشو پر ہوئے تلخ تنازعہ پر ایک بہترین مشورہ مقبول عام گاندھی وادی اور مجاہد آزادی اچیوت پٹوردھن نے دیا۔ انھوں نے 9 جون 1979 کو 'انڈین ایکسپریس' میں 'جنتا، آر ایس ایس اینڈ دی نیشن' کے عنوان کے تحت ایک مضمون لکھا— 'ایمرجنسی کے خلاف عوامی جدوجہد میں قابل ستائش کارفرمائی انجام دینے کے سبب بھارتیہ جن سنگھ کو جنتا پارٹی کے اہم حلیف کے طور پر شامل کیا گیا تھا۔ ایمرجنسی کے خاتمہ کے بعد سے اب تک جن سنگھ یا سنگھ نے ایسا کیا کیا کیا، جس نے مسٹر مدھو لمیئے مسٹر راج نارائن اور ان کے ساتھیوں کو انھیں بدنام کرنے کی مشتعل مہم چھیڑنے کے لئے مجبور ہونا پڑا۔

یہاں میں ذکر کرنا چاہوں گا کہ ایک اہم سماج وادی لیڈر، جو لمیئے سے دوہری رکنیت کے معاملہ میں نااتفاقی رکھتے تھے، وہ جارج فرنانڈیز تھے۔ بدقسمتی سے پٹوردھن کی درست صلاح اور فرنانڈیز کے ساتھیوں کا مشورہ اور انھیں قائل کرنے کی کوشش ضائع گئی۔ اس وقت تک چرن سنگھ، جنھوں نے لمیئے کی 'دوہری رکنیت' کی رائے کی حمایت کی تھی، اب جنتا پارٹی سے الگ ہونے کی کوشش میں تھے اور مرار جی ڈیسائی کی حکومت کے زوال کی وجہ بنے۔

ایک دن چندر شیکھر پارلیمنٹ میں میرے دفتر میں یہ کہتے ہوئے آئے کہ انھیں اٹل جی اور مجھ سے ضروری بات چیت کرنی ہے۔ انھوں نے ہمیں بتایا کہ ہیم وتی نندن بہوگنا، جو اس وقت چرن سنگھ کے خیمے میں تھے، اور کچھ دیگر لوگ بھی جنتا پارٹی میں ہی رہنا چاہتے ہیں، اگر جن سنگھ مرار جی بھائی کی حکومت کا حصہ نہ ہو۔ بہوگنا نے یہ واضح اشارہ دیا تھا۔ چندر شیکھر کے رخصت ہونے کے بعد ہم نے آپس میں اس موضوع پر تفصیل سے تبادلہ خیال کیا۔ برج لال ورما، جو وزارت میں جن سنگھ کے تیسرے وزیر تھے، سے مشورہ کرنے کے بعد ایک نتیجہ اخذ کیا گیا۔ ہم تینوں پارلیمنٹ میں وزیر اعظم کے کمرہ میں گئے اور انھیں بتایا کہ ہم حکومت کے وجود اور استحکام کے لئے حکومت سے الگ ہونے کے لئے تیار ہیں۔

مرار جی بھائی نے اس پیشکش پر غور تک نہیں کیا۔ انھوں نے یہ کہتے ہوئے فوراً اسے ٹھکرا دیا' آپ کیوں استعفیٰ دیں گے؟ آپ نے کیا غلطی کی ہے؟ ہوسکتا ہے کہ آپ کی پیشکش میری حکومت کے لئے مددگار ثابت ہو، لیکن میرے لئے آپ کا استعفیٰ قبول کرنا غیر اخلاقی ہوگا۔ آپ کو حکومت چھوڑنے کے لئے کہنے کی بجائے میں خود حکومت چھوڑنا پسند کروں گا۔' 15 ر جولائی کو جب دل بدل کے سبب مرار جی بھائی نے اپنی اکثریت کھودی تو انھوں نے استعفیٰ دے دیا۔ غیر آئینی معاہدہ کرنے کے بجائے انھوں نے اپنے عہدہ کو قربان کردینا مناسب سمجھا۔

ان سب واقعات سے میں دلبرداشتہ ہوگیا۔ میں کئی ماہ تک جنتا پارٹی کے اپنے کچھ ساتھیوں کے ذریعہ اپنائے گئے اس خودکش رویہ کی بنیادی وجوہات پر غور وفکر کرتا رہا۔ اس رویہ کا موازنہ میں صرف 'لیمنگس' کے برتاؤ سے کرسکا، جو تنہا ایک نسل ہے، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ اجتماعی خودکشی کرتے ہیں، وہ لوگ جنھوں نے پارٹی کو توڑ دیا، جانتے تھے کہ ان کے اس قدم سے حکومت گر جائے گی اور اندرا گاندھی کے عروج کا راستہ صاف ہوجائے گا، لیکن انھوں نے اس کی بالکل پرواہ نہیں کی۔

'دوہری رکنیت' کے اس پورے تنازع میں دو تعمیری دخل اندازی ہوئی۔ ایک اٹل جی کے ذریعہ اور دوسرا بالا صاحب دیورس کے ذریعہ، جو اس وقت سنگھ کے سرسنگھ چالک تھے۔ 'انڈین ایکسپریس' میں 2 راگست 1979 کو 'وی آر آل ٹو بلیم' (ہم سب قصوروار ہیں) کے نام سے غیر جانبدارانہ مضمون میں اٹل جی نے چار نکات کی وضاحت کی۔ (الف) جنتا پارٹی کا مسئلہ خاص طور سے چرن سنگھ کے مرکزی کابینہ میں خود کے لئے نمبر 2 کی پوزیشن نہ قبول کر پانے کے سبب پیدا ہوا۔ (ب) سنگھ کا ایشو چرن سنگھ کے کچھ حامیوں کے ذریعہ ذہنی اختراع سے تیار کی گئی ایک سازش تھی، جو اس وقت کے جن سنگھ کے ممبروں کے ذریعہ مرکزی حکومت کو غیر مستحکم نہ کرنے کے خلاف رچی گئی تھی۔ (ج) جن سنگھ کا ملک کے فرقہ وارانہ تشدد سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ (د) یہ اندیشہ کہ سنگھ کا مقصد سیاسی اقتدار پر قابض ہونا ہے، بالکل بے بنیاد ہے۔ اٹل جی نے اپنے مضمون کا اختتام سنگھ کو تین مشورہ دیتے ہوئے کیا۔ (1) سنگھ سے منسلک جرنلس کو عالمی سیاست میں چل رہے اقتدار کے کھیل میں فریق بننے کی ضرورت نہیں ہے۔ (2) سنگھ کو ان یوتھ اکائیوں، جو سیاسی پارٹیوں سے رابطہ رکھتے ہیں اور ٹریڈ یونین میں شامل نہیں ہونا چاہئے۔ (3) سنگھ کو رسمی طور پر اعلان کرنا چاہئے کہ ان کے ذریعہ قبول کئے گئے 'ہندو راشٹر' کا مطلب 'ہندوستانی راشٹر' سے ہے۔

پہلے دو مشوروں کا مقصد ان شکوک کو دور کرنا تھا کہ سنگھ کی کوئی سیاسی خواہشات ہیں۔ تیسرے کا مقصد سنگھ کی سیکولرازم کے لئے پابند عہد ہونے کی وضاحت کرنا، جو مرار جی ڈیسائی اور جگ جیون رام نے بھی دوہرایا تھا۔

ناگپور میں اکتوبر 1979 میں وجے دشمی تہوار پر اپنے سالانہ خطاب میں بالا صاحب دیورس نے ایک اہم نظریہ پیش کیا، جس کی سچائی آج بھی قائم ودائم ہے:

"کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ سنگھ بدل رہا ہے اور اسے آگے بھی بدلنا ہے۔ تمام جاندار فطری طور پر بدلتے ہیں۔ یہ ان کی ترقی کا غماز ہے، جو بدل نہیں رہا ہے، وہ زندہ نہیں ہے، مردہ ہے، لیکن اس تبدیلی کو اپنی شہ رگ کاٹ کر نہیں اپنایا جاسکتا۔ سنگھ بھی وقت کی ضرورتوں کے حساب سے تبدیل ہو رہا ہے اور مستقبل میں بھی تغیر پذیر رہے گا۔"

پہلی مرتبہ جب 'دوہری رکنیت' کے تنازعہ نے جنتا پارٹی کی تباہی کے لئے سر اٹھایا تھا، اس کے تین دہائی گزر چکے ہیں۔ جب میں ماضی کے جھروکوں سے دیکھتا ہوں تو خود سے پوچھتا ہوں کہ اس کے حامیوں نے کیا حاصل کیا؟ یقیناً وہ جن سنگھ کی سیاسی رفتار کو روک نہیں سکے، بلکہ وہ خود الگ تھلگ پڑ گئے۔ میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ بالآخر ہمیں جنتا پارٹی سے بے دخل کر کے انھوں نے ہم پر بہت بڑی مہربانی کی۔ اس کی وجہ سے ہی ہم بھارتیہ جنتا پارٹی کی شکل میں اپریل 1980 میں خود کو از سر نو زندہ کر سکے اور اس طرح آنے والے برسوں میں ہندوستانی سیاست کا ایک مایہ ناز باب درج کر سکے۔

4

کمل کا کھلنا
بھارتیہ جنتا پارٹی کا جنم

ریاستوں یا خود انسانی مسائل کا تب تک خاتمہ نہیں ہوگا، جب تک فلاسفر و دانشور اس دنیا کا راجہ نہیں بن جاتے یا جب تک وہ، جنہیں ہم راجہ یا حکمراں کہتے ہیں، حقیقت میں اور مکمل طور پر فلاسفر و دانشورٔ نہیں بن جاتے اور اس طرح سیاسی اقتدار ایک ہی ہاتھوں میں نہیں آجاتا۔

— افلاطون، ایک عظیم یونانی مفکر

ایک موضوع، جس نے پوری سیاسی زندگی میں مجھے حیرت زدہ کیا ہے، وہ یہ ہے کہ ہندوستانی رائے دہندگان الیکشن میں اپنی پسند کا تعین کیسے کرتے ہیں؟ کئی مرتبہ ان کے رجحانات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، لیکن بیشتر نہیں۔ رائے دہندگان کی گنجلک اتفاق رائے کے سبب عموماً الیکشن میں نتائج کا قیاس لگانا ناممکن ہوتا ہے، حالانکہ کئی مرتبہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ووٹروں کا اجتماعی برتاؤ، کسی ایک جذبہ سے متاثر نہیں ہوتا اور اس سے ان کی پسند کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔'اجتماعی حسیت' اور 'اجتماعی ذہنیت' کا نظریہ تیزی سے ماہرین نفسیات کا دھیان اپنی جانب مرکوز کررہا ہے۔ رسمی تربیت حاصل نہ کرنے کے باوجود ایک تجربہ کار سیاسی کارکن اکثر یہ پیشین گوئی کرسکتا ہے کہ انتخابی لہر کی سمت کس جانب ہے۔

میں نے ایسا 1977 کے عام الیکشن سے پہلے کیا تھا، جو ایمرجنسی کے بعد ہوئے تھے اور میں نے دوبارہ ایسا ہی 1980 کے شروع میں کیا، جب چھٹی لوک سبھا تحلیل ہونے کے بعد وسط مدتی انتخاب ہوئے تھے۔ میں جانتا تھا کہ جنتا پارٹی کا صفایا ہوجائے گا اور اندرا گاندھی دوبارہ اقتدار پر قابض ہوں گی۔ اس کی وجہ صاف تھی۔ اگر ایمرجنسی کے خلاف غم وغصے کی لہر نے 1977 میں جنتا پارٹی کو اقتدار کا تحفہ دیا تو آپسی رنجشوں سے جنتا پارٹی کی حکومت گرنے سے پیدا ہوئی ناراضگی نے لوگوں کے اعتماد کو چکنا چور کردیا اور یہ اس مرتبہ رائے دہندگان کے رویہ کو متاثر کرنے والی تھی۔

جنتا پارٹی کی زبردست شکست نے مجھے رائے دہندگان کے رویہ کے ایک دیگر پہلو سے بھی روشناس کرایا۔ جب رائے دہندگان ایک

گمراہ سیاسی پارٹی کو سبق سکھانا چاہتے ہیں تو اکثر اس پارٹی کے خلاف ناراضگی کے سبب۔ 1980 میں ہم نے یہ بھی سیکھا کہ گہرا موہ بھنگ بھی انھیں اس پارٹی کو سزا دینے کے لئے مجبور کرسکتا ہے، جو ان کی امیدوں پر کھری نہیں اترتی۔

1980 کے الیکشن میں اندرا گاندھی کا نعرہ تھا 'منتخب کریں ایسی سرکار جو کام کرسکے۔' اس کا رائے دہندگان پر گہرا اثر پڑا، کیونکہ وہ جنتا پارٹی کی مسلسل اندرونی لڑائی سے ناراض تھے۔ مرار جی بھائی کی حکومت کی مختلف حصولیابیوں — جمہوریت اور شہری آزادی کے ازسرنو قیام، قیمتوں کو قابو میں لانا، زراعت اور صنعتی ترقی، پاکستان اور چین کے ساتھ بہتر تعلقات، سوویت یونین کے ساتھ اپنے روایتی رشتوں کو بنائے رکھتے ہوئے امریکہ کے ساتھ تعلقات کو مضبوط بنانا وغیرہ — کے باوجود جنتا پارٹی کے کچھ لیڈروں کے خودکش سیاسی رویہ کے سبب انھیں گہن لگ گیا۔ اس نے اندرا گاندھی کی جنتا سرکار کو دیئے قابل اعتراض نام 'کھچڑی سرکار' کو تقویت بخشی۔

جن سنگھ کے رکن جنتا پارٹی سے برخاست

انتخابی شکست نے جنتا پارٹی کے اندر 'دوہری رکنیت' کے تنازع کو اور گہرا کردیا، جو پارلیمانی الیکشن تک حاوی رہا۔ 25 فروری 1980 کو جگ جیون رام نے پارٹی صدر چندر شیکھر کو ایک خط لکھ کر اس ایشو پر بحث و مباحثہ کا مطالبہ کیا۔ شکست کی پوری ذمہ داری ان لوگوں کے سر ڈالنے کی کوشش کی گئی، جو جن سنگھ سے منسلک تھے اور جو اس بات پر سختی سے قائم تھے کہ وہ سنگھ سے اپنے رشتے منقطع نہیں کریں گے۔ اٹل جی اور میں نے اس کوشش کی شدید مخالفت کی۔

میں نے پارٹی کی ایک میٹنگ میں کہا کہ ہمیں پارٹی میں ہریجنوں اور سیاسی اچھوتوں کی طرح دور کردیا گیا ہے۔ میں نے کہا 'جنتا پارٹی کے پانچ حلیف تھے — کانگریس (او)، بھارتیہ لوک دل، سوشلسٹ پارٹی، سی ایف ڈی اور جن سنگھ۔ سیاسی نقطہ نظر سے ان میں سے چار دو جگ تھے جبکہ جن سنگھ کا مقام ہریجن جیسا تھا، جسے کنبہ میں شامل کیا گیا ہو۔ 1977 میں اسے پارٹی کا حصہ بناتے وقت زبردست جوش وخروش کا مظاہرہ کیا گیا تھا، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ کنبہ میں ایک 'ہریجن' کی موجودگی نے مسائل کی شروعات کردی۔

کنبہ کا برا چاہنے والوں نے اس بنا پر ان کو نظرانداز کیا، کیونکہ ان کے ساتھ 'ہریجن' ہیں، آپ جن سنگھ کو الگ کردیں گے تبھی ہم آپ سے جڑیں گے۔ سیاسی دنیا میں جنتا پارٹی کے خلاف بہت سارے لوگوں کی یہ سوچ بن گئی تھی، لیکن ان کے پاس ہریجن بچوں کے اخلاقیات کے تعلق سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ حقیقت میں وہ ان کی اکثر تعریف کرتے تھے، لیکن وہ اس کی ذات کو نہیں بھلا پاتے تھے اور اس کے والدین ہی اس کے لئے گلے کی ہڈی اور رکاوٹ بن گئے تھے۔

ایسا سوچنے والا میں تنہا نہیں تھا بلکہ ملک بھر میں موجود جن سنگھ کے لاکھوں کارکنان اور حامیوں کی گونج اس میں شامل تھی۔ فروری-مارچ 1980 میں جن سنگھ کے سینئر عہدیدار سندر سنگھ بھنڈاری اور میں نے ملک گیر دورہ کرکے زمینی سطح پر جنتا پارٹی کے بارے میں لوگوں کے خیالات معلوم کرنے کی کوشش کی۔ جہاں بھی ہم گئے، ہم نے پایا کہ جن سنگھ کے کارکنان نے اس بات پر سخت اعتراض کیا تھا کہ پارٹی کے اندر ان کے ساتھ دوئم درجہ کا سلوک کیوں جار ہا ہے۔ جنتا پارٹی کے اندر سنگھ مخالف مہم نے 1980 کے لوک سبھا الیکشن میں ان کے جذبہ کو سرد کردیا۔ اس سے واضح طور پر کانگریس کو فائدہ پہنچا اور انتخابات میں اس نے جنتا پارٹی کے مظاہرہ کو گرانے میں اپنا رول نبھایا۔

اپنی فتح سے سرشار اندرا گاندھی نے 1980 کے ابتدائی مہینوں میں کئی ریاستوں میں اسمبلی الیکشن کرانے کا فیصلہ لیا۔ اس سے جنتا پارٹی

کے اندر'دوہری رکنیت' کے تنازع نے شدت اختیار کرلی، جولوگ جن سنگھ کے اراکین کومعطل کرنا چاہتے تھے، ان کی آواز مسلسل تیز ہوتی گئی۔ اس سلسلہ میں اپریل کے پہلے ہفتہ میں دواہم واقعات رونما ہوئے۔ 4/اپریل کو جنتا پارٹی کی قومی مجلس عاملہ کی اہم میٹنگ نئی دہلی میں منعقد کی گئی، جس میں 'دوہری رکنیت' کے ایشو پر دائمی فیصلہ لیا جانا تھا۔ اس میٹنگ کے نتیجہ کا اندازہ لگا کر جن سنگھ کے ہم سب سابق اراکین نے فیصلہ لیا کہ ہم اگلے دن دہلی میں قومی اجلاس کریں گے۔ مرارجی ڈیسائی اور کچھ دیگر ممبروں نے ہمیں باہمی معاہدہ کے اقبال نامہ کی بنیاد پر جنتا پارٹی میں شامل رکھنے کی آخری کوشش کی، لیکن مستقبل اٹل تھا۔ جنتا پارٹی کی قومی مجلس عاملہ نے معاہدہ فارمولہ کو 14 کے مقابلہ میں 17 ووٹوں سے نامنظور کردیا اور تجویز پیش کردی کہ جن سنگھ کے اراکین کومعطل کردیا جائے۔

عجیب اتفاق تھا کہ اگلے دن جگ جیون رام جنتا پارٹی چھوڑ کروائی بی چوہان کے زیر قیادت کانگریس (یو) میں شامل ہوگئے۔ چرن سنگھ نے لوک دل کے احیا کے لئے پہلے ہی پارٹی چھوڑ دی تھی، جس نے لوک سبھا الیکشن میں اچھا مظاہرہ کرتے ہوئے 41 سیٹیں حاصل کیں، لہٰذا اصل جنتا پارٹی میں جولوگ بچے تھے، وہ محض باقیات تھے، جن کی قیادت چندر شیکھر کررہے تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ باقیات بھی مختلف پارٹیوں میں ملتے گئے۔ کئی ناقدین پارٹی کا مذاق بنانے لگے۔ ایک فلمی گانے 'اس دل کے ٹکڑے ہزار ہوئے، کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا' میں انھوں نے لفظ 'دل' کی جگہ 'دَل' سے بدل کر طنزیہ انداز سے گایا — 'اس دَل کے ٹکڑے ہزار ہوئے، کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا۔'

6/اپریل 1980: ایک نئے سیاسی سفر کا مبارک آغاز

جنتا پارٹی سے ہماری معطلی ہم تمام کے لئے کافی راحت پہنچانے والی تھی، لیکن ساتھ ہی ہم کافی دلبرداشتہ تھے۔ کچھ بھی ہو 1977 میں جے پرکاش نارائن کی پکار پر جن سنگھ کا جنتا پارٹی میں مکمل طور سے غیر مشروط انضمام تھا۔ نفسیاتی اور سیاسی، دونوں اعتبار سے ہم نے خود کو پوری طرح جنتا پارٹی میں ضم کرلیا تھا۔ جن سنگھ سے جڑے ہم لوگ کبھی بھی گروپ بندی میں شامل نہیں ہوئے اور نہ ہی کبھی اقتدار میں رہتے ہوئے اپنے 'دھڑے' کو جانبدارانہ طریقہ سے فائدہ پہنچایا۔ اس کے برعکس ہم نے جنتا پارٹی کے اتحاد اور توازن کو برقرار رکھنے کے لئے کئی قربانیاں دیں، اس لئے جنتا پارٹی سے آخری وداعی کے وقت میرے اور میرے ساتھیوں کے دل میں ملاجلا تاثر تھا۔ بے چینی، اداسی، چھٹکارا پانے کی راحت اور آخر کار، اس آزادی کا حل!

ان ملے جلے تاثرات میں 6-5/اپریل 1980 کو دوروزہ قومی اجلاس نے ہم میں قوت اور عزم کا حوصلہ پیدا کیا۔ دہلی کے فیروز شاہ کوٹلہ میدان میں 3500 سے زیادہ اراکین جمع ہوئے اور 6/اپریل کو ایک نئی سیاسی پارٹی 'بھارتیہ جنتا پارٹی' (بی جے پی) کی تشکیل کا اعلان کیا گیا۔ اٹل بہاری واجپئی کو اس کا پہلا صدر منتخب کیا گیا۔ مجھے، سکندر بخت اور سورج بھان کے ساتھ جنرل سکریٹری کی ذمہ داری سونپی گئی۔ سیاسی گلیاروں میں یہ قیاس آرائی ہونے لگی کہ کیا نئی پارٹی جن سنگھ کو زندہ رکھ سکے گی؟ اٹل جی نے اپنے صدارتی خطبہ میں واضح طور پر اس قیاس آرائی پر لگام لگائی۔ انھوں نے کہا 'نہیں، ہم واپس نہیں جائیں گے۔ ہم یہ نہیں بتانا چاہتے کہ ہم کسی بھی طرح سے جن سنگھ کا احیا کریں گے۔ ہم جنتا پارٹی کے اپنے تجربات کا فائدہ اٹھائیں گے۔ ہمیں اس کے ساتھ بنے اپنے تعلقات پر فخر ہے۔ اب ہم اس سے الگ ہوچکے ہیں، ہم کسی بھی طرح سے اپنے ماضی سے الگ نہیں ہونا چاہیں گے۔ اپنی نئی پارٹی کی تشکیل کرتے ہوئے ہم مستقبل کی جانب دیکھتے ہیں پیچھے نہیں۔ ہم اپنے بنیادی ڈھانچہ اور اصولوں کی بنیاد پر آگے بڑھیں گے۔'

لہٰذا شروعات سے ہمارا زور جن سنگھ پر واپس لوٹنے کا نہیں تھا، بلکہ ایک نئی شروعات کرنے کا تھا۔ یہ پارٹی کے سینئر اراکین کے ذریعہ نئی پارٹی کے نام پر ہوئے گہرے تبادلہ خیال سے بھی واضح ہوتا ہے۔ کچھ لوگوں کو لگتا تھا کہ اس کو بھارتیہ جن سنگھ کہنا چاہئے، لیکن بھاری اکثریت نے اٹل جی کے ذریعے دیئے گئے نام 'بھارتیہ جنتا پارٹی' کی حمایت کی، جو ہمارے بھارتیہ جن سنگھ اور جنتا پارٹی، دونوں کے ساتھ قابل فخر تعلقات کو ظاہر کرتا تھا اور یہ وضاحت بھی کرتا تھا کہ اب ہم ایک نئی شناخت کے ساتھ ایک نئی پارٹی ہیں۔ ہم پرانے کو چھوڑے بغیر ایک نئی راہ پر گامزن ہونا چاہتے تھے۔ 'جنتا' لفظ کو شامل کر کے ہم نے ہندوستان کے لوگوں کو یہ واضح کر دیا تھا کہ ہم خود کو جنتا پارٹی کا سچا جانشین مانتے ہیں۔

جے پرکاش نارائن کے ساتھ ہمارے تعاون کا نئے نظریہ فکر پر کافی اثر پڑا۔ ہم ان کی شخصیت اور ان کے اصولوں سے بے حد متاثر تھے۔ یہ اثر اور بھی گہرا اس لئے تھا، کیونکہ انھوں نے خود کے بنائے گئے اصولوں کو ہمارے تعلقات کے سبب ختم کر دیا اور ایک قابل احترام اور باہمی رشتوں کی بنیاد ڈالی۔ ہماری نئی سوچ نئی پارٹی کے نشان سے بھی صاف ہوتی تھی۔ کوٹلہ میدان میں بی جے پی کے قومی اجلاس میں اسٹیج کے پیچھے جن سنگھ کے بانی ڈاکٹر شیاما پرساد مکھرجی اور مفکر و آدرش دین دیال اپادھیائے کے ساتھ ساتھ جے پرکاش نارائن کی بھی تصویر تھی۔

نئی پارٹی نے ایک نیا نشان اور جھنڈا بھی اپنایا۔ جن سنگھ کے 'دیئے' کا مقام 'کمل' نے لیا۔ نیا جھنڈا کچھ کچھ جنتا پارٹی سے مشابہ تھا۔ اس کا ایک تہائی حصہ ہرا اور دو تہائی زعفرانی تھا، جس میں کمل کا پھول بنا ہوا ہے۔ بعد میں کمل بی جے پی کا انتخابی نشان بھی بن گیا۔ اس کے بارے میں ایک دلچسپ واقعہ ہے۔ جنتا پارٹی سے علیحدہ ہونے کے بعد ہم نے اپنی الگ پہچان بنائی تھی، اس لئے ضروری تھا کہ ہم ووٹروں کے پاس جنتا پارٹی کے 'ہل لئے ہوا کسان' سے الگ انتخابی نشان کے ساتھ جائیں۔ الیکشن کمیشن میں ہمارے پاس پارٹی رجسٹریشن کے لئے کافی وقت نہیں تھا اور نہ ہی ہم اپنے پارٹی نشان پر الیکشن لڑ سکتے تھے، کیونکہ یہ ابھی تک مختص نہیں کیا گیا تھا۔

پارٹی کی جانب سے مجھے اس وقت کے چیف الیکشن کمشنر ایل ایل شکدھر سے اس موضوع پر تبادلہ خیال کرنے کے لئے جا رہے وفد کی قیادت کرنے کے لئے کہا گیا تھا۔ شکدھر نے مجھ سے کہا 'میرے لئے اس وقت ایک نئی پارٹی کو شامل کرنا مشکل ہے، کیونکہ انتخابی عمل شروع ہو چکا ہے اور آپ کی پارٹی ابھی تک رجسٹرڈ بھی نہیں ہوئی ہے۔ پھر بھی، آپ ان میں سے ایک نشان پسند کر سکتے ہیں، جو آزاد امیدواروں کے لئے ہے۔ میں آپ کے تمام امیدواروں کو یکساں نشان اپنانے کی اجازت دوں گا، جس سے کہ ان کی تنظیمی پہچان بن سکے۔'

ہم نے وہاں موجود نشانات کو دیکھا۔ ہمیں دیکھ کر خوشی ہوئی کہ کمل بھی ان میں سے ایک تھا، میں نے الیکشن کمشنر سے پوچھا کہ کیا وہ ہمیں 'کمل' کا نشان دے سکتے ہیں؟ شکدھر، جو جانتے تھے کہ ہم نے کمل اس لئے منتخب کیا ہے کیونکہ اسے پارٹی کے دہلی میں ہوئے تاسیسی اجلاس میں جھنڈے کے لئے چنا گیا تھا، ہماری جانب دیکھ کر مسکرائے اور کہا کہ آپ کی اپیل منظور کی جاتی ہے، لیکن میں نے یہ بھی دیکھا کہ آزاد امیدواروں کے لئے موجود نشانات میں گلاب بھی تھا۔ پھول والے دونوں نشان تقریباً مشابہ تھے۔ تب میں نے شکدھر سے اپیل کی کہ کیا وہ گلاب کو فہرست سے ہٹا سکتے ہیں، چونکہ ووٹر ایک ووٹر لسٹ پر دو پھول دیکھ کر حیرت میں پڑ جائیں گے۔ وہ پھر سے مسکرائے اور کہا کہ 'مطالبہ منظوری کے لائق ہے۔'

ایک دیگر اہم پہلو تھا، جہاں بی جے پی جن سنگھ سے الگ تھی۔ 80-1974 کی مدت کے دوران بڑی تعداد میں غیر سنگھ کارکنان ہماری جانب متوجہ ہوئے۔ وہ ایمرجنسی کی پیچیدہ مدت کے دوران اور بعد کے ہمارے کام سے متاثر تھے، اس لئے ہمارے لئے لازمی ہو گیا تھا کہ ہمارا تنظیمی نظام اور ترقی کی پالیسی علیحدہ ہو۔ جن سنگھ کی خصوصاً کیڈر مبنی ڈھانچہ کی جگہ پر ہم نے عوامی بنیاد کے ڈھانچہ کو اپنانے کا فیصلہ کیا۔

بی جے پی کی نظریاتی پہچان میں ایک چھوٹی مگر اہم تبدیلی بھی آئی۔ پنڈت دین دیال اپادھیائے کا 'ایکاتم مانوواد' بی جے پی کے لئے مشعل راہ بنا رہا، لیکن پارٹی نے گاندھی وادی سماج واد کے تئیں بھی اپنے عزم کا اظہار کیا۔ اس سے پارٹی کے اندر اور باہر، دونوں جگہوں پر ایک بحث شروع ہوگئی، جو آج بھی سیاسیات کے طلبا کو دلچسپ لگتی ہے۔ ہمارے فیصلہ میں کئی وجوہات کی کارفرمائی تھی۔

اولاً بی جے پی کی تشکیل اس وقت ہوئی، جب ہمیں زبردستی جنتا پارٹی سے الگ کر دیا گیا۔ دوسرے، نئی پارٹی نے مختلف پس منظر والے کئی اہم لوگوں کو اپنی جانب متوجہ کرنا شروع کر دیا۔ وہ جن سنگھ میں ہمارے ساتھ نہیں تھے، لیکن ایمرجنسی کے خلاف ہماری مضبوط لڑائی، جمہوریت میں ہمارا یقین، ہمارے آدرش اور عوامی زندگی میں ایمانداری کے تئیں ہمارا عزم، ان تمام چیزوں کی وہ ستائش کرنے لگے تھے۔ جنتا حکومت کے وزیر قانون شانتی بھوشن ہم سے جڑے اور ایسا ہی رام جیٹھ ملانی نے کیا، جو ایک مشہور وکیل ہیں اور ایمرجنسی کے خلاف ان کی حمایت سے انھیں قومی سطح پر مقبولیت حاصل ہوئی۔ ایک مشہور ماہر اقتصادیات جے ڈی سیٹھی نے ہم سے رابطہ کیا، کانگریس (او) کے سینئر لیڈر اشوک مہتا بھی بی جے پی میں شامل ہونے کے خواہش مند تھے۔

تیسرے گاندھی وادی سماج واد، ہمیں مکمل طور پر 'مکمل انسان دوستی' کے نظریہ کے موافق لگا اور یہ سماج واد کے مارکسوادی نظریئے سے بالکل مختلف تھا۔ دین دیال بھی اقتصادی مساوات، سودیشی، اقتصادی لامرکزیت، زراعت اور چھوٹی صنعتوں کی ترقی اور سرمایہ سے محنت کو زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ ان کے فلسفے میں طبقاتی کشمکش کا غلطیوں سے پر کمیونسٹ اصول شامل نہیں تھا۔ اس کی جگہ معاشرہ میں مختلف طبقوں کے باہمی انحصار پر زور دیتی تھی، جس میں کہا گیا تھا کہ سبھی ایک ساتھ مل کر سبھی شہریوں کے بہبود کے لئے کام کریں۔ ساتھ ہی مارکسوادی اصول جس میں انقلاب کے لئے تشدد ضروری سمجھا جاتا ہے اس کے برعکس گاندھی واد، معاشرتی اقتصادی تبدیلی کے لئے بغیر کسی سمجھوتے کے پرامن اور جمہوری طریقوں کو اپناتا ہے۔

آخر میں ہم کمیونسٹوں کے اس دعوے کو غلط ثابت کرنا چاہتے تھے کہ وہی غریبوں کے واحد مسیحا ہیں۔ ہم یہ ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ سیکولرازم کے نظریہ کی طرح ہی سماج واد کی بھی جڑیں ہندوستان میں موجود ہیں اور اقتصادی و سماجی انصاف حاصل کرنے کا صرف ہندوستانی طریقہ ہی کامیاب ہوسکتا ہے۔ ہم یہ بھی یقین دلانا چاہتے تھے کہ ہندو روایت کے عظیم دانشور اور سماجی اصلاح کار، جس میں سوامی وویکانند اور مہاتما گاندھی شامل ہیں، اس بات کے حامی تھے جسے 'روحانی سماج واد' کہا جاسکتا ہے۔ ہمارے قدیم رشیوں نے انسان کو خالص مادی اور جسمانی ضرورت والے ایک اقتصادی جاندار کے طور پر کبھی نہیں دیکھا۔ اس کی جگہ پر انھوں نے زندگی کے فطری رجحان کو اپنایا جو کہ سبھی جانداروں کی مادی اور روحانی ضروریات کو پورا کرنے پر زور دیتی ہے۔ انسان کے روحانی پہلو کو نظرانداز کرنے یا اس سے انکار کرنے کے باعث یوروپ اور ایشیا میں ایک کے بعد ایک ملک میں کمیونزم کا تجربہ ناقابل قبول رہا، اس لئے بی جے پی نے کمیونزم کے ایک مثبت ہندوستانی متبادل کے طور پر گاندھی وادی سماجواد کو اپنایا۔

یقینی طور سے اس فیصلے سے پارٹی میں ہر کوئی خوش نہیں تھا۔ ایک سینئر لیڈر جو فیصلے سے ناخوش تھیں وہ تھیں راج ماتا وجے راجے سندھیا، جنھوں نے پارٹی کی مجلس عاملہ میں ایک نوٹ جاری کرایا کہ گاندھی وادی سماج واد کو اپنانے سے بی جے پی کانگریس کی فوٹو کاپی بن جائے گی، بعد میں انھوں نے اپنا نوٹ واپس لے لیا، جبکہ پارٹی کے اندر بڑے غور و خوض کے بعد ہمارے اقتصادی فلسفہ میں ہندوستانیت پر زور دیا گیا۔

'کون کہتا ہے کہ کانگریس کا کوئی متبادل نہیں ہے؟
متبادل ہمیں اپنے سامنے ایک دکھائی دے رہا ہے'

چونکہ ہم اپنے سیاسی سفر کے ایک نئے مرحلے کا آغاز کر رہے تھے۔ ایسے میں 30-28 دسمبر 1980 کو ممبئی میں بی جے پی کا پہلا اجلاس ایک یادگار سنگ میل ثابت ہوا۔ باندرہ کے قریب بحر عرب کے قریب لگائے گئے عظیم کھلے پنڈال میں تقریباً 50 ہزار نمائندے جمع ہوئے۔ اس مقام کو بجا طور پر ہی 'سمتا نگر' کہا گیا، جو کہ بی جے پی کی سماجی اور اقتصادی مساوات کی وابستگی کو پیش کرتا تھا۔

پارٹی کی قومی کونسل کے اجلاس میں لیڈروں اور نمائندگان، دونوں نے حد درجہ جوش وخروش، خوداعتمادی اور پختہ وابستگی کا مظاہرہ کیا۔ اپریل میں بی جے پی کے قیام کے بعد کی مختصر مدت میں تقریباً 25 لاکھ نئے ممبران کو شامل کیا گیا اور عملی نقطہ نظر سے ہندوستان کی ہر ریاست میں پارٹی کی اکائیاں قائم کی گئیں، یہاں تک کہ جب جن سنگھ اپنے عروج پر تھی تب بھی اس کے صرف 16 لاکھ ممبر تھے۔ بی جے پی کے آئین کے مطابق قومی کونسل نے اٹل جی کو رسمی طور سے صدر منتخب کیا۔ اس موقع پر ان کی صدارتی تقریر کو آزاد ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں سب سے اہم تقریروں میں سے ایک تسلیم کیا جانا چاہئے۔

اس پس منظر کا ذکر کرتے ہوئے جس میں بی جے پی کا قیام ایک ضرورت بن گئی تھی، اٹل جی نے کہا 'ہمیں کوئی خوشی نہیں کہ ہمیں جنتا پارٹی سے الگ ہونا پڑا۔ شروع سے آخر تک ہم نے پارٹی کا اتحاد قائم رکھنے کی کوشش کی۔ ہم راج گھاٹ میں لوک نائک جے پرکاش نارائن کی موجودگی میں کیے گئے عہد سے واقف تھے کہ ہم پارٹی کا اتحاد قائم رکھیں گے، لیکن 'دوہری رکنیت' کے فروعی مسئلے کو طول دے کر ایسے حالات پیدا کر دیئے گئے کہ جنتا پارٹی میں ہمارا وقار اور خودداری کے ساتھ رہنا ناممکن ہوگیا۔ جنتا پارٹی جس کی تشکیل لوک نائک جے پرکاش کی رہنمائی میں ہوئی تھی ٹوٹ گئی، لیکن ایک روشن ہندوستان کا ان کا نسخہ آج بھی ہمارے ساتھ ہے جس سے ہم کبھی پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ ان کے خواب، ان کی محنت، ان کی جدوجہد اور کچھ خاص قدروں میں ان کا پختہ یقین ان کی وراثت کے حصے کے طور پر ہمارے ساتھ ہے۔'

اس دوران انھوں نے اعلان کیا کہ بی جے پی 'پارٹی ودھ اے ڈیفرنس' (الگ شناخت والی پارٹی) اٹل جی نے کہا کہ 'ہم پارٹی کو تبھی متحد کر سکتے ہیں جب ہم لوگوں کے دل میں اعتماد پیدا کر سکیں۔ لوگوں کو یہ تسلیم کرنا چاہئے کہ یہ بھیڑ کھینچنے والی پارٹیوں سے الگ ہے جو سیاسی اسٹیج پر چھا گئی۔ اس کا ہدف کسی نہ کسی طرح اقتدار حاصل کرنا نہیں ہے۔ اس کی سیاست کچھ قدروں اور اصولوں پر مبنی ہیں۔ دھوکہ اور طاقت پر مبنی سیاست کا کوئی مستقبل نہیں ہوتا۔ بی جے پی میں ان لوگوں کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے جو عہدے اور دولت کے لئے پاگل بنے رہتے ہیں۔ وہ لوگ جن میں ہمت یا خودداری کا نقدان ہے وہ جائیں اور خود کو دہلی دربار کے قدموں میں گرادیں۔ جہاں تک ہمارا سوال ہے، ہم جمہوریت اور سماجی انصاف کے لئے مسلسل جدوجہد کر رہے ہیں۔ ایک ہاتھ میں ہندوستان کا آئین اور دوسرے ہاتھ میں مساوات کا پرچم لے کر آیئے، ہم جدوجہد کے لئے کمر کس لیں۔'

اٹل جی نے اپنے آخری لفظوں کو شاعرانہ اور انوکھے طرز تخاطب میں کہا، جو کہ امید اور حوصلے سے پر تھے — 'سمندر کے ساحل سے میں اس خوداعتمادی کے ساتھ پیشین گوئی کر سکتا ہوں — اندھیرا ختم ہوگا، سورج نکلے گا اور کمل کھلے گا۔'

ممبئی اجلاس کو مرکز میں کانگریس کی کئی سرکاروں میں وزیر رہے اور ایمرجنسی کے خلاف لڑائی کے ہیرو رہے محمد کریم چھاگلہ کی موجودگی

کے لئے بھی یاد رکھا جائے گا۔ اپنے خطاب میں چھاگلہ جو سیاست سے ریٹائرڈ ہو چکے تھے، نے تبصرہ کیا 'کون کہتا ہے کہ ملک میں کانگریس کا متبادل نہیں ہے؟ میں یہاں اپنے سامنے بھارتیہ جنتا پارٹی کی شکل میں اسے دیکھ رہا ہوں اور اٹل بہاری واجپئی کی شکل میں مجھے اندرا گاندھی کا متبادل دکھائی دے رہا ہے۔'

چھاگلہ نے اس الزام کی پرزور الفاظ میں تردید کی کہ بی جے پی ایک فرقہ پرست پارٹی ہے۔ اندرا گاندھی یہ دوہراتی رہتی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ 'اخبارات اور ریڈیو پر وہ ہر دوسرے دن کہتی ہیں کہ اس پارٹی پر آر ایس ایس کا اثر و رسوخ ہے جو فرقہ پرست ہے اور جہاں کہیں فرقہ وارانہ فسادات ہوتے ہیں اس کی وجہ آر ایس ایس ہوتی ہے۔ یہ ایک الزام ہے، جس کی میں تردید کرنا چاہوں گا۔ بی جے پی ایک فرقہ پرست پارٹی نہیں ہے۔

بی جے پی کو خود کو ایک قومی متبادل پیش کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے انھوں نے کہا 'میں آپ کے ڈسپلن، آپ کی ایمانداری اور آپ کی وابستگی کی تعریف کرتا ہوں۔ اب میں آپ کو مشورہ دیتا ہوں کہ آپ اپنا مستقبل ایک قومی پارٹی کے طور پر بنائیں۔ دیگر پارٹیوں جیسے لوک دل یا کانگریس (یو) پر نظر ڈالیں۔ ان پارٹیوں کے لیڈر ہیں لیکن حامی نہیں ہیں۔ کمیونسٹوں کے کچھ حامی ہیں لیکن وہ قومی پارٹی نہیں ہے، وہ احکامات حاصل کرنے کے لئے ماسکو یا بیجنگ کی جانب دیکھتے ہیں۔ اس سے اندرا گاندھی کے متبادل کے طور پر ان پر اعتماد مشکوک ہے۔ اس وجہ سے صرف بی جے پی ہی واحد متبادل ہے۔

ملک کے سبھی اخبارات نے بی جے پی کے ممبئی اجلاس کی تاریخی اہمیت کو سمجھ لیا۔ یہاں میں 'ان لوکل' ہفتہ وار کے اس وقت کے ایڈیٹر جناردن ٹھاکر کا خصوصی طور پر ذکر کرنا چاہوں گا، جنھوں نے لکھا 'میں ابھی ممبئی میں بی جے پی کے اجلاس سے ایک بات کے یقین کے ساتھ لوٹا ہوں کہ آج نہیں تو کل اٹل بہاری واجپئی ملک کے وزیر اعظم بنیں گے۔ میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ شاید بنیں گے، میں کہہ رہا ہوں کہ وہ یقینی طور پر بنیں گے۔ میری پیشین گوئی سیاروں پر مبنی نہیں ہے اور نہ ہی میں کوئی جیوتشی ہوں۔ یہ پیشین گوئی اس شخص اور پارٹی پر ڈالی گئی نظر پر مبنی ہے۔ واجپئی مستقبل کی پارٹی کی قیادت کر رہے ہیں، دونوں کھلے ہوئے ہیں۔'

نئی پارٹی کے جنم کا درد زہ

بی جے پی کا قیام فوری انتخابی فائدہ حاصل کرنے کے لئے نہیں ہوا تھا اور نہ ہی اس کی قیادت سے یہ امید کی جا رہی تھی۔ 1980 کے پارلیمانی انتخابات میں اندرا گاندھی کی واپسی سے پیدا احساس مسرت سے کانگریس کو محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ریاستی اسمبلیوں میں بھی فتح حاصل کرے گی۔ بی جے پی نے 1983 میں کرناٹک اسمبلی کی 224 میں سے 18 نشستیں جیت کر جنوبی ہندوستان میں اپنی موجودگی درج کی۔ گزشتہ سال پارٹی نے ہماچل پردیش میں آدھی سے کچھ کم سیٹیں حاصل کیں، پھر بھی مجموعی طور پر ہماری انتخابی کارکردگی پارٹی کے تیزی سے بڑھنے کا اشارہ نہیں دے رہی تھی۔ جموں و کشمیر میں 1983 کے اسمبلی الیکشن خاص طور پر مایوس کن رہے۔ جموں علاقہ میں ہندو آبادی کی اکثریت کے باعث وہاں جن سنگھ کی مضبوط گرفت تھی اور بعد میں بی جے پی کی ہو گئی۔ 1983 میں بڑی تعداد میں ہمارے ووٹروں نے کانگریس کو ووٹ دیا، کیونکہ اندرا گاندھی نے اپنی انتخابی مہم میں کشمیر کے کبھی علیحدگی پسند لیڈر رہے شیخ عبداللہ کی قائم کردہ نیشنل کانفرنس کے خلاف سخت رویہ اپنایا تھا۔ جموں میں شکست کے بعد کئی لوگوں کو تشویش ہو گئی کہ اگر بی جے پی نے ہندوؤں کے درمیان اپنی روایتی حمایت کی بنیاد کو نظر انداز کیا تو کیا بی جے

پی کو ملک کے دیگر حصوں میں بھی اس طرح کے جھٹکے کا سامنا کرنا پڑے گا؟

پارٹی کے اندر اس طرح کی باتوں کے سلسلے میں بھی کافی اختلاف تھا کہ انتخابی کامیابیوں کے لئے کس طرح کی سیاسی حکمت عملی اپنائی جائے۔ دو متبادل تھے — اکیلے رہیں یا غیر کانگریسی اور غیر کمیونسٹ پارٹیوں کے ساتھ اتحاد کریں۔ جنتا پارٹی کے ہمارے تلخ تجربے کے باعث بی جے پی میں کئی لوگوں کو دیگر اپوزیشن پارٹیوں کے ساتھ چلنے میں جھجھک تھی، ساتھ ہی جنتا پارٹی کے تجربے نے ہمیں یہ سکھا دیا تھا کہ کس طرح کانگریس جیسے طاقتور حریف کا سامنا کرنے کے لئے متحدہ طاقت سودمند ہو سکتا ہے۔ پارٹی کے صدر ہونے کے ناطے اٹل جی سبھی قوم پرست اور جمہوری پارٹیوں کو راشٹریہ لوک تانترک مورچہ (این ڈی ایف) کے تحت ایک ساتھ لانے کے حق میں تھے۔ میں نے اس نظریہ کی حمایت کرنے کے ساتھ ساتھ مختلف ریاستوں میں بی جے پی کی اپنی طاقت کو تنظیمی اور سیاسی دونوں سطحوں پر بڑھانے پر زور دیا۔ پارٹی کے اندر کافی غور و خوض کے بعد ہم نے 3 نکاتی حکمت عملی اپنائی: (1) بی جے پی اپنی الگ شناخت سے کوئی سمجھوتہ نہیں کرے گی، (2) ہم دیگر اپوزیشن پارٹیوں کے ساتھ قومی اہمیت کے موضوعات پر تعاون کی بنیاد پر کام کریں گے اور (3) ہم ملک اور عوام سے وابستہ موضوعات پر اپنی عوامی تحریک تیار کریں گے، جس میں ہماری حمایت کو وسعت اور استحکام حاصل ہو سکے۔

80 کی دہائی کا ابتدائی دور ایسا تھا جیسے بی جے پی کے علاوہ دیگر پارٹیاں بھی جوش و خروش سے زیادہ بڑی اپوزیشن اکائی بننے کے امکانات تلاش کر رہی تھیں۔ اس سلسلے میں دو لوگ سنجیدگی سے کوشش کر رہے تھے۔ اڑیسہ کے کرشمائی لیڈر اور دو مرتبہ ریاست کے وزیر اعلیٰ رہ چکے بیجو پٹنائک اور تیلگو فلم کے سپر اسٹار جنھوں نے 1982 میں اپنی سیاسی پارٹی تیلگو دیشم بنائی اور اگلے سال کانگریس کی سرکار گرا کر آندھرا پردیش کے وزیر اعلیٰ بنے این ٹی راما راؤ۔ کئی اپوزیشن پارٹیاں آپس میں ضم ہوئیں اُن میں سب سے اہم 1983 میں سری نگر میں ہوئی جس میں مرکز اور ریاست کے تعلقات کو بدلنے کی ایک تجویز منظور کی گئی، اس میں ریاستوں کو آئین کے بنیادی اصولوں کے مطابق زیادہ اختیارات دینے کی بات کہی گئی تھی۔

1980 کی ابتدا میں ہندوستان کی سیاست میں ایک اہم واقعہ پیش آیا۔ 23/جون 1980 کو اندرا گاندھی کے چھوٹے بیٹے سنجے گاندھی کی نئی دہلی میں ایک طیارہ حادثہ میں موت ہو گئی۔ اس کے بعد برسر اقتدار پارٹی میں سنجے کے بڑے بھائی راجیو جو اس وقت انڈین ایئر لائنس میں پائلٹ تھے، کو پارٹی میں شامل کرنے کی مہم چلائی گئی۔ انھیں پارٹی کی قیادت سونپنے کی بات کہی گئی۔ دو برسوں سے بھی کم وقت میں انھیں کانگریس پارٹی کا جنرل سکریٹری بنا دیا گیا۔ اس قدم نے واضح کر دیا کہ اندرا گاندھی خاندانی جانشین چاہتی ہیں۔

ہماری پارٹی کو سب سے بڑا دھچکا 1984 میں لگا۔ 31/اکتوبر کو وزیر اعظم اندرا گاندھی کو ان کی رہائش گاہ پر دو محافظوں ستونت سنگھ اور بے انت سنگھ نے گولی مار کر قتل کر دیا۔ یہ قتل پنجاب میں چل رہے پاکستانی حمایت یافتہ دہشت گرد مہم جس کا مقصد خالصتان کا قیام تھا، سے وابستہ تھا۔ اگر اندرا گاندھی کا قتل ایک قومی المیہ تھا تو اتنا ہی شرمناک اور مایوس کن المیہ دہلی اور شمالی ہندوستان میں بے قصور سکھوں کا قتل تھا۔ قومی راجدھانی میں سرکاری مشنری کی اجازت سے 3000 سے زائد سکھوں کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔ کئی مقامات پر کانگریسی لیڈروں کو تشدد بھڑکانے کا قصوروار پایا گیا۔

ابھی اندرا گاندھی کی آخری رسوم ادا بھی نہیں ہوئی تھی کہ صدر جمہوریہ گیانی ذیل سنگھ نے 31/اکتوبر کی شام کو راجیو گاندھی کو وزیر اعظم کے عہدے کا حلف دلایا۔ چالیس سال کی عمر میں وہ ہندوستان کے سب سے نوجوان وزیر اعظم بنے، جنھیں وزیر کے عہدے تک کا کوئی تجربہ

نہیں تھا۔ ہمدردی کی لہر کا فائدہ اٹھانے کے لئے سرکار نے لوک سبھا تحلیل کر دی اور 45 دنوں کے اندر انتخابات کرانے کا اعلان کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ ایک اور شرمناک بات یہ تھی کہ کانگریس پارٹی نے انتخابات میں ووٹ حاصل کرنے کے لئے ایک سکھ مخالف مہم چلائی۔ دہلی میں ہوئے قتل پر راجیو گاندھی نے تبصرہ کر کے اسے جائز ٹھہرانے کے لئے بوٹ کلب پر منعقد ریلی میں کہا 'جب ایک بڑا پیڑ گرتا ہے تو اس کے نیچے زمین ہلتی ہے۔'

1984 کے لوک سبھا انتخابات میں اس 'ہمدرد لہر' کا سب سے بڑا شکار بی جے پی ہوئی۔ ہماری پارٹی 542 ارکان پر مشتمل ایوان میں صرف 2 انتخابی حلقوں — ایک گجرات اور ایک آندھرا پردیش سے ہی جیت سکی۔ غیر یقینی طور سے اٹل جی بھی ہار گئے۔ کانگریس کو 401 سیٹیں حاصل ہوئیں جو اندرا گاندھی اور نہرو کے وزیر اعظم رہنے کے وقت سے بھی زیادہ تھیں۔

فطری طور سے مارچ 1985 میں کلکتہ میں ہوئی پارٹی کی قومی مجلس عاملہ کی میٹنگ میں اس شکست پر غور کیا گیا۔ 'پارٹی کی صدر کی حیثیت سے' اٹل جی نے کہا 'میں لوک سبھا انتخابات میں بی جے پی کی شکست کی پوری ذمہ داری لیتا ہوں اور پارٹی جو بھی سزا طے کرے خوشی سے بھگتنے کے لئے تیار ہوں۔' پارٹی نے فوراً اس تجویز کو ٹھکرا دیا۔ بی جے پی میں ہر کوئی جانتا تھا کہ لوک سبھا میں صرف دو سیٹیں ملنے کا مطلب ہندوستانی سیاست میں پارٹی کی صحیح پوزیشن کی علامت نہیں ہے۔

پھر بھی اٹل جی نے پارٹی کی صدارت کا عہدہ قبول کرنے کے لئے مجھ پر زور ڈالا۔ انھوں نے کہا کہ اس کی تشکیل سے اب تک انھوں نے لمبی اننگ کھیلی ہے۔ اس وقت پارٹی کے آئین میں ابھی کوئی پابندی نہیں تھی کہ کوئی شخص صرف مسلسل دو مرتبہ صدر بن سکتا ہے۔ اس پابندی کو بعد میں شامل کیا گیا۔ اٹل جی نے زور دیا کہ 'کسی بھی شخص کو کسی بھی عہدے پر ہمیشہ کے لئے نہیں رہنا چاہئے۔' اس طرح مئی 1986 میں نئی دہلی کے اندر پرستھ اسٹیڈیم میں منعقد پارٹی اجلاس میں مجھے صدر منتخب کیا گیا۔

اس کے ساتھ ہی میری پارٹی اور میرے اپنے سیاسی سفر کا ایک نیا دور شروع ہوا۔

5

1980 کی دہائی: بی جے پی کی امر پرندے جیسی پرواز

شکست کئی مرتبہ ایک عارضی صورت حال ہوتی ہے۔
شکست تسلیم کرلینا اسے مستقل بناتی ہے۔
— مارلن ووس سیونٹ، ایک امریکی کالم نگار

مئی 1986 میں میرے پارٹی کا صدر بننے سے قبل پارٹی میں مختلف بنیادی نظریاتی اور تنظیمی موضوعات پر بحث چھڑ چکی تھی۔ 1984 کے لوک سبھا کے انتخابات میں بی جے پی کی خراب کارکردگی سے پارٹی کے ارکان اور حامیوں کے سامنے دل برداشتہ ہونے کی صورت حال پیدا ہوگئی تھی۔ 1980 میں جب پارٹی کا قیام ہوا، اس وقت اس کا ہدف کانگریس کے متبادل کے طور پر ابھرنا مقرر کیا گیا تھا۔ پانچ سال بعد صورت حال یہ تھی کہ اپنے ہدف کی جانب آگے بڑھنے کی بات تو دور، لوک سبھا میں ہمارے ممبران کی تعداد محض دو ممبران پارلیمنٹ کے ساتھ اس حد تک نیچے پہنچ گئی جس پر 1952 میں پہلے عام انتخابات کے بعد جن سنگھ ہوا کرتی تھی۔ واضح طور پر وہ خود احتسابی کا دور تھا۔

1980 میں پارٹی کے قیام کے بعد سے لے کر اب تک کے پارٹی کے سفر کے فرق کا جائزہ لیتے ہوئے اٹل جی نے دو اہم سوال رکھے تھے۔ پہلا، کیا 1977 میں جن سنگھ کو جنتا پارٹی میں ضم کرنا اور پھر 1980 میں جنتا پارٹی سے الگ ہوجانے کا فیصلہ ہی پارٹی کی شکست کی وجہ تھی؟ دوسرا، کیا بی جے پی کو دوبارہ جن سنگھ بنایا جانا چاہیے؟ ان دونوں سوالوں پر غور کرنے کے بعد، نظریاتی، تنظیمی معاملوں، تحریک پر مبنی پروگراموں اور تعمیری سرگرمیوں اور انتخابی حکمت عملی جیسے موضوعات پر اپنی منظوری دے کر بی جے پی کے لئے ایک پنچ سالہ ترقیاتی منصوبہ کا ڈھانچہ تیار کیا۔ پارٹی کے نائب صدر کرشن لال شرما کو ایک ورکنگ گروپ کا کنوینر بنایا گیا۔ مجھے اور اٹل جی جیسے سینئر لیڈروں کو اس سے الگ رکھا گیا تھا تاکہ آزادانہ اور کھلی بحث ہوسکے۔

اس ورکنگ گروپ نے جو رپورٹ سونپی، اسے میں اب تک کی تاریخ میں وقتاً فوقتاً سونپی گئی رپورٹوں اور دستاویزات میں سب سے زیادہ مفید تسلیم کرتا ہوں۔ رپورٹ میں یہ واضح کیا گیا تھا کہ جن سنگھ کا نہ تو 1977 میں جنتا پارٹی سے ملنے کا فیصلہ غلط تھا اور نہ ہی تین سال بعد یعنی

1980 میں اس سے الگ ہونے کا فیصلہ غلط تھا۔اس طرح اس نے جن سنگھ کو دوبارہ زندہ کرنے کے سوال کو ٹھکرا دیا۔

ورکنگ گروپ کے مطالعے سے ایک اطمینان بخش بات سامنے آئی — 'ہمارے انتخابی میدان میں سنگین مایوسی یا بہت زیادہ نقصان ہونے کی بات بالکل صحیح نہیں ہے۔' یہ نتیجہ الیکشن میں ہماری کارکردگی کے عمیق جائزہ پر مبنی تھا، خاص طور پر ہمارے سیاسی سفر کے تین مرحلوں کے دوران ہماری جانب سے حاصل کیے گئے ووٹوں کی فیصد پر مبنی تھا۔ 1952 سے 1971 تک جن سنگھ کی جانب سے، 1977 اور 1980 کے درمیان کی مدت میں جنتا پارٹی کے ذریعہ اور 1984 میں بی جے پی کے ذریعہ۔ جن سنگھ نے 1952 میں کل ڈالے گئے ووٹوں کا 3.1 فیصد، 1957 میں 4.9 فیصد، 1962 میں 6.44 فیصد، 1967 میں 9.4 فیصد اور 1971 میں 7.4 فیصد حاصل کیا تھا۔ 1977 میں ایمرجنسی مخالف لہر کا فائدہ اٹھاتے ہوئے جنتا پارٹی نے 298 سیٹیں حاصل کی تھیں۔اسے کل ڈالے گئے ووٹوں کا 42.1 فیصد ووٹ ملا تھا۔ چونکہ اس میں 93 سیٹیں جن سنگھ کے حصے کی تھیں، اس لئے ورکنگ گروپ نے ہمارا حصہ 42.1 فیصد کا ایک تہائی یعنی 14 فیصد نکالا۔ 1980 کے انتخابات میں جنتا پارٹی کے ووٹوں کا فیصد گھٹ کر 18.93 پر پہنچ گیا اور سیٹوں کی تعداد 31 آ گئی۔اس میں جن سنگھ کے حصے میں 16 سیٹیں تھیں۔اس طرح جن سنگھ کو حاصل ہونے والے ووٹوں کا فیصد 8.6 تھا۔

1984 میں بی جے پی نے پہلی مرتبہ اکیلے دم پر الیکشن لڑا اور اس کو کل پڑنے والے ووٹوں میں 7.66 فیصد ووٹ ملے۔ دوسرے الفاظ میں اندرا گاندھی کے قتل کے بعد کے ناموافق حالات میں ہمارے ووٹوں کے فیصد میں صرف ایک فیصد کی ہی کمی آئی تھی۔اس کے علاوہ 1984 کے الیکشن میں ہماری کارکردگی کے پیچھے کچھ اہم حقائق بھی پوشیدہ تھے۔ حالانکہ بی جے پی کو 2 سیٹوں پر ہی فتح حاصل ہو سکی تھی، لیکن 101 دیگر سیٹوں پر وہ دوسرے نمبر پر تھی۔ دوسری بات بی جے پی کو حاصل ووٹ دیگر سبھی اپوزیشن پارٹیوں کے ووٹوں سے زائد تھے۔ تیسری بات اگر کانگریس کے حق میں ہمدردی کی لہر نہیں ہوتی تو اس صورت میں جیسا کہ جائزے میں کہا گیا تھا— مختلف ذیلی انتخابات میں ہماری کامیابی اور ہمارے حامیوں اور ہمدردوں کی بڑھتی تعداد کے مدنظر بی جے پی کا ووٹ فیصد 10 سے 15 فیصد کے درمیان ہونے کی امید کی جا سکتی تھی۔

اس تجربہ کا نتیجہ واضح تھا— اپنے مستقبل کے سلسلے میں بی جے پی کو مایوس ہونے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

گاندھی وادی سماجواد اور ایکاتم مانو واد

ورکنگ گروپ کی جانب سے دیئے گئے مشوروں میں سب سے اہم مشورہ پارٹی کے نظریات سے متعلق تھا۔ 1980 میں بی جے پی نے 'گاندھی وادی سماجواد' کو ایک رہبر اصول کے طور پر اپنایا تھا۔ میں نے پہلے واضح کیا ہے کہ اس وقت بھی پارٹی کی قیادت کا ایک طبقہ، جس میں راج ماتا وجے راجے سندھیا سب سے اہم تھیں، نے اس کی مخالفت کی تھی۔اس گروپ نے اس پر اپنی رائے دی کہ اس فیصلے سے بی جے پی کی نظریاتی خصوصیت کمزور پڑ گئی۔ جن سنگھی پس منظر سے آئے لیڈر خود کو اپنے سیاسی فلسفہ کے طور پر گاندھی وادی سماجواد سے وابستہ کر کے نہیں دیکھ پا رہے تھے۔ ورکنگ گروپ نے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا— 'بی جے پی اپنی ایک الگ شناخت والی پارٹی ہے— اس کے معنی یہ ہیں کہ دیگر چیزوں کے ساتھ ساتھ پارٹی کے اپنے نظریات بھی ہیں جو دوسروں کے نظریات سے مختلف ہیں۔ مجموعی طور پر کسی سیاسی پارٹی کی طاقت اور اس کی توسیع اس کے اپنے نظریات پر ہی مبنی ہوتی ہے۔

اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے ورکنگ گروپ نے مشورہ دیا کہ پنڈت دین دیال اپادھیائے کی جانب سے پیش کیے گئے 'ایکاتم مانو واد' کو

بی جے پی کے بنیادی فلسفہ کے طور پر پیش کیا جانا چاہئے۔ ساتھ ہی ساتھ اس نے 'گاندھی وادی سماجواد' کو ترک نہ کرنے پر زور دیا تھا۔ اپنی رپورٹ میں اس نے لکھا— 'دنیا بھر میں سماجواد کا الگ الگ مطلب نکال لیا گیا ہے۔ ہندوستان میں اسے سماجی انصاف کے معنی کے طور پر لیا جاتا ہے، اس لئے ہندوستانی آئین میں سماجواد غریبوں اور دلتوں کی ترقی کے لئے ہے۔ اس پس منظر میں سماجواد' تنہا انسانیت پرستی' کے مطابق ہے۔

ورکنگ گروپ نے بی جے پی کے لئے مندرجہ ذیل 'پانچ بنیادی عہد' کو اپنانے کی سفارش کی تھی۔ 1. قوم پرستی و قومی سلامتی، 2. جمہوریت، 3. سماجی اقتصادی نظام کی گاندھی وادی سوچ— یعنی مساوات پر مبنی اور استحصال سے مبرا سماج، 4. مثبت سیکولرازم یعنی سبھی فرقوں کے ساتھ یکساں رویہ اور 5. اصولوں پر مبنی سیاست۔

ورکنگ گروپ کے ان مشوروں کے ساتھ ساتھ دیگر مشوروں کو منظور کرلیا گیا اور اکتوبر 1985 میں گاندھی نگر میں منعقد پارٹی کی قومی مجلس عاملہ میں اسے بی جے پی کے آئین میں شامل کرلیا گیا۔

بی جے پی: کیڈر پر مبنی عوام کی پارٹی

ورکنگ گروپ کی رپورٹ سے قطع نظر ایک دیگر معاملہ میں واضح ہوگیا، جو پارٹی کے کچھ لوگوں کو تذبذب میں رکھ رہا تھا۔ وہ اس بات سے فکر مند تھے کہ بی جے پی کے قیام کے بعد جن سنگھ کا کیڈر پر مبنی کردار سست گیا ہے۔ میرا اپنا نظریہ تھا کہ ایک طرف بی جے پی کی بنیاد کو وسعت دیتے رہنے اور دوسری جانب پارٹی کی کیڈر بنیاد کو قائم رکھ کر اس کی تنظیم کو مزید مستحکم ڈسپلن پر مبنی بنانے میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

ورکنگ گروپ نے بھی اپنی رپورٹ میں اسی طرح سفارش کی تھی— ہم ایک کیڈر پر مبنی پارٹی بنانے میں کامیاب ہوگئے ہیں، لیکن کیڈر پر مبنی تنظیم کے بل پر ہم اپنے مقصد تک نہیں پہنچ پائیں گے۔ اس سے گرفت ہمارے کیڈر تک ہی محدود رہ جائے گی۔ اس کیڈر کی مدد سے ہی ہم اپنی بنیاد کی توسیع کر پائیں گے، اس لئے ہمیں ایک کیڈر پر مبنی عوامی حمایت والی پارٹی بنانی ہوگی، حالانکہ 'کیڈر پر مبنی' اور 'عوامی حمایت' باہمی متضاد لفظ دکھائی دیتا ہے، لیکن دونوں کی خوبصورت اور باعث مسرت آمیزش ہوسکتی ہے۔

یہاں میں وضاحت کرنا چاہوں گا کہ بی جے پی کے تنظیمی کردار سے میرا نظریہ یونیورسٹی آف کیلیفورنیا، لاس اینجلس کے ایک امریکی دانشور ہیمنٹن تھامسن ڈیوی جونیئر کی کتاب سے متاثر تھا۔ ان کی پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ 'دی ٹرانسفارمیشن آف این آئیڈیالوجیکل مومنٹ ان ٹو این ایگریگیٹیو پارٹی: اے کیس اسٹڈی آف دی بھارتیہ جن سنگھ' دو طرح کی سیاسی پارٹیوں، نظریاتی (آئیڈیالوجیکل) اور کل انضمام (ایگریگیٹو) کا تقابلی مطالعہ تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ ہندوستان جیسے مختلف النوع معاشرہ میں ایک مکمل نظریاتی پارٹی کا فروغ اور توسیع کا زیادہ امکان نہیں ہے، جبکہ کل انضمام شدہ پارٹی میں معاشرہ کے جدید طبقوں میں ربط ضبط بڑھانے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ ابتدائی برسوں میں جن سنگھ بالواسطہ طور پر راشٹریہ سیوم سنگھ کی سیاسی اکائی ہی تھی، لیکن گزشتہ دہائی میں پارٹی کا سماجی دائرہ وسیع ہوا ہے۔ یہ قیادت کے لئے افراد کے انتخاب میں جھلکتا بھی ہے۔ اب پارٹی میں آر ایس ایس کا پس منظر نہ ہونے کے باوجود افراد کو بڑھاوا مل رہا ہے۔ 1967 سے جن سنگھ اور دیگر سیاسی پارٹیوں کے باہمی تعلقات میں زبردست تبدیلی آئی ہے۔ معاشرہ کے مختلف طبقوں کے ساتھ داخلی رویہ کے باعث جن سنگھ کے پروگراموں میں تبدیلی دکھائی دے رہی ہے۔ دیگر قومی اپوزیشن پارٹیوں نے جن سنگھ کے ساتھ تعاون کرنے کے سلسلے میں لچیلے پن کا مظاہرہ کیا ہے۔ پارٹی میں مختلف داخلی پروگراموں پر زور دیا جارہا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس کی خارجہ پالیسی کے پیمانے بھی دیگر قومی پارٹیوں کے یکساں ہوگئے ہیں۔'

اس تحقیق نے مجھے یقین دلا دیا کہ جن سنگھ کی شکل میں مزید تبدیلی لانا ہوگی۔ اس کی نظریاتی شناخت کو مدنظر رکھتے ہوئے زیادہ قابل قبول بنانا ہوگا۔ ایمرجنسی کے خلاف وسیع جدوجہد اور جے پرکاش نارائن سے متاثر ہو کر جنتا پارٹی کے بننے سے میرے اس نظریہ کو مزید تقویت ملی۔

اٹل جی سے ملی پارٹی کے صدر کے عہدہ کی ذمہ داری

میں نے اس پس منظر میں اٹل جی سے پارٹی کے صدر کے عہدہ کی ذمہ داری قبول کی۔ اٹل جی کے تئیں اپنے جذبات کو ظاہر کرتے ہوئے میں نے اپنی صدارتی تقریر شروع کی '1980 میں اپنے قیام کے بعد سے ہی بھارتیہ جنتا پارٹی کو اٹل جی جیسے لیڈر کی قیادت میں آگے بڑھنے کا موقع حاصل رہا ہے۔ سب سے پچھڑے لوگوں کے تئیں تشویش ہی ان کی سوچ اور کاموں کی خصوصیت رہی ہے۔ لوگوں کو ان کی کرشمائی شخصیت میں صلاحیت اور معجزاتی اتفاق کا نادر نمونہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ گزشتہ ماہ کیے گئے ایک عوامی سروے کے مطابق، لوگوں کو کانگریس کی موجودہ قیادت کا واضح متبادل جناب اٹل بہاری واجپئی کی شکل میں دکھائی دیتا ہے۔'

اپنی تقریروں میں میں نے یہ بھی امید ظاہر کی کہ 'دو مدت کار کے بعد خود صدارت چھوڑنے کی اٹل جی کی اس مثال کا دیگر پارٹیوں پر بھی اچھا اثر پڑے گا، جن میں سے کچھ پارٹیوں میں تو مستقل طور پر تاعمر صدر کے عہدہ پر قائم رہنے والے لیڈر بھی ہیں۔'

تقریر کے دوران میں نے کئی معاملوں پر اپنے نظریات پیش کیے، جن میں سے کئی معاملے راجیو گاندھی کی 18 ماہ پرانی سرکار کی پالیسیوں اور کاموں سے متعلق تھے۔ واضح رہے کہ راجیو گاندھی نے ہی بڑے بڑے وعدوں کو جھٹلانا شروع کر دیا تھا، جن پر ان کی انتخابی کامیابیوں کی بنیاد رہی تھیں۔ میں نے اپنی تقریر کے آخر میں اپنے منصوبے کا نچوڑ پیش کیا۔ میں نے کہا کہ 1973 میں جن سنگھ کا اور اس کے بعد 1986 میں بھارتیہ جنتا پارٹی کا صدر رہنے کے بعد سے میں نے اپنی پارٹی کو نہ صرف کانگریس کے ایک سیاسی متبادل کے طور پر کھڑا کرنے بلکہ اسے متبادل سیاسی کلچر دینے والی پارٹی کے طور پر قائم کرنے کے لئے اب تک ساری کوششیں کی ہیں۔

گزشتہ تقریباً دو دہائی سے ہندوستانی سیاست امید اور مایوسی کے درمیان تھپیڑے کھاتی رہی ہے۔ عوامی امیدوں سے اس طرح کے اتار چڑھاؤ سے سیاست دانوں اور سیاسی پارٹیوں کے تئیں تلخی کا ماحول پیدا ہو رہا ہے۔ بی جے پی اس تلخی کو ختم کر کے اپنے عملی رویے، خدمت اور قربانی سے یہ ثابت کر دکھائے کہ گاندھی اور جے پرکاش، مکھرجی اور اپادھیائے سے متاثر یہ پارٹی واقعی سب پارٹیوں سے مختلف ہے۔ فی الحال اس کے پاس بھلے ہی برسر اقتدار پارٹی کا متبادل پیش کرنے کا مستحکم نظام نہیں ہے، لیکن ایک متبادل سیاسی کلچر تو یقینی طور پر یہ دے سکتی ہے۔

میرے ان الفاظ کو دو دہائیاں گزر چکی ہیں اور اس مدت میں بی جے پی سیاسی طور پر مستحکم اور وسیع ہوئی ہے۔ ہم ملک کو پہلی بار مستحکم غیر کانگریسی سرکار دینے میں کامیاب رہے ہیں، لیکن میں اتنا ضرور سمجھتا ہوں کہ ہم نے جو اعداد و شمار کی کامیابی حاصل کی ہے اس کے لئے کچھ حد تک خصوصیات کی قیمت چکائی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ آج ہم اتنے اعتماد کے ساتھ دعویٰ نہیں کر سکتے، جیسا ہم نے 1986 میں کیا تھا کہ 'ہم ایک متبادل سیاسی کلچر' کا فروغ کر رہے ہیں۔ بی جے پی کی کئی خصوصیات آج بھی موجود ہیں جن پر مجھے فخر ہے، لیکن میں چاہتا ہوں کہ میری پارٹی کا ایک ایک ممبر، نیچے سے لے کر اوپر تک خود احتسابی کرے کہ ہم نے کیا کھویا اور کیا پایا ہے اور غور کرے کہ ہم کس طرح ایک بہترین کلچر کی اپنی قابل فخر روایات کو دوبارہ قائم کر سکتے ہیں۔

پارٹی صدر کے طور پر میں نے اپنے عہدیداروں کی ٹیم میں نئے جوش والے نوجوان لیڈروں کو ترجیح دی۔ اس کے تحت کیدار ناتھ

ساہنی، کرشن لال شرما اور ڈاکٹر مرلی منوہر جوشی کے ساتھ پرمود مہاجن، جن کی عمر اس وقت صرف 37 سال تھی، لیکن جو اپنی غیر معمولی تنظیمی صلاحیت اور لہجے کے بل پر پارٹی کے سبھی سینئر لیڈروں کے توجہ کا مرکز بن گئے تھے — جنرل سکریٹری مقرر کئے۔ ٹیم میں میرے ذریعہ شامل کیے گئے دیگر نوجوان کارکنان تھے۔ سشما سوراج، ونکیا نائیڈو، ارون جیٹلی، نریندر مودی، راج ناتھ سنگھ، اوما بھارتی اور کے این گووندا چاریہ — جو بعد میں اپنی اپنی صلاحیتوں سے پارٹی کے اہم لیڈر بن گئے۔

بی جے پی میں شامل ہونے والے دیگر نئے لیڈر جو آر ایس ایس کے پس منظر سے نہیں آئے تھے، لیکن اپنی صلاحیت اور لیاقت کے بل پر کچھ ہی وقت میں پارٹی کے اہم لیڈروں میں شامل ہو گئے، وہ تھے جسونت سنگھ۔

راجیو گاندھی کی 'مسٹر کلین امیج' سے امیدیں ہوئیں روشن

جب میں نے بی جے پی کے صدر کا عہدہ سنبھالا تب ملک کا سیاسی ماحول کافی چیلنج بھرا تھا۔ وزیر اعظم کے طور پر اپنی مدت کے دوسرے سال راجیو گاندھی کی مقبولیت اپنے عروج پر تھی۔ اس کے مقابلے میری پارٹی کم از کم پارلیمنٹ میں تعداد کے حساب سے قومی سیاست میں حاشیے پر تھی۔ پارٹی صدر بننے کے بعد پیش آنے والا ایک تکلیف دہ واقعہ مجھے یاد آ جاتا ہے۔ ایک غیر ملکی مہمان ہماری پارٹی کے دفتر میں مجھ سے ملنے آئے۔ انھوں نے میری پارٹی کی تاریخ، اس کے نظریات اور مختلف قومی اور بین الاقوامی موضوعات پر پارٹی کی پالیسیوں کے بارے میں مختلف سوالات پوچھے اور وہ میرے جوابات سے کافی متاثر دکھائی دے رہے تھے۔ تبھی انھوں نے ایک سوال پوچھا، جس نے مجھے تذبذب کی کیفیت میں ڈال دیا۔ 'یقینی طور پر آپ کی پارٹی ہندوستان میں ایک بہت اہم پارٹی نظر آتی ہے۔ ہندوستانی پارلیمنٹ میں آپ کے کتنے ممبران ہیں؟'

اس سوال کا جواب دینے کے لئے میں کافی تذبذب میں پڑ گیا، اس لئے اس سوال کو ٹالنے کے لئے میں نے ایسا ظاہر کیا، گویا میں نے یہ سوال سنا ہی نہیں اور ان سے پوچھا 'اوہ میں پوچھنا ہی بھول گیا کہ آپ چائے لیں گے یا کافی کیا لیں گے؟ کیا آپ ٹھنڈا مشروب لینا پسند کریں گے؟'

یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اپنے وزیر اعظم کے عہدے کے پہلے ہی سال میں راجیو گاندھی ہندوستان کے عوام میں مقبول بن گئے تھے۔ ہر ذات، دھرم اور فرقہ کے مرد عورتوں کے درمیان وہ یکساں طور پر مقبول تھے۔ اس کے کئی وجوہات تھے۔ پہلی وجہ تو یہی تھی کہ اندرا گاندھی کے قتل کے بعد اٹھی 'ہمدردی کی لہر' اب بھی چل رہی تھی، جس نے انھیں اقتدار تک پہنچایا تھا۔ دوسری وجہ وزیر اعظم بننے کے وقت وہ مشکل سے چالیس سال سے کچھ اوپر کے رہے ہوں گے۔ اس طرح ملک کے اب تک کے سب سے نوجوان وزیر اعظم ہونے کے ناطے ملک کی نوجوان نسل ان کی جانب مائل ہو گئی، لیکن ان کی مقبولیت کی سب سے اہم وجہ تھی ان کی 'مسٹر کلین' کی امیج۔ انھیں بدعنوانی سے بالکل دور مثالی شخصیت کے طور پر دیکھا جا رہا تھا، جبکہ یہ خصوصیت کانگریسی سیاست دانوں میں عام طور پر نہیں تھی۔

کانگریس کی صد سالہ تقریبات کے موقع پر دسمبر 1985 میں ممبئی میں منعقد آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس میں راجیو گاندھی کی صدارتی تقریر سیاست اور میڈیا میں موضوع سخن بن گئی تھی۔ وضاحت اور خود احتسابی سے عاری لہجے میں تقریب کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا 'ملک بھر کے لاکھوں عام کانگریسی کارکن کانگریس کی پالیسیوں اور پروگراموں سے خوب حوصلہ مند ہیں، لیکن وہ مجبور ہیں کیونکہ ان کے اوپر طاقت اور اثر دار ہونے والے دلال سوار ہیں۔ جو عوامی تحریک کو ایک بورژوا والے نظام میں تبدیل کرنے کے لئے لوگوں کو لالچ دیتے رہتے

ہیں۔ وہ گروپ بندی کر کے ہمیشہ سرگرم رہتے ہیں، جو کانگریس کے زندہ جسم کو اپنی لالچ اور مفاد کے جال میں پھنسا کر الجھا کر پھل پھول رہے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لئے عوام کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ ان کی سوچ، طرز زندگی اور بدعنوانی بھرا رویہ ان کی مفاد پرستی میں کچھ ایسا ہے جو عوام میں رہ کر کام کرنے کے لئے مناسب نہیں ہے۔ وہی لوگ کانگریس کی تنظیم کو اس طرح کھوکھلا کر رہے ہیں کہ اس میں خدمت اور قربانی کا جذبہ ختم ہو گیا ہے۔ اس موڑ تک کیسے پہنچے ہیں؟

بدعنوانی کے کینسر کے بارے میں راجیو گاندھی نے کھل کر اپنی بات رکھی 'ہم اونچے اونچے اصولوں اور قدروں کی بات کرتے ہیں جو ایک خوشحال اور مستحکم ہندوستان کی تعمیر کے لئے ضروری ہے، لیکن ہم نہ تو کسی اصول اور ڈسپلن کی پابندی کرتے ہیں اور نہ ہی عوامی بہبود کے اصولوں پر چلتے ہیں۔ بدعنوانی کو نہ صرف ہم برداشت کر رہے ہیں بلکہ اسے قیادت کی ایک شناخت کے طور پر دیکھا جا رہا ہے۔ قول اور فعل کا تضاد ہماری روزمرہ کی زندگی کا رواج بن گئی ہے۔ ہر قدم پر ہمارے کاموں اور مقاصد میں تضاد اور فرق دیکھا جا سکتا ہے۔ ہمارا نجی مفاد ہماری سماجی ذمے داری کو کچل دیتا ہے۔' بدعنوانی کی بیماری کے خاتمے کے بعد انھوں نے بھروسہ دلاتے ہوئے مزید کہا 'بدعنوانی کے خلاف لڑائی بغیر کسی رکاوٹ کے مسلسل جاری رہے گی۔ ملک کو آج ایک صاف ستھرے معاشرے اور سیاسی ماحول کی ضرورت ہے۔ کانگریس ایسا ماحول دینے کا عہد کر چکی ہے۔'

ہندوستان کے عوام نے پنڈت نہرو کے وزیراعظم کے دور میں بھی بدعنوانی کے خلاف اتنے پرعزم الفاظ نہیں سنے تھے۔ راجیو گاندھی کی تقریر میں ویسے تو اپنی ماں یعنی اندرا گاندھی کے تئیں تعریف کے جذبے پوشیدہ تھے، لیکن ہر کوئی یہ بات اچھی طرح سمجھ سکتا تھا کہ ان کے یہ تبصرے اس زہر آلود اور بدعنوان کلچر میں براہ راست اور سنگین الزام تھا جو اندرا گاندھی کے وقت میں پارٹی کی شناخت بنی ہوئی تھی۔

بالآخر بی جے پی کے ایک اجلاس میں تقریر کے دوران میں نے ماں بیٹے کے طریقہ کار میں فرق کی وضاحت کی۔ 'مسز اندرا گاندھی سب سے الگ تھلگ رہنے والی اور چڑچڑے مزاج کی تھیں۔ دوسری طرف نئے وزیراعظم (راجیو گاندھی) خوش گفتار اور ملنسار ہیں۔ اپوزیشن کے ساتھ اندرا گاندھی کے تعلقات ہمیشہ کشیدہ رہے تھے۔ راجیو گاندھی کے آنے کے بعد صورت حال تبدیل ہوئی ہے۔ گزشتہ 19 ماہ میں برسراقتدار اور اپوزیشن کے درمیان جتنی میٹنگیں ہوئی ہیں اتنی شاید کبھی نہیں ہوئیں۔' نجی طور پر بات کریں تو راجیو گاندھی میرے ساتھ بہت نرمی سے پیش آتے تھے۔ کم از کم شروع میں مجھے لگا کہ میری عمر اور تجربے کے لحاظ کی وجہ سے ایسا ہے۔

بوفورس گھپلا اور اس کی لیپا پوتی

بدقسمتی سے تقریباً ایک سال بعد ہی مجھے علم ہوا کہ اس رویے میں دکھاوا زیادہ اور اصلیت کم ہے۔ راجیو گاندھی کی مسٹر کلین کی امیج یعنی صاف ستھری امیج کو اس وقت زوردار دھچکا لگا جب بوفورس گھپلا سامنے آیا۔ 17 راپریل 1987 کو ہریانہ کے روہتک میں میری پارٹی کی قومی مجلس عاملہ کی میٹنگ ہو رہی تھی۔ ایک دن قبل ہی سویڈش اسٹیٹ ریڈیو نے بوفورس— سویڈن کی ہتھیار بنانے والی سب سے بڑی کمپنی — کے ایک خفیہ کام کے بارے میں ایک چونکا دینے والی خبر دی تھی، جس کے مطابق حکومت ہند کی جانب سے 155 ایم ایم ہاؤٹزر توپوں کی خرید کے سلسلے میں بوفورس کی جانب سے وزیراعظم راجیو گاندھی کی کانگریس کے ممبران کو مبینہ طور پر 1.6 کروڑ ڈالر (اس وقت تقریباً 20 کروڑ) دیئے گئے تھے۔ چار قسطوں میں 50 لاکھ ڈالر سوئس بینک کے خفیہ کھاتوں میں 1986 میں ہی جمع کروا دیئے گئے تھے۔ اپنی صدارتی تقریر میں میں نے کہا 'اگر یہ الزام غلط ہیں تو سویڈن کی حکومت لائق مذمت ہے اور اس کا سخت جواب دیا جانا چاہئے، لیکن جو کچھ کہا جا رہا ہے، اگر اس میں ذرہ برابر بھی

سچائی ہے تو وزیراعظم کو فوراً ایسی تحقیقات کا حکم دینا چاہئے، جس کی غیر جانبداری پر کسی کو بھی شبہ نہ ہو۔ اس پوری تفتیش کے دوران راجیو گاندھی کو اپنا عہدہ چھوڑ دینا چاہئے اور پارٹی کو نیا لیڈر منتخب کرنا چاہئے۔

سویڈش ریڈیو کی جانب سے نشر یہ خبر پورے ہندوستان کے لئے ایک دھماکہ تھی۔ سرکار نے 'جھوٹی بے بنیاد اور بکواس' بتا کر اسے سرے سے خارج کردیا، لیکن بوفورس سودے سے وابستہ ادائیگی سے متعلق تفصیل جلد ہی سب کے سامنے آگئی، جس کا سہرا این رام اور چترا سبرامنیم کو جاتا ہے، جن کی سخت محنت اور صحافتی تفتیش سے بالآخر تفصیل انگریزی روزنامہ 'دی ہندو' جس کا صدر دفتر چنئی میں ہے شائع ہوسکی۔ توپوں کی خرید سے متعلق سودے سے لے کر بوفورس اور ایک فرانسیسی کمپنی میں سخت مقابلہ آرائی ہورہی تھی، جس میں فوج نے فرانسیسی کمپنی کے ساتھ سودا کرلیا تھا۔ اس کے باوجود آرڈر بوفورس کو دیا گیا، کیونکہ خود وزیراعظم کی ہدایات پر آناً فاناً کسی نے سودا بوفورس کے حق میں کرنے کے لئے سرکار کو تیار کرلیا تھا۔ وہ کون ہوسکتا تھا؟ راجدھانی میں اس وقت بوفورس سودے میں کسی 'اطالوی' کا ہاتھ ہونے کی بات زور و شور سے چل رہی تھی۔ این رام اور ان کے ساتھیوں نے سخت محنت سے کی گئی اپنی تفتیش کی رپورٹ میں کافی تحریری ثبوت پیش کیے جن سے واضح ہوگیا کہ وہ بچولیا ایک اطالوی ہی تھا— اوطاویو قواطروچی— اسے صحافتی تفتیش اور رپورٹنگ کی دنیا کی سب سے بہترین مثال تسلیم کیا جاسکتا ہے۔

سرکار کا قریب سے جائزہ لینے والے لوگوں کو بھلے ہی علم ہوگیا تھا کہ قواطروچی، جو ایک اطالوی ملٹی نیشنل کمپنی کی طرف سے دہلی میں تعینات ایجنٹ تھا، اس نے راجیو گاندھی کی اطالوی بیوی سونیا مائنو گاندھی کے ذریعہ وزیراعظم کے ساتھ کافی قربت حاصل کرلی تھی۔ ایک وہیلر ڈیلر کے طور پر اس کی شناخت تھی اور ساتھ ہی وزیراعظم کی رہائش گاہ میں اس کا آنا جانا تھا۔ اس وجہ سے سرکار کے کئی وزراء کے ساتھ اس کی شناسائی اور دعا سلام بھی تھی۔

میڈیا رپورٹوں میں جب راجیو گاندھی کا نام بوفورس گھپلے میں اچھالا گیا تو لوگ فطری طور پر ان کی تاریخی تقریر کو یاد کرنے لگے جس میں انھوں نے کانگریس میں موجود اقتدار کے دلالوں کی بات کہی تھی۔ لوگ سوچنے پر مجبور ہوگئے تھے کہ 'آخر کار خود مسٹر کلین نے ہی کسی اقتدار کے دلال کو کیسے کام کرنے دیا اور وہ بھی اپنی رہائش گاہ سے۔

وزیراعظم کی قابل اعتماد اور صاف ستھری امیج پر خاص طور پر دھبہ اس بات سے لگا کہ خود بوفورس نے ہی حکومت ہند کو باخبر کیا تھا کہ توپ سودے کے لئے ہندوستان میں ہمارا کوئی کارکن یا نمائندہ نہیں ہے۔ اس کے باوجود تقریباً ایک کروڑ ڈالر کی جو رشوت لی گئی تھی وہ اس یقین دہانی کی واضح خلاف ورزی تھی۔ راجیو گاندھی نے خود ملک کو بھروسہ دلایا تھا کہ 'سودے کے معاملے میں 'بچولیوں' کو بیچ میں نہیں آنے دیا جائے گا'۔

جیسا این رام نے بعد میں لکھا 'یہاں پیش کیے گئے حقائق خود میں غیر جانبدار اور شفاف ہیں۔ 24 / مارچ 1986 کو ہندوستان کے ساتھ ہاوٗتزر توپوں کا سودا طے ہونے کے بعد سویڈن کی اسلحہ تیار کرنے والی کمپنی کی جانب سے خود سوئس بینک کے خفیہ کھاتوں میں ناجائز طور پر بڑی بڑی رقم جمع کرائی گئی تھی، جنھیں فیصد حصے کے طور پر مقرر کیے گئے 'کمیشن' کا نام دیا گیا تھا۔ مرکزی جانچ ایجنسی کے پاس جو دستاویز ہیں، ان سے بوفورس گھپلہ معاملہ میں قواطروچی کا گہرا ہاتھ ہونے کی بات واضح ہوجاتی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر راجیو گاندھی نے میڈیا رپورٹوں کا شفافیت اور ایمانداری سے جواب دیا ہوتا تو ملک میں ان کی سیاسی عزت پہلے سے زیادہ بڑھ جاتی، لیکن بدقسمتی سے ہوا اس کے برعکس۔ بوفورس گھپلے کا علم ہونے کے بعد تقریباً پہلے ہی دن سے ان کے مداحوں تک کو یہ محسوس ہونے لگا کہ معاملے کو دبانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ اس کی ایک قابل بھروسہ تفصیل تو سویڈن میں ہندوستان کے سفیر رہ چکے بی ایم

اوجھا کی کتاب میں ہی مل جاتا ہے۔ جیسے ہی سویڈن کے میڈیا نے بوفورس کی جانب سے ہندوستانیوں کو رشوت دینے کی خبر نشر کرنی شروع کی، اوجھا جیسا کہ ایک ذمہ دار سفیر کا فرض بنتا ہے، معاملے کی گہرائی سے تفتیش کے لئے سویڈن سرکار پر دباؤ ڈالنے لگے، لیکن اس وقت انھیں گہرا دھچکا پہنچا جب انھیں علم ہوا کہ خود وزیر اعظم ہی نہیں چاہتے کہ سچائی سامنے آئے۔ راجیو گاندھی نے سویڈن کے وزیر اعظم انگوار کارلسن سے واقعی کہا تھا کہ چونکہ بوفورس نے رشوت دینے کی بات سے انکار کر دیا ہے، اس لئے اب مزید تفتیش کی ضرورت نہیں ہے۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ سفیر اوجھا کو اس بات کے لئے اندھیرے میں رکھا گیا تھا۔

اپنی کابینہ کے وزیر مملکت برائے دفاع ارون سنگھ، جو توپوں کی خرید کا معاملہ دیکھ رہے تھے، کے ساتھ بھی وزیر اعظم کے طرز عمل میں شفافیت کا فقدان تھا۔ اسی وجہ سے ارون سنگھ جن کا شمار راجیو گاندھی کے قریبی دوستوں میں ہوتا تھا، نے جولائی 1987 میں اپنے عہدہ سے استعفیٰ دے دیا۔ اپوزیشن کی جانب سے مسلسل بڑھ رہے دباؤ کے باعث بالآخر سرکار نے بوفورس گھپلے کے الزام کی تفتیش کے لئے ایک مشترکہ پارلیمانی کمیٹی قائم کر دی، لیکن اس کی صدارت بی شنکرانند جیسے لیڈر کو سونپی گئی، جو کانگریس سرکار کی کٹھ پتلی تھے۔ یہی نہیں کمیٹی کے طرز عمل میں بھی شفافیت کا فقدان دکھائی دیا۔ ان باتوں سے اپوزیشن کا یہ خدشہ یقین میں بدل گیا کہ مشترکہ پارلیمانی کمیٹی سچائی سامنے لانے کے بجائے اسے دبانے کے لئے قائم کی گئی ہے۔ ایسی کئی مثالیں بھی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ بوفورس گھپلے کی سچائی کو باہر آنے سے روکنے کے لئے راجیو گاندھی خود مداخلت کر رہے تھے۔

راجیو گاندھی کے اعتماد کو اس سے بڑا دھچکا اس وقت پہنچا جب ان کی ہی سرکار میں ایک سینئر وزیر وشوناتھ پرتاپ سنگھ نے بغاوت کا علم بلند کر دیا۔ دراصل وی پی سنگھ کے پاس پہلے وزارت خزانہ تھی۔ بعد میں جنوری 1987 میں انھیں وزارت خزانہ سے وزارت دفاع میں منتقل کر دیا گیا۔ اس معاملے میں قیاس لگایا جارہا تھا کہ کارپوریٹ شعبہ میں غلطی پر چل رہے کچھ لوگوں کے خلاف وی پی سنگھ کے جہاد سے ناراض ہو کر ہی وزیر اعظم نے ایسا کیا تھا۔ نئی وزارت سنبھالنے کے بعد وی پی سنگھ نے جرمن آبدوز سے وابستہ ایک مبینہ معاملے کی تحقیقات کا حکم جاری کر دیا۔ وزیر اعظم نے اس کی نکتہ چینی کی۔ ان کا کہنا تھا کہ اس معاملے میں ان سے صلاح ومشورہ نہیں کیا گیا۔ معاملے کو دبانے کی کوشش کا الزام لگاتے ہوئے وی پی سنگھ نے اپنے عہدہ سے استعفیٰ دے دیا۔ اس کے بعد انھیں کانگریس سے نکال دیا گیا۔ راجیو گاندھی کے مزید دو قریبی معاون ارون نہرو اور عارف محمد خاں بھی کانگریس چھوڑ کر وی پی سنگھ کے ساتھ آگئے۔ اکتوبر 1987 میں انھوں نے مل کر ایک محاذ قائم کیا، جو ایک سال بعد 'جنتا دل' کے نام سے ایک مکمل سیاسی پارٹی بن گئی۔ وی پی سنگھ نے بوفورس معاملے کو اپنی سیاسی مہم کا اہم موضوع بنایا جو تھوڑے ہی عرصہ میں کافی مقبول ہو گئی اور اس طرح وی پی سنگھ کو 'مسٹر کلین' کے بارے میں سچائی سامنے لانے کے لئے 'مسٹر کلینز' کا نام دیا گیا۔

بوفورس معاملے کو دبائے جانے کے خلاف مہم پر عوام کی توجہ اس سے زیادہ مرکوز ہوئی کہ دفاعی سودے سے وابستہ بدعنوانی کا معاملہ تھا۔ اس سے ایک بار پھر واضح ہو گیا کہ عام ہندوستانی قومی سلامتی کے سلسلے میں کتنا بیدار ہے۔ جہاں تک راجیو گاندھی کی بات تھی، ان کے معاملے میں لوگوں کا بھرم کچھ زیادہ ہی ٹوٹا تھا، کیونکہ اندرا گاندھی کے قتل سے ہندوستان کی سلامتی کو پیدا ممکنہ خطرات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہی 1984 میں عوام نے انھیں بڑے پیمانے پر ووٹ دیا تھا۔

اس طرح راجیو گاندھی کی جانب سے اب تک کی سب سے بڑی اکثریت حاصل کرنے کے تین سال سے بھی کم وقت میں ان کی سرکار ڈانواڈول ہو گئی۔ 1989 میں لوک سبھا کے الیکشن میں عوام کی جانب سے ان کی سرکار کو باہر کر دیئے جانے کے بعد بھی بوفورس معاملے پر پردہ

ڈالنے کی شرمناک کوششیں جاری رہیں۔ اسی طرح اب ڈاکٹر منموہن سنگھ کی سرکار میں بھی لیپاپوتی رہی ہے۔ اس کا ثبوت ہے کہ کانگریس کی قیادت والی یو پی اے کی حکومت نے بے شرمی سے سرکاری اداروں کا غلط استعمال کر کے کواطروچی کے غیر ملکی کھاتے کھول دیئے اور اسے بوفورس معاملے سے کھلی چھوٹ دے دی۔

شاہ بانو معاملہ! اقلیتوں کے سامنے کانگریس نے گھٹنے ٹیکے

اگر بوفورس معاملے نے راجیو گاندھی کی ایمانداری پر سوالیہ نشان لگانے کا کام کیا تو شاہ بانو معاملے میں ان کے اقلیتوں کے سامنے گھٹنے ٹیکنے نے ایک لیڈر کے طور پر ان کے پختہ لیڈر ہونے پر سوال کھڑا کر دیا۔ جدید ہندوستان کی تاریخ میں ایسی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی جب پارلیمنٹ میں زبردست اکثریت رکھنے والی کسی حکومت نے مذہبی جنون کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے ہوں، بلکہ اپنی اکثریت کا غلط استعمال کرتے ہوئے سپریم کورٹ کے ذریعہ خواتین کو بااختیار بنانے کے مطابق کیے گئے فیصلے کو اس طرح الٹ دیا ہو۔

62 سالہ شاہ بانو اندور (مدھیہ پردیش) کی ایک مسلم خاتون تھیں، جس کے شوہر نے 1978 میں اسے طلاق دے دی تھی، چونکہ اس کے پاس اپنے پانچ بچوں اور خود کی زندگی گزارنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا، اس لئے اس نے اپنے امیر اور خوشحال شوہر سے گزارہ بھتہ لینے کے لیے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ زیریں عدالتوں کے ذریعہ پانچ سو روپے کا ماہانہ گزارہ بھتہ دینے کا فیصلہ سنانے کے باوجود شوہر نے اسے یہ دینا گوارا نہیں کیا اور نچلی عدالتوں کے فیصلوں کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل دائر کردی۔ سپریم کورٹ نے تعزیرات ہند کی دفعہ 125 کا حوالہ دیتے ہوئے جو ذات اور مذہب سے قطع نظر ہیں، پر نافذ ہوتا ہے۔ شاہ بانو کے حق میں اپنا فیصلہ سنایا۔

سپریم کورٹ کے اس فیصلے پر مسلم فرقہ کے انتہا پسند لیڈروں نے ناراضگی ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ اس سے مسلم پرسنل لاء یعنی شریعت میں مداخلت ہورہی ہے۔ آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کی شکل میں متحد ہو کر انھوں نے دھمکی دی کہ اگر سرکار مناسب آئینی کاروائی کے ذریعہ اس فیصلے کو کالعدم نہیں قرار دیتی تو وہ تحریک چھیڑ دیں گے۔ کچھ شہروں میں تو ریلیاں نکال کر احتجاجی مظاہرے بھی کیے گئے۔ آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ نے 26 رجنوری 1986 کو منعقد ہونے جا رہی یوم جمہوریہ کی تقریب سے بائیکاٹ کی اپیل کی تھی۔

سپریم کورٹ کے فیصلے کو بے اثر کرنے کے مطالبہ پر راجیو گاندھی کی ابتدا قابل تعریف تھی۔ ملک کے بیشتر لوگ، جن میں ان کی پارٹی اور مسلم فرقہ کے ترقی پسند طبقہ کے لوگ بھی شامل تھے، کی ہی طرح ان کا بھی ماننا تھا کہ ایک طلاق شدہ اور ضرورت مند عورت کے اختیار کو قائم رکھ کر سپریم کورٹ نے اچھا ہی کیا ہے۔ یہ بات اس سچائی سے واضح ہو جاتی ہے کہ انھوں نے خود اپنی ہی کابینہ کے ایک رکن عارف محمد خاں کو مسلم لیگ کے ایم پی جی ایم بنات والا کی جانب سے پیش کیے گئے ایک ذاتی بل پر پارلیمنٹ میں بحث کے دوران سپریم کورٹ کے اس فیصلے کے حق میں بولنے کی حوصلہ افزائی کی تھی۔ ہمت اور دانشورانہ انداز سے اپنی بات رکھتے ہوئے عارف محمد خاں نے ایوان کے بیشتر ممبران سے داد حاصل کی۔

لیکن اس کے دو ماہ کے اندر ہی راجیو گاندھی پیچھے ہٹنے لگے۔ 1986 کے آغاز کی بات ہے۔ ایک دن وہ میرے والد کے انتقال پر تعزیت پیش کرنے کے لئے پنڈارا روڈ پر واقع میرے مکان پر آئے۔ واضح رہے کہ 1986 کے دسمبر مہینہ میں میرے والد کا کچھ (گجرات) کے ادے پور میں انتقال ہو گیا تھا۔ کنبے کی خیریت پوچھنے کے بعد راجیو گاندھی نے مجھ سے پوچھا 'آڈوانی جی' آپ کو کیسا لگتا ہے شاہ بانو معاملے میں سپریم کورٹ کے فیصلے پر کیا کیا جانا چاہیے؟' اس سوال پر تو پہلے میں چونک پڑا، پھر یہ سمجھنے میں مجھے دیر نہیں لگی کہ اس معاملے میں پیچھے ہٹنے کا ارادہ

انھوں نے پہلے ہی کرلیا ہے، اس لئے اب وہ اس معاملے میں میری پارٹی کی حمایت چاہتے ہیں۔ میں نے کہا ' کیا کرنا چاہئے اس سے آپ کا کیا مطلب ہے؟ آپ کی سرکار نے جو مناسب فیصلہ کیا ہے اس پر قائم رہنے کے علاوہ اور کیا کیا جا سکتا ہے؟'

'نہیں، لیکن مجھے لگتا ہے کہ کچھ کرنا ضروری ہے۔'

'لیکن راجیو جی سپریم کورٹ کے فیصلے کے حق میں بولنے کے لئے خود آپ ہی نے عارف محمد خاں کو پارلیمنٹ میں اتارا اور انھوں نے بہت موثر طریقے سے اپنی بات رکھی۔ تمام خواتین کی تنظیمیں آپ کی حکومت کے فیصلے کی حمایت کررہی ہیں، یہاں تک کہ کئی مسلم دانشوروں نے بھی اس کا خیر مقدم کیا ہے۔'

'وہ تو ٹھیک ہے۔' راجیو نے کہا 'لیکن مخالفت زور پکڑ رہی ہے، اگر فوراً کچھ نہیں کیا گیا تو صورت حال سنگین ہوسکتی ہے۔'

اس پر میں نے مضبوطی سے کہا ' آپ وزیر اعظم ہیں۔ آپ کو اپنی خواہش کے مطابق کام کرنے کے لئے پارلیمنٹ میں اکثریت حاصل ہے۔ اس کے باوجود اگر آپ سپریم کورٹ کے فیصلے کو آئینی طریقے سے بے اثر کرنے کے مطالبے پر جھک جاتے ہیں تو آپ ملک کا نقصان کریں گے۔'

سچ بتاؤں تو اس کے بعد میرے دل میں راجیو گاندھی کے تئیں ستائش کا جو جذبہ تھا وہ کافی کم ہوگیا۔

سپریم کورٹ کے فیصلے کو الٹنے کے لئے سرکار نے پارلیمنٹ میں اپنی اکثریت کا استعمال کرتے ہوئے مسلم خواتین (طلاق سے متعلق اختیارات تحفظ) قانون 1986 پاس کردیا۔ اس قانون کے مطابق شوہر کے ذریعہ طلاق پانے والی بیوی کو گزارہ بھتہ دینے کی ذمہ داری صرف عدت کے دوران تک ہی محدود ہوگئی۔ اس بار راجیو گاندھی نے اپنی کابینہ کے ایک دوسرے مسلم وزیر زیڈ آر انصاری کو پارلیمنٹ میں بولنے کے لئے اتارا، جن کی تقریر پہلے کی عارف محمد خاں کی تقریر کے بالکل برعکس تھی۔ انصاری نے فیصلہ سنانے والے سپریم کورٹ کے ججوں کی مذمت تک کرڈالی۔ میڈیا نے جب اسے سنجیدگی سے لیتے ہوئے وزیر کی کھنچائی شروع کردی تو راجیو گاندھی ان کی دفاع میں سامنے آگئے۔ اسے 'سیکولرازم' کی مثال بتا کر وہ اپنے نئے قانون کو مناسب بتانے کی کوشش کرنے لگے، لیکن یہ بات بالکل واضح تھی کہ سرکار ہندوستان کے سیکولرازم کے تانے بانے کو مستحکم بنانا تو دور مسلم ووٹ بینک کو رجھانے کے لئے ہی اقلیت پرستی کی سیاست کے آگے خم ہوئی تھی اور ایسا کرکے اس نے سیکولرازم کے ساتھ ساتھ قومی یکجہتی کو بھی کمزور کیا تھا۔

مئی 1986 میں دہلی میں منعقد بی جے پی کی قومی مجلس عاملہ کی میٹنگ میں اپنی صدارتی تقریر میں میں نے شاہ بانو معاملے میں تفصیل سے اپنی بات رکھی تھی۔ شاہ بانو معاملے میں سرکار کی پینترے بازی انتہائی قابل افسوس ہے۔ یہ آئین پر کیا گیا ایک ناقابل معافی حملہ ہے۔ مجرمانہ قانون کے شعبہ میں آج ایک یکساں ضابطہ ہے۔ آئین کی دفعہ 44 کے مطابق سرکار کو سول قانون کے شعبہ میں بھی یکسانیت لانے کی کوشش کرنی چاہئے۔ مسلم خواتین بل اس پالیسی اور اصولوں کے خلاف ہے اور آئین کی دفعہ 14 اور 15 کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ تاریخ اس سرکار کو اس بات کے لئے کبھی معاف نہیں کرے گی کہ جب ہندوستان میں مسلم فرقہ میں خواتین کے اختیارات کی بات چلی تو ایک بڑا طبقہ جس میں بہت سارے بیدار اور دانشور تھے، نے اصلاح معاشرہ اور خواتین کو یکساں انصاف دلانے کے لئے اپنے ہی فرقہ کے قدامت پرستوں کی نظروں میں خود کو قابل مذمت بنا ڈالا تب سرکار نے قدامت پرستوں کا ہی ساتھ دیا۔ کیسا المیہ ہے کہ ایک عارف اور ایک انصاری کے درمیان 'اکیسویں صدی کے وزیر اعظم' نے انصاری کو اپنے ساتھ لے کر چلنا پسند کیا جو اب بھی عہد وسطیٰ میں جی رہے ہیں۔ شاہ بانو معاملے میں سپریم

کورٹ کی جانب سے سنائے گئے فیصلے پر اس سال طویل بحث چلتی رہی۔ اس سے ملک میں آئین کی دفعہ 44 کے بارے میں بیداری پیدا ہوئی اور ساتھ ہی مسلم فرقہ کے ترقی پسند طبقے کو مسلم پرسنل لا میں اصلاح کی فوری ضرورت کا بھی علم ہوا۔'

میں نے اپنی تقریر میں ہندوستان میں یکساں سول کوڈ نافذ کرنے کی دلیل پیش کی۔ 'ہمارے آئین نے ریاست کی یہ ذمہ داری مقرر کی ہے کہ وہ اس طرح کے ضابطہ کی سمت مثبت پہل کرے۔ بدقسمتی کی بات ہے کہ اس موضوع پر اب تک بحث نہیں ہوئی کہ وہ ضابطہ کیسا ہونا چاہئے۔ میرا مشورہ ہے کہ قانونی کمیشن کو اس سلسلے میں خاص طور پر کوشش کرنی چاہئے۔ شہری قانون کا ایک حصہ جس میں املاک کی منتقلی وغیرہ سے وابستہ قانون شامل ہیں۔ پہلے ہی ایک جیسے یا یکساں ہیں۔ جو فرق موجود ہے وہ شادی، طلاق، گزارہ بھتہ، گود لینے وغیرہ سے متعلق قانون بھی ہیں۔ قانونی کمیشن کو ملک میں رائج مختلف نجی قوانین (پرسنل لاء) کی جانچ کرنی چاہئے۔ ہندو لاء، مسلم لاء، کرشچین لاء، پارسی لاء، سول لاء وغیرہ میں موجود یکساں اور انصاف پر مبنی عناصر کی شناخت کر کے ان کی بنیاد پر ایک یکساں کوڈ تیار کرنا چاہئے اور اسی پر قومی سطح پر کھلی بحث ہونی چاہئے۔'

اس سے یہ بات واضح ہو جانی چاہئے کہ ہمارے مخالفین کے جھوٹے پروپیگنڈہ کے برعکس بی جے پی مسلمانوں پر ہندو لاء تھوپنے کی سازش نہ تو تب ہی کر رہی تھی اور نہ ہی اب کر رہی ہے۔

سری لنکا میں ہندوستانی امن فوج کی ناکامی

1987 میں سری لنکا میں ہندوستانی امن فوج بھیجنا راجیو گاندھی کی اگلی بڑی غلطی تھی۔ ہندوستان کے وزیر اعظم اور سری لنکا کے صدر جے آر جے وردھنے کے مابین ہوئے ایک امن معاہدہ کے مطابق ایسا کیا گیا تھا۔ یہ امن معاہدہ ایل ٹی ٹی ای اور سری لنکا کی مسلح فورسیز کے درمیان چل رہی لڑائی کو ختم کرنے کے مقصد سے کیا گیا تھا۔

سری لنکا 80 کی دہائی کی شروعات سے ہی نسلی تشدد سے جوجھ رہا تھا۔ وقتاً فوقتاً کولمبو میں رہنے والی سرکاریں سری لنکا کے شمالی اور مغربی حصوں میں رہ رہے تمل بولنے والے لوگوں کے سماجی، تہذیبی، اقتصادی اور نسلی جذبات کے تئیں اتنی ہمدرد نہیں تھیں۔ سری لنکا سرکار کی جانب سے منظور کیے گئے کچھ قوانین ایسے تھے جن سے تمل یہ سوچنے پر مجبور تھے کہ انھیں دوسرے درجے کا شہری تسلیم کیا جا رہا ہے۔ چونکہ سری لنکا کے تملوں اور ہندوستان میں تمل ناڈو کے عوام کے درمیان تاریخی اور خون کے رشتے رہے ہیں، اس لئے سری لنکا کے تملوں کے لئے متحدہ سری لنکا کی سرحد کے تحت یکساں انصاف فراہم کرانے میں ہندوستان کی خاص دلچسپی رہی ہے۔

لیکن ہند-سری لنکا معاہدہ میں کئی خامیاں تھیں۔ پہلی خامی تو یہی تھی کہ اس میں ایل ٹی ٹی ای یا تمل تنظیموں کو بات چیت کے عمل میں ایک فریق کے طور پر شامل نہیں کیا گیا۔ دوسری خامی، اگرچہ ہندوستانی فوج کا کام وہاں صرف امن قائم کرنا تھا، لیکن بعد میں وہ لڑائی مہمات میں بھی شامل ہو گئی۔ اس سے بھی زیادہ نقصان دہ بات یہ ہوئی کہ امن فوج بدقسمتی سے ناگزیر حالات کے باعث ایل ٹی ٹی ای کے آمنے سامنے آ گئی۔ المیہ یہ کہ شروع میں اندرا گاندھی کی قیادت میں اور بعد میں راجیو گاندھی کی قیادت میں بھی حکومت ہند نے ایل ٹی ٹی ای کی مدد کی تھی، بلکہ اسے محفوظ اڈہ بھی فراہم کرایا تھا۔ ہندوستانی فوجیں ایک دوسرے ملک میں نسلی تصادم میں مسلسل الجھتی جا رہی تھی اور وہاں تعینات ہندوستانی فوجیوں کی تعداد ایک لاکھ تک پہنچ گئی، لیکن ہندوستانی امن فوج کی مہم سری لنکا میں فوجی اور سیاسی تعطل کو ختم نہ کر سکی، جبکہ اب تک اس لڑائی میں

تقریباً 1100 فوجی شہید ہو چکے تھے۔ سری لنکا کے عوام ہندوستان کی امن فوج کو ایک حملہ آور فوج کی شکل میں دیکھ رہے تھے، جبکہ تمل عوام اسے تباہ کاری پھیلانے والی فوج کے طور پر دیکھ رہے تھے۔ اس سے واضح ہو گیا کہ راجیو گاندھی کی سری لنکا پالیسی فوجی اور ڈپلومیٹک دونوں ہی سطحوں پر ناکام رہی۔

اس نازک صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے بی جے پی کی قومی مجلس عاملہ نے جنوری 1988 میں ارناکلم میں منعقد ایک میٹنگ میں منظور ایک تجویز میں کہا تھا — 'سری لنکا کی صورت حال کے سلسلے میں سرکار کی غیر دانشمندانہ اور ناسمجھی بھری پالیسی کی قیمت ہندوستان کو اپنے فوجیوں کا خون بہا کر اور دولت کا نقصان کر کے چکانی پڑ رہی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ہم نے سنہالیوں اور تملوں دونوں کا اعتماد کھو دیا ہے۔ نتیجے کے طور پر سری لنکا ممکنہ طور پر لبنان بننے کے دہانے پر آ گیا ہے۔'

1988 میں راجیو گاندھی نے ایک اور عجیب و غریب قدم اٹھایا جب ان کی سرکار نے بدنام 'ہتک عزت مخالف بل' پیش کیا جس کا مقصد پریس کی آزادی کے پر کترنا تھا اور جس نے ایمرجنسی کی تلخ یادوں کو پھر سے تازہ کر دیا۔ انھوں نے ایسا ہندوستانی اخبارات اور میگزین میں اپنے قریبی لوگوں کے بدعنوانی میں ملوث ہونے اور اقتدار کے غلط استعمال کرنے سے متعلق خبروں کو دبانے کے لئے کیا۔ اس کا مقصد واضح تھا 'ہتک عزت' کی وسیع طور پر تشریح کر کے پریس میڈیا کو ڈرانا، لیکن 77-1975 کے برعکس انڈین ایکسپریس کے بے خوف رام ناتھ گوئنکا کی قیادت میں میڈیا نے بڑے پیمانے پر مخالفت کی اور راجیو گاندھی کو یہ بل واپس لینے کے لئے مجبور کر دیا۔ میری پارٹی اور تقریباً سبھی غیر کانگریسی پارٹیوں نے بھی اس بل کی پرزور مخالفت کی۔

میں یہاں اس وقت کا ایک منظر پیش کرنا چاہتا ہوں۔ صدر جمہوریہ گیانی ذیل سنگھ کا پانچ سال کا دور 1987 میں ختم ہونے والا تھا، حالانکہ ذیل سنگھ اندرا گاندھی کے معتبر معاون رہے تھے، پھر بھی 1986 سے ان کے وزیراعظم کے ساتھ تعلقات میں تلخی پیدا ہونے لگی تھی، جو سیاسی حلقوں میں کسی سے پوشیدہ نہیں تھی۔ یہاں تک افواہیں پھیل رہی تھیں کہ صدر جمہوریہ وزیراعظم کو برخاست کرنے کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔ بی جے پی کے صدر کے ناطے میرا نظریہ یہ تھا کہ ایسا کرنا نہ صرف غیر قانونی ہوگا بلکہ یہ ایک سنگین آئینی بحران کو بھی جنم دے گا۔ اس سلسلے میں اٹل جی اور پارٹی کے دیگر لوگوں کا بھی یہی خیال تھا، اس لئے میں نے راشٹرپتی بھون میں ذیل سنگھ سے ملاقات کر کے اس بارے میں اپنا نظریہ بہت واضح طور سے ان کے سامنے رکھ دیا۔ خوش قسمتی سے ملک کے سربراہ اور سرکار کے سربراہ کے درمیان کشیدگی کا آتش فشاں پھٹا نہیں اور 1987 میں اس وقت کے نائب صدر جمہوریہ آر وینکٹ رمن ذیل سنگھ کے بعد صدر جمہوریہ بنے۔

کانگریس کی شکست بی جے پی کی چھلانگ

راجیو گاندھی سرکار کی جانب سے کی گئی ان مسلسل غلطیوں کے باعث اپوزیشن میں بیٹھے ہم لوگ آئندہ سال یعنی 1989 میں ہونے والے لوک سبھا انتخابات میں کانگریس کی شکست کے بارے میں زیادہ پرامید ہوتے جا رہے تھے۔ جنوری 1988 میں بی جے پی نے راجیو گاندھی کے استعفیٰ اور وسط مدتی الیکشن کرانے کا مطالبہ کرتے ہوئے ملک گیر ستیہ گرہ شروع کر دیا۔ 18 رجنوری کو دہلی میں اٹل جی نے ستیہ گرہ کی قیادت کی، اس کے دو دن بعد میں نے لکھنؤ میں ایسے ہی ستیہ گرہ کی قیادت کی۔

3 رمارچ 1988 کو مجھے پارٹی کا دوبارہ صدر منتخب کر لیا گیا۔ ایک ماہ بعد آگرہ میں منعقد پارٹی کی قومی کونسل میں اظہار افسوس ظاہر کرتے

ہوئے میں نے کہا کہ ہندوستان جیسے عظیم ملک میں جھوٹے لوگوں کی حکومت چل رہی ہے۔ اگست 1988 میں بی جے پی اور بائیں بازو کی پارٹیوں کو چھوڑ کر دیگر 7 اپوزیشن پارٹیوں نے مل کر راشٹریہ مورچہ (نیشنل فرنٹ) قائم کیا۔ این ٹی راماراؤ اس کے چیئرمین اور وی پی سنگھ اس کے کنوینر بنے۔ اسی سال اکتوبر ماہ میں ایک اہم سیاسی تبدیلی آئی۔ سیاسی اتحاد کے عمل کو آگے بڑھاتے ہوئے وی پی سنگھ نے جن مورچہ، چندر شیکھر کی جنتا پارٹی اور لوک دل کے دو گروپوں — ایک دیوی لال کی قیادت میں اور دوسرا اجیت سنگھ کی قیادت والے، ان سب کو ملا کر جنتا دل بنایا گیا۔

25 ستمبر 1989 کو بمبئی میں منعقد پارٹی کی مجلس عاملہ کی میٹنگ نے بی جے پی کے لئے سنگ میل کا کام کیا۔ اس سے قبل جون میں پالم پور میں ہوئے اجلاس میں قومی مجلس عاملہ نے شیوسینا کے ساتھ اتحاد کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس طرح ممبئی اجلاس میں بال ٹھاکرے (شیوسینا کے بانی اور سربراہ) کو پارٹی کی مجلس کو بحیثیت مہمان خصوصی خطاب کرنے کے لئے مدعو کیا گیا۔ ممبئی کے شنمکھا نند آڈیٹوریم جو شہر کا سب سے بڑا آڈیٹوریم ہے اور جہاں اجلاس بلایا گیا تھا وہاں کا ماحول جوش وخروش سے بھرا تھا، کیونکہ آنے والے لوک سبھا انتخابات کے سلسلے میں پارٹی کے کارکنان اور لیڈران پر اعتماد تھے۔ اپنے صدارتی خطبے میں میں نے کہا '1984 میں ہوئے ساتویں عام انتخابات ہمارے اصولوں کے ترقیاتی سفر میں سب سے نچلے پائیدان پر رہے۔ ہمارا یہ ممبئی کا اجلاس اور اس میں کیے گئے فیصلے ہمارے اندر پختہ عزم پیدا کریں گے، تاکہ ہم آٹھویں عام انتخابات کو اپنے آئندہ سفر کا نقطۂ عروج بنا سکیں۔

دریں اثنا بی جے پی اور جنتا دل کے کئی خیر خواہ دونوں پارٹیوں میں اتحاد کے لئے کوشش کرنے لگے تھے۔ ہمارا ایک مشترکہ مقصد کانگریس کو شکست دینا ہی تھا اور ملک بھر میں جس طرح راجیو مخالف ماحول بنتا جارہا تھا اسے دیکھتے ہوئے واضح طور پر دکھائی دے رہا تھا کہ دو اہم غیر کانگریسی اور غیر کمیونسٹ پارٹیوں کی مشترکہ کوشش سے یہ نشانہ یقینی طور پر حاصل کیا جاسکتا ہے، لیکن بدقسمتی سے وی پی سنگھ کا منفی رویہ اس میں آڑے آگیا تھا۔ دراصل وہ بی جے پی کے ساتھ کسی بھی طرح کے اتحاد کے خلاف تھے، کیونکہ وہ اسے 'فرقہ پرست پارٹی' کہتے تھے۔ اسی وجہ سے جنتا دل کے کچھ لیڈر جو پہلے اتحاد کی کوشش میں تھے غیر یقینی پوزیشن میں آگئے۔

ممبئی اجلاس میں اپنی تقریر کے دوران میں نے جنتا دل کے اندر پیدا اس بے یقینی پر اپنی رائے دی۔ ویر ساورکر کی مثال پیش کرتے ہوئے میں نے کہا 'وہ ساتھ آتے ہیں تو ان کے ساتھ، وہ نہیں آتے تو ان کے بغیر، وہ ہماری مخالفت کرتے ہیں تو اس کے باوجود' جنتا دل جو بھی فیصلہ کرے لیکن ہم نے راجیو گاندھی کی بدعنوانی اور نااہل سرکار کو اکھاڑ پھینکنے کا عہد کر رکھا ہے۔

ممبئی اجلاس کے بعد اور الیکشن سے قبل جنتا دل کے لیڈر اور حامی مل کر سنگھ کے ایک سینئر لیڈر بھاؤ راؤ دیورس — جو سنگھ کے سرسنگھ چالک بالا صاحب دیورس کے بھائی تھے — کے پاس گئے۔ بھاؤ راؤ دیورس ایک انتہائی تجربہ کار مفکر لیڈر تھے۔ سبھی اہم معاملوں میں وہ بی جے پی کو متوازن اور اصولی مشورہ دیتے تھے۔ اس کے علاوہ کانگریس سمیت کئی دیگر سیاسی پارٹیوں کے لیڈروں کے ساتھ ان کے اچھے ذاتی تعلقات تھے اور سبھی ان کی عزت کرتے تھے۔ جنتا دل کے ان کے دوست لیڈروں نے ان سے کہا 'جنتا دل اور بی جے پی کے درمیان ایک وسیع معاہدہ سے ہی کانگریس کو شکست دی جاسکتی ہے۔ ہماری پارٹی لوک سبھا میں سب سے بڑی پارٹی کے طور پر ابھر کر سامنے آئے گی، لیکن مخلوط حکومت بنانے کے لئے ہمیں بی جے پی کی حمایت کی ضرورت ہے۔ اس معاملے میں آپ کا مشورہ اور رہنمائی حاصل کرنے کے لئے ہی ہم یہاں آئے ہیں۔' اس معاملے پر غور وخوض کرنے کے لئے جنتا دل کی سیاسی معاملوں کی کمیٹی کی میٹنگ ہونے والی تھی، اس لئے وہ ہماری طرف سے فوراً مثبت جواب کی امید کر رہے تھے۔

وی پی سنگھ کے مخالفانہ رویے کے باعث بی جے پی اور جنتا دل کے درمیان الیکشن سے قبل اتحاد کا سوال ہی نہیں تھا، لیکن سیٹوں کی تقسیم اور مشترکہ انتخابی مہم ضرور ممکن تھی، لیکن وی پی سنگھ اتر پردیش اور بہار میں دونوں پارٹیوں کے درمیان سیٹوں کے بٹوارے کے حق میں نہیں تھے، جبکہ ان دونوں شمالی ریاستوں میں کل 125 لوک سبھا سیٹیں تھیں۔ مدھیہ پردیش، گجرات، راجستھان اور مہاراشٹر جیسے صوبوں میں، جہاں ہماری پارٹی کی پوزیشن مضبوط تھی وہ سیٹوں کے بٹوارے اور مشترکہ انتخابی مہم کے حق میں تھے، لیکن اتر پردیش اور بہار میں جہاں انھیں مسلم ووٹوں سے محروم ہونے کا خوف تھا وہ اس کے لئے تیار نہیں تھے۔ ان کے اس ڈھونگ بھرے رویے سے بی جے پی کے سبھی لیڈر ناخوش تھے، اس لئے اپنے کچھ دوستوں کے ذریعہ میں نے جنتا دل کے لیڈروں کو یہ پیغام بھیجا کہ بی جے پی سیٹوں کی تقسیم اور مشترکہ انتخابی مہم کے لئے یا سبھی ریاستوں میں معاہدہ کرے گی ورنہ کہیں بھی نہیں کرے گی۔ ہمارا یہ سخت موقف رنگ لایا اور اس سے دونوں ہی پارٹیوں کو فائدہ پہنچا۔

1989 کے الیکشن کے نتائج سامنے آئے اور ہماری امیدوں کے مطابق راجیو گاندھی کی سرکار اقتدار سے باہر ہوگئی۔ کانگریس کو صرف 193 سیٹیں ہی ملیں، جو 1984 کے انتخاب میں ملیں 401 سیٹوں سے بہت کم تھیں۔ 141 سیٹیں جیت کر جنتا دل سب سے بڑی پارٹی کے طور پر سامنے آیا، اس لئے صدر جمہوریہ نے اسے سرکار بنانے کے لئے دعوت دی، حالانکہ مخلوط حکومت کی قیادت جنتا دل کے ہاتھ میں ہی تھی، لیکن بی جے پی کی غیر معمولی کارکردگی پر سب کی نگاہیں مرکوز ہوگئیں۔ 1984 کے الیکشن میں جہاں ہمیں صرف دو سیٹیں ملی تھیں وہیں 1989 کے الیکشن میں یہ تعداد بڑھ کر 86 تک پہنچ گئی۔

انتخابی نتائج کا جائزہ لیتے ہوئے یکم دسمبر کو نئی دہلی میں منعقد پارٹی کی مجلس عاملہ کی میٹنگ میں اپنی صدارتی تقریر میں میں نے کہا '1989 کے انتخابی نتائج یقینی طور سے راجیو گاندھی کی بدعنوانی اور نااہلیت کے خلاف عوام کا فیصلہ ہے۔ بی جے پی سمیت سبھی اپوزیشن پارٹیوں کو منفی ووٹوں کا فائدہ ہوا ہے، لیکن جہاں تک بی جے پی کی بات ہے اس کی فتح میں خاص مثبت پہلو ہے۔'

میری پارٹی کی فتح میں مثبت کیا تھا؟ اس سوال کا جواب میں نے اپنی تقریر میں دیا۔ 'ان برسوں میں بی جے پی خود کو ایک ایسی خصوصی پارٹی کے طور پر پیش کرنے میں کامیاب رہی ہے جس کے اپنے کچھ اصول و پالیسیاں ہیں، جنھیں وہ الیکشن کی قربان گاہ پر بلیدان کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ ممبئی اجلاس میں میں نے سیکولرازم اور فرقہ پرستی پر چل رہی قومی بحث کی وضاحت کرتے ہوئے کہا تھا کہ 'بی جے پی، سیکولرازم میں یقین رکھتی ہے، جبکہ کانگریس و دیگر پارٹیاں 'ووٹ سیکولرازم' میں۔ مثبت سیکولرازم کے معنی ہیں سب کے لئے انصاف، منھ بھرائی کسی کی نہیں۔ آنے والے انتخابات میں بی جے پی کا ملک کے لئے یہی پیغام ہوگا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے اس نظریئے کا ہماری کامیابی میں اہم رول ہے۔'

80 کی دہائی کا خاتمہ میری ہی سیاسی زندگی میں ایک اہم موڑ لے کر آیا۔ 1970 میں مجھے راجیہ سبھا کا پہلی مرتبہ رکن منتخب کیا گیا تھا۔ اس کے بعد تقریباً دو دہائیوں تک میں اس کا ممبر رہا۔ 1988 میں میری رکنیت کی تیسری مدت ختم ہوگئی۔ اسی سال مجھے چوتھی مرتبہ راجیہ سبھا کا رکن منتخب کرلیا گیا۔ میں آئندہ چھ برسوں تک راجیہ سبھا کا رکن بنا رہ سکتا تھا، لیکن اب میں لوک سبھا آکر عوام کے ذریعہ براہ راست منتخب ہونے والا عوامی نمائندہ بننا چاہتا تھا، جسے لاکھوں ووٹر اپنا ووٹ دے کر منتخب کرتے ہیں۔ اپنا پہلا لوک سبھا الیکشن میں نے نئی دہلی لوک سبھا سیٹ سے لڑا، جس میں کانگریس کی امیدوار موہنی گری کے خلاف کافی ووٹوں کے فرق سے جیت گیا۔

6

اجودھیا تحریک
جب ہندوستان کی روح بول پڑی

مجھے اپنی وراثت اور اپنے آباء و اجداد پر فخر ہے، جنھوں نے ہندوستان کو عقلی و ثقافتی شہرت دی۔ آپ کو اس باعث فخر ماضی کے بارے میں کیا محسوس ہوتا ہے؟ کیا آپ کو لگتا ہے کہ آپ بھی اس کے حصہ دار اور وارث ہیں، اور اس لئے کیا اس بات پر فخر نہیں ہوتا، جو جتنی میری ہے اتنا ہی آپ کی بھی ہے؟ کیا آپ اسے اپنی نہ مان کر بغیر سمجھے ہی اسے درکنار کردیتے ہیں؟ کیا آپ کو اس حیرت کا احساس نہیں ہوتا جو اس عظیم خزانے کا مالک اور جانشیں ہونے کے احساس سے پیدا ہوتی ہے؟

— جواہر لال نہرو، 24/ جنوری 1948 کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی کنووکیشن تقریب میں بولتے ہوئے

اجودھیا تحریک کو میں اپنی سیاسی زندگی کی سب سے فیصلہ کن تبدیلی کا واقعہ سمجھتا ہوں، جیسا کہ ہندوستان کی عصری تاریخ کا ہر طالب علم واقف ہے۔ اس واقعہ کا ہمارے سماج اور سیاست، بلکہ یوں کہیں کہ ہماری قومی شناخت یا وجود کے جذبہ پر بہت بڑا اثر پڑا۔ قسمت نے اس تحریک میں مجھے 1990 میں رام رتھ یاترا کی شکل میں ایک اہم فرض پورا کرنے کے لئے مائل کیا— اور میں نے بھی اپنی پوری صلاحیت اور ایمانداری سے یہ فرض نبھایا۔ اس فرض کی ادائیگی کے دوران میں نے نئے سرے سے ہندوستان کی کھوج کی۔ میں تو یہ بھی کہوں گا کہ میں نے اپنے اندر بھی ایک نیا 'میں' کھوج نکالا۔ اس طرح اجودھیا مشن میرے لئے ایک بڑی داخلی تبدیلی کا دور رہا۔

اجودھیا میں رام جنم بھومی پر مندر کی تعمیر — یا تعمیر نو کہہ لیں — کے مطالبہ کو ہندو فرقے کی جانب سے اپنی زیادہ حمایت کیوں حاصل ہوئی؟ آزاد ہندوستان کی تاریخ میں اس نے سب سے بڑی عوامی تحریک کو کیوں اور کس طرح جنم دیا؟ اسے غیر ضروری طور پر ہندو بنام

مسلم تنازعہ کی شکل کیوں دی گئی؟ اس معاملے کو پرامن اور قانونی حل کی امید کیوں جھٹلا دی گئی؟ جن واقعات کے باعث بالآخر 6 دسمبر 1992 کو بابری مسجد ڈھانچہ کو منہدم کیا گیا اور اجودھیا میں بھگوان رام کا ایک قدیم مندر بنایا گیا؟ کیا ان میں کانگریس پارٹی نے دوہرا رول ادا نہیں کیا؟ اب کون سا راستہ ہے، جس پر چل کر اس تنازع کو پرامن اور مستقل طور پر حل نہیں کیا جا سکتا ہے؟

سومناتھ مندر کی تعمیر نو
ہندوستان کے احیا میں اس کی اہمیت

اجودھیا تحریک کو اس کے صحیح پس منظر میں سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے آزاد ہندوستان میں ایک دوسرے مشہور مندر کی تعمیر نو کی تاریخ کے بارے میں معلومات حاصل کر لی جائے۔ یہاں میری مراد گجرات کے سوراشٹر ساحل پر واقع پربھاس پاٹن کے سومناتھ مندر سے ہے۔ جنھیں ہندوستان کی قدیم تاریخ کا علم نہیں ہے، ان کے لئے یہ یقین کر پانا مشکل بھی ہوگا کہ کس طرح ایک اکیلا ساحلی مندر ہندوستان کی جدوجہد، درد، فتح اور اس کے قومی وقار کی داستان سناتا ہے۔

اپنی نوجوانی میں میں نے ڈاکٹر کنہیالال مانک لال منشی کا ایک تاریخی ناول 'جے سومناتھ' پڑھا تھا، جس کا میرے اوپر گہرا اثر پڑا۔ یہ ناول بنیادی طور پر گجراتی زبان میں ہے، میں نے اس کا ہندی ترجمہ پڑھا تھا۔ اس وقت میری عمر بیس بائیس سال رہی ہوگی۔ کے ایم منشی جنھیں بھارتیہ ودیا بھون کے بانی چانسلر کے طور پر جانا جاتا ہے۔ واقعی گجرات کے ایک عظیم عالم، گاندھی وادی اور مجاہد آزادی تھے۔ واضح رہے کہ بھارتیہ ودیا بھون، دنیا بھر میں ہندوستانی تہذیب اور فلسفہ کو فروغ دینے والے ادارہ کے طور پر جانا جاتا ہے۔ منشی کے اس ناول میں — سومناتھ کے قدیم مندر — جو ملک بھر کے بارہ متبرک جیوترلنگوں میں سے ایک سمجھا جاتا ہے، کی باعث فخر داستان کو نہایت خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے۔

جیوترلنگ کا نظریہ ہندو دھرم کے مختلف خوبصورت پہلوؤں میں سے ایک ہے۔ 'جیوترلنگ' سنسکرت لفظ ہے، جو جیوتی اور سنگم سے بنا ہے۔ 'جیوتی' کے معنی 'روشنی' ہے اور 'سنگم' کے معنی ہیں 'مینارہ'۔ اس طرح جیوترلنگ ایک غیرمرئی روشنی کا مینارہ ہے جو ہر جگہ موجود ہے۔ آغاز اور انجام ہے۔ شیو وہ مردانہ جوہر کا بنیادی عنصر ہے جو بنیاد یا استقام کائناتی شعور کی علامت ہے۔ کائنات میں ہونے والی تبدیلیوں کی بنیاد ہیں۔ دوسری جانب شکتی (توانائی) جونسائی بنیادی عنصر ہے، اس کائنات میں ہونے والی مرئی اور غیرمرئی تبدیلیوں کی وجہ ہیں۔ شیولنگ بنیادی طور پر شیو کی توانائی کی علامت ہے جو کائنات اور زندگی کی تبدیلیوں کا منبع ہے۔

بارہ متبرک جیوترلنگ ملک کے الگ الگ حصوں میں واقع ہیں۔ ہمالیہ کی برفیلی چوٹیوں پر واقع کیدارناتھ سے لے کر تمل ناڈو میں رامیشورم تک جہاں قدیم روایت کے مطابق سیتاجی کو لنکا کے راجہ سے آزاد کرانے کے لئے جاتے ہوئے سمندر پر پل بنانے سے قبل شری رام نے شیو کی پوجا کی تھی۔ ہندوستان تہذیب کے آغاز سے ہی یہ ہندوستانیوں کی پوران پر مبنی روایت وعقیدت کے طور پر ایشور دھام کے طور پر رچے بسے ہیں۔ واقعی ہندوستانیوں کی ہزاروں سال قدیم تیرتھ رسم - جو زبان، جغرافیائی اور ذات برادری سے مبرا رہی ہے۔ ایک نادر قومی شناخت یا وجود کا جذبہ پیدا ہوا ہے۔ یہ متبرک مقامات - منادر کے تئیں عوام میں جو گہری عقیدت رچی بسی ہے، اسے سمجھے بغیر ہماری ترقی یافتہ اور مختلف النوع تہذیبی وراثت کو سمجھا ہی نہیں جا سکتا۔

اپنی کتابوں کے ذریعہ ہندوستان کے قدیم علم کی تعلیم انگریزی بولنے اور پڑھنے والے لوگوں تک پہنچانے میں مہارت رکھنے والے

نامور ادیب رمیش مینن نے حال ہی میں شائع اپنی مشہور کتاب 'شیو-شیو پران ری ٹولڈ' میں لکھا ہے—

''مندر پورے ہندوستان میں رچے بسے ہیں اور ان مندروں میں ایک چونکا دینے والی یکسانیت دکھائی دیتی ہے۔ میں نہیں مانتا کہ پران، جن میں ان چیزوں کا ذکر ملتا ہے۔قدیم عالموں کا محض تصور ہے۔ سچ تو یہی دکھائی دیتا ہے کہ یہ پران اس انسانی تاریخ کا بیان ہے جو ہماری کچھ ہزار سال پرانی تاریخ سے بھی قدیم ہے۔ پرانوں میں ہمیں ایک کائناتی تاریخ کی جھلک ملتی ہے۔اس وقت کی تاریخ کی جھلک جب زمین پوری کائنات کے لئے کھلی تھی۔ پرانوں میں جن کرداروں کا ذکر ملتا ہے وہ ان کی کائناتی پیکر یا شکل تھی، جیسے یہاں عادی دنیا میں دور، آسمان یا روح کی رفتار، ان نظریات کو دھندھلے ماضی کے گمنام ادیبوں کا مبالغہ آمیز تصور سمجھ کر ہم آسانی سے انکار کر سکتے ہیں۔ یا پھر ہم یہ مان کر چلنا شروع کر دیں کہ ان میں ایسا کچھ سیکھنے کے لئے ہے، جس کا ہم نے تصور بھی نہیں کیا ہوگا۔تصور اور خواب سے الگ یہ انسانی تاریخ اس تاریخ سے بنیادی طور سے الگ ہے، جواب تک ہمیں پڑھایا گیا ہے۔''

اور تاریخی شعور کا جیسا مؤثر ملن سومناتھ مندر میں دیکھنے کو ملتا ہے ویسا شاید ہی ہندوستان کے کسی تیرتھ مقام پر ملے۔اس کی بناوٹ اور پوزیشن دیکھنے والے کو مبہوت کر دیتی ہے۔ایک پہاڑ کی چوٹی پر واقع یہ متبرک مقام عقیدت مندوں کو اپنے دکھائی دینے والے وجود سے الگ ایک غیر مرئی طاقت اور اقتدار کے بارے میں سوچنے کے لئے مائل کرتا ہے۔ واضح رہے کہ بے شمار ہندو تیرتھ مقام پہاڑوں کی اونچی چوٹیوں پر واقع ہیں جس سے متعلق دیوی دیوتاؤں کے درشن کے لئے مشکل چڑھائی سے گزرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ دوسری جانب کسی سمندر کے ساحل پر واقع ایک مندر عقیدت مندوں کو اپنے وطن کی تاریخ، جغرافیہ، ورنوں کے بارے میں سوچنے کے لئے مائل کرتا ہے۔ جب جب میں پربھاس پاٹن گیا ہوں، سومناتھ مندر کے قدموں میں لوٹتی سمندری لہروں کو دیکھ کر ہر بار میرا دل ایک انوکھی جستجو اور جوش وخروش سے بھر گیا کہ اکیلے ہی اس مندر نے ہندوستان کی نہ مٹنے والی تاریخ کو کتنے قریب سے دیکھا ہوگا۔

منشی نے اپنے ناول میں سومناتھ مندر کا بڑا دلکش ذکر کیا ہے۔کس طرح عہد وسطیٰ میں یہ ہندوستان پر غیر ملکی حملوں کا گواہ اور شکار دونوں رہا۔افغانستان کے غزنی کے صوبے کے سلطان محمود غزنوی نے پچیس برسوں (1026-1001) کے درمیان ہندوستان پر 17 بار حملے کئے۔ سومناتھ کے مندر کو اس نے خاص طور پر نشانہ بنایا۔ مسلم تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ 1024 میں سومناتھ کے لئے لڑی گئی لڑائی میں 50000 ہندو مارے گئے۔ وہاں قائم شیولنگ کو خود سلطان نے ہی تباہ کر دیا۔کہا جاتا ہے کہ لڑائی کے بعد محمود غزنوی مندر سے سونا چاندی اور دیگر املاک لوٹ کر لے گیا۔کہا تو یہ بھی جاتا ہے کہ وہ اپنے ساتھ ہندو دیوی دیوتاؤں کی مورتیاں بھی لے گیا تھا جنھیں غزنی میں ایک مسجد کے سامنے دفنا دیا، تا کہ مسجد میں آنے والا ہر شخص انھیں اپنے پیروں سے کچلے۔منشی کے اس ناول میں سلطان کی جانب سے سومناتھ مندر کے انہدام کے ساتھ ساتھ یہ بھی ذکر ہے کہ کس طرح کچھ ہندوؤں نے ذات پات کی تنگ سوچ کے باعث اپنے ہی لوگوں کے ساتھ اعتماد شکنی کی۔ دوسری جانب کس طرح عقیدت مندوں نے ہر حملے اور انہدام کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور ہر بار مندر کی تعمیر نو کرائی، اس کا بھی حوصلہ افزا ذکر ہے۔

محمود غزنوی نے سومناتھ مندر پر کیوں اور کیسے حملہ کیا، اس سلسلے میں کئی بیانات ہیں۔ ڈاکٹر باباصاحب امبیڈکر نے اپنی کتاب 'پاکستان آر دی پارٹیشن آف انڈیا' میں سومناتھ مندر پر ہوئے ان حملوں کا ذکر کرتے ہوئے محمود غزنوی کے تاریخ نویس العتبی کے بیان کو پیش کیا ہے—

''اس نے مورت والے مندروں کو منہدم کیا اور اسلام کو قائم کیا۔اس نے شہروں پر قبضہ کیا اور مسلمانوں کو خوش کرنے کے لئے مورتیوں کی پوجا کرنے والوں کو مارا۔اس کے بعد اپنی مملکت میں واپس آ کر وہ اپنی بڑائی بیان کرتا ہے کہ اسلام کے لئے اس نے کتنی فتوحات

حاصل کیں...اور اس نے عہد کیا کہ ہر سال وہ ہند کے خلاف جہاد کرے گا۔'

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سومناتھ مندر کو اپنا نشانہ بنانے والا محمود غزنوی اکیلا مذہبی جنون میں مبتلا حکمراں نہیں تھا۔ اس طرح کا آخری حملہ 1706 میں گجرات کے اسی دور کے صوبیدار محمد اعظم نے اورنگ زیب کے حکم پر 'سومناتھ کے مندر کی تعمیر نو نہ ہو پانے کی میعاد تک منہدم کرنے' کے لئے کیا تھا۔ اس لئے جہاں سومناتھ مندر مسلم حملہ آوروں اور حکمرانوں کی مذہبی نفرت اور تشدد کا گواہ ہے وہیں یہ غیر ملکی ظالم لٹیروں کے خلاف عوام کے بہادرانہ احتجاج کی حوصلہ افزا مثال بھی ہے۔

> یہاں 'غیر ملکی' سے میری کیا مراد ہے، اسے بھی میں واضح کر دینا چاہتا ہوں۔ یہ بات مکمل طور سے سچ ہے کہ آزادی حاصل کرنے کے بعد ہمارے قوم پرست لیڈروں کی جانب سے سومناتھ مندر کی تعمیر کا جو فیصلہ لیا گیا تھا وہ ہندو بنام مسلم کے نظریات سے متاثر نہیں تھا، بلکہ ایسا کر کے ہم یہ ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ ہماری رواداری، فرقہ وارانہ غیر جانبداری قومی وقار اس طرح غیر ہندوستانی عناصر کی غیر رواداری اور جنگ یا فتح سے متاثر کاموں کی شرمناک تاریخ تو خاموشی سے تسلیم نہیں کر سکتا۔ محمود غزنوی اور اورنگ زیب کے کام ہمارے اصولوں اور قدروں کے لئے اس لئے غیر ملکی نہیں تھے کہ وہ مسلمان تھے۔ آخر ہندوستان میں رہنے والے 90 فیصد مسلمانوں کے آباء واجداد بنیادی طور پر ہندوستانی ہی تھے جو بعد میں اسلام قبول کر کے مسلمان بن گئے۔ ان دونوں حکمرانوں کے کام اس وجہ سے غیر ملکی تھے کہ دونوں نے ہی ہندوستان کے سبھی مذاہب کے تئیں عزت اور رواداری کی قومی روایت کو چوٹ پہنچائی۔ ہندوؤں کی بے عزتی کرنا اور انھیں یہ احساس دلانا کہ وہ ایک شکست خوردہ قوم ہے اور اس کے ساتھ ہی یہاں اسلام کو دیگر کسی بھی مذہب سے اوپر قائم کرنا۔ یہی ان حکمرانوں کا خاص مقصد رہا تھا۔

ہندوستان کی عہد وسطیٰ کی تاریخ میں مورتی توڑنے کے بارے میں سوامی وویکانند کا بیان یہاں پیش کرنا بے جا نہ ہوگا۔ سوامی وویکانند نے کہا تھا 'غیر ملکی حملہ آور ایک کے بعد ایک مندر توڑتا رہا، لیکن جیسے ہی وہ واپس جاتا وہاں اسی شاندار شکل میں مندر کھڑا ہو جاتا۔ جنوبی ہندوستان کے ان مندروں میں سے کچھ مندر اور گجرات کے سومناتھ جیسے دیگر مندر آپ کو ہندوستان کی تاریخ کے بارے میں اتنا کچھ بتا سکتے ہیں جو آپ کو کتابوں کے انبار سے بھی جاننے کو نہیں ملے گا۔ سوچئے ان مندروں کے انہدام اور تعمیر نو کے سیکڑوں نشان موجود ہیں—— مسلسل بار بار ٹوٹتے رہے اور ملبے سے ہی بار بار کھڑے ہوتے رہے۔ پہلے سے بھی زیادہ جذبہ کے ساتھ! یہی ہے قومی جذبہ، قومی لہر۔ اس لہر کے ساتھ چلئے، یہ آپ کو فخر کی جانب لے جائے گی۔'

سومناتھ مندر کی تعمیر نو کی داستان
سردار پٹیل کا پختہ یقین، مہاتما گاندھی کا آشیرواد،
کے ایم منشی کی جدوجہد اور صدر جمہوریہ راجندر بابو کی منظوری

ایسے میں یہ فطری ہے کہ 1947 میں جب ہندوستان آزاد ہوا تو بے شمار ہندوؤں کو یہ محسوس ہوا کہ یہ نہ صرف انگریزی حکومت سے نجات ہے بلکہ سابق برٹش ہندوستانی تاریخ کے ان پہلوؤں سے بھی نجات ہے جنھیں بت شکن، مندروں کے انہدام اور نسلی حاکمیت اور بہتر ثقافتی روایات کی خلاف ورزی جیسے خراب رجحانات کے طور پر دیکھا جاتا رہا ہے۔ ہندوستان کو آزادی بھی ملی تو اس کے ساتھ ہی اسے مسلم لیگ کی ہٹ

دھری کا مطالبہ، جو فرقہ وارانہ سوچ سے متاثر تھی، جس کے باعث تقسیم اور اس کے نتیجے کے طور پر پھوٹ پڑنے والے فرقہ وارانہ تشدد کا قہر بھی جھیلنا پڑا۔ یہ فطری ہی ہے کہ آزادی کے بعد ہندوستان کے قومی شعور نے اپنی تہذیبی شناخت کو دوبارہ پیش کرنے کے لئے کچھ حد تک ہندو علامتوں کا استعمال کیا۔

ایسی ہی صورت حال گجرات کے سوراشٹر علاقے کی جوناگڑھ ریاست میں پیدا ہوئی تھی جہاں سومناتھ کا مندر واقع ہے۔ جوناگڑھ کی 80 فیصد آبادی ہندو تھی، لیکن ریاست کا نواب مسلمان تھا۔ آزادی کی ماقبل شام نواب نے اپنی ریاست کو پاکستان سے ملانے کا اعلان کر دیا۔ اس سے ریاست کے ہندو بھڑک اٹھے اور انھوں نے بغاوت کر دی۔ نتیجے کے طور پر ایک مقامی کانگریسی لیڈر سامل داس گاندھی کی قیادت میں ایک متوازی حکومت بنائی گئی۔ نواب تو مزاج سے ہی عیش پرست اور لاپروا حکمراں تھا۔ ریاست کے عوام اسے بالکل پسند نہیں کرتے تھے۔ جب اسے کوئی اور راستہ نہیں ملا تو اس نے پاکستان سے مدد مانگی، لیکن اس کا کوئی بھی قدم کامیاب نہیں ہوا اور بالآخر ایک رات وہ چپ چاپ پاکستان بھاگ گیا۔ رام داس گاندھی اور ریاست کے دیوان سر شاہ نواز بھٹو— جو ذوالفقار علی بھٹو کے والد تھے — نے ہندوستان کو پیغام بھیجا کہ جوناگڑھ ریاست ہندوستان میں ضم ہونے والی ہے۔ اپنی کتاب 'پلگر یمیج ٹو فریڈم' میں کے ایم منشی نے اس وقت کو یاد کرتے ہوئے لکھا ہے کہ سردار ولبھ بھائی پٹیل، جو اس وقت ہندوستان کے وزیر داخلہ تھے اور جن کے سر ملکی ریاستوں کو ہندوستان میں ملانے کا سہرا جاتا ہے، نے انھیں (کے ایم منشی کو) انضمام کی اطلاع والا تار سونپتے ہوئے بڑے فخر کے ساتھ اعلان کیا 'جے سومناتھ'۔

جوناگڑھ کے ہندوستان میں ضم ہونے کے بعد سردار پٹیل نے 9 رنومبر 1947 کو سوراشٹر کا دورہ کیا۔ ان کے ساتھ اس وقت کے عوامی تعمیرات اور بازآبادکاری کے وزیر این وی گاڈگل بھی تھے۔ جوناگڑھ کے عوام نے دونوں کا خوب گرم جوشی سے استقبال کیا۔ ان کے اعزاز میں ایک جلسہ منعقد کیا گیا، جسے خطاب کرتے ہوئے سردار پٹیل نے ایک انتہائی اہم اعلان کیا— آزاد ہندوستان کی سرکار تاریخی سومناتھ مندر کی اسی مقام پر تعمیر نو کرے گی، جہاں قدیم دور میں وہ قائم رہا تھا اور اس میں جیوتر لنگم قائم کیا جائے گا۔ پنڈت نہرو کی وزارتی کونسل میں وزیر تعلیم رہے مولانا ابوالکلام نے کہا کہ مندر کی جگہ کو تاریخی عمارت کے طور پر محفوظ رکھنے کے لئے ہندوستانی آثار قدیمہ سروے کو سونپ دیا جانا چاہئے، لیکن سردار پٹیل کا ردعمل بھی پختہ تھا—

> ''اس مندر سے ہندوؤں کا جذبہ مستحکم اور وسیع ہے۔ موجودہ حالات میں یہ ممکن نہیں دکھائی دیتا کہ صرف مندر کی بحالی سے یا اس کی زندگی تھوڑی سی بڑھا دینے بھر سے جذبے کی تسکین ہو جائے گی۔ مندر میں مورت کو دوبارہ قائم کرنے سے ہی ہندو عوام کے جذبے کو عزت ملے گی۔''

چونکہ سردار پٹیل اپنے فیصلے پر قائم تھے اور اس سلسلے میں کوئی بھی سمجھوتہ نہیں چاہتے تھے، بالآخر پنڈت نہرو کی وزارت کونسل کو ان کی تجویز کو منظوری دینی پڑی۔ واضح رہے کہ مہاتما گاندھی نے بھی اس تجویز کی مکمل حمایت کی تھی۔ ان کا صرف اتنا ہی کہنا تھا کہ مندر کی تعمیر نو کے لئے رقم سرکاری خزانہ سے نہ لے کر عوام سے ہی اکٹھی کی جائے۔

یہیں منشی سومناتھ مندر کی کہانی میں پھر داخل ہوتے ہیں۔ کسی مؤرخ کے طور پر نہیں بلکہ ایک تاریخ ساز کے طور پر— وہ پنڈت نہرو کی وزارتی کونسل میں خوراک اور زراعت کے محکمے کے وزیر تھے۔ انھیں مندر کی تعمیر نو کے کام کی نگرانی کے لئے قائم بااختیار کمیٹی کا صدر بنایا گیا تھا، لیکن یہ ان کے لئے کوئی آسان کام نہیں تھا۔ 15 ردسمبر 1950 کو سردار پٹیل کی اچانک موت کے بعد ان کا کام اور بھی مشکل ہو گیا۔ سرکار کے

باہر بائیں بازو کے دانشوروں اور لیڈروں کے ساتھ ساتھ انھیں خود وزیراعظم کی جانب سے سخت نکتہ چینی کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ دراصل پنڈت نہرو کو بعد میں ایسا لگنے لگا تھا کہ سومناتھ مندر کی تعمیرنو میں سرکار کے خود شامل ہو جانے سے سیکولرازم کی وابستگی کی خلاف ورزی ہو رہی ہے۔ سردار پٹیل کی موت کے بعد انھیں کھل کر مخالفت کرنے کا موقع اور ہمت دونوں مل گئی۔ اب منشی اپنے مشن میں اکیلے پڑ گئے۔ وزارتی کونسل میں ان کے کئی ساتھی ان کی انفرادی طور سے حمایت اور تعاون کر رہے تھے، لیکن وہ اپنی بات براہ راست کہہ کر وزیراعظم کے عتاب کے شکار نہیں بننا چاہتے تھے۔ ایک بار وزارتی کونسل کی میٹنگ کے بعد وزیراعظم نے منشی کو بلایا اور کہا 'میں نہیں چاہتا کہ آپ سومناتھ مندر کی تعمیرنو کی کوشش کریں۔ یہ ہندو نو بیداری ہے۔'

ایک لیڈر کے کردار کے لئے امتحان کی گھڑی اس وقت ہوتی ہے، جب اس کے اعتماد اور مقصد کو چیلنج مل رہا ہو۔ وزیراعظم کی سطح پر رکاوٹوں کا سلسلہ شروع ہونے پر منشی نے 24/اپریل 1951 کو پنڈت نہرو کو ایک خط لکھا۔ بلاشبہ ان کا خط اب تک کسی وزیراعظم کو کسی باہمت وزیر کی جانب سے لکھے آج تک کے بہترین خطوں میں سے ایک ہے۔ منشی جی نے لکھا تھا—

''کل آپ نے ہندو احیا کا ذکر کیا تھا۔ وزارتی کونسل میں آپ نے میری سومناتھ سے وابستگی پر انگلی اٹھائی۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ نے ایسا کیا، کیونکہ میں اپنے کسی نظریہ یا کام کو پوشیدہ نہیں رکھنا چاہتا ہوں... میں آپ کو یقین دلا سکتا ہوں کہ ہندوستان کے تمام عوام آج حکومت ہند کی جانب سے سومناتھ کی تعمیر کے منصوبہ سے بہت خوش ہیں، اتنی خوشی اسے اب تک ہماری جانب سے کیے گئے یا کیے جا رہے کسی بھی کام سے نہیں ملی ہے۔''

سومناتھ کی تعمیرنو سے وابستہ اصلاح معاشرہ کے پہلو پر زور دیتے ہوئے منشی جی نے آگے لکھا—

''مندر کے دروازے ہریجنوں کے لئے کھولنے کے فیصلے کی ہندو فرقہ کے انتہاپسند طبقہ کی جانب سے کچھ نکتہ چینی ضرور ہو رہی ہے، لیکن ٹرسٹ کے قرارنامے میں واضح کر دیا گیا ہے کہ مندر کے دروازے نہ صرف ہندوؤں کے سبھی طبقوں کے لئے کھلے ہیں بلکہ سومناتھ مندر کی قدیم روایت کے مطابق وہ غیر ہندوؤں کے دیدار کے لئے بھی کھلا ہے۔ کئی رسم و رواج کو میں اپنی ذاتی زندگی میں بچپن سے توڑتا رہا ہوں۔ ہندو دھرم کے کچھ پہلوؤں کو جوڑنے کے لئے میں نے اپنے ادبی اور سماجی کام کے ذریعہ اپنی جانب سے پوری کوشش کی ہے۔ اس یقین کے ساتھ کہ ایسا کر کے ہی نئے حالات میں ہندوستان کو ایک ترقی یافتہ اور طاقتور ملک بنایا جا سکتا ہے۔''

منشی نے ایسے دلکش الفاظ کے ساتھ خط کو ختم کیا جسے ہم کو سنبھال کر ہمیشہ کے لئے سنبھال کر رکھنا چاہئے—

''مستقبل کو دھیان میں رکھ کر حاضر میں کام کرنے کی طاقت مجھے ماضی کے تئیں اپنے یقین سے ملتی ہے۔ ہندوستان کی آزادی اگر ہمیں 'بھگوت گیتا' سے دور کرتی ہے یا ہمارے کروڑوں لوگوں کے اس اعتماد اور جذباتی وابستگی کو توڑتی ہے جو ہمارے مندروں کے تئیں ان کے دل میں ہے اور ہمارے سماج کے تانے بانے کو درہم برہم کرتی ہے تو ایسی آزادی کی میرے لئے کوئی قیمت نہیں ہے۔ سومناتھ مندر کی تعمیر کا جو خواب میں ہر روز دیکھتا آیا ہوں اور اسے پورا کرنے کا مجھے اعزاز حاصل ہوا ہے۔ اس سے میرے دل میں بھی احساس اور اعتماد پیدا ہوتا ہے کہ اس متبرک مقام کی تعمیرنو سے ہمارے ملک کے لوگوں کے مذہبی نظریات امید کے مطابق مزید بہتر ہوں گے اور اس سے اپنی طاقت کے تئیں ان کی بیداری اور بھی بڑھے گی، جو آزادی کے ان مشکل بھرے دور میں بہت ضروری ہے۔''

اس خط کو پڑھ کر مشہور انتظامیہ افسر وی پی مینن — جنھوں نے دیسی ریاستوں کے انضمام میں سردار پٹیل کی بھرپور مدد کی تھی — نے منشی

کو ایک خط میں لکھا — 'میں نے آپ کے اس نادر خط کو دیکھا۔ جو باتیں آپ نے خط میں لکھی ہیں، ان کے لئے تو میں جینے اور ضرورت پڑنے پر مرنے کے لئے بھی تیار ہوں۔'

کس طرح منشی نے ان نامساعد حالات اور رکاوٹوں کا سامنا کیا اور کس طرح وہ بالآخر اپنے کام میں کامیاب ہوئے — سب کچھ ایک حوصلہ افزا داستان کی طرح ہے، جسے انھوں نے اپنی کتاب 'سومناتھ: دی شرائن اٹرنل' میں لکھا ہے۔ ہندوستان کی تحریک آزادی پر لکھی ان کی ایک دیگر کتاب 'پلگر یمیج ٹو فریڈم' میں بھی سومناتھ مندر معاملے پر کئی باب ملتے ہیں۔ اس میں انھوں نے افسوس ظاہر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مہاتما گاندھی اور سردار پٹیل کی موت کے بعد ہندو دھرم 'سیکولرازم' کے لئے الرجی بن گیا ہے۔ 'اس کے نام پر برسراقتدار سیاست داں ایسے عجیب رویے کو لے کر چلنے لگے ہیں، جو ایک طرف تو اقلیتی فرقے کی مذہبی و سماجی خدمات کے ساتھ سمجھوتے کر رہا ہے اور دوسری طرف اکثریتی فرقے کے اسی طرح کے جذبات کو فرقہ پرستی کا ٹھپہ لگا رہا ہے۔ سومناتھ مندر کی تعمیر نو سے متعلق کچھ واقعات سے واضح ہو جاتا ہے کہ کس طرح ہندو دھرم کے لئے سیکولرازم الرجی بن جاتا ہے۔'

'اس طرح کے بدبختانہ رویے سے اکثریتی فرقے میں خوف اور مایوسی کا جذبہ پیدا ہو رہا ہے۔ اگر اس 'سیکولرازم' لفظ کا اسی طرح غلط استعمال ہوتا رہا، اگر سنسکرت جو اتحاد کی علامت ہے — کو ہم اپنے لسانی فارمولوں میں جگہ نہیں دیتے، ہر بار اسی طرح فرقہ وارانہ تصادم میں سچائی کو نظرانداز کرتے ہوئے اکثریتی فرقے کو ہی قصوروار ٹھہرایا جاتا رہا۔ اگر بنارس، متھرا اور رشی کیش وغیرہ تیرتھ استھانوں میں بڑے بڑے کارخانے قائم کر کے انھیں اسی طرح صنعتی بستی میں تبدیل کیا جاتا رہا تو روایتی رواداری کا چشمہ سوکھ جائے گا۔ جب اکثریتی فرقہ صبر اور رواداری کا مظاہرہ کر رہا ہو تو اقلیتی فرقے کو بھی اس کے ساتھ ربط ضبط قائم کر کے چلنا سیکھنا چاہئے۔ ورنہ مستقبل غیر یقینی صورت حال سے دوچار ہو جائے گا اور ایسے میں ہم دھماکہ خیز صورت حال سے بچ نہیں سکیں گے۔'

چونکہ سردار پٹیل اب نہیں رہے تھے، اس لئے منشی نے نو تعمیر شدہ سومناتھ مندر کے افتتاح اور جیوتر لنگ کے باضابطہ قیام کی تقریب کے لئے اس وقت کے صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرساد سے گزارش کی۔ حالانکہ انھیں ڈر تھا کہ کہیں راجندر بابو ان کی درخواست کو ٹھکرا نہ دیں اور کہیں وزیراعظم صدر جمہوریہ کی جانب سے ایک ہندو مندر کا افتتاح کیے جانے کی مخالفت نہ کریں۔ پہلی بات تو راجندر بابو خود ہی انکار کر سکتے تھے، کیونکہ انھیں وزیراعظم کے ساتھ منشی کی خط و کتابت کے بارے میں سب کچھ پتہ تھا، لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا — راجندر بابو نے افتتاحی تقریب میں آنے کا وعدہ کر لیا۔ یہ منشی کے لئے کم خوشی کی بات نہیں تھی۔ راجندر بابو نے یہ بھی کہا کہ 'مجھے اگر مسجد یا گرجا گھر کے لئے بھی دعوت دی جاتی تو بھی میں اسے منظور ہی کرتا۔ یہی ہندوستانی سیکولرازم کا بنیادی عنصر ہے۔ ہمارا ملک نہ غیر مذہبی ہے اور نہ ہی مذہب مخالف۔'

منشی کا خدشہ صحیح نکلا۔ پنڈت نہرو نے صدر جمہوریہ کے سومناتھ مندر کے افتتاح کے لئے جانے کی زوردار مخالفت کی، لیکن راجندر بابو نے ان کی مخالفت پر توجہ نہیں دی اور اپنے قول پر عمل کیا۔ اس موقع پر ان کی تقریر ہندوستان کے کسی بھی صدر جمہوریہ کی جانب سے سیکولرازم پر کی گئی تقریروں میں سے ایک ہے —

''کائنات یا دنیا کی تخلیق کرنے والے برہما بھی بھگوان وشنو کی ناف میں رہتے ہیں۔ اسی طرح انسان کے دل میں بھی تعمیری قوت اور مذہبی عقیدہ براجمان ہے، جو دنیا کے بڑے بڑے اسلحے، آلات، بڑی بڑی فوجوں اور شہنشاہوں کی طاقت سے بھی بڑھ کر ہے۔ قدیم دور میں ہندوستان سونے اور چاندی کا خزانہ تھا... صدیوں قبل دنیا کے کل سونے کا بیشتر حصہ ہندوستان کے مندروں میں تھا۔ مجھے یقین

ہے کہ سومناتھ مندر کی تعمیر نو اس دن مکمل ہوگی جب اس بنیاد پر نہ صرف ایک شاندار مورت کھڑی ہوگی بلکہ اس کے ساتھ ہی ہندوستان کی اصلی خوشحالی کا محل بھی کھڑا ہوگا، وہی خوشحالی جس کا سومناتھ کا یہ قدیم مندر علامت رہا ہے۔'

سومناتھ مندر کی قومی عقیدت اور اعتماد کی علامت بناتے ہوئے راجندر بابو نے آگے کہا تھا—

''اپنے انہدام کے باقیات سے ہی بار بار کھڑا ہونے والا سومناتھ کا یہ مندر پکار پکار کر دنیا سے یہ کہہ رہا ہے کہ جس کے تئیں لوگوں کے دل میں بے پناہ عقیدت ہے، اسے دنیا کی کوئی بھی طاقت تباہ نہیں کرسکتی...آج جو کچھ ہم کر رہے ہیں وہ تاریخ میں درج کرنے کے لئے نہیں ہے۔ ہمارا واحد مقصد اپنے روایتی انداز، اصولوں اور عقیدت کے تئیں اپنی وابستگی کو ایک بار پھر دوہرانا ہے جن پر قدیم زمانے سے ہی ہمارے مذہب اور مذہبی یقین کی عمارت کھڑی ہوئی ہے۔'

یہاں یہ ذکر کرنا غیر ضروری نہ ہوگا کہ سومناتھ مندر کی تعمیر نو کی پاکستان نے سخت مذمت کی تھی۔ اس سلسلے میں حکومت ہند کی مذمت کے لئے کراچی میں ایک جلسہ بھی ہوا تھا۔

سومناتھ مندر آج ہمیں یہ یاد دلاتے ہوئے کھڑا ہے کہ کوئی کمزور ملک اگر باہری حملوں سے اپنی حفاظت نہیں کرسکتا تو اپنی سیاسی آزادی سے بڑھ کر بہت کچھ کھو بیٹھتا ہے۔ وہ اپنی تہذیبی وراثت کے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا ہے اور یہی تہذیبی وراثت ہندوستان کی روح ہے۔ مہاتما گاندھی اور ڈاکٹر راجندر پرساد کی نیک خواہشات سے حکومت ہند کی جانب سے سومناتھ مندر کی تعمیر نو کر کے سردار پٹیل اور کے ایم منشی نے یہ قابل فخر ثبوت دے دیا کہ ہندوستان میں وہ قوت ارادی ہے جس کے بل پر وہ مذہبی جنون میں مبتلا غیر ملکی حملہ آوروں کی تاریخ کو مٹا کر اپنے کھوئے ہوئے تہذیبی وقار کو دوبارہ حاصل کرسکتا ہے اور اپنا سر اونچا کر کے کھڑا رہ سکتا ہے۔ اس سلسلے میں اگر دیکھا جائے تو سومناتھ مندر ہندوستان بھر میں واقع سیکڑوں ہزاروں مندروں سے واقعی بالکل الگ اور انوکھا ہے۔

حصہ - 1

اجودھیا تک پہنچی سومناتھ کی گونج

ہندوستان کی قومی شناخت کا اظہار

سومناتھ مندر کے انہدام اور تعمیر نو کا اتنا لمبا تاریخی پس منظر میں نے اس لئے پیش کیا، کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ یہاں ان وجوہات، حوالوں اور حالات کو سمجھ لینا ضروری ہے جن کے باعث مجھے اجودھیا میں رام مندر کی تعمیر نو کی اپنی پارٹی کی مہم کی قیادت کرنی پڑی۔ 80 کی دہائی میں جب اجودھیا معاملہ قومی سیاست کے مرکز تک پہنچ گیا تو اس وقت میرے ذہن میں مہاتما گاندھی، سردار پٹیل، راجندر پرساد اور کے ایم منشی کی ایک ایک بات اور کام گونجنے لگے جو انھوں نے سومناتھ مندر کی تعمیر نو کے خواب کو پورا کرتے وقت کیے تھے۔ دراصل اجودھیا بھی سومناتھ سے وابستہ ہمارے جذبہ کا ہی ایک حصہ تھا۔

1990 میں بی جے پی نے جب یہ فیصلہ کیا کہ پارٹی کے اجودھیا میں رام مندر کی تعمیر نو کے لئے عوام کی حمایت حاصل کرنے کی خاطر میں پارٹی کا قومی صدر ہونے کے ناطے رام رتھ یاترا کی قیادت خود کروں تو یہ تاریخی یاترا شروع کرنے کے لئے سومناتھ سے زیادہ مناسب مقام کوئی اور نہیں تھا۔ میں نے اجودھیا معاملے میں بحث کے بارے میں سومناتھ کو مرکز بنایا جس نے ہندوستان کے سیاسی اور دانشور طبقے کو اسی طرح خانوں میں تقسیم کردیا جس طرح 50 کی دہائی کے نصف اوّل میں دیکھنے کو ملا تھا۔

منشی کی دو باتیں حسب توقع سچ ثابت ہوئیں۔ پہلی 'سیکولرازم' کے معنی ہوگئے مذہب سے الرجی، دوسری بات اگر یہ الرجی بنی رہی تو اکثریتی فرقہ کے صبر اور رواداری کو نظرانداز کرنا جاری رہا تو 'دھماکہ' ہونا یقینی ہے۔ 6/دسمبر 1992 کو اجودھیا میں متنازع ڈھانچے کو منہدم کیا جانا اسی طرح کا دھماکہ تھا جو خود میں قابل افسوس تھا، لیکن غیر جانبدارانہ طور پر کوئی دیکھے اور ان صورت حال اور واقعات کو سمجھنے کی کوشش کرے تو اسے جو کچھ ہوا اس پر ذرا بھی حیرت نہیں ہوگی۔ اسی طرح اسے اس بات پر بھی کوئی تعجب نہیں ہوگا کہ دھماکہ سے نہ صرف متنازع ڈھانچہ گر گیا بلکہ اس کی وجہ سے ایک چھوٹا سا عارضی مندر بھی تیار ہوگیا، جس میں رام للا کی مورت رکھی گئی۔

یہ حیرت انگیز بات ہے—اور انتہائی اہم بھی— کہ اس چھوٹے سے مندر کی تعمیر اس وقت ہوئی جب پی وی نرسمہا راؤ کی قیادت میں کانگریس سرکار کا اجودھیا اور اتر پردیش پر پورا کنٹرول تھا (اتر پردیش کے اس وقت کے وزیر اعلیٰ کلیان سنگھ نے 6/دسمبر کو دوپہر بعد استعفیٰ دے دیا اور ریاست میں صدر راج نافذ کردیا گیا تھا) حیرت اس لئے کہ کانگریس اور اس کی سرکار نے 6/دسمبر کے واقعہ سے قبل اور اس کے بعد بھی کہا تھا کہ متنازعہ ڈھانچہ ایک مسجد کا ہے اور اس جگہ مندر بنانے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ اہم اس لئے کہ چاہے جان بوجھ کر یا چاہے مجبوری کی وجہ سے مرکزی حکومت نے نہ صرف عارضی مندر کی تعمیر ہونے دی بلکہ وہاں (شری رام کے) جنم استھان پر عقیدت مندوں کے لئے بھگوان رام کے درشن اور روزانہ پوجا کا انتظام کیا۔ میں نہیں جانتا کہ یہ سب اس وقت کے وزیر اعظم نے جان بوجھ کر یا پھر کوئی طاقت تھی جس نے انھیں اور ان کی سرکار کو یہ کرنے کے لئے مجبور کردیا۔

رام: ہندوستانی تہذیب کی مثالی علامت

ہر عوامی تحریک کی اپنی حوصلہ افزا طاقت ہوتی ہے، کیونکہ اس میں لاکھوں افراد— جو اس میں حصہ لیتے ہیں— کی توانائی، حوصلہ اور جوش سمایا ہوتا ہے، لیکن ایسے کم ہی لمحے ہوتے ہیں کہ عوام کی آواز کے ساتھ ساتھ اس قوم کی روح کی آواز بھی گونج اٹھتی ہے۔ ان دونوں آوازوں کو ملانے سے ایک ایسی طاقت پیدا ہوتی ہے جو تاریخ کو بھی ہلا کر رکھ دیتی ہے۔

رام جنم بھومی تحریک کو اتنی وسعت اور طاقت کیسے ملی؟ اس کا جواب تلاش کرنے کے لئے پہلے ہمیں یہ سمجھنا ہوگا کہ ہندوستان کی قومی زندگی میں شری رام اور 'رامائن' کی کیا اہمیت ہے؟ مہابھارت کے ساتھ ساتھ رامائن بھی ہندوستانیوں کے تہذیبی تشخص اور اخلاقی بنیادی نظام کو نسل در نسل اور صدی بہ صدی متاثر کرتی رہی ہے۔ شری رام مثالی راجہ تھے، اسی لئے گاندھی نے 'رام راجیہ' کو اصولی حکومت کے طور پر بیان کیا تھا۔ شری رام ایک مثالی انسان بھی تھے، اس لئے انھیں 'مریادا پرشوتم' بھی کہا جاتا ہے۔

رامائن کی پوری داستان ان انسانی جذبات اور اخلاقی فرائض کا ایک انوکھا امتزاج ہے جو ہر جگہ موجود ہے۔ اس عظیم داستان کا ایک ایک کردار، شری رام اور ان کی اہلیہ سیتا، بھائی لکشمن، بھرت اور شتروگھن ان کے خادم ہنومان، جن کی دانز دیوتا کے طور پر پوجا کی جاتی ہے، ان

کے والد دشرتھ اوران کی ماں کوشلیا اور سوتیلی ماں کیکئی وسمترا، ان کے بیٹے لو اور کش، راکشش راج راون اور دیگر — ایک عام ہندوستانی کے دل ودماغ سے جڑا ہوا ہے۔ اس کے عام کرداروں کے ساتھ بھی اخلاقی تعلیم دینے والی انتہائی مقبول کہانیاں جڑی ہوئی ہیں۔ جنگل میں رہنے والی بھیلنی شبری کی ہی مثال لیجئے جو شری رام کے دیدار کی خواہش دل میں لئے رات دن انتظار کرتی ہے اور اپنے چودہ سال کے بن واس کے دوران جب رام خود درشن دیتے ہیں اور اس کی خدمت منظور کرتے ہیں تو اسے اپنی خوش قسمتی پر یقین نہیں ہوتا۔ اسی طرح شرون کمار بھی ایک مثالی کردار ہے جس سے والدین کے تئیں ایک فرض کی تعلیم ملتی ہے۔ ایک افسوسناک واقعہ نے والمیکی کو ایک قبائلی شکاری سے ایک عظیم رشی اور شاعر بنادیا اور انھوں نے 'رامائن' جیسے عظیم ادب کی تخلیق کرڈالی، یہ خود میں ایک کارنامہ ہے۔

شاید ہی کوئی ایسی ہندوستانی زبان ہوگی جس میں رامائن کا ترجمہ یا دوبارہ نہ لکھا گیا ہو۔ عوامی روایت کی بات کریں تو کوئی بھی عوامی روایت ایسی نہیں ہوگی جس میں شری رام کی زندگی پر مبنی قصے نہیں چلے آرہے ہوں۔ ہندوستان میں کوئی ایسی ذات، علاقہ نہیں ہے جس میں شری رام کا نام کسی نہ کسی شکل میں نہیں آتا ہو۔

ہندوستان میں اب تک ہوئے سبھی سنت شاعروں نے رام کی شان میں قصیدے پڑھے ہیں۔ تلسی داس سے لے کر سورداس تک، کبیر سے لے کر تکارام تک، آسام کے شنکر دیو سے لے کر تمل ناڈو کے کمب تک، یہاں تک کہ سکھوں، جینیوں، بدھوں اور آریہ سماجیوں (جو مورت کو پوجنے میں یقین نہیں کرتے) نے بھی شری رام اور رامائن کی تعریف کی ہے۔ 'گرو گرنتھ صاحب' میں شری رام کا نام تقریباً 2400 بار آیا ہے۔

مختلف ہندوستانی مسلمانوں نے بھی شری رام کو ایک مثالی حکمراں اور عظیم انسانی خصوصیات کی علامت کے طور پر دیکھا ہے۔ علامہ اقبال — اردو فارسی کے مشہور شاعر نے تو 'امام ہند' کے طور پر کیا ہے اور انھیں ہندوستان کا روحانی پیشوا بتاتے ہوئے یہ لکھا ہے

لبریز ہے شراب حقیقت سے جام ہند
سب فلسفی ہیں خطہ مغرب کے رام ہند
یہ ہندیوں کی فکر فلک رس کا ہے اثر
رفعت میں آسماں سے اونچا ہے بام ہند
اس دیش میں ہوئے ہیں ہزاروں ملک سرشت
مشہور جن کے دم سے ہے دنیا میں نام ہند
ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز
اہل نظر سمجھتے ہیں اس کو امام ہند
اعجاز اس چراغ ہدایت کا ہے یہی
روشن تر از سحر ہے زمانے میں شام ہند
تلوار کا دھنی تھا، شجاعت میں فرد تھا
پاکیزگی میں جوش محبت میں فرد تھا

گاندھی جی تو پوری زندگی رام نام کے بنیادی اصول کو لے کر چلتے رہے اور یہی رام نام ہی ان کے سماجی اور سیاسی کاموں میں حوصلہ دیتا

رہا یا ان کے لئے توانائی کا باعث تھا۔ انھوں نے کہا تھا 'رام نام تمام مسائل کا حل ہے اور سب کو نجات دلاتا ہے۔' بنیادی طور پر وہ شری رام کو خالص ہندو دیوتا کے طور پر نہیں دیکھتے جس کی پوجا کی جاتی ہے، شری رام ان کے لئے عالمی بھائی چارہ اور ہندوستان کے تناظر میں، قومی اتحاد و سالمیت کی روحانی طاقت تھے۔ مثال کے طور پر ان کی سرودھرم پرارتھنا سبھا رام دُھن کے بغیر ادھوری رہتی تھی—

'رگھوپتی راگھو راجہ رام، پتت پاون سیتا رام
ایشور اللہ تیرو نام، سب کو سمتی دے بھگوان'

اس گیت میں یہ یقین ظاہر کیا گیا ہے کہ ایشور اور اللہ دونوں ہی روحانی طاقت کے نام ہیں، جس کی عقیدت مندوں کو صاف دل، نیک خیالات کے لئے دعا کرنی چاہئے۔ واضح رہے کہ مسلم لیگ گاندھی جی کی پرارتھنا سبھاؤں کی نکتہ چینی کرتا تھا، کیونکہ ان کے سبھی سماجی اور سیاسی پیغام رام دُھن (رگھوپتی راگھو راجہ رام) سے شروع ہوتے تھے۔ کچھ مسلمان اور مارکسوادی تو آج بھی یہ سمجھتے ہیں کہ 'رام راجیہ' کا نعرہ پیش کر کے گاندھی جی نے ہندوستان کی تحریک آزادی کو 'فرقہ وارانہ' رنگ دے دیا تھا، لیکن اس طرح کا نکتہ چینی پر مبنی نظریہ عدم واقفیت اور ضد پر مبنی ہے، کیونکہ گاندھی جی نے خود واضح کر دیا تھا 'رام راجیہ سے میری مراد ہندو راج سے نہیں، میرا مطلب ایشور کا راجیہ ہے۔' اور آخر میں جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں، آخری وقت میں بھی ان کے ہونٹوں پر 'ہے رام' لفظ ہی تھا۔

اس طرح رام ہندوستان کی شناخت، اتحاد اور سالمیت کی علامت ہیں۔ وہ ہندوستانیوں کی اعلیٰ زندگی کی اقدار کی علامت ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی جائے پیدائش اجودھیا، جو کہ ان کی راجدھانی بھی رہی تھی، سیکڑوں صدیوں سے ہندوؤں کی عقیدت کا مرکز ہے۔

بابری مسجد
ماضی میں موجود ہندو مندر کے انہدام کا ثبوت

بدقسمتی سے سومناتھ کی طرح ہی اجودھیا میں رام جنم بھومی پر واقع مندر بھی ایک غیر ملکی حملہ آور بابر کے حملوں کا شکار ہوا، جو مغل حکومت کا بانی تھا۔ 1528 میں بابر نے اپنے سپہ سالار میر باقی کو اجودھیا میں ایسی جگہ مسجد بنانے کا حکم دیا جسے وہ 'فرشتوں کے اوتار کی جگہ' بنانا چاہتا تھا۔ اس مسجد کا نام ہی 'بابری مسجد' پڑا۔ ہندوؤں میں عام یقین ہے کہ میر باقی نے شری رام کی جائے پیدائش یعنی رام جنم بھومی پر پہلے سے واقع ایک مندر کو منہدم کر کے ہی مسجد کی تعمیر کروائی تھی۔

سچ ہی کہا جاتا ہے کہ ہارنے والا اپنی ہار کی تاریخ کبھی نہیں لکھتا ہے، جبکہ فاتح ہمیشہ اپنی فتح کی دستاویز رقم کرتا ہے۔ (سولہویں صدی) میں لکھا ہے کہ اودھ (جس کے تحت اجودھیا واقع تھا) ترپتا دور کے شری رام چندر کی جائے پیدائش تھی۔ وہاں رام نومی کا تہوار بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا تھا۔ بہادر شاہ ابن عالمگیر کی بیٹی کی لکھی کتاب 'صحیفہ چہل نصیح بہادر شاہی' جسے سترہویں-اٹھارہویں صدی میں لکھا گیا تھا، میں کہا گیا ہے— 'کنہیا (کرشن) کی جائے پیدائش، سیتا کی رسوئی، ہنومان-استھل...ان سبھی کو اسلام کے بل پر ختم کر دیا گیا اور ان جگہوں پر مسجدیں بنائی گئیں۔ اسی طرح مرزا جان نے (1856) 'حدیق شہادۃ' میں لکھا ہے— '...جائے پیدائش کا مندر شری رام کی اصل جائے پیدائش تھا۔ سیتا جی ان کی بیوی کا نام تھا، اس لئے اس کے بغل میں ہی سیتا کی رسوئی واقع ہے۔ اس طرح بابر بادشاہ نے میر عاشقان کی ہدایت میں اس جگہ ایک شاندار مسجد کی تعمیر کروائی...'

اجودھیا میں پہلے سے ہی مندر ہونے کے مضبوط آثار قدیمہ پر مبنی ثبوت ہیں۔ دراصل جن لوگوں نے 6 دسمبر 1992 کو 3 گنبدوں والے ڈھانچے کے منہدم ہونے سے قبل دیکھا تھا، اس میں انھیں دو تضاد دکھائی دیئے۔ پہلا، خاص طور پر ہندو شہر کے بیچ مندروں، آشرموں اور دیگر ہندو مذہبی اداروں سے گھری مسجد غیر فطری اور الگ دکھائی دیتی تھی۔ دوسرا بابری مسجد کا اندرونی حصہ ہندو آرکیٹکچر اور علامتی نشانوں سے بھرا ہوا تھا۔ مثال کے لئے مسجد کے ڈھانچے میں کالے پتھر کے چودہ ستون تھے، جن پر ہندو دھرم کے علامتی نشان کھدے ہوئے تھے۔ ایسے نشان عہد وسطیٰ کی بے شمار مسجدوں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ 70 کی دہائی میں پروفیسر بی بی لال کی قیادت میں ہندوستانی آثار قدیمہ (آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا) کی ایک ٹیم نے مسجد کے باہر کھدائی کی۔ ٹیم نے ستونوں کی لمبی قطاریں پائیں جو اس جگہ کسی بڑی عمارت کے ہونے کی نشان دہی کرتی ہیں۔ وشو ہندو پریشد کی جانب سے سارے ثبوت نرسمہا راؤ سرکار کی جانب سے اجودھیا موضوع پر بنائے گئے خصوصی سیل کو سونپ دیئے گئے۔ تجربہ کار اور سابق ایڈمنسٹریٹو افسر نریش چندرا اس سیل کے سربراہ تھے جو بعد میں امریکہ میں ہندوستان کے سفیر بنے۔

ڈھانچہ کے گرنے کے بعد متنازع جگہ پر پہلے ہندو مندر ہونے کے آثار قدیمہ، مصوری اور شیلا لیکھ سے متعلق کئی ثبوت بھی ہے۔ یہ شیلا لیکھ الٰہ آباد ہائی کورٹ کی جانب سے اس مقام کی زمین کے نیچے خصوصی جائزہ سروے اور ملبے میں حاصل باقیات کا ثبوت تھے۔ ملنے والی اشیاء میں وشنو کی ایک مورت، دیوناگری رسم الخط میں نقش ایک قدیم پاشان اور کالے پتھر کے دو ستون، جن پر کھلے کمل کے پھول پر پلتھی مار کر بیٹھی دو خوبصورت شکلیں نقش تھیں۔ ساتھ ہی گنیش جی کی ایک مورت بھی تھی۔ سب سے اہم کھوج تھی گیارہویں- بارہویں صدی کی ناگری رسم الخط میں سنسکرت زبان کی تین پٹیاں۔ ایک پٹی جنم بھومی اور وشال پہاڑ کی شکل کے پتھروں سے بنی وشنو ہری کے شاندار مندر کا ذکر کرتی ہے۔ یہی ثبوت بیان کرتا ہے کہ اس کی تعمیر اجودھیا میں ہی ہوئی ہے، جو ساکیت کے علاقے میں واقع ہے اور جہاں عظیم اور اونچے مندروں کی بہتات ہے۔ یہ انتہائی بدقسمتی ہے کہ اس تنازع کا حل کرنے اور اسے ہمیشہ کے لئے ختم کرنے کے مقصد سے ان تحقیقات کا کوئی علمی اور منظم طور سے مطالعہ نہیں ہوا۔

فلومش کیتھولک خاندان میں پیدا بلجیم کے عالم ڈاکٹر کونراڈ ایلسٹ نے اجودھیا معاملے پر تفصیل سے لکھا ہے — 'ایسے بے شمار ثبوت موجود ہیں جن سے یہ علم ہوتا ہے کہ ایک طرف جہاں ہندو روتے بلکتے رہے وہیں دوسری طرف مسلمان مندر منہدم کرکے اس جگہ مسجد کھڑی کرکے خود کو شاباشی دیتے رہے، مسلمانوں کے دور اقتدار میں شری رام کی یوم پیدائش منانے کے لئے ہندو اس مقام کے بالکل قریب تک پہنچ جاتے تھے، ویسے ہی جیسے مندر کے وجود کے وقت کرتے رہے تھے۔'

اجودھیا تنازع کا تاریخی پس منظر

1936 سے 1949 تک ڈھانچہ دراصل مندر ہی تھا

تاریخی دستاویزات سے پتہ چلتا ہے کہ اس متبرک مقام کو دوبارہ بحال کرنے کے لئے ہندو چار سو سال سے مسلسل جدوجہد کرتے رہے۔ رام جنم بھومی کی مذہبی اہمیت مدنظر رکھ کر دیکھیں تو یہ فطری سا لگتا ہے، لیکن جہاں تک مسلمانوں کی بات ہے ان کے لئے اس مقام کی نہ کوئی اہمیت رہی ہے اور نہ ہی کوئی تہذیبی۔ دوسری طرف طویل مسلم دور اقتدار میں ہندو تیرتھ یاترا کے لئے اجودھیا جاتے رہے۔ اس کے برعکس بابری مسجد کے سفر پر کوئی بھی مسلمان نہیں جاتا تھا، کیونکہ مسلمانوں کے لئے وہاں کچھ خاص تھا ہی نہیں، جس سے وہ اپنے مذہبی عقیدے سے وابستہ کرکے دیکھتے۔ ان کے لئے اس کی اہمیت تھی تو بس اتنی کہ وہ عہد وسطیٰ میں ایک حملہ آور کی فتح کی علامت تھی۔ ہندو بے چینی کی ایک وجہ یہ

بھی تھی— بابری مسجد ہندوؤں کے لئے مذہبی نقطہ نظر سے نا قابل قبول ہونے کے ساتھ ساتھ قومی ندامت کی علامت بھی تھی۔

اجودھیا ہی واحد ایسا متبرک ہندو مقام نہیں ہے جو اسلام کی غیر رواداراور انتہا پسند شکل ماننے والے مسلم حکمرانوں کے انہدام کا شکار ہوا ہے۔ ہندوستان کے مختلف حصوں میں ایسے سیکڑوں مندر اور ہندو تیرتھ مقام ہیں جو مذہبی جنون میں مبتلا مسلم حکمرانوں کے حملے کے شکار ہوئے۔ یہاں ایسے دو مذہبی مقامات کا ذکر کرنا ضروری ہے جو مذہبی اہمیت کے نقطہ نظر سے اجودھیا کے برابر ہیں۔ یہ دو مذہبی مقام ہیں — متھرا میں شری کرشن جنم بھومی اور کاشی میں وشوناتھ مندر جو ہندوؤں کے لئے سب سے متبرک مقامات ہیں۔

جہاں تک اجودھیا کی بات ہے اس میں ایک بات توجہ دینے لائق یہ ہے کہ جس مقام پر بابری مسجد واقع تھی، اسے واپس حاصل کرنے کے لئے ہندوؤں کی جانب سے جو کوشش کی گئیں ان کا وقت رام جنم بھومی تحریک سے کئی صدیوں قبل کا ہے۔ اس سچائی کے اصل پہلو کو سمجھ لینا ضروری ہے، خاص کر اس رجحان کو دیکھتے ہوئے جس میں یہ تشہیر کی جاتی رہی ہے کہ اجودھیا تحریک راشٹریہ سیوم سیوک سنگھ، وشو ہندو پریشد اور بھارتیہ جنتا پارٹی کی جانب سے مشترکہ طور پر تیار کیے گئے ایک 'ہندو سیاسی ایجنڈا' سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔

رام جنم بھومی مسئلہ کے سلسلے میں انیسویں اور بیسویں صدی میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ہوئی کم از کم دو جھڑپوں کا ذکر ملتا ہے۔ پہلی جھڑپ 1855 میں ہوئی تھی جس کے بارے میں فیض آباد ضلع (جس کے تحت اجودھیا واقع ہے) کے گزیٹر میں لکھا ہے— 1855 میں مسلمانوں نے حملہ کر کے رام جنم بھومی پر قبضہ کر لیا اور ہنومان گڑھی کو بھی اپنا نشانہ بنایا، لیکن انھیں منھ کی کھانی پڑی۔ نواب واجد علی شاہ کی فوج خاموش تماشائی رہی۔ ہندوؤں نے رام جنم بھومی ڈھانچہ کو دوبارہ حاصل کر لیا۔' دوسرا فرقہ وارانہ تصادم 1934 میں ہوا، جس میں کئی لوگ مارے گئے اور متنازعہ ڈھانچہ کو کافی نقصان پہنچا۔ اس واقعہ کے بعد متنازعہ ڈھانچہ کو تالا لگا دیا گیا اور 1950 تک یہی صورت حال تھی۔ اس کے باوجود ہندو عقیدت مندوں نے بند دروازے کے باہر اور مندر احاطے کے اندر واقع متبرک مقامات پر پوجا وغیرہ کرنا جاری رکھا۔

آزادی سے قبل اور اس کے بعد میں ہندوؤں نے رام جنم بھومی کو واپس حاصل کرنے کے لئے کافی عرصے تک کوشش کی جو خاص طور سے آئینی راستے پر ہی چل رہا تھا۔ 1885 کے ایک واقعہ کے بعد مقامی ہندو لیڈر رہنت رگھوور داس نے فیض آباد ضلع عدالت سے اپیل کی کہ رام جنم بھومی پر مندر کی تعمیر کے لئے حکم دیا جائے۔ 18 رمارچ 1886 کو ضلع عدالت کے انگریز جج کرنل این ای اے چیمبر نے حکم جاری کیا جو اس طرح تھا—

> ''کل میں نے سبھی فریقوں کی موجودگی میں متنازعہ مقام کا دورہ کیا۔ میں نے پایا کہ بادشاہ بابر کے ذریعہ بنوائی گئی اجودھیا کی سرحد مغرب اور جنوب پر واقع ہے، یہاں کوئی رہائش نہیں ہے۔ ہندوؤں کی جانب سے خاص طور پر متبرک سمجھے جانے والے مقام پر مسجد بنانے کی بات انتہائی بدقسمتی ہے، لیکن چونکہ یہ 536 سال پہلے کی بات ہے، اس لئے اب بہت دیر ہو چکی ہے۔ ایسے میں سابقہ صورت حال بنائے رکھ کر چلنا ہی ایک متبادل رہ گیا ہے۔ اس طرح کی صورت حال میں کوئی نیا قدم اٹھانے سے قانون و نظم بگڑے گا اور اس طرح جتنا فائدہ ہوگا اس سے کہیں زیادہ نقصان ہوگا۔''

1947 میں آزادی ملنے کے بعد اجودھیا اور اس کے اردگرد کے ہندوؤں نے نئی امید اور جوش کے ساتھ دوبارہ جدوجہد شروع کی۔ اس امید میں کہ نہرو سرکار نے سومناتھ مندر کے معاملے میں جو راستہ اپنایا وہی راستہ رام جنم بھومی معاملے میں بھی اپنایا جائے گا۔ 22 ردسمبر 1949 کی رات کچھ لوگوں نے 1934 سے بند پڑے متنازعہ ڈھانچے کے اندر شری رام، سیتا اور لکشمن کی مورتیاں رکھ دیں۔ فیض آباد کے کلکٹر کے کے

نائر نے روزانہ گربھ گرہ میں ان مورتیوں کی پوجا کرنے کی اجازت دی۔ اس وقت اتر پردیش میں کانگریس کی حکومت تھی۔ بعد میں عدالتی کاروائی میں فیض آباد کے سول کورٹ نے مورتیوں کو ہٹانے پر پابندی عائد کردی اور ہندوؤں کو بھگوان کے سامنے روزانہ پوجا کرنے کی اجازت دے دی۔ اس روک کو جائز ٹھہراتے ہوئے فیض آباد کے سول جج نے کہا '...کم سے کم 1936 کے بعد سے مسلمانوں نے متنازعہ مقام کو نہ تو مسجد کے لئے استعمال کیا اور نہ ہی وہاں کوئی عبادت وغیرہ کی...جبکہ ہندو مسلسل وہاں پوجا وغیرہ کرتے آرہے ہیں۔'

مسلمانوں کی جانب سے دائر کی گئی ایک رٹ کی سماعت کرتے ہوئے الہ آباد ہائی کورٹ نے اپریل 1955 میں اپنا فیصلہ سناتے ہوئے ہندوؤں کے بغیر روک ٹوک پوجا کے اختیار کو قائم رکھنے کا حکم دیا۔ املاک کے نام سے جڑے تنازع پر ہائی کورٹ نے کہا 'اس طرح کے مقدمے پر جلد از جلد سنایا جانا نہایت ضروری ہوتا ہے، لیکن یہ افسوس کی بات ہے کہ 4 سالوں تک اس پر فیصلہ نہیں دیا جاسکا۔'

کتنا المیہ ہے کہ اس معاملے پر نصف صدی کے بعد کوئی فیصلہ نہیں ہوسکا ہے۔ یہ بات اہم ہے کہ 1936 سے لے کر 1949 تک متنازعہ ڈھانچہ ایک اصل مندر کے طور پر تھا۔ 1955 کے بعد وہ ایک باضابطہ مندر بن گیا۔ اس کا فیصلہ کسی اور کے ذریعہ نہیں خود عدالت کے ذریعہ کیا گیا۔ اتنا ہی نہیں عدالتوں نے یہ بھی احکام دیئے ہیں کہ سابقہ پوزیشن بدلی نہیں جاسکتی۔

اجودھیا تنازعہ پر نہرو سرکار کا نقطہ نظر
سردار پٹیل کے مدلل مشورے کو نظر انداز کیا جانا

اجودھیا معاملے سے وابستہ 1949 کے واقعہ پر مرکز میں پنڈت نہرو کی سرکار نے جو نقطہ نظر اپنایا وہ خود بہت کچھ کہنے والا ہے۔ تقسیم اور اس کے نتیجے میں پھوٹ پڑنے والے فرقہ وارانہ تشدد سے ملک کے درد کو سمجھتے ہوئے ہی وزیراعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے واقعہ کے تین دن بعد ہی 26 دسمبر 1949 کو — اتر پردیش کے اس وقت کے وزیراعلیٰ پنڈت گووند بلبھ پنت کو ایک تار بھیجا تھا 'اجودھیا کے حال کے واقعات سے میں فکرمند ہوں۔ مجھے پوری امید ہے کہ آپ اس معاملے میں ذاتی طور پر دلچسپی لیں گے۔ وہاں ایک خطرناک صورت حال پیدا ہورہی ہے جس کے نتیجے بھی خطرناک ہوں گے۔'

پنڈت نہرو نے اس تار کو وزیر داخلہ سردار پٹیل کو دکھایا۔ سردار پٹیل نے 9 جنوری 1950 کو پنڈت گووند بلبھ پنت کو ایک خط لکھا۔ اس خط میں انھوں نے اجودھیا معاملے کو حل کرنے کے لئے ایک ایسا راستہ سمجھایا جو مدلل تھا۔ اگر اس پر عمل کیا گیا ہوتا تو اجودھیا معاملہ بہت پہلے ہی حل ہو چکا ہوتا، وہ بھی بہت خوشگوار طریقے سے۔ اس خط کی اہمیت دھیان میں رکھتے ہوئے میں اسے یہاں پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں —

'پیارے پنڈت جی!

وزیراعظم نے اجودھیا کے واقعات پر اپنی تشویش ظاہر کرتے ہوئے آپ کو پہلے ہی تار بھیجا تھا۔ لکھنؤ میں میں نے اس موضوع پر آپ سے گفتگو کی تھی۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ یہ تنازعہ پورے ملک اور خاص طور پر آپ کے صوبے کے متعلق انتہائی ناموافق وقت میں اٹھایا گیا ہے۔ حال ہی میں کئی بڑے فرقہ وارانہ معاملوں کو مختلف فرقوں کی باہمی رضامندی سے حل کیا گیا ہے، جہاں تک مسلمان کا سوال ہے وہ اپنی نئی وابستگیوں کے ساتھ رقم کررہے ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ تقسیم کا پہلا جھٹکا اور اس سے پیدا غیر یقینی صورت حال اور افراتفری کا دور اب ختم ہوتا جارہا ہے۔ اب وسیع پیمانے پر وفاداری میں تبدیلی کا کوئی امکان نہیں دکھائی دیتا۔ آپ کے اپنے صوبے

کی بات کریں تو وہاں فرقہ وارانہ مسئلہ کو حل کرنا ہمیشہ مشکل رہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ کے انتظامیہ کی اہم کامیابی ہے کہ 1946 سے اب تک کئی مشکلات کے باوجود فرقہ وارانہ تعلقات میں کافی بہتری آئی ہے۔ گروپوں کے بن جانے کے بعد اتر پردیش میں ہماری کچھ تنظیمی اور انتظامی دشواریاں ہیں، اس معاملے کا اگر ہم کسی خاص گروپ کو فائدہ اٹھانے دیتے ہیں تو وہ انتہائی بدقسمتی ہوگی، اس لئے ان حالات کو دیکھتے ہوئے مجھے لگتا ہے کہ یہ ایسا معاملہ ہے جسے دونوں فرقوں کے باہمی بھائی چارے اور رواداری کی بنیاد پر حل کیا جانا چاہئے۔

اس حقیقت سے میں واقف ہوں کہ جو کچھ ہوا اس کے پیچھے شدید جذبات وابستہ ہوئے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ ان معاملوں کو پرامن طور پر سمجھایا جاسکتا ہے کہ ہم مسلم فرقہ کی رضامندی کو ساتھ لے کر چلیں۔ اسے معاملے کو طاقت کے بل پر حل کرنے کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ اس صورت میں کسی بھی قیمت پر امن اور قانون وانتظام بنائے رکھنا ہوگا، اس لئے اگر پرامن اور باہمی اتفاق پر مبنی کوئی طریقہ اپنانا ہے تو جارحانہ طریقے پر مبنی کسی طرح کی یکطرفہ کارروائی نہیں کی جاسکتی۔ ایسے میں مجھے پورا یقین ہے کہ اس معاملے کو اس طرح ایشو نہیں بنایا جانا چاہئے اور موجودہ تنازعات کو سمجھا بجھا کر پرامن طریقے سے حل کیا جانا چاہئے۔ اس حد تک کسی خوشگوار معاہدے پر پہنچنے کے راستے میں کسی بھی مستحکم حقائق کو نہیں آنے دینا چاہئے۔ مجھے امید ہے کہ اس سلسلے میں کی جارہی آپ کی کوشش کامیاب ہوگی۔'

اپریل 2001 میں جسٹس لبراہن کمیشن کے سامنے میرے بیان کے دوران مجھ سے مذکورہ خط پر اپنے نظریات کو پیش کرنے کے لئے کہا گیا۔ اس پر میں نے واضح طور سے کہا 'میں سردار پٹیل کے ایک ایک لفظ کی حمایت کروں گا۔ ان کا ایک بھی لفظ ایسا نہیں ہے جس سے میں اجودھیا تحریک کے وقت عدم اتفاق ظاہر کرتا۔ سردار پٹیل نے ایک طرف زور دیا کہ 'اس سچائی سے میں واقف ہوں کہ جو کچھ ہوا اس کے پیچھے شدید جذبات کارفرما ہیں اور دوسری طرف (جیسا انھوں نے لکھا تھا)، ساتھ ہی ساتھ اس معاملے کو پرامن طریقے سے نمٹایا جاسکتا ہے۔ اگر ہم مسلم فرقہ کی رضامندی کو ساتھ لے کر چلیں۔' اجودھیا مسئلہ پر جب بھی میں نے کچھ کہا ہے، میں نے اسی نقطہ نظر پر زور دینے کی کوشش کی ہے۔ دوسرا پہلو جس پر میں نے زور دینے کی کوشش کی، وہ یہ ہے کہ طاقت کے بل پر کچھ بھی حاصل نہیں کیا جانا چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ 6 ردسمبر 1992 کو جب متنازعہ ڈھانچے کو گرایا گیا، اس وقت اجودھیا تحریک کی تعریف کرنے کے باوجود مجھے بہت تکلیف پہنچی تھی، کیونکہ یہ غیر قانونی اور طاقت کے زور پر کیا گیا کام تھا۔

کمیشن نے پنڈت نہرو کی جانب سے اتر پردیش کے اس وقت کے وزیر اعلیٰ پنڈت گووند بلبھ پنت کو بھیجے گئے تار پر بھی مجھ سے اپنے نظریات پیش کرنے کے لئے کہا۔ میرا جواب تھا 'مجھے یقین ہے کہ پنت کو بھیجے گئے وزیر اعظم کے تار اور وزیر داخلہ کے خط پر اتر پردیش کی حکومت نے توجہ دی ہوگی، جب اس نے پہلے 1949 میں اور اس کے بعد 1986 میں فیض آباد کے سول جج کے سامنے اپنا معاملہ رکھا تھا۔ جج کے حکم میں ان سبھی باتوں کو ضرور دھیان میں رکھا گیا ہوگا۔'

80 کی دہائی میں اجودھیا معاملہ دوبارہ کس طرح ابھرا؟
راجیو گاندھی سرکار نے مندر کا تالا کھلوایا

متنازعہ ڈھانچے کے سلسلے میں ہندوؤں کے دعوے سے وابستہ تاریخ کو اتنی تفصیل سے آپ کے سامنے پیش کرنے کا میرا مقصد صرف

اس غلط پروپیگنڈہ کو مسترد کرنا تھا کہ اجودھیا معاملے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کبھی کوئی سنگین تنازعہ نہیں رہا ہے اور یہ سب راشٹریہ سویم سیوک سنگھ، وشو ہندو پریشد اور بھارتیہ جنتا پارٹی کی جانب سے مشترکہ طور پر رچی گئی اور سیاسی سازش کا حصہ ہے، جس کے پیچھے ان کا سیاسی مفاد پوشیدہ ہے۔ 1989 میں بھارتیہ جنتا پارٹی کی جانب سے اجودھیا تحریک کو حمایت دیئے جانے کے تقریباً پانچ سال قبل جس طرح ہندوؤں کی اجتماعی کوشش نے زور پکڑا تھا اسے دیکھنے سے بھی بات بہت کچھ واضح ہو جاتا ہے۔

اجودھیا معاملہ 80 کی دہائی میں دوبارہ کیسے اٹھا، اسے قومی سیاسی منظرنامے پر لانے کے لئے کس نے تعاون کیا اور کیوں دیا— یہ کچھ ایسے سوالات ہیں جن کا جواب جان لینے کی حالت پر سے پردہ بہت کچھ ہٹ جاتا ہے۔ 1951 سے لے کر 1986 تک جب لکھنؤ اور دہلی کی کانگریسی سرکاروں کی سرپرستی میں متنازعہ ڈھانچہ کھولا گیا تھا— اجودھیا معاملہ بس ایک مقامی معاملہ ہی تھا۔ سچ تو یہ بھی ہے کہ اس وقت تک مجھے خود اس معاملے پر کچھ بولنے کا موقع نہیں ملا تھا، جبکہ میں 1952 سے ہی ایک سیاسی کارکن رہا ہوں۔

تین ایسے عوامل ہیں جن کے باعث اجودھیا تنازعہ میں ایک ڈرامائی تبدیلی آئی۔ پہلی وجہ، متنازعہ ڈھانچہ پر عدالتی فیصلہ آنے میں بہت تاخیر ہو رہی تھی، جس سے اجودھیا کے مذہبی لیڈروں کو لگنے لگا کہ ان کا انتظار بے کار ہو رہا ہے۔ دوسری وجہ، رام کی جائے پیدائش پر مسجد کے ڈھانچے پر موجودگی اتر پردیش اور ملک کے مختلف حصوں سے آنے والے عقیدت مندوں کے لئے اشتعال کا باعث تھی، پھر بند دروازے سے صرف ایک ہی پجاری کو پوجا کرنے کے لئے اندر جانے دیا جاتا تھا۔ اس نے ہندوؤں کے غصے اور مایوسی کو بڑھانے کا ہی کام کیا۔

اس بدامنی کے باعث ہی 1983 میں ایک عوامی تحریک کا نظریہ ابھر کر سامنے آیا۔ واضح رہے کہ یہ سب ایک بالکل غیر سیاسی نظام کے تحت ہوا۔ اتر پردیش کے مظفرنگر میں منعقد ایک جلسے میں جن میں کئی لیڈروں کے علاوہ مشہور گاندھی وادی لیڈر اور جواہر لال نہرو، لال بہادر شاستری اور اندرا گاندھی کی کابینہ میں وزیر رہ چکے گلزاری لال نندہ بھی شامل تھے۔ اس جلسے میں موجود دیگر لیڈروں میں تھے پروفیسر راجندر سنگھ عرف رجو بھیا— سنگھ کے ایک سینئر عہدیدار جو 1993 میں سنگھ کے سرسنچالک بنے، داؤ دیال کھنہ— اتر پردیش سے کانگریس کے ایک سابق وزیر اور پدم چندر داس— اجودھیا کے ایک مہنت جو 1949 سے ہی مندر معاملے کی حمایت کر رہے تھے۔ اس کے بعد 1984 میں دہلی میں منعقد پہلی دھرم سنسد (ملک کے سبھی حصوں سے آئے ہندو مذہبی لیڈروں کا ایک اجتماع) نے اتفاق رائے سے یہ فیصلہ کیا کہ شری رام کی جائے پیدائش کو پرامن عوامی تحریک کے ذریعہ 'آزاد' کرایا جانا چاہئے۔ اس کے لئے جولائی 1984 میں رام جنم بھومی مکتی یگیہ کمیٹی قائم کی گئی جس کا سہرہ وشو ہندو پریشد کو جاتا ہے۔

1984 میں ستمبر- اکتوبر کے وسط رام مندر کے تالے کو کھولنے کا مطالبہ کرتے ہوئے بہار میں سیتامڑھی سے شروع ہو کر اجودھیا تک ایک عوامی بیداری یاترا نکالی گئی۔ جہاں جہاں سے ہو کر یہ یاترا گزری وہاں لوگوں کا حوصلہ افزا ردعمل سامنے آیا۔ اس یاترا کے وقت پر توجہ دینی اہم ہے، کیونکہ یہ اس وقت کی بات ہے جب اندرا گاندھی خود ملک کی وزیراعظم تھیں۔

1985 میں رام جنم بھومی تحریک میں کافی تیزی آ گئی، حالانکہ اس وقت بھی یہ تحریک مذہبی لیڈروں اور ان کے حامیوں تک ہی محدود تھی۔ اس وقت راجیو گاندھی کا بحیثیت وزیراعظم پہلا سال تھا۔ اتر پردیش میں ویر بہادر سنگھ کی قیادت میں کانگریس کی ہی سرکار تھی۔ واضح رہے کہ اجودھیا کے متنازعہ معاملے پر اہم فیصلہ کرنے والی سرکاریں کانگریس کی ہی تھیں۔ اتر پردیش میں بھی اور مرکز میں بھی۔ 19 رجنوری 1986 کو

لکھنؤ میں ہندو مذہبی لیڈروں کا ایک اجلاس ہوا، جس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ اگر مہا شیو راتری کے دن (یعنی 8 رمارچ) تک سرکار خود کچھ نہیں کرتی تو مندر میں لگا تالا توڑ دیا جائے گا۔ اس اجلاس کے بعد کانگریس کی سرکاروں اور عدلیہ نے جس تیزی سے کام کیا وہ سبھی کو چونکانے والا ہے۔

ریاستی سرکار کی جانب سے دو دنوں کے اندر تالا کھلوانے کے لئے فیض آباد ضلع عدالت میں ایک درخواست دائر کی گئی۔ 28 رجنوری کو اسے خارج کر دیا گیا۔ اس کے بعد اس سلسلے میں ایک اپیل دائر کی گئی اور یکم فروری کو متنازعہ ڈھانچے میں لگا تالا کھولنے کا حکم جاری ہوا۔ عدالت نے ریاست کی کانگریسی حکومت سے یہ تصدیق کر لینے کے بعد ہی یہ حکم جاری کیا گیا تھا کہ مندر کے دروازے کھلنے سے امن وانتظام میں کسی طرح کا مسئلہ پیدا نہیں ہوگا۔ کچھ ہی گھنٹوں کے اندر اس حکم کو نافذ کر دیا گیا۔ اور بھی دیکھئے۔ دوردرشن جو اس وقت پوری طرح کانگریس سرکار اور وزیر اعظم کے دفتر کے کنٹرول میں تھا، نے مندر کا تالا کھولے جانے کی خبر خوب زور وشور سے ٹیلی کاسٹ کی اور ساتھ ہی وہاں رام للا کی پوجا کرنے کے لئے جمع عقیدت مندوں کے ہجوم کو بھی دکھایا۔

ایک اور مثال موجود ہے، جب راجیو گاندھی کی سرکار نے مندر سے وابستہ تحریک کی حمایت کی تھی، بھلے ہی کسی یقین کے کیوں نہ کیا ہو۔ ستمبر 1989 میں وشو ہندو پریشد نے 10 رنومبر کو مندر کا شیلانیاس کرنے کے لئے رام شلائیں لا کر اجودھیا میں جمع کرنے کے پہلے فیصلے کا اعلان کیا۔ دہلی اور لکھنؤ کی کانگریسی سرکاروں نے 8 رنومبر کو یہ اعلان کرتے ہوئے کہ متنازعہ جگہ کے بغل میں واقع شلانیاس کی جگہ غیر متنازعہ شلانیاس تقریب کی اجازت دے دی، جبکہ ایک دن قبل ہی الٰہ آباد ہائی کورٹ نے اس کے برعکس حکم دیا تھا۔ قابل ذکر بات ہے کہ بہار کے کامیشور چوپال نام کے ایک ہریجن نے ہی رام مندر کی بنیاد میں پہلی اینٹ رکھی تھی، لیکن وہاں اگلے ہی دن سرکار نے تعمیر کا کام روکنے کا حکم دے دیا۔ اس سرکار نے جس نے شیلانیاس کی اجازت دی تھی۔ سچ پوچھا جائے تو اجودھیا کے سلسلے میں اس کی خصوصیات سے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ سب کچھ اس بات پر منحصر تھا کہ وزیر اعظم کو کون کب اور کتنا متاثر کر سکتا ہے۔

> اجودھیا معاملے پر کانگریس کے ڈھلمل نقطۂ نظر کا سیدھا تعلق راجیو گاندھی کے 1989 کے پارلیمانی انتخابی حکمت عملی سے تھا۔ انھوں نے اپنی انتخابی مہم کو 'رام راجیہ' کے قیام کا وعدہ کرتے ہوئے اجودھیا سے ہی شروع کی۔ یہ سب میں کانگریس پارٹی کی نکتہ چینی کے مقصد سے نہیں کہہ رہا ہوں، لیکن اسے اپنی کھلی موقع پرستی اور عدم استحکام بھرے رویے کی وجوہات کا تو جواب دینا ہی ہوگا۔ آخرکار متنازعہ ڈھانچے کا تالا کھلوانے کے اس کے فیصلے کا مطلب تو یہی نکلتا ہے کہ راجیو گاندھی خود متنازعہ جگہ پر ہندوؤں کے دعوے کی حمایت کرتے تھے، لیکن نہ تو وہ خود اپنے اس فیصلے کو لے کر چلے اور نہ ہی ان کی موت کے بعد ان کی پارٹی اس پر قائم رہی۔ ایسے میں اب مجھے یہی لگتا ہے کہ شاہ بانو معاملے میں — جسے مسلم دباؤ میں آکر خود سپردگی کے طور پر دیکھا جا رہا تھا — اپنی سرکار کے یوٹرن سے پیدا عدم توازن کو دور کرنے کے لئے ہی راجیو گاندھی نے اجودھیا معاملے کا سہارا لیا تھا۔
>
> شاہ بانو معاملے میں راجیو گاندھی سرکار کا گھٹنا ٹیکنا اور مسلم خواتین (طلاق سے متعلق اختیار تحفظ) بل 1986 نافذ کرنا پورے طور سے اقلیتوں کے ووٹ بینک کی منہ بھرائی کے لئے ہی تھا۔ اس میں ہندوؤں اور لبرل مسلمانوں میں غصہ پیدا ہو گیا۔ ان وجوہات نے اجودھیا کو ایک قومی مسئلہ بنانے میں کافی مدد کی۔ بعد میں جب کچھ خاص مسلم تنظیموں اور لیڈروں نے متنازعہ ڈھانچے کا تالا کھولے جانے کی مخالفت شروع کی تو قومی سطح پر اس میں اور بھی زیادہ وسعت پیدا ہو گئی۔

1986 تک آزاد ہندوستان کی کسی بھی مسلم تنظیم نے عدالت کے 1951 کے فیصلے، جس میں متنازعہ ڈھانچے کے اندر رام للا کی مورت

رکھنے اور اس کی پوجا کرنے کی اجازت دی گئی — کو تحریک کے ذریعہ بدلنے کی بات نہیں سوچی تھی، لیکن شاہ بانو معاملے میں اپنی فتح سے حوصلہ پاکر کچھ انتہا پسند تنظیم یہ سوچنے لگیں کہ پارلیمنٹ میں اکثریت سے بنی سرکار کو بھی دباؤ میں لاکر جھکایا جاسکتا ہے۔ انھیں محسوس ہوا کہ اگر مناسب مسلم دباؤ بنایا جائے تو 1951 کے عدالتی حکم اور 1986 کے انتظامیہ کے حکم کو بدلنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ اسی خیال کے باعث آل انڈیا بابری مسجد ایکشن کمیٹی (اے آئی بی ایم اے سی) کا قیام ہوا۔

بی جے پی مندر تحریک سے کیوں جڑی؟

شاہ بانو معاملے میں راجیو گاندھی کی جانب سے گھٹنے ٹیکنے سے اس کا پس منظر تیار ہوا

میں واضح طور پر کہوں گا کہ اگر کانگریس پارٹی رام جنم بھومی معاملے میں اپنے حامی رویے پر قائم رہتی تو بی جے پی اجودھیا تحریک سے اس طرح وابستہ نہیں ہوتی جیسا وہ بعد میں وابستہ ہوئی۔ دراصل ہمیں اس بات سے کوئی مطلب نہیں تھا کہ رام مندر کی تعمیر طے کرانے کا سہرا کس کے سر جاتا ہے، جسے اٹل بہاری واجپئی نے وزیر اعظم بننے کے بعد 'قومی امید' کا نام دیا تھا، اگر اسے کانگریس پورا کرتی تو ہمیں بہت خوشی ہوتی، لیکن جیسا ہم نے دیکھا، کانگریس پارٹی اور خود راجیو گاندھی نے عین موقع پر اپنا رویہ تبدیل کرلیا جو ہمارے لئے مایوس کن تھا۔

دوسری جانب اجودھیا میں ہندو فرقہ کے قانونی مطالبے پر کچھ مسلم تنظیموں کے پرزور منفی ردعمل سے ہم فکرمند ہوئے تھے۔ سب سے زیادہ چوٹ پہنچانا مجھے یہ لگا کہ 'بابری مسجد' کے تحفظ کے کام کو ہندوستانی مسلمانوں کے لئے جینے مرنے کا معاملہ بنا کر پیش کیا جارہا تھا۔ رام مندر اور بابری مسجد یعنی رام اور بابر کے درمیان جو یکسانیت یا برابری دکھانے کی کوشش کی جارہی تھی وہ مشتعل کردینے والی تھی۔ ان مسلم تنظیموں کے لیڈر اتنا بھی نہیں سوچ سکے کہ رام کی جائے پیدائش کے تئیں کروڑوں ہندوؤں کے دلوں میں جو عظیم عقیدت ہے، اسی طرح جیسے دنیا بھر کے مسلمانوں کے لئے مکہ میں کعبہ کے تئیں عقیدت ہے۔ دوسری طرف بابری مسجد کی ہندوستانی مسلمانوں کے لئے کوئی مذہبی اہمیت نہیں ہے۔ اگر مسلمانوں کو مکہ میں مکمل اسلامی نظام کا اختیار ہے اور ویٹکن عیسائیوں کو مکمل عیسائیت کا نظام بنائے رکھنے کا اختیار ہے تو ہندوؤں کی جانب سے اجودھیا میں ایک مکمل نظام کی امید رکھنے میں کیا برائی ہے؟

اس بنیادی سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے آل انڈیا بابری مسجد ایکشن کمیٹی 'اسلام خطرے میں ہے' کا اشتعال انگیز نعرہ دے کر ملک بھر کے مسلمانوں کو متحد کرنے کی کوشش کررہی تھی۔ اس نے ملک بھر میں یوم سیاہ بھی منایا، یہاں تک کہ اس نے 1987 کے یوم جمہوریہ کا بائیکاٹ کرنے کی مسلمانوں سے اپیل کی۔ حالانکہ ملک گیر مخالفت کے باعث، جس میں لبرل مسلمان بھی شامل تھے، اس اپیل کو واپس لے لیا گیا۔

پارلیمنٹ میں اپنی بڑی اکثریت کے باوجود کانگریس پارٹی اجودھیا معاملے کو صحیح پس منظر میں مسلمانوں کے سامنے رکھنے میں نااہل تھی۔ نااہل ہی نہیں بلکہ وہ ایسا کرنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ اجودھیا تحریک کی مخالفت کا معاملہ اس وقت مزید گرما گیا جب یکم فروری 1989 کو کنبھ میلے کے موقع پر تقریباً ایک لاکھ سادھو سنت پریاگ میں جمع ہوئے اور 10 نومبر کو رام مندر کے سنگ بنیاد رکھنے کا اعلان کردیا۔ اس اجلاس میں یہ بھی طے کیا گیا کہ ملک بھر کے لاکھوں گاؤوں سے کارسیوک رام مندر کی تعمیر کے لئے رام شیلائیں لاکر جمع ہوں گے۔ اس اعلان کا ملک بھر کے ہندو فرقے میں چونکا دینے والا اثر دیکھا۔

لیکن اس وقت ایک متضاد صورت حال پیدا ہوگئی۔ ایک طرف اجودھیا تحریک کو جہاں عام ہندوؤں کی بڑے پیمانے پر حمایت حاصل

ہو رہی تھی وہیں دوسری طرف ملک میں اسے کسی طرح کی سیاسی حمایت نہیں مل رہی تھی۔ بیشتر اہم سیاسی پارٹیوں نے ہندوؤں کے مطالبے کی کھلے عام حمایت کرنے سے انکار کر دیا تھا، جبکہ ان کے لیڈر ذاتی طور پر اس کے ساتھ ہونے کی بات کر رہے تھے۔ وجہ واضح تھی ــــ انھیں مسلمانوں کے ووٹ سے محروم ہونے کا ڈر تھا۔ ہندوؤں کے منقسم ووٹوں اور مسلمانوں کے غیر منقسم ووٹوں کی وجہ سے ہندوستانی سیاست میں ایک خطرناک صورت حال پیدا ہوگئی تھی۔ افسوس کی بات ہے کہ کئی سیاسی پارٹیوں نے سیکولرازم کے نام پر ووٹ بینک کی سیاست کا سہارا لے لیا ہے۔

اس طرح اجودھیا معاملہ اب رام جنم بھومی مندر کی تعمیر تک ہی محدود نہیں رہ گیا۔ دراصل اب یہ سچے سیکولرازم اور نقلی سیکولرازم کے درمیان لڑائی کی علامت بن گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ہندوستانی قومیت اور قومی شناخت سے وابستہ دو متضاد نظریہ کی شکل اختیار کر لی ہے۔ تہذیبی قومیت کے اتحاد کا نظریہ اور ہندو مخالف قومیت کی تقسیم پر مبنی نظریہ۔

اس پس منظر میں بی جے پی نے رام جنم بھومی تحریک کو حمایت دینے کا فیصلہ کیا۔ اس سے پہلے تک اگر راج ماتا وجے راجے سندھیا اور ونے کٹیار وغیرہ ہمارے حامیوں نے تحریک میں حصہ لیا تھا تو ان کا اپنا ذاتی فیصلہ تھا۔ ایک پارٹی کے طور سے بی جے پی نے خود کو اس معاملے سے دور رکھا تھا، لیکن اب وہ وقت آ گیا تھا جب اس کے لئے اجودھیا معاملے سے خود کو جوڑنا اور اس طرح اصلی سیکولرازم اور تہذیبی قوم پرستی کی حفاظت کی لڑائی میں خود کو شامل کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ اس لئے جون 1989 میں پالم پور (ہماچل پردیش) میں پارٹی کے قومی ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ میں اس سلسلے میں اک اہم تجویز منظور کی گئی۔ میں نے خود یہ تجویز تیار کی تھی۔

بھارتیہ جنتا پارٹی کا یہ یقین ہے کہ مذہبی ریاست ہماری تاریخ اور روایات مخالف ہے۔ اسی وجہ سے 1947 میں ملک کی تقسیم فرقہ وارانہ بنیاد پر ہونے کے باوجود اور پاکستان کی جانب سے خود کو اسلامی ریاست ڈکلیئر کرنے کے باوجود ہندوستان نے اپنے موجودہ آئین کو ہی منظور کیا اور سبھی شہریوں کو مساوات کی گارنٹی دی، چاہے ان کا مذہب کچھ بھی ہو۔

ہمارے آئین کے تیار کرنے والوں کے مطابق سیکولرازم کا مطلب تمام فرقے کے ساتھ خیر سگالی تھا۔ اس کا مطلب 'بغیر مذہب' کی ریاست نہیں تھا۔ اس کا مطلب اپنی تاریخ اور تہذیبی وراثت کو ٹھکرانا قطعی نہیں تھا۔

قومی ورکنگ کمیٹی ان شیعہ لیڈروں کی کوششوں کی تعریف کرتی ہے جنھوں نے اپنے ہم مذہب لوگوں سے یہ منوانے کی کوشش کی کہ کسی دوسرے مذہب کے ماننے والوں کی عبادت کی جگہ پر کوئی مسجد بنانا اسلام کے اصولوں کے خلاف ہے، اس لئے اس متنازعہ مقام کو ہندوؤں کو سونپ دینا چاہئے اور کسی دوسری مناسب جگہ پر مسجد تعمیر کر لینی چاہئے۔ بی جے پی نے راجیو گاندھی سرکار سے اپیل کی کہ وہ اجودھیا کے سلسلے میں ویسا رویہ اپنائیں جیسے کہ نہرو سرکار نے سومناتھ کے سلسلے میں اپنایا تھا۔ لوگوں کے جذبات کا احترام کیا جائے اور رام جنم بھومی کو ہندوؤں کو سونپ دیا جائے۔ اگر ممکن ہو تو بات چیت کے ذریعہ سمجھوتہ کیا جائے یا قانونی کارروائی کے ذریعہ۔ یقینی طور سے قانونی کارروائی کوئی حل نہیں ہے۔

> بی جے پی نے شروع سے ہی یہ واضح کر دیا تھا کہ ہم رام مندر کی تعمیر کی حمایت ضرورت کرتے ہیں، لیکن ساتھ ہی ہم چاہتے ہیں کہ مسلمان بھائیوں کو ٹھیس پہنچائے بغیر ہی ایسا کیا جائے۔ اس لئے ہم بات کے حق میں تھے کہ متنازعہ ڈھانچے کو عزت کے ساتھ دوسری جگہ لے جایا جائے تاکہ ہندو-مسلم فرقے باہمی تعاون سے اجودھیا کے باہر کسی دوسری جگہ مسجد کو تعمیر کیا جا سکے۔

مندرجہ بالا اقتباس سے یہ واضح ہو جانا چاہئے کہ میری پارٹی نے سیاسی فائدہ حاصل کرنے کے لئے اجودھیا تنازعہ نہیں کھڑا کیا۔

حصہ - 2
رام رتھ یاترا
—— سومناتھ سے اجودھیا تک ——

نومبر 1989 میں نویں لوک سبھا کے لئے انتخابات ہوئے۔ انتخابی نتائج کانگریس پارٹی کے لئے تباہ کن تھے۔ 1984 کے عام انتخابات میں جہاں راجیو گاندھی کو لوک سبھا کی 415 سیٹوں کے ساتھ مکمل اکثریت ملی تھی، وہیں پانچ سال بعد وہ اقتدار سے باہر ہو گئے، حالانکہ ان کی پارٹی کی اس زبردست شکست کا اہم سبب بوفورس معاملہ تھا، لیکن میں تو کہوں گا کہ شاہ بانو معاملہ میں اس کے گھٹنے ٹیک دینے اور رام مندر جنم بھومی معاملے میں ان کے غیر ذمہ دارانہ رویے کے سبب رائے دہندگان کے دلوں سے ان کے تئیں خوش فہمی نکل گئی تھی۔

انتخابات کے بعد جنتا دل سب سے بڑی سیاسی پارٹی کے طور پر ابھری، لیکن کسی بھی پارٹی کو واضح اکثریت نہ ملنے کے سبب کمزور حکومت بنی اور نیشنل فرنٹ اتحاد کے اہم رہنما کے طور پر نومبر 1989 میں وشوناتھ پرتاپ سنگھ ملک کے وزیر اعظم بنے۔ اتحادی سرکار کو بی جے پی اور بائیں بازو کی پارٹیوں نے باہر سے حمایت دی۔ چونکہ وشوناتھ پرتاپ سنگھ نے بی جے پی سے حمایت مانگی تھی، ایسے میں ان کی ایک اخلاقی اور سیاسی ذمہ داری بن گئی تھی کہ وہ رام مندر معاملے پر قابل فہم رویہ اپناتے، کیونکہ یہ معاملہ ہمارے انتخابی منشور میں اہم مقام رکھتا تھا۔ اس معاملے میں ہمیں ان سے دیانت دارانہ اور غیر جانبدارانہ وشفاف رویے کی امید تھی، لیکن بدبختی کی بات یہ ہے کہ وہ ہماری توقعات پر کھرے نہیں اتر سکے۔

انتخابات سے قبل بی جے پی اور جنتا دل کے درمیان نشستوں کی تقسیم کے موضوع پر ہونے والے مختلف مباحثوں میں اجودھیا معاملہ کو اٹھایا گیا تھا۔ اس بات چیت یا سمجھوتے کا سہرا ہمارے کچھ نیک خواہوں کو جاتا ہے، جو ہندوستان کو کانگریس کی مطلق العنان حکمرانی سے نجات دلانا چاہتے تھے۔ ایسی ہی ایک بات چیت میں وی پی سنگھ نے ایک بیان دیا تھا جو چونکانے والا تھا۔ اجودھیا اور رام مندر معاملے پر جاری بی جے پی کے وہائٹ پیپر میں اس کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ وہائٹ پیپر میں درج ہے: 'تعطل کو دور کرنے کے لئے بمبئی کے ایکسپریس ٹاورس میں ایک میٹنگ منعقد کی گئی۔ اس میٹنگ میں موجود لوگوں میں شامل تھے: 'انڈین ایکسپریس' اخبار گروپ کے چیئرمین رام ناتھ گوئنکا، سنگھ کے سینئر رہنما بھاؤ راؤ دیورس، پروفیسر راجندر سنگھ اور ناناجی دیشمکھ، معروف ہندی صحافی پربھاش جوشی اور گوئنکا کے خصوصی مشیر ایس گرومورتی۔ اسی میٹنگ میں وی پی سنگھ نے کہا تھا: 'ارے بھائی، مسجد ہے کہاں؟ وہ تو ابھی مندر ہے، پوجا چل رہی ہے۔ وہ اتنی خستہ حال ہے کہ ایک ہی دھکا میں نیچے گر جائے گی۔ اسے ڈھانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟' اسی میٹنگ کے بارے میں ارون شوری نے اپنی ایک تحریر میں لکھا تھا، جو اکتوبر 1990 میں شائع ہوا تھا۔

وی پی سنگھ کا بیان ہندوستانی سیاست کی جڑوں میں پیوست مہلک عناصر کی ہی علامت ہے۔ ذاتی بات چیت میں اس طرح کا بیان دینے والے وہ تنہا لیڈر نہیں تھے۔ درحقیقت دیگر سیاسی پارٹیوں کے کئی اہم لیڈر بھی اجودھیا معاملے سے وابستہ حقائق سے بخوبی واقف تھے اور

خفیہ بات چیت میں اس طرح کی بات کرتے تھے۔

میں خود مانتا ہوں کہ بی جے پی اور وی پی سنگھ کے درمیان پیدا ہونے والے اس عدم اعتماد کے پس منظر کے سبب ہی میرے دل میں نیشنل فرنٹ سرکار کے وجود اور کامیابی کے ساتھ کام کرنے کے حوالے سے شبہ پیدا ہونے لگا تھا۔ نئی سرکار کے قیام کے بعد جلد ہی رام جنم بھومی تحریک سے وابستہ سنتوں نے فروری 1990 سے دوبارہ کارسیوا شروع کرنے کا فیصلہ لیا۔ 8 رفروری کو وزیر اعظم نے انھیں بات چیت کے لئے دہلی بلایا اور یہ بھروسہ دلاتے ہوئے کہ مسئلہ چار ماہ کے اندر حل کرلیا جائے گا— ان سے اور تھوڑا وقت مانگا، لیکن اس مدت میں بھی جب کچھ نہیں ہوا تو آندولن سے وابستہ رہنماؤں نے جون میں ایک میٹنگ بلائی، جس میں 30 راکتوبر سے کارسیوا شروع کرنے کا فیصلہ لیا گیا۔

جون کے آخری ہفتہ میں اس وقت کے لوک سبھا اسپیکر ربی رائے کی صدارت میں تشکیل شدہ ایک پارلیمانی وفد کے رکن کی حیثیت سے میں لندن چلا گیا۔ لندن روانگی سے ٹھیک پہلے راشٹریہ سویم سیوک سنگھ سے متاثر ہفتہ وار 'پانچ جنیہ' کے ایڈیٹر ترون وجے نے میرا انٹرویو لیا۔ انٹرویو کے دوران انھوں نے مجھ سے سوال کیا: 'وی پی سنگھ کی سرکار نے جسے بی جے پی حمایت دے رہی ہے، 4 ماہ کے اندر اجودھیا معاملہ کو حل کرنے کا یقین دلایا تھا، لیکن چار ماہ کی مدت گزر جانے کے بعد بھی اب تک کچھ نہیں ہوسکا ہے اور اب سنگھ نے 30 راکتوبر سے اجودھیا میں کارسیوا کا اعلان بھی کر دیا ہے۔ آپ کو کیا لگتا ہے، آگے کیا ہونے والا ہے؟'

اس کے جواب میں میں نے انھیں جو کچھ بتایا، اس کے چار نکات تھے— پہلا نکتہ، جون اور اکتوبر کے درمیان ابھی سرکار کے پاس چار ماہ کا وقت اور ہے۔ میں نے توقع ظاہر کی کہ سرکار مسئلہ کا کوئی اچھا حل نکالے گی۔ دوسرا نکتہ، میں نے 30 راکتوبر کو اجودھیا میں کارسیوا شروع کرنے کے فیصلہ کی حمایت کرنے کا اپنا عزم ظاہر کیا۔ تیسرا نکتہ، میں نے یہ بھی کہا کہ رام مندر کی تعمیر کے لئے بی جے پی کسی بھی مہم میں حصہ لینے کے لئے تیار ہے۔ چوتھا اور آخری نکتہ، میں نے وی پی سنگھ کی سرکار کو خبردار کیا کہ کارسیوا کو روکنے کی کوئی بھی کوشش آزاد ہندوستان کے اب تک کے 'سب سے بڑے جن آندولن' کو جنم دے گی۔

سچ کہوں تو لندن کے لئے روانہ ہونے کے بعد میں اس انٹرویو کو بھول ہی گیا تھا۔ لندن میں اپنی سبھی میٹنگوں میں مختلف معاملوں پر وی پی سنگھ سرکار کی حمایت میں بولنے والے وفد کا میں ہی اہم رکن تھا۔ میں لندن سے روانہ ہونے والا تھا، تبھی میری بیوی کا فون آگیا۔ فون پر انھوں نے مجھ سے پوچھا 'آپ نے کیا کہا ہے؟ یہاں اخبارات کی شہ سرخیوں میں شائع ہوا ہے کہ اجودھیا معاملے پر آڈوانی نے آزاد ہندوستان کی تاریخ میں اب تک کا سب سے بڑا جن آندولن (عوامی تحریک) چھیڑنے کی دھمکی دی۔'

> تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ کارسیوا کے رہنماؤں اور سرکار کے درمیان رشتے تیزی سے غیر معمولی ہوتے جارہے تھے، لیکن میں نیشنل فرنٹ سرکار کو بنائے رکھتے ہوئے کارسیوا کے ہر ایک امکان پر غور کر رہا تھا، تاکہ ٹکراؤ کی صورت حال کو ٹالا جاسکے۔ بہر حال 1989 کے عام انتخابات میں کانگریس کی شکست ہندوستان کی جمہوری طاقتوں کی ایک بڑی جیت تھی۔ اسے قائم رکھنا ضروری تھا۔ 13 راگست کو نئی دہلی میں منعقد ایک تقریب میں کونراڈ ایلسٹ کی کتاب 'رام جنم بھومی ورسیس بابری مسجد— اے کیس اسٹڈی ان ہندو-مسلم کنفلکٹ' کا اجرا کرتے ہوئے میں نے اس سمت میں ایک اہم پیش رفت کی۔ میں نے مسلم رہنماؤں کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ اگر رام جنم بھومی پر مسلمانوں کی جانب سے اپنا دعویٰ رضا کارانہ طور پر واپس لے لیا جائے تو میں وشو ہندو پریشد کے رہنماؤں کو متھرا اور وارانسی میں ہندو پوجا استھلوں (عبادت گاہوں) کا مطالبہ چھوڑنے کے لئے تیار کرلوں گا۔

لیکن مسلمانوں کے ذریعہ اس تجویز کو ٹھکرائے جانے پر مجھے انتہائی مایوسی ہوئی۔ بہت غور وفکر کر کے میں نے اس سمجھوتے کی تجویز پیش کی تھی۔ کاشی اور متھرا کے مندر استھلوں کے بارے میں جسے تھوڑی بہت بھی معلومات ہے، وہ ان مذہبی مقامات کے اندر مسجد موجود ہونے کی بات کو جان بوجھ کر کیے گئے مذہبی حملے کے طور پر ہی دیکھے گا۔ دراصل ہندوؤں کے لئے کاشی اور متھرا کی اہمیت کو کم کر کے دیکھنے والا کوئی لاعلم یا متعصب ہی ہوسکتا ہے۔ اس لئے ان مقدس مذہبی مقامات کے اندر واقع مسجدوں کو ہٹانے کے لئے مسلمانوں پر دباؤ نہ ڈالنا مسلمانوں کے تئیں ہندوؤں کی فراخ دلی کو ظاہر کرنے والا اشارہ تھا۔ اس فراخ دلی کو نظرانداز کر کے آل انڈیا بابری مسجد ایکشن کمیٹی کے رہنماؤں نے اس بار بھی اپنی ہٹ دھرمی، بے حسی اور مذہبی شدت پسندی کا ہی ثبوت دیا۔

میری مذکورہ تجویز ایک دوسری وجہ سے بھی اہم تھی۔ اس میں مسلمانوں کے درمیان پھیلی گہری تشویش کو بھی دھیان میں رکھا گیا تھا۔ اجودھیا کا مسئلہ جب ایک قومی معاملہ بن گیا تو مسلمانوں میں ایک عام تشویش پیدا ہونے لگی تھی — 'کیا ہندوؤں کے ذریعہ مسلمانوں کے مذہبی مقامات پر دعویٰ کرنے کے عمل کا یہ آغاز ہوگا؟' اسی تشویش کا غیر واضح فطری نتیجہ تھا کہ اگر ہندو تنظیمیں اس معاملے میں قابل اعتماد یقین دہانی کراتیں تو اوسط مسلمان — جس کا بابری مسجد سے کوئی جذباتی لگاؤ ہی نہیں تھا — کو متنازع ڈھانچہ کو دوسری جگہ لے جا کر اس کی جگہ پر مندر بننے دینے میں کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔ عام مسلمانوں کے اس مفاہمتی نظریہ پر آل انڈیا بابری مسجد ایکشن کمیٹی کے رہنماؤں نے کوئی مثبت ردّعمل ظاہر نہیں کیا، اس سے مجھے صحیح معنی میں ناراضگی ہو رہی تھی۔

ان دنوں جب میں اجودھیا معاملے پر اپنے خیالات ظاہر کرتا تھا تو اکثر پولینڈ کی مثال دیا کرتا تھا۔ پولینڈ کے وارسا شہر پر اپنے شروعاتی قبضہ کے دوران (1614-1915) روسیوں نے کسی زمانے میں ایک آزاد ملک رہنے والے اس رومن کیتھولک عیسائی ملک کی راجدھانی کے اہم چوک پر ایک ایسٹرن آرتھوڈوکس کرشچین کیتھڈرل کی تعمیر کروائی تھی۔ 1918 میں پولینڈ کی آزادی کے بعد پولینڈ کے باشندوں نے کیتھڈرل کو منہدم کر دیا۔ انھوں نے ایسا اس لئے کیا، کیونکہ انھیں لگا کہ جس مقصد سے کیتھڈرل کی تعمیر وہاں کرائی گئی تھی، وہ مذہبی نہیں بلکہ سیاسی تھا۔ 'ہمارا طریقہ الگ ہوگا' میں اکثر کہتا تھا کہ 'ہم مکمل مذہبی عقیدت کے ساتھ بابری ڈھانچے کو دوسری جگہ لے جائیں گے۔'

پولینڈ کی مثال بیسویں صدی کے عظیم تاریخ داں ارنالڈ ٹائن بی کی اس تقریر کا بھی ایک اہم نکتہ رہی تھی جو انھوں نے 1960 میں نئی دہلی میں منعقد آزاد میموریل لیکچر میں دی تھی۔ ٹائن بی نے پولینڈ کی مثال ہندوستان میں کچھ مذہب کی اندھی تقلید کرنے والے مسلم حکمرانوں کی حکومت کے دوران بت شکنی اور مندر انہدام کے حوالے سے ہی دی تھی۔ اپنی تقریر میں انھوں نے کہا تھا 'روسی چرچ کو گرانے کے لئے میں پولینڈ کی سرکار کو زیادہ قصوروار نہیں مانتا ہوں۔ دوسری جانب میں حکومت ہند کی ستائش کرتا ہوں کہ اس نے اورنگ زیب کے ذریعہ تعمیر کردہ مسجدوں کو نہیں گرایا۔ میں خاص طور پر بنارس گھاٹ کے اوپر واقع دو (مسجدوں) اور متھرا میں کرشن کی پہاڑی کے اوپر واقع ایک مسجد کے حوالے سے بات کر رہا ہوں۔ ان مسجدوں کی تعمیر کے پیچھے اورنگ زیب کا مقصد بھی مذہبی نہ ہو کر سیاسی ہی تھا، جس کے سبب پولینڈ نے وارسا کے اہم چوک پر تعمیر شدہ آرتھوڈوکس کیتھڈرل کو گرا دیا تھا۔ یہ تینوں مسجدیں یہ دکھانے کے لئے بنائی گئی تھیں، یہاں ایک اسلامی حکومت کا اقتدار اعلیٰ تھا جو ہندو مذہب کے سب سے مقدس مقام سے بھی اوپر تھا۔'

رتھ یاترا کے خیال کا جنم

میرے اندر کی آواز نے کہا— 'اسے کرو'

بعد میں حالات تیزی سے بدلتے رہے۔ وشو ہندو پریشد کی رہنمائی میں پورے ملک میں کارسیوا سمیتیاں قائم کی گئیں۔ 30 راکتوبر کی مہم کے لئے رام بھگتوں کو متحد کرنے کی اس کوشش پر کافی مثبت ردّعمل دیکھنے کو ملا۔ دور دراز میں واقع چھوٹے چھوٹے گاؤں، محلوں، شہری قصبوں و بستیوں— یعنی ملک کے کونے کونے سے لوگ اجودھیا پہنچنے کو تیار تھے— مجھے محسوس ہونے لگا تھا کہ ضرور ایک نئی تاریخ رچی جانے والی ہے۔ اس احساس کے ساتھ ہی میرا من اندر ہی اندر سوچنے لگا تھا' کیسے بی جے پی اس تحریک میں حصہ لے؟ اور پارٹی صدر کی حیثیت سے مجھے اس کی حمایت میں کیا کرنا چاہیے؟'

اب مجھے مکمل یقین ہو گیا تھا کہ یہ آندولن صرف اجودھیا میں ایک مندر بنانے کے لئے نہیں ہے۔ ایسا بھی نہیں کہ یہ صرف ماضی میں مذہب کی اندھی تقلید کرنے والے غیر ملکی حملہ آور کے حملے سے ایک ہندو مذہبی مقام کو دوبارہ حاصل کرنے کے لئے تھا۔ یہ آندولن ناقص سیکولرازم (Pseudo-Secularism) کے حملے سے اصلی 'سیکولرازم' کو بچانے اور اس کے اصل معنی کو حاصل کرنے کے لئے بھی تھا۔ یہ آندولن ہندوستان کی قومی شناخت کے تعریفی وسیلہ یعنی ہماری ثقافتی وراثت پر دوبارہ دعویٰ کرنے کے لئے تھا۔

ستمبر کا مہینہ تھا۔ ایک شام میں پنڈارا پارک میں واقع اپنی رہائش گاہ کے ڈرائنگ روم میں اپنی بیوی کملا کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ میں غور و فکر میں مبتلا تھا، تبھی پرمود مہاجن جو بھاجپا کے ایک جنرل سکریٹری تھے، وہاں آپہنچے۔ حالانکہ وہ اچانک ہی میرے پاس آگئے تھے، لیکن یہ بات میں اچھی طرح سمجھ گیا کہ اجودھیا معاملہ ان کے دماغ میں کوندھ رہا ہے۔ انھوں نے مجھے بتانا شروع کیا کہ اجودھیا میں مجوزہ کارسیوا کس طرح پورے ملک میں چھائی ہوئی ہے۔ کہنا پڑے گا کہ پرمود میں ایسی حساس بیداری تھی کہ کسی سماجی یا سیاسی منظر کے پوری طرح ابھرنے سے پہلے ہی وہ اس کے بارے میں جان لیتے تھے۔

'میں سومناتھ سے اجودھیا تک کی پد یاترا شروع کرنے کے بارے میں سوچ رہا ہوں جو 30 راکتوبر کو اجودھیا پہنچے گی۔'

میں نے پرمود اور کملا کو بتایا' یہ پد یاترا میں یا تو 2 راکتوبر یعنی گاندھی جینتی کے دن یا پھر 25 رستمبر یعنی دین دیال جینتی کے دن شروع کر سکتا ہوں۔' اپنی بات سمجھاتے ہوئے میں نے انھیں بتایا کہ پد یاترا سے مجھے گاؤں والوں اور دیگر لوگوں سے آمنے سامنے ملنے اور انھیں اجودھیا آندولن کی اہمیت کے بارے میں بتانے کا موقع ملے گا۔

سیاسی تحریکوں کے منتظم ہونے کے ناطے پرمود نے حساب کتاب کرنا شروع کر دیا کہ یہ پوری پد یاترا کتنی دوری کی ہوگی اور سومناتھ سے اجودھیا پہنچنے کے لئے مجھے کون سا راستہ اپنانا اچھا رہے گا۔ تھوڑی دیر خاموشی کے بعد وہ بولے' پد یاترا کا خیال تو اچھا ہے، لیکن جو مقصد آپ دل میں لے کر چل رہے ہیں، اس کے لئے یہ بہت زیادہ سودمند نہیں ہے۔ اس یاترا میں آپ گجرات، راجستھان، مدھیہ پردیش اور دہلی کے کچھ حصوں اور آدھے اتر پردیش تک پہنچ سکیں گے۔'

'تو اور کیا متبادل ہے؟' میں نے پوچھا' کار میں یاترا کرنے کا خیال مجھے ٹھیک نہیں لگ رہا ہے، کیونکہ میں لوگوں سے آمنے سامنے نہیں مل سکوں گا۔ جیپ میں یاترا کرنا شاید کچھ اچھا رہے گا۔'' کیوں نہ ہم رتھ یاترا کا منصوبہ بنائیں۔ آخر یہ یاترا رام مندر کے لئے ہی تو ہے۔' پرمود

نے مشورہ دیا۔' آپ کا مطلب میں سمجھا نہیں۔' میں نے کہا۔

'ہم ایک منی بس یا منی ٹرک لیں گے اور اسے رتھ کی طرح بنائیں گے۔ آپ اس میں بیٹھ کر یاترا کر سکتے ہیں اور چونکہ اس کا مقصد اجودھیا میں رام مندر بنانے کے لئے عوامی حمایت حاصل کرنا ہے، اس لئے اس کا نام ہم 'رام رتھ یاترا' رکھیں گے۔' اپنی بات واضح کرتے ہوئے پرمود نے مزید بتایا کہ 'یہ رتھ مغربی، جنوبی، وسطی، شمالی اور مشرقی ہندوستان کا ایک بڑا حصہ طے کرتا ہوا کم از کم ایک درجن ریاستوں تک پہنچ سکے گا۔'

' آڈوانی جی، یاترا کے لئے ضروری انتظامات اور روٹ کے انتخاب کی ذمہ داری آپ مجھ پر چھوڑ دیجئے۔ بس، آپ کو اتنا بتانا ہے کہ آپ کب سے یاترا شروع کرنا چاہتے ہیں؟'

'ستمبر کا پہلا ہفتہ تو چل ہی رہا ہے، اگر ہم دین دیال جینتی (یعنی 25 ستمبر) کو یاترا شروع کرنا چاہیں تو کیا تیاری کے لئے ہمیں خاطر خواہ وقت مل جائے گا؟' رتھ یاترا کا خیال تو مجھے بہت پسند آیا تھا اور میں اس کے اثر کے حوالے سے بھی مطمئن تھا، لیکن میرے من کے کسی کونے میں یہ شبہ ضرور ہونے لگا تھا کہ اتنے کم وقت میں ہماری پارٹی تنظیم تمام ضروری انتظامات کر بھی پائے گی یا نہیں۔

رتھ یاترا کے مشورہ پر مجھے یہ بھی لگنے لگا کہ یہ کچھ زیادہ ہی ڈرامائی ہے۔ 'یہ میری فطرت کے مطابق نہیں ہے۔' میں نے اپنے من میں ہی کہا، لیکن میرے اندر سے آواز آئی 'اسے کرو۔'

میں نے پرمود سے کہا کہ وہ پارٹی کے جنرل سکریٹریوں اور دیگر اہم رہنماؤں کی فوری طور پر ایک میٹنگ بلائیں۔ میری تجویز پر حوصلہ افزا ردعمل سامنے آئے۔ 12 ستمبر کو میں نے 11 اشوک روڈ پر واقع پارٹی کے دفتر میں ایک پریس کانفرنس منعقد کی اور 25 ستمبر کو شروع کی جانے والی اپنی 10,000 کلو میٹر لمبی رتھ یاترا کا اعلان کر دیا، جو 30 اکتوبر کو اجودھیا پہنچ کر کارسیوا میں شامل ہونے والی تھی۔

اور رام رتھ نکل پڑا

رتھ کی پوجا ہونے لگی

گجرات کے سوراشٹر علاقہ میں ستمبر کے آخری ہفتہ کا وقت ایسا ہوتا ہے جب مانسون تو جا چکا ہوتا ہے، لیکن سردیاں شروع نہیں ہوتی ہیں۔ سمندر سے بھی ایسا کوئی اشارہ نہیں ملتا کہ موسم کیسا رہنے والا ہے۔ یعنی سب کچھ غیر یقینی سے بھرا ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح کی غیر یقینی کا احساس میرے دل میں اس وقت تھا، جب میں رام رتھ یاترا شروع کرنے کے لئے سومناتھ پہنچا تھا۔ اس سے پہلے میں نے اتنا منظم عوامی رابطہ پروگرام نہیں بنایا تھا اور وہ بھی بالکل نئے طریقے سے۔ مجھے احساس ہونے لگا تھا کہ میری سیاسی زندگی میں یہ میل کا پتھر ثابت ہوگا، لیکن قسمت مجھے کہاں لے کر جانے والی ہے، اس کا مجھے بالکل بھی علم نہیں تھا۔ میں بس اتنا جانتا تھا کہ مجھے اپنا کام کرنا ہے اور پھل کی فکر نہیں کرنی ہے۔

25 ستمبر کو صبح کے وقت سومناتھ مندر میں جا کر میں نے 'جیوتر لنگ' کی پوجا کی۔ میرے اہل خانہ کے علاوہ پرمود مہاجن اور نریندر مودی — جو فی الحال گجرات کے وزیر اعلیٰ ہیں — اور گجرات پردیش بھاجپا کے دیگر اہم کارکنان تھے۔ پارٹی کے دو نائب صدور راج ماتا وجے راجے سندھیا اور سکندر بخت یاترا کے افتتاح کے موقع پر آئے تھے۔ روانگی سے قبل ہم سب نے مندر کے بالکل باہر سردار پٹیل کے شاندار مجسمے پر

گلہائے عقیدت پیش کیے۔ من ہی من میں نے ان سبھی عظیم ہستیوں سے ترغیب حاصل کی اور ان کا شکریہ ادا کیا، جنھوں نے سومناتھ مندر کی تعمیرِ نو میں اپنی اپنی سطح پر کردار ادا کیا تھا۔

مندر سے باہر نکل کر ہم رام رتھ پر چڑھ گئے۔ رتھ کو گیندے کے پھولوں سے سجایا گیا تھا۔ ہمارا خیر مقدم کرنے اور ہمیں اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرنے سے متعلق نیک خواہشات پیش کرنے کے لئے وہاں لوگوں کی ایک بڑی تعداد جمع ہوگئی تھی۔ تبھی شنکھ کی آواز، 'جے شری رام' اور 'سوگندھ رام کی کھاتے ہیں، مندر وہیں بنائیں گے' کے فلک شگاف نعروں کے درمیان رام رتھ چل پڑا۔ بعد میں یہی نعرے ملکہ ترنم (سورکوکیلا) لتا منگیشکر★ کے ذریعہ گائے گئے گیت رتھ یاترا کی علامتی آواز بن گئے۔

اپنی یاترا کے شروعاتی کچھ دنوں میں گجرات میں میں نے جو ردّعمل دیکھا، اس سے میں سچ مچ بہت خوش تھا۔ جس راستے سے رتھ گزرتا تھا، اس کے آس پاس کے گاؤں، قصبوں سے لوگ آکر جمع ہوجاتے اور بڑی بے صبری سے رتھ کے وہاں پہنچنے کا انتظار کرتے تھے۔ بڑے شہروں اور قصبوں میں تو لوگوں کی اتنی بڑھی بھیڑ جمع ہوجاتی تھی کہ ہمیں اپنے طے شدہ جلسہ گاہ پر پہنچنے میں گھنٹوں لگ جاتے تھے۔ پہلے ہی دن سے ہمارا پروگرام طے شدہ وقت سے کافی پیچھے ہوگیا تھا۔ دن کی ہماری آخری عوامی میٹنگ اکثر آدھی رات تک پہنچ جاتی تھی۔ چار دنوں تک—جب تک ہماری رتھ یاترا گجرات میں تھی—یہی سلسلہ چلتا رہا۔

سچ کہوں تو مجھے اس طرح کے ردّعمل کی توقع تھی ہی نہیں۔ میں حیرت زدہ تھا۔ مجھے اس طرح دیکھ کر پرمود، جنہیں پوری یاترا کے دوران میرے ساتھ رہنے کے لئے پارٹی نے چنا تھا، بول پڑے 'اتنا زبردست ردّعمل اس لئے مل رہا ہے، کیونکہ یہ گجرات ہے۔ یہاں کے لوگ روایتی طور پر انتہائی مذہبی مزاج کے ہیں۔ جب ہم گجرات سے آگے بڑھ کر مہاراشٹر میں داخل ہوں گے تو اس طرح کا ردّعمل شاید نہ دیکھنے کو ملے۔'

پرمود کا اندازہ غلط نکلا، بالکل غلط، مہاراشٹر ہی نہیں، بلکہ راستے میں پڑنے والی دیگر ریاستوں میں بھی ایسا ہی زبردست اور حوصلہ افزا ردّعمل دیکھنے کو ملا، بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ بڑی تعداد میں لوگ اکٹھا ہوکر، جگہ جگہ حلقہ بنا کر اور رتھ پر پھول نچھاور کرکے ہمارا خیر مقدم اور حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ سب سے زیادہ خوش کن بات میرے لئے یہ تھی کہ لوگ—خاص طور پر عورتیں—گروپ میں آگے آکر رتھ کی آرتی اتارتی تھیں۔ یہ محسوس کرنے میں مجھے زیادہ دیر نہیں لگی کہ لوگوں کی نظر میں میرا مقام تھا۔ میں صرف ایک سارتھی تھا۔ رتھ یاترا کا اصل پیامبر تو خود رتھ ہی تھا اور وہ رتھ صحیح معنی میں قابلِ پرستش تھا، کیونکہ وہ رام کی جائے پیدائش پر رام مندر بنانے کے عظیم مقصد سے اجودھیا جا رہا تھا۔ راستے میں میٹنگوں کے دوران میں نے جو کچھ بھی کہا، وہ اسی سلسلے میں صرف وضاحت تھی۔

ہندو روایت میں 'سگن برہم' کی پوجا ممکنہ طور پر یہ انتہائی قابلِ ذکر مثال تھی۔ 'سگن برہم' کی پرستش میں ہم کسی ظاہری مورتی یا شئے (درخت، ندی، پہاڑ، جھیل وغیرہ) میں ایشور کو دیکھتے ہیں اور اسے مقدس مان کر اس کی پوجا کرتے ہیں۔ اس طرح رتھ بذاتِ خود دیوتائی صلاحیتوں کا حامل ہوگیا تھا۔

★ آندولن شروع ہونے سے ایک روز قبل مجھے معروف فلم اسٹار اور حب الوطنی کی متعدد فلموں کے فلم ساز منوج کمار کی جانب سے ایک کیسٹ موصول ہوا، جس میں لتا منگیشکر کا گایا ایک گیت تھا، جو رام رتھ یاترا کا ٹائٹل گیت بن گیا—

رام نام جادو ایسا، رام نام من بھائے

من کی ایودھیا تب تک سونی، جب تک رام نہ آئے رے

رتھ یاترا کا سب سے زیادہ حوصلہ افزا اور دل کو چھو لینے والا ردِّ عمل دور دراز گاؤں اور چھوٹے چھوٹے محلوں میں دیکھنے کو ملا، جہاں زیادہ تر درج فہرست ذات اور قبائلی ذات کے لوگ رہتے تھے۔ گاؤں والوں کے چہروں پر ایک الگ قسم کی معصومیت اور عقیدت مندانہ تاثر دیکھا جاسکتا تھا۔ جیسا کہ گاندھی جی نے اپنی کتاب 'ہند سوراج' میں لکھا ہے: وہ شہری زندگی کے اثر اور مقابلہ آرائی و پیشہ واریت کے رجحان سے بہت دور تھے۔ کئی تو بالکل ناخواندہ یا برائے نام تعلیم یافتہ تھے۔ رام یا 'رامائن' کے بارے میں انھوں نے کسی کتاب میں پڑھ کر نہیں جانا تھا۔ ان کے بارے میں معلومات انھیں جیسے روایتی طور پر حاصل ہوئی تھیں، جو خاندانوں میں ایک نسل سے دوسری نسل تک کہانیوں کے طور پر یا دیہی میلوں یا رام نومی وغیرہ سالانہ تہواروں کے دوران منعقد کیے جانے والے رام لیلاؤں اور کیرتنوں کے توسط سے پہنچی تھیں۔ کئی مقامات پر تو ایسا ہوا کہ ایک بوڑھا گاؤں والا خاموشی سے آتا، رتھ کے سامنے پہنچ کر پوجا کرتا اور میرا استقبال کر کے چلا جاتا۔ ان تجربات سے میں پوری طرح جذباتی ہو گیا تھا۔

میں نے پہلے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ہندوستانی عوام کے دلوں میں مذہبیت اتنی گہرائی میں بسی ہوئی ہے۔ اس کے بارے میں میں نے کتابوں میں پڑھا تھا اور اس کی جھلکیاں بھی دیکھی تھیں، لیکن گاؤں گاؤں شہر شہر میں اسے اس طرح بلاواسطہ اور فطری انداز میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ رام رتھ یاترا کے دوران ہی مجھے سوامی وویکانند کے اس بیان کی حقیقت کا اندازہ ہوا — 'مذہب ہندوستان کی آتما ہے۔ اگر آپ ہندوستانیوں کو کچھ سکھانا پڑھانا چاہتے ہیں تو انھیں مذہب کی زبان میں پڑھائیں، انھیں بہتر سمجھ میں آئے گا۔' رام رتھ یاترا کے دوران ہی مجھے یہ بھی سمجھ میں آیا کہ اگر قوم پرستی کا پیغام دینا ہو تو اسے مذہب کی زبان میں دیا جائے۔ اس سے یہ پیغام زیادہ موثر ڈھنگ سے اور وسیع پیمانے تک پہنچے گا۔ اسی رام رتھ یاترا سے مجھے گاندھی جی کے طریقۂ کار کے پیچھے کے علم کے بارے میں پتہ چلا، جو اپنی سیاسی نصیحتیں شروع کرنے سے پہلے اکثر: 'رگھوپتی راگھو راجا رام' کا بھکتی گان کرتے تھے۔

اپنی تقریروں میں — جو اکثر رتھ پر ہی خاص طور پر تیار کیے گئے منچ پر دیئے گئے تھے — میں رتھ یاترا کے مقاصد اور ان حالات کی وضاحت کرتا تھا، جن کے سبب بی جے پی کو اجودھیا تحریک میں شامل ہونا پڑا تھا۔ حالانکہ رتھ یاترا کے تئیں لوگوں کا ردِّ عمل مذہبی تھا، لیکن میری تقریروں کا مرکزی موضوع قوم پرستی (راشٹرواد) ہوتا تھا۔ میں اس نام نہاد سیکولرزم کو اپنی تقریروں کا موضوع بناتا تھا جس کی آڑ میں کچھ سیاسی پارٹیاں ہندوستانی قوم کے ثقافتی و تہذیب پر مبنی بنیادی عناصر کو نظرانداز کر رہے تھے۔ میں نے یہ بھی واضح کر ڈالا کہ کس طرح یہ سب اقلیتی ووٹ بینک کو رجھانے کے لئے کیا جا رہا تھا۔

اپنی تقریروں میں میں نے اس بات پر زور دیا کہ کس طرح مذہبی اعتقاد کے تئیں مثبت سوچ کی طاقت قومی تعمیر اور سماجی تبدیلیوں میں عظیم کردار ادا کر سکتی ہے۔ میں کہتا تھا 'رام بھکتی لوک شکتی (عوامی طاقت) بن سکتی ہے۔' میں نے لوگوں سے خاص طور سے یہ اپیل کی کہ وہ ذات پات کی بندھن سے اوپر اٹھ کر ایک قومی مقصد کے لئے اتحاد کا مظاہرہ کریں۔ میٹنگوں میں بڑی تعداد میں موجود ہریجنوں کا میں نے خیر مقدم کیا۔ میں نے انھیں یاد دلایا کہ کس طرح مہاتما گاندھی نے لوگوں کو چھوا چھوت کی برائی کے بارے میں بتانے کے لئے مذہب کی طاقت کا استعمال کیا — 'رام بھکتی اور دیش بھکتی کے اشتراک سے ایک ناقابل تسخیر قومی طاقت بن سکتی ہے۔'

آزاد بھارت میں مسلم بھائیوں کو ہندوؤں کے مساوی درجہ دیا گیا ہے۔ میں اپنی تقریروں میں خاص زور دے کر اس بات کو کہتا تھا کہ پاکستان اور اس کے بعد بنگلہ دیش کے ذریعہ خود کو اسلامی ممالک قرار دیئے جانے کے باوجود ہندوستان اپنی کل مذاہب کی یکساں احترام کی پالیسی پر ہی چلتا رہا ہے۔ سبب واضح کرتے ہوئے میں نے بتایا کہ ایسا ہندو مذہب کے زمانۂ قدیم کے تمام مذاہب کا یکساں احترام کے اقدار

کے سبب ہے۔ مسلم فرقہ کے رہنماؤں سے اپیل کرتے ہوئے میں نے کہا کہ وہ اجودھیا معاملہ میں اپنے ہندو بھائیوں کے جذبات کا احترام کریں اور شری رام کی جائے پیدائش پر ایک عظیم الشان رام مندر کی تعمیر ہونے دیں۔

میری تقریروں کے پیغام کا لوگوں پر اچھا اثر پڑا۔ تالیوں کی گڑگڑاہٹ سے اس کا خیر مقدم کیا گیا۔ تقاریر بہت مختصر ہوتی تھیں۔ تقریباً 5 منٹ کی، کیونکہ راستے میں ایک دن میں مجھے تقریباً 25-20 استقبالیہ جلسوں کو خطاب کرنا پڑتا تھا۔ شہروں اور قصبوں میں تو دسیوں ہزار لوگوں کی بھیڑ استقبالیہ جلسہ میں جمع ہو جاتی تھی، جسے خطاب کرنے کے لئے مجھے اکثر رتھ کے نیچے اترنا پڑتا تھا۔ گجرات اور مہاراشٹر کے عوام کی جانب سے رتھ یاترا کے تئیں جو حوصلہ افزا ردّعمل تھا، اس کے بارے میں میڈیا نے خبر دینی شروع کردی تھی۔ اس کا ایک فائدہ یہ مل رہا تھا کہ ایک ریاست سے دوسری ریاست میں رتھ یاترا کے پہنچنے پر مقابلتاً اور زیادہ ردّعمل آتا تھا۔ کئی جگہ تو صورت حال ایسی ہو جاتی تھی کہ دن کا آخری جلسہ رات 2:00 بجے تک پہنچ جاتا تھا۔ ایک بار تو آندھرا پردیش میں اپنے دن کی آخری منزل تک پہنچنے میں صبح کے 5:00 بج گئے تھے۔ ویسے رتھ یاترا کے پہلے دن کا پروگرام خواہ جتنی تاخیر سے مکمل ہوتا تھا، لیکن اگلے دن کی یاترا صبح 10:00 بجے تک شروع ہو جاتی تھی۔

رتھ یاترا کے خلاف گمراہ کن تشہیر

میری تقریروں میں فرقہ وارانہ شدت پسندی برائے نام بھی نہیں

کیا میری مہم مسلم مخالف تھی؟ بالکل نہیں، لیکن رتھ یاترا کے حوالے سے عام لوگوں کی جانب سے جو وسیع پیمانے پر اور حوصلہ افزا ردّعمل آرہا تھا، اس سے بوکھلا کر ہمارے سیاسی مخالفین نے اس طرح کی گمراہ کن تشہیر کا سہارا لیا۔ ان کی یہ مہم پوری طرح بے بنیاد تھی اور وہ سیاسی مفاد پر مبنی تھی۔ میں نے انھیں چیلنج دیتے ہوئے کہا کہ وہ میری تقریروں سے کوئی ایک بات بتائیں جسے کسی بھی طرح سے مسلمانوں یا اسلام کے خلاف ثابت کیا جاسکے۔ پوری یاترا کے دوران میں نے ایسا کچھ بولا ہی نہیں تھا، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اگر میرے جلسے میں کبھی کوئی قابل اعتراض نعرہ لگاتا بھی تھا تو میں فوراً اسے ڈانٹ دیتا تھا۔ مثلاً ایک جگہ کچھ لوگ نعرہ لگانے لگے — 'جو ہندو ہت کی بات کرے گا، وہی دیش پر راج کرے گا' میں فوراً کھڑا ہو گیا اور انھیں روکتے ہوئے کہا کہ بھارتیہ جنتا پارٹی ملک کے ہر شہری کی نمائندگی کرتی ہے اور کرنا چاہتی ہے، خواہ وہ ہندو ہو یا مسلم، سکھ، عیسائی یا پارسی ہو، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں نے کہا کہ ہماری پالیسیوں کا مقصد ملک کے صد فی صد عوام کی فلاح و بہبود ہے نہ کہ صرف ہندوؤں کا، جن کی کل آبادی میں حصہ 82 فیصد ہے۔ یقینی طور پر ہم ان 'سیوڈو سیکولرسٹوں' سے متفق نہیں ہیں جن کے لئے 82 فیصد عوام معنی نہیں رکھتے، صرف 18 فیصد ہی معنی رکھتے ہیں۔ میں نے مزید کہا کہ اگر نعرہ لگانا ہی ہے تو وہ کچھ اس طرح ہونا چاہیے: 'جو راشٹر ہت کی بات کرے گا، وہی دیش پر راج کرے گا'

ہمارے سیاسی مخالفین کے ذریعہ ایک اور گمراہ کن تشہیر یہ کی گئی کہ رام رتھ یاترا اپنے پیچھے فرقہ وارانہ تشدد چھوڑ گئی، لیکن تحریروں سے صاف پتہ چلتا ہے کہ رتھ یاترا کے دوران راستے میں ایک بھی مقام پر ایسا واقعہ نہیں ہوا جسے فرقہ وارانہ تشدد کہا جاسکے۔ بلاشبہ ملک کے کئی حصوں میں فسادات بھڑکے تھے، لیکن رتھ یاترا کے راستے میں ایسا ایک بھی واقعہ رونما نہیں ہوا۔ اس کے باوجود میڈیا کے ایک طبقہ کو جب 'آڈوانی کی خونیں یاترا' جیسے تبصرے کرتے دیکھا تو صحیح معنوں میں مجھے بہت دکھ ہوا۔

ڈاکٹر کونراڈ ایلسٹ نے اپنی دو جلدوں کی کتاب 'دی سیفرن سواستک' میں میڈیا کے ایک طبقہ کے ذریعہ بی جے پی کے اوپر کیے جانے

والے قابل مذمت حملوں کی بہت منظم اور نا قابل رد جوازوں کے ذریعہ تردید کر کے انھیں جھوٹ کا پلندہ ثابت کر دیا ہے۔ رتھ یاترا کے سلسلے میں انھوں نے لکھا: 'لیکن اکتوبر 1990 میں سومناتھ سے اجودھیا کی آڈوانی کی خونیں رتھ یاترا (کار یاترا) کا کیا؟ بہت معمولی بات ہے۔ ایسا بالکل نہیں ہے کہ رتھ یاترا کوئی خونیں واقعہ تھا، جبکہ اسی مدت میں ملک کے مختلف حصوں، خاص طور پر حیدرآباد، کرناٹک اور اتر پردیش میں مختلف مقامات پر فساد ہوئے، جس میں تقریباً 600 افراد مارے گئے جبکہ رتھ یاترا کے پورے راستے پر ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔ ہاں، ایک جگہ کچھ اعلیٰ طبقہ کے طلبا نے آڈوانی پر پتھر پھینکے، کیونکہ وہ وی پی سنگھ کے ذریعہ نافذ کردہ ذات پات پر مبنی ریزرویشن کے خلاف ان کے ذریعہ چلائے جانے والی تحریک کی آڈوانی کے ذریعہ حمایت نہ کیے جانے کے سبب ان سے ناراض تھے۔ تب بھی نہ کوئی ہلاکت ہوئی اور نہ ہی زخمی۔ یہ ہندوستانی انگریزی میڈیا کی معتبریت اور احساس ذمہ داری پر ایک بڑا سوالیہ نشان کھڑا کرتا ہے کہ کیسے اس نے فسادزدہ ملک میں ایک مکمل طور پر پرامن یاترا کی 'آڈوانی کی خونیں یاترا' کے طور پر غلط تشہیر کی۔ یہ مضحکہ خیز تھا کہ اڈیٹروں نے اپنے اداریوں میں آڈوانی کو ان فرقہ وارانہ فسادات کے لئے کیسے ذمہ دار ٹھہرایا۔ وہیں اسی اخبار میں ایک دیگر صفحہ پر آڈوانی دیگر سبب گنائے۔ حالانکہ آڈوانی اپنی رتھ یاترا کے دوران کسی فساد متاثرہ علاقہ سے 500 میل دور تھے (جیسے اتر پردیش میں گونڈا) یا قیدی تھے یا اجودھیا تحریک کے بعد اپنے گھر پر تھے، تب بھی 1990 کے نصف آخر میں ملک میں ہونے والے کسی بھی فساد کے لئے انھیں ہی ذمہ دار ٹھہرایا گیا۔'

میری یاترا 24 اکتوبر کو اتر پردیش کے دیوریا ضلع میں داخل ہونے والی تھی، لیکن جیسا مجھے اندیشہ تھا، 23 اکتوبر کو سستی پور میں بہار کے اس وقت کے وزیر اعلیٰ لالو پرساد یادو کی ہدایت پر یاترا کو روک دیا گیا۔ وہاں سے مجھے بہار، بنگال کے سرحدی دمکا ضلع کے مانجور میں محکمہ سینچائی کے ایک انسپکشن بنگلے میں لے جایا گیا۔ اس قدم سے لوگوں میں ناراضگی پھیل گئی۔ پورے ملک میں فطری طور پر احتجاجی مظاہرے ہوئے۔

میں مانجور میں 5 ہفتے قیدی رہا۔ اس طرح رتھ یاترا — جو میری سیاسی زندگی کا سب سے دلچسپ واقعہ تھا — کا اختتام ہوگیا۔

ایک غیر جاری شدہ آرڈیننس کی کہانی

وی پی سنگھ سرکار کی ڈھلمل پالیسی

اب میں ان کوششوں کے بارے میں بتانا چاہوں گا جو وی پی سنگھ اور قومی مورچہ سرکار کے ان کے معاونین کے ذریعہ اجودھیا مسئلہ کو حل کرنے کے لیے کی گئی تھیں۔

اجودھیا مسئلہ جب قومی بحث کا موضوع بن گیا تو ہندو اور مسلمان دونوں ہی فرقوں میں ایک آواز اٹھی کہ یہ مسئلہ سیاسی پارٹیوں کی مداخلت کے بغیر دونوں فرقوں کے مذہبی رہنماؤں کے ذریعہ آپسی کوششوں سے حل کیا جائے۔ میں اس سے غیر متفق نہیں تھا۔ 1990 کے اوائل میں وی پی سنگھ کی سرکار نے ایک نئی پیش رفت کی کوشش کی، جو مفاہمت کے دھاگے پر مبنی تھی — متنازع ڈھانچہ اور مقام اس شرط پر کسی نئے ہندو ٹرسٹ کو دے دیا جائے کہ وہ وہاں موجود ڈھانچے میں کوئی چھیڑ چھاڑ کئے بغیر رام مندر بنائے گا اور مندر اور متنازعہ ڈھانچہ کے درمیان ایک دیوار تعمیر کرے گا۔

اس مفاہمتی ترکیب پر حمایت حاصل کرنے کے لئے وزیر اعظم نے آندھرا پردیش کے اس وقت کے گورنر، جو بعد میں ملک کے نائب صدر بھی بنے تھے، کرشن کانت کی خدمات لیں۔ کرشن کانت نے مشورہ دیا کہ کانچی کا مکوٹی مٹھ کے سوامی جیندر سرسوتی کی قیادت میں نیا ٹرسٹ

بنایا جاسکتا ہے۔ اسی کے مطابق انھوں نے تمل ناڈو کے کانچی پورم میں اتر پردیش کے ندوۃ کے معزز مسلم مذہبی رہنما اور سوامی جی کے درمیان ایک میٹنگ کرائی۔ یہ میٹنگ کچھ حد تک کامیاب رہی۔ بات چیت کے بعد ایک پریس کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے سوامی جی نے کہا کہ سیاسی عناصر کو اجودھیا مسئلہ سے دور رکھا جانا چاہیے اور اس مسئلہ کا مستقل و پرامن حل نکالنے کے لئے سرکار کو دونوں فریقوں کے مذہبی رہنماؤں کی ایک میٹنگ بلانی چاہیے۔

بعد میں کرشن کانت اوڈوپی گئے اور وہاں پیجاور مٹھ کے وشویش تیرتھ سوامی جی کے ساتھ بات چیت میں اس مفاہمتی ترکیب کے مواد کی تصدیق کردی۔ سوامی جی، جو وشو ہندو پریشد کے بانی رہنماؤں میں سے ایک رہے تھے، نے کہا کہ وہ دیگر لوگوں کے ساتھ صلاح ومشورہ کریں گے اور ان کے مجموعی ردعمل کو سرکار تک پہنچائیں گے۔ کچھ دنوں کے بعد کرشن کانت سوامی جی کو ایک خصوصی طیارہ کے ذریعہ وزیر اعظم کے پاس لے گئے لیکن یہ کوشش ناکام رہی۔

وی پی سنگھ کے بارے میں یہ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے اجودھیا مسئلہ کو حل کرنے کے لئے کچھ نہیں کیا، لیکن ان کی اتنی غلطی ضرور تھی کہ وہ اپنی سرکار کی ہی مثبت پہلوؤں کو لے کر آگے چلنے کی ہمت نہیں کرسکے۔ کانچی اور اوڈوپی کے سوامیوں کو شامل کرکے حل ڈھونڈنے میں کی گئی ناکام کوشش اس کی مثال تھی۔ دوسری مثال صحیح معنی میں بے معنی تھی —— وی پی سنگھ کی سرکار نے اڑتالیس گھنٹے کے اندر اس آرڈیننس کو واپس لے لیا جسے اس نے خود اجودھیا مسئلہ کو حل کرنے کے لئے نافذ کیا تھا۔

15 اکتوبر 1990 کو وی پی سنگھ نے ایس گرومورتی، جو سرکار اور مندر تحریک کے رہنماؤں کے درمیان ایک اہم کڑی کے طور پر کام کررہے تھے، کو بات چیت کے لئے مدعو کیا۔ یہ سب کچھ 30 اکتوبر کو کارسیوا شروع کرنے کے اعلان کے بعد ہوا تھا۔ اس وقت میری رتھ یاترا بھی جاری تھی۔ ظاہری بات تھی کہ وزیر اعظم کو رتھ یاترا پر پورے ملک سے آنے والے زبردست ردعمل کے بارے میں بھی واقفیت تھی۔ وہ اس حقیقت سے بھی آشنا تھے کہ ان کی پارٹی کے ہی کچھ لوگ، خاص طور پر اتر پردیش اور بہار کے وزرائے اعلیٰ، ملائم سنگھ یادو اور لالو پرساد یادو، رتھ یاترا کے خلاف اپنی بیان بازی میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش میں لگے تھے۔ اسی سلسلے میں بات کرنے اور حالات کو کنٹرول کرنے پر غور کرنے کے لئے انھوں نے گرومورتی کو بلایا تھا۔

گرومورتی نے ایک 3 نکاتی حل پیش کیا —— (الف) مجوزہ مندر احاطہ کا کل رقبہ تقریباً 170 ایکڑ ہے، جس میں سے صرف 2.5 ایکڑ ہی متنازع مقام کے تحت آتا ہے، باقی تقریباً 167 ایکڑ زمین جس پر 1989 میں راجیو گاندھی سرکار کی منظوری سے شیلانیاس کا کام مکمل ہوا تھا، غیر متنازع ہے۔ گرومورتی کی تجویز تھی کہ اس متنازع اور پوری غیر متنازع اراضی کو مرکزی سرکار اپنے قبضے میں لے لے اور پھر 167 ایکڑ کی غیر متنازع اراضی کو رام جنم بھومی نیاس کو سونپ دے، تاکہ وہاں کارسیوا مکمل کی جاسکے۔ (ب) متنازع ڈھانچہ کو جہاں ہے جیسا ہے کی حالت میں اس کے آس پاس کی 30 فٹ زمین کے ساتھ مرکزی سرکار اپنے قبضہ میں لے لے۔ (ج) متنازع مقام کے سلسلے میں مرکزی سرکار آئین کے آرٹیکل 143 کے تحت سپریم کورٹ کو ایک سرٹیفکیٹ دے گی جس میں یہ حوالہ دیا جائے کہ کیا ماضی میں کبھی اس مقام پر مندر تھا جسے گراکر اس کی جگہ پر مسجد بنائی گئی۔ اس مجوزہ سرٹیفکیٹ میں ایسی کسی بات کا ذکر نہیں ہونا تھا کہ رام کبھی وہاں پیدا ہوئے تھے یا نہیں۔ آخر اس مسئلہ کو کوئی بھی عدالت نہیں حل کرسکتی تھی۔

وی پی سنگھ فوراً اس تجویز پر متفق ہوگئے۔ گرومورتی نے مندر تحریک کے رہنماؤں کو اس سے آگاہ کرایا اور پھر ان کی منظوری وزیر اعظم تک

پہنچائی۔ تین روز بعد وزیراعظم کی کابینہ کے دوسینئر ارکان، وزیر برائے ریلوے جارج فرنانڈیز اور وزیر برائے اطلاعات ونشریات پی اوپیندر نے نئی دہلی میں واقع سنگھ کے ہیڈکوارٹر میں اشوک سنگھل اور مندر تحریک سے جڑے دیگر رہنماؤں سے ملاقات کی۔ انھوں نے بتایا کہ سرکار نے وزیراعظم کے ذریعہ دیئے گئے اشاروں کی بنیاد پر اجودھیا معاملے پر ایک آرڈیننس جاری کرنے کی تجویز رکھی ہے۔

اسی روز شام کو وزیراعظم نے بی جے پی کے جنرل سکریٹری کے این گووندا چاریہ اور ارون جیٹلی، جو اس وقت سالیسٹر جنرل تھے، کو اجودھیا معاملے پر بات چیت کے لئے مدعو کیا۔ 3 نکاتی حل والی تجویز پر اتفاق رائے قائم ہوگئی۔ بات چیت ختم ہونے کے بعد وزیراعظم کے دفتر کے ایک سینئر افسر کو آدھی رات میں بلا کر اس تجویز پر عمل آوری کے لئے ضروری لوازمات پورے کرنے کے لئے کہا گیا۔ اس طرح دیر رات میں آرڈیننس کا خاکہ تیار کیا گیا، جسے صبح 5:00 بجے کابینہ سکریٹری کی رہائش گاہ پر حتمی شکل دی گئی۔ 10:00 بجے وزیراعظم کی رہائش گاہ پر کابینہ کی میٹنگ ہوئی اور آرڈیننس اور 3 نکاتی حل کی تجویز کو منظوری دے دی گئی۔

گرومورتی اس دن چنئی میں تھے۔ وزیراعظم نے ایک دیگر اہم میٹنگ کے لئے انھیں بلایا۔ رتھ یاترا میں دیوالی پر جز وقتی چھٹی کے لئے میں دہلی میں رکا تھا۔ رتھ یاترا کا منصوبہ تیار کرتے وقت ہی ہم سمجھ گئے تھے کہ دیوالی کا تہوار ہماری یاترا کے درمیان پڑے گا اور تہوار میں کسی طرح کی گڑبڑی مناسب نہیں ہوگی، اس لئے یاترا کا پروگرام کچھ اس طرح تیار کیا گیا تھا کہ رتھ دیوالی سے دوروز قبل یعنی 14 اکتوبر کو دہلی پہنچ جائے۔ بہار کے دھنباد سے اپنی یاترا دوبارہ شروع کرنے کے لئے مجھے تہوار منانے کے بعد 18 اکتوبر کو کلکتہ کے لئے روانہ ہونا تھا۔ 18 تاریخ کو ہی شام کو وزیراعظم نے فون پر مجھ سے بات کی اور مجوزہ حل پر میری رائے جاننی چاہی۔ میں نے انھیں بتایا کہ تجویز پر میری رائے مثبت ہے۔ اس پر انھوں نے کہا 'آپ تو کل کلکتہ جارہے ہیں، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ آپ کی رتھ یاترا دھنباد سے پرسوں ہی شروع ہوجائے گی۔ آپ سے درخواست ہے کہ کل آپ رک جائیں۔ امید کی کچھ کرن آج دکھائی دینے لگی ہے، کیوں نہ ہم اسے مکمل روشنی میں بدل دیں اور پھر ہم دونوں ساتھ ساتھ کارسیوا کرسکیں گے۔'

اس کے تھوڑی دیر بعد ہی مغربی بنگال کے کمیونسٹ وزیراعلیٰ جیوتی باسو کا بھی فون آگیا۔ بی جے پی کی طرح ہی ان کی پارٹی مارکسوادی کمیونسٹ پارٹی بھی وی پی سنگھ سرکار کو باہر سے حمایت دے رہی تھی۔ فون پر باسو بھی کچھ اسی طرح کی درخواست کر رہے تھے، تب میں نے اپنا کلکتہ جانے کا پروگرام ترک کرنے اور 19 اکتوبر کو سیدھے دھنباد پہنچنے کا فیصلہ کیا۔

دہلی میں میرے قیام کے دوران سرکار اور مندر تحریک کے رہنماؤں کے درمیان بات چیت کا سلسلہ جاری رہا۔ بات چیت کے عمل کے تحت ہی 19 اکتوبر کو صبح میں رام ناتھ گوئنکا سے ملنے کے لئے 'انڈین ایکسپریس' کے سندر نگر میں واقع گیسٹ ہاؤس گیا۔ واضح رہے کہ رام ناتھ گوئنکا نے کانگریس سرکار کے گھوٹالوں، بدعنوانیوں کے خلاف کئی لڑائیوں میں حصہ لیا تھا اور وہ وی پی سنگھ کے ایک اچھے معتقد بھی تھے۔ وہاں گرومورتی اور گوئنکا اور وزیراعظم کے کچھ اسی طرح کے دوست موجود تھے۔ کچھ لوگوں نے اندیشہ ظاہر کیا کہ میری رتھ یاترا — جسے اگلے دن میں دوبارہ شروع کرنے والا تھا — کے سبب مرکز میں قومی مورچہ سرکار گرسکتی ہے، جسے باہر سے بی جے پی کی حمایت حاصل ہے۔ میں نے یہ بھی واضح کردیا کہ میں آرڈیننس اور 3 نکاتی حل کا خیر مقدم کرتا ہوں، خواہ وشو ہندو پریشد کو متنازع ڈھانچہ کارسیوا بنایا جائے یا نہیں۔ اس وقت بھی میں نے اپنی یہی بات دہرائی، جب گرومورتی اور ارون جیٹلی میری رہائش گاہ پر مجھ سے ملنے آئے تھے، جبکہ اس وقت میں دھنباد سے اپنی یاترا دوبارہ شروع کرنے کے لئے ریلوے اسٹیشن جانے کی تیاری کر رہا تھا۔

اسی دوران دوپہر بعد گرومورتی نے وزیراعظم سے بات کی اور انھیں صبح کی میٹنگ کے نتائج کے بارے میں بتایا۔ وزیراعظم وی پی سنگھ کے رویے میں اچانک آئی بڑی تبدیلی سے وہ حیرت زدہ رہ گئے۔ دراصل وزیراعظم نے ان سے کہا کہ صرف متنازع ڈھانچہ ہی نہیں بلکہ پوری 'غیر متنازع' اراضی ہی سرکار کے قبضہ میں رہے گی اور اسے مندر نیاس کو نہیں سونپا جائے گا۔ جب گرومورتی نے اشارتاً کہا کہ یہ پہلے منظور شدہ آرڈیننس یا 3 نکاتی حل کی بنیاد نہیں ہے تو وزیراعظم نے کہا کہ 'آڈوانی جی کو اپنی رتھ یاترا ایک دن کے لئے ٹال دینی چاہئے تاکہ کوئی حل نکالا جاسکے۔' انھوں نے یہ بھی کہا کہ 'باہمی اطمینان بخش حل نکل آئے تو آڈوانی جی کے ساتھ میں بھی کارسیوا کے لئے اجودھیا جاؤں گا۔'

گرومورتی نے یہ بات مجھے بتائی۔ میں نے ان سے کہا کہ وہ میری جانب سے وزیراعظم سے کہہ دیں کہ اس کے لئے میرا یہاں رہنا ضروری نہیں ہے اور اگر مجوزہ آرڈیننس اور 3 نکاتی حل کو نافذ بھی کیا جاتا ہے تو وہ میرے لئے قابل قبول ہے۔ مجھے لگنے لگا تھا کہ وزیراعظم یا تو پوری طرح پرعزم نہیں ہیں یا پھر وہ ان لوگوں کی جانب سے آنے والے دباؤ کو لے کر چل پانے کی ہمت نہیں کر پا رہے ہیں، جو نہیں چاہتے کہ تنازع کا کوئی پرامن حل نکلے۔

بعد میں گرومورتی اور جیٹلی سے ہی مجھے پتہ چلا کہ اسی دن شام کو انھیں وزیراعظم کی رہائش گاہ پر ایک میراتھن میٹنگ کے لئے بلایا گیا تھا۔ وہاں وی پی سنگھ کے معاون کے طور پر 4 سینئر وزراء موجود تھے — جارج فرنانڈیز، ارون نہرو، اجیت سنگھ اور دنیش گوسوامی، جو اس وقت وزیر قانون تھے — نے جواز پیش کیا کہ آرڈیننس کو جاری کرنا ممکن نہیں ہے، کیونکہ اس میں کئی مقدمے اور 'سیکڑوں متنازع مسئلے' جڑے ہوئے ہیں۔ معاملے کو بگڑنے سے بچانے کے لئے ایک بار ارون جیٹلی اور گرومورتی کی ضرورت پڑی، انھوں نے واضح کیا کہ 'سیکڑوں متنازع معاملے صرف 3 کیٹگریوں میں آتے ہیں — پہلی متنازع مقام پر رام پیدا ہوئے تھے (یا نہیں)، دوسری متنازع ڈھانچہ کے مقام پر کوئی ہندو مندر پہلے سے موجود تھا (یا نہیں) اور تیسری متنازع مقام کے آس پاس کی زمین کس کی ہے۔' انھوں نے مزید کہا کہ پہلے تنازع کا حل عدالتی یا قانونی دائرۂ کار میں نہیں ہے۔ دوسرا تنازع دستیاب دستاویزات وثبوتوں کی جانچ کی بنیاد پر عدالتی رائے یا احکام کے تحت ہے۔ جہاں تک تیسرے تنازع کی بات ہے، سرکار اپنی لازمی ایکوائرمنٹ کی غیر متنازع طاقت کے تحت قانونی کارروائی کرسکتی ہے۔

جیٹلی اور گرومورتی کا جواز اتنا ناقابل رد تھا کہ وزیراعظم کے معاونین اس کے خلاف کچھ بھی نہیں بول سکے۔ اسی کے مطابق سرکار نے دیر رات ایک پریس ریلیز کے توسط سے آرڈیننس کو جاری کرنے کے اپنے فیصلے کا اعلان کردیا۔

لیکن سرکار نے بڑے ہی مضحکہ خیز ڈھنگ سے اپنے فیصلے کو اسی رات پلٹ دیا۔ واضح تھا کہ وزیراعظم کے سامنے ملائم سنگھ کی جانب سے ایک چیلنج تھا جو ریاست میں اس آرڈیننس کو نافذ نہیں ہونے دیتے، بالآخر 21 راکتوبر کو آرڈیننس واپس لے لیا گیا۔ یہ خبر مندر تحریک کے رہنماؤں اور ان کے حامیوں کے لئے انتہائی مایوس کن تھی جس میں اعتماد شکنی کی بو آرہی تھی۔

وی پی سنگھ سرکار کا زوال

چندر شیکھر کے ذریعہ حل کی کوشش

بی جے پی کی حمایت یافتہ وی پی سنگھ سرکار نے اپنے پاؤں پر کلہاڑی اسی دن ماری تھی جس دن وزیراعظم کی اپنی پارٹی کے ایک وزیراعلیٰ نے میری رتھ یاترا کو روک دیا اور بہار میں مجھے گرفتار کرنے کا حکم دیا۔ 17 راکتوبر کو نئی دہلی میں بی جے پی قومی ایگزیکٹو کمیٹی نے ایک قرارداد

پاس کی — 'بی جے پی مرکزی سرکار سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ لوگوں کے جذبات کا احترام کرے اور جنم استھان پر مندر تعمیر ہونے دے۔ ایگزیکیٹو کمیٹی سرکار کو متنبہ کرتی ہے کہ اگر سرکار نے ایسا نہیں کیا یا اس نے عوامی جذبات کی علامت رتھ یاترا کو روکنے کی کوشش کی تو بی جے پی کو سرکار سے حمایت واپس لینے کے لئے مجبور ہونا پڑے گا۔' اس لئے 23 ر اکتوبر کو میری گرفتاری کے بعد اٹل جی کی قیادت میں ایک وفد صدر جمہوریہ آر وینکٹ رمن سے ملا اور انھیں وی پی سنگھ سرکار سے حمایت واپسی کا خط سونپ دیا۔

اس وقت تک یہ بات یقینی ہوگئی تھی کہ سرکار ایوان میں اپنی اکثریت کھو چکی ہے اور اس طرح اسے ملک پر حکومت کرنے کا سیاسی اور اخلاقی حق بھی نہیں رہا، لیکن اس کے باوجود وی پی سنگھ ایسا ہی برتاؤ کرتے رہے جیسے وہ اس وقت کے نائک ہوں۔ انھوں نے لوک سبھا میں اپنی اکثریت ثابت کرنے پر زور دیا اور کہا کہ وہ اس میں کامیاب ہوں گے۔ ساتھ ہی ساتھ ان کی پارٹی کے کچھ لوگوں نے ساری مریادائیں طاق پر رکھ دیں اور کسی بھی قیمت پر 30 اکتوبر کو کارسیوا روکنے کی قسم کھائی۔ بدقسمتی سے، یہ جنتادل کے دو وزرائے اعلیٰ، اترپردیش کے ملائم سنگھ یادو اور بہار کے لالو پرساد یادو کے درمیان زیادہ 'سیکولر' دکھائی دینے کی ہوڑ کا نتیجہ تھا۔ بہار کے وزیراعلیٰ نے میری یاترا کو روکنے کا شرف حاصل کر لیا تھا۔ ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی اس دوڑ میں اب باری تھی ملائم سنگھ یادو کی، انھوں نے اعلان کر دیا کہ 'میری سرکار اتنے سخت حفاظتی انتظامات کرے گی کہ 30 ر اکتوبر کو کارسیوا کی بات تو دور، اجودھیا میں پرندہ بھی پر نہیں مار سکے گا۔'

اس دھمکی کے باوجود پورے ملک سے ہزاروں کی تعداد میں کارسیوک کارسیوا کے لئے اجودھیا پہنچنے لگے۔ وشو ہندو پریشد کے جنرل سکریٹری اشوک سنگھل بھی کسی طرح 28 ر اکتوبر کو اجودھیا پہنچ گئے۔ مقررہ دن یعنی 30 ر اکتوبر کو کارسیوا مکمل ہوئی۔ سرکار نے اسے اپنی شکست کے طور پر دیکھا اور پولس اور نیم فوجی جوانوں کو عقیدت مندوں کو اجودھیا کی گلی کوچوں سے منتشر کرنے کے لئے گولی اور آنسو گیس کے گولے چھوڑنے کے احکامات جاری کئے۔ اس نے پورے ملک میں ہندوؤں میں ناراضگی بھر دی اور اجودھیا میں ناراض کارسیوکوں میں اس کا زبردست ردِّعمل ہوا۔ کچھ کارسیوک بابری ڈھانچہ کے گنبدوں پر چڑھ گئے اور ان پر بھگوا پرچم لہرا دیا، جو 6 ر دسمبر 1992 کے واقعہ کی پیشگی اطلاع تھی۔ 2 ر نومبر کا دن مندر تحریک کی طویل تاریخ میں سب سے خونیں دن رہا۔ اسی روز نہتے کارسیوکوں کا ایک گروپ جب رام جنم بھومی کی طرف جا رہا تھا، اس پر ریاستی پولس نے فائرنگ کر دی جس میں تقریباً 50 کارسیوک مارے گئے اور سیکڑوں دیگر زخمی ہو گئے۔

صدر جمہوریہ وینکٹ رمن نے 7 ر نومبر کو وی پی سنگھ سے اکثریت ثابت کرنے کو کہا تھا۔ اس وقت تک جنتادل میں پھوٹ پڑ گئی تھی۔ چندر شیکھر 58 ممبران پارلیمنٹ کو لے کر الگ ہو گئے تھے اور جنتادل (سیکولر) کے نام سے الگ پارٹی بنالی تھی۔ بڑے فرق — 356 کے مقابلے صرف 151 — سے وی پی سنگھ اعتماد کا ووٹ حاصل نہیں کر سکے۔ ان کے استعفیٰ سے مجھے ملے جلے تاثرات کا احساس ہوا۔ میں ان کی سرکار کے گرنے سے خوش نہیں تھا۔ میں اداس تھا، کیونکہ ایک اور غیر کانگریسی متبادل ناکام ہو گیا تھا جس سے کانگریس کو اقتدار میں آنے کا موقع مل گیا۔ حسب توقع راجیو گاندھی نے اپنی ماں کی سیاسی چالاکی سے متاثر ہو کر اس معاملہ کو پھر دہرایا جو 1979 میں اندرا گاندھی نے چرن سنگھ کے معاملے میں کیا تھا کہ کانگریس چندر شیکھر کو نئی سرکار بنانے کے لئے باہر سے حمایت دے گی۔

مرکز میں نئی سرکار کی تشکیل کے بعد میں موقع ملتے ہی سب سے پہلے اجودھیا گیا۔ 19 ر نومبر کو فیض آباد سے اجودھیا کی یاترا آج بھی میرے ذہن پر نقش ہے۔ سڑک کے دونوں طرف قطار بند ہزاروں لوگ فلک شگاف آواز میں نعرے لگا رہے تھے۔ میری گاڑی، جزوی طور پر تیار ایک رتھ، گھونگا کی رفتار سے آگے بڑھ رہی تھی۔ اس دن اپنی تقریر میں میں نے 30 ر اکتوبر کو اجودھیا کے باشندوں کو ملائم سنگھ یادو کی سیکورٹی

فورسیز کے ذریعہ کیے گئے غیر انسانی برتاؤ سے کارسیوکوں کو پناہ دینے کے لئے ان کا شکریہ ادا کیا۔ میں نے متنبہ کیا کہ ہندوستان میں شری رام کے تئیں بے حرمتی کا جذبہ دکھانے والی کوئی بھی ہندو مخالف سرکار بچ نہیں پائے گی۔

چندر شیکھر سرکار صرف 7 ماہ رہی، پھر بھی مجھے یہ حقیقت سامنے رکھنی چاہیے کہ 1992 سے پہلے 4 وزرائے اعظم نے جس طرح سے اجودھیا تنازع کو سلجھانے کی کوشش کی، ان میں چندر شیکھر نے بات چیت کے ذریعہ تنازع کے حل کے لئے سب سے زیادہ ایمانداری اور مستعدی سے کوشش کی۔

مسئلہ کا حل نکالنے کے لئے ان کی سرکار نے وشو ہندو پریشد اور آل انڈیا بابری مسجد ایکشن کمیٹی کی پہلی سرکاری میٹنگ منعقد کی۔ ہندوؤں کی جانب سے یہ واضح کیا گیا کہ جنم بھومی پر رام کے جنم کی بات کروڑوں ہندوؤں کی عقیدت سے جڑی ہوئی ہے، جسے کسی بھی طرح سے چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ بلاشبہ یہ سبھی مذاہب کی بنیادی عقیدت کے بارے میں حقیقت ہے۔ اس طرح بات چیت کا اہم نکتہ یہ تھا کہ کیا متنازع ڈھانچہ ہندو مندر کو گرا کر بنایا گیا تھا؟

بات چیت کے آغاز میں آل انڈیا بابری مسجد ایکشن کمیٹی نے یہ بات رکھی تھی کہ اگر یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ بابری مسجد کی تعمیر کسی مندر کو گرا کر کی گئی ہے تو متنازع ڈھانچہ کو ہٹا لیا جائے گا، لیکن بعد میں اس میں ایک اہم ترمیم کرکے اس طرح پیش کیا گیا— متنازع ڈھانچہ تب ہٹایا جائے گا جب ثبوتوں کے ذریعہ یہ ثابت ہو کہ وہاں رام مندر تھا جسے گرایا گیا ہے۔

دونوں فریقوں کے درمیان ثالث کے طور پر کام کرنے والی سرکار نے اپیل کی کہ دونوں فریق اپنی اپنی بات کی حمایت میں ضروری دستاویزوں کا لین دین کریں۔ دونوں فریقوں کو ایک دوسرے کی دستاویزوں کا مطالعہ کرنے کے بعد اپنا جواب بھی پیش کرنا تھا۔ وشو ہندو پریشد نے آرٹس، تاریخ اور آثار قدیمہ سے جڑے ثبوتوں کے علاوہ ہندو ادبی رسائل، مسلم تاریخی کتابوں، یوروپی تفصیلات، سرکاری اشاعتوں اور ریونیو ریکارڈوں اور آرکائیوز کے سامانوں پر مبنی ڈھیر ساری دستاویزات ثبوت کے طور پر پیش کیے۔

آل انڈیا بابری مسجد ایکشن کمیٹی کی بات کا بنیادی نکتہ تھا— رامائن کی کہانی تصوراتی ہے، تاریخی نہیں۔ 'رامائن' میں جس اجودھیا کا ذکر کیا گیا ہے، وہ آج کی اجودھیا نہیں ہے۔ بابری مسجد کی تعمیر مندر یا کسی دیگر تعمیر کو گرا کر نہیں کی گئی ہے۔ اس مقام پر رام مندر کے ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا اور 1949 میں جب وہاں مورتیاں قائم کی گئیں تب تک بابری مسجد پر مسلمانوں کا مسلسل قبضہ تھا۔

وشو ہندو پریشد اور بابری مسجد ایکشن کمیٹی کے ذریعہ الگ الگ پیش کردہ دستاویزوں کا تجزیہ کرنے والوں میں مشہور صحافی اور مختلف کتابوں کے مصنف ارون شوری بھی شامل تھے۔ بابری مسجد ایکشن کمیٹی کے ذریعہ پیش کردہ ثبوتوں کے بارے میں شوری نے لکھا—

> ''آل انڈیا بابری مسجد ایکشن کمیٹی نے جو دستاویزات پیش کی تھیں، انھیں دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ کاغذوں کے ڈھیر کے سوائے وہ اور کچھ نہیں تھا...اس میں سے ڈھیر ساری چیزیں تو ایسی تھیں جو کسی سنکی کے ذریعہ تحریر کردہ کتاب سے لیے گئے صفحات کی شکل میں تھیں، جس میں یہ دکھایا گیا تھا کہ رام دراصل مصر کے ایک فیرو یعنی سمراٹ تھے۔ اس میں ایک مضمون تھا— جیسا کہ وہ خود کہتے ہیں— سری لنکا کی کسی رقاصہ سے موصولہ جانکاری پر مبنی تھی اور جو اسی ملک کے ایک چھوٹے سے ضلع کے ایک چھوٹے سے حصہ تک محدود تھی، جس میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی تھی کہ سیتا رام کی بہن تھیں، جن کے ساتھ انھوں نے شادی کی، وغیرہ۔

اس میں ایک ایک دستاویز ایسی تھی جو آل انڈیا بابری مسجد ایکشن کمیٹی کی بجائے وشو ہندو پریشد کے موقف کو مضبوط کرنے والی تھی۔ اس

میں یہ دکھایا گیا ہے کہ مسجد 1936 سے استعمال میں نہیں ہے۔ ان میں مسلمانوں کے الگ الگ فرقوں کو جائیداد کے لئے ایک دوسرے کے ساتھ لڑتے دکھایا گیا ہے۔ ان میں دکھایا گیا ہے کہ مسلمانوں کے ذریعہ انتہائی پاک مانے جانے والے اس مقام کو حاصل کرنے کے لئے ہندوؤں نے لگاتار لڑائی لڑی۔ ان میں دکھایا گیا ہے کہ اس کے اوپر مسجد بن جانے کے بعد بھی ہندو اس کی پوجا کرتے رہے۔ جب ہندوؤں کو اصل مقام پر پوجا کرنے سے روک دیا گیا تو وہ اس کے آس پاس مندر وڈھانچہ تیار کرنے لگے۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ آل انڈیا بابری مسجد ایکشن کمیٹی کے ذریعہ پیش کردہ دستاویزوں کے مطابق متنازع ڈھانچہ کا نام نہ تو شیعہ وقف بورڈ میں فہرست زدہ ہے اور نہ ہی سنی وقف بورڈ کی فہرست میں اس کا نام ہے، جبکہ وقف کی سبھی جائیداد کے لئے ضابطہ کے مطابق یہ ضروری ہے۔''

وشو ہندو پریشد نے جو ثبوت پیش کیے تھے، ان کے بارے میں شوری کا کہنا تھا—

''اس کے بالکل برخلاف، وشو ہندو پریشد کی دستاویزات اہم نکتہ سے جڑی اور باجواز تھیں۔ ان میں اسلامی تاریخ دانوں کے ذریعہ دی گئیں واضح تفصیلات موجود ہیں— اورنگ زیب کی پوتی کی تفصیلات سے، جن میں یہ دکھایا گیا ہے کہ رام مندر کو گرا کر اس کے مقام پر مسجد بنائی گئی تھی۔ ان میں یوروپی سیاحوں اور برطانوی دور کی سرکاری اشاعتیں شامل ہیں۔ 1854، 1877، 1881، 1892 اور 1905 کے گزیٹیڈ، 1880 کی سیٹلمنٹ (نوآبادیات) رپورٹ، 1838 کی سروے رپورٹ، 1891 اور 1934 کی آثار قدیمہ کی سروے رپورٹیں— سب میں مسلم تاریخ دانوں کی باتوں کی ہی تصدیق ہوتی ہے— کہ مندر کو تباہ کر کے مسجد بنائی گئی تھی، کہ مندر کے کچھ حصے، یعنی ستون، مسجد میں اب بھی موجود ہیں، کہ ہندو اس مقام کو عقیدت کی نگاہ سے دیکھتے آرہے ہیں اور اسے واپس حاصل کرنے کے لئے لگاتار جدوجہد کر رہے ہیں۔

''ان میں سو سے بھی زیادہ برسوں کے ریونیو ریکارڈ ہیں، جنہیں (متنازع) مقام 'جنم استھان' کے طور پر فہرست میں شامل کیا گیا ہے اور اسے مہنتوں کی جائیداد دکھایا گیا ہے... سب سے اہم بات یہ کہ ان میں آثار قدیمہ کی کھدائی کی تفصیلات ہیں، جو 1975 سے 1980 تک کی مدت میں کی گئی تھی۔ سب کچھ واضح ہے— ستون کی بنیاد، ستون، دروازوں کا جوڑ، الگ الگ پرتوں کا وقت، بنیادوں وستونوں کا اختلاط اور پتھر جن سے یہ ستون بنے ہیں... — سب کچھ ایک دوسرے سے میل کھاتا ہے اور یہ سب کچھ اس مسئلہ کا واضح اور مثبت حل پیش کرتا ہے جو سرکار اور دونوں فریقوں (ہندو اور مسلم) کی بحث کا موضوع ہے۔''

اجودھیا پر موجود مسلم ادبی رسائل کو دبائے جانے یا مٹائے جانے کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ مثلاً ارون شوری نے مولانا حاکم سعید عبدالحئ (وفات: 1923) کے ذریعہ بھارت پر تحریر کردہ عربی زبان کی ایک کتاب کا حوالہ دیا ہے۔ واضح رہے کہ عبدالحئ مشہور اسلامک اکادمی ندوۃ العلماء (لکھنؤ) کے بانی رہے تھے۔ ادارہ کے ذریعہ اس کتاب کا اردو ترجمہ کرا کے 1973 میں اشاعت کی گئی تھی۔ 1977 میں اس کا انگریزی ترجمہ شائع ہوا۔ کتاب کا پیش لفظ مصنف کے بیٹے مولانا ابوالحسن علی ندوی، جنہیں 'علی میاں' کے نام سے جانا جاتا ہے، نے لکھا ہے۔ واضح رہے کہ ندوی 1961 سے 1999 تک اس ادارہ کے سرپرست رہے ہیں۔ وہ مسلم پرسنل لا بورڈ کے چیئرمین بھی رہے۔

شوری نے لکھا ہے— '(کتاب کے) اردو ترجمہ میں 17 صفحات پر مشتمل ایک باب ہے— 'ہندوستان کی مسجدیں'۔ مصنف نے لکھا ہے کہ کس طرح 7 مسجدوں کو ہندو مندروں کے مقام پر بنایا گیا تھا، خواہ اس کا ڈیزائن دوبارہ تیار کر کے اور خواہ انھیں گرا کر (انہی پتھروں سے) نئی تعمیر کر کے۔ ایسی ہی ایک مسجد ہے، اجودھیا کی بابری مسجد۔ انگریزی ترجمہ کے مطابق اس مسجد کی تعمیر اجودھیا میں بابر کے ذریعہ کرائی

گئی تھی۔ اجودھیا میں ہندو رام چندر جی کا جنم استھان مانتے ہیں۔ رام چندر جی کی اہلیہ سیتا کے بارے میں ایک کہانی مشہور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں سیتا نے ایک مندر بنوایا تھا، جس میں رہتے ہوئے وہ اپنے شوہر کے لئے کھانا بناتی تھیں۔ اسی مقام پر بابر نے ہجری سنہ 963 میں اپنے نام سے مسجد بنوائی....'

اس طرح واضح ہو جاتا ہے کہ اگر ثبوت اور جوابی ثبوت کی بنیاد پر مسئلے کا حل نکالا جاتا تو ہندوؤں کے حق کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا تھا۔

حصہ - 3

خوشی اور افسوس

فیصلہ کن دن کی جانب سفر

جولائی 1991 کے ریاستی اسمبلی انتخابات میں بی جے پی کی جیت اجودھیا تحریک کی تاریخ میں میل کا پتھر ثابت ہوئی۔ رام جنم بھومی معاملے پر انتخابات سے پہلے ہی زوردار مثبت ردعمل آ رہے تھے، جو ذات اور طبقہ کی سرحدوں سے اوپر تھے۔ اس کے بعد ملائم سنگھ یادو کی سرکار نے کارسیوکوں پر گولیاں چلوا کر اتر پردیش ہی نہیں بلکہ پورے ملک کے ہندوؤں میں ناراضگی کی لہر پیدا کر دی۔ پارٹی کے بے لوث اور مقبول عوامی رہنما کلیان سنگھ ریاست کے نئے وزیر اعلیٰ بنے۔ ان کی سرکار نے اجودھیا مسئلے کو حل کرنے کے لئے نئے اقدام کیے۔

اس کے تحت متنازع ڈھانچے پر غیر متنازعہ فیصلے کی جگہ پر مندر تعمیر شروع کرنے کے فیصلے سے الگ کرنے پر زور دیا گیا۔ بعد میں اتر پردیش سرکار نے اکتوبر 1991 میں اراضی ایکوائرمنٹ ایکٹ کے تحت ایک نوٹیفکیشن کے ذریعہ متنازع ڈھانچہ کے برابر 2.77 ایکڑ اراضی لے لی۔ واضح رہے کہ اس 2.77 ایکڑ اراضی میں سے 2.04 ایکڑ اراضی وشو ہندو پریشد سے حاصل کی گئی تھی۔ وشو ہندو پریشد نے یہ اراضی سابق زمین مالک سے خرید کر یا تحفہ میں حاصل کی تھی، لہٰذا ایکوائرڈ زمین کے 80 فیصد حصہ پر مالکانہ حق کے سلسلے میں کوئی تنازع نہیں تھا۔ اہم بات یہ ہے کہ 2.77 ایکڑ پر مشتمل زمین کے اسی ٹکڑے کے سلسلے میں یہ اعلان کر کے — کہ اس اراضی پر کوئی تنازع نہیں ہے — مرکز میں راجیو گاندھی سرکار نے 1989 میں شیلانیاس کی اجازت دی تھی۔

بدقسمتی سے کلیان سنگھ سرکار کی اس کوشش کو بھی آل انڈیا بابری مسجد ایکشن کمیٹی کے ذریعہ روکنے کی کوشش کی گئی۔ ایکوائرمنٹ کو ہائی کورٹ میں چیلنج کیا گیا۔ ہائی کورٹ نے حکم جاری کر کے سرکار کو نوٹیفائڈ اراضی پر قبضہ کرنے کی اجازت دے دی، لیکن ساتھ ہی اس نے ہدایت بھی دی کہ وہاں کوئی مستقل ڈھانچہ نہ کھڑا کیا جائے۔

ادھر مرکز میں چندر شیکھر کی سرکار مارچ 1991 میں گر گئی تھی۔ کانگریس، جو اسے باہر سے حمایت دے رہی تھی، نے یہ الزام مضحکہ خیز طریقے سے لگاتے ہوئے اپنی حمایت واپس لے لی کہ پولس کے کچھ سپاہیوں کو راجیو گاندھی کی رہائش گاہ پر 'جاسوسی' کرتے دیکھا گیا۔ بعد کے پارلیمانی الیکشن میں کانگریس کو اکثریت نہیں مل پائی۔ اسے صرف 232 سیٹیں ہی ملیں اور — جیسا کہ انتخابی نتائج کے جائزہ سے لگ رہا تھا —

یہ 232 سیٹیں بھی انتخابی عمل کے دوران راجیو گاندھی کے قتل کے سبب کانگریس پارٹی کے لئے پیدا ہونے والی عام ہمدردی کے سبب ہی ملی تھیں۔

ادھر بی جے پی نے گزشتہ الیکشن (86 سیٹیں) کے مقابلے اس بار زیادہ سیٹیں (119 سیٹیں) حاصل کر کے اپنی پوزیشن اور مضبوط کر لی تھی، لیکن سب سے بڑی پارٹی کے طور پر ابھرنے کے سبب کانگریس کو سرکار بنانے کا موقع ملا اور پی وی نرسمہاراؤ کی قیادت میں نئی سرکار بنی۔ سچ کہوں تو مجھے نئے وزیراعظم سے بہت امیدیں تھیں۔ نرسمہاراؤ تجربہ کار اور نرم گفتار سیاسی رہنما تھے۔ بالکل نچلی سطح سے اٹھ کر وہ اس سطح تک پہنچے تھے۔ ان کے پاس سیاسی و انتظامی تجربہ تھا۔ شروع میں ہی انھوں نے یہ اشارہ دے دیا کہ وہ عام اتفاق رائے قائم کر کے چلنے میں یقین رکھتے ہیں، اس کے لئے ضروری تھا کہ سرکار اپوزیشن کو آپسی اعتماد و احترام پر مبنی بات چیت کا عمل شروع کرنے کے لئے مدعو کرے۔

دراصل مرکز میں اس سے پہلے کی کانگریسی سرکاروں کے گھمنڈی مزاج کی ہوا سے وہ آزاد تھے اور ایسا شاید اس لئے تھا کہ وہ نہرو خاندان کے نہیں تھے۔ ان سے میں اتنا متاثر ہوا کہ میں نے عوامی طور پر کہہ دیا کہ 'لال بہادر شاستری کے بعد ہونے والے وزرائے اعظم میں نرسمہاراؤ سب سے اچھے وزیراعظم ہیں۔' درحقیقت راؤ نے بعد میں اپنے کام کاج کے طریقے سے یہ بات غلط ثابت کر دی۔

رام جنم بھومی تحریک کے رہنماؤں کو بھی راؤ سے بڑی امیدیں تھیں۔ ان کی ان امیدوں کے پیچھے دو اسباب تھے — پہلا، راؤ کو بھارت کی تاریخ کی اچھی جانکاری تھی۔ کئی ہندوستانی اور غیرملکی زبانوں کے اچھے جانکار ہونے کے ساتھ ساتھ وہ پنڈت نہرو کے بعد ملک کے سب سے دانشور وزیراعظم تھے اور پھر سوامی رامانند کی ترغیب سے حیدرآباد میں نظام کے خلاف جدوجہد میں شامل ہو کر تحریک آزادی میں حصہ لینے والے ایک مجاہد آزادی کے طور پر وہ مذہب کی اندھی تقلید کرنے والے مسلم حکمرانوں کے تحت ہندوؤں کی خستہ حالی سے بخوبی واقف تھے۔ دوسرا سبب، رام جنم بھومی معاملے میں وہ ہندو فرقہ کی جدوجہد کے پورے پس منظر سے واقف تھے، کیونکہ 1987 میں وزیراعظم راجیو گاندھی نے انھیں اجودھیا معاملے پر سرکار کو مشورہ دینے کے لئے تشکیل شدہ وزراء کے ایک خصوصی گروپ کا سربراہ مقرر کیا تھا۔

ہندو مذہبی رہنماؤں کے ساتھ اپنی ذاتی میٹنگوں میں راؤ نے یقین دلایا تھا کہ وہ اجودھیا مسئلہ کا حل نکالنے کے لئے چندر شیکھر کے ذریعہ شروع کی گئی کوششوں کو آگے بڑھائیں گے، یعنی مندر تحریک کے رہنماؤں اور آل انڈیا بابری مسجد ایکشن کمیٹی کے درمیان سرکار کی ثالثی سے بات چیت دوبارہ شروع کی جائے گی، لیکن راؤ نے اس سمت میں کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ سرکار کی خاموشی توڑنے کے لئے 4/اپریل 1991 کو نئی دہلی کے بوٹ کلب میں عظیم الشان ہندو کانفرنس منعقد کی گئی۔ راجدھانی میں منعقد اب تک کی یہ ممکنہ طور پر سب سے بڑی ریلی تھی۔ اصل کارسیوا 9/جولائی کو شروع ہوئی جو 17 دنوں تک چلتی رہی۔ اس دوران اجودھیا یا ملک کے کسی بھی مقام پر کوئی ناخوشگوار واقعہ رونما نہیں ہوا۔

اب وزیراعظم نے سنتوں کو بات چیت کے لئے دہلی بلایا۔ بات چیت میں انھوں نے سنتوں کو یقین دلایا کہ وہ 4 ماہ کے اندر مسئلہ کا حل نکال لیں گے۔ انھوں نے سنتوں سے اپیل کی کہ وہ کارسیوا روک دیں۔ وزیراعظم نے واجپئی اور مجھ سے بھی بات کی اور مندر تحریک کے رہنماؤں کو کارسیوا روکنے کے لئے دست بستہ درخواست کی۔ سنتوں نے اس یقین دہانی پر مثبت ردعمل ظاہر کرتے ہوئے کارسیوا روک دی۔

لیکن اس بار بھی کچھ نہیں ہوا۔ اس دوران بھیروں سنگھ شیخاوت اور شرد پوار نے مداخلت کر کے وشو ہندو پریشد اور آل انڈیا بابری مسجد ایکشن کمیٹی کے درمیان بات چیت دوبارہ شروع کرانے کی کوشش کی۔ بات چیت کے لئے ایک میٹنگ بھی ہوئی لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا، لہٰذا مندر تحریک کے رہنماؤں نے نومبر میں کارسیوا دوبارہ شروع کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

اس کے بعد حالات تیزی سے بدلے۔ اتر پردیش سرکار کی اس یقین دہانی پر — کہ کارسیوا صرف رسمی یا علامتی ہی ہوگی — 28/نومبر کو

سپریم کورٹ نے کارسیوا کی اجازت دے دی۔ دھرم سنسد نے 6 ردسمبر سے 10 ردسمبر تک کارسیوا کرانے کا فیصلہ لیا۔ چونکہ متنازع ڈھانچہ کے بغل میں 2.77 ایکڑ اراضی پر اتر پردیش سرکار کے قبضہ کی قانونی حیثیت کے معاملے پر الہ آباد ہائی کورٹ کی لکھنؤ بنچ کا فیصلہ بھی آنے والا تھا، لہٰذا دھرم سنسد نے اس کے فوراً بعد ہی مندر کی تعمیر کا کام شروع کرنے کا فیصلہ لیا۔

الہ آباد ہائی کورٹ کے فیصلے کا اتنی بے صبری سے انتظار کیوں کیا جا رہا تھا؟ کیونکہ اس کے فیصلے سے مندر تعمیر کا کام جاری رکھنے کا راستہ تیار ہو جانے والا تھا، خواہ عدالت کا فیصلہ اتر پردیش سرکار کے فیصلے کے خلاف جاتا یا پھر اس کے حق میں جاتا۔ اگر ایکوائرمنٹ کو جائز ٹھہرا دیا جائے تو ریاستی سرکار کو پوری 2.77 ایکڑ اراضی رام جنم بھومی نیاس کو سونپنے کا اختیار مل جاتا اور اگر ایکوائرمنٹ کو ناجائز ٹھہرایا جاتا تو بھی ریاستی سرکار کل 2.77 ایکڑ ایکوائر شدہ اراضی میں سے 2.04 ایکڑ اراضی نیاس کو دے سکتا تھا، کیونکہ اس پر نیاس کا ہی مالکانہ حق تھا۔ اس طرح اس صورت حال میں رام جنم بھومی نیاس اپنی خود کی اراضی پر مندر کی تعمیر کا کام جاری رکھنے کے لئے قانونی طور پر آزاد ہو جاتا۔

نرسمہا راؤ کے وزراء کے ساتھ ناکام بات چیت

کمل ناتھ اور پی آر کمار منگلم کا کردار

ان دنوں راؤ کی کابینہ کے دو وزراء کمل ناتھ اور پی آر کمار منگلم اجودھیا معاملے پر بات چیت کرنے کے لئے مجھ سے مستقل طور پر ملا کرتے تھے۔ مدھیہ پردیش کے کمل ناتھ کانگریس پارٹی کے ایک سینئر رہنما ہیں اور کانگریس کی مختلف کابینہ میں وہ وزیر کے عہدے پر رہ چکے ہیں۔ فی الحال وہ ڈاکٹر منموہن سنگھ کی کابینہ میں مرکزی وزیر برائے کامرس ہیں۔ پی آر کمار منگلم معروف کمیونسٹ رہنما موہن کمار منگلم (جو 70 کی دہائی کے اوائل میں اندرا گاندھی کے 'بائیں بازو' دور کے دوران ان کی سرکار میں شامل ہوئے تھے) کے لڑکے تھے اور راجیو گاندھی کے خاص معتمد میں سے تھے۔ بعد میں وہ بی جے پی میں شامل ہو گئے اور واجپئی کابینہ میں 1999 میں اپنی اچانک موت تک وزیر کے عہدے پر رہے۔

میرے ساتھ کمل ناتھ کی میٹنگوں کا سلسلہ جولائی 1992 میں شروع ہوا اور اکتوبر کے دوسرے ہفتہ میں ختم ہو گیا۔ پہلی یا دوسری میٹنگ کے بعد میں نے اپنی بات چیت کے بارے میں وزیر اعظم کو بتایا اور ان سے پوچھا کہ کیا کمل ناتھ ان کی منظوری سے میرے ساتھ بات چیت کر رہے ہیں؟ وزیر اعظم کا جواب 'ہاں' میں تھا۔ ستمبر میں کسی بات چیت کے دوران میں نے کمل ناتھ سے کہا کہ مرکزی سرکار کو الہ آباد ہائی کورٹ میں زیر سماعت اراضی کے ایکوائرمنٹ سے متعلق معاملے میں تیزی لانی چاہیے۔ میں نے انھیں سمجھایا کہ کس طرح اتر پردیش سرکار کے 2.77 ایکڑ اراضی کے ایکوائرمنٹ کے خلاف فیصلہ آنے پر بھی اصل متنازع ڈھانچہ کو پہلے کی حالت میں رکھتے ہوئے مندر کی تعمیر کا کام شروع کیا جا سکتا ہے۔

کمل ناتھ نے کہا کہ معاملے کے تئیں آپ کی سوچ ٹھیک نہیں ہے۔ اگلے روز انھوں نے مجھے بتایا کہ مرکزی سرکار کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ عدالت سے اپنے فیصلوں میں تیزی لانے کے لئے درخواست کرے۔ مزیدار بات یہ ہے کہ دو یا تین دن بعد ہی، اکتوبر کے دوسرے ہفتے میں، وہ پھر میرے پاس آئے اور کہنے لگے 'مان لیجیے، مرکزی سرکار مندر بنانے کے لئے اراضی حاصل کرے اور اسے رام جنم بھومی نیاس کو اس شرط پر دے دے کہ جب تک عدالتی فیصلہ نہیں آ جاتا تب تک ڈھانچے کے ساتھ کوئی چھیڑ چھاڑ نہیں کی جائے گی، تو کیا یہ قابل قبول ہوگا؟' انھوں نے مزید کہا کہ اصل ڈھانچے سے جڑا تنازع بعد میں عدالت کے فیصلہ کے ذریعہ یا ہندو مسلم فرقہ کے درمیان آپسی مفاہمت کے ذریعہ حل کیا جا سکتا ہے۔

لمحہ بھر کے لئے بھی ہچکچائے بغیر میں نے کہہ دیا کہ یہ تجویز قابل قبول ہے۔ میں نے اپنی جانب سے صرف ایک بات کہی 'اصل تنازع

کے حل کے عمل کو 'عدالتی فیصلہ' نہ کہہ کر 'مناسب قانونی عمل' کہا جائے۔' میں نے واضح کرتے ہوئے کہا کہ 'مناسب قانونی عمل سے تنازع کے قانونی حل کا راستہ بھی ہموار ہو جائے گا۔' کمل ناتھ کو بھی میرا یہ مشورہ پسند آیا۔

ایک یا دو دن میں ہی وزیر اعظم نرسمہا راؤ نے سنگھ کے سینئر رہنما نانا جی دیشمکھ کو بات چیت کے لئے دعوت دی۔ جب نانا جی نے ان سے کمل ناتھ کی تجویز کے بارے میں کہا تو ان کا جواب تھا 'ایسی کوئی تجویز نہیں ہے۔' جب میں نے کمل ناتھ سے مل کر ان سے کہا کہ وزیر اعظم نے تجویز کو مسترد کر دیا ہے تو وہ کہنے لگے 'وزیر اعظم شاید اس تجویز کو ترپ کے پتے کی طرح استعمال کرنا چاہتے ہیں، اس لئے وقت سے پہلے اس کے انکشاف سے وہ پریشان ہو گئے ہیں۔'

سچ، میں تو وزیر اعظم کے رویے سے بالکل حیرت زدہ تھا۔ کچھ دن بعد کمار منگلم سے مجھے پتہ چلا کہ راؤ نے کمل ناتھ کو اجودھیا معاملے پر کچھ کرنے کا اختیار ہی نہیں دیا ہے۔ اس سے کمل ناتھ کی وہ بات غلط ثابت ہو گئی، جس میں انھوں نے کہا تھا کہ وہ وزیر اعظم کی جانب سے مجھ سے ملنے آتے ہیں۔ یہ سچ تھا، ہر میٹنگ یا بات چیت کے بعد وہ وزیر اعظم کے پاس واپس جاتے تھے اور اگلے دن اس پر ان کے ردّعمل کی بات بتاتے تھے۔ ایسے میں شک کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی کہ انھیں وزیر اعظم کے ذریعہ اختیار نہیں دیا گیا ہے۔ جب کمل ناتھ میرے ساتھ بات چیت کر رہے تھے تب کمار منگلم نے اسی تجویز کی بات شیخاوت کو بھی بتا دی تھی۔ شیخاوت کو بھی مسئلہ کا یہ اچھا حل لگا تھا۔

ان سب باتوں سے واضح تھا کہ اجودھیا مسئلہ پر اپنی سرکار کے نقطہ نظر کے سلسلے میں وزیر اعظم آزادانہ طور پر اپنے مطابق کام نہیں کر رہے تھے۔ ان کی پارٹی اور سرکار میں چکر ہی چکر تھے۔ اس بات کے ثبوت ملتے جا رہے تھے کہ جب بھی وزیر اعظم کوئی تعمیری یا مثبت قدم اٹھاتے تھے، ان کی کابینہ کے معاونین ہی یہ الزام لگا کر انھیں روک دیتے تھے کہ 'وہ بھگوا ایجنڈے کو بڑھاوا دے رہے ہیں۔''

تاخیر سے انصاف، نہ ملنے کے برابر

6 دسمبر کو کیسے ٹالا جا سکتا تھا

'تاخیر سے ملنے والا انصاف، انصاف نہ ملنے کی طرح ہے۔' اس حقیقت پر مبنی کہاوت کو اگر وضاحت کی ضرورت ہے تو وہ الٰہ آباد ہائی کورٹ کے اس عدالتی عمل سے پوری ہو جاتی ہے جس میں وہ متنازع ڈھانچے کے پاس 2.77 ایکڑ اراضی پر اتر پردیش سرکار کے ایکوائرمنٹ سے متعلق معاملے پر اپنے فیصلے کو مسلسل ٹالتی رہی۔ میں پہلے واضح کر چکا ہوں کہ متنازع ڈھانچے کی پوزیشن کو مندر کی تعمیر کے کام کے آغاز کے معاملے سے الگ کر کے رکھنے کا کلیان سنگھ سرکار کا فیصلہ بذات خود عملی اور تنازع سے پاک تھا۔ متنازع ڈھانچہ کے پاس کی 2.77 ایکڑ اراضی پر اس کے ایکوائرمنٹ سے یہ کام آسان ہو جاتا۔ الٰہ آباد ہائی کورٹ اس ایکوائرمنٹ کے معاملے پر دسمبر 1991 میں فیصلہ سنانے والا تھا، لیکن کچھ مسلمانوں نے اسے ہائی کورٹ میں چیلنج کرایا۔ ویسے ہائی کورٹ خواہ جو بھی فیصلہ کرتا، مندر کی تعمیر کا کام شروع کیا جا سکتا تھا، خواہ وہ پوری 2.77 ایکڑ اراضی پر ہوتا یا پھر 2.04 ایکڑ اراضی پر، جو بنیادی طور پر مندر نیاس کی ہی تھی۔

سپریم کورٹ نے بھی توقع کی تھی کہ ایکوائرمنٹ کے معاملے سے متعلق عرضی پر ہائی کورٹ دسمبر 1991 تک اپنا حتمی فیصلہ دے دے گا، لیکن بدقسمتی ہی کہی جائے گی کہ ہائی کورٹ نے مئی 1992 تک عرضی پر سماعت بھی شروع نہیں کی تھی۔ اگست میں سپریم کورٹ نے کہا 'یہ بھی ضروری ہے کہ ہائی کورٹ اس معاملے کو بہت تیزی سے نمٹائے۔' لیکن اس کے باوجود پراسرار اور غیر ضروری طور پر سماعت ٹلتی رہی جبکہ معاملے کی

سماعت کے لئے ایک خصوصی بنچ تشکیل دی گئی تھی۔

خوش قسمتی سے 30 اکتوبر 1992 کو جس وقت دھرم سنسد نے 6 دسمبر سے کارسیوا شروع کرنے کے اپنے فیصلے کا اعلان کیا، اس وقت تک ایکوائرمنٹ سے متعلق معاملے پر دائر عرضی پر سماعت ختم ہو چکی تھی۔ درحقیقت 4 نومبر کو حتمی طور پر سماعت کر کے عدالت نے فیصلہ اپنے پاس محفوظ کر لیا تھا۔ 25 نومبر کو سپریم کورٹ نے ایک بار پھر معاملے پر 'جلد از جلد فیصلہ کئے جانے کی ضرورت' دہرائی۔

مندر تحریک کے رہنماؤں کو توقع تھی کہ فیصلہ نومبر میں یا پھر دسمبر کے آخری ہفتہ میں سنایا جائے گا۔ مندر تحریک کے رہنما اور بی جے پی بھی الہ آباد ہائی کورٹ کے فیصلہ کا اتنی بے صبری سے انتظار کیوں کر رہی تھی؟ اس کے پیچھے میں دو اسباب گنوا سکتا ہوں۔ پہلا، فیصلہ آ جانے کے بعد تعمیراتی کام پر امتناع سے متعلق عدالتی احکام خود بخود ہی بے اثر ہو جاتا اور اس طرح کارسیوا اور تعمیراتی کام دونوں ہی کسی مشکل کے بغیر پورے کیے جا سکتے تھے، اور یہ پوری طرح سے قانونی ہوتا۔

دوسرا سبب، کارسیوکوں کے اپنے کام میں مصروف ہو جانے کے بعد متنازع ڈھانچہ کے تحفظ اور سیکورٹی کا مسئلہ ختم ہو جاتا، اس لئے مندر تحریک کے رہنما 2.77 ایکڑ اراضی پر اتر پردیش سرکار کے اس فیصلے کی پوری طرح حمایت کر رہے تھے جس میں اس نے متنازع ڈھانچہ کی پوزیشن کو کارسیوا اور مندر کی تعمیر کے معاملے سے الگ کر کے رکھنے کی بات کی تھی۔ وہ یہ مان کر چل رہے تھے کہ متنازع ڈھانچے کی پوزیشن کو سلجھانے کی کوشش عدالتی فیصلے، قانونی کارروائی یا ہندو مسلم آپسی مفاہمت کے راستے پر چلتے ہوئے کی جا سکتی ہے۔ میری پارٹی اور مندر تحریک کے رہنماؤں کو بھی پوری توقع تھی کہ اس طرح 6 دسمبر کو شروع ہونے والی کارسیوا کلیان سنگھ کی سرکار کے ذریعہ سپریم کورٹ سے کیے گئے وعدے اور نرسمہا راؤ کی سرکار کے ذریعہ پارلیمنٹ اور نیشنل انٹیگریشن کونسل سے کیے گئے وعدے کے مطابق ہی ہوگی۔

بدقسمتی ہی کہی جائے گی کہ جو فیصلہ 4 نومبر کو ہائی کورٹ کے ذریعہ محفوظ رکھا گیا تھا، اسے کارسیوا والے دن تک بھی نہیں سنایا گیا۔ بالآخر 11 دسمبر کو — یعنی 6 دسمبر کو اجودھیا میں ہونے والے افسوسناک واقعہ کے 5 دن بعد — وہ فیصلہ آیا۔ اتنے چھوٹے سے معاملے پر دائر کی گئی عرضی کا یہ حال تھا تو 1959 اور 1961 میں دائر کئے گئے مقدموں کا تو اور بھی برا حشر ہوا تھا۔ آج بھی وہ مقدمے التوا میں پڑے ہوئے ہیں۔

یہاں میں واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ بی جے پی اور مندر تحریک کے رہنماؤں نے منڈراتے ہوئے خطرے کو ٹالنے کے لئے مرکزی سرکار پر ضروری قدم اٹھانے کی غرض سے دباؤ بنانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ سنگھ کے سرسنچالک پروفیسر راجندر سنگھ (رجو بھیا) اور مورو پنت پنگلے اور بھیروں سنگھ شیخاوت — جو اس وقت راجستھان کے وزیر اعلیٰ تھے — نے 2 نومبر کو ممبئی میں شرد پوار اور کمار منگلم سے ملاقات کی۔ 8 نومبر کو معزز ہندو رہنما سوامی چنمیا نند وزیر اعظم نرسمہا راؤ سے ملے۔ رجو بھیا نے تو وزیر اعظم سے دو بار مل کر بات چیت کی۔ آخری بار 3 دسمبر کو ان کی بات چیت ہوئی تھی۔ 25 نومبر کو مندر تحریک سے جڑے اجودھیا کے انتہائی معزز رہنما سوامی پرم ہنس رام چندر داس بھی راؤ سے ملے۔ اس کے بعد 30 نومبر کو واجپئی اور ناناجی دیشمکھ نے بھی راؤ سے مل کر بات چیت کی۔ ناناجی تو 5 دسمبر کو بھی راؤ سے ملے تھے۔ نومبر ماہ میں دو بار میں خود وزیر اعظم سے مل چکا تھا۔

ان سبھی ملاقاتوں میں ہم نے ایک ہی درخواست کی تھی، اتر پردیش اور مرکز کی، دونوں سرکاریں مل کر سپریم کورٹ یا ہائی کورٹ کے پاس جائیں اور معاملے کو جلد نمٹانے کی درخواست کریں۔ ہم نے یہ بھی درخواست کی کہ وزیر اعظم خود کوشش کریں کہ پورا فیصلہ نہیں تو کم از کم فیصلے کے قابل عمل حصہ کا تو 6 دسمبر سے پہلے آ ہی جائے۔ سچ تو یہ ہے کہ رجو بھیا نے راؤ کو بتا دیا تھا کہ 'اجودھیا میں لاکھوں لوگوں کی بھیڑ جمع ہونے والی

ہے۔ہم نے یہ یقینی بنانے کے لئے وسیع انتظامات کیے ہیں کہ کارسیوا عدالتی احکامات کے دائرے میں ہی ہو،لیکن اگر عدالت کا فیصلہ نہیں آتا ہے اور ایسی کچھ انہونی ہو جائے تو کیا ہوگا؟ میں امید کرتا ہوں کہ ایسا نہیں ہوگا،اس لئے میں سرکار کو مؤدبانہ طریقے سے کہہ رہا ہوں کہ وہ 6 دسمبر سے پہلے عدالتی فیصلہ یقینی بنائے۔'اس پر وزیراعظم کا جواب تھا' مجھے پورا یقین ہے کہ آپ لوگوں کے رہتے کچھ بھی انہونی نہیں ہوگی۔'لیکن انھوں نے یہ یقین نہیں دلایا کہ ان کی سرکار ہائی کورٹ سے جلد فیصلہ دینے کے لئے اپیل کرے گی۔

اس سمت میں آخری کوشش 5 دسمبر کی صبح بی پی سنہل کے ذریعہ کی گئی۔واضح رہے کہ بی پی سنہل ایک سابق سرکاری افسر ہیں،جو بعد میں بی جے پی میں شامل ہوگئے۔انھوں نے نریش چندرا سے بات چیت کی۔معروف آئی اے ایس افسر نریش چندرا کو وزیراعظم کے دفتر میں خصوصی اجودھیا سیل کے سربراہ کے طور پر وزیراعظم کے ذریعہ مقرر کیا گیا تھا۔دونوں ایک عملی منصوبہ پر متفق ہوگئے۔اسی روز دوپہر بعد اتر پردیش سرکار ہائی کورٹ سے درخواست کرے گی کہ وہ کم از کم اپنے فیصلے کے قابل عمل حصہ کو ضرور سنا دے اور مرکزی سرکار کے وکیل اس درخواست کی حمایت کریں گے۔اسی منصوبہ کے مطابق اتر پردیش سرکار نے تو درخواست پیش کردی،لیکن مرکزی سرکار کے وکیل عدالت میں نہیں پہنچے۔نتیجہ یہ ہوا کہ ریاستی سرکار کی درخواست خارج کردی گئی۔

کم از کم اتنا تو ضرور کہا جائے گا کہ جو کچھ ہوا،اس سے مندر تحریک کے رہنماؤں کے من میں وزیراعظم اور ان کی سرکار کی ایمانداری اور ان کے ارادوں کے تئیں شدید شبہ پیدا ہوگیا۔ایسا لگنے لگا کہ اجودھیا تحریک کے رہنماؤں کے سبھی پہلوؤں کو ناکام کرکے راؤ سرکار ایک عوامی دھماکہ کو لازمی بنانا چاہتی تھی۔

بعد میں لبراہن کمیشن نے جب نرسمہا راؤ سے یہ پوچھا کہ انھوں نے ہائی کورٹ سے اتر پردیش سرکار کے اراضی ایکوائرمنٹ سے متعلق معاملے پر جلد فیصلہ دینے کے لئے درخواست کیوں نہیں کی؟ تو ان کا جواب تھا' مرکزی سرکار اگر چاہتی بھی تو ایسی درخواست کیسے کرسکتی تھی،جب الٰہ آباد ہائی کورٹ میں جاری عدالتی کارروائی میں وہ ایک فریق کے طور پر شامل ہی نہیں تھی؟'اس کے بارے میں جان کر میں حیران رہ گیا تھا۔مندر تحریک کے رہنماؤں کے ساتھ کتنی بار ان کی بات چیت ہوئی،لیکن یہ بات انھوں نے کبھی کسی کو بتائی ہی نہیں تھی۔اگر انھوں نے یہ بات ہمیں بتائی ہوتی تو ہم کوئی دوسرا راستہ اپناتے۔

مندر تعمیر کے لئے کارسیوا

ہندو اتحاد کا بے مثال اظہار

میری پارٹی نے جب دیکھا کہ نرسمہا راؤ کی سرکار ہندوؤں کے جذبات کے تئیں بے حس اور مندر کی تعمیر کے خلاف ہوگئی ہے — جبکہ یہ متنازع ڈھانچے سے جڑا ہوا نہیں تھا — تو اس نے مجھے اور ڈاکٹر مرلی منوہر جوشی کو اتر پردیش میں ایک یاترا پر بھیجنے کا فیصلہ لیا۔اس یاترا کا مقصد عام لوگوں کو کانگریس سرکار کے مخالف رویے کے بارے میں آگاہ کرنا اور انھیں اجودھیا میں کارسیوا کے لئے متحد کرنا تھا۔

اسی کے مطابق میں نے وارانسی سے اور ڈاکٹر جوشی نے متھرا سے 3 دسمبر کو اپنی اپنی یاترا شروع کردی۔ہماری یاتراؤں پر عوام کی جانب سے جو مثبت اور حوصلہ افزا ردعمل دیکھا گیا،وہ ہماری توقعات سے کہیں زیادہ تھا۔یاترا کے تیسرے دن تو حالت یہ ہوگئی تھی کہ ہمیں لوگوں کو اجودھیا کی جانب جانے سے روکنا پڑا،کیونکہ تقریباً ایک لاکھ رام بھکت پہلے ہی اجودھیا پہنچ چکے تھے۔مجھے کہنا ہوگا کہ مرکزی سرکار کے عدم

تعاون کے رویے سے لوگوں میں ناراضگی پیدا ہوئی تھی اور اس سے وہ اور بھی زیادہ عزم کے ساتھ اجودھیا جانے کے لئے تیار تھے۔ اس کے ساتھ ہی الٰہ آباد ہائی کورٹ کے ذریعہ فیصلہ دینے میں کی گئی تاخیر سے عوامی ناراضگی میں اور اضافہ ہو گیا تھا۔ اس حالت میں لوگوں کی نظر میں کارسیوا ایک پاک کام ہی نہیں، ایک طرح کی نافرمانی بھی تھی۔

ایک اور بات ہے جس کا خاص طور سے ذکر کیا جانا چاہیے۔ ملک کے ہر کونے سے ہندو اجودھیا کی جانب چلے آ رہے تھے، جن میں ہندو فرقہ کے ہر ایک طبقہ کے افراد شامل تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ درج فہرست ذات، درج فہرست قبائل اور نام نہاد پسماندہ ذات کے لوگوں کی تعداد برہمنوں اور نام نہاد 'اعلیٰ ذات' کے لوگوں کی تعداد سے کہیں زیادہ تھی۔ دور افتادہ جنوب میں کیرل سے لے کر دور افتادہ شمال مشرق میں آسام تک، دور دور سے لوگ اجودھیا پہنچ رہے تھے۔ پنجاب اور ملک کے دیگر حصوں سے سکھ کمیونٹی کے لوگوں کی تعداد بھی کچھ کم نہیں تھی اور یہ سب لوگ خود آ رہے تھے، انھیں بلایا یا لایا نہیں جا رہا تھا، جیسا کہ اکثر سیاسی ریلیوں میں ہوتا ہے۔ اجودھیا پہنچ کر کارسیوا کرنے کی فطری مذہبی خواہش یا از خود خدمت کا جذبہ ان میں واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا تھا۔

جن قصبوں یا گاؤں سے وہ کارسیوک آئے تھے، وہاں ان کی روانگی کے وقت بڑی تعداد میں جمع ہو کر لوگوں نے تقریب کی شکل میں 'جے شری رام' اور 'سوگندھ رام کی کھاتے ہیں، مندر وہیں بنائیں گے' کے نعروں کے ساتھ انھیں وداع کیا تھا۔ راستے میں جہاں سے بھی وہ گزرتے، لوگ ان کی آرتی اتارتے اور انھیں کھانے کے ساتھ ساتھ اپنے آشیرواد اور نیک خواہشات پیش کرتے تھے۔ کارسیوکوں میں خواتین کے مقابلے مرد زیادہ تھے، لیکن کارسیوکوں کو جلوس کے ساتھ اجودھیا کے لئے وداع کرنے اور راستے میں ان کا خیر مقدم کرنے میں خواتین آگے تھیں۔

اس طرح جو بھی کارسیوک اجودھیا آیا تھا، وہ اپنے ساتھ پورے ملک کے ہزاروں لوگوں کی دعائیں اور نیک خواہشات لے کر آیا لگ رہا تھا۔ ایسا منظر ہندوستان میں پہلے کبھی دیکھنے کو نہیں ملا تھا۔ ہندو فرقہ میں اتحاد کی کمی یا پھوٹ کے سلسلے میں جو لوگ ہمیشہ فکر مند رہتے تھے، انھیں یہ بے مثال منظر دیکھ کر دلی خوشی مل رہی تھی اور ان لوگوں کے لئے تو یہ سب کچھ چونکانے اور ششدر کر دینے والا تھا، جو ہندو اتحاد کو ایک خیالی چیز مانتے تھے یا جو یہ مان کر چل رہے تھے کہ اجودھیا میں رام مندر بنانے کے مطالبہ کی حمایت صرف 'اعلیٰ ذات' کے ہندو ہی کرتے ہیں اور ان لوگوں کے لئے بھی جو یہ مانتے اور کہتے آ رہے تھے کہ اجودھیا تحریک 'سنگھ پریوار' کا ایک بناوٹی ناٹک ہے۔

حصہ - 4

6/دسمبر 1992

کیا ہوا — اور کیوں؟

انسانی تاریخ سیدھے راستے پر کم ہی چلتی ہے۔ عوامی تحریکیں، جو اکثر تاریخی تبدیلی کے لئے انجن کی طرح کام کرتی ہیں، رہنماؤں کے ذریعہ پہلے سے تیار کردہ اسکرپٹ کے مطابق شاید ہی کبھی سامنے آتی ہیں۔ کئی بار واقعات یا حالات پوری طرح سے غیر معمولی موڑ لے لیتے ہیں اور نتیجہ کے طور پر انہونی ہو جاتی ہے۔ اکثر جو ہمیں چوٹ کے طور پر دکھائی دیتی ہے، اس کے اندر ہی ہمیں لگتا ہے کہ تحریک نے ایسا کچھ کر ڈالا ہے

جسے پلٹا یا بدلا نہیں جاسکتا۔ اور جو تحریک کے رہنماؤں اور اس کے حامیوں کے لئے متوقع یا مطلوبہ نہیں تھا۔

6 دسمبر 1992 کو اجودھیا میں جو کچھ ہوا، وہ تاریخی تبدیلیوں کے واقعات کے اسی غیر معمولی زمرے کے تحت آتا ہے۔ ایک متنازع مسجد کا ڈھانچہ، جو چار سو برسوں سے ایک مقدس ہندو شہر کے قلب پر کھڑا تھا۔ ایک ایسا ڈھانچہ جسے ہندوؤں کی عقیدت کے مطابق بھگوان شری رام کی جائے پیدائش پر بنایا گیا تھا۔ ایک ایسا ڈھانچہ، جو اپنے مقام پر کھڑا ہمیں اور مذہبی اندھی تقلید کی یاد دلاتا تھا، جس کی اراضی کو واپس حاصل کرنے کے لئے ہندوؤں نے ایک طویل لڑائی لڑی تھی، وہ ایک بھیانک عوامی ناراضگی کی آگ میں جھلس کر ختم ہو گیا۔

5 دسمبر کو لکھنؤ میں اپنے آخری عوامی جلسہ کو خطاب کرنے کے بعد میں تقریباً آدھی رات کے وقت اجودھیا پہنچا۔ رات کا باقی حصہ میں نے جانکی محل میں گزارا۔ جب بھی میں اجودھیا آتا تھا، اکثر جانکی محل میں ہی ٹھہرتا تھا۔ اگلے روز صبح مجھے اس مقام پر لے جایا گیا، جہاں سرجو ندی کے ساحل سے لی گئی مٹھی بھر ریت سے علامتی کارسیوا ہونی تھی۔ وہاں سے پھر مجھے مندر تحریک کے دیگر رہنماؤں کے ساتھ منچ پر لے جایا گیا، جو رام کتھا کنج کی چھت کے اوپر بنایا گیا تھا۔ دس یا ساڑھے دس کے قریب — منچ پر رہنماؤں کی تقریر شروع ہونے سے پہلے ہی — کسی نے آکر ہمیں بتایا کہ کارسیوکوں کا ایک چھوٹا سا گروپ متنازع ڈھانچہ کے ایک گنبد پر چڑھ گیا ہے۔ رام کتھا کنج کی چھت کے اوپر سے وہ گنبد دکھائی دے رہا تھا۔ اس طرح میں نے خود اپنی آنکھوں سے سارا منظر دیکھ کر اس اطلاع کی تصدیق کر لی۔

رہنماؤں نے فوراً لاؤڈ اسپیکر کے توسط سے اپیل کرنی شروع کی کہ گنبد کی چھت پر چڑھے کارسیوک نیچے اتر آئیں، لیکن اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوا، بلکہ اوپر چڑھنے والے کارسیوکوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ تبھی میں نے دیکھا کہ ان کے ہاتھ میں کچھ اوزار بھی تھے، جن سے وہ گنبد پر چوٹ مار رہے تھے۔ میرے ساتھ ساتھ منچ پر موجود دیگر رہنما بھی یہ سب دیکھ کر حیران تھے۔ سبھی کو احساس ہوا کہ کچھ غلط ہو رہا ہے۔ وہاں موجود سبھی رہنما مسلسل اپیل کر رہے تھے کہ کارسیوک فوراً نیچے اتر آئیں اور منتظمین کے ذریعہ طے کردہ ضوابط (ڈسپلن) پر عمل کریں۔ میرا دل بہت دکھی ہو گیا تھا۔ کسی طرح میں بول پا رہا تھا۔ سنگھ کے سینئر عہدیدار ایچ وی شیشادری بھی وہاں موجود تھے۔ وہ کئی زبانیں جانتے تھے اور سبھی زبانوں میں انھوں نے کارسیوکوں سے نیچے اترنے کے لئے اپیل کی، کیونکہ کچھ پتہ نہیں تھا کہ وہ لوگ کون تھے اور کہاں سے آئے تھے، جنھوں نے اس طرح قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ تحریک کی ایک معزز رہنما راج ماتا وجے راجے سندھیا نے انتہائی جذباتی انداز میں اپیل کی 'میں تمہاری ماں کی طرح تم سے یہ سب نہ کرنے کی درخواست کر رہی ہوں۔' ان اپیلوں اور درخواستوں سے یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ جو کچھ ہو رہا تھا، وہ تحریک کے مقصد اور اصولوں کے برخلاف تھا۔

لیکن ان اپیلوں کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ تب میں نے اوما بھارتی — جنھیں سنیاسن کے طور پر دیکھا جاتا ہے — سے کہا کہ وہ خود وہاں جائیں اور اوپر چڑھے کارسیوکوں سے نیچے آنے کے لئے درخواست کریں۔ وہ گئیں اور تقریباً 45 منٹ بعد واپس آکر انھوں نے بتایا کہ کچھ کارسیوکوں نے تو ان کی بات پر غور کیا، لیکن متعدد نے دھیان نہیں دیا۔ انھوں نے کہا کہ جو کارسیوک اب بھی گنبد پر چڑھے ہیں، وہ لگتا ہے مراٹھی زبان بول رہے ہیں)، لہٰذا میں نے پرمود مہاجن — جو لکھنؤ سے میرے ساتھ آئے تھے — سے نیچے جا کر یہ سب رکوانے کے لئے کہا۔ پرمود مہاجن نیچے گئے اور تھوڑی دیر بعد واپس آگئے۔ ان کا تجربہ بھی اوما بھارتی کے تجربہ سے مختلف نہیں تھا۔ اس کے بعد میں نے خاتون پولس افسر — جنھیں میری سیکورٹی کا انچارج مقرر کیا گیا تھا — سے کہا کہ وہ میرے ساتھ اس مقام تک چلیں، جہاں توڑ پھوڑ ہو رہی ہے۔ اس پر انھوں نے جو جواب دیا، اس سے میں ایک دم حیرت میں پڑ گیا — 'چونکہ میں آپ کی سیکورٹی کی انچارج ہوں، اس لئے میں آپ کی وہاں

جانے کی بات پر متفق نہیں ہوں۔' اسی دوران وشو ہندو پریشد کے صدر اشوک سنگھل بھی کارسیوکوں کو توڑ پھوڑ کرنے سے روکنے کے لئے اس مقام پر پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کسی نے آ کر مجھے بتایا کہ جب اشوک سنگھل کارسیوکوں کو روکنے کی کوشش کر رہے تھے تو ان کے ساتھ ہاتھا پائی تک ہو گئی تھی۔

تب میں نے خاتون پولس افسر سے کہا کہ میں اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ کلیان سنگھ سے بات کرنا چاہتا ہوں جو اس وقت لکھنؤ میں تھے۔ ہم منچ پر سے نیچے اترے اور ٹیلی فون تلاش کرنے لگے۔ ایک ٹیلی فون ملا بھی، لیکن لکھنؤ سے رابطہ نہیں ہو پایا۔ میں ٹیلی فون کے پاس ہی تھا، جب دھڑام کی آواز سنائی دی اور اس کے بعد کسی نے آ کر مجھے بتایا کہ ایک گنبد منہدم کر دیا گیا۔ میں بھاگتا ہوا رام کتھا کنج کی چھت پر واپس پہنچا۔ اس وقت جو کچھ میں نے دیکھا، وہ میرے من میں آج بھی درج ہے۔ منچ پر جتنے بھی رہنما موجود تھے، سبھی اس غیر متوقع واقعہ سے مجروح تھے، لیکن وہاں موجود کارسیوکوں کے چہرے پر بالکل الگ ہی تاثرات دکھائی دے رہے تھے۔ انھیں جیسے راحت مل گئی تھی۔ ان میں سے کچھ تو خوشی سے جیسے اچھل ہی رہے تھے۔ تھوڑی ہی دیر بعد دوسرا گنبد گرا دیا گیا اور ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ تیسرا گنبد بھی دھڑام سے نیچے گر گیا۔ اب تو منچ پر موجود کچھ رہنما بھی کارسیوکوں کی خوشی سے متاثر ہونے لگے تھے۔

تبھی ایک شخص آیا اور مٹھائیاں بانٹنے لگا۔ میں نے کہا 'نہیں، آج میں مٹھائی نہیں کھاؤں گا۔'

دریں اثنا مجھے پیغام ملا کہ لکھنؤ سے رابطہ ہو گیا ہے اور میں وزیر اعلیٰ سے بات کرنے کے لئے نیچے چلا گیا۔ ڈھانچہ گرائے جانے کے بارے میں انہیں پتہ چل چکا تھا۔ وزیر اعلیٰ کلیان سنگھ سے میری جو بات چیت ہوئی، اس کا خلاصہ یہی تھا کہ چونکہ ان کی سرکار سپریم کورٹ کو دی گئی اپنی یقین دہانی پر قائم نہیں رہ پائی، اس لئے انھیں اب استعفیٰ دے دینا چاہئے۔ وہ راضی ہو گئے۔

میں انتہائی دکھی اور بے بسی محسوس کر رہا تھا۔ میری نفسیاتی حالت سمجھ کر ہی پرمود مہاجن نے کہا تھا 'آڈوانی جی، اگر آپ یہاں زیادہ دیر تک رکے رہیں گے تو آپ کو اور بھی زیادہ دکھ ہوگا۔ چلئے، لکھنؤ چلتے ہیں۔' اس لئے شام 6:00 بجے کے آس پاس ہم لکھنؤ کے لئے روانہ ہو گئے۔ میں نے من ہی من فیصلہ کر لیا تھا کہ اب میں بھی اپنے واحد سرکاری عہدہ — لوک سبھا میں اپوزیشن کے لیڈر — سے استعفیٰ دے دوں گا۔ لکھنؤ پہنچتے ہی میں نے لوک سبھا اسپیکر کو اپنا استعفیٰ نامہ فیکس کر دیا۔

اجودھیا سے لکھنؤ کی 135 کلومیٹر کی یاترا کے دوران راستے میں ایک تجربہ کے بارے میں مجھے ابھی تک اچھی طرح یاد ہے۔ راستے میں میں نے دیکھا کہ سخت سیکورٹی انتظامات کے باوجود جگہ جگہ لوگ خوشیاں منا رہے تھے۔ اجودھیا سے چلنے پر آدھے گھنٹہ میں ہی راستے میں پولس نے ہماری کار روک لی۔ کار میں مجھے اور پرمود مہاجن کو دیکھ کر اتر پردیش سرکار کے ایک سینئر افسر ہمارے پاس آئے اور پوچھنے لگے 'آڈوانی جی، کچھ بچا تو نہیں نا؟ بالکل صاف کر دیا نا؟' اس کا ذکر میں صرف یہ واضح کرنے کے لئے کر رہا ہوں کہ اجودھیا کے اس افسوسناک واقعہ کے بعد عام لوگوں کے ساتھ ساتھ سرکاری افسروں میں بھی خوشی کی لہر تھی۔

کانگریس سرکار کی دوہری چال

سرکاری وہائٹ پیپر محض لیپا پوتی

بابری ڈھانچہ میں توڑ پھوڑ کے واقعہ کے بعد وزیر اعظم نرسمہا راؤ نے مندر تحریک کے رہنماؤں پر سازش، مجرمانہ منشا اور اعتماد شکنی کا الزام

لگانا شروع کر دیا، لیکن کیا متنازع ڈھانچے کا گرایا جانا پہلے سے طے شدہ منصوبہ تھا؟ نہیں۔ کیا یہ کسی سازش کے تحت ہوا تھا، جس کے بارے میں مندر تحریک کے رہنماؤں کو پہلے سے پتہ تھا؟ نہیں۔ سازش اور پیشگی منصوبہ بندی کی بات سے تو خود ایس بی چوہان نے بھی انکار کیا تھا، جو راؤ کابینہ میں وزیر داخلہ تھے۔ 'دی پائنیئر' نے اپنے 3 رجنوری 1993 کے شمارہ میں لکھا تھا—

'وزیر داخلہ ایس بی چوہان نے جمعہ کو یہ کہہ کر سنسنی پھیلا دی کہ بابری ڈھانچے کو گرائے جانے کا منصوبہ پہلے سے طے شدہ نہیں تھا۔ خفیہ ایجنسیوں کے پاس بھی ایسی کوئی اطلاع نہیں تھی، جس سے پتہ چلتا کہ اس دن وہاں (اجودھیا میں) کیا کچھ ہونے والا ہے۔ درحقیقت ہم برابر کہتے آرہے ہیں کہ اگر ہمارے پاس اس سے متعلق کوئی پیشگی جانکاری ہوتی تو اسے روکنے کے لئے ہم ضرور قدم اٹھاتے، انھوں نے بتایا۔'

6 ردسمبر کے واقعہ میں میرا کردار کھلی مذمت کا موضوع بن گیا۔ مجھ پر متنازع ڈھانچے کو گرانے کے لئے بھیڑ کو اکسانے کا الزام لگایا گیا۔ درحقیقت میرے خلاف داخل فرد جرم میں یہی اہم الزام لگایا گیا ہے، لیکن اس کا سچائی سے دور دور تک ناطہ نہیں تھا۔ 6 ردسمبر کے واقعہ والے دن جو لوگ وہاں موجود تھے، وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں ان رہنماؤں میں سے ہی تھا، جو توڑ پھوڑ روکنے کے لئے کارسیوکوں سے اپیل کر رہے تھے۔ کئی ہندوستانی اور غیر ملکی صحافیوں نے بھی اس دن مجھے دیکھا تھا۔ میری نفسیاتی کیفیت کسی سے پوشیدہ نہیں تھی۔ ان میں سے ایک صحافی جیف چین برتھی، جو اس وقت 'ٹائم' میگزین کے نئی دہلی بیورو چیف تھے، نے 'دی ایشین ایج' کے 17 ر ستمبر 2004 کے شمارے میں شائع اپنی تحریر 'وہاٹ آئی وٹنیسڈ آن دسمبر 6' میں یہ بات لکھی بھی تھی—

> 'اس وقت 'ٹائم' میگزین کے نئی دہلی بیورو چیف کے طور پر میں حال ہی میں مقرر ہوا تھا۔ انیتا پرتاپ اس وقت ہماری دہلی رپورٹر تھیں۔ مسٹر ایل کے آڈوانی کی رتھ یاترا کے بارے میں جانکاری حاصل کرنے کے لئے انیتا جنوب کی طرف گئی تھیں، وہاں سے اجودھیا آئی تھیں اور میں لکھنؤ سے چل کر وہاں پہنچا تھا۔ 6 ردسمبر کو ہم بابری ڈھانچے کے انہدام کا منظر دیکھ سکے تھے، کیونکہ ہم وہاں کے لئے جلدی نکل گئے تھے۔ مسجد کے سامنے واقع مانس بھون کی چھت پر میں نے اور انیتا نے صبح 10:00 بجے ہی اپنی اپنی پوزیشن لے لی تھی۔
>
> اجودھیا میں تقریباً 3 لاکھ لوگوں کی بھیڑ تھی۔ آخر میں مسٹر آڈوانی بھی وہاں پہنچے اور دوپہر کے وقت انھوں نے وہاں موجود (کارسیوکوں کی) بھیڑ کو خطاب کرنا شروع کیا۔ مجھے یاد ہے، بی جے پی کے رہنما (آڈوانی) بہت غم زدہ دکھائی دے رہے تھے اور جب نوجوانوں نے لوہے کے سریوں سے چہار دیواری کو توڑ دیا اور مسجد کی جانب ٹوٹ پڑے تو وہ اپنے مائیکروفون پر بولتے ہوئے اپیل کر رہے تھے، براہ کرم (آپ لوگ) ایسا نہ کریں۔' لیکن شور شرابے میں ان کی اس اپیل پر کسی نے توجہ نہیں دی۔'

6 ردسمبر کے واقعہ کو سازش ماننے والے لوگوں کا کہنا ہے کہ رام للا کی مورتیاں— جو 1949 سے مرکزی گنبد کے نیچے رکھی تھیں— سہ پہر 3:00 بجے کے آس پاس وشو ہندو پریشد کے کیمپ دفتر میں لے جائی گئی تھیں اور بعد میں انھیں غیر مستقل مندر میں رکھ دیا گیا، جو منہدم ڈھانچے کی جگہ پر تیار کیا گیا تھا۔ آخر ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ اتنی افراتفری میں مورتیاں محفوظ باہر نکال لی جائیں اور پھر انھیں محفوظ مندر میں رکھ دیا جائے؟ کیا اس سے نہیں لگتا— ناقدین کا کہنا ہے— کہ یہ سب پیشگی منصوبہ بندی تھی؟ میں کہتا ہوں 'نہیں۔' ناقدین کی یہ سوچ غلط ہے۔ اس میں کارسیوکوں کا رام للا کی مورتیوں کے تئیں جذباتی لگاؤ اور عقیدت کے جذبے کو دھیان میں نہیں رکھا گیا ہے۔ جب پہلا گنبد منہدم ہو گیا تو وہاں آس پاس موجود سبھی لوگوں کو لگنے لگا تھا کہ اب باقی دونوں ڈھانچوں کو گرائے جانے میں دیر نہیں ہے۔ جو کارسیوک نیچے کھڑے تھے، وہ مرکزی گنبد کے نیچے واقع مندر میں رکھی مورتیوں کے تحفظ کے بارے میں فکر مند تھے۔ ان میں سے کوئی بھی ایک کارسیوک منہدم ہوئے ڈھانچے

میں سے مورتیوں کو نکال کر محفوظ مقام پر لے جا سکتا تھا۔

فروری 1993 میں نرسمہا راؤ سرکار نے اجودھیا کے واقعات کے بارے میں ایک سرکاری وہائٹ پیپر جاری کیا۔ اس میں اتر پردیش سرکار پر 'مجرمانہ لاپروائی' اور 'غیر ذمہ دارانہ رویئے' کا الزام لگایا گیا تھا۔ اس میں وزیر اعلیٰ کلیان سنگھ کو اس کے لئے ذمہ دار ٹھہرایا گیا تھا، کیونکہ انھوں نے پولس کو 'طاقت کا استعمال نہ کرنے' کی ہدایات دی تھیں۔ سچ کہا جائے تو مرکز میں کانگریس کی سرکار پر بھی یہ الزام جاتا ہے۔ کیسے؟ ڈھانچے کا آخری گنبد 6 دسمبر کو سہ پہر 4:50 بجے گرا تھا۔ 5:30 بجے کلیان سنگھ نے اپنا استعفیٰ دے دیا تھا۔ اس کے بعد فوراً ہی مرکز نے ان کی سرکار کو برخاست کر کے اتر پردیش میں صدر راج نافذ کر دیا تھا۔ اس دن کے واقعات سے صاف پتہ چلتا ہے کہ گنبدوں کے انہدام کے بعد بھی کارسیوکوں نے متنازع ڈھانچے کو کھودنا جاری رکھا تھا اور بعد میں وہاں سے ملبہ ہٹانے لگے تھے۔ یہ سب کچھ تب ہوا جب اجودھیا مرکزی سرکار کے کنٹرول میں آ چکا تھا۔

اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ کارسیوک وہاں رات بھر غیر مستقل مندر تیار کرنے میں لگے رہے تھے۔ مندر بن جانے کے بعد انھوں نے رام للا، سیتا، لکشمن اور ہنومان کی مورتیاں بھی اس میں قائم کیں۔ وزیر اعظم سے لے کر وزیر داخلہ اور دیگر افسران تک سبھی کو یہ معلوم تھا کہ اتر پردیش میں صدر راج نافذ کئے جانے کے بعد اجودھیا میں کیا چل رہا ہے۔ اس کے باوجود مرکزی سرکار نے کارسیوکوں پر طاقت استعمال نہ کرنے کا حکم دیا تھا اور اتنا ہی نہیں، انہیں متنازع مقام پر غیر مستقل رام مندر بھی بنانے دیا گیا۔

اس طرح جو سرکار پہلے غیر متنازع ڈھانچے کے نزدیک بھی کارسیوا کی اجازت نہیں دے رہی تھی، اسی سرکار نے اب متنازع مقام پر ہی کارسیوا کی اجازت دے دی۔ کسی بھی طرح سے یہ علامتی کارسیوا نہیں تھی۔ اس کا اظہار رام جنم بھومی پر رام مندر کی تعمیر کے طور پر ہوا، بھلے ہی وہ چھوٹا اور غیر مستقل کیوں نہ ہو۔ ایک طرح سے یہ اچھا ہی ہوا کہ غیر مستقل رام مندر کی تعمیر اور اس میں مورتیوں کے قیام کا کام صدر راج کے وقت ہوا۔ اس سے مندر کی قانونی حیثیت کو تقویت ملی۔ بعد میں الٰہ آباد ہائی کورٹ نے 1993 میں اپنے ایک حکم میں عقیدت مندوں کو مندر میں رام للا کے درشن کی اجازت دے کر اس کی قانونی حیثیت کو اور بھی مضبوط بنا دیا۔ واضح رہے کہ راؤ سرکار کے وہائٹ پیپر میں بھی پہلے ہی صفحہ پر اعتراف کیا گیا ہے 'دسمبر 1949 سے لے کر 6 دسمبر 1992 تک ڈھانچہ مسجد کے طور پر استعمال میں نہیں رہا تھا'۔

6 دسمبر کے واقعہ کے فوراً بعد کچھ سیاسی رہنما مطالبہ کرنے لگے کہ 'بابری مسجد' کو پھر سے بنوایا جائے۔ وزیر اعظم راؤ نے خود 7 دسمبر کو یہ وعدہ کیا تھا۔ ایک جانب تو انھوں نے کارسیوکوں کو غیر مستقل رام مندر بنانے دیا تھا اور دوسری جانب اب وہ خود ہی مسجد بنانے کا وعدہ کر رہے تھے۔ کیسا المیہ ہے! نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے خود اور ان کی کانگریس پارٹی نے ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کا اعتماد کھو دیا۔

ایسا میں نے کیوں کہا—

'یہ میری زندگی کا سب سے تکلیف دہ دن ہے'

6 دسمبر کے واقعہ کے بعد راؤ سرکار نے بی جے پی اور مندر تحریک کے رہنماؤں پر سیاسی حملے شروع کر دیئے۔ 8 دسمبر کو ڈاکٹر مرلی منوہر جوشی، اشوک سنگھل، وشنو ہری ڈالمیا، ونے کٹیار اور اوما بھارتی کے ساتھ مجھے بھی گرفتار کر لیا گیا۔ مجھے جھانسی کے نزدیک ماتا ٹیلا میں 10 جنوری 1993 تک عدالت کا حکم آنے تک قید میں رکھا گیا تھا۔ دو دن بعد 10 دسمبر کو سرکار نے راشٹریہ سویم سیوک سنگھ، وشو ہندو پریشد، بجرنگ دل، جماعت اسلامی ہند اور اسلامک سیوک سنگھ کو ممنوعہ قرار دے دیا۔ 15 دسمبر کو مرکز نے راجستھان، مدھیہ پردیش اور ہماچل پردیش بی جے پی

سرکاروں کو برخاست کر دیا۔ یہ پوری طرح سے بدلے کے جذبہ سے کی گئی کارروائی تھی، کیونکہ یہ سبھی ریاستی سرکاریں جمہوری طریقے سے منتخب کی گئی تھیں اور ان کا اجودھیا کے واقعہ سے کوئی لینا دینا نہیں تھا۔ ممکنہ طور پر یہ سب کانگریس پارٹی کے اندر وزیراعظم کے خلاف پیدا ہونے والی بے چینی کی لہر کو دبانے کے لئے ہی کیا گیا تھا۔

ماتاٹیلا میں قیدی بنا کر رکھنا آزاد ہندوستان میں سیاسی قیدی کے طور پر میرا چوتھا تجربہ تھا۔ پہلی بار میں نے 1948 میں گرفتاری دی تھی، جب مہاتما گاندھی کے قتل کے بعد سرکار نے سنگھ کو ممنوعہ قرار دے دیا تھا۔ تین ماہ تک مجھے قیدی بنا کر رکھا گیا تھا۔ دوسری بار ایمرجنسی کے دوران (77-1975) مجھے جیل میں رہنا پڑا تھا اور یہ میری سب سے طویل مدت کی قید تھی۔ تیسری بار بہار کے لالو پرساد یادو سرکار نے میری رام رتھ یاترا کو سستی پور میں روکا اور تقریباً ایک ماہ تک مجھے مانجور جیل میں رکھا۔ سیاسی قیدی کے طور پر گزاری گئی زندگی کا حصہ، خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا، اپنے آپ میں کافی تعلیم دینے والا ہوتا ہے۔ قید یا گرفتاری کے دوران سیاسی کارکن کو ایک تعلیم یہ ملتی ہے کہ قربانی اور جدوجہد سیاست سے الگ نہ ہونے والے حصے ہوتے ہیں۔ اگر آپ اپنے کسی یقین اور اصول پر عزم کے ساتھ چلنا چاہتے ہیں تو اس کی قیمت چکانے کے لئے بھی آپ کو تیار رہنا چاہئے۔ جو سیاست کو بچوں کا کھیل یا پھولوں کی سیج کے طور پر دیکھتے ہیں یا پھر عوامی تحریکوں کی دوڑ بھاگ اور دھول مٹی کو پسند نہیں کرتے، وہ سیاست کے لئے مناسب نہیں ہیں۔ ویسے ایک معاملے میں ہم ہندوستانیوں کو خود کو قسمت والا سمجھنا چاہئے کہ ہمارے یہاں جمہوری نظام ہے، اس لئے یہاں کی سیاست میں جو قربانی اور جدوجہد جھیلنی پڑتی ہیں وہ اتنی سخت یا مشکل نہیں ہیں جتنی دیگر ظالم یا تاناشاہی نظام حکومت میں ہوتی ہیں۔

> کئی ماہ کے تناؤ کے بعد ماتاٹیلا جیل میں مجھے شانتی محسوس ہو رہی تھی۔ اسی دوران مجھے 6 دسمبر کے واقعہ کے پیچھے کے طوفان پر سنجیدگی سے غور وفکر کرنے کا موقع ملا۔ سب کچھ سوچنے سمجھنے کے بعد میں نے اپنے من کی بھڑاس ایک مضمون میں نکالی، جو 'انڈین ایکسپریس' کے 27 اور 28 دسمبر 1992 کے شماروں میں دو بار میں شائع ہوئی تھی۔ اس مضمون میں میں نے اجودھیا آندولن کے آغاز اور ارتقاد توسیع کے بارے میں لکھا تھا۔ ان اسباب کا بھی میں نے تجزیہ پیش کیا تھا، جس کے سبب 6 دسمبر کا وہ بدبختانہ واقعہ سامنے آیا تھا۔ مندر تحریک اور اس میں اپنی پارٹی کی شمولیت کی میں نے پوری طرح سے حمایت کی تھی۔ ساتھ ہی آندولن کے اس بدبختانہ مرحلے پر اپنے جذبات وخیالات بھی ظاہر کیے تھے۔ میں نے تذکرہ کیا تھا کہ بابری ڈھانچہ گرائے جانے کے بعد کچھ رہنماؤں کو خوشی ہوئی تھی، لیکن میں خود اس خوشی میں شامل نہیں ہو سکا تھا۔ 'وہ میری زندگی کا سب سے تکلیف دہ دن تھا۔' میں نے لکھا تھا 'اس دن جتنا مایوس اور بے سہارا میں نے خود کو محسوس کیا تھا، اتنا اور کبھی نہیں۔'

مضمون میں میں نے اپنے من کا دکھ ظاہر کیا، جس سے میڈیا والے بعد میں مجھ سے پوچھنے لگے کہ 'کیا آپ کو اجودھیا آندولن سے اپنے لگاؤ کے سلسلے میں افسوس ہے؟ میرا واضح جواب تھا 'نہیں'۔ دونوں بیانات — پہلا دکھ ظاہر کرنے کے بارے میں اور دوسرا افسوس نہ ہونے کے بارے میں — ایک دوسرے کے برخلاف لگ سکتے ہیں۔ پہلے بیان کے لئے تو مندر آندولن کے میرے کچھ معاونین نے بھی میری نکتہ چینی کی تھی۔ میرے ناقدین نے پہلے بیان کی میری ایمانداری پر شبہ ظاہر کیا تو دوسرے بیان کے لئے میری مذمت بھی کی، اس لئے 6 دسمبر کے واقعات سے جڑے اپنے تجربات وخیالات کو صداقت سے اور وسیع سماجی وسیاسی تناظر میں ظاہر کر دینا میں ضروری سمجھتا ہوں۔

جیسا کہ میں نے 'انڈین ایکسپریس' میں شائع اپنے مضمون میں ظاہر کیا تھا 'میرے دکھ کا سبب نہ تو اجودھیا آندولن سے کسی طرح کی علیحدگی کے طور پر تھا اور نہ ہی اپنی پارٹی کے ذریعہ اپنائے گئے راستے کی شکل میں تھا۔ درحقیقت (بابری) ڈھانچہ کے انہدام کے بعد جو کچھ ہوا،

وہ آندولن کے تئیں ہمارے شبہات کا بدلہ لینے کے لئے ہی کیا گیا۔ مجھے دکھ اس بات کا تھا کہ اتنی مشکل سے تیار کی گئی پلاننگ — جس کے تحت اتر پردیش سرکار کسی قانون کی خلاف ورزی کئے بغیر یا کسی عدالتی حکم نامہ کی ان دیکھی کئے بغیر مندر تعمیر سے متعلق اپنا مینڈیٹ پورا کرنے کی سمت میں تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی — بے کار ہوگئی۔ مندر آندولن سے منسلک تنظیموں کا کوئی قصور تھا تو اتنا ہی کہ وہ آندولن میں شامل لوگوں کی جذباتی بے صبری کا اندازہ پہلے سے نہیں لگا سکے، لیکن جو اس دن ہوا، اس کے لئے وہ قصوروار نہیں تھے۔'

ان دنوں 'دی ٹیلی گراف' کی سینئر صحافی مانی چٹرجی نے ایک پریس کانفرنس میں ایک عجیب طرح کا سوال مجھ سے پوچھا 'ایک لفظ، جو آپ کو زندگی میں سب سے اچھا لگتا ہے، وہ کون سا ہے؟' میں نے کہا 'معتبریت' میں جو کچھ بھی ہوں اور اپنے ملک، اپنی پارٹی کے لئے جو کچھ بھی کر سکا ہوں، وہ اس معتبریت سے ہی ممکن ہو سکا ہے، جو میں نے اپنی زندگی میں حاصل کی ہے۔ یہ میری ذاتی طور پر ہی نہیں، بلکہ میری پارٹی کی بھی معتبریت ہے۔ یہاں تک کہ جن سنگھ اور بی جے پی کے ناقدین بھی اعتراف کرتے تھے کہ 'یہ پارٹی وہی کرتی ہے، جو کہتی ہے اور وہی کہتی ہے جو خود کر کے دکھاتی ہے۔' متنازع ڈھانچہ گرائے جانے سے مجھے جو دکھ ہوا تھا، اس کا سبب یہی تھا کہ اس سے لوگوں کی نظروں میں ہماری معتبریت ختم ہوگئی۔

ہم بی جے پی والوں کا شروع سے یہی کہنا تھا کہ ہمارا مقصد مسجد کے ڈھانچے کو پورے احترام کے ساتھ کسی دوسری جگہ قائم کر کے رام جنم بھومی پر مندر بنانا ہے اور ایسا ہم یا تو ضروری قانونی کارروائی کے ذریعہ یا پھر ہندو و مسلم دونوں فرقوں کے درمیان آپسی مفاہمت کی بنیاد پر کریں گے، لیکن ہم اپنا وعدہ نہیں نبھا سکے۔ مشتعل کارسیوکوں نے مندر آندولن کے رہنماؤں کی اپیل اور درخواست کو نظر انداز کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پورے آندولن کی معتبریت ان لوگوں کے سبب ختم ہوگئی جنھوں نے 6 دسمبر کو قانون اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اسی ایک معنی میں مجھے لگا تھا — اور اب بھی لگتا ہے — کہ ہمارے پورے آندولن کو اس دن ایک دھچکا لگا تھا۔

ساتھ ہی اس وقت مجھے بہت دکھ ہوا تھا، جب کچھ جانے مانے لوگوں نے اسے 'قومی شرمندگی' یا 'مہاتما گاندھی کے قتل کے برابر گناہ' کہہ کر مذمت کی۔

میں اس بات سے بالکل انکار نہیں کروں گا کہ 6 دسمبر ہندوستان اور ہندوستانی ہندوؤں کی زندگی کا ایک عہد کے خاتمہ کا دن رہا۔ اس سے ہندوستان کی جدید تاریخ میں یہ بات پوری طرح سے واضح ہوگئی کہ ہندو فرقہ مسلسل اپنے جذبات کی ان دیکھی برداشت نہیں کرے گا۔ جو ہندوؤں کے جذبات اور ان کی تشویشات کو نظر انداز کرتے رہے تھے اور سیاسی سازش اور زیر التواعدالتی کارروائی کے تحت انھیں دبانے کی کوشش کرتے رہے تھے، انھیں اچھا سبق مل گیا، جسے وہ شاید نہیں بھول پائیں گے۔

دراصل، جیسا کہ میں نے پہلے ذکر کیا ہے، کبھی کبھی ان تحریکوں کے اندر ایسی خوابیدہ بیداری پوشیدہ رہتی ہے کہ خود آندولن کے رہنما بھی اسے کنٹرول کرنے کے اہل نہیں رہ پاتے۔ اس طرح اپنے ایک کام کے ذریعہ — جسے نہ مندر آندولن کے رہنما کنٹرول کر سکے اور نہ ہی مرکزی سرکار خود کنٹرول کر سکی — کارسیوکوں کے ایک گروپ نے ہندوستان کی دور وسطیٰ و جدید تاریخ سے جڑے ایک بنیادی سوال پر اپنا فیصلہ سنا دیا — رام یا بابر؟ حقیقی عدم فرقہ واریت یا سیوڈو سیکولرازم؟ سب کے لئے انصاف یا کچھ مخصوص فرقہ کی تذلیل؟ ہندو کیا ہمیشہ ذات، دھرم و زبان کی بنیاد پر بٹے رہیں گے؟ یا مذہبی اعتقاد اور راشٹرواد کے سامنے آنے والے بنیادی چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کے لئے انھیں متحد ہونا چاہئے؟

میں یہ نہیں کہوں گا کہ 6 دسمبر کے واقعہ نے ان سارے سوالوں کا مکمل طور پر اطمینان بخش جواب دے دیا، لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ یہ ہندو بیداری کا دن تھا، جو تاریخی نقطہ نظر سے انتہائی اہم ہے۔

وی ایس نائپال، نیرد سی چودھری اور گری لال جین
اجودھیا آندولن کے تین حساس مبصر

جب بھی کسی ملک میں کوئی عہد ساز واقعہ رونما ہوتا ہے، اس پر الگ الگ طرح کے — اکثر مخالف — ردِّعمل تو آتے ہی ہیں۔ ہندوستان کی دانشور برادری کے ایک طبقہ کے ذریعہ اجودھیا آندولن کی نکتہ چینی کی بات کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ تنقید یا تنقیدی نقطۂ نظر کو میں کبھی غلط نہیں مانتا ہوں، کیونکہ اس سے ہمیں اپنے اندر جھانکنے اور اپنے پراعتماد و کاموں کا نئے سرے سے جائزہ لینے کا موقع ملتا ہے، لیکن یہ دیکھ کر مجھے بہت دکھ ہوا تھا کہ کچھ ناقدین اجودھیا کے واقعہ کے صرف باہری پہلوؤں کو ہی دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے اس کی اہمیت اور اثر کو تاریخی پس منظر میں رکھ کر سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔

اس سلسلے میں ان تین دانشوروں کے تبصروں اور جائزوں سے مجھے بہت خوشی ہوئی — ایک ناول نگار، ایک مصنف اور ایک صحافی۔ اور اہم بات یہ ہے کہ ان تینوں میں سے کسی کو بھی پہلے ہندو نظریاتی پس منظر میں یقین رکھنے والے دانشور کے طور پر نہیں جانا جاتا تھا۔ ایک تھے سر وی ایس نائپال — ٹرینیڈاڈ میں پیدا ہونے والے ہندنژاد برطانوی مصنف، جنہیں 2001 میں ادب کا نوبل انعام ملا تھا۔ دوسرے تھے نیرد سی چودھری — مشہور کتاب 'آٹو بایوگرافی آف این ان نون انڈین' (1951) کے مصنف اور تیسرے دانشور تھے گری لال جین — 'دی ٹائمز آف انڈیا' کے ایڈیٹر (89-1978)۔ جین کا نظریاتی سفر دلچسپ رہا تھا، جو ایم این رائے (بین الاقوامی کمیونسٹ تحریک کے ایک بانی رکن، جو بعد میں اشتراکیت سے مایوس ہوئے تھے) کے حامی، پنڈت نہرو کے مداح، ایمرجنسی میں اندرا گاندھی کے دفاع کرنے والے، وہ آخر میں ہندو احیا کے حامی بن گئے۔ ان کی کتاب 'دی ہندو فینومینن' (1994) ان کی زندگی بھر کے تجربات - افکار کا مختصر مجموعہ ہے۔ اس کتاب میں اجودھیا آندولن کا ہندو آتم جاگرن کے تاریخی عمل کے اٹوٹ حصہ کے طور پر ذکر کیا گیا ہے اور اس طرح ہندوستانی قومیت کی ثقافتی بنیاد کو ہندوستانی سیاسی مذاکرہ کے مرکز تک پہنچانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان تین نظریوں اور فکری نکات کا تذکرہ یہاں میں اس لئے کر رہا ہوں، کیونکہ مجھے قارئین کو بتانا ہے کہ کیوں اجودھیا آندولن سے اپنے لگاؤ کے تئیں مجھے فخر ہے۔

18 رجولائی 1993 کو 'دی ٹائمز آف انڈیا' میں اس وقت کے ایڈیٹر دلیپ پاڈگاؤنکر کے ذریعہ لیا گیا سر نائپال کا ایک مشہور انٹرویو شائع ہوا تھا، جس کا عنوان تھا — این ایریا آف اویکننگ' جو ہندوستان پر تحریر کردہ ان کی کتاب 'این ایریا آف ڈارکنیس' (1964) کی بہت خوبصورت شبیہ ہے۔ اس انٹرویو کے کچھ اقتباسات یہاں پیش کر رہا ہوں —

پاڈگاؤنکر: سوویت یونین کی تخریب اور اس کے بعد جنوبی ایشیا میں اسلامی ملکوں کا طلوع، سلمان رشدی کا معاملہ، ہندوستان میں روادار مسلم دانشوروں پر سخت گیروں کے ذریعہ مظالم — ان سب باتوں کے پیش نظر کچھ طاقتوں کو یہ سوچنے کا موقع مل گیا کہ منقسم ہندو سماج مسلم شدت پسندی کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

نائپال: میں ایسا نہیں دیکھتا۔ جن باتوں کا آپ نے ذکر کیا، وہ سطحی باتیں ہیں۔ ہندوستان میں آج جو کچھ ہو رہا ہے، وہ ایک نئی تاریخی نو جاگرن کا حصہ ہے۔ گاندھی جی نے دھرم کا استعمال لوگوں کو تحریک آزادی کے لئے تیار کرنے کے مقصد سے کیا تھا، لہٰذا جو لوگ تحریک آزادی میں حصہ لے رہے تھے، انھیں لگتا تھا کہ انھیں اس سے ثواب کا فائدہ ملے گا۔

آج مجھے لگ رہا ہے کہ ہندوستان کے عام لوگ اپنی تاریخ کے تئیں بیدار ہو رہے ہیں۔ ہندوستانی تاریخ پر تحریر کردہ رومیلا تھاپر کی کتاب تاریخ کے مارکسی نظریہ کو پیش کرتی ہے، جس کے مطابق حملوں کے پیچھے ایک بڑی سچائی پوشیدہ ہے— جاگیرداری اور وہ سب کچھ — حملہ آور اپنے کاموں کو جس نظریہ سے دیکھتے تھے، وہی سچائی ہے۔ وہ فاتح بن رہے تھے اور (عوام پر) اثر ڈال رہے تھے اور وہ سب کچھ ایک ایسے ملک میں کر رہے تھے، جس کے لوگ کبھی اس بات کو سمجھ ہی نہیں سکے۔

اتنے وقت کے بعد لوگ سمجھ رہے ہیں کہ ہندوستان میں بہت بڑی توڑ پھوڑ کی گئی ہے۔ فاتحین کی جیت کا خاکہ اور ہندو سماج کی فطرت بھی کچھ ایسی تھی، جس کے سبب ہندوستانی کچھ سمجھ نہیں پا رہے تھے۔ آج ہندوستان میں جو کچھ دیکھا جا رہا ہے، وہ طاقتور تعمیری عمل کا حصہ ہے۔ ہندوستانی دانشور — خاص طور پر اگر وہ امریکہ میں رہ رہے ہیں تو — جو اپنے رواداری نظریے سے چپکے رہنا چاہتے ہیں، بھلے ہی اسے سمجھ نہ سکیں، لیکن ہر دوسرا ہندوستانی اچھی طرح جانتا ہے کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔ اس کے من کی گہرائی میں یہ بات ہے کہ ایک وسیع ردعمل ابھر کر سامنے آ رہا ہے، بھلے ہی یہ ردعمل کبھی کبھی اسے خطرناک لگتے ہوں۔

پاڈگاؤنکر: اجودھیا کے واقعہ پر آپ کا کیسا ردعمل تھا؟

نائپال: میرا ردعمل اتنا خراب نہیں تھا جتنا دوسرے لوگوں کا رہا تھا۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ وہاں مندر نہیں تھا، وہ ایک بات بھول رہے ہیں۔ آپ کو سمجھنا چاہئے کہ بابر اس ملک سے نفرت کرتا تھا، جسے اس نے جیت لیا تھا۔ اس نے جو مسجد بنوائی تھی، وہ اس ملک کے تئیں اپنی نفرت کے سبب ہی بنوائی تھی۔ ترکی میں سانتا صوفیا چرچ کو مسجد میں تبدیل کرایا گیا تھا۔ نکوسیا میں بھی چرچوں کو مسجد میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ مسلم حملہ آوروں سے اپنی زمین واپس حاصل کرنے میں اسپینی باشندوں کو کئی صدیوں کا وقت لگ گیا۔ اس طرح ایسی باتیں پہلے بھی اور دیگر جگہوں پر بھی ہوئی ہیں۔ اجودھیا میں ماضی بعید کے لوگوں کے ذریعہ مقدس مانے جانے والے مقام پر مسجد بنوانے کا مقصد ان کی توہین ہی رہی تھی۔ یہ ایک قدیم تصور — یعنی رام سے جڑے تصور کی توہین تھی، جو دو یا تین ہزار سال پرانی تھی۔

نیرد سی چودھری، جن کا 1999 میں 101 برس کی عمر میں انتقال ہو گیا، بین الاقوامی شہرت یافتہ ابتدائی ہندوستانی نژاد انگریزی مصنفین میں سے ایک تھے۔ ان کا جنم بنگال میں ضرور ہوا تھا، لیکن زندگی کے آخری دن تک وہ وکٹوریائی جنٹلمین ہی بنے رہے۔ انھوں نے ہندوستان میں برطانوی سامراج کے ایسے پہلوؤں کی ہمیشہ حمایت کی تھی، جنہیں وہ مثبت سمجھتے تھے۔ اپنی سوانح عمری بھی انھوں نے 'ہندوستان میں برطانوی سامراج کو وقف' کیا ہے۔ 1993 میں انھوں نے 6 دسمبر کے واقعہ کو ہندوستانی تاریخ کے ایک اہم واقعہ کے طور پر تذکرہ کر کے کئی تجزیہ کاروں کو چونکا دیا تھا۔ 'بالآخر اب جا کر کہیں ہندوستان کی تاریخ سازی سیکھ رہے ہیں۔' انھوں نے تبصرہ کیا تھا۔ 'دی ٹائمز آف انڈیا' کے ساتھ اپنے انٹرویو میں انھوں نے اجودھیا معاملے پر اپنے خیالات ظاہر کئے تھے، جن میں ان کی فطری بیباکی صاف جھلکتی ہے۔

دونوں ہی فریقوں (ہندو اور مسلم) پر تاریخی ذمہ داری ہونی چاہئے۔ انھیں اس ذمہ داری سے منہ موڑنے کی کوشش نہیں کرنی چاہئے۔ سب کے سب ہندو تاریخ داں جھوٹے ہیں۔ 1907 کے بعد قومی تحریک کے حوالے سے ہمیں ہندو مسلم تنازع کا احساس ہوا۔ اس کے بعد سے 1946 تک میں نے جس کسی بنگالی بھائی سے پوچھا ہوگا، اس کا — اور درحقیقت ہر دوسرے ہندوستانی کا بھی — ایک ہی جواز تھا 'ہندو مسلم کا کوئی تنازع نہیں ہے۔ یہ انگریزوں کی دین رہی ہے۔' میرے کہنے کا مطلب ہے کہ ہر چیز کی فطرت یہی ہوتی ہے۔ اجودھیا میں جو کچھ ہوا، وہ نہیں ہونا چاہئے تھا، لیکن یہ ایک الگ بات ہے۔ بہر حال میں تو کہوں گا کہ مسلمانوں کو کسی ایک مسجد کے لئے شکایت کرنے کا حق بالکل بھی نہیں

ہے۔ 1000 عیسوی سے دیکھا جائے تو کاٹھیاواڑ سے لے کر بہار تک اور ادھر ہمالیائی خطہ سے لے کر وندھیہ خطہ تک ایک ایک ہندو مندر کو لوٹا گیا ہے، اسے تباہ کیا گیا ہے۔ پورے شمالی ہند میں ایک بھی ہندو مندر محفوظ کھڑا نہیں رہ سکا تھا۔ ملک میں اگر کہیں کوئی مندر تباہی کا شکار ہونے سے بچا تو اس کا سبب یہی رہا تھا کہ گھنے جنگل یا دیگر رکاوٹوں کے سبب مسلم اقتدار وہاں تک نہیں پہنچ سکا، ورنہ مندروں کی تباہی کا ایک مسلسل عمل جاری تھا۔ اپنی قومی خودداری کا احساس رکھنے والی کوئی بھی قوم اسے معاف نہیں کرے گی۔

مستقل انقلاب کے اصول کی تلاش سب سے پہلے مسلمانوں نے ہی کی تھی۔ ان کے پاس سے یہ انقلاب اشتراکیت پسندوں کے پاس پہنچا۔ غیر مسلم سیاسی حکمرانی میں کوئی بھی مسلم نہیں رہ سکتا۔ دوسری بات، مسلمانوں کے سبب دنیا دو خطوں میں منقسم ہوگئی — پہلا امن کا خطہ اور دوسرا غیر امن یا لڑائی کا خطہ۔ غیر امن یا لڑائی کے خطہ کو اسلام کے اندر یا ماتحت لانا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ خلیفہ کا عربی ہم منصب 'عقیدت مندوں کا سپہ سالار' ہے اور اس کا فرض ہے — جہاد۔ میں انگریزوں سے پوچھتا ہوں کہ کابل میں تو انھیں شدت پسند کہتے ہو، لیکن انگلینڈ میں انھیں کہیں شدت پسند نہیں کہتے، کیوں؟ کیونکہ انگریز لوگ پوری طرح سے لاعلم ہوگئے ہیں اور ہماری طرح ہی وہ بھی سچائی کا سامنا نہیں کر سکتے۔'

اب میں گری لال جین کے اس مضمون کے دو اقتباسات پیش کرنا چاہتا ہوں جس میں انھوں نے اجودھیا آندولن کا 'ایک تاریخی موڑ' کے طور پر ذکر کیا تھا۔ پہلے اقتباس میں جین نے ہندوستان کے ہندو جذبہ میں پنڈت نہرو کے یقین پر زور دیا ہے —

'اس میں کوئی شبہ نہیں کہ 1992 ہندوستانی تاریخ میں اجودھیا سال کے طور پر جانا جائے گا۔ اجودھیا کا مطلب یہ ہے کہ ہندوستان نے ایک عام زندگی کے طور پر برتاؤ اور ردّعمل ظاہر کرنے کے پہلے سے کچھ حد تک زیادہ صلاحیت حاصل کرلی ہے۔ اپنے حقوق کے لئے لڑنے کی سمت میں اس نے ایک اور بڑا قدم آگے بڑھا دیا ہے، جیسا کہ لینن نے کہا تھا 'ہر سچ جانبدار ہوتا ہے۔' میرا بھی یہی خیال ہے۔ میں لڑائی سے دور نہیں ہوں یا پنڈت نہرو کے لفظوں میں کہانی ہے تو میں خود کے تئیں غیر جانبدار نہیں ہوسکتا، لیکن جانبدار سچ کا مطلب عوامی اشتعال کو بڑھاوا دینا یا گمراہی پھیلانا نہیں ہوسکتا، جس میں 'مشترکہ ثقافت' کے یہ عناصر شامل ہیں۔ ہندوستان کے جذبہ یا آتما کے اپنے حقوق کے لئے بار بار عزم کے ساتھ قائم ہونے کے لئے سرگرم ہونے کی بات پنڈت نہرو نے بھی لکھی اور قبول کی ہے۔ یقینی طور پر یہ جذبہ یا آتما مشترکہ معاملہ نہیں ہوسکتی۔

پنڈت نہرو کے لئے فرقہ وارانہ وابستگی (سیکولرازم) — ذاتی فلسفہ اور قومی پالیسی دونوں ہی شکلوں میں — ہندوستان کے ثقافتی، تہذیبی تشخص اور ڈھانچہ کا ایک اظہار تھا، نہ کہ اس کی تردید۔ ان کی نظر میں فرقہ وارانہ ناوابستگی ہندوستان کی ضرورتوں کے عین مطابق تھی۔ شیخ عبداللہ نے 'آتش چنار' میں لکھا تھا کہ 'نہرو ہندوستان کی پرانی وراثت اور ہندو جذبہ کے بڑے مداح تھے۔ ہندوستان کے قدیم جذبہ یا آتما سے قوم کی تعمیر نو کے لئے وہ خود کو ایک وسیلہ کی طرح دیکھتے تھے۔' درحقیقت شیخ عبداللہ کی یہ بات حقیقت سے زیادہ دور نہیں ہے۔

دوسرے اقتباس میں گری لال جین اجودھیا آندولن کو 'خود استحکام' کے لئے ہندوؤں کے ذریعہ کی جانے والی دو سو برسوں کی کوششوں کے نتیجہ کے طور پر دیکھتے ہیں۔

'رام جنم بھومی معاملے کے اہم بننے کے عمل کو اچانک واقعات کے سلسلہ کی شکل — 1949 میں ڈھانچہ کے اندر اچانک رام للا کی مورتی دکھائی دینا اور 1986 میں فیض آباد کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے حکم سے ڈھانچے کا دروازہ کھولا جانا وغیرہ — میں دیکھنے کا مطلب صرف یہی ہوسکتا ہے کہ پورے معاملے کے صرف باہری پہلوؤں کو ہی دیکھنا ہے۔ اس طرح دیکھنے میں ہندوستان کی جدید تاریخ — جو انیسویں صدی میں راجہ رام موہن رائے کے ساتھ شروع ہوتی ہے — کے جانکاری کی کمی معلوم ہوتی ہے۔' جیسا کہ اس طرح کے سبھی معاملوں میں ہوتا ہے۔

ان واقعات نے دوسو برس پرانی اس تحریک کو ظاہری شکل دے کر اسے اور مضبوط بنانے میں مدد کی، جو ہندوؤں کے ذریعہ خود بیداری اور خود استحکام کے لئے شروع کی گئی تھی۔

اگر ایسا نہیں ہوتا تو یہ 'اتفاقیہ' واقعات ختم یا بے اثر ہو جاتے۔ اسی طرح، اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مندر کی تعمیر کے لئے حمایت اکٹھا کرنے میں وشو ہندو پریشد، راشٹریہ سویم سیوک سنگھ اور بی جے پی نے اہم کردار ادا کئے، لیکن یہاں دھیان رکھنا چاہئے کہ اگر وقت صحیح نہیں ہوتا اور ماحول مناسب نہیں ہوتا تو انھیں یہ کامیابی نہیں مل پاتی۔ سیاسی پارٹیوں میں سے ایک بھارتیہ جنتا پارٹی نے ہندوستان کی ثقافتی وتہذیبی وراثت کو پھر سے واپس لانے کے لئے خود ایک وسیلہ کے طور پر کام کرنے کا راستہ منتخب کیا ہے۔ یہ فطری طور پر آنے والی دہائیوں اور برسوں میں ہندوستان کی ازسرنو تعمیر میں اہم کردار ادا کرے گی۔ حالانکہ دیگر پارٹیاں اور تنظیمیں بھی اس بڑے کام میں اپنے اپنے کردار ادا کریں گی۔

اس طرح کے اثر دار تاریخی واقعات جب بھی رونما ہوتے ہیں، دانشور طبقہ میں کشمکش اور پس وپیش کی صورت حال اکثر پیدا ہو جاتی ہے۔ انسانی من فطری طور پر واقعات کے پیچھے چلتا ہے۔ ان کے بارے میں پہلے سے اندازہ لگانا انسانی دماغ کی صلاحیت سے باہر ہے، لیکن کشمکش اور پس وپیش کی حالت سے باہر نکل کر معاملے کے اصل نکتہ تک پہنچنا ممکن نہیں ہے اور معاملے کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ اگر ہندوستان کی وسیع روحانیت، جدید بول چال میں اندرونی توانائی، جو صدیوں سے خستہ حالت میں پڑی تھی، کو سرگرم اور منظم کرنا تھا تو ہندوؤں کو جگانا بھی ضروری ہی تھا — اور کسی طاقتور، بااثر علامت کا استعمال کر کے ہی انھیں جگایا جا سکتا تھا۔ یہ علامت رام کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ بات میں بیسویں صدی میں اس وقت واضح ہوگئی تھی، جب رام راجیہ کی بات کر کے مہاتما گاندھی نے لاکھوں ہندوستانیوں کو سرگرم کر دیا تھا، لیکن جب یہ علامت عام لوگوں میں چھپ جاتی ہے، جیسا کہ بیسویں صدی میں ہوا تھا اور ابھی حال میں ہوا ہے، تو اس کی مخالفت بھی عام طور پر اسے اور مضبوط اور بااثر ہی بناتی ہے۔

تاریخ داں بھلے ہی جواز اور جوابی جواز پیش کرتے رہیں کہ اجودھیا میں بابری ڈھانچہ کی جگہ پر کوئی مندر تھا یا نہیں اور اگر تھا تو وہ رام مندر ہی تھا یا کچھ اور، اسے گرایا گیا تھا یا پھر وہ اپنے آپ ہی گر گیا تھا۔ اسی طرح پالیسی نواز اور سیکولرازم نواز یہ جواز پیش کرتے رہیں کہ ایک مذہبی مقام یا 'پوجا استھل' کی جگہ پر دوسرا مذہبی مقام یا پوجا استھل بنانا ٹھیک نہیں ہے، خاص طور پر تب تک جب تک کہ معاملہ سلجھ نہ گیا ہو، لیکن تاریخ اس طرح نہیں چلتی، نہ ہی تہذیبی معاملے اس طرح سلجھائے جاتے ہیں۔ یہ ایک ٹھوس حقیقت ہے کہ اجودھیا میں رام جنم بھومی کے لئے ہندوؤں نے جتنی سخت اور طویل جدوجہد کی ہے اتنی کسی دیگر مقام کے لئے کبھی نہیں کی ہے۔

نیرد بابو سے تو میں کبھی نہیں ملا تھا، لیکن اجودھیا آندولن کے سبب سرنا ئپال اور گری لال جین میرے اچھے دوست بن گئے۔ گری لال جین دہلی میں منعقد اس تقریب کے صدر بھی رہے تھے، جس میں میں نے کانراڈ ایلسٹ کے ذریعہ اجودھیا پر تحریر کردہ کتاب کا اجرا کیا تھا۔ اپنی تقریر میں گری لال جین نے اجودھیا آندولن میں میرے کردار کے لئے میری ستائش کرتے ہوئے کہا تھا کہ 'آپ نے تو تاریخ رقم کر دی ہے۔'

مجھے توقع ہے کہ اجودھیا آندولن کے حامی اور ناقدین — دونوں ہی ان تین دانشوروں کے خیالات ونظریات سے معاملے کو وسیع نظرنامہ میں دیکھنے کی ترغیب حاصل کریں گے۔

حصہ - 5

مشن ادھورا

ہندو- مسلم رابطہ کے ذریعہ ہی اجودھیا کا حل ممکن

آج جبکہ میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں، میری آرام دہ رتھ یاترا کے تقریباً19 سال گزر چکے ہیں۔ راجیو گاندھی کی سرکار نے جب رام جنم بھومی کا تالا کھولنے کی اجازت دی تھی، اس کے بعد اب تک دو دہائی گزر چکے ہیں۔ رام مندر کے شلانیاس— جس کی اجازت خود راجیو گاندھی کی سرکار نے دی تھی— کو 18 سال ہو گئے۔ 2007 کا 6 ردسمبر ایک ایسے اہم واقعہ کی پندرہویں سال گرہ تھی، جو اجودھیا آندولن کے حامیوں اور مخالفین کی نظر میں جدید ہندوستان کی سماجی و سیاسی زندگی کا اہم واقعہ رہا ہے۔ یہ واقعات 500 برس پرانی اس طویل تاریخی جدوجہد میں میل کا پتھر ثابت ہوئے ہیں، جو ہندوؤں کے ذریعہ بھگوان رام کی جائے پیدائش— جس سے کروڑوں ہندوؤں کی عقیدت وابستہ ہے— کو پھر سے حاصل کرنے کے لئے کی جاتی رہی ہے۔

میں بخوبی جانتا ہوں کہ کچھ لوگ یہی کہیں گے کہ 'زمین کے ایک ٹکڑے کے لئے آپ لوگ آخر اتنے پریشان کیوں ہیں؟ اور پھر آپ لوگوں کو اور مندر بنانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ ہندوستان میں کیا مندروں کی کمی ہے؟' میں یہ جانتا ہوں کہ اس طرح کی باتیں کرنے والوں میں زیادہ لوگ ہندو ہی ہوں گے، خواہ وہ خود کو ہندو مانیں یا نہ مانیں، ان میں سے کئی لوگ بھلے مانس ہیں اور حب الوطنی میں بھی کسی سے کم نہیں ہیں، لیکن ایک بات میں کہوں گا کہ ہندو سماج میں ایسے لوگوں کی متناسب تعداد کم ہی ہے۔ جو بھی ہو، ان کی یہ سوچ ہندو مذہب میں موجود رواداری کے تئیں احترام ہے اور ساتھ ہی یہ اظہار رائے کی آزادی کا ثبوت بھی ہے۔ میں ان کی اظہار رائے کی آزادی اور ان کی سوچ کا احترام کرتا ہوں، بھلے ہی وہ میری اپنی سوچ سے بہت مختلف ہے، لیکن میں جاننا چاہتا ہوں— کیا وہ بھی ہندوستان کی اکثریتی کمیونٹی کے لوگوں کے خیالات و عقائد کا احترام کر رہے ہیں؟ جواب ہے— نہیں۔

ہندو فطرت سے ہی روادار، فراخ دل اور وسیع سوچ والے ہیں۔ زندگی اور تاریخ کو وہ بنیادی طور پر آپسی اتحاد کے جذبہ اور یکتا کی نظر سے دیکھتے ہیں، نہ کہ اصولی ضد یا ٹکراؤ کے جذبہ سے۔ ہندو دھرم کی اس خصوصیت سے میں انتہائی متاثر ہوں اور جس دن ذاتی یا اجتماعی سطح پر ہندوؤں کی زندگی سے یہ عظیم خوبی غائب ہو جائے گی، وہ دن میرے لئے سچ مچ تکلیف دہ ہوگا، لیکن تب مجھے اور بھی زیادہ دکھ ہوگا، جب ان خوبیوں کو ہندوؤں کی کمزوری مان لی جائے اور لوگ یہ مان کر چلنے لگیں کہ ہندوؤں کا اپنا کوئی بنیادی یا قدیم اعتقاد ہی نہیں ہے یا انھیں اس طرح کے اعتقاد کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ چونکہ میں سیاسی طبقہ سے تعلق رکھتا ہوں، اس لئے مجھے اس وقت بہت دکھ ہوتا ہے جب دیگر پارٹیوں کے میرے ساتھی و معاونین اس طرح کا برتاؤ کرتے ہیں۔ مانو، ہندوؤں کا اپنا کوئی مذہبی جذبات ہی نہیں ہیں، اس لئے صرف غیر ہندوؤں کے مذہبی جذبات کا ہی احترام کیا جانا چاہئے۔ مانو، ہندوؤں کے لئے جو عقیدت یا تقدس کا موضوع ہے، اس کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہے اور جو بھی غیر ہندوؤں کے لئے کسی طرح کی عقیدت سے جڑا ہی نہیں رہا ہے، اس کے تئیں بھی ہمیں حساس ہونا ضروری ہے اور اسے سیکولرازم کا حوالہ دے

کر انصاف پر مبنی ہی ٹھہرایا جاتا ہے۔

کیا مجھے بتانے کی ضرورت ہے کہ مکہ اور مدینہ — جو مسلمانوں کے دو مقدس زیارت گاہیں ہیں — میں غیر مسلموں کا داخلہ ممنوع ہے؟ سچ تو یہ ہے کہ پورے سعودی عرب میں ہی کوئی غیر مسلم نہ تو اپنا مذہب چلا سکتا ہے اور نہ ہی کھلے عام اس کی تشہیر کر سکتا ہے۔ بلاشبہ، ہندوستان سعودی عرب کی اس طرح کی عدم رواداری نہیں اپنا سکتا اور اپنانی بھی نہیں چاہئے، لیکن کیا ہندو اتنی بھی توقع نہیں کر سکتے کہ ان کی تین مقدس زیارت گاہوں میں سے کم از کم ایک زیارت گاہ غیر مسلکی، مذہبی یا قومی اثر کی علامت سے آزاد ہو؟

این ڈی اے دور حکومت میں اجودھیا کا معاملہ

جب 1998 میں پارلیمانی انتخابات میں بھاجپا سب سے بڑی پارٹی کے طور پر ابھری اور قومی جمہوری اتحاد کی سرکار بنانے میں کامیاب رہی، تب ہماری پارٹی کو عجیب وغریب حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک جانب بی جے پی 1989 سے مسلسل اقتدار کی جانب گامزن تھی، جو اجودھیا معاملے کے تئیں اس کے ٹھوس عزائم کا نتیجہ تھا۔ 1998 کے پارٹی کے انتخابی منشور کا اہم وعدہ اجودھیا میں رام مندر بنوانا تھا۔ وہیں دوسری جانب، یہ وعدہ پورا کرنے کے لئے بھاجپا کے پاس پارلیمنٹ میں اتنی اکثریت نہیں تھی۔ ہم این ڈی اے کے کم از کم مشترکہ پروگرام سے بندھے ہوئے تھے، جس میں اجودھیا کے سلسلہ میں بھاجپا کے عزائم شامل نہیں تھے۔ یہ اتحاد کی سیاست کا دباؤ تھا، جسے بھاجپا کے زیادہ تر حامی اچھی طرح سمجھتے تھے۔

اس صورت حال کے سبب دوطرفہ چیلنجز کھڑے ہوئے تھے۔ پہلی بات، مندر آندولن کے حامیوں کی یہ دیرینہ خواہش تھی اور وہ امید لگائے بیٹھے تھے کہ نئی دہلی میں بھاجپا کی قیادت والی سرکار سے ان کے اس خواب کو حقیقت میں تبدیل کرنے کا راستہ کھلے گا۔ ہمیں ان لوگوں کو پھر سے یقین دلانا پڑا کہ اجودھیا کے معاملے پر بھاجپا کے عزائم اٹل ہیں۔ دوسرے، برسر اقتدار اتحاد کے لیڈر کے طور پر بھاجپا کو اپنے اتحاد کے فریقین کو بھی یقین دلانا پڑا کہ وہ این ڈی اے کے مشترکہ پروگرام کے تئیں اٹل ہے۔

مجھے اس بات پر فخر ہے کہ میری پارٹی نے ٹھوس اعتماد اور ایمانداری سے دونوں چیلنجوں کا سامنا کیا۔ میرے معاون اور 2002-2004 کے درمیان بھاجپا کے صدر کے طور پر کام کرنے والے ایم وینکیا نائیڈو کے ذریعہ دیے گئے اس نعرہ میں میری پارٹی کی یہ دونوں خوبیاں منعکس ہوئی ہیں — 'ایک ہاتھ میں بھاجپا کا جھنڈا، دوسرے ہاتھ میں این ڈی اے کا ایجنڈا۔' اس نعرہ سے بھاجپا کے تمام فریقوں کو ان دونوں چیزوں کی آپسی تال میل اور انھیں مضبوط بنانے کی ضرورت کا احساس ہوا۔

اٹل جی اور میں اپنے سینئر معاونین کے ساتھ سنگھ اور وشو ہندو پریشد کے رہنماؤں کے ساتھ مستقل طور پر میٹنگیں کرتے تھے۔ ساتھ ہی اجودھیا مسئلہ پر مختلف مذہبی تنظیموں کے نمائندوں کے ساتھ بھی میٹنگیں ہوتی تھیں۔ ان بات چیت میں ہماری کوشش رہتی تھی کہ وہ اس معاملے پر سرکار کے ٹھوس اعتماد اور مجبوری کو سمجھیں۔ 6 دسمبر 2000 کو پارلیمنٹ میں بولتے وقت وزیر اعظم واجپئی نے تبصرہ کیا 'اجودھیا میں رام مندر کی تعمیر قومی جذبہ کے اظہار کا سبب تھا، جو ابھی تک پورا نہیں ہوا ہے۔'

اس موضوع پر اپنے عزائم ثابت کرنے کا ایک موقع اس وقت آیا، جب یکم اگست 2000 کو اٹل جی اور میں 31 جولائی 2000 کو ایک دن قبل آنجہانی ہو چکے مہنت رام چندر داس پرم ہنس کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے اجودھیا گئے تھے۔ رام جنم بھومی نیاس کے 90 سالہ

صدر 40 کی دہائی سے رام مندر کی تعمیر کے لئے مسلسل کوششیں کرتے رہے تھے۔ سرجوندی کے تلسی گھاٹ پر ہزاروں غمزدہ شردھالوؤں کے سامنے بولتے ہوئے وزیراعظم نے کہا تھا 'رام جنم بھومی پر مندر کی تعمیر مہنت جی کا خواب تھا۔ ہم ان کے اس خواب کو پورا کریں گے۔ ہمیں بھروسہ ہے کہ رام مندر کی تعمیر کی راہ میں آنے والی تمام رکاوٹیں دور ہو جائیں گی۔ مجھے امید ہے کہ اجودھیا میں مندر کی تعمیر کے مخالفین کو بھی صحیح عقل آئے گی۔' اسی موقع پر بولتے ہوئے میں نے کہا تھا کہ مہنت جی کے تئیں سب سے بڑی خراج عقیدت یہی ہوگی کہ 'گربھ گرہ' میں موجود چھوٹے سے مندر کو بھگوان شری رام کے عالیشان مندر وزیارت گاہ میں تبدیل کیا جائے۔ میں نے اعلان کیا تھا 'یہاں پر مندر کی تعمیر یقینی ہے۔'

وشو ہندو پریشد کے صدر اشوک سنگھل نے ان بیانات کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا 'ہمیں اجودھیا میں مندر کی تعمیر کے تئیں وزیراعظم اور نائب وزیراعظم کے عزائم پر فخر ہے۔ ہم مانتے ہیں کہ یہ این ڈی اے کے ایجنڈے اور اتحاد کے اصولوں سے مجبور ہیں، لیکن ہم ان کے نجی خیالات سننا چاہتے تھے۔'

یہاں مجھے وزارت داخلہ میں اپنی مدت کار کے دوران پیش آنے والے ایک دردناک واقعہ کا بھی تذکرہ کرنا چاہئے۔ مندر آندولن کے رہنماؤں کا ماننا تھا کہ وہ قانوناً متنازع ڈھانچہ کے باہر اس علاقہ میں تعمیراتی کام شروع کر سکتے ہیں، جو رام جنم بھومی نیاس کی قانونی ملکیت تھی۔ جنوری 2001 میں پریاگ میں منعقد مہاکمبھ کے موقع پر دھرم سنسد نے مہاشیوراتری (12 رمارچ 2002) تک مندر کی تعمیر میں درپیش تمام رکاوٹیں دور کرنے کی قرارداد منظور کی۔ واضح طور پر مندر آندولن کے کچھ رہنما جواب دیتے۔ تحمل اور ہمدردی سرکار کے ذریعہ قانونی رکاوٹوں کو دور کرنے میں پیش آنے والی رکاوٹوں کے درمیان کشمکش میں مبتلا تھے۔ اس سلسلے میں بات چیت کے ذریعہ کوئی اطمینان بخش حل سامنے نہیں آرہا تھا۔ اسی دوران 24 رفروری 2002 کو مندر آندولن کے رہنماؤں نے مندر تعمیر کی پیشگی مرحلے کے طور پر اجودھیا میں 100 دن کا 'پورنا ہوتی یگیہ' شروع کر دیا۔ ملک میں حالات کشیدہ ہو رہے تھے اور اس وقت وزیر داخلہ کی حیثیت سے میں بھی تشویش میں مبتلا تھا۔

تین دن بعد 27 رفروری کو گجرات کے ایک چھوٹے سے قصبہ گودھرا میں ایک ریل گاڑی روک کر، اس پر حملہ کر کے اسے جلا دیا گیا، جس میں 58 مسافر جن میں سے زیادہ تر اجودھیا سے لوٹنے والے کارسیوک تھے، جل کر مر گئے۔ مارچ کے اوائل میں سرکار کو مندر آندولن کے رہنماؤں سے ایک خط ملا، جس میں 15 رمارچ کو غیر متنازع ایکوائر شدہ اراضی پر عدالتی طور سے پوجا کرنے کی اجازت مانگی گئی تھی۔ سپریم کورٹ نے 'علامتی طور پر یا حقیقی طور پر کسی بھی طرح کی مذہبی سرگرمی کے اہتمام پر روک لگا دی اور حکومت ہند کو بھی اس ایکوائر شدہ اراضی کا کوئی 'حصہ' کسی کو بھی سونپنے سے منع کر دیا۔

دکھ کی بات ہے کہ 17 راکتوبر 2003 کو اجودھیا میں بدبختانہ واقعہ رونما ہوا۔ اس دن وشو ہندو پریشد نے مندر کی تعمیر کے لئے اپنے عزائم کو دوہرانے کے لئے بڑا 'سماگم' منعقد کیا جس سے وشو ہندو پریشد اور اتر پردیش سرکار کے درمیان ٹکراؤ پیدا ہو گیا۔ پوری ریاست میں 30 ہزار سے بھی زائد کارسیوکوں کو بندی بنا لیا گیا۔ مندر کے کیمپس میں داخل ہونے والے کارسیوکوں پر پولس نے لاٹھی چارج کیا۔ پولس نے کئی بار آنسو گیس چھوڑی، سنگھل جی کو دھکے دیئے اور وشو ہندو پریشد کے کئی رہنماؤں کو گرفتار کر لیا۔ یہ میرے لئے بہت تلخ تجربہ تھا۔ ذاتی طور پر میں نے محسوس کیا کہ وشو ہندو پریشد کو یہ پروگرام منعقد کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ ساتھ ہی، چونکہ میں خود اجودھیا آندولن سے جڑا تھا، اس لئے یہ دیکھ کر مجھے ناقابل برداشت تکلیف ہوئی کہ جن لوگوں کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر میں کام کرتا رہا، ان کے ساتھ پولس نے ایسا غلط برتاؤ کیا۔

اجودھیا تنازع حل کرنے کا راستہ

اٹل جی کے دور اقتدار میں حل نکلنا انتہائی یقینی تھا

اجودھیا آندولن میں اہم فریق کے طور پر این ڈی اے کے 6 سال کے دور حکومت میں میری کوشش رہی کہ یہ تنازع جلد از جلد اور پرامن طریقے سے کیسے سلجھایا جاسکتا ہے۔ اس تنازع کے حل کے تین اہم متبادل تھے — (1) قانون کے ذریعہ، (2) عدالتی فیصلہ کے ذریعہ اور (3) ہندو اور مسلم فرقوں کے نمائندوں کے درمیان دوستانہ سمجھوتے کے ذریعہ۔ اجودھیا مسئلہ پر سیاسی اور عدالتی پہلوؤں کے اچھی طرح سے جائزہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ آخری متبادل ہی سب سے بہتر راستہ تھا۔ میں نے مختلف موقعوں پر پارلیمنٹ کے اندر اور باہر اس متبادل کا ذکر بھی کیا تھا۔

مختصراً، میرا یہ خیال تھا کہ 'قانونی حل کی تردید نہیں کی جاسکتی، لیکن اس کا امکان معدوم ہے۔ عدالتی فیصلہ سے دونوں میں سے کسی ایک فریق کو دکھ اور تکلیف ہوگی۔ تیسرے متبادل کی قبولیت اور اس کے استحکام کا امکان زیادہ ہے اور بلاشبہ آپسی قابل قبول سمجھوتے کو بھی عدلیہ کی منظوری لینی ضروری ہوگی، جس سے تمام زیر التوا معاملے ختم ہو جائیں گے۔ اس معنی میں آخری حل متبادل دو اور تین کی مخلوط شکل ہوگی۔'

مجھے خوشی ہے کہ اٹل جی اور میں اس تعمیری نظریہ کی حمایت کرنے کے لئے این ڈی اے کی معاون پارٹیوں کو راضی کرنے میں کامیاب رہے۔ اسی کے مطابق 2004 کے پارلیمانی الیکشن کے لئے اس اتحاد (این ڈی اے) کے انتخابی منشور میں کہا گیا تھا کہ 'این ڈی اے کا اعتماد ہے کہ اجودھیا مسئلہ کے جلد اور دوستانہ حل سے قومی یکجہتی مضبوط ہوگی۔ ہمارا ہمیشہ یہی ماننا رہا ہے کہ اس سلسلے میں عدالتی فیصلہ کو بھی لوگوں کو قبول کرنا چاہئے۔ ساتھ ہی، آپسی بات چیت اور آپسی اعتماد اور خیر سگالانہ ماحول میں ہونے والے ایک روادارانہ سمجھوتے کے لئے بھی کوششوں کو رفتار دینی چاہئے۔'

میں فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اٹل بہاری واجپئی کے 6 برسوں کے دور حکومت میں وزیر داخلہ کے عہدہ پر رہتے ہوئے میں نے دونوں فریقوں کو عدالتی بات چیت کے مشترکہ منچ پر لانے کے لئے اپنی جانب سے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ میری اس کوشش میں ہندو اور مسلم دونوں ہی فریقوں کے باعزم ثالثوں نے تعاون دیا۔ بات چیت کے کئی ادوار کے بعد بالآخر آپسی مفاہمت پر مبنی حل واضح طور پر دکھائی دینے لگا — اور اس طرح رام جنم بھومی پر ایک شاندار رام مندر کی تعمیر کا راستہ بھی ہموار ہونے والا تھا۔ 2004 کے آغاز میں ہی اس آپسی سمجھوتے کے اصول طے کر لئے گئے تھے اور یہ فیصلہ لیا گیا کہ مئی میں ہونے والے چودہویں لوک سبھا کے انتخابات کے فوراً بعد اس کا اعلان کیا جائے گا۔ دراصل یہ فیصلہ اس امید پر لیا گیا تھا کہ لوک سبھا الیکشن میں واجپئی سرکار کو نئی اکثریت ملے گی اور تب وہ اس سمجھوتے کو نافذ کرنے کی ذمہ داری خود لے گی، لیکن بدقسمتی سے ایسا نہیں ہونا تھا۔

پھر بھی، اجودھیا تنازع کو حل کرنے کے لئے تیسرے متبادل — ہندو اور مسلم فرقوں کے درمیان آپسی اعتماد اور روادارانہ ماحول میں ہوئے سمجھوتے — کے تئیں میری اپیل اور اعتماد آج بھی اتنی ہی مضبوط ہے جتنا این ڈی اے کے دور حکومت میں تھی۔ دراصل 6 دسمبر 1992 کے بعد پندرہ برسوں میں قومی نفسیات میں ہونے والے ایک اہم مثبت واقعہ نے میرے اس تصور کو مضبوط کیا۔ آج کوئی بھی سیاسی پارٹی متنازع مقام پر 'بابری مسجد' کی تعمیر نو کی بات نہیں کرتی جبکہ اس وقت مختلف غیر بھاجپا پارٹیوں نے اس کی حمایت میں مطالبہ کیا تھا۔ وقت گزرنے کے

ساتھ تقریباً سبھی نے اس سلسلے میں اپنے قدم پیچھے کھینچ لئے، کیونکہ انھیں پتہ تھا کہ اس زمین پر کوئی ایسی طاقت نہیں ہے جو اجودھیا میں اس کی تعمیرنو کو یقینی بنا سکے۔ ان میں سے کوئی بھی متنازع مقام پر واقع غیر مستقل مندر کو ہٹانے یا مستقل پرار تھناؤں کو روکنے کا مطالبہ نہیں کر رہا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ انھوں نے متنازع مقام پر ہندوؤں کے حقوق کی حمایت کرنا شروع کر دیا ہے۔ وہ سب ایک آواز میں کہتے ہیں— 'عدالت کو اپنا فیصلہ دینے دیجئے۔'

نہ تو مجھے اور نہ ہی میری پارٹی کو عدلیہ کے ذریعہ اس تنازع کو حل کرنے کے تئیں کوئی اعتراض ہے، لیکن ایک فطری سوال کے سلسلے میں ہمارے مخالفین خاموش ہیں۔ عدلیہ پچاس برسوں سے بھی زائد مدت میں اس تنازع کو حل کیوں نہیں کر پائی؟ اور کیا یہ عدلیہ کے لئے مناسب ہے کہ وہ ایسے حساس اور متنازع معاملے کو دہائیوں تک ایسے ہی کھینچتی رہے؟

لیکن میں تو فطرت پر بے پناہ اعتماد رکھتا ہوں۔ مجھے بھروسہ ہے کہ اجودھیا میں رام جنم بھومی پر ایک شاندار اور عظیم الشان مندر کی تعمیر یقینی ہے۔ ایسا کیسے اور کب ہوگا، اس کی اہمیت کم ہے اور یہ آنے والا وقت اور تاریخ ہی بتائے گا، لیکن یہ بات اتنی ہی سچ ہے جتنا کہ سومناتھ مندر کی حملہ آوروں کے ذریعہ بار بار مسماری اور بار ہا اس کی تعمیرنو اور آزادی ملتے ہی اس کی مستقل طور پر مکمل تعمیر۔

> میرے لئے یہ خوشی کی بات ہے کہ صدیوں پرانے ہندو عزم کو پورا کرنے کی اس اجتماعی قومی کوشش میں مجھے اپنا کردار نبھانے کا موقع ملا۔ میری اپنے مسلمان بھائیوں سے صرف اتنی اپیل ہے کہ وہ ہندوؤں کی طرح ہی فراخ دل اور روادار پیش رفت کے ساتھ آگے آئیں۔ آخر یوں تو شری رام ہندوؤں کے عقیدت مندانہ جذبہ سے جڑے ایک مذہبی شخص ہیں، لیکن وہ ہندوستان کی ثقافتی وراثت کی علامت بھی ہیں جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے لئے یکساں اہمیت کے حامل ہیں۔ اس لئے میرا اٹوٹ بھروسہ ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ کوشش سے یہ مشن ضرور پورا ہوگا، جس سے آپسی بھائی چارہ اور قومی یکجہتی و سالمیت کا ایک نیا باب لکھا جائے گا۔

7

پنجاب کا درد اور فتح

دیہی شیوا ور موہے ایہے،
شبھ کرمن سے کبھوں نہ ٹروں
نہ ڈروں اری سو جب جائی لروں،
نشچئے کر اپنی جیت کروں

(اے ایشور! مجھے یہ وردان دو کہ میں کبھی بھی اچھے کاموں سے پیچھے نہ ہٹوں اور کبھی بھی اپنے دشمنوں سے لڑتے ہوئے خوف زدہ نہ ہوں اور یہ یقین رکھوں کہ مجھے فتح ضرور نصیب ہوگی۔)

— گرو گووند سنگھ (1666-1708)، سکھوں کے دسویں گرو

آزاد ہندوستان کی کوئی بھی تاریخ پنجاب میں تڑپانے والے دہشت گردانہ واقعات کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی، جس نے تقریباً ڈیڑھ دہائی تک اس ریاست کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ یہ دہشت گردی درحقیقت ہمارے مخالف پڑوسی ملک کے ذریعہ چھیڑی گئی ایک بالواسطہ جنگ ہی تھی، جو نہ صرف ہندوستان کی طاقت وصلاحیت کا ایک کٹھن امتحان تھا—اپنے اتحاد وسالمیت کو بنائے رکھنے کی صلاحیت کا بھی امتحان تھا۔ اس سے قبل کسی دیگر بحران کے وقت ملک کو ایسے مشکل امتحان سے نہیں گزرنا پڑا تھا۔ وہیں یہ ہندو-سکھ فرقوں کے آپسی میل کا بھی امتحان تھا اور اس کا خاتمہ ہندوستان اور ہندوستان کے عوام کی جیت کی شکل میں ہوا اور دہشت گردی وعلیحدگی پسندی کے غیر ملکی اسپانسروں کی منشا کامیاب نہیں ہو سکی۔

میں فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ قومی یکجہتی کو بنائے رکھنے کے لئے ہندوستان کی اس جدوجہد میں میری پارٹی نے قابل ستائش کردار ادا کیا۔ پنجاب کے ہمارے بیسیوں کارکنان، لیڈر اور سیکڑوں دیگر محب وطن اس لڑائی میں شہید ہو گئے۔ مجھے امید ہے کہ ان کی قربانیوں سے ہمیں ملک کے ایسے دشمنوں کے نفرت آمیز مقاصد کے تئیں بیدار رہنے کی طاقت وترغیب ملتی رہے گی، دور رواں میں بھی اور مستقبل میں بھی۔

اب تقریباً ایک دہائی سے زیادہ عرصہ سے پنجاب میں حالات پرامن ہیں، لیکن ہمیں ہمیشہ یہ یاد رہے گا کہ دہشت گردی کو کچلنے کے لئے ہندوستان کو بھاری قیمت چکانی پڑی ہے۔ اعداد وشمار سے پتہ چلتا ہے کہ 1981 سے لے کر 2001 تک ریاست میں دہشت گردی کے خلاف

وزارت اطلاعات ونشریات



▲ مارچ 1977 میں نئی دہلی میں راج گھاٹ پر وہیل چیئر پر بیٹھے ہوئے لوک نائک جے پرکاش نارائن جنتا پارٹی کے منتخب اراکین پارلیمنٹ کو حلف دلاتے ہوئے۔



▲ 1977 میں نائب صدر جمہوریہ بی ڈی جتی مرارجی ڈیسائی حکومت میں آڈوانی کو کابینی وزیر کا حلف دلاتے ہوئے۔



▲ نومبر 1978 میں کراچی میں اُس وقت کے پاکستانی فوجی حکمراں جنرل ضیاءالحق کے ساتھ اوّلین ہندو پاک کرکٹ میچ کا راست ٹیلی کاسٹ دیکھتے ہوئے آڈوانی۔



▲ آڈوانی ہندی سنیما کے سدابہار اداکار دیو آنند اور (دائیں) فلمی دنیا کی مقبول شخصیات۔ راج کپور، ششی کپور اور رامانند ساگر کے ساتھ۔

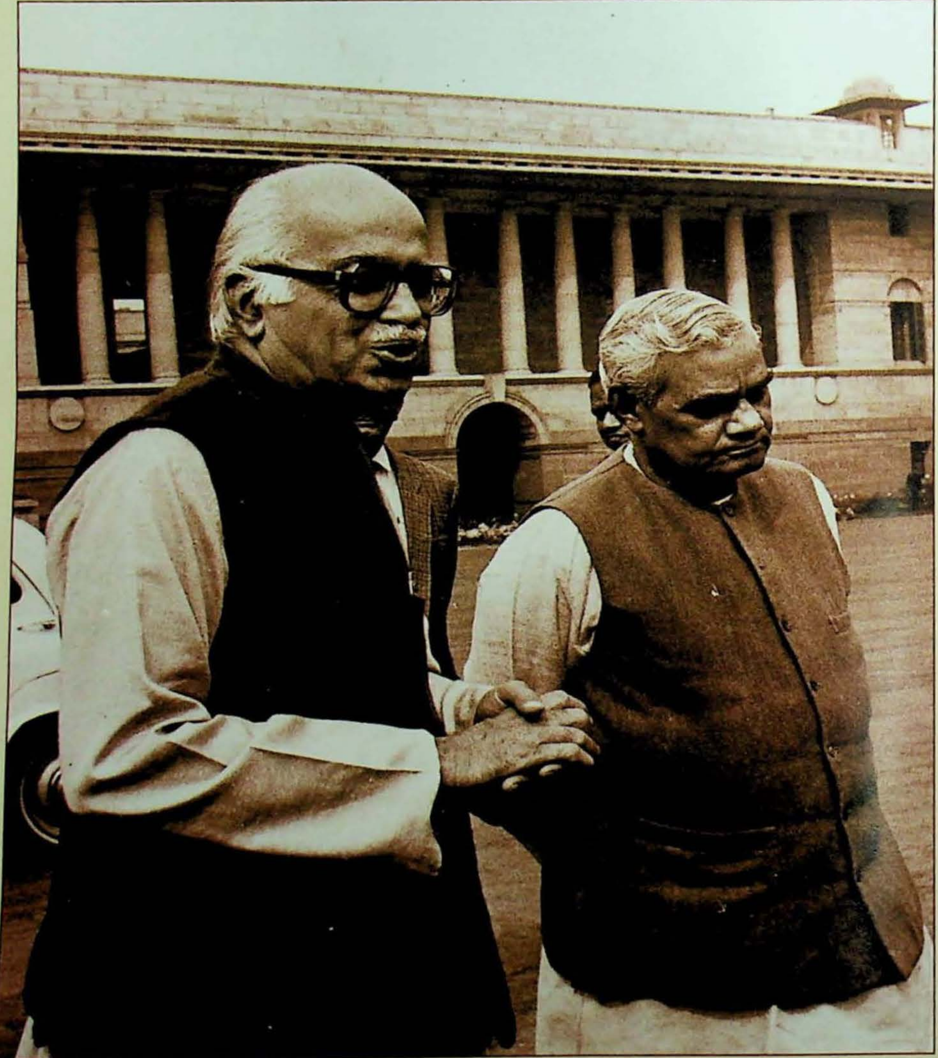


▲ آڈوانی مشہور فلمساز شیام بینیگل کے ساتھ۔



◀ اپنے پسندیدہ فلمساز فلمسار ستیہ جیت رے کے ساتھ اُن کی بیٹی پرتھا۔

بی جے پی کا طلوع



اڈوانی اور اٹل جی۔



▲ نامور قانون داں محمد کریم چھاگلہ 1980 میں ممبئی میں بی جے پی کے افتتاحی اجلاس میں مہمانِ خصوصی تھے۔ جس میں انہوں نے بی. جے. پی کو مستقبل میں کانگریس کا نعم البدل قرار دیا تھا۔ ان کے ساتھ اسٹیج پر مرلی منوہر جوشی، رام جیٹھ ملانی، اٹل جی اور آڈوانی۔



▲ بی. جے. پی اراکین پارلیمنٹ کے ساتھ راشٹر پتی بھون تک مارچ میں اڈوانی ساتھ میں اٹل جی، ڈاکٹر مرلی منوہر جوشی اور سکندر بخت۔



◀ 1980 اور 1990 کی دہائیوں کے شروعاتی برسوں میں بی جے پی نے پنجاب میں پاکستان کی شہ پر خالصتانی دہشت گردی کی ڈٹ کر مخالفت کی، پنجاب بی جے پی کے صدر ڈاکٹر بلدیو پرکاش کے ساتھ آڈوانی۔

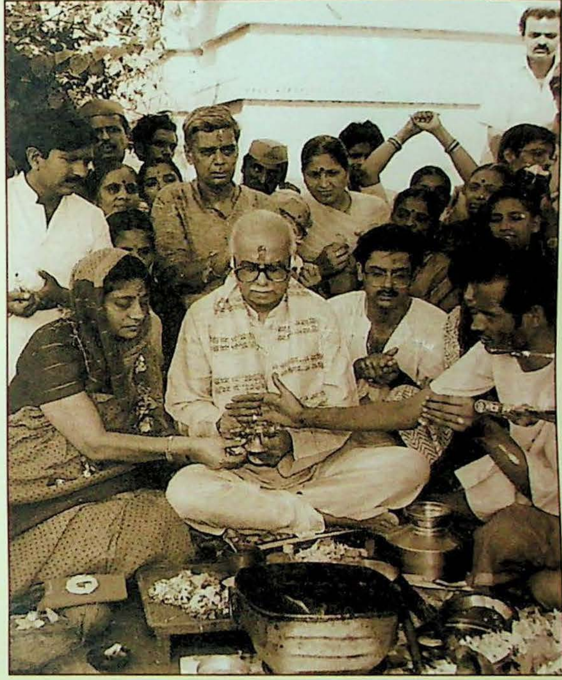
اجودھیا تحریک



پربھوشری رام ہندوستانی وقار، اتحاد اور سالمیت کی بے نظیر علامت ہیں۔ وہ ہندوستانیوں کے اُصولِ حیات کے مرکز بھی ہیں اس لیے اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں ہے کہ صدیوں سے اجودھیا شری رام کے جنم استھان اور ہندوؤں کی عقیدت کا مرکز رہا ہے۔



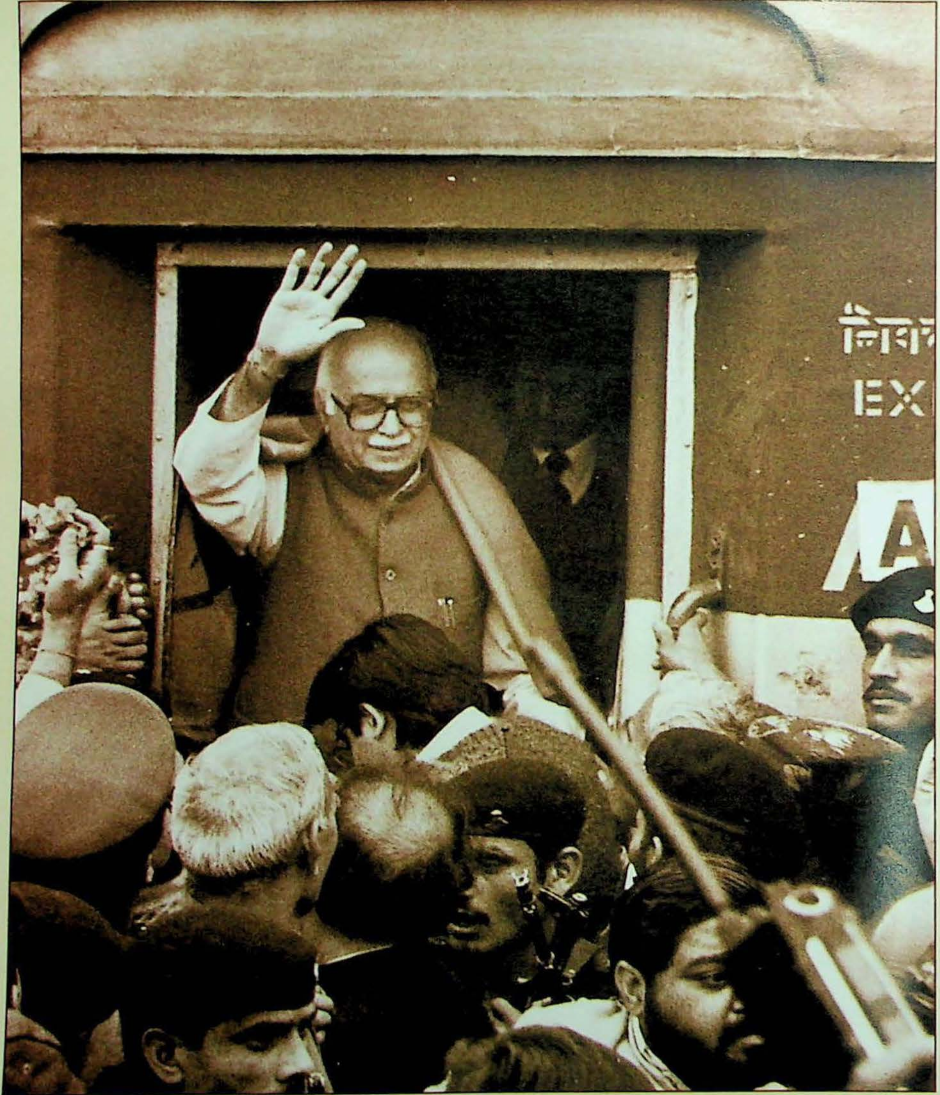
▲ گجرات میں سوم ناتھ مندر کے کنارے پر آڈوانی۔ آزادی کے بعد اس مندر کی تعمیرِ نو نے اجودھیا آندولن کا تصور پیدا کیا۔



◀ رام رتھ یاترا کے آغاز کے موقع سے متعلق یگیہ میں حصہ لیتے ہوئے آڈوانی ساتھ میں ہیں اہلیہ کملا، بیٹا جینت اور پارٹی کے کارکنان۔



▲ 1990ء میں سوم ناتھ سے اجودھیا تک کی آڈوانی کی رام یاترا اُن کی سیاسی زندگی کا اہم پڑاؤ بن گئی۔



▲ اجودھیا پہنچنے سے قبل ہی 30/اکتوبر 1990 کو آڈوانی کی دس ہزار کلومیٹر لمبی رتھ یاترا کو بہار میں روک لیا گیا۔ انہیں سمستی پور میں گرفتار کر کے پانچ ہفتوں تک مسانجور میں قید رکھا گیا۔ رہائی کے بعد آڈوانی کا دہلی واپسی پر لوگوں نے زبردست خیر مقدم کیا۔





▲ سندر سنگھ بھنڈاری، جو بی جے پی کے بنیادی ستونوں میں سے ایک تھے۔

◄ باہمی اشتراک اور تعاون کے دوستون اٹل جی اور آڈوانی۔

▼ آڈوانی سنگھ کے سابق سربراہ رجو بھیا اور رام رتھ یاترا کے معاون پرمود مہاجن (بائیں) اور گوپی ناتھ منڈے (دائیں) کے ساتھ۔



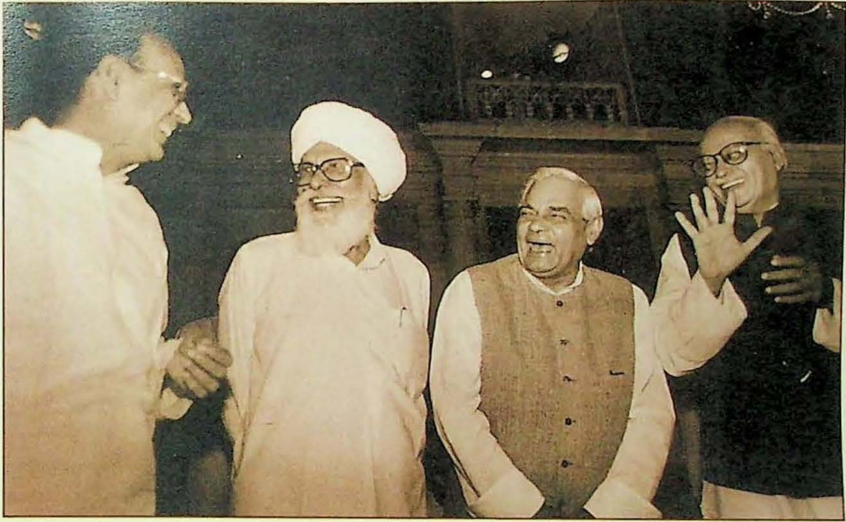
بڑھتے قدم

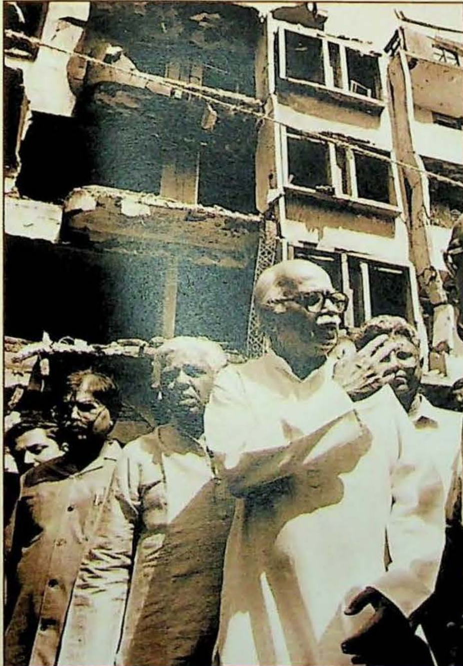




▲ اپریل 1997 میں حوالہ معاملہ میں دہلی ہائی کورٹ سے بدعنوانی کے الزام سے بری ہونے کے بعد اٹل جی مٹھائی کھلا کر آڈوانی کا خیر مقدم کرتے ہوئے۔

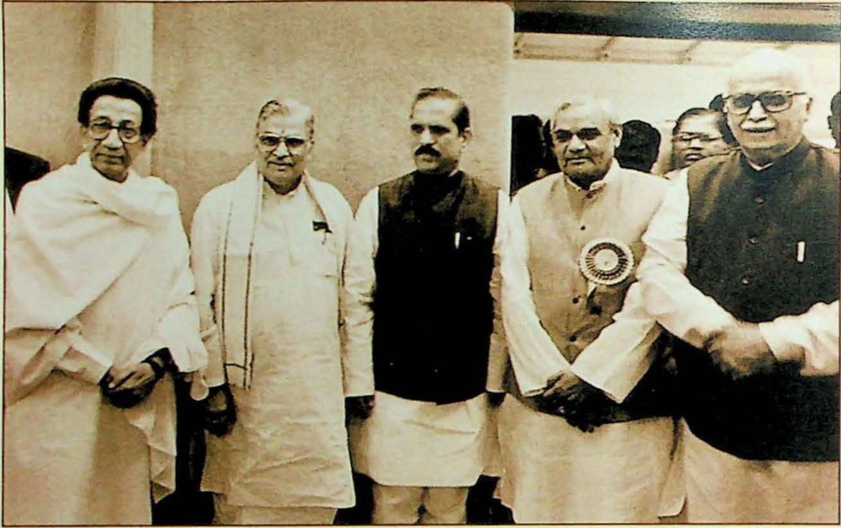
◄ سابق وزیر اعظم پی وی نرسمہا راؤ کے ساتھ آڈوانی۔



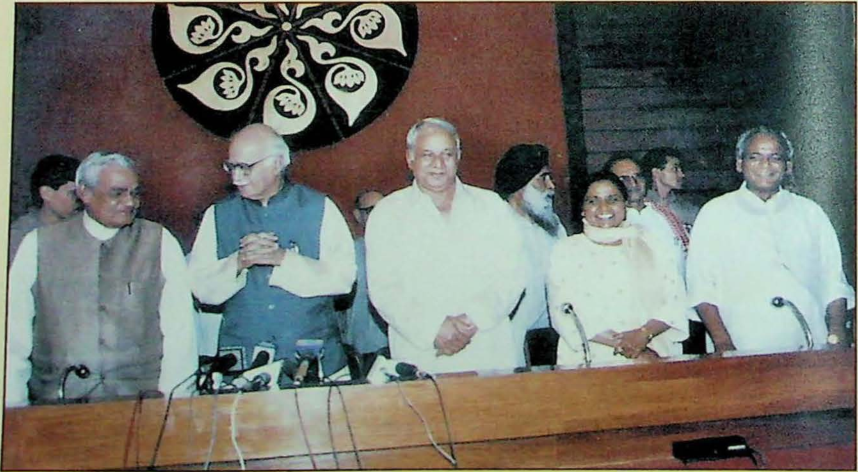


▲ 1989 میں خوشگوار ماحول میں اٹل جی، آڈوانی،
سابق وزیراعظم وی پی سنگھ اور سی پی آئی (ایم) لیڈر
ہرکشن سنگھ سرجیت کے ساتھ۔

◄ 12 رمئی 1993ء کو ممبئی میں سیریل بم دھماکوں
میں 250 سے زاید افراد ہلاک ہوئے تھے۔ جائے
حادثہ کا معائنہ کرتے ہوئے آڈوانی۔



▲ بی جے پی صدر کی حیثیت سے آڈوانی نے مختلف سیاسی جماعتوں کے درمیان گٹھ بندھن کے لیے مثبت پہل کی تھی۔ 1989 میں شیوسینا کے قائد بال ٹھاکرے، مرلی منوہر جوشی، شیوسینا لیڈر و مہاراشٹر کے سابق وزیر اعلیٰ منوہر جوشی اور اٹل جی کے ساتھ آڈوانی۔



▲ 1995 میں بہوجن سماج پارٹی کے بانی کانشی رام مایاوتی اور کلیان سنگھ کے ساتھ — اُتر پردیش میں مایاوتی کی قیادت میں بی جے پی، بی ایس پی اتحاد کی سرکار دوبارہ بنی۔

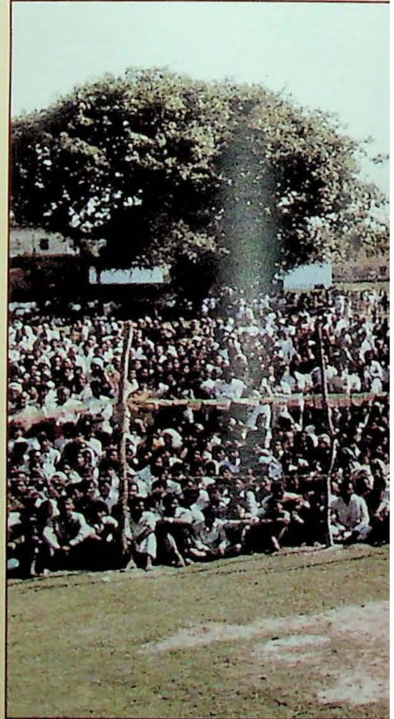


▲ کرشن لال شرما، بھیروں سنگھ شیخاوت، جسونت سنگھ، سشما سوراج اور دیپک چوپڑا کے ساتھ آڈوانی۔

اتر پردیش میں ایک سیاسی ریلی سے خطاب کرتے ہوئے آڈوانی۔



▲ 1995 میں بی جے پی کے ممبئی اجلاس میں پارٹی صدر کی حیثیت سے آڈوانی نے 1996 کے پارلیمانی انتخابات کے لئے اٹل جی کو وزیر اعظم کے عہدے کے اُمیدوار کے طور پر پیش کیا، ساتھ میں مرلی منوہر جوشی، منوہر جوشی، گوپی ناتھ منڈے، بھیروں سنگھ شیخاوت اور مدن لال کھورانہ۔





▲ ایک ٹی وی انٹرویو کے لیے آڈوانی کو تیار کرتے ہوئے بی بی سی کے نامور صحافی مارک ٹلی۔

یاترائیں



▲ اپریل 2005 میں راجکوٹ میں بھارت سرکشا یاترا کے مبارک آغاز پر
آڈوانی گجرات کے وزیر اعلیٰ نریندر مودی کے ساتھ۔



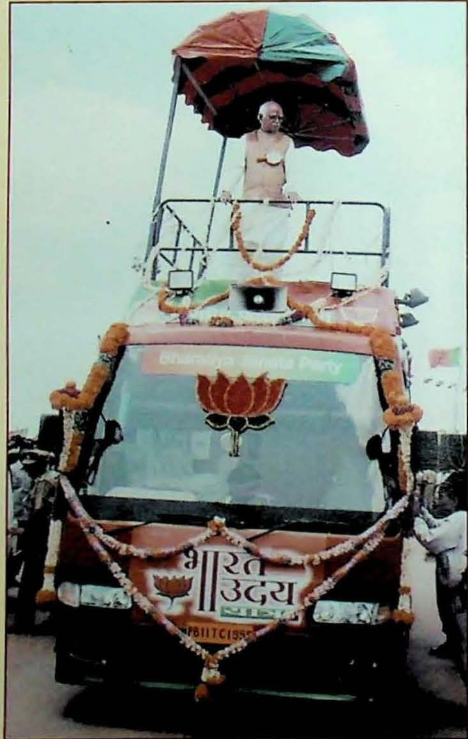
▲ مئی 1997 میں ممبئی سورن جینتی یاترا کے آغاز پر اسٹیج پر جارج فرنانڈیز (بائیں سے چوتھے) اور اٹل جی۔



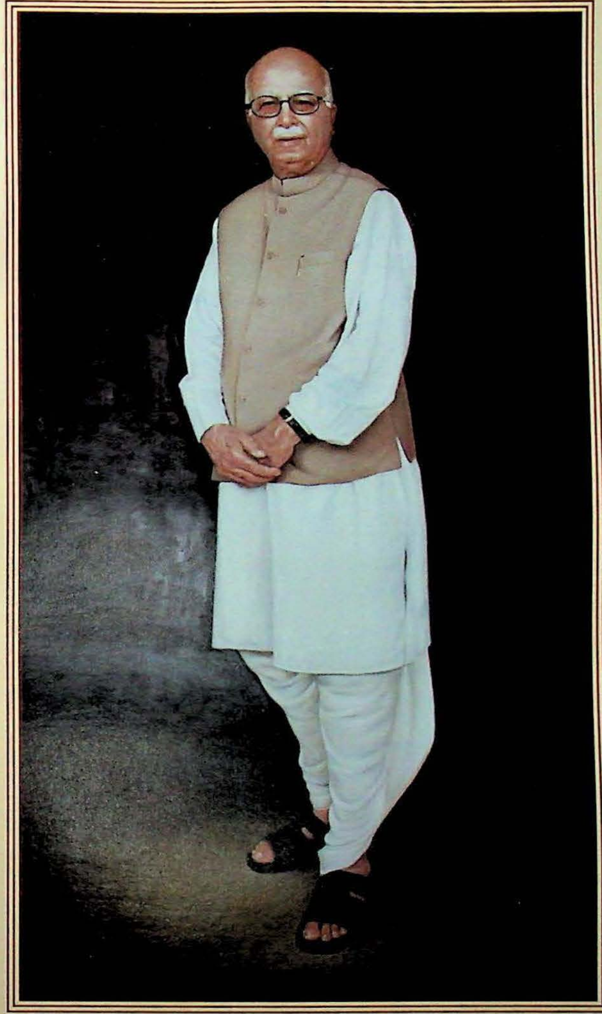
▲ بنگال سے گجرات سورن رتھ یاترا۔



▲ سورن جینتی رتھ یاترا کے دوران جبل پور میں زلزلہ سے
متاثرہ مکانات کا معائنہ کرتے ہوئے آڈوانی۔



▶ 2004 میں کنیا کماری میں بھارت اُدے یاترا کے
آغاز کے وقت رتھ یاترا پر سوار آڈوانی۔



اپنے طویل سیاسی سفر میں وقتاً فوقتاً مجھے سونپی گئی چھوٹی بڑی ذمہ داریوں کو میں نے پوری
دیانتداری، فعالیت اور خلوص کے ساتھ پورا کیا ہے۔ اسی نے عوامی زندگی میں
میری خوداعتمادی کو تقویت عطا کی ہے۔

لڑائی میں کل 21608 لوگ مارے گئے، جن میں سے 11776 عام شہری اور 1748 سیکورٹی اہلکار شامل ہیں۔ مجھے یاد ہے، جب ریاست میں دہشت گردی اپنے عروج پر تھی، اس دوران کوئی بھی ماہ ایسا نہیں جاتا تھا، جس میں کسی نہ کسی دن مجھے پنجاب کے دورے پر نہ جانا پڑا ہو۔ کبھی قتل یا قتل عام کے واقعہ کا جائزہ لینے کے لئے تو کبھی اپنی پارٹی کے کسی معاون کارکن یا دیگر شہید کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے۔

1988 میں ایک پارلیمانی وفد کے رکن کے طور پر میں بلغاریہ کے دورے پر گیا۔ صوفیا — بلغاریہ کی خوبصورت راجدھانی — پہنچنے کے کچھ ہی گھنٹوں بعد ہمیں چنڈی گڑھ سے ایک انتہائی دلخراش واقعہ کی خبر ملی — بی جے پی کی پنجاب اکائی کے صدر ہتا بھیلاشی کی ایک دہشت گردانہ حملے میں موت ہوگئی تھی۔ میں فوراً وہاں سے واپس وطن کے لئے چل پڑا۔

پنجاب کی دہشت گردی کا اثر ریاست کی سرحدوں سے باہر پورے ہندوستان کی سماجی وسیاسی حالت پر افسوسناک اور دوررس نتائج کے ساتھ پڑ رہا تھا۔ 30 / اکتوبر 1984 کو دو سکھ باڈی گارڈوں کے ذریعہ وزیر اعظم اندرا گاندھی کا قتل ان کی سرکاری رہائش گاہ کے اندر ہی کردیا گیا۔ اس واقعہ کے بعد راجدھانی اور شمالی ہند کے کچھ دیگر شہروں میں مسلسل پانچ دنوں تک سکھ مخالف قتل وقتل عام کا سلسلہ جاری رہا، جس میں 3 ہزار بے قصور افراد مارے گئے اور پورا سرکاری نظام خاموش تماشائی بن کر بیٹھا رہا۔

پنجاب یا یوں کہیں کہ پورے ہندوستان کو اس مشکل امتحان اور تکلیف سے کیوں گزرنا پڑا؟ کیا اسے بچایا یا روکا جاسکتا تھا؟ غلطی کہاں ہوئی تھی اور ان غلطیوں سے ہم کیا سبق لے سکتے ہیں؟

مسئلہ کی تاریخی جڑیں

پنجاب — ہندوستان کی جنگ آزادی کے امر جنگجو — شہید بھگت سنگھ کی دھرتی ہے۔ یہ غدر کے انقلابیوں لالہ لاجپت رائے، بھائی پرمانند اور دیگر بے شمار محبان وطن کا بھی گھر ہے۔ دیگر کسی بھی دھرتی نے 1947 سے قبل یا بعد میں ہندوستان کے لئے پنجاب سے زیادہ قربانیاں نہیں دی ہیں۔ پنجاب سنتوں، صوفیوں اور گروؤں کی بھی زمین رہی ہے۔ سکھ دھرم کے بانی اور سکھوں کے پہلے گرو — گرونانک دیو یہیں پیدا ہوئے تھے۔ ہندو دھرم اور ہندوؤں کے تحفظ میں سکھوں نے جتنی بہادری سے لڑائی لڑی ہے، اتنی بہادری سے لڑائی کسی دیگر فرقہ نے نہیں لڑی ہے۔ تین سو سال پہلے اس وقت کے راسخ العقیدہ مسلم حکمرانوں سے ہندوؤں اور ہندو دھرم کو بچانے کے لئے خالصہ پنتھ کا قیام سکھوں کے دسویں گرو — گروگووند سنگھ نے کیا تھا۔ سکھوں اور ہندوؤں کے درمیان سماجی، ثقافتی وروحانی تعلق اتنے مضبوط اور کثیر جہتی ہیں کہ ان کا بھائی چارہ دنیا کی مذہبی تاریخ میں بالکل بے مثال رہا ہے۔

سندھ میں میرے خاندان میں بھی 'گروگرنتھ صاحب' کا پاٹھ سب سے اہم مذہبی عمل میں شامل تھا۔ پنجاب کے ہندو خاندانوں میں سب سے بڑے بیٹے کو پگڑی دھاری سکھ بنا کر سکھ دھرم کی مضبوطی میں کردار ادا کرنے کی روایت رہی ہے۔ اتنا ہی نہیں، دونوں فرقوں کے بہت سارے تہوار بھی مشترکہ ہیں۔ بین کمیونٹی شادی عام ہے اور اسی طرح ہندوؤں کو گرودوارے میں متھا ٹیکتے اور سکھوں کو ہندو مندروں میں پوجا کرتے دیکھا جاسکتا ہے، لیکن اس تاریخی وروایتی سچائی کو جھٹلاتے ہوئے سکھ فرقہ کو ایک الگ ملک کا مطالبہ کرنے کے لئے اکسایا گیا اور یہ سب کچھ ایک نفرت آمیز سازش کا حصہ تھا۔

اس مسئلہ کی جڑ — جس نے پنجاب میں علیحدگی پسندگی اور دہشت گردی کی گھناؤنی شکل اختیار کرلی — نوآبادیاتی دور کے دوران

انگریزوں کی 'پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو' کی نفرت آمیز پالیسی میں پنہاں تھی۔ انگریزوں کی شہہ پر ہی مسلمانوں کے ایک طبقہ نے 1909 کے 'منٹو-مارلے ریفارمس'★ کے تحت اپنی کمیونٹی کے لئے الگ نمائندگی کا مطالبہ کیا تھا۔ اس نے سکھوں کے ایک طبقہ کو بھی اس طرح کا مطالبہ کرنے کے لئے اکسایا۔ بعد میں جب مسلم لیگ نے 'ہندو بھارت' سے الگ مسلمانوں کے لئے پاکستان کی شکل میں الگ ملک کا مطالبہ کیا تو سکھ فرقہ کے مٹھی بھر لوگوں نے بھی اپنی کمیونٹی کے لئے یہ کہتے ہوئے الگ ملک کا مطالبہ شروع کر دیا کہ 'مسلمانوں کو پاکستان مل گیا، ہندوؤں کو ہندوستان مل گیا، ہم سکھوں کو کیا ملا؟' حالانکہ سکھ فرقہ کے اکثریتی طبقہ نے اس کی حمایت نہیں کی، کیونکہ وہ خود کو وسیع ہندوستانی کنبہ کا ایک اٹوٹ حصہ مانتا تھا اور جسے ہندوستان کی تحریک آزادی میں اپنی فرقہ کے ذریعہ دی گئی قربانیوں پر فخر تھا۔

پنجاب کی اسٹریٹجک پوزیشن اور سکھ فرقہ کی خصوصی تاریخ اور نسلی خصوصیات کو دھیان میں رکھتے ہوئے کانگریس پارٹی اور اس کی مرکزی سرکار کو ریاست سے جڑے معاملوں پر سنجیدہ اور ہمدردانہ رویہ اپنانے کی ضرورت تھی، لیکن بدقسمتی سے آزادی کی حصولیابی کے بعد ایسا نہیں ہوا۔ 50 کی دہائی میں زبان کی بنیاد پر ریاستوں کی تشکیل نو کے مطالبہ پر پنڈت نہرو کے تحت اور غیر جمہوری رویے سے ملک کے مختلف حصوں میں بدامنی پیدا ہو گئی تھی۔ گرچہ زبان کی بنیاد پر 1956 میں کئی ریاستوں کی تشکیل نو کی گئی تھی، لیکن ماسٹر تارا سنگھ کی قیادت میں اکالی دل کے پنجابی صوبہ یا پنجابی زبان کی بنیاد پر ریاست کے مطالبہ کے تئیں مرکز میں کانگریس کی سرکار بے حس بنی رہی۔

دو عوامل نے حالات کی سنگینی کو اور بڑھانے کا کام کیا۔ پہلا، غیر منقسم پنجاب میں اس وقت پنجابی بولنے والے لوگ اکثریت میں نہیں تھے۔ دوسرا، غیر منقسم پنجاب میں سکھ فرقہ اکثریت میں نہیں تھا۔ اپنے سیاسی مفاد کی خاطر کانگریس پارٹی نے ان حالات کا انتخابی فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ سکھ اکثریتی خطہ کے لئے اکالی دل کے الگ پنجابی صوبہ کے مطالبہ کو غلط معنوں میں پیش کیا گیا۔ اس کے سبب کئی پنجابی زبان بولنے والے ہندوؤں نے 1951 اور ★ 1961 کی مردم شماری میں ہندی کو اپنی مادری زبان قرار دیا۔ اس سے ریاست کے علیحدگی پسند عناصر کو یہ کہنے کا موقع مل گیا کہ مرکز نے 'سکھوں کے دھرم، زبان اور ثقافت کو تباہ کرنے کے لئے سازش رچی ہے۔' اس دوران اکالی دل کے مطالبہ کی حمایت میں بڑے بڑے لیکن پرامن مظاہرے ہوئے۔ اس سے پنجاب کے ہندوؤں اور سکھوں کے درمیان ایک بڑی خلیج تیار ہو سکتی تھی، خاص تشویش کی بات یہ تھی کہ پنجابی صوبہ کے مطالبہ کے معاملے میں پاکستان گہری دلچسپی لے رہا تھا اور اپنی یومیہ ٹیلی ویژن اور ریڈیو نشریات میں وہ تحریک کے لئے 'پاکستان کی جانب سے مکمل حمایت' کی یقین دہانی بھی کراتا رہتا تھا۔

آخرکار ستمبر 1966 میں اندرا گاندھی کی سرکار نے الگ پنجابی صوبہ کا مطالبہ قبول کرتے ہوئے پورے صوبہ کو جنوب میں ہریانہ اور شمال میں ہماچل پردیش میں تقسیم کر دیا، لیکن اب بھی کانگریس پارٹی اکالی دل کو اہمیت دینے کے لئے تیار نہیں تھی، جبکہ پنجاب کی سیاست میں اکالی دل کو اکثریتی فرقہ کی حمایت ہمیشہ حاصل رہی ہے۔ چونکہ کانگریس مرکز اور ریاست دونوں سطحوں پر 'ایک پارٹی' حکومت کی عادی ہو چکی تھی، اس

★ برطانوی پارلیمنٹ کے ذریعہ پاس کردہ حکومت ہند ایکٹ 1909، جسے منٹو-مارلے ریفارمس کے نام سے بھی جانا جاتا ہے، ہندوستانیوں کو مرکزی و ریاستی قانون ساز کونسلوں میں محدود کردار ادا کرنے کی اجازت دیتا تھا۔ پرائمری ووٹروں میں اعلیٰ طبقہ کے ہندوستانیوں کا ایک بہت چھوٹا گروپ تھا، جسے جائیداد اور تعلیم کے سبب ووٹ ڈالنے کا حق حاصل تھا۔

★ میں نے پہلے بھی تذکرہ کیا تھا کہ ہندو-سکھ ایکتا کو بنائے رکھنے کے لئے اس وقت کے سرسنگھ چالک شری گروجی نے پنجاب کے ہندوؤں کو اپنی مادری زبان پنجابی قرار دینے کی اپیل کی۔

لئے اس نے پنجاب میں اکالی دل کے اثر کو دبانے کی کوشش کی اور اس کے لئے اکثر وہ غیر جمہوری اور حسب ممکن خطرناک طریقوں کا استعمال کرنے سے بھی نہیں چوکتی تھی۔

ایک ہی مثال سے یہ بات پوری طرح واضح ہوسکتی ہے۔ 1967 کے ریاستی اسمبلی انتخابات میں پنجابی بولنے والی ریاست کے قیام کے لئے چلائی گئی اپنی تحریک کی کامیابی کے زور پر اکالی دل واحد سب سے بڑی سیاسی پارٹی کی شکل میں ابھرا تھا۔ جن سنگھ اور دوسری چھوٹی چھوٹی پارٹیوں کی حمایت سے اپنی سرکار بنائی اور اس طرح پنجاب ہائی کورٹ کے سابق چیف جسٹس گرنام سنگھ پنجاب کے وزیر اعلیٰ بنے، لیکن اس کے باوجود کانگریس اس مینڈیٹ کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھی۔ اس لئے گرنام سنگھ کی سرکار کو گرانے کے لئے اس نے ایک چال چلی۔ اکالی دل کے رہنماؤں کو توڑ کر اس نے باغی اکالی رہنما لکشمن گل کو حمایت دے کر انھیں سرکار بنانے کے لئے تیار کرلیا۔ واضح رہے کہ غیر اخلاقی طریقے سے تشکیل شدہ اس سرکار میں وزیر خزانہ کا عہدہ ڈاکٹر جگجیت سنگھ چوہان کو دیا گیا تھا، جو بعد میں 'خالصتان کا (خودساختہ) صدر' بنا تھا۔

اندرا گاندھی کے آمرانہ مزاج کے سبب پنجاب کی صورت حال بد سے بدتر ہوگئی تھی۔ اکالی دل کے بہت سارے رہنماؤں کے ساتھ پرکاش سنگھ بادل کو بھی ایمرجنسی کے دوران جیل میں ڈال دیا گیا، جن کی سرکار کو 1971 میں ناجائز طریقے سے برخاست کردیا گیا تھا۔ آزاد بھارت میں سردار پرکاش سنگھ بادل، جن کی وطن پرستی غیر مشتبہ رہی ہے اور ان سے زیادہ جیل کی سزا کسی بھی سیاسی فرد نے نہیں بھگتی ہوگی، کو تقریباً 13 سال سلاخوں کے پیچھے زندگی گزارنی پڑی۔ ملک میں جمہوریت کا گلا دبا کر اپنا سیاسی مفاد پورا کرنے میں مصروف کانگریس سرکار نے اس خطرناک سازش کی جانب توجہ نہیں دی، جو سرحد کے اس پار رچی جارہی تھی۔

پنجاب میں دہشت گردی کے پیچھے پاکستان کا باغیانہ ہاتھ 1971 کی جنگ میں ہندوستان سے بری طرح شکست کھانے اور بنگلہ دیش کے الگ ملک بن جانے سے بوکھلائے پاکستان کے ہند مخالف عناصر نے ایک اہم نتیجہ اخذ کیا — چونکہ ہندوستان کو راست جنگ میں نہیں ہرایا جاسکتا، اس لئے دہشت گردی، تباہی اور فرقہ وارانہ تشدد پھیلا کر اس کے خلاف بالواسطہ جنگ چھیڑنا ہی اسے کمزور کرنے کا سب سے اچھا طریقہ ہے۔ 1977 میں پاکستان کے اقتدار پر قابض جنرل ضیاء الحق نے ایک نئی حکمت عملی کا انتخاب کیا، جس کے تین مقاصد تھے — پہلا، ہندوستان کو توڑنا، دوسرا ہندوستان کے اندر اپنی سرگرمیوں کو انجام دینے کے لئے آئی ایس آئی (انٹر سروسز انٹیلیجنس) کو تعینات کر کے مقامی جنگجوؤں اور سلیپر سیل کا وسیع نیٹ ورک (جال) تیار کرنا اور تیسرا اپنی سرگرمیاں چلانے کے لئے نیپال اور بنگلہ دیش سے متصل ہندوستان کی سرحدوں کا فائدہ اٹھا کر وہاں اپنے اڈے تیار کرنا۔

جموں و کشمیر میں دہشت گردی اور علیحدگی پسندی پھیلانے کے لئے اس حکمت عملی کو کس طرح بروئے کار لایا گیا تھا، اس کے بارے میں آگے تذکرہ کروں گا۔ یہاں اتنا بتا دینا ضروری ہے کہ دہشت گردی و علیحدگی پسندی کو بڑھاوا دینے کے لئے پاکستان کی حکمت عملی میں پنجاب اور جموں و کشمیر کے درمیان کی باجواز اور فوجی مینجمنٹ دونوں کڑی شامل تھی۔

جیسا کہ امرتسر کے کیمونسٹ رہنما ستیہ پال ڈانگ — خالصتان کے خلاف باہمت مہم کے لئے جن کی میں تعریف کرتا ہوں — نے اپنی کتاب 'ٹیررزم ان پنجاب' میں تحریر کیا ہے — 'سکھ انتہا پسندوں کو مدد وحمایت دے کر پاکستان پنجاب کو ہندوستان سے الگ کر کے اسے خود ہتھیانا چاہتا تھا۔' ڈانگ کے مطابق 'اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں ہے کہ علیحدگی پسند تحریک خاص طور پر دونوں سرحدی اضلاع امرتسر اور

گرداس پور میں ہی مرکوز تھا۔ ان اضلاع کے غیر مستحکم ہو جانے کی حالت میں ہندوستان پنجاب اور کشمیر کے درمیان کے انتہائی اہم رابطہ راستہ پر سے اپنا کنٹرول کھو بیٹھتا۔'

اس لئے خالصتانی تحریک اور اس کے لئے دہشت گردی کو مدد اور حوصلہ دینا پاکستان کی سرکاری پالیسی کا ایک اٹوٹ حصہ بن گئی۔ یہ مدد کئی شکلوں میں دی جا رہی تھی — ہتھیار، گولہ بارود، تربیت چھپنے کے لئے محفوظ مقام، رقم، ریڈیو اور ٹیلی ویژن اور اخبارات کے توسط سے جھوٹی تشہیر اور ہندوستان کے خلاف سکھوں کو بھڑکانے اور انھیں مدد دینے کے لئے سفارتی وسائل کا استعمال، جرنیل سنگھ بھنڈراوالے ★ کے حامی نوجوانوں کو سرحد پار کر کے پاکستان پہنچنے میں مدد کرنا اور سکھ تاریخ کو توڑ مروڑ کر پیش کرتے ہوئے انھیں ہندوؤں کے خلاف بھڑکانا اور سرحد پار میں واقع کیمپوں میں تربیت ایک اہم حصہ ہوتا تھا۔ آئی ایس آئی کے ایجنٹ پاکستان کے مختلف سکھ مذہبی مقامات پر جانے والے ہندوستانی سکھوں کو پھسلا کر اپنے جال میں پھنسا لیتے تھے۔ 'خالصتان' کے کئی خود ساختہ ترجمانوں کے ساتھ بھی ان کے تار جڑے ہوئے تھے، جن میں گنگا سنگھ ڈھلوں، جگجیت سنگھ چوہان، گرمیت سنگھ الکھ وغیرہ شامل تھے جو کناڈا، برطانیہ اور امریکہ میں رہتے تھے۔

جنرل ضیاء الحق پنجاب میں پھیلی دہشت گردی کے پیچھے پاکستان کا ہاتھ ہونے کی بات سے مسلسل انکار کرتے رہے، لیکن ثبوت اس کے برخلاف کہانی بیان کر رہے تھے۔ دو باتوں سے یہ کہانی واضح ہو جائے گی۔ 1985 میں خالصتان نیشنل کاؤنسل نے پاکستان کے اس وقت کے صدر کو ایک خط لکھا تھا، جس میں لکھا گیا تھا — 'ہندو سرکار سکھوں کو کچل رہی ہے، لیکن سکھ جنگجو اس کا مردانہ وار مقابلہ کر رہے ہیں۔ عام سکھ بھی اس لڑائی میں مدد کر رہے ہیں، لیکن آپ کی جانب سے ہتھیار، گولہ بارود، تربیت اور پناہ گاہ کی شکل میں ہمیں جو امداد ملی ہیں، اس کے لئے ہم آپ کے احسان مند ہیں۔ امریکہ اپنے اس چہیتے 'سرحدی ملک' یعنی پاکستان کی کرتوتوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ فروری 1994 میں سی بی سی ٹیلی ویژن کے ساتھ اپنے ایک انٹرویو میں رابرٹ گیٹس — جو جارج بش (سینئر) کے ڈپٹی نیشنل سیکورٹی ایڈوائزر تھے اور ان کے بعد جارج بش (جونیئر) کے ماتحت دفاعی سکریٹری تھے — نے کہا تھا 'مئی 1990 میں جب صدر بش نے مجھے پاکستان اور ہندوستان بھیجا گیا تھا، اس وقت میں نے پاکستان کے صدر سے خصوصی درخواست کی تھی کہ وہ ان تربیتی کیمپوں کو بند کر دیں، جہاں لوگوں کو کشمیر اور ہندوستانی پنجاب میں اپنی سرگرمیاں چلانے کے لئے تربیت دی جا رہی ہے۔

انتہا پسندی کی حوصلہ افزائی میں کانگریس کا کردار

جولائی 1979 میں جنتا پارٹی کی سرکار گر جانے کے سبب پنجاب میں انتہا پسندی پھیلانے کے لئے پاکستان نے ہندوستان میں پیدا ہونے والے عدم استحکام کا فائدہ اٹھایا۔ بعد میں 1980 کے نصف اوّل میں جب اندرا گاندھی اقتدار میں آئیں تو ملک میں انتہا پسندی کی حوصلہ افزائی کی خودکش پالیسی دیکھی گئی۔ یہی نہیں، اکالی دل کے خلاف کانگریس کی لڑائی میں اور کانگریس کے اندر گروپ بازی کی لڑائی میں بھی انتہا پسندوں کو استعمال کرنے کی پالیسی دیکھی گئی۔ 70 کے نصف آخر میں اکالی تخت نے نرنکاری برادری کے بائیکاٹ کرنے کا حکم نامہ

★ پنجاب میں انتہا پسند اور علیحدگی پسند تحریک کے اہم ہیرو بننے سے پہلے جرنیل سنگھ بھنڈراوالے (84-1947) کو دیہی پنجاب میں ایک مذہبی ناصح کے طور پر تھوڑا بہت جانا جاتا تھا۔ اپنے مسلح حامیوں کے ساتھ امرتسر میں گولڈن ٹیمپل میں پناہ لے کر اس نے ہندوستان کو چیلنج کیا تھا۔ 1984 میں جون کے پہلے ہفتہ میں ہندوستانی فوج کے ذریعہ کیے گئے 'آپریشن بلیو اسٹار' کے دوران ان سبھی کو مار گرایا گیا۔

جاری کر دیا۔★ نتیجتاً بھنڈرا والے کے حامیوں اور نرنکاریوں کے درمیان کئی پرتشدد جھڑپیں ہوئیں۔ اپریل 1980 میں ایسی ہی جھڑپ میں نرنکاریوں کے رہنما بابا گربچن سنگھ کا گولی مار کر قتل کر دیا گیا، جس میں قتل کے ملزم 20 لوگوں میں ایک بھنڈراں والے کا نام بھی تھا۔ بعد میں تمام 20 لوگوں کو چھوڑ دیا گیا۔ بھنڈراں والے کے بارے میں اس وقت کے وزیر داخلہ گیانی ذیل سنگھ نے کہا تھا کہ قتل میں ان کا ہاتھ نہیں تھا۔

پنجاب میں انتہا پسندی سے جڑا ایک دیگر واقعہ 9 ر ستمبر 1981 کا ہے، جب ہندی اخبار گروپ کے بانی اور پنجاب میں صحافت کی جانی مانی ہستی لالہ جگت نارائن کا قتل کر دیا گیا تھا۔★★ وسیع پیمانے پر پڑھا جانے والا ہندی اخبار 'پنجاب کیسری' بھنڈرا والے کا بے خوف نکتہ چیں تھا اور لالہ جگت نارائن خود اس کی ادارت کرتے تھے۔ اس بار بھی گیانی ذیل سنگھ نے پارلیمنٹ میں کہہ دیا کہ (قتل کے معاملے میں) بھنڈراں والے کا ہاتھ ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ اس طرح کچھ دن تک جیل میں رکھنے کے بعد بھنڈراں والے کو چھوڑ دیا گیا۔

1980 میں اندرا گاندھی کے دوبارہ اقتدار میں آنے کے بعد پنجاب میں حالات بد سے بدتر ہونے لگے تھے۔ ایسی کئی تحریری مثالیں موجود ہیں، جن سے پتہ چلتا ہے کہ اپنے امیدواروں کو الیکشن جتانے کے لئے کانگریس پارٹی بھنڈراں والے کی مدد اور حمایت لے رہی تھی۔ یہی نہیں، وہ اکالی دل کے ان حریفوں کو بھی حمایت دے رہی تھی، جو انتہا پسندی اور انتہا پسندوں سے ہمدردی رکھتے تھے۔ کبھی کبھی تو کانگریس پارٹی کے اندر ہی داخلی انحراف کے سبب ایک گروپ دوسرے گروپ کو الگ تھلگ کرنے کے لئے انتہا پسندوں کی مدد لیتا تھا۔ پنجاب میں انتہا پسندی کے طلوع کا ایک اور مہلک پہلو یہ تھا کہ وہاں کچھ مذہبی مقامات کا استعمال شدت پسندی اور مذہبی گمراہی کا پیغام دینے، ہتھیار رکھنے اور جرم کرنے کے بعد مجرموں کو چھپا کر رکھنے کے لئے کیا جا رہا تھا۔ اس میں عام سکھوں کے مذہبی جذبہ کا بڑی چالاکی سے فائدہ اٹھانے کی کوشش ہو رہی تھی۔ حالانکہ سکھ عوام نے 'خالصتان' کے مطالبہ کی حمایت کبھی نہیں کی، لیکن انتہا پسندی کے شروعاتی مرحلے میں وہ بے بس تھے، کیونکہ اس کے لئے کچھ مذہبی مقامات کا غلط استعمال کیا جا رہا تھا۔ اس دوران اپنی تقریروں اور بیانات میں میں اور اٹل جی بھی مذہبی رہنماؤں سے اپیل کرتے رہتے تھے کہ وہ اس معاملے میں آگے آئیں اور انتہا پسندوں کے ذریعہ کئے جا رہے مذہبی مقامات کے غلط استعمال کے خلاف عوامی طور پر آواز اٹھائیں۔

مئی 1984 کے پہلے ہفتہ میں بھاجپا کے ذریعہ ایک عوامی تحریک چھیڑی گئی، جو بھاجپا کی تاریخ میں اب تک کئی اہم عوامی تحریکوں میں سے ایک تھی۔ مئی 1984 کے پہلے ہفتہ میں ہم نے بھنڈرا والے اور اس کی پرائیویٹ فوج — جس نے سکھ فرقہ کے سب سے مقدس مقام گولڈن ٹیمپل کو اپنی سرگرمیوں کا ہیڈ کوارٹر بنالیا تھا — کے سامنے سرکار کی 'علامتی خود سپردگی' کے خلاف دس دن تک چلنے والی ستیہ گرہ شروع کر دی۔ 3 ر مئی کو چودھری چرن سنگھ کے ساتھ اٹل جی نے گرفتاری دینے والے پندرہ ہزار مظاہرین کی قیادت کی۔ اگلے دن پھر مظاہرین کے ایک دیگر بڑے گروپ نے گرفتاری دی۔ یہ معاملہ میں نے پارلیمنٹ میں بھی اٹھایا اور سرکار پر الزام لگایا کہ وہ بھنڈراں والے اور اس کے حامیوں کے سبب ملک کی ایکتا اور نظم و نسق کے لئے پیدا شدہ چیلنجز کے سامنے اپنی ذمہ داریوں کو نبھانے میں ناکام رہی ہے۔

★ عالمی بھائی چارہ قائم کرنے کی غرض سے 1929 میں پنجاب میں سنت نرنکاری مشن کا قیام عمل میں آیا تھا۔

★★ یہاں میں خاص طور پر ہندی اخبار گروپ کے ذریعہ ان شہیدوں کے اہل خانہ کی مدد کے لئے قائم کردہ 'شہید پریوار فنڈ' کا خصوصی ذکر اور اس کی ستائش کرنا چاہوں گا، جنھوں نے ہندوستان کے اتحاد اور سالمیت کی حفاظت کے لئے اپنی جانیں قربان کر دیں۔ دہشت گردی کے خلاف جدوجہد میں اپنی زندگی قربان کرنے والے شہیدوں کے اعزاز کے لئے گروپ کے ذریعہ منعقدہ مختلف پروگراموں میں میں نے حصہ لیا ہے۔ میں 'پنجاب کیسری' اور دیگر گروپ اشاعتوں کے چیف ایڈیٹر وجے چوپڑا کی حب الوطنی کی مہم کی دل سے تعریف کرتا ہوں۔

دراصل اندرا گاندھی کی ڈھلمل پالیسی اور وقت پر ضروری کارروائی کی کمی اور سکھ سیاست میں پھوٹ ڈال کر اپنا سیاسی مفاد پورا کرنے کی ان کی پالیسی کے سبب پنجاب کی صورت حال مسلسل بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔ بالآخر ملک میں اور ملک کے باہر بھی اپنے اعتماد کو داؤ پر رکھتے ہوئے انھیں ملک مخالف عناصر سے گولڈن ٹیمپل کو خالی کرانے کے لئے طاقت کا استعمال یعنی فوج کا سہارا لینا پڑا۔ 'آپریشن بلیو اسٹار' کے تحت 5 رجون 1984 کو ہندوستانی فوج گولڈن ٹیمپل کے کیمپس میں گھس گئی۔ مندر کے اندر سے انتہا پسندوں نے زوردار مزاحمت کی۔ ان کے پاس جدید ہتھیار تھے اور مندر کے احاطہ کی سبھی اہم عمارتوں پر وہ پوری طرح قبضہ جمائے بیٹھے تھے۔ اس طرح انھوں نے مندر کیمپس کی زبردست مورچہ بندی کر رکھی تھی۔ یہ سب کچھ دیکھ کر کوئی بھی دانتوں تلے انگلی دبالیتا۔ انتہا پسندوں کو مندر کیمپس سے باہر نکالنا ہندوستانی فوج کے لئے ایک مشکل ترین کام ہو گیا تھا، کیونکہ اسے مندر کے مذہبی تقدس کو بھی بچائے رکھنا تھا۔

آخرکار، بھنڈراں والے کے سبب پیدا شدہ چیلنجز پر قابو تو پالیا گیا، لیکن اس میں گولڈن ٹیمپل کے اندر تقریباً 500 شہریوں کی جانیں تلف ہوئیں۔ ہندوستانی فوج کے 83 جوان اور افسران شہید ہوئے۔ کئی ڈھانچے تباہ ہو گئے۔ گولڈن ٹیمپل کیمپس کے اندر واقع سکھ دھرم گرو کا ہیڈکوارٹر یعنی اکال تخت 'آپریشن بلیو اسٹار' کے دوران دونوں جانب سے ہونے والی گولیوں اور توپوں کی بوچھار کا گواہ رہا ہے۔ یہ سب کچھ بہت ہی بدبختانہ رہا۔

وہ گھڑی ہماری جمہوریت کی تاریخ کی انتہائی تکلیف دہ گھڑی تھی۔ 'آپریشن بلیو اسٹار' ملک کے لئے بہت مہنگا ثابت ہوا، کیونکہ دکھ کی گھڑیاں اس کی کامیابی کے بعد بھی ختم نہیں ہوئیں۔ درحقیقت مہم کے بعد کی گھڑیاں بھی اتنی ہی تکلیف دہ رہی تھیں — پہلے 31 راکتوبر 1984 کو وزیراعظم اندرا گاندھی کا قتل اور اس کے بعد راجدھانی دہلی اور شمالی ہند کے اہم شہروں میں سکھ مخالف فسادات، دو سال بعد جنرل ارون ایس ویدھ — جو آپریشن بلیو اسٹار کے وقت فوجی سربراہ تھے — کا پنے میں گولی مار کر قتل کر دیا گیا۔

آپریشن بلیو اسٹار کے بعد انتہا پسندی میں اضافہ

پنجاب میں حالات ایسے بنتے جا رہے تھے کہ ان کے معمول پر آنے کی کوئی امید ہی نہیں نظر آ رہی تھی۔ پنجاب کو 'خالصتان' کی شکل میں آزاد سکھ ریاست میں بدلنے کے مقصد سے ہندوستان کے خلاف مسلح جدوجہد چھیڑنے کے لئے کئی انتہا پسند تنظیمیں تیار ہو گئی تھیں، جیسے — خالصتان کمانڈو فورس، خالصتان آرمڈ فورس، ببر خالصہ انٹرنیشنل، بھنڈراں والے ٹائیگر فورس آف خالصتان اور خالصتان لبریشن فورس۔ 1986 کے آغاز میں ان تنظیموں نے مل کر 'پنتھک کمیٹی' کے نام سے ایک بڑی تنظیم بنائی۔ اپریل میں پنتھک کمیٹی نے گولڈن ٹیمپل کیمپس سے 'خالصتان' کی تشکیل کا اعلان کر دیا۔ ایسے میں ایک بار پھر فوجی کارروائی ضروری ہو گئی۔

ادھر پاکستان کی حمایت سے دہشت گردانہ سرگرمیاں مسلسل جاری رہیں اور دہشت گرد عناصر ہندوؤں اور سکھوں کے درمیان فرقہ وارانہ علیحدگی پیدا کرنے میں کوئی بھی کسر نہیں چھوڑ رہے تھے۔ اس نفرت آمیز کام کے لئے بے قصور ہندوؤں کو بڑے ہی منصوبہ بند طریقے سے نشانہ بنایا جا رہا تھا۔ کئی بار تو ہندو مسافروں سے بھری بس کو بندوق کی نوک پر روک لیا جاتا تھا اور پھر مسافروں کو ایک قطار میں کھڑے کر کے انھیں گولیوں سے بھون دیا جاتا تھا۔ سکھوں کو بھی نہیں بخشا جا رہا تھا۔ جو انتہا پسندوں کے کہنے پر نہیں چلتے تھے یا جو اپنے ہندو بھائیوں کو بچانے کی کوشش کرتے تھے، ایسے سکھ بھائی بڑی تعداد میں انتہا پسندوں کی گولیوں کا نشانہ بنے۔

اس دوران بھاجپا نے مختلف ہندو-سکھ ایکتا ریلیاں منعقد کیں۔ ان عوامی جلسوں میں ہمارا ایک یادگار نعرہ ہوتا تھا— 'ہندو-سکھ نوں لڑنہیں دینا، سن سینتالیس ہون نہیں دینا' (ہم ہندو-سکھ کو آپس میں لڑنے نہیں دیں گے، ہم سن سینتالیس کو پھر دہرانے نہیں دیں گے) 6/جون 1985 کو میں نے اور ڈاکٹر بلدیو پرکاش— جو اس وقت بھاجپا کی پنجاب اکائی کے صدر تھے— نے مل کر ایک ستیہ گرہ کی قیادت کی، جس میں ہم نے پاکستان کی سرحد سے متصل پنجاب کے 4 سرحدی ضلعوں میں فوج تعینات کرنے کا مطالبہ کیا تھا۔ اس ستیہ گرہ مظاہرہ کے دوران ہمارے 30 ہزار کارکنوں نے گرفتاری دی تھی۔

موگا کا 25/جون 1989 کا وہ بھیانک دہشت گردانہ واقعہ مجھے آج بھی یاد ہے۔ صبح کا وقت تھا، آر ایس ایس کے سویم سیوک اپنی مستقل شاکھا کے لئے نہرو پارک میں جمع ہوئے تھے، تبھی موٹر سائیکل پر سوار ہو کر کچھ دہشت گرد آئے، انھوں نے اشتعال انگیز نعرے لگائے اور اندھادھند فائرنگ شروع کر دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے 27 سویم سیوکوں کو اپنی گولیوں کا نشانہ بنا کر وہ بھاگ گئے۔ موگا اور دیگر قصبوں میں ہندوؤں اور سکھوں کو آپس میں لڑانے کے لئے ہی وہ دہشت گردانہ حملہ کیا گیا تھا۔ اہم بات یہ ہے کہ سنگھ اور بھاجپا کے کارکنوں نے یہ یقینی بنانے میں بڑھ چڑھ کر کوشش کی کہ کچھ بھی انہونی نہ ہو۔

ہندو-سکھ اتحاد کو بچانے کے لئے ان مشکل کی گھڑیوں میں بی جے پی اور راشٹر سویم سیوک نے جو کچھ کیا، اس پر ہمیں ناز ہے اور اس کے بارے میں میں خود کچھ نہ کہہ کر معروف و مشہور صحافی و مصنف خشونت سنگھ کی کتاب 'اے ہسٹری آف دی سکھس' کا ایک اقتباس پیش کر سکتا ہوں جو سب کچھ کہہ دیتا ہے—

> '1984 میں بھیڑ کو (سکھوں کے خلاف) اکسانے والے خود کانگریسی رہنما ہی تھے جس میں 3 ہزار سے زیادہ لوگ مارے گئے۔ اس مشکل گھڑی میں بے یار و مددگار سکھوں کی حفاظت کرنے میں سنگھ اور بھاجپا نے جو جرأت دکھائی، اس کی میں ستائش کرتا ہوں۔ ایک دو مقام پر مشکل میں پھنسے بے چارے ٹیکسی ڈرائیوروں کو بچانے کے لئے خود اٹل بہاری واجپئی نے مداخلت کی تھی۔'

ایک قومی بحران سے مفاد کی حصولیابی

پنجاب میں دہشت گردی کا ایک بدبختانہ نتیجہ یہ سامنے آیا کہ اندرا گاندھی کے قتل کے بعد کافی دنوں تک ہندوستان کی کئی ریاستوں کے سرکاری نظام کے ذریعہ سکھوں کو شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا رہا اور کانگریس نے اس صورت حال کو ختم کرنے کے لئے کچھ بھی نہیں کیا۔ 1987 کا ایک واقعہ مجھے یاد آتا ہے۔ کیرل میں ریاستی قانون ساز اسمبلی کے لئے انتخابات ہو رہے تھے۔ انتخابی مہم کے دوران مجھے تین سکھ لڑکے مل گئے، جنھوں نے مجھے بتایا کہ 'ہم آٹو موبائل اسپیئر پارٹس' کے ڈیلر ہیں اور کاروبار کے سلسلے میں آج ہی صبح دہلی سے ارناکولم آئے ہیں، لیکن اب ہمیں فوراً واپس دہلی لوٹنا ہے۔' جب میں نے پوچھا کہ اس طرح اچانک کیوں واپس جانا پڑ رہا ہے تو ان سکھ لڑکوں نے اپنی دکھ بھری روداد سنائی۔

اگلے دن وزیر اعظم راجیو گاندھی شہر میں آنے والے تھے۔ یہ تینوں سکھ لڑکے ایک عام ہوٹل میں رکے تھے، تبھی پولس اہلکاروں کی ایک ٹیم ہوٹل میں آئی اور انھیں اپنے ساتھ نزدیک کے تھانے میں لے گئی۔ تھانہ میں انھیں یہ ہدایت دی گئی کہ اگلے دن شام تک، جب تک وزیر اعظم شہر سے واپس نہیں چلے جاتے، تب تک وہ اپنے ہوٹل کے کمرے سے نہ نکلیں۔ سچ مچ، ان سکھ لڑکوں نے بتایا کہ شہر میں آئے سبھی سکھوں پر ایسی ہی پابندی عائد تھی۔ مخالفت کرنے پر انھیں جیل میں بند کرنے کی دھمکی دی جا رہی تھی۔ آخر میں جب وہ لوگ اسی دن واپس دہلی جانے کے لئے تیار

ہوئے تب کہیں جا کر پولس اہل کاروں نے انھیں چھوڑا۔

اس طرح کا یہ کوئی اکیلا واقعہ نہیں تھا۔ اندرا گاندھی کے قتل کے بعد سے کانگریس نے پوری سکھ کمیونٹی پر ہی دہشت گرد کے طور پر کلنک لگانے کی ایک گھٹیا اور منصوبہ بند مہم سی چھیڑ دی تھی جس سے سکھ کمیونٹی کے لوگ خود کو دوسرے درجے کا شہری سمجھنے کے لئے مجبور ہو گئے تھے۔ 1982 میں ایشیائی کھیل دیکھنے کے لئے پنجاب سے دہلی آنے والے سکھوں کو راستے میں مختلف طرح کے شرمناک اور افسوسناک تجربوں سے گزرنا پڑا تھا۔ 1984 کے سکھ مخالف فسادات — یا یوں کہیں کہ قتل عام — کے بعد بھی حکمراں پارٹی کی جانب سے سکھوں کے تئیں مظالم بند نہیں ہوئے۔ اندرا گاندھی کے قتل کے بعد وزیر اعظم راجیو گاندھی نے — جسے اس قتل عام کو جائز ٹھہرانے کے لئے — دہلی میں ایک عظیم الشان عوامی جلسہ، جوان کی ماں یعنی اندرا گاندھی کے قتل پر اظہار تعزیت کے لئے منعقد کیا گیا تھا، کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا 'جب کوئی بڑا پیڑ گرتا ہے تو نیچے زمین کا ہلنا فطری تقاضا ہے۔' 1984 کے لوک سبھا الیکشن کے لئے کانگریس پارٹی کی انتخابی مہم میں سکھوں کو خطرناک ملک مخالف عناصر کے طور پر دکھایا جا رہا تھا اور اس سے ہوشیار رہنے کی بات کی جا رہی تھی۔ انہی اشتہارات اور منفی تشہیر کا اثر تھا کہ ٹیکسی میں بیٹھی سواری اس وقت خوف زدہ ہو جاتی تھی، جب اس کا ڈرائیور ایک مخصوص کمیونٹی کا ہوتا تھا۔

درحقیقت، اندرا گاندھی کے قتل کے بعد کچھ ہی گھنٹوں میں اس قومی بحران کو چھوٹے موٹے سیاسی مفادات کو حاصل کرنے کے لئے استعمال کرنا شروع کر دیا گیا تھا۔ اس کے لئے سرکار نے سبھی اصولوں کو طاق پر رکھ کر دوردرشن کا استعمال کیا، جو سرکار کے زیر نگراں قومی ٹیلی ویژن نشریات تھی اور اس وقت ملک میں یہی واحد ٹی وی چینل تھا۔ جب دہلی میں غنڈوں کی دہشت پھیلی ہوئی تھی اور وہ بے قصور سکھوں کا قتل کر رہے تھے، اس وقت بھی دوردرشن کانگریس کارکنان کو وزیر اعظم کی رہائش گاہ پر اشتعال انگیز نعرے لگاتے ہوئے دکھا رہا تھا۔ دوردرشن کے کیمرے صرف راجیو گاندھی پر ہی فوکس ہوتے تھے اور انھیں اپنی ماں کے گولی لگے مردہ جسم کے پاس بیٹھے دکھایا جا رہا تھا۔ اپوزیشن کے رہنماؤں کے ذریعہ خراج عقیدت پیش کرنے یا اظہار افسوس کرنے کی بات بالکل نہیں دکھائی جا رہی تھی۔ درحقیقت کئی اپوزیشن رہنماؤں کو تو اس مقام پر بھی نہیں جانے دیا گیا، جہاں اندرا گاندھی کا جسد خاکی رکھا گیا تھا۔ 2 رنومبر کو آخری رسومات کی ادائیگی کے وقت بھی دوردرشن اپوزیشن رہنماؤں کی موجودگی کو جان بوجھ کر روشنی میں نہیں لا رہا تھا، جبکہ وہاں اٹل جی، چندر شیکھر اور مدھو ڈنڈوتے کے ساتھ میں خود بھی موجود تھا۔ بعد میں مجھے اور اٹل جی کو ملک بھر کے لوگوں کے خطوط ملے، جن میں ہم سے پوچھا گیا تھا کہ کیا اپوزیشن نے اندرا گاندھی کی آخری رسومات کا بائیکاٹ کیا تھا؟

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان واقعات کی تصویریں ملک کی اجتماعی یادداشت میں یقینی طور پر دھندلی پڑ گئی ہیں۔ ایک طرح سے یہ اچھا ہی ہے کہ تکلیف دہ برائی ہمارے دل و دماغ سے نکل جائے، تاکہ اس کے سبب لگا زخم مٹ جائے اور ہمارے ملک و سماج کی زندگی میں ایک نئی شروعات ہو۔ حالانکہ جب بھی میں ان دنوں کو یاد کرتا ہوں، میرے دل میں فوراً سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ اس طرح بنیادی جمہوری اصول و ضوابط کو نظر انداز کر کے کانگریس آخر کس سیاسی کلچر کی پرورش کر رہی تھی؟ کیا انتخابی جیت کے لئے یہ سب ضروری تھا؟ کیا اقتدار میں خاندانی روایت کو برقرار رکھنے کے لئے صحیح یا غلط سبھی طریقوں کا سہارا لیا جائے گا؟

قومی راجدھانی میں سکھوں کے قتل کے خلاف اکالی دل نے 1984 کے لوک سبھا انتخابات کے بائیکاٹ کا فیصلہ لیا تھا۔ ایسے میں پنجاب کی سبھی سیٹوں پر کانگریس کی جیت طے تھی۔ ان حالات میں اگر کوئی تجربہ کار لیڈر ہوتا تو وہ اپنی پارٹی کی انتخابی مہم تحمل اور ذمہ داری کے ساتھ چلاتا، لیکن راجیو گاندھی ویسے نہیں تھے۔ انھوں نے اپنی انتخابی تقریروں میں اکالی دل پر جم کر حملے کئے۔

آنند پور صاحب قرارداد پر اکالی دل کے رویے کو انھوں نے اپنے حملوں کا اہم نشانہ بنایا اور چاروں طرف یہ تشہیر کرنے لگے کہ یہ قومی اتحاد کے لئے ایک خطرہ ہے۔ آگے انھوں نے بھاجپا پر الزام لگاتے ہوئے یہاں تک کہہ ڈالا کہ وہ اس معاملے میں اکالی دل کی حمایت کر رہی ہے۔ یہ بالکل سفید جھوٹ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری پارٹی آنند پور صاحب قرارداد کی مسلسل مخالفت کر رہی تھی۔ اٹل جی نے 1981 میں ہی کہہ دیا تھا کہ یہ قرارداد 'ہندوستانی تقسیم کا اعلامیہ' ہے۔ بعد میں الیکشن جیت جانے کے بعد راجیو گاندھی نے اکالی رہنما سنت لونگووال کے ساتھ کیے گئے پنجاب سمجھوتے میں اس قرارداد کو شامل کر کے اسے بڑی آسانی سے قانونی شکل دے دی۔

پنجاب میں بھاجپا-اکالی دل اتحاد

پنجاب میں انتہاپسندی کے دوران اور اس کے بعد بھی ہماری پارٹی نے جو اصولی رخ اپنایا، اس کے بارے میں بات کرتے ہوئے میرا سینہ فخر سے پھول جاتا ہے۔ 1984 میں حالانکہ اس کے لئے ہمیں ایک بھاری قیمت بھی چکانی پڑی تھی، لیکن اس کے ساتھ ہی 1984 کے قتل عام کی مذمت کر کے اور بے قصور سکھوں کی حفاظت میں بہادری کے ساتھ اپنا کردار نبھا کر ہم نے سکھ فرقہ کا اعتماد خیر سگالانہ جذبہ حاصل کیا تھا۔ 1989 کے اسمبلی انتخابات کے بعد جب دہلی میں بھاجپا کی سرکار بنی، اس وقت یہ اعتماد اور بھائی چارہ اور بھی مضبوط ہو گیا۔ 1984 کے سکھ مخالف فسادات اور قتل عام کے قصوروار پورے دس سال تک قانون سے بچ کر گھوم رہے تھے۔ بالآخر مدن لال کھورانہ کی قیادت میں بھاجپا سرکار نے قانون نافذ کرنے والے نظام کو بیدار کیا اور قصورواروں کو سزا دلانے کے لئے ایک قانونی عمل شروع کروایا۔

پیچھے نظر ڈالیں تو آج پنجاب میں جو کچھ بھی کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں، اس میں بھاجپا کا انتہائی اہم کردار رہا ہے۔ اس کے پیچھے بھاجپا کی ٹھوس اور اصولوں پر مبنی پالیسی رہی ہے جو ایک جانب قومی اتحاد اور دوسری جانب ہندو-سکھ بھائی چارہ کے جذبہ سے متاثر تھی۔ اس کامیابی کے سلسلہ میں میں بھاجپا کی صرف انتخابی کامیابیوں کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ بلاشبہ بھاجپا-اکالی اتحاد — جو اب 40 سال پرانا ہو چکا ہے — سے پنجاب میں دونوں ہی پارٹیوں کو فائدہ ہوا ہے۔ اکالی دل بھاجپا کی پہلی اور مستقل یا پکی دوست پارٹی رہی ہے۔ مرکز میں قومی جمہوری اتحاد سرکار میں وہ ایک باوقار اور اہم معاون رہی تھی۔ فی الحال دونوں پارٹیاں مل کر پرکاش سنگھ بادل — جو 4 بار پنجاب کے وزیر اعلیٰ رہ چکے ہیں — کی قیادت میں پنجاب میں ایک اتحادی سرکار چلا رہے ہیں۔

بہر حال سیاسی میدان میں ان کامیابیوں کو میں پنجاب مسئلہ کے حوالے سے اپنی پارٹی کی سب سے اہم کامیابی کے طور پر نہیں دیکھتا ہوں۔ اصل کامیابی تو یہ ہے کہ پنجاب مسئلہ پر ہماری پارٹی کے مستقل اور مثبت رویے سے ہندو-سکھ اتحاد کو قائم رکھنا، دونوں کمیونٹیوں میں آپسی اعتماد اور دوستی کو بنائے رکھنا اور اسے مزید مضبوطی فراہم کرنا ممکن ہو سکا۔ یہاں میں اپنی ان باتوں کا حوالہ دینا چاہتا ہوں جو میں نے جنوری 1987 میں وجے واڑہ میں منعقدہ اپنی پارٹی کے قومی اجلاس میں اپنے صدارتی خطاب میں کہی تھیں۔ اس وقت پنجاب میں دہشت گردی اپنے عروج پر تھی:

'(پنجاب کے) حالات میں ایک باریک سا فرق ہے۔ کشیدگی کے سبب الگ الگ کمیونٹیوں کے ارکان کے درمیان معمولی جھڑپ بھلے ہی کہیں کہیں فرقہ وارانہ لڑائی کی شکل اختیار کر لے رہی ہو، لیکن یہ سچ ہے کہ قتل اور زور زبردستی کے باوجود پنجاب میں فرقہ وارانہ فسادات نہیں ہوئے ہیں اور نہ ہی کہیں دو گروپوں میں مڈبھیڑ ہوئی۔ بھاجپا پنجاب میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور رواداری بنائے رکھنے کی بھرپور کوشش کر رہی ہے،

لیکن اس کا اصل سہرا ہماری صدیوں پرانی تاریخ کو جاتا ہے، جو سکھ فرقہ کو ہندوؤں سے الگ قبول ہی نہیں کر سکتی۔ روایت، خاندان، مذہب و ثقافت — ہمارا سب کچھ ایک دوسرے سے وابستہ ہے، ایک دوسرے میں سمایا ہوا ہے۔'

کئی کانگریسی آج بھی بھاجپا اور اکالی دل پر 'موقع پرست' ہونے کا الزام لگاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ صرف انتخابی نقطہ نظر سے کیا گیا اتحاد ہے۔ 1967 میں جسٹس گرنام سنگھ کی قیادت میں اکالی دل اور ڈاکٹر بلدیو پرکاش کی قیادت میں جن سنگھ — دونوں کے درمیان اتحاد ہوا تھا، جو خاص طور پر ایک انتخابی اتحاد تھا اور یہ اتحاد طاقت ور کانگریس کو ہرانے کے لئے کیا گیا تھا، لیکن تب سے اب تک، ان 40 برسوں میں پنجاب اور پورے ملک کی تاریخ میں کئی اہم واقعات رونما ہوئے ہیں۔ ان واقعات اور حالات میں ہماری مشترکہ سوچ اور ساجھے داری سے دونوں پارٹیوں کے درمیان دوستانہ تعلقات اتنے مضبوط اور ہم آہنگ ہو گئے ہیں کہ کہا جا سکتا ہے کہ اکالی دل اور بھاجپا دونوں 'ایک دوسرے کے لئے ہی بنے ہیں۔' میں اپنی بات کروں تو اکالی دل کے تینوں رہنماؤں — پرکاش سنگھ بادل، سرجیت سنگھ برنالا (پنجاب کے سابق وزیر اعلیٰ اور فی الحال تامل ناڈو کے گورنر) اور آنجہانی گرچرن سنگھ توہڑا، جو شرومنی گرودوارہ پربندھک کمیٹی (ایس جی پی سی) کے چیئرمین رہے تھے — کے ساتھ کام کرنے کا اچھا اور یادگار تجربہ رہا ہے۔

پنجاب میں اپنے دوروں اور قیام سے وابستہ متعدد یادگار واقعات ہیں۔ ایک انتخابی تشہیری مہم کے دوران ایک بار مجھے فتح گڑھ جانے کا موقع ملا، جہاں سرہند کے گورنر وزیر خاں کے حکم پر سکھوں کے دسویں گرو، گرو گووند سنگھ کے بیٹوں فتح سنگھ اور زور آور سنگھ کو دیوار میں چنوا دیا گیا تھا۔ اس مقام پر اب ایک گرودوارہ بن گیا ہے، لیکن جس دیوار میں وہ دونوں بہادر لڑکے شہید ہوئے تھے، اسے گرودوارہ کے ٹھیک نیچے محفوظ رکھا گیا ہے۔ ایسے مقام کا دورہ ترغیب دینے والا رہا۔ سچ مچ یہ میرے لئے کسی تیرتھ یاترا سے کم نہیں تھا۔

کچھ سبق

پنجاب کے کٹھن تجربہ سے کچھ اہم سبق ملے ہیں، جنہیں سرکاروں، سیاسی پارٹیوں اور خود عوام کو بھی کبھی نہیں بھولنا چاہئے۔

پہلا اور اہم سبق تو یہی ہے کہ کسی مسئلہ سے شروعات میں ہی نمٹ لینا چاہئے، نہ کہ اس کے بڑا اور خطرناک ہونے تک انتظار کرنا چاہئے۔ پنجاب میں انتہاپسندی کو تقریباً دو دہائی طویل تاریخ کے دوران ایسے کئی مواقع آئے تھے، جب اندرا گاندھی کی سرکار وقت پر مناسب کارروائی کر کے بالآخر جون 1984 کے 'آپریشن بلیو اسٹار' کو ٹال سکتی تھی۔ یہی نہیں، آپریشن بلیو اسٹار کے زیادہ تر تکلیف دہ نتائج کو بھی ٹالا جا سکتا تھا۔

دوسرا سبق یہ ہے کہ اقتدار میں بیٹھے یا اقتدار کی خواہش رکھنے والے لوگوں کو انتہاپسندی اور دہشت گردی کی پشت پناہی کرنے یا اس میں ملوث لوگوں کو کمتر سمجھنے سے بچنا چاہئے۔ پنجاب میں انتہا پسندی کی تاریخ سے صاف پتہ چلتا ہے کہ اپنے معمولی سیاسی مفاد کے لئے انتہاپسندی اور انتہاپسندوں کا سہارا لینے کی کانگریس پارٹی کی پالیسی نے ہی بھنڈراں والے کو 'بھسماسر' بنا دیا تھا۔ کانگریس نے ریاستوں میں بھی اسی طرح کی نقصان دہ پالیسی اپنائی ہے۔ آسام میں اس نے اپنے حریف آسام گن پریشد (اے جی پی) کو ہٹانے کے لئے کئی بار الفا (یونائٹیڈ لبریشن فرنٹ آف آسام) کو حمایت دی ہے اور اس سے حمایت لی بھی ہے۔ اسی طرح آندھرا پردیش، جھارکھنڈ اور چھتیس گڑھ میں بھی اس نے اپنے وقتی انتخابی مفاد کے لئے نکسلیوں کو بڑھاوا دیا ہے۔

تیسرا سبق یہ ہے کہ جب بھی یہ انتہا پسند یا دہشت گرد اپنی مذموم حرکتوں کو مذہب کے لبادے میں لپیٹنے کی کوشش کریں، اس وقت اس مذہب کے پیروکاروں کی بھی یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ اس طرح کی سرگرمیوں کی سخت مخالفت کریں اور ان قوم مخالف عناصر کو الگ تھلگ کردیں۔ مسئلہ پنجاب کے خصوصی حوالے سے اس نظریہ کو جتنے عزم کے ساتھ کے پی ایس گل نے ظاہر کیا تھا اتنا کسی اور نے نہیں کیا۔ پنجاب میں دہشت گردی کو کچلنے میں کے پی ایس گل کا جو کردار رہا، اسے میں سب سے زیادہ حوصلہ مند اور جرأت مندانہ مانتا ہوں۔ درحقیقت انہی کی کامیاب اور بامقصد قیادت میں پنجاب پولس کو 'خالصتان' کے لئے دہشت گردانہ مہم کو کچلنے میں بالآخر کامیابی مل سکی۔ قومی جمہوری اتحاد سرکار میں وزیر داخلہ کے عہدہ پر کام کرتے ہوئے میں نے داخلی سیکورٹی کے معاملوں پر ان سے اکثر مشورہ کیا تھا۔ اپنی کتاب 'نائٹس آف فاس ہڈ' میں گل نے لکھا ہے۔

> ''خالصتان کے لئے جو دہشت گردانہ مہم چلائی گئی، وہ مذہب کے نام پر تھی، خاص طور پر میرے اپنے یعنی سکھ مذہب کے نام پر۔ ویسے تو سکھوں کی تاریخ ہی لڑائیوں سے بھری رہی ہے، لیکن سکھوں اور سکھ مذہب کے لئے جتنی توہین آمیز یہ دہشت گردانہ تحریک رہی ہے، اتنی کوئی نہیں۔ اس کے باوجود سچ یہ ہے کہ جس سکھ مذہب کے نام پر اتنے ناقابل معافی مظالم ڈھائے گئے، اس کا اور اکثریتی سکھ پیروکاروں کا اس بدتہذیبی اور پاگل پن سے کوئی لینا دینا ہی نہیں رہا ہے۔ درحقیقت سکھ فرقہ نے ہی پنجاب میں دہشت گردی کی مخالفت کی اور بالآخر اسے دبانے میں بھرپور مدد کی۔''

اسلام کی آڑ میں پھیلائی جانے والی انتہا پسندی اور دہشت گردی کے سلسلے میں بھی ان باتوں کی اہمیت اتنی ہی ہے۔

آخری سبق یہ ہے کہ ہم ہندوستانیوں نے اپنی سرحدی ریاستوں پر گزشتہ 60 برسوں میں بہت کم توجہ دی ہے۔ ان ریاستوں کی جانب ہمیں اور زیادہ توجہ دینی پڑے گی۔ پنجاب جیسی ریاست میں جو 'دو ملک کے اصول' پر بنے ملک کی سرحد سے متصل ہے، 'خالصتان' کا مطالبہ کرنا صرف ایک اتفاق نہیں ہے۔ پاکستانی حکمرانوں نے جموں و کشمیر میں بھی اسی حکمت عملی کو اپنایا۔ مغربی بنگال اور شمال مشرق کی کچھ ریاستوں کے مستقبل کے حوالے سے، جہاں بنگلہ دیشی دراندازی کے سبب آبادی کا تناسب بالکل تبدیل ہوگیا ہے، ہندوستان کے اتحاد و سلامتی کے پیش نظر ہمیں پنجاب سے سبق لینے کی ضرورت ہے۔

8

دو برسوں میں دو وزرائے اعظم

حالات خراب ہونے کا سنگین خطرہ ہے۔ وقت تیزی سے بدل رہا ہے۔ لوگ 'عوام کے ذریعہ' سرکار سے پریشان ہورہے ہیں۔ وہ 'عوام کے لئے سرکار' کے لئے تیار ہیں اور انھیں فرق نہیں پڑتا کہ سرکار 'عوام کی' ہے یا 'عوام کے ذریعہ'۔ اگر ہم آئین کو محفوظ رکھنا چاہتے ہیں، جس میں ہم نے 'عوام کا، عوام کے لئے، عوام کے ذریعہ' سرکار کا اصول شامل کیا ہے، تو آئیے، ہم عزم کریں کہ ہماری راہ میں آنے والی کسی بھی برائی کو پہچاننے میں ہم لاپروا نہیں ہوں گے جو لوگوں کو 'عوام کے ذریعہ' سرکار کے بجائے 'عوام کے لئے' سرکار کو پسند کرنے کے لئے ترغیب دیتی ہے۔ آئیے ان برائیوں کو ختم کرنے کے لئے ہم پیش رفت کریں۔ یہی ملک کی خدمت کرنے کا واحد طریقہ ہے۔ میں اور کوئی دوسرا طریقہ نہیں جانتا۔

— ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر کے ذریعہ ہندوستان کی پہلی آئین ساز اسمبلی کے اختتام پر 25/ نومبر 1949 کو کی گئی تقریر

یہ صرف ایک اتفاق ہوسکتا ہے، لیکن اس حقیقت نے میری توجہ کھینچی کہ 1960 کے بعد سے ہر دہائی کا اختتام ہندوستان میں سیاسی اتھل پتھل لے کر آیا۔ 1969 میں کانگریس پارٹی میں تقسیم ہوئی جس کا ملک کی سیاست پر طویل مدتی اثر پڑا۔ 1979 میں جنتا پارٹی کی تقسیم کے بعد چرن سنگھ کی سرکار بنی اور گر گئی۔ 1999 میں کانگریس نے اٹل بہاری واجپئی کی سرکار کو گرا کر غیر ضروری وسط مدتی انتخابات کی طرف ملک کو ڈھکیلا اور 1980 کے آخر میں کیا ہوا؟ یہ بھی ایک ایسی ہی کہانی ہے، البتہ اس میں ایک موڑ ہے۔ اتنا ہی نہیں، بلکہ دو اقلیتی سرکاریں 18 مہینے کے اندر گر گئیں۔

میں پہلے ہی تذکرہ کر چکا ہوں کہ کس طرح بوفورس گھوٹالے اور اس کے نتائج کی وجہ سے 1989 کے انتخابات میں راجیو گاندھی سرکار کا زوال ہوا۔ اس کے نتیجے کے طور پر جنتا دل سب سے بڑی اپوزیشن پارٹی کے طور پر ابھری اور اس کے لیڈر وی پی سنگھ کو سرکار بنانے کے لئے دعوت دی گئی، لیکن ان کے پاس ضروری 272 سیٹوں کی جگہ آدھی 141 سیٹیں ہی تھیں۔ چھوٹی پارٹیوں کے ساتھ مل کر جنتا دل نے ایک اتحاد

بنایا، جسے 'راشٹریہ مورچہ' کہا گیا۔اس کا چیئرمین آندھراپردیش کی تیلگو دیشم پارٹی کے صدر این ٹی راماراؤ کو بنایا گیا۔اس کے باوجود ان کے پاس لوک سبھا میں واضح اکثریت کے لئے ضروری تعداد نہیں تھی۔لوک سبھا کی پوزیشن ایسی تھی کہ وی پی سنگھ صرف بھاجپا یا پھر بائیں بازو کی پارٹیوں کی حمایت سے سرکار بنا سکتے تھے۔

اس سلسلے میں مجھے 28 نومبر 1989 کو راماراؤ اور سنگھ کا دستخط شدہ خط موصول ہوا، جس میں راشٹریہ مورچہ سرکار بنانے کے لئے بھاجپا کی حمایت طلب کی گئی تھی۔ میں نے رسمی جواب میں انھیں اپنی پارٹی کے نظریات سے آگاہ کر دیا۔اسے تفصیل سے بتانا بہتر ہوگا۔

'پیارے شری این ٹی راماراؤ اور شری وی پی سنگھ جی'

مجھے آپ کا خط موصول ہوا۔ میں متفق ہوں کہ لوگوں نے راجیو سرکار کے خلاف واضح فیصلہ دیا ہے، لیکن ساتھ ہی یہ بھی صحیح ہے کہ کسی ایک پارٹی کے یا 5 پارٹیوں والے راشٹریہ مورچہ کے حق میں بھی کوئی فیصلہ نہیں دیا گیا ہے۔

آپ کا خط اقلیتی سرکار بنانے میں بھاجپا کی غیر مشروط حمایت چاہتا ہے۔آپ کی سرکار کو حمایت دینے میں بھاجپا کو کچھ اعتراضات ہیں، خاص طور پر ہمارے دو اعتراضات ہیں:

(1) راشٹریہ مورچہ اور بھاجپا نے یہ الیکشن یکساں نہیں بلکہ دو الگ منشورات پر لڑا ہے۔منشور لوگوں کے حوالے سے پارٹی کا ٹھوس عزم ہوتا ہے۔ ہمارے منشور میں کافی باتیں یکساں ہیں، جیسے آکاش وانی اور دوردرشن کو خود مختار بنانا، اطلاعات کے حق کو قانونی طور پر نافذ کرنا، کام کے حق کو بنیادی حقوق کے طور پر آئین میں شامل کرنا، لوک پال جیسے نگراں بنا کر بدعنوانی کو دور کرنا، قرض کی سہولت اور کسانوں کے لئے مناسب قیمت طے کرنے کے لئے قدم اٹھانا، لیکن کچھ پہلو ہیں جن پر دونوں منشوروں میں فرق ہے۔ہم چاہیں گے کہ راشٹریہ مورچہ سرکار اپنے سرکاری پروگرام میں انہی موضوعات پر کام کرے جن پر ہمارا اتفاق ہے۔

(2) راشٹریہ مورچہ کا اہم حلیف جنتا دل ہے۔اپنے آغاز سے ہی جنتا دل کی قیادت اپنے کاموں اور سرگرمیوں سے لوگوں کے دل میں یہ شبیہ بنانے میں معروف ہے کہ بھاجپا ایک فرقہ پرست پارٹی ہے اور یہ بھاجپا کے ساتھ اقتدار میں شامل ہونے کے بجائے اپوزیشن میں بیٹھنا زیادہ پسند کرے گا۔ جنتا دل کا عوامی کردار دونوں پارٹیوں کے درمیان اعتماد اور دوستی کے رشتے بنانے کی راہ میں رکاوٹ ڈالتا ہے۔اگر جنتا دل کے ذریعہ یہ اعتراف کیا جاتا ہے کہ وہ بھاجپا کو ایک فرقہ پرست پارٹی نہیں مانتی — ان میں دفعہ 370، یکساں سول کوڈ، حقوق انسانی کمیشن، شری رام جنم بھومی وغیرہ موضوعات پر جنتا دل اور بھاجپا میں اختلافات ہیں — یہ عام لوگوں میں غلط پیغام کو دور کرنے میں معاون ہوگا۔

مجھے توقع ہے کہ راشٹریہ مورچہ ان اعتراضات کا خیال رکھے گا اور انھیں قبول کرے گا۔ بھاجپا خواہش مند ہے کہ 9 ویں عام انتخابات میں دہلی میں کانگریس کے اقتدار کا خاتمہ ہو، اس لئے ان اعتراضات کا ذکر کرتے ہوئے بھی ہم نے اپنی حمایت کے لئے بھی انھیں ہٹانے کی شرط نہیں رکھی ہے۔آپ کے خط کے جواب میں بھاجپا آپ کو یہ بتانا چاہتی ہے کہ وہ راشٹریہ مورچہ سرکار کو عمومی لیکن اصولوں پر مبنی تنقید حمایت دے گی۔

نیک خواہشات کے ساتھ،

آپ کا

ایل کے آڈوانی

وی پی سنگھ وزیراعظم بنے

بھاجپا کے اندر ہمارا کیڈر جنتادل کے زیر قیادت سرکار کو حمایت کے فیصلے سے خوش نہیں تھا۔ اس کا اہم سبب وی پی سنگھ کا ہماری پارٹی کے خلاف مخاصمانہ برتاؤ تھا۔ بائیں بازو کی پارٹیوں کو اپنا 'فطری ساتھی' بتاتے ہوئے انھوں نے انتخابی مہم کے دوران عام لوگوں کے درمیان بھاجپا کی مخالفت میں کوئی موقع نہیں چھوڑا تھا۔ سب سے زیادہ تلخ واقعہ متھرا میں رونما ہوا جہاں جنتادل کے امیدوار کی حمایت میں ایک ریلی ہوئی۔ پیشگی سمجھوتے کے مطابق بھاجپا اور جنتادل نے اتر پردیش اور دیگر ریاستوں میں سیٹوں کے لئے مفاہمت کی تھی اور انتخابی مہم کے دوران ایک دوسرے کے امیدوار کی حمایت کا فیصلہ کیا تھا۔ اسی کے مطابق بھاجپا نے متھرا میں جنتادل کے امیدوار کی حمایت کا اعلان کیا اور اس کے لئے کھل کر تشہیر کی، لیکن جب وی پی سنگھ مندروں کے اس شہر میں ایک انتخابی ریلی کو خطاب کرنے آئے تو وہ جنتادل کے ساتھ بھاجپا کے جھنڈے دیکھ کر ناراض ہو گئے۔ انھوں نے دھمکی دیتے ہوئے کہا کہ 'جب تک بھاجپا کے جھنڈے اسٹیج سے ہٹا نہیں دیئے جاتے، میں ریلی سے خطاب نہیں کروں گا۔'

فطری طور پر ہماری پارٹی کے کارکنان حیران اور ناراض ہو گئے۔ جو بھی ہو، جنتادل ہی بھاجپا کے ساتھ سیٹوں کی تقسیم اور مشترکہ انتخابی مہم چاہتا تھا۔ الیکشن کے بعد بھی جب سرکار بنانے کی بات آئی، تب بھی وی پی سنگھ کے سامنے بھاجپا کی حمایت لینے اور اسے قبول کرنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ ساتھ ہی ان میں یہ تشہیر کرنے کا مزاج بھی تھا کہ وہ ایک 'غیر موقع پرست سیکولرسٹ' ہیں اور ان کا بھاجپا سے کوئی لینا دینا نہیں ہے۔ یہ یقینی طور پر دوہرے پیمانوں کی واضح نمائش تھی۔ وی پی سنگھ کی یہ مکاری ہندوستانی سیاست کے کسی بھی غیر جانبدار تجزیہ نگار سے پوشیدہ نہیں تھا۔ اس کے باوجود ہم نے راشٹریہ مورچہ سرکار کو باہر سے حمایت دینے کا فیصلہ کیا۔ سی پی آئی (ایم) کی قیادت میں بائیں بازو کی پارٹیوں نے بھی ایسا ہی کیا۔ چونکہ الیکشن کے فیصلے کا احترام کیا جانا تھا، اس لئے بھاجپا میں ہم نے نئی سرکار کو پیر جمانے میں تعاون دینے کی پوری کوشش کی۔ اس طرح راشٹریہ مورچہ کی سرکار 2/دسمبر 1989 کو اقتدار میں آئی اور وی پی سنگھ وزیراعظم بنے۔

حالانکہ ہمارا فیصلہ قومی مفاد کے حق میں تھا، لیکن کچھ دیگر عوامل نے بھی ہمارے فیصلے کو متاثر کیا۔ جنتادل میں کچھ دیگر رہنما بھی تھے، جن کے ساتھ اٹل جی اور میرے طویل عرصہ سے دوستانہ تعلقات تھے۔ ان میں جارج فرنانڈیز، مدھو ڈنڈوتے، رام کرشن ہیگڑے، دیوی لال، دنیش گوسوامی، نتیش کمار اور شرد یادو شامل تھے۔ راشٹریہ مورچہ میں ایک دوسرے اہم شخص اور تھے جن کے ساتھ ہمارے رشتے حال ہی میں قائم ہوئے تھے، لیکن ان کا ہم پر گہرا اثر پڑا تھا۔ وہ اور کوئی نہیں، این ٹی راما راؤ تھے۔

سیاست سے وابستگی سے قبل آندھرا پردیش میں اس سنے اسٹار نے 1982 میں تیلگو دیشم پارٹی قائم کی۔ این ٹی آر کے نام سے مقبول راما راؤ نے تنہا جنوبی ریاست میں کانگریس کے قلعوں کو مسمار کر دیا۔ ان کے ذریعہ 'تیلگو وقار' کے تحفظ کی اپیل نے لوگوں پر گہرا اثر ڈالا۔ یہ آندھرا پردیش میں کانگریسی رہنماؤں کی چاپلوسی کے خلاف تھا جو نئی دہلی میں مقیم پارٹی 'ہائی کمان' کے سامنے ظاہر کرتے تھے۔ 'تیلگو وقار' کے حامی اصل میں حب الوطن تھے۔ انھوں نے علاقائی توقعات کو مضبوط اور ٹھوس قومی عزائم کے ساتھ شاندار طریقے سے ملنے کی ایک مثال پیش کی۔ این ٹی آر کے بارے میں جو بات مجھے خاص طور پر پسند تھی، وہ تھی ان کی مرکز میں کانگریس کے متبادل کے طور پر ایک جمہوری اور مستحکم سرکار کے قیام کی حقیقی فکر۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے انھوں نے اپوزیشن پارٹیوں کو ایک اسٹیج پر لانے کے لئے انتھک کوشش کی۔ 1980 کی دہائی کے اوائل

میں منعقد' اپوزیشن اختلاط' انہی کی کوششوں سے ہوا تھا۔ٹھوس قوت ارادی والے ایک حقیقی رہنما این ٹی آر نے کبھی بھی بھاجپا کے لئے مکاری کا مظاہرہ نہیں کیا، جیسا کہ کئی دوسرے اپوزیشن رہنماؤں نے کیا۔

کمیونسٹوں کا چھلاوہ

چونکہ وی پی سنگھ ایک ایسی اقلیتی سرکار کی قیادت کر رہے تھے جو ان پارٹیوں کی حمایت پر ٹکی تھی جن کا نظریہ بالکل مخالف تھا، ان میں تال میل قائم کرنا ہر روز ضروری تھا۔ سرکار کی کامیابی اور وجود یکساں مقاصد کے تئیں ایمانداری اور عزائم پر منحصر تھی۔ میں خوش تھا کہ راشٹریہ مورچہ، بھاجپا اور بائیں بازو کی پارٹیوں کے درمیان سہ رخی تال میں ایک نیم ادارہ جاتی ڈھانچہ جلد وجود میں آگیا۔ ہر منگل کو تینوں حلیفوں کے رہنما وزیر اعظم کی سرکاری رہائش گاہ پر رات کے کھانے کے لئے ملتے اور سرکار کے سامنے موجود اہم موضوعات پر صلاح و مشورہ کرتے۔ وزیر اعظم وی پی سنگھ کے علاوہ جنھوں نے مستقل طور پر ان میٹنگوں میں حصہ لیا، ان میں سی پی ایم کے لیڈر ہر کشن سنگھ سرجیت، سی پی آئی کے لیڈر اندر جیت گپتا اور بھاجپا سے میں اور اٹل جی شامل تھے۔ مغربی بنگال کے وزیر اعلیٰ اور سی پی ایم کے سینئر رہنما جیوتی بسو جب بھی دہلی میں ہوتے تھے، ان میٹنگوں میں حصہ لیتے تھے۔

یہ میٹنگیں بہت اہم ہوتی تھیں۔ میرے لئے کمیونسٹ لیڈروں اور ممبران پارلیمنٹ کے ساتھ نزدیک سے بات چیت کرنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ ان میں سے جنہوں نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ تھے، اندر جیت گپت۔ وہ ایک بہترین پارلیمنٹرین کے علاوہ انتہائی سادہ اور فرض شناس شخص تھے۔ وہ جس طرح سے اٹل جی اور مجھ سے بات چیت کرتے تھے وہ فطری ہوتا تھا۔ اس کے برعکس مارکس وادی کمیونسٹ پارٹی کے لیڈر ہمارے ساتھ بات چیت میں ہمیشہ' سیاسی نظریے سے صحیح' ہونے کے تئیں کافی ہوشیار رہتے تھے۔

میں ایک دلچسپ واقعہ ذکر کرنا چاہوں گا، جو وی پی سنگھ حکومت بننے کے 6 مہینے کے بعد پیش آیا۔ ایک دن جیوتی بسو نے ہمیں کلکتہ سے ایک دوست کے ذریعہ پیغام بھیجا— 'یہ حکومت ٹھیک سے کام نہیں کر رہی ہے، مجھے لگتا ہے، ہم تینوں— اٹل جی، آپ اور میں— ان حالات پر غور کرنے کے لئے ملاقات کریں۔ کیوں نہ ہم ورین شاہ کے دہلی میں واقع رہائش گاہ پر عشائیہ پر ملیں؟'

یہ پیغام ممبئی کے مشہور صنعت کار ورین شاہ کے ذریعہ آیا تھا، جو کچھ عرصہ سے بی جے پی کے عہدیدار تھے اور جن کے جیوتی بسو کے ساتھ بھی اچھے تعلقات تھے۔ بعد میں این ڈی اے حکومت نے انہیں وزیر اعلیٰ جیوتی بسو سے مشورہ کر کے اور ان کی خواہش پر مغربی بنگال کا گورنر نامزد کیا تھا۔

اٹل جی اور میں نے ایک غیر رسمی میٹنگ کے خیال کا خیر مقدم کیا، پھر بھی ہم تھوڑے گومگو کی حالت میں تھے۔ ہم نے اپنا ردعمل اس ثالث کو دیا کہ ہم جیوتی باسو کو اس مشورے کے لئے شکریہ ادا کرتے تھے۔ اگر وہ ہم سے ملاقات کرنے میں دلچسپی رکھتے ہیں تو اٹل جی کے گھر پر یا میرے غریب خانہ پر ان کا استقبال ہے، لیکن ہمیں یہ سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ ہم کسی دوسری جگہ پر کیوں ملیں۔ بسو نے فوراً جواب بھیجا— کسی کو بھی ہماری میٹنگ کے بارے میں معلوم نہ ہو۔ خاص کر میری پارٹی کے لوگوں کو یہ اچھا نہیں لگے گا۔

بالآخر ہم شاہ کے گھر پر ملے لیکن میرے لئے یہ کمیونسٹوں، خاص کر مارکس وادی کمیونسٹ پارٹی سے جڑے لوگوں سے مصنوعی نمائش اور افکار و نظریات و رویے کی ایک مثال تھی۔ کئی مواقع پر بی جے پی اور بائیں بازو کی پارٹیوں نے، جب کانگریس اقتدار میں تھی، ایوان میں تال میل

قائم کیا۔ ان کے ممبران پارلیمنٹ ہم سے کہتے تھے 'ہمیں اس ایشو پر کانگریس کو الگ رکھنے کی کوشش کرنی چاہئے۔' اس کے لئے ہم کہتے تھے 'ٹھیک ہے چلئے ملتے ہیں، یا تو ہم آپ کے آفس میں آجاتے ہیں یا تو آپ بی جے پی آفس میں آجایئے۔' ان کے جواب عام طور پر منفی ہوتے تھے۔ 'نہیں نہیں ہم آپ کے آفس میں نہیں آسکتے اور نہ ہی آپ ہمارے آفس میں آسکتے ہیں۔ ہم لوگ پارلیمنٹ کی لابی میں ملاقات کریں۔' ان کا کہنا تھا کہ لابی میں ملاقات کرنے سے آس پاس سے گزرنے والوں کو لگے گا کہ بائیں بازو اور بی جے پی کے ممبران پارلیمنٹ اچانک مل گئے ہیں اور ایک دوسرے کی خیر خیریت دریافت کر رہے ہیں، اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ کمیونسٹ پارٹیوں خاص طور سے مارکس وادی کمیونسٹ پارٹی کے ذریعہ اسی طرح کی عجیب و غریب سیاست کی جاتی تھی۔

وی پی سنگھ نے حکومت بچانے کے لئے منڈل کارڈ کھیلا

وی پی سنگھ کی حکومت کی کارکردگی، حصولیابی، غلطیوں اور سیاست سے متاثر ملغوبہ تھا۔ پہلی بڑی گڑبڑی ان کے کام سنبھالتے ہی سامنے آئی۔ سری نگر میں دہشت گردوں نے مرکزی وزیر داخلہ مفتی محمد سعید کی لڑکی روبیہ سعید کا اغوا کرلیا اور اسے چھوڑنے کے بدلے میں جیل میں بند اپنے ساتھیوں کی رہائی کا مطالبہ کیا۔ بی جے پی سے صلاح لئے بغیر اور ملک کے عوام کے جذبات کے خلاف وی پی سنگھ اور وزیر داخلہ نے دہشت گردوں کے مطالبات کے سامنے خود سپردگی کر دی۔ اس کارروائی نے حکومت کی کمزوری ثابت کر دی اور ریاست میں پاک حمایت یافتہ دہشت گردوں کی بنیاد ڈال دی۔

وی پی سنگھ کے مثبت پہلو میں مجھے کہنا ہے۔ ان کی سورن مندر دورہ اور آپریشن بلیو اسٹار کے لئے معافی مانگنے کی وجہ سے پنجاب میں حالات کے بہتر ہونے میں کافی مدد ملی۔ اسی طرح وی پی سنگھ نے ہی مارچ 1990 میں سری لنکا سے ہندوستانی امن فوج (آئی پی کے ایف) کو ہٹالیا تھا، جس سے ہندوستان کی فوجی تاریخ کا ایک بھلا دینے والے باب کا خاتمہ ہوا۔

وی پی سنگھ کو خاص طور سے اس ایک فیصلہ کے لئے بھی جانا جاتا ہے جو حقیقت میں ان کے اور ان کے نائب وزیر اعظم دیوی لال کے درمیان سیاسی برتری کی اندرونی لڑائی کا نتیجہ تھی۔ وی پی سنگھ نے دیوی لال کو یکم اگست 1990 کو وزارت سے باہر کر دیا۔ 6 دن کے بعد انہوں نے منڈل کمیشن کی سفارشات کو منظور کرنے کا اعلان کیا جس میں سرکاری نوکریوں میں دیگر پسماندہ طبقات کو بھی ریزرویشن دیا جانا تھا۔ یہ وزیر اعظم کا اس وقت کے نائب وزیر اعظم جنہوں نے قومی راجدھانی میں کسانوں کی ایک عظیم الشان ریلی منعقد کرنے کی اسکیم بنائی تھی، کو روکنے سے قبل اٹھایا گیا قدم تھا۔

میں نے وزیر اعظم سے درخواست کی تھی کہ وہ جوائنٹ کمیٹی کی غیر رسمی میٹنگ جس میں راشٹریہ مورچہ کمیونسٹ پارٹی اور بھارتیہ جنتا پارٹی کے لیڈر شامل ہوں، کے سامنے اس کے نتائج پر غور وخوض کئے بغیر منڈل کمیشن کی سفارشات کی رپورٹ کے عمل درآمد کا اعلان نہ کریں۔ میں نے یہ واضح طور سے کہا کہ مارکس وادی کمیونسٹ پارٹی کے لیڈر سومناتھ چٹرجی اور میں دونوں ان کے ساتھ اس موضوع پر تبادلۂ خیال کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے ان سے کہا 'ہماری منگل کی میٹنگ میں صرف 2 دن باقی ہیں' وی پی سنگھ کا جواب تھا— 'نہیں، میں انتظار نہیں کرسکتا۔ مجھے اس کا اعلان کل ہی کرنا ہے۔' وی پی سنگھ نے دیوی لال کی کسان ریلی کا ذکر نہیں کیا لیکن میں سمجھ گیا تھا کہ وہ منڈل کمیشن کے ایشو کا استعمال صرف سیاسی دفاع کے لئے ہی کر رہے ہیں۔

ہندوستان کے آئین میں پہلے ہی تعلیمی اور سول سروسز کی سیٹوں میں درج فہرست ذات وقبائل کے لئے 15 فیصد اور 7.5 فیصد کا التزام کیا گیا ہے۔ منڈل کمیشن کا قیام دسمبر 1979 میں وزیر اعظم مرار جی ڈیسائی نے سماج کے دیگر پسماندہ طبقات کی شناخت کر کے انہیں سرکاری نوکریوں اور تعلیمی اداروں میں ریزرویشن دینے کے لئے کی تھی۔ 5 رکنی پینل کی صدارت ایک سابق ممبر پارلیمنٹ اور بہار سے سوشلسٹ لیڈر بندیشوری پرساد منڈل نے کی۔ کمیشن نے اپنی رپورٹ 1980 میں دی جب اندرا گاندھی وزیر اعظم تھیں۔ مختلف سماجی، تعلیمی اور معاشی معیار کو قبول کرتے ہوئے کمیشن نے 3743 قبائل اور برادریوں کی شناخت دیگر پسماندہ طبقات کی شکل میں کی۔ اس نے سبھی سرکاری نوکریوں اور پبلک سیکٹر کے اداروں میں نوکریوں میں 27 فیصد ریزرویشن اور اعلیٰ تعلیم میں دیگر پسماندہ طبقہ (او بی سی) کے لئے حال میں درج فہرست ذات وقبائل کے لئے 22.5 فیصد سیٹوں کے علاوہ 27 فیصد ریزرویشن کی سفارش کی۔

یہ بتانا مناسب ہوگا کہ نہ تو اندرا گاندھی نے اور نہ ہی راجیو گاندھی نے منڈل کمیشن کی سفارشات پر عمل درآمد کیا۔ یہ رپورٹ تقریباً ایک عشرے تک یونہی پڑی رہی۔ حقیقت میں وزیر اعظم وی پی سنگھ اسے ایک بار بھی منگل کو ہونے والی میٹنگ میں بحث کے لئے نہیں لائے اور نہ ہی کبھی پارلیمنٹ میں اس پر بحث کی گئی۔ اس لئے جب او بی سی کے لئے ریزرویشن کا اعلان ہوا تو پورا ملک سکتہ میں رہ گیا۔ اس کی وجہ سے بڑے پیمانے پر احتجاجی مظاہرے ہوئے جس میں کئی مقامات پر پرتشدد واقعات بھی ہوئے۔ یہ سماجی ترقی کی بدنامی کی ایک واضح مثال ہے جو اس کے سیاست زدہ کرنے کا نتیجہ تھی۔

اس لئے میری پارٹی نے ایک قرارداد میں جو 17 راکتوبر 1990 کو دہلی میں ہونے والی قومی مجلس عاملہ کی میٹنگ میں پیش کی گئی جس میں کہا گیا 'بی جے پی سماجی اور تعلیمی طور سے پسماندہ طبقات کو ریزرویشن دینے کے حق میں ہے۔ جس طرح سے حکومت نے مخلوط حکومت رپورٹ کی حمایت کر رہی پارٹیوں سے بغیر صلاح ومشورہ کئے اور بغیر کسی معاشی معیارات کو پورا کئے بغیر منڈل کمیشن نافذ کرنے کا اعلان کیا ہے وہ پوری طرح سے غلط ہے۔ اس فیصلے سے پسماندہ طبقہ کے تئیں کوئی ہمدردی نظر نہیں آتی بلکہ یہ ایک سیاسی مہم کا حصہ ہے۔ سرکار کے اس فیصلے سے صرف سماج کی تقسیم ہوگی۔ اس کے منفی نتائج نہ صرف امن کے سنگین خطرے اور جان ومال کے زبردست نقصان کے طور پر دیکھے جائیں گے بلکہ اس سے ہمارے نوجوان کو قربانی دینی پڑے گی۔'

میرے کچھ مخالفین کا دعویٰ ہے کہ میں نے منڈل کمیشن کی سفارشات کی حمایت نہیں کی۔ یہ الزام بے بنیاد ہے۔ میں نے نہ کبھی پسماندہ طبقوں اور نہ ہی درج فہرست ذات وقبائل کے ریزرویشن کی مخالفت کی۔ اگر میں نے ریزرویشن کے بارے میں کچھ اعتراض کیا ہے تو یہ صرف منفی ذہنیت اور سیاسی فائدہ سے تحریک پا کر فیصلہ لینے والی کچھ پارٹیوں کے بارے میں کیا۔ مثلاً مجھے پارلیمنٹ میں ہونے والی منڈل کمیشن کی سفارشوں پر بحث یاد آتی ہے جس کی شروعات بہار کے پسماندہ طبقہ کے لیڈر اور ریزرویشن کے حامی حکم دیو نارائن یادو نے کی جو وی پی سنگھ کی پارٹی میں تھے لیکن بعد میں بی جے پی میں آگئے۔ اس بارے میں ان کی تقریر اب تک کی سب سے بہترین تقریر رہی ہے۔ حقیقت میں بحث کے فوراً بعد میں ان کے پاس گیا اور ان کے ذریعہ کی گئی تقریر میں پُرجوش طریقے سے دلائل اور پُرخلوص خیالات پیش کرنے کے لئے انہیں مبارک باد پیش کی۔ میں نے یہ بھی کہا کہ میں اس ایمانداری کی سند ان کی حکومت کو نہیں دے سکتا۔

منڈل کمیشن کی سفارشات پر بحث کے دوران راجیو گاندھی کے ذریعہ 6 ردسمبر کو لوک سبھا میں کی گئی ایک اہم تقریر تھی۔ یہ ہندوستانی پارلیمنٹ میں کی گئی سب سے طویل تقریروں میں سے ایک ہے جو ڈھائی گھنٹے تک جاری رہی۔ راجیو گاندھی جو اس وقت ایوان میں حزب

اختلاف کے لیڈر تھے، نے وزیر اعظم وی پی سنگھ پر ہندوستان کی ایکتا اور سالمیت کے لئے خطرہ پیدا کرنے کا الزام لگایا۔ انہوں نے کہا 'آپ نے ملک میں ذات پات کی تشدد کی آگ لگادی ہے۔' راجیو گاندھی نے دیگر پسماندہ طبقہ کے لئے خصوصی سہولیات حاصل کرنے والوں کو ریزرویشن کا فائدہ دیئے جانے کے طریقے پر سوال اٹھایا۔ انہوں نے ایک جج کی مثال پیش کی جو پسماندہ طبقہ کے تھے اور 15 سال تک اس پر فائز رہے۔ راجیو گاندھی نے کہا 'اس کے بعد یہ شخص سیاست میں آجاتا ہے اور وزیر بن جاتا ہے تو کیا اسے ریزرویشن کا فائدہ دیا جائے گا؟ کیا اس کے بچوں کو اس طرح کی مدد دی جائے گی؟ کیا ہم چاہتے ہیں کہ ریزرویشن کا فائدہ وزراء، ان کے بچوں اور گھر والوں کو دیا جائے؟ کیا ہم چاہتے ہیں کہ اس کا فائدہ ان زمین مالکان کو دیا جائے جن کے پاس بڑی املاک ہیں؟'

منڈل کمیشن کی بحث جن لوگوں کو یاد ہے وہ جانتے ہیں کہ ریزرویشن کے فائدہ سے 'کریمی لیئر' کو الگ کرنے کے سوال پر بی جے پی کمیونسٹ پارٹیاں اور کانگریس متفق تھے۔ سپریم کورٹ نے 1992 میں منڈل کمیشن کی سفارشات کو نافذ کرنے کے سلسلے میں دئے گئے اپنے فیصلے میں 'کریمی لیئر' کو ریزرویشن سے باہر رکھنے کا فیصلہ برقرار رکھا۔

پارلیمنٹ میں اعتماد کی قرارداد پر ناقابل فراموش بحث

راشٹریہ مورچہ کی حکومت بہت دنوں تک نہیں چلی، وہ ایک سال کی بھی مدت پوری نہیں کرسکی۔ جن حالات میں 10 رنومبر 1990 کو اس کی حکومت گرادی گئی وہ اجودھیا آندولن سے منسلک تھی، جس کا میں 'اجودھیا تحریک' باب میں ذکر کر چکا ہوں۔ راشٹریہ مورچہ کی حکومت سے بی جے پی کی حمایت واپس لینے کا فیصلہ 23 رنومبر 1990 کو بہار میں سومناتھ سے اجودھیا کی میری یاترا کو درمیان میں روک دینے کے نتیجہ میں ہوا تھا۔ وزیر اعظم کو فوراً اپنا استعفیٰ دے دینا چاہئے تھا۔ اس سے واضح ہوگیا تھا کہ وی پی سنگھ کی حکومت کی لوک سبھا میں اکثریت نہیں رہی۔ پھر بھی انہوں نے ایوان میں اکثریت ثابت کرنے پر زور دیا۔ اسی کے مطابق صدر جمہوریہ نے 7 رنومبر کو انہیں ایوان میں اعتماد کا ووٹ حاصل کرنے کے لئے کہا۔ میں اس وقت بہار میں مسان جور میں نظر بند تھا۔ مجھے اس اہم بحث میں شرکت کرنے کے لئے دہلی بلایا گیا، میں اعتماد کی قرارداد کے دوران اپنی تقریر کو سب سے اہم اور پارلیمانی کیریئر کی سب سے اطمینان بخش تقریر قرار دیتا ہوں۔

بحث کے دوران کئی غیر بی جے پی ممبران پارلیمنٹ نے میری پارٹی پر 'طالع آزما' ہونے کا الزام لگایا چونکہ ہم نے وی پی سنگھ کی حکومت سے حمایت صرف اس لئے واپس لے لی تھی کہ میری رتھ یاترا کو بہار میں روک لیا گیا تھا جہاں ان کی پارٹی کی حکومت تھی۔ میں نے اس الزام کی تردید کی اور 17 راکتوبر کو بی جے پی کی قومی مجلس عاملہ میں پیش قرارداد کا ذکر کیا۔ میں نے یہ واضح کردیا کہ 'میری پارٹی کی وی پی سنگھ کی حکومت سے دلچسپی ختم ہوگئی ہے اور حمایت واپس لینے کا فیصلہ اجودھیا ایشو پر ان کے بدلتے اور غیر ذمہ دارانہ رویے سے ہی متاثر نہیں تھا۔ اس سے کئی دیگر اسباب بھی منسلک تھے۔ اجودھیا کے تئیں حکومت کا رویہ آخری وجہ تھی۔ محترم اسپیکر! میں مہابھارت کے ایک ناخوشگوار واقعہ کا ذکر نہیں کرنا چاہتا لیکن ایسا لگتا ہے کہ دیگر پارٹیاں مجھے وہ واقعہ پیش کرنے کے لئے مجبور کررہی ہیں۔ ششو پال نے شری کرشن کو گالی پر گالی دینا شروع کردیا اور ہر کوئی حیران تھا کہ شری کرشن یہ سب کچھ کیوں برداشت کررہے ہیں۔ کرشن نے ششو پال کی بدتہذیبی کو برداشت کرنے کے لئے خود کو تیار کررکھا تھا لیکن ساتھ ہی 100 کی حد بھی طے کررکھی تھی۔ جیسے ہی ششو پال نے 100 واں جرم کیا کرشن نے اس پر حملہ کردیا۔'

میری تقریر کا زیادہ تر حصہ اس الزام کی تردید کرنے میں تھا کہ اجودھیا آندولن فطری طور پر فرقہ وارانہ ہے۔ میں نے کہا 'محترم اسپیکر!

(لوک سبھا میں) اس پوری بحث میں فوکس اس بات پر ہے کہ سیکولرازم کیا ہے اور فرقہ واریت کیا ہے اور قومیت کیا ہے؟ اس بحث کو پارلیمنٹ کی چہار دیواری تک محدود نہ رکھ کر ہمیں اسے عوام کے سامنے لے جانا چاہئے۔ اس موضوع پر عوام کی رائے لیتے ہیں اور اس بحث کی بنیاد پر ایک انتخاب کراتے ہیں۔' چونکہ وی پی سنگھ کی حکومت پر زوال آنا یقینی تھا، میں نے اس بحث کا استعمال پارلیمنٹ اور ملک کی توجہ اس جانب کرنے میں مبذول کرایا کہ کانگریس اس کی جگہ پر ایک دیگر ڈانواڈول حکومت بنانے کی اسکیم بنا رہی ہے۔ اپنا موقف ثابت کرنے کے لئے میں نے برطانوی ممبر پارلیمنٹ کی ایک پر مغز مثال پیش کی، جسے میں نے گریول جینر کی کتاب 'اسپیچ میکر' میں پڑھا تھا۔ وہ لیبر پارٹی کے ایک معزز یہودی ممبر پارلیمنٹ تھے۔ میں جون 1989 میں لندن میں ایک پارلیمانی وفد کے طور پر دورے کے دوران جینر سے ملا تھا۔ ان سے اس وقت کی دوستی آج تک برقرار ہے۔ میں نے کہا—

> 'حال ہی میں میں نے برطانیہ کے سابق وزیر اعظم ہیرالڈ ولسن کے بارے میں ایک قصہ سنا۔ جب ولسن نے وزیر اعظم کا عہدہ جیمس کیلگھن کو سونپا تو انہوں نے انہیں 3 لفافے بھی دیئے جنہیں ان کی حکومت پر بحران آنے کی حالت میں ایک ایک کر کے لفافہ کھولا جانا تھا۔ جب پہلا بحران آیا کیلگھن نے پہلا لفافہ کھولا جس میں لکھا تھا— 'گزشتہ سرکار پر الزام لگاؤ'۔ انہوں نے بالکل ویسا ہی کیا، تب دوسرا بحران پیدا ہوا۔ کیلگھن نے دوسرا لفافہ کھول کر پڑھا— 'آپ کی کمان میں جو دوسرے نمبر پر ہے اسے نکال کر باہر کرو۔' بی جے پی نے 17 راکتوبر کے دن جب یہ قرارداد پیش کی تو یہ قصہ میرے ذہن میں آیا اور مجھے لگا کہ وی پی سنگھ نے پہلے ہی 2 لفافے کھول لئے ہیں اور اب تیسرا لفافہ کھولنے کا وقت آ گیا ہے۔ جب تیسرا لفافہ کھولا گیا تو اس میں مشورہ تھا— 'برائے کرم 3 لفافے تیار کریں۔'

وی پی سنگھ کی حکومت میں وزیر قانون دنیش گوسوامی نے کہا 'کیا آپ یہ مشورہ نئے کپتان کو دے رہے ہیں؟' میں نے کہا 'میں ہر کسی کو یہ مشورہ دے رہا ہوں۔ محترم اسپیکر! میں 7 رنومبر کے بعد کے پس منظر کو دیکھ رہا ہوں کہ ملک میں 1979 دوبارہ ہو رہا ہے۔' میرا اشارہ تھا کہ کس طرح اندرا گاندھی نے 1979 میں چرن سنگھ کو سہارا دے کر ایک نئی حکومت بنوائی جو کہ جنتا پارٹی سے دل بدل کر کے آئے تھے اور جلد ہی ان سے سہارا چھین کر ان کی حکومت کو گرا دیا۔

ہندوستان میں 1990 میں بالکل 1979 کے واقعہ کا ری پلے دیکھا۔ جنتا دل کے 54 ممبران کے ساتھ الگ ہو کر چندر شیکھر نے الگ نئی پارٹی جنتا دل (سیکولر) بنائی۔ راجیو گاندھی نے چندر شیکھر کی حکومت کو باہر سے حمایت دینے کا وعدہ کیا۔ ہندوستان کے صدر جمہوریہ نے 10 ر نومبر کو انہیں وزیر اعظم کے عہدے کا حلف دلایا اور 6 روز بعد اعتماد کا ووٹ حاصل کرنے کو کہا۔ میں نے اپنی تقریر کے دوران اسے 'بغیر سیاسی آئین کی حکومت' کہا۔

میں نے کہا 'عوامی رائے عامہ ایک معاہداتی مجبوری ہے جو ہر ممبر کی اور ہر حکومت کی ووٹر کے ساتھ ہوتی ہے۔ اب اچانک مجھے لگتا ہے کہ آج اقتدار میں جو پارٹی ہے اس کا عوام کی جگہ پر کانگریس سے معاہدہ ہے۔ خود وزیر اعظم نے اسے 'وقت کی مانگ' کی حکومت کہا ہے۔ میں کہنا چاہوں گا کہ یہ اور کچھ نہیں طالع آزما حکومت ہے۔'

یہ فطری تھا کہ چندر شیکھر کو کانگریس پارٹی کی حمایت حاصل کرنے کے لئے انہیں کچھ یقین دہانی کرانی تھی جس میں سب سے اہم تھا بوفورس واقعہ کی جانچ کو سست کرنا، اس لئے پارلیمنٹ میں اپنی تقریر میں میں نے کہا 'پہلا افسوسناک تبصرہ جو چندر شیکھر نے کیا وہ بوفورس معاملے کی پہلے کی طرح جانچ اب وزیر اعظم کے ذریعہ نہیں بلکہ پولس کے ایک سب انسپکٹر کے ذریعہ کی جائے گی۔ گزشتہ 40 برسوں میں اکثر انتخابات

میں سیاسی بدعنوانی کے موضوع اٹھائے جاتے ہیں اور کئی طرح کی سازباز کی بات کی جاتی ہے لیکن مجھے ایسا کوئی سانحہ یاد نہیں آتا جو عوام کے الفاظ میں اتنا زیادہ گھل مل گیا ہو جتنا کہ 'بوفورس' لفظ۔ میں وزیراعظم سے اپیل کرنا چاہوں گا کہ وہ اسے ایک عام اسکینڈل کی شکل میں نہ دیکھیں۔ وہ اسے اس شکل میں دیکھیں کہ اگر عوامی زندگی میں اعلیٰ مقام پر فائز ہوں، غلط کام کریں گے، بچ نکلیں گے اور ریاست کی ساری مشینری صرف چھوٹے چھوٹے چوروں کو پکڑنے میں لگی رہے گی تو یہ اسٹیٹ کے اقتدار کو کمزور بنا دے گی۔'

میرے دل میں چندر شیکھر کے تئیں ایک پروقار لیڈر کی شکل میں عزت تھی۔ اندرا گاندھی کی مطلق العنانی کے خلاف ان کی اصولی بغاوت، ایمرجنسی کے خلاف ان کی حوصلہ مندانہ مہم اور مرار جی ڈیسائی حکومت کے دوران جنتا پارٹی کے صدر کے طور پر ان کے رول اور ان کی شخصیت میں کافی مقبولیت تھی۔ پھر بھی میں نئے وزیراعظم کو انتباہ دینا ضروری سمجھتا تھا۔ 'میں چندر شیکھر کو ایک کٹھ پتلی ہونے کا الزام نہیں لگاؤں گا۔' میں نے اپنی تقریر میں کہا 'نہ، اس وقت نہیں بلکہ میں کہوں گا کہ کٹھ پتلی کو نچانے والے کے سامنے کافی لالچ ہوتے ہیں اور اس لئے چندر شیکھر کے سامنے مسلسل گومگو کی حالت برقرار رہے گی۔ اگر وہ کٹھ پتلی بننے کو تیار ہوں گے تو اس کے نتائج حکومت اور ملک دونوں کے لئے انتہائی نقصان دہ ثابت ہوں گے، لیکن اگر وہ کٹھ پتلی بننے سے انکار کریں گے تو ان کی حکومت گر جائے گی۔'

یہاں میں ایک بار پھر صحیح ثابت ہوا۔ چندر شیکھر کے ذریعہ اجودھیا مسئلے کو حل کرنے کی سنجیدہ کوشش اور اس سمت میں ان کے ذریعہ کی جارہی قابلِ ذکر پیش رفت نے کانگریس میں خطرے کی گھنٹی بجادی۔ اس لئے ان کے وزیراعظم بننے کے 4 مہینے بعد ہی کانگریس نے ان سے حمایت واپس لے لی۔ اس کے لئے مضحکہ خیز وجہ بتائی گئی—راجیو گاندھی کی رہائش گاہ کے باہر ہریانہ کے 2 پولس اہلکار نگرانی کر رہے تھے۔ تاریخ میں سیاسی پاکھنڈ کی ایسی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔

چندر شیکھر کو مئی 1991 کے وسط مدتی انتخابات تک وزیراعظم کے عہدے پر برقرار رہنے کو کہا گیا۔ آئندہ الیکشن بھی ہندوستانی جمہوریت کی تاریخ میں ایک نیا انقلابی واقعہ ثابت ہوا اور بی جے پی کی ترقی کے سفر کے لئے بھی۔ انتخابات کے درمیان ملک کو راجیو گاندھی کے قتل کے طور پر ایک سانحہ جھیلنا پڑا۔

9

پی وی نرسمہا راؤ حکومت کے 5 سال

جب بارش ہوتی ہے تو دنیا مین ترقی ہوتی ہے۔
جب راجا انصاف کرتاہے تو عوام ترقی کرتی ہے۔

— تری ولّور تھرک کورل (مقدس تمل گرنتھ) کے مصنف

21رمئی 1991 شب کے 10 بجے سے زائد کا وقت ہو رہا تھا۔ میں گاندھی نگر میں انتخابی ریلی سے خطاب کر رہا تھا جہاں سے میں لوک سبھا انتخاب کا الیکشن لڑ رہا تھا۔ اس وقت چندر شیکھر کی حکومت کے گرنے کی وجہ سے وسط مدتی پارلیمانی انتخاب ضروری ہو گئے تھے۔ الیکشن کمیشن نے 3 مرحلوں میں انتخابات کرانے کا اعلان کیا تھا—20، 23 اور 26 رمئی۔ میرے انتخابی حلقہ میں یہ میری آخری ریلی تھی۔

انتخابی جلسہ میں زبردست بھیڑ تھی۔ میری تقریر کے درمیان میں کسی نے مجھے ایک پرچی تھمائی۔ میں اسے پڑھنے لگا— 'ابھی ابھی تھوڑی دیر پہلے تمل ناڈو میں ایک بم دھماکے میں راجیو گاندھی کا قتل ہو گیا ہے۔' اس پیغام سے میں سکتے میں آگیا۔ یہ اطلاع دل و دماغ کو ہلا دینے والی تھی لیکن میں نے محسوس کیا کہ پہلے اس خبر کی تصدیق کی جانی ضروری ہے۔ میں نے تقریر کے دوران جملے کو روک کر جملہ معترضہ کے طور پر کہا 'دوستو! مجھے ابھی ابھی بہت ہی اندوہناک خبر ملی ہے، اسی کی وجہ سے مجھے اب یہ جلسہ درمیان میں ہی چھوڑنا پڑ رہا ہے۔'

میں فوراً احمد آباد کے سرکٹ ہاؤس پہنچا۔ وہاں مجھے بتایا گیا کہ تمل ناڈو کی خبر صحیح ہے لیکن ابھی تک یہ اطلاع نہیں مل پائی کہ اس قتل کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے۔ سرکٹ ہاؤس میں مجھے جھنڈے لئے کانگریسی کارکنوں کا جھنڈا دکھائی دیا جو اشتعال میں نعرے لگا رہے تھے۔ 'بی جے پی مردہ باد'، راجیو گاندھی امر ہیں۔ وہ پہلے ہی بغیر سوچے سمجھے اس نتیجہ پر پہنچ گئے تھے کہ اس قتل کے پیچھے میری پارٹی کا ہاتھ ہے۔

سرکٹ ہاؤس میں میں نے چودھری دیوی لال سے ملاقات کی جو چندر شیکھر کی کارگزار حکومت میں نائب وزیر اعظم تھے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا 'میں دہلی لوٹ رہا ہوں، کیا آپ میرے طیارے میں جانا چاہیں گے؟' میں نے فوراً منظوری دے دی۔ جب میں گھر پہنچا تب آدھی رات گزر چکی تھی۔ میں اس وقت نوجوان اور پُر جوش لیڈر کی بے وقت موت پر بہت غم زدہ تھا۔ میں اس غیر یقینی سانحہ کے دوررس نتائج کے بارے میں بہت زیادہ متفکر تھا۔

جب اس بارے میں تفصیلی معلومات اور تفتیش کے نتائج سامنے آنے لگے تب پورا ملک اس جرم کی بہیمیت پر مشتعل ہوا تھا۔ پہلی بار

عام لوگ نئے اسلحہ 'انسانی بم' سے متعارف ہوئے تھے۔ ایل ٹی ٹی ای کی سرگرم رکن دھنو 'انسانی بم' تھی۔ اس نے ڈھیلی پوشاک پہن رکھی تھی۔ اس کی کمر کے چاروں جانب دھماکہ خیز مادے کی پٹی تھی۔ راجیو گاندھی کا استقبال کرنے کے لئے بے چین بھیڑ میں کسی طرح وہ بھی شامل ہوگئی۔ جیسے ہی راجیو گاندھی تامل ناڈو میں شری پیرمبدور انتخابی جلسہ گاہ میں پہنچے، وہ انہیں پھولوں کا مالا پہنانے کے بہانے آگے آئی۔ اس نے آتے ہی خود کو اڑا دیا۔ اس دھماکے میں کانگریس صدر اور ہندوستان کے سابق وزیر اعظم کی زندگی ختم ہوگئی۔ دھنو سمیت ایک درجن سے زائد افراد کی جانیں چلی گئیں۔

جیسے جیسے جانچ کا عمل آگے بڑھتا گیا مزید تلخ حقائق سامنے آنے لگے۔ اعلیٰ سطح پر رچی گئی اس سازش میں ایل ٹی ٹی ای کی شراکت سامنے آنے لگی تھی۔ تمام سیاسی دائروں سے اوپر اٹھ کر ہندوستان کے لوگ یہ سوچ کر ہی ششدر رہ گئے کہ پڑوسی ملک کی دہشت گرد تنظیم ایل ٹی ٹی ای (لبریشن ٹائیگرس آف تمل اِلم) ہندوستان کے قومی لیڈر کو قتل کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ لازماً راجیو گاندھی حکومت کی ہندوستانی امن فوج کی پالیسی کے بارے میں کئی ماہ تک بحث ہوتی رہی تھی، لیکن تمام ملک اس غم کے ماحول میں اتنا ڈوب گیا کہ یہ بحث ہی دب گئی۔

10 ویں لوک سبھا کی تشکیل پر اپوزیشن لیڈر ہونے کے ناطے میں نے آنجہانی لیڈر کو یہ جذباتی خراجِ عقیدت پیش کیا 'مجھے 1985 کا واقعہ یاد ہے جب مسٹر راجیو گاندھی اکثریت کے ساتھ انتخاب جیتنے کے بعد وزیر اعظم بنے تھے۔ انہوں نے سبھی سیاسی پارٹیوں کے اہم لیڈروں کو مدعو کیا اور تقریباً ایک گھنٹے تک ان سب کے ساتھ الگ سے میٹنگ کی۔ اس میٹنگ میں میرے ذہن میں راجیو گاندھی کی انمٹ نقوش پڑے۔ حالانکہ اس نوجوان نے کچھ دنوں قبل ہی سیاست میں قدم رکھا ہے، لیکن شخصی طور سے یہ بہت ہی ملنسار اور بُردبار ہیں۔ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اگرچہ میری پارٹی ان کی سیاست کی ناقد رہی ہے لیکن پہلی میٹنگ میں شخصی طور پر میرے دماغ میں ہمیشہ کے لئے ان کی مثبت چھاپ پڑ چکی ہے۔ ہم ایک دوسرے کے بہت قریب تھے اور اس طرح سے میں تصور کر سکتا ہوں کہ ان کی بے وقت موت سے ان کے گھر اور ملک کو کتنا نقصان پہنچا ہے۔'

جب نرسمہا راؤ وزیر اعظم بنے

راجیو گاندھی کے قتل کے بعد دوسرے اور تیسرے مرحلہ کی ووٹنگ وسط جون تک رد کر دی گئی۔ ایک بار پھر کانگریس پارٹی نے وزیر اعظم کی 'شہادت' کی شکل میں 'ہمدردی کی لہر' کو کیش کرانے کی کوشش کی۔ راجیو گاندھی کی جان لینے والے اس دہشت گردانہ فعل سے دوسرے کسی بھی شخص کے برابر ہی بی جے پی میں ہم بھی غم زدہ تھے اور ہمارے دل میں بھی غصہ تھا لیکن ہم یہ نہیں سمجھ پائے کہ ان کی موت کو 'شہادت' کے طور پر کیسے مانا جا سکتا ہے۔

انتخابات کے نتائج سے دو چونکانے والے حقائق سامنے آئے۔ پہلا:۔ ووٹنگ کے دوسرے اور تیسرے مرحلہ کی معطلی کی وجہ سے 'ہمدردی کی لہر' سے کانگریس کو مدد ملی تھی لیکن اس سے وہ محض شکست کا منہ دیکھنے سے بچ گئی اور انہیں شاندار کامیابی نہیں مل پائی۔ کانگریس نے انہی انتخابی حلقوں سے سیٹیں جیتیں جہاں قتل کے بعد ووٹنگ ہوئی تھی۔ 20 رمئی سے قبل کے مرحلہ کی بہ نسبت کافی زیادہ تعداد میں سیٹیں ملیں، لیکن اس بار زیادہ سے زیادہ جیتنے کے لئے کانگریس کو مضبوط حالت میں لانے میں 'ہمدردی کی لہر' کارگر نہیں ہو پائی۔ اس پارٹی کو کل تعداد کی نصف 273 سے بھی کم 232 سیٹیں ملیں۔ اس لئے سیاسی پنڈت اس نتیجہ پر پہنچے کہ اگر راجیو گاندھی کا قتل نہیں ہوا ہوتا تو کانگریس کو اس سے بھی کم سیٹیں

ملتیں۔ حقیقت میں ان کی قیادت میں کانگریس پارٹی کو ممکنہ دوسری بار براہِ راست شکست جھیلنی پڑتی۔

ووٹنگ کا دوسرا اور سب سے اہم پہلو یہ رہا کہ بی جے پی نے بہتر مظاہرہ کر کے سبھی کی توجہ اپنی جانب مبذول کرائی۔ 1989 میں ہماری 86 سیٹیں تھیں، لیکن 1991 میں ہم نے 121 سیٹیں جیت لیں۔ ہم سب سے بڑی دوسری پارٹی کے طور پر ابھرے اور ہماری پارٹی لوک سبھا میں سب سے بڑی اپوزیشن پارٹی بن گئی۔ بی جے پی کے رول پر تبصرہ کرتے ہوئے لندن کے مشہور ہفت روزہ 'اکنامسٹ' نے ہندوستان کے انتخابی نتائج پر اپنے کالم میں پُرکشش عنوان دیا— 'دونرکمس سیکنڈ' (کامیاب دوسرے مقام پر)۔ میری پارٹی نے مجھے لوک سبھا میں حزب اختلاف کا لیڈر منتخب کیا۔ میں نے محسوس کیا کہ اٹل جی کو ہی یہ کردار ادا کرنا چاہئے لیکن انہوں نے بھی اسی بات پر زور دیا کہ مجھے یہ ذمہ داری سنبھالنی چاہئے۔

اتر پردیش انتخابات میں ملنے والی کامیابی سے میری پارٹی کا قومی سیاست میں پروفائل بلند ہوا۔ بی جے پی نے 415 میں سے 221 سیٹیں جیتیں اور پہلی بار ہندوستان کی سب سے زیادہ آبادی والی ریاست میں اپنی حکومت بنائی۔ اس ریاست کے وزیر اعلیٰ کلیان سنگھ بنے۔ یہاں تک کہ کانگریس بھی لوک سبھا میں اکثریت حاصل نہیں کر پائی۔ اس سے واضح تھا کہ مرکز میں وہ اپنی حکومت بنا سکتی ہے۔ تاہم جب حکومت کا لیڈر چننے کا سوال پیدا ہوا تب اس وقت پارٹی نے دکھا دیا کہ کس طرح سے وہ اقربا پروری کی قیادت کے اصول کے سامنے جھک جاتی ہے۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی نے متوفی لیڈر کی بیوہ سونیا گاندھی سے وزیر اعظم بننے کے لئے درخواست کی، لیکن ان کے پاس سیاسی یا انتظامی امور کا تجربہ نہیں تھا۔ جب سونیا گاندھی نے اس تجویز کو نامنظور کر دیا تب پارٹی کے سب سے سینئر لیڈر پی وی نرسمہا راؤ کے سامنے یہ تجویز پیش کی گئی جو اندرا گاندھی و راجیو گاندھی— دونوں کی حکومتوں میں متعدد اہم عہدوں پر کام کر چکے تھے۔ اس طرح حکومت کی باگ ڈور سنبھالنے کے لئے اس وقت وہی سب سے آسان متبادل تھے۔

12 رجولائی 1991 کو پارلیمنٹ میں اعتماد کے ووٹ پر چلنے والی بحث کے دوران اپنے خطاب میں میں نے راؤ حکومت کی 3 انوکھی باتوں کا ذکر کیا۔ پہلا: ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں 5 ویں اقلیتی حکومت تھی۔ گزشتہ 20 مہینوں سے تیسری بار سرکار بنی۔ پہلی مثال 1969 کی ہے، جب کانگریس پارٹی منقسم ہو گئی تھی اور اندرا گاندھی کی حکومت اقلیت میں آگئی تھی۔ یہ حکومت سی پی آئی اور ڈی ایم کے کی حمایت کے بل پر ٹکی رہی تھی۔ دوسری بار 1979 میں اس طرح کی حکومت بنی جب چودھری چرن سنگھ نے وزیر اعظم کے طور پر حلف لیا تھا۔ اس سرکار کو کانگریس پارٹی نے باہر سے حمایت دی تھی۔ تیسری بار 1989 میں انتخابی فیصلے کے نتیجہ میں اقلیتی حکومت بنی، جب وی پی سنگھ نے بی جے پی اور باہر سے حمایت دے رہی بائیں بازو کی پارٹیوں کی حمایت سے اقلیت سرکار بنائی گئی۔ چوتھی بار 1990 میں ایسی حکومت بنی جس کا عوام کے فیصلے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ حقیقت میں یہ رائے عامہ کی خلاف ورزی تھی۔ کانگریس پارٹی نے چندر شیکھر حکومت کو حمایت دی تھی جس کی 545 ارکان والے ایوان میں محض 54 سیٹیں تھیں۔ حقیقت میں اس پارٹی کی ایوان کی کارروائی چلانے کے لئے مقررہ کورم 25 سے بھی کم سیٹیں تھیں۔

'اب یہ 5 ویں سرکار ہے' میں نے کہا 'لیکن کئی معاملوں میں ان سب سے ہٹ کر ہے۔ سب سے پہلا یہ محض اقلیت حکومت ہی نہیں بلکہ معلق پارلیمنٹ کی سرکار ہے کیونکہ الیکشن کمیشن نے 36 سیٹوں پر انتخابات رد کر دیئے تھے۔ اس لوک سبھا میں 2 ریاستوں پنجاب اور جموں وکشمیر کی نمائندگی بھی نہیں ہے۔ آخری لمحوں میں پنجاب کے بارے میں لئے گئے فیصلے کی بابت کئی سوال کھڑے ہو گئے۔ یہاں تک کہ اس ریاست کے گورنر جنرل او پی ملہوترا نے بھی کہا تھا' میں نے 3 لڑائیاں لڑیں، میں جنگ میں جنرل رہا، لیکن میں نے کبھی بھی خود کو شکست خوردہ محسوس نہیں

کیا تھا جتنا آج الیکشن کمیشن کے پنجاب میں انتخابات معطل کرنے کے اعلان سے محسوس کیا ہے۔'

دوسرے ماضی کی پہلی 4 حکومتوں کے معاملے میں حالانکہ برسر اقتدار پارٹیاں اقلیت میں تھیں لیکن معاون پارٹیوں کی باہر سے حمایت کی وجہ سے لوک سبھا میں وہ اکثریت میں رہیں۔ اس کے برعکس راؤ حکومت اس نظریے سے الگ تھی کہ یہ حکومت ایوان میں اکثریت میں نہیں آپائی۔

تیسری انوکھی بات یہ تھی کہ حکومت سازی کے وقت وزیر اعظم سمیت 3 سینئر وزیر پارلیمنٹ کے رکن نہیں تھے۔ دیگر 2 وزراء میں وزیر خزانہ ڈاکٹر منموہن سنگھ اور وزیر دفاع شرد پوار تھے۔ حقیقت میں راؤ نے صحت کی خرابی کی وجہ سے انتخاب لڑنے سے انکار کر دیا تھا۔ آئین کی دفعہ 75(5) میں کہا گیا ہے کہ رکن منتخب نہ ہونے کے باوجود کوئی بھی شخص 6 ماہ کے لئے وزارت کے عہدے پر کام کر سکتا ہے لیکن اسے اس دوران ایم پی کا انتخاب لڑنا ہوگا۔ نومبر 1991 میں راؤ نے نامدیال سے لوک سبھا کا ضمنی الیکشن جیتا لیکن اتنی زبردست ووٹنگ کے فرق کے بارے میں بڑے پیمانے پر انتخابی گڑبڑی کے الزامات لگائے گئے تھے۔

ڈاکٹر منموہن سنگھ آسام سے راجیہ سبھا کے لئے منتخب ہوئے۔ حیرت انگیز سچائی یہ تھی کہ انہوں نے 1996 میں جنوبی دہلی سے لوک سبھا کا الیکشن لڑا تھا۔ وہاں سے بی جے پی کے وی کے ملہوترا سے وہ انتخاب ہار گئے تھے اور انہوں نے 2004 میں وزیر اعظم بننے کے بعد بھی لوک سبھا کا ممبر بننا بھی ضروری نہیں سمجھا۔ ڈاکٹر سنگھ کی حکومت کی یہ بھی ایک انوکھی بات ہے۔

'شاستری جی کے بعد سب سے اچھے وزیر اعظم'

5 سال کے دوران وزیر اعظم راؤ کے ساتھ میرے تعلقات میں ڈرامائی انداز میں تبدیلی آئی۔ دوستی سے مخالفت تک۔ لوگ اکثر مجھ سے پوچھتے تھے 'آپ پہلے نرسمہا راؤ کی ستائش میں ایسا کیوں کہتے تھے کہ لال بہادر شاستری کے بعد نرسمہا راؤ ہندوستان کے سب سے اچھے وزیر اعظم ہیں؟' حزب اختلاف کے لیڈر کی شکل میں— اس تبصرے سے بی جے پی اور کانگریس دونوں میں کھلبلی مچ گئی تھی۔ کچھ کانگریسی خاص طور پر جو راؤ سے خوش نہیں تھے، حیرت زدہ تھے۔ 'کیا اس ستائش کے پیچھے کوئی خاص مقصد چھپا ہے؟' جب کہ حقیقت یہ تھی کہ ایسا کچھ نہیں تھا۔ میں نے خلوص دل سے ان کی ستائش کی تھی اور متعدد وجوہات سے میں یہ تبصرہ کرنے کے لئے مجبور ہوا تھا۔

پہلا، میں راؤ کی ذہنیت کی ستائش کرتا تھا، ان کے پاس سیاسی اور انتظامی تجربہ تھا اور قومی و بین الاقوامی معاملوں کی سمجھ تھی، علم تھا۔ دوسرے ان کے ساتھ اپنی ابتدائی میٹنگوں میں میں نے یہ جانا کہ انتہائی اہم پالیسی، متعدد موضوعات پر ان کے خیالات بی جے پی سے ملتے تھے۔ مثال کے لئے معاشی پالیسی کے نظریہ سے راؤ نے معاشی اصلاحات کے نئے دور کا استقبال کرنے کے لئے لائسنس کوٹہ ختم کرنے اور کنٹرول ہٹانے جیسی تجاویز پیش کیں۔ بی جے پی اور سابق جن سنگھ ہمیشہ لائسنس پرمٹ کوٹہ راج ہٹانے کی مانگ کرتے رہے ہیں۔ کیونکہ اس سے بدعنوانی کو فروغ ملتا ہے اور ترقی کی راہ میں رکاوٹیں آتی ہیں۔ گزشتہ کانگریسی حکومتوں نے 'سوشلزم' کے نام پر لائسنس، کوٹہ اور کنٹرول کی ایک عظیم الشان روایت کھڑی کر دی لیکن حقیقت میں عوام کی توانائی کو دبا کر ہندوستان غریب اور پسماندہ ملک بنا رہا۔ پبلک سیکٹر کے معاشی نظام کے اونچے مقام پر رکھنے کے نام پر کانگریس حکومتوں نے سیاسی حمایت، لال فیتہ شاہی، نااہلیت اور اونچی سطحوں پر پروڈکشن کی صلاحیت کو فروغ دیا۔

ٹھنڈی اور انتہائی تحمل سے راؤ نے یہ اشارہ دینے شروع کر دیئے کہ اقلیت حکومت ہونے کے باوجود وہ ہندوستان کے بحرانی نظام معیشت میں بنیادی تبدیلی لانے کے خواہش مند ہیں۔ اس بحران کا واضح اشارہ ماضی کی حکومت کا لیا گیا فیصلہ تھا۔ اس حکومت کے لیڈر چندر شیکھر تھے، انہوں نے ادائیگی سے متعلق توازن ملک کے اندر اور باہر موجود سنگین حالات پر قابو پانے کے لئے ہندوستان کے سونے کا بھنڈار گروی رکھنے کا فیصلہ لیا تھا۔ ملکی و غیر ملکی کرنسی بھنڈار کی سطح اتنی گر گئی تھی کہ اس سے ملک کے درآمدات کے بلوں کا تقریباً 8 ہفتہ تک ہی ادائیگی کی جاسکتی تھی۔ ہندوستان 'ڈفالٹر' ہونے جارہا تھا اور اگر ایسا ہو جاتا تو عالمی برادری میں ہمارے ملک کی ساکھ پر بہت برا اثر پڑتا۔ اوسطاً ہندوستانیوں کے ذہن میں قرض ادا کرنے کے لئے یا گھریلو خرچ پورا کرنے کے لئے سونا گروی رکھنا معاشی تباہی کی نشانی سمجھی جاتی ہے۔ چندر شیکھر کی حکومت کے ذریعہ سونا گروی رکھنے کے فیصلے سے عام آدمی بھی سمجھ گیا تھا کہ ملکی معیشت کے نظام میں کچھ غلط ہو رہا ہے اور کہیں سنگین غلطی ہوئی ہے۔

یہاں اس بات پر زور دینا ضروری ہے کہ اس حالت کے لئے محض چندر شیکھر کی حکومت ہی ذمہ دار نہیں تھی۔ آخر کار یہ حکومت محض 3 مہینے تک اقتدار میں رہی۔ 4 ماہ تک اس نے کارگزار حکومت کے طور پر کام کیا۔ گزشتہ کانگریسی حکومتوں کی غلط پالیسیاں اور کئی سال تک معاشی بدانتظامی بھی اس کی جڑوں میں موجود تھیں، جس کی وجہ سے ملک کا سونا گروی رکھنے کی نوبت آئی۔

ایسے پس منظر میں ملک کی معاشی پالیسی میں کافی سختی کے ساتھ تبدیلی لانے کی کوشش اور اسے کارگر بنانے میں راؤ نے حوصلے کا مظاہرہ کیا تھا۔ یکساں طور سے دیگر حوصلہ مندانہ کام ڈاکٹر منموہن سنگھ کو وزیر خزانہ کی شکل میں اپنی وزارت میں شامل کرنا تھا۔ منموہن سنگھ ایک بڑے اور معزز ماہر معاشیات ہیں، لیکن انہیں سیاسی نظام کا تجربہ نہیں تھا۔ اس فیصلے سے میں نے محسوس کیا کہ راؤ معاشی نظام کو اصلاح کرنے کے تئیں سنجیدہ ہیں۔ وزیر اعظم ہونے کے ناطے انہوں نے ڈاکٹر منموہن سنگھ کو سیاسی حمایت دی تاکہ معاشی اصلاحات کی فہرست پر کام شروع کیا جاسکے۔ اس میں آہستہ آہستہ لیکن مسلسل 'منفی سوشل ازم' نامی عمارت کو گرانا شروع کر دیا۔ یہ عمارت ماضی کی کانگریسی حکومتوں نے کھڑی کی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار پارلیمنٹ میں بحث کے دوران چندر شیکھر نے وزیر خزانہ کی یہ کہہ کر سخت تنقید کی تھی کہ وہ عالمی بینک اور بین الاقوامی فنڈ کے ایجنٹ ہیں۔ میں نے اس وقت کھلے عام پارلیمنٹ میں ڈاکٹر منموہن سنگھ کا دفاع کیا تھا۔ میری ہی پارٹی کے کچھ لوگوں نے مجھ سے سوال پوچھے تھے لیکن میں نے کہا کہ ہمیں محض مخالفت کرنے کے نظریے سے ہر ایک ایشو پر حکومت کی تنقید نہیں کرنی ہے۔ حال ہی میں ٹیلی ویژن کو دیئے گئے ایک انٹرویو میں میں نے اس واقعہ کا یاد دلایا اور کہا کہ راؤ حکومت کے ابتدائی دور میں حکومت اور حزب اختلاف کے درمیان جتنے مثبت اور اچھے تعلقات رہے اتنے پہلے کبھی نہیں رہے۔ (ٹائمس ناؤ ٹی وی، 18 ستمبر 2007)

ان دنوں ڈاکٹر منموہن سنگھ کے ساتھ میرے تعلقات خوشگوار تھے۔ انفرادی سطحوں پر ہمارے آپسی تعلقات ابھی بھی بہتر ہیں۔ گرچہ وزیر اعظم بننے کے بعد ڈاکٹر منموہن سنگھ سے میری یہی سب سے بڑی شکایت رہی کہ کانگریس صدر کے سامنے خود سپردگی کر کے انہوں نے اپنے عہدے کے وقار کو کم کر دیا۔ میں نے ٹیلی ویژن پر ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ ہندوستان کے ہر ایک وزیر اعظم کے معاملے میں دہلی میں سب سے اہم سیاسی پتہ وزیر اعظم کی رہائش گاہ کی ہوتی ہے۔ صرف ڈاکٹر سنگھ کے دور میں یہ پتہ سونیا گاندھی کی رہائش 10 جن پتھ بن گیا۔

حقیقت میں نرسمہا راؤ کو بھی 10 جن پتھ کے ساتھ اپنے تعلقات میں توازن بنائے رکھنے میں دقتوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ان کے متعدد کابینہ کے ساتھی اسے کانگریس پارٹی اور کانگریس حکومت میں اقتدار کا ایک مرکز مانتے تھے، لیکن راؤ چالاک سیاست داں تھے۔ انہوں نے یہ کام بڑی خوش اسلوبی سے کیا۔ وہ اقتدار کے علاوہ آئینی مرکز کی شکل میں کسی دیگر سیاسی اتھارٹی کے آگے کبھی نہیں جھکے۔ اس لئے میں اس وقت ان

کی ستائش کرتا تھا جب لال بہادر شاستری کے برابر انہوں نے بھی بذاتِ خود نہرو-گاندھی نسل سے تعلق رکھے بغیر طاقت ور وزیر اعظم کے طور پر کام کرنا شروع کیا۔

راؤ کی صدارت میں اسرائیل کے تئیں ہندوستان کی نئی پالیسی — یہ نیا ایشو سامنے آیا تھا جس سلسلے میں وہ بی جے پی کی طرح یکساں خیالات رکھتے تھے۔ جنوری 1992 کے ابتدا میں میں بی جے پی کے بیرون ملک رہنے والے دوستوں کو معلومات حاصل کرنے کے لئے امریکہ گیا تھا۔ اس دورے میں میں نے پورے امریکہ میں تقریباً 10-9 مقامات کا دورہ کیا۔ بغیر کسی تنازع کے یہودی گروپ مجھ سے ملے اور سوال پوچھا 'ہم ہندوستان کے دوست ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہندوستان طاقت ور ملک بنے اور دنیا میں اہم کردار ادا کرے، لیکن آپ کے ملک نے ابھی تک اسرائیل کے ساتھ مکمل سیاسی تعلقات کیوں نہیں قائم کئے؟' میں نے ان کو یہ جواب دیا 'میری پارٹی اسرائیل کے ساتھ بہتر تعلقات قائم کرنے کے حق میں ہے، لیکن ہم اقتدار میں نہیں ہیں۔ آزادی حاصل کرنے کے بعد سے طویل عرصہ تک کانگریس پارٹی اقتدار میں رہی ہے۔ وہ اس کی مخالفت کرتی رہی ہے اور اسی طرح سے کمیونسٹ پارٹیاں بھی اس پالیسی کی مخالفت کرتی ہیں۔'

ریاستہائے متحدہ امریکہ سے لوٹنے کے بعد میں نے وزیر اعظم سے ملاقات کی۔ مجھے پتہ چلا کہ وہ خود بھی کچھ ہفتہ کے بعد امریکہ جا رہے ہیں۔ امریکی یہودی گروپوں کے ساتھ اپنی میٹنگ کے بارے میں امریکہ میں جانکاری دینے کے بعد میں نے کہا 'نرسمہا راؤ جی! وہاں جانے سے پہلے آپ اسرائیل کے ساتھ سیاسی تعلقات قائم کرنے کے بارے میں مستحکم فیصلہ لیں۔' انہوں نے جواب دیا 'میں بھی اس کے حق میں ہوں، لیکن میری پارٹی تیار نہیں ہے۔' ان کے جواب کے دوسرے حصہ کے بارے میں سبھی جانتے ہیں، لیکن ان کا جواب میرے دل کو چھو گیا۔ میں نے کہا 'میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ اسرائیل کے تئیں ہماری پالیسی ابھی بھی ہندوستان کے کچھ مسلمانوں کے ردِّ عمل کے اندیشہ میں کیوں گھری ہوئی ہے؟ آخر کئی مسلم ممالک اسرائیل کے ساتھ سیاسی تعلقات قائم کرنے کی اسکیم بنا رہے ہیں۔ مصر اور ترکی پہلے ہی ایسا کر چکے ہیں۔ یہاں تک کہ فلسطین بھی اسرائیل کے ساتھ کوآپریشن میں یقین رکھنے لگا ہے۔ اس لئے اگر کوئی بات ہمارے ملک کے مفاد میں ہے تو ہمیں یہ بات ان لوگوں کو سمجھانی چاہیے جو اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ کسی بھی حال میں گھریلو دباؤ کے ایسے روایتی خیالات کا ہماری غیر ملکی پالیسی پر اثر نہیں پڑنا چاہئے۔' راؤ نے یہ جواب دیا 'میں آپ سے متفق ہوں۔ میں ایسا کروں گا، لیکن میں گروپ آف منسٹر کی تشکیل دے کر ہی ایسا کروں گا۔ جو سفارش کریں گے تاکہ بڑے پیمانے پر یہ فیصلہ لیا جائے۔' انہوں نے وعدہ نبھایا۔ یہ جان کر مجھے اچھا لگا کہ وزیر اعظم کے فیصلے کا اعلان کرنے سے پہلے فلسطین لبریشن آرگنائزیشن (پی ایل او) کے قائد یاسر عرفات کو بھی مطلع کیا۔ عرفات نے راؤ کو جواب دیا 'بہت بہتر، اب ہمارا کم سے کم ایک مشترکہ دوست تو ہے۔'

راؤ کے دور اقتدار کے ابتدائی دنوں میں ان کی ستائش کرنے کی دیگر وجہ بھی تھی۔ یکے بعد دیگرے دو اقلیت حکومتوں کے زوال، راجیو گاندھی کے قتل اور ہندوستان کے سامنے مالی بحران کی وجہ سے بی جے پی میں کئی لوگ سوچنے لگے کہ حزب اختلاف اور حکومت کو حساس ترین قومی ایشوز پر عام اتفاق رائے کے لئے ایمانداری سے کوشش کرنی چاہئے۔ اٹل جی اور میرے — دونوں کے اس بارے میں یکساں خیالات تھے۔ ان دنوں کانگریس حکومت اور بی جے پی کے درمیان آپسی اعتماد اور مثبت تعاون قائم کرنے کے لئے سنگھ کے سینئر لیڈر بھاؤ راؤ دیورس بھی کوشش کر رہے تھے۔ راؤ اور دیورس جی طویل عرصہ سے ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ بھاؤ راؤ جی وی پی سنگھ، چندر شیکھر اور ان کے قریبی ساتھیوں کے ذریعہ سے ماضی کی 2 حکومتوں کی مدت کے دوران اجودھیا مسئلہ کو پُر امن طریقہ سے حل کرنے کی کوششوں میں مصروف تھے۔ راؤ اور ان کے

درمیان ابتدائی بات چیت سے مجھے ایسا لگا کہ نئے وزیراعظم اجودھیا بات چیت کے ان اچھے نکات کو پکڑنے میں دلچسپی لیں گے جہاں چندر شیکھر نے یہ کام چھوڑ دیا تھا۔ میں نے بی جے پی میں دوسرے کئی لوگوں کے سامنے اپنی اس امید کا اظہار کیا۔

یہاں یہ ذکر بھی کرنا چاہئے کہ اٹل جی بھی راؤ کے تئیں کشادہ دل رکھتے تھے اور راؤ بھی اٹل جی کے تئیں ایسے ہی تھے۔ اس سلسلے میں دو مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ 1993 میں راؤ نے اٹل جی کو جنیوا میں منعقد اقوام متحدہ حقوق انسانی کمیشن کی کانفرنس میں ہندوستانی وفد کا لیڈر نامزد کیا تھا۔ یہ کانفرنس اس نظریہ سے کافی اہم تھی کہ پاکستان مسلسل یہ مہم چلا رہا تھا کہ جموں وکشمیر میں حکومت ہندوستان کے ذریعہ 'حقوق انسانی کی خلاف ورزی' ہو رہی ہے۔ یقینی طور سے اس قسم کے مہم کی پیچھے پاکستان حکومت کا ہدف جموں وکشمیر اور دیگر حصوں میں دہشت گردی کو فروغ دینے اور بھڑکانے میں پاکستان حکومت کے کردار پر پردہ ڈالنا تھا۔ مثال کے طور پر مارچ 1993 میں ممبئی میں لگاتار بم دھماکوں میں پاکستان کا نام واضح طور سے سامنے آیا تھا۔ ایسی بین الاقوامی کانفرنس کے ہندوستانی وفد کے لیڈر کے طور پر حزب اختلاف کے لیڈر کو بھیجنے سے متعلق فیصلہ لینے کے لئے ملک و بیرون ملک میں راؤ کی ستائش کی گئی تھی۔ اسی طرح جنیوا کانفرنس میں اٹل جی کے رول کی ستائش کی گئی۔

اٹل جی اور وزیراعظم کے درمیان آپسی میل ملاپ کی ایک دوسری مثال تب سامنے آئی جب اٹل جی کے ذریعہ 'میری 51 کویتائیں' نامی اپنی کتاب کے اجراء کے لئے 1994 میں وزیراعظم راؤ کو مہمان خصوصی کے طور پر مدعو کیا گیا تھا۔ یہ تقریب دو اپوزیشن لیڈروں کے درمیان آپسی ستائش کی ایک مثال ہے۔ حالیہ برسوں میں ایسے بہترین تعلقات ختم ہونا میری نظر سے ہندوستان میں صحت مند سیاسی کلچر کے خاتمے کی نشانی ہے۔

'اگر سندھ میں استصواب رائے کا مطالبہ کیا جائے تو کیا ہوگا؟'

ستمبر 1991 میں وزیراعظم راؤ نے راجیو گاندھی کے قریبی دوست، کانگریس ممبر پارلیمنٹ منی شنکر ایّر اور مجھے یوروپین پارلیمنٹ میں اسٹراس برگ آسٹریلیا میں منعقد بین الاقوامی کانفرنس میں ہندوستان کی نمائندگی کرنے کے لئے کہا۔ 4 سال بعد منعقد ہونے والی اس کانفرنس کا اہم موضوع 'ترقی پذیر جمہوری ممالک کے سامنے چیلنجز' تھا۔ چونکہ ہماری پارلیمنٹ کا سیشن جاری تھا، اس لئے حکومت وہاں وفد نہیں بھیجنا چاہتی تھی۔ تاہم جب ہمارے سفیر نے اطلاع دی کہ پاکستان بہت بڑا اور طاقت ور وفد بھیج رہا ہے اور وہ اس گلوبل فورم پر کشمیر کا مسئلہ اٹھا سکتا ہے تب وزیراعظم نے ایّر اور مجھے اس کانفرنس میں شرکت کرنے کے لئے کہا۔

ہم نے کانفرنس کے منتظمین کو بتایا کہ انہیں پاکستان کو اس فورم میں 2 طرفہ ایشوز اٹھانے کی اجازت نہیں دینی چاہئے۔ ہمیں اس بارے میں یقین دہانی کرائی گئی، پھر بھی نیشنل اسمبلی کے اسپیکر کی قیادت میں پاکستان کے 10 رکنی وفد نے براہِ راست کشمیر کا مسئلہ اٹھایا اور کہا 'نئے ابھرنے والے متعدد جمہوری ممالک کے سامنے یہ بہت بڑا مسئلہ ہے جو کچھ پرانے جمہوری ممالک میں بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ لوگوں کے ان کی سرزمین کے بارے میں استصواب رائے کے حق کو بھی انتہائی بے رحمی سے کچل دیا جاتا'۔

ان کے بعد بولتے وقت میں نے اس تشہیر کے بارے میں کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے کہا 'پاکستان کے وفد نے براہِ راست کشمیر کا ذکر نہیں کیا ہے لیکن یہاں موجود وفود کے دلوں میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ پاکستان نے ہندوستان پر الزام لگایا ہے۔ میں انہیں اور یہاں موجود بھی ممبران کو بتانا چاہتا ہوں کہ 1947 میں آزادی حاصل کرنے تک ہم ایک خود کفیل ملک اور مضبوط جمہوری نظام بنانے میں کامیاب رہے ہیں،

جس سے مرکز اور ریاستوں، جموں و کشمیر سمیت آزادانہ اور پُر امن طریقہ سے انتخابات کرائے جاتے ہیں۔ گرچہ جتنے بڑے ملک برطانوی دور حکومت سے ابھر رہے ہیں انہیں قومی ایکتا اور سالمیت کو مضبوط کرنے کے مسئلہ کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ اکثر ایکتا اور سالمیت کی مخالفت کرنے والے ہی استصواب رائے کا جھنڈا اٹھاتے ہیں، لیکن آخر کار 'یہ ہے کیا؟' ہندوستان کثیر المذاہب و کثیر لسانی ملک ہے جس میں آئین اور صدیوں سے چلی آ رہی ثقافت کے ذریعہ مذہب کی بنیاد پر کوئی بھید بھاؤ نہ کرنے کی ضمانت دی گئی ہے۔ اس طرح سے پورا ہندوستان 'روح میں پرو دیا ہوا ہے۔ ہم ہر ایک لسانی اور مذہبی گروپ کے ذریعہ استصواب رائے کے فیصلے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے۔ کیونکہ یہ پھوٹ ڈالنے اور علیحدگی کا راستہ ہے اور اس کی وجہ 1947 سے مسلسل کوششوں کے بعد حاصل کی گئی کامیابیاں بھی صفر ہو جائیں گی۔'

میں نے یہ بھی کہا 'کشمیر میں استصواب رائے کا مسئلہ اٹھانے سے پہلے میرے پاکستانی دوست اس سوال پر غور فرمائیں۔ اگر سندھ کے لوگ استصواب رائے کا مطالبہ کرنے لگیں تو کیا ہوگا؟ اس کے کیا نتائج سامنے آئیں گے؟ کیا آپ سوچ سکتے ہیں کہ بنگلہ دیش کی آزادی کی وجہ پہلے سے ہی تقسیم جھیلنے والا پاکستان متحد ہو کر رہ سکتا ہے؟'

اس سیشن کے اختتام کے بعد سندھ سے آنے والے پاکستانی وفد کے دو ارکان الگ سے مجھ سے ملے اور سندھی زبان میں کہا 'آڈوانی صاحب! آپ نے انہیں ان کے حملے پر سخت جواب دے کر صحیح کیا۔ ہمارے پنجاب کے لوگ 24 گھنٹے صرف کشمیر کا مسئلہ ہی اٹھاتے رہتے ہیں۔ ہم ان کی باتوں سے عاجز آ چکے ہیں۔'

نرسمہا راؤ سے دلچسپی ختم

1992 کے وسط میں حصص مارکیٹ گھوٹالے کے تعلق سے سنسنی خیز پردہ فاش ہونے پر راؤ سے میری دلچسپی ختم ہونے لگی۔ اس اسکینڈل کا ماسٹر مائنڈ ہرشد مہتا تھا۔ اس نے ممبئی اسٹاک ایکسچینج کے چنندہ کاغذی کمپنیوں کے گروپ میں مصنوعی اتار چڑھاؤ کے لئے دولت کے غلط استعمال کے لئے ہندوستانی بینکنگ نظام میں ہیرا پھیری کی تھی۔ جب گھوٹالے کا پردہ فاش ہوا اور مہتا کو گرفتار کر لیا گیا تب اسٹاک مارکیٹ اوندھے منہ زمین پر گر گئی، جس کی وجہ سے ہزاروں لاکھوں شیئر ہولڈروں کو بہت زیادہ نقصان اٹھانا پڑا۔ یہ گھوٹالہ راتوں رات دولت مند بننے کی علامت بن گیا تھا۔ یہ معاشی اصلاحات کی بدقسمتی سے ایک چھوٹی مثال ہے، لیکن راؤ پر اس وقت پریشانی کے بادل چھا گئے جب ہرشد مہتا نے اعلان کیا کہ اس نے اس بحران سے نکلنے کے لئے وزیر اعظم کو کانگریس پارٹی کے لئے عطیہ کے طور پر ایک کروڑ روپئے کی رقم دی ہے۔

یہ داغ اس وقت اور بھی گہرا ہو گیا جب یہ پتہ چلا تھا کہ کانگریس پارٹی نے جھارکھنڈ مکتی مورچہ کے 4 سابق ممبران پارلیمنٹ کو رشوت دی۔ اس میں جھارکھنڈ مکتی مورچہ کے لیڈر شیبو سورین بھی شامل ہیں تا کہ جولائی 1993 میں عدم اعتماد کے خلاف ان کی ووٹ سرکار کی جھولی میں رہیں۔ سورین کے پرائیویٹ سکریٹری کو اس رشوت کے بارے میں جانکاری تھی۔ اس وقت یہ مسئلہ اور بھی الجھتا گیا جب اس پرائیویٹ سکریٹری کا مئی 1994 میں نئی دہلی میں اغوا کر لیا گیا اور بعد میں کراچی میں اس کو ہلاک کر دیا گیا۔

اسی وقت اسٹاک مارکیٹ کا راز اجاگر ہو گیا۔ میڈیا کی دنیا نے بتایا کہ وزیر اعظم راؤ کے لڑکے لڑکیاں تجارتی دنیا میں اچانک طاقت ور صنعت کار بن گئے ہیں۔ وہ کروڑوں روپئے کے پروجیکٹ چلا رہے ہیں، لیکن راؤ کے وقار کو متنازع تانترک چندرا سوامی کے ساتھ تعلقات کی وجہ سے سب سے زیادہ نقصان پہنچا۔ متعدد مجرمانہ الزامات کا سامنا کرنے کے باوجود راؤ کے 5 سال کے دور حکومت میں چندرا سوامی پر جانچ کا

کوئی اثر نہیں پڑا۔ وہ بغیر کسی اجازت کے کبھی بھی وزیر اعظم کی رہائش گاہ 7 ریس کورس روڈ پر آ سکتے تھے۔ راؤ کے ساتھ اپنی ایک میٹنگ میں میں نے پوچھا ’آپ کے چندرا سوامی کے ساتھ اتنے قریبی تعلقات کیسے ہیں؟ میں یہ سوال پوچھنے کے لئے مجبور ہوا ہوں۔ کیونکہ اس قربت کی وجہ سے آپ کی شخصیت اور ہندوستان کے وزیر اعظم کے وقار پر دھبہ لگا ہے۔‘ میرے اس سوال پر بھونچکے سے انداز میں انہوں نے جواب دیا ’نہیں ایسی کوئی قربت نہیں ہے۔ میں نے ان کے لئے کچھ نہیں کیا۔‘

راجیو گاندھی کے دور اقتدار میں بوفورس گھوٹالے کے بارے میں سچائی کو چھپانے کی کارروائی راؤ کے دور حکومت میں چلتی رہی۔ فروری 1992 میں میڈیا نے سنسنی خیز انداز میں پردہ فاش کیا کہ ہندوستان کے سابق وزیر خارجہ مادھوسنگھ سولنکی سوئٹزرلینڈ کے وزیر خارجہ کے پاس ہندوستان کے وزیر اعظم کا خط لے کر گئے جس میں بوفورس سے متعلق تحقیقات بند کردینے تک کے لئے کہا گیا تھا، سولنکی نے بتایا کہ غیر دستخط شدہ اور بغیر تاریخ کا یہ خط ہندوستان کے وزیر اعظم کی جانب سے آیا ہے۔ جب خط کی تفصیلات لیک ہوگئیں تب انہیں استعفیٰ دینے کے لئے مجبور کیا گیا۔ ایسے غلط کرپٹ کام کرنے کے لئے راؤ نے اپنے وزیر کا استعمال کیوں کیا؟ کس کی جانب سے انہوں نے ایسا کیا؟ یہ ملک اس سوال اور ایسے دیگر سوالوں کے جواب کا انتظار کر رہا ہے۔

راؤ حکومت کا دور دوسرے حوصلہ مندانہ کام کے لئے بھی رہا کہ 1995 میں بوفورس جانچ کو اس وقت پٹری سے اتار دیا گیا جب اٹلی کے بروکر (دلال) اوتاویو قواطروچی کو ملک سے باہر جانے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ اس شخص نے ہتھیاروں کا سودا کرنے میں اپنی جیبیں بھرلی تھیں۔ اسی شخص نے راجیو گاندھی کی فیملی سے اپنی قربت کا فائدہ اٹھایا۔ جب سپریم کورٹ اسے اپنے سامنے پیش ہونے کا حکم دینے والا تھا تب وہ یہاں سے کیوں چلا گیا؟ اس کا پاسپورٹ کیوں نہیں ضبط کیا گیا۔ کس کی شہ پر حکومت نے اسے ہندوستان چھوڑنے کی اجازت دی تھی؟ کانگریس پارٹی ہمیشہ ان سوالوں سے کتراتی رہی۔

اگرچہ راؤ سے میری دلچسپی ختم ہونے کی سب سے اہم وجہ اجودھیا مسئلے پر ان کے حوصلے میں کمی اور چالاکی کا پایا جانا تھا۔ میری اس سوچ کے پیچھے یہ وجہ تھی کہ دل ہی دل میں وہ ہندوؤں کے اس مطالبہ سے متفق تھے اور ساتھ ہی انہیں معلوم تھا کہ اپنی پارٹی کے اندر اٹھنے والے احتجاج کی بنیاد مسلم ووٹوں کی دلچسپی تھی۔ میں اس خیال کی تصدیق کے لئے ان کی کتاب ’اجودھیا‘ 6/دسمبر 1992 کے پہلے اور آخری پیراگراف کی جانب قارئین کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ یہ کتاب 2006 میں ان کی موت کے بعد شائع ہوئی تھی۔ ’تاریخ میں فاتحین نے کامیاب لوگوں کے ساتھ ہمیشہ بے عزتی کا رویہ اختیار کیا ہے اور ساتھ ہی بربریت جیسا برتاؤ بھی کیا ہے۔ عورتوں، غلاموں اور ہر طرح کی املاک پر فاتح اپنا حق جما لیتے ہیں اور وہ فاتح ہونے کے ناطے ان کا مالک بن جاتا ہے۔ مذہبی شدت پسندی کی وجہ سے بالجبر مذہب تبدیل کئے جاتے ہیں، مذہبی مقامات کو منہدم کیا جاتا ہے، مفتوح لوگوں کو فاتح کا مذہب اپنانے کے لئے مجبور کیا جاتا ہے۔ طاقت میں بدمست شخص ہتھیاروں کی مدد سے بھگوان کی شکل بدلنے کی کوشش کرتا ہے۔‘

6/دسمبر کے واقعہ کے لئے خود کو بے قصور ثابت کرنے کے سلسلے میں اپنا موقف واضح کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کتاب کے آخر میں انہوں نے لکھا ہے — ’میں نے یہ تمام باتیں اپنے ساتھیوں کو سمجھانے کی کوشش کی تھی، لیکن ان کے اپنے سیاسی ووٹ حاصل کرنے کے خیال تھے اور وہ پہلے ہی اپنی رائے بنا چکے تھے کہ اگر یہ مسئلہ سانحہ میں ختم ہوتا ہے تو اس کے لئے تاریخی طور پر ایک شخص کو ذمہ دار ٹھہرایا جائے گا۔ اگر کامیابی ملتی تھی (جیسا کہ ابتدائی مہینوں میں یقینی طور سے دکھائی دیتی تھی) تو بلاشبہ وہ مل کر تمام کریڈٹ لے لیتے یا آپس میں تقسیم کر لیتے۔ اس

لئے وہ یا تو کامیابی کے لئے کھیل کھیل رہے تھے یا ناکامی میں کسی کو قربانی کا بکرا بنانا چاہتے تھے۔ یہ تمام حکمت عملی تھی۔ بعد میں وہ کھل کر اعلان کر دیتے کہ بابری مسجد منہدم ہو جانے کے بعد کانگریس کو صرف میری وجہ سے مسلم ووٹ نہیں ملا'

ہندوستان کے وزیر اعظم اور کانگریس کے صدر— دونوں طور پر ایسے شخص کا بیان میری پارٹی کے اس الزام کا واضح ثبوت ہے کہ کانگریس ایشو کی بنیاد پر نہیں بلکہ مسلم ووٹوں کے خوف کی وجہ سے رام جنم بھومی مندر کی تعمیر کے ہندو مطالبات کی مخالفت کر رہی ہے۔

کتنی بدقسمتی ہے کہ راؤ خود اجودھیا ایشو پر اقلیتی کارڈ کھیل رہے تھے۔ 7/ دسمبر 1992 کو پارلیمنٹ میں اپنے بیان میں انہوں نے زور دیتے ہوئے کہا 'مسجد کو گرانا بربریت سے بھرا فعل تھا۔ حکومت مسجد کو دوبارہ تعمیر کرائے گی۔' یہ وہی وزیر اعظم تھے جن کی حکومت نے 2 گھنٹے قبل اجودھیا میں منہدم کئے گئے ڈھانچے کی جگہ پر چھوٹا سا مندر بنوانے کی اجازت دے دی تھی اور وہی شخص اب پارلیمنٹ کو یقین دہانی کرا رہا تھا کہ 'مسجد دوبارہ بنائی جائے گی۔' اسی وجہ سے راؤ نے ہندو اور مسلمان— دونوں کا اعتماد کھو دیا۔

یہ بات قابل غور ہے کہ تب سے کسی بھی وزیر اعظم نے اس وعدے کو نہیں دہرایا کہ 'بابری مسجد دوبارہ تعمیر کرائی جائے گی۔' اور کچھ نہیں تو اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اجودھیا سے متعلق ایشو کا اکلوتا حل پُر امن طریقے سے اور قانونی طور سے رام مندر بنوانا۔

حوالہ اسکینڈل: مشکلات کے دور ختم ہو جاتے ہیں، حوصلہ مند برقرار رہتے ہیں

میری زندگی کے سب اہم چیلنج کا دور 1996 کے شروع میں آیا تھا جب نرسمہا راؤ کی حکومت نے 'حوالہ' سودے میں میرے اوپر غلط طریقے سے الزام لگایا تھا۔ 16 جنوری کو اس وقت میں پارٹی آفس میں بیٹھا تھا، جب میری معاون سشما سوراج میرے کمرے میں آئیں اور کہنے لگیں کہ ان کے شوہر اور وکیل سوراج کوشل سے معلوم ہوا ہے کہ سی بی آئی نے میرے خلاف اور دوسرے سیاسی لیڈروں کے خلاف انسداد بدعنوانی ایکٹ کے تحت کیس درج کیا ہے۔ اس خبر سے مجھے زبردست دھچکا لگا۔

جیسا کہ مجھے پتہ چلا کہ حوالہ گھوٹالہ میں مختلف پارٹیوں کے کئی سیاستدانوں کے نام شامل تھے۔ ان میں کچھ راؤ کی وزارت کے رکن بھی تھے۔ ان لیڈروں پر یہ الزام لگایا گیا تھا کہ انہوں نے حوالہ بروکروں کے ذریعہ سے خطیر رقم حاصل کی ہے۔ نتیجتاً سی بی آئی نے بھوپال کے رہنے والے تاجر ایس کے جین اور جے کے جین کی ڈائریاں پیش کیں۔ یہ الزام لگایا جا رہا تھا کہ انہیں کے ذریعہ سے جموں و کشمیر کے دہشت گردوں تک رقم پہنچائی گئی ہے۔ میرے خلاف یہ الزام لگایا گیا تھا کہ جب میں ممبر پارلیمنٹ تھا، تب میں نے ناجائز طریقے سے 25 لاکھ روپے مانگے اور حاصل کئے تھے۔ اور جب میں ممبر پارلیمنٹ نہیں تھا تب میں نے اضافی 35 لاکھ روپے مانگے اور حاصل کئے تھے، لیکن اس کے علاوہ جین اور دوسرے لوگوں کے خلاف ساز باز کر کے مجرمانہ سازش بھی تیار کی تھی۔

ایک سیاسی کارکن ہونے کے ناطے جس نے متعدد احتجاجی مظاہروں میں شرکت کی تھی میرے لئے مجرمانہ الزامات کا سامنا کرنا کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اکثر ایسے ایسے الزامات کا تعلق نقض امن کی دفعہ 144 کی خلاف ورزی سے ہوتا تھا۔ ایودھیا آندولن کے معاملہ میں الزام زیادہ تلخ تھا، لیکن بدعنوانی کا الزام میرے لئے ایکدم نیا تجربہ تھا۔ اپنی پوری سیاسی زندگی میں میرے مخالفین نے کبھی مجھ پر رشوت یا مالی بدعنوانی کا الزام نہیں لگایا تھا۔

میں نے کئی ذرائع سے اس خبر کی تحقیق کی۔ سبھی سے تصدیق ہو گئی کہ سی بی آئی حقیقت میں یہ معاملہ کورٹ میں لے گئی ہے۔ میں نے فوراً دو فیصلے کئے۔ پہلا، میں لوک سبھا کی رکنیت سے استعفیٰ دے دوں گا، دوسرا میں اعلان کروں گا کہ جب تک عدالت مجھے ان بے بنیاد الزامات سے

بری نہیں کر دیتی تب تک میں لوک سبھا کا انتخاب نہیں لڑوں گا۔ میں نے اٹل جی کو فون پر یہ سب بتا دیا۔ جلد ہی وہ اور دوسرے ساتھ پارٹی آفس میں جمع ہوئے ان میں سے کچھ نے کہا کہ پارلیمانی انتخاب ہونے والے ہیں ایسی حالت میں اتنا بڑا قدم اٹھانا مناسب نہیں ہے۔ میں نے نفی میں جواب دیا 'بہتر جواب دینے کا یہی صحیح طریقہ ہے تاکہ عوام محسوس کر سکیں کہ میرے پاس چھپانے کیلئے کچھ نہیں ہے اور غیر جانبدارانہ عدالتی تفتیش کا سامنا کرنے کیلئے تیار ہوں'۔

کچھ ہی گھنٹوں کے اندر میں نے پارٹی آفس میں پریس کانفرنس بلائی جہاں میں نے مذکورہ دونوں باتوں کا اعلان کر دیا۔

یہاں میں غلط اور انتہائی غیر معمولی طریقے سے لگائے گئے دوسرے الزام کی یاد دلانا چاہتا ہوں۔ 1982 میں میں نے گوالیار میں ووٹنگ فہرست میں اپنا نام درج کرایا جہاں میری چچازاد بہن رہتی تھی۔ میری پارٹی کے کچھ مخالفین نے الیکشن کمیشن کے سامنے سوال اٹھائے۔ الیکشن کمیشن نے اس معاملے کی تحقیق کی اور گوالیار سے ووٹنگ فہرست میں میری موجودگی کو قانونی بتایا۔ اس کے باوجود اسی طرح سے مقامی عدالت میں میرے خلاف مجرمانہ مقدمہ درج کیا گیا۔ وہ جھوٹا مقدمہ چلتا ہی رہا، اس کا کہیں اختتام نظر نہیں آ رہا تھا۔

اسی طرح لوک سبھا میں 'استعفیٰ' دینے کے فیصلے کے بعد بھی میرے دماغ میں گوالیار کا معاملہ مسلسل گردش کرتا رہا تھا۔ ووٹر لسٹ میں اندراج کے سلسلے میں ایک معاملہ اگر چودہ سال تک طوالت کا شکار رہا تو مجھے اچھی طرح سمجھ جانا چاہیے تھا کہ میرے اس اعلان کا مطلب میرے پارلیمانی زندگی کا خاتمہ بھی ہو سکتا تھا۔

دہلی ہائی کورٹ میں سولہ ماہ تک 'حوالہ' اسکنڈل کا معاملہ چلا اور بالآخر 8 اپریل 1997 کو جسٹس شمیم نے فیصلہ دے کر میرے خلاف لگائے گئے بدعنوانی کے الزامات کو غلط ثابت کر دیا۔ میرا نام نہ تو کسی روزنامچہ میں تھا نہ ہی ماہنامہ ڈائریوں میں نہ جزوقتی کھاتوں میں۔ اور یہاں تک کہ مئی 1991 میں سی بی آئی کے ذریعہ جین برادران سے ضبط کی گئی 'مدر ڈائری' میں بھی کہیں میرا نام نہیں تھا بلکہ ایک کھلے اور واضح طور سے الگ سے جوڑے گئے کاغذ پر میرا نام لکھا تھا۔ اس کے بارے میں 'پائنیر' میں اس وقت شائع سدھیندر کلکرنی کے آرٹیکل کا حوالہ دینا چاہوں گا۔

> 'ایک ایماندار اور بیدار سیاسی لیڈر کے خلاف رچی گئی سازش کے تحت لگائے گئے الزامات عدالتی نظریہ سے مٹا دیئے گئے ہیں۔ بی جے پی صدر کے سیاسی کیریئر کو تباہ کرنے یا کسی بھی طرح سے اسے لاچار بنانے کی سازش اور اس طرح سے اس کی پارٹی کی لگاتار پیشرفت کو روکنے کی کوشش کو ناکام کر دیا گیا ہے۔ جسٹس شمیم کے 70 صفحہ کے اس فیصلے میں اعلیٰ عدالتی ڈسپلن اور حقائق کے تئیں غیر معمولی ایمانداری ظاہر ہوتی ہے۔ اس میں مسٹر آڈوانی کے خلاف لگائے گئے الزامات کو غلط ہی ثابت نہیں کیا گیا بلکہ یہ فیصلہ دیا گیا کہ یہ معاملہ عدالتی تفتیش کے لائق ہی نہیں ہے انہیں اس معاملے میں ایسی کوئی سند نہیں ملی جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ ایس کے جین کے مبینہ حوالہ میں نقد رقم کی ادائیگی کی تھی اور مسٹر آڈوانی نے رقم حاصل کی۔
>
> ایسا نہیں ہے کہ سی بی آئی یا ان کے ساتھ بلاک آقاؤں کو یہ پتہ نہیں تھا جب 16 جنوری 1996 کو مسٹر آڈوانی پر الزام لگایا گیا۔ اس معاملے کے بارے میں ہر شخص کو پتہ تھا جسے شواہد ایکٹ اور اس قانون کے دیگر مثبت پہلوؤں کی بنیادی جانکاری ہے لیکن اس سے بھی زیادہ جانکاری یہ تھی کہ مقدمہ سیاسی نظریے سے بھی کمزور تھا۔ مسٹر آڈوانی کی زندگی کا ریکارڈ رہا ہے کہ ان کی ایمانداری اور اخلاص کے سلسلے میں ان کے کٹر سیاسی حریفوں اور مخالف نظریات والوں نے بھی انگلی نہیں اٹھائی تھی۔ پھر بھی کمزور سی بی آئی کے چارج شیٹ میں ان کے خلاف مقدمہ درج کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس لیے یہ کیس تیار کیا گیا تھا۔ یہ بات واضح اور آسان تھی۔ مسٹر آڈوانی کے خلاف

معاملے کو خارج کرتے ہوئے جسٹس شمیم نے اس معاملے کے قانونی نکات کو ہی دیکھا۔ لیکن جو لوگ اپنی یادداشت کو بیدار کر سکتے ہیں وہ اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ اس کی حکومت کی چالا کی کی وجہ سے ہی سی بی آئی نے چارج شیٹ پیش کیا تھا۔ وزیراعظم اپنے خلاف لگائے گئے بدعنوانی کے الزامات سے سب کا دھیان ہٹانا چاہتے ہیں اور معاملے کو نیا موڑ دینا چاہتے تھے۔ مسٹر نرسمہاراؤ نے ضرور سوچا ہوگا کہ اس خواہش کو پورا کرنے کا اس سے بہتر طریقہ نہیں ہوسکتا کہ اپنے سیاسی مخالفین کا نام کرپشن یا اس گھوٹالے میں شامل کر دیا جائے جس میں ان کے وزیر اور پارٹی والوں کے نام شامل ہیں۔ اسی وجہ سے راؤ حکومت پر 1995 کے وسط میں عدالتی دباؤ میں اضافہ ہونے لگا کہ سنسنی خیز حوالہ اسکنڈل کی تفتیش شروع کی جائے جس میں ہمیشہ کی طرح 'فرمانبردار' سی بی آئی نے جین ڈائریوں میں درج سیاست دانوں کے نام کی فہرست میں مسٹر آڈوانی کا نام بھی شامل کر دیا ہے تا کہ یہ دکھایا جا سکے کہ کانگریس صدر تو محض بدعنوانی کے الزامات کا سامنا کر رہے ہیں لیکن بی جے پی سربراہ پر حقیقت میں بدعنوانی کا مقدمہ شروع ہو گیا ہے۔

16 مہینے تک مسٹر آڈوانی انتظامیہ کے بے ایمان اور چالاک لوگوں کے زمرہ میں ہونے کا تکلیف برداشت کرتے رہے ایسے وقت میں جب عام آدمی اپنے سیاست دانوں کے بارے میں منفی سوچ رکھ رہے ہیں اب مسٹر آڈوانی کی عزت دوبارہ برقرار ہوئی ہے اور اس میں انہیں ذاتی فائدہ پہنچا ہے۔ لیکن بی جے پی سربراہ کے خلاف مقدمہ خارج کر دینے سے پارٹی کو فائدہ پہنچا ہے لیکن جسٹس شمیم کی اس فیصلے کا اس سے بھی زیادہ فائدہ ہندستان کے سیاسی نظام اور جمہوریت کو پہنچا ہے۔ کسی کو اس فائدہ کو سمجھنے کے لیے بی جے پی سے ہمدردی رکھنے والا ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔'

سی بی آئی نے سپریم کورٹ میں دہلی ہائی کورٹ کے فیصلے کو چیلنج کیا ہے۔ سپریم کورٹ کے تین ججوں کی بنچ نے 2 مارچ 1998 کو یہ کہتے ہوئے یہ عرضی خارج کر دی' جہاں تک مسٹر آڈوانی کا سوال ہے ہم نے دیکھا ہے کہ اپنے بیانات میں کسی نے بھی ان کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ ہم نے پایا کہ انسداد بدعنوانی ایکٹ دفعہ 7 کے تحت کسی بھی جرم کے سلسلے میں ان کے خلاف پہلی نظر میں کوئی کیس ہی نہیں بنتا۔' اس عدالت نے یہ بھی فیصلہ دیا کہ 'معمولی ڈزائن کے تعلق سے سازش کاروں کے ذریعہ کہی گئی بات یا کیے گئے کام کے سلسلے میں ثبوت ایکٹ کی دفعہ 10 کی پہلی شرط بھی پوری نہیں ہوتی۔'

جب میں پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو اپنے بارے میں لیے گئے لوک سبھا سے استعفیٰ کے فیصلے پر اطمینان محسوس کرتا ہوں۔ یہ میرے خلاف لگائے گئے کرپشن کے الزامات کا صحیح اخلاقی جواب ہی نہیں تھا بلکہ اس فیصلہ سے لوگوں کی نظروں میں بی جے پی کی شبیہ اور اچھی ہوگئی۔ زندگی میں ایسے امتحان کی گھڑی میں میری طاقت کا ذریعہ میرا کنبہ رہا ہے۔ میں ایک یادگار واقعہ کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ استعفیٰ دینے کے بعد صبح میں اپنی رہائش گاہ کے آفس روم میں بیٹھا تھا مجھے اداس دیکھ کر میری بیٹی پرتبھا میرے پاس آئی اور کہا 'دادو، آپ اداس کیوں ہے؟ میں نے آپ کے لیے یہ نظم ڈھونڈی ہے، اسے پڑھیں۔ لکڑی سے بنی ایک خوبصورت طشتری پر فٹ پرنٹس (قدموں کے نشان سے) نظم لکھی تھی جس کا اردو ترجمہ درج ہے—

ایک رات ایک شخص نے ایک خواب دیکھا
اس نے دیکھا وہ چل رہا ہے سمندر تٹ پر
پرماتما کے ساتھ

افق پر چمک رہے تھے اس کی زندگی کے منظر
ہر منظر کے لیے تھے ریت پر دو جوڑی قدموں کے نشان
ایک اس کے اور دوسرے پرماتما کے
اور جب آکاش پر چمکا اس کے جیون کا آخری منظر
تو اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا
اور غور کیا......
کہ جیون پتھ کے رتیلے تٹ پر
کئی بار دِکھے صرف ایک ہی جوڑی قدموں کے نشان
جب جب وہ ڈوبا تھا اداسی کے سمندر میں
یاد با تھا دکھ کے پہاڑ تلے
بے چین ہوا اس کا من
اور اس نے پرماتما سے ہی پوچھ لیا
'ہے پرماتما! تم نے کہا تھا
کہ اگر میں فیصلہ لوں کہ میں چلوں گا تمہارے پیچھے
تو تم سدا چلو گے میرے ساتھ
لیکن غور کیا میں نے
زندگی کے لامتناہی درد میں
ریت پر چھپے تھے صرف ایک ہی جوڑی قدموں کے نشان
سمجھ نہیں پایا میں
جب جب تھی مجھے تمہاری سب سے زیادہ ضرورت
تب تب کیوں چھوڑ گئے تم میرا ساتھ......'
پرتما نے جواب دیا۔
'میرے پیارے امول بچے
مجھے تم سے ہے گہری محبت اور پریم
اور میں تمہیں کبھی نہیں چھوڑ سکتا
مصیبت اور تکلیف کے وقت
جب جب تمہیں دکھائی دیئے

صرف ایک جوڑی قدموں کے نشان
تب تب میں نے اٹھایا ہوا تھا تمہیں اپنی گود میں'

میں نے اپنے آفس میں یہ نظم لگائی اور یہ ابھی بھی وہاں ہے تقریباً اسی وقت فادر اینجلس اسکول دہلی کے فادر بینٹو روڈ رگس مجھ سے آکر ملاقات کی اور مجھے ایک کتاب دی۔ اس کتاب کا نام تھا- 'ٹف ٹائمس ڈونٹ لاسٹ، ٹف مین ڈو'۔ (مشکلات کے دور ختم ہو جاتے ہیں، حوصلہ مند برقرار رہتے ہیں۔)

وزیراعظم عہدے کے لیے اٹل جی کے نام کا اعلان

اپنے خلاف سی بی آئی کے جھوٹے مقدمہ سے محض دو ماہ قبل میں نے 13-11 نومبر 1995 کو ممبئی میں منعقد بی جے پی کانفرنس میں تقریر کرتے وقت ایک اہم اعلان کیا۔ یہ ہماری پارٹی کی ابھی تک کی سب سے بڑی کانفرنس تھی۔ قومی مجلس عاملہ کی سہ روزہ کانفرنس میں شرکت کرنے کے لیے پورے ملک سے تقریباً ایک لاکھ نمائندے آئے تھے۔ یہ سمندر کے سامنے مہالکشمی ریس کورس میدان میں ہوا تھا۔ اس مقام کا نام 'یشو بھومی' رکھا گیا تھا، جو مناسب تھا۔ دوسرے دن شام کو پورے مہاراشٹر سے پارٹی حامی شامل ہوئے اور دادر میں شیواجی پارک کی جانب روانہ ہوئے۔ یہ دہلی کے رام لیلا میدان اور کلکتہ کے بریگیڈ پریڈ میدانوں جیسا ہے۔ یہ میدان متعدد سیاسی مظاہروں اور ریلیوں کا گواہ رہا ہے۔ اس میٹنگ کا وقت بھی کافی اہم تھا۔ بدستور بدنام ہو رہی نرسمہا راؤ حکومت کی 5 سال دور کے خاتمہ سے پہلے کا سال تھا۔ ہندوستان کے عوام نے کانگریس کے متبادل کے طور پر بی جے پی سے امیدیں وابستہ کرنی شروع کر دی تھی۔ یہ عظیم الشان سیاسی کانفرنس ایسا اسٹیج بن گیا جہاں ہم نے بی جے پی کو 1996 کے پارلیمانی انتخابات میں اقتدار کے سنجیدہ دعویدار کے طور پر پیش کیا۔

اپنے صدارتی خطاب میں میں نے شروع سے لے کر 1980 میں ممبئی منعقد تاسیسی کانفرنس تک اس کی ترقی کے عمل میں آنے والے نشیب وفراز کو بتایا- کیسے 1984 میں پارلیمنٹ میں دو سیٹیں جیتیں اور بعد میں 1989 میں 86 اور 1991 میں 121 سیٹیں جیتیں۔ 1996 کے لوک سبھا انتخابات میں مرکز میں سرکار بنانے کے لیے رائے عامہ حاصل کرنے کے سلسلے میں امید اور اعتماد کا اظہار کرتے ہوئے میں نے اعلان کیا 'ہم اٹل بہاری واجپئی کی قیادت میں آئندہ انتخاب لڑیں گے اور وہ وزارت عظمٰی کے ہمارے امیدوار ہوں گے۔ کئی سال تک ہمارے پارٹی کے کارکن ہی نہیں بلکہ عام لوگ بھی یہ نعرہ لگاتے رہے ہیں- 'اگلی باری، اٹل بہاری'۔ مجھے یقین ہے کہ بی جے پی اٹل جی قیادت میں اگلی حکومت بنائے گی۔' اسٹیج پر اس اعلان کے بعد جو بھی ہوا اسے 'پائنیر' میں کنچن گپتا نے اپنے کالم میں شاندار ڈھنگ سے ذکر کیا ہے—

'......ایک لمحہ کے لیے خاموشی چھا گئی۔ تب تالیوں کی گڑگڑاہٹ سے ماحول گونج اٹھا، آڈوانی کی تقریر کے بعد یہ اعلان کیا گیا کہ یہ کوئی عام بات نہیں تھی، بلکہ جذباتی اعلان تھا۔ بعد میں انہوں نے ہمیں بتایا کہ خود ان کے لیے اور پارٹی کے لیے یہ 'تاریخی لمحہ' تھا ایسا کچھ جس کا اعلان کرنے کے لیے وہ کئی سال سے انتظار کر رہے تھے۔ آڈوانی کے ڈائس پر اپنے مقام پر لوٹنے سے قبل واجپئی نے مائکروفون تھام لیا اور جذبات سے رندھے اور کافی دیر تک ٹھہرنے کے بعد پھر بولے 'بی جے پی انتخابات جیتے گی، ہم حکومت بنائیں گے اور آڈوانی جی وزیراعظم ہوں گے۔' آڈوانی نے کہا 'اعلان ہو چکا ہے۔' مسکراتے ہوئے واجپئی نے کہا 'تو پھر میں بھی اعلان کرتا ہوں کہ وزیراعظم......' آڈوانی درمیان میں مخل ہوئے 'اٹل جی ہی بنیں گے۔' واجپئی نے کہا 'یہ تو لکھنوی انداز میں پہلے

آپ، نہیں پہلے آپ، ہو رہا ہے۔' تھوڑی دیر تک دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ دو پرانے ساتھیوں اور قریبی دوست، جنہوں نے بھارتیہ جن سنگھ کی اس کے تشکیل کے وقت سے ہی پرورش کی تھی اور بعد میں بی جے پی کو فروغ دیا۔ دونوں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔..... 1996 کی گرمیوں میں آڈوانی کا اعلان صحیح نکلا۔ بی جے پی سب سے بڑی پارٹی بن کر سامنے آئی اور صدر ڈاکٹر شنکر دیال شرما نے حکومت سازی کے لیے اسے مدعو کیا اور واجپئی نے وزیر اعظم کے طور پر حلف لیا......

اس کے بعد جو بھی ہے تاریخ ہے۔

ہر شخص میرے اعلان پر حیران تھا تب تک نہ تو بی جے پی اور نہ ہی دیگر غیر کانگریسی سیاسی پارٹی نے کسی بھی پارلیمانی انتخاب سے قبل وزیر اعظم عہدے کے لیے امیدوار کا اعلان کیا تھا۔ (کانگریس پارٹی اس بارے میں سب سے الگ ہے کیونکہ وزارت عظمیٰ کے لیے وہاں امیدوار نسلی ہوتا ہے یا 'نسل' کے ذریعہ نامزد کیا جاتا ہے) اس کے علاوہ میں نے اٹل جی کے ساتھ بھی اس بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی بعد میں انہوں نے مجھے بتایا 'کیا اعلان کر دیا آپ نے؟ کم سے کم مجھ سے تو بات کرتے۔' اس بارے میں میں نے جواب دیا 'کیا آپ مانتے؟ اگر ہم نے آپ سے پوچھا ہوتا؟'

بی جے پی صدر ہونے کے ناطے میرے ذریعہ کیے گئے اعلان کو عام لوگوں نے کشادہ دلی سے قبول کیا۔ وہیں میری پارٹی کے سبھی سطح کے کارکنوں نے جوش و خروش کے ساتھ میرے فیصلے کی حمایت کی۔ میری یہ ذاتی سوچ نہیں تھی کہ ملک کو اٹل جی کی قیادت والی سرکار چاہیے بلکہ یہ لاکھوں کروڑوں ہندوستانیوں کے جذبات تھے، دلی خواہش تھی۔

اعلان کے بعد کچھ چہ مگوئیاں ہوئیں اور یہ مشورہ دیا گیا کہ میں نے وزیر اعظم عہدے کے امیدوار کے طور پر اٹل جی کے نام کا اعلان کیا ہے لیکن میں اس کے تئیں پوری طرح مطمئن نہیں ہوں۔ صاف ہے کہ میں ایسی بیکار باتوں سے بہت افسردہ ہوا اور میرے دل کو ٹھیس پہنچی۔

اس لیے جنوری 1996 میں حوالہ اسکینڈل کے بارے میں جب میں نے یہ حلف لیا تھا کہ جب تک میرے اوپر لگایا گیا الزام غلط ثابت نہیں ہو جاتا تب تک میں لوک سبھا میں داخل نہیں ہوں گا– میں اس سچائی سے بخوبی واقف تھا کہ عدالتی فیصلہ آنے میں دسیوں سال لگ سکتے ہیں۔ اس کے باوجود ممبئی میں کیے گئے اعلان سے میرے پہلے کیے گئے فیصلہ کو تقویت ملے گی۔

کئی سیاسی مبصروں نے ان حقائق پر توجہ دلائی کہ انتخاب نہ لڑنے کا یہ حلف کچھ غور و فکر کرنے کے بعد نہیں لیا گیا تھا۔ مشہور میڈیا شخصیت ویر سنگھوی نے لکھا– 'یہ نامناسب دعویٰ کیا گیا ہے کہ حوالہ اسکینڈل میں لگائے گئے الزامات کے بعد آڈوانی جی ہٹ گئے۔ حقیقت میں انہوں نے حوالہ اسکینڈل سے بہت پہلے ہی واجپئی کے نام کی تجویز پیش کی تھی۔'

دوبارہ پارٹی صدارت کی ذمہ داری

90 کی دہائی کے ابتدا میں بی جے پی کی ترقی میں اہم میل کا پتھر ڈاکٹر مرلی منوہر جوشی کی 'ایکتا یاترا' تھی۔ پارٹی صدر بننے کے فوراً بعد انہوں نے قومی اتحاد اور سالمیت کے پیغام کی تشہیر کے لیے کنیا کماری سے کشمیر تک کی 47 روزہ یاترا شروع کی۔ 11 دسمبر 1991 کو شروع ہونے والی اس یاترا کی خصوصیت یہ تھی کہ یوم جمہوریہ 1992 کو سری نگر کے لال چوک میں قومی جھنڈا لہرایا گیا۔ جب سے پاکستان سے حمایت یافتہ علیحدگی پسند مہم کشمیر گھاٹی میں شروع ہوئی تھی تب سے یہ گروپ راجدھانی کے اس خاص چوک میں ہندوستانی ترنگا لہرانے سے روکتے رہے تھے۔

اس لیے ایکتایاترا کی کامیابی حقیقت میں سرحد پار دہشت گردی کے خلاف ہندوستان کی جدوجہد میں اہم واقعہ رہی۔

ڈاکٹر جوشی کی دوسالہ مدت کے آخر میں پارٹی نے دوبارہ جون 1993 کی طرح ہی مجھے صدر کے عہدہ کی ذمہ داری سنبھالنے کے لیے کہا۔ اکتوبر 1995 میں مجھے اس عہدے کے لیے دوبارہ منتخب کیا گیا۔ دونوں ہی مواقع پر میں نے درخواست کی کہ کسی نوجوان کو یہ ذمہ داری سونپی جائے۔ لیکن میری صلاح کسی نے نہیں مانی۔

بی جے پی کو 1993 میں انتخابی دھچکا لگا جب اتر پردیش، مدھیہ پردیش، راجستھان اور ہماچل پردیش میں اسمبلی انتخابات ہوئے تھے۔ ان چار ریاستوں میں بی جے پی حکومتوں کو برخاست کردیا گیا تھا اور دسمبر 1992 کو ایودھیا میں متنازع ڈھانچہ گرانے کے بعد مرکزی حکومت کے ذریعہ ان ریاستوں میں ایمرجنسی نافذ کردی گئی تھی۔ میری پارٹی اتر پردیش، مدھیہ پردیش اور ہماچل پردیش میں دوبارہ اقتدار میں نہیں آسکی۔ تاہم راجستھان میں بھیروں سنگھ شیخاوت نے 200 سیٹوں والے ایوان میں 90 سیٹیں جیت کر حکومت بنائی۔ 1993 کے اسمبلی انتخابات کا قابل اطمینان نتیجہ یہ رہا کہ دہلی میں بی جے پی کی جیت کی وجہ سے مدن لال کھورانہ وزیراعلیٰ بنے۔

میری پارٹی پہلی بار دو اور ریاستوں گجرات اور مہاراشٹر میں سرکار بنانے میں کامیاب رہی جہاں 1995 میں اسمبلی انتخابات ہوئے تھے۔ گجرات میں بی جے پی نے ایوان کی 182 میں سے 121 سیٹیں جیتی تھی اور کیشو بھائی پٹیل وزیراعلیٰ بنے۔ مہاراشٹر میں شیوسینا-بی جے پی اتحاد کامیاب ہوا اور منوہر جوشی وزیراعلیٰ اور گوپی ناتھ منڈے نائب وزیراعلیٰ بنے۔

کل ملاکر 90 کی دہائی میں ابتدا ایسی رہی جب بی جے پی نے متعدد ریاستوں میں قابل ذکر کام کیے اور مرکز میں کانگریس کے متبادل کی شکل میں ابھری۔ اپریل-مئی 1996 میں 11ویں لوک سبھا کے انتخابات کے وقت دو طاقتور طاقتیں ہندوستانی سیاست میں ابھریں۔ ہندوستان کی عوام اور پارٹی کے سبھی سطح کے کارکنوں- میں بی جے پی کو اقتدار میں لانے کی خواہش بیدار ہوئی۔ ان دو طاقتوں کے ملے جلے اثرات انتخابی نتائج سے واضح ہوتے ہیں- بی جے پی نے 161 سیٹیں، کانگریس نے 136 سیٹیں، جنتا دل نے 46 سیٹیں، مارکس وادی کیمونسٹ پارٹی نے 32 سیٹیں اور بھارتیہ کیمونسٹ پارٹی نے 9 سیٹیں حاصل کیں۔

1996 کا پارلیمانی انتخاب ہندوستانی جمہوریت میں انقلابی واقعہ رہا۔ آزادی حاصل کرنے کے بعد پہلی بار کانگریس کی مستحکم حالت ڈانواں ڈول ہوگئی اور وہ اقتدار سے باہر ہوگئی اور بی جے پی لوک سبھا میں سب سے بڑی پارٹی کے طور پر سامنے آئی۔

10

2 سال میں 3 وزرائے اعظم

سات سماجی گناہ —
1- بغیر اصول کی سیاست
2- بغیر اخلاق کے تجارت
3- بغیر عمل کے دولت
4- بغیر کردار کے تعلیم
5- بغیر انسانیت کے علم
6- بغیر بیداری کے خوشی
7- بغیر قربانی کے عبادت

— مہاتما گاندھی

1990 کے وسط کا دور ہندوستانی سیاست میں بہت زیادہ غیر مستحکم دور تھا۔ ملک نے دو سال سے بھی کم مدت میں۔ مئی 1996 اور مارچ 1998 کے درمیان تین وزرائے اعظم دیکھے۔ کانگریس اور کئی دیگر پارٹیوں کے ذریعہ 'سیکولرازم' کا ایک دم مضحکہ خیز استعمال کر کے بی جے پی کو اقتدار سے روکنے کی منشا ان کی اقتدار کی بھوک کی عکاسی کرتی ہے۔

ایک پارٹی جس کے لوک سبھا میں سب سے زیادہ 161 ممبران تھے، اقتدار میں 13 دن سے زیادہ نہیں رہ سکی، جبکہ وہ پارٹی جس کے صرف 46 ممبران پارلیمنٹ تھے کو سرکار بنانے کا موقع ملا، جس کی قیادت ایک ایسا شخص کر رہا تھا جو نہ تو صفِ اول کا لیڈر تھا اور نہ ہی اس کی سیاست کے باہر انہیں کوئی جانتا تھا۔ ان کے بعد ایک دوسرے وزیراعظم بنے جو اسی پارٹی کے تھے لیکن ان کی اپنی کوئی عوامی پکڑ نہیں تھی۔ ان دونوں حکومتوں کو کانگریس باہر سے حمایت کر رہی تھی جس نے '5 سال تک بغیر کسی شرط' کے حمایت دینے کا وعدہ کیا تھا، لیکن بدقسمتی سے دونوں ہی حکومتوں کو کانگریس نے گرایا جس کی بنیاد اتنی غلط تھی جو سیاسی اخلاق کی کسی بھی کسوٹی پر کھری نہیں اترتی۔

قارئین دیکھیں گے کہ کیسے ہندوستان کو سیاسی غیر استقامت کی وجہ سے کمزور ہونا پڑا اور کیسے بالآخر ملک کو کمزور کرنے والی ان طاقتوں کو

عوام نے شکست دی تھی۔ ان سب نے 1998 میں پہلی بار ہندوستان میں بی جے پی کی قیادت والی سرکار کی راہ ہموار کی۔

11ویں لوک سبھا مسلسل تیسرا معلق ایوان تھا۔ پھر بھی اسے ہندوستانی سیاست کے دوقطبی ہونے کے سال کے طور پر یاد رکھا جائے گا۔ یہاں تک کہ 1977 میں جب کانگریس کو پہلی بار اقتدار گنوانی پڑی تھی تب بھی وہ صرف جنتا پارٹی کسی بھی حلیف پارٹی سے بڑی پارٹی تھی۔ 1996 میں یہ صرف 136 سیٹیں جیتنے میں کامیاب رہی تھی جو بی جے پی سے 25 سیٹیں کم تھیں جس کی وجہ سے بی جے پی ایوان میں سب سے بڑی پارٹی ثابت ہوئی۔ جنتا دل کو 46 سیٹیں، مارکس وادی کمیونسٹ پارٹی کو 32 اور بھارتیہ کمیونسٹ پارٹی کو 10 سیٹیں حاصل ہوئی۔

سب سے اہم سچائی یہ ہے کہ کانگریس پارٹی کی مقبولیت کا گراف تیسرے انتخاب میں گھٹ گیا تھا، جبکہ اس نے ملک کے سب سے زیادہ انتخابی حلقوں سے الیکشن لڑا تھا۔ کانگریس کو 1989 میں 39.3 فیصد، 1991 میں 37.57 فیصد اور اس باریعنی 1996 میں 28.2 فیصد ووٹ ملے۔ اس کے برعکس کانگریس کے بہ نسبت بہت کم حلقوں سے انتخاب لڑنے والی بی جے پی کو مسلسل تینوں انتخابات میں برتری حاصل ہوئی۔ 1989 میں 11.36 فیصد سے، 1991 میں 20.11 فیصد اور 1996 میں 20.29 فیصد ووٹ حاصل ہوئے۔ یہ عوام کے ذریعہ کانگریس کے بہ نسبت بی جے پی کو زیادہ پسند کیے جانے کی ثبوت ہے۔

اٹل جی کی 13 دن کی حکومت

عوامی رائے عامہ کا مطلب واضح تھا، عوام نے اٹل بہاری واجپئی کی قیادت میں بی جے پی کے حق میں اور کانگریس کے خلاف ووٹ دیا تھا۔ کانگریس کی قیادت اس وقت پی وی نرسمہاراؤ کر رہے تھے۔ جہاں تک دوسری پارٹیوں کا تعلق ہے ان کی کوئی گنتی نہیں تھی۔ فطری طور سے اس وقت کے صدر جمہوریہ ڈاکٹر شنکر دیال شرما نے اٹل جی کو حکومت بنانے کے لیے مدعو کیا اور 16 مئی کو انہیں وزارت عظمٰی کے عہدے کا حلف دلایا اور ان سے 14 دن کے اندر ایوان میں اپنی اکثریت ثابت کرنے کے لیے کہا گیا۔

ڈاکٹر شرما کے ذریعہ حکومت سازی کے لیے اٹل جی کو مدعو کرنے کے فیصلے کی کچھ اپوزیشن لیڈروں اور بائیں بازوں کے حامیوں کے ذریعہ تنقید کی گئی۔ انہوں نے کہا کہ صدر نے حکومت سازی کے لیے پوری طرح ریاضی کا اصول اپنایا ہے۔ یہ اور کچھ نہ ہو کر صرف نظریات کی تنقید تھی، چونکہ ریاضی کا اصول صدر کے سامنے اکیلا آئینی راستہ تھا۔ ایک معلق ایوان میں صدر کا فرض ہوتا ہے کہ یہ اس پارٹی یا انتخاب سے قبل اتحاد کے لیڈر کی حکومت سازی کے لیے مدعو کرے جس کی سب سے زیادہ سیٹیں ہیں۔ اس لیڈر کے ایوان میں اپنی پارٹی کی اکثریت ثابت کرنے میں ناکام ہونے کے بعد ہی وہ دوسری سب سے بڑی پارٹی یا انتخاب سے قبل اتحاد کو مدعو کرسکتا ہے۔ ڈاکٹر شرما کا فیصلہ ان چار عناصر پر منحصر تھا جو ہمیشہ صدر کے فیصلے کو ڈائریکشن دیتے ہیں۔ یہ ہیں آئینی اقدار، غیر جانب دارانہ، شفافیت اور ملک کے مفاد میں۔ وزیراعظم واجپئی نے 19 مئی کو قوم کے نام اپنے خطاب میں اپنے مخالفین کو جواب دیا——

''صدر جمہوریہ نے مجھے حکومت سازی کے لیے مدعو کیا، چونکہ بھارتیہ جنتا پارٹی اور اس کے حلیفوں نے سب سے زیادہ سیٹیں جیتیں ہیں۔ صدر جمہوریہ کا یہ فیصلہ پوری طرح سے جمہوریت کی شرائط پر منحصر ہے۔ حقیقت میں یہ انہیں اور بھی تقویت پہنچائے گا۔ میں نے اس ذمہ داری کو پوری انکساری سے قبول کیا۔ یہ 1996 کے انتخابات کے نتائج کا خلاصہ ہے۔ میں ناامید ہوں اور مجھے یقین ہے کہ آپ میں بیشتر لوگوں کی بھی یہی حالت ہے کہ اس فیصلے کا کچھ گروپوں کے ذریعہ غیر منطقی طور سے تنقید کی جارہی ہے۔ وہ پارٹیاں جن

میں کئی مرتبہ علیحدگی ہوئی، ایک ساتھ مل کر اور ایکشن گروپ بنانے کے باوجود بی جے پی سے زیادہ سیٹیں جیتنے میں ناکام رہیں۔ اب وہ بغیر کسی ہچکچاہٹ سے ان پارٹیوں کے ساتھ بھی ہاتھ ملانے کو تیار ہیں جن کی انتخابات میں انہوں نے پوری طرح سے مخالفت کی تھی۔ اسے صرف بغیر اصولوں اور تحریک کی سیاست کہا جاسکتا ہے، جس کا صرف ایک ہی ہدف ہے کہ کسی بھی طریقے سے اقتدار میں آنا۔

گزشتہ ایک ہفتہ میں ہم نے ان سے ایک لفظ بھی نہیں سنا ہے کہ وہ آپ کے لیے اور ملک کے لیے کیا کریں گے۔ ان کا صرف ایک ایجنڈا ہے۔ کسی بھی قیمت پر بی جے پی کو اقتدار میں آنے سے روکنا۔ اسے حاصل کرنے کے لیے ایک مقررہ مہم شروع کی گئی ہے تاکہ ہمیں برا ثابت کیا جاسکے۔ 'فرقہ وارانہ' یا 'سیکولرازم' پر بحث میں شامل ہونے کے بجائے ایشوز کو غیر واضح کیا جارہا ہے تاکہ ایک ایماندار اور معنی خیز بحث سے بچا جاسکے۔ اس کا ایک ہی مقصد ہے لوگوں کے ذریعہ دیئے گئے فیصلے کو شکست دینا۔''

اٹل جی کے قوم کے نام خطاب نے عام لوگوں میں بہت زیادہ مثبت ردعمل پیدا کیا۔ 'انڈین ایکسپریس' نے اپنے اداریہ میں لکھا۔ 'اگر سیاست میں کامیابی کا پیمانہ خالصتاً وجود بچانا ہے تو یہ ممکن ہے کہ اٹل بہاری واجپئی کی بی جے پی حکومت کو لوک سبھا میں اعتماد کا ووٹ حاصل نہیں ہو۔ اگر مقبولیت کی کسوٹی پر تولا جائے تو نئے وزیراعظم اپنے حریفوں سے کافی آگے نکل چکے ہیں۔ واجپئی نے کامیابی کے ساتھ لوگوں کے درمیان بی جے پی کے اچھوت ہونے کی حالت کو ختم کیا ہے، چاہے وہ سیاسی طبقات میں ایسا کر پانے میں کامیاب نہ ہو پائے ہوں۔ ایک کھلے ہوئے سمجھوتہ کرنے والا اور فیڈرلسٹ ایجنڈے میں وزیراعظم نے بی جے پی مخالف طاقتوں کے لیے اعلیٰ اخلاق کے دعویٰ کو ثابت کر پانا انتہائی دشوار کردیا ہے۔ اب بھی عوام میں قابل قبول شبیہ کا پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے ثابت کردیا ہے کہ ان کے پاس ویژن ہے جبکہ مخالفین کے پاس صرف ٹارگیٹ ہے۔ اگر وہ لڑائی میں ہار بھی جاتے ہیں تو وہ آگے جنگ میں شاید جیتیں گے۔'

کانگریس، راشٹریہ مورچہ اور بائیں مورچہ کی پارٹیوں کے ساتھ مل کر ایک بی جے پی مخالف اتحاد بنانے کی کوشش پر کافی تیز ردعمل سامنے آیا۔ 'ہندوستان ٹائمس' کے ایڈیٹر وی این نارائن نے 'رسپیکٹ دی ووٹر' نامی اداریہ میں لکھا۔ 'اگر اچھوت قانون ابھی بھی ملک میں نافذ ہے تو سیاسی پارٹی کے اس طبقہ کے لیڈروں پر جو حکومت بنانا چاہتے ہیں، اس کے تحت چارج شیٹ لگانی چاہیے۔'

اٹل جی حکومت صرف 13 دن رہی کیونکہ بی جے پی لوک سبھا میں اپنی اکثریت ثابت نہیں کرسکی اور انہیں استعفیٰ دینا پڑے گا، یہ صاف تھا۔ پھر بھی انہوں نے اعتماد پر بحث کا استعمال کانگریس، راشٹریہ مورچہ اور بائیں بازو مورچہ کی پارٹیوں کے ذریعہ بی جے پی کو الگ تھلگ کرنے کے ہوئے کو دور کرنے میں کیا۔ ان کے ذریعہ اس موقع پر کی گئی تقریر ان کی پوری پارلیمانی زندگی میں سے سب سے شاندار تقریر تھی۔ چونکہ پہلی بار دوردرشن کے ذریعہ اس بحث کا لائیو ٹیلی کاسٹ کیا جارہا تھا، پورا ملک اپنے ٹیلی ویژن سیٹوں کے سامنے بیٹھا تھا۔ جن لوگوں نے یہ بحث دیکھی ان کا فیصلہ واضح تھا، شکست کھانے والے ہی اصلی فاتح تھے۔ راشٹرپتی بھون جاکر اپنا استعفیٰ سونپنے کے اعلان کرنے سے قبل اٹل جی نے چیلنج کرتے ہوئے دعویٰ کیا کہ 'ہم واپس آئیں گے۔' 'ہم جانتے ہیں کہ ہم کیسے چکرویو★ میں پھنسے، لیکن ہم جانتے ہیں کہ اس سے باہر کیسے نکل سکتے ہیں۔'

ان کے الفاظ یقینی طور سے مستقبل کے لئے مشعل راہ بن گئے۔ 'انڈین ایکسپریس' کے اداریہ میں عنوان 'اسٹیلنگ دی شو' میں شائع مضمون

★ چکرویو ایک پہیئے کی شکل کی جنگی اسٹرکچر ہے جو بتاتی ہے کہ جس میں ایک شخص یا تنظیم خود کو اکیلا پاتی ہے اور اس حالت سے باہر آنے کا اسے بہت کم موقع ملتا تھا۔ اس کا ذکر مہا بھارت میں ملتا ہے۔ لڑائی کے تیرہویں دن کوروؤں نے پانڈوؤں کو اس اسٹرکچر کو توڑنے کا چیلنج کیا۔ صرف ارجن اور کرشن اسے توڑنا جانتے تھے لیکن کوروافواج کے سپہ سالار درونا چاریہ نے چالاکی سے ان کا دھیان لڑائی کے دوسرے حصہ میں لگا دیا۔ جب پانڈوؤں کی............(جاری)

میں لوگوں کی سوچ واضح کی، 'اگر ٹیلی ویژن پر دوروزہ کے ووٹ اعتماد پر بحث کا لائیو ٹیلی کاسٹ ہوا جس میں ہر ہندوستانی نے حصہ لیا تو اس کا سہرا اٹل بہاری واجپئی کو جاتا ہے۔ یہ کہنا کہ بی جے پی سینئر لیڈر نے پورا اسٹیج لوٹ لیا، ان کی اہمیت کو کم کرنا ہوگا۔ انہوں نے اپنی تقریری صلاحیت کا شاندار ڈھنگ سے استعمال کرتے ہوئے بی جے پی کی سب سے کم مدت کی حکومت کے سربراہ کے پرشکوک وقار کو کامیابی کے ساتھ ایک سیاسی کامیابی میں تبدیل کر دیا۔ چونکہ انہوں نے اپنے استعفیٰ کا ڈرامائی اعلان کے ساتھ بحث کا اختتام کیا، اس سے نہ صرف انہوں نے سیاسی شہید کا درجہ حاصل کیا بلکہ انہوں نے اپنے لیے لوگوں کے ہیرو کی شکل بھی حاصل کر لی۔'

یہاں میں ذکر کرنا چاہوں گا کہ بی جے پی کے اندر بھی کچھ بحث ہوئی تھی کہ اٹل جی کو صدر کے ذریعہ سرکار بنانے کے لیے دی گئی دعوت کو قبول کرنا چاہیے یا نہیں کیونکہ بی جے پی کے پاس انتخابات سے قبل حلیفوں (اکالی دل اور شیوسینا) کو ملا کر صرف 181 سیٹیں تھیں۔ کچھ ساتھیوں کا خیال تھا کہ بی جے پی کو یہ موقع چھوڑ دینا چاہیے اور اس کی جگہ پر آئندہ انتخابات میں بڑی طاقت کی شکل میں ابھرنے کی شکل میں کوشش کرنی چاہیے۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ اٹل جی کو اپنے خطاب میں ان تین اہم ایشوز کا ذکر کرنا نہیں بھولنا چاہیے تھا جو کہ بی جے پی نے 1996 کے انتخابی منشور میں کیا تھا — اجودھیا میں رام مندر کی تعمیر، جموں وکشمیر سے متعلق آئین کی دفعہ 370 کا خاتمہ اور یکساں سول کوڈ کو نافذ کرنا۔ میں نے اس خیال کی حمایت نہیں کی۔ میرا ماننا تھا کہ اٹل جی کے ذریعہ صرف ہندوستان کے وزیراعظم کے طور پر حلف لینے سے لوگوں کے درمیان بی جے پی کی مقبولیت اور وقار میں زیادہ اضافہ ہوگا اور ویسا ہی ہوا۔

میں اٹل جی کی 13 دن کی حکومت کی وزارت کا ممبر نہیں تھا کیونکہ میں نے 1996 کا لوک سبھا انتخاب نہیں لڑا تھا۔ یہ میرے ذریعہ خود پر لگائی گئی پابندی تھی کہ جب تک مجھے حوالہ کیس کے جھوٹے الزامات سے بری نہیں کر دیا جاتا میں پارلیمنٹ میں داخل نہیں ہوں گا۔ میں یہاں بے حد اطمینان اور خوشی کے ساتھ ذکر کروں گا کہ اٹل جی نے دو اسمبلی حلقوں — لکھنؤ جو ان کا روایتی انتخابی حلقہ تھا اور گاندھی نگر جو میرا انتخابی حلقہ تھا — سے انتخاب لڑنے کا فیصلہ کر کے ایکتا کا مظاہرہ کیا۔ وہ دونوں حلقوں سے کامیاب ہوئے۔ بعد میں انہوں نے گاندھی نگر حلقہ سے استعفیٰ دے دیا اور اپنی رکنیت لکھنؤ سے برقرار رکھی۔ ایک دوسرے برادرانہ جذبے کا مظاہرہ انہوں نے تب کیا جب وہ وزیراعظم کے طور پر حلف لینے کے باوجود پارٹی سے متعلق سبھی میٹنگوں میں شرکت کرنے کے لیے میرے پنڈارا پارک واقع رہائش گاہ پر آنے کے لیے زور دیتے تھے کیونکہ میں اس وقت بی جے پی کا صدر تھا۔

دیوگوڑا وزیراعظم بنے

اٹل جی کی حکومت کے گرنے کا اندازہ لگاتے ہوئے کانگریس نے ایک نیا اتحاد متحدہ مورچہ کی حمایت کرنے کا فیصلہ کیا جو دوبارہ جنتادل کی قیادت میں راشٹریہ مورچہ کا نیا باب تھا۔ اس سرکار کی مضحکہ خیز حالت اس وقت نظر آئی جب اس نے اپنے قیام سے قبل جس طریقے

(گزشتہ کا بقیہ) فوج نے اس چیلنج کو قبول کرنے میں اپنی لاچاری کا مظاہرہ کیا تب ارجن کے بیٹے ابھیمنیو نے انتہائی کامیابی کے ساتھ اس چیلنج کا سامنا کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ اس نے انتہائی بہادری کے ساتھ کوروں کا سامنا کیا اور درونا چاریہ کو غرق حیرت کر دیا۔ ابھیمنیو کے چکرویو سے نکلنے کی کوشش کوروؤں نے ناکام کر دی، انہوں نے لڑائی کے قوانین کو توڑ کر اس کا قتل کر دیا۔ ارجن نے اپنے بیٹے کے قتل کا بدلہ اگلے دن کرشن کی مدد سے کوروں کو شکست دے کر لے لیا۔

سے وزیراعظم کا انتخاب کیا۔ جنتادل کے قومی لیڈروں یا مشترکہ مورچہ کے ساتھیوں کے درمیان کسی نام پر عام اتفاق رائے نہیں تھا۔ ایسا اس لیے تھا کیونکہ ان کا مشن تھا کہ ہر قیمت پر بی جے پی کو اقتدار میں آنے سے روکنا ہی نہیں تھا بلکہ دوسرے شخص کو بھی وزیراعظم بننے سے روکنا تھا۔ وزیراعظم کی کرسی حاصل کرنے کے لیے وہ انتہائی چالاکی کے ساتھ چالیں چل رہی تھی۔ وی پی سنگھ نے اس سے خود کو الگ کرلیا۔ یہ پسند سے زیادہ ان کی مجبوری تھی کیونکہ کانگریس ان کی قیادت میں سرکار کی حمایت نہیں کرتی۔ سب واضح تھا کہ انہوں نے بوفورس مسئلے پر راجیو گاندھی کے خلاف بغاوت کی تھی۔

اس وجہ سے نئے مورچہ کے لیڈر مارکس وادی کیمونسٹ پارٹی کے لیڈر مغربی بنگال کے وزیراعلیٰ جیوتی بسو کے پاس گئے۔ وہ خواہش مند تھے، لیکن ان کی پارٹی کی مرکزی پولت بیورو نے قرارداد کو ویٹو کردیا۔ یہ وہ فیصلہ تھا جسے بعد میں بسو نے اس کا ذکر 'تاریخی غلطی' کے طور پر کیا اور انہوں نے مارکس وادی پارٹی کے فیصلے کے معیار پر غور نہ کرتے ہوئے میں یہاں یہ قبول کروں گا کہ میں اس سے دو اسباب سے متاثر تھا- پہلا پارٹی نے اپنے اصولوں پر قائم رہنے کا حوصلہ دکھایا، جبکہ انہیں وزیراعظم کا عہدہ پلیٹ میں سجا کر پیش کیا گیا تھا، دوسرے اس کے اعلیٰ اختیاراتی کمیٹی کے اندرونی طریق کار کے ڈسپلن نے مجھے متاثر کیا۔

ممکنہ ناموں کا انتخاب کرتے کرتے بالآخر مشترکہ مورچہ کے لیڈروں نے کرناٹک کے وزیراعلیٰ ایچ ڈی دیوگوڑا کا انتخاب کیا، جنھوں نے تب تک قومی سیاست میں کوئی کردار ادا نہیں کیا تھا۔ اس طرح یکم جون کو انہوں نے ہندوستان کے 11 ویں وزیراعظم کے طور پر حلف لیا۔ تقریباً اسی وقت ملک میں ایک اور ڈرامہ دیکھا گیا۔ پی وی نرسمہا راؤ کو کانگریس پارٹی کے صدر کے عہدے سے ہٹا دیا گیا۔ ان پر 1996 کے پارلیمانی انتخابات میں شکست کا ویلن ہونے کا الزام لگایا گیا۔ ان کی جگہ سیتارام کیسری نے لی جو کئی سال سے پارٹی کے خزانچی تھے۔ میں اس بات پر کوئی تبصرہ نہیں کروں گا کہ کانگریس صدر کے عہدے کے لیے ان کا انتخاب کیوں کیا گیا۔ لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ کیسری کے ذریعہ فروری 1998 میں ایک غیر ذمہ دارانہ بیان نے مجھے اور میری پارٹی کو حیرت میں ڈال دیا تھا۔ اس وقت پارلیمانی انتخابات کی مہم کے دوران میں تمل ناڈو کے کوئمبٹور میں ایک ریلی سے خطاب کرنے گیا۔ میرے پہنچنے سے ٹھیک قبل انتخابی ریلی کی جگہ پر اور شہر میں متعدد مقامات پر سیریل بم دھماکے ہوئے، جس میں 58★ لوگ مارے گئے۔ دھماکہ کے بعد کیسری نے ایک نفرت انگیز بیان میں کہا کہ یہ بم دھماکے سنگھ کے ذریعہ کیے گئے ہیں اور ان کے پاس اس دہشت گردانہ کارروائی میں سنگھ کے ہاتھ ہونے کے ثبوت ہیں۔

کیسری کو ایک دوسری حاسدانہ سیاسی چال بازی کے لیے بھی یاد کیا جائے گا۔ اپریل 1997 میں انہوں نے اچانک دیوگوڑا حکومت سے کانگریس کی حمایت واپس لینے کا اعلان کردیا۔ اس کے لیے بتائے گئے وجوہات سے لوگ حیران رہ گئے، 'وزیراعظم کانگریس کو عزت واحترام اور اہمیت نہیں دے رہے ہیں، جبکہ ان کی حکومت کا وجود ہم سے ہے۔'

دیوگوڑا کی حکومت 13 مہینے کس طرح چلی اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب ان کے ہی ایک سینئر وزیر نے جو کہا وہ جدید ہندوستانی تاریخ کا ایک شاعرانہ تبصرہ بن گیا۔ بھارتیہ کیمونسٹ پارٹی کے لیڈر اندرجیت گپت، جو دیوگوڑا وزارت میں وزیرداخلہ تھے کے مطابق 'دیوگوڑا کو بدلنے کے لیے پوری طرح سے سیتارام کیسری ہی ذمہ دار نہیں تھے بلکہ مشترکہ مورچہ کے اندر بھی ان کو بدلنے کی خواہش تھی۔ دیوگوڑا کو ایک مطلق العنان وزیراعظم قرار دیا گیا۔ میرا مطلب ہے میں ان کا وزیرداخلہ تھا۔ انہوں نے مجھ سے بات کرنے سے انکار کردیا۔

★ میں نے اس واقعہ کا تفصیلی ذکر آگے پانچویں مرحلہ کے باب-1 میں کی ہے۔

انہوں نے کبھی مجھ سے صلاح و مشورہ نہیں لیا۔ میں ان باتوں کو سرِ عام نہیں کہہ سکتا تھا۔ میں اس وقت بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔ مجھے خاموش رہنا پڑا۔'

واضح طور سے مشترکہ مورچہ حکومت غیر منظم تھی۔ مرکزی وزارت میں بھی نا اتفاقی اور بد نظمی تھی۔ اچھی وزارت کو چلانے کا ایک بنیادی اصول اجتماعی جواب دہی ہوتی ہے جو اس حکومت میں ناپید تھی۔ اس کے لیے لوک سبھا اسپیکر پی اے سنگما نے خود حکومت کی تنقید کی۔ پی وی نرسمہا راؤ کی حکومت کے وزیر داخلہ ایس بی چوہان اور ان کے جونیئر راجیش پائلٹ میں بات چیت بند تھی۔ مشترکہ مورچہ حکومت اس سے بھی آگے نکل گئی۔ وزیر اعظم اور وزیر داخلہ گورنروں کی نامزدگی اور کشمیر و شمال مشرق میں دہشت گردی کے مسئلہ کا سامنا کرنے جیسے اہم ایشوز پر ایک دوسرے سے بات نہیں کرتے تھے۔ شاید برسر اقتدار اتحاد کی حالت کی سب سے بہترین تصویر کشی اس کے سینئر لیڈر بیجو پٹنائک نے کی۔ انہوں نے مشترکہ مورچہ کو 'ایک دوسرے پر جھپٹنے والی جھینگا مچھلی' کہا۔

اندر کمار گجرال وزیر اعظم بنے

21 اپریل 1997 کو دیوگوڑا کی جگہ اندر کمار گجرال نے لی جو ان کی وزارت میں وزیر خارجہ تھے۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے میں نے کہا کہ مشترکہ مورچہ حکومت کے ذریعہ کی گئی حیرت انگیز 'سر کی سرجری' ہے، جس میں برسر اقتدار اتحاد نے انکساری کے ساتھ کانگریس کو خود اپنی نکیل دے دی ہے۔ دیگر لوگوں نے اسے 'آپریشن گنیش' کہا جہاں حکومت کا جسم تو وہی رہا لیکن سر ایک دوسرے شخص کا لگا دیا گیا۔ لیکن اس آپریشن کو اتنی جلدی کرنے کی ضرورت کیا تھی؟ اس کا جواب گجرال کے وزیر اعظم بننے کے فوراً بعد لیے گئے ایک غلط فیصلے سے سمجھ میں آ گیا۔ انہوں نے جوگیندر سنگھ کو سی بی آئی کے ڈائریکٹر کے عہدے سے ہٹا دیا، کیونکہ وہ کانگریس پارٹی کے لیے بوفورس اسکینڈل کی تحقیق سے پریشانی کا سبب بن رہے تھے اور لالو پرساد یادو کے لیے چارہ گھوٹالہ★ میں تشویش کا باعث تھے۔

میں یہاں ذکر کرنا چاہوں گا کہ میں گجرال کو کئی سال سے جانتا ہوں اور میرے ان کے ساتھ اچھے تعلقات تھے، لیکن ان کی وزارت عظمیٰ سے میں بہت نا امید ہوا۔ نتیجتاً نئی دہلی میں جولائی 1997 میں بی جے پی کی قومی مجلس عاملہ میں میری صدارتی تقریر کافی واضح تھی۔ 'ابتدا میں مسٹر گجرال کے ساتھ ہمدردی رکھنے والوں اور ان کے اچھے تنقید نگاروں نے انہیں ان کی لاچاری اور پریشانی کی حالت کے لیے شبہ کا فائدہ دیا ہوگا لیکن جیسے جیسے دن گزرتے گئے اور وہ بغیر کسی مخالفت کے اپنی پارٹی کے ساتھیوں، مورچہ کے حلیفوں اور چال باز کانگریس کے ذریعہ ایک کے بعد ایک کی جارہی بے عزتی کا گھونٹ پیتے رہے، اس سے واضح ہو گیا کہ وزیر اعظم مجبور نہیں ہیں بلکہ اقتدار کی لالچ میں غرق ہیں۔'

ممکنہ طور سے کانگریس نے دوسری مشترکہ مورچہ حکومت کے پیروں سے قالین پہلی سرکار سے بھی جلدی کھینچ لی۔ اس بار بہانہ تھا کہ

★ راشٹریہ جنتا دل کے صدر لالو پرساد یادو اور حال میں ڈاکٹر منموہن سنگھ کی حکومت میں وزیر ریلوے کے خلاف بد عنوانی کے کئی الزامات عائد ہوئے۔ ان میں سے مشہور کروڑوں روپے کا 'چارا گھوٹالہ' تھا۔ جب وہ بہار کے وزیر اعلیٰ تھے جانوروں کے محکمہ کے ذریعہ جانوروں کے چارے کیلئے دی گئی رقم کا انہوں نے غلط استعمال کیا تھا۔ اس الزام میں چارج شیٹ ہونے کے بعد بھی انہوں نے استعفیٰ دینے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے اپنی سیاست کی طاقت کا استعمال وزیر اعظم اندر کمار گجرال کو سی بی آئی کو اپنے حق میں کرانے کیلئے کیا۔ بالآخر عدالتی اور سیاسی دباؤ میں مجبوراً 1997 میں انہوں نے اپنا عہدہ چھوڑا اور اپنی بیوی رابڑی دیوی کو وزیر اعلیٰ بنا دیا۔ پندرہ برسوں (1990-2005) کے دوران انہوں نے اور انکی اہلیہ نے بہار میں حکومت کی۔ اس دوران سماجی، معاشی ترقی کی رفتار تھم گئی اور کرپشن، جرائم اور ذات و برادری کا خوب بول بالا ہوا۔

راجیو گاندھی کے قتل میں جین کمیشن کی عبوری رپورٹ ۔ جسٹس ملاپ چند جین کمیشن کا قیام اگست 1991 میں حکومت کے ذریعہ قتل کے تین ماہ بعد کیا گیا، تاکہ جرم کے پیچھے چھپی سازش کی جانچ کی جا سکے۔ 28 اگست 1997 کو اس کے ذریعہ سونپی گئی 17 حصوں کی عبوری رپورٹ میں ڈی ایم کے پر الزام لگایا گیا تھا کہ اس نے ایل ٹی ٹی ای کو تامل ناڈو میں پناہ دینے کی اجازت دی جہاں وہ 1991 سے اقتدار میں تھی۔ عبوری رپورٹ کے کچھ حصے ایک پندرہ روزہ قومی میگزین میں مبینہ طور سے ایک سینئر کانگریسی نے لیک کردیا، جن کے کیسری کے ساتھ اچھے تعلقات نہیں تھے۔ چونکہ ڈی ایم کے مشترکہ مورچہ کا حلیف بھی تھا، کانگریس پارٹی نے گجرال سے ان کی حکومت کے تین ڈی ایم کے وزراء کو باہر کرنے کا مطالبہ کیا۔ جب مشترکہ مورچہ نے ان کا یہ مطالبہ ماننے سے انکار کردیا تب کانگریس نے 28 نومبر کو گجرال حکومت سے حمایت واپس لے لی۔ میں اس پر دوبارہ اندرجیت گپتا کے ذریعہ 'فرنٹ لائن' کو دیے گئے ایک انٹرویو کا ذکر کرنا چاہوں گا جس میں انہوں نے کہا' ڈی ایم کے کے بارے میں یہ خیال تھا کہ اس نے ایل ٹی ٹی ای کے ساتھ تعلقات قائم کیے۔ کانگریس کا کہنا ہے کہ ایل ٹی ٹی ای وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہمارے لیڈر کا قتل کیا، ہم اس سرکار کی حمایت کیسے کرسکتے ہیں جس میں یہ لوگ ہوں۔ یہ بہانہ بنایا گیا۔ لیکن انہوں نے عبوری رپورٹ کا مطالعہ ہی نہیں کیا۔ اس لیے ہم نے ڈی ایم کے باہر کرنے سے منع کردیا۔ آپ ایسے لوگوں پر (کانگریسیوں پر) کیسے بھروسہ کرسکتے ہیں؟'

راجیو گاندھی کے قتل کی تفتیش کے پیچھے کانگریس کی سیاست

میں نے ذکر کیا ہے، کانگریس پارٹی اکثر جنہیں باہر سے حمایت دیتی ہے ان حکومتوں کو کمزور کرنے کے لیے بہانے تلاش کرتی ہے۔ گجرال حکومت کو گرانے کے لیے اس نے جو ڈرامہ تیار کیا وہ نہ صرف پھوہڑ اور غیر ذمہ دارانہ تھا بلکہ بے ایمانی بھی تھی۔ اس مجبوری کا ملاحظہ فرمایئے، جس پارٹی نے 1997 میں گجرال حکومت سے یہ کہتے ہوئے حمایت واپس لے لی تھی کہ ڈی ایم کے کے وزراء کو برخاست کیا جائے انہیں ڈاکٹر منموہن سنگھ کے سرکار میں شامل کرنے میں کوئی پشیمانی نہیں ہے۔

فروری 2004 میں کانگریس صدر سونیا گاندھی نے ذاتی طور سے چنئی میں ڈی ایم کے کے ہیڈکوارٹر کا دورہ کیا اور آئندہ لوک سبھا کے لیے دونوں پارٹیوں کے درمیان اتحاد قائم کیا۔ جب صحافیوں نے گجرال سرکار میں ڈی ایم کے کے وزراء کی موجودگی کی وجہ سے حمایت واپس لینے کی بات یاد دلائی تو ان کا جواب تھا' عبوری رپورٹ میں کوئی منفی تبصرہ نہیں تھا۔ چونکہ آخری جین رپورٹ میں انہیں (کرونا ندھی کو) بے قصور ثابت کیا گیا تھا تو عبوری رپورٹ کا کیا وجود ہے؟'

یہ سچ ہے کہ جین کمیشن کی عبوری رپورٹ میں کسی تنظیم یا شخص جس میں ڈی ایم کے بھی شامل ہے، راجیو گاندھی کے قتل کی سازش میں ہاتھ ہونے کا نام نہیں لیا گیا تھا لیکن نہ تو سونیا گاندھی اور نہ ہی ان کے کسی دوسرے ساتھی نے آج تک گجرال حکومت سے صرف عبوری رپورٹ کی بنیاد پر حمایت واپس لینے کے فیصلے کا اطمینان بخش جواب دیا ہے۔

اس بارے میں کانگریس قیادت کو ہندوستان کے لوگوں کو کافی کچھ جواب دینا باقی ہے۔ اس کا تفصیل سے ذکر کرتے ہوئے میں تیزی سے آگے بڑھ کر اس وقت کا ذکر کرنا چاہوں گا جب میں این ڈی اے حکومت میں وزیر داخلہ تھا۔ میرے ابتدائی فیصلوں میں ایک یہ بھی تھا کہ جین کمیشن کی حتمی رپورٹ کو 31 جولائی 1998 کو پارلیمنٹ میں پیش کرنا جس کے ساتھ اس کی جانچ پر ایک ایکشن ٹیکن رپورٹ (اے ٹی آر) (کی گئی کارروائی کی رپورٹ) بھی تھی۔ اس موضوع پر لوک سبھا میں ہونے والی بحث کا جواب دیتے ہوئے میں نے کہا کہ سابق وزیر اعظم کا قتل

ایک قومی سانحہ تھا اور یقین دہانی کرائی کہ ہماری حکومت پوری سچائی جاننے کے لیے گہری تفتیش کے لیے پرعزم ہے جس میں اس بڑی سازش میں متعلقہ اندرونی اور بیرونی عناصر کی بھی جانچ کی جائے گی۔'

جب ایوان میں کانگریس کے نائب لیڈر پی شیوشنکر نے کہا کہ اے ٹی آر ان کی پارٹی کو قبول نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ فی الوقت ایک دوسرے عدالتی کمیشن کے قیام سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ میں نے مشورہ دیا کہ اس کی بجائے آئینی حقوق والا ایک ورکنگ ادارہ قائم کیا جائے جو جین کمیشن کی رپورٹ پر آگے کی کارروائی دیکھیں۔ اس مشورے کو کانگریس پارٹی نے قبول کیا اور اس کے مطابق ہماری پارٹی نے سی بی آئی کے تحت ایک ملٹی ڈسپلینری مانیٹرنگ ایجنسی کا قیام کیا تا کہ اس معاملے کے ملزمان پر جس میں بھگوڑے بھی شامل ہیں مقدمہ چلایا جاسکے۔

مجھے جس بات سے حیرانی ہوئی وہ یہ تھی کہ سابق وزیراعظم نرسمہاراؤ کی تنقید کرتے ہوئے پی شیوشنکر نے کہا کہ 1991 کے بعد مرکزی حکومت نہیں چاہتی تھی کہ جین کمیشن حقائق کی تلاش کرے۔ انہوں نے الزام لگایا کہ کانگریس کے اندر اور باہر کچھ طاقتیں راجیو گاندھی کے خلاف تھیں اور جس دن سے وہ وزیراعظم بنے وہ ان سے بدلہ لینا چاہتی تھیں۔ انہوں نے زور دیا کہ کچھ نوکر شاہوں، سیاستدانوں، تانترک چندرا سوامی کے سینٹرل انٹیلیجنس ایجنسی اور اسرائیل کی قومی خفیہ ایجنسی موساد کے ساتھ مبینہ تعلقات اور کچھ لوگوں کے ذریعہ جین کمیشن کو ختم کرانے کے لیے کی گئی کوششوں کی جانچ ہونی چاہیے۔

تب 19 اگست 1998 کو کانگریس لیڈروں کا ایک وفد جس میں ڈاکٹر منموہن سنگھ، ارجن سنگھ، پرنب مکھر جی، منی شنکر ایر، سریش پچوری اور دیگر لیڈران شامل تھے۔ نارتھ بلاک میں واقع میرے آفس میں آکر مجھ سے ملاقات کی۔ انہوں نے کہا کہ وہ جین کمیشن کی رپورٹ پر اے ٹی آر سے خوش نہیں ہیں۔ خاص طور سے ڈاکٹر کرونا ندھی اور دیگر افراد کی رول کے تفتیش سے جنہیں کمیشن نے الزامات سے آزاد کر دیا ہے۔ انہوں نے مجھے سات صفحات کا خط سونپا جس میں کئی ایشوز پر تشویش کا اظہار کیا گیا تھا اور زوردار مطالبہ کیا گیا تھا-' کانگریس زور دیتی ہے کہ ایجنسی کو سرکار کے ذریعہ احکامات دیئے جائیں کہ وہ مسٹر ایم کرونا ندھی سے جڑے سبھی معاملوں کی تحقیق کرے جیسا کہ کمیشن کے ذریعہ ذکر کیا گیا ہے اور ان کے خلاف عدالت میں کارروائی کرے، اگر تفتیش میں حاصل ثبوت ایسے ہیں تو اس کا مطالبہ کریں۔' یقینی طور سے وفد نے سونیا گاندھی کی اجازت کے بغیر اس طرح کا مطالبہ نہیں کیا ہوگا جس طرح سے ڈی ایم کے کے مسئلہ پر گجرال سرکار کی حمایت واپسی کا فیصلہ ان کی منظوری کے بغیر نہیں لیا ہوگا۔

میں نے یہ پایا کہ تب تک کانگریس نے پارلیمنٹ میں بحث کے دوران بھی کسی سیاسی لیڈر کا نام لینے سے خود کو روکے رکھا تھا۔ وہ الفاظ میں ذکر نہیں کیا جاسکتا تھا۔ انہوں نے ایم ڈی ایم اے (ملٹی ڈسپلینری مانیٹرنگ ایجنسی) کے ذریعہ اس معاملے کی تفصیلی جانچ کا مطالبہ کر کے نرسمہاراؤ حکومت پر نشانہ لگایا، ایم ڈی ایم اے کے ذریعہ تفتیش میں وہ یہ جاننا چاہتے تھے کہ جین کمیشن کے کام میں انتہائی غلط طریقے سے رکاوٹ پیش کی گئی تھی۔

اعلیٰ سطحی کانگریس وفد کے ذریعہ مجھے دیئے گئے خط کا سب سے سازشی پہلو یہ تھا کہ خط اس وقت لکھا گیا جب جین کمیشن اپنی آخری رپورٹ حکومت کو سونپ چکا تھا۔ دوسرے الفاظ میں کانگریس قیادت لگاتار راجیو گاندھی قتل کی سازش میں ڈی ایم کے کے ہاتھ ہونے کا شبہ کر رہی تھی، جبکہ جین کمیشن کی حتمی رپورٹ میں ڈاکٹر کرونا ندھی اور ان کی پارٹی کو بے قصور ثابت کیا گیا تھا، اس لیے یہ فروری 2004 میں سونیا گاندھی کے ذریعہ چنئی میں میڈیا کے سامنے کانگریس-ڈی ایم کے اتحاد کا دفاع کرتے ہوئے یہ کہا گیا کہ 'چونکہ حتمی رپورٹ میں کرونا ندھی کو بے قصور کہا

گیا ہے تو عبوری رپورٹ کا کیا مطلب ہے؟' یہ کافی ڈپلومیٹک تھا۔

میرے دوست ایس گرومورتی - ہندوستان میں سماجی اور سیاسی ترقی کے سب سے زیادہ تلخ تبصرہ نگار ہیں، نے اس ایشو پر سونیا گاندھی کے طریقہ کار کی سخت تنقید کی۔ 'انہوں نے اسے (کروناندھی) ہی بے قصور قرار دیا لیکن خود پر جھوٹا الزام لگایا۔' انہوں نے 'نیو انڈین ایکسپریس' (8 مئی 2004) میں اپنے آرٹیکل میں لکھا 'سونیا نے راجیو گاندھی کے قتل کے ایشو کو دفنا کر (کانگریس - ڈی ایم کے) اتحاد بنایا۔'

کس طرح سے جین کمیشن کا استعمال کانگریس پارٹی کے مخالف دھڑوں کے ذریعہ ایک دوسرے پر چوری چھپے الزامات لگانے کا ایک دوسرا اشارہ اس وقت حاصل ہوا جب نرسمہاراؤ حکومت کے وزیر داخلہ ایس بی چوہان نے 11 دسمبر 1997 کو کمیشن کے سامنے اپنا بیان درج کرایا۔ 'ہمارے دماغ میں سب سے پہلے یہ تھا - گاندھی کنبہ کے نام کو بچانا۔ یہ ظاہر ہے کہ اندرا گاندھی اور راجیو گاندھی کی حکومتیں اسی کی دہائی میں ایل ٹی ٹی ای کو مدد اور ٹریننگ کی سہولیات مہیا کراتی تھیں۔'

راجیو گاندھی قتل کو 16 سال ہو چکے ہیں۔ جین کمیشن نے حتمی رپورٹ 9 سال پہلے سونپ دی۔ ایم ڈی ایم اے، جس کا قیام قتل کے پیچھے سازش اور اندرونی و بیرونی زاویوں کی جانچ کے لئے کی گئی تھی وہ بھی 9 سال پہلے وجود میں آیا ہے۔ اس کے کام سے اب تک کوئی خاص نتیجہ نہیں نکلا ہے۔ یہاں پر میں ملک کے سیاسی طبقہ اور دانشوروں کے سامنے دو سوال رکھنا چاہوں گا۔ پہلا سری لنکا میں حملوں سے لڑنے کے لیے امن فوج بھیجنے کی خطرناک پالیسی کے لیے کون ذمہ دار تھے، ایسی پالیسی جس کی وجہ سے سیکڑوں ہندوستانی فوجیوں کو جانیں گنوانی پڑی اور اس کے علاوہ غیر ملکی زمین پر ایک دہشت گرد تنظیم کی وجہ سے راجیو گاندھی قتل کر دیئے گئے؟ دوسرے راجیو گاندھی قتل کے پیچھے کی پوری سچائی کو سامنے لانا نہ صرف کانگریس کے لیے بلکہ پورے ملک کے لیے اہم موضوع ہے۔ لیکن کیا کانگریس قیادت نے اس معاملے کی تفتیش کے سلسلے میں سیاسی اخلاق کے بجائے سیاسی طالع آزمائی کو نہیں اپنایا؟ ان سوالوں پر کانگریس پارٹی کے اندر اور باہر سنجیدہ بحث ہونی چاہیے۔

11

سورن جینتی رتھ یاترا

قوم پرستی کی تیرتھ یاترا

میرے خوابوں کا ہندوستان

لارڈمیکالے نے ایک بار سنکی پن میں یہ کہا تھا کہ مڈل سیکس کی ایک ایکڑبھومی آئیڈیل سیاست (یوٹوپیا) کے کسی ریاست سے زیادہ اچھی ہے۔ سخت گیر سیاستداں ان کے اس جملے سے متفق ہوسکتے ہیں اور خواب دیکھنے والوں کا مذاق اڑاسکتے ہیں لیکن آزاد ہندوستان کو اس بات کا بہت زیادہ احساس ہے کہ سوامی وویکا نند، شری اروند، گرودیو ٹیگور اور مہاتماگاندھی جیسے لوگوں کے خوابوں سے ہی آزادی کی لڑائی میں قوم کو تحریک ملی اور بالآخر اس میں انہیں کی مدد سے کامیابی حاصل کی۔

ان عظیم رشیوں اور اپنے قابل تقلید طریقے سے اپنے خوابوں کے ہندوستان کا ایک عظیم اور قابل افتخار ہندوستان کا – جسے تمام عالم میں احترام حاصل ہوا ذکر کیا۔ میری یہ سوچ ہے کہ ہندوستان کے آئین سازوں نے ان کے ان خوابوں کو آئین کے مقدمہ میں پیش کیا جو اس دن کا انتظار کرتے ہیں جب سبھی ہندوستانی شہریوں کو حاصل ہو–

سماجی، معاشی اور سیاسی انصاف

نظریۂ اظہار کی آزادی، اعتماد ویقین، مذہب اور عبادت کی آزادی، وقار اور مواقع میں یکسانیت

اور ان سب میں فرد کی عزت اور ملک کی سالمیت کو یقینی بنانے والی

بھائی چارگی کو فروغ دینے کی ضرورت۔

ایک سیاسی سرگرم وفعال کارکن کے طور پر میں مستقبل کے ہندوستان کے اس ماورائی، اگرچہ خواب سے اپنے آپ کو مکمل احساس دلاتا ہوں۔ میں اسے حاصل کرنے کی تمنا کرتا ہوں۔

(دی السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا کے جنگ آزادی کا خصوصی شمارہ
1987 میں شائع میرے مضمون کا ایک حصہ)

میں نے 'دی السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا' میں جب اسے لکھا، اس کے 10 سال پہلے 1997 میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا، جس نے مجھے اپنے نظریئے کو ایک خاص سیاسی مہم کے ذریعے سے پیش کرنے کا موقع فراہم کیا۔ یہ ہندوستان کی آزادی کی گولڈن جوبلی تھی جس نے پورے ملک میں حب الوطنی کے جذبات کو بیدار کر دیا تھا۔

فروری میں میں نے اپنی پارٹی آفس میں اپنے ساتھیوں کی ایک میٹنگ منعقد کی کہ بی جے پی 1997 کو یادگار موقع کے طور پر کس طرح منائے گی۔ کئی مشوروں پر غور وخوض کرنے کے بعد ہم نے تحریک آزادی کے سبھی ہیرو اور شہیدوں کو ملک بھر میں ان سے متعلق مقامات پر جا کر خراج عقیدت پیش کرنے کا فیصلہ لیا۔ میرے نوجوان افسران کی ٹیم اور دوسرے ساتھیوں نے جلد ہی اس سوچ کو ایک ملک گیر سڑک یاترا۔ 'سورن جینتی رتھ یاترا: حب الوطنی کی تیرتھ یاترا' کے انعقاد کو مستحکم منصوبے میں تبدیل کر دیا اور تحریک آزادی کے ہیرو کی جدوجہد اور قربانی سے جڑے مقامات کا یاترا کرنا تیرتھ یاترا کے مساوی تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ یہ یاترا میری اپنی اور پارٹی کی قوم پرست وآدرش وادی جڑوں کو مزید گہرا کریں گی۔

تین اسباب پریشانی پیدا کرنے والے تھے- وقت، موسم اور یاترا کیے جانے والے مقامات کی تعداد۔ یہ یاترا 15 اگست سے قبل شروع کرنی تھی لیکن اسکول اور کالجوں کے امتحانات مکمل ہونے کے بعد اس یاترا کو بارش کے شروع ہونے سے قبل ختم کرنا تھا جو جنوب میں شمال کی بہ نسبت جلدی آجاتی ہے۔ چونکہ یاترا میں سبھی ریاستوں کو شامل کیا جانا تھا اس لیے یاترا میں دو مہینے سے کم کا وقت نہیں لگنے والا تھا۔ دوسرے الفاظ میں مجھے ہندوستان کی زبردست گرمی میں سڑک کے راستے یہ یاترا کرنی تھی- اور اس وقت سڑکوں کی حالت آج کے بہ نسبت کافی خراب تھی۔ یہ میرے ساتھیوں کے لیے تشویش کا باعث تھا جنھیں میری اتنی پریشانی برداشت کرنے کی صلاحیت کے سلسلہ میں شبہ تھا۔ چونکہ میں جلد ہی 70 سال کا ہونے والا تھا۔ پھر بھی میں یاترا پر آگے بڑھنے کے تئیں پرعزم تھا۔

یاترا کا مقصد

کچھ وجوہات تھے جن کی وجہ سے میں نے اس مہم پر آگے بڑھنے پر اپنی رضامندی دی۔ پہلی وجہ ذاتی تھی- ہندوستان کی آزادی کی گولڈن جوبلی میرے لیے بہت زیادہ جذباتی تھی، حالانکہ یہ جتنا فیسٹول کا وقت تھا اتنا ہی خود احتسابی کا بھی۔ اس لیے یہ ضروری تھا کہ آزاد ہندوستان کے پہلے 50 برسوں کی کامیابیوں، ناکامیابیوں اور خامیوں پر دھیان دیا جائے اور ساتھ ہی ساتھ ہندوستان کی ترقی کی سمت پر ایک سنجیدہ بحث کو بھی تحریک دی جائے۔

دوسری وجہ سیاسی تھی۔ میں بی جے پی کو ایک ایسی پارٹی کی شکل میں پیش کرنا چاہتا تھا جو بہتر حکومت کے لیے پرعزم تھی۔ اگرچہ ہندوستان نے آزادی 1947 میں حاصل کرلی تھی لیکن 50 برسوں بعد بھی یہ حقیقی آزادی میں تبدیل نہیں ہوسکی۔ نتیجتاً لوگوں نے یہ ماننا شروع کر دیا تھا کہ سبھی سیاستداں غیر اصولی، منفی کردار کے مالک، لالچی اور اقتدار کے بھوکے ہیں، اس لیے یہ بی جے پی کے لیے ضروری تھا کہ وہ سیاست میں اعلیٰ آدرشوں کے تئیں خود کو ثابت کرے، جس کا آدرش فوری اقتدار پانے کے ہدف کی جگہ پر خود کو ہندوستان سے بھوک، خوف اور کرپشن سے آزاد کرانے کے کام میں لگانا تھا۔

دیوگوڑا حکومت کی طرح گجرال حکومت نے بھی کم عمری کے واضح اشارے دیئے تھے۔ ایک دوسرے وسط مدتی پارلیمانی انتخابات کا

امکان بڑھ گیا تھا اور کانگریس پارٹی جس نے اقتدار کھو دیا تھا، کو بدنظمی پھیلانے کا قصوروار قرار دیا جا رہا تھا۔ دوسری جانب ان حقائق سے لوگوں میں زبردست ناامیدی تھی کہ 1996 میں پارلیمانی انتخابات میں سب سے بڑی پارٹی کے طور پر ابھری اس کے باوجود واجپئی سرکار 13 دن سے زیادہ نہیں چل سکی۔ وہ استحکام اور اچھے انتظامیہ کی خواہش رکھتے تھے۔ اس طرح حالات تیزی سے بی جے پی کی حق میں بن رہے تھے۔ مجھے محسوس ہوا کہ اس وقت ملک گیر یاترا سے میرے دونوں مقاصد پورے ہو جائیں گے۔

میری پارٹی کے نوجوان ساتھیوں- پرمود مہاجن، ایم وینکیا نائیڈو، سشما سوراج، کے این گووند اچاریہ، نریندر مودی اور اوما بھارتی- نے یاترا کی تیاریاں شروع کر دیں۔ یاترا 18 مئی سے 15 جولائی تک 59 دنوں میں 4 مرحلوں میں 15 ہزار کلومیٹر کی مسافت طے کرتے ہوئے 21 ریاستوں اور مرکز کے زیر انتظام ریاستوں سے گزرنا تھی۔ یہ آزادی کے بعد کسی بھی سیاسی پارٹی کے ذریعہ کی جانے والی سب سے بڑی عوامی مہم تھی۔ (7 شمالی مشرقی ریاستوں میں جہاں دیگر مقامات سے بہت پہلے ہی بارش شروع ہو جاتی ہے، یوم آزادی کے بعد الگ سے یاترا کرنے کا پروگرام بنایا گیا) میں نے 750 جلسوں سے خطاب کیا۔ اس کے علاوہ میں نے کئی ہزار تقریبات کو خطاب کیا جو گاؤں اور قصبوں میں منعقد کی گئی تھیں۔ بعد میں میرے ساتھیوں نے یہ اندازہ لگایا کہ اس یاترا سے ہم نے ممبئی میں اس کے شروع ہونے سے دہلی میں اختتام تک 2 کروڑ ہندوستانیوں سے رابطہ قائم کیا۔

مجھے یہ دوسری یاترا کرنے کے لیے کئی لوگوں نے دھمکی دی، چونکہ 1990 میں سومناتھ سے ایودھیا کی میری یاترا سے اس کا موازنہ ضرور کیا گیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ رام جنم بھومی کے ایشو کے برعکس جو مذہبی ہونے کے باوجود لوگوں کے جذبات سے جڑا ہوا تھا، گولڈن جوبلی فیسٹول میں لوگوں کا آنا مشکل ہوگا۔ لیکن حقیقت میں گولڈن جوبلی رتھ یاترا کے تئیں لوگوں میں بہت زیادہ مثبت جوش و خروش پایا گیا تھا جس سے مجھے کافی اطمینان ہوا۔ ساتھ ہی اس نے مجھے ہندوستان کی آزادی کی تحریک کی تاریخ کے بارے میں بہت کچھ جاننے میں مدد کی، جو ملک کے کئی حصوں میں 1857 کی پہلی جنگ آزادی سے بھی پہلے شروع ہو گئی تھی۔ اس ملک گیر یاترا کی وجہ سے ہی میں اتنی بڑی تعداد میں کم مقبول ہیرو اور شہیدوں کے نام جان پایا۔ جن کے نام کا ذکر ہر ریاست میں مقامی لوک کہانیوں میں ملتا ہے اور جن کا ذکر آنے والی نسل کے نوجوانوں اور بزرگوں کو تحریک دیتی رہے گی۔

لیکن گولڈن جوبلی رتھ یاترا صرف ہندوستان کے ماضی کا موضوع نہیں تھا یہ یکساں طور سے ہندوستان کا حال، ماضی اور مستقبل بھی تھا۔ اس مہم سے مجھے مختلف ایشوز—بدعنوانی، جرائم، ذات پات، فرقہ واریت، دہشت گردی، غریبی، عورتوں کو مضبوط کرنے، تعلیم، ماحولیات اور کام کے طریقہ کار و معاشی ترقی—جو ملک کے اصولوں پر بنائے گئے ہیں جس میں زراعت اور روزگار پر مرتکز ہو—کے سلسلے میں بات چیت کرنے کا موقع ملا۔ ان سب سے اوپر اس نے میرے یقین و اعتماد کو اور بھی مستحکم کر دیا جو پہلی بار اجودھیا آندولن میں بنا تھا کہ ہمارے جیسے بڑے ملک میں لوگوں تک پہنچنے کا سب سے اچھا طریقہ یاترا ہے اور اپنی پارٹی کے کارکنوں اور حامیوں میں جوش پیدا کرنے کا اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں ہے۔ پیش ہے میری اس یاترا کی تلخیص*۔

---

* اس مہم کی مکمل تفصیلات میرے ساتھی سدھیندر کلکرنی کی کتاب 'سورن جینتی رتھ یاترا: راشٹر بھکتی کی تیرتھ یاترا' میں ہے۔ وہ پوری یاترا میں میرے ساتھ تھے۔ اس کو 1997 میں بھارتیہ جنتا پارٹی نے شائع کیا تھا۔

ممبئی سے یاترا کا آغاز

ممبئی کا اگست کرانتی میدان اس یاترا کے آغاز کے لیے ایک آئیڈیل جگہ تھی۔ یہیں سے مہاتما گاندھی نے 8 اگست 1942 کو 'انگریزو بھارت چھوڑو' کا نعرہ دیا تھا، جس نے ہندوستان میں برطانوی حکومت کے خاتمہ کی بنیاد رکھی تھی۔

میں نے 18 مئی کی صبح افتتاحی تقریر میں مہاراشٹر کے عظیم قوم پرستوں۔شیواجی سے تلک، دادا بھائی نوروجی سے مادام کاما، ویرساورکر سے بابوگینو★ اور جیوتبا پھلے سے ڈاکٹر باباصاحب امبیڈکر جن کی خودسپردگی کبھی نہ بجھنے والے چراغ کے تیل کی طرح تھا اور جنہوں نے آزادی کی جدوجہد کی رہنمائی کی تھی — میں نے خراج عقیدت پیش کی۔ یاترا کے تھیم کو پیش کرتے ہوئے میں نے کہا 'مہاتما گاندھی نے نعرہ دیا تھا— 'انگریزو بھارت چھوڑو'— اب وقت آگیا ہے کہ ہم بھی اس طرح کا نعرہ دیں— 'بھوک بھارت چھوڑو، خوف بھارت چھوڑو، کرپشن بھارت چھوڑو۔' کیوں کہ یہ مشکلات ہندوستان کی آزادی کے 50 سال بعد بھی ہمیں متاثر کررہی ہے؟ اس کی اصل وجہ ہے سیاست میں قومی شناخت اور اقتدار کا فقدان۔

تقریب کے آخر میں اٹل جی نے ڈیزائن کیے رتھ۔ ٹاٹا 709E ٹرک کو ہری جھنڈی دکھاکر روانہ کیا جس پر بھارت ماتا کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ اس میں مہاتما گاندھی، لوک مانیہ تلک، سردار ولبھ بھائی پٹیل، ڈاکٹر باباصاحب امبیڈکر، رانی لکشمی بائی، ویرپانڈیہ کٹ بومن، شہید بھگت سنگھ، چندرشیکھر آزاد، اشفاق اللہ خاں، ساورکر، نیتاجی سبھاش چندر بوس اور ڈاکٹر کیشو بلی رام ہیڈگوار کی تصویریں لگی تھیں۔

مہاراشٹر

پہلی رات پنے پہنچنے پر یاترا کا والہانہ استقبال کیا گیا۔ شہر کے داخلہ دروازے پر میں نے چافیکر برادران کے مجسمہ پر گلہائے عقیدت پیش کیا جو 1898 میں انگریز حکومت کے خلاف فوجی کارروائی کے خلاف شہید ہوگئے تھے۔ اس کے بعد میں لوک مانیہ تلک (1856-1920) کی رہائش پر گیا جن کے دروازے پر دیئے گئے 'آزادی میرا پیدائشی حق ہے اور میں اسے لے کر رہوں گا' نے غلامانہ دور کے حکمرانوں کو ہلاکر رکھ دیا تھا۔ یہاں میرا استقبال جینت راؤ تلک جو لوک مانیہ کے پوتے اور ایک قابل احترام کانگریسی تھے نے کیا۔ انہوں نے مجھے لوک مانیہ تلک کی کتاب 'گیتا رہسیہ' کی ایک کاپی دی۔ یہ کتاب تلک نے برما (اب میانمار) کی مانڈلے جیل میں 6 سال کی قید کے دوران تحریر کی تھی۔ بعد میں میں نے شنیواڑہ میں ایک ریلی سے خطاب کرتے ہوئے مہاتما گاندھی کی اس تحریر کو یاد کیا جس میں انہوں نے گاندھی دور سے قبل کے سب سے اہم لیڈر کے بارے میں لکھا تھا— 'تلک کوئی اور دھرم نہیں جانتے تھے سوائے ملک سے محبت کے۔ ملک کے تئیں انہیں بے انتہا محبت اور بے خوفی کے ساتھ انہوں نے مغربی سماج کے اصلاح پسندوں اور روایت پسندوں کو چیلنج کیا۔'

ستارا جو مراٹھا سامراج کے افتخار سے جڑا ایک تاریخی شہر ہے۔ مجھے پہلی بار محسوس ہوا کہ یہ یاترا میرے لیے تعلیم کے نظریے سے کتنی اہم ہے۔ جب میں رات میں قیام کرنے کے بعد وہاں سے روانگی کی تیاری کررہا تھا کچھ مقامی پارٹی کے ساتھیوں نے مجھ سے کہا کہ کیا میں قریب ہی میں واقع دٹ ورکش کو دیکھنا چاہوں گا؟ اس کی اہمیت پوچھنے پر مجھے 'پھانسیچا ڈ' لے جایا گیا۔ یہ ایک یادگاری پیڑ ہے جہاں انگریز حکمرانوں

★ بابوگینو ایک کپڑا مل کے معمولی ملازم تھے، جنہیں 1930 میں سودیسی آندولن میں شرکت کرنے کی پاداش میں انگریزوں نے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔

نے 1857 میں 5 مقامی قوم پرست جنگ آزادی کے ہیرو کو پھانسی پر چڑھادیا تھا۔ بعد میں میں نے ایک میٹنگ سے خطاب کرتے ہوئے کہا ’عام طور پر لوگ طہارت حاصل کرنے اور روحانی تجربہ کے لیے مذہبی تیرتھ یاترا کرتے ہیں لیکن مجھے گزشتہ شب لوک مانیہ تلک کی جائے پیدائش اور آج صبح ’پھانسیچا وڈ‘ کے دورے نے یہ احساس کرایا۔‘

کچھ ہفتہ بعد مجھے اتر پردیش میں بھی اسی طرح کے دو تجربے ہوئے۔ ریاست کے مشرقی حصہ میں واقع چھاؤنی گاؤں میں میں نے برگد کا ایک پیڑ دیکھا جہاں تقریباً 150 قوم پرستوں کو کچی پھانسی دی گئی تھی (ایک دن میں آہستہ آہستہ لٹکا کر پھانسی دینے کا بہیمانہ عمل)۔ اگلے ہی دن بریلی میں میں نے ایک دوسرا برگد کا پیڑ دیکھا جہاں پر ایک دن میں 257 جنگ آزادی کے سپاہیوں کو کچی پھانسی دی گئی تھی۔

مہاراشٹر کے ناسک میں 1857 کے ایک عظیم ہیرو تاتیہ ٹوپے کی جائے پیدائش پر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ پورا شہر گوداوری کے ساحل پر رتھ کا سواگت کرنے کے لیے موجود تھا۔ ویر ساورکر کے حب الوطنی سے بھرپور نغمے جن میں سے کئی انہوں نے انڈمان جزائر کی سیلولر جیل میں 11 سال کی قید کے دوران لکھے تھے، چاروں جانب بج رہے تھے میں ان کی جائے پیدائش بھگور گاؤں گیا تاکہ میں اپنے بچپن کے ہیرو کو خراج عقیدت پیش کرسکوں۔

میں نے کولہاپور میں ریاست کے ایک ترقی پسند حکمراں ساہو جی مہاراج کو خراج عقیدت پیش کی جو اصلاح پسند ڈاکٹر امبیڈکر کے کام کے ابتدائی حامیوں سے ایک تھے۔ ڈاکٹر امبیڈکر کے ذریعہ 1921 میں اچھوتوں کی ایک کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے ایک دور اندیش بیان دیا تھا ’آپ کو امبیڈکر کی شکل میں اپنا ایک نجات دہندہ مل گیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ آپ کی زنجیریں توڑ دیں گے۔ نہ صرف ایسا ہوگا بلکہ میرا دل کہتا ہے کہ ایک دن ایسا آئے گا جب امبیڈکر ملک کے صف اول کے لیڈر کے طور پر چمکیں گے۔‘ میں نے کہا ’ڈاکٹر امبیڈکر کی زندگی کا مشن ہمیشہ ہمیں یہ یاد دلاتا رہتا ہے کہ ہندوستان کے مستقبل کا خواب تب تک شرمندۂ تعبیر نہیں ہوگا جب تک سماجی اور معاشی طور سے بائیکاٹ کیے گئے ہمارے سماج کے طبقات کو برابری کے ثمر کا فائدہ نہیں ملے گا۔‘

اورنگ آباد میں منعقد ایک عظیم الشان ریلی میں میں نے ہندوستان کے مستقبل کو ایک مختلف شکل میں پیش کیا۔ ’ہم ایک نئی صدی کی شروعات سے محض ڈھائی سال دور ہیں، اگلی صدی میں دنیا کی تصویر کیسی ہوگی اور اس میں ہندوستان کی موجودگی کیا ہوگی پیشینگوئی کرنے والوں نے پیشین گوئی کی ہے کہ اگر بیسویں صدی امریکہ اور یورپ کی تھی تو اکیسویں صدی ایشیا کی صدی ہوگی، لیکن کیا ہندوستانی مطمئن ہوں گے، اگر یہ جاپان کی صدی یا چین کی صدی بنے اور ہندوستان کو اس مقابلے سے الگ رکھا جائے؟ نہیں ہمیں اجتماعی طور سے مل کر اسے ہندوستان کی صدی بنانے کی کوشش کرنی ہوگی۔ لیکن ایسا صرف قیادت کی تبدیلی سے نہیں ہوگا۔ سیاسی تبدیلی کافی نہیں ہے ہمیں بڑے پیمانے پر سماجی تبدیلی کی بھی ضرورت ہے۔ اگر ہم اسے حاصل کرلیں تو وہ دن دور نہیں جب ہندوستان عالمی برادری میں صف اول کا ملک بن جائے گا۔‘

گوا

رتھ یاترا نے پڑوسی گوا میں 1961 میں اس کے پرتگالی حکمراں سے آزادی کی یاد دلائی اس لڑائی میں سو سے زائد قوم پرست شہید ہوئے تھے جس میں بڑی تعداد میں دوسری ریاستوں کے لوگوں نے بھی حصہ لیا تھا۔ میں نے اس تحریک کے عظیم ہیرو- ڈاکٹر رام منوہر لوہیا، جگن ناتھ راؤ

جوشی، ایس ایم جوشی، وسنت راؤ اوک، مدھولے، ناتھ پئی اور دیگر- کی قربانیوں کے بارے میں بات کی۔ بعد میں گوا فریڈم فائٹرس ایسوسی ایشن کے ایک وفد نے مجھ سے ملاقات کی جو مرکز اور ریاستی حکومتوں سے اپنے مطالبات کے لیے میری حمایت چاہتے تھے۔ ان کی مانگ تھی کہ حکومت کا واسکوڈی گاما کے ہندوستان آنے کی 500 ویں سالگرہ منانے کی قابل اعتراض سوچ پر وہ بھی پرتگال حکومت کے ساتھ مل کر اسے چھوڑ دیں۔ میں نے ان کے مطالبہ کی حمایت کی اور کہا کہ یہ بیجنگ حکومت کے ساتھ 1962 میں چین کے خلاف جنگ میں ہندوستان کی شکست کی سالگرہ منانے کی طرح ہے۔ نتیجتاً یہ بات چھوڑ دی گئی۔

کرناٹک

جب رتھ یاترا کرناٹک سرحد کے قریب واقع بیل گاؤں پہنچی جو کئی سال سے کرناٹک اور مہاراشٹر کے درمیان تنازع بنا ہوا ہے تب میں نے لوگوں سے درخواست کی کہ وہ لسانی شدت پسندی قومیت کو چھوڑ کر کنڑ اور مراٹھی بولنے والوں کے صدیوں پرانے تعلقات کو بنائے رکھیں۔ میں نے انہیں یاد دلایا کہ دونوں نے مشترکہ طور سے 1924 میں بیل گاؤں میں اے آئی سی سی کی تاریخی کانفرنس کا انعقاد کیا تھا اور اسی وقت مہاتما گاندھی کانگریس پارٹی کے صدر بنے تھے۔

میں قریب کے شہر کتور میں رانی چنما کو خراج عقیدت پیش کرنے گیا۔ وہ ایک چھوٹی سی ریاست کی رانی تھی جنھوں نے 1824 میں انگریز حکومت کے خلاف جنگ کی۔ یہ شمالی ہندوستان میں آزادی کی پہلی لڑائی سے کافی پہلے کی بات ہے۔ انگریز ہمیشہ ہندوستانی ریاستوں پر قبضہ کرنے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔ چینما نے اس پر احتجاج کیا۔ وہ کتور کے راجہ بیوہ تھی جو اپنے گود لیے ہوئے نابالغ بیٹے کی جانب سے حکومت کررہی تھیں۔ ان کی 'غلطی' صرف اتنی تھی کہ انہوں نے بچے کو گود لینے سے قبل برطانوی کلکٹر سے اجازت نہیں لی تھی۔ ان کی مخالفت نے جنگ کو جنم دیا۔ رانی لکشمی بائی کی طرح رانی چنما نے اپنی افواج کی قیادت کی اور انگریزوں کی بہترین اور طاقتور فوج کو تین بار بری طرح شکست دی۔ بالآخر وہ گرفتار کرلی گئی تو انہوں نے خود اپنی زندگی ختم کرلی۔

یاترا کے دوران میں نے کئی مقامات کا دورہ کیا جو نہ صرف تاریخی بلکہ اہمیت کے حامل بھی تھے۔ اسی طرح ہبلی میں میں نے 1993 میں بی جے پی کی حب الوطنی سے پُر جدوجہد کو یاد کیا جب یوم آزادی اور یوم جمہوریہ پر میونسپل کارپوریشن کے مالکانہ حق والے عیدگاہ میدان میں قومی پرچم لہرانا تھا۔ مسلم فرقہ کے کچھ سخت گیروں نے مذہبی بنیاد پر اور تمام نام نہاد سیکولر پارٹیوں اور دانشوروں نے اس مسئلے پر بی جے پی کی مخالفت کی جس سے ایک غیر ضروری ملک گیر تنازع پیدا ہوا۔ بی جے پی کے ذریعہ شروع کیے گئے مظاہرہ میں پولس نے پرچم لہرانے والے پانچ حامیوں کو گولی ماردی۔ میری پارٹی نے بغیر گھبرائے ہوئے جدوجہد جاری رکھی جس میں بالآخر کامیابی حاصل ہوئی۔

اپنی تقاریر میں میں نے قوم پرستی کی اپیل کو ہندوستان کی فوری ترقی کے ساتھ ملا کر پیش کرنے کی کوشش کی۔ مثلاً ساحلی کرناٹک کے منگلور میں میں نے لوگوں سے ایک نئے ہندوستان کی تعمیر کی اپیل کی، جو ترقی کے معیار پر دنیا میں سب سے شاندار ہے۔' اس کے لیے اپنے شہر کو ہی لیں۔ منگلور پہلے سے ہی مغربی ساحل کی ایک اہم بندرگاہ شہر کی شکل میں ابھر چکا ہے۔ اب اسے ایمسٹرڈم- جو کہ اتنا کارگو سنبھالتا ہے جتنا ہندوستان کے سارے بندرگاہ ایک ساتھ مل کر سنبھالتے ہیں- کی طرح بڑا جدید اور باصلاحیت ہونے کی کوشش کرنی چاہیے۔

کیرل

بہت سے لوگوں کو یہ جان کر تعجب ہوگا کہ میری یاترا کے دو ریاستوں کیرل اور مغربی بنگال، جہاں بی جے پی کمزور اور ہمارے نظریاتی مخالف کمیونسٹ کافی مضبوط ہیں، میں حوصلہ افزا ردعمل دیکھنے کو ملا۔ جیسے ہی میرا رتھ نے کرناٹک کے سرحدی شہر کا سرگوڈ میں داخل ہوا، میں یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا کہ سڑک کے دونوں جانب ہزاروں نوجوانوں نے لامتناہی انسانی زنجیر بنا رکھی تھی جو 'بھارت ماتا کی جے' اور 'وندے ماترم' کے نعرے لگا رہے تھے۔ اسی طرح کا منظر ایک شہر کے بعد دوسرے شہر میں دکھائی دے رہا تھا۔ جہاں کہیں بھی میرا رتھ رکتا، خواتین کے ذریعہ روایتی استقبالیہ رسم 'آرتی' اتار کر میرا خیر مقدم کیا جاتا۔

اپنی تقریروں میں، میں نے آدی شنکر آچاریہ، جنھوں نے پورے ہندوستان کی پیدل یاترا کی تھی اور ہزاروں برس پہلے روحانیت کا پیغام دیا اور مشہور و معروف سوشل ریفارمر نارائن گرو جنھوں نے وحدانیت کے بنیادی ویدک نظریہ کا حوالہ دے کر ذاتی بھید بھاؤ کے خلاف مہم چلائی، کی سرزمین کے طور پر ہندوستانی قوم پرستی میں کیرل کے رول کا ذکر کیا۔ میں نے وطن کے وفادار سپاہی اور پلاسی * کے راجہ کا بھی ذکر کیا، جنھوں نے 1857 کی جنگ آزادی سے کافی پہلے انگریزی حکومت سے گوریلا جنگ لڑنے کے لیے قبائلیوں کو منظم کیا۔ میں نے کہا کہ کمیونسٹ اور ریاستی سیاست میں ایک اور اہم طاقت مسلم لیگ، یہ دونوں ہی ہندوستان کی قوم پرستی کی تہذیبی و ثقافتی بنیاد کو نہ تو قبول کرتے ہیں اور نہ ہی اس کی تعظیم کرتے ہیں۔

میں نے مارکس وادی کارکنان کے ذریعہ بی جے پی، سنگھ اور اکھل بھارتیہ ودیارتھی پریشد** کے کارکنان پر بار بار کیے گئے قاتلانہ حملوں کی سخت مذمت کی۔ میں نے اس حقیقت پر سخت تشویش ظاہر کی کہ حال کے برسوں میں کیرل ان ملک دشمن طاقتوں کے لیے ایک زرخیز سرزمین بن چکا ہے جو پاکستان کی آئی ایس آئی سے مل کر کام کر رہے ہیں۔ ملاّ پورم میں میں نے لوگوں سے 'تحفظ وطن کا عہد' بھی کروایا۔

تمل ناڈو

ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں تمل ناڈو کا اہم رول رہا ہے۔ یہ دکھ کی بات ہے کہ شمالی ہند کے لوگوں کو اس کی صحیح معلومات نہیں ہے۔ میں بندرگاہ شہر تو تیکورن گیا، جہاں جدوجہد آزادی کی اہم شخصیات میں سے ایک وی او چدمبرم پلّے کی پیدائش ہوئی تھی۔ وی او سی کے نام سے مشہور وہ ایک کامیاب صنعت کار اور سچے محب وطن تھے۔ سودیشی اسٹیم نیویگیشن کمپنی، جس کا مقصد برٹش جہازوں سے مقابلہ کرنا تھا، قائم کر کے انھوں نے نوآبادیاتی حکمرانوں کو ناراض کر دیا تھا۔ لوک مانیہ تلک کے حامی وی او سی 1906 میں سورت میں ہوئی تاریخی کانگریس کانفرنس میں گئے اور لال، بال اور پال*** کی تقریروں سے پرجوش واپس لوٹے۔ انگریزی حکومت نے ان کی شپنگ سروس بند کر دی اور بغاوت کے جرم

★ اتفاق سے گزشتہ دنوں کیرل کے کوچی میں منعقد 'مائی کنٹری، مائی لائف' کتاب سے متعلق تقریب میں ملیالم فلموں کے مشہور اداکار موہن لال موجود تھے، جو 'پلاسی راجہ' فلم میں ان کا رول ادا کر رہے ہیں اور پروگرام میں فلم کی شوٹنگ کے دوران آئے تھے۔ انھوں نے کتاب کی تعریف کی۔

★★ اکھل بھارتیہ ودیارتھی پریشد (اے بی وی پی) راشٹریہ سویم سیوک سنگھ سے مصدقہ اور متحرک قوم پرست طلبا کی تنظیم ہے جو دیگر طلبا تنظیموں کے برخلاف بی جے پی سے پوری طرح آزاد اکائی ہے۔

★★★ گزشتہ صدی کی پہلی دہائی میں 'لال، بال، پال' جنگ آزادی کے 3 ستون لالہ لاجپت رائے، بال گنگا دھر تلک اور وپن چندر پال کے لیے مقبول عام فقرہ جملہ تھا۔

میں انھیں عمر قید کی سزا سنادی۔ ان کی شہرت اتنی دور تک پھیلی ہوئی تھی کہ ہندوستان کے پہلے صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرساد، جو اس وقت پٹنہ میں ایک نوجوان وکیل تھے، وی او سی کا مقدمہ لڑنے کی نیت سے ان کے گاؤں اوٹاپدارم گئے تھے۔ جب میرا رتھ اوٹاپدارم پہنچا تو مجھے بتایا گیا کہ اس سورن جینتی سال میں، میں تنہا ہی ایسا قومی لیڈر تھا جو اس گاؤں میں آیا تھا۔

سینگوٹئی میں، میں نے شہر کے سب سے عظیم سپوت ویروانچی کے مجسمہ کی گل پوشی کی۔ جدوجہد آزادی کے یہ گمنام شہید 'بھارت ماتا سنگھم' نامی ایک انقلابی تنظیم کے ممبر تھے۔ یہ سن کر کہ ضلع کے انگریز سب کلکٹر نے وی او سی کو عمر قید کی سزا دی ہے۔ وانچی (جن کی شادی چند ہی ہفتہ قبل ہوئی تھی) نے 1911 میں اسے گولی مار کر اس ناانصافی کا بدلہ لے لیا۔ وہاں سے فرار ہونے میں ناکام رہنے پر انھوں نے اسی مقام پر خود کو گولی مار لی۔ اپنی تقریر میں میں نے ویرساورکر کی مشہور کتاب 'کالا پانی' میں بیان کردہ بہادری کے اس فسانہ کو یاد کیا۔

میری 'حب الوطنی کی تیرتھ یاترا' کا ایک اور مقصد تھا۔ قومی شاعر سبرامنیم بھارتی (1921-1882) کی جائے پیدائش ایٹایاپورم، جو دور جدید کے عظیم تمل شاعر مانے جاتے ہیں، ان کی پرجوش اور جذباتی نظمیں بھارت ماتا کی لافانی عظمت کا جشن مناتی ہیں۔ ان کی مشہور نظموں میں ایک کا عنوان ہے 'وندے ماترم'۔ ان کی تخلیقات دراوڑ۔ آریہ کی مصنوعی تقسیم کا پراثر تجزیہ کرتی ہیں اور ساتھ ہی وہ ہندو تہذیب کی اعلیٰ اقدار کو بھی پیش کرتی ہیں۔ ایک معروف نظم 'این تائی' (میری ماں) میں بھارتی نے لکھا— 'میری ماں کے 30 کروڑ چہرے ہیں، مگر ان کا جسم اور روح ایک ہے۔ وہ 18 زبانوں میں بولتی ہیں مگر وہ خیال ایک ہی ظاہر کرتی ہیں۔' میں نے اپنی تقریر میں سامعین کو یاد دلایا کہ مئی 1996 میں پارلیمنٹ میں اعتماد کا ووٹ حاصل کرنے کے دوران کی گئی اپنی تقریر میں وزیر اعظم اٹل بہاری واجپئی نے اسی نظم کو پہلے تمل میں، پھر ہندی میں پڑھی تھی۔

میں بھارتی کے گھر، جو اب ایک یادگار میوزیم میں تبدیل ہو گیا ہے، میں رکھی تصاویر اور آرٹ کو دیکھ کر بہت متاثر ہوا۔ اس میں 1908 میں تلک (جنھوں نے 'پیارے گروجی' سے مخاطب کیا تھا) کو لکھا ان کا وہ خط بھی تھا جس میں ان سے جنوب میں ہندی کی کلاسیز شروع کرنے کی التجا کی گئی تھی۔ وہاں ایک اور خط بھی رکھا ہوا تھا جو جون 1945 میں گاندھی جی نے بھارتی کو لکھا تھا اور یہ تمل میں تھا۔ گاندھی جی کی اپنی تحریر میں، اپنی تقریر میں ان کا ذکر کرتے ہوئے میں نے کہا کہ 'جدوجہد آزادی کے متوالوں سے ہمیں یہ درس لینا چاہیے کہ زبان، علاقہ، مذہب اور ذات کی سرحدیں پھلانگتے ہوئے لوگوں کو کیسے اتحاد کی لڑی میں پرویا جاسکتا ہے۔'

توتی کورین ضلع کے پنچلم کرچی میں واقع ویرپانڈیا کٹابومن کے قلعہ کو دیکھنا میرے لیے خاص طور سے مسرت بخش تھا۔ برٹش شہنشاہیت کے خلاف لڑائی میں شہید ہونے والوں میں سے ایک کٹابومن ایک چھوٹی سی ریاست کے حکمراں تھے۔ 18 ویں صدی میں جنوبی ہندوستان میں اپنا دبدبہ قائم کرنے کے مقصد سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے افسران نے ان کی ریاست پر حملہ کر دیا۔ کٹابومن نے دیوی جکمبل (شمالی ہند میں دیوی جگدمبا) کی پوجا کی اور کمپنی کے خلاف زبردست گوریلا جنگ چھیڑ دیا۔ انھیں گرفتار کر لیا گیا اور 1799 میں انھیں پھانسی دے دی گئی۔

اس دن کی تقریر میں میں نے بتایا کہ میں نے اپنی زندگی کی جو پہلی تمل فلم دیکھی تھی، وہ تھی عظیم اداکار شیواجی گنیشن کی 'ویرپانڈیا کٹابومن' حالانکہ مجھے اس فلم کی زبان سمجھ میں نہیں آئی، پھر بھی اس فلم نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ 1982 میں شیواجی گنیشن کے راجیہ سبھا کے لیے نامزد ہونے کے بعد میں نے اس فلم میں ان کے رول کے لیے پارلیمنٹ میں انھیں ذاتی طور پر مبارکباد دی۔

یاترا کے دوران تمل ناڈو کے جنوبی اضلاع میں تھیوروں اور دلتوں کے درمیان نسلی جنگ جاری تھی۔ اس جنگ کو ختم کرنے کی اپیل کرتے ہوئے میں نے کٹابومن کی مثال پیش کی جنھوں نے برطانوی حکومت کے خلاف بغاوت میں سبھی ذات کے لوگوں کو شامل کر کے سماجی اتحاد کو

فروغ دیا تھا۔ ان کے دوسب سے قابل اعتماد ساتھیوں میں سے ایک کا نام ویلیا تھیور تھا جن کا تعلق نچلی ذات تھیور برادری سے تھا، جبکہ دوسرے کا نام سندرلنگم تھا جو دلت تھے۔ یہاں مجھے یہ بتانا چاہیے کہ یاترا کے سندیش گان (پیغام ترانہ) میں کنابومن کو خصوصی مقام دے کر جنگ آزادی کے اس گمنام تمل شہید کو پورے ملک میں مشہور و معروف کر دیا تھا۔

میرا اگلا پڑاؤ کانگریس کی تاریخ میں سب سے معتبر اور معزز لیڈروں میں سے ایک کے. کامراج کی جائے پیدائش ورودونگر تھا۔ وہ ایمان دار، خوددار اور قوم و ملک کی عزت و آبرو کے لیے خود کو نچھاور کرنے والے سپوت تھے۔ بی جے پی کے صدر کے ذریعہ ایک معزز اور ایماندار کانگریسی لیڈر کی عزت و احترام کیے جانے پر تمل ناڈو کی میڈیا نے خوب خوب تعریف کی تھی۔ میرے اس بیان کی بھی تعریف ہوئی جو پنڈت جواہر لال نہرو کی برسی پر 27 رمئی کو چینئی میں جاری کیا گیا تھا، جس میں تحریک آزادی میں ان کا کردار اور بعد میں ہندوستان میں پارلیمانی جمہوریت کے فروغ کے لیے ان کی تعریف و تحسین کی گئی تھی۔

جزائر انڈمان ونکوبار میں واقع سیلولر جیل

جزائر انڈمان ونکوبار کی راجدھانی پورٹ بلیئر میں واقع سیلولر جیل دیکھنے کے لیے میں نے چینئی سے ہوائی سفر کیا۔ یہ پہلے 'کالا پانی' کہلاتا تھا، کیونکہ 1857 کی پہلی جنگ آزادی کے بعد برطانوی حکومت اس دور دراز اور اجنبی جزیرہ کا استعمال ایک اذیت خانہ کے طور پر کرتی تھی، جس میں ہزاروں قوم پرستوں کو قید کر کے رکھا جاتا تھا۔ اس بغاوت کے دو اہم لیڈروں، جو اپنے تابناک کردار اور دانشوری کے لیے مشہور تھے علامہ فضل حق خیر آبادی اور مولانا لیاقت علی نے بطور قیدی یہیں دم توڑا تھا۔

ہم وہاں 28 رمئی کو پہنچے، جو سیلولر جیل کے ایک اہم قیدی ویر ساورکر کی 114 ویں یوم پیدائش تھی۔ یہاں کی 698 اندھیری کوٹھریوں میں سے ایک سیل نمبر 123 میں اس معروف مؤرخ نے 1857 کی تاریخی خاکوں کا مطالعہ کر کے انھیں قلم زد کرنے میں اپنی زندگی کے تقریباً 11 سال (21-1911) صرف کیے۔ جیل میں قیدی ایک دوسرے سے الگ رکھے جاتے تھے کہ ویر ساورکر کے بڑے بھائی اور مجاہد آزادی گنیش دامودر ساورکر بھی اسی جیل میں بند تھے، لیکن دونوں بھائیوں کو پورے دو برس بعد اس کا پتہ چلا۔ ان نامساعد حالات میں ساورکر نے پہلے جیل کی دیواروں پر اور بعد میں اپنی رہائی کے بعد کاغذ پر کئی لافانی حب الوطنی سے سرشار گیت لکھے۔ ان میں سے 'سوتنترتا' نامی نظم میں انھوں نے گایا—

'تجھ ساٹھی مرن ہے جنن، تجھ بنا جنن ہے مرن' (اے مادر وطن! تیرے لیے مرنا ہی جینا ہے اور بغیر تیری خدمت کے جینا ہی مرنا ہے۔)

ساورکر بھائیوں کے علاوہ کچھ دیگر اہم مجاہدین آزادی بھی یہاں قید تھے۔ باریندر کمار گھوش (مہارشی اروند گھوش کے چھوٹے بھائی)، اُلہا سکر دت، اندو بھوشن رائے، ترلوک ناتھ چکرورتی، پولن داس، بابا پرتھوی سنگھ آزاد، گرمکھ سنگھ، بھائی پرمانند، موتی لال ورما اور لدا رام کے علاوہ کئی دیگر مجاہدین آزادی کی تصویریں ایک میوزیم میں رکھی ہوئی ہیں۔ مجھے اسمارک کو باریک بینی سے دکھلانے والی گائڈ رشیدہ بی بی ایک مقامی اسکول کی ٹیچر تھیں جن کے والد پشاور کے اناء اللہ خاں تیس کی دہائی میں کئی برسوں تک اس جیل میں قیدی تھے۔

یادگار (میموریل) کے باہر ساورکر پارک میں نیم کا ایک پودا لگا کر میں نے پارٹی کارکنان اور کچھ سیاحوں کے ایک چھوٹے اجتماع سے خطاب کیا۔ اپنی یادداشت کو تازہ کرتے ہوئے میں نے بتایا کہ 'میں اپنے بچپن کے اس ہیرو سے بے حد متاثر ہوا تھا۔' میں نے ساورکر کی ممنوعہ کتاب '1857 کا سوتنترسمر' جس کی ایک بوسیدہ کاپی 1942 میں، میں نے پوشیدہ طور پر 28 روپے کی اونچی قیمت دے کر خریدی تھی، پڑھ کر

حب الوطنی کا پہلا سبق سیکھا تھا۔ آج ہندوستان کی آزادی کے 50 ویں سال گرہ کے موقع پر ہم سب کو اپنے عظیم محب وطن ہیروز کی جدو جہد اور قربانیوں کو یاد کرنا چاہیے اور یہ عہد لینا چاہیے کہ ہم ان کے خوابوں کے ہندوستان کی تعمیر کریں گے۔

آندھرا پردیش

آندھرا پردیش میں یاترا کو دو چیلنجوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ان پورے پانچ دنوں میں، جب گولڈن جبلی رتھ ریاست سے گزرا، درجہ حرارت 45 ڈگری سیلسیس سے اوپر ہی تھا۔ دوسرے یہ کہ مقامی تنظیمی کارکنان کو ایک نکسلی تنظیم پیپلز وار گروپ کی دھمکیوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ان غیر موافق حالات کے باوجود یاترا انتہائی کامیاب رہی۔

یاترا کے دوران ہوئے عظیم الشان اجلاس میں سے ایک جلسہ نیلور میں ہوا، جس کا ریاست کی تاریخ میں ایک لائق فخر مقام ہے۔ یہ پوٹی شری راملو کی جائے پیدائش ہے، جن کی 52 دنوں کی بھوک ہڑتال کا خاتمہ دسمبر 1952 میں اپنی جان کی قربانی دے کر ہوا تھا، جس کے نتیجہ میں، پنڈت نہرو کو زبان کی بنیاد پر ریاستوں کے تشکیل نو کے مطالبہ کو قبول کرتے ہوئے 1956 میں نافذ کرنا پڑا تھا۔ بڑی تعداد میں ضلع کے مجاہدین آزادی کا استقبال کرنے کے بعد میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ 'آزادی کے 50 برس بعد بھی ایک نئے بھارت کا ان کا خواب کیوں پورا نہیں ہوسکا ہے؟ اگر مجاہد آزادی کے تمام محب وطن اور شہداء آج کے ہندوستان، جس کی سیاست بدعنوانی میں گلے تک ڈوبی ہوئی ہے اور جس کا سماج غریبی کی لعنت اور بغض وعناد سے برسر پیکار رہا ہے، کو دیکھ کر کیسا محسوس کرتے؟ مجاہدین آزادی نے اپنے وقت میں اپنا فرض پورا کیا، اب ہمیں اپنا فرض نبھانا ہے۔'

آندھرا پردیش کے تیسرے سب سے بڑے شہر وجے واڑہ میں رتھ ٹھیک نصف شب میں پہنچا، پھر بھی ایک بھاری بھیڑ اس کی آمد کا انتظار کر رہی تھی۔ وہاں میں نے ایک عظیم مجاہد آزادی الوری سیتارام راجو (1924-1897)، جنھوں نے انگریزوں سے جنگ لڑنے کے لیے قبائلیوں کو منظم کیا تھا، کو خراج عقیدت پیش کیا۔ پنجاب کے عظیم غدر انقلابی بابا پرتھوی سنگھ آزاد برٹش حکومت کے ذریعہ مشرقی آندھرا پردیش کے دور دراز راج مندوری شہر کی ایک جیل میں قید تھے۔ جب راجو کو اس بات کا پتہ چلا تو انھوں نے آزاد کو جیل سے چھڑانے کی قسم کھائی۔ اس عمل میں وہ ایک انگریز افسر کے ذریعہ گرفتار کر لیے گئے اور ایک درخت سے باندھ کر انھیں گولی ماردی گئی۔ بی جے پی کے یوتھ مورچہ نے مجھے ایک مشعل دیا جس کا نام 'الوری سیتارام راجو جیوتی' تھا اور جسے وہ راج مندری سے لائے تھے۔ اسی طرح پارٹی کارکنان کا ایک اور گروپ ایک کلش لایا تھا، جس میں الوری کی جائے پیدائش کرشنا دیوی پیٹ کی پاک سرزمین کی مٹی تھی۔ میں ان جذبوں سے واقعی سرشار ہوگیا۔

انگول میں میں نے آندھرا پردیش کے پہلے وزیر اعلیٰ تنگوتوری پرکاشم پنتلو (1957-1872) کے مجسمہ کی گل پوشی کی۔ 'آندھرا کیسری' کے نام سے مشہور اس مجاہد آزادی نے 1928 میں سائمن کمیشن کے خلاف احتجاج کے دوران اپنا سینہ دکھا کر برٹش پولس کو انھیں گولی مارنے کے لئے للکارا تھا۔ تقریباً اسی طرح جس طرح 'پنجاب کیسری' لالہ لاجپت رائے نے چیلنج کیا تھا۔ پونورو میں، میں نے کانگریس کے ایک اور مشہور لیڈر این جی رنگا، جو ایک کسان لیڈر، ممتاز ممبر آف پارلیمنٹ (پارلیمنٹ کے سب سے طویل المیعاد ممبر) اور جو چھوت چھات کے سخت مخالف تھے، کے مجسمہ کی گل پوشی کی۔

پرکاشم ضلع کے ایک چھوٹے سے گاؤں چیر ولو میں مجھے ایک متاثر کن تجربہ ہوا۔ ایک جلسہ سے خطاب کرنے کے بعد میں جیسے ہی رتھ پر سوار ہونے کی تیاری کر رہا تھا، گاؤں کے لوگوں نے مجھ سے 90 سالہ ایک مجاہد آزادی اوریندر چندر شیکھر راؤ کے گھر چلنے کی درخواست کی۔ 1942 کے 'بھارت چھوڑو آندولن' میں حصہ لینے کے لیے انھوں نے گاؤں کے 42 افراد کو تیار کرلیا تھا۔ گاؤں والوں نے بتایا کہ وہ سخت بیمار ہیں، تقریباً بستر مرگ پر ہیں۔ اگر میں ان سے ملاقات کے لیے گیا تو انھیں واقعی بہت خوشی ہوگی۔ میرا استقبال کرتے ہوئے ان کے چہرے پر ایک چمک تھی، میں نے ان کا آشیرواد لیا۔ اگلے ہی روز انھوں نے اس دار فانی کو لبیک کہا۔

آندھرا پردیش کے تلنگانہ علاقہ جہاں اسے ایک الگ صوبہ بنائے جانے کے لیے 60 کی دہائی کے وسط سے ہی ایک پرتشدد تحریک چل رہی تھی۔ تمام جلسوں میں میری تقاریر میں دو پیغام ہوتے تھے۔ پہلا یہ کہ میں نے کہا کہ بی جے پی ایک علیحدہ تلنگانہ کی مانگ کی حمایت کرتی ہے، کیونکہ ساخت کے نکتہ نظر سے وہ بھارت کے 11 ریاستوں سے بھی بڑا ہے۔ میرا دوسرا پیغام تھا کہ بی جے پی بایاں بازو کی سخت گیریت سے لبریز سیاست، جس کی جڑیں اس علاقہ میں کافی مضبوط تھیں، کے خلاف ہے۔ نکسلی سرگرمیوں کے مرکز وارنگل میں ایک عظیم الشان اجلاس کو خطاب کرتے ہوئے میں نے کہا کہ بلاشبہ ہمارے سماج میں بہت ہی ناانصافی ہے، جسے تلنگانہ کی عوام برداشت کر رہی ہے۔ پوری دنیا کی تاریخ نے اس سچ کو بار بار ثابت کیا ہے کہ تشدد اور دہشت کی سیاست ناانصافی کے خاتمہ میں کبھی کامیاب نہیں ہوئی ہے۔ ایک آزاد اور جمہوری ملک میں تبدیلی لانے کے لیے بندوق کی گولی نہیں بلکہ ووٹ ہی سب سے بہتر وسیلہ ہے۔

ایک مرتبہ رات کو قیام کرنے کے مقام پر دو پولس افسران مجھے نکسلی حملہ سے خبردار کرنے کے لیے آئے اور کہا کہ 'پیپلز وار گروپ کی دھمکی گیدڑ بھبکی نہیں ہوتی، اس لیے ہم آپ سے ایک بلٹ پروف کار کے استعمال کی درخواست کرتے ہیں۔

میں نے کہا: نہیں۔

جب میں نے منع کیا تو انھوں نے بلٹ پروف جیکٹ پہننے کے لیے کہا۔ میں نے اس کے لیے بھی منع کردیا اور زور دے کر کہا کہ 'دھمکی ہو یا نہ ہو، میرا رتھ چھوڑ کر جانے کا کوئی سوال ہی نہیں ہے۔'

گجرات

مہاراشٹر کے بعد دوسرے دَور کی یاترا کے لیے رتھ یاترا گجرات پہنچی، جو مجھے آزادی کے تین عظیم شخصیات مہاتما گاندھی، سوامی دیانند سرسوتی اور سردار بلبھ بھائی پٹیل کی جائے پیدائش پر لے گئی۔ یاترا کے پروگرام کے مطابق میرا پہلا قیام سوامی دیانند سرسوتی (83-1824) کی جائے پیدائش راجکوٹ کے قریب ٹنکارا تھا، جہاں میں پہلی مرتبہ گیا تھا۔ آریہ سماج کے بانی سوامی جی مقتدر شخصیات کی اس عدیم المثال فہرست میں شامل ہیں جنھوں نے سیاست کے میدان میں قدم رکھے بغیر ہندوستان کی جنگ آزادی میں بیش قیمت تعاون فراہم کیا۔ اس گاؤں میں ایک عظیم الشان اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے میں نے کہا کہ 'سوامی جی نے ملک کے باشندوں کو غلامی سے نجات پانے کے لیے ویدک تعلیم کی بنیاد پر وطن پرستی، خودداری اور اپنی زبان کی جیوتی پھر سے جلانے کے اپنے متحرک پیغامات کے ذریعہ قومی بیداری کی ترغیب دی تھی۔ انھوں نے ہندوستان کو سکھایا کہ ذاتی اور نسلی بھید بھاؤ ویدک روایت کا حصہ نہیں ہے اور یہ بھی کہ پیسہ نہیں بلکہ سماج کی بے غرض خدمات ہی اصلی خوشی دے سکتی ہیں۔'

میں مہاتما گاندھی کے آبائی مقام 'کرتی مندر' کئی بار جاچکا ہوں اور ہر مرتبہ وہاں مجھے امن اور پاکیزگی کا احساس ہوا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں 2 راکتوبر 1869 کوانسانی تاریخ کے عظیم المرتبت سپوتوں میں سے ایک کا جنم ہوا تھا۔ خراج عقیدت پیش کرنے کے بعد 'وزیٹرس بک' میں، میں نے لکھا کہ 'تقسیم کے بعد میں سندھ سے دہلی آیا تھا۔ اسی وقت مجھے ایک مرتبہ مہاتما جی کے درشن ہوئے تھے۔ اس کے بعد ان کا لٹریچر پڑھ کر ہی ان کے 'درشن' ہوتے رہے۔ آج پور بندر آکر ان کی جائے پیدائش دیکھنے کے بعد مجھے ایک نئی ترغیب کا احساس ہوا ہے۔'

بڑودرہ سے 90 منٹ کے فاصلے پر واقع کرم سد وہ مقام ہے جہاں 1875 میں ہندوستانی سیاست کے مردِ آہن سردار پٹیل کا جنم ہوا تھا۔ ان کی آبائی رہائش گاہ بالکل معمولی ہے جس میں نہرو کی جائے پیدائش الٰہ آباد کے 'آنند بھون' جیسا شاہی کچھ بھی نہیں ہے، لیکن کرم سد اس بات کا احساس ضرور کراتا ہے کہ پٹیل نہرو کے مقابلہ میں زیادہ زمینی لیڈر کیوں تھے۔ ہندوستان کے پہلے وزیر داخلہ کے طور پر جس مضبوطی اور عقل سلیم سے انھوں نے 565 صوبوں کے ہندوستان وفاق میں انضمام کے لیے سام، دام، ڈنڈ اور بھید کے تمام طریقے استعمال کیے، وہ ان کی زندگی کی سب سے بڑی حصولیابی تھی، اس کے لیے وہ ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔ آج بھی کئی ہندوستانیوں، جن میں میں بھی ایک ہوں، کا یقین ہے کہ اگر نہرو کشمیر کے ہندوستان میں انضمام کا کام پٹیل کو سونپ دیتے تو کشمیر مسئلہ کا حل 48-1947 میں ہی حل ہو گیا ہوتا۔

بھاؤنگر- احمد آباد شاہراہ پر واقع ایک چھوٹا سا گاؤں جھجھارکا میں ایک خوبصورت 'دلت مندر' جو ناتھ فرقہ سے متعلق ہے، میں یاتریوں نے دوپہر کا کھانا کھایا۔ یہ مندر پنجاب کے ایک دلت سوشل ریفارمر سنت ساؤ ناتھ کے ذریعہ تقریباً ڈھائی سو سال قبل قائم کیا گیا تھا۔ یہ فرقہ نسلی تفریق ختم کرنے اور سوشل خیر سگالی قائم کرنے کی کوشش کرتا رہا ہے۔ جب میں نے ایک ہی قطار میں ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر، گاندھی جی اور ہندو دیوی دیوتاؤں کی تصاویر لگی دیکھیں تو میرا یقین اور بھی پختہ ہو گیا کہ ہندو روایات کے اندر موجود ترقی پسند رجحانات کی مدد سے ہندو سماج میں جاری برائیوں سے نبردآزما ہوا جاسکتا ہے۔

ان دنوں ریاست میں 'واگھیلا اسکنڈل' کی دھوم تھی، جو بی جے پی کی تاریخ کا ایک تکلیف دہ باب تھا۔ پارٹی کے ایک سینئر لیڈر شنکر سنگھ واگھیلا نے وزیر اعلیٰ بننے کی اپنی خواہش پوری کرنے کے لیے پارٹی چھوڑ کر کانگریس سے ہاتھ ملا لیا تھا۔ اپنی تقریروں میں، میں نے ہم عصر ہندوستانی سیاست میں آئی برائیوں، گروپ بازی، اقتدار کی ہوس اور ذاتی خواہشات کو پارٹی مفاد سے برتر سمجھنے پر تشویش ظاہر کی۔

راجستھان

راجستھان میں یاترا راجپوت کی عظمت، خودداری اور شجاعت کی دو ترغیبی علامتوں چتوڑ گڑھ اور کنبھل گڑھ کے قلعہ کے سبب یادگار بن گئی۔ تقسیم ہند سے قبل میں ایک مرتبہ چتوڑ گڑھ گیا تھا۔ اس وقت میں کراچی میں ایک طالب علم تھا۔ چتوڑ گڑھ کے کھچا کھچ بھرے گورا بادل اسٹیڈیم میں تقریباً 50 ہزار لوگوں کے سامنے تقریر کرتے ہوئے اس بات کو یاد کرنا میرے لیے ایک خوشگوار تجربہ تھا۔ 'عظیم راجپوت سپاہی مہارانا پرتاپ (97-1540) جنھوں نے طاقتور حکمراں اکبر سے لوہا لیا تھا، کی جائے پیدائش کنبھل گڑھ میں، میں نے کہا کہ 'مہارانا پرتاپ اور ان کے پیروکار اپنی خودداری اور عزت نفس کے لیے لڑے۔ آج ہماری عزت نفس بھوک، خوف اور بدعنوانی کو ختم کرنے اور اکیسویں صدی میں بھارت کو ایک مکمل ترقی یافتہ ملک بنانے میں ہے۔'

کوٹہ میں یاترا کا جوش وخروش کے ساتھ استقبال کیا گیا۔ لاکھوں افراد سڑک کے دونوں جانب کھڑے تھے، جنھیں گلیوں میں پیر رکھنے کی

جگہ نہیں ملی وہ مکانوں کی چھت سے یہ نظارہ دیکھ رہے تھے۔ ایک بھی ایسا چہرہ نہیں تھا جہاں مجاہد آزادی کے ہیرو اور شہیدوں کی تصویر یا جھانکیوں کی نمائش نہ کی گئی۔ جیسے جیسے سورن جینتی رتھ شہر کی مختلف گلیوں سے گزرا، ان دو گھنٹوں میں اس پر مسلسل گلاب کی پنکھڑیوں اور گیندے کے پھولوں کی بارش ہوتی رہی۔ میں نے اپنی اظہار تشکر کی تقریر میں کہا کہ کوٹہ وہ شہر تھا جہاں 50 کی دہائی کے کئی شروعاتی برسوں میں، میں نے بھارتیہ جن سنگھ کے ایک نوجوان کارکن کے طور پر کام کیا تھا۔ پارٹی کی بے پناہ عوامی مقبولیت نے، خاص طور سے 90 کی دہائی میں مجھے مطمئن کر دیا۔

راجستھان یاترا کے دوران دل کو چھو لینے والا لمحہ اس وقت آیا جب میں نے بھیلواڑہ میں ہیمو کلانی کے مجسمہ کی نقاب کشائی کی۔ وہ نوجوان محب وطن سندھ کے ان لاکھوں لوگوں میں ایک تھا، جسے گاندھی جی کی اپیل 'کرو یا مرو' کی حمایت کرنے پر انگریزوں نے پھانسی دے دی تھی۔

راجستھان کے تمام عوامی اجلاس اور سڑک کنارے کی خیر مقدمی تقاریب میں یہ دیکھنا ایک خوشگوار حیرت تھی کہ سماجی نکتہ نگاہ سے دقیانوس کہلانے والی اس ریاست میں عورتوں نے بڑی تعداد میں اور جوش وخروش کے ساتھ حصہ لیا۔ 40 کی دہائی کے اختتام اور 50 کی دہائی کے شروعاتی برسوں میں 'سنگھ' کے ایک مبلغ اور 'جن سنگھ' کے کارکن کی شکل میں اپنی مدت کار میں، میں نے شاید ہی کسی عورت کو عمومی زندگی میں دیکھا ہوگا۔ یہ خاموش سماجی انقلاب ایک حد تک پنچایتی راج اداروں میں عورتوں کے لیے 33 فیصد سیٹیں ریزرو کرنے کی وجہ سے ہوا۔ یاترا کے دوران سڑک کے کنارے کئی جلسوں میں خاتون سرپنچوں نے مجھے پھولوں کا مالا پہنا کر اور میری پیشانی پر تلک لگا کر میرا خیر مقدم کیا۔ میں نے کہا کہ میری پارٹی پارلیمنٹ اور اسمبلیوں میں بھی خواتین کے لیے 33 فیصد ریزرویشن کے حق میں ہے تو خواتین نے تالیاں بجا کر اس کی تائید کی۔

مدھیہ پردیش

مدھیہ پردیش کے جنگلاتی علاقوں میں یاترا کرنا زیادہ خوشگوار تجربہ نہیں تھا۔ بدعنوان لیڈروں اور ٹھیکیداروں کے ذریعہ بڑے پیمانے پر درختوں کی کٹائی سے جنگلوں کی ہریالی تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ ایک حوصلہ پست کرنے والا تجربہ جبل پور پہنچ کر ہوا۔ یہاں دو ہفتہ قبل ہی زبردست زلزلہ کے سبب کافی نقصان ہوا تھا۔ 60 سے بھی زیادہ افراد مارے گئے تھے اور تقریباً 60 ہزار گھر یا تو منہدم ہو گئے تھے یا بری طرح برباد ہو گئے تھے۔ انیس گھنٹوں کی مشکل اور مسلسل یاترا کے بعد جب میں وہاں پہنچا تو میں نے پایا کہ راحت اور بازآبادکاری کے کام انتہائی سست رفتاری سے چل رہے تھے۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑا کہ 'ایسا لگ رہا ہے جیسے کہ زلزلہ اس مقام پر گزشتہ کل یا اس سے ایک دن پہلے ہی آیا ہو۔' اس تاریک پس منظر میں روشنی کی اگر کوئی کرن تھی تو وہ تھی راشٹریہ سویم سیوک سنگھ، بھارت سیوا سنگھ اور کچھ دیگر غیر سرکاری تنظیموں کے ذریعہ کیے گئے بازآبادکاری کے کام۔

یہ غم اور اضمحلال رات میں قیام کے لیے راج نند گاؤں ضلع کے ایک چھوٹے شہر کوردھا پہنچنے پر کافی کم ہو گیا۔ رات کے دو بج چکے تھے، پھر بھی قصبے کی تقریباً پوری 30 ہزار کی آبادی یاترا کے استقبال کے لیے سڑکوں پر اُمڈ آئی تھی۔ میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ 'آپ سب کا شکریہ ادا کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ آپ کی محبت اور جوش وخروش نے مجھے مغلوب کر دیا ہے۔ اس جوش وخروش کی مجھے ایک ہی وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ ہندوستان کے لوگ وطن عزیز کے تاریک سیاسی منظرنامے میں صرف بی جے پی کو امید کی کرن کے طور پر دیکھ رہے ہیں۔ اتفاق سے ڈاکٹر رمن سنگھ کوردھا سے بی جے پی کے ممبر اسمبلی تھے۔ اب وہ چھتیس گڑھ ریاست، جو 2000 میں مدھیہ پردیش کو تقسیم کر کے بنائی گئی تھی، کے وزیر اعلیٰ ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ بھوپال کی بھارت ہیوی الیکٹریکلس لمیٹڈ (بی ایچ ای ایل) کی کالونی میں یاترا کا پرتپاک استقبال کیا گیا تھا۔ یہ یاد کرتے ہوئے کہ وزیراعظم نہرو نے بی ایچ ای ایل اور دیگر اہم ترقیاتی منصوبوں کو 'جدید بھارت کے مندر' بتایا تھا۔ میں نے کہا کہ لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ اجودھیا میں رام مندر کی تعمیر کے لیے بی جے پی اس قدر بضد کیوں ہیں؟ میں ان سے کہتا ہوں کہ رام مندر کے لیے ہماری تحریک ایک ابھرتے ہوئے ایسے بھارت کا تصور جس میں ہماری قدیم تہذیب اور ثقافت کے اعلیٰ اقدار شامل ہوں گے، کا ہی ایک غیر منقطع اعضا ہے۔ اس نئے بھارت کی تعمیر کے لیے ہمیں ملک میں ایک نئے طریق تمدن اور کلچر پیدا کرنا ہوگا۔ ہم میں سے ہر ایک کو ملک و قوم کی ترقی کے پہیوں کو حرکت میں لانے کے لیے یکسوئی سے کام کرنا ہوگا۔ اگر ہم آج ایک دن میں 8 گھنٹے کام کرتے ہیں تو اب 9 گھنٹے کرنے کی ضرورت ہے۔ 7 گھنٹے کام کر کے ملک کی ترقی میں ہمارے اشتراک سے ایک گھنٹہ 'چرائیں' نہیں۔

اڑیسہ

بی جے پی کے مخالفین یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہماری پارٹی ایک صاحب ثروت سورنوں کی پارٹی ہے، جس کی غریبوں اور قبائلیوں میں کوئی پکڑ نہیں ہے۔ اس بات کا جواب اڑیسہ، وسطی اور مشرقی ہندوستان کے قبائلی علاقوں نے دیا ہے، جہاں بی جے پی نے حال ہی میں پارلیمانی اور اسمبلی دونوں انتخابات میں بہتر مظاہرہ کیا ہے۔

اڑیسہ میں مجھے جس بات نے متوجہ کیا وہ یہ تھا کہ جس فطری طریقے سے قبائلی عورتوں اور مردوں نے ہمارا استقبال کیا، اس میں کوئی گہرا مذہبی جذبہ شامل تھا۔ رتھ کو دیکھتے ہی وہ دوڑ کر اپنے جھونپڑوں سے باہر آتے اور ہاتھ جوڑ کر 'نمسکار' کرتے۔ ان کے چہروں پر عقیدت جھلک رہی تھی۔ جہاں جہاں بھی رتھ رُکا، خواتین نے آرتی اُلوک دھونی (منھ سے نکالی ہوئی شنکھ جیسی آواز، جس کا مقصد بری روحوں کو بھگانا ہوتا ہے) سے میرا استقبال کیا۔

جگناتھ پوری کی سالانہ رتھ یاترا کا اڑیسہ کے عوام کی اجتماعی زندگی میں کافی اہمیت ہونے کے سبب لفظ 'رتھ' ان کے لیے ایک نفسیاتی اور سماجیاتی معنی رکھتا ہے، اس لیے میری تقریروں میں مختلف فرقہ کے قبائلی اور غیر قبائلی لوگوں کے درمیان سماجی ہم آہنگی کا ذکر بار بار آتا تھا اور اس کے لیے میں نے ایک محاورہ بھی بنایا تھا— 'نہ ذات نہ پات/ جگناتھ کا بھات/ جگ پسارے ہاتھ'۔

دن کے آخری پڑاؤ پر نصف شب کو پہنچنا تقریباً پورے رتھ یاترا کا معمول بن گیا تھا۔ مجھے فکر لاحق ہوتی تھی کہ اتنی رات میں ہونے والے عوامی جلسہ میں بہت کم لوگ آئیں گے، لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا۔ مجھے یاد ہے کہ رتھ جب سنبھل پور پہنچا تو آدھی رات نکل چکی تھی۔ ایک عوامی سیلاب میرا انتظار کر رہا تھا، جس نے میرا گاتے ہوئے استقبال 'سواگتم، سواگتم - اڈوانی جی سواگتم' کہہ کر کیا۔ یہاں میں نے ایک مایہ ناز مقامی ہیرو اور اڑیسہ کے اوّلین مجاہدین آزادی میں ایک ویر سریندر سائی، جو 1884 میں ایک برٹش جیل میں شہید ہوئے تھے، کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔

میں یہاں یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ بھارت کی ان تمام ریاستوں میں، جہاں سے رتھ یاترا گزری تھی، اب تک کی سب سے اچھی سڑک تھی۔ 200 کلومیٹر لمبی سنبھل پور سے راؤڑکیلا تک کی سڑک۔ لارسن اینڈ ٹربو کے ذریعہ بنائی گئی یہ سڑک روڈ کی تعمیر میں پرائیویٹ سیکٹر کی حصہ داری کے تجربوں میں سے ایک تھی۔ راؤڑکیلا کی اپنی تقریر میں اس کا ذکر کرتے ہوئے میں نے کہا کہ 'ہمارے ملک میں ہمیں عالمی پیمانے کی

شاہراہ کیوں نہیں بنانی چاہیے؟ ہندوستان کے زیادہ تر حصوں میں سڑکوں کی اتنی خستہ حالی کیوں ہے؟ عام لوگوں کو ایک ٹیلی فون کنکشن یا گیس کنکشن لینے کے لیے رشوت کیوں دینی پڑتی ہے؟ ہمارے ملک میں زندگی کی بنیادی ضرورتوں کی چیزوں کی اتنی کمی کیوں ہے؟ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جب بی جے پی مرکز میں اقتدار میں آئے گی، تب ہم ان حالات کو تبدیل کردیں گے۔' میں نے یہاں اس بات کا ذکر اس لیے کیا کہ 1998 میں جب حکومت کی باگ ڈور واجپئی سرکار کے ہاتھوں میں آئی تو اس نے صحیح معنوں میں عالمی پیانے کی شاہراہ کے بنیادی ڈھانچے کی تعمیراتی کام شروع کردیا۔ ایک مواصلاتی انقلاب کا آغاز کیا اور ایل پی جی کنکشنوں کی سپلائی کی پریشانی کو دور کردیا۔

اڑیسہ یاترا میں میرے ساتھ میری معاون سشما سوراج بھی تھیں۔ ایک اعلیٰ پایہ کی وکیل سشما جی نے اپنی تقاریر میں اڑیسہ میں بی جے پی کے انتخابی امکانات کے بارے میں جو کچھ کہا وہ قابل ذکر ہے 'آپ کے استقبال کا شکریہ ادا کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ اڑیسہ میں داخل ہونے سے قبل جہاں بی جے پی اتنی مضبوط حالت میں نہیں ہے، ہم کچھ اندیشے میں تھے کہ یاترا کو کتنی حمایت ملے گی لیکن گذشتہ تین دن انتہائی حیرت انگیز رہے ہیں۔ سیاسی تبصرہ نگار اس بات پر بحث کرتے ہیں کہ کیا اس ریاست میں بی جے پی کا مینڈٹ بڑھا ہے تو اس کے ثبوت کے لیے انھیں زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں ہے، وہ ثبوت خود ہی سڑکوں پر اتر آیا ہے۔'

مغربی بنگال

یاترا کے تئیں لوگوں کی گرم جوشی مغربی بنگال میں اتنی ہی تھی جتنی کہ کیرل میں۔ نوجوان اور ضعیف، امیر اور غریب، قبائلی اور غیر قبائلی، رتھ کے استقبال کے لیے سبھی سڑک کے کنارے کھڑے تھے۔ بنگالی خواتین کی پاکیزگی سے میں خاص طور سے متاثر ہوا، جنھوں نے اڑیسہ کی عورتوں کی طرح ہی چاول، چندن، پھل اور ناریل بھری تھالی سے آرتی اتار کر رتھ کا استقبال کیا۔ میرا اس طرح کا استقبال دیگر ریاستوں میں بھی ہوا تھا، مگر جس طرح مغربی بنگال اور اڑیسہ کی خواتین نے سورن جینتی رتھ کا استقبال کیا، اس میں ان کی گہری عقیدت جھلک رہی تھی۔ رام رتھ یاترا کے وقت پورے ملک میں مجھے جو تجربہ ہوا تھا، یہ منظر اسی کی یاد دلاتا تھا۔

گوپی بلبھ پور کے نزدیک ایک گاؤں میں، میں نے ایک دوشیزہ کو ایک لمبا پھولوں کا ہار ہاتھ میں لیے تنہا کھڑا دیکھا۔ میں نے رتھ کو روکنے کے لیے کہا تاکہ وہ میرا استقبال کرے۔ وہ ایک سنتھالی لڑکی تھی جس کا نام کسم تھا اور جو کمل کے 108 پھولوں کی مالا لے کر آئی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا 'تم نے یہ کیوں بنایا؟' اس نے بنگلہ میں جواب دیا 'یہ اجودھیا بابا کے لیے ہے۔'

مغربی بنگال کے پانچ روزہ دورہ میں ہم 1340 کلومیٹر چلے۔ یاترا کے تئیں لوگوں کی گرم جوشی کے پس پردہ ایک بڑی وجہ تبدیلی کی قوی خواہش تھی۔ وہ 20 برسوں سے چلی آرہی کمیونسٹ حکومت، جس نے ہندوستان کی صنعت کاری میں سرفہرست رول نبھانے والے مغربی بنگال کو پسماندہ ریاستوں کی صف میں لاکھڑا کیا تھا، سے نجات حاصل کرنا چاہتے تھے۔

اس کے بعد میں شانتی نکیتن بھی گیا اور گرودیو رویندر ناتھ ٹیگور کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ 23 رجون کو بھارتیہ جن سنگھ کی بنیاد ڈالنے والے ڈاکٹر شیاما پرساد مکھرجی کے یوم شہادت کے موقع پر میں نے کلکتہ میں منعقد ایک خصوصی میٹنگ میں حصہ لیا۔ اس حقیقت کا ذکر کرتے ہوئے کہ ڈاکٹر مکھرجی ایک عظیم ماہر تعلیم تھے، جو 32 برس کی عمر میں کلکتہ یونیورسٹی کے سب سے نوجوان وائس چانسلر بن گئے تھے۔ میں نے کہا کہ 'ہندوستان کو ترقی پذیر ملک سے ایک ترقی یافتہ ملک میں تبدیل کرنے کے لیے پرائمری اور اعلیٰ دونوں سطحوں پر تعلیم کو فروغ دینا ہماری ترجیحات

بن جانی چاہیے۔' اپنی تمام تقریروں میں، میں نے بھارت کی تحریک آزادی میں بنگال کے مثالی اور دوررس رول کو یاد کیا۔ رام کرشن پرم ہنس، سوامی وویکانند اور مہرشی اروند جیسے سماجی اصلاح کاروں اور فلسفیوں کے لازوال پیغامات، بنکم چند چٹرجی کے 'وندے ماترم' کی دائمی اپیل، نیتاجی سبھاش چندر بوس کی آسمان کو چھونے والی حب الوطنی اور کھودی رام بوس اور دیگر لوگوں کی ترغیب دینے والی شہادت۔

میں نے اس قوم پرستی کی روایت سے آزادی سے قبل اور بعد میں کمیونسٹوں کے مسلسل فریبوں کا موازنہ کیا۔ 1942 میں قومی آزادی سے بے وفائی، جب کمیونسٹوں نے 'بھارت چھوڑو آندولن' کی مخالفت کی۔ 1947 میں قومی اتحاد کے ساتھ بدعہدی، جب 'مسلمانوں کے خودسر فیصلے' کے بہانے مسلم لیگ کی پاکستان کی مانگ کی حمایت، 1962 میں قومی تحفظ کے ساتھ دھوکہ، جب انھوں نے ہندوستان پر چینی حملے کو جائز ٹھہرایا، 1975 میں جمہوریت کے ساتھ دھوکہ، جب بھارتیہ کمیونسٹ پارٹی نے سرگرمی سے اندرا گاندھی کی ایمرجنسی والی حکومت کی حمایت کی اور سی پی آئی (ایم) نے اس حکومت کے تئیں خموشی اختیار کرلی اور 97-1996 میں رائے عامہ کے ساتھ بدعہدی، جب گیارہویں لوک سبھا کے انتخابات میں ووٹروں کے ذریعہ کانگریس کو نامنظور کردیئے جانے کے باوجود انھوں نے کانگریس کو پچھلے دروازہ سے اقتدار حاصل کرنے میں مدد کی۔

پوری دنیا میں کمیونسٹوں کی سامراجیت کے ختم ہونے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے میں نے کہا کہ مارکسوادیوں کے ذریعہ خوداحتسابی کرنے سے انکار نے انھیں ہمیشہ خودتصدیق کی خاطر شیطانیت کی جستجو کے لیے آمادہ کیا ہے۔ کمیونسٹوں نے اب ایک نئے 'دانو' بھارتیہ جنتا پارٹی کی تلاش کی ہے۔ دراصل کمیونسٹ اور کانگریس بی جے پی مخالف سیاست میں دوست بن گئے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ بنگال کے عوام اس کھیل کو سمجھیں گے۔ جب تک بنگال قوم پرستی کی جانب نہیں لوٹے گا، تب تک عظیم ملک بننے کی طرف ہندوستان کے قدم میں تیزی نہیں آئے گی۔

بہار

لالو پرساد یادو کے راشٹریہ جنتادل کے پندرہ سال (2005-1990) دورحکومت کے دوران 'بہار' جنگل راج کی مانند تھا۔ یاترا کا یہ پیغام کہ بی جے پی بہار سے جنگل راج کا خاتمہ کرکے بدعنوانی سے پاک صاف ستھری سرکار دینے کے لیے کوشاں ہے، لوگوں کے دلوں کو چھولیا۔ بنگال سرحد کے پورنیہ سے اترپردیش کی سرحد بکسر تک 1300 کلومیٹر کی لمبی مسافت میں ہوئے عوامی جلسوں اور سڑک کے کنارے استقبالیہ تقاریب میں لاکھوں لوگوں نے حصہ لیا۔ ان کا نعرہ 'بھرشٹاچاری گدی چھوڑو' بہار کی خستہ حالت پر ایک جذباتی تبصرہ تھا۔

بہار کی میری یاترا میں دو باتیں قابل توجہ تھیں۔ ایک سڑکوں کی خستہ حالی (جن کا موازنہ صرف بنگال کی سڑکوں سے کی جاسکتی تھی) اور دوسرے ریاست کے زیادہ تر حصوں میں رات میں بجلی کا غائب رہنا۔ جنریٹر کی مدد سے صرف وہ اسٹیج منور کردیا جاتا تھا جہاں سے مجھے تقریر کرنا ہوتی تھی، لیکن میں لوگوں کو بہ مشکل ہی دیکھ پاتا تھا۔ ان کی موجودگی کا پتہ صرف ان کے زوردار نعروں سے ہوتا تھا۔

بہار یاترا کے دوران ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی میں ریاست کے ممتاز مجاہد آزادی رہے کنور سنگھ کی جائے پیدائش جگدیش پور جانے کا موقع ملا۔ کنور سنگھ کی آبائی رہائش کی بدحالی دیکھ کر مجھے گہرا صدمہ ہوا۔ اس کا ایک حصہ جانوروں کی رہائش گاہ بنادیا گیا تھا۔ سہسرام کے باہری علاقے میں میرا تجربہ کچھ کم مایوس کن نہیں رہا جہاں میں ویر کنور سنگھ کے ایک حامی شہید نشان سنگھ وڈی کو خراجِ عقیدت پیش کرنے گیا تھا۔ انگریزوں نے نشان سنگھ کو پکڑلیا تھا اور انھیں توپ کے منھ سے باندھ کر اڑادیا تھا۔ ان کی یاد میں 'نشان نکیتن واچنالیہ' نامی ایک کتب خانہ قائم کیا گیا تھا، لیکن جب میں وہاں گیا تو کتب خانہ میں کتابوں کی ایک بھی الماری نظر نہیں آئی، یہاں تک کہ کتب خانہ کے تین ملازمین کو کئی مہینوں سے تنخواہ بھی نہیں ملی تھی۔

مجھے اورنگ آباد کے نواحی حصہ میں واقع اوبرا نامی قصبہ کی یاد تازہ ہے، جہاں بارش کے باوجود مجھے ایک شہید اسمارک پر گلہائے عقیدت پیش کرتے ہوئے دیکھنے کے لیے ہزاروں لوگ جمع ہو گئے تھے۔ وہ اسمارک ایک مقامی نوجوان جگ پتی کمار کی یاد میں بنایا گیا تھا، جو اپنے 6 محب وطن ساتھیوں کے ساتھ پٹنہ اسمبلی میں ترنگا لہرانے کی کوشش کرتے ہوئے 11 راگست 1942 کو برٹش پولس کے ذریعہ بندوق کی گولی سے شہید کردیئے گئے تھے۔ اس موقع پر اپنی تقریر میں، میں نے حاضرین سے اس سوال پر غور وفکر کرنے کے لیے کہا 'جنگ آزادی کے ہمارے معروف اور غیر معروف ہیرو کیا اسی طرح کا جنگل راج دیکھنے کے لیے انگریزوں کی حکومت سے نجات پانا چاہتے تھے، جیسا آپ کی ریاست میں دکھائی دیتا ہے؟ 60 کی دہائی کے آغاز تک بہار کا شمار خوشحال ریاستوں میں ہوتا تھا، اب کیوں سب سے زیادہ غریب اور جنگل راج بن گیا ہے؟ میرے خیال میں اس زوال کے تین اسباب ہیں: بدعنوانی، جرائم اور ذات پات دکھ کی بات یہ ہے کہ بہار پر حکمرانی جن لوگوں کے ذریعہ کی جارہی ہے وہ 1947 سے اب تک ہندوستان کے سب سے مضبوط بدعنوان مخالف تحریک جے پی تحریک کی اُپج ہے۔ آیئے ہم سب مل کر بہار کو ان تینوں جان لیوا بیماریوں سے نجات دلائیں اور اس کے شاندار ماضی کی طرح ایک صحت منداور خوش حال ریاست بنائیں'۔

ریاست کے قبائلی اکثریتی علاقوں سے گزرتے وقت میں نے شہنشاہیت مخالف لڑائی کی مثال بن چکے قبائلی انقلابی برسا منڈا کے ترغیب دینے والے رول کی تعریف کی۔ بہار میں ہی میں نے ریاست کے جدید دور کے دو دیگر عظیم سپوتوں ڈاکٹر راجندر پرساد اور لوک مانیہ جے پرکاش نارائن کو بھی خراج عقیدت پیش کیا۔

آندھرا پردیش کی طرح بہار میں بھی نکسلیوں نے یاترا پر حملے کی دھمکی دی تھی، لیکن بہار کے نکسل متاثرہ علاقوں میں بھی میرا پیغام وہی تھا کہ 'سماج کی برائیوں کو ختم کرنے کا راستہ بندوق کی گولی نہیں بلکہ ووٹ باکس ہے۔ دنیا میں کہیں بھی گولیوں کی سیاست نے مسئلہ کو حل نہیں کیا ہے، اس لیے آیئے! ہم اپنے ملک کے جمہوری سسٹم کو مضبوط بنائیں اور اپنے سامنے کھڑے مسائل کو مل جل کر دور کریں'۔

اتر پردیش

یکم جولائی کی شب میں یاترا بہار سے اتر پردیش کے سرحدی ضلع بلیا، جو 1857 کی پہلی جنگ آزادی کے پہلے شہید منگل پانڈے کی جائے پیدائش ہے، میں داخل ہوئی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے بنگال نیٹو انفنٹری کے ایک سپاہی منگل پانڈے نے اپنے ہندو اور مسلم ساتھی سپاہیوں سے 'انگریز' جو تاجر کے طور پر آئے اور حکمراں بن بیٹھے، کے خلاف بغاوت کرنے کی اپیل کی۔ اس سرزمین پر قدم رکھتے ہوئے میں نے خود کو خوش قسمت محسوس کیا جو 1857 کا اہم میدان جنگ تھا۔ وہی سرزمین جو منگل پانڈے، جھانسی کی رانی لکشمی بائی، چندر شیکھر آزاد اور لاتعداد دیگر شہیدوں کی قربانی سے پاک ہوگئی تھی۔

میں نے اپنی تقریروں میں کہا کہ ہندوستان کی دیگر ریاستوں کی طرح اتر پردیش میں بھی مختلف خیالات کے لوگوں نے ایک ہی نصب العین کے لیے مل جل کر کام کیا تھا۔ یہ تفریق کانگریس پارٹی میں دکھائی دیتی تھی۔ اس نے پنڈت نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد، پنڈت مدن موہن مالویہ، پرشوتم داس ٹنڈن اور ڈاکٹر رام منوہر لوہیا کو ایک ہی اسٹیج پر لا کھڑا کیا تھا۔ میں نے کہا کہ سورن جینتی سال میں ان عظیم لیڈروں کو یاد کرنے کا بہتر طریقہ یہی ہوگا کہ تمام سیاسی پارٹیاں کچھ عام قومی مقاصد کے تئیں سپرد ہوں۔

میری یاترا کے سب سے بڑے عوامی جلسوں میں سے ایک جلسہ شاہجہاں پور میں ہوا۔ وسطی اتر پردیش کا یہ شہر جنگ آزادی کے تین

غیر معمولی شہیدوں کی یاد سے منسلک ہے۔ پنڈت رام پرساد بسمل، اشفاق اللہ خاں اور ٹھاکر روشن سنگھ۔ انھیں کاکوری سازش معاملہ* میں سزا دی گئی تھی۔ جیسے ہی میں نے ایک چوراہے کے پاس واقع پارک میں ان تینوں نوجوان انقلابیوں کے مجسموں پر گل پوشی کی 'امر شہیدوں کا بلیدان۔ یادر کھے گا ہندوستان' کے نعروں سے آسمان گونج اٹھا۔

ان تینوں کی جوڑی نے حب الوطنی سے سرشار جرأت اور حوصلے کی واقعی ایک یادگار مثال پیش کی تھی۔ رام پرساد بسمل ایک شاعر اور انقلابی دونوں تھے۔ 19 اگست 1927 کو جب وہ صرف 30 سال کے تھے، گورکھپور جیل میں انھیں پھانسی دے دی گئی۔ اگرچہ ان کی زندگی کا خاتمہ ہوگیا، لیکن ان کا یہ شعر — 'سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے۔ دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے' ہمیں ترغیب دیتا ہے۔ چار ماہ بعد ان کے شاعر دوست اور ساتھی انقلابی اشفاق اللہ خاں کو فیض آباد جیل میں پھانسی دے دی گئی۔ انھوں نے پھانسی کے پھندے کو چوم کر بہ آواز بلند کہا کہ 'بہت برسوں سے میری ماں میرے پیچھے پڑی تھیں کہ میں شادی کرلوں۔ میں ہمیشہ یہ کہہ کر انکار کرتا رہا کہ مجھے اب تک من پسند دلہن نہیں ملی ہے۔ ماں آج آپ کو خوش ہونا چاہیے کہ مجھے میری پسند کی دلہن مل گئی ہے۔' اس کے بعد انھوں نے پھانسی کا پھندہ اپنے گلے میں ڈالا اور خدا اور بھارت ماتا کا نام لیتے ہوئے آخری سانس لی۔ اشفاق اللہ خاں جس دن پھانسی پر چڑھے اسی دن شاہجہاں پور کے تیسرے سپوت ٹھاکر روشن سنگھ کو نینی جیل میں پھانسی دے دی گئی۔ گیتا کو اپنے ہاتھوں میں لیے ان کے آخری لفظ تھے 'وندے ماترم'۔

3 جولائی کو رتھ جب اجودھیا پہنچا تو مجھے تعجب ہوا کہ 'میری یاترا کا یہ سب سے اہم دن ہے۔ رام رتھ یاترا اور سورن جینتی رتھ یاترا دونوں کے درمیان مجھے ایک فطری لگاؤ دکھائی دیتا تھا، جس کی وضاحت میں نے سرجوندی کے نوتعمیر خوبصورت ساحل پر منعقد ایک عوامی جلسہ میں کی۔ 1990 کی میری یاترا کا مقصد ایک عالیشان رام مندر کی تعمیر تھا۔ 1997 کی اس یاترا کا مقصد اتنے ہی عالیشان 'قومی مندر' کی تعمیر کے لیے لوگوں کو تیار کرنا ہے۔ اسے بار آور کرنے کے لیے ہمیں اپنی 'رام بھگتی' کو 'راشٹر بھگتی' کی راہ میں لگانا ہوگا۔

اجلاس کے بعد میں اجودھیا تحریک کے ہیرو کلیان سنگھ، پارٹی کے دیگر معاونین اور دوستوں کے ساتھ رام جنم بھومی میں واقع عارضی رام مندر میں پوجا کے لیے گیا۔ یہاں میرا من عارضی جذبات سے لبریز ہوگیا۔ ایک طرف تو میں خوش تھا کہ اجودھیا تحریک کی جزوی کامیابی کی سند کی شکل میں بھگوان رام کی جنم بھومی پر ایک غیر مستحکم مندر کھڑا تھا وہیں دوسری جانب یہ دیکھ کر تکلیف بھی ہوتی تھی کہ مندر احاطہ جواب مرکزی سرکار کے کنٹرول میں تھا، کی سخت گھیرابندی کردی گئی تھی اور کافی تعداد میں ہر طرف سیکورٹی اہلکار تعینات تھے۔ میں اپنے کرب کو ظاہر کیے بغیر رہ نہ سکا اور کہا کہ 'منصوبہ کے مطابق رام مندر کی تعمیر میں بلاشبہ وقت لگے گا، لیکن ایک عارضی مندر کو اس طرح سیکورٹی کے گھیرے میں رکھنے کا کیا مطلب؟' میں نے مزید کہا کہ 'جنم بھومی پر مندر پہلے ہی بنا ہوا ہے اور عقیدت مند وہاں رام للا کی دیدار کے لیے جاتے ہیں۔ دنیا کی کوئی بھی طاقت اب اس حالت کو پلٹ نہیں سکتی، لیکن انھیں اس وقت تک خوشی نہیں ملے گی جب تک یہ گھیرابندی ختم نہیں کردی جاتی اور مقام کی اہمیت کے موافق مندر کی تعمیر نہیں ہو جاتی'۔

3 جولائی کی ہی رات کو وہ دوسرا یادگار لمحہ آیا جب یاترا اٹل بہاری واجپئی کے انتخابی حلقہ میں داخل ہوئی اور وہ خود اس کے استقبال کے لیے وہاں پہنچے۔ میرے لیے وہ ایک جذباتی لمحہ تھا جب میں اپنے دیرینہ معاون اور لیڈر سے گلے ملا۔ ہم دونوں ہی رتھ پر سوار ہوکر بیگم حضرت

---

* کاکوری سانحہ برٹش سرکار کے ذریعہ انقلابیوں کو جھوٹے معاملوں میں پھنسانے کے سلسلہ کی ایک کڑی تھا، جس میں 9 اگست 1925 کو لکھنؤ کے نزدیک کاکوری میں ٹرین لوٹنے کے ایک جھوٹے معاملہ میں 25 محب وطن کو پھنسایا گیا۔

محل پارک پہنچے، جہاں ہم نے ایک عظیم الشان اجلاس کو خطاب کیا۔ اس وقت حال ہی میں لکھنؤ میں شیعہ-سنی تنازع ہوا تھا اور شہر کے کئی حصوں میں اب بھی کرفیو لگا ہوا تھا۔ اٹل جی اور میں نے دونوں فرقوں اور متعلقہ مسلمانوں سے غلط فہمی دور کرنے کی اپیل کی۔ جلسہ کے ختم ہونے پر اتر پردیش کی وزیر اعلیٰ مایاوتی جو اس وقت بھاجپا-بسپا کی متحد سرکار کی سربراہ تھیں، ریاستی مہمان خانہ، جہاں میں رات میں آرام کے لیے ٹھہرا تھا، میں آئیں اور انھوں نے گرم جوشی سے میرا استقبال کیا۔

ریاست میں میری 6 روزہ یاترا نے مجھے عوامی رابطے کا بے پناہ موقع دیا۔ اتر پردیش میں اپنی مہم کو ملی زبردست حمایت سے میں خاص طور سے خوش تھا، کیونکہ رام رتھ یاترا کے دوران میں اس ریاست میں نہیں آسکا تھا۔ اجودھیا پہنچنے سے قبل ہی اسے بہار میں روک لیا گیا تھا۔ 1997 کی اتر پردیش یاترا کی حصولیابی یہ تھی کہ کانگریس پارٹی کے ذریعہ اپنی رائے عامہ اور جملہ سیاق دونوں کھودینے کے سبب اتر پردیش کی عظیم الشان قوم پرست وراثت کے سچے وارث کی شکل میں بھاجپا ابھر کر سامنے آئی تھی۔

ہماچل پردیش

ہماچل کی وادی میں بسی اس خوبصورت ریاست کی گھماؤ دار سڑکوں پر یاترا کرنا بہت دلکش تھا۔ شملہ شاہراہ پر واقع تمام شہر اور بستی کے لوگوں نے ہمارا گرم جوشی سے استقبال کیا۔ ان میں سے زیادہ تر مقامات پر مقامی پارٹی کارکنان نے باحیات مجاہدین آزادی، جنگ کے بہادروں، یہاں تک کہ جنگ میں شہید ہوئے سپاہیوں کی بیوہ کو میرے ذریعہ عزت افزائی کیے جانے کا انتظام کیا تھا۔ راستے میں ہماچل پردیش کے سابق وزیر اعلیٰ ڈاکٹر شانتا کمار، جو میرے ساتھ ہی یاترا کر رہے تھے، نے مشورہ دیا کہ میں ہندی کے مشہور و معروف ناول نگار اور شہید بھگت سنگھ کے معاون انقلابی یشپال کو ان کی جائے پیدائش ہمیر پور ضلع کے بھوم پال گاؤں جا کر خراج عقیدت پیش کروں۔ شانتا کمار جو خود بھی ہندی کے ایک معروف ادیب ہیں، یشپال کو اچھی طرح جانتے تھے اور انھوں نے یشپال جی کے آبائی گاؤں میں ان کا ایک خوبصورت مقبرہ بنوا دیا تھا۔

جموں و کشمیر

میرے لیے وہ ایک بہت ہی جذباتی لمحہ تھا، جب رتھ لکھن پور کے پاس راوی ندی پر پنجاب کی سرحد پار کر کے جموں و کشمیر میں داخل ہوا۔ یہی وہ مقام تھا جہاں جموں و کشمیر صوبہ کے ہندوستانی وفاق میں انضمام کی ہماری پارٹی کی مانگ کو ملک کے سامنے رکھنے کے مقصد سے 1953 میں بھارتیہ جن سنگھ کے بانی ڈاکٹر شیاما پرساد مکھر جی کو ریاست میں بغیر اجازت کے داخل ہونے کے جرم میں شیخ عبداللہ سرکار کے ذریعہ گرفتار کر لیا گیا تھا۔ 1997 میں گجرال سرکار وادیٔ کشمیر کی انتہا پسند جماعتوں کے ساتھ سمجھوتے کی حالت میں تھی، یہاں تک کہ جموں و کشمیر میں 1953 سے قبل کی حالت بحال کرنے کی بات بھی اٹھائی گئی تھی۔ لکھن پور میں ایک عظیم الشان اجلاس کو خطاب کرتے ہوئے میں نے اس تجویز کی سخت مذمت کی اور کہا کہ 'اس کے معنی تاریخ کی گھڑی کے کانٹوں کو مخالف سمت میں گھمانے کے مترادف ہے اور سری نگر میں ڈاکٹر مکھر جی کی قربانی کی بے عزتی کرنا بھی ہوگا۔ قوم کو جس چیز کی ضرورت ہے، وہ ہے آئین کے آرٹیکل 370 کو رد کر کے جموں و کشمیر کا ہندوستان میں مکمل انضمام'۔

جموں کے لیے کوچ کرنے سے قبل یاترا جن سنگھ کے 1953 میں کشمیر ستیہ گرہ کے دو شہیدوں بہاری لال اور بھیکم سنگھ کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے ہیرا نگر میں رُکی جنھیں بھارت کی سرزمین پر بھارتیہ پرچم لہرانے کی کوشش میں گولی ماردی گئی تھی۔

پنجاب

ہندوستان کی آزادی کے لیے کی گئی شاندار جدوجہد میں ملک کی ہر ریاست نے اپنا تعاون دیا تھا۔ جب میری یاترا پنجاب پہنچی تو مجھے محسوس ہوا کہ میں نے اس سرزمین پر قدم رکھا ہے جو قربانی کی مثال ہے۔ جنگ آزادی کے شہیدوں میں اکثریت پنجاب کی تھی۔ 1857 میں 2646 حب الوطنوں کو کالا پانی کی سزا دی گئی تھی۔ ان میں 2147 محب وطن پنجاب کے تھے۔ حال کے برسوں میں پنجاب وہ ریاست ہے جہاں بھڑکانے والی بے پناہ کارروائیوں کے باوجود پاک حامی علیحدگی پسند خالصتان کی کمر توڑنے میں ہندوؤں اور سکھوں دونوں فرقوں نے قابل تقلید اتحاد کا مظاہرہ کیا ہے۔

سورن جینتی رتھ 11 رجولائی کو جیسے ہی راوی ندی پار کر کے جموں سے مادھوپور میں داخل ہوا، بھاجپا اور اکالی لیڈروں کی ایک بڑی جماعت نے اس کا استقبال کیا۔ اس موقع پر دو نعرے 'جو بولے سو نہال - ست شری اکال' اور 'جے شری رام' ریاست میں بی جے پی - اکالی اتحاد کے گہرے سماجی بنیاد کے مظہر تھے۔ ریاست کے ہردلعزیز وزیر اعلیٰ پرکاش سنگھ بادل پنجاب کی تقریباً تمام یاترا میں میرے ہم سفر رہے۔ راستے میں آنے والے ہر شہر میں سکھوں اور ہندوؤں کی لمبی قطاریں تھیں جو خوشی سے ہاتھ ہلا کر چلا رہے تھے — 'ہندو - سکھ ایکتا زندہ باد' اور 'پنجابی بھائی چارہ امر رہے'۔

یہاں میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ 'مجھے پنجاب کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی پاکیزگی کا احساس ہوتا ہے۔ اگر کسی کو ہندو - سکھ اتحاد کو مجسم دیکھنا ہو تو وہ سورن جینتی سال کے بھاجپا اور اکالی دل کی مشترکہ یادگار تقریب کی شکل میں یہاں موجود ہے۔' اس موقع پر بادل نے کہا کہ 'شری آڈوانی جی کے تئیں اظہار تشکر کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ ہماری آزادی کی 50 ویں سال گرہ منانے کے لیے سورن جینتی رتھ یاترا نکال کر انھوں نے واقعی قوم کی روح کو بیدار کر دیا ہے۔'

اس وقت تک خالصتانی دہشت گردی پنجاب میں پوری طرح ختم نہیں ہوئی تھی۔ ایک ہفتہ قبل ہی بھٹنڈہ کے پاس ایک ٹرین میں ہوئے دھماکے میں تین مسافروں کی موت ہو گئی تھی۔ ایک دیگر واقعہ میں ایک مندر میں ایک طاقتور بم پایا گیا تھا۔ ان واقعات کا حوالہ دیتے ہوئے بادل نے کہا کہ 'آج میں کھل کر کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ ان سازشوں کے پس پردہ کون ہیں؟ اس طرح کے مذموم فعل عام مجرموں کے ذریعہ نہیں کیے جا سکتے۔ صرف وہی جو ہمارے ملک کے دشمن ہیں اور جنہیں سرحد پار کے ہمارے ملک کے دشمنوں کے ذریعہ مدد مل رہی ہے، اس طرح کی سرگرمیوں میں شامل ہو سکتے ہیں۔' امرتسر میں، میں تیرتھ یاترا کے دو مقامات پر گیا۔ ایک روحانی اور دوسرا حب الوطنی سے سرشار دونوں ایک دوسرے کے بالکل قریب تھے۔ میں ہرمندر صاحب میں پرارتھنا کرنے کے لیے سورن مندر گیا۔ وہاں سے میں جلیانوالا باغ میں تقریباً 1500 لوگوں کو خراج عقیدت پیش کرنے گیا جو 13 راپریل 1919 کو شہید ہو گئے تھے۔ یہ واقعہ ہندوستان میں برٹش دور حکومت کے دوران سامراج وادی قتل سانحہ کی سب سے ذلیل مثال ہے۔ خاص طور سے اس حقیقت سے اطمینان تھا کہ اپنی یاترا کے دوران میں سکھوں کے تین سب سے پاکیزہ گردواروں میں جا پایا تھا۔ مہاراشٹر میں ناندیڑ، بہار میں پٹنہ اور اب امرتسر۔

میں نے موگا ضلع کے ڈھڑ کے گاؤں کا دورہ کیا پنجاب جہاں 'کیسری' لالہ لاجپت رائے (1928-1865) کا جنم ہوا تھا۔ وہ لاہور میں شہید ہوئے، جہاں سائمن کمیشن کے خلاف ایک مظاہرہ کی قیادت کرتے وقت ان پر لاٹھیوں سے حملے کیے گئے تھے۔ اپنی آخری سانس لینے سے

قبل انھوں نے کہا 'میرے جسم پر لگایا گیا ایک ایک زخم برٹش شہنشاہیت کے تابوت میں لگائی گئی کیل ہے۔' مقبرہ پر رکھی گئی وزیٹرس بک میں، میں نے لکھا کہ '20 ویں صدی اب اختتام کی جانب گامزن ہے، جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے، اس صدی کی پہلی دو دہائی لال- بال- پال کے دبدبہ میں رہی۔ اس ٹکڑی کی پہلی شخصیت محب وطن لالہ لاجپت رائے تھے جو برٹش پولس کی لاٹھیوں کے حملے میں شہید ہو گئے، لیکن اس معاملہ میں وہ برٹش سامراج کے زوال کا آغاز بھی کر گئے۔ میں اس عظیم شخصیت کی پاک سرزمین پر آ کر خود کو خوش قسمت سمجھتا ہوں۔'

اسی دن میری یاترا فیروزپور ضلع کے حسینی والا پہنچی جو ہندوستان- پاکستان سرحد کے بالکل قریب واقع ہے۔ یہاں جنگ آزادی کے تین اَمر شہیدوں کا مقبرہ ہے۔ بھگت سنگھ، سکھدیو اور راج گرو، جنہیں برطانوی حکومت نے لاہور سازش کیس معاملہ میں سزا سنائی تھی۔ 21 /مارچ 1931 کو لاہور سینٹرل جیل میں پھانسی دے کر قریب کے حسینی والا گاؤں میں رات کے سناٹے میں ان کی آخری رسومات ادا کر دی گئی تھیں۔ ان مقبروں کے سامنے کھڑا ہو کر میں نے خود سے کہا کہ 'ان نوجوان انقلابیوں کی قربانی کو ہندوستان کیسے فراموش کر سکتا ہے جنھوں نے ہنستے ہنستے موت کو گلے لگا لیا تھا۔'

ہریانہ

دہلی میں یاترا کے اختتام سے قبل ہریانہ ہماری آخری منزل تھا۔ ریاست کے دو مقامات کا دورہ اب تک میرے ذہن و دل میں جاگزیں ہے۔ پہلا مہابھارت کا میدانِ جنگ کروکشیتر۔ مندروں کے اس شہر میں کئی مقامات دیکھنے کے بعد ایک عظیم الشان عوامی جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے میں نے کہا کہ 'کروکشیتر کے نام کا تلفظ ہی دل میں پاکیزگی کا احساس دلاتا ہے۔ یہاں بھگوان شری کرشن نے ارجن کو برائی پر اچھائی کی جیت کا پیغام دیا تھا۔ آج ہندوستان کی آزادی کی سورن جینتی کے موقع پر ہم سب مہابھارت کے اس پیغام کو اپنے باطن میں محفوظ کر لیں۔'

دوسرا مقام بہادر گڑھ تھا جہاں یاترا کو الوداع کہنے کے لیے ہزاروں کسان جمع ہوئے تھے۔ بہادر گڑھ کا نام مغلیہ سلطنت کے آخری بادشاہ اور آزاد ہندوستان کے پہلے حکمراں بہادر شاہ ظفر، جنہیں 1857 میں دہلی کو انگریزوں سے آزاد کرانے کے بعد کچھ وقت کے لیے تخت پر بٹھا دیا گیا تھا، کے نام پر رکھا گیا تھا۔ 1857 کے محب وطن سپاہی جب دہلی کو آزاد کرانے کے لیے آگے بڑھے تو ان کا ایک مشہور نعرہ 'دِلّی اب دور نہیں' تھا۔ میں نے اپنی تقریر میں اس کا ذکر کرتے ہوئے تبصرہ کیا کہ جہاں تک بی جے پی کا مرکزی اقتدار کی جانب قدم بڑھانے کا تعلق ہے تو 'نئی دلّی اب دور نہیں' ہماری پارٹی نے دلّی میں پہلے ہی اقتدار پر قبضہ جما لیا ہے۔ جب بھی پارلیمانی انتخابات ہوں گے، بھاجپا دلّی سے نئی دلّی کا سفر بخوبی پورا کر لے گی۔

دلّی

15 /جولائی کو سورن جینتی رتھ یاترا دلّی میں داخل ہوا۔ ٹھیک ایک ماہ بعد ہندوستان کو اپنی آزادی کی سورن جینتی منانی تھی۔ راستے میں، ہر گلی میں ہوئے پُرجوش استقبال کے بعد جیسے ہی لال قلعہ کے تاریخی میدان پر یاترا اپنے اختتام کو پہنچی، اس یادگار تقریب میں اپنا چھوٹا سا لیکن کامیاب اور بامعنی اشتراک پورا کر لینے کا اطمینان تھا۔ اس مہم کا شاندار اختتام چاندنی چوک کے ایک عوامی جلسہ سے ہوا جس میں ان سب کو

جنھوں نے اسے کامیاب اور یادگار بنانے میں اپنا تعاون دیا تھا، انھیں دل کی گہرائیوں سے مبارکباد دینے کے علاوہ میرے پاس کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں باقی رہ گیا تھا۔

''ایئر کنڈیشنڈ سہولتیں''

یاترا شروع ہونے سے چند روز قبل ایک انگریزی قومی روزنامہ نے 'ایئر کنڈیشنڈ سہولت سے پُر گاڑی سے آڈوانی کی گرما گرم تقریر' کے عنوان سے ایک خبر شائع کی تھی۔ یاترا شروع ہونے کے کچھ دنوں بعد ہی وہ صحافی جنھوں نے میرے ساتھ کچھ ہی دوری تک سفر کیا تھا، مجھ سے پوچھنے لگے کہ آپ اتنا دشوار کن سفر ہر دن کیسے کر پاتے ہیں؟ گاڑی کے اندر کیبن میں آرام کرنے کے لیے ایک پلنگ ضرور تھا، لیکن اس جھٹکے کھاتے ٹرک پر کوئی جھپکی لے سکے، اتنا بھی آرام دہ نہیں تھا۔ جو بھی ہو، یاترا میں زیادہ تر مجھے رتھ کے سامنے والے حصہ میں موجود رہنا پڑتا تھا تاکہ لوگ مجھے دیکھ سکیں۔ یاترا کے دوران دن کا آخری جلسہ شاید ہی کبھی نصف رات سے پہلے ختم ہوا ہوگا۔ 23 /جون کو میں کلکتہ اتنی تاخیر سے پہنچا کہ ایک جلسہ کو میں نے صبح 3:30 بجے خطاب کیا۔ پچھلی رات کو چاہے جتنی بھی دیر ہو جائے لیکن دوسرے دن کے مقررہ پروگرام میں شاید ہی تبدیلی کی گئی ہوگی۔ پریس کانفرنس 8:30 بجے اور روانگی 9:00 یا 9:30 بجے۔ کیرل میں جہاں شمال سے جنوب تک سڑک کے دونوں جانب خاصی آبادی ہے، استقبال کا سلسلہ ختم ہی نہیں ہوتا تھا۔ مجھے مسلسل تین روز تک رتھ پر کھڑے رہنا پڑا۔ اس یاترا کے آخر میں میرے پیروں میں کافی سوجن آگئی تھی جسے ڈاکٹروں نے 'اسٹینڈنگ اوڈیما' بتایا۔

ان صحافیوں کے ذریعہ جو رتھ پر میرا انٹرویو لینے کے لیے آتے تھے، ایک سوال اکثر پوچھا جاتا تھا کہ 'اتنے دنوں سے سڑک یاترا کرنے اور صبح سے لے کر نصف شب تک اتنے جلسوں میں تقریر کرتے ہوئے آپ تھک نہیں جاتے؟' میں ان کو جواب دیتا تھا کہ بھگوان کی مہربانی سے 70 برس کی عمر میں بھی میں اچھی صحت کا مزہ لے رہا ہوں۔ ہاں کبھی کبھی میں تکان اس وقت محسوس کرتا ہوں جب اگلی صبح کسی اخبار میں پڑھتا ہوں کہ یاترا کا سرد مہری سے استقبال ہوا۔

میں اپنے ساتھ چل رہے صحافیوں کو شاعر اعظم کالی داس کے اس قول کے بارے میں بھی بتاتا جس کی سچائی کو میں نے یاترا کے دوران کئی مرتبہ محسوس کیا تھا۔ وہ قول یوں ہے ''کلیشن: پھلین ہی پونرنوتن ودھاتے۔' (یعنی جسم کی ساری تکالیف دور ہو جاتی ہیں اور اسے اس وقت نئی زندگی مل جاتی ہے، جب ہاتھ میں لیا گیا کام ثمر آور یا منافع بخش ہوتا ہے۔) یہ مجھے میرے اسکالر دوست آنجہانی پروفیسر وشنو کانت شاستری★ نے بتایا تھا، جو یاترا میں کافی وقت تک میرے ساتھ رہے تھے۔

اس یاترا اور دوران الیکشن انتخابی مہموں نے مجھے اس بات کا احساس دلا دیا کہ سیاسی کارکنان اور لیڈروں کے لیے اچھی صحت اور طاقت کی کتنی اہمیت ہے۔ میرے 20 برس کے ہونے کے فوراً بعد ہی سنگھ کے ایک مبلغ کے طور پر راجستھان میں گزارے سخت 10 برس ہمیشہ میرے کام آئے ہیں۔ اس لیے سیاست میں آئے نوجوانوں سے میرا کہنا ہے کہ وہ اپنی صحت کا پورا خیال رکھیں۔

★ پروفیسر وشنو کانت شاستری (1925-2005) بی جے پی کے قومی نائب صدر اور اتر پردیش کے گورنر تھے۔ وہ ہندی اور بنگلہ زبان کے معروف اسکالر تھے۔

یاترا کا غیر جانبدانہ پیغام

میں نہایت ہی انکسار سے کہنا چاہوں گا کہ سورن جینتی رتھ یاترا جنگ آزادی کی شاندار وراثت کو غیر جانبدار اور منظم طریقے سے پیش کرنے کے 1947 سے اب تک کی بہت کم سیاسی مہموں میں سے ایک رہی ہے۔ میں نے اپنی تقاریر میں بار بار اس بات پر زور دیا کہ ہندوستان کی جنگ آزادی مختلف خیالات اور حکمت عملیوں کی سنگم رہی ہے۔ لاتعداد مرد و خواتین نے گاندھی جی کے عدم تشدد ستیہ گرہ کی راہ اختیار کی اور درحقیقت یہی تحریک آزادی کی مین اسٹریم تھی، لیکن بھگت سنگھ اور نیتا جی سبھاش چندر بوس جیسے دیگر لوگ بھی تھے جنھوں نے مسلح فوج کی تشکیل کی۔ مہارشی اروند جیسے سنت بھی تھے جنھوں نے انقلابی سرگرمیوں کو چھوڑ کر روحانیت کے ذریعہ قوم کو بیدار کرنے کی کوشش کی۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر کیشو بلرام ہیڈگوار جیسے لوگ بھی تھے جنھوں نے کانگریس پارٹی میں لیڈر کا عہدہ چھوڑ کر نوجوانوں کی حب الوطنی سے پُر اِنرجی کو ایک سمت دینے کے لیے راشٹریہ سویم سیوک سنگھ جیسی غیر سیاسی تنظیم قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔

میں نے کہا کہ ان کے خیالات اور حکمت عملیوں میں اختلاف رائے ہونے کے باوجود وہ سبھی ہندوستان کی آزادی اور ملک کی تعمیر کے تئیں اپنے عزم کو لے کر ایک تھے۔ میں نے لوگوں سے جنگ آزادی کے تمام عظیم لیڈروں کی یاد اور نشانی کو تسلیم کرنے کی اپیل کی۔ یاترا کے دوران کی گئی اپنی تقریروں اور دیے گئے بیانات میں پنڈت نہرو، کے کامراج، گوپ بندھو داس، ٹی پرکاشم، وائی بی چوہان، وسنت دادا پاٹل، ایس نجلن گپا، وریندر پاٹل، اے کے گوپالن اور پرمود داس گپتا جیسے کانگریس اور کمیونسٹ پارٹیوں کے کئی ان لیڈروں کی بھی بے انتہا تعریف کی جن کے ساتھ ہمارے اصولی اختلاف رہے ہیں۔ یاترا میں بڑی تعداد میں بے توجہی کے شکار مقامی سطح کے شہیدوں اور بہادروں کی یاد کو پھر سے زندہ کرنے میں مدد کی۔ 279 مقامات سے بی جے پی اور بھارتیہ جنتا پارٹی یووا مورچہ کے کارکنان جنگ آزادی کے شہیدوں کی جائے پیدائش سے کلش لے کر آئے۔ بھاجپا مہیلا مورچہ نے مختلف حصوں میں 800 سے زیادہ باحیات مجاہدین آزادی سے ملنے کا موقع فراہم کیا۔

'بھدّے ہندوستانی سیاسی لیڈر' کی امیج کو بدلنے کی ضرورت

یہ عام خیال کہ 'تمام سیاسی لیڈر بدعنوان ہیں' نہ صرف غلط ہے بلکہ اگر اس کی دادرسی نہ کی گئی تو یہ ہمارے جمہوری دستور کے لیے زبردست خطرہ بن سکتا ہے۔ تمام سیاسی پارٹیوں میں ایماندار لیڈر ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ کسی میں زیادہ ہیں تو کسی میں کم۔ خود ایک سیاسی لیڈر ہونے کے سبب میں نے بدعنوان ہندوستانی لیڈر کی امیج بدلنے کی ضرورتوں کو گہرائی سے محسوس کیا، اس لیے یہ یاترا میرے لیے ایک موقع تھا کہ اس موضوع پر میں اپنا خیال ملک کے سامنے رکھوں۔ میں نے اس بات پر زور دیا کہ ہر پارٹی میں خود اصلاح کا عمل شروع ہونا چاہیے۔ 'بدعنوانی اوپر سے نیچے کی طرف بڑھتی ہے، نہ کہ نیچے سے اوپر کی طرف۔' اپنی تقاریر میں، میں اکثر کہتا کہ 'اس کے لیے پورا سیاسی نظام ذمہ دار ہے اور کسی حد تک میں اپنی پارٹی کو اس سے الگ نہیں مانتا۔ تحریک آزادی کے وقت سیاست ایک مہم ہوا کرتی تھی۔ کئی ترقی یافتہ ملکوں میں کئی دیگر ممالک کی طرح سیاست بھی ایک پیشہ ہے جس کے لیے پیشہ ورانہ ٹریننگ ضروری ہے۔ یہ دکھ کی بات ہے کہ ہندوستان میں کئی لوگوں کے لیے سیاست ایک تجارت بن گئی ہے، اس حالت کو بدلنے کی ضرورت ہے۔ اگر ہم بدعنوانی سے پاک نظام چاہتے ہیں تو ہمیں یہ طے کرنا ہوگا کہ ملکی سیاست میں ایماندار اور باعمل لوگوں کا غلبہ ہو۔'

شہریوں کا رول اور ان کی ذمہ داری

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ رتھ یاترا لوگوں میں بی جے پی کی سیاسی مقبولیت بڑھانے کی ایک مہم تھی۔ اپنے تمام جلسوں میں، میں نے لوگوں سے ہندوستان کے آئندہ وزیر اعظم کی شکل میں اٹل بہاری واجپئی کو واضح اکثریت دلا کر ملک کی سیاسی تبدیلی کی اپیل کی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے سماجی تبدیلی کی ضرورت پر بھی زور دیا۔ میں لوگوں میں یہ غلط فہمی پیدا نہیں کرنا چاہتا کہ صرف قیادت کی تبدیلی سے ہی ہندوستان ایک عظیم ملک بن جائے گا۔ گزشتہ 5 دہائیوں میں اور خاص طور سے 60 کی دہائی کے وسط سے بدعنوانی ہماری سماجی زندگی کے ہر شعبہ میں پھیل چکی ہے۔ میں اس کے لیے کئی مثال دے سکتا ہوں، مثلاً سرکاری ملازمین جو ایمانداری سے 8 گھنٹے کام نہیں کرتے، ڈاکٹر جو غیر ضروری ٹسٹ اور دواؤں کے ذریعہ لوگوں کی جیبیں خالی کرا دیتے ہیں، ٹیچر جو اسکول میں تعلیم نہیں دیتے اور طلبا کو پرائیویٹ ٹیوشن کا مشورہ دیتے ہیں، پولس والے جو اضافی کمائی کرنے کے لیے غریب اور مجبور لوگوں کو ستاتے ہیں۔

ہمارے سماج میں اخلاقی قدروں کی تشویشناک حد تک شکست و ریخت ہوئی ہے۔ میں نے کہا کہ ناگزیر طور سے حاکم اور محکوم دونوں یہ سمجھنے لگیں کہ حب الوطنی اور ڈسپلن جو تحریک آزادی میں بھلے ہی سودمند رہے ہوں، کی اب کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہماری روزمرہ کی زندگی میں انسان کو اونچائی پر لے جانے والی ان قدروں کے فقدان سے اپجی تنہائی کو مفاد پرستی، بے ایمانی اور بدعنوانی سے بھر دی گئی ہے۔ قانون بنا کر یا سرکاری کارروائی کے ذریعہ اس وبا کو ٹھیک نہیں کیا جا سکتا۔ اس زوال کو روکے بغیر ہم اپنے شہیدوں اور مجاہدین آزادی کے خوابوں کے ہندوستان کی تعمیر نہیں کر سکیں گے اور اس کے لیے ہم میں سے ہر ایک کو اپنا فرض نبھانا ہے۔

شہریوں کے رول اور جواب دہی کو واضح کرنے کے لیے یاترا کے دوران میں نے لاکھوں عوام سے مندرجہ ذیل تین نکاتی سورن جینتی عہد کرایا۔

1. میں نہ رشوت لوں گا اور نہ ہی رشوت دوں گا۔
2. میرا کوئی بھی پیشہ ہو، میں ایمانداری، لگن اور ڈسپلن کے دائرے میں اپنا کام کروں گا۔ ایک نئی عملی ثقافت کے تحت میں ملک کے تئیں اپنے فرائض کو اپنے نجی مفاد سے ہمیشہ اوپر رکھوں گا۔
3. میں اپنی زندگی میں جو بھی فیصلہ لوں گا اس میں ذات یا مذہب کی بنیاد پر امتیاز نہیں کروں گا بلکہ اس کی جگہ عقل اور مادر وطن کے مفاد میں کام کروں گا۔

ہندوستانی مسلمانوں سے اپیل

حسب امید بی جے پی کے مخالفین نے اس یاترا کو 'فرقہ واریت کا زہر پھیلانے' اور 'ملک کی سالمیت کو تباہ کرنے کی ایک اور مہم' بتانے کی کوشش کی۔ ایسا کرنے میں انھوں نے 1990 کی رام رتھ یاترا پر اپنی لغو باتوں کو دوہرایا۔ صحیح معنوں میں ان کی کوشش مسلمانوں کو اس مہم سے

دور رکھنے کی تھی، لیکن یاترا نے ہمارے مسلم بھائیوں پر مثبت اثر چھوڑا۔ وہ سبھی جو میرے جلسوں میں موجود تھے، دیکھ سکتے تھے کہ یاترا کے دوران دیئے گئے پیغام میں کچھ بھی 'فرقہ پرستی' یا 'مسلم مخالف' نہیں تھا۔ میں نے ان سے بی جے پی کے خلاف ہمارے مخالفین کے گمراہ کن تشہیر سے ہوشیار رہنے کے لیے کہا۔ '1947 سے قبل مسلم لیگ کانگریس کو ایک ہندو پارٹی کہتی تھی جو مسلم مفادات کے خلاف تھی۔ آج کانگریس وہی بات بی جے پی کے بارے میں کہہ رہی ہے۔'

بھوپال میں، میں نے ایک اپیل جاری کی جس کا عنوان تھا— 'بی جے پی ہندوستانی مسلمانوں سے تہذیبی وثقافتی قوم پرستی کو سمجھنے اور اپنے ہندو بھائیوں سے اتحاد قائم کرنے کی اپیل کرتی ہے۔' اس میں کہا گیا تھا کہ—

''ہندوستان کی جنگ آزادی میں قوم پرست مسلمانوں نے قابل تعریف تعاون دیا، لیکن یہ بھی سچ ہے کہ مسلم فرقہ کی اہم مذہبی، سیاسی قیادت کے توڑ پھوڑ کے رول نے تحریک آزادی کی سمت اور آزادی کے بعد کے ریاستی نظام کو متاثر کیا۔ آزادی سے قبل دو قومی فارمولہ پر مسلم لیگ کا سخت رویہ، جس کا مقصد مسلم فرقہ کو مین اسٹریم کی قومی تحریک سے دور رکھنا تھا، کا نتیجہ تھا ملک کی تکلیف دہ تقسیم۔ آزادی کے بعد کانگریس اور دیگر پارٹیوں کی نام نہاد عدم فرقہ پرستی کارروائیوں سے تنہا پا کر مسلم مذہبی، سیاسی قیادت کے مؤثر گروپوں نے مسلم فرقہ کی قومی زندگی کے ساتھ اچھی طرح سے گھل مل جانے میں رکاوٹ ڈالنا جاری رکھا ہے۔ اس حالت نے مسلم فرقہ اور عظیم قوم دونوں کی ترقی کو روک کر مختلف مسائل کھڑے کر دیئے ہیں۔

ہمارے مخالفین کے ذریعہ اپنے ووٹ بینک میں بی جے پی کے بارے میں گمراہ کن تشہیر کیے جانے سے کئی دفعہ ہمیں انتخابی نقصان ہوا، لیکن ان سب باتوں سے مسلم فرقہ ہی ہر طرح سے نقصان میں رہا ہے۔ سیاسی، سماجی، تعلیمی طور سے اور سب سے اہم اکثریتی طبقہ کی قربت حاصل کرنے میں مسلم طبقہ پیچھے رہ گیا۔ بی جے پی سچی مذہبی غیر جانبداری میں یقین کرتی ہے جس کے معنی ہیں سبھی کے لیے انصاف اور تحفظ، لیکن چاپلوسی کسی کی نہیں۔ ہماری پارٹی اور ہندوستانی مسلمانوں کے درمیان موجودہ تعلقات میں مثبت تبدیلی لانے میں ہماری دلچسپی ہے اور اس کے لیے ہم ایمانداری سے کوشش کریں گے۔ ہندوستان کی آبادی کے اتنے بڑے حصے کو اپنے احساس اور شعور سے باہر رکھنے کا خیال ہی ہمیں غیر دلچسپ لگتا ہے۔''

اس بیان میں ہندوستانی مسلمانوں سے چار نکاتی اپیل کی گئی تھی:

1. دو قومی نظریہ کے سایہ کو بھی اپنے دل سے نکال دیں۔ (میں مسلم مذہبی رہنماؤں اور دانشوروں سے یہ اعلان کرنے کی اپیل کرتا ہوں کہ انھوں نے ہندوؤں کو کافر سمجھنا بند کر دیا ہے۔)
2. جمہوریت کو صحت مند رکھنے کے لیے ووٹ بینک کی سیاست کا بائیکاٹ کریں۔
3. تہذیبی اور ثقافتی قوم پرستی کو سمجھیں۔ (یہ کسی بھی طرح سے اسلام کی شناخت کو ختم نہیں کرے گی، کیونکہ میری پارٹی ہندوستانی سماج کے کثیر مذاہب، کثیر لسانی اور کثیر علاقائی تنوع، جو اس کے دل کے نہاں خانے میں ہندو مذہب سے مربوط ہے، کا نہ صرف احترام کرتی ہے بلکہ اس پر فخر بھی کرتی ہے۔)

4. آیئے ہم اپنی کوششوں کو غریب مسلمانوں کی تعلیمی اور اقتصادی ترقی پر مرکوز کریں۔

جب میں پیچھے مڑکر دیکھتا ہوں اور یاد کرتا ہوں ان اوقات کو، جب دو ماہ تک ہندوستان کی چہار سمتوں میں سڑک کے راستے سے گزرتے ہوئے میں نے تحریک آزادی کے دبیدہ خاطر اور بہادروں کی یاد کو سلام کیا تھا تو مجھے اس بات کا اطمینان ہوتا ہے کہ یاترا اپنے نام کو بامعنی کر پائی—'حب الوطنی کی تیرتھ یاترا'

ہندوستان

طاقتور اور
خود اعتمادی سے بھرپور

1997-2007

”ہندوستان میں ترقی کی لامحدود توقعات ہیں اور توقعات کی تعمیر کے لیے اس کے پاس انسانی اور قدرتی دونوں طرح کے وسائل دستیاب ہیں۔ اس کے علاوہ ہمارے پاس رہنمائی کے لیے قابل فخر روحانی، تمدنی اور تہذیبی وراثت ہے۔ ہم اپنے وسائل کو صحیح طریقے سے استعمال کر کے اس میں جدید سائنس اور تکنیکی طاقت کو شامل کر کے اور اپنی وراثت سے رہنمائی حاصل کر کے ایک طاقتور اور خوشحال ہندوستان تعمیر کر سکتے ہیں۔ بھارت میں اور زیادہ اتحاد و یکجہتی ہو اور یہ آسمانوں کی بلندیوں کو چھوئے۔ جس سے میرے ایک ارب سے زیادہ ہم وطنوں کے لئے آج کے مقابلے میں کل زیادہ خوشحال اور سنہرا ہو۔“



پانچواں باب

1

ایک نئے عہد کا آغاز

ہماری نسل کی روحانی استعداد نے ہمیشہ بنیادی اتحاد کو تسلیم کیا ہے
اور ہر طرح کی اور ہر طبقہ کے تنوع کی نشان دہی کی ہے۔

— وپن چندر پال

مئی - جولائی 1997 کی سورن جینتی رتھ یاترا دراصل وسط مدتی پارلیمانی انتخابات، جو سیاسی اُفق پر دکھائی دے رہی تھی، کی انتخابی مہم سے قبل کی تیاری تھی۔ یاترا کے آغاز سے ایک ماہ قبل نئی دہلی میں بی جے پی کی قومی مجلس عاملہ کی میٹنگ میں اپنے صدارتی تبصروں میں، میں نے اپنے معاونین سے کہا تھا کہ —

> ''دوستو! ہمیں لوک سبھا کے لیے وسط مدتی انتخابات، جو آج کے بعد کسی بھی وقت ہو سکتے ہیں، کے لیے اپنی اندرونی تیاریوں اور لوگوں کے درمیان کاموں کو پوری سنجیدگی سے شروع کر دینا چاہیے۔ میں یہ اس لیے کہتا ہوں کہ حالیہ سیاسی واقعات (جن کی وجہ سے دیوگوڑا سرکار کا زوال اور گجرال سرکار کا قیام ہوا) عام یا فطری نہیں ہیں۔ اچانک ایک جھوٹ چرمرا کر گر پڑی ہے۔ اچانک ایک بڑی جھوٹ اقتدار کے گلیاروں میں بے پردہ پڑی ہوئی ہے، جو نہایت ہی بے چینی اور مایوسی کے ساتھ چیتھڑوں سے خود کو ڈھکنے کی کوشش کر رہی ہے، لیکن وہ چیتھڑے اس کی شرم کو چھپا نہیں سکتے، چاہے کتنا ہی ماہر ڈریس ڈیزائنر ایک نئے برسر اقتدار اتحاد کو تیار کرنے کا ذمہ اپنے کندھوں پر لے لے۔''

خود اعلان 'فرقہ واریت مخالف' طاقتوں کے اتحاد کا دعویٰ خیالی تھا۔ 1996 کے لوک سبھا انتخابات میں کانگریس کو زبردست شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا اور گیارہویں لوک سبھا انتخابات میں بی جے پی سب سے بڑی پارٹی کی شکل میں ابھری تھی۔ ہمارے مخالفین نے ہمیں اقتدار

سے باہر رکھنے کو اس بنیاد پر جائز قرار دیا تھا کہ ہندوستان کو 'فاشزم اور قومی توڑ پھوڑ' کے خطرے سے بچانا ہوگا اور اس چال بازی کی بنیاد پر متحدہ مورچہ کا ایک پرانا اور نحیف ڈھانچہ آناً فاناً میں کھڑا کر دیا گیا، جسے اسی کانگریس پارٹی نے تھامے رکھا تھا جو انتخابات میں عوام کے ذریعہ ٹھکرائی جا چکی تھی۔ ایک بنجر بی جے پی مخالف اور وزراء کی کرسیوں پر بیٹھنے کی تمنا ہی وہ گوند تھی جس نے خودساختہ متحدہ مورچہ کو اور کانگریس اور متحدہ مورچہ کو آپس میں جوڑ رکھا تھا، لیکن گوند کبھی نہ کبھی تو اکھڑنا ہی تھی اور وہ اکھڑ بھی گئی جب کانگریس نے جلدی جلدی دو وزرائے اعظم کے پیروں کے نیچے سے زمین کھسکالی۔ اس سے یہ واضح ہوگیا کہ ہمارے مخالفین کا حقیقی سروکار سیکولرزم نہیں بلکہ حصول اقتدار تھا۔ وہ اس حالت میں بھی اقتدار چاہتے تھے جب عوام نے انھیں نامنظور کر دیا تھا۔

قومی سطح پر حکومتی نظام میں اتنی بغاوت اور رکاوٹ تھی کہ بی جے پی کے لیے ایک غیر معمولی موقع کا دروازہ کھلتا نظر آ رہا تھا۔ ہندوستانی ریاستی نظام کا مرکز کھوکھلا ہو رہا تھا اور اس خالی پن کو بھرنے کے لیے بی جے پی تیار کھڑی تھی۔ 17 برس پہلے بی جے پی کے قیام کے بعد پہلی مرتبہ میں پُر امید تھا کہ ہم مرکز میں ایک مستحکم سرکار بنالیں گے۔ میری رجائیت کی بنیاد کیا تھی؟ ایک جمہوری نظام میں ایک سیاسی پارٹی، جو اقتدار میں آنا چاہتی ہے تو اسے حکومت کرنے سے پہلے اکثریت کے دل و دماغ پر حکومت کرنا ہوتا ہے۔ اس پیمائش سے بی جے پی پہلے ہی ایک منتظر حکمراں پارٹی بن چکی تھی۔

اس لیے پارٹی قومی مجلس عاملہ کو میرا پیغام واضح تھا۔ 'ہمیں حکومت کرنے کے لیے تیار رہنا ہے۔' معروف فرانسیسی رائٹر وکٹر ہیوگو نے ایک مرتبہ کہا تھا 'ایک ایسا خیال، جس کے ایجاب وقبول کا وقت آ چکا ہو، عظیم الشان فوجوں سے بھی زیادہ طاقتور ہوتا ہے۔' اس طرح بی جے پی کا مرکز میں حکمراں پارٹی بن جانا ایک خیال ہے، جس کا وقت آ چکا ہے۔

1998: فیصلہ کن پارلیمانی انتخابات

نومبر 1997 میں جب کانگریس پارٹی نے گجرال سرکار سے حمایت واپس لے لی تو اُس وقت کے صدر جمہوریہ کے آر نارائنن کے پاس ایک ہی متبادل تھا کہ لوک سبھا تحلیل کر کے نئے الیکشن کا حکم دیں۔ الیکشن کا اعلان بھی ہوگیا۔ فروری - مارچ 1998 انتخابات کا وقت متعین کیا گیا۔ بی جے پی نے ایک عام نعرہ، جو اپنی مثبت سوچ اور سیدھی اپیل میں غیر معمولی تھا، کے ذریعہ لوگوں سے رائے عامہ مانگی۔ ایک لائق و فائق وزیر اعظم کی قیادت میں ایک 'مستحکم سرکار' (Stable Government) کے لیے ووٹ دیجیے۔ 1998 کے انتخابات کے لیے ہمارے مینی فیسٹو میں کہا گیا تھا کہ 'اٹل بہاری واجپئی کو عوام ایک ایسے لیڈر کی شکل میں دیکھتی ہے جن میں اہلیت کے ساتھ ایمانداری، کرشمہ کے ساتھ کردار اور تجربہ کے ساتھ ہر سو قبولیت کا نادر امتزاج ہے۔ وہ ایسے شخص نہیں ہیں جو کسی خاص خاندان میں پیدا ہوئے یا اس سے متعلق ہونے کی بنیاد پر قیادت کا دعویٰ کرتے ہیں۔ وہ پارلیمنٹ کے اندر اور باہر قوم اور اس کے لوگوں کی طویل خدمات کی بنیاد پر لیڈر بنے ہیں۔' یہ الفاظ صرف شہرت کے لیے نہیں کہے گئے بلکہ ان میں اٹل بہاری واجپئی کی پورے پانچ سال کی مدت کے لیے وزیر اعظم کی شکل میں دیکھنے کی لوگوں کی خواہشات کی صدائے بازگشت تھی۔

میں نے جیسے ہی انتخابی مہم کا آغاز کیا تو محسوس ہوا کہ یہ الیکشن ہندوستانی جمہوری نظام کی تاریخ میں فیصلہ کن ہونے جا رہا ہے۔ میں تمل ناڈو اور مغربی بنگال جیسی ریاستوں سمیت، جہاں ہم نے کبھی کوئی پارلیمانی سیٹ نہیں جیتی تھی، ہندوستان کے تقریباً تمام حصوں میں بی جے پی

کے لیے زبردست جوش وخروش دیکھ سکتا تھا۔ سماج کے تمام طبقات میں اٹل جی کا کرشمہ دکھائی دیتا تھا۔ ملک کی تاریخ میں پہلی مرتبہ لوگ ایک غیر کانگریسی لیڈر کے ماتحت ایک مکمل غیر کانگریسی سرکار کے انتخاب کے لیے بے قرار تھے۔ یہ پیشین گوئی کرنے کے لیے کسی جیوتشی کی ضرورت نہیں تھی کہ سرکار بنانے کے لیے کون سی پارٹی سرفہرست آئے گی۔ انتخابی ماہرین کو صرف بی جے پی کے ذریعہ جیتی گئی سیٹوں کی تعداد کا شمار کرنا تھا۔

صحیح نتائج نے بتایا کہ بی جے پی نے ہندوستان کے سیاسی نقشہ کو تبدیل کر دیا ہے۔ جن 384 سیٹوں پر بی جے پی نے الیکشن لڑا تھا، ان میں سے 182 سیٹیں جیت کر پارٹی نے 1996 کے اپنے مظاہرے (161 سیٹیں) میں اہم اصلاح کیا۔ اس کے برعکس 1996 میں 140 سیٹوں کے مقابلے کانگریس نے کہیں زیادہ سیٹوں 462 پر الیکشن لڑکر 141 سیٹیں جیتیں۔ متحدہ مورچہ کی طاقت 183 سیٹوں سے گھٹ کر 86 رہ گئی۔ نتائج کو غور سے دیکھنے پر بی جے پی کی کئی اہم کامیابیوں اور کانگریس کی زبردست ناکامیاں نظر آئیں۔ پہلے یہ کہ اس انتخاب میں سونیا گاندھی نے اپنی پارٹی کے لیے کافی پبلسٹی کی تھی، جس کا کانگریس کو بہت کم فائدہ ہوا۔ دوسرے کانگریس کا ووٹ فیصد گر کر 25.72 پر آ گیا۔ 1989 میں جب آخری مرتبہ کانگریس نے اپنی طاقت پر مرکز میں سرکار بنائی تھی، کے مقابلے 14 فیصد کم۔ بی جے پی کا ووٹ فیصد 25.38، تقریباً کانگریس کے برابر تھا جو کم اہمیت کا حامل نہیں ہے۔ 1989 کے مقابلے 14 فیصد زیادہ تھا۔ تیسرے کانگریس کے مقابلے زیادہ ریاستوں اور مرکز کے زیر انتظام صوبوں سے اپنے نمائندے بھیجنے کے لیے بھی بی جے پی اپنی پیٹھ تھپتھپا سکتی تھی۔

اٹل جی اور میں دونوں ہی اپنے پرانے انتخابی حلقوں لکھنؤ اور گاندھی نگر سے اچھے ووٹ سے جیت گئے۔ میرے لیے خاص طور سے اطمینان بخش یہ تھا کہ بی جے پی نے اپنی سماجی اور جغرافیائی بنیاد میں توسیع کرنے میں کامیابی حاصل کی تھی۔ 1952 سے پہلی بار بی جے پی نے تمل ناڈو، مغربی بنگال اور آسام کی نمائندگی کی تھی۔ اتر پردیش میں ہماری کامیابی حیرت انگیز تھی۔ 85 میں سے ہم نے 57 سیٹیں جیتیں۔ نئی پارلیمنٹ میں کانگریس کی 10 کے مقابلے بی جے پی کی سب سے زیادہ 16 خاتون ممبران پارلیمنٹ تھیں۔ یہ اپنی پارٹی کے سب سے زیادہ درج فہرست (24) اور قبائلی (14) کے ممبر ہونے پر بھی فخر کر سکتی تھیں۔ الختصر 1980 میں بی جے پی کے یوم تاسیس کی تقریب میں پارٹی نے کانگریس پارٹی کا متبادل بننے کا جو ہدف رکھا تھا وہ 1998 میں پورا ہو گیا۔

کوئمبٹور بم دھماکہ: کیسے ایک ٹی وی انٹرویو نے مجھے بچایا!

اپنی سرکار بنانے کی بات کو آگے بڑھانے سے پہلے میں اس ناقابل فراموش واقعہ کا ذکر کرنا چاہوں گا، جو میری انتخابی مہم کے دوران پیش آیا تھا۔ فروری 1998 کے دوسرے ہفتہ میں اپنی پارٹی کے امیدواروں کے حق میں مہم چلانے کے لیے میں جنوبی ریاستوں میں گیا تھا۔ ایک طوفانی دورہ کے بعد 13 رفروری کو میں چنئی پہنچا۔ رات میں آرام کے بعد مجھے اگلی صبح ایک معروف مقامی لیڈر اور بی جے پی کے امیدوار سی پی رادھا کرشنن کی حمایت میں تمل ناڈو کے ایک شہر کوئمبٹور جو کپڑا اور انجینئرنگ صنعت کے لیے مشہور ہے، میں ایک انتخابی جلسہ کو خطاب کرنے کے لیے کوچ کرنا تھا۔

ناشتہ کرنے کے بعد میں نے اپنی گھڑی دیکھی۔ اس وقت صبح کے 8:30 بج رہے تھے۔ ایئر پورٹ جانے کا وقت ہو گیا تھا جہاں میری پارٹی کے حامیوں نے مجھے کوئمبٹور لے جانے کے لیے ایک چھوٹے چارٹرڈ طیارہ کا انتظام کیا تھا، کیونکہ جلسہ کے فوراً بعد چنئی واپسی کے لیے کوئی کمرشیل فلائٹ دستیاب نہیں تھی تاکہ چنئی سے میں اپنے اگلے پڑاؤ کے لیے نکل سکوں۔ اسی وقت میرے پرائیویٹ سکریٹری دیپک چوپڑا میرے

پاس آئے اور کہا کہ 'ٹی وی انٹرویو کے لیے ایک درخواست آئی ہے۔' میں نے جواب دیا کہ 'یہ ابھی کیسے ہو سکتا ہے؟ کیا جانے کا وقت نہیں ہو گیا ہے؟' لیکن انھوں نے کہا کہ یہ درخواست ای ٹی وی سے آئی ہے۔ وہ الیکشن سے عین قبل ایک تفصیلی انٹرویو نشر کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے چنئی سے روانگی کا وقت دوبارہ مقرر کر دیا ہے۔ میں اس بات کا خیال رکھوں گا کہ دن کا پروگرام اس سے متاثر نہ ہو۔ انھوں نے واضح کیا کہ اگر میں نے انٹرویو دیا تو وہ سود مند ہوگا، کیونکہ ای ٹی وی آندھرا پردیش کے اہم اخبار 'اینا ڈو' کے ذریعہ چلایا جاتا ہے اور تھوڑے ہی وقت میں سب سے زیادہ مقبول تیلگو چینل بن گیا ہے۔ میں تیار ہو گیا۔ انٹرویو کے سبب ہمارے چنئی سے نکلنے میں دو گھنٹے کی تاخیر ہو گئی اور یہ تاخیر نیک فال ثابت ہوئی۔

40 منٹ کی پرواز کے بعد جب ہمارا طیارہ کوئمبٹور میں لینڈ کیا تو ایئرپورٹ کا ماحول مجھے کچھ عجیب لگا۔ عام طور پر چھوٹے ہوائی اڈوں پر سب سے پہلا منظر جھنڈا ہاتھ میں لیے نعرے لگاتے ہوئے پارٹی کارکنان کی جماعت کا ہوتا ہے، جو کہیں دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ اس کی جگہ ماحول میں کچھ خوفناک خاموشی تھی۔ کچھ مقامی پارٹی لیڈروں کے ساتھ ایک پولس افسر مجھ سے ملے اور کہا کہ 'آڈوانی جی! انتہائی دکھ کے ساتھ مجھے بتانا پڑ رہا ہے کہ آپ کے انتخابی جلسہ گاہ سمیت کئی مقامات پر بم دھماکے ہوئے ہیں جس میں کئی افراد کی موت ہو چکی ہے۔'

میں اس خبر سے متحیر ہو گیا۔ جو کچھ ہوا تھا اس کے بارے میں مزید جانکاری لینے کے لیے میں نے اپنی پارٹی کے معاونین سے بات کی۔ انھوں نے کہا کہ وہ سیدھے جلسہ گاہ سے ہی آئے تھے اور انھوں نے کئی لوگوں کو مردہ یا زخمی حالت میں دیکھا تھا۔ دھماکہ جلسہ گاہ پر آپ کے پہنچنے کے مقررہ وقت پر ہوا۔ یہ خوش قسمتی ہے کہ آپ کا طیارہ دیر سے پہنچا۔ پولس افسر نے کہا کہ 'سر! شہر میں دہشت اور کشیدہ ماحول ہے۔ مجھے بڑے دکھ کے ساتھ آپ سے درخواست کرنا پڑ رہا ہے کہ آپ ایئرپورٹ سے ہی چنئی واپس لوٹ جائیں۔'

میں نے کہا کہ 'میں یہاں سے کیسے واپس لوٹ جاؤں جبکہ مارے گئے لوگوں میں متعدد میرے انتخابی جلسہ کے لیے آئے تھے۔ یہ میرا فرض ہے کہ میں مہلوکین کی تعزیت کروں اور زخمیوں سے ملاقات کروں۔' کوئمبٹور میں تب تک کرفیو لگا دیا گیا تھا۔ دھماکوں میں تقریباً 58 شہری ہلاک ہو گئے تھے۔ سرکاری اسپتال جہاں مہلوکین کی لاشیں لائی گئی تھیں اور زخمیوں کا علاج چل رہا تھا، کا منظر دلدوز تھا۔ میں نے اخبار نویسوں سے کہا کہ 'جنوبی ہند میں دہشت گردی کی اس قابل نفرت کارروائی کو انجام دینے والے لوگ ملک کے دشمن ہیں اور انھیں جلد ہی قانون کے حوالے کیا جانا چاہیے۔'

یہ فیصلہ کرنے میں عدالت کو 9 برس لگے کہ بم دھماکوں، جن کا مقصد تمل ناڈو کی خصوصی تحقیقاتی کمیٹی کے مطابق 'مسٹر ایل کے آڈوانی کو ختم کرنا تھا' میں 'الامۃ' نامی ایک اسلامی تنظیم کا ہاتھ تھا۔ اگست 2007 میں کوئمبٹور کی ایک خصوصی عدالت نے اس دہشت گردانہ کارروائی، جس کا کوڈ نام تھا 'آپریشن اللہ اکبر' کے لیے تنظیم کے بانی اے باشا اور اس کے 35 دیگر ساتھیوں کو سزا دی، مگر عدالت نے معاملہ کے اہم ملزم پڑوسی ریاست کیرل کی پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی کے صدر عبدالنصیر مدنی کو بری کر دیا، کیونکہ تفتیشی ایجنسی اس کے خلاف لگائے گئے الزامات کو ثابت کرنے میں ناکام رہی۔ 1991 میں اس نے اسلامی سویم سیوک سنگھ (آئی ایس ایس) قائم کیا تھا اور عمومی طور سے ہندوؤں اور خصوصی طور سے سنگھ اور بی جے پی کے خلاف اپنی اشتعال انگیز تقاریر کے لیے اس کے خلاف کئی معاملے درج کیے گئے تھے۔

کوئمبٹور کی اس دہشت گردانہ واردات میں اپنے مشتبہ رول کے لیے مدنی نے جو 8 برس جیل میں گزارے، اس دوران کانگریس اور کیرل کی کمیونسٹ پارٹیوں کے درمیان اسے رہا کرانے کے لیے مقابلہ چل رہا تھا۔ جیل سے رہا ہونے کے بعد اس کے بیانات میں وہ پہلے والی آگ نہیں تھی۔ ایک اخبار کو دیئے انٹرویو میں اس نے کہا کہ 'اتنے سال جیل میں رہ کر میں نے یہ محسوس کیا کہ انسانیت سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں۔' لیکن اسی

انٹرویو میں اس نے کہا کہ ’میرا مقصد ہندوؤں، ان کے رسم و رواج یا ان کے دیوی دیوتاؤں پر حملہ کرنے کا نہیں تھا۔ ہمارے نشانے پر صرف سنگھ اور ایل کے اڈوانی جیسے لوگ تھے۔‘

کوئمبٹور کی اس دہشت گردانہ کارروائی کے شکار لوگوں کو پورا انصاف ملا یا نہیں، اس سوال کا جواب میں تمل ناڈو کے حکمراں کے ضمیر پر چھوڑتا ہوں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے، ہندوستان میں دہشت گردی کے موضوع پر بعد میں دی گئی اپنی تقاریر میں، میں نے جب بھی کوئمبٹور بم دھماکوں کا ذکر کیا ہے تو کہا ہے کہ ’میں اس ای ٹی وی صحافی کی وجہ سے آپ کے سامنے کھڑا ہوں۔ اگر وہ 14 رفروری 1998 کی صبح چنئی سے میری روانگی میں تاخیر کا سبب نہ بنے ہوتے تو مجھے پتہ نہیں کہ میرے ساتھ کیا ہو جاتا۔‘

این ڈی اے کی تشکیل — وزیر اعظم اٹل جی کی حلف برداری

چونکہ بی۔ جے۔ پی کی حکومت بننا طے تھی، اس لیے کئی پارٹیوں نے اسے اپنی حمایت دینے کی خواہش ظاہر کی۔ اس دور میں میری پارٹی نے ایک مخصوص لائحۂ عمل تیار کیا۔ ہم نے ایک کم از کم مشترکہ پروگرام، جو اس کی تمام شامل تمام پارٹیوں کو قبول ہوگا، پر مبنی ایک اتحاد بنانے کا فیصلہ لیا۔ جب ہم نے یہ واضح کر دیا کہ ہمارے اس پروگرام، جو این اے جی (نیشنل ایجنڈا فار گورنینس) کے نام سے وجود میں آیا، میں وہ تین وعدے شامل نہیں ہوں گے جو بی جے پی کے 1998 کے انتخابی ایجنڈا کا حصہ تھے۔ اجودھیا میں رام جنم بھومی پر مندر کی تعمیر، یکساں سول کوڈ کا قانون اور آئین کے آرٹیکل 370، جو جموں وکشمیر کو ایک خصوصی درجہ دیتا ہے، کو رد کرنا۔ جب اتحاد کی تمام پارٹیاں سرکار میں شامل ہونے کے لیے تیار ہوگئیں تب آندھرا پردیش کی تیلگو دیشم پارٹی (جس کے صدر وہاں کے وزیر اعلیٰ چندرا بابو نائیڈو) نے اعلان کیا کہ وہ واجپئی سرکار کو باہر سے حمایت دے گی۔

مارچ کے وسط میں ایک شام اٹل جی کو اتحاد کا لیڈر منتخب کرنے کے لیے اتحاد میں شامل تمام پارٹیوں کے لیڈر جب صفدر جنگ روڈ پر واقع ان کی رہائش گاہ پر جمع ہوئے تو وہاں بہت ہی خوشنما ماحول دیکھنے کو ملا۔ وہاں ہمیں ایک چھوٹی سی بات یہ بھی طے کرنی تھی کہ ہمارے اس متحدہ ایلائنس کا نام کیا ہوگا؟ اس سلسلے میں کئی نام سامنے آئے لیکن میرے ذریعہ دیا گیا نام نیشنل ڈیموکریٹک ایلائنس (این ڈی اے*) کو فوراً قبول کر لیا گیا۔

ہم بھاجپائیوں کے لیے اس میں ایک جذباتی صدائے بازگشت تھی۔ اوّلین لوک سبھا میں ڈاکٹر شیاما پرساد مکھرجی کی قیادت میں بھی

★ واجپئی سرکار کے 6 سالہ مدت کار میں این ڈی اے میں مندرجہ ذیل ممبران تھے: مہاراشٹر کی شیوسینا (لیڈر: بالا صاحب ٹھاکرے)، پنجاب کا شرومنی اکالی دل (لیڈر: پرکاش سنگھ بادل)، بہار کا جنتا دل (یو) (لیڈر: جارج فرنانڈیز اور نتیش کمار)، اڑیسہ کا بیجو جنتا دل (لیڈر: نوین پٹنائک)، مغربی بنگال کی ترنمول کانگریس (لیڈر: ممتا بنرجی)، ہریانہ کا انڈین نیشنل لوک دل (لیڈر: اوم پرکاش چوٹالہ)، تمل ناڈو کا اے آئی اے ڈی ایم کے (لیڈر: ڈاکٹر جے للتا)، تمل ناڈو کا ہی ڈی ایم کے (لیڈر: ایم کرونا ندھی)، تمل ناڈو کا ہی ایم ڈی ایم کے (لیڈر: وائیکو)، تمل ناڈو کا ہی پی ایم کے (لیڈر: ڈاکٹر رام داس)، کیرل کی آئی ایف ڈی پی (لیڈر: پی سی تھامس)، ناگالینڈ کا ناگالینڈ پیپلز فرنٹ، میزورم کا میزو نیشنل فرنٹ، بہار کی لوک جن شکتی پارٹی (لیڈر: رام ولاس پاسوان) اور جموں وکشمیر کی نیشنل کانفرنس (لیڈر: ڈاکٹر فاروق عبداللہ)۔ ان میں سے کچھ پارٹیاں سرکار کے مدت کار میں ہی این ڈی اے کو چھوڑ کر کانگریس کے ساتھ چلی گئیں۔

حزب مخالف پارٹیوں کی جماعت کا نام 'نیشنل ڈیموکریٹک مورچہ' تھا۔ میں نے تھوڑی سی تبدیلی کا مشورہ اس لیے دیا کہ 'مورچہ' ایک عبوری وجود کا اشارہ دیتا ہے، جبکہ اتحاد استحکام کا مظہر ہے۔

ایک اور بات جو بی جے پی میں ہم سب لوگوں کے لیے انتہائی اطمینان بخش تھی کہ ہم اتحاد کی اپنی حامی پارٹیوں کو این ڈی اے کے کم از کم مشترکہ پروگرام میں 1998 کے اپنے انتخابی ایجنڈا کا ایک اہم وعدہ شامل کرنے کے لیے راضی کرسکے کہ 'بی جے پی نیوکلیئر اپارتھائڈ (امتیاز، بھید بھاؤ) کے عقیدہ کو نامنظور کرتی ہے اور کسی بھی ایٹمی بالادستی پر مبنی نظام مسلط کرنے کی کوششوں کی مخالفت کرے گی۔ ہم ملک کی نیوکلیئر پالیسی پر از سرنو غور کریں گے اور ملک کی دفاعی تیاریوں میں نیوکلیائی اسلحہ کو شامل کرنے کے متبادل کا استعمال کریں گے۔ ہم اپنی دفاع سے متعلق ضرورتوں اور نیوکلیائی اسلحوں پر اپنے متبادل کا استعمال کرنے کے سلسلے میں کسی سے ہدایت لینے کے لیے مجبور نہیں ہوں گے۔'

حالانکہ یہ واضح تھا کہ بی جے پی کی پالیسیوں پر مبنی اتحاد کو ہی سرکار بنانے کا مینڈیٹ ملا ہے، پھر بھی ہمارے کچھ مخالف بی جے پی سے پاک کسی متبادل کی 'جوڑ توڑ' کرنے میں لگے رہے۔ 'ہم مرکز میں بی جے پی اور اس کی حامی پارٹیوں کی سرکار نہیں بننے دیں گے۔ کانگریس اور متحدہ مورچہ کی ایک ایلائنس سرکار ہی بنے گی۔' یہ سابق وزیراعظم اندر کمار گجرال نے کہا تھا۔ ایک کانگریس کے ترجمان نے کہا— 'اگرچہ بی جے پی سب سے بڑی پارٹی ہے، لیکن ہم صدر جمہوریہ سے یہ امید کرتے ہیں کہ سرکار بنانے کے لیے وہ انھیں نہیں بلائیں گے، کیونکہ کانگریس اور متحدہ مورچہ کے درمیان رضامندی ہو جائے گی اور ہم انھیں اس مدعے کا خط بھیج دیں گے۔' آخر میں عام اعداد و شمار کا استدلال ہوس اقتدار پر اثر انداز ہوا۔ 'سرکار بنانے کے لیے ہمارے پاس کثرت رائے (میجارٹی) نہیں ہے اس لیے ہم اس کے لیے اپنا دعویٰ پیش نہیں کر رہے ہیں۔' صدر جمہوریہ کے آر نارائنن سے ملنے کے بعد سونیا گاندھی نے اعتراف کیا★ کہ ان کے بیان سے واضح تھا کہ ضروری کثرتِ رائے (میجارٹی) جٹا پانے میں ناکام رہنے کے سبب ہی انھوں نے سرکار بنانے کی پیش کش نہیں کی تھی۔ میں یہ اس لیے کہہ رہا ہوں کیونکہ ان کے الفاظ میں واجپئی سرکار کو غیر مستحکم کرنے کا ارادہ بلکہ ایک سازش کا تخم پوشیدہ تھا، جو مئی 1999 میں راشٹرپتی بھون کے سامنے بولے گئے ایک بڑے جھوٹ سے (بعد میں) صاف ہو گیا۔

صدر جمہوریہ کے آر نارائنن کے ذریعہ اٹل جی کو سرکار بنانے کے لیے مدعو کرنے میں 10 روز کی تاخیر سے کئی لوگ اندیشہ میں پڑ گئے۔ وزیراعظم کی حلف برداری سے متعلق انھوں نے ایک نئی روایت کی شروعات کی۔ وہ روایت یہ تھی کہ اگر لوک سبھا کے کسی الیکشن کا نتیجہ معلق ہو، جس میں کسی پارٹی یا اتحاد کو کثرتِ رائے (میجارٹی) حاصل نہ ہوا ہو تو کسی شخص کو وزیراعظم اسی وقت بنایا جائے گا جب وہ معاون پارٹیوں کی حمایت کے خط سے ایوان میں اکثریت ثابت کرنے کی اپنی استطاعت کے بارے میں صدر جمہوریہ کو مطمئن کر سکے۔ ایسا کر کے انھوں نے اپنے دو مشہور سابق صدور جمہوریہ آر. وینکٹ رمن اور شنکر دیال شرما کی تقلید نہیں کی تھی جنھوں نے ایوان کا اعتماد حاصل کرنے کی ان کی اہلیت کے بارے میں اپنا اطمینان کیے بغیر سب سے بڑی پارٹی یا اتحاد کے لیڈر کو سرکار بنانے کے لیے مدعو کیا تھا۔ 1994 میں بومئی فیصلہ میں سپریم کورٹ کے احکام اور مرکز اور ریاست کے تعلقات پر سرکاریہ کمیشن کی رپورٹ دونوں میں صاف طور پر کہا گیا ہے کہ گورنر کا یہ فرض ہے کہ وہ سب سے بڑی جماعت یا الیکشن سے پہلے کے اتحاد کے لیڈر کو سرکار بنانے کے لیے مدعو کریں اور وزیراعلیٰ کو ایوان کا اعتماد حاصل ہے یا نہیں، اس بات کا

★ انتخابات میں کانگریس کی شکست کے کچھ دنوں کے اندر ہی سیتارام کیسری، جن کے ساتھ ان کے پارٹی کارکنان کے ذریعہ ہی آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے دفتر میں ناروا سلوک کیا گیا اور جنھیں رسوا کر کے سونیا گاندھی کو کانگریس کا صدر منتخب کر لیا گیا۔

فیصلہ ایوان کے اندر ہوگا، نہ کہ راج بھون میں۔

آئین کا مقصد ایسا ہونے کے سبب وزیراعظم کی حلف برداری کے لیے ہندوستان کے صدر جمہوریہ کے ذریعہ اپنائے گئے طریق کار کو کسی بھی طرح جائز نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ ایک 'انتہائی سرگرم صدر جمہوریہ' کے طور پر مقبول نارائنن نے ایوان میں اپنی اکثریت ثابت کرنے کی این ڈی اے کی استطاعت کو ظاہر کرنے کے لیے اٹل جی سے حمایتی لیٹر پیش کرنے کے لیے کہا۔ اس سے کانگریس پارٹی کو ہمارے کچھ ممکنہ حمایتیوں کو پھسلانے کی ناپاک (مگر ناکام) سیاست کرنے کا وقت اور موقع مل گیا۔ بلاشبہ وہ اپنی کوششوں میں ناکام رہے۔ 1998 میں صدر جمہوریہ کے ذریعہ دی گئی بالواسطہ ترغیب نے اس کے فطری استحکام کے رجحان کو 1999 میں مزید تقویت ملی۔

اٹل جی صدر جمہوریہ کے مطالبہ کو پورا کرنے میں ناکام رہے اور 19 رمارچ کو انھیں اس شرط پر وزیراعظم کے عہدہ کا حلف دلایا گیا کہ وہ 10 دن کے اندر ایوان میں اعتماد کا ووٹ حاصل کرلیں گے۔ جمعرات کی اس روشن صبح کا وہ قیمتی لمحہ مجھے اب تک یاد ہے۔ راشٹرپتی بھون کا شاندار احاطہ موسم گرما کی آمد کی نرم دھوپ میں چمک رہا تھا۔ اٹل جی کے بعد حلف لینے کی میری باری تھی۔ تقریباً 21 برسوں کے بعد میں دوسری مرتبہ بھارت سرکار میں ایک وزیر بن رہا تھا، لیکن تب اور اب میں دو باتیں تھیں، ایک چھوٹا اور ایک بڑا۔ 1977 میں حلف برداری کی تقریب راشٹرپتی بھون کے اشوک ہال میں ہوئی تھی، لیکن اس سے بھی اہم یہ تھا کہ اٹل جی، جنھوں نے مرار جی دیسائی سرکار میں ایک وزیر کے طور پر حلف لیا تھا، اب وہ وزیراعظم بن چکے تھے اور ان کی کابینہ میں، میں نے وزیر داخلہ کے طور پر حلف لیا۔

میرا پہلا سرکاری کام: کامریڈ ای ایم ایس نمبودری پاد کو خراج عقیدت پیش کرنا

قارئین کو یہ جان کر تعجب ہوسکتا ہے کہ واجپئی سرکار میں وزیر داخلہ کے طور پر میرا پہلا سرکاری کام ایک سینئر کمیونسٹ لیڈر کو خراج عقیدت پیش کرنا تھا۔ 19 رمارچ کو حلف اٹھانے کے فوراً بعد ہی میں اپنا عہدہ سنبھالنے کے لیے نارتھ بلاک گیا جہاں وزارت داخلہ ہے۔ میں نے تعارفی سیشن کے لیے وزارت کے تمام سینئر افسران کو بلایا تھا۔ اسی شام کو داخلی ترسیل کے لیے ایک اعلیٰ حفاظتی تکنیک سے لیس فون سسٹم (آر اے ایکس) پر اٹل جی کا فون آیا کہ 'کامریڈ ای ایم ایس نمبودری پاد اب نہیں رہے۔' اس خبر نے مجھے مضمحل کردیا، کیونکہ ای ایم ایس (98-1909) جو کئی برسوں تک مارکسوادی کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سکریٹری رہے، کافی عرصہ سے میرے سیاسی اور فکری نظریات کے مخالف تھے۔ اپنے اصولوں کے تئیں ان کی وفاداری کے لیے میں ان کا احترام کرتا تھا۔ وزیراعظم نے مجھے بتایا کہ ان کی آخری رسوم کل صبح ادا ہوگی اور تروانت پورم میں ایک کل جماعتی تعزیتی جلسہ کا انعقاد کیا گیا ہے۔ 'ای ایم ایس کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے کیا اپنی سرکار کی جانب سے ہمیں کسی کو بھیجنا چاہیے؟' انھوں نے پوچھا۔

میرا جواب تھا 'یقیناً، اور اگر آپ کی رضامندی ہو تو میں خود جاسکتا ہوں۔' وہ راضی ہوگئے۔ فضائیہ کے ایک خصوصی طیارہ سے میں رات کو تروانت پورم پہنچا۔ اس طرح سینئر کمیونسٹ لیڈر کی آخری رسوم میں جانا این ڈی اے سرکار میں میرا پہلا سرکاری کام تھا۔

کل جماعتی اجلاس میں ہرکشن سنگھ سرجیت، اے کے انٹونی، ای کے نائر (جو اس وقت کیرل کے وزیراعلیٰ تھے) کے علاوہ مختلف سیاسی خیالات کے کئی لیڈر موجود تھے۔ میں نے اپنے بیان میں اس بات کی وضاحت کی کہ 'ای ایم ایس نمبودری پاد مارکس وادی کمیونسٹ پارٹی کے نظریہ ساز اور ایک ایسے شخص تھے جنھوں نے کمیونسٹ تحریک سے وابستہ تمام لوگوں کو ترغیب دی۔' میں نے یہ بھی کہا کہ 'مجھے بچپن سے ہی سنگھ کے بانی ڈاکٹر

کیشو بلرام ہیڈگوار سے تحریک ملی ہے۔ جس وقت ڈاکٹر ہیڈگوار وِدربھ کانگریس کے جنرل سکریٹری تھے، انھیں دنوں ای ایم ایس بھی مالابار کانگریس کے جنرل سکریٹری تھے۔ دونوں کے نظریات مختلف تھے، پھر بھی دونوں کانگریس پارٹی کی الگ الگ علاقائی اکائیوں کے عہدیدار تھے اور ان کے بینر تلے نوآبادیاتی حکومت سے ہندوستان کی آزادی کے لیے جدوجہد کر رہے تھے۔'

میری تقریر جاری رہی۔ میں نے کہا کہ نظریات میں اختلافات ہونے کے باوجود بھی دونوں میں جو ایک بات قدر مشترک تھی وہ تھی آئیڈیل ازم۔ کامریڈ ای ایم ایس کو میں ان کے آئیڈیل ازم کے لیے خراج عقیدت پیش کرتا ہوں۔ اسٹیج پر موجود شخصیات اور سامعین میں سے زیادہ تر لوگ حیرت زدہ تھے کہ حلف لینے کے پہلے ہی دن ایک بی جے پی کے وزیراعظم اپنی سرکار کے ایک اعلیٰ سطحی وزیر کو اس پارٹی کے لیڈر کی آخری رسوم میں حصہ لینے کے لیے بھیجیں گے جو بی جے پی کو اپنا 'نمبر ون دشمن' سمجھتی تھی۔ ای ایم ایس کے بارے میں میرے قابل تعریف اور قابل احترام الفاظ کو سن کر انھیں اور بھی زیادہ تعجب ہوا۔

حاضرین میں سے کئی لوگوں نے مجھ سے کہا کہ 'آڈوانی جی! آپ کی سرکار کے اس قدم نے ہمارے دلوں کو چھو لیا ہے۔' میں نے ان سے وہی کہا جو بی جے پی کے تئیں کمیونسٹوں کے رویے کے بارے میں اپنے تبصروں میں اکثر کہتا آیا ہوں۔ 'اگر سماجی تعلقات میں چھوت چھات غلط اور غیر مناسب ہے تو سیاسی تعلقات میں وہ کیسے صحیح اور مناسب ہو سکتی ہے!'

پارٹی صدر کا عہدہ چھوڑنا، 'ایک نئی بھاجپا' بنانے کا اعلان

اٹل جی کی سرکار میں وزیر بننے کے بعد وہ وقت آ گیا جب میں بھاجپا کے صدر کی ذمہ داری سے آزاد ہو جاؤں۔ میں 1993 سے اس عہدہ پر براجمان تھا اور نومبر 1997 میں میرے دوسالہ مدت کار ختم ہو چکے تھے، لیکن آئندہ پارلیمانی انتخابات کے مدنظر پارٹی نے مجھے صدر کے عہدے پر بنے رہنے کے لیے کہا تھا۔ جیت کی خوشی میں پارٹی نے این ڈی اے سرکار کی تشکیل کے بعد اپریل 1998 کے دوسرے ہفتہ میں اپنی قومی مجلس عاملہ کی پہلی میٹنگ نئی دہلی بلائی۔ بھارتیہ جن سنگھ اور بی جے پی کے ایک تجربہ کار لیڈر کوشا بھاؤ ٹھاکرے، جو اپنی بے غرضی، سادگی اور تنظیمی صلاحیت کے لیے جانے جاتے تھے، کو اتفاق رائے سے میرا اولی عہد منتخب کر لیا گیا۔

قومی مجلس عاملہ کے ذریعہ منظور سیاسی تجویز میں کہا گیا کہ 'اس عظیم ملک کے لوگوں کی خدمت کرنے کا موقع فراہم کرنے کے لیے بی جے پی تہہ دل سے رائے دہندگان کا شکریہ ادا کرتی ہے۔ یہ ایک زمانے کا اختتام اور ایک نئے دور کا آغاز ہے۔ ایک نئی امید جگانے، نئے وسائل کو فروغ دینے اور قوم پرستی کے جذبہ کو پھر سے متحرک کرنے کے اہداف کے تئیں خود کو نچھاور کر کے واجپئی سرکار آزاد ہندوستان کی تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز کرتی ہے، جس سے ہندوستان اکیسویں صدی کے چیلنجوں کا سامنا کرنے کے لیے پوری طرح سے تیار ہو سکے۔'

اپنی تاریخ میں ایک نئی اور تاریخی تبدیلی کی دہلیز پر کھڑی پارٹی کے سامنے درپیش چیلنجوں پر غور و فکر کرنے کے لیے میں نے قومی مجلس عاملہ کی میٹنگ میں اپنی آخری صدارتی تقریر★ کا استعمال کیا۔ میں نے محسوس کیا کہ ایک کم سے کم مشترکہ پروگرام کی بنیاد پر ایک الائنس سرکار

★ مجبوری حالات کے سبب بی جے پی کے صدر کے طور پر یہ میری آخری تقریر ثابت نہ ہو سکی۔ اکتوبر 2004 میں مجھے پھر سے پارٹی کی صدارت کی کمان سنبھالنے کے لیے کہا گیا۔

چلانے میں اندرونی مجبوریوں کے ساتھ ساتھ مواقع کو بھی پارٹی کارکنان اور حمایتیوں کے سامنے رکھنا ضروری ہے۔ چونکہ یہ موضوع ہمارے ہم خیال بھائیوں 'سنگھ پریوار' جس کے تئیں بی جے پی اعتماد رکھتی ہے، کے سامنے بحث کے لیے بار بار آتا رہا ہے۔ آئندہ صفحات میں ظاہر کیے گئے خیالات اہمیت کے حامل ہیں۔

یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ ہمارے انتخابی ایجنڈہ میں دیئے گئے تین ایشوز—اجودھیا، آرٹیکل 370 کا خاتمہ اور یکساں سول کوڈ کو بی جے پی کی پالیسی پر مبنی اتحاد کے ذریعہ اپنائے گئے نیشنل ایجنڈہ آف گورنیس سے باہر رکھنے کے ہمارے فیصلے کے بعد مخالفین نے بی جے پی کے مبینہ 'پوشیدہ ایجنڈا' کو لے کر کافی شور شرابہ کیا تھا۔ میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ 'وزیر اعظم نے ایوان میں یہ کہہ کر کہ سرکار صرف این اے جی کے تئیں پابند عہد ہے، نہ کہ کسی 'پوشیدہ ایجنڈا' کے تئیں، اس بے معنی الزام کی موثر طریقے سے تردید کردی ہے۔ چونکہ قومی مجلس عاملہ ایک پارٹی منچ ہے اور یہ تین ایشوز جو نیشنل ایجنڈا آف گورنیس کے دائرہ سے باہر رکھے گئے ہیں، بی جے پی کی فکری شناخت کے لیے خاص طور سے اہم ہیں۔ یہ توضیح کرنا کہ یہ ایشوز قوم پرستی کے ہمارے بنیادی خیالات سے کس طرح ہم پلّہ ہیں، میرا فرض ہے۔'

سب سے پہلے میں نے اس بات کی تصدیق کی کہ 'ہر وہ بات جس سے ہمارا جذباتی رشتہ ہے اور ہر وہ بات جس کے ساتھ ہم 1951 سے اب تک کے سیاسی سفر میں ساتھ ساتھ ہیں، وہ حب الوطنی اور قوم پرستی کا نتیجہ ہے۔ اس طرح جمہوریت، عدم طبقہ پرستی، صاف وشفاف حکومت، انصاف پر مبنی تقسیم، سماجی انصاف، مرد-خواتین مساوات، ریاستوں اور پنچایتی بلدیات کو مزید حق دینا، یہ سب اور کچھ دیگر ہدف، ہمارے لیے غیر جانبدار آزاد اصول نہیں بلکہ اجتماعی قوم پرستی کے تئیں پابند عہد میں پوشیدہ ہے۔ دوسرے یہ کہ کوئی بھی اصول خود میں با معنی نہیں ہوتا۔ وسیع تناظر میں ان کی معنویت اور اہمیت کا فیصلہ قومیت کے اعلیٰ اقدار کی روشنی میں ہوتا ہے۔ آج کے حالات میں قوم پرستی ہندوستان میں ایک مستحکم، طاقتور اور ایماندار سرکار کا مطالبہ کرتی ہے۔

میں نے وضاحت کی کہ 1998 کے پارلیمانی انتخابات، جس میں بی جے پی کو اپنی طاقت پر سرکار بنانے کے لائق مینڈیٹ نہیں ملا تھا، کے بعد ابھرے اتحاد کے لیے یہ فطری تھا کہ متعلقہ پارٹی اتفاق رائے سے اپنا کم از کم مشترکہ پروگرام طے کرے، لیکن مذکورہ بالا تینوں ایشوز کا کیا ہوگا جو ہماری نظریاتی شناخت بن چکے ہیں؟ کیا ہم نے ایسا اتحاد قائم کر کے کوئی موقع پرست یا غیر اصولی کام کیا ہے؟

اتنی بیباکی سے سوال پوچھنے کے بعد میں نے ان کا جواب دو نکات پر مرکوز کیا۔ پہلا یہ کہ 'قومی مفاد کے بنیادی حصوں کو چھوڑ کر، حکومت چلانے کے کام کا ایک بڑا حصہ کسی بھی نظریہ سے غیر وابستہ ہوتا ہے۔ دراصل قومی زندگی کے زیادہ تر حصوں میں بدعنوانی اور بے ایمانی سے پاک حکومت تبھی ممکن ہو پاتی ہے جب وہ سیاسی مطالبہ سے آزاد ہو۔ اس لیے اپنی چھپی ہوئی اہلیت کے باوجود کوئی ایشو اتنا دقیق، اصولی شکل اختیار کر لیتا ہے کہ اس کے سبب اتحادی حکومت یعنی مستحکم حکومت چلانا مشکل ہو جائے، تب اس ایشو کو چھوڑنا ہی مناسب ہوگا۔ ہم نے اپنے قومی ایجنڈا میں یہی کہا ہے۔'

دوسرے نکتہ پر آتے ہوئے میں نے ان تین بنیادی ایشوز کا دوبارہ ذکر کیا جس کے تئیں میں اور میری پارٹی پابند عہد ہے، لیکن ساتھ ہی قومی مجلس عاملہ کی میٹنگ میں برائے غور ایک نیا خیال پیش کیا۔ میں نے کہا کہ 'جہاں تک سرکار کا سوال ہے وہ نیشنل ایجنڈا کی پیروی کرے گی لیکن جہاں تک پارٹی اور قوم کا تعلق ہے، میں سمجھتا ہوں کہ صحیح طریقہ یہی ہوگا کہ ان تینوں ایشوز پر ایک پر امن اور تعمیری ڈائیلاگ جاری رکھا جائے۔'

خاص طور سے اجودھیا پر میں نے اپنی فکر زیادہ وضاحت کے ساتھ ظاہر کی۔ میں یہ کہنا چاہوں گا کہ اس فکر نے اجودھیا ایشو کا حل تلاش کرنے میں نہ صرف سرکار میں رہتے ہوئے 6 برسوں میں میری رہنمائی کی بلکہ وہ آج بھی جاری ہے۔ اس ایشوز کو عدالتی اور قانونی دونوں ضابطوں سے نکال کر صرف آپسی بات چیت کے ذریعہ ایک پرامن اور دوستانہ حل تلاش کیا جائے۔ آنے والی دہائی کا استعمال ہم صرف قومی تعمیر کے لیے کریں۔ دوسرے الفاظ میں ایک شاندار قومی مندر کی تعمیر کرنے کے لیے جس میں بھارت ماتا کی تمام اولادیں (خواہ ان کی ذات، مذہب یا علاقہ کچھ بھی ہو) پرامن، خوش حال اور حفاظت کے ساتھ رہ سکیں۔'

چونکہ بی جے پی پہلی مرتبہ مرکز میں برسراقتدار آئی تھی اس لیے میں نے ہر سطح پر اس کے لیڈروں اور کارکنان کی ذمہ داریوں کی شکل اور ان کی تاریخی اہمیت کے تئیں پارٹی کو بیدار کرنا ضروری سمجھا۔ بی جے پی کو فوری طور پر ایک مخالف پارٹی کی اپنی تنظیمی فکر کی ترجمانی کر کے اسے ایک حکمراں جماعت کی سوچ میں تبدیل کرنا ہوگا۔ اگر بی جے پی اپنی انتخابی کامیابی کو مستحکم کرنا چاہتی ہے اور ایک غیر معروف، کمزور اور خاندانی کانگریس کے ذریعہ خالی جگہوں کو بھرنا چاہتی ہے تو اسے ایک مستحکم اور بدعنوانی سے پاک حکومت عطا کرنے کا اپنا وعدہ پورا کرنا ہوگا۔ میں نے وارننگ دی کہ ذاتی فائدہ کے لیے ایڈمنسٹریٹو مشینری کے بے جا استعمال سے بچنا ہوگا، کیونکہ انھیں برائیوں کی وجہ سے کانگریس کو بدنامی ملی تھی۔ اپنی پارٹی کی توجہ 'گٹھ بندھن دھرم' کی ناگزیریت کی جانب دلاتے ہوئے میں نے کہا کہ 'حکمراں ایلائنس میں سب سے بڑی پارٹی بلکہ اتحاد کا دماغ، دل اور روح ہونے کے سبب بی جے پی کو ذمہ داری کا شدید احساس، دوراندیشی اور اعتماد کے ساتھ کام کرنا ہوگا۔ میں اپنے تمام ساتھیوں سے اس حالت سے پیدا شدہ فطری بنیاد اور عملی ضروریات کو اچھی طرح سے سمجھانے کی گزارش کروں گا۔ مرکز میں کام کر رہے اتحاد کا مفاد مقدم ہے۔ ریاستوں میں پارٹی کی حکمت عملی اس کی قومی حکمت عملی کی کامیابی میں معاون ہونی چاہیے۔

تنظیمی مورچہ پر میں نے کہا کہ 'عملی سطح پر ان سب باتوں کا مطلب یہ ہے کہ بی جے پی ایمانداری اور منظم طریقے سے خود کو ایک ایسی پارٹی میں تبدیل کرلے جو سماج کے سبھی طبقوں اور ہندوستان کے تمام تر علاقوں کے مفاد میں کام کرے۔ ہر ایک ہندوستانی خواہ وہ کسی بھی ذات، علاقہ، نسل یا زبان سے متعلق کیوں نہ ہو، کو انفرادی اور اجتماعی زندگی میں یکساں مقام ملنا چاہیے۔' میں نے اپنی تقریر، جسے میں اپنی سیاسی زندگی کی اہم تقریروں میں سے ایک مانتا ہوں، کا اختتام اپنے پارٹی معاونین سے اس اپیل کے ساتھ کیا کہ 'بی جے پی کو اب ایک 'نئی بھاجپا' بننا ہوگا کیوں کہ صرف ایک نئی بھاجپا ہی بھارت اور ہماری پارٹی دونوں کے لیے ایک ترقی یافتہ دور کی ذمہ داریوں کو باربرداری کر پائے گی۔ بی جے پی گزشتہ کل کے ایشوز پر نہیں بلکہ آنے والے کل کے ایجنڈے پر چلے گی۔ نئی بھاجپا دنیا کے بدلتے حالات پر گہری نظر رکھے گی اور ہندوستان کو اکیسویں صدی کے چیلنجوں کا سامنا کرنے کا اہل بنائے گی۔'

پوکھرن-II: بھارت نیوکلیائی طاقت بنا

واجپئی حکومت پوری سنجیدگی سے سرکار چلانے میں مصروف ہوگئی۔ اس کا پہلا اور سب سے اہم کام وہ تھا جو 1967 سے لے کر اب تک کے ہمارے انتخابی اعلان ناموں میں ایک بڑے وعدے کی شکل میں موجود تھا، وہ تھا ہندوستان کو نیوکلیائی طاقت بنانا۔ جیسا کہ اس باب میں میں پہلے بتا چکا ہوں کہ ایک مرکزی وعدہ کے طور پر اسے ہم اپنے کم از کم مشترکہ پروگرام میں شامل کرانے کے لیے اپنے ایلائنس کے ساتھیوں کو راضی کرنے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ اس حقیقت (ہماری سرکار نے اقتدار میں آنے کے دو ماہ کے اندر یہ وعدہ پورا کر دکھایا۔) نے یہ مطلع صاف

کر دیا کہ ہم میں اپنے قول کو عمل آوری میں تبدیل کرنے کی قوت ہے۔

جب میں پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو پاتا ہوں کہ ہندوستان کی ترقی میں واجپئی سرکار نے بے بہا کارنامے انجام دیئے ہیں۔ مثلاً شاہراہ، دیہی سڑکیں، نشریات، انفارمیشن ٹیکنالوجی اور انرجی وغیرہ کے میدان میں قابل تحسین کام ہوئے۔ ہماری سرکار کی سب سے بڑی حصولیابی یہ تھی کہ اس نے ہندوستان کے اندر اور باہر رہنے والے ہندوستانیوں کے دل میں فخر اور خود اعتمادی پیدا کی۔ انھیں یہ احساس ہوا کہ ماضی میں ہمارا ملک عظیم تھا اور مستقبل میں اور بھی عظیم ہوگا۔ اس قومی بیداری میں بلاشبہ ایک اہم اشتراک 11 رمئی 1998 کے اس تاریخی واقعہ کا تھا جس نے ہمارے دیگر ترقیاتی کاموں کے ساتھ ساتھ، ہندوستان کو طاقتور، خوش حال اور خوددار بنانے کے ہمارے ارادے کی تصدیق کی۔

جس مسرت بخش دن کو بی جے پی کا یہ برسوں پرانا وعدہ ایک حقیقت میں تبدیل ہوا ہے، وہ بدھ پورنیا کا دن تھا۔ گوتم بدھ کا یوم پیدائش، دن پیر تھا، شمالی ہند کے سب سے گرم ماہ کا ایک گرم دن۔ اسی دن صبح اٹل جی صفدر جنگ روڈ والی رہائش گاہ چھوڑ کر سرکاری رہائش، 7-ریس کورس روڈ میں آگئے تھے۔ گھر میں داخل ہونے کے موقع پر پوجا ارچنا ختم ہو چکی تھی، لیکن اس سے کہیں زیادہ اہم بات کی وجہ سے وہ دن ان کے لیے اور قوم کے لیے یادگار بننے والا تھا۔

وزیر اعظم کی رہائش گاہ کے ایک کمرہ میں ہم 7 افراد بیٹھے تھے۔ اٹل جی، وزیر دفاع جارج فرنانڈیز، پلاننگ کمیشن کے نائب صدر جسونت سنگھ، وزیر مالیات یشونت سنہا، وزیر اعظم کے سیاسی مشیر آنجہانی پرمود مہاجن، وزیر اعظم کے چیف سکریٹری برجیش مشرا اور میں۔ ہم بے صبری سے راجستھان کے ریگستان پوکھرن سے ایک خوش خبری کا انتظار کر رہے تھے۔ شام 4 بجے کے قریب ریکس لائن پر اطلاع ملی کہ 'تجربہ کامیاب' ہوا۔ ہندوستان کے ایٹمی سائنس داں کامیابی کے ساتھ ایک ساتھ تین ایٹمی دھماکے کر کے ہندوستان کے ایک نیوکلیائی اسلحہ سے مزین ملک بن کر ابھرنے کا اعلان کر چکے تھے۔ کمرے میں بیٹھے ہم میں سے کوئی بھی اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا۔ وہاں جمع لوگوں میں اس معاملہ میں شاید سب سے کمزور میں اپنے آنسوؤں کو نہ روک سکا۔

اٹل جی نے ان سائنس دانوں کا شکریہ ادا کیا، جنھوں نے اتنا بڑا کام کر دکھایا تھا، خاص طور سے دفاعی تحقیق و ترقیاتی ادارہ (ڈی آر ڈی او) کے چیف ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام، محکمہ نیوکلیائی توانائی (ڈی اے ای) کے چیف آر چدمبرم، ڈاکٹر انل کاکوڈکر (جواب ڈی اے ای کے چیف ہیں) اور ڈی آر ڈی او کے چیف مشیر ڈاکٹر کے سنتھانم۔ اس کے بعد وزیر اعظم نے اپنی رہائش گاہ کے لان میں جا کر میڈیا کے سامنے یہ اعلان کیا کہ 'آج 3:45 بجے، بھارت نے پوکھرن رینج میں تین زیر زمین ایٹمی تجربے کیے۔ یہ تجربے ایک فشن ڈیوائس، ایک لو ایلڈ ڈیوائس اور ایک تھرمو نیوکلیئر ڈیوائس کے ذریعہ کیے گئے۔ ناپے گئے ایلڈس درکار پیمانہ کے مطابق ہے۔ میجرمنٹ نے اس بات کی تصدیق کی ہے کہ فضا میں کوئی ریڈیو ایکٹیویٹی نہیں چھوڑی گئی ہے۔ مئی 1974 میں کیے گئے دھماکوں کی طرح یہ انڈر کنٹرول دھماکے تھے۔ ان کامیاب تجربوں کو انجام دینے والے سائنس دانوں اور انجینئروں کو میں تہہ دل سے مبارک باد پیش کرتا ہوں۔'

13 رمئی کو پوکھرن میں دو ایٹمی تجربے اور کیے گئے۔ اس طرح زیر زمین انڈر کنٹرول تجربوں کی یہ سیریز پوری کر لی گئی۔ مغربی ممالک کی راجدھانیوں میں بیٹھے حکمرانوں کو جس بات نے حیرت زدہ کر دیا وہ تھی ہندوستان کے اس عظیم تجربوں کے راز کا پتہ لگانے میں ان کے خفیہ نظام کی ناکامی۔ ان دو سلسلہ وار تجربوں کے بارے میں 27 رمئی کو پارلیمنٹ میں تقریر کرتے ہوئے وزیر اعظم واجپئی نے کہا کہ 'ہندوستان اب ایک نیوکلیئر ٹیکنالوجی سے لیس ملک ہے۔ یہ کسی طاقت کے ذریعہ عطا کردہ اعزاز نہیں ہے۔ یہ اہلیت پوری طرح خود کی ایجاد کردہ ہے۔ ہندوستان،

انسانی آبادی کا چھٹا حصہ اس کی اتھارٹی ہے۔' انھوں نے واضح کیا کہ 'ہندوستان نیوکلیئر ٹیکنالوجی کا استعمال کسی ملک پر حملے کی نیت یا اسے دھمکانے کے لیے نہیں کرے گا۔ یہ یقینی بنانے کے لیے ہے کہ ہندوستان کسی نیوکلیئر ٹیکنالوجی سے لیس طاقت کی دھمکی یا دباؤ میں نہ آئے۔ اسے صرف خودتحفظ کے لیے ایٹمی ٹیکنالوجی کی ضرورت ہے۔

وزیراعظم کے اعلان سے ہندوستان اور بیرون ملک میں رہنے والے ہندوستانیوں کے دل میں خوشی اور حب الوطنی کی عظمت کی لہر دوڑ گئی۔ ان جذبات کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ان تجربوں کا کوڈ نام 'آپریشن شکتی' تھا جو ہندوستانی عوام کی عکاسی کرتا ہے۔ ہندوستان ایک ہزار سے بھی زیادہ برسوں سے حملہ آوروں کی اعلیٰ فوجی طاقت کے سبب غیرملکی حملوں کا شکار رہا، اس لیے 1947 میں جب ہندوستان برطانوی حکومت سے آزاد ہوا، ان لوگوں کے لیے جو قوم پرست نظریہ کے حامی تھے، قوم کا تحفظ اوّلین مقصد بن گیا تاکہ شکست اور غلامی کا قصہ اب کبھی بھی نہ دوہرایا جائے، اس لیے شدید خطرات کے باوجود قوم کی حفاظت کرنے اور موزوں ٹیکنالوجی کو فروغ دینے میں خودکفیلی ان کے لیے ایک اٹل اصول بن گیا۔

یہ افسوس کی بات ہے کہ آزادی کے بعد نہرو کی قیادت میں کانگریس اور سرکار دونوں ہی اس عوامی جذبہ کو اتنی اہمیت نہیں دیتے تھے اور اس لیے یہ پہلو صحیح طریقے سے ظاہر نہ ہوسکا۔ قومی سلامتی کے تئیں ان کی سردمہری ایک ریاکاری اور لعنت و ملامت کی حد تک جاتی تھی۔ مابعد آزادی کے قومی واقعات میں کوئی بھی واقعہ اتنا تکلیف دہ نہیں تھا جتنا کہ 1962 کی فوجی شکست اور ہندوستان کی اراضی کے ایک حصہ پر قبضہ کرلیا جانا تھا۔

بھارت کے انسداد نیوکلیئر: 1964 سے اب تک ہماری ناقابل تبدیل پالیسی

بی جے پی میں شامل ہم لوگوں کے لیے پوکھرن-II ایک خاص فخر کا موضوع تھا، کیونکہ 1964 سے ہی ہم سب مطالعہ کررہے تھے کہ ہندوستان اپنا خودکفیل نیوکلیائی ٹیکنالوجی فروغ دے۔ 1962 کے تجربہ کے علاوہ ہمیں ایسا کرنے کے لیے جس بات نے ترغیب دی وہ تھی جون 1964 میں چین کے ذریعہ لیپ نار میں ایک بنیادی تجربہ کرنے کے بعد خود کو ایک زرخیز نیوکلیائی ٹیکنالوجی طاقت ہونے کا اعلان کیا جانا۔ مجھے یاد ہے کہ بھارتیہ جن سنگھ کی مرکزی مجلس عاملہ کمیٹی نے دسمبر 1964 میں پٹنہ میں منعقد میٹنگ میں مندرجہ ذیل تجویز منظور کیا تھا:

> ''چین کے نیوکلیئر کلب میں شامل ہوجانے سے ہندوستان کی سلامتی کو جو خطرہ پیدا ہوگیا ہے اس کی شدت کو سمجھنے میں سرکار کی ناکامی پر بھارتیہ جن سنگھ شدید غم و غصہ ظاہر کرتا ہے۔ اس معاملہ میں سرکار کتنی تساہلی سے کام لے رہی ہے، وہ اس بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اتنے اہم معاملہ کو مرکزی کابینہ کے سامنے ٹیک رائے تک کے لیے نہیں بھیجا گیا ہے۔ بھارتیہ جن سنگھ ہمیشہ سے اس خیال کا حامل رہا ہے کہ ملک کی آزادی اور اتحاد و اتفاق منڈلا رہے شدید خطروں سے نمٹنے میں اہل اپنی فوجی طاقت مناسب طریقے سے بڑھانے کے قوم کے عہد کامل کو کسی نام نہاد امن پسندی کے سبب محدود نہیں کیا جانا چاہیے۔''

تجویز میں نہ صرف ہندوستان کی سلامتی کے سلسلے میں چین کے بم کے پوشیدہ مفاد کو سمجھنے سے انکار کرنے بلکہ اقتصادی بحران کا بہانہ بناکر، عوامی رائے کو مشکوک بنانے کے لیے بھی نہرو سرکار کی تنقید کی گئی۔ اس وقت یہ کہا گیا تھا کہ ہندوستان کی اقتصادیات ایٹمی بم بنانے کے خرچ کو برداشت نہیں کرسکتی۔ 'جن سنگھ بنیادی طور پر اس خیال سے متفق نہیں ہے۔ جہاں تک ملک کی سلامتی کا تعلق ہے، کوئی بھی قیمت بہت

زیادہ نہیں سمجھی جاسکتی۔ اس اہم بحث کے سلسلے میں ایٹمی توانائی کمیشن کے صدر ڈاکٹر ہومی جہانگیر بھابھا* کے حال کے بیانات نے یہ واضح کردیا کہ نیوکلیئر ٹیکنالوجی سے خود کو محروم رکھنے کی پالیسی کو کم سے کم اقتصادی بنیاد پر تو درست نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔'

جن سنگھ کی تجویز میں نہرو کی سوچ میں ایک اور بڑی غلطی کی جانب اشارہ کیا گیا کہ —

''یہ دلیل دینا کہ چین کے ایٹمی خطرے کا مقابلہ دنیا کے دیگر ملکوں کو اس کے خلاف کر کے کیا جاسکتا ہے، نہایت ہی طفلانہ ہے۔ حال ہی میں ختم ہوئی قاہرہ کانفرنس میں ہندوستان کا تجربہ اور یہ حقیقت کہ ایک بھی ملک نے چین کے بنیادی دھماکوں کی مذمت کرنے میں ہندوستان کا ساتھ نہیں دیا، ہماری آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی تھے۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ خودفریبی میں کانگریسی لیڈروں کی طاقت لامحدود ہے۔ قوم کا سروکار اس بات سے ہے کہ اس خصوصی ایشو پر بین الاقوامی اخلاقیات کے معاملہ میں سرکار کی خودفریفتگی نے ہندوستان کی سلامتی اور آزادی کو خطرے میں ڈال دیا ہے، اس لیے بھارتیہ جن سنگھ اس بات کو ضروری قرار دیتا ہے کہ ہندوستان اپنی دفاعی طاقت کو حاصل کرنے میں کوئی کوتاہی نہ کرے۔''

میں نے بھارتیہ جن سنگھ کی 1964 کی تجویز کی تفصیلی مثال اس لیے دی ہے کہ نیوکلیائی ٹیکنالوجی کے معاملے میں میری پارٹی کا رخ کیسے قومی سلامتی کے اعلیٰ سروکار سے متعلق تھا اور کیسے تب سے ہوئے بین الاقوامی واقعات نے ہماری سرکار کی 1998 میں کی گئی کارروائی کو درست ٹھہرایا ہے۔ میں یہاں یہ بھی بتادوں کہ بھارتیہ جن سنگھ کی تجویز اور 1998 کے تجربہ کے درمیان کے عرصے میں ہمارے ہندوستانی اور غیرملکی ناقدوں نے کئی مرتبہ ہم سے بھی سوال کیا تھا کہ ہندوستان جیسے امن پسند اور صبروتحمل والی سرزمین پر ہم نیوکلیائی تجربہ کرنے کو کیسے درست قرار دے سکتے ہیں؟ اس کے جواب میں، میں نے کہا تھا کہ ایک کمزور شخص بردبار ہونے کا ڈھونگ نہیں کرسکتا۔ میں اس سلسلے میں ہندی کے معروف قومی شاعر رام دھاری سنگھ دِنکر کی نظم کا ایک مصرعہ پیش کرتا ہوں:

'چھما شوبھتی اس بھوجنگ کو، جس کے پاس گرل ہو'

1964 سے ہی میرا یہ کامل یقین رہا ہے کہ ہندوستان کو حفاظتی ایٹمی ٹیکنالوجی سے لیس کرنا، اسے طاقتور بنانے کے لیے بہت ضروری ہے۔ ہر ملک کو اپنی حفاظت کرنے اور علاقائی و عالمی تحفظ کے پس منظر میں فطرت کے مطابق مناسب قدم اٹھانے کا حق ہے۔ میں نے دلیل دی کہ ایک غیریقینی دنیا جس میں کچھ بڑی طاقتیں ایٹمی ٹیکنالوجی سے لیس ہیں جو دیگر ممالک کے ساتھ ایٹمی امتیاز کی پالیسی اپناتی ہیں اور جو اس سے متعلق ناانصافی پر مبنی معاہدوں پر دستخط کرنے کے لیے ان پر دباؤ ڈالتی ہیں، میں ہندوستان کا تحفظ ہمیشہ دقت طلب رہے گا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اس حقیقت پر بھی زور دیا کہ بی جے پی اور اس سے پہلے بھارتیہ جن سنگھ نے ہمیشہ ایک مکمل، عالم گیر اور غیرجانبدار انسداد ایٹمی ٹیکنالوجی کا ایک لمبے عرصہ سے چلے آرہے ہندوستان کے مطالبے کی حمایت کی ہے۔ اس طرح عالمی امن کے تئیں میری پارٹی کا عہد، ایک ایسا عہد جس پر وہ ہندوستان کی ہر ایک سیاسی پارٹی کے ساتھ یک رائے ہے اور صرف خود حفاظتی کے مقصد سے انسداد ایٹمی طاقت کی ہماری وکالت

---

* ہندوستانی ایٹمی پروگرام کے چیف ڈاکٹر ہومی جہانگیر بھابھا کو اس بات کا پتہ تھا کہ چین والے ایٹمی تجربہ کا منصوبہ بنارہے ہیں اور اسی لیے وہ خوشی سے مسلسل سرکار کو خبردار کررہے تھے کہ چین کے اس منصوبہ کا سامنا کرنے کے لیے خصوصی کوشش کرنے کی ضرورت ہے۔ 4راکتوبر 1964 کو لندن کے سفر کے دوران انھوں نے اعلان کیا کہ اگر فیصلہ لیا جائے تو ہندوستان 18 ماہ میں ایٹمی بم کا دھماکہ کرسکتا ہے، لیکن انھوں نے یہ بھی استقامت کے ساتھ کہا کہ 'میں نہیں سمجھتا کہ ایسا فیصلہ لیا جائے گا۔' (انڈیاز نیوکلیئر بامب: اِمپیکٹ آن گلوبل پرولی فریشن، یونیورسٹی آف کیلیفورنیا پریس 1999، صفحہ 65)

کے بیچ کوئی اندرونی اختلاف نہیں رہا ہے۔

ایٹمی ایشو یا قومی دفاع سے متعلق دیگر کسی بھی معاملہ میں کانگریس سرکار نے جب بھی کوئی صحیح فیصلہ لیا ہے، اس کی تائید کرنے میں ہمیں کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہوئی ہے۔ اس طرح اندرا گاندھی کی سرکار نے 18 رمئی 1974 کو جب نیوکلیائی تجربہ کیا (پوکھرن-1) تو میری پارٹی نے بغیر کسی پس وپیش کے اسے مبارک باد دی۔ وہ بھی اس سچائی کے باوجود کہ اس وقت کانگریس پارٹی اور وزیراعظم سے ہمارے سیاسی تعلقات بے حد کشیدہ تھے۔ 2 رجون 1974 کو پاس کی گئی ایک تجویز میں جن سنگھ کی مرکزی مجلس عاملہ 18 رمئی کو 'بھارت کی تاریخ کا ایک یادگار دن' بتایا اور کہا کہ 'پارٹی ان ہندوستانی سائنس دانوں کو سلام کرتی ہے جنھوں نے ہندوستان کو دنیا کے ایٹمی نقشے پر لا کھڑا کیا ہے۔' 'دی مدر لینڈ' میگزین میں شائع اپنے ایک مضمون میں، میں نے لکھا کہ 'حالیہ برسوں میں صرف دو مرتبہ لوگوں نے پورے ملک کو خوش ہوتے دیکھا ہے۔ پہلی مرتبہ اس وقت جب بنگلہ دیش کو آزاد کرانے کے لیے ہندوستانی فوج ڈھاکہ میں داخل ہوئی تھی اور اب جب ہندوستان نے نیوکلیئر کلب میں داخلہ لیا ہے۔ یہ دیگر بات ہے کہ اندرا گاندھی کی سرکار نے اسے ایک 'پرامن بنیادی دھماکہ' بتایا ہے اور ہندوستان کو ایک ایٹمی اسلحہ سے آراستہ ملک بننے کی خواہش سے انکار کیا ہے۔'

یہ حقیقت سب پر ظاہر ہے کہ جدید ایٹمی تجربہ کرنے کی تجویز 1974 سے اب تک کانگریس اور کانگریس حامی سرکاروں کے زیرِغور رہی تھی، لیکن کسی نے بھی ایسا کرنے کی جرأت نہیں کی۔ کچھ نے تو بیرونی دباؤ کے سبب عین وقت پر قدم پیچھے کھینچ لیے۔ اس حقیقت کی تصدیق عمومی طور پر سابق صدر جمہوریہ آر وینکٹ رمن جیسی شخصیت نے کی۔ انھوں نے بھارت کے وزیر دفاع کی اپنی مدت کار کی ایک مثال دی۔ 27 رمئی 1998 کو وزیراعظم اٹل بہاری واجپئی کو مبارک باد دیتے ہوئے انھوں نے لکھا کہ 'اٹل جی نے وہ شجاعت دکھائی ہے جو سابقہ کانگریس سرکاروں میں نہیں تھی۔' انھوں نے لکھا کہ '1983 میں جب وہ وزیر دفاع تھے تو پوکھرن میں زیرزمین ایٹمی تجربہ کے لیے سبھی تیاریاں کر لی گئی تھیں۔ میں تیاریاں دیکھنے کے لیے وہاں گیا تھا لیکن بین الاقوامی دباؤ کے سبب اسے ملتوی کر دیا گیا۔ اسی طرح 1995 میں بھی ہوا۔'

'انڈیا ٹوڈے' میں شائع ایک کور اسٹوری سے بلاواسطہ طور پر اس بات کی تصدیق ہوئی کہ 'سابقہ سرکاروں نے دباؤ کا سامنا مسئلہ سے بچ کر چلنے اور آخری فیصلہ کو ملتوی کرنے کی کوششوں سے کیا۔ واجپئی نے نافرمانی کا ڈرامائی مظاہرہ کرتے ہوئے بیل کو سینگوں سے پکڑا۔ اس عمل میں انھوں نے ہماری خارجہ پالیسی کو قوم پرستی کی بلندیوں تک پہنچایا ہے۔ یہ ایک ایسا کام تھا جسے سابقہ سرکاریں خود کرنا چاہتی تھیں مگر ان میں ضروری سیاسی قوتِ ارادی کا فقدان تھا۔'

امید کے مطابق ہی پوکھرن-II کے تجربہ کے ایک ہفتہ کے اندر ہی پاکستان نے بلوچستان میں واقع چگائی ٹیسٹنگ رینج میں زیرزمین نیوکلیائی دھماکہ کرکے ہماری تقلید کی، لیکن بھارت اور پاکستان کی ایٹمی دفاعی پالیسیوں میں کافی فرق تھا۔ پاکستان کے مکمل طور پر ہندوستان پر مرکوز ایٹمی اسلحہ پروگرام کے برعکس بھارت کا پروگرام پاکستان پر مرکوز نہیں ہے۔ وہ ہماری دفاع کے لیے حال اور مستقبل میں علاقائی اور عالمی چیلنجوں کے پیش نظر بنایا گیا ہے۔ پاکستان پہلے استعمال نہ کرنے کے کسی قول سے بندھا ہوا نہیں ہے جبکہ بھارت ہے۔ پاکستان کی نیم پختہ تخلیق کافی حد تک چین کے تعاون سے وجود میں آئی ہے، جس میں کچھ خفیہ ذرائع کا بھی رول ہے۔ بھارت کی تخلیق خود انحصاری پر مبنی ہے۔

سب سے اہم فرق یہ ہے کہ بین الاقوامی برادری جہاں بھارت کو ایک ذمہ دار ایٹمی طاقت کے حامل ملک کی شکل میں قبول کرتا ہے وہیں غیرقانونی ایٹمی اسلحوں کی توسیع میں پاکستان کے راست ملوث ہونے کے سبب اس کے تئیں سخت نظر رکھتی ہے۔ دراصل پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے بانی ڈاکٹر عبدالقدیر خاں جوان کے ملک میں 'اسلامک بم' کے خالق کے طور پر معروف ہیں، نے جنوری 2004 میں ایٹمی اسلحہ جات

ٹیکنالوجی کے پاکستان سے لیبیا، ایران اور شمالی کوریا کو منتقل کرنے میں اپنا ہاتھ ہونے کی بات کا اعتراف کیا ہے۔

شجاعتی اور اصولی کاموں میں خطرہ تو ہوتا ہی ہے جو بھارت کے لیے امریکہ اور دیگر بڑی طاقتوں کے ذریعہ لگائی گئی پابندیوں کی شکل میں سامنے آیا، لیکن یہ پابندی بھارت کو دھمکانے یا زیادہ نقصان پہنچانے میں ناکام رہی۔ ہم نے ان کا سامنا استقامت اور انکساری سے کیا۔ صحیح معنوں میں انہی میں سے کچھ ممالک، جنھوں نے پابندی عائد کی تھی، نے بعد میں بھارت کو ایک ذمہ دار ایٹمی طاقت کا حامل ملک کہہ کر اس کی تعریف کی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زیادہ تر پابندیاں ختم کردی گئیں۔ حقیقی معنوں میں بین الاقوامی برادری میں ہمارے تنقید نگار ہم سے تعلقات پھر سے استوار کرنے کے لیے جس تیزی سے آگے آئے وہ خود میں ایک ایسی حصولیابی تھی جس کی مثال عالمی شاطرانہ پالیسی میں کم ہی ملے گی۔ ان سب باتوں سے دنیا میں بھارت کا قد اور عزت بڑھی۔ میں نے بھارت اور غیر ملکوں میں قیام پذیر لاتعداد ہندوستانیوں کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ پوکھرن میں بھارت سرکار کی کارروائی اور مابعد پوکھرن ڈپلومیسی سے نہ صرف ان کا سر فخر سے اونچا ہوا ہے بلکہ غیر ملکی بھی بھارت اور ہندوستانیوں کی پہلے سے زیادہ عزت کرنے لگے ہیں۔

کانگریس اور کمیونسٹوں کے ذریعہ کی گئی تنقید

جس بات سے سرکار میں بیٹھے ہم لوگ حیران رہ گئے وہ تھی ملک میں کانگریس اور کمیونسٹ لیڈروں کے ذریعہ کی گئی تنقید۔ کانگریس کی طرف سے تنقید کسی اور نے نہیں، موجودہ وزیر اعظم ڈاکٹر منموہن سنگھ نے کی جو اس وقت راجیہ سبھا میں حزب مخالف کے لیڈر تھے۔ 1998 میں پارلیمنٹ کے مانسون سیشن میں ایک بحث میں حصہ لیتے ہوئے ڈاکٹر سنگھ نے تجربوں کے نتائج اور ارزاں اسلحہ جاتی مقابلہ، جو دفاعی اخراجات کو آسمان پر لے جائے گا—اس پوائنٹ تک جہاں 'حفاظت کرنے کے لیے کچھ باقی ہی نہ رہ جائے گا' کے سلسلے میں انتباہ دیا۔

کانگریس صدر سونیا گاندھی کا ردعمل 'ڈھلمل' تھا۔ ایک طرف یہ خوش آئند عوامی جذبے کی بے دلی حمایت تھی وہیں دوسری جانب یہ قابل مذمت بھی تھا۔ کانگریس صدر سونیا گاندھی پر سلمان خورشید اور منی شنکر ایّر جیسے کانگریسی لیڈروں کا دباؤ تھا جو ان تجربوں کو اسلحہ جاتی مقابلہ کا نقیب بتا کر اس کی مذمت کرنا چاہتے تھے۔ وہ ہچکچائیں اور آخر میں عوامی جذبہ کی طاقت کے آگے جھک گئیں۔ ایک ذرائع کے مطابق— 'کانگریس پارٹی منقسم تھی'۔ 11 مئی کو کانگریس صدر نے تجربوں کی تنقید کرنے والے بیان کا مسودہ تیار کرلیا تھا، لیکن سینئر کانگریسی لیڈر شرد پوار نے ایٹمی سائنس دانوں کو ان کی حصولیابی کے لیے پہلے ہی مبارکباد دے دی جس کی وجہ سے انھوں نے اپنے بیان کو تھوڑا بدلا۔

مارکسوادی کمیونسٹ پارٹی نے سرکار پر بھارت کی ایٹمی پالیسی کو بلاوجہ الٹ دینے کا الزام لگایا۔ 1999 میں 'گن شکتی' اخبار میں شائع ایک مضمون، جس کا عنوان تھا 'پوکھران-II: بھاجپا کی نقصان دہ وراثت' میں پرکاش کرات، جو بعد میں مارکسوادی کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سکریٹری ہوئے، نے لکھا کہ 'پوکھرن تجربوں کے بعد کے ایک برس نے اس فیصلے کے بھرم کو اچھی طرح سے اُجاگر کردیا ہے۔ بھارت زیادہ طاقتور بن کر نہیں ابھرا بلکہ اس بے حوصلہ پالیسی کی وجہ سے کمزور ہوا۔ بین الاقوامی نقطہ نظر سے بھارت اپنے دوستوں اور ناوابستہ ممالک کی برادری سے الگ تھلگ پڑ گیا ہے۔'

کرات اور ان کے ساتھی کمیونسٹوں سے میرا یہ سوال ہے کہ 'کیا آپ نے کبھی چین اور سابقہ میں کمیونسٹ کے زیر انتظام سوویت یونین کی ایٹمی اسلحہ پالیسی کو ایک 'نقصان دہ وراثت' بتا کر اس کی مذمت کرنے اور اسے چھوڑ دینے کی مانگ کرنے کی جرأت کی ہے؟ یا آپ کا خیال یہ

ہے کہ اگر بھارت ایک نیوکلیئر طاقت سے لیس ہوتا ہے تو وہ ہمارے قومی دفاع کو کمزور بناتا ہے، جبکہ کوئی کمیونسٹ ملک نیوکلیئر طاقت سے لیس ہوتا ہے تو وہ ہمارے قومی دفاع کو مضبوط بناتا ہے۔'

بلاشبہ بھارت دفاعی ایٹمی اسلحہ جاتی نظام پر بحث 1998 میں ختم نہیں ہوگئی۔ 2007 میں امریکہ کے ساتھ ایک ایٹمی تعاون قرار پر دستخط کرنے کے مشترکہ ترقی پسند اتحاد (یو پی اے) سرکار کے فیصلے کے ضمن میں یہ بحث سیاسی طور سے اور بھی دھماکہ خیز شکل اختیار کر کے پھر سے ابھر آئی۔ مختصر یہ کہ یہ معاہدہ ایک ناہموار سمجھوتہ ہے جو توانائی سے متعلق تحفظ مہیا کرانے کا مشکوک وعدہ کرتے ہوئے پوکھرن-I اور II کی بھارت کی قابل فخر حصولیابی کی اہمیت کو کم کر دیتا ہے اور جنگی ایٹمی دفاع کے معاملہ میں ہماری آزادی اور یکجہتی کو ضرب پہنچاتا ہے۔

28 نومبر 2007 کو لوک سبھا میں ایک بحث کے دوران تفصیلی تقریر میں میں نے اس موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ میں نے کہا کہ جس طرح اندرا گاندھی نے 1974 میں پوکھرن-I کے ذریعہ بھارت کا سر فخر سے اونچا کیا تھا، اسی طرح 1998 میں پوکھرن-II کے ذریعہ اٹل جی نے بھارت کا سر مزید اونچا کر کے قومی طاقت اور قومی فخر کو بڑھایا ہے۔ بھارت-امریکہ نیوکلیائی معاہدہ اس بات کو یقینی بنائے گا کہ بھارت کا کوئی ممکنہ وزیر اعظم قومی دفاع کے لیے انتہائی ضروری ہوتے ہوئے بھی پوکھرن-III نہیں کر پائے گا۔ ایسا کرنا اس لیے ممکن نہیں ہوگا کیونکہ بھارت-امریکہ نیوکلیئر تعاون کو نافذ کرنے والا سمجھوتہ امریکی پارلیمنٹ کے ذریعہ پاس ہائڈ ایکٹ* میں اس بات کا التزام ہے کہ اگر بھارت نیا ایٹمی تجربہ کرے گا تو امریکہ بھارت کے خلاف قابل سزا اقدام اٹھا سکتا ہے۔ میں نے پوچھا کہ 'کون خوددار ملک اپنے ذریعہ دستخط کیے گئے کسی دوفریقی معاہدہ میں اپنے خلاف قابل سزا اقدام اٹھانا تسلیم کرے گا'۔

میں نے بحث میں اس بات پر زور دیا کہ کس طرح بھارت-امریکہ ایٹمی سمجھوتہ بھارت کو ایٹمی عدم توسیع معاہدہ کے دائرے میں (خواہ پچھلے دروازہ سے ہی) لایا جائے گا، جبکہ بھارت کے ہر وزیر اعظم، اندرا گاندھی سے واجپئی تک، نے اس معاہدہ کو جانب دارمان کرا سے ٹھکرا دیا۔ اسی تقریر میں، میں نے سونیا گاندھی کے ذریعہ اکتوبر میں ہریانہ میں ایک ریلی میں دیئے اس بیان کو قابل افسوس بتایا جس میں انھوں نے کہا تھا کہ 'ایٹمی معاہدہ کی مخالفت کرنے والے نہ صرف کانگریس کے بلکہ ملک کی ترقی کے بھی دشمن ہیں'۔

ہندوستانی آئین کے تحت مرکزی سرکار دیگر ممالک کے ساتھ دوفریقی سمجھوتوں پر دستخط کرنے کے لیے پارلیمنٹ کی منظوری لینے کے لیے مجبور نہیں ہے۔ عام سمجھوتوں کے لیے اسے پارلیمانی منظوری کی ضرورت نہ بھی ہو لیکن بھارت-امریکہ ایٹمی معاہدہ کی حالت بالکل مختلف تھی، جس میں یو پی اے سرکار کو نہ صرف حزب مخالف بھاجپا بلکہ بایاں بازو مورچہ میں شامل پارٹیوں کی بھی حمایت حاصل نہیں تھی، اس لیے میں نے اپنی تقریر میں یہ تجویز رکھی کہ ہندوستان کے آئین میں ایسی ترمیم کردی جانی چاہیے جس سے برسراقتدار سرکار کے لیے بھارت کی یکجہتی اور قومی دفاع سے متعلق کسی بھی دوفریقی معاہدہ پر دستخط کرنے سے پہلے پارلیمنٹ سے منظوری لینا لازمی ہوجائے۔ مجھے خوشی ہے کہ میری اس تجویز کو متعدد غیر کانگریسی پارٹیوں نے حمایت کی۔

★ ہنری جے-ہائڈ یونائیٹڈ اسٹیٹس-انڈیا پیپلز ایٹامک انرجی کوآپریشن ایکٹ 2006 بھارت اور امریکہ کے درمیان دوفریقی قانونی ڈھانچہ ہے جس کے تحت امریکہ، جس نے پہلے بھارت کو سول ایٹمی تکنیک اور ایٹمی ایندھن کی رسائی تک راہ مسدود کردی تھی، ہندوستانی سول پلانٹوں کو انٹرنیشنل ایٹامک انرجی ایجنسی (آئی اے ای اے) کے اصولوں کے مطابق تعاون دے گا۔ اگرچہ یہ ایکٹ واضح طور پر اشارہ کرتا ہے کہ اگر بھارت نے مستقبل میں کبھی ایٹمی تجربے کیے تو یہ اشتراک ختم ہوجائے گا اور امریکہ اپنا پلانٹ اور دیگر سپلائی شدہ اشیاء واپس لے لے گا۔

اٹل جی کی تاریخی لاہور بس یاترا

پوکھرن-II نے وزیراعظم واجپئی کی عزت اور ساتھ ہی ان کی سرکار کی مقبولیت کو کافی حد تک بڑھا دیا۔ یہ مظاہرہ کرنے کے بعد کہ وہ طاقت کے پجاری تھے، اسی طرح انھوں نے یہ ثابت کردیا کہ وہ امن کے بھی اسی طرح خواہاں تھے۔ بھارت اور پاکستان کے درمیان مستقبل امن اور اچھے پڑوسی تعلقات کا قیام اٹل جی کا مقصد تھا اور ان کے قریب کے تمام کابینی ساتھی اس ضمن میں پوری طرح ان کے ساتھ تھے۔ مرار جی دیسائی کی سرکار میں وزیر خارجہ کے طور پر دونوں ملکوں کے درمیان دوستانہ تعلقات قائم کرنے کی ان کی کوششوں نے زبردست اثر چھوڑا تھا۔ اب جب کہ بھارت اور پاکستان دونوں ہی زرخیز نیوکلیائی اسلحہ طاقت بن چکے تھے، ان مشکل ایشوز کا مستقل حل تلاش کرنا اور بھی ضروری ہو گیا تھا، جو دونوں کے درمیان عام طور سے کشیدگی اور نزاع پیدا کرتے تھے۔

امن کے قیام کے سلسلے میں 20 رفروری 1999 کو اٹل جی کو لاہور تک کی تاریخی بس یاترا کا خیال آیا۔ یاترا کا بالواسطہ مقصد دہلی اور لاہور کے درمیان سرحد پار تک ایک باضابطہ بس سروس کا افتتاح کرنا تھا۔ اس سروس کی پہلی بس سے سفر کر کے (انھوں نے امرتسر سے لاہور تک 60 کلومیٹر تک کا لمبا سفر کیا)، وزیراعظم نے بھارت اور پاکستان دونوں ملکوں کے عام شہریوں کا دل جیت لیا۔ یہ گزشتہ 10 برسوں میں کسی ہندوستانی وزیراعظم کا پہلا سفر پاکستان تھا۔

اٹل جی کی بس یاترا کے ذریعہ پاکستان کے ساتھ امن عمل پھر سے شروع کیے جانے کو پروفیسر راجندر سنگھ (رجو بھیا) جو اس وقت راشٹریہ سویم سیوک سنگھ کے چیف تھے، کی دعا شامل حال تھی۔ میں نے بھاجپا صدر کشا بھاؤ ٹھاکرے کو اٹل جی کے اس جرأت مندانہ قدم کے لیے خود واگھہ بارڈر جاکر پارٹی کی جانب سے انھیں مبارک باد دینے کا مشورہ دیا۔ اس طرح پارٹی سمیت پورے سنگھ پریوار این ڈی اے سرکار کی اس اہم حکمت عملی کی کوششوں کے پیچھے کھڑا تھا۔

پاکستان کے وزیراعظم مسٹر نواز شریف نے واگھہ بارڈر پر ہندوستانی وزیراعظم کا استقبال کیا۔ واجپئی نے انھیں اور پاکستان کی عوام کو کہا کہ وہ ایک امن کا پیغامبر بن کر آئے ہیں۔ اپنے اعزاز میں منعقد عشائیہ کی تقریب میں انھوں نے کہا کہ —

> ''لاہور سے دہلی تک کی بس سروس نہ صرف ایک ملک سے دوسرے ملک کا سفر آسان بنانے کے لیے ہے بلکہ دونوں ملکوں کے درمیان بس کا دوڑنا دونوں ملکوں کے شہریوں کے تعلقات خوشگوار بنانے اور ایک دوسرے کے پاس آنے کی خواہش کا منتظر ہے۔ اگر یہ صرف میٹل سے بنی ایک بس ہوئی تو اس سے نہ صرف ہمارے دو ملکوں میں بلکہ پوری دنیا میں اتنی گرم جوشی اور امیدیں روشن نہ کی ہوتیں۔ میں بھارت سے صرف ایک پیغام لے کر آیا ہوں۔ ہم ایک دوسرے پر بے اعتمادی چھوڑنے، تنازع کو ختم کرنے، مستقل امن، بھائی چارہ اور تعلقات بڑھانے سے اچھی وراثت چھوڑ کر نہیں جاسکتے۔''

دوسرے دن دونوں وزرائے اعظم نے 'لاہور اعلان نامہ' پر دستخط کیے جس میں تین اہم نکات تھے۔ اوّل یہ کہ اس نے 'شملہ معاہدہ' کو اس کے الفاظ اور جذبات دونوں کے مطابق نافذ کرنے کے دونوں ممالک کے ارادوں کو پھر سے ظاہر کیا۔ دوسرا یہ کہ اس میں یہ تسلیم کیا گیا کہ 'دونوں ملکوں کے دفاعی نظام میں ایٹمی معاملوں کے جڑنے سے تنازع سے بچنے کی ذمہ داری بڑھ جاتی ہے۔' تیسرا نکتہ بھارت کے لیے خصوصی اہمیت کا حامل تھا۔ پاکستان 'کسی بھی شکل میں دہشت گردی اور اس کا مظاہرہ' کی مذمت کرنے اور 'اس دانو (جن) کا مقابلہ کرنے کے اپنے عزم'

کو دوہرانے میں بھارت کے ساتھ ہو گیا تھا۔

واجپئی کا 'مینار پاکستان' جو 23 / مارچ 1940 کو برصغیر میں مسلمانوں کے لیے ایک الگ ملک بنانے کے لیے مسلم لیگ کی مانگ کا ایک میموریل تھا (جس کی ایک علامتی اہمیت تھی) جو جون 2005 میں میرے کراچی میں جناح کے مقبرے پر جانے سے مختلف نہیں تھا۔ میموریل میں رکھی وزیٹرس بک میں واجپئی نے اس بات کی تصدیق کی کہ 'ایک مستحکم، محفوظ اور خوش حال پاکستان بھارت کے مفاد میں ہے۔ پاکستان میں کسی کو اس پر شبہ نہیں ہونا چاہیے۔ بھارت دل کی گہرائیوں سے پاکستان کی بہتری چاہتا ہے۔' ان کے مینار پاکستان جانے اور وہاں مذکورہ پیغام تحریر کرنے سے پاکستانی سماج کے ایک طبقہ میں اس بھرم کہ 'پاکستان کے وجود کو بھاجپا نے اب تک تسلیم نہیں کیا ہے' کو دور کرنے میں کافی مدد ملی۔

مختصراً یہ کہ لاہور بس یاترا ایک بڑی کامیابی تھی۔ اس نے سرحد کی دونوں جانب یہ امید بڑھادی کہ جموں و کشمیر سمیت بھارت اور پاکستان کے درمیان کے تمام مشکل مسائل کا حل تلاش کرنے کی باقاعدہ ایک تحریک شروع ہو چکی ہے، لیکن تمام امیدیں بر نہیں آتیں۔ ناکامی اور بدعہدی سیاست اور حکومت میں اسی طرح زندگی کا ایک حصہ ہیں جس طرح غیر سیاسی کاموں میں۔ امن کی اس بس کو اغوا کر کے کارگل تک لے جایا گیا، جو پوری طرح پاکستان کے خصوصی اقتدار کے کھیل کا نتیجہ تھا۔ اگلے باب میں، میں کارگل بدعہدی اور بھارت کے ذریعہ لڑی اور جیتی گئی ایک شاندار جنگ پر گفتگو کروں گا۔

سرکار گرانے کا کانگریس کا منصوبہ کامیاب: ایک ووٹ کے فرق سے سرکار گری

پوکھرن-II کی طرح لاہور امن مہم سے بھی وزیراعظم کی ہردلعزیزی اور عوام کی نظر میں این ڈی اے سرکار کا قد اور اونچا ہو گیا۔ اسی ماہ فروری 1999 میں وزیر مالیات یشونت سنہا نے اپنا پہلا بجٹ پیش کیا جس کی چوطرفہ تعریف ہوئی۔ اس طرح حرف 'ب' سے شروع ہونے والے تین لفظوں بم، بس اور بجٹ نے این ڈی اے سرکار کا ایک سال مکمل ہونے سے پہلے ہی اس کی مضبوطی اور استحکام کے طریق کار کا اشارہ دینا شروع کر دیا تھا۔

ان سب باتوں سے خوف زدہ ہو کر کانگریس پارٹی غیر کانگریسی سرکاروں کو غیر مستحکم کرنے کے لیے اپنے پرانے کھیل میں سرگرم ہو گئی۔ اس نے حکمراں اتحاد میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش کی۔ افسوس کہ این ڈی اے کی ایک معاون پارٹی اے آئی اے ڈی ایم کے اس کی سازش کا شکار ہو گئی۔ کانگریس پارٹی کے ذریعہ مرکز سے ریاست کی ڈی ایم کے سرکار کو برخاست کرنے کی مانگ کرنے کے لیے اسے اکسایا گیا۔ ایک ایسی مانگ جسے واجپئی سرکار پوری نہیں کر سکتی تھی۔ اس سے شاید ہماری سرکار بچ جاتی، لیکن اس کی معتبریت کی قیمت پر۔ اٹل جی اور میں وہ گناہ کرنا نہیں چاہتے تھے جو کانگریس پارٹی نے مرکز میں اقتدار میں رہتے ہوئے مخالف پارٹیوں کی سرکاروں کو گرانے کے لیے آئین کے آرٹیکل 356 کا بار بار استعمال کر کے کیا تھا۔

14 / اپریل 1999 کو اے آئی اے ڈی ایم کے نے این ڈی اے سرکار سے حمایت واپس لے لی۔ ایک مرتبہ پھر صدر جمہوریہ کے آر نارائنن نے اس سلسلے میں اہم رول ادا کیا۔ انھوں نے وزیراعظم واجپئی سے تین روز کے اندر لوک سبھا میں اعتماد کا ووٹ حاصل کرنے کے لیے کہا۔ اتنے کم وقت میں بھی این ڈی اے کئی چھوٹی پارٹیوں کی حمایت حاصل کرنے میں کامیاب رہا۔ وزیراعظم کے ذریعہ رکھی گئی اعتماد کی تجویز پر ہوئی بحث کئی معنوں میں عجیب و غریب تھی۔ صحیح معنوں میں ایسا کوئی ایشو نہیں تھا جس پر سرکار گرانا جائز ہو۔ ہماری سرکار نے ایسا کون سا غلط کام

کیا تھا کہ اسے ہٹانے کی نوبت آئی؟ کیا کوئی ایسی قانونی وجہ تھی کہ ملک کو ایک اور وسط مدتی انتخابات کی طرف دھکیل دیا جائے؟ کوئی بھی نہیں۔ کانگریس پارٹی کو یہ بتانا مشکل ہو رہا تھا کہ وہ کیوں سرکار کو اقتدار سے باہر دیکھنا چاہتی ہے۔ کانگریس کا مقصد بی جے پی کو ایک فرقہ پرست پارٹی قرار دینا تھا، اس کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ جیسا کہ وزیر اعظم نے اپنی تقریر میں بتایا کہ ان کی سرکار اچھا کام کر رہی تھی۔ اس نے بھارت کو مضبوط بنانے کے لیے پوکھرن-II جیسے قدم اٹھائے تھے۔ ایسا قدم جس سے سابقہ سرکاریں برسوں سے بچتی آ رہی تھیں۔ جب جنوب مشرقی ایشیا کے ملک غیر معمولی اقتصادی بدحالی سے گزر رہے تھے، این ڈی اے سرکار نے بھارت کو اس سے بچائے رکھنے اور معیشت کو بچانے کے لیے ممکنہ طریقے اپنائے تھے۔ پورے ملک میں پرامن ماحول تھا۔ فرقہ وارانہ کشیدگی اور تشدد بہت حد تک کم ہو گئے تھے۔ اٹل جی نے کہا کہ 'مجھے کبھی کبھی حیرت ہوتی ہے کیونکہ سرکار گرانے کا کوئی ایشو ہی نہیں تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ بھارت کو مضبوط اور خوش حال بنانے کے لیے ہم ہر ممکن کوشش کر رہے تھے اور یہی وجہ تھی کہ ہماری سرکار کو گرایا جا رہا تھا۔' کانگریس اور ان کے حمایتیوں کو قوم کو یہ بتانے میں کہ این ڈی اے سرکار کے گرنے کی صورت میں ان کا اپنا منصوبہ کیا ہے اور متبادل ہے کہ نہیں، ایک مضحکہ خیز صورت اختیار کر لی۔ وزیر اعظم نے ان سے پوچھا کہ 'آپ کا وزیر اعظم کون ہوگا؟ نئی سرکار میں کون سی پارٹیاں شامل ہوں گی؟ آپ کے کم از کم مشترکہ پروگرام کا راز کیا ہوگا؟' مخالف پارٹیوں کے مقررین نے ان سوالوں کا مذاق اڑایا اور کہا کہ ہم پانچ منٹ میں متبادل پیش کر دیں گے۔

آخر میں جب تجویز پر اظہار رائے ہوا تو واجپئی سرکار معمولی فرق صرف ایک ووٹ سے شکست کھا گئی۔ 270 کے مقابلے اسے 269 ووٹ ملے اور وہ فیصلہ کن ایک ووٹ بھی اخلاقی و سیاسی نقطہ نظر سے ناجائز تھا، صرف تکنیکی اعتبار سے جائز تھا۔ وہ اڑیسہ سے ایک کانگریسی ممبر پارلیمنٹ گردھر گومانگو، جو اپنی ریاست میں وزیر اعلیٰ کے طور پر پہلے ہی حلف لے چکے تھے، لیکن انھوں نے اب تک لوک سبھا سے استعفیٰ نہیں دیا تھا، کانگریس منیجروں کے ذریعہ تجویز اعتماد کے خلاف ووٹ دینے کے لیے انھیں بھونیشور سے خصوصی طور سے بلایا گیا۔

جب رائے دہی کے نتیجہ کا اعلان ہوا تو ہم سب بہت مایوس ہوئے۔ ہم لوگ ایوان کے باہر نکل کر پارلیمنٹ میں وزیر اعظم کے چیمبر کمرہ نمبر 1 میں جمع ہوئے۔ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھتے ہوئے اٹل جی نے کہا کہ 'ہم ایک ووٹ سے ہار گئے، صرف ایک ووٹ سے۔' ان کے اور ان کی سرکار کے ساتھ جو کچھ کیا گیا تھا وہ حقیقت میں غیر معمولی تھا اور اس کمرہ میں جمع ہم تمام لوگ ان کے جذبات کو سمجھ سکتے تھے۔ ہم نے ایک آواز میں کہا کہ 'اٹل جی ہم نے ایک ووٹ سے بھلے ہی سرکار گنوا دی ہو، لیکن جب تازہ انتخابات ہوں گے اور ہم عوام کے پاس جائیں گے تب ہم ہر رائے دہندہ سے اس کے ایک ووٹ سے آپ کو پھر سے وزیر اعظم بنانے کے لیے کہیں گے۔'

سونیا گاندھی کی 'باہری آواز': 'مجھے 272 ممبران پارلیمنٹ کی حمایت حاصل ہے'

17 اپریل کو کانگریس اور دیگر حزب مخالف پارٹیوں کے لیڈروں نے کہا تھا کہ پانچ منٹ میں ایک متبادل سرکار کی تشکیل کر لیں گے، جبکہ حقیقت یہ تھی کہ پانچ دن گزر جانے کے بعد بھی وہ ایسا نہیں کر سکے۔ جیسے ہی واجپئی سرکار اقلیت میں آئی، غیر مستحکم کرنے کی سازش کے دو متوازی مخالف پہلو سامنے آ گئے۔ پہلا یہ کہ کانگریس پارٹی، جس کے لوک سبھا میں صرف 140 ممبران تھے اور کسی دیگر پارٹی کے ساتھ کوئی معاہداتی اتحاد بھی نہیں تھا، نے یہ ظاہر کر دیا کہ وہی اگلی سرکار کی قیادت کرے گی۔ ان کا غرور ایسا تھا اور زیادہ تر مخالف پارٹیوں کو وہ اتنی گری ہوئی نظروں سے دیکھتے تھے کہ سوائے سی پی آئی ایم کے جنرل سکریٹری ہرکشن سنگھ سرجیت کے (جو سازش کرنے والوں کے اندرونی گروپ میں شامل

تھے) علاوہ ان کے کسی لیڈر سے مشورہ کرنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی۔ وہ یہ سمجھ کر بیٹھے تھے کہ ان لیڈروں کے پاس ایک کانگریس کی پالیسی پر مبنی سرکار کو حمایت دینے کے علاوہ کوئی متبادل نہیں ہے۔

صدر جمہوریہ نارائنن نے اپنے سرگرم رول پھر نبھانے شروع کر دیئے۔ 20 اپریل کو انھوں نے آئندہ روز گفتگو کرنے کے لیے سونیا گاندھی کو مدعو کرتے ہوئے ایک خط لکھا۔ صدر جمہوریہ سے ملاقات کے بعد 21 اپریل کی شام کو راشٹرپتی بھون کے احاطہ میں الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کے صحافیوں کے سامنے سونیا گاندھی نے ایک تعجب خیز دعویٰ کیا کہ انھیں 272 ممبران پارلیمنٹ کی حمایت حاصل ہے اور وہ سرکار بنانے کی خواہاں ہیں۔ باہر سے حمایت لے کر کانگریس اپنی سرکار بنائے گی۔

این ڈی اے کے ہم سب لوگ سونیا گاندھی کے اس اعلان (جو نہ صرف یہ اشارہ دیتا تھا کہ وہ بھارت کی وزیر اعظم بننا چاہتی تھیں بلکہ لوک سبھا میں ان کے پاس ضروری اکثریت تھی) سے حیرت زدہ رہ گئے۔ حیرت زدہ ہونے والوں میں ہم تنہا نہیں تھے، غیر کانگریسی پارٹیوں کے کئی لوگوں کو بھی تعجب ہوا کہ کانگریس صدر ایسا سفید جھوٹ کیسے بول سکتی تھیں، وہ بھی راشٹرپتی بھون کے سامنے، کیونکہ حزب مخالف کا تخمینہ ان کے دعوے کو پوری طرح خارج کرتا تھا۔ یہ سچ ہے کہ مارکسوادی کیمونسٹ پارٹی اور بھارتیہ کیمونسٹ پارٹی کے لیڈروں نے کانگریس کی پالیسی پر مبنی سرکار کو بغیر شرط حمایت دینے کا اپنا فیصلہ صدر جمہوریہ کو بتا دیا تھا، لیکن کچھ طاقتور گروپوں، جو واجپئی سرکار کو گرانے کی سازش میں شامل تھے، پر ان کا بھی کوئی زور نہیں چلا۔

21 یا 22 اپریل کی دیر رات وزیر دفاع اور این ڈی اے کے کنوینر جارج فرنانڈیز نے مجھے فون پر کہا کہ 'لال جی میرے پاس آپ کے لیے ایک اچھی خبر ہے۔ سونیا گاندھی سرکار نہیں بنا سکتیں۔' میں نے پوچھا 'آپ کس بنیاد پر ایسا کہہ رہے ہیں۔' 'بہت جلد آپ مان جائیں گے۔ دوسرے گروپ کا ایک خاص شخص آپ سے ملنا چاہتا ہے، لیکن یہ ملاقات آپ کے یا میرے گھر پر نہیں ہو سکے گی۔ ہم لوگ سجان سنگھ پارک میں جیہ★ کے گھر پر ملیں گے۔ آپ اپنی کار سے مت آیئے گا، کیونکہ اس سے سیکورٹی دستہ آپ کے ساتھ ہوگا۔ جیہ آپ کو لینے جائیں گی اور آپ ان کی کار میں آئیں۔'

جب میں جیہ جیٹلی کے گھر پہنچا تو میں نے سماج وادی پارٹی کے صدر ملائم سنگھ یادو اور فرنانڈیز کو وہاں پایا۔ دونوں سماج وادی بیک گراؤنڈ کے ہیں اور ڈاکٹر رام منوہر لوہیا کے وفادار پیروکار رہے ہیں۔ ایک لمبے عرصے سے وہ دوست رہے ہیں اور 1990 کی دہائی کے آخر میں وی پی سنگھ سرکار کے ختم ہونے کے بعد الگ الگ سیاسی راستوں پر چلے جانے کے باوجود بھی ان کی دوستی برقرار ہے۔ کانگریس کے کٹر مخالف فرنانڈیز نے کہا کہ 'لال جی میرے دوست کا یہ پکا وعدہ ہے کہ ان کی پارٹی کے 20 ممبران پارلیمنٹ کسی بھی حال میں سونیا گاندھی کے وزیر اعظم بننے میں تعاون نہیں دیں گے اور میں انھیں اپنے ساتھ لایا ہوں تاکہ آپ کو اس بات کا مکمل یقین ہو جائے۔'

یادو نے اپنا وعدہ میرے سامنے دوہرایا، لیکن انھوں نے یہ بھی کہا کہ 'آڈوانی جی، میری ایک شرط ہے۔ اس سے پہلے کہ میں یہ اعلان کروں کہ سرکار بنانے میں ہم سونیا گاندھی کے ساتھ نہیں ہیں، میں آپ سے ایک وعدہ چاہتا ہوں کہ اس حالت میں این ڈی اے پھر سے سرکار بنانے کا دعویٰ پیش نہیں کرے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ انتخابات دوبارہ ہوں۔'

میں نے کہا 'ملائم جی، اس جرأت مندانہ فیصلہ کے لیے میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔ جہاں تک آپ کی دوسری بات کا تعلق ہے، میں

★ ایک معروف سماجی وسیاسی کارکن جیہ جیٹلی جارج فرنانڈیز کے ذریعہ قائم کردہ سمتا پارٹی کی صدر تھیں۔

آپ کو بتانا چاہوں گا کہ این ڈی اے میں ہی کئی لوگوں کا خیال ہے کہ ہمیں سرکار بنانے کا دعویٰ دوبارہ نہیں پیش کرنا چاہیے اور اس کے بجائے وسط مدتی انتخابات کا سامنا کرنا چاہیے۔'

یادو نے اپنا وعدہ نبھایا۔ 23 ر اپریل کو انھوں نے صدر جمہوریہ کو ایک خط دیا جس میں لکھا تھا کہ وہ کانگریس کی پالیسی پر مبنی سرکار کو حمایت نہیں دیں گے۔ آل انڈیا فارورڈ بلاک اور ریولیوشنری شوشلسٹ پارٹی، دونوں مارکسوادی کیمونسٹ پارٹی کی پالیسی پر مبنی بایاں بازو مورچہ کے ممبر، نمائندوں نے بھی اسی طرح کی اطلاع سے صدر جمہوریہ کو آگاہ کیا ہے۔ 23 ر اپریل کو جب سونیا گاندھی صدر جمہوریہ سے دوبارہ ملیں تو وہ صرف 233 حمایتی ممبران پارلیمنٹ کی فہرست دے پائیں، جو تعداد میں ان کے صرف دو دن پہلے کے دعوے 272 سے بہت کم تھی۔ غور طلب ہے کہ جب انھوں نے کچھ اور وقت مانگا تو صدر جمہوریہ نے انھیں دو دنوں کا وقت مزید دے دیا۔ جیسا کہ میرے معاون ارون شوری نے کہا 'راشٹرپتی کا تمام تر زور ایک اتحاد کے جانے اور ایک خاص اتحاد کے اقتدار میں آنے پر تھا' راشٹرپتی بھون سے اس دن جاری کیا گیا سرکاری بیان بہت کچھ ظاہر کرتا تھا 'مسز سونیا گاندھی نے ان 233 ممبران پارلیمنٹ کی فہرست صدر جمہوریہ کو دی جو ایک کانگریسی سرکار کی تشکیل میں انھیں حمایت دیں گے۔ جب انھیں بتایا گیا کہ یہ تعداد سرکار بنانے کے لیے ضروری تعداد سے کم ہے تو انھوں نے صدر جمہوریہ کو بتایا کہ وہ ان پارٹیوں اور لیڈروں سے بات چیت جاری رکھیں گی جنھوں نے 17 ر اپریل 1999 کو ہوئے تجویز اعتماد کے خلاف ووٹ دیا تھا اور اپنی کوششوں کے سلسلے میں جلد از جلد صدر جمہوریہ کو مشورہ دیں گی۔' این ڈی اے سے متعلق ہم لوگوں کے لیے یہ سمجھنا غیر یقینی تھا کہ سونیا گاندھی صدر جمہوریہ سے کہیں کہ اپنی کوششوں کے نتائج کے بارے میں وہ انھیں 'مشورہ' دیں گی۔ کون کس کو مشورہ دے رہا تھا؟ سونیا گاندھی صدر جمہوریہ کو؟

25 ر اپریل کو سونیا گاندھی نے صدر جمہوریہ سے پھر ملاقات کی اور انھیں مطلع کیا کہ وہ مزید ممبران پارلیمنٹ کی حمایت جٹانے میں لاچار ہیں۔ انھوں نے یہ بھی جانکاری دی کہ ان کی پارٹی کسی تیسرے مورچہ کی سرکار کی حمایت نہیں کرے گی۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ ان لوگوں کے لیے اور بھی نصیحت آمیز ہوگا جو راشٹرپتی بھون میں فائز عظیم المرتبت شخصیات کے کردار کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں۔ جب وزیر اعظم واجپئی نے 25 ر اپریل کی شام 8:40 بجے صدر جمہوریہ سے ملاقات کی تو نارائنن نے انھیں اطلاع دی — میں 26 ر اپریل کو صدر جمہوریہ کے دفتر سے جاری اعلان کا اقتباس پیش کر رہا ہوں کہ ''(الف) غیر بھاجپا پارٹی کوئی متبادل پیش کرنے میں ناکام رہے ہیں اور (ب) بھاجپا کی پالیسی پر مبنی اتحاد کو حمایت دینے والے ممبران پارلیمنٹ کی تعداد میں اضافہ کی کوئی اطلاع انھیں نہیں ملی ہے۔ صدر جمہوریہ نے وزیر اعظم کو اپنے اندازے سے واقف کرایا کہ بارہویں لوک سبھا مستحکم اور اطمینان بخش سرکار دینے میں بے استعداد ہے، اس لیے بارہویں لوک سبھا کو تحلیل کیا جانا ضروری ہو گیا ہے۔ وزیر اعظم نے اس کا جواب یہ کہہ کر دیا کہ وہ اگلے روز کابینہ میں اس صورتِ حال پر بات چیت کریں گے۔''

اگلی صبح اٹل جی نے جارج فرنانڈیز، جسونت سنگھ، پرمود مہاجن اور مراسولی مارن (ایک درمک لیڈر جنھوں نے این ڈی اے کو مضبوط بنانے میں مثبت رول ادا کیا تھا) کے پاس مجھے ان کی رہائش گاہ پر بلایا۔ ہم دوبارہ سرکار بنانے کے امکانات تلاش کرنے کے لیے صدر جمہوریہ سے بات چیت کرنے کے لیے مضطرب نہیں تھے، پھر بھی ہمیں یہ غیر مناسب لگا کہ صدر جمہوریہ نے ایک قلیل الرائے سرکار بنانے کے لیے واجپئی کو مدعو کرنے کے متبادل کو نظر انداز کرتے ہوئے بارہویں لوک سبھا کو تحلیل کرنے کا فیصلہ کیا جس نے اپنے پانچ سال کے مقررہ مدت کا ایک ہی سال پورا کیا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر گومانگو کے لائق سوال ووٹ کو گنتی میں نہ لیا جائے۔ ان کے اڑیسہ کا وزیر اعلیٰ بن جانے کے بعد ہر حال میں لوک سبھا سے استعفیٰ دینا ہی تھا۔ اس صورتِ حال میں واجپئی کے حق میں ٹھیک اتنے ہی ایم پی ہوتے جتنے ان کے برخلاف تھے۔ سب سے بڑی

بات یہ ہے کہ صدر جمہوریہ آر وینکٹ رمن نے ایک صحت مند مثال اس وقت پیش کی جب جون 1991 میں ہوئے لوک سبھا کے انتخابات کے بعد انھوں نے پی وی نرسمہا راؤ کو ایک قلیل الرائے سرکار بنانے کی اجازت دی تھی۔ حقیقت میں وہ سرکار دو برسوں تک کام کرتی رہی اور اسے کثرتِ رائے (میجارٹی) اس وقت ثابت کرنا پڑی جب حزب مخالف نے ان کی سرکار کے خلاف ایک بے اعتمادی کی تجویز پیش کی۔ دوسرے الفاظ میں یہ صدر جمہوریہ کا ذاتی فیصلہ تھا کہ جس سرکار کو مصدقہ طور پر 269 ممبران پارلیمنٹ کی حمایت حاصل تھی، اسے اقتدار میں رہنے کا کوئی حق نہیں تھا اور یہ کہ لوک سبھا کو تحلیل کیا جانا ضروری ہو گیا۔

اس کے کچھ ہی دیر بعد کابینہ کی میٹنگ میں ہم نے احتیاط سے تیار کیا تھا ایک دائرۂ عمل پاس کیا جس میں لوک سبھا کو تحلیل کرنے کی جواب دہی صاف طور سے صدر جمہوریہ کی تھی۔ 'صدر جمہوریہ کے ذریعہ کیے گئے صورتِ حال کے جائزہ (جیسا کہ 25 اپریل کو وزیر اعظم کو بتایا گیا تھا) کا احترام کرتے ہوئے کابینہ ان سے یہ سفارش کرنے پر فیصلہ لیتی ہے کہ وہ لوک سبھا کو تحلیل کر دیں۔' جس بات نے بعد میں ہمیں حیرت زدہ کر دیا وہ یہ تھی کہ 27 اپریل کو راشٹر پتی بھون سے جاری پریس ریلیز میں کابینہ کے دائرۂ عمل کے معنی اور مقصد کو ہی توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ '26 اپریل 1999 کی دوپہر 12 بجے کابینہ کی ایک میٹنگ منعقد کی گئی اور اس میں صدر جمہوریہ کو یہ سفارش کرتے ہوئے کہ وہ بارہویں لوک سبھا تحلیل کر دیں تا کہ عوام سے فوراً تازہ مینڈیٹ حاصل کیا جا سکے، ایک عملی توضیح ریکارڈ کی گئی۔ دائرۂ عمل کی صورتِ حال کے صدر جمہوریہ کے خود کے جائزہ سے مطابقت رکھتا تھا۔' یقینی طور پر یہ سچ نہیں تھا۔ صدر جمہوریہ کے ذریعہ کیے گئے حالات کے تجزیہ اور واجپئی سرکار کے تجزیہ میں کافی فرق تھا۔

بالآخر 26 اپریل کو لوک سبھا تحلیل کر دی گئی۔ یہ صدر جمہوریہ نارائنن کا ایک افسوسناک فیصلہ تھا، کیونکہ اس سے وہ ہدف بھی حاصل نہیں ہوا تھا جو خود راشٹر پتی بھون کی ریلیز میں کہا گیا تھا۔ اس کے پس پردہ صدر جمہوریہ کے دو اہم مقاصد تھے۔ (۱) وسط مدتی انتخابات کی ہدایت دینے سے بچنے کی ضرورت اور (۲) یہ دیکھنا کہ کیا کوئی پارٹی یا پارٹیوں کا اتحاد ایک ایسی کارگر اور متبادل سرکار بنا سکتا ہے جس کا بارہویں لوک سبھا کی بقیہ مدت تک چلنے کا امکان نہ ہو تو بھی ایک مناسب وقت تک چل سکے۔ اگر اس قانونی بنیاد پر کہ سونیا گاندھی کے حمایتی 233 ممبران پارلیمنٹ کے مقابلے انھیں 269 ممبران پارلیمنٹ کی حمایت حاصل تھی، مسٹر نارائنن نے بارہویں لوک سبھا میں مسٹر واجپئی کو دوبارہ سرکار بنانے کی اجازت دے دی ہوتی تو ان کے مذکورہ دونوں مقاصد پورے ہو سکتے تھے۔

میں نے 1999 کی گرمی کے اس موضوع کا تفصیلی ذکر اس لیے کیا ہے، کیونکہ ان اہم واقعات نے قوم کو جو پیغام دیا تھا وہ آج بھی اس سے متعلق ہے۔ پہلا یہ کہ 'سیکولر طاقتوں کے اتحاد' کے جھوٹ کی دھجیاں اڑ گئی تھیں۔ کانگریس اور دیگر پارٹی 'سیکولرزم کو بچانے' کے نام پر واجپئی سرکار کو گرانے کے لیے متحد ہوئے، لیکن جب انھیں ایک متبادل سرکار بنانے کے لیے کہا گیا تو ان کا اتحاد ہوا میں غائب ہو گیا۔

دوسرے یہ کہ یہ دیکھ کر مجھے تکلیف ہوئی کہ کس طرح پارٹیوں، خاص طور سے چھوٹی پارٹیوں کو توڑنے کی کوشش کی گئی۔ آزاد ممبران پارلیمنٹ کو شکار بنایا گیا اور اس پورے نفرت انگیز ڈرامہ میں دولت کا استعمال کیا گیا۔ یہ سب باتیں بھارت کی جمہوری کاملیت اور عزت پر دھبہ تھیں۔

اس کے ساتھ ہی این ڈی اے میں شامل تقریباً تمام پارٹیاں اس مشکل وقت میں جس طرح متحد رہیں اس سے مجھے خوشی بھی ہوئی۔ فرنانڈیز اور مارن، جن کے ناموں کا میں پہلے ہی ذکر کر چکا ہوں، کے علاوہ پرکاش سنگھ بادل، بال ٹھاکرے، نوین پٹنائک، وائیکو، ممتا بنرجی اور

شمال مشرق کی کچھ چھوٹی پارٹیوں نے جس یکجہتی کا مظاہرہ کیا اس کے لیے وہ قابل ستائش ہیں۔ ان سبھوں نے اٹل جی کے تئیں سچی ہمدردی ظاہر کی اور بلاشبہ اس عرصہ میں اٹل جی کا کردار پروقار رہا۔

جمہوریت سے محبت کرنے والوں کے دل سے وقت گزرنے کے ساتھ جہاں سبھی دیگر واقعات کی یاد دھندلی پڑ جائے گی، ایک تاریخ اور اس سے منسلک ٹیلی ویژن کے مناظر کو وہ کبھی بھی نہیں بھول پائیں گے۔ اور وہ ہے 21/اپریل 1999 کو راشٹرپتی بھون کے سامنے وزیراعظم بننے کے مقصد سے کیا گیا سونیا گاندھی کا وہ وعدہ کہ انھیں 272 ممبران پارلیمنٹ کی حمایت حاصل ہے۔ بعد میں جھوٹے ثابت ہوئے اس دعوے نے 2004 میں انھی ان کی 'ضمیر کی آواز' جس کی پیروی کر کے ان کے وزیراعظم عہدہ کی ''قربانی'' دینے کا ڈھول پیٹا گیا تھا، جس نے ایک سوالیہ نشان لگا دیا۔ وہ 1999 کی ان کی 'باہری آواز' کے برخلاف تھا، کیونکہ جنہوں نے 1999 میں واجپئی سرکار کو گرانے کی سازش کو قریب سے دیکھا ہے ان میں سے کسی کو یہ شبہ نہیں رہا ہوگا کہ اس کا محض ایک ہدف سونیا گاندھی کی قیادت میں ایک کانگریس کی پالیسی پر مبنی سرکار کا قیام کرنا تھا۔

اس کھیل کو بگاڑنے کا سہرا ملائم سنگھ یادو کو دیا جانا چاہیے، لیکن انھوں نے ایسا کیوں کیا؟ اس کا جو جواب تقریباً ایک ہفتہ بعد لکھنؤ کی ایک پریس کانفرنس میں خود مسٹر یادو نے دیا وہ بھارت کے حکومتی نظام کے لیے اب بھی ایک بڑے متعلقہ ایشو کی تہہ تک جاتا ہے۔ اپنا نشانہ کانگریس پر لگاتے ہوئے انھوں نے کہا کہ 'سونیا گاندھی کی قیادت میں کانگریس کی ایک اقلیتی سرکار کو بغیر شرط حمایت دینے سے انکار کر کے سماج وادی پارٹی نے ملک کو غیرملکی حکومت سے بچا لیا تھا۔' یہ پوچھے جانے پر کہ کیا وہ مسز گاندھی کی امیدواری کے صرف اس لیے خلاف ہیں کہ وہ ایک غیرملکی ہیں، مسٹر یادو نے کہا کہ 'ان کی پارٹی کا کہنا ہے کہ صدر جمہوریہ، نائب صدر جمہوریہ، وزیراعظم اور لوک سبھا کے اسپیکر جیسے اہم عہدوں پر ایک غیرملکی کو نہیں بٹھایا جانا چاہیے۔'

سیاسی غیریقینی کے سبب صدر جمہوریہ نے 'کام چلاؤ' سرکار کا کام کرتے رہنے کے لیے کہا۔ تمام پارٹیوں اور قوم کی توجہ تیرہویں لوک سبھا کے انتخابات پر مرکوز ہوگئی، لیکن کارگل جنگ کی شکل میں ایک بڑی قومی مصیبت ملک کے سامنے ظاہر ہوگئی۔ اس لیے توجہ انتخابی جنگ سے ہٹ کر فوراً بھارت اور پاکستان کے درمیان ہونے والی اس جنگ کی طرف چلی گئی۔

2

کارگل جنگ:
بھارت کی ایک فیصلہ کن فتح

چاہ نہیں میں سُربالا کے، گہنوں میں گونتھا جاؤں
چاہ نہیں دیووں کے سر پر چڑھوں، بھاگیہ پر اتراؤں
مجھے توڑ لینا بن مالی، اس پتھ پر تم دنیا پھینک
ماتر بھومی پر شیش چڑھانے، جس پتھ جائیں ویرانیک

— ماکھن لال چترویدی کی حب الوطنی پر مبنی نظم 'پشپ کی ابھلاشا' سے

تاریخ کبھی بھی ہموار اور کشادہ پر نہیں چلتی۔ ایسی انسانی کوشش بہت ہی کم ہوئی ہیں جن کا نتیجہ اعلانات کے مطابق سامنے آتا ہے۔ کسی شخص یا قوم کے کاموں کا تخمینہ صرف اس کے نتیجہ کے مطابق ہی نہیں لگایا جانا چاہیے بلکہ کام کے تئیں ایمانداری اور اختتام کو بھی ذہن میں رکھا جانا چاہیے۔ اگر ارادہ نیک ہے اور مقصد قرین انصاف ہے تو آخر میں نتیجہ بھی مثبت ہوگا۔

جب 20 رفروری 1999 کو وزیر اعظم اٹل بہاری واجپئی نے اپنی لاہور بس یاترا سے پاکستان کے ساتھ امن اور بھائی چارہ کا جرأت مندانہ قدم اٹھایا تھا تو اس وقت انھوں نے خود یا این ڈی اے سرکار میں دیگر کسی نے یہ نہیں سوچا تھا کہ اس کوشش پر پانی پھیرنے کے لیے سرحد کے اس پار پہلے سے ہی سازش رچی جا رہی ہے۔ اِدھر پاکستان کے وزیر اعظم مسٹر نواز شریف واگھہ سرحد پر اپنے مہمان کا گلے مل کر استقبال کر رہے تھے اور اُدھر ان کے نومقررہ فوج کے چیف جنرل پرویز مشرف کی قیادت میں ان کی اپنی ہی فوج بھارت پر جرأت بیجا حملے کا منصوبہ تیار کر رہی تھی۔ دونوں ملکوں کے وزیر اعظموں کے ذریعہ لاہور اعلان نامہ پر کیے گئے دستخط کی سیاہی ابھی خشک بھی نہیں ہوئی تھی کہ پاکستان نے اس کا تجاوز کرتے ہوئے بھارت کے ساتھ 1947 کے بعد کے چوتھی جنگ کا پس منظر تیار کر دیا۔ اس سے قبل کی تینوں جنگوں میں اسے منہ کی کھانی پڑی تھی۔

لائن آف کنٹرول کو ہی نہیں، اعتماد کی لائن کو بھی عبور کیا

مئی 1999 کے دوسرے ہفتہ میں وزیر اعظم نے مجھے اور دیگر سینئر وزراء کو کسی ضروری گفت وشنید کے لیے ایک میٹنگ میں بلایا۔ فوج کی جانب سے انھیں جموں وکشمیر میں لداخ علاقہ کے کارگل ضلع میں لائن آف کنٹرول عبور کرنے والے کچھ نامعلوم افراد کی سرگرمیوں کے بارے میں اطلاع ملی تھی۔ اونچائی پر واقع اور کم آبادی والا علاقہ ہونے کے سبب بٹالک گاؤں کے گڑریوں نے دراندازوں کو دیکھ لیا تھا۔

فوج نے علاقے میں اپنی گشتی ٹیم کو بھیج کر معلوم کر لیا تھا کہ دراندازوں کی تعداد مسلسل بڑھتی جا رہی ہے اور وہ جارح بھی ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ درانداز ہتھیاروں سے لیس تھے اور لائن آف کنٹرول پر 150 کلومیٹر کی بھارتیہ سرحد کے ساتھ ساتھ 18000-16000 فٹ کی اونچائی پر پہنچ کر نیچے سری نگر-لیہہ شاہراہ پر گولہ باری شروع کر دی تھی۔ 12-14 مئی کو وزیر دفاع جارج فرنانڈیز نے علاقے کا دورہ کیا۔ وہاں سے واپس آکر انھوں نے اور سینئر فوجی افسران نے وزیر اعظم سے ملاقات کر کے انہیں حالات سے واقف کرایا، جو کافی سنگین تھے۔ حالانکہ اس کی سنگینی پہلے نہیں سمجھی جا سکی تھی۔ دفاعی معاملہ پر مشتمل کابینی کمیٹی نے فیصلہ لیا کہ لائن آف کنٹرول سے متصل مقامات پر حملے کے لیے توپوں اور دیگر ضروری ہتھیاروں سے لیس فوج کی ٹکڑیاں بھیجی جائیں۔ بالآخر 26 مئی کو بری فوج نے جوابی حملے شروع کر دیے، جسے 'آپریشن وجے' نام دیا گیا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اتنی بڑی تعداد میں ہو رہی دراندازی سے فوج متحیر تھی، لیکن یہاں یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ جموں وکشمیر کے اس علاقے میں کافی سردی پڑتی تھی، اس لیے سردیوں میں برف جمنے کے وقت لائن آف کنٹرول کے پاس واقع اپنی اپنی چوکیوں کو چھوڑ دینا اور گرمیوں میں برف پگھلنے پر دوبارہ واپس آجانا ہندوستانی اور پاکستانی فوجیوں کا مستقل ضابطہ بن گیا تھا، جو 1980 کی دہائی سے ہی چلی آ رہی تھی۔ لائن آف کنٹرول پر فوجی گشت اور ہوائی نگرانی کا قاعدہ بھی استثنا بن کر رہ جاتا ہے۔ اس مرتبہ یعنی 1999 میں الگ بات یہ تھی کہ بھارتیہ علاقہ میں دراندازی اور قبضہ کے ذلیل ارادے سے پاکستانی فوج وقت سے بہت پہلے چوکیوں پر واپس آگئی تھی۔

پاکستان کی بدعہدی سے شروع ہوئے واقعہ سے ہم سب کو جھٹکا لگا تھا۔ وزیر اعظم واجپئی کے جذبات کو کچھ زیادہ ہی ضرب لگی تھی۔ ان کو تکلیف کے ساتھ غم وغصہ بھی تھا۔ دراصل انھیں لگ رہا تھا کہ پاکستان کے وزیر اعظم نے ان کے ساتھ ذاتی طور سے بدعہدی کی ہے۔ کئی موقعوں پر تقریر کرتے ہوئے انھوں نے کہا بھی کہ پاکستان نے لائن آف کنٹرول ہی نہیں بلکہ یقین اور اعتماد کی لائن کی بھی خلاف ورزی کی ہے۔ انھوں نے نواز شریف سے فون پر بات بھی کی تھی جس کے بارے میں نواز شریف نے تقریباً پانچ سال بعد وضاحت کی کہ 'واجپئی صاحب نے مجھ سے فون پر کہا تھا کہ نواز صاحب، یہ کیا ہو رہا ہے؟ آپ کی فوج ہماری فوج پر حملہ کر رہی ہے، وہ ہماری فوج کے ساتھ لڑ رہی ہے۔' دلچسپ اور تعجب خیز بات یہ ہے کہ شریف نے اس سلسلے میں لاعلمی ظاہر کی۔ شریف کے مطابق 'میں نے (واجپئی صاحب سے) کہا کہ پاکستانی فوج آپ کی فوج کے ساتھ لڑائی نہیں کر رہی ہے۔ مجھے اس سلسلے میں جانکاری ہونی چاہیے تھی، لیکن سچ کہہ رہا ہوں کہ مجھے کوئی اطلاع نہیں دی گئی۔ اس کے لیے میں مشرف کو قصوروار مانتا ہوں۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ میرا اپنا ہی جنرل میری پیٹھ میں چھرا گھونپ رہا ہے۔'

اس حملے کے پیچھے جسے 'آپریشن بدر' نام دیا گیا تھا، پاکستان کا مقصد پنچ آیامی تھا۔ پہلا، سری نگر-لیہہ شاہراہ کو بند کرنا، کیونکہ یہ لداخ میں بھارتیہ فوج کے لیے اہم شاہراہ تھی۔ دوسرا ہندوستانی فوجیوں کو سیاچین گلیشیئر سے ہٹنے کے لیے مجبور کرنا۔ تیسرا، بھارت پر دباؤ بنا کر اپنی

حالت مضبوط کرنا تاکہ اسے کشمیر مسئلہ پر اپنے طریقے سے سمجھوتہ کے لیے مجبور کیا جاسکے۔ چوتھا، کارگل جنگ کے ذریعہ جموں وکشمیر میں دہشت گردی کو مزید بھڑکانا اور پانچواں، کشمیر مسئلہ کا انٹرنیشنلائزیشن کرنا۔

آپریشن وجے

آغاز میں پاکستانی فوج تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی جس میں ہوئی جنگ میں ہندوستانی فوج کے کئی جوان بھی شہید ہو چکے تھے، چنانچہ دفاعی معاملہ پر تشکیل دی گئی کابینی کمیٹی میں وہاں ہوائی فوج کی تعیناتی پر بات چیت ہو رہی تھی۔ ایک طرف یہ بھی سوچا جارہا تھا کہ لائن آف کنٹرول کے قریب ہوائی فوج کی تعیناتی یا ہوائی حملہ سے جنگ کی حالت پیدا ہوسکتی ہے۔ ڈر یہ تھا کہ کہیں ہمارے جنگی طیارے لائن آف کنٹرول کے دوسری جانب نہ پہنچ جائیں۔ 25 رمئی کو کابینی کمیٹی کی میٹنگ میں بالآخر ہندوستانی ہوائی فوج کی تعیناتی کی منظوری دے دی گئی۔ کمیٹی میں مسلح فورس کو لائن آف کنٹرول کو عبور نہ کرنے کی شرط کے ساتھ یہ ہدایت بھی دی گئی کہ دراندازوں کو نکال باہر کرنے کے لیے وہ کوئی بھی ضروری قدم اٹھا سکتے ہیں۔ لائن آف کنٹرول پار نہ کرنے کی شرط سے ہندوستانی فوج نے جلد ہی پاکستانی فوج کی شروعاتی کامیابیوں کو ملیامیٹ کردیا۔ اس طرح اب حوصلہ شکن ہونے کی باری پاکستانی فوج کی تھی۔

غور طلب ہے کہ لائن آف کنٹرول کوئی بین الاقوامی سرحد نہیں ہے۔ یہ تو بس پاک مقبوضہ کشمیر کو علیحدہ کرنے والی لائن ہے، جس پر ہر طرح سے بھارت اپنا دعویٰ کرتا رہا ہے، چنانچہ لائن آف کنٹرول پار کرنے سے کسی بین الاقوامی قانون کی خلاف ورزی نہیں ہونے والی تھی اور پھر حملہ پہلے پاکستان نے خود ہی کیا تھا تو بھارت نے خود کو لائن آف کنٹرول کی سرحد میں باندھ کر کیوں رکھا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ہماری سرکار ایک بڑا ایجنڈا حاصل کرنا چاہتی تھی اور اس نے مؤثر طریقے سے ایسا کر کے دکھایا۔

کارگل جنگ میں بھارت کی جیت بھارتیہ مسلح فورسز کی تاریخ کے سب سے شاندار کارناموں میں سے ایک تھی۔ صحیح معنوں میں ہماری مسلح افواج نے یہ جیت ایک ایسے جنگی میدان میں لڑتے ہوئے حاصل کی جسے دنیا کے سب سے اونچے جنگی میدان کے طور پر جانا جاتا ہے اور جہاں درجہ حرارت 15 - ڈگری سیلسیس تک پہنچ جاتا ہے، جہاں سرد ہوائیں ہڈیوں تک کو فریج کردینے کی قوت رکھتی ہیں اور ان سب وجوہات سے فوجی انتظام وانصرام میں کافی دقتیں پیش آتی ہیں۔ شروع میں تو پاکستانی حملہ آوروں کی حالت تھوڑی مضبوط تھی، کیونکہ چوٹیوں پر ان کا قبضہ ہوگیا تھا، جہاں سے وہ ہندوستانی فوجوں کو اچھی طرح دیکھ سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری فوج کو کئی مورچوں پر براہِ راست حملے کرنے پڑے اور کئی مرتبہ اسے دشمن کے ساتھ آمنے سامنے کی لڑائی بھی لڑنی پڑی۔ ان مشکلات اور مخالف حالات میں بھی ہندوستانی فوج نے اپنی بے پناہ قوت، عہد کامل، ہمت اور وفاداری کا غیر معمولی مظاہرہ کیا اور دشمن فوج کے ایک ایک سپاہی کو بھاگنے کے لیے مجبور کیا۔ اس طرح ہماری مسلح فورسز نے پاکستانی دراندازوں سے اپنی ایک ایک انچ زمین خالی کروالی۔ 74 دنوں کی لڑائی کے بعد آخرکار 26 رجولائی 1999 کو 'آپریشن وجے' کو فتح یابی نصیب ہوئی، اس لیے 26 رجولائی کو ہر سال 'کارگل یوم فتح' کے طور پر منایا جاتا ہے۔

کارگل جنگ بھارت کی پہلی ایسی جنگ تھی جس کی ہر لمحہ کی خبر ٹیلی ویژن کے ذریعے پورے ملک میں براہ راست پہنچی۔ اس جنگ کے دوران قومی یکجہتی اور خوداعتمادی کا جو جذبہ ملک میں دیکھا گیا وہ واقعی غیر معمولی تھا۔ ایک دیگر اہم حقیقت کا ذکر میں یہاں کرنا چاہتا ہوں۔ کارگل جنگ کے دوران سابقہ جنگوں کی طرح ملک میں کہیں بھی ہندو-مسلم کشیدگی یا تنازع نہیں دیکھا گیا۔ اس جنگ میں ہمارے بہادر جوانوں نے

بہادری اور شجاعت کی جو کہانیاں رقم کیں ان سے پورے ہندوستانی سماج کا دل فخر اور حب الوطنی کے جذبہ سے سرشار ہو گیا۔ شہید ہوئے جوانوں میں تمام مذاہب، ذات اور مختلف خطہ کے جوان تھے، جو سبھی کے لیے ترغیب کا ذریعہ بن گئے۔

شہیدوں کے عزیزوں کی ہمت اور بہادری بھی کچھ کم لائق ترغیب نہیں تھی۔ 'مجھے اپنے تینوں بیٹوں کو مورچہ پر بھیجنے میں کوئی تردّد نہیں ہوگی۔' یہ الفاظ کارگل جنگ کے بہادر سپاہی منگیز سنگھ کی بیوہ سنتوش کنور کے تھے۔ 'میں کیوں روؤں؟ وہاں شہید ہونے والا ہر جوان میرا بیٹا ہی تو ہے۔' میجر آر. ادھیکاری جو کارگل جنگ میں شہید ہو گئے تھے، کی ماں مالتی کا کہنا تھا۔ آندھرا پردیش کی ایک بہادر خاتون جس نے جنگ میں اپنا شوہر کھو دیا تھا، نے تسلی دینے آئے ریاست کے وزیر اعلیٰ اور گورنر سے کہا کہ 'میں چاہتی ہوں کہ آپ لوگ میرے دکھ میں نہیں بلکہ میرے غرور اور فخر کے جذبہ میں شریک ہوں۔ بہادری اور قوم پرستی کی اس طرح کی باتیں سن کر مجھے محسوس ہوتا تھا کہ کوئی بھی طاقت ہماری یکجہتی اور اتحاد کو نقصان نہیں پہنچا سکتی۔'

جنگ کے دوران اٹل جی نے اپنی اعلیٰ قیادت کا تعارف کرایا۔ غیر متوقع واقعہ سے وہ ذرا بھی مضطرب نظر نہیں آئے۔ ان کے خاموش، صبر و ضبط اور خود اعتمادی سے لبریز پیغام سے ملک کو ترغیب مل رہی تھی۔ 7 رجون کو قوم کے نام اپنے پیغام میں انھوں نے کہا تھا کہ 'میں یہ بات صاف کر دینا چاہتا ہوں کہ اگر یہ دراندازی، بات چیت کے ذریعہ لائن آف کنٹرول کو بدلنے کے لیے ایک سازش کا حصہ ہے تو مجوزہ بات چیت شروع ہونے سے قبل ہی ختم ہو جائے گا۔' ملک کے عوام سے اپیل کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ 'ہماری مسلح افواج کی اہلیت اور قابلیت پر اعتماد کریں۔ ہمارے سپاہی اس میں کامیاب ہوں گے اور وہ یقینی طور پر کچھ ایسا کر دکھائیں گے کہ مستقبل میں کوئی بھی اس طرح کی ناپاک جرأت نہ کر سکے۔' ان کی سب سے بڑی جیت یہ تھی کہ کارگل جنگ میں گزشتہ چار جنگوں جو 1948، 1962، 1965 اور 1971 میں کانگریسی وزیر اعظموں کی قیادت میں لڑی گئی، کی طرح ایک انچ بھی زمین نہیں کھوئی گئی اور نہ ہی بات چیت میں کوئی بھارتیہ زمین چھوڑی گئی تھی۔

جنگ ختم ہونے کے دو روز بعد میں قوم کے تئیں اظہار تشکر پیش کرنے اور ملک کے بہادر سپاہیوں کی حوصلہ افزائی کرنے کے لیے لداخ کے دورہ پر گیا۔ لداخ ملک کی سب سے کم آبادی والا علاقہ ہے۔ 45000 اسکوائر کلومیٹر رقبہ والے اس علاقہ میں صرف 2.5 لاکھ افراد رہتے ہیں، لیکن بھارت کی اس اہم حصولیابی میں ان کا اہم رول تھا۔ جنگ میں اس علاقہ کے تقریباً 25 فوجیوں نے اپنی جانیں قربان کر دیں۔

دو روزہ 'سندھو درشن مہوتسو' کا افتتاح کرنے کے لیے میں شیہ گیا تھا جو لداخ کی راجدھانی لیہہ سے قریب 10 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ وزیر دفاع جارج فرنانڈیز اور جموں و کشمیر کے موجودہ وزیر اعلیٰ، ڈاکٹر فاروق عبداللہ بھی میرے ساتھ تھے۔ مہوتسو میں آئے عقیدت مندوں کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے میں نے کہا تھا کہ 'ویسے تو بھارت نے اس سے قبل کی چاروں جنگوں میں جیت حاصل کی تھی، لیکن اس مرتبہ وہ حملہ آور ملک کے ناپاک ارادوں کے بارے میں عالمی برادری کو اعتماد میں لینے میں سب سے زیادہ کامیاب رہا۔ 1999 میں پہلی مرتبہ ہم پاکستان کو سیاسی اور شاطرانہ پالیسی دونوں مورچوں پر ایک ساتھ شکست دینے میں کامیاب رہے۔ آج عالمی برادری بھارت کے رویہ کی تعریف کر رہی ہے اور پاکستان کو جنگ تھوپنے یا حملہ کرنے کا قصوروار ٹھہرا رہی ہے۔' میں نے اس مہوتسو کو کارگل کے شہیدوں کے نام وقف کیا تھا۔

ڈپلومیٹک مورچہ پر پاکستان کی شکست

کہا جاتا ہے کہ ڈپلومیسی، لڑی جانے والی جنگ کی دوسری شکل ہے۔ دیگر معاملوں میں یہ صحیح ہو یا نہیں لیکن کارگل معاملہ میں یہ بات

بالکل سچ ثابت ہوئی تھی۔ اگر بھارت کے جوانوں نے میدان جنگ میں شاندار مظاہرہ کیا تو ہمارے وزارت داخلہ کے افسران نے ڈپلومیسی کے میدان میں قابل تعریف کام کر کے دکھایا۔ اسی طرح پاکستان کو جتنی شرمناک شکست کارگل کی چوٹیوں پر ملی تھی، عالمی برادری کی قومی راجدھانیوں کے ڈپلومیٹک اسٹیج پر اسے ملی شکست اس سے کم شرمناک نہیں تھی۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی ذکر کیا کہ واجپئی سرکار لائن آف کنٹرول کو عبور نہ کرتے ہوئے ایک بڑا ایجنڈا تیار کرنا چاہتی تھی۔ دراصل سرکار عالمی برادری کو یہ دکھانا چاہتی تھی کہ پاکستان نے شملہ معاہدہ اور لاہور اعلان نامہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے بھارت پر حملہ کیا ہے، جبکہ بھارت اس کے باوجود صبر سے کام لے رہا ہے۔ اس طرح سرکار عالمی برادری کی حمایت حاصل کرنا چاہتی تھی اور پاکستان کو ایک حملہ آور ملک کے طور پر پیش کرنا چاہتی تھی۔ اس سے عالمی برادری خاص طور سے پاکستان کی مدد کرنے والے ملکوں میں خوف پیدا کرنے میں بھی مدد ملی کہ اس طرح کی جھڑپوں کا انجام بالآخر ایٹمی جنگ کی شکل میں بھی ہوسکتا ہے۔ ویسے 'ایٹمی حملے کی (جھوٹی) دھمکی' کی غیر ذمہ دارانہ بات اس لڑائی کے دوران سننے کو بھی نہیں ملی۔ ہاں پاکستان کی جانب سے اس طرح کی بات سامنے ضرور آئی تھی۔ اس دھمکی نے پاکستان سرکار کو عالمی برادری میں یک و تنہا کر دیا۔

پاکستان مسلسل جھوٹا دعویٰ کرتا رہا تھا کہ دارندازاس کی فوج نہیں بلکہ کشمیر کو ہندوستانی قبضہ سے آزاد کرانے کے لیے جدوجہد کر رہے مجاہدین ہیں۔ اس کے اس دعوے نے عالمی برادری کے سامنے اسے کافی بے عزت کیا۔ دراصل وہ اتنی سرگرمی اور تندہی سے اس جنگ میں منہمک تھا کہ عالمی برادری کی نظر میں سب کچھ صاف ہو گیا تھا۔

ایک شرمناک سچائی کی وضاحت میرے معاون جسونت سنگھ (جو اس وقت وزیر خارجہ تھے) کے ذریعہ 11 رجون کو نئی دہلی میں منعقد ایک پریس کانفرنس میں کی گئی۔ یہ کانفرنس پاکستان کے وزیر خارجہ سرتاج عزیز کے بھارت دورہ سے ایک روز قبل بلائی گئی تھی۔ عزیز صاحب دونوں ملکوں کے درمیان کشیدگی کو ختم کرنے سے متعلق بات چیت کے لیے بھارت آنے والے تھے۔ اس دن جسونت سنگھ نے کیا کہا تھا اور کس سلسلے میں کہا تھا، وہ ان کے ذیل کے بیان سے واضح ہو جائے گا، جو انھوں نے میڈیا میں جاری کیا تھا۔

''پاکستانی وزیر خارجہ سرتاج عزیز کل دہلی آنے والے ہیں۔ ان کا یہ دورہ جموں و کشمیر میں لداخ کے کارگل علاقہ میں پاکستان کی دراندازی اور حملے کے سلسلہ میں ہے۔ میڈیا سے جڑے آپ سبھی لوگوں اور آپ کے توسط سے سارے ملک کے عوام اور عالمی برادری کو بھی میں کچھ غیر متنازع حقائق کے بارے میں بتانا چاہتا ہوں جو ہمیں اس دراندازی اور حملے کے متعدد پہلوؤں کے سلسلے میں ملے ہیں۔ میں پھر کہہ رہا ہوں کہ یہ صرف کچھ ہی سچ ہیں۔ ان سے اس بے جا جسارت میں پاکستانی حکومتی نظام کی شمولیت شبہ کے دائرے سے پرے ہو جاتی ہے۔ اس سے وزیر خارجہ سرتاج عزیز کے 'تنازع ختم کرنے' کے مبینہ مقصد کے سلسلے میں سنگین شبہ پیدا ہوا ہے۔ جس سچائی کی میں بات کر رہا ہوں اس سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جائے گی کہ اس پورے منصوبہ کا انتظام انھیں لوگوں کے ہاتھوں میں تھا جنھوں نے پہلے اسے عمل میں لایا تھا۔ اس سچ کو عام کرنے کا مقصد عالمی برادری کو پاکستان کے کھیل سے واقف کرانا ہے۔ مسلح دراندازی اور حملے میں اپنی مستقل فوج کے مسلسل ملوث ہونے کے اہم ایشو کو دبانے کے لیے پاکستان کے ممکنہ منصوبے کا پہلے ہی خلاصہ کر دینا ہے۔ لائن آف کنٹرول کے حساس معاملہ کو جو پہلے حل ہو چکا تھا، دوبارہ ابھارنے کے پاکستان کے خطرناک مقصد کو پہلے ہی ناکام کر دینا ہے اور سب سے بڑا اور اہم مقصد بھارت کے حالات کو پھر سے مضبوطی کے ساتھ سامنے رکھنا ہے۔ اس بے جا جسارت کا صرف ایک ہی پہلو ایسا ہے جس پر گفتگو کی جاسکتی ہے۔ سب سے پہلے سابقہ حالات کی بحالی اور لائن آف کنٹرول کا احترام، علاقہ میں

امن برقرار رکھنے کے لیے کم ازکم اتنا ضروری ہے۔

خواتین اور حضرات، اب میں گزارش کروں گا کہ پاکستان کی بری فوج کے سربراہ (جنرل پرویز مشرف) اور ان کے نائب صدر (لیفٹیننٹ جنرل محمد عزیز) کے درمیان ہوئی بات چیت آپ کو سنائی جائے۔ ان بات چیت کی فوٹو کاپی ساتھ ساتھ تقسیم کی جائیں گی۔''

یہاں جس گفتگو کی بات کی گئی ہے وہ 26 اور 29 مئی 1999 کو اس وقت ہوئی تھی جب جنرل مشرف بیجنگ میں اور ان کے چیف آف جنرل اسٹاف لیفٹیننٹ جنرل محمد عزیز راولپنڈی میں تھے۔ پہلی گفتگو سے یہ صاف ہوگیا کہ کارگل حملے کے بارے میں کور کمانڈر کے ساتھ ساتھ خارجہ سکریٹری شمشاد احمد کو بھی واقف کرایا گیا تھا۔ دوسری بات چیت میں مشرف نے بھارت کے ساتھ کسی طرح کا شاطرانہ عمل شروع ہونے سے پہلے جنگ کے پس پردہ پاکستان کے مقصد کے بارے میں گفتگو کی تھی۔ عزیز نے مشرف سے کہا تھا کہ میں یہ خیال رکھوں گا کہ دہلی میں بات چیت کے دوران وزیر خارجہ سرتاج عزیز حقیقت حال کے سلسلے میں کچھ بھی نہ بتائیں اور نہ ہی کوئی یقین دہانی کرائیں۔ مشرف نے عزیز کو ہدایت دی تھی کہ وہ وزیر خارجہ کو یہی بتائیں کہ 'ہم یہاں لمبے عرصہ تک بیٹھے رہے ہیں۔ ہم برسوں سے یہیں بیٹھے رہے ہیں۔' سچ کہوں تو یہ سوچ کر مجھے بہت تعجب ہوا تھا کہ جنرل اتنے بزدل بھی ہوسکتے ہیں۔

12 ؍جون کو سرتاج عزیز کے ساتھ گفتگو کے دوران جسونت سنگھ نے کچھ اپنے فوجی پس منظر کے سبب اور کچھ اپنے سیاسی اعتماد کی وجہ سے، غیر ڈپلومیٹک اشارے دیئے بغیر بالکل صاف لفظوں میں اپنی بات رکھی۔ پاکستانی وزیر خارجہ کے سامنے انھوں نے بھارت کی جانب سے جو مطالبات کیے وہ اس طرح تھیں۔

1. حملہ آوروں کی فوراً واپسی۔
2. لائن آف کنٹرول کی دوبارہ قانونی منظوری
3. سرحد پار دہشت گردانہ پالیسی کو ترک کرنا۔
4. پاک مقبوضہ کشمیر میں دہشت گردی کے ڈھانچے کو ختم کرنا۔
5. شملہ سمجھوتہ اور لاہور اعلان نامہ کو پھر سے منظوری۔

کارگل میں پاکستان کے حملے اور جموں وکشمیر پر اس کے جھوٹے اور بے بنیاد دعوے کا معاملہ غیر ملکی سرکار کے سامنے رکھنے میں بھارت نے اپنی مہارت کا ثبوت پیش کیا۔ بھارت کی شاندار ڈپلومیٹک جیت اس وقت ہوئی جب میدان جنگ میں منہ کی کھانے اور عالمی برادری میں بالکل الگ تھلگ پڑ جانے پر پاکستان کے وزیر اعظم مایوس ہوکر اُس وقت کے امریکی صدر بل کلنٹن سے درخواست کرنے لگے کہ وہ سمجھوتے کے لیے بات چیت میں ثالثی کا رول ادا کریں۔ کلنٹن نے درخواست کو منظور کرتے ہوئے شریف کو انتباہ دیا کہ وہ 4 ؍جولائی★ کو واشنگٹن ڈی سی آکر بات چیت کریں اور اس بات کا اعتراف کریں کہ 'پاکستان نے کتنی بڑی غلطی کی ہے اور اس کا اصلاح فوراً کریں۔'

پاکستان سرکار کی 'بھول- سدھار' (یا خود سپردگی) ہوگئی تھی۔ جیسا کہ صدر کلنٹن کے ساتھ شریف کی بات چیت کے بعد جاری مشترکہ بیان سے ظاہر ہوگیا تھا۔ 1972 کے شملہ سمجھوتہ کے مطابق 'کشمیر میں لائن آف کنٹرول کی پاسداری' کرنے اور 'لائن آف کنٹرول قانونی حیثیت'

★ جس دن پاکستان کے وزیر اعظم نواز شریف فوج واپسی کا راستہ تلاش کرنے کے لیے صدر کلنٹن سے گفتگو کر رہے تھے، اسی دن ہندوستانی فوج نے ٹائیگر ہل پر قبضہ کرکے کارگل جنگ کو ایک اہم موڑ پر پہنچا دیا تھا۔

بحال کرنے پر اپنی رضامندی ظاہر کر کے پاکستان کو واقعی تلخ گولیاں نگلنی پڑیں۔ اس نے یہ بھی اعتراف کیا کہ فروری میں شروع ہوئے دوفریقی مذاکرات بھارت اور پاکستان کو تقسیم کرنے والے کشمیر سمیت تمام مسائل کو حل کرنے کا سب سے اچھا پلیٹ فارم ہے۔

اہم بات یہ ہے کہ صدر کلنٹن کو جیسے ہی شریف کا درخواست نامہ ملا، انھوں نے فوراً وزیراعظم واجپئی کو فون کر کے گفتگو میں حصہ لینے کے لیے مدعو کیا تھا۔ حالانکہ اٹل جی نے اس دعوت کو انکساری اور استقامت کے ساتھ نامنظور کر دیا تھا۔ دونوں وزرائے اعظموں کی عملی کارروائی میں امتیازات کی اس سے زیادہ واضح مثال نہیں ہوسکتی۔ ایک وزیراعظم اپنا منھ ایک عظیم طاقت سے چھپانے کے لیے بات چیت کی استدعا کر رہا تھا اور دوسرے نے اسی طاقت کی دعوت کو یہ کہتے ہوئے ٹھکرا دیا کہ بات چیت کرنے کے لائق اب کچھ بچا ہی نہیں، کیونکہ ایک حملہ آور سے جو امید کی جاسکتی ہے وہ بالکل واضح ہے۔

بھارت اور پاکستان کے درمیان فرق دونوں ملکوں کے اپنے اپنے جنگی سپاہیوں کے ساتھ کیے گئے سلوک سے بھی ظاہر ہو گیا تھا۔ بھارت میں کارگل جنگ کے بہادر جوانوں کا نام سب کی زبان پر تھا۔ آزادی کے بعد پہلی مرتبہ ہماری سرکار نے شہیدوں کے سرکاری اعزاز کے ساتھ آخری رسومات ادا کرنے کے لیے ان کے جسد خاکی کو ان کے گاؤں یا قصبے تک لے جانے کی اجازت دی تھی۔ اس فیصلے کی تعریف کی گئی تھی، کیونکہ اس سے ملک کے لوگوں میں حب الوطنی کا جذبہ پیدا کرنے میں مدد ملی۔ ادھر پاکستانی سرکار جنگ میں شہید ہوئے اپنے سپاہیوں کی لاش کو واپس لے جانے یا ان کے لواحقین کے دکھ اور تکالیف کو سمجھنے کے لیے بھی تیار نہیں تھی۔ کئی مقامات پر تو بھارتیہ سپاہیوں کو اسلامی طریقے سے ان کی آخری رسومات ادا کرنی پڑی تھیں۔

لائن آف کنٹرول کو عبور نہ کرنے کے بھارت کے خودسر فیصلے کی اور کشمیر مسئلہ کو حل کرنے میں امریکہ، یوروپی یونین اور آسیان (ASEAN) اور جی-8 ملکوں کے ذریعہ تعریف کی گئی۔ کارگل جنگ کے وقت چین بھی پاکستان کی مدد کے لیے نہیں آیا۔ اگر پاکستان اپنی غلطی کو نہیں سدھارتا تو بھارت کیا کرتا؟ اس کے جواب میں بس اتنا ہی کہنا مناسب ہوگا کہ ہندوستانی قیادت نے طے کر لیا تھا اور بین الاقوامی برادری کو بھی یہ صاف کر دیا تھا کہ اس حالت میں ہماری مسلح فورسز کو لائن آف کنٹرول کی دوسری جانب، دشمن کا تعاقب کر کے مطلوبہ نشانہ حاصل کرنے کا حکم دے دیا جاتا۔

کارگل اور پاکستان کا داخلی بحران

جب کوئی برا آدمی دوسروں کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا ہے تو اس کا انجام اس کے لئے خود ہی مصیبتوں کو دعوت دینے کی شکل میں سامنے آجاتا ہے۔ یہی قدرت کا اصول ہے۔ کارگل منصوبہ کی ناکامی کا اثر پاکستان کے لیے پوری طرح امید کے مطابق منفی ہی رہا۔

پاکستان پیپلز پارٹی کی لیڈر اور سابق وزیراعظم بے نظیر بھٹو نے کارگل جنگ کو 'پاکستان کی ایک بڑی غلطی' بتایا تھا۔ نواز شریف نے اس کے لیے فوج کے چیف مشرف کو قصوروار ٹھہرایا تھا اور کہا کہ 'مشرف نے ہی اس طرح کا غیرذمہ دارانہ کام کیا اور انھوں نے ہی یہ منصوبہ بنایا تھا۔' اپنی سرکاری سوانح عمری 'غدار کون؟ نواز شریف کی کہانی، ان کی زبانی' (جس کے مصنف سہیل وراثچ ہیں) میں انھوں نے مشرف پر الزام لگایا ہے کہ 'کارگل جنگ میں مشرف نے ایٹمی اسلحہ اٹھا لیا تھا۔' شریف کو یہ کہتے دکھایا گیا ہے کہ 'کارگل واقعہ کے بعد امریکی صدر بل کلنٹن کے ساتھ بات چیت کے دوران مجھے کلنٹن کے ذریعہ بتایا گیا کہ کارگل جنگ کے دوران ایٹمی اسلحے کو ایک ٹھکانے سے ہٹا کر دوسرے ٹھکانے پر لے جایا گیا

تھا۔ اس انکشاف سے میں حیرت زدہ رہ گیا تھا، کیونکہ مجھے اس کے بارے میں کوئی جانکاری نہیں تھی۔ بات چیت کے دوران بل کلنٹن نے مجھے مزید بتایا کہ ایٹمی اسلحے اٹھا لیے گئے تھے تا کہ بھارت کے خلاف ان کا استعمال کیا جا سکے۔ صدر کلنٹن نے مجھ سے پوچھا کہ قانونی طریقے سے منتخب کیے گئے ملک کے نمائندے اور وزیر اعظم ہونے کے باوجود آپ کو کیوں ان باتوں سے واقفیت نہیں کرائی گئی؟ جنرل مشرف کا یہ قدم واقعی غیر ذمہ دارانہ تھا۔'

پاکستان کے معروف کالم نویس ایاز عامر (جن کے 'ڈان' میں شائع ہونے والے مضامین کو میں ضرور پڑھتا ہوں) نے اس شکست کے سلسلے میں لکھا ہے کہ 'کارگل مہم کے خیال وفکر کے غلط ہونے کی بات سب کی نظر میں واضح ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی صاف ہونے لگی تھی کہ آخر میں پاکستان کو رہنے غرور اور غرور بھری بہادری کی باتیں چھوڑ کر کبھی نہ کبھی پیچھے ہٹنا ہی پڑے گا۔'

چونکہ کارگل جنگ کی تنزلی پاکستان کے لیے شرمناک شکست کے ساتھ ساتھ الزام- جوابی الزام کی شکل میں بھی ہوئی تھی، چنانچہ وزیر اعظم نواز شریف اور ان کی فوج کے چیف جنرل مشرف کے درمیان عداوت دیر سویر اپنی انتہا کو پہنچنا ہی تھا۔ جب 12 ر اکتوبر 1999 کو یہ دشمنی اسلام آباد میں تختہ پلٹ کی شکل میں اپنی انتہا کو پہنچی تو واقعی وہ کسی المیہ ڈرامہ کے جیسا محسوس ہوا تھا۔ جنرل مشرف نے شریف کو اقتدار سے بے دخل کر کے جیل میں ڈال دیا اور پھر انھیں پناہ لینے کے لیے سعودی عرب بھیج دیا۔

کارگل جنگ کے بعد سے یہ بات گفتگو کا موضوع بنی ہوئی ہے کہ پاکستان کے وزیر اعظم نواز شریف کو بھارت کے وزیر اعظم کے ساتھ لاہور اعلان نامہ پر دستخط کرتے وقت اس ذلیل منصوبہ کے بارے میں (جو ان کی فوج تیار کر رہی تھی) جانکاری تھی یا نہیں اور اگر جانکاری تھی تو کتنی تھی؟ خیر سچائی جو بھی رہی ہو، اس بے جا جرأت مندی سے ملک کے بارے میں ایک سچائی سب کے سامنے آگئی۔ پوری دنیا پر یہ بات عیاں ہوگئی کہ پاکستان کی فوج سرکش ہے۔ پاکستان بھارت کی طرح جمہوری نہیں تھا اور نہ ہی اب ہے، جہاں عوام کے ذریعہ منتخب کیے گئے نمائندوں کا فیصلہ ہی آخری ہوتا ہے۔ اسلام آباد میں اقتدار کے ایسے خود مختار مرکز تھے جو خود ہی کام میں لگے تھے۔★

کارگل جائزہ کمیٹی

کارگل جنگ کے دوران بھارت اور پاکستان کے رویہ میں دیکھے گئے امتیازات میں ایک اور فرق قابل ذکر ہے۔ جنگ میں ملک کی شکست سے بہت سارے لوگوں نے یہ مطالبہ کرنا شروع کر دیا کہ جنگ کا منصوبہ بنانے والے قصوروار افراد کا پتہ لگانے کے لئے ایک تحقیقاتی کمیشن تشکیل کی جائے، مگر نہ تو شریف سرکار نے ایسے کسی کمیشن کی تشکیل کی اور نہ ہی بعد میں اس کا مقام لینے والی فوجی حکومت نے۔ تقریباً سات

★ میرے اچھے دوست اور معروف صحافی اور پبلشر آر وی پنڈت نے کارگل جنگ کے دوران 'واشنگٹن پوسٹ' (30 جون 1999)، 'دی نیو یارک ٹائمس' (یکم جولائی 1999)، 'ٹائمس لندن' (6 ر جولائی 1999) اور کئی دیگر اخباروں میں پورے صفحہ کا اشتہار نکالا تھا جس کا عنوان 'اے اسٹیٹ ود ین اے اسٹیٹ: اے ماڈرن راگ آرمی ود اِٹس فنگر آن دی نیوکلیئر بٹن' تھا۔ آئندہ برس انھوں نے بھارت میں پاک اسپانسرڈ سرحد پار دہشت گردی کی جانب عالمی برادری کی توجہ مبذول کرنے کے لیے اسی طرح کی ایک اور اشتہار مہم چلائی جس کا عنوان 'جہاد فار پاکستان، ایگونی فار انڈیا' تھا۔ آر وی پنڈت جیسے محب وطن شہریوں کی آزاد مہموں نے پاکستان کی غیر حالت کی وجہ سے بھارت اور پوری دنیا کے لیے پیدا ہوئے خطرے کو روشنی میں لانے کی سرکاری کوششوں کو تقویت ملی۔

سال بعد شریف کی پارٹی پاکستان مسلم لیگ (این) نے ایک قرطاس ابیض جاری کیا جس میں یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ ان کی سرکار نے تحقیقاتی کمیشن کی تشکیل کی تھی اور اس کمیشن نے جنرل مشرف کے کورٹ مارشل کی سفارش کی تھی۔

اس کے برخلاف جنگ ختم ہونے کے تین روز بعد ہی یعنی 29/جولائی 1999 کو این ڈی اے سرکار نے کارگل جائزہ کمیٹی کی تشکیل کی جس کا مقصد تھا— 'ان حالات یا واقعات کا جائزہ لینا جن کی وجہ سے پاکستان کی طرف سے حملہ ہوا۔ اس طرح کی دراندازی سے ملک کی حفاظت کے لیے ضروری تدبیر بتانا۔' وزیر دفاع جارج فرنانڈیز نے کمیٹی کی رپورٹ کو 23/فروری 2000 کو پارلیمنٹ میں پیش کیا۔ اس معاملے میں ہماری سرکار نے جس طرح کی تیزی اور چابک دستی دکھائی اس کی آزاد ہندوستان کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی۔

معروف ماہر دفاع کے. سبرامنیم کی صدارت میں تشکیل دی گئی چار رکنی جائزہ کمیٹی نے ان حالات کا تجزیہ کیا جن کے سبب بھارت کو پاکستانی حملے کا سامنا کرنا پڑا۔ خاص طور سے اس نے ہماری خفیہ ایجنسیوں کے طریقۂ کار اور ناکامیوں کا پتہ لگانے کی کوشش کی۔ اس نے سابق صدر جمہوریہ آر وینکٹ رمن، وزیر اعظم اٹل بہاری واجپئی اور سابق وزرائے اعظم وی پی سنگھ، نرسمہا راؤ، اندر کمار گجرال اور میرے معاونین جارج فرنانڈیز اور جسونت سنگھ سے ملاقات کر کے بات چیت کی۔ اس طرح اس نے تقریباً 100 میٹنگیں کیں۔ اسے ہر طرح کی اطلاعات مہیا کرائی گئی تھیں۔ وزیر اعظم اور ان کے معاون سینئر وزراء کا شروع سے ہی یہ نظریہ تھا کہ سرکار کے پاس چھپانے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔ کارگل جنگ کے اسباب اور کمزوریوں میں جتنی شفافیت ہوگی، کمیٹی کی رپورٹ کی اہمیت اتنی ہی زیادہ ہوگی۔

رپورٹ کا نتیجہ یقینی طور پر واضح اور امید افزا تھا۔ اس نے اختصار میں لکھا کہ

> 'کارگل مہم کی کامیابی بھارت کی فوجی فتح کے ساتھ ساتھ ڈپلومیٹک جیت بھی تھی۔ پاکستانی دراندازوں کے ساتھ لڑائی میں بھارت کے جتنے فوجی شہید ہوئے، اس سے کہیں زیادہ پاکستان کے فوجی مارے گئے تھے۔ لائن آف کنٹرول کو بین الاقوامی منظوری مل گئی اور پاکستان عالمی برادری میں الگ تھلگ پڑ گیا۔ درحقیقت ہم اپنی کمزوریوں کو سامنے لانے کے ساتھ ساتھ قوم، اپنے حفاظتی دستوں کے مظاہرے اور عوام نے جس طرح تعاون دیا، اس پر فخر بھی کر سکتے ہیں۔'

میرے لئے یہ مبارکبادی کے الفاظ ہیں بلکہ تنقید، تفکر اور ہوشیاری کے الفاظ زیادہ قدر و قیمت کے حامل ہیں—

> 'فوجی خفیہ ایجنسیوں اور دیگر ایجنسیوں میں بنیادی سطح پر مناسب اشتراک نہیں تھا۔ دہشت گردی مخالف مہموں اور باغی سرگرمیوں سے نمٹنے میں فوج کی بھاری تعیناتی سے مسلح فورسیز کے باہری حملوں سے ملک کی حفاظت کرنے کے اہم رول کی تیاری متاثر ہوئی تھی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ وقت بہ وقت ملک میں آئی سرکاروں نے ہنگامہ اور باغی سرگرمیوں سے نمٹنے کے لئے کوئی مستقل اور طویل المیعاد حکمت عملی ہی نہیں اپنائی تھی۔
>
> ...لمبے عرصہ تک دہشت گردی مخالف مہموں میں منہمک رہنے سے فوج کے ٹریننگ پروگرام متاثر ہوتے ہیں۔ فوج کی توجہ بنیادی مقصد سے ہٹ جاتی ہے...
>
> ...نیم فوجی دستوں اور جنرل پولس فورسیز کو اعلیٰ اور جدید اسلحہ سے آراستہ، نیز اچھی طرح ٹرینڈ بھاڑے کے فوجیوں جو سرحد سے لگاتار دراندازی کرتے رہتے ہیں، کے ذریعہ پھیلائی جانے والی سرحد پار دہشت گردوں سے نمٹنے کے لئے ضروری ٹریننگ نہیں ملتی ہے۔ ان فورسیز کی اہلیت یا کوالٹی میں وقت کی مانگ کے مطابق چیلنجوں سے نمٹنے کے لئے ضروری اصلاح یا اضافہ نہیں کیا گیا ہے، یہی سبب

ہے کہ باغی سرگرمیوں کا مقابلہ کرنے کے لئے فوج پر ہمارا انحصاری بڑھا ہے...'

'...آخری نتیجہ یہ رہا ہے کہ ہندوستانی فوج کو نیم فوجی دستوں کی سطح پر اور نیم فوجی دستوں کو جنرل پولس فورسیز کی سطح پر رکھا گیا تھا۔ ہندوستانی فوج کو الجھا کر رکھنے اور اس کی روایتی عظمت کو نقصان پہنچانے کے لئے پاکستان، پنجاب، جموں وکشمیر اور شمال مشرق میں مسلسل دہشت گردی کا سہارا لیتا رہا ہے۔ اپنے اس مقصد میں جزوی کامیابی حاصل کرنے کے بعد وہ یہ مان کر بھی چلنے لگا ہے کہ ہندوستان کے خلاف ایٹمی حملے کی اس کی دھمکی تین مواقع پر کام آئی ہے۔ پاکستان کی دہشت گردانہ ایٹمی دھمکی اور روایتی دھمکی سے نمٹنے کے لئے ایک مشترکہ حکمت عملی پر غور کئے جانے کی ضرورت ہے۔'

جائزہ کمیٹی نے وقت بہ وقت مرکز میں آنے والی سرکاروں کو 'بھارت کے حفاظتی انتظامات میں کئی اہم کمیوں' کے لئے ذمہ دار ٹھہراتے ہوئے کچھ سخت تبصرے کئے تھے۔ اپنی رپورٹ میں اس نے لکھا تھا— 'لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے ذریعہ مجوزہ تجویز کو ان قومی لیڈروں کے ذریعہ منظور کرلیا گیا تھا جو قومی سیکورٹی انتظامی کی مشکلات کے بارے میں جانتے ہی نہیں تھے۔ ان 52 برسوں میں 1962 کی شکست، 1965 کا جمود، 1971 کی فتح اور بڑھتے ایٹمی خطرات اور سرد جنگ کا اختتام، کشمیر میں بالواسطہ جنگ اور فوج کے معاملوں میں انقلاب کے باوجود اس میں کوئی تبدیلی یا اصلاح نہیں کی گئی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آزاد ہندوستان کے سیاسی اور نوکرشاہی طبقہ نے پانی پت کی تین جنگوں سے بھی کوئی سبق نہیں لیا ہے۔ حال میں 1948 اور 1971 کی جنگوں سے سبق لینے کی بات تو دور ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے ہمارے سیاسی، نوکرشاہی، فوجی اور خفیہ تنظیموں نے اپنا کوئی مفاد تلاش کرلیا ہو۔ امن کے دور میں قومی تحفظ کے معاملہ کو سب سے نچلی سطح پر رکھا جاتا ہے اور جنگ یا غیر اعلانیہ جنگ کی حالت میں اسے نہایت حساس مانا جاتا ہے۔'

چنانچہ کمیٹی نے دو اہم تجاویز پیش کیں 'کارگل تجربہ، مسلسل جاری غیر اعلانیہ جنگ اور ایٹمی اسلحہ پر مبنی حفاظتی دائرہ کو دیکھتے ہوئے قومی سیکورٹی نظام کا اعلیٰ اور باریک جائزہ کی ضرورت ہے۔ یہ جائزہ انتہائی مصروف نوکرشاہوں کے ذریعہ نہیں کرایا جاسکتا۔ قابل اعتماد ماہرین کی کسی اکائی یا کمیٹی، وہ کوئی قومی کمیشن ہوسکتا ہے یا ایک یا زیادہ کام کرنے والی ٹیم ہوسکتی ہے یا ضرورت کے تحت کسی دیگر کے ذریعہ یہ تحقیقات فوری کروائی جانی چاہئے۔'

جائزہ کمیٹی کی کچھ سفارشات میں سے ایک قومی سیکورٹی کونسل سے متعلق تھی جسے آزادی کے بعد پہلی مرتبہ واجپئی سرکار کے ذریعہ اپریل 1999 میں تشکیل کی گئی تھی، کو منظور نہیں کیا گیا، جو کہتی تھی 'قومی حفاظتی مشیر' جو وزیراعظم کے چیف سکریٹری بھی ہیں۔ جائزہ کمیٹی کا ماننا ہے کہ ملک میں ایک طویل مدتی یا مستقل قومی سیکورٹی مشیر ہونا چاہئے اور اس (کمیٹی) کا کہنا ہے کہ اس نظام میں دوسرے درجہ کے افسران کو جلد سے جلد شامل کرکے انہیں ضروری جواب دہی سونپی جانی چاہئے۔

میرے ساتھ ساتھ دیگر سینئر وزراء کو یہ مشورہ اہم اور مفید لگا۔ ہم نے وزیراعظم واجپئی سے درخواست کی کہ وہ قومی سیکورٹی مشیر اور وزیراعظم کے چیف سکریٹری برجیش مشرا کو ملے دونوں عہدوں کو الگ الگ کردیں، لیکن وہ کچھ اور سوچ رہے تھے، اس لئے انھوں نے اس مشورے پر عمل نہیں کیا۔ حالانکہ یہ وزیراعظم کا اختیار خصوصی (ویٹو پاور) تھا، لیکن مجھے افسوس ہے کہ ان کے اس فیصلے سے اعلیٰ سرکاری سطح پر تال میل بنانے میں مدد نہیں ملی۔

کارگل فتح اور کانگریس کی تنقید

میری پارٹی ہمیشہ یہی کہتی رہی تھی کہ کارگل جنگ میں بھارت کی فتح سیاسی یا گروہی سرحدوں سے الگ ایک قومی کامیابی ہے۔ 1971 کی ہند-پاک جنگ (جس کے نتیجے میں بنگلہ دیش وجود میں آیا تھا) میں ہندوستان کی جیت کے بعد ہم نے سیاسی سرحدوں سے اوپر اٹھ کر اندرا گاندھی کی قیادت والی موجودہ سرکار کو تہہ دل سے مبارک باد دی تھی۔ حالانکہ بدقسمتی یہ رہی کہ کارگل جنگ کے دوران اور اس کے بعد بھی کانگریس کا ردعمل بالکل الگ رہا۔ اس قومی کامیابی پر اس نے کوئی خوشی ظاہر نہیں کی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ کامیابی بی جے پی سرکار کے مدت کار میں حاصل ہوئی تھی۔

مجھے دکھ اس بات پر ہوتا ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ کانگریس کے رویے میں تبدیلی نہیں آئی۔ ابھی اکتوبر 2007 میں ہی وزیراعظم منموہن سنگھ نے واجپئی سرکار پر حملہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ 'ہم جانتے ہیں کہ کارگل جنگ کیوں ہوئی تھی۔ جب درانداز ملک میں دراندازی کر رہے تھے تب دہلی میں سرکار سو رہی تھی۔'

دراصل ڈاکٹر منموہن سنگھ کا یہ بیان کانگریس ترجمان کپل سبل کے اس بیان سے کوئی الگ نہیں ہے جو انھوں نے 1999 میں دیا تھا۔ 'کارگل میں مکمل ناکامی کے لئے واجپئی خود اور ان کی سرکار ذمہ دار ہے، کیونکہ لاہور بس یاترا کے بعد وہ سو نے چلے گئے اور جب ہندوستانی خطے میں دراندازی ہو رہی تھی، تب انھوں نے اپنی آنکھیں موند لی تھیں۔' انھوں نے یہ بھی کہا کہ 'میں یہ بھی ثابت کردوں گا کہ وزیراعظم، وزیر داخلہ اور وزیر دفاع کو اس دراندازی کی اطلاع تھی۔' کارگل جائزہ کمیٹی نے اس الزام کو پوری طرح سے غلط ثابت کر دیا۔ اپنی رپورٹ میں کمیٹی نے لکھا ہے 'آپریشن سطح پر کمیٹی کو ایسی کوئی چیز نظر نہیں آئی جس سے اس نتیجہ کو جائز ٹھہرایا جاسکے کہ لاہور چوٹی کانفرنس کے سبب ہندوستانی پالیسی یا فیصلہ لینے والوں نے (ملک کی) سیکورٹی نظام کو نظرانداز کر دیا تھا۔'

کانگریس نے جس وقت یہ بے بنیاد الزام لگایا تھا، اس وقت میں پارٹی کارکنان کی ایک میٹنگ کو خطاب کرنے کے لئے چنئی گیا ہوا تھا۔ میں یہ کہنے کے لئے مجبور ہو گیا کہ 'کیا کوئی انہیں ایسا کرنے کے لئے مشورہ دے رہا ہے؟ الیکشن کے لئے اس طرح کا ایجنڈا بنانا ان کے خودکش میلان کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوسکتا۔ ہندوستانی جوانوں نے کارگل کی چوٹیوں پر دشمن کو شکست دی ہے اور سرکار نے دشمن پر شاطرانہ فتح حاصل کی ہے۔ آج دنیا کا ہر ملک (پاکستان کو چھوڑ کر) وزیراعظم اور ان کی سرکار کی تعریف کر رہا ہے۔ کانگریس کو چھوڑ کر ملک کے گوشہ گوشہ میں واجپئی کی تعریف ہو رہی ہے۔'

کانگریس پارٹی کے لیڈروں، جو کارگل جنگ کے نتیجے کو ہندوستان کے لئے ناکامی بتا رہے ہیں، ان سے میں چند سوالات پوچھنا چاہتا ہوں:

- کیا انھوں نے کبھی اس پر غور کیا ہے کہ وزیراعظم پنڈت نہرو نے پہلی ہند-پاک جنگ 48-1947 کے دوران کشمیر مسئلہ کا سامنا کس طرح کیا تھا؟ یکم جنوری 1949 کو انھوں نے یک طرفہ جنگ بندی کا اعلان کر دیا تھا، جبکہ اس وقت ہماری مسلح افواج دراندازوں کو شکست دیتے ہوئے ایسے مقام پر پہنچ گئے تھے جہاں سے ہندوستان جموں وکشمیر کے پاک مقبوضہ خطے کو حاصل کرسکتا تھا۔ ہندوستان کی 83100 اسکوائر کلومیٹرز مین پاکستان کے لئے چھوڑتے وقت کیا انھوں نے ملک کے عوام اور پارلیمنٹ کو اعتماد میں لیا تھا؟ کشمیر مسئلہ کو

اقوام متحدہ میں لے جانے سے قبل کیا انھوں نے کوئی قومی رضامندی یا اپنی کابینہ کے اندر کوئی اتفاق رائے بنائی تھی؟

- 1962 میں چینی حملے میں ہندوستان کی شکست کے بعد کانگریس پارٹی نے ایک اشتہار جاری کیا تھا، جس میں وزیراعظم پنڈت جواہر لال نہرو کے ساتھ مناسب تعاون، عزت واحترام اور نرمی کے ساتھ پیش نہ آنے والے ہر کسی کو باغی قرار دیا گیا تھا۔ حزب مخالف پارٹیوں کو کانگریس پر کیچڑ اچھالنے کے لئے ایمرجنسی کا فائدہ اٹھانے دینا غلط ہے۔ 1962 میں ہندوستانی دفاعی بل پر بحث کے دوران سوتنتر پارٹی کے تجربہ کار ممبر آف پارلیمنٹ پروفیسر این. جی رنگا نے اس اطلاع کو بے نقاب کیا تھا۔ کیا کانگریسی لیڈر اس سے انکار کریں گے۔
- کیا وہ بتائیں گے کہ 1962 کی ہند-چین جنگ میں ملک کی شکست کا جائزہ لینے والی ہینڈرسن بروکس کمیٹی کی رپورٹ کو 45 سال گزر جانے کے بعد بھی کیوں عام نہیں کیا گیا ہے؟ یہ رپورٹ تیار کرنے والے ہندوستانی مسلح فورس کے دو افسران تھے، لیفٹیننٹ جنرل ہینڈرسن بروکس اور ہندوستانی ملٹری اکادمی کے کمانڈنٹ بریگیڈیر پی ایس بھگت۔ مانا جاتا ہے کہ یہ رپورٹ وزیراعظم پنڈت جواہر لال نہرو اور وزیر دفاع وی کے کرشنا مینن کی قیادت کی تنقید سے بھری ہے۔
- کیا وہ ملک کو بتا سکتے ہیں کہ 1965 کی ہند-پاک جنگ میں ہندوستانی فوج کے ذریعہ حاجی پیر پر دوبارہ قبضہ کر لئے جانے کے باوجود جنوری 1966 میں تاشقند میں منعقد سمجھوتہ مذاکرات میں کانگریس سرکار نے اسے حملہ آور ملک پاکستان کو واپس کیوں دے دیا؟
- کیا وہ ملک کو بتا سکتے ہیں کہ 1971 کی جنگ میں پاکستان پر فیصلہ کن جیت حاصل کر لینے کے بعد بھی اندرا گاندھی نے پاکستان کو کشمیر معاملہ کے آخری حل کے لئے کیوں نہیں مجبور کیا؟ جبکہ اس وقت پاکستان کے 93 ہزار پاکستانی افواج جنگ بندی کی شکل میں ہماری قید میں تھے؟ کیا وہ بتائیں گے کہ کارگل جنگ سے پہلے بھی بین الاقوامی برادری نے کبھی ہندوستانی فریق کی اتنے زوردار طریقے سے حمایت کی تھی؟

کیا ہندوستان کی عوام کو کانگریس کی اس غلط تشہیر میں ذرا بھی یقین تھا کہ واجپئی سرکار کارگل جنگ سے نمٹنے میں ناکام رہی تھی؟ اس سوال کا جواب عوام نے ستمبر-اکتوبر 1999 میں تیرہویں لوک سبھا کے لئے ہوئے وسط مدتی انتخابات میں دے دیا تھا۔

3

قومی جمہوری اتحاد (این ڈی اے) کی اقتدار میں واپسی

قومی جمہوری اتحاد قومی مفاد اور علاقائی خواہشات،
دونوں کی نمائندگی کرتا ہے۔ این ڈی اے کثرت میں وحدت،
خوش حالی اور فیڈرل انتظام کے نقطہ نظر سے ہمارے ملک کا آئینہ ہے۔

— 1999 میں منعقد تیرہویں لوک سبھا کے انتخابات میں
این ڈی اے کے اعلان نامہ سے ماخوذ

1999 کا موسم گرما آنے والا تھا۔ کارگل کی سرحد لائن آف کنٹرول پر 74 دنوں تک مسلسل توپوں سے آرہی دھماکوں کی گونج خاموش ہوگئی تھی۔ ہندوستان کی عظیم فتح کے ساتھ جنگ ختم ہوگئی تھی اور پاکستان کو ناقابل فراموش شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ حملہ آور ملک کی بے جا جرأت اس کے اوپر ہی بھاری پڑی۔

اپنے ملک میں بھی کانگریس پارٹی نے واجپئی سرکار گرانے کی جو حماقت ستمبر-اکتوبر میں تیرہویں لوک سبھا کے انتخابات میں کی تھی، اس کا نتیجہ برعکس آیا۔ الیکشن کے لئے یہ مناسب وقت نہیں تھا، کیونکہ سیاسی پارٹیوں کو مانسون کے دوران انتخابی مہم چلانی پڑی، لیکن چونکہ اپریل کے آخری ہفتہ میں لوک سبھا تحلیل کر دی گئی تھی اور آئین کے التزام کے مطابق 6 ماہ کے اندر نئے ایوان کا الیکشن کرانا ضروری تھا۔

1998 سے الگ (جب این ڈی اے الیکشن کے بعد تشکیل ہوا تھا) 1999 میں انتخابات مل کر اور ایک ہی اعلان نامہ پر لڑے گئے تھے۔ اس اتحاد کی توسیع بھی ہوئی تھی۔ اب اس میں 24 پارٹیاں شامل ہوگئی تھیں۔ ہم نے خاص تین ایشوز حفاظت، استحکام اور ترقی کے نام پر ووٹ مانگا تھا۔ واجپئی سرکار نے فیصلہ لیا تھا کہ ہندوستان کو نیوکلیائی طاقت سے پر ملک بنانا ہے۔ اس فیصلے پر ہندوستانیوں کو فخر محسوس ہوا۔ کارگل جنگ میں فتح کے بعد قومی عظمت کا احساس اور بھی زیادہ ہو چکا تھا۔ اس کوشش سے این ڈی اے عوام میں ہردلعزیز ہوگیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ عوام ملک میں استحکام لانے کے لئے ہماری اپیل سے بھی متاثر ہوئی۔ این ڈی اے کے لیڈروں نے انھیں یاد دلایا کہ کس طرح سے کانگریس اور

اس کی معاون پارٹیوں نے کسی متبادل کا مشورہ دیئے بغیر ہی سرکار گرادی تھی اور اس طرح ملک کو غیر ضروری محور پر وسط مدتی الیکشن کی جانب ڈھکیل دیا تھا۔ ہم نے سرکار کے استحکام، ملک کی ترقی، عوامی بہبود اور قومی تحفظ کے درمیان براہ راست تعلقات پر زور دیا۔ اس پیغام کو رائے دہندگان نے فوراً قبول کرلیا، کیونکہ تین سال کی مدت کے اندر بھارت میں چار سرکاریں وہ دیکھ چکے تھے۔ ہندوستانی رائے دہندگان کے ساتھ طویل تجربہ میں میں نے ایک بات واضح طور پر سمجھ لی تھی۔ جب تک قدرتی یا ناگزیر وجہ پیدا نہ ہوں تب تک ہندوستانی عوام وسط مدتی انتخابات کو ملک کے کندھوں پر پڑنے والا گراں اور غیر ضروری بوجھ سمجھتی ہے۔

ووٹروں سے ہماری سیدھی اپیل تھی کہ 'ان لوگوں نے صرف ایک ووٹ سے ہماری سرکار گرائی تھی اور وہ بھی دھوکہ سے، اب آپ سب کے پاس اتنی طاقت آگئی ہے کہ آپ قیمتی ووٹ سے انتخابات میں ہمیں جیت دلا کر ایسے دھوکہ باز لوگوں کو سبق سکھا سکیں، لیکن آپ کی رائے پہلے کی طرح منقسم نہ ہو۔ 1996 میں اٹل جی کی پہلی سرکار محض 13 دن تک اقتدار میں رہی تھی۔ 1998 میں ان کی دوسری سرکار صرف 13 ماہ اقتدار میں رہی۔ اب آپ ایسا فیصلہ کن مینڈیٹ دیں کہ ان کی سرکار پورے پانچ سال تک حکومت چل سکے اور ہم آپ سے وعدہ کرتے ہیں کہ قومی تحفظ کے شعبہ میں ہندوستان کو ملی کامیابی کی طرح اب قومی ترقی میں بھی کامیابی ملے گی۔'

اس اپیل پر رائے دہندگان نے غیر معمولی حمایت دی۔ این ڈی اے نے 545 ممبران کے ایوان میں 306 سیٹیں جیت کر زبردست اکثریت حاصل کی۔ بی جے پی نے 182 سیٹیں جیتیں۔ 1998 میں حاصل سیٹوں کے مقابلہ میں ایک سیٹ زیادہ۔ اس کے برعکس کانگریس پارٹی کی تعداد انتخابات میں بری طرح گر گئی۔ اس نے صرف 144 سیٹیں ہی حاصل کیں۔ 1998 کے مقابلہ میں اسے 26 سیٹیں کم ملیں۔ اس سال کانگریس نے 140 سیٹوں پر فتح حاصل کی تھی۔ بی جے پی کا ووٹ میں حصہ 23.75 فیصد تھا۔ یہ اعداد و شمار 1998 کے مقابلے بہت کم تھا، کیونکہ تب ہمیں 25.59 فیصد ووٹ ملے تھے۔ ایسا اس لئے ہوا، کیونکہ بی جے پی نے اس مرتبہ توقع سے بہت کم سیٹوں پر الیکشن لڑا۔ بقیہ سیٹیں این ڈی اے کی معاون پارٹیوں کو چھوڑ دی گئی تھیں۔ 13 راکتوبر کو صبح راشٹرپتی بھون کے صحن میں اٹل بہاری واجپئی نے تیسری مرتبہ ہندوستان کے وزیر اعظم کے طور پر حلف لیا۔ میں نے بھی اپنے عہدے کا حلف اٹھایا اور سیدھے نارتھ بلاک جا کر وزارت داخلہ میں اپنے عہدہ کا چارج لیا۔ حکومت کرنے کے نقطہ نظر سے وسط مدتی الیکشن پوری طرح غیر ضروری تھا، لیکن اس وقت دیگر خیال بھی موجود تھا۔ اس غور و خوض کے مطابق ہندوستان میں جمہوریت کی جیت اور پاکستان میں جمہوریت پر چھائے مصیبت کے بادل کے درمیان تضاد واضح طور پر سامنے آیا۔ ہندوستان اور پوری دنیا کے ٹیلی ویژن کے ناظرین نے 13 راکتوبر کو ہندوستان کے وزیر اعظم کو حلف لیتے دیکھا تھا۔ اس سے محض ایک روز قبل انھوں نے فوجی بغاوت میں پاکستان کے وزیر اعظم نواز شریف سے حکومت کی باگ ڈور چھینتے ہوئے پوری دنیا دیکھی۔ جنرل پرویز مشرف نے اقتدار پر قبضہ جما لیا تھا۔ مشرف کے تئیں وفادار فوجوں نے شریف کے سرکاری رہائش گاہ پر حملہ کر کے انھیں قید کرلیا اور جیل بھیج دیا تھا۔ ان دونوں شبیہوں کے درمیان تضاد سے پاکستان کا ناکام نظریہ اور ہندوستان کے طاقتور، متحرک اور برتی نظریہ کے درمیان فرق ظاہر ہوتا ہے۔

سونیا گاندھی کے غیر ملکی ہونے کا ایشو

آگے بڑھنے سے پہلے میں 1999 کی انتخابی مہم کے اہم ایشو پر بات کرنا چاہتا ہوں۔ یہ ایشو کانگریس کی صدر سونیا گاندھی کے غیر ملکی نسل کے ہونے سے منسلک ہے۔ اپنے مشترکہ اعلان نامہ میں این ڈی اے نے ایسا قانون بنانے کا وعدہ کیا تھا، جس سے یہ اطمینان ہو سکے کہ

'ہندوستانی ریاست کے اہم عہدوں پر وہی شخص بیٹھے گا جو ہندوستانی نسل سے ہندوستان کا فطری شہری ہوگا' صرف بی جے پی اور اس کی معاون پارٹیوں کا ہی یہ خیال نہیں تھا بلکہ آندھرا پردیش کے وزیر اعلیٰ چندرا بابو نائیڈو کی قیادت میں تیلگو دیشم پارٹی (ٹی ڈی پی) نے بھی آئین یا قانون میں ایسی تبدیلی لانے کی تائید کی جس سے صدر جمہوریہ، نائب صدر جمہوریہ اور وزیر اعظم کے اعلیٰ عہدوں پر غیر ملکی نسل کے شہریوں کو آنے سے روکا جا سکے۔ اس سے قبل، جیسا کہ میں نے ذکر کیا ہے، سماج وادی پارٹی کے لیڈر ملائم سنگھ یادو کے اس فیصلے کے پس پردہ یہی خاص سبب تھا کہ اپریل 1999 میں وزیر اعظم بننے کے لئے سونیا گاندھی کے دعوے کی حمایت نہ کی جائے۔ انھوں نے مجموعی طور سے 'سونیا کے وزیر اعظم بننے کے خواب کو چکنا چور کر دیا'۔

دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ سونیا گاندھی کے غیر ملکی ہونے کا ایشو خود کانگریس پارٹی کے اندر بھی گفتگو کا موضوع بن گیا تھا۔ 16 مئی 1999 میں کانگریس کے تین سینئر لیڈروں نے پارٹی کی صدر سونیا گاندھی کو خط لکھا تھا۔ یہ تینوں کانگریس کے ایگزیکیٹو کمیٹی کے ممبر تھے۔ ان کے نام اس طرح ہیں — مسٹر شرد پوار، مہاراشٹر کے سابق وزیر اعلیٰ اور سابق وزیر دفاع، لوک سبھا کے سابق اسپیکر پی اے سنگما اور بہار کے کانگریسی لیڈر طارق انور۔ ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں اس کی اہمیت کے نقطہ نظر سے میں ذیل میں اس کا خلاصہ پیش کر رہا ہوں۔

عزت مآب! کانگریس صدر!!!

اپنی جواب دہی کو سمجھتے ہوئے اور لاحق تشویش کے سبب آپ کو یہ خط لکھنا پڑ رہا ہے۔ آپ کے نانا سسر پنڈت جواہر لال نہرو جیسے مشہور کانگریس پارٹی کے لیڈروں اور بانیوں نے ہمیشہ کانگریسیوں کے درمیان آزادانہ طور سے تبادلہ خیال کو ترجیح دیا ہے۔ انھوں نے اظہار رائے کی آزادی، سوچنے کی آزادی، کام کرنے کی ذمہ داری اور ان سب سے اوپر قومی مفاد کے چار ستونوں پر جمہوریت کی بنیاد رکھی تھی۔ ہمارا یقین ہے کہ آپ کے سامنے ان اصولوں کو صحیح پس منظر میں رکھا جا رہا ہے۔ صدر صاحبہ! ہندوستان کی تاریخ، وراثت اور روایت ہزاروں سال قدیم ہے۔ اس کی الگ ثقافت ہے اور یہ ایک عظیم اور قابل فخر ملک ہے۔ سب سے اوپر یہ ایک ایسا ملک ہے جو ہر معنی میں خود کفیل یا خوددار ہے۔ ہندوستان میں ہمیشہ مہاتما گاندھی کے ان لفظوں کے معنی کو اہمیت دی گئی ہے — 'میرے کمرہ میں ہر جانب سے ہوا داخل ہونے دو۔' پھر انھوں نے یہ کہا 'لیکن میرے پیر اپنی زمین پر ہی ٹکے رہیں گے۔' ہم شمال، جنوب، مشرق یا مغرب کے بہترین عناصر، کسی بھی بات کو ذوق اور انکساری کے ساتھ قبول کرتے ہیں اور ہم ان خصوصیات کو اپنی مٹی میں جذب کر لیتے ہیں، لیکن ہماری قوت ترغیب، روح، عزت نفس، شان اور عظمت کی جڑیں ہماری مٹی میں پیوست ہیں۔ یہ جڑیں ہماری مادر وطن سے اپجی ہیں۔'

سونیا جی! آپ اس سب کا احترام کرتے ہوئے آپ ہمارے ملک کا، ہمارا حصہ بن چکی ہیں، اس لئے یہ جان کر ہمیں تعجب ہو رہا ہے کہ اس فیصلے کی گھڑی میں آپ نے اسے بھلا دیا۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ 98 کروڑ کی آبادی والے تعلیم، صلاحیت اور لیاقت سے پُر اس ملک میں ہندوستان کی سرکار ایسا شخص چلائے جس کی جائے پیدائش ہندوستان نہیں بلکہ دیگر ملک ہے۔ ہم میں سے کچھ لوگوں نے پارٹی کے اندر اس ایشو پر پہل کرنا اور بڑے پیمانے پر غور و فکر کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ ایسا ایشو ہے جس کا تحفظ معاشی مفاد اور ہندوستان کی بین الاقوامی شبیہ پر ہی اثر نہیں پڑتا ہے، بلکہ اس سے ہر ایک ہندوستانی کی شان و شوکت اور فخر و غرور پر شدید ضرب لگے گی۔ بدقسمتی سے ہر حالت میں اس کوشش کو بے اثر کر دیا گیا ہے۔ اس بات کو دوہراتے ہوئے بھی ہم اس پر زور دینا چاہیں گے کہ کانگریسی ہونے کے

ناطے ہم آپ کو ایسے لیڈر کے طور پر دیکھتے ہیں جس نے پارٹی کو متحد کر رکھا ہے اور آپ ہم سب کی طاقت کا سرچشمہ ہیں، لیکن ایک جواب دہ سیاسی پارٹی کی شکل میں ہمیں اوسط ہندوستانی کی اس فکر کو بھی ذہن میں رکھنا ہے، جو کانگریسی بھی ہوسکتا ہے اور نہیں بھی ہوسکتا ہے۔ ہندوستان ایسے شخص کے لئے فکرمند ہے جو کم از کم پانچ برسوں تک اس ملک کی رہنمائی کر سکے۔ شاید آج پوری دنیا میں ہندوستان کے وزیراعظم عہدہ کا کام سب سے زیادہ مشکل ہے۔

اس ملک کی ساخت براعظم کے برابر ہے اور یہاں کی آبادی 98 کروڑ ہے۔ یہاں زندہ جمہوریت، جدوجہد کرتی معیشت، سماج کو نقصان پہنچانے والی تخریبی طاقتیں اور بغاوت و دہشت گردی جیسے مسائل موجود ہیں، جن سے قومی یکجہتی کو خطرہ لاحق ہے۔ دنیا کی کوئی بھی سرکار اتنے مشکل مسائل اور اتنے بڑے ایشوز کا سامنا نہیں کر رہی ہے، جبکہ ہندوستان میں ان پر خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اس ملک کے سرکاری باگ ڈور سنبھالنے والے شخص کے پاس لمبا تجربہ اور عوامی زندگی کے بارے میں معلومات ہونا ضروری ہے۔

اس لئے پارٹی کے بانیوں نے اس پر زور دیا کہ اعلیٰ عہدوں کے تمنائی لوگوں کو دھیرے دھیرے آگے بڑھنا ہوگا۔ اس طرح پارٹی کے کارکنان ملک کے ایشوز کے مشکلات سے واقف ہو جاتے ہیں۔

اوسط ہندوستانی کا یہ مطالبہ بے مقصد نہیں ہے کہ اس کے وزیراعظم کا عوامی زندگی کے سلسلے میں پچھلا ریکارڈ رہا ہو۔ کانگریس پارٹی کو حق پر مبنی خواہش یا امید کا احترام کرنا چاہئے۔ قابل احترام صدر صاحبہ! ہمیں یقین ہے کہ اس سمت میں ابھی بھی تاخیر نہیں ہوئی ہے۔ ہم نے اس موضوع پر آج کانگریس ایگزیکٹیو کمیٹی میں تفصیلی گفتگو کی۔ ہمیں یقین ہے کہ کانگریسی اور سیاسی لیڈر ہونے کے ناطے ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم اپنے خیالات اور فکر کو ظاہر کریں۔ ہماری ایگزیکٹیو کمیٹی اور آپ سے درخواست ہے کہ مندرجہ ذیل مشورے پر غور کیا جائے۔ ہماری رائے میں اس سے پورے ملک میں بحث کا موضوع بنے تنازع حل ہو جائے گا۔

کانگریس کے اعلان نامہ میں اس مقصد سے ہندوستانی آئین میں ترمیم کرنے کا مشورہ دیا جانا چاہئے کہ صدر جمہوریہ، نائب صدر جمہوریہ اور وزیراعلیٰ کی کرسی پر صرف ہندوستان میں پیدا ہوئے ہندوستانی شہری ہی بیٹھ سکتے ہیں۔ ہمارا آپ سے یہ بھی استدعا ہے کہ کانگریس صدر ہونے کے ناطے آپ اس ترمیم کی تجویز رکھیں۔ یہ آپ کے اپنے قرین زاویہ نظر کے مطابق ہوگا کہ عوامی زندگی میں آپ کے قدم رکھنے کا مقصد پارٹی میں نئی جان ڈالنا ہے۔

ان تینوں باغی لیڈروں کو جنھوں نے 'غیر ملکی نسل' کا ایشو اٹھایا تھا، کانگریس سے فوراً ہی نکال دیا گیا۔ ان تینوں نے مل کر راشٹروادی کانگریس پارٹی (این سی پی) نامی اپنی نئی سیاسی پارٹی تشکیل دی۔ یہ بات دیگر ہے کہ اب این سی پی مہاراشٹر اور مرکز دونوں سطحوں پر کانگریس اتحاد کا حصہ ہے۔

اٹلی میں پیدا ہوئیں سونیا گاندھی کا 'غیر ملکی نسل' کا موضوع ہندوستان میں انتخابی ایشو کیوں بن گیا؟ صرف بی جے پی ہی نہیں بلکہ بہت ساری سیاسی پارٹیوں نے ایک دوسرے سے صلاح ومشورہ کیے بغیر اس موضوع پر آزادانہ طور سے ایک ہی رویہ کیوں اپنایا؟ جہاں تک بی جے پی کا تعلق ہے، ہمارا خیال ہے کہ اس رویے سے کوئی شخصی یا ذاتی سبب نہیں جڑا ہے۔ میں نے انتخابی مہم کے دوران سونیا گاندھی کے سلسلے میں کیے گئے سخت تبصرے کی مخالفت کی۔ کسی خاتون کے سلسلے میں اس طرح کی ذاتی تنقید کرنا ہندوستان کی ثقافتی روایت میں ممنوع ہے اور جمہوری انتظام

میں بھی اسے قبول نہیں کیا جاسکتا ہے، لیکن بنیادی طور پر یہ ہمارے لئے اصول اور نظریہ کا موضوع ہے۔ اس عقیدہ کے پس پردہ دیگر سیاسی پارٹیوں کا بھی یہی نظریہ ہے اور ایسی ہی بنیادی تفکرات ہیں۔ ایسا کیوں؟ یہ جاننے کے لئے ہمیں کچھ حقائق کو ذہن میں رکھنا ہوگا۔

- سونیا گاندھی کا پہلا نام سونیا انتونیو مائنو تھا۔ 1968 میں راجیو گاندھی سے شادی کے بعد وہ ہندوستان آئی تھیں، لیکن انھوں نے وزیراعظم اندرا گاندھی کے خاندان کی ممبر بن جانے کے بعد بھی ہندوستانی شہریت کے لئے درخواست نہیں دی۔ اس کے بجائے انھوں نے ہندوستان میں 'غیرملکی' شکل میں ٹھہرنے کی اجازت مانگی تھی۔ یہ اجازت پانچ برسوں کے لئے دی گئی تھی۔ پانچ برس کی مدت گزرنے کے بعد انھوں نے 1973 اور 1978 میں دوبارہ درخواست دی اور 'غیرملکی' ہونے کی حیثیت کو برقرار رکھتے ہوئے ہندوستان میں قیام کرنے کے لئے اجازت مانگی۔ 27/اپریل 1983 کو 5 سال کا پرمٹ ختم ہوجانے پر انھوں نے اٹلی کی شہریت کو الوداع کہہ کر ہندوستانی شہری بننے کا فیصلہ کیا۔ ان کا یہ فیصلہ اس سچائی سے متاثر تھا کہ اس وقت ان کے شوہر کو اندرا گاندھی کے وارث کی شکل میں تیار کیا جارہا تھا، اس لئے اس وقت اور آج بھی متعدد ہندوستانیوں کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا اور آج بھی یہ سوال بار بار پوچھا جارہا ہے کہ ہندوستان میں آنے کے بعد 15 برسوں کی طویل مدت میں اور دو بچوں کی ماں بن جانے کے بعد بھی سونیا گاندھی نے ہندوستانی شہریت کیوں نہیں حاصل کی؟ آج تک انھوں نے اس سوال کا اطمینان بخش جواب نہیں دیا۔ 6/ستمبر 1999 کو ٹیلی ویژن پر دیئے گئے انٹرویو میں انھوں نے دعویٰ کیا تھا کہ اندرا گاندھی کی بہو بنتے ہی وہ ہندوستان کی شہری بن گئی تھیں اور دوسری باتیں محض 'تکنیکی' ہیں۔ شہریت کی یہ عجیب وغریب تشریح ہے۔
- اس مدت کے دوران سونیا گاندھی کی کچھ کارروائیوں پر اس لئے سوالیہ نشان لگائے گئے کہ وہ ہندوستانی شہری نہیں ہیں۔ 2004 میں شائع 'ایشو آف فارن اوریجن: سونیا انڈر اسکروٹنی' نامی کتاب میں مرتب سینئر صحافی اے سوریہ پرکاش تحقیقی مضامین میں ایسے سوالات کے دستاویز ملتے ہیں۔ یہ کتاب نئی دہلی واقع انڈیا فرسٹ فاؤنڈیشن کی جانب سے شائع کی گئی تھی۔ اس میں میرے معاون دینا ناتھ مشر نے ان سوالوں کا جواز ثابت کیا تھا۔ مثال کے طور پر سونیا گاندھی نے 1980 کے لوک سبھا کے انتخابات میں ووٹ ڈالا تھا جبکہ وہ اس وقت ہندوستانی شہری نہیں تھیں۔ ایسی حالت میں ووٹر لسٹ میں ان کا نام کیسے شامل کیا گیا؟
- یونائیٹڈ اسٹیٹ آف امریکہ اور اٹلی سمیت کئی جمہوری ممالک میں قانون کے تحت ایسا کوئی شخص اس وقت تک ملک کا اعلیٰ عہدہ حاصل نہیں کرسکتا، جب تک اس ملک میں اس شخص کی پیدائش نہیں ہوئی ہو۔ اسی طرح سے انڈونیشیا، فلپائن، فن لینڈ، بلغاریہ، کانگو، الجیریا، برازیل اور ایران میں بھی مساوی قانون موجود ہے۔ ہندوستان میں ایسا کوئی قانون نہیں ہے کیونکہ اصولی طور پر ہمارے آئین سازوں نے ایسی حالت کا تصور نہیں کیا تھا، جس میں 1990 کی دہائی کے آخر میں اس طریقے سے سیاسی ہستی کے غیرملکی نسل کے ایشوز کا قومی سطح پر چھڑے تنازع میں برتری حاصل ہوگی۔ میں یہاں پر وضاحت کرنا چاہوں گا کہ امریکہ کے سابق وزیرخارجہ ہینری کسنجر جیسے لیڈر بھی ملک میں صدارتی الیکشن نہیں لڑپائے تھے، کیونکہ ان کا جنم غیرملک میں ہوا تھا۔ امریکہ کے آئین کے آرٹیکل 2 کی دفعہ 1 میں اسی شہری کو صدارتی الیکشن لڑنے کی اجازت دی گئی ہے جس کی پیدائش امریکہ میں ہوئی ہے۔ یہی پابندی ایک دیگر ریاستی سکریٹری میڈیلین البرائٹ اور کیلی فورنیا کے گورنر آرنالڈ شوارجینگر پر بھی عائد ہوتی ہے۔

لیکن اس ایشو پر میرے غور وفکر پر شہریت کے قانونی پہلوؤں کا اتنا زیادہ اثر نہیں پڑا، حالانکہ اس کی بھی اپنی ایک اہمیت ہے۔ ہندوستانی

سماج کی متحمل فطرت ہے اور ہماری ثقافت سونے جیسے نرم و نازک اور سمندر جیسے وسیع دل رکھنے والی ہے۔ خاص طور سے اس وقت جب کوئی لڑکی بہو کی شکل میں خاندان کا حصہ بنتی ہے۔ غیر ملک میں پیدا ہوئے شخص کو اپنا بنانے میں ہندوستانیوں کو کسی طرح کی دقتوں کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ آزادی سے قبل ایسی دو خصوصی غیر ملکی خواتین کا ذکر کیا جاتا ہے جو ہندوستانی رعایا اور روح کا جزو بن گئیں۔ ان کے نام ہیں بھگنی نویدیتا★ اور مسز اینی بیسنٹ★ آج بھی ہندوستانی عوام انھیں عزت و احترام سے یاد کرتے ہیں۔

ہر ایک ہندوستانی کی طرح مجھے سونیا گاندھی سے پوری ہمدردی ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی میں کافی تکلیفیں اٹھائی ہیں۔ اس مصیبت سے نکلنے میں دکھائی گئی ان کی ہمت اور جرأت کی میں تعریف کرتا ہوں۔ اس کے باوجود مجھے اس بات سے مایوسی ہوئی کہ انھوں نے بوفورس گھپلے میں اطالوی ساتھی اوتاویو کواتروچی کے ذریعہ نبھائے گئے رول کو چھپانے کے لئے سانٹھ گانٹھ کی۔

اس رویہ میں سیاسی اخلاقیات کا فقدان نظر آتا ہے، ساتھ ہی ہندوستان کے اعلیٰ ایگزیکیٹو عہدہ پر متمکن ہونے کے لئے کسی خواہش مند شخص کو زیب نہیں دیتا۔ اس کور اَپ کے لئے ہندوستان کی تقریباً ہر انسٹی ٹیوشن — وزیر اعظم دفتر، وزارت قانون، وزارت خارجہ، وزارت دفاع، عدلیہ، سی بی آئی، جے پی سی، سرکار کے ذریعہ چل رہے میڈیا کا غلط استعمال کیا گیا ہے۔ کانگریسی ہرگز اپنے لیڈر اور پارٹی پر لگے اس کلنک کو مٹا نہیں پائیں گے۔

مئی 2004 میں غیر ملکی نسل کا ایشو چودھویں لوک سبھا کے انتخابات کے بعد دوبارہ اٹھ گیا۔ یہ ایشو اب تک حل نہیں ہو پایا ہے۔

★ بھگنی نویدیتا (1867-1911) کا جنم آئرلینڈ میں ہوا تھا۔ ان کا نام مارگریٹ الزبتھ نوبل تھا۔ وہ 1895 میں لندن میں سوامی وویکانند سے ملیں اور اپنی بقیہ زندگی ہندوستان کی خدمت میں وقف کردی۔ روحانی متجسس، عظیم مفکر اور سماجی خدمت گار کے طور پر انھوں نے 20ویں صدی کی پہلی دہائی میں ہندوستان میں قومی بیداری لانے میں بے پناہ اشتراک کیا تھا۔ ان کے روحانی اور عقلیت پسند کاموں سے متاثر ہوکر رویندر ناتھ ٹیگور نے 'عوامی ماں' کے طور پر ان کی تعریف کی۔ مسٹر اروند نے انھیں 'اگنی شکھا' کے نام سے پکارا اور ان کے گرو سوامی وویکانند نے انھیں 'ایک اصلی شیرنی' کہا۔ ان کی تخلیقات سے ہندوستان کی نئی نسلوں کو مسلسل ترغیب مل رہی ہے۔

★★ اینی بیسنٹ (1847-1933) مشہور و معروف برٹش سماجوادی تھیں۔ وہ زندگی کے تئیں ہندو مذہب کے نظریہ سے متاثر ہوکر روحانیت پسند بن گئیں۔ انھیں تمام مذاہب میں اندرونی تعلیم پر مبنی عالمی بھائی چارہ کو فروغ دے رہی عالمی تنظیم 'تھیوسوفیکل سوسائٹی' کی صدر منتخب کیا گیا۔ 1893 میں ہندوستان کی پہلی یاترا کے بعد وہ ہندوستان کی تحریک آزادی سے منسلک ہوگئیں۔ انھوں نے انڈین ہوم رول لیگ قائم کی جس کی طرف کئی قوم پرست لیڈر راغب ہوئے۔ 1917 میں وہ انڈین نیشنل کانگریس کی صدر منتخب کی گئیں۔ تھیاسوفی، سیاست، ثقافت، تعلیم، خواتین کی بھلائی اور سماجی اصلاح جیسے موضوعات پر تفصیلات سے لکھے گئے ان کے مضامین میں ہندوستان اور پوری دنیا کے لئے پیغام شامل ہے۔

4

ہندوستانی آئین کے کام کاج کا جائزہ

سماجی، اقتصادی اور سیاسی **انصاف**
غور و فکر، اظہار خیال، اعتماد، مذہب
اور عبادت کی **آزادی**،
عزت اور موقع کی **مساوات**
حاصل کرانے کے لئے
اور ان سب میں
فرد کی شان و شوکت اور یکجہتی
اور سالمیت کو یقینی بنانے والی **بھائی چارگی**
کو فروغ دینے کے لئے

— آئین ہند کے دیباچہ سے

حلف لینے کے 15 دن کے اندر ہی واجپئی سرکار نے اپنے انتخابی منشور میں کیے گئے ایک اہم وعدے کو پورا کر دیا۔ وہ وعدہ تھا— آئین کا جائزہ لینے کے لیے ایک قومی کمیشن کی تشکیل، جس کا مقصد آئین کی نصف صدی کے تجربے کا جائزہ لینا اور مستقبل کے چیلنجوں کے مطابق اس میں ترمیم کرنا تھا۔ کمیشن کو اس پر بھی غور کرنے کے لئے کہا گیا تھا کہ مرکز اور ریاست دونوں سطحوں پر سیاسی عدم استحکام کی حالت کو روکنے کے لئے موجودہ عدم اعتماد تجویز نظام کی جگہ پر 'تعمیری اعتماد کا ووٹ' کا انصرام اور لوک سبھا اور اسمبلیوں کے لئے ایک معینہ مدت کے امکان پر بھی غور کرے۔

آئین جائزہ کمیٹی کی تشکیل کی تجویز بنیادی طور پر میری ہی تھی۔ آئین کے نفاذ کے بعد سے یکے بعد دیگرے سرکاروں، خاص طور سے کانگریسی یا کانگریس حمایتی سرکاروں نے انتظامی اور سیاسی ضرورت کے مطابق اس میں 80 مرتبہ سے زیادہ ترمیم کی تھیں، چنانچہ میری پارٹی کا خیال تھا کہ خاص طور سے تین اسباب سے آئین کی بڑے وسیع پیمانہ پر جائزہ لینا ضروری ہے۔ پہلا، 1950 سے اب تک نافذ ہونے کے پچاس

برسوں میں آئین کے بنیادی آئیڈیلز اور اہداف و جمہوریت کی حقیقی نظم نسق میں کجی پیدا ہوگئی تھی، جسے دور کرنا ضروری تھا۔ دوسرا، پارلیمانی جمہوریت کے تینوں ستون-آئین ساز، انتظامیہ اور عدلیہ- کے طریق کار اور ان کے اشتراک کی سمت میں اصلاح کی ضرورت تھی۔ ساتھ ہی مرکز سے ریاستوں اور ریاستوں سے پنچایتی راج اداروں اور مقامی بلدیات کو اختیارات دینے کے مطالبہ پر ٹھیک سے غور خوض نہیں ہو پایا تھا۔ تیسرا اور سب سے اہم سبب تھا، سیاسی غیر یقینی۔ جس طرح اپریل 1999 میں کانگریس پارٹی نے واجپئی حکومت کو، متبادل حکومت کے بغیر، کمزور کیا تھا اور جس کی وجہ سے ملک کو لوک سبھا کے پانچ سال کے مدت کار میں تیرہ مہینے بعد ہی انتخابات کرانے کے لئے مجبور کر دیا تھا، اس نے ہمیں اس بارے میں یقین دہانی کرائی تھی کہ مستحکم انتظامیہ کے لئے ملک کو بہتر جمہوری طریقے اپنانے ہوں گے۔

اس کے بعد فروری 2000 حکومت نے 'نیشنل کمیشن ٹو ریو ودورکنگ آف دی کانسٹیٹیوشن' کی تشکیل کی۔ سیاسی گروہ بازی سے اوپر اٹھ کر اس کمیشن کے آزادانہ کردار کو اس میں شامل شخصیات ★ سے لگایا جا سکتا ہے۔ اس کے چیئر مین اتفاق رائے سے سپریم کورٹ کے چیف جسٹس اور نیشنل ہیومن رائٹس کمیشن کے سابق چیئر مین جسٹس ایم این وینکٹ چلیا تھے۔ کمیشن کے بارے میں کسی تنازع کی گنجائش نہیں تھی۔ یہ واضح طور سے بتایا گیا تھا کہ اس کی سفارشات 'پارلیمانی جمہوریت کے دائرہ کے اندر ہوں گی' اور 'آئین کے بنیادی اشکال یا خصوصیت میں مداخلت کئے بغیر ہوں گی'۔ لوگوں کے دلوں میں اپنے کام کو لیکر پیدا ہونے والی کسی بھی غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے کمیشن نے کہا کہ اس کا کام 'آئین کے کام کرنے کے طریقوں کا جائزہ لینا ہے، نہ کہ آئین کو دوبارہ لکھنا'۔ بدقسمتی سے شروع سے ہی کانگریس اور کمیونسٹ پارٹیوں نے اس پہل کی سخت تنقید کرتے ہوئے تیز حملے کرنے شروع کر دیئے۔ ان کی تنقید، اس (کمیشن) کے مقاصد اور سوچ کے بارے میں زبردست غلط فہمی تھی۔ انہوں نے حکومت پر الزام لگایا کہ اس کے پیچھے حکومت کا کوئی 'پوشیدہ ایجنڈا' ہے اور آئینی جائزہ لینے کا طریقہ اس طرح بنایا گیا ہے، جس سے بی جے پی 'آئین میں چن چن کر چھیڑ چھاڑ کر کے ایسے حالات بنا لے تا کہ مستقبل میں اتحاد ٹوٹنے تک این ڈی اے حکومت میں بنا رہے'۔ انہوں نے لوک سبھا کی ایک مقررہ مدت ہونے کی سوچ کو بھی یہ کہہ کر ٹھکرا دیا کہ اس سے پانچ سال تک منتخب نمائندوں کی ہندوستانی شہریوں کے تئیں جوابدہی نہیں ہوگی۔ 14 اپریل 2000 کو کانگریس پارٹی نے امبیڈکر جینتی کو 'آئین بچاؤ دن' کی شکل میں منایا اور بھارتیہ جنتا پارٹی کو 'امبیڈکر مخالف' اور 'دلت مخالف' دکھانے کے لئے مہم چھیڑ دی۔

بغیر سوچے سمجھے، بے بنیاد تنقید

ہمارے اتحادی حریفوں کے ذریعہ کی جا رہی بے جا اور غیر منصفانہ تنقید سمجھ میں تو آتی تھی لیکن جس نے ہمیں سب سے زیادہ ناامید کیا وہ تھی صدر جمہوریہ کے آر نارائنن کے ذریعہ اس پہل کی بے بنیاد مذمت۔ 27 جنوری 2000 کو پارلیمنٹ کے سنٹرل ہال میں آئین نافذ ہونے

★ کمیشن کے دوسرے ممبر تھے- سپریم کورٹ کو سابق چیف جسٹس اور مرکز-ریاست سے تعلقات بنانے کے لئے سرکاریہ کمیشن کے سربراہ جسٹس آر ایس سرکاریہ، سپریم کورٹ کے سابق چیف جسٹس بی جی جیون ریڈی، سابق لوک سبھا اسپیکر اور راجیو گاندھی حکومت میں وزیر پی اے سنگما، معروف ماہر قانون اور لوک سبھا کے سابق جنرل سکریٹری ڈاکٹر سبھاش سی کشیپ، آندھرا پردیش ہائی کورٹ کے سابق جج جسٹس کے پٹیا، ہندوستان کے سابق اٹارنی جنرل کے پراشرن، حالیہ اٹارنی جنرل سولی جے سوراب جی، امریکہ میں ہندوستان کے سابق سفیر ڈاکٹر عابد حسین، 'اسٹیٹس مین' کے سابق چیف سی آر ایرانی اور سابق رکن پارلیمنٹ سمترا جی کلکرنی۔

کے گولڈن جبلی کے موقع پر منعقد ایک تقریب میں انہوں نے کئی ایسے خیالات پیش کئے جو اس بارے میں حکومت کے غلط موقف پیش کرتے تھے۔ انہوں نے کہا 'آج جب آئین کے دوبارہ جائزہ لینے یا اس کے دوبارہ لکھے جانے کے بارے میں اتنا کچھ کہا جارہا ہے ہمیں یہ غور کرنا پڑے گا کہ کیا آئین ناکام ہوگیا ہے یا ہم نے اسے ناکامیاب کردیا ہے......حکومت کی شکل، پارلیمانی جمہوریت کی شکل آئین سازوں کے ذریعہ گہری سوچ فکر کے بعد انتخاب کیا گیا تھا۔ آئین ساز اجلاس میں ڈاکٹر امبیڈکر نے بتایا تھا کہ آئین کی شکل بنانے والی مسودہ کمیٹی نے ہندوستان کے لئے پارلیمانی نظام حکومت منتخب کرتے وقت مضبوطی کے بجائے جواب دہی کو زیادہ اہمیت دی تھی جو یکطرفہ اقتدار کی شکل لے سکتی تھی......حال میں نظام یا حکومت کی غیر مضبوطی کا جو تجربہ ہمیں ہوا وہ پارلیمانی نظام حکومت کو چھوڑ کر صدارتی نظام حکومت یا کسی دیگر نظام اپنانے کی مکمل وجہ نہیں ہے......میرا ماننا ہے کہ ہمیں اپنے نظام حکومت میں زیادہ سختی یا لچیلا پن سے بچنا چاہئے۔ کیونکہ اس سے سماج میں دھما کہ خیز حالات پیدا ہونے کا خطرہ بنا رہتا ہے......ہمیں یہ یقینی بنانا چاہئے کہ آئین کے پس منظر میں بنیادی سوچ اور آئین کی سماجی، معاشی یا تقدیس کی وہ روح برقرار رہے۔ نہانے کے بعد پانی کے ساتھ بچے کو باہر نہیں پھینکا جاسکتا'۔*

نارائن کی تقریر غلط تھی کیونکہ سرکار نے نیا آئین لکھنے یا پارلیمانی نظام حکومت کو چھوڑنے کے مقصد سے کمیشن کی تشکیل نہیں کی تھی۔ حکومت یا نظام میں غیر مضبوطی کے سلسلہ میں لوگوں کی تشویش کو جس طرح انہوں نے ابھارا وہ غلط تھا اور ساتھ ہی سیاست سے متاثر بھی محسوس ہورہا تھا۔ اسی موقع پر بولتے ہوئے وزیراعظم واجپئی نے ایک بار دوبارہ قوم کو یقین دلایا تھا کہ 'آئین کے بنیادی ڈھانچے اور بنیادی آئیڈیلز کی خلاف ورزی نہیں کی جائے گی۔' اس طرح صدر نارائن کے ذریعہ ظاہر کئے گئے خوف یا شبہ کو دور کردیا گیا تھا۔

ایک دوسرا نکتہ ہے جسے ہمارے حریفوں نے نظرانداز کردیا تھا۔ حقیقت میں آئین جائزہ کمیشن کے کام کی شکل مشورہ دینے والا تھا۔ آئین میں اصلاح تو لوک سبھا اور راجیہ سبھا کی اکثریت ہی کے ذریعہ کیا جاسکتا ہے جس میں لوک سبھا کے کم سے کم دو تہائی اراکین کی حاضری لازمی ہوتی ہے۔ کچھ آئینی اصلاح کے لئے کم سے کم نصف اسمبلیوں کی منظوری بھی ضروری ہوتی ہے۔ اس وقت دونوں ایوانوں کی ایسی اسٹرکچر ہوتی تھی کہ ذیلی ایوان میں تو این ڈی اے کی اکثریت تھی لیکن ایوان اعلیٰ میں اس کی اکثریت نہیں تھی۔ ایسی حالت میں اپوزیشن کے تعاون کے بغیر کوئی آئینی ترمیم بل پیش نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اسی طرح یہ الزام بھی بالکل غلط اور بے بنیاد تھا کہ اپنے ذاتی مفاد کے لئے آئین کو دوبارہ لکھنے یا بدلنے کا بی جے پی کا کوئی 'خفیہ ایجنڈا' ہے۔

اس اہم موضوع پر پٹنہ میں 26 اپریل 1998 کو میرے ساتھی اور پارٹی کے معاون ٹھاکر پرساد** یادگاری لکچر میں کی گئی تقریر کے میرے خیالوں کے کچھ حصوں سے قارئین کو اس اہم موضوع پر اور معلومات حاصل ہوگی۔

'کچھ لوگ غلط فہمی پھیلا رہے ہیں کہ ہماری حکومت امبیڈکر کے ذریعہ بنائے گئے آئین کو چھوڑ کر سیکولرزم کو درکنار کرکے اور درج فہرست ذات، درج فہرست قبائل و دیگر پسماندہ طبقات کے لئے ریزرویشن پالیسی کو ختم کرکے ایک نیا آئین نافذ کرنا چاہتی ہے۔ یہ الزام پوری طرح بے بنیاد ہے، سیاست سے متاثر ہیں۔ 'سرو دھرم سمبھاؤ' اور ریزرویشن دونوں ہی ہماری آئین کی بنیادی خصوصیات

---

* صدر جمہوریہ کے ذریعہ پارلیمنٹ سے خطاب، سرکاری پالیسی کا ایک رسمی بیان ہوتا ہے، جسے وزارت کے ذریعہ تیار کرکے حتمی شکل دی جاتی ہے اور مقررہ روایت کے مطابق صدر جمہوریہ کے ذریعہ پڑھا جاتا ہے۔ صدر چاہیں تو دیگر مواقع پر اپنے خیالات یا نظریہ پیش کرسکتے ہیں۔

** آنجہانی ٹھاکر پرساد کے لڑکے روی شنکر پرساد بی جے پی کے نوجوان لیڈر ہیں جو واجپئی وزارت میں وزیر رہے تھے۔

ہیں جن کے ساتھ نہ تو کوئی چھیڑ چھاڑ کی جا سکتی ہے اور نہ ہی کی جائے گی۔ آئین کی دفعہ 368 میں التزام ہے کہ کس طرح ہندوستانی آئین میں ترمیم کی جا سکتی ہے۔ اس کی تاریخ بہت دلچسپ رہی ہے۔ اس التزام کی سفارش کرتے ہوئے ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر- جو مکمل طور سے کمیٹی کے صدر تھے- نے تھامس جیفرسن کی مثال دی تھی، جنہوں نے امریکی آئین بنانے میں اہم کردار ادا کیا تھا- 'ہر ایک (آنے والی) نسل کو ہم ایک الگ قومیت کی شکل میں مان سکتے ہیں جس کے پاس اکثریت کی خواہش سے خود کو (قوانین وضوابط میں) باندھنے کا اختیار ہے لیکن اگلی نسل کو باندھنے کا حق کسی کو نہیں ہے۔ اسی طرح جیسے کسی دوسرے ملک کے لوگ اسے نہیں باندھ سکتے۔' ڈاکٹر امبیڈکر نے مزید کہا- 'جیفرسن نے جو کچھ کہا تھا وہ سچ ہی نہیں بلکہ مکمل سچ ہے...... آئین ساز مجلس نے اس آئین پر تکمیل اور صحیح ہونے کے مہر لگانے سے خود کو روکا ہے، اس میں ترمیم کی انتہائی لچیلے عمل کا التزام بھی کیا ہے۔' آج جو لوگ یہ منفی تشہیر کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ ہندوستان کی حالیہ سرکار ڈاکٹر امبیڈکر کے اچھے کاموں کو پلٹنا چاہتی ہے انہیں اس پس منظر میں خود ڈاکٹر امبیڈکر کے خیالات کا مطالعہ کرنا چاہئے۔

بی جے پی اتحاد میں ہم آج ملک کے سامنے منھ کھولے بڑے مسائل- غریبی، بے روزگاری، ناخواندگی، خراب صحت، غیر ترقی یافتہ سماج- کے لئے آئین کو ذمہ دار نہیں قرار دے سکتے۔ آئین ساز مجلس کے صدر کی شکل میں ڈاکٹر راجندر پرساد نے ٹھیک ہی کہا تھا- 'منتخب نمائندے اگر اہل ہیں اور ان میں اخلاق وایمانداری ہے تو وہ آئین میں کچھ غلط ہونے کے باوجود اچھا کام کر سکیں گے۔ اگر ان میں یہ باتیں نہیں ہیں تو آئین ملک کے لئے مناسب نہیں ہے۔ آخر آئین کسی مشین کی طرح ایک بے جان چیز ہی ہے، اس کو زندگی اور توانائی ان لوگوں سے ملتی ہے جو اس پر کنٹرول کرتے ہیں اور اس کو چلاتے ہیں، اس لئے آج ہندوستان کو صرف مخلص اور ایماندار لوگوں کا گروپ چاہئے جن کے سامنے ملک کا مفاد سب سے اوپر ہو۔ واضح طور سے آئین کے جائزہ کا موضوع بحث غصہ کے بجائے فکر کی زیادہ ضرورت ہے۔

آئینی جائزہ کمیٹی کی سفارشات

31/مارچ 2002 کو کمیشن نے وزیر اعظم کو اپنی رپورٹ سونپ دی۔ اتنے کم وقت میں اس نے قابلِ ستائش کام کیا تھا۔ کمیشن کے ذریعہ دی گئی کچھ ٹھوس پیش گوئی اور میل کا پتھر بننے کے لائق سفارشات کو میں یہاں اپنے تبصرے کے ساتھ اختصار میں پیش کرنا چاہتا ہوں—

سیاسی مضبوطی— کمیشن نے مشورہ دیا تھا کہ اس حالت میں— جب کسی ایک سیاسی پارٹی یا انتخاب سے قبل اتحاد کو مکمل اکثریت نہ ملے— ایسا التزام کیا جا سکتا ہے کہ لوک سبھا کے لئے منتخب کئے گئے سبھی اراکین مل کر ایوان کا لیڈر منتخب کر سکیں اور ساتھ ہی لوک سبھا کے اسپیکر کا انتخاب بھی کر سکیں۔ بعد میں ایوان میں منتخب ہونے والے لیڈر کو وزیر اعظم نامزد کیا جا سکتا ہے۔' ریاست کی حکومت کے معاملوں میں بھی یہی عمل نافذ کیا جا سکتا ہے۔' کمیشن نے عدم اعتماد کے مثبت ووٹ کو منظم کرنے کے لئے آئین ساز کے قوانین میں ترمیم کی سفارش بھی کی تھی— 'کسی حکومت کے خلاف عدم اعتماد تحریک لانے کے لئے ایوان کے کل منتخب ممبران میں سے کم سے کم 20 فیصد کی موجودگی لازمی ہونی چاہئے اور متبادل لیڈر کے انتخاب کی تجویز بھی اسی وقت رکھی جانی چاہئے۔

انتخابات سے متعلق اصلاحات—انتخابی نظام میں اصلاح کے لئے کمیشن نے متعدد مشورے پیش کئے تھے—

(الف) انتخابی فہرست ایک شفاف فوٹو شناختی کارڈ جاری کر کے تیار کرنی چاہئے اور یہ ووٹر شناختی کارڈ کثیر المقاصد شہریت (شناختی) کارڈ کی شکل میں ہونا چاہئے۔

(ب) چیف الیکشن کمشنر اور دوسرے الیکشن کمشنروں کی نامزدگی وزیر اعظم، لوک سبھا میں حزب اختلاف کے لیڈر، راجیہ سبھا میں اپوزیشن کے لیڈر، لوک سبھا اسپیکر اور راجیہ سبھا کے ڈپٹی چیئر مین کو ملا کر بنائی گئی ایک تنظیم یا گروپ کی سفارش پر بھی کی جانی چاہئے۔ ریاستی الیکشن کمشنروں کی نامزدگی کے معاملے میں یہی عمل دہرایا جا سکتا ہے۔

(ج) آئین کی 10ویں شیڈولڈ میں ترمیم کی جانی چاہیے—خاص کر یہ التزام کرنے کے لئے کہ منتخب نمائندے اگر انفرادی یا اجتماعی طور سے اس پارٹی یا اتحاد کو چھوڑتے ہیں جس کے ٹکٹ پر انہوں نے انتخاب جیتا ہے تو انہیں اپنی رکنیت سے استعفیٰ دینا پڑے اور دوبارہ انتخاب لڑنا پڑے۔

(د) انتخابی خرچ کی حالیہ حد بڑھتی قیمتوں کو دھیان میں رکھتے ہوئے مناسب سطح پر لائی جانی چاہئے۔ اس حد میں وہ سارے انتخابات سے متعلق اخراجات بھی شامل کئے جانے چاہئیں جو کسی امیدوار، اس کی پارٹی اور دوستوں، حامیوں وغیرہ کے ذریعہ کئے جاتے ہیں۔

(ر) سیاسی پارٹیوں کو منظوری دینے والی شرائط اور معیار کی سطح اوپر اٹھایا جانا چاہئے تاکہ چھوٹی چھوٹی (علاقائی) پارٹیوں کا حوصلہ توڑا جا سکے۔

(ذ) بہت بڑے وزارت کو قانون بنا کر روک لگائی جانی چاہئے۔ ریاست یا فیڈریشن منسٹریل کونسل میں کل وزرا کی تعداد متعلقہ اسمبلیوں کی کل تعداد اراکین کا 10 فیصد ہونا چاہئے۔

ایک بہتر قانون کے ذریعہ این ڈی اے حکومت نے ان میں سے کچھ سفارشوں کو 2003 میں نافذ کیا تھا۔ پارٹی بدلنے کی روایت کو روکنے کے لئے کی گئی تجویز کے تحت لوگوں کو سرکاری عہدہ سے محروم کرنے کا التزام کیا گیا تھا۔ وزارت میں وزرا کی تعداد اسمبلی کی کل ممبران کی تعداد کا 15 فیصد رکھی گئی تھی۔ وزرا کی کم سے کم تعداد 12 تھی۔ یوں تو کمیشن کے انتخابی اصلاح سے متعلق مشورے قابلِ ستائش تھے لیکن اس میں انتخاب کے سرکاری مالی مدد کی سفارش نہیں تھی جو میرے لئے افسوس ناک تھی—اس تجویز کی بنیاد پر کہ 'کنٹرول نظام' موجود نہیں تھے۔ اسی طرح 'غیر ملکی نسل' کے معاملے پر اس کے پلٹنے والے رویے سے بھی مجھے دکھ ہوا تھا۔ اس معاملے پر اس نے کہا تھا کہ 'ملکی سطح پر بات چیت کے بعد ایک سیاسی عمل کے ذریعہ سے اس کی گہرائی سے جانچ کی جانی چاہئے۔' کمیشن کے اسی پلٹنے والے رخ کی وجہ سے کمیشن کے ایک انتہائی رکن کی یہ پی اے سنگما نے استعفیٰ دے دیا تھا۔

بنیادی فرائض— کمیشن کی اس سفارش سے مجھے ازحد خوشی ہوئی کہ جس میں اس نے آئین کے دفعہ 513 الف میں دیئے گئے بنیادی فرائض میں مندرجہ ذیل فرائض کو جوڑنے کی بات کی تھی—انتخاب میں ووٹنگ کرنا، جمہوری عمل میں سرگرم حصہ داری ادا کرنا، ٹیکسوں کی ادائیگی، اپنے بچوں کی تعلیم اور جسمانی واخلاقی تربیت دینے کے معاملے میں ماں یا باپ کی ذمہ داری ادا کرنا اور خانگی اقدار کے جذبات کو فروغ دینا۔

ممبر پارلیمنٹ کے فنڈ کے تحت مقامی علاقہ کی ترقی اسکیم (MPLADS)— چینل نے ایم پی فنڈ کو فوراً ختم کرنے کی سفارش کی۔ کیونکہ یہ آئین کی بنیادی روح کے منافی تھی۔ مجھے یہ بہت مضحکہ خیز لگتا ہے کہ ہندوستان میں ایک ممبر پارلیمنٹ 'ایم پی فنڈ' کے ذریعہ کئے گئے کاموں کی وجہ سے ہی مشہور ہوتا ہے۔ جب کہ منتخب نمائندے کے ناطے یہ اس کی ابتدائی ذمہ داری بھی نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہم جیسے کثیر پارٹی جمہوریت میں سماجی، معاشی ترقی اور مقامی خراب انتظامیہ کی وجہ سے ہی لوگ خراب یا صرف نام کی سڑکوں، بغیر رسائل والے اسکولوں، بہتر طبی خدمات وغیرہ کے لئے اپنے ممبر پارلیمنٹ سے 'کچھ کرنے' کی امید کرتے ہیں۔ لیکن میرا ماننا ہے کہ ایم پی اگر اپنا وقت اور توانائی بہتر قانونی پالیسیوں کا باریک بینی سے تفتیش کرنے اور سرکاری پروگراموں کا ٹھیک سے جائزہ لیں تو ترقیات کی کوششوں کو مزید رفتار ملے گی۔

انتظامیہ وعوامی انتظامیہ— شہری خدمات میں اصلاح کے لئے کمیشن نے 2 اہم سفارشیں کی تھیں۔ 'حکومت ہند نے جوائنٹ سکریٹری سے اوپر کے سبھی عہدوں پر نامزدگی بڑے پیمانے کی اور قانونی ذرائع کے لئے کھلی ہونی چاہئے۔ سرکار کو کچھ عام یا عام زمرہ کے ملازمین کو ماہر زمرہ کے کچھ ملازمین کو عام ملازمین کے زمرہ میں لانا چاہئے— اور یہ کیریئر مینجمنٹ سیاسی اثرات سے پاک ہونا چاہئے۔ ذمہ داری کو یقینی بنانے کے لئے افسران کا سماجی تحریر امتحان ہونا چاہئے۔ معاملوں کو نمٹانے کے لئے اور کلرکوں کی لال فیتہ شاہی وتگڑم بازی اور بدعنوانی کو روکنے یا کم کرنے کے لئے کمیشن نے شہریوں کو حقوق اطلاعات کے اختیار کو یقینی بنانے والے قانون کی سفارش کی تھی۔' مجھے خوشی ہے کہ این ڈی اے اتحاد حکومت نے اس مشورے پر عمل کیا اور 2005 میں حقوق اطلاعات کے ایکٹ کو قانون بنادیا۔

عدالتی اصلاحات— سپریم کورٹ کے ججوں کی نامزدگی کے لئے کمیشن نے ایک قومی جوڈیشیل کمیشن تشکیل دینے کی سفارش کی تھی جس کے صدر ہندوستان کے چیف جسٹس ہوں اور سپریم کورٹ کے 2 سینئر ججوں، مرکزی وزیر قانون اور صدر کے ذریعہ نامزد ایک خاص شخص کو اس کا رکن بنایا جائے۔ کمیشن نے ہندوستانی عدالتی نظام کی رکاوٹیں دور کرنے کے لئے کئی مشورے دئے جس نے مختلف عدالتوں میں 2 کروڑ سے زائد معاملے برسوں سے التوا میں پڑے ہوئے ہیں۔ اس نے سفارش کی کہ 'سپریم کورٹ اور ہائی کورٹوں کے فیصلے کی آخری ساعت کے 90 دنوں کے اندر آجانے چاہئیں۔'

تیز رفتار سماجی، معاشی ترقی— درج فہرست ذات، درج فہرست قبائل اور پسماندہ طبقات کی ترقی اور اس کی مضبوطی پر زور دینے والے تیز رفتار سماجی معاشی، ترقی کے لئے کمیشن نے کئی مشورے دئے تھے۔ اپنی رپورٹ اس نے کہا تھا 'ایک اعلیٰ گروپ ہونا چاہئے جو رہنما اصولوں اور سماجی، معاشی اور ثقافتی حقوق— خاص طور سے کام کرنے کے حقوق، صحت، طعام اور قیام کے حقوق، 14 سال تک اور اس سے اوپر کی عمر تک تعلیم حاصل کرنے کے حقوق کا جائزہ لے۔ اس سے پلاننگ کمیشن کا فرض بن جاتا ہے کہ وہ خود یہ یقینی بنائے کہ سرکاری پالیسیوں کے رہنما اصولوں پر مثبت انداز سے عمل ہو رہا ہے۔ 'ہندوستان سرکار کے ہر ایک محکمہ روزارت کو ایک اسپیشل سالانہ رپورٹ تیار کرنی چاہئے جس میں متعلقہ سال میں نافذ کئے جانے والے رہنما اصولوں اور اہداف کی تفصیلات اور ان اہداف کو حاصل کرنے میں آنے والی رکاوٹوں اور ان رکاوٹوں کی وجہ اور حل کی تجاویز کی تفصیل ہونی چاہئے۔ رپورٹ پر 3 ماہ کے اندر پارلیمنٹ میں بحث ہونی چاہئے اور متعلق محکمہ روزارت کے ذریعہ کی جانے والی ضروری کارروائی سے متعلق تجاویز پیش کی جانی چاہئے۔ ریاستوں میں بھی اسی طرح کے عمل کو دہرایا جاسکتا ہے۔'

درج فہرست ذات ودرج فہرست قبائل کے لئے آئین میں ذیلی اسکیموں کے التزام کے تحت بجٹ وسائل کے اخراجات کی بدتر حالت پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کمیشن نے 'نئے بہتر اداروں' کو بنانے کا مشورہ دیا تھا تاکہ اس کو دور کیا جاسکے۔ علاقائی بنیاد پر تقسیم یقینی بنانے سے

قبل مرکز اور ہر ایک ریاست کے کل منصوبہ اخراجات میں سے ایک مقررہ رقم — مرکز اور متعلقہ ریاست کے اتھارٹیز کے ماتحت رکھی جانی چاہئے۔' اس سے درج فہرست ذات، ذیلی اسکیم اور درج فہرست قبائل ذیلی اسکیم میں آنے والی مشکلیں اور رکاوٹیں ایک ہی بار میں دور کی جاسکیں گی اور اس طرح درج فہرست ذات وقبائل کی معاشی آزادی تعلیمی معیار اور سماجی وقار پر قائم ایک بااثر سماجی شکل تشکیل دی جاسکے۔

ڈی سنٹرلائزیشن — ملک میں گاندھی وادیوں اور دیگر کئی لوگوں اور گروپوں — جس میں بی جے پی بھی شامل رہی تھی — کے ذریعہ بہت پہلے سے اٹھائی جارہی مانگ کے مطابق کمیشن نے پایا کہ '(سرکار) نظام میں ڈی سنٹرلائزیشن اور جمہوریت کے ذریعہ سیاسی اور قومی ڈھانچہ کے درمیان کے فرق کو کم کر کے ہی اشیا کی سب سے بہتر تقسیم یقینی بنا سکتی ہے۔' راجیو گاندھی حکومت کے ذریعہ نافذ کئے گئے 73 ویں اور 74 ویں آئینی ترامیم کا مقصد پنچائتی راج اداروں کو مستحکم کرنا ہی تھا لیکن پنچایتی راج اداروں کے مالی اور انتظامی استحکام کے لئے ان کی مالی اور طریقہ کار کے تبادلے کی سمت میں بہت کم کوشش کی گئی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ممبران پارلیمنٹ کو مقامی ترقیاتی اسکیم کو پنچایتی راج اداروں میں تبدیلی لانے والی اسکیم کی شکل میں دیکھا جارہا تھا۔

اس لئے آئینی جائزہ کمیشن نے مشورہ دیا تھا کہ پنچایتوں اور بلدیات کے لئے 'ایک الگ سرکاری خزانہ' بنانے کے لئے آئین کی 11 ویں اور 12 شیڈول میں ترمیم کیا جانا چاہئے۔' آئین کے سیکشن 4 میں ایک ایسا التزام کیا جانا چاہئے جس سے ریاستی اسمبلی ایسے التزام یا قانون بنا سکے جن سے پنچایتوں کو ڈی سنٹرلائزیشن کی وجہ سے ٹرانسفر ہونے والے ملازمین پر انتظامی کنٹرول کی مکمل طاقت مل جائے۔ خواہ ان ملازمین کو ریاستی قوانین کے تحت کیسے بھی اختیار کیوں نہ ملے ہوں۔ پنچایتوں کو یہ حق بھی ہونا چاہئے کہ اپنے دائرہ کار میں کام کے لئے کچھ ضروری ملازمین کو بھرتی کرسکیں۔'

اس سلسلے میں کمیشن کا ایک دوسرا دوررس مشورہ ضلع کو ترقیاتی اسکیموں کے لئے پلاننگ اور عمل درآمد کی یونٹ بنانے کے لئے تھا۔' اس سے موجودہ خرابیوں کو کافی حد تک دور کیا جاسکے گا اور اس طرح ترقیاتی پروگراموں کے پس منظر میں متعلقہ افسران کو عوام کے تئیں جوابدہ بنایا جاسکے گا۔' اس معاملے میں جہاں تک میرا ماننا ہے کمیشن اور زیادہ بہتر مشورہ دے سکتا تھا۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ مرکز اور ریاستی حکومتوں سے نیچے تیسری سطح کی حکومت یا سرکار کی شکل میں ایک مستحکم واہل 'ضلع سرکار' کی روایت پر غور کرنے کا وقت آگیا ہے۔ ہمارے یہاں کئی اضلاع ایسے ہیں جن کی آبادی دنیا کے کئی ممالک کی ریاستوں کی آبادی سے بھی زیادہ ہے۔ اسی طرح ہماری کئی ریاست رقبہ اور آبادی کے حساب سے دنیا کے کئی ممالک سے بھی بڑی ہیں۔ اسلئے بہتر حکومت کے لئے ہمیں سرکار وانتظامیہ کو نئے اداروں کے ذریعہ ڈی سنٹرلائزیشن کرنے پر غور کرنا ہوگا۔ اس سلسلے میں ایک دوسری قابلِ غور روایت بڑے شہروں★ میں میئروں اور کارپوریشن کونسلروں سے 'سٹی گورنمنٹ' بنانے کی ہے جس کے ذریعہ شہروں کی ترقی اور بہتر شہری انتظامیہ کو یقینی بنایا جاسکتا ہے۔

مرکز – ریاست تعلقات — سرکاریا کمیشن کے ذریعہ پیش کئے گئے خیالات کو دہراتے ہوئے جائزہ کمیشن نے فوری فیصلہ کے لئے بین ریاستی کونسل کے کام واستعمال کو زیادہ اثر دار بنائے جانے کی سفارش کی تھی جس کی کمی سے کئی ترقیاتی پروگراموں اور انتظامی اصلاحات کی رفتار سست ہوگئی ہے۔ اس میں آفات مینجمنٹ اور کسی ایمرجنسی حالات میں مرکز وریاستوں کے درمیان مستحکم ادارہ جاتی تعاون کی ضرورت پر زور دیا۔ سروسز پر حاصل ہونے والے ٹیکس جو اس وقت جی ڈی پی کا سب سے بڑا حصہ ہے، میں مرکزی حکومت کے ذریعہ لگائے اور وصول کئے

★ یہ کہنا غیر مناسب ہوگا کہ یہ بڑے شہر اپنی ریاست کا حصہ بنے رہیں گے۔

جاتے ہیں—— کو لگانے اور وصول کرنے کا کام ریاستوں کو دینے کے لئے آئین نے مناسب ترمیم کی سفارش کی۔ کمیشن نے پانی سے متعلق تنازع میں 'قومی مفاد سب سے اوپر' رکھتے ہوئے فوری تجاویز بھی پیش کئے تھے۔

پینل نے ریاستی اسمبلیوں کے ذریعہ پیش کئے گئے کسی قانون پر گورنر کے ذریعہ منظوری دیئے جانے یا اسے صدر جمہوریہ کے لئے محفوظ رکھنے کے بارے میں 6 ماہ کا وقت مقرر کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ 'اگر قانون کو صدر کے لئے زیر غور محفوظ رکھا جاتا ہے تو اس کے لئے ایک وقت مقرر —— مثلاً 3 ماہ ہونی چاہئے، جس کے اندر صدر جمہوریہ یہ فیصلہ لیں کہ قانون پر اپنی منظوری دیں یا اسے ریاستی اسمبلی کے پاس واپس بھیجنے کے لئے گورنر کو حکم دیں یا پھر آئین کی دفعہ 143 کے تحت اس پر سپریم کورٹ سے رائے مانگیں۔

گورنروں کی نامزدگی

کمیشن نے کہا کہ 'گورنروں کے انتخاب اور نامزدگی کے معاملے میں صدر جمہوریہ کے پاور کو کم نہیں کیا جانا چاہئے' ساتھ ہی اس نے یہ بھی سفارش کی کہ 'کسی ریاست کے گورنر کی نامزدگی صدر جمہوریہ کے ذریعہ اس ریاست کے وزیر اعلیٰ کے مشورے کے بعد ہی کی جانی چاہئے' کیونکہ وزارت داخلہ گورنروں کے ساتھ کام کرنے کے طور طریقوں کا جوابدہ ہوتا ہے، اس لئے یہ کہنے میں مجھے فخر کا احساس ہو رہا ہے کہ این ڈی اے حکومت نے آئینی جائزہ کمیشن کے ذریعہ یہ تجویز رکھنے سے بہت پہلے ہی یہ طریقہ اپنا گیا تھا۔ یو پی اے کے 6 سال کے دور حکومت میں ایک بھی گورنر کی نامزدگی متعلقہ ریاست کے وزیر اعلیٰ کے مشورہ—— بلکہ اجازت کے بغیر نہیں کی گئی۔ کانگریس اور کمیونسٹ پارٹیوں کے وزرائے اعلیٰ کے معاملے میں بھی ہم نے اسی وصول پر عمل کیا۔ مغربی بنگال کے سابق وزیر اعلیٰ جیوتی باسو اور ان کے بعد وزیر اعلیٰ بنے بدھا دیب بھٹا چاریہ کو تو اس پر خوشگوار احساس ہوا۔ کیونکہ ماضی میں کانگریسی حکومتوں کے ساتھ ان کا تجربہ بالکل مختلف رہا تھا۔

اب میں قارئین کی ذہانت اور صوابدید پر چھوڑتا ہوں کہ کیا وینکٹ چلیا کمیشن کی مندرجہ بالا سفارشات ہمارے حریفوں کے ذریعہ ہماری حکومت پر ہندوستان کی آئین کے بنیاد سے چھیڑ چھاڑ کرنے سے 'خفیہ ایجنڈے' کے الزامات کو متاثر کرتی ہے۔ میں ہندوستان کے لوگوں کو یاد دلانا چاہوں گا کہ ہمارے اوپر یہ الزام لگانے والے کئی لوگ اس وقت خاموش تھے جب ایمرجنسی کے دوران ایسا کیا جا رہا تھا۔

یہاں یہ ذکر کرنا مناسب ہوگا کہ کچھ گورنر—— جنہیں 1998 میں این ڈی اے حکومت کے اقتدار میں آنے سے قبل کانگریس یا کانگریس حامی حکومتوں کے ذریعہ نامزد کیا گیا تھا—— بھی اس وقت حیرت زدہ رہ گئے تھے جب ہم نے ان کی اچھے کام کو دیکھتے ہوئے انہیں دوبارہ گورنر نامزد کیا۔ اس سلسلے میں مہاراشٹر کے گورنر ڈاکٹر پی سی الیگزینڈر، جو اندرا گاندھی اور راجیو گاندھی سے نزدیکی کے لئے جانے جاتے تھے اور دونوں وزرائے اعظم کے چیف سکریٹری کے طور پر بھی کام کر چکے تھے اور میگھالیہ کے گورنر ایم ایم جیکب جو راجیو گاندھی کی وزارت میں منسٹر تھے—— کے ناموں کا ذکر کر سکتا ہوں۔ اسی طرح دہلی کے مشہور سابق پولس کمشنر و... مارواہ، جن کا بی جے پی سے کوئی تعلق نہیں تھا، بھی اس وقت چونک گئے تھے جب میں نے ان سے جھارکھنڈ میں گورنر کا عہدہ سنبھالنے کے لئے کہا تھا۔

مہاراشٹر کے گورنر کے عہدے پر ڈاکٹر الیگزینڈر کی نامزدگی کی وجہ سے کچھ منفی نتائج سامنے آئے۔ انہیں کبھی بی جے پی کا قریبی نہیں مانا جاتا تھا۔ این ڈی اے حکومت کے اقتدار میں آنے سے قبل ان سے میرا رابطہ محدود ہی رہا تھا۔ 1995 میں جب مہاراشٹر میں بی جے پی، شیوسینا کی حکومت قائم ہوئی تھی تب وہ مہاراشٹر کے گورنر تھے اور مجھے ممبئی کے راج بھون میں ملے تھے۔ پارٹی سیاست سے مستثنیٰ الگ الگ سیاسی

پارٹیوں کے ساتھ لے کر چلنے کی ان کی صلاحیت اور غیر جانب دارانہ و چوکنے پن سے میں بہت متاثر ہوا تھا۔ سچ کہوں تو ان کی کسی خصوصیت کو دیکھ کر ہم نے انہیں دوبارہ گورنر نامزد کرنے کا فیصلہ لیا تھا، لیکن کانگریس نے سونیا گاندھی سمیت کئی دوسرے لوگوں کو یہ بات اچھی نہیں لگی۔ جیسا کہ ڈاکٹر الیگزینڈر نے خودنوست میں لکھا ہے — 'انہوں نے (سونیا گاندھی نے) صاف صاف کہہ دیا کیا گورنر کے عہدے کی تجویز کو قبول کرنے پر، دوبارہ نامزدگی پر وہ سچ مچ مجھ سے ناخوش ہیں'۔

1998 کے بعد ڈاکٹر الیگزینڈر کے ساتھ مسلسل رابطہ اور کام کے دوران مجھے ان کے کردار، ایڈمنسٹریٹیو لائف کے تجربات اور مختلف موضوعات پر ان کے علم کے بارے میں پتہ چلا۔ اس لئے 2002 میں جب ڈاکٹر کے آر نارائنن کا صدر کے طور پر وقت ختم ہوا اور این ڈی اے کو صدر کے عہدہ کے لئے اپنے امیدوار کا انتخاب کرنا تھا تو اٹل جی اور میں نے سوچا کہ الیگزینڈر ہی ملک کے سب سے بڑے آئینی عہدہ کے لئے سب سے اہل ہیں۔ حقیقت میں این ڈی اے کی سبھی حلیف پارٹیوں نے ان کی امیدواری کو منظوری دے دی۔ باقی بچی تھی تو بس رسمی اعلان۔ لیکن آخری لمحہ میں جیسا کہ الیگزینڈر نے خود اپنی کتاب میں لکھا ہے — ان کے خلاف ایک 'گروپ' کھیلی گئی 'سازشی چالوں' کی وجہ سے سب کچھ الٹا ہو گیا۔ کانگریس قیادت نے ہمیں مطلع کیا کہ اگر ہم الیگزینڈر کو اپنا امیدوار بناتے ہیں تو حمایت نہیں کریں گے۔

الیگزینڈر نے لکھا ہے: کچھ 'کانگریسیوں' سازشی چال کے بارے میں پتہ چلنے پر میں نے انتہائی افسوس کے ساتھ وزیر اعظم اور وزیر داخلہ کو خط لکھا جس میں میں نے ان حاسدانہ باتوں کے کھوکھلے پن کا ذکر کیا تھا۔ خوش قسمتی سے یہ دونوں بڑے لیڈر ان لوگوں کی چالوں سے بالکل متاثر نہیں تھے۔ دراصل میرے خلاف چلائی جارہی اس مہم سے آڈوانی غم زدہ تھے۔ 2/جون 2002 کو مجھے بھیجے اپنے ایک خط میں انہوں نے لکھا تھا — 'آپ کے خلاف جو مہم شروع کی گئی ہے وہ سچ مچ افسوس ناک ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ سیاست داں طبقہ کے کچھ لوگ اپنے سیاسی مفاد کے لئے کس حد تک نیچے گر سکتے ہیں'۔

اس وقت صدر کے انتخاب کی اسٹرکچر ہی کچھ ایسی تھی کہ این ڈی اے کو اپنا امیدوار کامیاب بنانے کے لئے کانگریس اور دوسری اپوزیشن پارٹیوں کی حمایت ضروری تھی، اس لئے ہم نے مشہور و معروف میزائل سائنسداں اور پوکھرن نیوکلیائی تجربہ-II کے ہیرو ڈاکٹر اے پی جے عبد الکلام کو این ڈی اے کے امیدوار کے طور پر انتخابی میدان میں اتارا۔ ڈاکٹر کلام ہندوستان کے سب سے بہترین اور سب سے مقبول صدر ثابت ہوئے۔ انہوں نے نہ صرف اس اعلیٰ ترین عہدے کے وقار کو برقرار رکھا بلکہ ہندوستان کے سبھی طبقوں خاص طور سے بچوں اور نوجوانوں کو ایک ترقی یافتہ ہندوستان کو اپنے خواب سے متحرک کیا۔ انہوں نے ہندوستان کی روحانی اور ثقافتی روایت میں اٹوٹ آستھا کو لوگوں تک پیش کیا۔ ساتھ ہی عام لوگوں سے سائنس کی کم سے کم تکنیک اور دریافتوں کو اپنانے کے لئے درخواست کی۔ جولائی 2007 میں صدر جمہوریہ کے انتخاب کے وقت این ڈی اے ایک بار پھر ڈاکٹر کلام کو حمایت دینے کے لئے پرجوش تھی لیکن کانگریس نے اس کی مخالفت کی تھی۔

مجھے خوشی ہے کہ ڈاکٹر الیگزینڈر نے خودنوست میں غیر جانبدار ہو کر 2002 کے اس واقعہ کی تفصیلات پیش کی ہے۔ ان کی کتاب میں 2 آپسی مخالف سیاسی ثقافتوں کا فرق صاف صاف دکھائی دیتا ہے — ایک جانب کانگریس قیادت ہے، جو لوگوں کو 'ہمارا آدمی بنام ان کا آدمی' کے چشمے سے دیکھنے کی عادت ہے اور دوسری جانب بی جے پی ہے جس کے فیصلے قومی مفاد میں اور جمہوریت کے وقار کی حفاظت کرنے کے لئے ہے۔

5

وزارت داخلہ کی کمان

ایشور، ہمیں انسان دو. اس وقت کی مانگ ہے.
مضبوط ذہن، بڑا دل، سچی عقیدت اور تیار ہاتھ،
انسان،عہدے کی خواہش جسے مار نہ سکے،
انسان، جسے عہدے کی بدعنوانی خرید نہ سکے
انسان، جس کے خود کے خیالات اور عزم و خواہش ہو،
انسان، جو سیاست میں بھڑکانے والوں کے درمیان کھڑا رہ سکے
اور ان کی دل شکن باتوں کو پلک جھپکتے ختم کر سکے
ایک اونچے اصولوں والا انسان، جو عوامی خدمات میں اور ذاتی خیالات
میں دُھند سے اوپر رہ سکے

— جو سیاہ گلبرٹ ہالینڈ (1881-1819) امریکی شاعر

1998 میں لوک سبھا انتخابات میں جب اٹل بہاری واجپئی کی قیادت میں بی جے پی اتحاد کو واضح اکثریت ملی تو اس وقت کے میرے کچھ ساتھیوں نے مشورہ دیا کہ میں وزارت میں شامل نہ ہو کر پارٹی کو اور مضبوط کرنے کا کام کرتا رہوں۔ شروع میں میں خود بھی یہی چاہتا تھا لیکن پارٹی میں زیادہ تر لوگوں کی خواہش تھی کہ میں سرکار میں شامل ہو جاؤں۔ ان کا کہنا تھا کہ نئے سرکاری نظام کو مضبوط بنانے اور لوگوں کو 2 اقتدار کے مراکز کے بارے میں بے بنیاد سوچ پالنے سے روکنے کے لئے یہ ضروری ہے۔ اٹل جی خود بھی چاہتے تھے کہ میں حکومت میں ان کا ساتھ دوں۔

وزیر اعظم نے مجھے اپنی پسند کے مطابق وزارت منتخب کرنے کے لئے کہا۔ میں نے وزارت داخلہ کا انتخاب کیا جو پہلے سے سوچ رکھا تھا۔ 1997 میں اپنے 2 ماہ کی گولڈن جوبلی رتھ یاترا کے دوران اور 1998 میں لوک سبھا انتخاب میں اپنی مہم میں بھی 'سیکورٹی' کو میں نے بی جے پی کی اچھی حکومت کا اہم ایشو بنایا تھا۔ میں اپنی تقریروں میں کہتا تھا کہ دنیا کی تاریخ میں اور ملک کے لوگوں کی سلامتی کو یقینی بنانا کسی بھی حکومت کی

سب سے پہلی ذمہ داری ہے۔ بدقسمتی کی بات ہے کہ آزادی کے 50 برسوں کے بعد بھی ہندوستان کی حکومت یہ بنیادی فرض پورا کرنے میں ناکام دکھائی دیتی ہے۔ ہندوستان کو— ملک کے اندر اور باہر بھی— ایک کمزور ملک کے طور پر دیکھا جاتا رہا تھا جو نہ صرف طاقت ور ملکوں بلکہ بہت چھوٹے، کمزور پڑوسی ملکوں کے سامنے بھی اپنے ملکی مفادات کی حفاظت نہیں کرسکتا۔ ہندوستان کو ایک ایسے ملک کے طور پر دیکھا جاتا تھا جس کے پاس مضبوط سیاسی عزم کی کمی اور غیر اثر دار، تامل، بغیر کسی مقصد اور کرپٹ سیکورٹی ڈھانچہ وغیرہ جس کی کمزوریاں تھیں۔'

1998 میں اپنے انتخابی منشور میں بی جے پی نے واضح طور سے ذکر کیا تھا— 'ملک کی سلامتی ہماری اولین ترجیح ہے۔ اپنے اس مقدس فرض کو پورا کرنے کے لئے ہم ماضی کی حکومتوں کے ذریعہ گزشتہ ایک عشرہ میں سلامتی کے معاملوں میں کی گئی لاپروائی کو دور کریں گے۔ ہم ملک کے ہر ایک حصہ میں سبھی شہریوں کی سلامتی یقینی بنانے کے لئے پُرعزم ہیں۔ اس ہدف کو حاصل کرنے کے لئے ہم فساد سے مبرا— انتظامیہ اور دہشت گردی— سے پاک ہندوستان کی تعمیر کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔

اس طرح وزارت داخلہ منتخب کرنے کے پیچھے میرا اپنا مقصد رہا تھا، جس میں میں اس وعدے کو پورا کرنے میں اپنا ذاتی تعاون دینا چاہتا تھا۔ میری یہ پسند دوسرے مسائل سے بھی متصادم تھی، جسے اقتدار میں آنے کے بعد این ڈی اے حکومت نے نشان زد کیا تھا۔ ہندوستان کی سلامتی خطروں کے مطالعہ وتجزیہ سے صاف اشارہ مل گیا تھا کہ ملک کی باہری سلامتی کے بہ نسبت اندرونی سلامتی کی اہمیت بہت بڑھ گئی تھی۔ یہ سچ ہے کہ ملکوں کے درمیان لڑائی کے خطرے بہت کم ہو گئے تھے لیکن اندرونی سلامتی کے خطرے بہت بڑھ گئے تھے۔ اور— جیسا مطالعہ سے پتہ چل رہا تھا— آنے والے وقت میں یہی حالات برقرار رہنے کا اندیشہ تھا۔

ہندوستان کے خلاف پاکستان کی پراکسی لڑائی 80 کے عشرہ میں ہی شروع ہوگئی تھی جو اس وقت کے فوجی حکمراں جنرل ضیاء الحق کے ذریعہ بنائی گئی اسکیم کی شکل میں تھی۔ 1971 کی لڑائی میں اپنی شکست اور نتیجتاً بنگلہ دیش کے قیام کے بعد پاکستان اچھی طرح سمجھ گیا کہ وہ بالواسطہ یا روایتی لڑائی میں ہندوستان کو شکست نہیں دے سکتا، اس لئے اس نے لڑائی تھوپنے کا دوسرا طریقہ اختیار کیا۔ اس کے لئے اس نے دہشت گردی کا طریقہ اپنایا اور دہشت پھیلانے کے لئے اس نے جن لوگوں کو تعینات کیا اس میں کچھ بھاڑے کے فوجی تھے تو کچھ مجاہدین، جو افغانستان پر سوویت یونین کا قبضہ ہو جانے کے بعد بے روزگار ہو گئے تھے اور کچھ ایسے نوجوان تھے جنہیں گمراہ کر کے انٹر سروس انٹلی جنس (آئی ایس آئی) کے ذریعہ پاکستان میں تربیت دی گئی تھی اور انہیں جن ہتھیاروں سے لیس کیا گیا تھا وہ افغان لڑائی کے بعد بڑی مقدار بچے ہوئے ہتھیار تھے۔

یہ ایک ایسی لڑائی تھی جس کی کوئی حد نہیں تھی۔ چھپے ہوئے دشمن کسی بھی مقام پر حملہ کرسکتے تھے۔ اسی طرح سرحد پار دہشت گردی اب پنجاب و جموں کشمیر تک ہی محدود نہیں تھی۔ 12 / مارچ 1993 کو آئی ایس آئی کے ذریعہ تربیت یافتہ دہشت گردوں نے ممبئی میں سیریل بم دھماکے کئے جس میں 257 بے قصور لوگوں کی جانیں چلی گئیں۔ یہ انتہائی بہیمانہ فعل تھا جو کچھ ہی گھنٹوں کے اندر شہر کے 10 مختلف مقامات پر کیا گیا تھا۔ اس میں دہشت گردوں کے ذریعہ ممبئی اسٹاک ایکسچینج کی عظیم الشان بلڈنگ اور ایئر انڈیا کے ہیڈ کوارٹر کو حملہ کا نشانہ بنایا گیا تھا، جس سے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ حملہ آوروں کا مقصد ہمارے ملک کی تجارتی راجدھانی کو معذور بنانا تھا۔ تفتیش سے جلد ہی یہ بات سامنے آئی کہ اس حملے کا کلیدی پالیسی ساز داؤد ابراہیم— ممبئی میں پیدا ہونے والا اور دبئی میں رہنے والا بین الاقوامی مافیا تھا جسے جلد ہی پاکستان میں محفوظ پناہ گاہ مل گئی۔ اس حملے کو انجام دینے والے دوسرے بیشتر دہشت گردوں کو بھی اسی ملک میں پناہ مل گئی جہاں حملے کی سازش تیار کی گئی تھی۔

فروری 1998 میں کوئمبتور میں مجھے بھی ایک دہشت گردانہ حملے کا نشانہ بنایا گیا تھا جس میں 57 لوگ مارے گئے تھے۔ ممبئی اور کوئمبتور کے دہشت گردانہ حملوں کا ذکر اس لئے کر رہا ہوں کہ اس حملے کو پنجاب اور جموں وکشمیر کی دہشت گردانہ سرگرمیوں کے ساتھ ملا کر دیکھنے پر — این ڈی اے کے اقتدار میں آنے کے وقت — پاکستان کی 'ہندوستان کو ایک ہزار چوٹیں پہنچا کر اس کا خون بہانے' کی پالیسی کا ثبوت ملتا تھا۔
وزیر داخلہ ہونے کے ناطے مجھے محسوس ہوا کہ دہشت گردی کے خلاف اس لڑائی میں ہندوستان کی کامیابی کو یقینی بنانا میرا فرض ہے۔

نارتھ بلاک سے افسوس ناک منظر

جب میں نے وزارت داخلہ کی ذمہ داری سنبھالی تو وزارت کی عمارت کی عظمت اور اس کے کام کے طریقہ میں بڑی سستی کے درمیان اندرونی اختلافات کو دیکھ کر میں بہت بے چین ہوا۔ نارتھ بلاک جہاں وزارت داخلہ اور وزارت خزانہ واقع ہے اور ساؤتھ بلاک جہاں پرائم منسٹر آفس اور وزارت دفاع و وزارت خارجہ کے دفاتر ہیں — دونوں یکساں ڈیزائن کی عمارتیں ہیں جو نئی دہلی کی رائے سینا ہلز پر واقع ہے۔ دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کرنے والی ایک لمبی سڑک ہے جسے 'راج پتھ' کہا جاتا ہے جس کے ایک سرے پر راشٹر پتی بھون اور دوسرے سرے پر دہلی کی شناخت انڈیا گیٹ ہے۔ ان عمارتوں کی خوبصورتی اور عظمت — جہاں ہندوستان کی حکومت ہے — کسی بھی ہندوستانی کے قومی فخر کے جذبہ کو بھر دینے والی ہے۔ نارتھ بلاک سے تھوڑے ہی فاصلے پر پارلیمنٹ ہاؤس، جس کی پہلی منزل پر ریتیلے پتھر کے بنے 144 عظیم کھمبوں کا کاریڈور ہے۔ بلاشبہ حکومت ہند کی یہ شاندار آرکی ٹیکٹ، نئی دہلی کو دنیا کی سب سے خوبصورت راجدھانیوں میں سے ایک بناتی ہے۔★ پھر بھی اس مقام کے غلامی کے دور کے باقیات اب بھی ہندوستان کے نظام سلامتی پر اثر ڈالے ہوئے ہے۔

جب ہندوستان آزاد ہوا تب اسے ایک ایسا سیکورٹی نظام وراثت میں ملی جو بنیادی طور سے غلامانہ دور حکومت کی ضرورتوں کے مطابق برطانوی سامراج کے سیاسی، معاشی اور فوجی مفادات کے تحفظ کے لئے تیار کی گئی تھی۔ انتظامیہ کی شکل کچھ ایسی تھی کی وہ عوام سے ایک دوری بنا کر چلتی تھی اور عوام بھی اسے خوف اور غلامانہ ذہن سے ہی دیکھتی تھی۔ اس نظام کا قصور اور ہندوستان کی ضرورتوں کی تقسیم میں اس کی نااہلیت صدی کے آخری دو عشروں میں پوری طرح سے واضح ہوگئی تھی۔ متعدد خطروں کی وجہ سے اس کی اندرونی سیکورٹی کی حالت بگڑ گئی۔ پاکستان حامی سرحد پار دہشت گردی کے علاوہ ہمارے ملک کے سامنے شمال مغربی ریاستوں میں مختلف دہشت گرد اور علیحدگی پسند تنظیموں، نیپال سے لے کر جنوبی ہند کے آندھرا پردیش اور اس کے آگے کے حصے جسے 'لال کاری ڈور' کہتے ہیں، بائیں بازو کی دہشت گرد تنظیموں کے بڑھتے حملے، ملک کے مختلف حصوں میں توڑ پھوڑ، دھماکے، جاسوسی، جعلی کرنسی اور منشیات کے ناجائز کاروبار کے بڑھتے واقعات نے ایک عظیم بحران کھڑا کر دیا ہے۔

پاکستان اور بنگلہ دیش سے لگنے والی ہندوستان کی سرحدیں محفوظ نہیں تھیں۔ دوسری جانب چین کے ساتھ سرحدی تنازع ابھی حل نہیں ہو پایا تھا اور نیپال سے متصل سرحد پر سیکورٹی کا کوئی بہتر انتظام ہی نہیں ہے۔ بنگلہ دیش سے ہونے والی ناجائز دراندازی نے آبادی پر حملہ کر دیا ہے جس سے ہندوستان کی ایکتا، سالمیت اور سلامتی کے لئے سنگین خطرہ پیدا ہوگیا تھا۔ وقتاً فوقتاً ملک میں بننے والی حکومتوں نے شمال مغرب میں

★ 1911 میں انگریزوں نے اپنی راجدھانی کلکتہ سے دہلی لانے کا فیصلہ کیا تو نئی دہلی اور برٹش حکومت طاقت کے بھی عظیم نشانوں کا تصور ایک انگریز آرکی ٹیکٹ ایڈونڈ لٹینس نے کی تھی۔ یہ بدقسمتی کی بات ہے کہ آزاد ہندوستان میں ہماری جمہوریت کے افتخار اور اس کے وقار کے مطابق اس طرح کی ہندوستانی عمارتیں تعمیر نہیں ہو پائی ہیں۔

ہندوستان کی جغرافیائی و تاریخی حساسیت کو سنجیدگی سے نہیں لیا ہے۔ شمال مغرب میں ہماری 8 ریاستیں — اروناچل پردیش، آسام، منی پور، میگھالیہ، میزورم، ناگالینڈ، تریپورہ اور سکم ہیں۔ ان ریاستوں کی تقریباً 2 ہزار کلومیٹر طویل سرحد کا 98 فیصد حصہ غیر ملکی زمین سے ملتا ہے اور محض 2 فیصد حصہ ہندوستان کی زمین سے۔ ہندوستان کے باقی حصہ سے اس علاقہ کا رابطہ شمالی بنگال کے اوپر صرف 21 کلومیٹر کے مخدوش کاری ڈور جسے 'چکنز نیک'★ کہا جاتا ہے، کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔ ایک طرح سے شمال مغرب کی سبھی ریاستیں کبھی نہ کبھی بغاوت اور علیحدگی پسند سرگرمیوں سے لڑ چکی ہیں۔ اس حساس ترین سرحد کا سب سے بڑا علاقہ بنگلہ دیش سے ملتا ہے جہاں کے کچھ لیڈر 'لیبنس راؤم' کی پالیسی کی وکالت کرتے رہے ہیں۔ 'لیبنس راؤم' جرمن زبان کا ایک لفظ ہے جس کا معنی ہے— دوسرے ملک کے علاقہ میں 'رہنے کے لئے' اور 'زیادہ جگہ' کی مانگ۔ بدقسمتی کی بات ہے کہ یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی ہمارے ملک کی کئی سیاسی پارٹیوں — خاص کر کانگریس — نے اس مسئلہ کی جانب سے آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔

اسی طرح ہندوستان کی طویل ساحلی سرحدوں کو بھی کافی عرصہ سے نظر انداز کیا جاتا رہا ہے، جہاں سے ناجائز شکار اور بڑے پیمانہ پر اسمگلنگ ایک عام بات ہوگئی ہے۔ بحیرۂ ہند، بحیرۂ عرب اور خلیج بنگال کے 20 لاکھ کلومیٹر رقبہ سے زیادہ آبی علاقہ میں پھیلے ہمارے اہم معاشی علاقہ کی سیکورٹی اور بہتر استعمال کا کوئی اچھا انتظام نہیں تھا۔

فوج کے ایک بڑے حصہ کو قومی سلامتی کے اس روایتی کردار سے ہٹا کر شہری انتظامیہ کی مدد میں لگا دیا گیا تھا۔ اس سے اس کی تیاری، تربیت اور حوصلہ پر منفی اثر پڑ رہا تھا۔ مرکز کے پاس نیم فورسز ہوتے ہوئے بھی اسے نظم و نسق سے جڑی ریاستی حکومتوں کی بڑھتی ضرورتوں کو پورا کرنے میں مشکلیں دکھائی پڑ رہی تھی۔ اس سے دہشت گردی سے متاثر علاقوں میں سیکورٹی فورسز کو بڑی قیمت چکانی پڑ رہی تھی۔ اس میں ہر سال 1000 سے زائد سیکورٹی فورسز مارے جارہے تھے۔

ماضی میں وقتاً فوقتاً اقتدار میں آنے والی حکومتیں ان خطروں کے پیش نظر ملک کے لئے کوئی کثیر المیعاد سیکورٹی پالیسی یا مقصد بنا پانے میں اور اسے حاصل کرنے کے لئے بہتر پلاننگ کرنے میں ناکام رہی تھی۔ قومی سلامتی کی جانب حکومت کی توجہ ہمیشہ جنگ یا دوسرے سنگین خطروں کے وقت ہی جاتی تھی۔ وہ بھی تب تک جب تک خطرہ سامنے رہتا تھا۔ نتیجتاً ٹکراؤ یا بات چیت کا راستہ ہمارے مخالفین کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔

اگرچہ یہ معاملہ میری وزارت سے بالواسطہ متعلق نہیں تھا لیکن 1980 کے بعد سے دفاعی معاملوں کے ماڈرنائزیشن کے ٹھپ پڑے عمل کو گھٹتے دفاعی بجٹ پر مجھے بہت دکھ ہوتا تھا۔ غیر ضروری تاخیر اور ٹال مٹول کا مسئلہ نہ صرف ہونے والے پروگراموں میں تھا بلکہ لائٹ کمبیٹ ایئر کرافٹ پروجیکٹ اسکیم- جو 1983 میں شروع کی گئی تھی - اور 'ارجن' جنگی ٹینک پروجیکٹ، جو 1974 میں شروع کی گئی تھی - جیسے کثیر المقاصد پروجیکٹ بھی اس مسئلہ کے گرفت میں تھے۔ دفاعی ریسرچ اور ڈیولپمنٹ تنظیم کے کئی پروگراموں میں بھی رکاوٹیں آرہی تھی۔ کئی ماہرین سے مجھے پتہ چلا تھا کہ ہمارے مسلح فورسز کو ملنے والی تربیت، فوجی ساز و سامان سے متعلق تعاون نہ ملنے کی وجہ سے ہمارے دفاعی نظام میں بدامنی کے جذبات پھیل گئے ہیں۔ 'سیاسی آقا قومی مفادات کو دھیان میں رکھ کر فیصلہ لینے کے بجائے دیگر وجوہات سے فیصلہ لیتے ہیں'۔ مجھے ان ماہرین نے بتایا۔

★ اس کے برعکس شمال مغرب کے بنگلہ دیش کے ساتھ 1272 کلومیٹر طویل سرحد ہے جو ہندوستان- بنگلہ دیش کی 4095 کل میٹر طویل سرحد کا حصہ ہے۔ اس کا 60 فیصد حصہ کھلا ہوا بغیر باڑھ کا ہے۔

ہماری قومی سلامتی نظام کے منظم ڈھانچے اور طریق کار سے متعلق پریشانیاں بھی تھیں۔ افسر شاہی اور گروپ بازی کا مسئلہ گہرائی تک پہنچ چکی تھی، جس نے ایسی لڑائیوں کو جنم دے دیا تھا جنہیں ٹالا جا سکتا تھا۔ ہماری سیکورٹی منظم وسائل، تجربات اور انفارمیشن ونکنالوجی کے تبادلہ کے معاملہ میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون اور تال میل بنا کر نہیں چل پا رہی تھی۔ ہمارا سیکورٹی ڈھانچہ تو بہت بڑا تھا لیکن ہنر مندی اور اور اس کی قیمت ادا کرنے کی کمی تھی۔ فوری چیلنجوں سے کامیاب طریقے سے نمٹنے کے لئے اسے نہ تو بہتر تربیت حاصل تھی اور نہ ضروری آلات مہیا کرائے گئے تھے۔ ان برسوں میں اس میں نہ صرف زنگ لگ گیا تھا بلکہ اس میں بدعنوانی، دباؤ اور مفاد پرستی بھی پوری طرح آ گئی تھی۔ یہ سب ہمارے مخالفین، دشمنوں کو اچھا موقع مہیا کرانے والا تھا، لیکن مجبوری بھی تھی۔

خارجہ پالیسی کا بنیادی مقصد قومی مفادات کا تحفظ کرنا ہوتا ہے- خاص طور سے قومی سلامتی۔ لیکن بدقسمتی سے اندرونی سیکورٹی کے معاملہ کو ہمارے سفارتی کوششوں میں بہت کم ترجیح دی گئی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم عالمی برادری کو ہندوستان کے خلاف پاکستان کے ذریعہ چلائی جا رہی پراکسی لڑئی کے معاملہ میں مکمل اعتماد میں نہیں پائے تھے۔ پاکستان پنجاب اور جموں وکشمیر میں آزادی کی لڑائی کے نام پر دہشت پھیلا تا رہا تھا۔ ہمارے سیکورٹی فورسز کے جوابی حملوں کو وہ دنیا کے اہم ممالک میں حقوق انسانی کی خلاف ورزی کی شکل میں پیش کر رہا تھا۔

ملک کے سیکورٹی انتظام میں پچھلی روایت پسندی، انتظامی اور قانونی رکاوٹوں سے میں بہت زیادہ متفکر تھا۔ ہمارے آئین ساز آزادی کے ابتدائی دور میں یہ اندازہ نہیں لگا سکے تھے کہ آنے والے عشروں میں سلامتی کے چیلنجز کس شکل میں سامنے آئیں گے۔ ہمارا آئین اس سوچ پر تیار کیا گیا تھا کہ قومی سلامتی کی ذمہ داری مرکز کی ہے، جبکہ نظم ونسق بنائے رکھنے کی ذمہ داری ریاستی حکومتوں کی ہے۔ اس دور کے لئے یہ سوچ خود میں مکمل اور اچھی تھی، جبکہ لڑائی روایتی فوجی حملوں کی شکل میں لڑی جاتی تھی۔ لیکن پراکسی لڑائی کے حالات میں- جس میں دشمن سامنے نہ آ کر بھی بھاری نقصان پہنچا سکتا ہے- یہ بہتر نہیں ہے۔ دہشت گردی، علاحدگی پسند تحریک۔ بائیں بازو کی دہشت گردی، جاسوسی، دھماکے وغیرہ- جو یہ سب ملک کی قومی ایکتا، سالمیت اور سیکورٹی کے لئے خطرہ بنے ہوئے تھے- کو کسی خالص نظم ونسق کے پس منظر میں کیسے دیکھ سکتا تھا؟ یہاں جرائم کے لئے ہدف کا تعین، پلاننگ، وسائل اور تربیت وغیرہ سب کچھ باہری تھی، بس وہ جرائم ہمارے ملک میں ہونا تھا۔ جس ریاست میں جرائم کی یہ وارداتیں ہوتی تھیں، اس سے یہ امید نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ ان مجرموں کو پکڑ کر تفتیش کر کے انہیں سزا دے سکے گی، جن کا ایک ملک گیر نیٹ ورک تیار ہو گیا تھا اور جن کے سازشی سرغنہ سرحد پار سے سازشیں تیار کر رہے تھے۔

ماضی کی ایک اور وراثت بھی ہے، جس نے اجتماعی قتل اور مجرموں کے تئیں ہندوستان کے ردعمل کے رویہ کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ ہمارا کرمنل جوڈیشل نظام حالیہ چیلنجوں سے نمٹنے میں ناکام رہا ہے۔ ہماری عدالت مجرموں اور مشتبہ ملزمان کے حق میں سست اور حمایتی رہے ہیں۔ دراصل عدالت سچائی جاننے کی کوشش نہیں کرتی تھی، بلکہ ثبوت کا مطالبہ کرتی تھی۔ اس طرح انصاف کے عمل میں سست روی اور جرم ثابت کرنے کے انتہائی کمتر شرح- جو سنگین جرائم کے معاملوں میں بھی دس فیصد سے کم ہوا کرتا تھا- سے ایک طرف تفتیشی ایجنسیوں کا حوصلہ گر جاتا تھا وہیں دوسری جانب ملک مخالف عناصر کا حوصلہ بلند ہو جاتا تھا۔

کرمنل جوڈیشل نظام میں اصلاح کے لئے تشکیل دی گئی منی متھ کمیٹی ★ نے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا—

★ نومبر 2000 میں میری وزارت کے ذریعہ کرناٹک اور کیرالہ ہائی کورٹوں کے سابق چیف جج -جسٹس وی ایس منی متھ کی صدارت میں کرمنل جوڈیشل نظام میں اصلاح کے لئے تشکیل دی گئی کمیٹی نے مارچ 2003 میں اپنی خصوصی رپورٹ پیش کردی۔

"کسی (کرمنل) معاملہ کی کامیابی یا ناکامیابی اس سے جڑے جرائم کی تفتیش کرنے والے پولس افسران پر ہی منحصر کرتی ہے۔لیکن بدقسمتی کی بات ہے کہ ہمارے نظام کا پولس پر اعتماد نہیں ہے۔عدالت پولس کو شبہ کی نظر سے دیکھتی ہے اور اس پر اعتماد نہیں کرتی۔مجرم یا ملزم کے ذریعہ پولس افسر کے سامنے اپنے قبول کئے گئے جرم کو مقدمے کے دوران عدالتی عمل کی بنیاد نہیں بنایا جاتا۔تفتیشی افسر جو اہم معلومات جمع کرتا ہے،انہیں سماعت کے دوران سامنے نہیں لایا جاتا۔مجرم-جسکے حقوق کی خلاف ورزی ہوتی ہے-کو ایک گواہ کے طور پر ہی سامنے آنے کا حق دیا گیا ہے۔گواہ عدالت میں آتے ہیں حلف اٹھاتے ہیں اور کئی بار جھوٹے بیان یا ثبوت دیکر چلے جاتے ہیں۔گواہوں کا بدل جانا ایک عام بات ہوگئی ہے۔گواہوں کی سیکورٹی کے لئے کوئی الگ سے قانون نہیں ہے۔انہیں کافی مشکل حالات سے گذرنا پڑتا ہے۔معاملے پر سماعت بار بار ٹالی جاتی رہتی ہے،جس سے گواہوں کو بار بار عدالت آنے کے لئے مجبور ہونا پڑتا ہے۔ اس طرح کئی بار مجرم (ملزم) ہیں انہیں راستہ سے ہٹا دیتے ہیں'۔

ان کے علاوہ ایک اور مسئلہ بھی تھا جو کسی پلاننگ یا سرکاری ادارہ میں نہیں بلکہ ہمارے ملک کی اجتماعی سوچ یا روایت میں تھی۔صدیوں سے غیر ملکی حملے اور غلامی جھیل چکے ہندوستانیوں کے دل و دماغ میں جڑیں جمع چکی تھیں۔ذات پات،مذہبی اور لسانی تقسیم نے ملک کی ایکتا کو متاثر کیا تھا۔صدیوں سے غیر ملکی قبضہ کی وجہ سے ہندوستانیوں نے اپنے ثقافتی اور روایتی زوال کو روکنے کی صلاحیت یا عزم کو کھودیا تھا۔جنگ آزادی کے دوران ملک میں جو قومی اتحاد دیکھنے کو ملا تھا وہ بعد کے عشروں تک قائم نہیں رہ سکا۔

ووٹ بنک کی سیاست اور حکومت کی منفی پالیسی کی وجہ سے ہندوستانی سماج میں ذات پات،مذہب،زبان کا مسئلہ پیدا ہوا اور جس کی وجہ سے آپسی دشمنی اور نفرت کے جذبات پیدا ہوگئے تھے۔اقتدار کی سیاست،سماج اور ملک کو اتحاد کے دھاگے میں باندھنے کے بجائے اسے تقسیم کرنے کا کام کرر ہا تھا۔جرائم اور سیاست کے درمیان کی کڑی بہت وسیع اور مضبوط ہوگئی تھی۔حکومت کے ہر شعبہ میں بدعنوانی کی جڑیں پھیل چکی تھیں۔اس وجہ سے اچھی پالیسیوں اور پروگراموں کا فائدہ عوام الناس تک نہیں پہنچ رہا تھا۔خراب اور نااہل انتظامیہ عوام میں- خاص طور سے قبائلی پسماندہ علاقوں میں-عوامی ناراضگی و ناطمینانی کی وجہ بنا ہوا تھا جس کا فائدہ ملک مخالف عناصر کے ذریعہ ملک میں تشدد پھیلانے اور ملک کو کمزور بنانے کے لئے اٹھایا جارہا تھا۔

ان ہی حالات میں 19 مارچ 1998 کو جب میں نے نارتھ بلاک کی پہلی منزل کے دور کونے والے کمرے میں اپنا کام سنبھالا تو یہ سوچ کر میرا دل بے چین ہوگیا تھا کہ جن حالات،عادات اور انتظامات کے درمیان ہندوستان نئی صدی میں داخل ہونے جارہا ہے،وہی اسے ایک مستحکم،محفوظ،اور ترقی یافتہ ملک بنانے سے روک رہے ہیں۔ایسے حالات میں ایک بار پھر ہمیں اپنی مشترکہ تہذیب وثقافت پر قائم ذات برادری اور مذہبی،لسانی قومی ایکتا کو بیدار کرنے کی ضرورت تھی۔ہندوستان کی قومی سلامتی،خاص طور سے اندرونی سلامتی،کے انتظام میں بہتر انتظامی اصولوں کو اپنانے کی ضرورت بھی تھی۔

مجھے میرے روم میں دو چیزوں نے مجھے کافی متوجہ کیا۔پہلی چیز تھی-ہندوستان کا ایک بڑا نقشہ۔یہ نقشہ مجھے اپنی ذمہ داریوں کو یاد دلاتا تھا۔تقریباً 7,500 کلومیٹر کی ساحلی پٹی اور اس سے دوگنی طویل زمینی سرحدوں والا برصغیر کی شکل کا زمینی حصہ،تقریباً ایک ارب آبادی،سب سے زیادہ آبادی والا دنیا کا دوسرا اور ساتواں سب سے بڑا ملک۔دنیا کی ایک ابھرتی معاشی طاقت لیکن اندرونی خطروں سے گھرا ہوا۔دوسری چیز تھی-ہندوستان کے پہلے وزیر داخلہ سردار ولبھ بھائی پٹیل کی تصویر جو میرے آئیڈیل رہے ہیں۔دوراندیش،فولادی عزم وارادہ اور بے پناہ حوصلہ والے مرد

آہن۔ میں ایسی عظیم شخصیت کے ذریعہ لئے گئے عہدہ کے لئے خود کو اس کا اہل بنانا چاہتا تھا۔

قومی سیکورٹی اسٹرکچر کا بڑے پیمانہ پر جائزہ اور اصلاح

مذکورہ حالیہ سیکوٹی تجاویز کی خامیوں نے ہی بی جے پی کو اپنے انتخابی منشور میں نیشنل سیکورٹی کونسل (این ایس سی) کے قیام کے لئے تحریک دی تھی۔ لیکن کونسل کو منظم شکل میں تشکیل دینے سے قبل ہی ہندوستان کو کارگل لڑائی میں کودنا پڑا، جس نے حکومت کو سلامتی سے متعلق ایشوز پر بڑے پیمانہ پر جائزہ لینے کے لئے مجبور کردیا۔ حالانکہ ہندوستان نے پاکستان پر غیر معمولی فتح حاصل کی لیکن اس واقعہ نے ہمارے قومی سیکورٹی نظام کو متعدد تلخ حقائق سے روشناس کرایا۔ یہاں میں اس بات پر زور دینا چاہوں گا کہ وہ نظام اور طریقہ بی جے پی نے نہیں بنایا تھا اسے وہ وراثت میں ملا تھا۔ ویسے بھی ہماری حکومت بننے کے 13 مہینے بعد ہی کارگل لڑائی شروع ہوگئی تھی اور وہ بھی تب، جب کانگریس کے ذریعہ ہماری حکومت کو کمزور کرنے کے لئے مسلسل سازشیں ہورہی تھیں۔ کارگل کے بعد سیکورٹی کے شعبہ سے جڑے افراد کے ذریعہ اس بارے میں کی گئی صحیح تنقید کو حکومت نے کھلے دل سے قبول کیا۔

جیسا کہ میں نے کسی باب میں ذکر کیا ہے کہ سبرامنیم کی صدارت میں قائم کارگل جائزہ کمیٹی نے کہا کہ 'قومی سیکورٹی کے نظام کا جلد سے جلد وسیع پیمانے پر جائزہ لیا جانا چاہئے۔ اس کے بعد آزادی کے بعد پہلی بار واجپئی حکومت نے میری صدارت میں داخلی اور خارجی سیکورٹی کو مستحکم بنانے اور صلاح مشورہ کے لئے ایک وزارتی کمیٹی (GoM-گروپ آف منسٹرز) تشکیل دی۔ وزیر دفاع جارج فرنانڈیز، وزیر خارجہ جسونت سنگھ اور وزیر خزانہ یشونت سنہا اس کمیٹی کے دوسری رکن تھے۔ نیشنل سیکورٹی ایڈوائزر اور وزیر اعظم کے پرنسپل سکریٹری برجیش مشرا اس کمیٹی کی میٹنگوں میں خاص طور سے مدعو کئے جاتے تھے۔

گروپ آف منسٹرز کی پہلی میٹنگ میں ہی میں نے محسوس کیا کہ 'ملک کی سلامتی غیر منقسم ہے اور یہ وزارت یا محکموں کے دائروں میں رہ کر نہیں کیا جا سکتی۔ ملک کی سلامتی کا روایتی ڈھانچہ اور عناصر انتہائی دباؤ میں ہیں۔ ہمیں اکیسویں صدی میں خفیہ نظام، سرحد و سیکورٹی انتظام اور داخلہ سلامتی کے شعبوں میں سامنے آنے والے چیلنجوں سے نمٹنے کے لئے ایک بہترین اور کم خرچ والے قومی سیکورٹی کے نظام کو توسیع دینے کی ضرورت ہے'۔

اس کام کو تیزی دینے کے لئے گروپ آف منسٹرس نے چار ورکنگ فورس تشکیل دیں، جن کی قیادت کی ذمہ داری مشہور ماہرین کررہے تھے، جو خاص طور سے سرکاری عہدوں پر کام نہیں کررہے تھے۔ خفیہ نظام پر بنائی گئی ورکنگ فورس کی قیادت ریسرچ اینڈ انالیسس ونگ (RWA) کے سابق سربراہ اور جموں وکشمیر کے گورنر گریش چندر سکسینہ کررہے تھے۔ وزارت داخلہ اور دفاع کے سابق چیف سکریٹری این این وو ہرا، داخلی ورکنگ فورس کی قیادت کررہے تھے۔ سرحدی انتظام پر تشکیل دی گئی ورکنگ فورس کی صدارت وزارت داخلہ کے سابق سکریٹری ڈاکٹر مادھو گوڈبولے کررہے تھے۔ راجیو گاندھی وزارت میں دفاع کے وزیر مملکت ارون سنگھ سیکورٹی انتظامات پر تشکیل دی گئی ورکنگ فورس کی قیادت کررہے تھے۔ باصلاحیت افسر اور قومی سلامتی کونسل سکریٹریٹ کے سکریٹری ستیش چندر کو اس گروپ آف منسٹرس کا سکریٹری بنایا گیا تھا۔ چاروں ورکنگ فورس کے ذریعہ باریک بینی سے تحقیق کرکے، مثبت تنقید کے ساتھ سونپی گئی رپورٹیں ہندوستان کے سیکورٹی نظام کے مطالعہ میں میل کا پتھر ثابت ہوا تھا۔

میں انتہائی انکساری کے ساتھ کہنا چاہوں گا کہ چاروں ورکنگ فورس کی رپورٹوں پر گروپ آف منسٹرس کے تجزیوں اور ریسرچ نے ہندوستان کے قومی سیکورٹی نظام کی اصلاح کے لئے سب سے بڑی 'بلیو پرنٹ' تیار کی گئی۔ گروپ کی فکر وتشویش کے تئیں میرا نظریہ تھا کہ ہندوستان کو مضبوط اور محفوظ رکھنے کے لئے فوجی طاقت کے علاوہ ٹیکنالوجی، انفرااسٹرکچر، انسانی اور مالی وسائل، صنعت ثقافت وغیرہ سبھی عناصر کو بھی مضبوط کرنا ہوگا۔ توانائی، آبی وسائل، ماحولیات اور انفارمیشن جیسے سیکٹروں میں بھی قومی سلامتی کو دھیان میں رکھنا ہوگا۔ قومی سلامتی اور قومی ترقی دونوں ایک دوسرے پر منحصر ہیں۔ اسلئے سبھی قومی پالیسیاں اس شکل میں وضع کی جانی چاہئیں کہ سلامتی اور ترقی کی پالیسیاں ایک دوسرے کے متوازی ہوں۔

میں نے پایا کہ اس سلسلے میں عزم وارادے کی کافی اہمیت ہے جس کے فقدان میں دیگر عناصر کی طاقت بھی بہتر نتیجے نہیں دے پائیں گے۔ ہندوستان کے سوکروڑ لوگوں کے اس عظیم عزم وحوصلے کو یکجا کر کے ملک کی سالمیت کو کمزور اور غیر مستحکم کرنے کی کوششوں کو ناکام کر دینا ہوگا۔ ہندوستان کو ایک نرم ملک، بدعنوان اور منقسم سماج اور اس میں بیرونی وداخلی دشمنوں کے ذریعہ اتھل پتھل مچا پانے کے بارے میں پھیلی غلط فہمی کو دور کرنا ہوگا۔ اس کے لئے پوری طاقت اور وسائل کے ساتھ لگنا ہوگا۔ خاص طور سے دہشت گردی، تشدد آمیز بغاوت اور غیر ملکی بھاڑے کے ٹٹوؤں کی سرگرمیوں کو بھی کچلنا ہوگا۔

11 مئی 2001 کو حکومت نے گروپ آف منسٹرس کے ذریعہ پیش کی گئی 340 سفارشوں کو بھی قبول کر لیا تھا۔ مئی 2004 میں اقتدار سے ہٹنے سے قبل ہماری حکومت نے ان میں سے دوتہائی سے بھی زیادہ سفارشوں کو نافذ کرنے کے عمل کو شروع کر دیا تھا۔

- دفاع کے شعبہ میں کمیٹی کی سب اہم سفارش تھی کہ جوائنٹ دفاعی سربراہ (سی ڈی ایس) کا عہدہ تشکیل دینا، جو فوج کے تینوں حصوں کے سربراہوں کی کمیٹی کے مستقل چیئرمین ہوں گے۔ کمیٹی کو مندرجہ ذیل وجوہات سے یہ ضروری محسوس ہوا۔
  1- حکومت کو ایک شخص کے ذریعہ صلاح دینا
  2- فوجی پالیسیوں کا انتظام اور انڈومان ونکوبار جزائر میں تینوں حصوں کی کمان کا جائزہ لینا
  3- سیکورٹی فورسز کی اہلیت کو نکھارنے اور منصوبہ سازی میں اشتراک
  4- سیکورٹی فورسز میں اشتراک بڑھانا۔ انتہائی افسوسناک ہے کہ حکومت کی جوائنٹ ڈیفنس سربراہ کے بارے میں دیئے گئے کچھ مشورے اور سفارشیں حزب اختلاف کے تعاون نہ کرنے کی وجہ سے اسے رد کرنے پڑے۔ جوائنٹ ڈیفنس سربراہ کی نامزدگی نہ ہونے کی حالت میں ان کا رول چیف آف اسٹاف کمیٹی کے چیئرمین کو ادا کرنا ہوگا۔
- ڈیفنس خدمات میں ضروری آلات کی آسان اور فوری دستیابی کے لئے ایک طویل المیعاد پلاننگ کے تحت کئی نئے ادارے قائم کئے گئے، جن میں اہم تھے-وزیر دفاع کے زیر ماتحت ڈیفنس ایگزیکیوشن کاؤنسل اور ڈیفنس ٹیکنالوجی کاؤنسل۔ ان کا تعاون ڈیفنس پروکیورمنٹ بورڈ، ڈیفنس پروڈکشن بورڈ اور ڈیفنس ریسرچ اینڈ ڈیولپمنٹ بورڈ کرتے ہیں۔ ان کوششوں سے سیکورٹی فورسز کے لئے انتہائی جدید ہتھیار اور آلات وغیرہ حاصل کرنے میں ہونے والی غیر ضروری تاخیر، جس سے لاگت میں کافی اضافہ ہو جاتا ہے، ہلکی ہتھیار کے بنانے کا فروغ دینے کی کوشش کو پیش رفت ملی۔
- مختلف خفیہ ایجنسیوں کے درمیان بہتر تال میل قائم کرنے کے لئے نیشنل سیکورٹی صلاح کار کے زیر تحت ایک اعلیٰ ادارہ انٹیلی جنس کو

آرڈینیشن گروپ تشکیل دی گئی۔

- مکمل داخلی قومی سلامتی کی ذمہ داری انٹلی جنس بیورو کو سونپ دی گئی۔اس کے ڈائرکٹر کو بڑے پیمانہ پر اختیار تفویض کئے گئے۔انٹلی جنس بیورو کے زیر اہتمام ایک ملٹی ایجنسی سینٹ کی تشکیل کی جس میں سیکورٹی فورسز، نیم فوجی دستوں، وزارت خزانہ کی انفورسمنٹ ایجنسیوں اور مرکزی خفیہ ایجنسیوں کے نمائندے شامل تھے۔اس ملٹی ایجنسی سینٹر کا ہدف مختلف ذرائع سے کھلی اور خفیہ اطلاعات جمع کرنا اور دہشت گردی، توڑ پھوڑ، جاسوسی وغیرہ کے واقعات پر فوری کرنا تھا۔ہندوستانی آئین میں پولس کے اختیارات ریاستوں کے پاس ہیں۔قومی سطح پر سلامتی کے خطروں سے نمٹنے کے لئے ریاستی حکومتوں کی شراکت ضروری ہے۔اسلئے مرکز اور ریاستی سرکاروں کی سیکورٹی ایجنسیوں کو مشترکہ طور پر کام کرنے کے لئے ریاستوں کے نمائندوں کولیکر انٹلی جنس بیورو کے تحت جوائنٹ ٹاسک فورس آن انٹلی جنس بنایا گیا۔
- قومی سلامتی پر بڑھتے عالمی معاشی اور مالی اثرات کو دیکھتے ہوئے اکنومکس انٹلی جنس کاؤنسل اور سینٹرل اکنامکس انٹلی جنس بیورو کے مزید اختیارات سونپے گئے۔
- ہندوستان کی سرحدوں کی سیکورٹی کے انتظامات کولیکر ایک بڑی کوشش 'ایک سرحد ایک فورس' کا تصور پیش کیا گیا۔اس سے قبل ہماری سبھی سرحدوں کی سیکورٹی دوسرے نیم فوجی دستون کے ذریعہ مشترکہ طور سے کی جاتی تھی۔نتیجتاً کسی کو بھی ایک خاص سیکٹر میں مہارت حاصل ہو پاتی تھی اور نہ ہی کسی مسئلہ کے اٹھ کھڑے ہونے پر کسی کو ذمہ دار ٹھہرایا جاسکتا تھا۔اس لئے آسام رائفلز کو وزارت دفاع سے وزارت داخلہ میں منتقل کر کے اسے ہن-میانمار سرحد کی چوکسی کی ذمہ داری سونپی گئی۔1962 میں چینی حملہ کے وقت تشکیل دی گئی اسپیشل سروس بیورو کو 2001 میں وزارت داخلہ میں منتقل کر کے اسے ہند-نیپال سرحد کی حفاظت کی ذمہ داری سونپی گئی (مارچ 2004 میں اس کا نام بدکر آرمڈ بارڈر سیکورٹی فورس کردیا گیا)۔بنگلہ دیش سرحد کی پوری ذمہ داری تبت سرحدی پولس پر تھی۔
- اسی طرح ملک کے سبھی 45 ہوائی اڈوں کی سیکورٹی کی ذمہ داری سینٹرل انڈسٹریل فورس کو سونپ دی گئی۔بیورو کی بنیادی تبدیلی کر کے بین الاقوامی چیک پوسٹوں پر ناجائز دراندازی کے کنٹرول کا پورا کام اسے سونپ دیا گیا۔آزادی کے بعد پہلی بار ویزا ختم ہونے کے بعد بھی ملک میں رہنے والے پاکستانیوں کی فہرست تیار کر کے انہیں ان کے ملک واپس بھیجنے کا کام کیا گیا۔
- ساحلوں کی بہتر سیکورٹی اور ہندوستانی بحریہ و ساحلی ریاستوں کی حکومتوں کے ساتھ زیادہ تعاون کے لئے ساحلی فورسز کو مضبوط کر کے انہیں نئے بحری بیڑے اور دوسرے ساز و سامان مہیا کرائے گئے۔گجرات اور مغربی بنگال میں بارڈر سیکورٹی فورسز کے محکمہ آبی کو مضبوط کیا گیا۔ہند-پاک سرحد کے لئے معاشی اور دیگر فوجی نظریئے سے انتہائی اہم گجرات کے سر کریک علاقہ میں اسے خصوصی ذمہ داری سونپی گئی۔

خفیہ بیورو کے رول میں تبدیلی اور توسیع خاص طور سے قابل ذکر ہے۔اس اعلیٰ خفیہ سروس کی تاریخ میں پہلی بار اسے اس کے کاموں اور ذمہ داریوں کا ایک رسمی اعلامیہ جاری کیا گیا۔ماضی کی کانگریس حکومتوں نے اس کا غلط استعمال اپنے سیاسی حریفوں پر نظر رکھنے کے لئے ہی کیا تھا۔نئے اعلامیہ سے خفیہ بیورو ان کاموں سے آزاد ہوگیا اور اس کا کام داخلی سلامتی سے جڑی معلومات جمع کرنے اور ان کا تجزیہ کرنے تک ہی

محدود رہ گیا۔ اس طرح وہ دہشت گردی کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک اعلیٰ ادارہ بن گیا۔ اسے ہندوستان کا پہلا پولس کمپیوٹر نیٹ ورک اور دہشت گردی سے متعلق ڈاٹا بیس تیار کرنے کا کام سونپا گیا۔

خفیہ ایجنسی کے رول میں اس تبدیلی سے اسے اپنی توجہ دہشت گردی اور دوسرے چھپے ہوئے خطروں کا مقابلہ کرنے کی جانب موقع ملا۔ اب معلومات جمع کرنے میں اس کی ذمہ داری اور صوابدید مزید بڑھ گئی تھی۔ 'سلیپنگ سیلز' کے طور پر 'چھپے ہوئے دشمن' - جو کئی برسوں تک خاموش رہنے کے بعد اچانک سرگرم ہو جاتا ہے اور اچانک حملہ کرتا ہے - کا پتہ لگانے کے لئے یہ نہایت ہی ضروری ہے۔ آئی ایس آئی کے ذریعہ پھیلائی گئی دہشت گری کا ماڈل ہندوستان میں اسی طرح کام کرتا ہے۔

اس وقت میں سچ مچ حیران رہ گیا تھا جب مجھے معلوم ہوا کہ آئی ایس آئی نے کتنی آسانی سے ہندوستان کے مختلف حصوں میں اپنے 'سلیپنگ سیلز' بنا رکھے ہیں۔ 'آپریشن مین' کے نام سے مشہور خفیہ بیورو کے سینئر افسر اجیت ڈووال ایک دن میرے پاس آئے اور کہنے لگے 'سر! ہم نے اڑیسہ کے بالاسور ضلع میں ایک آئی ایس آئی ٹھکانے کا پتہ لگالیا ہے'۔ اس سلسلے میں انہوں نے مجھے جو کچھ بتایا وہ بھیانک تھا۔ یہ تنظیم ہندوستان میں میزائل ٹسٹ کے مقام چاندی پور میں سرگرم تھی۔ اس کا مقامی سربراہ چائے کی دکان چلانے والا ایک بنگلہ دیشی تھا۔ جو برسوں سے ہمارے میزائل پراگراموں کے بارے میں خفیہ معلومات اکٹھی کر کے انہیں کلکتہ پہنچاتا تھا اور کلکتہ سے یہ تفصیلات بنگلہ دیش ہو کر اپنے مقام پاکستان پہنچائی جاتی تھی۔ چائے والا بنگلہ دیشی، ایک ناجائز دراندازکنبہ کا رکن تھا اور دس سال کی عمر میں ہی دہلی میں آئی ایس آئی کے ساتھ جڑ گیا تھا۔ تقریباً 10 سال کے لئے اسے تعلیم حاصل کرنے کے لئے پاکستان کے ایک مدرسہ میں داخل کرادیا گیا تھا۔ ٹریننگ کے بعد اسے اس حکم کے ساتھ بنگلہ دیش بھیجا گیا کہ وہ بنگلہ سرحد سے ہندوستان میں داخل ہو اور کلکتہ میں آئی ایس آئی کے سیل سے رابطہ قائم کر کے خود کو بنگلہ دیشی ہندو کے طور پر شناخت کراتے ہوئے میزائل ٹسٹ رینج کے قریب چائے کی دکان کھول کر بیٹھ جائے۔

ایک اور معاملہ اتر پردیش کے مظفر نگر ضلع کے مدرسہ کے ایک نابینا ٹیچر کا تھا، جو بعد میں جموں وکشمیر کے کپواڑہ ضلع میں ایک مدرسہ میں کام کرنے لگا تھا۔ 1997 میں وہ آسام کی سرحد سے بنگلہ دیش میں داخل ہوا تھا۔ وہاں سے حزب المجاہدین کے ایک رضا کار کے ساتھ وہ پاکستان گیا۔ پاکستان سے واپس لوٹنے کے بعد اس نے بڑی تعداد میں اتر پردیش، جموں وکشمیر اور آسام کے سرحدی اضلاع کے مقامی مسلم نوجوانوں کو بھرتی کر کے حزاب المجاہدین کے سیل بنانے شروع کردیئے، جنہیں پاکستان میں اسلحہ وگولہ بارود چلانے کی ٹریننگ دی جاتی تھی۔ چونکہ وہ نابینا تھا اسلئے مقامی پولس کو اس پر کوئی شک نہیں ہوتا تھا۔ لیکن یہ خفیہ بیورو اور دوسری خفیہ ایجنسیوں کی مشترکہ کوششوں کا ہی نتیجہ تھا کہ 1999 میں اسے وقت اسے پکڑ لیا گیا جب وہ بنگلہ دیش کے ایک ایجنٹ کے ذریعہ سے بڑی مقدار میں آرڈی ایکس دھماکہ خیز مادہ اور ٹائم بم وغیرہ آسام بھیجنے کی کوشش کر رہا تھا۔

بعد میں بھی مجھے ہندوستان میں آئی ایس آئی کی گہری جڑوں کے بارے میں کئی باتیں سننے کو ملیں۔ حیدرآباد کا ایک معصوم اور پولٹری فارمنگ کرنے والا نوجوان جو آئی ایس آئی کا ایجنٹ پایا گیا۔ آگرہ میں چمڑے کی مصنوعات کا ایک تاجر بڑے پیمانہ پر ملک مخالف سرگرمیوں میں ملوث پایا گیا۔ جب مجھے پتہ چلا کہ اس کے وجہ سے ہی آئی ایس آئی کو مسلسل بم دھماکہ کرنے، مقامی لوگوں میں ہندوستان مخالف جذبات ابھارنے، پاکستان میں واقع ٹریننگ کیمپوں کے لئے نوجوانوں کی بھرتی کرنے اور ہندوستان میں خطرناک اسلحوں کی اسمگلنگ کرنے - سب کچھ ایسے مقامی تعاون - میں کامیاب ہو رہا ہے تو مجھے بہت غصہ آیا۔ میں ڈووال سے کہا' میں ان ہندوستان مخالف اور ٹھکانوں کو ختم کرنا خفیہ بیورو

کی ترجیحات میں شامل کرنا چاہتا ہوں۔اس کے لئے جس تعاون اور وسائل کی ضرورت پڑے گی،وہ دستیاب کرائے جائیں گے'میرے لئے یہ اطمینان کی بات ہے کہ ہماری حکومت کے چھ سال (2004-1998) کی مدت کے دوران آئی ایس آئی سے متعلق تقریباً 272 ٹھکانے ختم کردیئے گئے جس میں جاسوسی کرنے والے 79 اور توڑ پھوڑ اور دھماکہ کرنے والی سرگرمیوں میں ملوث مراکز تھے۔1994 سے 1998 کے دوران ایسے صرف 28 ٹھکانے ختم کئے گئے تھے۔بدقسمتی سے 2004 میں یو پی اے حکومت کے اقتدار میں آنے کے بعد یہ اوسط ایک بار پھر اپنے ماضی کی سطح پر آ گیا۔اس معاملہ میں میرا مشاہدہ کہتا ہے کہ سیاسی قیادت کے لئے ضروری ہے کہ وہ دہشت گردی کی تنظیموں کا پتہ لگانے اور ان کی مدد کرنے والوں پر نظر رکھنے میں خفیہ بیورو کے کام میں مداخلت نہ کرے۔سیاسی قیادت کی جانب سے خفیہ بیورو کو جو غلط احکامات ملتے ہیں ان کی ہمارے ملک نے زبردست قیمت ادا کی ہے۔اور ابھی بھی ادا کر رہا ہے۔

پولس اصلاح اور ماڈرنائزیشن

گروپ آف منسٹر کی سفارشوں کی بنیاد پر این ڈی اے حکومت نے ہندوستان کی پولس فورس کے ماڈرنائزیشن کا ایک اہم فیصلہ لیا تھا۔ہمارے ملک میں نظم ونسق کو نافذ کرنے کے لئے ذمہ دار بیشتر پولس اہلکار ایسے حالات میں کام کرتے ہیں،اور کرتے رہتے ہیں جو ان جیسے پروفیشنلوں کے شایان شان نہیں ہیں۔چونکہ پولس ریاستی حکومت کے اختیارات اور صوابدید کے شعبہ میں آنے والی تنظیم ہے،اسلئے ماضی کی مرکزی حکومتوں نے اس کے اہلکاروں کے معیار زندگی بہتر کرنے کی ذمہ داری کبھی نہیں سمجھی۔وسائل کی کمی کی وجہ سے بیشتر ریاستی حکومتوں کو اپنے پولس فورس کو نظرانداز کرنا پڑا ہے۔آزادی کے بعد پہلی بار این ڈی اے حکومت نے پولس فورس کے ماڈرنائزیشن کے لئے دس برسوں میں خرچ ہونے والی 10 ہزار کروڑ روپے کی رقم سے ایک کثیر المقاصد اسکیم کی شروعات کی۔یہ رقم مرکزی حکومت کے ذریعہ ریاستی حکومتوں کو بہتر ٹریننگ،اسلحہ،ساز وسامان اور انفارمیشن نظام میں اصلاح کے لئے خرچ ہونی تھی۔اس کے علاوہ سینٹرل پولس تنظیموں کے ماڈرنائزیشن کے لئے چار ہزار کروڑ روپے سے زائد رقم کی اسکیم کو بھی منظوری دی گئی۔اس کے لئے ہم نے ماڈرنائزیشن پروگرام میں الگ سے رقم مختص کی تھی۔

ہندوستان میں پچاس فیصد سے بھی کم پولس اہلکاروں کو ہی محکمہ کی جانب سے رہائش ملی ہے۔دہلی،ممبئی،اور کلکتہ جیسے بڑے شہروں میں بھی کئی پولس اہلکاروں کو سلم بستیوں میں رہنا پڑتا ہے،جس سے ان کے حوصلہ پر منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں ریاستی پولس کے سربراہوں سے بات چیت کے دوران میں نے کہا کہ ہماری کوشش ہونی چاہئے کہ کوئی بھی ہندوستانی پولس اہلکار محکمہ کی جانب سے اچھی رہائش گاہ سے محروم نہ رہے۔اس کے لئے ہم نے ماڈرنائزیشن پروگرام میں الگ سے رقم مختص کی تھی۔

میں مانتا ہوں کہ اتنی کوششوں کے باوجود پولس اصلاح کے شعبہ میں مجھے ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا۔اہم شخصیت (وی آئی پی) کی سیکورٹی۔میری رائے میں اس کام میں پولس فورسز کے وسائل ایک بڑا حصہ لگا ہوا ہے۔میں نے سبھی وی آئی پی شخصیات کی ضرورت اور سیکورٹی التزامات کا جائزہ لینے کا حکم دیا،جس میں حیرت میں ڈالنے والے حقائق کا پتہ چلا کہ صرف پچیس فیصد افراد کو ہی سیکورٹی کی ضرورت تھی۔باقی کے لئے بندوق بردار پولس اہلکاروں کی سیکورٹی میں چلنا شان سمجھنے کے مترادف تھا۔میں نے کئی وی آئی پی شخصیات کی سیکورٹی میں تخفیف کرنے یا اسے بالکل ختم کرنے کی کوشش کی لیکن اس پر خوب واویلا کیا گیا۔کتنا تضاد ہے کہ اعلیٰ عہدوں پر فائز جن لوگوں نے پہلے عوامی زندگی میں وی آئی سیکورٹی پر احتجاج کیا تھا انہوں نے ہی سب سے پہلے یہ درخواست کی کہ ان کی سیکورٹی میں تخفیف نہ کی جائے اور اسے پہلے

کی طرح ہی قائم رکھا جائے۔

اس سلسلے میں، میں سی بی آئی کے سابق خصوصی ڈائرکٹر آر کے راگھون کی ایک تحریر کے ایک حصہ کا حوالہ دینا چاہتا ہوں۔-'تعداد میں تخفیف کے لئے لال کرشن آڈوانی نے جو حوصلہ مندانہ کوششیں کیں، وہ مجھے یاد ہیں۔اس پر احتجاج کی جو آوازیں اٹھیں وہ بھدی اور غیر اخلاقی تھیں۔جب تک برسراقتدار طبقہ کے طریق کار میں تبدیلی نہیں آتی تب تک میں سمجھتا ہوں کہ ہم وی آئی پی کی سیکورٹی کا دعویٰ کرنے والوں کی تعداد کو کنٹرول نہیں کر سکتے ......۔ایک وزیر یا پھر اس کا پرسنل اسٹاف یہ دیکھتا ہے کہ اس کے جلسہ یا ریلی میں مقامی پولس سب انسپکٹر موجود ہے یا نہیں۔اگر کسی وجہ سے وہ موجود نہیں ہے تو پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے۔رتبہ اور نمائش کی اس فضا میں پولس فورسز کو بچنا بہت مشکل کام ہے'۔

بلاشبہ اسلحہ وساز وسامان اور دیگر ضروری اشیا کی ماڈرنائزیشن پولس اصلاح کا محض ایک حصہ ہے۔عام شہری کی نظر سے دیکھا جائے تو پولس کانسٹبل اور افسران کی ذہنیت کا ماڈرنائزیشن کم اہم نہیں ہے۔اس معاملہ میں میں مانتا ہوں کہ کوئی اطمینان بخش پیش رفت نہیں ہوئی ہے۔ہندوستان کے وزیر داخلہ کے طور پر مجھے سب سے زیادہ فکر اس بات سے ہوئی کہ پولس فورسز کی شبیہ عام آدمی کے 'دوست' کی نہیں بن پائی ہے۔ایک عام شہری کبھی کسی پولس اسٹیشن میں نہیں جانا چاہے گا۔اس میں کتنا تضاد ہے کہ غریب اور مظلوم کو سب سے زیادہ سیکورٹی کی ضرورت ہوتی ہے لیکن ان کا اعتماد پولس پر سب سے کم ہوتا ہے۔پولس کا خوف، اس کے کرپٹ وظالم ہونے اور امیر وغریب کے لئے الگ الگ قانون عائد کرنے کے الزام لگتے رہے ہیں۔حقیقت میں یہ سچ نہیں ہے اور یہ ایک محض روایت ہے۔دولت کا لالچ یا اقتدار کے دباؤ میں نہ آکر ضرورتمندوں کی مدد کرنے والے ایماندار، فرض شناس اور نڈر پولس اہلکار ہمیشہ رہے ہیں۔بدقسمتی سے وہ ہندوستان کی پولس کی منفی شبیہ کو بدل نہیں پائے ہیں۔

ریاستی پولس تنظیموں کے سربراہوں کے ساتھ بات چیت اور اپنی تقریروں میں میں اس موضوع پر لگاتار بحث کیا کرتا تھا۔وزارت داخلہ میں اپنے تجربات سے میں نے نتیجہ نکالا کہ تین عناصر کی مشترکہ کوششوں سے ہی حالات کو بہتر کیا جاسکتا ہے-پولس قیادت، سیاسی قیادت اور میڈیا۔سب سے پہلے ضروری ہے کہ ہندوستانی پولس سروس کی اعلیٰ قیادت سبھی سطحوں پر پولس افسران اور ملازمین کی سوچ اور رویہ تبدیل کرنے میں اپنا سرگرم رول ادا کریں۔پولس فورس کی سوچ وذہنیت میں تبدیلی لانے کے لئے رقم کی ضرورت ہے، اور نہ ہی سرکاری پالیسی کی۔دوسری بات، سیاسی لیڈروں کو چاہئے کہ پولس فورس کے کاموں میں مداخلت نہ کریں اور ذاتی مقاصد کے لئے اس کا غلط استعمال نہ کریں۔ایک پولس اہلکار یا افسر جب یہ جان لے گا کہ اسے اپنے اعلیٰ افسران کو خوش کرنے کے بجائے بس اپنا فرض ادا کرنا ہے تو عام شہری کے تئیں اس کا رویہ خود بخود تبدیل ہونے لگے گا۔ساتھ ہی جب بھرتی اور پرموشن میں دھاندلی نہیں ہوگی تو پولس اہلکاروں میں خود بخود فرض ادا کرنے کی خوبی آئے گی۔سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جب پولس اہلکاروں وافسران کو محسوس ہوگا کہ وہ مجرموں کو پکڑنے اور انہیں سزا دلانے کے لئے آزادانہ کام کرسکتے ہیں، اور ان مجرموں کو سیاسی پناہ نہیں ملے گی تو ان کے کام کرنے کا طریقہ خود بخود بدل جائے گا۔

تبدیلی کا تیسرا عنصر ہے-میڈیا، جسے پولس کے بارے میں ہروقت منفی باتیں سامنے لانے سے باز آنا چاہئے۔ہمارے پولس اہلکاروں، جس میں اب بڑی تعداد میں عورتیں بھی ہیں، کو مختلف حالات میں کام کرنے کے لئے احترام دیا جانا چاہئے۔میڈیا اور سماجی تنظیموں کے ذریعہ اچھے اور ایماندار پولس اہلکاروں وافسران کو سامنے لایا جانا چاہئے اور قانون کا غلط استعمال کرنے والوں کی مذمت کی جانی چاہئے۔اس سے پولس کی شبیہ اپنی اور عام لوگوں کی نظر میں اچھی بنے گی۔

دہشت گردی اور نکسلی تشدد جیسے بڑے چیلنجوں سے نمٹنے میں مرکزی حکومت کو اہل بنانے کے لئے ایک نیا فیڈرل قانون بنانے کا کام

ادھورا رہنے کا مجھے دکھ ہے۔ یہ اہم سفارش نیشنل سیکورٹی پر تشکیل دی گئی وزرا کی کمیٹی نے کی تھی۔ بعد میں کرمنل جوڈیشل نظام میں اصلاح کے لئے تشکیل دی گئی ملی متھ کمیٹی نے بھی اسے دوہرایا تھا۔ بین الاقوامی کونسل کی سبھی میٹنگوں اور میری صدارت میں داخلی سلامتی پر ہونے والی وزرائے اعلیٰ کی دو کانفرنسوں میں یا ریاستی پولس فورسز کے سربراہوں کی سالانہ میٹنگ میں میری تقاریر میں ایک بات خاص طور سے ہوتی تھی۔ 'داخلی سلامتی کے خطروں سے نمٹنے کے لئے ہمیں خود کو' قانون اور نظام' کی ذہنیت سے آزاد کرنا ہوگا۔ ہمیں مرکز - ریاست اور بین ریاستی تعاون کو فروغ دینا ہوگا۔ اس کے لئے ہم کو آئین میں ضروری ترمیم کر کے، مرکز کو، ریاستوں کے تعاون اور اشتراک سے فیڈرل جرائم سے نمٹنے کے لئے، اہل بنانے کے لئے ایک نیا فیڈرل قانون بنانا چاہئے'۔ میری اس درخواست پر عجیب ردعمل سامنے آیا۔ ذاتی طور سے تقریباً ہر ایک وزیر اعلیٰ میری بات سے متفق تھے، لیکن عوامی طور پر وہ یہی کہتے تھے کہ پولس نظام میں مرکز کا کوئی رول ریاستوں کے آئینی اختیارات کو گھیرنے کے مترادف ہوگا۔ مجھے پوری امید ہے کہ ریاستی حکومتیں اپنے رویہ اور نظریہ تبدیل کریں گی اور اس معاملہ میں سیاسی پارٹیاں عام اتفاق رائے پیدا کریں گی تاکہ ملک کی داخلی سلامتی کو مستحکم کرنے کے لئے مرکز کے پاس ایک کارگر فیڈرل قانون ہو۔

6

سرحد پار سے دہشت گردی
پاکستان کا جہادی چیلنج اور ہمارا جواب

ہر قیمت پر فتح، تمام طرح کی دہشت گردی کے باوجود فتح، فتح کا راستہ خواہ کتنا ہی دشوار گذار اور طویل کیوں نہ ہو، بغیر فتح کے بقا نہیں ہے۔

(ونسٹن چرچل، دوسری جنگ عظیم کے دوران، برطانیہ کے وزیر اعظم)

24 دسمبر 1999، جمعہ کی اس سرد دوپہر کو میں اپنے نارتھ بلاک میں واقع آفس میں تھا۔ جیسا کہ عموماً ہوتا ہے، ملک نہایت ہی جوش و خروش کے ساتھ نئے سال کا منتظر تھا۔ ایک ہفتہ کے اندر نہ صرف نیا سال آنے والا تھا بلکہ ایک نئی صدی اور ایک نئے ملینیم کا بھی۔ آئندہ روز کرسمس تھا اور اس دن وزیراعظم اٹل بہاری واجپئی کی 75 ویں سال گرہ بھی تھی۔

نشیب و فراز سے لبریز سال اپنے اختتام کی جانب گامزن تھا۔ اٹل جی کی لاہور بس یاترا، ایک ووٹ کے فرق سے ہماری حکومت کا گرنا، پاکستان کی اعتماد شکنی کی وجہ سے کارگل میں لڑائی، وسط مدتی انتخابات اور ایک نئی رائے عامہ — یہ تمام عوامل سال کو پُر خطر بنانے کے لیے کافی تھے اور حکومت میں شامل ہم سبھی لوگ کچھ لمحوں کے سکون کے بھی حقدار تھے۔

انڈین ایئر لائنس آئی سی-814 طیارہ کا اغوا

جس خبر نے حقیقت میں ملک کو خوف زدہ کردیا اور رخصت پذیر سال کے نشیب و فراز میں ایک نئی تاریخ رقم کی، جب میں کرسمس سے ایک روز قبل کچھ سرکاری فائلیں دیکھ رہا تھا۔ شام 5:00 بجے سے کچھ پہلے انٹیلیجنس بیورو کے ڈائریکٹر شیامل دتہ نے یہ کہنے کے لیے مجھے فون کیا: 'سر! نیپال سے آرہے انڈین ایئر لائنس کے طیارہ کا اغوا کرلیا گیا ہے۔' میں نے جو کچھ سنا، اس سے میں سکتہ میں رہ گیا۔ 'اس میں کتنے مسافر ہیں؟' میں نے پوچھا۔ '160 سے زائد۔' انھوں نے جواب دیا۔ دہلی آنے والا آئی سی-814، جو کاٹھمنڈو سے پرواز کرچکا تھا، پانچ مسلح دہشت گردوں کے ذریعہ اغوا کرلیا گیا۔ انھوں نے پائلٹ سے طیارہ لاہور لے جانے کے لیے کہا۔ جب لاہور کے ایئرپورٹ کے افسران نے طیارہ

اتارنے کی اجازت نہیں دی تو طیارہ امرتسر میں اتارا گیا، جہاں اغوا کاروں نے ایندھن بھرنے کا مطالبہ کیا۔

وزیر اعظم نے اپنی رہائش گاہ پر ایمرجنسی میٹنگ طلب کی۔ یہ فیصلہ کیا گیا کہ ہماری پہلی ترجیح طیارہ کو امرتسر میں ہی روکے رکھنے اور اس کے ملک کے باہر کسی اور مستقر کے لیے پرواز کو ناکام کرنے کی ہوگی۔ کابینہ سکریٹری پربھات کمار کی صدارت میں تشکیل دی گئی آفات مینجمنٹ گروپ (کرائسس مینجمنٹ گروپ یعنی سی ایم جی) کو فی الفور حرکت میں لاکر پنجاب کے پولس افسران کو یہ پیغام پہنچا دیا گیا۔ سی ایم جی نے ایک فیول باؤزر — جس میں کمانڈو بھی بیٹھے ہوں گے، جو طیارہ کے ٹائروں کو پنکچر کر دیتے — تیار کیا۔ بدقسمتی سے، اس کے طیارہ تک پہنچنے سے کچھ ہی منٹ پہلے اغوا کاروں نے کیپٹن کو طیارہ کے اڑان بھرنے کا حکم دیا۔ طیارہ میں بس اتنا ہی ایندھن تھا جس سے لاہور ہی اس کا مستقر ہو سکتا تھا، جہاں پاکستانی افسران نے نہ صرف طیارہ میں ایندھن بھروایا بلکہ اسے پرواز کرنے سے روکنے کی ہماری درخواست کو ٹھکرا دیا۔ اغوا کار پھر آئی سی-814 کو دبئی کے پاس ایک آرمی ایئر بیس پر لے گئے۔ وہاں انھوں نے مسافروں میں سے ایک روپن کتیال، جنھیں انھوں نے مار ڈالا تھا، کی لاش کو پھینک دیا تھا اور دیگر 28 افراد کو رہا کر دیا، پھر انھوں نے پائلٹ کو حکم دیا کہ 161 یرغمالوں سے بھرے طیارہ کو قندھار * لے چلے، جو اس وقت جنوبی افغانستان طالبان کے زیر نگراں تھا۔

میں نے ساری رات راجیو گاندھی بھون میں واقع سی ایم جی کے آفس میں گزاری، جہاں قومی سیکورٹی صلاح کار برجیش مشرا اور دوسرے افسران بھی موجود تھے۔ ہم حالات پر باریکی سے نظر رکھے ہوئے تھے اور تیزی سے بدلتے ہوئے حالات میں یرغمالوں کی رہائی یقینی بنانے کے لیے اپنی حکمت عملی میں ردّوبدل کرتے جا رہے تھے۔ جب طیارہ دبئی میں اترا، میں نے امریکہ سے مدد لینے کے لیے ہندوستان میں امریکہ کے سفیر سے گفتگو کی۔ ہمیں اطلاع ملی تھی کہ متحدہ عرب امارات میں امریکی سفیر ایئر پورٹ پہنچ گئے تھے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ متحدہ عرب امارات اتھارٹیز نے دبئی میں موجود ہندوستان کے سفیر کو ایئرپورٹ کے اندر جانے کی اجازت نہیں دی۔ میں نے سوچا کہ خلیج کے علاقہ میں اپنی عظیم الشان فوجی موجودگی اور سفارت کاری سے امریکہ اغوا شدہ طیارہ کے لیے کچھ مثبت قدم اٹھا سکتا تھا۔ پھر یرغمالوں کو چھڑانے کے لیے ہندوستانی کمانڈو فورس کو وہاں بھیجا جا سکتا تھا۔ مجھے اس بات سے سخت مایوسی ہوئی کہ انھوں نے کوشش تک نہیں کی۔ اس مسئلہ کے ختم ہونے کے کچھ برس بعد جب رابرٹ بلیک ویل **، جو 03-2001 کے درمیان ہندوستان میں امریکہ کے سفیر تھے، مجھ سے ملے تو میں نے ان سے اپنی ناراضگی کا

---

* 'قندھار' ایک قدیم ہندو ریاست کی راجدھانی تھی۔ یہاں کی راج کماری گاندھاری ہستناپور کے راجہ، دھرت راشٹر سے بیاہی گئی تھی جو مہابھارت کے پانڈو برادران کے ماموں تھے۔ مقبول ہو چکے کشان بادشاہ کنشک کے دور حکومت میں افغانستان میں بودھ مذہب کو فروغ حاصل ہوا تھا۔ عظیم الشان پتھر کے ایک ہی ٹکڑے سے بنائی گئی بھگوان بودھ کی دنیا کی سب سے اونچی مورتی بامیان بودھ کی تخلیق کشان دور میں ہوئی تھی۔ 2001 میں طالبان حکومت کے ذریعہ اسے توڑ دیا گیا۔ اس نے مشہور کابل میوزیم، جہاں افغانستان کے ہندوستان کے ساتھ گہرے تعلقات کو واضح کرنے والی کئی بیش قیمت اشیا کی نمائش کی گئی تھی، کو بھی تہس نہس ہونے دیا۔ کچھ عشرہ پہلے تک قندھار میں کثیر تعداد میں ہندو اور سکھ رہتے تھے۔

** بلیک ویل امریکہ کے ان افسران میں سے ایک تھے جن کی ہمیشہ سے ہندوستانی حکومتوں کے ساتھ ہمدردی تھی، جب وہ پہلی بار نئی دہلی آئے تھے تب برصغیر ہند کے حالات کے بارے میں ان کے خیالات مختلف تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں ان کے نظریہ میں کچھ تبدیلی لانے میں کامیاب رہا۔ 27 مارچ 2008 کو این ڈی ٹی وی کو دیئے گئے ایک انٹرویو میں بلیک ویل نے اس بات کی تصدیق کی کہ 1999 میں طیارہ اغوا کے معاملہ میں مداخلت نہ کرنا امریکی پالیسی کی ناکامی تھی۔

اظہار کیا۔ 'دہشت گردی سے لڑنے میں ہند-امریکہ تعاون کا یہ مطلب ہم نہیں لگاتے' میں نے ان سے کہا۔ اس تجربہ سے میرا یقین واعتماد اور پختہ ہوا کہ دہشت گردی کے خلاف اپنی لڑائی ہندوستان کو خود ہی لڑنی ہوگی۔ ان خیالات کا اظہار میں نے متعدد بار کیا تھا۔

ہمیں جلد ہی پتہ چل گیا کہ اغوا کار ہندوستانی جیلوں میں بند 36 دہشت گردوں کی رہائی کے ساتھ 20 کروڑ امریکی ڈالر کا مطالبہ کر رہے تھے، لیکن ان کا سب سے اہم مطالبہ جموں وکشمیر کی سب سے خطرناک دہشت گرد تنظیموں میں سے ایک کے لیڈر مولانا مسعود اظہر جسے 1994 میں گرفتار کیا گیا تھا، کی رہائی تھی۔ سیکورٹی سے متعلق وزارت کمیٹی (سی سی ایس) کے تین افسران — پیچیدہ آپریشن کو سنبھالنے کے لیے آئی بی کے سینئر افسر اجیت دووال، وزارت خارجہ میں جوائنٹ سکریٹری وویک کاٹجو اور 'را' کے سی ڈی سہائے — کی ایک ٹیم کو اغوا کاروں کے ساتھ طالبان کے نمائندوں سے گفت وشنید کرنے کے لیے قندھار بھیجنے کا فیصلہ لیا تھا۔

میں ابتدا میں یرغمالوں کی رہائی یقینی بنانے کے لیے دہشت گردوں کی رہائی کے حق میں نہیں تھا، لیکن ہماری حکومت کے سامنے حقیقت میں غیر معمولی حالات تھے۔ یہ سچ ہے کہ اغوا کار طیارہ کو قندھار لے گئے تھے، جس نے حالات کو بہت زیادہ مشکل اور دشوار بنا دیا تھا۔ ایک عام اغوا کے معاملہ میں اغوا کار جلد سے جلد سودے بازی کر کے اپنی شرائط منوانے کے لیے کم سے کم اتنے دباؤ میں تو آتے ہی ہیں جتنی کہ وہ حکومت، جس کے ملک کا طیارہ اغوا کیا گیا ہو۔ اس معاملہ میں اغوا کاروں پر کوئی دباؤ نہیں تھا اور وہ جب تک چاہتے یرغمالوں کو اپنے قبضہ میں رکھ سکتے تھے، کیونکہ تین باتیں ان کے حق میں تھیں۔ پہلی، وہ ایک بہتر علاقہ میں تھے۔ طالبان کے زیر نگراں افغانستان ★، جس کے ساتھ ہندوستان کے کوئی سفارتی تعلقات نہیں تھے، نے انہیں اغوا کا معاملہ ختم کرنے یا ملک چھوڑنے کے لیے اغوا کاروں پر دباؤ ڈالنے کا کوئی اشارہ نہیں دیا۔

دوسری، ہمارے پاس مصدقہ اطلاع تھی کہ اغوا کاروں کی تمام سرگرمیوں کی ڈور پاکستان میں واقع آئی ایس آئی کے ہاتھ میں تھی۔ چونکہ طالبان آئی ایس آئی ہی کی پیداوار تھے، اس لئے نہ صرف طیارہ بلکہ ایئرپورٹ تک پاکستان کے کنٹرول میں تھے۔ حکومت ہند کے پاس یرغمالوں کو رہا کرانے کی کوشش میں براستہ فضا کمانڈو ٹیم اور فوج کو قندھار بھیجنے کا متبادل تھا، لیکن ہمیں اطلاع ملی تھی کہ اسلام آباد کے احکامات کے مطابق طالبان نے ایئرپورٹ کی جانب سبھی طرف سے ٹینک تعینات کر دیئے تھے۔ ہمارے کمانڈو طیارہ کے اندر اغوا کاروں کو غیر مسلح کر سکتے تھے، لیکن طیارہ کے باہر طالبان فوجیوں کے ساتھ ایک مسلح جھڑپ ان لوگوں کے لیے خطرناک ہوتی جو طیارہ کے اندر تھے۔

اس کے علاوہ ایک اور خطرہ تھا۔ آزاد کرانے والے طیاروں کو بھی پاکستان کی فضائی حدود سے ہو کر گزرنا پڑتا، جس کی اجازت یقینی طور سے نہیں ملتی۔ ہمارے پاس یہ مصدقہ اطلاع بھی تھی اور جس کی تصدیق بعد میں مغویہ طیارہ کی جانچ سے ہوئی کہ ہائی جیکروں کے پاس گرینیڈ اور دھماکہ خیز مادے تھے اور وہ طیارہ کو دھماکوں سے اڑا دینے کے لیے تیار تھے۔ ایک اغوا کار کو یہ کہتے ہوئے سنا گیا تھا کہ یہ گولہ بارود ہندوستان کی

★ طالبان کے زیر حکومت افغانستان (1996-2001) کو دنیا بھر میں صرف دو ملکوں نے منظوری دی تھی — پاکستان اور سعودی عرب۔ طالبان کے کرتا دھرتا اور حامیوں، جو اسلام کی سخت گیری پر یقین رکھتے تھے، کو پاکستان کے مدرسوں میں تعلیم دی جاتی تھی۔ انھیں آئی ایس آئی کے ذریعہ جہاد کے لیے ٹریننگ اور اسلحوں سے لیس کیا جاتا تھا۔ انھیں مالی امداد دینے والوں میں سے ایک تھا عالمی دہشت گردی نیٹ ورک القاعدہ کا سربراہ اسامہ بن لادن، جسے اس کے بدلے میں افغانستان میں سر چھپانے کی جگہ مل گئی تھی۔ افغانستان پر سوویت قبضہ (89-1980) کے خلاف امریکہ-پاک اتحاد نے شروعات میں طالبان اور اسامہ بن لادن دونوں کو تعاون دیا تھا۔ اس واقعہ کی وجہ سے نہ صرف افغانستان کی زبردست بربادی ہوئی بلکہ ہندوستان کے اس روایتی دوست کو اس کی خواہش کے خلاف ہند مخالف طاقتوں کی سالمیت کو قبول کرنے کے لیے مجبور ہونا پڑا۔

حکومت کے لیے ایک خصوصی سوغات کی شکل میں نئے سال پر ایک دہشت گردانہ کاروائی میں استعمال کیا جائے گا۔

تیسری، اور تمام واقعات کا سب سے بدقسمت پہلو یہ تھا کہ ہندوستانی حکومت پر یرغمالوں کو ''کیسے بھی'' رہا کرانے کے لیے دباؤ ڈالا جارہا تھا۔ جب یہ بحران تیسرے دن میں داخل ہوا تو کچھ یرغمالوں کے رشتہ داروں کے ذریعہ وزیراعظم کی رہائش گاہ کے باہر اشتعال انگیز مظاہرہ کیا گیا، جو مجھے انتہائی دکھ کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ وقتی طور سے ہی سہی، بی جے پی کے سیاسی مخالفین کے اکسانے کے نتائج تھے۔ کچھ ٹی وی چینلوں نے دن رات ان مظاہروں کو خاص طور سے دکھایا جس سے لوگوں میں یہ پیغام جاتا تھا کہ جیسے کہ اتنے ہندوستانیوں کی زندگی خطرے میں دیکھنے پر بھی سرکار 'کچھ نہیں کررہی' تھی۔ یہ سب دیکھ کر میں حیرت زدہ رہ گیا کہ 'ہندوستان کی سرکاری مشینری کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ انتہائی لچیلی ہے، لیکن کیا ہندوستانی سماج بھی ایک نرم سماج بن گیا ہے؟ یہ دیکھ کر کچھ سکون ملا کہ ٹی وی پر دکھائے گئے ان مظاہروں نے کارگل کے شہیدوں کے رشتہ داروں کو مجبور کیا کہ وہ یرغمالوں کے رشتہ داروں سے حوصلہ رکھنے کے لیے کہیں۔

ایک جانب تو یرغمالوں کے رشتہ داروں کے بڑھتے دباؤ اور دوسری جانب اس بات کا امکان کہ اغوا کار کوئی بھی انتہائی قدم اٹھا سکتے ہیں۔ حکومت نے نہایت ہی غیرارادتاً نقصان کو کم سے کم رکھنے کے متبادل کو منتخب کیا۔ مولانا مسعود اظہر سمیت جیل میں بند تین دہشت گرد، 31 دسمبر کو رہا کیے جانے کے بعد قندھار میں طالبان اتھارٹیز کو سونپ دیئے گئے۔ قندھار میں بات چیت کے لیے گئی ہماری ٹیم نے سمجھوتے کی بات مضبوطی سے کی، جس کی وجہ سے وہ جیل میں بند 36 افراد کو رہا کرنے کے مطالبہ کو کم کر کے صرف تین تک لانے میں کامیاب رہے۔ آئی سی-814 کے سبھی مسافر اور طیارہ کے عملہ آزاد کیے جانے کے بعد اسی رات دہلی واپس بھیج دیئے گئے۔ اس طرح اس بحران کا خاتمہ ہو گیا جس نے دنیا کے سامنے ایک نئی طرح کی لڑائی کا چہرہ پیش کیا کہ کیسے مرنے مارنے پر آمادہ دہشت گردوں کا ایک چھوٹا سا گروپ بھی ایک ایسے ملک کو چیلنج دے سکتا ہے، جس کے پاس عظیم فوجی طاقت ہے۔

اس پورے واقعہ کے دوران میرے ساتھی جسونت سنگھ اور وزارت خارجہ کے ان کے ساتھیوں نے اس بحران کے اطمینان بخش حل کے لیے بہت کوششیں کیں۔ جہاں تک دہشت گردوں کا تعلق تھا وہ آئی ایس آئی کے اپنے حامیوں کے ساتھ اس ملک میں واپس چلے گئے جس نے گھناؤنی کاروائی انجام دی تھی۔ دراصل مولانا مسعود اظہر نے اپنی رہائی کے کچھ ہی دنوں بعد کراچی کی ایک مسجد میں ایک پرجوش بھیڑ سے کہا ''میں اپنا فرض ہونے کی وجہ سے یہاں آپ کو یہ بتانے کے لیے آیا ہوں کہ امریکہ اور ہندوستان کو پوری طرح برباد کرنے تک مسلمانوں کو چین سے نہیں بیٹھنا چاہیے۔''

پاکستان کے صدر جنرل پرویز مشرف نے ایک عالمی ٹیلی ویژن نیٹ ورک کو دیئے گئے انٹرویو میں کہا کہ پاکستان کو بدنام کرنے کے لیے طیارہ اغوا کی یہ اسکیم ہندوستان نے خود تیار کی تھی، لیکن 6 جنوری 2000 کو پارلیمنٹ میں دستیاب کرائی گئی میری تفصیلات سے اس گھناؤنے کھیل میں پاکستان کی شمولیت اجاگر ہوتی ہے۔

> ''پاکستان کے ذریعہ کی گئی اس اغوا کی کاروائی کی تفتیش کررہے سیکورٹی دستوں نے ایک اہم کامیابی حاصل کی ہے۔ مرکز کی خفیہ ایجنسیوں کے ساتھ کام کرتے ہوئے ممبئی پولس نے ممبئی سے آئی ایس آئی کے ان چار ایجنٹوں کو گرفتار کیا ہے جو انڈین ایئر لائنس طیارہ کے پانچ ہائی جیکروں کو تعاون دے رہی پارٹی کا حصہ تھے۔ چاروں راولپنڈی (پاکستان) کے ایک متشدد گروپ حرکت الانصار، جسے امریکہ نے 1997 میں ایک دہشت گرد تنظیم قرار دیا تھا، کے رضا کار تھے۔ اس اعلان کے بعد اس تنظیم نے اپنا نام حرکت المجاہدین رکھ

لیا۔ پوچھ گچھ کے دوران ان چاروں نے تصدیق کی کہ طیارہ کا اغوا آئی ایس آئی کے ذریعہ حرکت الانصار کی مدد سے کیا گیا تھا اور چاروں اغواکار ہائی جیکر پاکستانی تھے۔"

میں نے پارلیمنٹ میں جو تفصیلات دی تھیں اس کی تصدیق کے لیے اس دن پاکستانی میڈیا میں رپورٹ آئی کہ چھوڑے گئے دہشت گرد کراچی میں دیکھے گئے ہیں۔ اس طرح، یہ بالکل واضح تھا کہ طیارہ اغوا کا معاملہ ہندوستان کے خلاف جاری پاکستان کی سیڈو-وار کا ہی ایک حصہ تھا، بعد میں اس بات کے بھی مصدقہ ثبوت ملے، جن سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ آئی سی-814 کے اغوا سے جڑے دہشت گرد اور ان کے حامی ہی اس سازش میں شامل تھے، جس کا نتیجہ 9/11 تھا۔

بل کلنٹن کی ہندوستان آمد

میں نے طیارہ اغوا کے واقعہ کی کچھ تفصیلات کا ذکر کیا ہے، کیونکہ وہ میری وزارت کے دور کے سب سے دردناک تجربوں میں سے ایک تھا۔ وزیراعظم اور حکومت میں شامل میرے سبھی ساتھیوں کے لیے بھی ویسا ہی تھا، لیکن یہ تجربہ ہمیں ایک اہم نتیجہ تک لے گیا 'ہمیں پاکستان کی کارگزاریوں کے بارے میں عالمی برادری، خاص طور سے مغربی ممالک کو آگاہ کرانے کے لیے سفارتی اور سیاسی پہل میں تیزی لانی ہوگی۔'

بل کلنٹن کو اس کا احساس تب ہوا جب وہ مارچ 2000 میں ہندوستان کے دورہ پر آئے۔ دو دہائیوں سے زیادہ مدت کے بعد کسی امریکی صدر کا یہ پہلا ہندوستانی دورہ تھا۔ ان کی نئی دہلی آمد سے ایک دن قبل شام میں کشمیر میں چھتی سنگھ پورہ گاؤں میں پاکستان میں واقع لشکر طیبہ کے دہشت گردوں کے ذریعہ 36 سکھوں کو گولیوں سے بھون ڈالا گیا۔ وزیراعظم واجپئی نے اسے ایک 'فرقہ وارانہ قتل عام کی کاروائی' بتایا۔ ان کے خیالات پر صاد کرتے ہوئے میں نے کہا "اب تک دہشت گردوں نے ہندو فرقہ کو اپنا نشانہ بنایا تھا اور ان کی کوشش تھی کہ کشمیر سے اس مخصوص فرقہ کا صفایا کر دیا جائے۔ اب ان کا مقصد ہے کہ سکھ بھی وہاں سے نقل مکانی کا عمل شروع کریں۔"

ہندوستان کی پارلیمنٹ میں دیئے گئے اپنے خطاب میں کلنٹن نے کہا 'انڈین ایئرلائنس طیارہ اغوا کے دوران آپ لوگ جس درد سے گزرے اسے امریکہ کی عوام سمجھتی ہے اور میں نے اس درد کو بذات خود محسوس کیا، جب میں اس نوجوان کے والدین اور اس کی بیوہ سے ملا، جسے اس طیارہ میں ہلاک کر دیا گیا تھا۔ کشمیر میں مارے گئے سکھوں کے لیے ہم آپ کے ساتھ اظہار تعزیت کرتے ہیں اور ہمارا دل ان کے گھر والوں کے تئیں رنج و غم سے بھرا ہے۔' کلنٹن کا یہ سفر، جس میں ان کے ساتھ ان کی اہلیہ ہلیری کلنٹن اور بیٹی چیلسی بھی تھیں، ایک بہت بڑی سفارتی کامیابی تھی۔ اس کامیابی نے جیسا کہ کلنٹن نے خود بتایا، ہندوستان کے ساتھ نئی 'متحرک، مستقل ساجھیداری' کا اعلان کیا۔ کلنٹن فیملی نے ہندوستانیوں کا دل جیت لیا اور ہندوستانیوں نے ان کا، وہ بھی اتنے غیر محسوس طریقے کے ساتھ جو ان ہی ملکوں میں ملتے ہیں جن کے دوطرفہ تعلقات آزادی، جمہوریت اور کھلے پن کے طور پر یکساں طور سے ہوتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ہندوستان اور امریکہ کے درمیان کچھ ایشوز پر جن میں سے سب سے اہم ہمارا نیوکلیائی پروگرام تھا، اتفاق رائے قائم نہیں ہوسکا، لیکن یہ بھی ہر کسی پر واضح تھا کہ ہندوستان کے تئیں امریکہ کے سامنے ہمارا قد اس لیے بڑا ہے کیونکہ اس میں نیوکلیائی پروگرام کا بڑا ہاتھ ہے۔

سب سے بڑی بات یہ تھی کہ کلنٹن کا صرف چھ گھنٹوں کے لیے پاکستان میں رکنا وہ بھی اس گرم جوشی اور رابطہ کی کمی میں جو ہندوستان کی پانچ روزہ سفر کی اہمیت تھی۔ اس بات نے برصغیر کی ڈپلومیسی میں ہندوستان اور پاکستان کے سامنے، اہمیت دینے کے امریکہ کے اب تک کے

نظریوں کو خاصا اجاگر کردیا۔ اسلام آباد میں انھوں نے پاکستان کی مصیبتوں کی دو برائیاں ''تشدد اور دہشت گردی'' کا ذکر کیا۔ کشمیر کو ہتھیانے کے مقصد سے پاکستان کے دہشت گردوں کے ذریعہ چلائی گئی مہم کی جانب واضح اشارہ کرتے ہوئے انھوں نے صاف گوئی سے اپنے میزبانوں کو یاد دلادیا کہ نیا دور ان لوگوں کی حمایت نہیں کرتا جو اپنی سرحدی لکیروں کو خون سے پھر سینچنا چاہتے ہیں۔

اٹل جی کی پیشین گوئی کو 9/11 نے صحیح ثابت کیا

1980 کی دہائی کے شروعات سے ہی ہندوستان، پاک کی سرپرستی والی دہشت گردی کا شکار رہا ہے، لیکن صرف این ڈی اے حکومت کے عزم مصمم اور مسلسل کوششوں کی وجہ سے ہی جمہوریت نواز مغربی ممالک کو یہ ماننا پڑا کہ حقیقت میں ہندوستان کے خلاف جاری سرحد پار کی دہشت گردی کا اسپانسر پاکستان ہی ہے۔ ہماری سفارتی کاوشیں ایک اور عظیم مقصد کو پورا کرنے میں کامیاب رہیں، کہ دہشت گردی کی کارروائیوں میں پاکستان کی ملی بھگت صرف ہندوستان ہی کے لیے نہیں بلکہ پوری دنیا کے لیے خطرہ ہے۔ ماضی میں مغرب کے ہمارے دوست زمینی حقائق کے بارے میں جانتے ہوئے بھی یہ ڈھونگ کرتے تھے کہ ہندوستان میں دہشت گردی مقامی وجوہات کی وجہ سے ہے، جس کو حل کرنے میں نئی دہلی ناکام رہی ہے۔ ان میں سے کئی تو دہشت گردی کے خلاف اس کی لڑائی میں حقوق انسانی کی خلاف ورزی کے لیے ہندوستان کو قصوروار قرار دیتے تھے۔ واجپئی حکومت کو ہی یہ سہرا جاتا ہے کہ اس نے حقائق، اعداد اور دلائل کے ذریعہ پاکستان کے خلاف نہ صرف ایک مضبوط کیس بنایا بلکہ اس نے امریکہ اور دیگر ممالک کو یہ انتباہ دینے میں بھی کوتاہی نہیں برتی کہ ان کی غیر مستحکم پالیسی انھیں مہنگی پڑے گی۔

اس سلسلے میں دنیا کے کسی لیڈر نے ایسے دور اندیشی کے الفاظ نہیں کہے جیسے کہ وزیر اعظم واجپئی نے 14 ستمبر 2000 کو واشنگٹن ڈی سی میں امریکی کانگریس کے مشترکہ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کہے تھے۔ ''ہمارے پڑوسی سے بڑھ کر کوئی ملک علاقائی دہشت گردی کا اتنا بڑا ذریعہ نہیں ہے۔ حقیقت میں ہمارے پڑوس میں — اس اکیسویں صدی میں — صرف مذہبی لڑائی کو ہی نیا جامہ نہیں پہنایا گیا بلکہ اسے ملک کی پالیسی کے ایک میکانزم کی شکل میں اعلان بھی کردیا گیا ہے۔ فاصلہ اور جغرافیہ کسی ملک کو عالمی دہشت گردی سے تحفظ فراہم نہیں کرتے۔ آپ جانتے ہیں اور میں جانتا ہوں، یہ برائی کامیاب نہیں ہوسکتی، لیکن اپنی ناکامی میں بھی یہ ناقابل برداشت درد پہنچا سکتی ہے۔''

تقریباً ایک سال بعد 11 ستمبر 2001 کو نہ صرف امریکہ بلکہ پوری دنیا کو ان الفاظ کی سچائی کا احساس ہوا۔ منگل کی اس شام کو میں اپنے آفس میں دیر تک بیٹھا تھا کہ میرے پرائیویٹ سکریٹری دیپک چوپڑا تیزی سے اندر آئے اور بولے 'امریکہ میں ایک بہت بڑی دہشت گردی کی واردات ہوئی ہے۔' انھوں نے ٹی وی آن کردیا اور جو کچھ میں نے دیکھا وہ ناقابل یقین ہوتا، اگر وہ انتہائی حساس مناظر امریکہ سے براہ راست ٹیلی کاسٹ نہیں کیے جارہے ہوتے۔ ورلڈ ٹریڈ سینٹر کی جڑواں ٹاور جو نیویارک کے اتنے ہی اہم تھے جتنے کہ مرکز اسٹیچو آف لبرٹی، ان میں سے پہلے ایک اور پھر دوسرا ٹاور اس طیارہ کے ذریعہ، جسے خودکش اور بھیانک انسانی زیاں کے مشن پر نکلے ہائی جیکروں نے ایک میزائل کی شکل میں تبدیل کردیا تھا، گرد میں ملادیا گیا۔ ہائی جیکروں کی ایک اور ٹیم نے تیسرے مسافر بردار طیارہ کو پنٹاگن سے ٹکرادیا، جبکہ وہائٹ ہاؤس کو نشانہ بنانے کے لیے نکلا چوتھا مسافر بردار طیارہ دیہی پنسلوانیہ کے نزدیک ایک کھیت میں کریش ہوکر گرگیا۔ عالمی دہشت گردی کی تاریخ کے اس سب سے بھیانک حملہ میں تقریباً 3 ہزار لوگ مارے گئے۔ ان میں 117 ہندوستانی یا ہندنژاد لوگ تھے۔ اس بات کے ثابت ہونے سے پوری دنیا سکتہ

میں رہ گئی کہ تمام 19 ہائی جیکرز عرب نژاد تھے۔ان کی برین واشنگ اور تربیت عالمی دہشت گردی کے مرکز طالبانی انغانستان اور اس کے محافظ پاکستان میں ہوئی تھی۔

12/13: ہندوستانی پارلیمنٹ پر دہشت گردوں کا حملہ

9/11 سے ایک مہینہ کے اندر ہی یکم اکتوبر 2001 کو پاکستان حامی دہشت گردوں نے سری نگر میں جموں وکشمیر کے اسمبلی ہاؤس پر ایک خودکش حملہ کیا۔اسمبلی کے پاس ایک کار بم دھاکہ میں 38 لوگ مارے گئے۔ بم دھاکہ کے بعد تین مسلح دہشت گردوں نے اسمبلی کیمپس میں گولہ باری کی۔اس سے بھی زیادہ قابل مذمت حملہ 13 رنومبر 2001 کو نئی دہلی میں ہوا۔اس بار نشانہ پر ہندوستان کی پارلیمنٹ تھی۔

پارلیمنٹ میں اس وقت سرمائی اجلاس چل رہا تھا،لیکن 'تابوت معاملہ★' میں وزیر دفاع جارج فرنانڈیز کے استعفیٰ کے مطالبہ کو لے کر اپوزیشن کے احتجاجی مظاہرہ کے بعد ہاؤس کی کاروائی رد کردی گئی تھی۔ میں پارلیمنٹ ہاؤس کے اپنے روم میں بیٹھا تھا کہ 11:40 کے آس پاس میں نے کچھ زوردار آوازیں سنیں جو گولیاں چلنے کی آواز سے مشابہ تھیں۔یہ جاننے کے لیے کہ کیا ہو رہا تھا میں تیزی سے اپنے آفس سے نکلا،لیکن اس گولائی والے کوریڈور میں کچھ ہی فٹ آگے چلا تھا کہ سیکورٹی کے اہلکاروں نے مجھے روک کر کہا 'صاحب! آگے مت جائیے، دہشت گردوں نے حملہ کیا ہے۔'

بجلی کی سی تیزی کے ساتھ مرکزی ریزرو پولس فورس (سی آر پی ایف)، انڈین تبت سرحدی پولس (آئی ٹی بی پی) اور دہلی پولس کے سیکورٹی اہلکاروں نے پوزیشن سنبھال لی اور جوابی فائرنگ شروع کردی۔اس کے ساتھ ہی واچ اینڈ وارڈ اسٹاف نے پارلیمنٹ ہاؤس کے تمام دروازے بند کردیے اور یہ یقینی بنایا کہ کوئی رکن پارلیمنٹ یا کوئی بھی شخص کوریڈور میں نہ رہے۔ میں نے فوراً وزیراعظم، جو پارلیمنٹ کی کاروائی معطل کیے جانے کی خبر سن کر Seven Race Course Road پر واقع اپنے رہائشی آفس میں ہی کام کر رہے تھے،کو فون پر ساری بات بتائی۔ باہر دہشت گردوں اور سیکورٹی اہل کاروں کے مابین گھمسان لڑائی جاری تھی۔ وہ تقریباً نصف گھنٹے تک چلی اور پھر سب کچھ شانت ہو گیا۔ اس وقت نائب صدر جمہوریہ کرشن کانت،لوک سبھا اسپیکر جی ایم سی بالایوگی اور راجیہ سبھا کی ڈپٹی چیئر پرسن نجمہ ہیبت اللہ کے علاوہ 200 سے زائد اراکین پارلیمنٹ میں موجود تھے۔کانگریس صدر سونیا گاندھی سمیت کئی ممبر ہاؤس کی کاروائی رد ہو جانے کے بعد کیمپس میں چلے گئے تھے، بڑی تعداد میں رپورٹرز اور ٹی وی کیمرا مین بھی کیمپس کے اندر تھے اور ان کی موجودگی ہندوستانی پارلیمنٹ پر ہوئے حملے کو دنیا کے سامنے رکھنے میں مددگار ثابت ہوئی۔

★ کانگریس پارٹی نے باجپئی حکومت اور خاص طور سے جارج فرنانڈیز پر بے بنیاد الزام لگائے جسے 'کافین گیٹ گھوٹالہ' کہا گیا ہے۔ان کا مطالبہ تھا کہ وزیر دفاع نے فوج کے لیے بیرون ممالک سے المونیم کے تابوت کے معاملے میں بدعنوانی کی، اس لیے انھیں استعفیٰ دے دینا چاہیے۔کانگریس کے ممبروں نے 'کفن چور، گدی چھوڑ' اور 'سینا خون بہاتی ہے، سرکار دلالی کھاتی ہے' جیسے بھدے نعرے لگائے اور کئی دن تک پارلیمنٹ کی کاروائی کو متاثر کیا۔ 2004 کے لوک سبھا انتخاب تشہیر کے وقت بھی سونیا گاندھی نے یہ الزام لگائے کہ وزیر رہتے فرنانڈیز نے ٹھوس دستاویز اور سرٹیفکیٹ پیش کرتے ہوئے ان الزامات کو غلط، بے بنیاد اور وقار کو ٹھیس پہنچانے والا ثابت کردیا۔ یہ بات حیرت انگیز ہے کہ چار سال کے اپنے مدت کار میں یو. پی. اے حکومت نے فرنانڈیز پر لگائے الزامات کی صداقت جانچنے کے لیے کوئی قدم نہیں اٹھایا۔

بعد میں یہ بات واضح ہوگئی کہ پانچ دہشت گرد ایک سفید رنگ کی ایمبیسڈر کار، جس پر وزارت داخلہ کا لیبل اور پارلیمنٹ میں داخل ہونے کے لیے ایک جعلی داخلہ کارڈ لگا تھا، سنسد مارگ والے مین گیٹ سے، پارلیمنٹ کیمپس میں داخل ہوئے تھے، وہ سبھی مارے گئے تھے۔ ان میں سے ایک گرنے سے پہلے چلایا، 'ہمارا مشن پورا ہوا، پاکستان زندہ باد۔' پارلیمنٹ کی سب سے بڑی عمارت میں دہشت گردوں کو نہ گھسنے دینے میں 9 جانباز سیکورٹی اہلکاروں نے اپنی جان قربان کردی۔ ★

دوپہر 3 بجے وزیراعظم نے قوم کو خطاب کیا۔ 'دہشت گردی کے خلاف لڑائی اب ایک فیصلہ کن گھڑی تک پہنچ گئی ہے۔' انھوں نے اعلان کیا۔ اس کے بعد سیکورٹی سے متعلق وزارت کمیٹی اور پھر پوری وزارت کی میٹنگ ہوئی۔ میٹنگ کے بعد ہونے والی پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے میں نے وزارت کے ذریعہ منظور تجاویز کو پڑھ کر سنایا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ 'یہ حملہ صرف ایک عمارت پر نہیں بلکہ ہمارے نظام حکومت کے قلب پر اور دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کے مندر پر ہوا ہے۔ اس حملہ سے دہشت گردوں نے ملک کے سامنے ایک بار پھر چنوتی پیش کی ہے۔ ہمارا ملک اس چیلنج کو قبول کرتا ہے۔ ہم دہشت گردوں اور ان کے اسپانسروں کا صفایا کردیں گے، چاہے وہ کہیں بھی ہوں، کوئی بھی ہو جیسا کہ ہمارے سیکورٹی اہلکاروں نے اس خاص معاملہ میں کیا ہے۔'

پارلیمنٹ پر حملہ کے بعد پاکستان کا پہلا ردعمل حیرت میں ڈال دینے والا تھا۔ جنرل پرویز مشرف کے ترجمان جنرل راشد قریشی نے دعویٰ کیا کہ 'یہ حملہ ہند مقبوضہ کشمیر میں چل رہی جنگ آزادی کی لڑائی کو بدنام کرنے کے لیے ہندوستانی خفیہ ایجنسیوں کے ذریعہ کھیلا گیا ایک ڈرامہ ہے۔ اس حملہ میں لشکر یا دیگر جہادی تنظیمیں شامل نہیں ہیں۔' مجھے دنیا کے سامنے سارے حقائق رکھنے تھے، جو میں نے 5 دن بعد 18 دسمبر کو پارلیمنٹ میں دی گئی تفصیلات میں کیا۔

میں نے کہا: 'ہماری جمہوریت کے مرکز پر کیے گئے دہشت گردانہ حملہ کا واضح مقصد ملک کی بڑی سیاسی قیادت کا صفایا کردینا تھا۔ ہمارے سیکورٹی اہلکار ستائش کے مستحق ہیں کہ بحران کی اس حالت میں مستعد رہے اور ایک قومی ناخوشگوار واقعہ کو ٹالنے میں کامیاب رہے۔ ایسا کرنے میں انھوں نے اپنی عظیم قربانی دی، جس کے لیے قوم ہمیشہ مقروض رہے گی۔' اس وقت ہوئی تفتیش کی بنیاد پر مجھے اطلاع ملی تھی کہ 'یہ دہشت گردانہ حملہ پاک پرست دو دہشت گرد تنظیموں لشکر طیبہ اور جیش محمد، جنھیں پاکستان کی خفیہ تنظیم آئی ایس آئی کا تحفظ حاصل تھا، نے مل کر انجام دیا تھا۔' بعد کی تفتیش نے بھی ان ابتدائی رپورٹوں کی پوری طرح تصدیق کی۔ حقیقت میں خودکش حملہ آوروں کی ٹیم میں تمام پانچ دہشت گرد پاک شہری تھے۔

تفتیشی ٹیم کو اس وقت ایک بڑی کامیابی ہاتھ لگی جب دہلی کے ایک کالج میں لیکچرر سید عبدالرحمٰن گیلانی کو گرفتار کیا گیا۔ پوچھ گچھ کے دوران اس کے دو اور ساتھیوں محمد افضل اور شوکت حسین گرو کا بھی پتہ چلا۔ شوکت حسین کی اہلیہ نوجوت سندھو عرف افشاں گرو نے بتایا کہ اس کا شوہر اور افضل 13 دسمبر کی دوپہر کو سری نگر گئے تھے۔ یہ اطلاع فوراً جموں و کشمیر پولس کو دی گئی، جس نے ان دونوں کو گرفتار کرلیا۔ بعد میں انھیں دہلی لایا گیا۔ پوچھ گچھ کے بعد پتہ چلا کہ حملہ کا ماسٹر مائنڈ افضل تھا، یہ کام ایک پاکستانی شہری جیش محمد کے غازی بابا نے سونپا تھا۔ افضل کو پاک

★ پارلیمنٹ پر دہشت گردوں کے حملہ میں جان قربان کرنے والے جانباز اور فرض شناس سیکورٹی اہلکاروں اور دیگر اشخاص کے نام ہیں: (1) جے پی یادو، (2) ماتبر سنگھ، (3) کملیش کماری، (4) نانک چند، (5) رام پال، (6) اوم پرکاش، (7) گھنشیام، (8) وجیندر سنگھ، (9) دیش راج۔ اے این آئی کے ٹی وی کیمرہ مین وکرم سنگھ بشٹھ بھی حملہ میں زخمی ہوئے۔

مقبوضہ کشمیر کے مظفرآباد میں آئی ایس آئی کے ذریعہ چلائے جارہے ایک کیمپ میں ٹریننگ دی گئی تھی۔ 5 دہشت گردوں کے چھپنے کے ٹھکانوں کا انتظام شوکت حسین گرو نے کیا تھا۔ 2 کو مکھرجی نگر میں اور ایک کو شمالی دہلی کے تیمار پور علاقہ میں۔ بعد میں مارے گئے چھاپے میں پولس کو ان دونوں ٹھکانوں سے جرائم سے متعلق کافی اشیاء ملیں۔

یہ بتاتے ہوئے کہ انڈین ایئر لائنس کے طیارہ آئی سی-814 کو ہائی جیک کر کے قندھار لے جانے، لال قلعہ میں دہشت گردوں کی دراندازی اور سری نگر میں جموں وکشمیر اسمبلی پر حملہ، یہ تمام کاروائیاں آئی ایس آئی تربیت یافتہ دہشت گرد تنظیموں کے ذریعہ کیے جارہے اور چلائے جارہے تھے۔ میں نے کہا 'بلاشبہ گزشتہ ہفتہ پارلیمنٹ پر ہونے والا حملہ ہندوستان میں پاک اسپانسر دہشت گردی کی تقریباً دو دہائیوں کی تاریخ کی سب سے تشویشناک کاروائی تھی، عملی طور سے اس عظیم ہاؤس کے متعلق ہم سب لوگوں اور ملک کے تمام لوگوں کے لیے یہ اس بات پر غور کرنے کا وقت ہے کہ دہشت گردوں اور ان کے حامیوں نے اتنا بڑا داؤ کیوں کھیلا، خاص طور سے ایسے وقت میں جب پاکستان دہشت گردی کے خلاف تشکیل دیئے گئے بین الاقوامی اتحاد کا ایک حصہ ہونے کا دعویٰ کر رہا ہے۔ اس سوال کا ایک ہی اطمینان بخش جواب ہوسکتا ہے کہ پاکستان، جو خود غیر محفوظ ملکی نظریہ کی پیداوار ہے، جو خود ایک مذہبی ملک ہے اور جہاں جمہوریت کی بنیاد بہت کمزور ہے، ایک سیکولر جمہوری، خوداعتماد اور مسلسل ترقی پذیر ہندوستان، جس کا عالمی برادری میں وقار بڑھتا ہی جارہا ہے، سے سمجھوتہ نہیں کر پارہا ہے۔

پارلیمنٹ پر حملے کی سازش میں قصوروار پائے جانے پر 2002 میں ٹرائل کورٹ میں محمد افضل کو موت کی سزا سنائی گئی۔ دہلی ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ نے اس سزا کو برقرار رکھا۔ سپریم کورٹ نے یہ کہا کہ مارے گئے دہشت گردوں کے ساتھ سازباز کے پختہ ثبوت ہیں، جس کے بعد عدالت عالیہ نے اس عرضی کو مسترد کردیا۔ دیگر تین ملزمان میں سے ٹرائل کورٹ نے افضل، شوکت حسین اور گیلانی کو موت کی سزا اور شوکت حسین کی بیوی نوجوت سندھو عرف افشاں گرو کو پانچ سال قید کی سزا سنائی۔ سپریم کورٹ نے شوکت حسین کی موت کی سزا کو گھٹا کر 10 سال کی سزا کردی جبکہ گیلانی اور افشاں گرو کو چھوڑ دیا۔

افضل کو سزائے موت دیئے جانے کے لیے 20/اکتوبر 2006 کا دن مقرر کیا گیا تھا لیکن اس پر روک لگادی گئی، کیونکہ یوپی اے حکومت کی وزارتِ داخلہ نے افضل کی رحم کی اپیل پر اپنا احتجاج ہندوستان کے صدر جمہوریہ کو جاری کرنے سے انکار کردیا۔ صرف ووٹ بنک کو دھیان میں رکھ کر کانگریس اور کچھ دوسری سیاسی پارٹیوں نے اس ایشو کو مذہبی رنگ دے کر اور افضل کو معاف کیے جانے کے کچھ غیر سرکاری تنظیموں کے مسلسل مظاہرے کو حمایت دے کر سب کو سکتے میں ڈال دیا۔ میری پارٹی اور میں نے اس مطالبہ کی پرزور مخالفت کی۔ میں نے کہا 'سپریم کورٹ نے کہا کہ یہ فعل ایک جنگ کے مترادف ہے، کیونکہ اس کے نشانے پر ہندوستانی پارلیمنٹ تھی، اس لیے اس جرم کو کسی دیگر مقام پر ہونے والے دہشت گردانہ حملے کے برابر نہیں دیکھا جانا چاہیے۔' اقلیت نواز کانگریس پارٹی کی اس سے زیادہ شرمناک بات کیا ہوسکتی ہے کہ 13/دسمبر کے دہشت گردوں کے حملے میں شہید ہونے والے بہادر سیکورٹی اہلکاروں کے گھر والوں نے افضل کو پھانسی دینے کے فیصلہ کو بری جھنڈی دینے سے یوپی اے حکومت کے انکار کے خلاف صدر جمہوریہ کے ذریعہ دیئے 'ویرتا پدک' واپس کردیئے۔

ہندوستانی پارلیمنٹ پر حملہ حقیقت میں 03-2002 میں پاک اسپانسر دہشت گرد گروپوں کی قاتل سرگرمیوں کی ایک لمبی سیریز کا نقطہ عروج تھی۔ جنوری 2002 میں انھوں نے کولکاتہ میں امریکی کلچرل سینٹر پر حملہ کر کے 4 پولس اہلکاروں کو ماردیا۔ مارچ میں جموں کے مشہور رگھوناتھ مندر پر ہوئے ایک فدائین حملہ میں 7 لوگ مارے گئے۔ یہی مندر نومبر میں دوسری بار فدائین حملہ کا شکار بنا، جب 13 عقیدت مند مارے گئے۔

مئی میں دہشت گردوں نے جموں کے پاس کالوچکر کنٹونمنٹ میں 30 لوگوں، جن میں سے بیشتر فوجیوں کے گھر والوں کے ممبران تھے، اجتماعی قتل کر دیا گیا۔ اسی ماہ انہوں نے حریت کانفرنس کے ایک سینئر لیڈر عبدالغنی لون کو سری نگر میں گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ وہ کشمیر کے میر واعظ مولوی محمد فاروق، جن کا قتل بھی دہشت گردوں کے ہاتھوں ہی ہوا تھا، کی بارہویں برسی کے موقع پر ہو رہے عوامی اجلاس کے دوران مارے گئے۔ اس نے یہ واضح کر دیا کہ کیسے اثر دار اور امن کے حامیوں کا صفایا، ہندوستان کے خلاف پاکستان کے دہشت گردی مہم کا ایک اہم حصہ رہا ہے۔ جولائی میں جموں کے نزدیک قاسم نگر میں 20 دیہی باشندوں کو مار دیا گیا۔ اگست میں انھوں نے کشمیر میں بھگوان شیو کی مقدس گپھا مندر امرناتھ کی سالانہ یاترا پر جاتے ہوئے پہلگام میں تیرتھ یاتریوں پر حملہ کر کے ان میں سے 8 کو مار ڈالا۔ ایک سال قبل دہشت گردوں نے جس دن جموں وکشمیر کے مختلف مقامات پر تقریباً 100 افراد کو گولی مار کر قتل کر دیا، اسی دن پہلگام میں امرناتھ جا رہے 33 تیرتھ یاتریوں کا اجتماعی قتل عام ہوا۔ ستمبر میں انھوں نے گجرات کے گاندھی نگر میں واقع اکشر دھام مندر میں گھس کر 29 بھگتوں، جن میں کئی عورتیں اور بچے شامل تھے، کو مار دیا۔

مارچ 2003 میں دہشت گردوں نے پولس کی وردی پہن کر سری نگر کے نزدیک ندی مارگ گاؤں پر حملہ کر دیا جس میں 24 عورتیں، مرد و بچے ہلاک ہوئے۔ اسی مہینہ میں ممبئی میں ایک لوکل ٹرین میں بم دھماکہ ہوا جس میں 10 افراد مارے گئے۔ اگست میں جنوبی ممبئی میں دو طاقتور کار بم دھماکوں میں 46 افراد اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

مندرجہ بالا تفصیلات ان دو سالوں میں ہندوستان میں دہشت گردوں کی کاروائیوں کی مکمل فہرست نہیں، لیکن 1980 کی دہائی کے ابتدا میں دہشت گردوں کے ذریعہ اپنا بدنما چہرہ دکھانے کے بعد سے ہندوستانیوں نے سال بہ سال جو تکلیف اور درد برداشت کیا ہے اس کی یہ صرف مختصر فہرست ہے۔ یہ اس بات کا بھی واضح ثبوت ہے کہ دہشت گردی کو ہتھیار کی طرح استعمال کرتے ہوئے پاکستانی ارباب اقتدار اس مہم کے ذریعہ کیا پانا چاہتے ہیں۔ جموں وکشمیر میں امن کی آواز اٹھانے والوں کو ختم کر دینے کے علاوہ ریاست کے بیشتر حصوں سے ہندوؤں کو بھگا کر وہ ''مذہبی تطہیر'' کرنا چاہتے ہیں۔ ملک کے دوسرے حصوں میں وہ ہندو اور مسلمانوں کے درمیان فرقہ وارانہ تناؤ اور تشدد بھڑکانے کی سازش کر رہے ہیں۔ ہمارے سیکورٹی دستوں نے سیاسی لیڈروں کے اغوا یا قتل کی سازش کے کچھ معاملوں کا بھی پردہ فاش کیا ہے۔

اسلامی انتہا پسندی اور دہشت کو نظریاتی حمایت

اس تلخ اور مذہب متاثر دہشت گردی مہم کا نشانہ ہندوستان کو کیوں بنایا گیا؟ ہندوستان میں دہشت گردی کی نظریاتی بنیادیں کیا ہیں؟ ان سوالوں کو اگر راست طور پر نہیں پوچھا گیا اور ایمانداری سے جواب نہیں دیا گیا تو نہ ہم دہشت گردی کو سمجھ سکیں گے اور نہ ہی اس سے مقابلہ کرنے میں کامیاب ہوں گے۔

> میں ان تمام مثبت سوچنے والے لوگوں سے متفق ہوں کہ کسی بھی مذہب کو بدنام نہیں کیا جانا چاہیے اور کسی بھی مذہبی فرقہ پر دہشت گردی کا لیبل چسپاں کر کے اسے نہیں دیکھنا چاہیے۔ اپنی بنیادی شکل میں سبھی مذہب شانتی اور بھائی چارے کا پیغام دیتے ہیں اور اپنے پیروکاروں سے صراط مستقیم پر چلنے کی درخواست کرتے ہیں۔ کوئی بھی مذہب بے قصور لوگوں کے قتل کی حمایت نہیں کرتا اور اسی لیے دہشت گردوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا ہے، لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس دور میں دہشت گردی کی سب سے تباہ کن شکلوں میں

سے ایک اسلام کی آڑ لیتا ہے۔ اپنی قاتل مہم کو وہ 'جہاد' کا نام دیتا ہے اور اس طرح مقدس اور پرعقائد مسلمانوں کی نظروں میں خود کو درست ٹھہرانے کی کوشش کرتا ہے۔ جہاد کی اس غلط تشریح اور خود سے وضع کردہ تعریف سے متاثر ہو کر دہشت گرد حقیقت میں مقررہ ہدف کے لیے یہ سب کرتے ہیں۔ پوری دنیا میں سیاسی اسلام، جسے اسلامزم بھی کہا جاتا ہے، کے اثر کو قائم کیا۔ فطری طور سے ہندوستان کا اکثریتی طبقہ سیکولرزم کا قانونی اصول، جس نے ہندوستان کو بنیاد فراہم کی ہے اور ہندو مذہب کی ثقافتی روحانی جس نے ہندوستانی سماج اور اسٹیٹ دونوں کو متعارف کرایا ہے، اسلامزم اس کے لیے ایک کلنک ہے۔

اس لیے ہندوستان میں دہشت گردی کی نظریاتی بنیاد واضح طور سے اپنے مقصد میں تو مخالف اور اپنی اپیل میں پان اسلامک ہے۔ یہ مسلم دنیا کے بیشتر حصوں میں پھیلی ہوئی دہشت گردی کی گہری بیماری کے اثرات ہیں۔ اس کا مالی انتظام خاص طور سے سعودی عرب خلیجی ممالک میں آباد شدت پسندوں کے ذریعہ کیا جاتا ہے۔ پاکستان اور دیگر مسلم ممالک میں یہ گروپ بچوں کے شفاف اور انتہائی حساس دل و دماغ میں کٹرپن بو دینے کے لیے مدرسوں کا سہارا لیتے ہیں۔ گزشتہ دو دہائیوں میں خاص طور سے ہندوستان کے سرحدی علاقوں میں بڑے پیمانے پر مدرسے کھل گئے ہیں، جو انھیں مقامات تک محدود نہیں ہیں۔ تباہ کاری اور دہشت گردانہ سرگرمیوں کے لیے ان میں سے بہت سے مدرسوں کا زبردست استعمال کیا گیا ہے۔ یہ عدم مساوات اور اندھی تقلید کی تعلیم دیتے ہیں۔ اہل حدیث جیسے سعودی عرب کے ذریعہ مالی امداد یافتہ وہابی ازم، سعودی عرب میں مشتہر اسلام کی ایک ابتدائی بنیادی شکل جو ہندوستانی اسلام پر صوفی اور دیگر ملکی اثرات کو بھی برداشت نہیں کرتا، کی شکل میں جانے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ مشترکہ اسلام جسے میں نے اپنے بچپن میں سندھ میں دیکھا ہے، وہابیوں کے ذریعہ اسلام مخالف قرار دیا جا رہا ہے اور اسے پرتشدد طریقے سے اکھاڑ پھینکا جا رہا ہے۔

1998 سے پہلے، ہندوستان کی مختلف سخت گیر مسلم تنظیم جو ایک شدت پسند ایجنڈا پر کام کر رہی تھیں، کی سرگرمیوں کے بارے میں مجھے عام معلومات تھی، لیکن وزارت داخلہ میں اپنے چھ سال کے مدت کار کے دوران ان کے اور بین الاقوامی سطح پر متحرک دہشت گردوں سے ان کے رابطوں کے بارے میں، میں نے جو کچھ جانا اس سے میں بھی حیرت زدہ رہ گیا۔ مثال کے طور پر ہندوستان کے کئی حصوں میں دہشت گردانہ کارروائیوں اور فرقہ وارانہ فسادات میں اسٹوڈنٹس اسلامک موومنٹ آف انڈیا (سیمی) کے رول کو دیکھا جا سکتا ہے۔ سیمی کے القاعدہ اور جیش محمد سے رابطوں کے بارے میں خفیہ ایجنسیاں سال بہ سال میرے پاس مستند اطلاعات لاتی رہیں۔ ان کے جنرل سکریٹری صفدر ناگوری نے کھلے عام کہا کہ 'اسامہ بن لادن ایک دہشت گرد نہیں ہے اور نہ جموں و کشمیر ہندوستان کا ایک حصہ۔' اس کے آفیشیل ترجمان 'اسلامک موومنٹ' کے جولائی 2001 کے شمارہ میں زور دے کر کہا گیا 'جمہوریت، سیکولرزم اور قوم پرستی کے نظریات نے ماضی میں پوجے جانے والے دیوی دیوتاؤں کا مقام لے لیا ہے۔ ان نظریات کو توڑ کر اللہ کے ذریعہ بتائے گئے نظام خلافت کو قائم کرنا ہمارا فرض ہے۔'

حرکت المجاہدین کے جنرل سکریٹری فضل الرحمٰن خلیل نے ستمبر 2000 کو اپنے رضا کاروں سے کہا کہ 'ہم لوگ صرف کشمیر کے لیے نہیں بلکہ نئی دہلی پر اپنا جھنڈا لہرانے کے لیے لڑ رہے ہیں۔ ہماری جنگ تب تک جاری رہے گی جب تک ہندوستان میں مسلم حکومت پھر سے قائم نہیں ہو جاتی۔' لشکر طیبہ جیسی تنظیموں نے اپنا یہ عزم چھپانے کی کبھی کوشش نہیں کی کہ جموں و کشمیر میں جاری جہاد 'کسی علاقہ کے لیے ہونے والی لڑائی نہیں ہے۔' پاکستان کی آئی ایس آئی کی حمایت اور اسامہ بن لادن سے اسپانسرڈ لشکر اپنے آخری ہدف کا اعلان 'دنیا کے تمام مسلمانوں پر حکومت کرنے کے لیے خلافت کی تشکیل' کی شکل میں کرتا ہے اور زور دے کر کہتا ہے کہ 'ایک مسلسل جہاد تب تک جاری رہے گا جب تک ایک رہنما

اصول زندگی کی شکل میں ہر جگہ نافذ نہیں ہو جاتا بلکہ اسلام اور کافروں کے درمیان کبھی نہ ختم ہونے والی جدوجہد کا ایک حصہ ہے۔' وہ جموں وکشمیر میں ہندوستانی حکومت کو لازمی طور سے ناجائز اور استحصال کرنے والا بتاتا ہے۔ لشکر طیبہ کو قائم کرنے والے حافظ محمد سعید کے مطابق 'ہندو ایک نیچ دشمن ہے اور اس سے نمٹنے کا بہتر طریقہ وہی ہے جسے ہمارے مورثوں نے اپنایا تھا—انھیں طاقت سے کچل دینا چاہیے۔'

ان تنظیموں کو پاکستان کا تعاون ہندوستان میں متحرک دہشت گردی گروپ کی بقا، پرورش و پرداخت اور ترقی میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ بڑی تعداد میں ٹریننگ کیمپ اور معاون آفس کیمپ—پاک مقبوضہ کشمیر اور پاکستان میں واقع ہے۔ آئی ایس آئی کے ذریعہ مصدقہ، اسلامی تشدد پسند گروپوں کے آقاؤں اور مسلم دانشوروں کو نوجوانوں کی بھرتی اور ان میں جوش بھرنے کے لیے اکثر استعمال کیا جاتا تھا۔ حزب المجاہدین، یونائیٹڈ جہاد کونسل، العمر مجاہدین، مرکز دعوۃ والارشاد، لشکر طیبہ، البدر، جیش محمد وغیرہ کے بیشتر اعلیٰ لیڈروں کو مالی امداد، سرگرمیاں چلانے کی بنیاد اور ہندوستان میں دہشت گردانہ کاروائیوں کو انجام دینے کے لیے ساری سہولیات دستیاب کرائی جاتی تھیں۔ اگر عالمی دباؤ کی وجہ سے کسی تنظیم پر پابندی لگانا بھی پڑتا تو وہ کسی دیگر نام سے اٹھ کھڑی ہوتی تھی۔

مختصراً ہندوستانی جمہوریہ کو دی گئی چنوتی بہت سنگین تھی۔ اس میں بے قصور شہریوں اور سیکورٹی فورسیز کی اجتماعی ہلاکتیں، ہماری سرحدوں پر دراندازی، ایک علیحدگی پسند تحریک کے غیر منقسم جسم کی شکل میں کشمیر اور جموں کے کچھ حصوں سے ہندوؤں اور کچھ سکھوں کو باہر نکال دینا، غیر ملکی دولت سے چلائی گئی مذہبی اشتہار بازی کی آڑ میں ہندوستان مخالف جذبات، فرقہ وارانہ کشیدگی اور تشدد بھڑکانا، طیارہ اغوا، اسلحوں کی اسمگلنگ، ملکی معیشت میں جعلی نوٹوں کا داخلہ...اور پارلیمنٹ پر حملہ۔ کوئی بھی خود مختار ملک یہ سب خاموشی سے برداشت کرے گا؟ کون سی جمہوریت نواز حکومت خاموش بیٹھے گی؟

پوٹا: کس طرح کانگریس نے ایک انسداد دہشت گردی قانون کو فرقہ واریت کا نام دیا

اس چیلنج کا سامنا کرنے کے لیے واجپئی حکومت نے کثیر الجہات پالیسی، جس کے تین پہلو تھے، اپنانے کا فیصلہ کیا، قانونی، انتظامیہ اور سفارتی۔ قانونی ہتھیار ایک تاریخی ایکٹ کی شکل میں تھا، پارلیمنٹ پر دہشت گردانہ حملہ کے چار ماہ کے اندر مارچ 2002 میں پاس پریونشن آف ٹیریرزم ایکٹ (پوٹا)، یہ بہت بڑی تعداد میں ملک مخالف سرگرمیوں کو اپنے دائرۂ اختیار میں لے لیتا تھا، جن میں دہشت گردوں کی بھرتی، لالچ، انھیں پناہ دینا، دہشت گردوں کی میٹنگوں میں شرکت کرنا، اسلحوں، دھماکہ خیز اور دہشت گردوں کے ذریعہ استعمال کی جانے والی دیگر اشیاء کو رکھنے، منگانے اور استعمال کرنے کی سرگرمیاں شامل تھیں۔ اس میں دہشت گردی کو مالی تحفظ، رقم اور اس کے استعمال سے نمٹنے کے لیے اس ایکٹ میں سخت التزامات کیے گئے تھے، جن سے ایسے اثاثوں، دولت کو قانون کے تحت قرق یا ضبط کرنا ممکن ہو گیا تھا۔ اس میں مشتبہ دہشت گردوں کے غیر ضمانتی وارنٹ اور گرفتاریوں کے کئی بڑے التزامات کیے گئے تھے۔ ایکٹ میں دہشت گردی سے متعلق معاملوں میں فعالیت سے متعلق کئی تبدیلی کی گئی، جیسے کچھ خاص طرح کے ثبوتوں وشواہد کی منظوری، جن سے پولس کے ہاتھ کافی حد تک مضبوط ہوئے۔

یہ انتہائی افسوسناک ہے کہ پوٹا کو قانون کی کتاب میں شامل کرانے میں ہماری سرکار کو متعدد پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ایسا خاص طور سے کانگریس پارٹی کی مخالفت کی وجہ سے ہوا، جس نے راجیہ سبھا میں اس بل کی شکست یقینی بنادی، جہاں این ڈی اے اقلیت میں تھی۔ اس نے ہم کو دونوں ایوان کا مشترکہ اجلاس بلانے کے لیے مجبور کر دیا۔ اپنی 50 سالہ زندگی میں یہ صرف تیسرا موقع تھا جب ایک اہم قانون کو پاس کرانے

کے لیے آئین کے اس خصوصی التزام کا سہارا لیا گیا ہو۔ 10 گھنٹے تک چلی یہ بحث میری پارلیمانی زندگی کی سب سے لمبی بحثوں میں سے ایک تھی۔ سونیا گاندھی نے یہ کہہ کر پوٹا کی تنقید کی تھی کہ 'یہ لوگوں کے بنیادی حقوق' کو سلب کرتا ہے اور اعلان کیا کہ کانگریس حکومت والی ریاستیں اس قانون کو نافذ نہیں کریں گی۔ انھوں نے نکتہ دیا کہ دہشت گردی سے نمٹنے کے لیے جو قانون موجود ہے، وہ کافی ہے۔ اگر ایسا تھا تو انھوں نے یہ نہیں بتایا کہ مہاراشٹر، جہاں اس وقت کانگریس کی حکومت تھی، نے 1999 میں دہشت گردوں سے متعلق معاملوں سے نمٹنے کے لیے کیوں ایک خصوصی قانون مہاراشٹر منظم جرائم کنٹرول ایکٹ یا مکوکا * بنایا تھا۔ یہ سمجھ سے بالاتر تھا۔ انھوں نے سہولت کے مطابق اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا تھا کہ پوٹا اپنی شکل میں دہشت گردی اور تباہ کاری پھیلانے والی سرگرمیاں (کنٹرول) ایکٹ (ٹاڈا) جسے 1987 میں راجیو گاندھی حکومت نے پیش کیا تھا، سے مختلف نہیں تھا۔

بحث کا جواب دیتے ہوئے میں نے سونیا گاندھی اور حزب اختلاف کے دیگر افراد کو یاد دہانی کرائی کہ پنجاب کی بڑھتی ہوئی دہشت گردی اور تشدد کے پس منظر میں کیسے ٹاڈا کی تشکیل کی گئی تھی اور یہ بھی کہ اس انتہائی ضروری قدم پر بی جے پی نے کیسے کانگریس حکومت کی حمایت کی تھی۔ حقیقت میں دہشت گردی کی سرگرمیوں کو متعارف اور ان کا سامنا کرنے کے لیے مرکزی حکومت کے ذریعہ یہ پہلی آئینی کوشش تھی۔ ویسے بھی 1993 میں سیریل بم دھماکوں میں شامل دہشت گردوں کا مقدمہ ممبئی کی ایک ٹاڈا عدالت میں چل رہا تھا، بعد میں 2007 میں انھیں سزا سنائی گئی۔

1995 میں ٹاڈا کے ختم ہو جانے کے بعد سیکورٹی برادری کے ممبران مرکز میں برسراقتدار مختلف حکومتوں سے ویسا ہی ایک قانون بنانے کے لیے پرزور درخواست کرتے رہے تھے، کیونکہ دہشت گردی کی اپنی لڑائی میں وہ خود کو قانونی طور سے لاچار پاتے تھے۔ 1995 سے دہشت گردی سے خطرے کی سنگینی اور جغرافیائی توسیع دونوں پہلے کی بہ نسبت زیادہ بڑھ گئی تھی۔ حقیقت میں مغربی بنگال کے وزیر اعلیٰ بدھادیب بھٹا چاریہ سمیت کانگریس اور مارکسوادی پارٹی کے کئی وزراء اعلیٰ نے ذاتی طور پر مجھے مطلع کیا تھا کہ ملک کو آئی ایس آئی کی کارروائیوں سے سختی سے نمٹنے کی ضرورت ہے۔ میرے لیے یہاں اس بات کا ذکر کرنا ضروری ہوگا کہ بھٹا چاریہ اکیلے ایسے کمیونسٹ لیڈر ہیں جن کا نظریہ آئی ایس آئی اسپانسرڈ دہشت گردی اور ان کے نظریات کافی حد تک میرے خیالات سے میل کھاتے تھے۔

نومبر 2000 میں جیوتی باسو کے بعد مغربی بنگال کا وزیر اعلیٰ بننے کے کچھ دن بعد ہی ایک دن وہ میرے آفس میں مجھ سے ملے اور کہا 'آڈوانی جی! میں نے اس بات پر غور کیا ہے کہ جب بھی آپ ہندوستان کے مختلف حصوں میں آئی ایس آئی کی ہندوستان مخالف سرگرمیوں کی بات کرتے ہیں تو آپ مہاراشٹر، گجرات اور دوسری ریاستوں کا ذکر کرتے ہیں، لیکن مغربی بنگال کا کبھی بھی نہیں۔ میری ریاست میں آئی ایس آئی کی موجودگی کے بارے میں آپ خاموش کیوں ہیں؟' ایک کمیونسٹ وزیر اعلیٰ کے ذریعہ یہ سوال پوچھے جانے سے میں حقیقت میں حیرت زدہ رہ گیا تھا۔ میں خاموش رہنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے جواب دیا 'میں خاموش رہنا نہیں چاہتا۔ آئی ایس آئی اور اس کے تعاون سے چل رہی مسلم دہشت گرد تنظیمیں، مغربی بنگال میں کیا کر رہی ہیں، اس بارے میں وزارت داخلہ کے بعد کافی تفصیلات ہیں، لیکن عوامی طور سے میں ان کا ذکر نہیں کرتا، کیونکہ اگر میں ایسا کروں تو آپ اسے مسترد کر دیں گے۔' اس کے بعد بھٹا چاریہ نے زور دے کر کہا 'اسے مسترد کرنے کا کوئی سوال ہی

★ کانگریس پارٹی کے دوہرے معیار کی ایک اور مثال ہے۔ گجرات کی بی جے پی حکومت نے ریاستی اسمبلی میں مکوکا ایکٹ 1999 کی طرز پر، ایکٹ 2003 پاس کروالیا۔ مرکز میں برسراقتدار کانگریس حکومت کے سخت رویے کی وجہ سے گجرات کے اس قانون کو چار سال کے بعد بھی صدر جمہوریہ کی منظوری نہیں مل پائی ہے۔

نہیں ہے۔' اس کے بعد انھوں نے نہایت ہی تفصیل سے مجھے بتایا کہ وہ کس طرح بنگلہ دیش سے متصل مغربی بنگال کی سرحد پر اچانک مدرسوں کا سیلاب آگیا ہے اور کیسے ان میں سے کچھ میں فرقہ واریت اور ملک مخالف عناصر کو فروغ دیا جا رہا ہے۔ انھوں نے کثیر تعداد میں بنگلہ دیش سے مغربی بنگال اور شمال مغرب کی جانب دراندازی پر تشویش کا اظہار کیا اور اس سلسلے میں ہماری حکومت کی پالیسی پر اطمینان کا اظہار کیا۔ حقیقت میں بنگلہ دیشیوں کی دراندازی کے ایشو پر کولکاتہ میں انھوں نے میرے ساتھ ایک پریس کانفرنس سے بھی خطاب کیا۔ ★

پارلیمنٹ میں پوٹا (POTA) پر ہونے والی بحث پر واپس آتے ہوئے میں کہوں گا کہ میں نے حزب اختلاف کو یاد دلایا کہ اقوام متحدہ کے ذریعہ دہشت گردی پر کئی قرارداد، جن میں رکن ممالک سے کہا گیا کہ وہ ان قراردادوں کے مطابق مؤثر قانون بنائیں، پاس کیے جانے کے بعد ایسا قانون بنانا ضروری ہوگیا ہے۔ ہندوستان نے نہ صرف ان قراردادوں پر دستخط کیے ہیں بلکہ دہشت گردی مخالف سخت قدم اٹھانے کے لیے اقوام متحدہ سے درخواست کرنے میں اس نے ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ میں نے کانگریس اور دیگر اپوزیشن لیڈروں سے پوچھا 'دہشت گردی پر سخت کارروائی کرنے کے لیے ہندوستان عالمی برادری سے کیسے کہہ سکتا ہے، اگر وہ اپنے ملک میں ہی ایسا کرنے کے لیے خواہش مند نہیں ہے؟'

حالانکہ پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس میں بل اکثریت سے پاس ہوگیا۔ حکومت پر اپوزیشن پارٹیوں کا حملہ لگاتار جاری رہا۔ وہ اکثر طنزیہ لہجہ میں سوال کرتے 'کیا آپ کے پوٹا نے ہندوستان میں دہشت گردی کی کارروائیوں کو روک دیا ہے؟' یہ حقیقت میں ایک بے تکا سوال تھا۔ دنیا کا کوئی بھی قانون جرائم کو پوری طرح ختم کرنے کی گارنٹی نہیں دے سکتا، لیکن اس جرم کا ہونا، اس قانون کے ہی خلاف کوئی جواز نہیں ہوسکتا۔ میں نے کہا 'قتل اور عصمت دری کے خلاف قوانین رہے ہیں پھر بھی قتل اور عصمت دری جاری ہیں۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم ان قوانین کو ختم کردیں۔ میں نے اس بات پر زور دیا کہ کسی بھی کرمنل قانون کا بنیادی مقصد اور اہلیت سہ رخی ہوتی ہے۔ (الف) اس جرم کے ممکنہ فاعلوں کو اس سے دور رکھنے کا کام کرنا، (ب) قانون کو عمل درآمد کرانے والی اتھارٹیز کے لیے کسی جرم کا پتہ لگانے اور مجرموں کو پکڑنے اور ان پر مقدمہ چلانے کے لیے راہ ہموار کرنا۔ (ج) یہ یقینی بنانا کہ قصوروار افراد کو ایسی سزا ملے کہ وہ دوبارہ جرم کی طرف مائل نہ ہوں۔ چونکہ سرحد پار دہشت گردی کوئی عام جرم نہیں ہے اور اس سے ملک کی سیکورٹی اور اتحاد کو خطرہ لاحق ہے، اس لیے اس کے لیے ہر طرح سے غیر معمولی التزامات کی ضرورت ہے۔ وہ دشمن جو اس طرح کے جرائم کو کرنے میں مدد کرتا ہے اور اکساتا ہے، ہماری برداشت اور صبر کی حد کو آزمانا چاہتا ہے۔ اس لیے ایک طاقتور دہشت گردی مخالف قانون کا نافذ ہونا دہشت گردی کے جرائم کو برداشت نہیں کرنے کی ہماری سنجیدگی اور عزم کے

★ اس سے قبل، جیوتی بسو جو 23 سال تک مغربی بنگال کے وزیر اعلیٰ رہے، کا رویہ بالکل برعکس تھا۔ مثال کے طور پر 1998 میں مہاراشٹر، جہاں اس وقت شیوسینا - بی جے پی کی مخلوط حکومت تھی، نے ریاست میں لاکھوں کی تعداد میں آباد بنگلہ دیشیوں میں سے تقریباً 80 کو مغربی بنگال کی بین الاقوامی سرحد سے واپس بھیجنے کا فیصلہ لیا۔ اس کی یہ کارروائی پوری طرح سے فارنرز ایکٹ کے مطابق ہی تھی۔ لیکن بسو حکومت نے اس کی پرزور مخالفت کی۔ اس نے دعویٰ کیا کہ ان میں سے کچھ غیر مقیم مستند طور سے ہندوستانی تھے اور اس نے مطالبہ کیا کہ اسے اس بات کی پہلے سے اطلاع دی جانی چاہیے، کیونکہ واپس بھیجنے کی کارروائی ان کی زمین سے کی جاتی ہے۔ اس نے یہ پتہ لگانے کے لیے کہ واپس بھیجے جانے کے لیے نشان زد افراد حقیقت میں مغربی بنگال کے تو نہیں ہیں، 30 دن دیے جانے کی درخواست کی۔ اس نے یہ بھی کہا کہ دراندازوں کو بھیجنے کے عمل پر بحث کرنے کے بعد ہی اس پر کارروائی کی جائے۔ کل ملا کر بسو کا سخت رویہ اس بات کو لے کر میری آنکھیں کھول دینے والا تھا کہ فارنرز ایکٹ کے تحت بنگلہ دیشی دراندازوں کو واپس بھیجنا ہندوستان کے لیے کتنا دشوار گزار بلکہ تقریباً ناممکن کام تھا۔

بارے میں ایک پیغام دیتا ہے۔

کوئی بھی حکومت کسی مجرمانہ قانون کوصرف اس لیے ختم نہیں کر دیتی ہے کہ وہ اس جرم کو پوری طرح روکنے میں کامیاب نہیں ہوئی۔ اسی طرح کسی بھی فوج کو اس لیے غیر مسلح نہیں کیا جاسکتا کہ ان اسلحوں کا کوئی غلط استعمال کرسکتا ہے، اس لیے کسی ملک کو اپنی اور اپنے شہریوں کی حفاظت کے لیے ایسے قانون بنانے میں تردد نہیں کرنا چاہیے۔ کسی بھی قانون کے غلط استعمال ہونے کے امکان سے انکار نہیں کیا جاسکتا، حالانکہ کئی مثالیں ہیں جہاں کئی ریاستی حکومتوں نے اپنے سیاسی حریفوں کے خلاف ٹاڈا کا استعمال کیا، اس لیے ہم نے پوٹا میں سیکورٹی کے متعدد پوائنٹ رکھے تھے۔ میں نے اپنے افسران کو حکم دیا تھا کہ وہ ٹاڈا کے غلط استعمال کے بارے میں سپریم کورٹ کے تبصرے اور ہدایات کا ہوشیاری سے مطالعہ کریں اور اس کے بعد پوٹا میں ان کی بابت مناسب سیکورٹی کے پوائنٹ شامل کریں، جو انھوں نے کیا۔ اس وجہ سے ہندوستان کا دہشت گردمخالف قانون 9/11 کے بعد امریکہ اور برطانیہ کے دہشت گردمخالف قوانین سے زیادہ نرم تھا، پھر بھی پوٹا کے غلط استعمال کے معاملے سامنے آئے تو حکومت نے عدالتی جائزہ کا دائرہ بڑھانے کے لیے دسمبر 2003 میں ایک نوٹیفکیشن کے ذریعہ اس میں ترمیم کی۔

یہ انتہائی افسوسناک ہے کہ اس سے بھی کانگریس اور دیگر اپوزیشن پارٹیوں کے ذریعہ پوٹا کی مذمت بند نہیں ہوئی۔ اس کے غلط استعمال کو روکنے کے بارے میں بات چیت کرنے کے بجائے ہمارے اپوزیشن کے دوست دہشت گردی کے خلاف ہندوستان کی لڑائی کو کمزور کرنا چاہتے تھے۔ یہ حقیقت میں ایک المیہ تھا۔

میں کانگریس پارٹی کے پوٹا کو ووٹ بینک کے چشمے سے دیکھنے کی ذہنیت کی وجہ سے کافی غمزدہ تھا۔ اپنی اتحادی پارٹیوں کے ساتھ مل کر اس نے پوٹا کو 'مسلم مخالف' قرار دینے کے لیے ایک زبردست مہم چھیڑی، لیکن میرا غم اس وقت سوا ہوگیا جب ستمبر 2004 میں کانگریس والی یو پی اے حکومت نے نہ صرف پوٹا کو رد کردیا بلکہ ہندوستان کو اس کی دہشت گردمخالف مہم میں باقاعدہ غیر مسلح کرنے کے اس غیر ذمہ دارانہ فعل کو ایک عظیم حصولیابی کی شکل میں پیش کیا۔ میں تمام قوم پرست ہندوستانیوں سے درخواست کروں گا کہ وہ ہندوستان کی سلامتی کے بارے میں ایسی ناعاقبت اندیش اور بغیر غور وخوض والی پالیسیوں کے بارے میں غور کریں جس کی وجہ سے ہندوستان دہشت گردانہ سرگرمیوں کے لیے 'نرم ملک' بن گیا ہے۔

پوٹا کے رد ہونے کے بعد آج ہندوستان کے پاس ایسا کوئی قانون نہیں ہے جو دیگر باتوں کے علاوہ، دہشت گردانہ سرگرمیوں کے مالی تعاون اور دیگر سہولیات مہیا کرانے والے لوگوں کا بہتر طریقے سے پتہ لگا سکے۔ اگر امریکہ اور مغرب کے دیگر جمہوری ممالک دہشت گردوں اور دہشت گردی کے مددگار اشخاص تک پہنچنے والے دھن دولت کو اپنے ملک میں روک پائے ہیں تو اس لیے کہ ان کے نئے دہشت گردمخالف قانون ان کی حکومتوں کو یہ طاقت دیتے ہیں کہ وہ اپنے ملکوں کے بینکنگ نظام میں آنے اور اس سے جانے والے ہر ایک ڈالر پر نظر رکھ سکتے ہیں۔ اس کے برعکس ملک مخالف عناصر کے لیے ہندوستان ایک محفوظ پناہ گاہ بن چکا ہے۔ ایک ایسی پناہ گاہ جہاں بے نام اثاثہ، غیر قانونی دراندازی، جعلی پاسپورٹ، سیکورٹی ایجنسیوں میں بدعنوانی، نہ ختم ہونے والی عدالتی کاروائیاں اور ان سے بھی بڑی غلطیاں بڑے پیمانے پر موجود ہیں۔ آنے والی نسلوں کے لیے ہندوستان کو محفوظ بنانے کا راستہ یقینی طور سے بہتر نہیں ہے۔

دہشت گردی کے خلاف انتظامی طاقت کا استعمال

دہشت گردی کے خلاف انتظامی کاروائی میں واجپئی حکومت نے متعدد کام کیے۔ ہندوستان اور بیرون ممالک میں سرگرم القاعدہ،

لشکر طیبہ، جیش محمد، حرکت المجاہدین، حزب المجاہدین، حرکت الانصار، ببر خالصہ انٹرنیشنل، خالصتان کمانڈو فورس، انٹرنیشنل سکھ یوتھ فیڈریشن، اسٹوڈنٹس اسلامک موومنٹ آف انڈیا (سیمی)، الامہ وغیرہ جیسی تقریباً 30 اہم دہشت گرد تنظیموں پر پوٹا کے تحت پابندی عائد کردی گئی۔ اس قدم نے ہندوستان کے لیے یہ ممکن بنادیا کہ امریکہ، برطانیہ، یورو پی فیڈریشن وغیرہ سے انہیں دہشت گرد تنظیم ثابت کرنے کے لیے ان سے درخواست کرے۔

ان کارروائیوں میں سرگرم افسران کو میری ہدایت نہایت ہی واضح تھی 'آپ اپنا کام بے خوف اور غیر جانب دارانہ ڈھنگ سے کریں'۔ انھیں زیادتیوں اور حقوق انسانی کی خلاف ورزی کے تئیں ہوشیار رہنے کا مشورہ دیتے ہوئے بھی میں نے انہیں اطمینان دلایا اور یہ یاددہانی پوری طرح سے کرائی کہ اپنے فرائض کی ایماندارانہ ادائیگی میں اگر انہیں کوئی حوصلہ مند قدم اٹھانا پڑا تو اس کی ذمہ داری لینے میں میں ان کے ساتھ رہوں گا۔ ان کا حوصلہ بڑھانے اور انھیں متحرک کرنے، جوان لوگوں کے لیے بڑا اہم ہے، جو مادر وطن کی حفاظت کے لیے اپنی جان خطرے میں ڈالتے ہیں، میں ان کی مدد کی۔ ان ایجنسیوں کے چلانے میں کچھ اور مشکلات بھی در پیش تھیں۔ ذات، مذہب، علاقہ، رابطہ اور رشوت خوری، جو ان کی تقرریوں اور تبادلوں کو متاثر کرتی تھیں۔ یہ دکھ کی بات ہے کہ ہندوستان میں سرکاری نظام کے تقریباً سبھی شعبوں میں اس طرح کی مشکلات وسیع پیمانہ پر موجود تھیں اور اب بھی ہیں۔ مجھے اس سچائی پر فخر ہے کہ میری وزارت میں تقرری یا ترقی کا ہر ایک معاملہ جو میرے زیر غور آیا صرف اہلیت وصلاحیت کی بنیاد پر نمٹایا گیا۔

فوج کا استعمال لازمی طور سے سرحد پار سے دراندازی کو روکنے، انفارمیشن نظام اور فوجی سامانوں کی سپلائی کا معاملہ درہم برہم ہونے پر مدد کرنے اور دہشت گردوں کے ٹھکانوں پر ایسے سرجیکل آپریشن کرنے جن میں زیادہ فائر پاور کی ضرورت ہو، کیا گیا۔ ان سب اصلاحات کے نتیجے میں صرف جموں وکشمیر میں ہی 1999 اور 2003 کے درمیان 7100 دہشت گرد، جن میں 45% سے زیادہ غیر ملکی تھے، مار گرائے گئے۔ 2001 میں ہی 2100 سے زائد دہشت گرد مارے گئے جو ریاست میں دہشت گردی شروع ہونے سے اب تک کی سب سے بڑی دہشت گردوں کی صفائی مہم تھی، بلکہ دنیا بھر میں کہیں بھی دہشت گردوں سے لڑائی کا بے مثال ریکارڈ۔ اس سے بھی زیادہ اہم یہ تھا کہ اس مہم نے دہشت گردوں کے حوصلے توڑ دیئے۔ ان کے ڈھانچے کو تہس نہس کردیا اور دہشت گرد گروپوں کو ان کی قیادت سے محروم کردیا۔ پاک تربیت یافتہ لڑاکوؤں کی دراندازی میں زبردست کمی آئی۔ 1997 میں جموں وکشمیر حکومت نے 2600 دراندازوں کی رپورٹ دی تھی۔ این ڈی اے حکومت کے مدت کار کے آخری مکمل سال 04-2003 میں یہ تعداد 383 رہ گئی۔

اب سرحد پار دہشت گردی کے خلاف ہندوستان کی لڑائی کے بارے میں غیر ملکی حکومتوں کو حساس بنانے کے لئے این ڈی اے حکومت کی کوششوں کی تفصیلات میں بیان کروں گا۔ یہ کوشش پاکستان اور اس کی سرپرستی میں سرگرم دہشت گرد گروپوں کو الگ تھلگ کرنے کی این ڈی اے حکومت کی پیش رفت اور جارح سفارت کاری کی وسیع پالیسی کا ہی ایک حصہ تھے۔

7

پاکستان کی پراکسی جنگ

ہندوستان نے کیسے امریکہ اور دنیا کو اپنے ساتھ لیا

تمام ممالک کو دہشت گردانہ کاروائیوں میں ملوث کسی بھی شخص یا اکائی کو
بالواسطہ یا بلاواسطہ کسی بھی شکل میں حمایت دینے سے بچنا چاہیے،
ان لوگوں کو محفوظ پناہ دینے سے انکار کرنا چاہیے، جو دہشت گردی کی
کاروائی کرتے ہیں یا منصوبہ، حمایت یا مالی مدد مہیا کرتے ہیں یا انھیں تحفظ
دیتے ہیں،
ان لوگوں کو روکنا چاہیے جو دوسرے ممالک یا ان کے شہریوں کے خلاف اپنی
زمین کا غلط استعمال کرکے دہشت گردانہ کاروائی کرتے ہیں، انھیں دولت مہیا
کراتے ہیں یا سہولت دیتے ہیں۔

— اقوام متحدہ سیکورٹی کونسل، قرارداد - 1373 (2001)

ہندوستان کے وزیر داخلہ کے طور پر اپنی مدت کار کے دوران میں نے جو اہم باتیں سیکھیں ان میں سے ایک تھی کہ دہشت گردی سے لڑنا حقیقت میں 'جنگ' جیسا کہ وہ عموماً سمجھی جاتی ہے— کرنے سے بہت مختلف ہے۔ اسے کئی سطحوں پر، نئے موروچوں پر مختلف ہتھیاروں سے لڑنا پڑتا ہے اور لوگوں کو ان حقائق کے بارے میں اطلاع کا مطالبہ دیا جانا چاہیے کہ اس کے ہدف— کیونکہ ہر ایک جنگ کا ایک واضح ہدف ہونا ہی چاہیے— کا حاصل دیر تک چلنے والی کوششوں کی مانگ کرتی ہے۔ کسی بھیانک دہشت گردانہ حملہ کے بعد عوامی جذبات کا بھڑکنا فطری ہے اور پارلیمنٹ پر کیا گیا حملہ یقینی طور سے جنگ جیسی ہی ایک دہشت گردانہ کاروائی تھی، جو ہندوستان نے برداشت کی ہے۔ میری پارٹی کے لوگوں

سمیت ملک میں ایسے افراد کی کمی نہیں تھی جو 'پاکستان کو سبق سکھانے' کے موڈ میں تھے۔

لیکن مستحکم اور طاقت ور ملکوں کا یہ کام نہیں ہوتا کہ وہ اکسانے والے عمل کا جواب ان سے پیدا ہونے والے اشتعال اور نفرت کا جواب دیں۔ قیادت کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ حالات کا ہوشیاری سے اور اس کا مکمل طور سے جائزہ لے اور ایسی کارروائی کرنے کا فیصلہ کرے جو مستحکم بھی ہو اور مناسب بھی۔ 13 دسمبر 2001 کو پارلیمنٹ پر ہونے والے دہشت گردانہ حملہ کے بعد وزیر اعظم اٹل بہاری واجپئی نے یہی کیا۔ سیکورٹی پر وزارت کمیٹی کی غیر سرکاری میٹنگوں اور سینئر معاونین اور افواج کے سربراہ سے غیر رسمی بحث کے ذریعہ انھوں نے ان کی رائے معلوم کی، جو انھیں بغیر ہچکچاہٹ کے وسیع القلبی سے دی گئی۔ کسی بھی فوجی کارروائی کا فیصلہ لینے کے لیے اس کے اوقات کا تعین کرنا، سیاسی مقاصد، کارروائی کے اہداف، حملہ کی تیاری اور دیگر عوامل جن میں اہم ہیں — سنگھرش بڑھنے کے امکانات — کی باریکی سے تفتیش کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اٹل جی نے ہندوستان کے پاس دستیاب غیر فوجی وسائل پر بھی مکمل دھیان دیا۔ وزیر اعظم نے یہ صحیح فیصلہ لیا کہ ہندوستان نے پارلیمنٹ پر ہوئے حملہ کا جواب فوجی تیاریوں، پاکستانی حمایت یافتہ دہشت گردوں کو الگ تھلگ کرنے کے لیے جموں و کشمیر میں سیاسی پہل اور دنیا کے تمام ممالک کی راجدھانیوں میں تیز رفتار سفارت کاری — ان سب کو ملا کر دیا جانا چاہیے۔

اس پالیسی کے فوجی حصہ 'آپریشن پراکرم' کے تحت ہند - پاک سرحد پر فوج تعینات کی جاتی تھی۔ یہ ملک کی دور امن تاریخ میں اب تک کی سب سے بڑی تعیناتی تھی۔ اس کا مقصد پاکستان کو انتباہ دینا اور عالمی برادری کو یہ بتانا تھا کہ اگر اسلام آباد ہندوستان کے خلاف دہشت گردانہ کارروائیوں کو اپنی ملکی پالیسی بنائے رکھتا ہے تو ہندوستان اپنے فوجی متبادل کا استعمال کرنے کے لیے تیار ہے۔ اس کا پیغام بالکل واضح تھا — جس طرح اسلام آباد نے کارگل علاقہ سے لائن آف کنٹرول کی خلاف ورزی کرنے کی ناکام کوشش کی تھی، اسی طرح اس کے ذریعہ چلائی جارہی دہشت گردی کی کارروائی بھی ناکام ہو جائے گی۔

جنوری 2002 میں میرا پہلا دورۂ امریکہ

اس پیغام کو مزید مستحکم بنانے کے لیے حکومت نے کئی سفارت کاری کے قدم اٹھائے، ان میں سے ایک تھا جنوری 2002 میں میرا امریکہ دورہ۔ اس سفر کے تین مقاصد تھے — دہشت گردی کے خلاف جاری امریکہ کی لڑائی میں وہاں کی حکومت اور عوام کے ساتھ اتحاد کا مظاہرہ کرنا، اسی وسیلہ سے نکلے اس دیو سے ہندوستان کی لڑائی میں ان کی سمجھ اور تعاون کے لیے شکریہ ادا کرنا، 11 ستمبر اور 13 دسمبر کے واقعات سے پیدا ہونے والے حالات سے نمٹنے کے لیے دہشت گردی کا مقابلہ فوری اور فیصلہ کن طور سے کرنے کے ہمارے عزم کو عملی جامہ پہنانے کے طریقوں پر بات چیت کرنا۔

میں نیویارک میں 9/11 کے میموریل 'گراؤنڈ زیرو' گیا اور میں نے انسانیت کی تاریخ کے سب سے بھیانک دہشت گردانہ حملہ کے خلاف امریکیوں کے عزم کی ستائش کی۔ 9 جنوری کو واشنگٹن میں ایک کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے میں نے ہندوستان اور امریکہ کو 'جمہوریت کے دوستون (ٹوئن ٹاور آف ڈیموکریسی) بتایا۔ یہ بتاتے ہوئے کہ دونوں ممالک دہشت گردی کے شکار رہے ہیں، میں نے کہا 'اس یکساں خطرے نے ہمارے درمیان ایک مضبوط اور طویل المیعاد ساجھیداری کی ضرورت کو ثابت کیا ہے، پھر بھی یہ جاننا ضروری ہے کہ عالمی دہشت گردی نے ہندوستان اور امریکہ کو اپنا خاص نشانہ کیوں بنایا ہے؟ میرے خیال سے ایسا اس لیے ہے کہ ہم دونوں ممالک جن باتوں کو

نہایت ہی خوبصورت اور فخریہ مانتے ہیں ان ہی سے دہشت گرد نفرت کرتے ہیں اور انھیں اپنی حکمت عملی کے اہداف کے حصول میں رخنہ مانتے ہیں۔ ہم دونوں کثیر الجہتی اور سیکولرزم جن کی بنیاد میں سبھی مذاہب کے تئیں عزت و وقار کے جذبات ہیں، میں یقین رکھتے ہیں۔ ہم دونوں ہی کھلے سماج ہیں، جہاں پولس، عدلیہ اور صنعت کی آزادی کو آئینی تحفظ حاصل ہے۔ دہشت گردوں نے خواہ اسٹیل اور سیمنٹ سے بنے ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے ڈھانچوں کو منہدم کردیا ہو لیکن وہ ہمارے جمہوری جذبات اور ڈھانچوں کو نقصان نہیں پہنچا سکتے۔'

اس سفر کی ایک خاص بات آئندہ روز واشنگٹن ڈی سی میں جارج ڈبلیو بش سے میری 30 منٹ کی ملاقات تھی۔ بش نے گرم جوشی سے مجھ سے مصافحہ کیا اور بولے 'میں نے سنا ہے کہ آپ حکومت ہند میں ایک طاقتور شخص ہیں۔ آپ سے پہلے ہی آپ کی تعریف واشنگٹن ڈی سی پہنچ چکی تھی۔' میں نے ہند-امریکہ اور بقیہ عالم کے لیے ایک بڑا خطرہ بنے پاکستان حمایت یافتہ مذہبی بنیاد پر دہشت گردی کے بارے میں انھیں اتنے مثبت انداز میں بتایا جتنا کسی دوسرے غیر ملکی لیڈر کو نہیں بتایا تھا۔ 9/11 کا واقعہ ایک بھیانک شکل میں اس کا مظاہرہ پہلے کر چکا تھا۔ میں نے انھیں ان خطرناک نتائج کے بارے میں بتایا جو 13/12 کی سازش کامیاب ہوجانے کی حالت میں پیدا ہوتے۔ میں نے اس بات پر زور دیا کہ دہشت گردی کا مقابلہ کرنے میں امریکہ 'دوہرا معیار' نہ اپنائے۔ میں نے بتایا کہ امریکہ کے سینئر افسران کے ساتھ ہونے والی بات چیت میں ہندوستانی موقف کے ذریعہ سرحدی دہشت گردی میں پاکستان کے ملوث ہونے کا مکمل ثبوت دیا جاچکا ہے۔

صدر بش نے یقین دہانی کرائی کہ اُن کی انتظامیہ پاکستان سے یہ امید رکھتی ہے کہ وہ دہشت گردی کو ملک کی پالیسی کا حصہ نہ بنائے۔ انھوں نے کہا کہ وہ جنرل مشرف سے امید رکھتے ہیں کہ وہ دہشت گردی کے مسئلہ سے نمٹنے کے لیے 'سبھی ضروری اقدام اٹھائیں گے۔ مشرف طالبان کے معاملہ میں ایسا کر چکے ہیں اور میں ان سے ہندوستان کے سلسلہ میں ویسا ہی کرنے کی امید کرتا ہوں۔ میں نے ان سے پاکستان میں اور وہاں سے اپنی سرگرمیاں چلانے والے دہشت گردوں کے خلاف مناسب قدم اٹھانے کی درخواست کی ہے۔' انھوں نے کہا ہندوستان اور پاکستان کے درمیان 'تنازعات' کو سفارت کاری اور سیاسی طور پر دور کرنے پر بھی زور دیا ہے۔ میں محسوس کرسکتا تھا کہ واشنگٹن نے 'آپریشن پراکرم' کی اہمیت کو سمجھ لیا ہے۔

امریکہ کے وزیر خارجہ (سکریٹری آف اسٹیٹ) کولن پاویل سے بھی میں نے ان ہی ایشوز پر بات چیت کی تھی۔ انھوں نے بھی اس بات پر زور دیا تھا کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان تنازعات سیاسی اور سفارتی وسائل سے نمٹائے جانے چاہئیں۔ میں نے ان سے اتفاق کیا، لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ ہندوستان کے خلاف دہشت گردی کی مہم چلانے کے لیے امریکہ کو بھی پاکستان کی طرف سے اور زیادہ واضح طور سے سرزنش کرنی چاہیے۔ پاویل نے میری باتوں کا درد سمجھا اور جواب دیا 'امریکہ کسی بھی طرح کی دہشت گردی کے خلاف مہم میں شامل ہے اور انسانی تہذیب کے لیے خطرہ بن چکی اس لعنت کو کرۂ ارض سے مٹانے کے لیے اپنے سبھی دوستوں کے ساتھ کام کرے گا، کیونکہ اب یہ قابل قبول نہیں ہے کہ اکیسویں صدی میں ملکوں کو اس خوف کے سائے میں رہنا پڑے۔'

مختلف امریکی افسران — جن میں امریکی اٹارنی جنرل جان ایش کرافٹ بھی تھے — کے ساتھ اپنی ملاقاتوں میں میں نے عالمی دہشت گردی کو فروغ دینے میں پاکستان کے بنیادی اور اب تک جاری رول پر ان کی توجہ مرتکز کی۔ میں نے انھیں طالبان کی مثال دی، جسے ہندوستان کے خلاف اپنی پراکسی لڑائی میں پاکستان کے سرکاری ڈھانچہ نے کھڑا کیا اور ہر ممکن مدد کی۔ گزشتہ دو دہائیوں میں آئی ایس آئی کے ذریعہ تیار اور ہدایت یافتہ دہشت گردانہ کاروائیوں میں پنجاب، جموں و کشمیر اور ہندوستان کے دوسرے حصوں میں ہمارے 60 ہزار بے قصور

شہری اور سیکورٹی اہلکار مارے جا چکے ہیں۔ میں نے انھیں کہا کہ اسی لیے جب پاکستان نے طالبان کے متعلق اپنی پالیسی میں اچانک ایک یوٹرن لے لیا اور افغانستان میں دہشت گردی کے خلاف امریکی قیادت میں چل رہی لڑائی میں شامل ہونے کا فیصلہ لیا تو ہندوستانی حیرت زدہ رہ گئے۔

'ہم یہ نہیں سمجھ پائے کہ کیسے پاکستان مغرب میں دہشت گرد مخالف ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہے، جبکہ اس کو وہ ماضی میں تحفظ دیتا رہا ہے۔'

میرے امریکی دورہ سے ایک ہفتہ قبل کاٹھمنڈو میں ہونے والے سارک سربراہ کانفرنس میں پاکستان کے صدر نے ایک بار پھر دعویٰ کیا تھا کہ جموں وکشمیر میں دہشت گردی کی سرگرمیاں ایک جائز 'آزادی کی لڑائی' کا حصہ ہیں، جسے ان کی حکومت کا تعاون ملتا رہے گا۔ اپنی کانفرنس میں اس کا حوالہ دیتے ہوئے میں نے کہا 'میں چاہوں گا کہ امریکہ اور دنیا کے دوسرے حصوں میں رہنے والے ہمارے دوست اس بات پر غور کریں— ''یہ کس طرح کے مجاہد آزادی ہیں جو ممبئی میں سیریل بم دھماکے کرتے ہیں، ایک مسافر بردار طیارہ کو ہائی جیک کر کے اسے اور کہیں نہیں طالبان کے زیر کنٹرول قندھار لے جاتے ہیں، آئے دن بے قصور شہریوں کا اجتماعی قتل عام کرتے ہیں، جموں وکشمیر کے اسمبلی ہاؤس پر دہشت گردانہ حملہ کرتے ہیں اور دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت، ہندوستان کے قلب یعنی اس کی پارلیمنٹ پر حملہ کرتے ہیں۔'' ہم صدر بش کی اس بات سے پوری طرح اتفاق کرتے ہیں کہ ''یہ نہیں ہوسکتا کہ کچھ دہشت گرد اچھے ہوں اور کچھ برے۔'' یہ صاف ہے کہ صدر مشرف ایسا نہیں سوچتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ دنیا اس بات پر یقین کرے کہ کشمیر پر پاکستان کے موقف کو مضبوط کرنے کے لیے 'اچھے دہشت گرد کام کر رہے ہیں۔'

پاکستان کے ساتھ متصل ہماری سرحد پر ہندوستانی افواج کی تعیناتی پر امریکیوں اور دنیا کے دوسرے لوگوں کی تشویش کو دھیان میں رکھتے ہوئے میں نے کہا 'صبر وتحمل کے معاملہ میں ہندوستان کبھی بھی پیچھے نہیں رہا ہے۔ پاکستان کے ذریعہ شروع کی گئی ایک طویل پراکسی لڑائی، جس میں زیادہ مشتعل کرنے والے کام کیے گئے، کے دوران ہم نے انتہائی تحمل سے کام لیا۔ گزشتہ تین برسوں میں ہندوستان نے پاکستان کے ساتھ امن بنائے رکھنے کے لیے ایمانداری سے حوصلہ مندانہ کوششیں کیں۔ ہر بار پاکستان نے اس کا جواب اعتماد شکنی سے دیا۔ جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے، 13 ردسمبر اب تک کی سب سے سنگین اور اشتعال آمیز کارروائی ہے۔ وزیر اعظم واجپئی کے منہ سے ایک ارب ہندوستانیوں کے دل کی آواز نکلی، جب انھوں نے کہا کہ اس نے ہماری برداشت کی ساری حدیں پار کر لی ہیں۔ اب ہم کوئی اور اعتماد شکنی برداشت نہیں کریں گے۔ پاکستان کو جلد اور ایمانداری کے ساتھ فیصلہ کن اور ضروری ومناسب قدم اٹھانے ہوں گے۔'

میں نے کہا کہ 'پاکستان کی سچائی کی کسوٹی یہ ہوگی کہ وہ ہندوستان کے مندرجہ ذیل مطالبات، جو میں نے ان سے اپنی متعدد ملاقات کے دوران ہوئی سرکاری گفت وشنید کے دوران رکھے تھے، پر مثبت ردّعمل ظاہر کرے۔

1. ان 20 دہشت گردوں کو ہندوستان کے حوالے کرے جن کے نام اور ہندوستان کے خلاف ان کے جرائم کے ثبوت ہم نے پاکستانی حکومت کو دے دیے ہیں۔ ان دہشت گردوں میں سے کئی ہندوستان کے شہری ہیں جنہیں پاکستان میں تحفظ ملا ہوا ہے۔ ★

★ یہاں ان 20 موسٹ وانٹیڈ دہشت گردوں کی فہرست دی جارہی ہے جن کی حوالگی کے لیے ہندوستان نے مطالبہ کیا تھا: (1) کراچی میں رہنے والا مافیا ڈان داؤد ابراہیم— مارچ 1993 میں ممبئی میں ہونے والے سیریل بم دھماکوں، جن میں 257 لوگ مارے گئے تھے، کے پیچھے اسی کا دماغ تھا۔ (2) جیش محمد کا مولانا اظہر مسعود— جو ہندوستان کی پارلیمنٹ پر ہونے والے حملے میں کلیدی ملزم کے طور پر نامزد ہے۔ یکم اکتوبر 2001 کو جموں وکشمیر اسمبلی ہاؤس پر ہونے والے حملے، جس میں 37 افراد مارے گئے تھے، کا بھی ملزم ہے۔ (3) لشکر طیبہ کا سرپرست حافظ محمد سعید بھی.................. (جاری)

2. پاکستان کی زمین اور اس کے زیر کنٹرول دوسرے علاقوں میں دہشت گردوں کو دی جارہی سہولیات، ٹریننگ مراکز، اسلحوں کی سپلائی، مالی تعاون اور ہر طرح کی مدد بند کی جائے۔
3. جموں وکشمیر اور ہندوستان کے دوسرے حصوں میں ہتھیاروں اور لڑاکوؤں کی دراندازی روکی جائے۔
4. واضح اور غیر مشتبہ طور سے دہشت گردی (اس کا مبینہ مقصد کچھ بھی ہو) کو اس کے سبھی اشکال میں اور جہاں بھی وہ موجود ہوں، ختم کیا جائے۔

داؤد ابراہیم کی حوالگی سے انکار پر میری مایوسی

اس پس منظر میں میں اپنی مدت کار کے دوران ہونے والی گہری مایوسی میں سے ایک کا ذکر کروں گا۔ افسر شاہی کی جانب سے تعاون نہ ملنے کی وجہ سے، جسے میں آج تک پوری طرح نہیں سمجھ پارہا ہوں، پاکستان کی حمایت یافتہ دہشت گردی کے خلاف جاری لڑائی میں ایک بڑی کامیابی سے محروم رہ گیا تھا۔

ان ہندوستانی افسرانٰ نے، جو امریکہ کے دورہ میں میرے ساتھ تھے مکمل اور یقینی شواہد کے ساتھ پاکستان میں واقع 20 'موسٹ وانٹیڈ' دہشت گردوں کی فہرست امریکی افسران کو سونپ دی تھی۔ فہرست میں سب سے اوپر مافیا ڈان داؤد ابراہیم کا نام تھا، جس نے 12 رمارچ 1993 کو ممبئی میں 13 سیریل بم دھماکوں، جن میں 257 رافراد مارے گئے تھے، کی اسکیم بنائی اور اس کے لیے رقم مہیا کرائی تھی۔ 'ڈی کمپنی' کے نام سے مشہور منظم مجرموں کے ایک سنڈیکیٹ کے سربراہ داؤد نے قتل، اسلحہ کی سپلائی، اسمگلنگ، جعل سازی اور منشیات کی تجارت جیسے جرائم میں گرفتاری سے بچنے کے لیے اپنی بنیاد دبئی منتقل کرلی تھی۔ 1993 کے ممبئی بم دھماکوں کے بعد اسے کراچی میں پناہ دی گئی، جہاں پاکستانی افسران نے اس بھیانک دہشت گردانہ کاروائی میں شامل کئی دیگر افراد کو چھپا رکھا تھا، متعدد تحقیقی رپورٹوں جن میں سے کئی پاکستان میں ہی شائع ہوئی ہیں، مشرف ★ اور پاکستانی سرکاری انتظامیہ میں بیٹھے کئی لوگوں کے اس دعویٰ کو جھٹلادیا کہ داؤد کراچی میں نہیں رہتا۔

حقیقت میں اکتوبر 2003 میں امریکہ نے داؤد ابراہیم، جس کے القاعدہ سے تعلقات تھے اور جو لشکر طیبہ اور دیگر دہشت گرد تنظیموں کے لیے مالی امداد دینے میں شامل تھا، کو ایک 'عالمی دہشت گرد' ہونے کا اعلان کیا تھا۔ امریکہ میں اس کی سارے املاک کو فریز کردیا گیا تھا۔

(گزشتہ سے پیوستہ) نئی دہلی میں واقع پارلیمنٹ ہاؤس پر حملہ کا ایک ملزم ہے۔ (4) کراچی میں ہی رہنے والا داؤد ابراہیم کا دست راست چھوٹا شکیل — قتل، لوٹ مار، اغوا، تاجروں اور فلمی ستاروں کو بلیک میل کرنے وغیرہ جرائم کے لیے اس کی تلاش ہے۔ (5) ممبئی کے سیریل بم دھماکوں کی سازش رچنے کا قصوروار 'ٹائیگر' ابراہیم میمن۔ یہ پاکستان کے ذریعہ اسمگلنگ کرکے 300 کلوگرام سے بھی زیادہ آر ڈی ایکس لایا تھا۔ یہ بھی داؤد ابراہیم کا ساتھی ہے اور کراچی میں رہتا ہے۔ (6) مولانا اظہر مسعود کا ایک ساتھی ابراہیم اطہر — وہ 1999 میں کاٹھمنڈو سے دہلی جارہے انڈین ایئر لائنس کے مسافر بردار طیارہ آئی سی-814، کو ہائی جیک کرنے والوں میں ایک تھا۔ جیش محمد کا ممبر ہے اور بہاولپور میں رہتا ہے۔ (7) ببر خالصہ انٹرنیشنل کا سربراہ بدھاون سنگھ ببر، جس کی پنجاب کے سابق وزیر اعلیٰ بے انت سنگھ سمیت درجنوں ہلاکتوں اور غداری کے معاملوں میں تلاش ہے۔ وہ لاہور میں رہتا ہے۔ (8) خالصتان کمانڈو فورس کا لیڈر پرمجیت سنگھ پنجوار، جس کی 1986 میں جنرل اے۔ایس۔ویدیہ کے قتل سمیت ایک درجن سے بھی زائد معاملوں میں تلاش ہے۔ وہ لاہور میں رہتا ہے۔

★ پاکستان کے صدر سے میری بات چیت کے دوران داؤد ابراہیم معاملہ میں مشرف نے سفید جھوٹ بولا۔ دیکھیں صفحہ 566

امریکہ کے محکمہ مالیات کے ذریعہ جاری ایک بیان میں کہا گیا تھا— 'ہم نے عالمی برادری سے اس کالے دھن کو روکنے کی درخواست کی ہے جو ہلاکتیں کرواتی ہے۔ ابراہیم سنڈیکیٹ کے لیے دہشت گردی کی تجارت ان کے پھیلے ہوئے مجرمانہ چال کا ہی ایک حصہ ہے، جسے منہدم کیا ہی جانا چاہیے۔' اس میں اتنا ہی نہیں کہا گیا تھا کہ داؤد کراچی میں تھا بلکہ اس بات کی بھی تصدیق کی گئی تھی کہ اس کے پاس انفرادی طور پر ایک پاکستانی پاسپورٹ بھی تھا، جس کا نمبر 869537G ہے، ٹریژری محکمہ کی جانب سے جاری ایک خط میں کہا گیا کہ 1990 کی دہائی میں طالبان کے تحفظ میں داؤد نے افغانستان کا دورہ کیا اور ساتھ ہی یہ اہم بات جوڑی کہ 'اس کے سنڈیکیٹ نے فساد بھڑکانے اور دہشت گردی کی کاروائی کرنے کے لیے حکومت ہند کو غیر مستحکم کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے، وہ گجرات میں حملہ کروانے کے لیے لشکر طیبہ کو مالی امداد فراہم کراتا رہا ہے۔' اس لیے اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں کہ اسے 'کراچی کا اسامہ' کہا گیا جسے آئی ایس آئی نے پناہ دی ہوئی تھی۔ اس سے یہ واضح ہو جانا چاہیے کہ داؤد اور پاکستان حامی دیگر دہشت گردوں کی حوالگی اور ہندوستان میں ان پر قانونی کاروائی کے لیے میں کیوں اتنا زور دے رہا تھا۔

جب خبر آئی کہ امریکی حکومت نے داؤد کو ایک 'عالمی دہشت گرد' قرار دیا ہے تو فطری طور پر میں بہت خوش ہوا تھا، میں نے اُسے ایک 'بڑا واقعہ' بتایا اور مزید یہ بھی کہ 'ہندوستان کی بات صحیح ثابت ہوئی۔' خوش قسمتی سے انٹرپول کے ذریعہ منعقد 'بھگوڑے دہشت گردوں پر ایک بین الاقوامی کانفرنس جو اس وقت نئی دہلی میں ہو رہا تھا، کے افتتاحی خطاب میں میرے ذریعہ ہندوستان کے موسٹ وانٹیڈ دہشت گردوں کو پاکستان کے ذریعہ دیئے جارہے تحفظ کا ایشو اٹھائے جانے کے کچھ گھنٹوں کے اندر ہی یہ خبر آئی۔ اخبار 'دی ہندو' نے لکھا کہ 'امریکہ کے ذریعہ داؤد ابراہیم کو 'عالمی دہشت گرد' قرار دیئے جانے کے فیصلہ کے بعد نائب وزیر اعظم لال کرشن آڈوانی کے پاس مطمئن ہونے کی وجوہات ہیں۔ خفیہ ایجنسی سے جڑے افسر بھی 'موسٹ وانٹیڈ-20' دہشت گردوں کو ہندوستان کے حوالہ کیے جانے کے معاملہ میں مسٹر آڈوانی کی استقامت کی جم کر تعریف کر رہے تھے۔'

بھگوڑے دہشت گردوں پر اس کانفرنس میں میں نے عالمی برادری سے ان ممالک کا بائیکاٹ اور الگ تھلگ کرنے کی اپیل کی، جو ملک کی ایک حکمت عملی کے طور پر دہشت گردی کو فروغ دیتے ہیں۔ ایسے کئی ممالک ہیں جو دہشت گردی کے خلاف ایک عالمی اتحاد کا رکن ہونے کا دکھاوا کرتے ہیں، پھر بھی وہ اپنی زمین سے دہشت گردی کو پنپنے سے روکنے کے لیے کچھ نہیں کرتے۔ ہندوستان کی سرزمین پر دہشت گردانہ کاروائیوں سمیت ہر طرح کی نفرت پھیلانے والے جرم کرنے والے لوگوں کو ہمارے پڑوس اور دیگر ممالک میں ایک محفوظ پناہ گاہ حاصل ہے۔ میں نے کہا کہ 'دہشت گردی، منظم جرائم، عالمی معاشی کرائم اور بین الاقوامی بھگوڑوں سے نصف لڑائی تو مختلف ممالک کے ذریعہ صرف زبانی ہمدردی کا اظہار کرنے کے بجائے اپنی سرزمین پر ان جرائم کو روکنے کے لیے ٹھوس قدم اٹھائے جانے سے ہی جیتی جاسکتی ہے۔

دورۂ امریکہ کے دوران میں نے وزیر خارجہ کولن پاویل اور نیشنل سیکورٹی صلاح کار کونڈالیزا رائس دونوں سے کہا کہ اگر بش انتظامیہ مشرف کو امریکہ میں 9/11 اور دیگر دہشت گردانہ کاروائیوں سے جڑے کئی افراد کو پاکستان سے باہر نکالنے کے لیے مجبور کر سکتا ہے تو ہندوستان اس سے یہ توقع رکھتا ہے کہ وہ داؤد ابراہیم اور دیگر افراد پر مقدمہ چلانے کے لیے انھیں ہندوستان کے حوالے کرنے کے لیے پاکستان پر ویسا ہی دباؤ ڈالے۔ اس سے ہندوستانی عوام کو بھروسہ ہو جائے گا کہ امریکہ جس بات کا اُپدیش دیتا ہے اس پر وہ حقیقت میں عمل بھی کرتا ہے— یعنی وہ کسی بھی صورت میں اور دنیا کے ہر حصہ میں دہشت گردی کے خلاف ہے۔

پاویل سے میری ملاقات کے بعد میڈیا سے بات کرتے ہوئے صحافیوں نے وزیر خارجہ سے دیگر سوالات کے علاوہ دو سوال پوچھے:

سوال: مسٹر سکریٹری، میں سمجھتا ہوں کہ منسٹر (آڈوانی) کے پاس ان 20 دہشت گردوں کی فہرست ہے، جنھیں ہندوستان، پاکستان سے چاہتا ہے، کیونکہ وہ پاکستان میں آباد ہیں۔ ان دہشت گردوں کے بارے میں آپ کا کیا کہنا ہے؟ کیا آپ جنرل مشرف سے پاکستان میں ان دہشت گردوں کو ہندوستان کو سونپنے کے لیے کہیں گے؟

پاویل: جہاں تک اس فہرست کا سوال ہے، میں نے اسے دیکھ لیا ہے اور میں جانتا ہوں کہ صدر مشرف کے پاس بھی وہ فہرست ہے۔ ہم نے اس فہرست پر ان سے گفتگو کی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ وہ اس کی تحقیق کر رہے ہیں اور مجھے امید ہے کہ وہ اس پر مناسب کارروائی کریں گے۔

سوال: امریکہ نے لگاتار یہ کہا ہے کہ وہ صدر مشرف کو دہشت گردی کے خلاف مثبت قدم اٹھاتے ہوئے دیکھتا ہے، لیکن ہندوستان کو ایسا ہوتا ہوا نہیں دکھائی دے رہا ہے اور وہ کہتا ہے کہ انھیں ایسی کوئی ایماندارانہ کوشش نہیں دکھائی دی۔ کیا ہندوستانیوں کے ساتھ آپ کی آج کی میٹنگ میں دونوں کی سمجھ میں زبردست فرق تھا کیا وہ مشرف کو تھوڑا بہت بھی مارکس دیتے ہیں؟

پاویل: میرے خیال میں صدر مشرف نے کچھ قدم اٹھائے ہیں۔ انھوں نے جیش محمد اور لشکر طیبہ کے لیڈروں کو گرفتار کیا ہے، ان کے ٹھکانوں کو بند کیا ہے۔ انھوں نے دہشت گردی کے خلاف بیان دیئے ہیں۔ انھوں نے کئی دہشت گردوں کو بھی گرفتار کیا ہے، لیکن میں سوچتا ہوں کہ ان کے ذریعہ اور بہت کچھ کیے جانے کی گنجائش ہے۔ اس ہفتہ میں، بعد میں دیئے جانے والے خطاب کی جانب ہم تجسس سے دیکھ رہے ہیں، جو کہ میں سوچتا ہوں، ان کے ملک کو ہندوستان کو اور باقی دنیا کو ایک واضح اشارہ دے گا، لیکن صرف تقریر ہی نہیں، ہم یہ بھی دیکھیں گے کہ وہ اور کیا قدم اٹھاتے ہیں۔ میں مانتا ہوں کہ حال کے مہینوں میں انھوں نے کافی کارروائیاں کی ہیں، لیکن جیسا کہ آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔ ہندوستان کے لوگ سوچتے ہیں کہ اور زیادہ کارروائی کی ضرورت ہے۔ ہم دیکھیں گے کہ آنے والے دنوں اور ہفتوں میں کیا ہوتا ہے۔

میں نے پاویل کے جواب کو جوں کا توں دیا ہے، کیونکہ وہ ہندوستان کے مطالبات کے تئیں امریکیوں کی دلچسپی ظاہر کرتے ہیں۔ خاص طور سے 'ٹاپ 20' کی فہرست کے تئیں۔ پاویل کے ساتھ میری ملاقات کو 'ٹائمز آف انڈیا' نے اس طرح پیش کیا تھا:

آڈوانی نے پاویل سے منوایا، پاکستان باتیں نہیں کارروائی کرے

— چدانند راج گھٹہ —

10 رجنوری 2002، واشنگٹن: امریکہ ہندوستان کی اس بات سے متفق ہوگیا ہے کہ پاکستان اور اس کے فوجی حکمراں پرویز مشرف کو دہشت گردی کے خلاف صرف باتیں کرنے سے زیادہ کچھ اور بھی کرنا ہوگا۔ اعلان کیے گئے طریقوں سے آگے جا کر انھیں 'کچھ اضافی کارروائیاں' کرنی ہوگی۔ پاکستان کے لیے 20 دہشت گردوں کی اس فہرست پر بھی مناسب کارروائی کرنا ضروری ہے، جو نئی دہلی نے اسلام آباد کو سونپی ہے۔ امریکہ کے گزشتہ نظریہ جس نے ہندوستان کو پاکستان کی زبانی یقین دہانیوں پر تبصرہ کرنے کے لیے مجبور کر دیا تھا، میں واضح تبدیلی کرتے ہوئے وزیر خارجہ کولن پاویل، ہم پاکستان کو حقیقت میں کارروائی کرتے دیکھنا چاہتے ہیں، کے رخ پر آگئے .... یہ وزیر داخلہ لال کرشن آڈوانی کا مستحکم نظریہ تھا جس میں انھوں نے دہشت گردی سے نمٹنے میں پاکستان کی ایمانداری پر سوال اٹھائے تھے، کے بعد ممکن ہوا۔ ان کے

تبصرہ سے احساس ہوتا تھا کہ واشنگٹن ہندوستان کی اس بات سے بہت حد تک متفق ہے کہ دہشت گردی پر ہندوستان کے تفکرات کو دور کرنے کے لیے پاکستان نے مکمل قدم نہیں اٹھائے ہیں۔ یہ تبصرے تب کیے گئے جب امریکی انتظامی مشنریاں، جس میں پاویل، کچھ ماہرین قانون اور میڈیا کا ایک طبقہ مشرف کی تقاریر کے ڈھول پیٹ رہے تھے، جیسے کہ وہ تقریر دی جا چکی ہوں — اور یہ واضح کرتے تھے کہ اب ہندوستان کی یہ ذمے داری ہے کہ وہ 'پاکستان کے پیچھے ہٹنے' پر ردعمل ظاہر کرے۔ آڈوانی نے امریکی مذاکرات کاروں سے کہا کہ ایسا نہیں ہوا۔ دہشت گردی کے سلسلہ میں پاکستان اب بھی دوہری پالیسی پر عمل پیرا ہے اور حقیقت میں بہت کم کام ہوا ہے۔ ہندوستان کا کبھی بھی سخت رویہ نہیں رہا ہے، بلکہ اس کے برعکس پاکستان کے ذریعہ گزشتہ ایک عشرہ سے جاری پراکسی وار کے باوجود اس نے بہت کم تحمل کا ثبوت دیا ہے۔

وزیر داخلہ کے ذریعہ پاویل کے سامنے رکھے گئے موقف، جسے وہاں موجود افسران نے 'وکیل نما' اور 'سنیک' الفاظ میں ذکر کیا ہے، اس بنیاد پر بھی سوال اٹھائے، جس پر یہ کہا جا رہا تھا کہ پاکستان دہشت گردی کے خلاف مؤثر قدم اٹھا رہا ہے۔ اس کے برعکس اس نے قابل اعتراض بیان جاری کیے تھے اور ہندوستانی پارلیمنٹ پر ہونے والے حملے کو معمولی واقعہ بتایا تھا۔ خاص طور سے آڈوانی نے پارلیمنٹ پر ہونے والے حملے کے فوراً بعد مشرف کے ترجمان خالد قریشی کے اس بیان کی جانب پاویل کی توجہ دلائی کہ خود ہندوستانی خفیہ ایجنسیوں نے یہ حملہ کروایا تھا۔ امریکی افسران کے ساتھ دن بھر چلنے والی بات چیت کے بعد ایک دوسرے پریس کانفرنس میں آڈوانی جو واضح طور سے کسی سمجھوتہ کے موڈ میں نہیں تھے، نے کہا کہ وہ مذاکرات سے مطمئن تھے اور امید تھی کہ واشنگٹن ہندوستان کی پوزیشن کو سمجھے گا۔ پاویل کے تبصرہ کو دیکھتے ہوئے یہ صاف تھا کہ وزیر داخلہ نے ہندوستان کے نظریہ کو ان کے سامنے رکھنے میں مکمل کامیابی حاصل کی تھی۔

واشنگٹن میں پاویل سے میری ملاقات کے 10 دنوں کے اندر ہی وہ 12/13 اور 'آپریشن پراکرم' سے دونوں ممالک کے درمیان پیدا ہونے والی کشیدگی کو دور کرنے کے مقصد سے بش انتظامیہ نے مشرف سے دہشت گردی سے نمٹنے کی باتوں کو حقیقت میں بدلنے، خاص طور سے '20 موسٹ وانٹیڈ' دہشت گردوں کی فہرست پر کوئی ٹھوس کارروائی کرنے کے لیے کہا ہے۔ انھوں نے ہندوستانی مذاکرات کاروں سے کہا کہ پاکستان 'کچھ معمولی شرائط' کے ساتھ مافیا ڈان داؤد ابراہیم کو ہندوستان کے حوالے کر دے گا اور یہ بھی کہ مشرف کو ایسا کرنے کے لیے 'پندرہ سے بیس دنوں کا وقت' اور لگے گا۔ پاویل نے کہا 'ان پر ہندوستان کے خلاف جاری دہشت گردی پر لگام کسنے کے لیے عالمی برادری کا زبردست دباؤ ہے اور انھیں یہ بتا دیا گیا ہے کہ اس بار ہندوستان اپنے فوجی دباؤ کو تب تک کم نہیں کرے گا جب تک اسلام آباد سے اسے کوئی ٹھوس قدم اٹھاتے نہیں دکھائی دیتا۔

داؤد کی حوالگی سے جڑی شرائط کے بارے میں ہمیں پتہ چلا کہ (الف) داؤد کی گواہی صرف ممبئی بم دھماکوں کے معاملہ میں استعمال کی جائے گی اور کسی معاملہ میں نہیں اور (ب) ہندوستانی حکومت کے ذریعہ داؤد کا استعمال عالمی برادری میں پاکستان کو بدنام کرنے کے لیے نہیں کیا جائے گا۔ اس بات کی تصدیق تب ہوئی جب خفیہ ایجنسی آئندہ ہفتہ فیڈرل بیورو آف انوسٹی گیشن (ایف بی آئی) کے سربراہ رابرٹ میولر ہندوستان آئے اور انھوں نے داخلہ سکریٹری کمل پانڈے، انٹیلیجنس بیورو کے ڈائریکٹر کے پی سنگھ اور سی بی آئی کے سربراہ پی سی شرما سے بات چیت کی۔

داؤد ابراہیم کو واپس لانے کے ان مسلسل اور مستحکم کوششوں کے باوجود میری راہ میں رخنے پڑنے شروع ہو گئے۔ اس وقت وہ سب یاد کرنا کوئی خوشگوار احساس نہیں ہے۔ جب پاویل ہندوستان آئے تو مجھے یہ جان کر کافی دکھ ہوا اور حیرت بھی ہوئی کہ ان سے ملنے والے

ہندوستانی افسران میں، میں نہیں تھا۔ اس سلسلے میں وزیراعظم آفس کی وضاحت تھی کہ چونکہ میں امریکی وزیر خارجہ سے صرف 10 دن قبل واشنگٹن میں مل چکا تھا، مجھے دوبارہ ان سے ملنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس سے میں حیرت میں پڑ گیا۔ پاویل سے ملنے میں میری دلچسپی خاص طور سے یہ پتہ لگانے میں تھی کہ داؤد ابراہیم اور پاکستان کو بھیجی گئی فہرست میں شامل دیگر افراد کی حوالگی کے ہندوستانی مطالبہ پر بش انتظامیہ نے آگے کیا کارروائی کی تھی۔

آنے والے دنوں میں داؤد ابراہیم سے متعلق ہندوستان کے مطالبہ پر پاکستان کی جانب سے کوئی کارروائی نہیں ہوئی، صرف آنکھ مچولی ہوتی رہی۔ ہندوستان آنے والے امریکیوں سے بات چیت میں حیرت انگیز طور سے، مجھے عدم دلچسپی دکھائی دی۔ 'ہمارے پاس اس ایشو پر پاکستان کو مجبور کرنے کی طاقت نہیں ہے۔' انھوں نے کہنا شروع کیا۔ اس کا احتجاج کرتے ہوئے ایک بار میں نے امریکی ڈپٹی وزیر خارجہ رچرڈ آرمیٹیز سے کہا' پاکستان کسی بھی حالت میں امریکی احکامات کو نظرانداز نہیں کرسکتا۔ آخرکار افغانستان میں طالبان سے لڑنے کے آپ کے دباؤ کے آگے مشرف جھک گئے تھے۔ القاعدہ کے 500 دہشت گردوں کو امریکہ کے حوالے کروانے میں آپ کی واضح طاقت دکھائی دی تھی۔ پاکستان آپ کے کہنے کو رد نہیں کرسکتا*، کیونکہ وہ آپ پر بہت زیادہ منحصر ہے۔

میرا یہ شبہ بے بنیاد بھی نہیں تھا کہ افسر شاہی میں کوئی شخص ہند-امریکہ مذاکرات میں داؤد ابراہیم اور دیگر ہندوستانی دہشت گردوں کو پاکستان سے حوالگی کے ایشو کو ترجیح دیئے جانے سے روک رہا ہے۔ میں اس بات سے بے چین ہوگیا۔ اس معاملہ میں ہماری کامیابی نہ صرف پاکستان کے حکمرانوں کو بے حد شرمندہ کردیتی بلکہ سرحد پار سے دہشت گردی کے خلاف ہندوستان کی طویل عرصہ سے جاری مہم میں اس کی ایک بڑی نفسیاتی فتح ہوتی۔ اس سے بی جے پی اور واجپئی حکومت کو زبردست سیاسی فائدہ بھی ہوتا۔

اس معاملہ میں میری ناامیدی اور قنوطیت اس لیے اور بھی زیادہ تھی کہ ہندوستان کے ایک اور موسٹ وانٹیڈ دہشت گرد ابوسلیم کی پرتگال سے حوالگی کرانے کی ہماری مسلسل ہمہ کوششوں میں ہماری حکومت نے کافی ترقی کرلی تھی۔ کبھی داؤد ابراہیم کے قریبی معاون کا رہے ابوسلیم کی 1993 میں ہونے والے ممبئی بم دھماکوں سمیت کئی مجرمانہ معاملوں میں تلاش تھی۔ ہندوستان کا پرتگال کے ساتھ کوئی حوالگی معاہدہ نہیں تھا۔ میں اس بات پر قائم تھا کہ سلیم کو ہندوستان واپس لاکر مختلف مجرمانہ وارداتوں کے لیے مقدمہ چلایا جائے۔ اس کی حوالگی کے لیے میں نے پرتگال کے افسران اور انٹرپول کو خطوط لکھے۔ ان کے ساتھ ہماری بات چیت اطمینان بخش ہورہی تھی۔ ایک رکاوٹ سامنے تھی — یوروپ فیڈریشن کے ممالک میں موت کی سزا پر پابندی عائد ہے۔ میں نے ضروری قانونی صلاح لینے کے بعد پرتگال حکومت کو یقین دلا دیا کہ ہندوستان میں سلیم کو موت کی سزا نہیں دی جائے گی۔ ہماری محنت رنگ لائی اور بالآخر نومبر 2005 میں اسے ہندوستان بھیج دیا گیا۔ دہشت گردی کے خلاف لڑائی

---

* جنرل مشرف کی یادداشت میں پاکستان پر امریکہ کی برتری کا واضح اعتراف ہے۔ '9/11 کی اگلی صبح کولن پاویل نے مشرف کو فون کیا۔ انھوں نے واضح طور سے کہا' آپ یا تو ہمارے ساتھ ہیں یا ہمارے مخالف۔' میں نے اسے واضح دھمکی کے طور پر لیا۔ جب دوسرے دن میں اسلام آباد لوٹا تو ہمارے آئی ایس آئی کے ڈائریکٹر جنرل جو اس وقت واشنگٹن میں ہی تھے، نے فون پر امریکی ڈپٹی وزیر خارجہ رچرڈ آرمیٹیز سے اپنی ملاقات کے بارے میں بتایا۔ آرمیٹیز نے اس بات جو کولن پاویل نے مجھ سے کہی تھی، کو ایک نہایت غیر سفارتی طریقے سے آگے بڑھاتے ہوئے ڈائریکٹر جنرل سے نہ صرف یہ کہا کہ یہ فیصلہ ہمیں کرنا ہے کہ ہم امریکہ کے ساتھ ہیں یا دہشت گردوں کے ساتھ، بلکہ یہ بھی کہا کہ اگر ہم نے دہشت گردوں کو منتخب کیا تو ہمیں بموں کے ذریعہ ازمنہ قدیم میں جانے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔' ('ان دی لائن آف فائر' پرویز مشرف کی خودنوشت، 2006، صفحہ 201)

میں ہندوستان کی یہ ایک اہم کامیابی تھی اور اس کے لیے سی بی آئی، داخلہ، قانون اور خارجہ وزارتوں اور لزبن میں واقع ہمارے سفارت خانہ کے افسران اپنی مشترکہ کوششوں کے لیے ستائش کے حقدار تھے۔

2003 میں میرا دوسرا امریکہ دورہ

میں جون 2003 میں دوسری بار امریکہ گیا۔ اس مرتبہ ہندوستان کے نائب وزیر اعظم کے طور پر، اس بار میرے دورے کی فہرست جنوری 2002 کی فہرست سے کہیں زیادہ طویل تھی، جس میں ہمارے دوطرفہ تعلقات سے جڑے کئی ایشوز مثلاً عوامی خلائی تعاون، نیوکلیائی توانائی تعاون اور اعلیٰ تکنیکی پروڈکشن کی تجارت کے پروجیکٹ شامل تھے۔ پھر بھی میں عام طور سے دہشت گردی پر ہندوستان کے نظریہ اور خاص طور سے کشمیر ایشو پر امریکی معلومات کو مزید بڑھانے کے لیے پر تجسس تھا۔

اس دورے کی خاص بات، صدر بش سے میری ملاقات تھی اور وہ کونڈالیزا رائس کے ساتھ میری مقررہ میٹنگ ★ میں غیر رسمی طور سے آپہنچے۔ انھوں نے ہند-امریکہ تعلقات کے اشکال کے عمل کو جاری رکھنے کی اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ انھوں نے وزیر اعظم واجپئی کی قیادت کی پیش رفت کی زبردست ستائش کی۔ جنھوں نے کچھ مہینے قبل اپنے کشمیر دورے کے دوران پاکستان سے دوبارہ بات چیت شروع کرنے کی تجویز پیش کی تھی۔ 'انھوں نے امن کے لیے خطرہ مول لیا ہے اور سیکورٹی سے متعلق باتوں کو نظرانداز کیے بغیر تنازع کو دور کرنے کے لیے ایک سیاسی امید پیدا کی ہے۔ میں نے یہ بات آپ کے وزیر اعظم کو پہلے ہی بتادی ہے اور میں صدر مشرف سے ایسے ماحول تیار کرنے کے لیے کہوں گا جس میں یہ پہل کامیاب ہوسکے۔' بش نے مجھ سے یہ بھی کہا کہ وہ ہندوستان کی اعلیٰ تکنیک کو دنیا میں سب سے اونچے مقام پر دیکھتے ہیں۔ جس نے ہندوستانیوں کی طاقت، تکنیکی علوم اور صنعت کی سپلائی کر کے امریکی پیداوار کو بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

اپنی جانب سے انھیں میں نے یقین دلایا کہ ہم ہندوستانی امریکیوں کے ساتھ اپنے رشتوں کو ایک سہولت کا موضوع نہ قرار دے کر آپسی اعتماد کی ایک ساجھے داری مانتے ہیں، جو مستقبل میں کسی بھی چیلنج کا سامنا کرسکتی ہے۔ جہاں تک پاک حمایت یافتہ سرحد پار دہشت گردی کا تعلق ہے میں نے انھیں تفصیل سے بتایا کہ کیسے میرے گزشتہ امریکی دورے سے اب تک زمینی حالات میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ میں نے کہا کہ میرے ساتھ آئے افسران یہ دکھانے کے لیے کہ پاکستان اسلامی شدت پسندی کو قابو میں رکھنے کی کوششوں میں ایماندار نہیں رہا اور وہ اب بھی

★ 'آڈوانی - رائس ملاقات میں بش کی موجودگی' واشنگٹن سے عزیز حنیفہ، ریڈف ڈاٹ کام، 10 ر جون 2003۔ اس ملاقات پر حنیفہ کی رپورٹ تھی — 'نائب وزیر اعظم لال کرشن آڈوانی اور نیشنل سیکورٹی صلاح کار کونڈالیزا رائس کے درمیان چل رہی میٹنگ میں صدر بش صرف داخل ہی نہیں ہوئے بلکہ آڈوانی نے رائس کے ساتھ جو 38 منٹ گزارے، ان میں سے 30 منٹ موجود رہ کر اس میٹنگ کو دراصل بش-آڈوانی سربراہ میٹنگ میں بدل دیا۔ جس میں انھوں نے ہندوستانی لیڈر کو سرحد پار دہشت گردی پر پاکستانی صدر پرویز مشرف سے کچھ واضح اور سخت بات کرنے کی یقین دہانی کرائی۔ انتظامیہ اور سفارتی ذرائع نے کہا کہ آڈوانی اور رائس کے درمیان بات چیت کے کچھ منٹوں بعد ہی بش نے وہاں داخل ہوتے ہوئے آڈوانی سے فوراً کہا کہ وہ وزیر اعظم اٹل بہاری واجپئی کی امن پہل کی بہت زیادہ ستائش کرتے ہیں اور انھوں نے اٹل جی کو ایک 'اسٹیٹس مین' بتایا۔ ذرائع کے مطابق آڈوانی نے پرتپاک لہجہ میں بش کو بتایا کہ برصغیر ہند میں امن بنائے رکھنے کے تئیں وعدوں پر قائم ہے، لیکن پاکستان سرحد پار سے دہشت گردی کو مسلسل ہوا دے رہا ہے اور جب تک اسے ہمیشہ کے لیے ختم نہیں کیا جاتا نئی دہلی سے یہ امید نہیں کی جاسکتی کہ وہ اسلام آباد کے ساتھ اعلیٰ سطحی بات چیت یا بحالی امن کی شروعات کرے۔'

دہشت گردوں کو تربیت دے کر دہشت گردی کو فروغ دے رہا ہے۔ ان کے معاونین کو مزید دستاویزی ثبوت دیں گے۔ رائس نے مجھے بتایا کہ دوفریقی ورکنگ فہرست میں شامل ایشوز، جن میں قومی خلائی تعاون، سول نیوکلیائی تعاون اور اعلیٰ تکنیکی پروڈکشن کی تجارت کی 'تکڑی' شامل ہے، پر پیش رفت یقینی بنانے کے لیے مزید قدم اٹھائے جارہے ہیں، تاکہ دونوں ممالک کے درمیان بدلے ہوئے تعلقات واضح طور سے دکھائی دیں۔

اسی دن اٹارنی جنرل جان ایش کرافٹ کے ساتھ کھانے کے وقت ہونے والی بات چیت میں ہم نے دہشت گردی کا مقابلہ کرنے کے بارے میں اپنی توجہ مرتکز کی اور اس مسئلہ سے نمٹنے میں دنیا کی جمہوریتوں کے سامنے آنے والی مشکلات پر اپنے نوٹس کا موازنہ کیا۔ داخلہ سکریٹری این گوپال سوامی ★ اور انٹیلیجنس کے ڈائریکٹر کے پی سنگھ جو میرے وفد کا ایک حصہ تھے، نے ایش کرافٹ کو ہندوستان کی دہشت گرد تنظیموں اور ان کے عالمی رابطوں کے بارے میں کچھ اہم خفیہ اطلاعات فراہم کریں۔ سکریٹری، ہوم لینڈ سیکورٹی، ٹام رج کے ساتھ ہماری اس دن کی میٹنگ میں بھی سرحد پار مینجمنٹ، ایئرپورٹ، بندرگاہ سیکورٹی اور داخلی سیکورٹی پر ممکنہ خطروں سے مقابلہ کرنے کے لیے مختلف تکنیکوں پر آپسی تعاون جیسے ایشوز پر توجہ مرتکز کی۔

اس بار کا میرا امریکی دورہ عراق جنگ کے پس منظر میں ہو رہا تھا۔ مارچ 2003 میں امریکہ نے ایک عالمی اتحاد جس میں برطانیہ اور کچھ دیگر ممالک بھی شامل ہو گئے تھے، عراق پر حملہ کر دیا تھا، اس لیے صدر بش اور ان کے تمام ساتھیوں کے ساتھ ہونے والی میٹنگ میں انھوں نے زوردار اپیل کی کہ ہندوستان بھی اپنی فوج کی کم سے کم ایک ڈویژن عراق بھیج کر اس اتحاد میں شامل ہو جائے۔ یہ بات وزیر دفاع ڈونالڈ رمس فیلڈ جو پنٹاگن میں مقررہ میٹنگ کے بجائے میری امریکہ آمد سے پہلے ہی دن اتوار ہونے کے باوجود میرے ہوٹل میں مجھ سے ملنے آئے تھے، انتہائی عاجزانہ گزارش کی۔ میں نے انھیں بتایا کہ سیکورٹی پر وزارت کمیٹی نے اس مسئلہ پر بحث کی ہے، جس میں کچھ اعتراض اٹھائے گئے ہیں۔ وزیراعظم واجپئی اور ان کی وزارت کے ساتھیوں کا یہ واضح خیال ہے کہ اس سلسلہ میں کوئی بھی فیصلہ قومی اتفاق رائے سے ہی لیا جا سکتا ہے، جس کے لیے ہماری حکومت تمام اپوزیشن پارٹیوں سے بات کرے گی۔

عراق پر امریکہ کے حملہ کے ابتداء سے ہی اٹل جی کا اور میرا یہ مضبوط فیصلہ تھا کہ امریکی جنگ میں شامل ہونے کے لیے ہندوستانی فوج بھیجنے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ہے۔ نہ تو اس جنگ کا کوئی مطلب تھا اور نہ ویسا کرنا ہندوستان کے حق میں تھا۔ اس کے علاوہ ہندوستان کی ہر ایک سیاسی پارٹی اس خیال کی مخالف تھی، پھر بھی اس مسئلہ پر امریکی دباؤ سے نمٹنے کا وزیراعظم کا طریقہ جہاندیدہ تھا۔ قومی اتفاق رائے حکومت کے فیصلہ کو بنیاد بنا کر ملک میں انھوں نے اپوزیشن پارٹیوں کو اپنے ساتھ کرلیا اور عالمی منچ پر انھوں نے امریکہ اور باقی دنیا پر یہ واضح کر دیا کہ ایسے مسئلہ پر فیصلہ لینے کا ہندوستانی طریقہ جمہوری ہے۔ عراق میں فوج نہ بھیجنے کا فیصلہ 2003 میں امریکی ناسمجھی کے افسوسناک نتائج کو دیکھتے ہوئے صحیح ثابت ہوا۔

اس بات کو جانتے ہوئے کہ کس طرح امریکہ میں سرکاری نظریہ تھنکس ٹینکس اور میڈیا سے تیار ہوتا ہے، میں نے اپنے امریکی دورہ کا استعمال اپنے خیالات کو محدود سرکاری نظام سے باہر جا کر ایک بڑے گروپ تک پہنچانے کے لیے کیا۔ میں نے 'امریکی عوام' تک پہنچنے، اسے احساس دلانے کی کوشش کی کہ دونوں ممالک کو 'سرد جنگ' کے دنوں کے 'السٹینجڈ ڈیکموکریسیز' والے تعلقات کو اکیسویں صدی کے شروع میں مکمل جمہوریتوں (السٹینجڈ ڈیکموکریسیز) کے تعلقات میں بدلنے کے لیے برابری کے اصول اور یکساں اقدار پر زور دینا چاہیے۔ اس سمت میں کی جارہی ہندوستان کی کوششوں میں میں اپنا مختصر تعاون دینے کے لیے بے چین تھا۔ وزیراعظم واجپئی نے اپنے ایک سابقہ امریکی دورے کے دوران

★ صاف ستھری شخصیت والے افسر این گوپال سوامی بعد میں ہندوستان کے چیف الیکشن کمشنر منتخب ہوئے۔

ہندوستان اور امریکہ کو فطری معاون (نیچرل الائنز) بتایا تھا۔ میری اپنے امریکی دوستوں کو یہ بتانے کی کوشش تھی — اور امریکہ کے دوسرکاری دوروں سے پہلے اور بعد میں بھی میری یہ کوشش جاری رہی — کہ پاک حمایت یافتہ دہشت گردی سے ہماری لڑائی یا کسی بھی اور معاملہ میں ہندوستان ایک 'جی حضور یہ معاون' کی طرح ان سے مدد مانگنے کا خواہش مند نہیں ہے۔ ہندوستان اپنی لڑائی خود لڑنے اور جیتنے میں اہل ہے۔ میں نے انھیں یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ 'فطری تعاون' کا رشتہ ایک دوسرے کے جائز سروکاروں کے تئیں دکھ دکھانے کی ذمہ داری بھی ساتھ لاتا ہے۔

میرا ہمیشہ سے یہ یقین رہا ہے کہ کسی بھی دو ممالک کے درمیان تعلقات کی صحیح بنیاد کو اس بات سے سب سے اچھے طریقے سے سمجھا جاسکتا ہے کہ دونوں نے ایک دوسرے کے عظیم دانشوروں کو کتنا متاثر کیا ہے۔ جب میں شکاگو کونسل میں غیر ملکی معاملات پر اظہار رائے دینے کے لیے گیا تو مجھے یہ بات یاد کرنے کا موقع ملا۔ ہندوستان کے امریکہ کو ایک 'فطری معاون' کی شکل میں دیکھنے کے اسباب میں سے ایک ہے انیسویں صدی میں عظیم روحانی پیشوا سوامی وویکانند کا شکاگو سے غیر معمولی رشتہ یہیں 1893 کے عالمی مذاہب کانفرنس میں شرکت کرتے ہوئے سوامی جی نے عالمی بھائی چارہ کے پیغام کا اعلان کر کے ہندوستان کا نام روشن کیا تھا، لیکن انھوں نے نہ صرف ہندوستان کو امریکہ سے متعارف کرایا بلکہ امریکہ کو بھی ہندوستان سے متعارف کرایا تھا۔ یہاں میں نے ایک خوبصورت نظم '4 رجولائی کے تئیں' ذکر کیا جسے سوامی جی نے امریکہ کی آزادی کے اعلان کی جوبلی کے موقع پر لکھا تھا:

جے کار ہو جیوترمئے،
نو ابھینندن آج تمہارا،
ہے سوکشچھند آج،
او دِنکر
سوتنترتا کا اَسمیت پرکاش تمہارا
اَوِ چلت ہو اب بڑھو دیو
نہ ہو جب تک آلوکت
اونی کی ہر دشا
اور نہ جب تک،
نر—ناری
بیڑیوں سے ہو سوتنتر اور
ہو گرو سے پرکاشمان
سواگت کریں نوجیون کا

میں نے کہا کہ جیسے امریکہ کی جنگ آزادی نے ہندوستان کے عظیم دانشوروں کو متاثر کیا، اسی طرح مہاتما گاندھی کی قیادت میں لڑی گئی ہندوستان کی جنگ آزادی نے بھی مارٹن لوتھر کنگ اور البرٹ آئن اسٹائن جیسے رہنماؤں اور دانشوروں سمیت امریکی عوام کو متاثر کیا۔ 'ہمارے تعلقات آزادی' جمہوریت، آپسی بھائی چارہ اور قوانین کے تئیں ایک جیسی باتوں میں بندھے ہوئے ہیں۔ ان اقدار کے تئیں ہمارے یکساں

خواب نے ہی پرآشوب حالات میں بھی اچھے تعلقات بنائے رکھنے میں ہماری مدد کی ہے۔آج وہی اقدار مستقبل کے لیے بہت زیادہ ساجھے داری کی بنیاد بن گئی ہیں۔ہاں دو آزاد ممالک کے درمیان اس یا اُس موضوع پر اختلافات ضرور رہیں گے،لیکن ہمارے مفاد اور خیالات کا میل اب ایسے مقام پر پہنچ چکا ہے، جہاں سے ہمارے اختلافات بہت ہلکے لگتے ہیں۔

لاس اینجلس جانے سے مجھے مغربی ساحل جو امریکہ کے رنگا رنگ،کثرت میں وحدت کی جیتی جاگتی مثال ہے، سے اپنے رابطوں کو تجدید نو کرنے کا موقع ملا۔ایک جغرافیائی سیاسی نظریہ سے اس کا ایشیا سے ایک خصوصی تعلق ہے، جو یہ یاد دلاتا ہے کہ ریاستہائے متحدہ امریکہ یوروپ سے جڑا ہوا ایک اٹلانٹک ملک ہی نہیں ہے بلکہ ایشیا سے جڑا ہوا ایک پسیفک ملک بھی ہے۔میں 1992 میں'اوورسیز فرینڈز آف بھارتیہ جنتا پارٹی' نامی تنظیم کی ایک نئی شاخ کا افتتاح کرنے کے لیے لاس اینجلس آیا تھا۔اس سے قبل 1990 کے دورے کے دوران انفارمیشن ٹیکنالوجی کی 'دھوم' سے متعارف ہونے کے لیے میں سیئٹل میں مائیکروسافٹ کا ہیڈ آفس دیکھنے گیا تھا۔اس وقت یہ کمپنی اوراس کے مالک بل گیٹس اس'دھوم' کے مرکز میں تھے۔تب سے ہندوستان نے خود انفارمیشن ٹیکنالوجی کے سیکٹر میں اونچی چھلانگ لگائی ہے، جو'سلی کان ویلی' کی کامیابی میں غیر ممالک میں آباد ہندوستانیوں کے تعاون سے اوراس سے بھی زیادہ اہم ہندوستان میں ہی سافٹ ویئر پروفیشنلوں کی دستیابی میں نظر آتی۔

لاس اینجلس میں ورلڈ افیئرز کونسل میں تقریر کرتے ہوئے میں نے کہا'ہندوستان اور امریکہ کی حکمت عملی کی ساجھے داری وجود میں آچکی ہے اور آنے والے دنوں میں یہ اور بھی مضبوط ہوں گی۔بلاشبہ اختلافات رہیں گے اور کچھ مسائل پر اختلافات رہتے ہوئے بھی ہم متحد ہوں گے، لیکن جیسا دو مضبوط اور مستقبل کو دیکھنے والی جمہوریتوں کو راس آتی ہے ہم نے اپنے یکساں اقدار اور وسیع ایشوز پر یکساں نظریہ کے ساتھ ان حقائق کو ہمیشہ اپنے ذہن میں رکھتے ہوئے کہ دنیا میں امن، استقامت اور ترقی کے لیے دنیا کی دو سب سے بڑی جمہوریتوں کے درمیان تعاون ضروری ہے،آگے بڑھتے رہیں گے۔'

اس سے قبل واشنگٹن میں ہندوستانی سفارت کار للت مان سنگھ کی رہائش گاہ پر بروکنگس انسٹی ٹیوشن، ووڈ رو ولسن سینٹر، سینٹر فار اسٹریٹیجک اینڈ انٹرنیشنل اسٹڈیز اور سینٹر فار انٹرنیشنل پالیسی کے امریکی دانشوروں کے ساتھ خیالات و بات چیت کا ایک دور شروع ہوا تھا۔میرے دو امریکی دوروں کا، میرا تجربہ امید اور چوکسی کے تال میل لیے ہوئے تھا،ایک طرف تو میں یہ محسوس کرسکتا تھا کہ امریکی حکومت، ہندوستان کو ایک بڑی طاقت کی شکل میں قبول کرنے کے لیے ایمانداری سے کوشش کر رہی ہے، دوسری جانب ہندوستان کے خلاف سرحد پار دہشت گردی کو روکنے کی کوششوں میں وہ پاکستان کو اتنا بھی دبانا نہیں چاہتی تھی کہ وہ ناراض ہو جائے۔2008 میں یہ تحریر کرتے وقت بھی میرا تجزیہ زیادہ نہیں بدلا ہے۔ یہ صاف ہے کہ دہشت گردی اور مذہبی شدت پسندی کے ایشوز پر ہندوستان کو اپنے اس جمہوری معاون سے بات چیت کرتے رہنا ہوگا اور امریکہ کو بھی پاکستان میں جو کچھ ہو رہا ہے، اس پر دوہرے معیار چھوڑ کر مزید ایمانداری سے نظر ڈالنی ہوگی۔

دنیا کی دیگر راجدھانیوں کا دورہ

امریکہ سے واپسی پر، میں برطانیہ گیا اور وزیراعظم ٹونی بلیئر، نائب وزیر اعظم جان پرسکاٹ، داخلہ سکریٹری ڈیوڈ بلینکٹ اور خارجہ سکریٹری جیک اسٹرا کے ساتھ مختلف موضوع پر بات چیت کی۔یہاں بھی بلیئر نے عراق میں امریکی قیادت میں جاری فوجی کاروائی میں شامل ہونے کے لیے ہندوستانی فوجی دستہ بھیجنے کا معاملہ اٹھایا۔میرا جواب وہی تھا جو میں نے واشنگٹن میں دیا تھا۔کشمیر اور سرحد پار دہشت گردی کے

موضوع پر ذاتی گفت وشنید میں، میں نے برطانوی اقتدار اعلیٰ کو ہندوستان کے سرکاروں کے تئیں پہلے کی بہ نسبت زیادہ سمجھدار پایا، لیکن ان کے عوامی اعلانات اس نظریہ کو پوری طرح واضح نہیں کرتے تھے۔ ہمارے کئی امریکی دوستوں کی طرح وہ بھی کہتے' چونکہ دہشت گردی کی لڑائی میں ہم پاکستان کو صف اوّل کے معاون کی شکل میں دیکھنا چاہتے ہیں، اس لیے ہم پاکستان کے بارے میں وہ سب باتیں نہیں کہیں گے جن میں ہمارا یقین ہے۔' میں ان سے دوٹوک کہہ دیتا تھا کہ ہندوستانی مغرب کے دوہرے معیار سے بہت مایوس ہیں۔ آپ کا استحصال کرنے والی دہشت گردی بھی اتنے طویل عرصہ سے لگاتار زخم دے رہی دہشت گردی سے آپ کو زیادہ سنگین لگتی ہے۔

وزیر اعظم ٹونی بلیئر نے بات چیت کے دوران مجھ سے پوچھا 'ایمانداری سے بتایئے کہ ہندوستان کے لوگ ہمارے بارے میں کیا سوچتے ہیں؟' میں نے کہا 'ہندوستانی آپ کے رویے سے خوش نہیں ہیں۔ حکومت چلانے والے لوگ پاکستان کو اپنے ساتھ رکھنے کی آپ کی پالیسی ساز مجبوریوں کو سمجھ سکتے ہیں، بشرطیکہ آپ کی جنگ حقیقت میں عالمی دہشت گردی سے ہو نہ کہ 9/11 کے جواب میں صرف بدلے کی ایک کاروائی ہو، لیکن ایک عام ہندوستانی کے لیے دہشت گردی کا مطلب ہے — پاکستانی تربیت یافتہ دہشت گردی۔ وہ اس بات کو ہضم نہیں کر پاتا کہ کیسے ایک دہشت گرد ملک جو دو دہائیوں سے بھی زیادہ عرصہ سے ہمیں پریشان کر رہا ہے، دہشت گردی سے لڑائی میں امریکہ اور مغرب کا صف اوّل کا ساتھی ہو سکتا ہے۔'

میں نے برطانوی وزیر اعظم کو یہاں تک کہا 'مسٹر بلیئر! لوگ یہ بھی جانتے ہیں کہ طالبان یا بن لادن یا آئی ایس آئی، ان سب کو تیار کرنے میں امریکہ معاون ہے اور ان کی کڑیاں آپس میں جڑی ہوئی ہیں۔ ہمارا یہ مستحکم موقف ہے کہ جو لوگ دہشت گردی کو فروغ دیتے ہیں انھیں ایک دن اس کے نتائج بھگتنے پڑتے ہیں۔ بھنڈرانوالہ کے ساتھ ایسے ہی ہوا۔ ایل ٹی ٹی ای کے ساتھ ایسا ہی ہوا اور اب طالبان اور بن لادن کے ساتھ بھی یہی ہوا ہے۔'

میری صاف گوئی کا شاید کچھ اثر ہوا۔ خارجہ سکریٹری جیک اسٹرا سے میری ملاقات کے بعد برطانوی وزارت خارجہ کی دفتر میں ہونے والی مشترکہ پریس کانفرنس میں ایک صحافی نے جنرل پرویز مشرف کے ذریعہ جموں وکشمیر کے دہشت گردوں کو آزادی کے مجاہد بتائے جانے پر ان سے تبصرہ کرنے کو کہا 'برطانیہ انھیں کیا کہتا ہے؟' جیک اسٹرا نے جواب دیا 'دہشت گرد تو دہشت گرد ہیں، اپنے کارناموں کو وہ چاہے جو نام دیں۔ برطانیہ انھیں خالص دہشت گرد مانتا ہے۔'

دیگر ممالک — فرانس، جرمنی، ترکی، قطر، متحدہ عرب امارات (یو اے ای)، تھائی لینڈ، سنگاپور اور اسرائیل — جہاں میں سرکاری طور پر گیا، میں بھی یہی پیغام لے کر گیا۔ پیرس میں فرانس کے وزیر اعظم جین پئیرے ریفرن سے ملنے کے علاوہ میں نے ان کے وزیر داخلہ نکولس سرکوزی (موجودہ صدر) اور وزیر دفاع مشیل ایلیٹ میری سے مذاکرات کیے۔ سرکوزی دہشت گردی، مذہبی دہشت گردی اور غیر قانونی دراندازی جیسے ایشوز پر کھل کر بولے۔ میں نے وزیر انصاف ڈومنک پربین کے ساتھ ایک ہند-فرانس حوالگی معاہدہ پر دستخط کیے۔ برطانیہ اور اسپین کے بعد فرانس تیسرا اہم یوروپی ملک بن گیا جس کا ہندوستان کے ساتھ ایک حوالگی نظام ہے۔ میں نے اپنے مذاکرات کاروں سے کہا کہ فرانس جو اس وقت گروپ جی-8 کا چیئرمین تھا، یوروپی فیڈریشن کے دیگر ممالک کے توسط سے دہشت گرد تنظیموں کو دی جانے والی مالی امداد کو روک دینی چاہیے تھی۔ یہ حوصلہ افزا تھا کہ دیگر موضوعات پر ایک کثیر الجہت دنیا کے خیالات کا فرانس میں استقبال ہوا تھا۔ جملہ معترضہ کے طور پر فرانس ان چند مغربی ممالک میں سے ایک تھا جس نے 1998 میں ہونے والے پوکھرن نیوکلیائی ٹسٹ کی تنقید نہیں کی تھی۔

میرا قطر کا دورہ ایک ایسی وجہ کے لیے یادگار بن گیا جو سرکاری فہرست میں نہیں تھا۔ قطر تقریباً 6 لاکھ کی آبادی والا ایک چھوٹا سا خوش حال ملک ہے، جس کا ایک تہائی حصہ ہندنژاد لوگوں کا ہے۔ حقیقت میں تناسب کے نظریہ سے اتنے زیادہ ہندوستانی دنیا کے کسی دیگر ملک میں نہیں ہیں۔ قطر کا سرکاری مذہب اسلام ہے اور 'شریعت' قانون بنانے کا ایک ذریعہ ہے۔ قطر کے امیر شیخ حامد بن خلیفہ الثانی نے بڑی گرم جوشی سے میرا استقبال کیا۔ ہندوستانیوں کے قطر والوں کے ساتھ خوشگوار تعلقات ہیں، لیکن ان کی ایک شکایت تھی — وہاں مذہبی آزادی نہیں تھی، جیسا کہ ایک غیر مقیم ہندوستانی نے مجھے بتایا 'اگر کسی ہندوستانی کی موت ہو جاتی ہے تو اس کی آخری رسم ادا کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ بڑی مشکل سے اسے دفنانے کی اجازت دی جاتی ہے، لیکن کوئی ہندو مرنے کے بعد دفنایا جانا پسند نہیں کرتا۔' میں نے امیر کے ساتھ اپنی بات چیت میں اس بات کو اور غیر مسلموں کو مذہبی آزادی دیئے جانے کا مسئلہ بھی اٹھایا۔ انھوں نے یقین دہانی کرائی کہ ملک کے آئین میں ترمیم کے وقت وہ اس بات کا دھیان رکھیں گے۔'

میں نے قطر، جو اس وقت مسلم ممالک کی ایک بین الاقوامی تنظیم آرگنائزیشن آف اسلامک کانفرنس (او آئی سی) کا چیئرمین تھا، سرحد پار دہشت گردی سے متعلق ہندوستان کی تشویش پر غور کرنے کی اپیل کی۔ میں نے امیر سے کہا کہ قطر اور دیگر او آئی سی ممالک کے ذریعہ ہندوستان کے ساتھ حوالگی معاہدہ کر کے اور مسلم دنیا کے ذریعہ پاکستان پر دباؤ ڈال کر ایسا کیا جاسکتا ہے۔

حقیقت میں ترکی ان مسلم ممالک میں سے ایک تھا جس کے ساتھ 2001 میں اس ملک کے یادگار دورے کے دوران میں نے ایک حوالگی معاہدہ پر دستخط کیے تھے۔ عام طور سے مسلم ممالک کے وفود کے ساتھ اپنی بات چیت میں خواہ نئی دہلی میں یا غیر ممالک میں، میں نے انھیں سمجھانے کی کوشش کی کہ دہشت گردی اور مذہبی دہشت گردی مسلم دنیا میں بھی امن و شانتی کے لیے خطرہ پیدا کر رہے ہیں۔

فروری 2003 میں میرے تھائی لینڈ اور سنگاپور کے سفر نے بنگلہ دیش سے متصل ہماری مشرقی سرحد سے ہندوستان کی اندرونی سیکورٹی کو سرحد پار سے دہشت گردی کے خطرے پر مرتکز کرنے کا موقع دیا۔ تھائی وزیر اعظم تھاکسن شنواترا اور سنگاپور کے وزیر اعظم گوہ چوک ٹونگ کے ساتھ اپنی بات چیت میں میں جنوب مشرقی ایشیا میں سرگرم دہشت گرد گروپوں کے علاقائی اور عالمی سطح پر بڑھتے جال اور منشیات و اسلحوں کے اسمگلروں کے ساتھ ان کے رابطوں پر خصوصی زور دیا۔

جون 2000 میں اسرائیل کے میرے پانچ روزہ دورے ★ سے میرے پرانے تعلقات پھر تازہ ہو گئے اور نئے حالات کے پس منظر میں دوستی بڑھانے اور دوطرفہ تعاون کو مضبوط کرنے میں وہ بڑے مددگار ثابت ہوئے۔ 1995 میں بی جے پی کے صدر کے طور پر میں اسرائیل گیا تھا اور دونوں ممالک جن میں کئی باتوں میں یکسانیت ہے، کے درمیان سفارتی تعلقات کو مکمل طور سے سہل بنانے میں اپنے کردار پر مجھے فخر ہے۔ میں اسرائیل کے ہولوکاسٹ میوزیم 'یادواشیم' گیا اور ان 60 لاکھ لوگوں کو خراج عقیدت پیش کیا جنھیں دوسری عالم گیر جنگ کے دوران

★ میرے اسرائیل کے دورے پر اخبار 'ہارٹیز' نے لکھا 'آڈوانی کے ساتھ ایک انٹرویو میں ان کے خیالات اور عالمی نظریہ واضح تھے۔ دیگر مہمان لیڈروں سے الگ وہ اپنے خیالات، یہاں تک کہ نیوکلیائی تعاون جیسے انتہائی حساس موضوع پر بھی، کھلے پن اور بیباکی سے بھی اظہار کرنے میں جھجک محسوس نہیں کرتے۔ انھوں نے کہا 'میں اسرائیل کے ساتھ تمام شعبوں میں، خاص طور سے نیوکلیائی شعبہ میں تعاون کے حق میں ہوں اور اسے مضبوط بنایا جانا چاہیے۔' (انڈیاز وزیٹنگ اسٹرانگ مین وانٹس ٹو ایکسپینڈ نیوکلیئر کوآپریشن ود اسرائیل'، مصنف یوسی میل مین، ہارٹیز، مورخہ 16 جون 2000) انٹرویو کے بعد 'آؤٹ لک' میگزین (جولائی 2000) کے ساتھ ایک انٹرویو میں ہندوستان میں اسرائیل کے سفارت کار یہویادہیم نے کہا 'مسٹر آڈوانی ایک بہت ہی انوکھے شخص ہیں۔ خیالات اور شخصی اچھائیوں کے نظریہ سے وہ گزری ہوئی اسرائیلی نسل کے لوگوں کی یاد دلاتے ہیں۔'

نازیوں نے مار ڈالا تھا۔ میں نے صدر ایز دوائز مین، وزیر اعظم ایہود براک، شمعون پیریز جو اس وقت علاقائی ترقیات کے وزیر تھے، موساد کے سربراہ ایفریم ہالیوی اور دیگر افسران سے ملاقات کی۔ ہم نے خفیہ اطلاعات ترسیل کے لیے ایک معاہدہ جس کے تحت اسرائیلی خفیہ ایجنسیاں، امریکہ کی ایف بی آئی کی طرز پر نئی دہلی میں آفس کھول سکیں گی۔ ہم نے داخلہ سیکورٹی مینجمنٹ اور ڈیفنس، خاص طور سے انسداد دہشت گردی کے طریقہ پر اور ٹیکنالوجی کے تبادلہ پر اور زیادہ تعاون دینے کے بارے میں بات چیت کی۔ میں لبنان سے متصل اسرائیل کی شمالی سرحد پر گیا جہاں سرحدی مینجمنٹ کے اسرائیل کے طور طریقوں کے بارے میں مجھے جانکاری ملی۔

فلسطینی رہنما یاسر عرفات سے غزہ سٹی میں واقع ان کے آفس میں ملنے کا موقع حاصل ہونے کی وجہ سے میرا اسرائیلی دورہ یادگار بن گیا۔ اس ملاقات میں ہندوستان کے اس مشہور و معروف نظریہ کو ثابت کر دیا کہ اسرائیل اور فلسطینیوں کے درمیان ایک مستقل اور انصاف پر مبنی امن تبھی قائم کیا جا سکے گا جب دونوں آپسی تعاون سے دشمنی ختم کر کے پر وقار ملک کی شکل میں بقائے باہم سے رہنے کے جائز حقوق کو قبول کریں گے۔

وزیر داخلہ کی شکل میں میرے چھ سال کی مدت کار میں ہندوستان نے کل ملا کر چوبیس ممالک کے ساتھ دو فریقی سمجھوتے، تیرہ ممالک کے ساتھ آپسی قانونی تعاون کے لیے سمجھوتے اور سترہ ممالک کے ساتھ دہشت گردی کے خلاف مشترکہ ورکنگ ٹیم کی تشکیل عمل میں لائی گئی۔ یہ ایک شاندار ریکارڈ ہے۔ واجپئی نے ایک بڑا قدم اٹھاتے ہوئے اقوام متحدہ میں عالمی دہشت گردی پر ایک وسیع اعلامیہ سی سی آئی ٹی (کمپری ہینسو آن انٹرنیشنل ٹیررزم) کی تجویز پیش کی اور سیکورٹی کونسل کی قرارداد 1269 اور 1378 (جو دہشت گردی کو عالمی امن اور سیکورٹی کے لیے پرخطر بتاتے ہیں) کی حمایت کی اور انھوں نے پوری طرح عملدرآمد کیا اور یو این (اقوامِ متحدہ) انسداد دہشت گردی کمیٹی کو اپنی ملکی رپورٹیں بھیجنے کے لیے فوری کارروائی کی۔

میں یہ بات کچھ فخر سے کہہ سکتا ہوں کہ این ڈی اے حکومت ان پورے چھ سالوں میں جب وہ برسر اقتدار تھی دراصل سیکورٹی کو مستحکم و مضبوط کرنے کے لیے اپنی جانب سے پہل کرنے میں مسلسل فرض شناس طریقے سے کوششیں کرتی رہی۔

8

مسئلہ کشمیر

مستحکم اور ایماندارانہ کوششوں سے پیش رفت ہوئی

شیو چوئے تھالی – تھالی روزان، مو جانِ ہندو لا مسلمان
تُرک اے چك پن یا نن پرجا نو، سوئے چه ساہیباس ستی جانئے جان

(شیو ہر جگه ہیں، ہندو کو مسلم سے بانٹو مت. خودی کو پہچاننے میں اپنے دماغ
کا استعمال کرو، ایشور کو پانے کا یہی راستہ ہے۔)

(لال دیدیا للیشوری (92-1320)، کشمیر کی عظیم شاعرہ)

دور جدید میں کسی ملک کی مقررہ سرحدیں امن و شانتی، تحفظ اور ترقی کے لیے اہم وسیلہ اور شرائط ہیں۔ قدیم اور قرون وسطیٰ میں جب ہندوستان ایک ملک تھا جو کئی ریاستوں سے مل کر بنا تھا، لیکن اس وقت سرحدوں کے بہتر تعین کا کوئی تصور نہیں تھا۔ ہندوستان اور اس کے پڑوسیوں کے درمیان کسی طرح کی کوئی دشمنی نہیں تھی۔ ساتھ ہی قدیم اور قرون وسطیٰ میں ہندوستان نے دوسری ریاستوں کی زمین جیتنے اور ایک 'ہندوستانی سامراج' قائم کرنے کے لیے اپنی فوجیں کبھی نہیں بھیجیں۔ باقی دنیا کی نظروں میں ایک عظیم ثقافت والا ملک تھا جو ریاستوں اور نسلوں کے اتار چڑھاؤ سے جڑا تھا۔ چین کے مشہور دانشور اور امریکہ میں چین کے سابق سفیر ہوشہ (1962-1891) نے ہندوستان کی تہذیب کی ستائش میں یہاں تک کہہ ڈالا تھا کہ 'ہندوستان نے اپنی سرحد کے باہر ایک فوجی بھیجے بغیر چین پر ثقافتی فتح حاصل کر کے 20 صدیوں تک اس پر اپنا اقتدار جمائے رکھا تھا۔'

شاہی نوآبادکاری اجارہ داری اور تقسیم کے بعد ہندوستان نے خود کو ایک الگ پس منظر میں پایا۔ آزادی کے بعد ہندوستان کی پہلی حکومت کے پہلے فرائض میں سے ایک یہ تھا کہ وہ پاکستان اور چین کے ساتھ اپنی بین الاقوامی سرحدوں کا تعین کرے، لیکن بدقسمتی کی بات ہے کہ اس وقت

کے وزیر اعظم جواہر لال نہرو اپنا یہ فرض پورا کرنے میں ناکام رہے اور ہمارے دو پڑوسی ممالک کے ساتھ اس تنازع کو وراثت میں چھوڑ گئے، جو تقریباً 6 دہائی گزر جانے کے باوجود ابھی تک حل نہیں کیے جاسکے ہیں۔ ویسے دونوں تنازع ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ اگرچہ این ڈی اے حکومت کے وقت میں چین کے ساتھ متصل سرحد کے تعین میں ذاتی طور پر شامل نہیں تھا، پھر بھی ہندوستان کے لیے اس کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے پہلے میں اس کے بارے میں مختصراً بات کروں گا۔ اس کے بعد جموں وکشمیر مسئلہ پر ہندوستان کے ساتھ پاکستان کی دشمنی اور ہندوستان کے وزیر داخلہ کے طور پر ان سے نمٹنے کے لیے میں نے کیا کچھ کیا، اس کے بارے میں آگے تفصیلات درج کروں گا۔

چین کے ساتھ سرحدی تنازع: 1962 کی تاریخ بدلنے کی کوشش

چین کے ساتھ ہندوستان کے سرحدی تنازع کی جڑیں مشرق میں اروناچل پردیش اور مغرب میں اقسائی چین پر دونوں ممالک کے درمیان پیدا ہونے والے اختلافات میں مضمر تھا۔ ہندوستان کا دعویٰ تھا کہ اقسائی چین جو لداخ کا ایک پٹھاری علاقہ ہے، جموں وکشمیر کا حصہ ہے۔ 1949 میں آزاد ہونے اور ماؤ تسے تنگ کی قیادت میں کیمونسٹ سرکار قائم ہونے کے بعد چین نے یہ دعویٰ کر کے تنازع کھڑا کر دیا کہ اقسائی چین اس کے جن ژیانگ خطہ کا حصہ ہے۔ دوسری جانب مشرق میں اس نے بھوٹان سے میانمار تک پھیلی میک موہن لائن کو ماننے سے انکار کر دیا، جو برطانوی ہندوستان میں تبت اور آسام کے درمیان کی بھی سرحد تھی۔ قابل ذکر ہے کہ 1914 میں جب تبت آزاد تھا، تب شملہ کانفرنس میں اس وقت حکومت ہند کے خارجہ سکریٹری اور انگریز ثالث آرتھر ہینری میکموہن نے اس سرحدی لائن کو حتمی شکل دی تھی۔

چین کے ساتھ سرحدی تنازع سے جڑے ہندوستانی دعویٰ کو مشکل بنانے والے چار عناصر تھے۔ پہلا، انیسویں اور بیسویں صدی میں جب ایک غیر ملکی طاقت کے ذریعہ سروے کرائے گئے تھے، اس وقت نہ تو ہندوستان آزاد تھا اور نہ ہی چین۔ اس دوران اس سروے کو تیار کرتے وقت برٹش سامراج نے ایشیا میں جاری سب سے بڑا کھیل (گریٹ گیم) نے روسی سامراج کے ساتھ اپنے حریفوں کو ہی خاص طور سے دھیان میں رکھا تھا۔ دوسرا، برٹش دور میں ہندوستان اپنے آزاد نقشہ کی صلاحیت میں ترقی نہیں کر سکا تھا اور نہ ہی جنگ آزادی کے دوران بھی سرحد سے متعلق امکانی معاملوں کی جانب کوئی خاص دھیان دے سکا تھا۔ تیسرا، 1950 میں چین کے ذریعہ تبت پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کا دعویٰ اور تماشائیوں والے رویہ نے اس واقعہ میں ایک نئی مشکل کھڑی کر دی۔ چین نے جن ژیانگ ریاست سے مغربی تبت تک ہندوستانی دعویٰ والے علاقوں اقسائی چین سے ہوکر جانے والی سڑک بھی تیار کر لی۔ اس کے بعد 1963 میں پاکستان نے پاک مقبوضہ کشمیر کے کچھ علاقے غیر قانونی طور سے چین کو سونپ کر دونوں ممالک کے ساتھ سرحدی تنازع میں ایک اور کڑی جوڑ دی۔

سب سے زیادہ خطرناک وجہ یہ رہی کہ آزادی کے بعد ہندوستانی حکومت کے ذریعہ چین کے ساتھ ملک کی سرحد کے 'مسئلہ' میں ہندوستان کی جانب سے ڈپلومیسی کوششوں کے ساتھ اپنی فوجی صلاحیت کو بھی مستحکم کرنے میں ناکامی۔ میں نے یہاں 'تنازع' کے بجائے 'مسئلہ' لفظ کا استعمال اس لیے کیا ہے کہ 1950 کی دہائی کی شروعات میں یہ دو ایشیائی پڑوسی ممالک کے درمیان تنازع نہ ہوکر صرف ایک مسئلہ تھا۔ اگر اس وقت حکومت نے ملکی سیکورٹی کو نظر انداز نہ کر کے اپنی سیاسی حکمت عملی میں استقامت اور حقیقت پسندانہ رویہ کا ثبوت دیا ہوتا اور غیر وابستہ تحریک میں نہرو کی قیادت یقینی بنانے کی کوششوں کی بجائے زمینی حقائق کو سمجھ کر اس کی بنیاد پر کام کیا گیا ہوتا تو ممکن ہے یہ مسئلہ اسی وقت حل ہو جاتا۔ اس وقت آپسی 'لین دین' کی بات ضرور رہی ہوتی، جیسے کسی معاملہ کو حتمی طور پر سلجھاتے وقت آپسی سمجھوتے میں ہوتی ہے،

لیکن سردار پٹیل * کی بے وقت موت کے بعد نہرو نے اس معاملہ کو حل کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں دکھائی، جبکہ اس وقت حالات آج کے بہ نسبت بہتر تھے۔ اس کے بجائے وہ غلط فہمی میں رہے کہ چینی قیادت میں اپنے اعتماد اور 'ایشیائی اتحاد' کی وکالت کی طاقت پر یہ معاملہ خود بخود اور پرامن طریقے سے حل ہو جائے گا۔ یہ جھوٹا اعتماد اس وقت پاش پاش ہو گیا جب 1962 میں چین نے ہندوستان پر حملہ کر دیا، جس سے پورا ملک شرمسار ہو گیا تھا۔

میرے ساتھی جسونت سنگھ نے اپنی کتاب 'اے کال ٹو آنر' میں اس راز کو فاش کیا ہے کہ کس طرح 1962 میں نہرو کی قیادت ناکام رہی۔ ہند-چین جنگ کے دوران ہندوستان کے شمال مشرق میں تعینات فوج کے افسر رہے جسونت سنگھ نے ان الفاظ میں اپنی ناراضگی کا اظہار کیا ہے کہ 'فوجی، سفارتی، سیاسی سبھی سطحوں پر ملک کی اعلیٰ قیادت ہندوستان کو بچانے میں افسوسناک حد تک ناکامیاب رہی۔ ان لیڈروں نے ملک کی عزت و وقار کو داغدار کر دیا۔ اس پر بھی انھیں اپنے کیے پر پچھتاوا نہیں تھا۔ آزاد ہندوستان کی یہ پہلی اور سب سے بڑی آزمائش تھی۔ جو ناکام رہی انھیں اس کی ذمہ داری اپنے سر لینی چاہیے تھی، لیکن کوئی بھی اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ ایک وسیع اور فرض شناس قوم نے اس واقعہ سے اپنی آنکھیں پھیر لی تھیں، جیسے کسی مشکل کو دیکھتے ہی ہم ایسا کرتے ہیں۔ وہ نہرو کو اور چوٹ نہیں پہنچانا چاہتے تھے۔ قومی وسعت قلبی کے اس کام کی قیمت ہمیں آج تک ادا کرنی پڑ رہی ہے۔'

اکتوبر 1962 میں ہندوستان پر چین کے فوجی حملہ سے ہندوستانی فوج کے سامنے پیدا ہونے والی پریشانیوں میں کس طرح نہرو نے ایک ایس او ایس (مشکلات کی گھڑی میں فریاد) کے ساتھ امریکہ کی جانب رخ کیا۔ اس کے بارے میں جسونت سنگھ نے انتہائی افسوسناک حقائق کا پردہ فاش کیا ہے۔ نہرو نے امریکی صدر جان ایف کنیڈی کو نومبر 1962 میں دو خط لکھے — 'ظاہری طور پر اپنے ساتھی وزراء یا افسران سے بات چیت کیے بغیر، جیسا ان کے سوانح نگار ایس گوپال نے لکھا ہے، جس میں انھوں نے حالات کو 'حقیقت میں انتہائی افسوسناک' بتاتے ہوئے 'ہندوستانی فضائیہ علاقہ میں چین کے ساتھ ممکنہ لڑائی میں ہندوستانی فضائیہ کی مدد کے لیے ہر موسم میں کام کرنے والے سپرسانک فائٹروں کے کم سے کم بارہ اسکوائڈرن فوراً بھیجنے کی درخواست کی تھی۔ چینی بیڑوں اور ہوائی پٹیوں پر حملہ کرنے میں ہندوستانی فوج کی مدد کے لیے انھیں دو B-47 بمبار اسکوائڈرنس بھی مانگے تھے، لیکن ان طیاروں کو چلانے کے لیے ہندوستانی

---

* سردار پٹیل نے 7 نومبر 1950 کو وزیراعظم جواہر لال نہرو کو لکھے اپنے تاریخی مکتوب میں کمیونسٹ چین کے بارے میں تفصیل سے اپنی دوراندیشانہ رائے دیتے ہوئے انھیں آگاہ کیا تھا۔ خط میں انھوں نے واضح طور پر لکھا تھا 'اپنے پرامن ارادے کی بات کر کے چینی حکومت نے ہمیں جھانسا دینے کی کوشش کی ہے.... ہم چین کو بھلے ہی اپنا دوست سمجھتے ہیں، لیکن چینی ہمیں اپنے دوست کے طور پر نہیں دیکھتے۔' جو ان کے ساتھ نہیں ہیں وہ (ضرور) ان کے خلاف ہیں'— اس کمیونسٹ سروے کی بنیاد پر دیکھیں تو یہ (ہمارے لیے) ایسا اشارہ ہے جس پر پہلی توجہ دینی چاہیے۔' تبت پر چین کے قبضہ کے بارے میں پٹیل نے لکھا ہے— 'تبت کے غائب ہو جانے اور چین کے ہمارے دروازے تک پہنچ جانے سے جو حالات ہمارے سامنے آئے ہیں اس پر ہمیں غور کرنا چاہیے۔ تاریخ گواہ ہے کہ ہم نے اپنی شمال مشرقی سرحدوں کی کبھی فکر نہیں کی۔ اب ہندوستان کی سیکورٹی پالیسی کو پہلی بار دو سرحدوں پر ایک ساتھ مرتکز کرنا ہوگا۔ ابھی تک ہمارے دفاعی طریقے پاکستان پر ہماری فوقیت کی بنیاد پر ہی تیار کیے جاتے رہے ہیں۔ ہمارے اندازوں کے مطابق اب ہمیں کمیونسٹ چین کو پہچاننا ہوگا، جس کے اپنے مقررہ اہداف اور خواہشات ہیں اور جو ہمارے تئیں کسی بھی کونے سے دوست دکھائی نہیں دیتا۔' (پٹیل کے ذریعہ نہرو کو لکھا پورا خط جسونت سنگھ کی کتاب 'اے کال ٹو آنر' روپا اینڈ کمپنی، 2006، صفحہ 400-394 میں پیش ہے۔)

پائلٹوں اور تکنیشینوں کی تربیت کے لیے امریکہ بھیجا جانا تھا۔'

کنیڈی انتظامیہ کو فوجی مدد کے لیے نہرو کی غیر معمولی درخواست کے جواب میں امریکہ کے وزیر خارجہ ڈین رسک کی جانب سے ہندوستان میں امریکہ کے سفیر جان کے گیل بریتھ کے پاس دو تار آئے۔ میں یہاں اس کا ذکر کرنا چاہوں گا۔

(1) امریکہ ہندوستان کو زیادہ فوجی امداد اس لیے نہیں دے پائے گا، کیونکہ ہندوستان کی بیشتر فوج پاکستان کے خلاف ایک ایسے معاملہ پر تعینات ہے، جس میں عوام کے فیصلہ سے براہِ راست منسلک امریکی مفاد کی وجہ سے 1954 سے ہی ہمیں پاکستان کے دعوؤں کے تئیں ہمدردانہ رخ اپنانا پڑا ہے۔

(2) وزیر اعظم کی جانب سے موصول اس پیغام کا مطلب ہندوستان اور امریکہ کے درمیان فوجی اتحاد ہی نہیں بلکہ جنگ میں (ہندوستان کی جانب سے) شامل ہونے کے لیے ہماری جانب سے مکمل عزائم بھی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ بحران کی حالت میں کسی بھی حکومت کا یہی ردّعمل ہوسکتا ہے، لیکن ایسی تجویز ہے جو ہندوستان کے ناوابستہ پالیسی سے میل نہیں کھاتا۔ اگر نہرو کے ذہن میں یہی بات ہے تو ہمیں اپنے فیصلہ پر غور کرنے سے پہلے انھیں اس (ناوابستہ تحریک کے) بارے میں صاف ہونا چاہیے۔

جنگ میں ہی کسی لیڈر کی قوت ارادی اور طاقت کا امتحان ہوتا ہے۔ نہرو — جنھیں ان کے وزیر دفاع وی کے کرشنا مینن کے ذریعہ صلاح دی جارہی تھی — اپنے اس امتحان میں بری طرح ناکام ہوگئے۔ طویل عرصہ سے نظرانداز اور ناتجربہ کار ہندوستانی فوج جب نیفا* (NEFA - نارتھ ایسٹ فرنٹیئر ایجنسی) میں بغیر جنگی ساز وسامان کے جنگی مورچہ پر نامساعد حالات میں چینی فوج سے لڑ رہی تھی، تب ناامید اور ناراض وزیر اعظم نے 19 نومبر 1962 کو ملک کے نام پیغام جاری کیا، جسے بلاشبہ آزاد ہندوستان کی تاریخ میں سب سے شرمناک اور افسوسناک واقعہ شمار کیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے کہا 'عظیم چینی فوج شمال مشرق میں آگے بڑھ رہی ہے... کل کیمنگ سیکٹر کا بومڈیلہ قصبہ ہمارے ہاتھ سے نکل گیا۔ میرا دل آسام کے عوام کے لیے بے چین ہے۔' اس آخری جملہ نے آسام کے عوام میں غم واندوہ کی لہر دوڑا دی۔ انھیں محسوس ہوا کہ ہندوستانی حکومت نے انھیں ان کی حالت پر چھوڑ دیا ہے۔ اس سے ان کے ذہن میں غیر محفوظ ہونے کے جذبات گھر کر گئے۔ دہشت گرد تنظیم ابھی تک ان کے ذہن میں بیٹھی اس غیر محفوظ ہونے کے جذبات کو ہندوستان کے خلاف بھڑکانے میں لگے رہے ہیں۔

آزاد ہندوستان کی تاریخ میں اس افسوسناک باب کو پھر سے کھولنے کے پیچھے میرا کوئی اکیڈمک مقصد نہیں ہے، بلکہ اس کے پیچھے میرا مقصد ملک کے لوگوں کو متنبہ کرنا ہے کہ اگر ہم اپنی بین الاقوامی سرحدوں کی جانب سے لاپرواہ بنے رہتے ہیں — جیسا کم وبیش اب تک ہر کانگریسی حکومت بنی رہی ہے — تو کس طرح ہمیں اپنی زمین کے ساتھ ساتھ اپنا عالمی وقار بھی کھونا پڑتا ہے۔ کیا یہ بات افسوسناک نہیں ہے کہ نہرو جیسے لیڈر نے جنھیں پورا ملک انتہائی عقیدت سے دیکھتا تھا — کسی غیر ملکی طاقت کے حملہ سے ملک کو بچانے کے لیے، فوجی امداد کے لیے دیگر غیر ملکی طاقت کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے تھے؟ ہندوستان کی خودکفیل رہنے کی پالیسی پر اس سے کیا اثر پڑا؟ خود نہرو کی ناوابستہ پالیسی کا کیا حشر ہوا؟

بدقسمتی کی بات ہے کہ کانگریس پارٹی نے اس معاملہ پر ایمانداری اور شفافیت سے کبھی کوئی چرچا نہیں کی ہے، لیکن ہندوستان کی موجودہ

★ 1972 میں نیفا میں اروناچل پردیش بن گیا۔ 1962 کی جنگ میں چینی فوج نے نیفا کے ایک بڑے حصہ پر قبضہ کرلیا تھا، لیکن اپنی فتح کے اعلان کے بعد وہ خود میک موہن لائن سے پیچھے ہٹ گئی۔

نوجوان نسل کو خود کچھ سوالوں پر سنجیدگی سے غور کرنا ہوگا— جب تک ہماری بین الاقوامی سرحدیں محفوظ نہیں رہیں گی تب تک کیا ہندوستان محفوظ ہے؟ اگر ہندوستان اس طرح کمزور ملک بنا رہا، جو اپنی زمین پر کسی دوسرے کے دعوے کو نہیں روک سکتا، جو پاکستان حمایت یافتہ سرحد پار دہشت گردی کو نہیں روک سکتا اور جو بنگلہ دیش کے ساتھ ہونے والی ناجائز اور غیر قانونی دراندازی کی جانب سے اپنی آنکھیں ہی موند لیتا ہے— تو کیا ہماری سرحدیں محفوظ رہ سکتی ہیں؟

یہ خوشی کی بات ہے کہ حال کی کچھ دہائیوں میں ہندوستان اور چین کے درمیان تعلقات تیزی سے بہتر ہو رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اب دونوں ممالک کو سرحدی تنازع کو غیر جانب دارانہ اور بھائی چارہ اور حسب حال صورت حال کی بنیاد پر فوراً حل کرنے کی ضرورت اور اہمیت کو قبول کرنا چاہیے۔ ایک عظیم الشان مستقبل ایشیا میں امن اور استقامت کو فروغ دینے اور دنیا میں عمومی زندگی کو خوشحال بنانے کے لیے ان دو قدیم تہذیبوں کو مل کر آپسی تعاون کی شاہراہ پر چلنے کی راہ دکھا رہا ہے۔

یہ قابل اطمینان بات ہے کہ چین کے ساتھ جاری سرحدی تنازع کو حل کرنے کی ذمہ داری 2003 سے دونوں ممالک کی حکومتوں کے ذریعہ آپسی گفت وشنید کے ایک ادارہ کو سونپ دی گئی ہے۔ نئی دہلی اور بیجنگ دونوں نے ہی یقین دہانی کرائی ہے کہ دیگر سیکٹروں میں آپسی اور سودمند تعاون سے سرحدی تنازع کے فیکٹر متاثر نہ ہوں۔ دوسرے الفاظ میں بات چیت کے ذریعہ سرحد کی کا تعین اور تعاون، دونوں یکساں راہ پر ساتھ ساتھ چل رہے ہیں اور دونوں فریقوں نے حقیقی کنٹرول لائن پر پہلے کی حالت کو بدلنے کے لیے طاقت کے استعمال کے امکانات کو مسترد کر دیا ہے۔

دنیا کے ان دو بڑے ممالک کے درمیان دوطرفہ تعلقات کو مضبوط بنانے والا یہ بنیادی خاکہ تیار کرنے کا سہرا خاص طور سے دو عظیم لیڈروں ہندوستان کی جانب سے اٹل بہاری واجپئی اور چین کی جانب سے ڈینگ ژیاؤ پنگ کو جاتا ہے۔ فروری 1979 میں ہندوستان کے وزیر خارجہ کے طور پر اٹل بہاری واجپئی چین کے دورے پر گئے تھے۔ اس طرح 1962 کے بعد چین کے دورے پر جانے والے وہ پہلے ہندوستانی لیڈر بنے۔ بیجنگ میں واقع گریٹ ہال آف پیپل میں ان کی گرم جوشی سے استقبال کرتے ہوئے ڈینگ ژیاؤ پنگ نے کہا تھا 'ہمارے کچھ آپسی مسئلے ہیں جن پر ہمارے خیالات مختلف ہیں۔ ان مسئلوں کو الگ رکھ کر فی الحال ہمیں ایسی فضا تیار کرنی چاہیے کہ مسائل سے نمٹا جا سکے۔ ہم دو ملک دنیا کی سب سے زیادہ آبادی والے ملک ہیں اور دونوں ایشیائی ملک ہیں۔ آخر ہم دوست کیوں نہیں ہو سکتے؟' واجپئی اور ڈینگ نے سرحدی مسئلہ کے لیے ایک 'پیکیج حل' پر غور وخوض کیا جس میں دونوں ممالک کی جانب سے ایک دوسرے کو کچھ رعایتیں دینے کی بات کی گئی تھی۔ مجھے امید ہے کہ مسئلہ کو حل کرنے کے لیے آگے بڑھنے کا یہ سب سے اچھا طریقہ ہے۔

اس سلسلہ میں دسمبر 1988 میں راجیو گاندھی کے تاریخی چینی دورے کی اہمیت اور تعاون کا یہاں ذکر کرنا چاہوں گا۔ راجیو گاندھی-ڈینگ کی تاریخ ساز ملاقات دونوں ممالک کے درمیان امن و دوستی کے تعلقات بحال کرنے کے لیے دونوں لیڈروں کے ذریعہ دکھائی گئی گرم جوشی سے اس امید کو بہت تقویت ملی تھی کہ ہمارے دوطرفہ تعلقات کو 1962 کی تلخ یادوں سے چھٹکارا پایا جا سکتا ہے۔ اس امید کو حقیقت میں بدلنے کے عمل میں اس وقت پیش رفت ہوئی جب جون 2003 میں ہندوستان کے وزیراعظم کے طور پر اٹل بہاری واجپئی نے چین کا دورہ کیا اور صدر ہوجنتاؤ اور وزیراعظم وین جیاباؤ سے مل کر اس بارے میں مثبت بات چیت کی۔

نومبر 2006 میں ہوجنتاؤ خود ہندوستان کے دورے پر آئے۔ ان کے ساتھ نئی دہلی میں اپنی میٹنگ کے دوران میں نے سرحدی تنازع کو آپسی بات چیت کے ذریعہ حل کرنے کے لیے دونوں ممالک کی کاوشوں کی ستائش کی تھی۔ میں نے کہا کہ مسئلہ کشمیر کو حل کرنے کے لیے

پاکستان کو یہی طریقہ اپنانا چاہیے اور ساتھ ہی آپسی فائدہ کے سیکٹروں میں تعاون کے راستہ پر آگے بڑھنا چاہیے۔ بات چیت کے دوران میں نے یہ امید بھی ظاہر کی تھی کہ چینی حکومت ایسی کوشش کرے گی کہ تبت کے روحانی پیشوا دلائی لامہ اکتوبر 2008 میں منعقد ہونے جارہے بیجنگ اولمپک سے قبل تبت جاسکیں۔

مسئلہ کشمیر: نہرو ازم ماضی کی ایک اور وراثت

اب میں پاکستان کے ساتھ ہندوستان کے سرحدی تنازع کے بارے میں تبادلہ خیال کروں گا، جو 1947 سے ہی ہندوستان کی بیرونی اور داخلی سلامتی کو متاثر کررہا ہے، اس لیے واجپئی حکومت کو اور ہندوستان کے وزیر داخلہ کے طور پر میں نے اس معاملہ کو ترجیح دی۔ تقسیم کے وقت کا ایک زخم ہے جو ابھی تک مندمل نہیں ہوسکا ہے۔ تاریخ کی مندمل کرنے والی طاقتیں بھی اسے نہیں بھر سکی ہیں۔ ملک کی تقسیم کی قیمت سندھ، پنجاب اور بنگال کے لاکھوں افراد کی موت کی شکل میں اور دیگر کو رفیوجی بنا کر ادا کرنی پڑی تھی۔ اگر چہ ماضی کے سندھ، بنگال اور پنجاب کے زخم کافی حد تک بھرے جاچکے ہیں، جموں و کشمیر کا زخم اب تک نہیں بھرا جاسکا ہے۔ اس کے برعکس آج چھ دہائی کے بعد ایک الگ 'مسلم ریاست' کا مطالبہ ہندوستان کو منقسم کرنے کے لیے مجبور کرنے والی ذہنیت مسلسل یہ کوشش کررہی ہے کہ ہندوستان میں روز خون بہے۔

چین کے ساتھ سرحدی تنازع کی طرح ہی کشمیر تنازع بھی نہرو کے ماضی کی وراثت ہے۔ یہ ہندوستانی تحریک آزادی کی کمزوریوں کا نتیجہ ہے جس نے بعد میں برطانوی اقتدار اعلیٰ کی سوچی سمجھی سازش اور نہرو حکومت کی غلطیوں سے مزید گنجلک بنا دیا۔

جس وقت برٹش پارلیمنٹ میں ہندوستانی آزادی ایکٹ 1947 پیش کیا گیا تھا اس وقت جموں و کشمیر 565 دیسی ریاستوں میں سے ایک تھا۔ اقتدار کی تبدیلی کے وقت ان ریاستوں کے حکمرانوں کو خود سے ہندوستان یا پاکستان میں کسی ایک ملک میں شامل ہونے کا متبادل موجود تھا۔ اس وقت مذہبی آبادی سے متعلق کوئی قانونی التزام نہیں تھا۔ تھوڑے گومگو کے بعد جموں و کشمیر کے حکمراں مہاراجہ ہری سنگھ جو ایک آزاد ریاست کا حکمراں بننے کا خواب دیکھ رہے تھے، بالآخر 27 اکتوبر 1947 کو ہندوستان میں شامل ہوگئے۔ دراصل پاکستانی حکومت کی حمایت سے قبائلی پٹھانوں کے ذریعہ کشمیر پر حملہ کیے جانے سے انھیں فیصلہ لینا پڑا۔ جب ہری سنگھ کے پاس کوئی اور راستہ نہیں بچا تو انھوں نے 24 اکتوبر کو ہندوستان سے فوجی مدد مانگی۔ ہندوستانی فوج نے جموں و کشمیر پر بہ زور طاقت قبضہ کرنے اور اس کے بعد مسلم آبادی کی اکثریت کی بات کرکے اس پر اپنا دعویٰ پیش کرنے کے پاکستان کے منصوبوں پر پانی پھیر دیا۔ اس نے حملہ آوروں کو جموں و کشمیر سے باہر بھگا دیا۔ دوسری جانب مقامی لوگوں کے حملہ آور قبائلیوں کا ساتھ نہ دینے سے پاکستان کو اور دھچکا لگا۔ اس وقت جموں و کشمیر کی پوری زمین کو پاکستانی دراندازی اور قبضہ سے واپس لینا ہندوستانی فوج کے لیے بہت آسان تھا۔

جنگ کے دوران ہی یکم جنوری 1948 کو وزیر اعظم جواہر لال نہرو لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے دباؤ میں آکر مسئلہ کشمیر کو غیر ضروری طور سے اقوام متحدہ کی سیکورٹی کونسل میں لے جانے کے لیے متفق ہوگئے۔ سیکورٹی کونسل نے تنازع کی جانچ کرنے کے لیے سہ رکنی اقوام متحدہ کمیشن (یونائیٹیڈ نیشن کمیشن فار انڈیا اینڈ پاکستان — یو این سی آئی پی) کی تشکیل کی۔ 13 اگست 1948 کو اقوام متحدہ سیکورٹی کونسل نے ایک جنگ بندی قرارداد پاس کیا، جس میں پاکستانی افواج سمیت سبھی دراندازوں کو واپس جانے، ہندوستانی فوج کی تعیناتی کم کرنے اور عوامی استصواب رائے کے ذریعہ 'عوام کی خواہش' کے مطابق جموں و کشمیر کا مستقبل طے کرنے کی بات کی گئی تھی۔ یہ استصواب رائے کبھی نہیں ہوسکا، کیونکہ اس

کے پہلے کی شرط کے مطابق پاکستانی فوج کو پورے جموں وکشمیر کا علاقہ چھوڑنا تھا، لیکن اس نے ایسا کبھی نہیں کیا۔ اقوام متحدہ کی قرارداد میں 'استصواب رائے' اور 'عوام کی خواہش' کا محض ذکر ہی پاکستان اور جموں وکشمیر کے علیحدگی پسند عناصر کو دہائیوں سے دنیا بھر میں ہند مخالف منفی تشہیر جاری رکھنے کے لیے کافی تھا۔

مسئلہ کشمیر کا انٹرنیشنلائزڈ کرنے اور وہ بھی ہندوستان سے فرار ہو رہی نوآبادیاتی طاقتوں کے ایک نمائندہ کے دباؤ میں آ کر کہ نہرو کی اس زبردست غلطی کی قیمت ہندوستان کو آج تک ادا کرنی پڑ رہی ہے۔ جموں وکشمیر کا ایک تہائی حصہ پاکستان کے قبضہ میں ہی رہنے دیا گیا۔ اس سے بھی زیادہ دکھ کی بات یہ ہے کہ ہمارے دسیوں ہزار فوجی، سیکورٹی اہلکار اور شہری صرف اس وجہ سے مارے گئے کہ 48-1947 میں ہی ہمیشہ کے لیے ہند اور پاک کے درمیان بین الاقوامی سرحد طے نہیں کی جا سکی۔ جہاں تک کانگریس پارٹی کی بات ہے اس نے ملک کے عوام کو ان سوالات کا جواب دینا کبھی ضروری نہیں سمجھا۔ پورے جموں وکشمیر کو پاکستانی دراندازی سے خالی کرائے جانے تک نہرو حکومت نے جنگ جاری کیوں نہیں رکھی؟ وزیراعظم جواہر لال نہرو مسئلہ کشمیر کو اقوام متحدہ میں کیوں لے گئے؟ فوجی طاقت کے نظریہ سے ہندوستان کی فوقیت کے باوجود انھوں نے جنگ بندی کی تجویز کیوں منظور کر لی؟

ایسا بار بار نہیں ہوتا کہ تاریخ کسی ملک کو اپنے بڑے مسئلہ کو مستقل اور فیصلہ کن طریقہ سے حل کرنے کا موقع فراہم کرے۔ اگر مناسب اور بہتر وقت کا فائدہ نہیں اٹھایا گیا تو کچھ پتہ نہیں کہ دوبارہ ایسا وقت پھر کبھی آئے گا بھی یا نہیں۔ 48-1947 کی جنگ میں پاکستان کی شکست ایک ایسا ہی موقع تھا۔ دوسرا موقع 1971 میں آیا جب ہندوستان نے پاکستان کو بری طرح شکست دے کر بنگلہ دیش کو آزاد کرایا تھا، لیکن جیسے پہلا موقع نہرو نے چھوڑ دیا ویسے ہی دوسرا موقع ان کی بیٹی اندرا گاندھی نے گنوا دیا۔

دفعہ 370 کیوں رد کی جانی چاہیے

جیسے جموں وکشمیر کا مسئلہ نہرو کے ماضی کی وراثت ہے جسے بعد میں کانگریس سرکاریں بڑے فخر سے طول دیتی آئی ہے، آئین کی دفعہ 370 کا مسئلہ ہے۔ ہندوستانی آئین میں یہ غیر مستقل التزام جو آزادی کی ایک جز وقتی ضرورت تھی، کانگریس پارٹی کی اقلیت نواز پالیسی کی وجہ سے اب تقریباً مستقل اور ناقابل تبدیل بن گئی ہے۔

انضمام کے دستاویز پر دستخط کرتے وقت ہری سنگھ نے صرف تین معاملے: دفاع، خارجہ اور انفارمیشن ہی مرکزی حکومت کو سونپے تھے۔ نہرو راہ سے بھٹکے مہاراج کو اپنی ریاست بغیر کوئی اختیار رکھے اور بغیر کسی شرط کے ہندوستان میں شامل کرنے کے لیے ان مثبت اور اثردار طریقوں کا استعمال نہیں کیا جنھیں سردار پٹیل نے حیدرآباد کے نظام کے لیے اپنایا تھا۔ ان کی دوسری غلطی یہ تھی کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے دباؤ میں آ کر انھوں نے قبول کر لیا کہ شمولیت کے آخری فیصلہ کی تصدیق جموں وکشمیر کی آئین ساز اسمبلی کے ذریعہ کی جائے گی۔ ایسی چھوٹ اور رعایت کسی دوسری ریاست کو نہیں دی گئی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کی کسی دوسری ریاست کا اپنا کوئی ذاتی قانون نہیں ہے۔ یہاں یاد رکھنے والی بات یہ ہے کہ اگرچہ دیگر سبھی دیسی ریاستوں کو ہندوستان میں شامل کرنے کی ذمہ داری سردار پٹیل کی تھی جبکہ جموں وکشمیر کا معاملہ وزیراعظم نہرو نے اپنے پاس رکھا تھا۔ میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اگر جموں وکشمیر کو بھی ہندوستان میں شامل کرنے کی ذمہ داری سردار پٹیل کو

سونپی گئی ہوتی تو آج مسئلہ کشمیر کا نام ونشان نہیں ہوتا۔ ★

شمولیت کے دستاویز پر ریاست کی آئین ساز اسمبلی کے ذریعہ فیصلہ لیے جانے تک کے لیے غیر مستقل طور پر ہندوستانی آئین میں دفعہ 370 کی شکل میں جزوقتی التزامات کیے گئے تھے۔ اس دفعہ کے مطابق جموں وکشمیر سے متعلق دفاع، خارجہ اور انفارمیشن معاملوں کے علاوہ دیگر سبھی طرح کے قوانین نافذ کرنے کے لیے ہندوستانی پارلیمنٹ کو ریاستی حکومت کی جانب سے منظوری حاصل کرنی ضروری ہے۔ اس طرح ریاست کے وزیراعلیٰ کو خصوصی مراعات مل گئیں، جن کا استعمال بیشتر وزراءاعلیٰ نے جموں وکشمیر کو خصوصی اور علیحدہ درجہ دینے کی بات پر زور دینے کے لیے کیا ہے۔

آئین ساز اسمبلی نے جموں وکشمیر کے ہندوستان میں انضمام کے فیصلہ کو 1954 میں منظوری دی۔ 1956 میں نافذ کیے گئے ریاست کے آئین میں دفعہ-3 جوڑی گئی، جس کے مطابق 'جموں وکشمیر ریاست ہندوستانی وفاق کا ایک حصہ ہے اور رہے گا' اس دفعہ میں کسی بھی طرح کی کوئی ترمیم کبھی نہیں کی جا سکتی تھی۔ اس کے بعد ہندوستان کی آئین (ساتواں ترمیم) ایکٹ 1956 کے دفعہ 1 کے تحت جموں وکشمیر کو ہندوستان کی ایک ریاست کے طور پر شامل کرلیا گیا۔ ایسی حالت میں دفعہ 370 کو ہندوستان کے آئین میں بنائے رکھنے کا کوئی مطلب نہیں رہ گیا تھا، لیکن نہرو اپنے دوست شیخ عبداللہ کو ناراض کرنا نہیں چاہتے تھے، اس لیے کانگریس پارٹی کے اندرونی احتجاج کو نظرانداز کرتے ہوئے بھی انھوں نے اس دفعہ کو رد کرنے کی بات قبول نہیں کی۔

اگرچہ 1953 کے بعد سے مرکزی حکومت نے جموں وکشمیر سے متعلق کچھ طاقتوں کو مزید توسیع دی ہے۔ دفعہ 370 کے بنائے رکھنے کے کئی منفی نتائج سامنے آئے، ہندوستان کے لیے بھی اور جموں وکشمیر کے لیے بھی۔ استصواب رائے سے متعلق پہلے کے مطالبہ (جواب پس پردہ ہے) کی طرح یہ بھی کشمیری سیاست دانوں کے ایک طبقہ کی علیحدگی پسند سوچ کے لیے بھرپور غذا بن گئی ہے، جس کے لیے سرحد پار سے ان کے تحفظ دینے

★ یہاں میں ایک عجیب واقعہ کا ذکر کرنا چاہوں گا کہ کتنی صلاحیت اور ہوشیاری سے سردار پٹیل نے دیسی ریاستوں کو ہندوستان میں شامل کرنے کا دشوار کن کام کیا۔ 1950 کی دہائی کی شروعات میں راجستھان میں سنگھ کے تشہیر کار کے طور پر میں جودھپور گیا تو جب میں نے سڑک پر کسی سے وقت پوچھا تو اس نے جواب دیا 'ہاڑے ہات' جو میری سمجھ میں نہیں آیا تو میں نے دوبارہ پوچھا۔ اس بار اس نے کہا 'ساڑھے سات'۔ میں نے کہا پہلے تو تم نے کچھ اور کہا تھا، تب اس شخص نے تاریخ کا ایک واقعہ سنایا کہ کیسے جے پور کے راج گھرانہ کو دوسرے راجہ ناپسند کرتے تھے۔ مغلوں نے جے پور کے راجہ جے سنگھ کو اپنی طرف کرنے کے لیے ان کو بلایا اور کہا 'ہماری نظر میں باقی دوسرے راجہ 'ایک ہیں' لیکن آپ 'سوائی' (ایک اور چوتھائی) ہیں'۔ اس کے بعد جے پور کے راجہ فخر سے اپنے نام سے پہلے 'سوائی' لگانے لگا۔ مغلوں کے ذریعہ جے پور کے راجہ کو دیا گیا یہ خطاب راجستھان کے دوسرے راجاؤں کو پسند نہیں آیا اور انھوں نے جے پور کے راجاؤں کو 'ہوائی' کہنا شروع کردیا، یہاں تک کہ 'س' سے شروع ہونے والے الفاظ استعمال کرنا ہی بند کردیا'۔

ریاستوں کے ہندوستان میں انضمام کے وقت سردار پٹیل نے اپنے مقصد کی برآوری کے لیے مختلف سام، دام — دنڈ، بھید اقدام کیے۔ بیشتر معاملوں میں راجاؤں کی دیش بھکتی کو اجاگر کرکے کچھ کو برائے نام طاقتوں کے ساتھ اقتدار کا لالچ دے کر اور کچھ اڑیلوں کو طاقت کی دھمکی دے کر، جے پور کے راجا اس لالچ میں آگئے اور انھیں ریاست کے گورنر کے یکساں 'راجہ پرمکھ' کہا جانے لگا۔ اس سے راجستھان کے دوسرے سبھی راجہ ناراض ہوگئے، خاص طور سے اودے پور کے مہاراجہ، پٹیل نے انھیں 'مہاراجہ پرمکھ' کا عظیم الشان عہدہ دینے کی پیشکش کی اور ساتھ ہی جے پور راجہ کی طرح انھیں بھی 21 توپوں کی سلامی ملنے کی یقین دہانی دلائی گئی۔ اس پیشکش نے کام کیا اور اودے پور کے مہاراجہ بھی انضمام کے لیے تیار ہوگئے۔

والے انھیں اکساتے رہے ہیں۔ ہندوستانی آئین کی دفعہ 19(1)اور(جی) کے مطابق ہندوستان کا کوئی بھی شہری ملک کے کسی بھی حصہ میں جا کر مستقل طور سے آباد ہوسکتا ہے، لیکن دفعہ 370 کے مطابق ملک کے کسی دوسری جگہ کا باشندہ جموں وکشمیر میں مستقل طور سے آباد نہیں ہوسکتا۔ اس سے جموں وکشمیر میں پیدا ہونے والی تعلیم یافتہ عورتوں کے اختیارات کی حق تلفی ہوتی ہے۔ ریاست کی کوئی خاتون شہری اگر ریاست کے باہر کے کسی مرد کے ساتھ شادی کرے تو اسے اپنے اثاثہ سے محروم ہونا پڑے گا۔ اپنے آبائی املاک پر بھی اس کا کوئی اختیار نہیں رہ جائے گا۔

میری پارٹی پہلے جن سنگھ کے طور پر اور اس کے بعد بی جے پی کی شکل میں بھی ہمیشہ دفعہ 370 کے خلاف رہی ہے اور اسے ختم کیے جانے کا مطالبہ کرتی رہی ہے۔ ہماری پارٹی کی قرارداد میں مستقل طور سے کشمیر کو ہندوستانی وفاق میں پوری طرح سے جوڑنے کا معاملہ رکھا جاتا رہا ہے، اتنا شاید کوئی معاملہ نہیں رکھا گیا ہوگا۔ مثلاً 1966 میں کانپور کانفرنس میں پیش کیے گئے 'دفعہ 370 کو ختم کرو' قرارداد میں جن سنگھ نے کہا تھا:

'جموں وکشمیر ہندوستان کا حصہ ہے۔ 1947 میں پاکستان نے اس کے ایک تہائی حصہ پر زبردستی قبضہ کرلیا، اسے خالی کرانے اور پاک مقبوضہ کشمیر کو آزاد کرانے کی ذمہ داری ہندوستانی حکومت کی ہے۔ جموں وکشمیر کے اس حصہ کو جو ہمارے ہاتھ میں ہے، بقیہ ہندوستان کے ساتھ آئینی طور سے جوڑنا ہندوستان کا داخلی معاملہ ہے۔ ہندوستانی آئین کی غیر مستقل دفعہ 370 جس کے مطابق جموں وکشمیر کا اپنا الگ آئین ہے، اس میں ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ اس نے جموں وکشمیر اور بقیہ ہندوستان کے لوگوں کے درمیان ایک نفسیاتی دیوار کھڑی کردی ہے، جس کا ناجائز فائدہ اٹھا کر ملک مخالف عناصر اور پاکستانی ایجنٹ ہندوستان کے قومی مفادات کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ ریاست میں عام زندگی بحال کرنے کے لیے اس دفعہ کو رد کیا جانا اور جموں وکشمیر میں ہندوستانی آئین کو مکمل طور سے نافذ کیا جانا ایک ضروری ولازمی کام ہے۔'

ان سطور کو پڑھ کر مجھے لگتا ہے کہ 42 سال کے بعد بھی اس پیغام کی ضرورت ابھی بھی ویسی ہی ہے۔ اپنی زندگی کے آخری دور میں — شاید 1962 کے چینی حملہ میں ہندوستان کی شکست کے تجربہ سے سبق لے کر — نہرو خود بھی دفعہ 370 کے معاملہ میں تھوڑا حقیقت پسند ہو گئے تھے۔ 27/نومبر 1963 کو انھوں نے لوک سبھا میں کہا تھا 'ہمارا ماننا ہے کہ دفعہ 370 جیسا آئین میں درج ہے ایک عبوری التزام ہے اور یہ حقیقتاً ایسا ہی وزیر داخلہ نے اشارہ کیا ہے اسے کمزور کردیا گیا ہے۔ گزشتہ کچھ برسوں میں ایسی کئی باتیں ہوئی ہیں جس سے جموں وکشمیر اور ہندوستانی فیڈریشن بہت نزدیک آگئے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ کشمیر پوری طرح سے جڑا ہوا ہے۔ اس طرح ہمیں لگتا ہے کہ دفعہ 370 کے بتدریج ختم ہونے کا عمل جاری ہے....'

دفعہ 370 کے بارے میں نہرو کے اس اعتراف نامہ کو بھی 44 برس گزر چکے ہیں، لیکن آج بھی یہ عبوری التزام ہندوستان کے آئین میں موجود ہے۔ ایسا اس لیے ہے کہ اس کا ختم کرنا کانگریس اور کمیونسٹ پارٹیوں کی نظر میں مسلم مخالف کام ہوگا۔ مختصراً ان کی تشویش وسیع قومی مفادات کے مقابلہ سماج کے ایک طبقہ کی چاپلوس نوازی ہے۔ میری پارٹی جو اسے ختم کرنے کی بات کرتی ہے، کو 'فرقہ وارانہ' اور 'علیحدگی' پسند کہا جاتا ہے۔ نام نہاد سیکولرازم کی اس مضحکہ خیزی کی اس سے بڑی اور واضح مثال شاید ہی کہیں دیکھنے کو ملے۔

دفعہ 370 سے جڑی ان سب باتوں کی صرف تاریخی اہمیت ہی نہیں ہے بلکہ ہندوستانی جمہوریت کے حال و مستقبل سے اس کا خاص تعلق ہے۔ 26/جون 2000 کو واجپئی حکومت کے دوران جب جموں وکشمیر قانون ساز اسمبلی نے ریاستی خودمختار کمیٹی کی ایک رپورٹ کو منظوری دے کر مرکزی حکومت سے اسے فوراً نافذ کرنے کے لیے کہا تو پورا ملک سکتہ میں رہ گیا۔ ریاستی خودمختار کمیٹی نے جموں وکشمیر کی آئینی صورت حالت کو 1953 سے قبل کی حالت میں واپس لانے اور اس طرح دفاع، کرنسی اور انفارمیشن معاملوں کو چھوڑ کر ریاست کے دیگر سبھی اختیارات کو بحال کرنے

کی سفارش کی تھی۔ اس وقت بی جے پی، کانگریس، جنتا دل (یو) اور کچھ علاقائی پارٹیوں کے ارکان پارلیمنٹ نے اس قرارداد کی مخالفت کی تھی۔

مرکزی کابینہ نے 4 ر جولائی کو منعقدا اپنے اجلاس میں جموں وکشمیر آئین ساز اسمبلی کی خودمختاری کو مسترد کر دیا۔ جیسا کہ میں نے اس دن میڈیا کو بتایا تھا — اسے منظور کرنے سے ریاست کے عوام کی خواہشات کا ملک کی سالمیت کے ساتھ ضم ہونے کا فطری عمل الٹ جائے گا۔ اگر حکومت اسے منظور کرے تو ایسے حالات پیدا ہوں گے جو قومی اتحاد کے لیے نقصان دہ ہوگا'۔ میں نے زور دیتے ہوئے کہا تھا کہ اگر چہ 'یہ مرکز سے ریاستوں کو زیادہ انتظامی اور مالی اختیارات کا براہ راست معاملہ ہے؟'' این ڈی اے حکومت سبھی ریاستوں کے لیے اس کے حق میں تھی نہ کہ صرف اکیلے جموں وکشمیر کے لیے۔ یوں بھی ریاستوں کو زیادہ اختیارات سونپنے کا معاملہ اور خودمختاری دینے میں بہت فرق تھا۔ میں نے یاد دلایا کہ جموں وکشمیر میں 1953 سے قبل کی آئینی حالت بحال کرنے کے معاملہ پر، 1975 میں اندرا گاندھی اور شیخ عبداللہ کے درمیان ہونے والے سمجھوتے کی بنیاد پر 25 سال قبل پہلے ہی بات چیت کر کے اس پر فیصلہ کیا جا چکا ہے۔ اس سمجھوتہ میں واضح طور سے کہا گیا تھا کہ ہندوستانی آئین کے جو التزامات جموں وکشمیر کی ریاست میں پہلے سے نافذ ہیں، وہ بغیر تبدیلی یا ترمیم کے ناقابل تبدیلی ہیں'۔

یہ ایسا موقع تھا جب اٹل جی اور مجھے جموں وکشمیر کے وزیر اعلیٰ ڈاکٹر فاروق عبداللہ کے ساتھ سختی سے پیش آنا پڑا تھا، جبکہ ان کی پارٹی نیشنل کانفرنس برسر اقتدار این ڈی اے کا ایک حصہ تھی۔ ہم نے ان سے کہا کہ وہ ریاستی خودمختار کمیٹی کی سفارش نافذ کرنے کے لیے دباؤ نہ ڈالیں، بالآخر فاروق عبداللہ نے اس معاملہ کو چھوڑ دیا۔

سردار پٹیل اور دفعہ 370:

دفعہ 370 پر اپنی بات چیت کو کچھ لحظہ ٹھہر کر میں اس کی تاریخ سے متعلق ایک اور اہم پہلو سے آپ کو آگاہ کرانا چاہتا ہوں۔ 90 کی دہائی کی شروعات کی بات ہے، میں اس موضوع سے متعلق دستاویزوں کی تلاش میں پارلیمنٹ لائبریری گیا۔ اسی دوران مجھے نہرو کے ذریعہ کیے گئے ایک حیرت انگیز تبصرہ کا مضمون دستیاب ہوا جس میں انھوں نے کہا تھا کہ اس التزام (دفعہ 370) میں سردار پٹیل کا تعاون رہا ہے۔ 24 ر جولائی 1952 کو لوک سبھا میں کشمیر پر دیئے گئے اپنے طویل بیان میں نہرو نے دفعہ 370 کو اس نکتہ پر مناسب ٹھہرانے کی کوشش کی تھی کہ چونکہ معاملہ اقوام متحدہ کو سونپا جا چکا ہے، اس لیے سارا عمل رکا ہوا ہے۔ انھوں نے مزید کہا تھا کہ آئین میں جموں وکشمیر کی حالت کا معاملہ نومبر 1949 میں ہی نمٹ گیا تھا اور سردار پٹیل ہی 'تمام وقت اس معاملہ کو دیکھ رہے تھے'۔

مزید آگے پڑھتے ہوئے مجھے پتہ چلا کہ نہرو کی اس بات میں سچائی تھی، کیونکہ جس آئین ساز اسمبلی نے اس دفعہ کو منظوری دی تھی اس وقت نہرو بیرون ملک گئے ہوئے تھے اور نائب وزیر اعظم کے طور پر سردار پٹیل ہی تمام سرکاری معاملے کو دیکھ رہے تھے، لیکن اس سے متعلق ایک دلچسپ قصہ ہے، جسے سردار پٹیل کے پرائیویٹ سکریٹری وی شنکر نے اپنی دو جلدوں میں شائع کتاب 'مائی ریمنی سینسز آف سردار پٹیل' میں کچھ تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ انھوں نے ہندوستانی وفاق کے ساتھ آئینی تعلقات تو منظور کر لیا لیکن اپنی پسند کے تین معاملے — دفاع، خارجہ اور انفارمیشن — وہ جموں وکشمیر حکومت کے پاس محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔ عبداللہ یہ بھی چاہتے تھے کہ ریاست کی آئین ساز اسمبلی کو قانون بنانے کی پوری آزادی ہو۔

بیرون ملک جانے سے قبل نہرو نے جموں وکشمیر سے متعلق التزامات کو شیخ عبداللہ کے ساتھ بیٹھ کر حتمی شکل دیا اور آئین ساز اسمبلی کے ذریعہ سے ان التزامات کو آگے بڑھانے کا کام اپنے وزیر دفاع گوپال سوامی آئنگر کو سونپ دیا۔ یہ واضح ہے کہ مسٹر آئنگر کو اس بات کا احساس نہیں

تھا کہ یہ کام اتنا پیچیدہ ہوگا۔ دفعہ کو آئین ساز اسمبلی کے پاس بھیجنے سے پہلے آئنگر نے ان تجاویز کو کانگریس پارلیمانی کمیٹی کی میٹنگ میں پڑھ کر سنایا۔ شنکر نے لکھا ہے کہ جب آئنگر نے تجاویز پڑھ کر سنائیں تو چہار جانب سے مخالفت کی شدید آوازیں اٹھنے لگیں اور آئنگر خود کو بہت تنہا محسوس کر رہے تھے۔ ایک غیر اثر دار حامی کے طور پر مولانا آزاد کو چھوڑ کر۔

شنکر کے مطابق 'پارٹی میں ایک بڑا طبقہ تھا جو جموں وکشمیر اور ہندوستان و دیگر نظر انداز کی گئی ریاستوں کے ساتھ اختلافات کے کسی بھی مشورہ کو دوررس نظریہ سے دیکھ رہا تھا اور جموں وکشمیر کو خصوصی ریاست کا درجہ دیئے جانے کے سلسلے میں ایک مقررہ حد سے آگے بڑھنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ سردار پٹیل خود اس بات کے حق میں تھے، لیکن نہرو اور گوپال سوامی آئنگر کے فیصلوں میں دخل اندازی نہ کرنے کی اپنی فطری پالیسی کی وجہ سے انھوں نے اپنے خیالات پیش نہیں کیے اور اس طرح نہرو اور آئنگر نے اپنے مطابق ہی سارا معاملہ نمٹایا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ قرارداد کا مسودہ تیار کرنے میں سردار پٹیل نے حصہ نہیں لیا تھا۔ ان کے بارے میں انھیں تب ہی پتہ چلا جب گوپال سوامی آئنگر نے کانگریس پارلیمانی کمیٹی کے سامنے اسے پڑھ کر سنایا۔'

کانگریس پارلیمانی کمیٹی کی میٹنگ میں اپنے ساتھ ہونے والے سخت برتاؤ سے دل برداشتہ ہو کر آئنگر بالآخر سردار پٹیل کے پاس پہنچے اور انھیں ان حالات سے بچانے کی درخواست کی۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اس کے بارے میں شنکر نے لکھا 'سردار پٹیل نے آئنگر کی بات سنی اور خاموش ہو گئے۔ جب میں نے ان سے پوچھا کہ وہ کیا جواب دیں گے تو اس پر انھوں نے کہا کہ میں اس بارے میں سوچوں گا۔ بعد میں شام کو انھوں نے مجھے فون کر کے بتایا کہ انھوں نے کانگریس کے ترجمان ستیہ نارائن سنہا سے پارٹی کی ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ، جس میں کچھ اہم لیڈران بھی ہوں گے، منعقد کرنے کے لیے کہا ہے، جس میں اس معاملہ پر بات چیت کی جائے گی۔ وہ میٹنگ میں مجھے بھی شامل رکھنا چاہتے تھے۔ میٹنگ مقررہ وقت پر ہوئی جس میں مولانا آزاد بھی موجود تھے۔ وہ میٹنگ نہایت ہی طوفانی اور سنسنی خیز رہی۔ گوپال سوامی کی تجویز کی زبردست مخالفت ہوئی۔ مولانا آزاد کی بات کو بھی شور مچا کر خاموش کرا دیا گیا۔ آخرکار بحث کو عام حالت میں لانے اور میٹنگ میں موجود لوگوں کو یہ سمجھانے کہ عالمی پیچیدگیوں کی وجہ سے ایک کام چلانے والا انتظام ہی کیا جا سکتا ہے کی ذمہ داری سردار پٹیل پر چھوڑ دی گئی۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کانگریس پارٹی نہ چاہنے کے باوجود سردار پٹیل کی خواہشات کے سامنے جھکی۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ آئین ساز اسمبلی میں اس التزام پر کوئی بحث اتنی سطحی اور بے مزہ کیوں تھی۔ آئنگر کے علاوہ اور کسی نے کچھ نہیں کہا، نہ ہی مخالفت میں اور نہ ہی حمایت میں۔ ممکن ہے کہ سارا غصہ اور غبار پارٹی کی میٹنگ میں پھوٹ چکا تھا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ دفعہ 370 'غیر مستقل' التزام کے لیے کانگریسیوں کو منانے میں سردار پٹیل کی کامیابی سے پٹیل اور ان کے نائب کے درمیان ایک طرح سے علیحدگی پیدا کر دی گئی۔ شنکر نے لکھا ہے 'گوپال سوامی کی تجاویز کے مسودہ پر سردار پٹیل کی خاموشی سے میں کچھ حیرت میں پڑ گیا تھا اور یہ سوچنے لگا تھا کہ اس تجویز کو منظور کر کے اس کی بنیاد پر انھوں نے ہندوستانی فیڈریشن اور دیگر ریاستوں کے حالات کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا ہے۔ سچ کہوں تو مجھے سردار پٹیل کے رویہ پر کافی غصہ آ رہا تھا اور جب دوپہر کے کھانے کے دوران ہم ان کی رہائش گاہ پر پہنچے، اس وقت میں خاموش اور مایوس تھا۔ میں وہاں سے سیدھے اپنے آفس چلا گیا۔ منی بین (سردار پٹیل کی بیٹی) مجھے دوپہر کے کھانے کے لیے بلانے آئی، میں نے انکار کر دیا اور انھیں اپنی ذہنی اذیت کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا کہ پہلی بار مجھے لگ رہا ہے کہ سردار پٹیل نے اعتماد شکنی کی ہے۔ انھوں نے یہ بات سردار پٹیل کو بتائی تو پٹیل نے پھر کہلوایا کہ کم سے کم بات چیت کے لیے ہی کھانے کی میز پر آ جاؤ۔ میں نے ایسا ہی کیا۔

جیسے ہی میں اپنی جگہ پر بیٹھا، سردار پٹیل بول پڑے 'تو تم مجھ سے ناراض ہو جو میں نے گوپال سوامی کے فارمولہ کو منظور کرلیا؟' میں نے کہا کہ اگر آپ کو ایسا ہی لگتا ہے تو آپ نے اپنے دل کی بات پہلے کیوں نہیں بتائی؟ اس کے جواب میں انھوں نے کہا 'میں اس حالات سے بہت پریشان تھا۔ گوپال سوامی نے نہرو کی صلاح کے مطابق ہی کام کیا تھا۔ اگر جواہر لال نہرو یہاں ہوتے تو میں ان سے بات کر کے اسے مسترد بھی کر دیتا، لیکن گوپال سوامی کے ساتھ میں ایسا کیسے کرسکتا تھا، جو صرف احکامات کی بجا آوری کر رہے تھے۔ اگر میں ایسا کرتا تو لوگ یہی کہتے کہ ان کے (نہرو کے) یہاں نہ رہنے پر میں ان کے سکریٹری سے اپنا انتقام لے رہا ہوں۔ گوپال سوامی نے مجھ سے مدد مانگی تھی، ایسی حالت میں ان کی غیر موجودگی میں، میں انھیں کیسے مایوس کرسکتا تھا؟'

شنکر نے آگے لکھا ہے 'تب میں نے کہا کہ ایسا ہے تو آپ نے پورے ملک اور ریاستوں کو نیچا کیوں دکھایا، جن کی آئین ساز اسمبلیاں، آپ کی پالیسی اور صلاح کے مطابق ختم کردی گئیں۔ اس تنقید کی مقصدیت کو انھوں نے قبول کیا، لیکن اس کے ساتھ انھوں نے ریاست (جموں و کشمیر) کی بین الاقوامی حالات اور ملک کے ساتھ ان کے تعلقات کی حساسیت کی جانب بھی اشارہ کیا۔ ہمیں احساس ہوا کہ فی الحال حالات پر ممکنہ نتائج کو دھیان میں رکھ کر غور و خوض کرنا ہوگا اور اس فارمولے کے تحت ایسا ہوگیا۔ انھوں نے کہا کہ نہ تو شیخ عبداللہ ہمیشہ رہیں گے اور نہ ہی گوپال سوامی۔ ملک کا مستقبل حکومت ہند کی فیصلہ کن طاقت اور عزم کے ساتھ طے ہوگا اور اگر ہم اپنی طاقت پر اعتماد نہیں کرسکتے تو ہم ایک ملک کی شکل میں رہنے کے لائق ہی نہیں ہیں۔'

اس اہم واقعہ کے بعد کی بھی ایک کہانی ہے۔ 24 / جولائی 1952 کو، جس دن نہرو نے لوک سبھا میں کشمیر سے متعلق اپنا بیان دیا تھا کہ جموں وکشمیر سے متعلق التزامات کے معاملہ کو سردار پٹیل ہی دیکھ رہے تھے، شنکر جو اس وقت آئنگر کی وزارت میں جوائنٹ سکریٹری تھے، اپنے وزیر کے پاس پہنچے اور ان کے ساتھ اس واقعہ پر غور و خوض کیا۔ نہرو کے بیان پر آئنگر نے کافی تلخ تبصرہ کیا تھا۔ 'یہ سردار پٹیل کی اس وسیع القلبی کا نتیجہ ہے جو انھوں نے اپنے بہترین فیصلہ کو چھوڑ کر پنڈت نہرو کے نظریہ کو منظور کرنے میں دکھائی۔'

مجھے امید ہے کہ قارئین، خاص طور سے نوجوان طبقہ مسئلہ جموں وکشمیر کی جڑوں کے بارے میں جاننے کی کوشش کریں گے، جن سے ہندوستان ابھی تک دوچار ہے، کیونکہ مسئلہ کے مناسب حل کے لیے اس کے بارے میں پوری معلومات ہونا ضروری ہے۔

ایک چہاررخی پالیسی: امن، جمہوریت، ترقی، مکالمہ

مارچ 1998 میں واجپئی حکومت کے کام سنبھالنے کے وقت تک مسئلہ جموں وکشمیر میں کئی نئے آیام جڑ کھل گئے تھے۔ پاکستان حامی سرحد پار دہشت گردی، کشمیری پنڈتوں اور جموں کے کچھ اضلاع میں ہندو پریواروں کو ان کے گھروں سے بھگانے کی منظم مہم، جموں وکشمیر اور لداخ علاقوں کے عوام کی شکایتیں، ملکی وغیر ملکی سیاحوں کی زبردست کمی اور ریاست کی سماجی و معاشی ترقی میں رکاوٹ کے نتائج کی شکل میں وسیع پیمانہ پر بے روزگاری کا مسئلہ۔

جس وقت این ڈی اے حکومت اقتدار میں آئی تھی — اس وقت دہشت گردی اپنے ہی ملک میں پلے بڑھے انتہا پسندوں کے ذریعہ معمولی طور پر اور کشمیر کو ہندوستان سے الگ کرنے کی ذہنیت — اپنے عروج پر تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ ان چنوتیوں سے نمٹنے اور جموں وکشمیر میں جمہوری عمل کی بحالی میں ہماری کامیابی کی بنیاد پر ہی تاریخ ہماری کارکردگی کا موازنہ کرے گی۔

ہمارے لیے اطمینان بخش بات یہ تھی کہ نیشنل کانفرنس — جو اس وقت جموں وکشمیر میں برسراقتدار تھی — نے این ڈی اے میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کے لیڈر اور اس وقت کے وزیراعلیٰ ڈاکٹر فاروق عبداللہ کشمیری عوام کے مقبول رہنما اور نیشنل کانفرنس کے بانی شیخ عبداللہ کے بیٹے تھے۔ عبداللہ فیملی کا بی جے پی کے ساتھ جڑنا اپنے آپ میں سیاسی اہمیت رکھتا تھا۔ 1953 میں ریاست میں نافذ قابل مذمت 'پرمٹ نظام' کی خلاف ورزی کر کے جموں وکشمیر میں داخل ہونے پر جن سنگھ کے بانی ڈاکٹر شیاما پرساد مکھرجی کو گرفتار کرنے کا حکم شیخ عبداللہ نے ہی دیا تھا۔ ڈاکٹر مکھرجی تو جموں وکشمیر ریاست کو ہندوستان میں مکمل طور سے ضم کرنے کے مقصد کے لیے ہی سری نگر میں شہید ہو گئے۔ 1953 میں جن سنگھ ایک ابھرتی ہوئی سیاسی پارٹی کی شکل میں تھی، لیکن اس کی نئی تخلیق بی جے پی 1998 میں نئی دہلی میں اقتدار میں تھی۔ اس طرح بی جے پی کے ساتھ مل کر عبداللہ فیملی نے ملک کی نئی سیاسی حقیقت کو قبول کر لیا تھا۔

ان کے ساتھ اپنی پہلی غیررسمی میٹنگ میں، میں نے ان سے کہا تھا 'فاروق صاحب! آیئے ہم تاریخ کو پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھیں۔ قدرت آپ کو سری نگر میں اور ہمیں نئی دہلی میں اقتدار میں لائی ہے۔ آیئے ہم جموں وکشمیر کے حالات میں مثبت تبدیلی لانے کے لیے مشترکہ طور پر کام کریں۔' دراصل ان کے ساتھ میرے اچھے ذاتی تعلقات قائم ہو گئے تھے۔ فاروق عبداللہ کے لڑکے عمر عبداللہ کو این ڈی اے حکومت میں کامرس کا وزیرمملکت بنایا گیا تھا۔ ایک نوجوان، تعلیم یافتہ لیڈر کی شکل میں عمر عبداللہ نے اچھا کام کیا۔

وزارت داخلہ کا کام سنبھالنے کے ایک مہینہ کے اندر ہی ایسا دردناک واقعہ ہوا کہ مجھے اور ڈاکٹر عبداللہ کو پران کوٹ اور ڈکیکوٹ جانا پڑا۔ جموں وکشمیر کے اودھم پور ضلع کے دو پہاڑی گاؤں جہاں دہشت گردوں نے 26 ہندوؤں کو مار دیا تھا، جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے۔ حقیقت میں دل دہلا دینے والا منظر تھا۔ دو ماہ بعد ایک بار پھر ہم دونوں کو ایک ساتھ جموں کے ڈوڈہ ضلع کے پریم نگر گاؤں کے دورے پر جانا پڑا، جہاں دہشت گردوں نے ایک شادی کی تقریب میں شامل 25 ہندوؤں کا قتل کر دیا تھا۔ دہشت گردوں کا مقصد مقامی لوگوں میں دہشت پھیلا کر اقلیتوں کو وہ مقام چھوڑنے کے لیے مجبور کرنا تھا۔ پریم نگر میں منعقد سوگ سبھا میں متاثرہ کنبوں کو ڈھارس دیتے ہوئے میں نے ان سے اپنا آبائی گاؤں نہ چھوڑنے کی درخواست کی تھی، لیکن اس سلسلے میں ان کی سیکورٹی یقینی بنانے کی حکومت کے عزائم کی بات کیے بغیر یہ درخواست کرنا میرے لیے کافی افسوسناک تھا۔ میں نے واضح الفاظ میں ان لوگوں سے کہا 'اگر میں آپ لوگوں کو تحفظ نہیں دے سکتا تو میرے وزیرداخلہ رہنے کا کوئی مطلب نہیں ہے۔'

ریاست کے وزیراعلیٰ، گورنر گریش چندر سکسینہ اور دیگر افسران کے ساتھ منعقد میٹنگوں میں میں نے کہا 'ریاست کی ضرورتوں کو پورا کرنے میں مرکزی حکومت کوئی کسر نہیں چھوڑے گی، لیکن اس طرح کے قتل کے واقعات روکنے کے لیے ہمیں ہر ممکن قدم اٹھانے ہوں گے۔ پنجاب میں دہشت گردی کو ختم کرنے کی اپنی کامیابی سے ہمیں یہاں سبق سیکھنے کی ضرورت ہے۔ پنجاب کے تجربہ سے ہمیں سیکھنے کو ملا ہے کہ ریاست کی پولس فورس اور انتظامیہ کی مشترکہ کوششوں اور مقامی لوگوں کی مدد سے ہی دہشت گردی کو کچلا جا سکتا ہے۔' ان کے ساتھ بات چیت کے بعد ہماری حکومت نے جموں وکشمیر میں بحالی امن کے لیے ایک چہاررخی پالیسی تیار کی — (الف) سرحد پار دہشت گردوں کے خلاف جم کر لڑائی، (ب) ریاستی قانون ساز اسمبلی کے لیے آزادانہ اور غیرجانبدارانہ انتخاب، (ج) بہتر حکومت کے ذریعہ سماجی ومعاشی ترقی میں پیش رفت اور (د) امن نواز سبھی سماجی اور سیاسی تنظیموں کے نمائندوں کے ساتھ سنجیدہ داخلی مکالمہ۔

جموں وکشمیر کے سیاسی پس منظر میں ایک اہم موڑ اس وقت آیا جب اگست 2000 میں ریاست کے ایک دورے میں وزیراعظم واجپئی نے یہ اعلان کیا کہ ہندوستان کی حکومت ریاستی عوام کی نمائندگی کرنے والی کسی بھی تنظیم کے ساتھ بات چیت کے لیے تیار ہے۔ بعد میں ماہ نومبر

میں رمضان کے مقدس ماہ کے شروع ہونے سے قبل انھوں نے یکطرفہ جنگ بندی کا اعلان کیا۔ اس اعلان کا کشمیری عوام پر بڑا جذباتی اثر پڑا۔ انھیں ہمارے خلوص اور ایمانداری پر یقین آ گیا اور پاکستان کی غلط اور منفی تشہیر کے ذریعہ ان کے دماغ میں بیٹھی خوف زدہ کرنے والی یہ باتیں بہت حد تک دور ہو گئیں کہ ہم ایک 'ہندو قوم پرست پارٹی' ہیں۔ اس سے پہلے واجپئی کے لاہور بس سفر اور پاکستان کے ذریعہ کارگل میں کی گئی اعتماد شکنی کا بھی کچھ ایسا ہی اثر ہوا تھا۔ اس طرح آہستہ آہستہ ہم کشمیری عوام کے دل و دماغ پر فتح پانے میں کامیاب ہو رہے تھے۔

جموں و کشمیر کی تاریخ کا قابل فخر آزادانہ انتخاب

2002 کا اسمبلی انتخابات ہمارے لیے ایک امتحان ثابت ہونے والا تھا، جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔ مرکز میں کانگریسی حکومتوں کی وجہ سے ریاست جموں و کشمیر میں انتخابی دھاندلیوں کی ایک طویل تاریخ رہی ہے۔ اس سے کشمیری عوام میں یہ بات بیٹھی ہوئی تھی کہ مرکزی حکومت عوام کی خواہشات کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی پسند کے لوگوں کو ہی سری نگر میں اقتدار کی کرسی پر بٹھائے گی۔

پاکستان اپنے فائدہ کے لیے اس بات کو ہوا دیتا رہا تھا۔ این ڈی اے نے وعدہ کیا کہ جموں و کشمیر میں انتخاب پوری طرح آزادانہ اور غیر جانبدارانہ ہوں گے اور عوام کو اپنی پسند کی حکومت ملے گی۔ آزادانہ اور غیر جانبدارانہ انتخاب ہونے کے امکانات سے مختلف پاک حمایت یافتہ دہشت گرد اور علیحدگی پسند تنظیموں کو ورغلا دیا گیا۔ ووٹنگ سے قبل ہونے والے دہشت گردانہ حملوں میں تقریباً 250 افراد مارے گئے، جن میں سیاسی کارکنوں کے علاوہ ممکنہ امیدوار اور جمہوریت حامی دانشور بھی شامل تھے، جو ووٹنگ کا بائیکاٹ کرنے کے دہشت گردوں کے اعلان کے خلاف تھے۔ مہلوکین میں خاص طور سے عبدالغنی لون جو حریت کانفرنس کے نرم گروپ کے لیڈر تھے۔ دہشت گرد اور پاکستان میں بیٹھے ان کے آقا اپنے مخالفین کا منھ گولیوں سے بند کر دینا چاہتے تھے۔

پھر بھی بیلٹ بنام بلیٹ یعنی انتخاب بنام گولی کی اس لڑائی میں بالآخر جمہوریت کی ہی جیت ہوئی۔ ستمبر/اکتوبر 2002 میں انتخابات مکمل ہوئے، جس میں تقریباً 44 فیصد عوام نے اپنی رائے دہی کا استعمال پورے جوش و خروش سے کیا۔ ماضی میں ہونے والے انتخابات سے یہ انتخاب بالکل مختلف تھا۔ تقریباً سبھی سیاسی پارٹیوں، آزاد امیدواروں، عالمی مشاہدین اور غیر سرکاری تنظیموں، حقوق انسانی کے رضاکاروں اور ہندوستانی و غیر ملکی میڈیا، سبھی نے مانا کہ یہ جموں و کشمیر کی انتخابی تاریخ میں سب سے زیادہ غیر جانبدارانہ و آزادانہ انتخاب تھے۔ دو دہائیوں سے سب سے زیادہ عرصہ تک اقتدار میں رہنے کے بعد نیشنل کانفرنس اقتدار سے باہر ہو گئی۔ نو منتخب اسمبلی میں مفتی محمد سعید کی پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی سب سے بڑی سیاسی پارٹی کی شکل میں ابھری۔ کانگریس کے ساتھ مل کر اس نے حکومت بنائی۔

جموں و کشمیر میں جس طرح جمہوریت کو کامیابی مل رہی تھی اس وقت پاکستان جمہوریت کا مذاق اڑا رہا تھا۔ اکتوبر 2002 میں ہونے والے انتخاب کو پاکستان اور عالمی برادری کے ذریعہ 'غلط' اور 'ہیرا پھیری' قرار دیا گیا۔ اسی سال اپریل میں ہونے والے ریفرنڈم کے بارے میں بھی کچھ اسی طرح کی رائے زنی کی گئی تھی، جس میں جنرل پرویز مشرف نے 98 فیصد ووٹوں کے ذریعہ خود کو 'صدر' کی شکل میں منتخب ہونا بتایا تھا۔

جموں و کشمیر میں واجپئی حکومت کی جمہوریت کی جیت کی سب سے خوبصورت سند 'انڈین ایکسپریس' کے مدیر اور عالمی معاملوں کے مبصر شیکھر گپتا کے ان الفاظ میں ظاہر ہوتا ہے——

'جموں و کشمیر میں آزادانہ اور غیر جانب دارانہ انتخابات یقینی بنانے کی ہماری حکومت کی یقین دہانی اور مشرف کے اپنے 'جمہوریت کے نقشہ'

میں ان کے پہلے میل کے پتھر میں ایک یکسانیت کی بات یہ تھی کہ دونوں نے ہی ناممکنات حالات سے باہر نکلنے کے لیے جمہوریت کا راستہ اختیار کیا۔ دونوں ہی معاملوں میں اعتماد اور قانون کا بحران تھا۔ عالمی برادری اور خاص طور سے کشمیری عوام کو یہ یقین دلانا ہمارے لیے مشکل کام تھا کہ ہماری جمہوریت نے انھیں سب سے اعلیٰ وسائل دیئے ہیں۔ مشرف جانتے تھے کہ انتخاب کے بغیر ان کی حکومت اخلاقی طور سے قابل قبول نہیں ہوگی، بھلے ہی انھیں ملنے والی عالمی حمایت کتنی کیوں نہ ہو۔ بس یہیں یکسانیت ختم ہو جاتی ہیں۔ ایک جانب ہندوستان کی فعال اور سرگرم جمہوریت کشمیر جیسے مشکل حالات میں اپنے قومی مفادات کو بحال کرنے کے لیے انتخابات کا راستہ اپناتی ہے اور دوسری جانب پاکستان میں ایک فوجی تاناشاہ اپنے ہی عوام کا منھ بند کرنے اور اپنے غیر ملکی مددگاروں کو پریشانی سے بچانے کے لیے انتخاب کو ڈھال کی شکل میں استعمال کرتا ہے، جبکہ اپنی عوام کی خواہشات کا احترام کرنے کا اس کا کوئی مقصد ہی نہیں ہے۔

'ہندوستان کے لیے یہ فخر کرنے کا لمحہ ہے، اس لیے ہمیں اپنی حکومت، اس کے سب سے بڑے لیڈروں کی دوراندیشی، اپنے مسلح فورسیز کی ایمانداری و بہادری اور الیکشن کمیشن اور اس کے افسران و ملازمین کے عزم کی ستائش خوب ہونی چاہیے۔ جنھوں نے دہشت گردوں کی گولیوں اور ماضی میں ہونے والے دھاندلی اور غلط ووٹنگ اور کھوکھلے وعدوں کی وجہ سے شک وشبہ پر فتح پائی۔'

جموں وکشمیر میں جمہوری حکومت کی بحالی اور کچھ حد تک عمومی حالات کی بحالی کو میں این ڈی اے حکومت کی سب سے شاندار کامیابیوں میں سے ایک قرار دیتا ہوں۔ کنٹرول لائن پر امن ہے۔ ہندوستان و پاکستان دونوں ہی فریق کی جانب سے گولیوں کی آوازیں تھم گئی ہیں۔ سرحدی گاؤں میں شانتی کا ماحول ہے، جس کے لیے دیہی علاقہ کے لوگ دو دہائیوں سے ترس رہے تھے۔ سری نگر، گلمرگ، پہلگام اور کشمیر کے دوسرے خوبصورت مقامات پر سیاحوں کی آمدورفت شروع ہوگئی ہے۔ امرناتھ کی سالانہ تیرتھ یاترا ملک بھر کے ہزاروں عقیدت مندوں کو متوجہ کر رہا ہے۔ سرحد پار سے پاک تربیت یافتہ دہشت گردوں کی دراندازی پوری طرح سے بند نہیں تو کم ضرور ہوئی ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ وادیٔ کشمیر میں دہشت گردوں کی جڑیں کافی خشک ہو چکی ہیں۔ عوام امن کے خواہش مند ہے، جس سے دہشت گرد بالکل الگ پڑ گئے ہیں۔ یہ سب جموں وکشمیر کے مستقبل کے لیے ایک اچھا اور مثبت اشارہ ہے۔

حریت کے ساتھ بات چیت: 'گولیوں کی آواز کو سیاست کی پکار میں بدلیں'

وزیر داخلہ کے طور پر جموں وکشمیر سے متعلق سب سے بڑا قدم اُٹھاتے ہوئے میں نے کشمیر کے اہم علیحدگی پسند تنظیموں اور مذہبی وسیاسی رہنماؤں، آل پارٹیز حریت کانفرنس کے نرم گروپ کے لیڈروں کے ساتھ بات چیت شروع کی۔ نئی دہلی میں میرے آفس میں 22 رجنوری اور 27 رمارچ 2004 کو بات چیت کے دو دور ہوئے۔ حریت وفد کی قیادت اس کے صدر مولوی عباس انصاری کر رہے تھے۔ وفد کے چار رکن تھے: میر واعظ عمر فاروق، بلال غنی لون، عبدالغنی بٹ اور فضل الحق قریشی۔ حریت کانفرنس کے ساتھ بات چیت کا فیصلہ میں نے کیوں کیا، جس کے پاکستان کی جانب جھکاؤ سے سب واقف تھے اور جس نے 2002 کے اسمبلی انتخابات کا بائیکاٹ کیا تھا، جس کے کچھ لیڈروں کے دہشت گرد تنظیموں کے ساتھ تعلقات تھے؟ یوں اپنی پارٹی اور سنگھ پریوار کے کچھ لوگ بھی میرے اس فیصلہ سے حیران تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ دوسرے فریق سے بھی شک اور حیرانی کی بات تھی، کیونکہ 'سخت' اور 'کٹر ہندو' کی میری شناخت کے باوجود حریت لیڈروں نے میرے ساتھ بات چیت کی درخواست کی تھی۔ جولائی 2002 میں وزیراعظم واجپئی کے ساتھ آگرہ میں منعقد سربراہ مذاکرات کی ناکامی کے لیے مجھے موردالزام ٹھہرا کر

پاکستانی صدر پرویز مشرف نے میری اس شبیہ کو اور بھی ہوا دی تھی۔

حریت لیڈروں کے ساتھ میری بات چیت حقیقت میں واجپئی حکومت کی اس پالیسی کا ہی حصہ یا توسیع تھی جو اس نے ریاست میں امن وامان بحال کرنے کے لیے اپنائی تھی۔ ہماری پالیسی کے دو حصے تھے اور ہماری حکومت کو دونوں میں اہم کامیابی ملی تھی۔ سرحد پار دہشت گردی کے خلاف ہندوستان کی لڑائی میں وزیراعظم واجپئی نے جنوری 2004 میں ایک بڑی سفارتی جیت حاصل کی۔ پاکستان نے پہلی بار ایک مشترکہ بیان جاری کر کے یہ یقین دہانی کرائی کہ وہ اپنی زمین کا استعمال ہندوستان کے خلاف دہشت گردانہ سرگرمیوں کے لیے نہیں ہونے دے گا۔ یہ بیان سارک کانفرنس میں واجپئی-مشرف کی میٹنگ کے بعد جاری کی گئی تھی۔ داخلی طور پر دیکھا جائے تو جموں وکشمیر میں ہونے والے آزادانہ و غیر جانب دارانہ انتخابات اور عوام کے مثبت ردعمل سے نہ صرف واجپئی کی حکومت پر لوگوں کا اعتماد بڑھا، ریاست میں بھی اور بیرونی ممالک میں بھی، بلکہ اس سے یہ واضح پیغام بھی گیا کہ عام لوگ دہشت گردی کے خلاف ہیں۔

حریت کانفرنس ان واقعات کے اثرات سے خود کو الگ نہیں رکھ سکی، جو ستمبر 2003 میں اس کے ٹوٹنے سے بھی واضح ہو گیا۔ اس کے نرم لیڈروں کو جو جموں وکشمیر میں تشدد وخون خرابہ کو ختم ہوتے دیکھنا چاہتے تھے۔ اب بات چیت کے عمل میں شامل ہونے کی اہمیت اور فائدہ سمجھ میں آ گیا تھا، جو واجپئی حکومت نے 2001 میں شروع کی تھی۔ مرکزی حکومت کی جانب سے بات چیت کے لیے پہلے پلاننگ کمیشن کے وائس چیئر مین کے سی پنت کو نامزد کیا گیا۔ پھر اس وقت کے وزیر قانون ارون جیٹلی کو اور بعد میں این این ووہرہ — جموں وکشمیر سے متعلق معاملوں کی اچھی جانکاری رکھنے والے ایک اعلیٰ ایڈمنسٹریٹو افسر کو نامزد کیا گیا۔ جنہوں نے ریاست کی سماجی اور سیاسی تنظیموں کے نمائندوں کے ساتھ بات چیت کی۔ بات چیت کے عمل سے خود کو الگ رکھنے والی ایک تنظیم تھی آل پارٹیز حریت کانفرنس۔ سیکورٹی کے مسئلہ پر تشکیل دی گئی وزارتی کونسل کمیٹی کی اکتوبر 2003 میں میٹنگ ہوئی، جس میں فیصلہ لیا گیا تھا کہ مجھے حریت کانفرنس کے ساتھ بات چیت کرنی چاہیے۔ آل پارٹیز حریت کانفرنس سے الگ ہونے والے دھڑے جو کشمیر کو پاکستان میں ملانے کی وکالت کرتے ہوئے دہشت گردی کی حمایت کر رہا تھا — کے لیڈر سید علی شاہ گیلانی کو چھوڑ کر دیگر بیشتر لیڈروں نے اس فیصلہ کا خیر مقدم کیا۔

یہاں یہ قابل ذکر ہے کہ حریت لیڈروں کے ساتھ بات چیت کے میرے اور وزیراعظم کے پرنسپل سکریٹری اور قومی سیکورٹی صلاح کار برجیش مشرا اور اے ایس دُولت 'را' کے سابق سربراہ جو وزیراعظم آفس میں جموں وکشمیر معاملہ پر ایک صلاح کار کے طور پر کام کر رہے تھے، کے طریقوں میں بڑا فرق تھا۔ دولت کشمیر کی مختلف پارٹیوں کے لیڈروں کے ساتھ مسلسل رابطہ میں تھے۔ مجھے پتہ چلا کہ ان سے حریت لیڈروں کو یہ اشارہ ملا ہے کہ حکومت ہندوستانی آئین کی حدود سے باہر نکل کر کشمیر مسئلہ کا حل تلاش کرنے کے لیے تیار ہے۔ یہ بات میرے لیے تشویشناک تھی۔ حریت کے وفد کے ساتھ اپنی پہلی ہی میٹنگ میں میں نے واضح کر دیا کہ سرکار کے ذریعہ ہندوستانی آئین کے دائرہ سے باہر کسی بھی تجویز کو منظور کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

بات چیت کا پہلا دور * جو تقریباً قریب ڈھائی گھنٹہ تک چلا، دونوں ہی فریق کی جانب سے آزادانہ وواضح رہا اور کافی مثبت بھی۔ 'مثبت'

* بات چیت کے دونوں مرحلوں میں میرے ساتھ اہل اور باصلاحیت افسران کی ایک معاون ٹیم ساتھ رہی تھی، جس میں حکومت کے ذریعہ مکالمہ کے لیے جموں وکشمیر کے نمائندوں سے نامزد مذاکرات کار این این ووہرہ کے علاوہ داخلہ سکریٹری این گوپال سوامی، خفیہ ایجنسی بیورو کے ڈائریکٹر کے پی سنگھ، 'را' کے سربراہ سی ڈی سنہا، اسپیشل سکریٹری (داخلہ) بی بی مشرا اور وزیراعظم آفس میں نامزد خصوصی افسر اے ایس دولت شامل تھے۔

اس لیے کہہ رہا ہوں کہ میں خود اور حریت لیڈر اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ 'پانچ دہائی سے کشمیر میں جاری سبھی طرح کی پر تشدد کاروائیوں کا خاتمہ ہونا چاہیے۔' اور 'گولیوں کی تڑتڑاہٹ کی جگہ سیاسی آواز گونجنی چاہیے۔' ساتھ ہی ہم کشمیر سے متعلق سبھی مسئلوں کو حل کرنے کے لیے ایک 'خصوصی طریقہ اپنانے پر متفق' ہو گئے تھے۔

جموں وکشمیر کے حالات کے بارے میں بالغ نظری سے میں نے بات چیت شروع کی، جس میں تین نکات پر زور دیا گیا تھا— بحالی امن کا ہمارا مصمم ارادہ اور ذمہ داری، حریت اور دیگر پارٹیوں کے لیڈروں کے ذریعہ اٹھائے جانے والے سبھی حساس معاملوں پر ہمارا لچیلا پن اور ہندوستان کے غیر منقسم حصے کی شکل میں جموں وکشمیر میں ہمارا ٹھوس اور مستحکم رویہ۔ میں نے حریت لیڈروں کو واضح کر دیا تھا کہ ہندوستان مسئلہ کشمیر کو حل کرنے کے لیے ماضی میں پاکستان اور حریت کانفرنس کے ذریعہ مجوزہ سہ فریقی بات چیت ہندوستان، پاکستان اور حریت کانفرنس کے درمیان ہو کبھی بھی متفق نہیں ہوگی۔ میں نے یہ بھی وضاحت کی کہ کیوں واجپئی حکومت نے جموں وکشمیر کو 1953 سے قبل کا درجہ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کے ساتھ میں نے یہ بھی کہا کہ ریاست کے لیے کچھ خصوصی مراعات کے بارے میں فطری باتوں پر حکومت غور کرنے کے لیے تیار ہے، جس سے ریاست میں عملی طور سے امن کی بحالی اور ریاست کو قومی دھارا سے جوڑ کر اس کی ترقی کرانے میں مدد ملنے والی ہو۔

میں نے کہا تھا 'کشمیر کے درد کا احساس سبھی ہندوستانیوں کو ہے، کیونکہ ہم آپ لوگوں کو الگ یا غیر نہیں سمجھتے۔' ساتھ ہی میں نے دو دہائیوں سے وادی کے باہر کیمپوں میں رہ رہے کشمیری پنڈتوں کی دگرگوں حالت کی جانب بھی ان کو متوجہ کیا— 'میں ایسے کسی بھی حل کو کل وقتی اور خوش آئند نہیں مانتا جس کے نتیجے میں وہ سبھی کشمیری پنڈت اور وہ سبھی مسلمان کشمیر واپس نہ لوٹ سکیں، جو تشدد اور خون خرابہ کی وجہ سے اپنا گھر بار چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ وادیٔ کشمیر میں بحالی امن کے لیے یہی ایک اہم کسوٹی ہے۔'

جنوری اور مارچ کی دونوں میٹنگوں میں ریاست کی حالت پر اپنے سوچ اور نظریہ کو پیش کرتے ہوئے حریت لیڈروں نے دو نکات پر زور دیا— سیکورٹی دستوں کے ذریعہ 'حقوق انسانی کی پامالی اور سیاسی قیدی۔' 'ہم نہیں چاہتے کہ جموں وکشمیر فوجی چھاؤنی بنا رہے۔' انھوں نے شکایت کی تھی۔ 'ہم چاہتے ہیں کہ جموں وکشمیر میں عامہ زندگی ممکن ہو۔' میں نے کہا 'ہم بھی چاہتے ہیں کہ جموں وکشمیر کے لوگ خوف وخون خرابہ سے آزادانہ زندگی گزاریں۔' حکومت مبینہ حقوق انسانی کی پامالی کو روکنے کے لیے ضروری قدم اٹھائے گی۔ انھیں یہ یقین دلاتے ہوئے میں نے کہا 'ہم نے احکامات جاری کر دیئے ہیں کہ سیکورٹی فورسز فرض کی ادائیگی کے دوران انسانیت سے پیش آئیں۔' اس یقین دہانی کا فوری ردِّعمل بھی ہوا۔ اس طرح جنوری کی میٹنگ میں، میں انسانیت کی بنیاد پر جموں وکشمیر کی جیلوں میں نظر بند کیے گئے سیاسی قیدیوں— بدترین جرائم کے ملزمان کو چھوڑ کر— کو رہا کرنے پر غور کرنے کے لیے راضی ہو گیا تھا۔ دوسری میٹنگ سے پہلے حکومت 69 قیدیوں کو چھوڑ چکی تھی اور 500 سے زائد دیگر معاملوں پر تیزی سے کاروائی کر رہی تھی۔

جون میں ہم دوبارہ ملنے والے تھے، جب میں نے حریت لیڈروں سے کہا تھا 'ہم کل وقتی مسائل پر بات کریں گے۔' لیکن وہ میٹنگ نہ ہو سکی، کیونکہ 2004 کے پارلیمانی انتخابات میں این ڈی اے کی شکست ہو گئی۔ واجپئی حکومت کی شکست پر حریت لیڈروں نے سرعام افسوس کا اظہار کیا تھا۔ پھر بھی، اب جب کبھی میں حریت لیڈروں کے ساتھ اپنی بات چیت کے بارے میں سوچتا ہوں تو مجھے کافی طمانیت کا احساس ہوتا ہے۔ بیشتر مبصروں نے ہماری بات چیت کو امن کی راہ پر ایک 'میل کا پتھر' قرار دیا تھا۔ 'ہم آگے بڑھ رہے ہیں، پیچھے اور لوگوں کی بنیادی سوچ اور نظریہ میں تبدیلی آئی ہے۔' آل پارٹیز حریت کانفرنس کے ترجمان عبدالغنی بٹ نے کہا۔

میرے اطمینان کی ایک بنیاد یہ ہے کہ بات چیت کے دوران میں نے حریت لیڈروں میں ایمانداری اور کچھ حد تک کھلا پن دیکھا۔ ساتھ ہی میں خود بھی انھیں جموں وکشمیر میں بحالی امن کے تئیں اپنی اور واجپئی حکومت کی ذمہ داری وفرائض اور ایمانداری کا یقین دلانے میں کامیاب رہا۔ پاکستانی اخبار 'ڈیلی ٹائمز' کے واشنگٹن کے نمائندہ نے لکھا تھا—

''میر واعظ عمر فاروق کے ذہن میں ہندوستان کے سخت نظریہ کے حامی نائب وزیر اعظم لال کرشن آڈوانی کے تئیں زبردست عقیدت ہے، جس کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ آڈوانی 'حریت کی دہلی آکر بات چیت کرنے کی باریکی کو پوری طرح سمجھتے ہیں۔' 'انڈیا ابراڈ' میں شائع ایک انٹرویو میں کشمیری لیڈر، جو ہندوستان کے ساتھ بات چیت کی حمایت کرنے والے گروپ کے اہم رکن ہیں، نے کہا تھا 'ہم ہندوستانی حکومت کے ذریعہ شروع کیے گئے اس عمل کو مستحکم کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کریں گے۔' میٹنگ کے بعد انھوں نے کہا' آڈوانی جی کے تئیں میرا نظریہ بدلا ہے۔ جس طرح انھوں نے حریت کانفرنس کے ساتھ بات کی، اس سے ان کی سچائی اور حقائق کا پتہ چلتا ہے۔

مسٹر آڈوانی نے حریت کانفرنس سے کہا کہ مسئلہ کشمیر ایک دن میں حل ہونے والا نہیں ہے اور 'حساس ترین مسئلوں' کو حل کرنے میں وقت لگے گا۔ انھوں نے اس کے لیے ایک مرحلہ وار عمل اپنانے کی وکالت کی۔ میر واعظ عمر فاروق نے کہا کہ وفد کو کئی معاملوں پر اختلاف ہونے کا اندیشہ تھا، لیکن جو بھی معاملے یا مسائل ہم نے اٹھائے اسے انھوں نے نہایت صبر وتحمل سے سنا اور ان میں سے بیشتر پر اپنی رضامندی کا اظہار کیا۔ میر واعظ عمر فاروق نے دہلی کی میٹنگ پر وادیٔ کشمیر کے عمل کو مثبت بتایا اور یہ بھی کہا کہ حالات انتہائی حوصلہ افزا و پرامید ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اگر حکومت بند قیدیوں کو آزاد کرنے جیسا کوئی فوری قدم اٹھاتی ہے تو 'جموں وکشمیر کے لوگوں کی سوچ اور ذہنیت میں بڑی تبدیلی نظر آئے گی۔' انھوں نے کہا کہ 'حریت کے ساتھ بات چیت شروع کرنے کا سہرا وزیر اعظم واجپئی کو جانا چاہیے۔' واجپئی کے بارے میں انھوں نے کہا کہ 'وہ دور اندیش شخصیت' ہیں اور 'آگے کی جانب بڑھنا' چاہتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ مسٹر واجپئی امن کے موضوع پر انتخاب لڑ رہے ہیں، جس کا سہرا انھیں ملے گا اور مسٹر آڈوانی کو بھی اس کا 'فخر' حاصل ہوگا۔''

مولوی عباس انصاری کی باتوں میں بھی ان جذبات کی عکاسی ہوتی ہے—

''واجپئی امن کے سفیر ہیں، وہ دل سے شاعر ہیں اور ان سے ہمیں ڈھیر ساری امیدیں ہیں۔ ہمارے وفد کے ساتھ بات چیت میں آڈوانی جی نے بڑی صاف گوئی اور سچائی دکھائی۔ وہ مسئلہ کشمیر حل کرنا چاہتے ہیں اور بات چیت کے لیے بہتر ماحول تیار کرنا چاہتے ہیں اور ان کے حقیقتوں سے پر نظریہ سے ہی آزادانہ بات چیت میں مدد ملتی ہے۔''

ایک خواہش اور ایک دعا

میری ایک خواہش اور ایک دعا ہے کہ جموں وکشمیر ایک بار پھر عام لوگوں کے لیے امن وامان کا گہوارہ اور آپسی بھائی چارہ کی زمین بنے۔ یہ ایسی زمین ہے جسے قدیم دور میں ہندوستان کے رشیوں نے اور عہد وسطیٰ میں صوفی سنتوں نے مقدس بنایا تھا۔ اسے شیو، بودھ اور مذہب اسلام نے ایک لاثانی روحانی گہوارہ بنایا تھا۔ دور قدیم میں کشمیر، جہاں 'شاردا پیٹھ'، وِدّیا کی دیوی سرسوتی قیام کرتی ہیں، کی شکل میں جانا جاتا تھا۔ سری نگر کی خوبصورت ڈل جھیل کے اوپر واقع ایک پہاڑی پر آدی شنکر آچاریہ کا ایک مندر ہے۔ اپنے آبائی شہر سندھ اور جموں وکشمیر کے درمیان مجھے کئی ایک یکسانیت دکھائی دیتی ہیں۔ کچھ اس وجہ سے بھی کہ سندھ ندی لداخ علاقہ سے نکلتی ہے، جو اس ریاست میں واقع ہے۔

کشمیر کی عظیم شاعرہ لال دید یا للیشوری ہندو-مسلم اتحاد کی پیامبر تھیں۔صوفی سنت شیخ نورالدین کشمیری ہندو 'نندرشی' کے نام سے جانے جاتے ہیں۔

آپسی محبت و بھائی چارہ اور مختلف النوع روایت کا یہ گہوارہ جسے کشمیریت کہتے ہیں، کو سنوار کر رکھنا ضروری ہے۔20ویں صدی کے کشمیر کے عظیم شاعر غلام احمد مہجور (1952-1887) نے لکھا ہے:

سندھ ندی میں اشنان کرو
مانس بل ★ میں دھیان کرو
اور ہرمکھ ★★ پر ایشور کا ساکشاتکار

کشمیری ہونے کے ناطے، تمہاری ایک ہی دھرتی اور آدرش ہے
اَکارن ایک دوسرے سے الگ مت ہو

مسلم دودھ ہیں اور ہندو چینی
دودھ میں چینی ملا کر اسے میٹھا کر دو

ہندو پتوار ہوں، مسلم ہو ناؤ
تب دیکھنا کیسے چلتی ہے ہماری ناؤ

اَگیانتا کو بھگاؤ اور دیکھو کون ہے
ہماری ماتر بھومی کا ہتیشی اور کون ہے شترو

آپسی جھگڑوں میں کسی انجان کو مت بلاؤ
خود ہی انھیں سلجھاؤ

مہجور نے ایکتا کا پاٹھ پڑھایا ہے
اسے یاد کر لو اور ایک دوسرے کو پڑھاؤ

مندرجہ بالا سطور سب کچھ کہہ دیتی ہیں۔

★ مانس بل جھیل — جو سری نگر سے 30 کلومیٹر کے فاصلہ پر ہے۔اسے کشمیر کی سبھی جھیلوں سے شاندار کہا جاتا ہے۔اس کے قریب ہی آٹھویں صدی کا ایک ہندو مندر واقع ہے۔

★★ ہرمکھ ایک اونچا پہاڑ ہے جس کے گلیشیئروں سے سندھ ندی نکلتی ہے۔

9

آگرہ میں واجپئی-مشرف سربراہ کانفرنس اس کی ناکامی ہندوستان کے لیے بالآخر کامیاب کیسے رہی

تمہارے پاس صرف کام کرنے کا اختیار ہے، لیکن کبھی اس کے نتائج کا دعویٰ مت کرو۔ نتائج تمہارے کام کا مقصد نہیں ہونا چاہیے، ساتھ ہی یہ نااہلیت سے جڑا نہیں ہونا چاہیے۔

— بھگوت گیتا میں شری کرشن کے ذریعہ ارجن کو دی گئی فرائض کی تعلیم

زندگی میں اچھے ارادے سے کیے گئے ہر کام میں کامیابی حاصل نہیں ہوتی۔ انسان کا جزو لاینفک ہے کامیابی اور ناکامی۔ میں نے ایسی کسی بھی کوشش سے بچنے کی کوشش نہیں کی ہے جو مجھے ملک کے مفاد میں دکھائی دی ہو، خواہ اس میں ناکام ہونے اور اس حالت میں مجھ پر ذاتی طور پر غلط ہونے کا خطرہ کیوں نہ رہا ہو۔ میں نے کئی بار دیکھا ہے کہ متعدد بار کامیابی میں ناکامی میں پنہاں ہوتی ہے اور ابتدا میں جو لاچاری ہوتی ہے وہ بالآخر دوررس اور حوصلہ افزا ثابت ہوتی ہے۔

این ڈی اے حکومت میں ہندوستان کے وزیر داخلہ کے طور پر جولائی 2001 میں آگرہ میں منعقد وزیر اعظم واجپئی اور پاکستانی صدر جنرل پرویز مشرف کی سربراہ کانفرنس کا ناکام ہونا ایسا ہی ایک واقعہ ہے۔ سربراہ کانفرنس کے فوراً بعد اور اس کے بعد اپنی بایوگرافی میں بھی مشرف نے اس کے لیے مجھے انفرادی طور پر ذمہ دار ٹھہرایا تھا۔ ہندوستان میں میری پارٹی کے کچھ سیاسی مخالف اب بھی یہی رویہ اختیار کیے ہوئے ہیں کہ میری 'جارحیت' اور 'ضدی شخصیت' اس کی وجہ تھی۔ یہاں میں پورا واقعہ وضاحت سے پیش کرنا چاہتا ہوں۔

مشرف کو مذاکرات کے لیے دعوت دینا میرا ہی مشورہ تھا

فروری 1999 میں نواز شریف کی دعوت پر وزیر اعظم واجپئی اپنے دل میں امن کا سچا مقصد لے کر ہی بذریعہ لاہور بس پاکستان گئے

تھے۔ پاکستانی وزیراعظم کے ساتھ ان کی بات چیت اور لاہور اعلامیہ سے دونوں ممالک کے درمیان جاری گزشتہ پانچ دہائی پرانی دشمنی کو ختم کرنے کی سمت میں پیدا ہوئی امیدیں جاگی تھیں، لیکن بدقسمتی سے اس وقت پاکستانی حکومت میں کچھ ایسے حالات پیدا ہوئے کہ اس سے امن کا عمل متاثر ہوگیا اور اس نے کارگل جنگ، جس میں پاکستان کو ایک بار پھر شکست کا سامنا کرنا پڑا، کا اہم کردار ادا کردیا۔ اس کے ساتھ ہی ملک میں چوتھا فوجی تختہ پلٹ بھی ہوگیا۔

کتاب میں، اس سے پہلے میں نے ذکر کیا ہے کہ کس طرح 13 اکتوبر 1999 کی صبح جب واجپئی حکومت نے حلف لیا تھا تب اخبارات اسلام آباد میں ہونے والے فوجی تختہ پلٹ کی خبروں سے بھرے پڑے تھے، جن میں جمہوری عمل کے ذریعہ قانونی طور پر منتخب ایک وزیراعظم کو گرفتار کرنے کے لیے اس کی رہائش گاہ پر فوجیوں کو ہنگامہ مچاتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ نواز شریف کو اقتدار سے باہر کیا جانا اور فوج کے سربراہ جنرل پرویز مشرف کے ذریعہ اقتدار پر قبضہ کیا جانا، تمام واقعات حقیقت میں کسی ڈرامہ سے کم نہیں تھے۔ ہندوستانیوں کو معلوم ہوگیا تھا کہ کارگل حملہ کے پیچھے مشرف کا ہی ہاتھ رہا تھا۔ اس وجہ سے تختہ پلٹ کا واقعہ اور تختہ پلٹ کے ذمہ داران دونوں کے تئیں ہندوستان کی سیاسی اور سماجی حلقوں میں شبہ اور شک آمیز ردعمل ظاہر ہوا تھا، لیکن پاکستان میں ابھرے نئے حالات سے نمٹنے کے لیے ہماری حکومت کو ایک مناسب حکمت عملی تیار کرنی تھی۔ ہمیں اسلام آباد میں اقتدار پر بیٹھنے والے حکمراں — فوجی یا غیر فوجی سے نمٹنے کے لیے تیار رہنا تھا۔

اکتوبر 1999 اور 2001 کی شروعات کے درمیان ہماری حکومت نے ایک سہ رخی پالیسی اپنائی۔ ہم نے جموں وکشمیر اور ملک کے دیگر حصوں میں سرحد پار دہشت گردی کے خلاف لڑائی تیز کردی۔ ہم نے یہاں تک اعلان کردیا کہ ہندوستان تب تک پاکستان کے ساتھ بات چیت کے عمل کو دوبارہ شروع نہیں کرے گا جب تک وہ سرحد پار دہشت گردی کو روک نہیں دیتا۔ اس کے ساتھ ہی ہم نے پاک تربیت یافتہ دہشت گردوں کی ہندوستان میں دراندازی روکنے کی اپنی مہم بھی تیز کردی۔ دوسری جانب، عالمی برادری کو کارگل جنگ کے پس پردہ کے حقائق اور ہندوستان میں دہشت گردی پھیلانے کی پاکستان کی مسلسل کوشش، کی بات کو سمجھانے کے لیے ہم نے سفارت کارانہ کوششیں بھی تیز کردیں۔ سچ تو یہ ہے کہ سرحد پار دہشت گردی کے معاملہ پر پاکستان واجپئی حکومت کے چھ سال کی مدتِ کار کے دوران عالمی برادری میں جتنا الگ تھلگ نظر آیا اتنا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔

اس پالیسی کے تحت وزیراعظم واجپئی نے نومبر 2000 میں ایک اور حوصلہ مندانہ قدم اٹھایا۔ رمضان شروع ہونے سے قبل انھوں نے جموں وکشمیر میں دہشت گرد مخالف مہم کو چھ ماہ کے لیے روکنے یعنی 'جنگ بندی' کا اعلان کردیا۔ میڈیا نے تو اس کے لیے 'جنگ بندی' لفظ کا استعمال کیا تھا، لیکن حقیقت میں یہ دہشت گردوں کے خلاف مہم شروع نہ کرنے کی یک طرفہ کوشش تھی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ سیکورٹی فورسز کو مجبور و لاچار ہونے پر بھی خاموش نہیں بیٹھنا تھا۔ ریاستی عوام نے اس اعلان کا تہہ دل سے استقبال کیا۔ گمراہ مقامی نوجوانوں کو دہشت گردی کے راستہ پر جانے سے بچانے میں اس سے مدد ملی۔

چھ ماہ کی طویل جنگ بندی جلد ہی ختم ہونے کو آئی اور اب غیر رسمی بات چیت میں اٹل جی مجھ سے اور جسونت سنگھ سے پوچھنے لگے تھے۔ 'اب آگے کیا کرنا چاہیے؟' میں خود اس بارے میں کچھ عرصہ سے سوچ رہا تھا۔ ان دنوں میں معروف صحافی کرن تھاپر جنھیں میں کئی سال سے جانتا ہوں، کے ذریعہ سے ایک سینئر پاکستانی سفارت کار کے قریبی رابطہ میں تھا۔ بات چیت کے دوران اس سفارت کار کی سچائی سے میں کافی متاثر ہوا اور مجھے لگنے لگا کہ اب پاکستان کے ساتھ بات چیت کا عمل دوبارہ شروع کرنے کا وقت آگیا ہے۔ دوسری جانب پاکستان میں ایسا لگ

رہا تھا کہ جنرل پرویز مشرف، جنھوں نے جون 2001 میں اپنا عہدہ چیف ایگزیکٹو افسر سے تبدیل کر کے 'صدر' کر لیا تھا، عالمی برادری میں اپنے ملک کے الگ تھلگ پڑے ہونے کی حالت کو دور کرنے کے لیے بیتاب تھے اور اس کے لیے وہ ہندوستان کے ساتھ بات چیت کرنا چاہتے تھے۔ میں نے سوچا 'کیوں نہیں اس فوجی تاناشاہ کی منشا آزمائی جائے جس کی کوئی سیاسی بنیاد نہیں ہے اور جو اپنے ملک کا اکیلا مالک نظر آتا ہے، جہاں جمہوری عمل سے منتخب ہونے والے لیڈروں نے کبھی اپنے حقیقی طاقتوں کا استعمال نہیں کیا ہے۔'

بالآخر مئی 2001 میں جب ایک دن وزیراعظم نے مجھے اور جسونت سنگھ کو اپنی رہائش گاہ پر آئندہ قدم اٹھانے کے بارے میں بات چیت کرنے کے لیے بلایا تو میں نے انھیں مشورہ دیا 'اٹل جی! کیوں نہ آپ جنرل پرویز مشرف کو بات چیت کے لیے دہلی بلائیں۔ آپ کا لاہور بس سفر ناکام رہا تو کیا ہوا، ملک کے اندر اور عالمی برادری میں اس کی خوب ستائش ہوئی۔ اسی طرح جب آپ مشرف کو بات چیت کے لیے دعوت دیں گے تو اس کا بھی ہندوستان کے اندر اور عالمی برادری میں خیر مقدم کیا جائے گا۔' جسونت سنگھ نے میرے اس خیال کی تائید کی اور وزیراعظم نے وہ مشورہ قبول کر لیا۔

اس کے بعد سرگرمیاں تیز ہو گئیں۔ پہلا سوال یہ تھا کہ سربراہ مذاکرات کے لیے مناسب مقام مقرر کرنا۔ ابتدا میں خیال رکھا گیا کہ سربراہ کانفرنس گوا میں منعقد کی جائے، لیکن اٹل جی نے اس کے لیے تاج نگری آگرہ کو منتخب کیا۔ ویسے آگرہ کئی معنوں میں مناسب مقام بھی تھا۔ آگرہ محبت کی جیتی جاگتی مثال اور دنیا میں مشہور یادگار تاج محل کا شہر ہے، جسے مغل شہنشاہ شاہجہاں نے اپنی بیگم ممتاز محل کی یاد میں تعمیر کرایا تھی۔ دونوں ممالک کی مشترکہ تاریخ کی اس سے اچھی نشانی اور کیا ہو سکتی تھی۔

آگرہ سربراہ کانفرنس کے سرکاری اعلان نے سبھی کے دلوں میں امید کی کرن جگا دی تھی۔ چونکہ اٹل جی ہند-پاک تعلقات کے مشکلات اور سنگینی سے واقف تھے، اس لیے انھوں نے لوگوں کو کسی ڈرامائی کامیابی حاصل ہونے کے امکانات سے بھی آگاہ کر دیا تھا۔ میں نے بھی ان ہی خیالات کا اظہار کیا۔ 24/جون 2001 کو مقبول ٹی وی چینل 'آج تک' کو دیے گئے ایک انٹرویو میں، میں نے کہا 'فروری 1999 میں امن کا پیغام لے کر بس کے ذریعہ لاہور دورہ پر جانے کی واجپئی جی کی حوصلہ مندانہ پہل کے بعد یہ ہندوستان اور پاکستان کے لیے دوسرا تاریخی موقع ہے۔ مجھے امید ہے کہ اس سے دونوں ممالک کو تعلقات سدھارنے میں کچھ حد تک مدد ملے گی۔ حالانکہ یہ امید نہیں کی جانی چاہیے کہ سربراہ کانفرنس کے نتائج راتوں رات سامنے آ جائیں گے، کیونکہ دہائیوں پرانے مسائل ایک میٹنگ میں حل نہیں کیے جا سکتے۔

انٹرویو کے دوران جب مجھ سے پوچھا گیا کہ 'پاکستان کے ذریعہ کارگل میں حملہ کر کے ہندوستان کی پشت میں 'چھرا گھونپنے' کے باوجود مشرف کو بات چیت کے لیے کیوں مدعو کیا جا رہا ہے؟ تو میرا جواب تھا 'ملک کی سیکورٹی ہماری حکومت کی ترجیحات میں ہے اور ہندوستان اپنی سیکورٹی کے معاملہ میں کوئی سمجھوتہ نہیں کر سکتا۔ کارگل کے واقعہ سے قبل جموں و کشمیر میں جو کچھ بھی ہوتا تھا، اس کا پاکستان کے ذریعہ ناجائز فائدہ اٹھایا جاتا رہا تھا، لیکن کارگل کے واقعہ کے بعد عالمی برادری کی توجہ سرحد پار دہشت گردی اور پاک حمایت یافتہ پراکسی لڑائی کی جانب مرتکز ہو گئی ہے، جس سے پاکستان کو نقصان ہوا ہے۔ اس لیے ڈیڑھ سال تک بات چیت بند رکھنے کے بعد اب ہمیں لگتا ہے کہ ایسے حالات بنائے رکھنا ٹھیک نہیں ہے، اس لیے صدر مشرف کو بات چیت کے لیے مدعو کرنے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستان پاکستان کے ساتھ اپنے تنازعات کو بات چیت کے ذریعہ اور پرامن طریقہ سے حل کرنا چاہتا ہے۔'

داؤد ابراہیم معاملہ میں مشرف کا سفید جھوٹ

جنرل مشرف 14 رجولائی 2001 کو اپنی اہلیہ صہبا کے ساتھ نئی دہلی پہنچے۔ یہ سچ ہے کہ اس وقت تک ہندوستانیوں کے ذہن میں کارگل کی تلخ یادیں تازہ تھیں، لیکن اس کے باوجود اپنی قدیم روایت 'اتی تھی دیوو بھو' (مہمان بھگوان کے برابر ہیں) کو نبھاتے ہوئے جنرل مشرف اور ان کی اہلیہ کا پرتپاک استقبال کیا گیا، جو بحالی امن کے لوگوں کی خواہش کی ایک واضح مثال تھی، اور چونکہ جنرل پرویز مشرف ہندوستان میں پیدا ہوئے تھے، اس لیے بھی ان کی خوب خاطر مدارات کی گئی۔ پرانی دہلی میں واقع 'نا ہر والی حویلی' جہاں وہ 1943 میں پیدا ہوئے تھے اور خاندان کے کراچی میں آباد ہونے سے قبل چار سال تک رہے بھی تھے، ان کا دورہ ہندوستان ان کے تین دن کے قیام کے دوران میڈیا کوریج کا ایک اہم حصہ بنا۔

میں مشرف سے پہلی بار 14 رجولائی کی صبح راشٹرپتی بھون میں ملا۔ ہماری ابتدائی بات چیت اس حقیقت پر مرتکز رہی کہ ہم دونوں ہی کراچی کے 'سینٹ پیٹرکس ہائی اسکول' کے طالب علم تھے۔

خیرمقدم کرنے کے بعد میں نے کہا 'ویسے تو آپ دہلی میں پیدا ہوئے، لیکن 53 سال کے بعد آپ پہلی بار اپنی جائے پیدائش پر آئے ہیں۔ اسی طرح میں کراچی میں پیدا ہوا تھا، لیکن تقسیم کے بعد میں صرف ایک بار اپنی جائے پیدائش پر گیا ہوں، وہ بھی بہت کم وقت کے لیے۔ لاکھوں پریوار تو ایسے بھی ہیں جو تقسیم کی وجہ سے منتقل ہونے کے بعد اپنی جنم بھومی یا جائے پیدائش پر ایک بار بھی وہاں جا نہیں پائے ہیں۔ نصف صدی کا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی یہ حالت ہے۔ کیا یہ بات عجیب نہیں لگتی؟ کیا ہمیں ان مسئلوں کا مستقل حل نہیں نکالنا چاہیے جس کی وجہ سے ہمارے دونوں ممالک اور لوگ اتنے الگ ہو گئے ہیں؟'

'بالکل نکلنا چاہیے۔' مشرف کا جواب تھا۔ 'آپ کا کیا خیال ہے؟'

'سب سے اہم ہے، آپسی اعتماد سازی کی تعمیر۔'

مشرف نے مثبت انداز میں سر ہلایا اور بولے 'لیکن کیسے؟'

'میں آپ کو ایک مثال دوں گا۔ میں حال ہی میں ترکی سے ایک کامیاب دورہ کر کے آیا ہوں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کو ترکی سے خاص انسیت ہے، کیونکہ آپ نے اپنی زندگی کے ابتدائی دن ترکی میں ہی گزارے ہیں۔'

'جی ہاں، میرے والد وہیں تعینات تھے۔ میں فراٹے سے ترکی بول سکتا ہوں۔'

'میں وہاں ہندوستان اور ترکی کے درمیان ایک حوالگی معاہدہ کو حتمی شکل دینے کے لیے گیا تھا۔ ہندوستان اور ترکی کے درمیان حوالگی معاہدہ کی اتنی ضرورت کیا ہے؟ حقیقت میں حوالگی معاہدہ کی ضرورت تو ہندوستان و پاکستان کے درمیان ہے، تا کہ کسی ایک ملک میں جرائم کر کے دوسرے ملک میں چھپنے والے مجرموں کو متعلقہ ملک کے حوالہ کر کے اس پر مقدمہ چلوایا جا سکے۔'

مشرف اب تک کچھ بھی سمجھ نہیں پائے تھے کہ میں گفتگو کو کس جانب لے جا رہا ہوں۔ ان کا پہلا ردعمل تھا:

'بالکل کیوں نہیں، ہمیں حوالگی معاہدہ کرنا چاہیے۔'

میں نے کہا 'جنرل! دونوں ممالک کے درمیان رسمی حوالگی معاہدہ کا عمل مکمل ہونے سے قبل اگر آپ داؤد ابراہیم کو ہندوستان کے حوالے

کر دیں تو امن کے عمل میں آپ کا بہت بڑا تعاون ہوگا، کیونکہ داؤد ابراہیم 1993 کے بمبئی بم دھماکوں کا کلیدی ملزم ہے اور فی الحال وہ کراچی میں رہ رہا ہے۔' اچانک مشرف کا چہرہ تمتما گیا۔ اپنی بے چینی کو چھپانے کی لاچاری میں انھوں نے جو کچھ کہا، وہ مجھے بہت سخت لگا۔

'جناب آڈوانی، یہ ہلکی چال ہے۔' انھوں نے کہا۔ میں نے محسوس کیا کہ فریقین کے پانچ پانچ افسران کی موجودگی میں کمرے کا ماحول اچانک تبدیل ہو گیا۔

میں نے کہا 'جنرل، آپ فوجی ہیں اور چال یا حکمت عملی کی بات آپ ہی سوچ سکتے ہیں۔ آگرہ میں وزیر اعظم واجپئی اور آپ ہند و پاک کے درمیان مکمل امن کی حکمت عملی پر تبادلہ خیال کرنے والے ہیں۔ دونوں ممالک کے لوگ آگرہ سربراہ کانفرنس کے نتائج کی بڑی امید سے انتظار کریں گے، لیکن ہندوستان کے وزیر داخلہ ہونے کے ناطے اور 50 سال تک عوامی زندگی میں رہنے والا ایک سیاست داں ہونے کے ناطے میں آپ کو بتانا چاہوں گا کہ داؤد ابراہیم کو ہندوستان کے حوالے کرنے کے آپ کے ایک ہی کام سے ہندوستان کے عوام کا آپ میں اور آپ کے ملک میں اعتماد میں اضافہ ہوگا۔ دنیا میں ایسے مواقع آتے ہیں جب رسمی حوالگی معاہدہ کے بغیر بھی کسی ایک ملک کے ذریعہ دوسرے ملک کے مجرموں کی حوالگی کی گئی ہے۔'

مشرف اپنی بے چینی چھپا نہیں پا رہے تھے۔ اس بار انھوں نے قدرے سخت الفاظ میں کہا 'جناب آڈوانی، میں آپ کو بتا دوں کہ داؤد ابراہیم پاکستان میں نہیں ہے۔' کئی سال بعد ایک پاکستانی افسر، جو اُس دن میٹنگ میں موجود تھے، نے مجھے بتایا 'ہمارے صدر نے داؤد ابراہیم کے بارے میں اس دن جو کچھ کہا تھا وہ ایک سفید جھوٹ تھا۔'

دونوں ممالک کے درمیان سرحد پر اور پورے علاقہ میں امن قائم کرنے کے لئے ایک وسیع حکمت عملی تیار کرنے سے متعلق میرے مشورہ کے جواب میں جنرل مشرف نے کہا کہ سرحد کی دونوں جانب تعینات فوجی اکثر فائرنگ کرنا شروع کر دیتے ہیں اور اس میں کچھ بھی غیر مناسب نہیں ہے۔ 'وہ تو ٹھیک ہے۔' میں نے کہا 'لیکن بس اسٹینڈ پر اور سنیما گھروں میں بے قصور لوگوں کو مروانے کی بات سمجھ میں نہیں آتی۔ کسی ایک مسئلہ کے حل کے لئے امن کو یرغمال نہیں بنانا چاہئے۔'

اس پر مشرف نے کہا کہ بنیادی مسئلہ کشمیر تنازع ہے۔ میں نے کہا کہ اس مسئلہ پر اختلاف ہے۔ ایک بڑی خلیج ہے جسے پاٹنا ہے۔ اس کے لئے ایک ایک مسئلہ پر بات چیت ہونی چاہئے۔ کوئی بھی مسئلہ زیر التوا نہیں رکھا جانا چاہئے، لیکن آپ کو یہ نہیں کہنا چاہئے کہ کسی خاص مسئلہ کے حل ہونے تک جہاد جاری رہے گا۔ میں نے انہیں یہ بھی یاد دہانی کرائی کہ جسے پاکستان متنازع علاقہ بتاتا ہے اس میں جموں، لداخ اور پاک مقبوضہ کشمیر کے ساتھ ساتھ وہ علاقہ بھی آتا ہے جو پاکستان کے ذریعہ چین کو بھی دیا گیا تھا۔

گفتگو کے آخر میں میں نے پاکستان کے صدر اور ان کی اہلیہ کے لئے ہندوستان میں یادگار قیام کے لئے دعا کی اور ساتھ ہی آگرہ سربراہ کانفرنس کی کامیابی کے لئے نیک خواہشات کا اظہار کیا۔

دہشت گردی یا تحریک آزادی

راشٹرپتی بھون میں ہندوستان کے صدر جمہوریہ کے آر نارائنن کی جانب سے استقبالیہ پروگرام میں شامل ہونے کے بعد پاکستانی اور ہندوستانی وفد 14 رجولائی کی رات میں آگرہ پہنچا۔ مشرف کو ان کی ٹیم کے ساتھ 'ہوٹل امرولاس' میں ٹھہرایا گیا تھا، جس کے ہر کمرے سے تاج

محل نظر آتا ہے۔ اٹل جی کے ساتھ ہم لوگ جے پی پلیس ہوٹل میں ٹھہرے تھے اور بات چیت بھی وہیں ہونے والی تھی۔

یوں تو ہندوستان کے وزیراعظم اور پاکستان کے صدر کے درمیان ہونے والی سربراہ کانفرنس تھی، لیکن اٹل جی نے سیکورٹی سے متعلق وزارت کمیٹی کے اپنے سبھی معاون وزراء کو آگرہ میں رکھنے کا فیصلہ لیا تھا۔ اس میں میرے علاوہ وزیر دفاع جسونت سنگھ، وزیر خزانہ یشونت سنہا اور کامرس کے وزیر مراسولی مارن بھی شامل تھے۔ ان کے علاوہ قومی سیکورٹی صلاح کار برجیش مشر، اسلام آباد میں ہندوستان کے ہائی کمشنر وجے نامبیار اور دیگر افسران بھی موجود تھے۔ میڈیا ذمہ داری کے لئے وزیر اطلاعات ونشریات سشما سوراج خاص طور سے موجود تھیں۔ آخر کار یہ آگرہ سربراہ کانفرنس ہندوستان کی ڈپلومیسی تناظر میں میڈیا مینجمنٹ کے لئے سب سے بڑا موقع تھا جس میں دنیا بھر کے صحافی کئی سال کی لڑائی اور امن، وعدہ خلافی اور امید سے بھرے اس تاریخی واقعہ کو کور کرنے کے لئے موجود تھے۔ مشرف کی ترجیحات کو دھیان میں رکھتے ہوئے سربراہ کانفرنس کے لئے کوئی مقررہ ایجنڈا نہیں تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ٹھیک بھی تھا، کیونکہ یہ دونوں کی پہلی ملاقات تھی اور مستقبل میں مذاکرات کے لئے راستے تیار کرنے سے قبل انہیں غیر رسمی پس منظر میں ایک دوسرے کو سمجھنا ضروری تھا۔ 15 رجولائی کو صبح وفد کی میٹنگ میں وزیراعظم واجپئی نے ہندوستان کا موقف نہایت دوراندیشی اور ہوشیاری سے رکھا۔

> 'ہم جموں وکشمیر سمیت تمام مسئلوں پر گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس موضوع پر ہمارے درمیان بڑے اختلافات ہیں۔ ہم ان اختلافات کو دور کرکے آگے بڑھنا چاہتے ہیں، لیکن اس کے لئے بہتر فضا تیار کرنا ضروری ہے۔ ریاست میں سرحد پار سے پھیلائی جارہی دہشت گردی کے واقعات سے ایسی فضا تیار نہیں کی جاسکتی۔ ہم اس کا سینہ سپر مقابلہ کریں گے۔ کوئی یہ نہ سمجھے کہ ہمارے پاس دہشت گردی اور تشدد سے مقابلہ کرنے کا عزم، امن اور صبر وتحمل نہیں ہے۔ یہ ہمارا مکمل یقین ہے کہ جموں وکشمیر مسئلہ پر اختلافات کو دور کرنے کے عمل کے دائرہ میں سرحد پار دہشت گردی کا معاملہ بھی آتا ہے۔'

وزیراعظم نے کچھ دیگر اہم مسئلے بھی اٹھائے، جیسے پاکستان میں قید 54 ہندوستانی جنگی قیدیوں کی رہائی اور دو دیگر، جن پر میں نے اٹل جی کے ساتھ پہلے سے ہی بات کی تھی۔

☆ 'ہم جانتے ہیں کہ 1993 کے ممبئی بم دھماکوں اور انڈین ایئر لائنس کے مسافر بردار طیارہ کے اغوا سے متعلق ملزمین اور دہشت گرد پاکستان میں رہ رہے ہیں۔ ہم نے پاکستان سے درخواست کی ہے کہ وہ ان مجرموں کو پکڑ کر ہندوستان کو سونپ دے۔ ان پر مقدمہ چلایا جاتا ہے۔'

☆ 'دونوں ممالک کے مذہبی مقامات کے تیرتھ یاتریوں کو سہولت مہیا کرائی جانی چاہئے اور ان کے جذبات کا خیال رکھا جانا چاہئے۔ ظاہری دہشت گردوں کو پاکستان میں سکھ گردواروں میں ٹھہرنے دینے کا معاملہ ہمارے سکھوں کے لیے لمحہ فکریہ ہے۔ ہم نے آپ کے افسران سے رسمی طور پر درخواست کی ہے کہ وہ ان دہشت گردوں کو ہندوستان کو سونپ دے تاکہ ان جرائم سے متعلق قانونی عمل کو پورا کیا جاسکے، جن کے لیے وہ ہندوستان کو مطلوب ہیں۔ جہاں تک مذہبی مقامات کی بات ہے ہندو مندروں کی حالت اور ہندو عقیدت مندوں کے ساتھ کیا جارہا رویہ بھی لمحہ فکریہ ہے۔'

ان دو باتوں کا میں نے خاص طور سے ذکر کیا تاکہ ان بے بنیاد باتوں کو توڑ سکوں کہ آگرہ سربراہ کانفرنس میں سرحدی دہشت گردی کے مسئلہ پر میرے اور اٹل جی کے درمیان کوئی اختلافات تھے۔ 15 اور 16 رجولائی کو وزیراعظم واجپئی اور صدر مشرف نے تنہائی میں بڑے پیمانہ پر بات چیت کی تھی جو تقریباً 5 گھنٹے تک چلی تھی۔ بات چیت کے پہلے مرحلہ کے بعد انھوں نے آپسی اتفاق سے ایک مشترکہ اعلامیہ جاری کرنے کا

فیصلہ کیا، جس کا مسودہ تیار کرنے کی ذمہ داری دونوں ممالک کے خارجہ سکریٹریوں کو اپنے اپنے وزیر کی رہنمائی میں سونپی گئی۔

ہندوستان کے نظریہ کو دیکھیں تو دو باتیں ہوئیں۔ پہلا مشترکہ بیان جاری کرنے کا کام نہایت ہی غیراطمینان بخش ثابت ہوا۔ جسونت سنگھ کے ذریعہ پاکستان کے وزیر خارجہ عبدالستار کے ساتھ میٹنگ کے بعد جو نامکمل مسودہ لایا گیا اس پر 15 رجولائی کی شام کو وزیر اعظم کے ذریعہ طلب کی گئی سیکورٹی معاملوں کی وزارت کمیٹی کی میٹنگ میں تبادلہ خیال ہوا۔ میں نے دیکھا کہ اس میں سرحد پار دہشت گردی کا ذکر ہی نہیں تھا۔ 'اسے منظور نہیں کیا جا سکتا' میں نے کہا۔ میٹنگ میں موجود سبھی ممبروں نے میری بات کی حمایت کی۔

ہم نے یہ بھی دیکھا کہ مسودہ میں شملہ معاہدہ (1972) اور لاہور اعلامیہ (1999) کا ذکر ہی نہیں ہے۔ مشرف کو ان دونوں ہی معاہدوں سے نفرت تھی، کیونکہ یہ ان کے سیاسی حریفوں سے متعلق تھے۔ وہ اپنے ملک کی عوام کو یہ اشارہ دینا چاہتے تھے کہ مشرف ہندوستان پاکستان معاملوں کے بالکل نئے سرے سے خالص اپنی شرائط پر شروع کرنا چاہتے تھے۔ اپنی جانب سے ہم نے یہ واضح کر دیا کہ شملہ سمجھوتہ اور لاہور اعلامیہ کو ہند-پاک مذاکرات کی کسوٹی مانا جانا چاہئے۔ ہم نے مشترکہ بیان کے مسودہ کو نامنظور کر دیا، جس کی خبر پاکستانی وفد کو دی گئی۔ اس کے بعد 16 رجولائی کو صبح 4:30 بجے تک سرکاری سطح پر اسے پھر سے تیار کرنے کی کوشش کی گئی۔

شاید مشرف سمجھ گئے کہ وہ آگرہ اعلامیہ اپنے ساتھ لے کر پاکستان نہیں جا پائیں گے، اسی لئے انھوں نے سربراہ کانفرنس کی باقی بات چیت میڈیا کے ذریعہ کرنے کی کوشش کر کے دوسری مشکل کھڑی کر دی۔ 16 رجولائی کی صبح ہندوستان کے 35 اہم صحافیوں کے ساتھ جو ایک غیر رسمی 'ناشتہ میٹنگ' ہونے والی تھی اسے انھوں نے ایک گھنٹہ تک چلنے والی پریس کانفرنس میں بدل دیا۔ حکومت پاکستان کے ذریعہ چلنے والی پی ٹی وی پر اس کے ٹیلی کاسٹ کا انتظام کرنے کے ساتھ ساتھ انھوں نے ہندوستانی ٹی وی چینل کو بھی اس کے مکمل ٹیلی کاسٹ کا اختیار دے دیا تھا۔ اس طرح ہندوستانی وزیر اعظم کے ساتھ خفیہ بات چیت کے دوران مشرف کے ذریعہ سرحد پار دہشت گردی پر اپنے جارحانہ خیالات پیش کرتے دیکھنا، ہندوستانی وفد کا ایک انوکھا اور تلخ تجربہ تھا۔

صحافیوں کے ساتھ بات چیت کرتے ہوئے مشرف نے زور دیا کہ ہند-پاک مذاکرات میں ہندوستان کو کشمیر مسئلہ کی اہمیت کو قبول کرنا چاہئے۔ انھوں نے کہا 'اہم مسئلہ کو حل کرنے کے بعد ہم دیگر سبھی ایشوز کو حل کر سکتے ہیں۔ معاشیات، اعتماد سازی، نیوکلیائی اور دیگر ایشوز کی وجہ سے پاکستان کا کوئی بھی لیڈر مسئلہ کشمیر نہیں چھوڑ سکتا۔ 1971 کی لڑائی میں ہندوستان کے ذریعہ بنگلہ دیش کی آزادی کے موقف کو لینے کی بات کا حوالہ دیتے ہوئے انھوں نے کشمیر کی علیحدگی پسند تحریک کی حمایت کی۔ 'تاریخ پر نظر ڈالئے' انھوں نے کہا 'کارگل پر پہنچ کر رکنے کی نیت رہی ہے۔ مجھے 'کارگل مین' مانا جاتا ہے۔ میں سمجھ سکتا ہوں کہ آپ کارگل کے بارے میں کیسا محسوس کرتے ہیں۔ آپ کو بھی سمجھنا چاہئے کہ 1971 اور سیاچین کے بارے میں پاکستانی کیسا محسوس کرتے ہوں گے۔ 1967 میں جب ہندوستان کے ذریعہ بنگلہ دیش کی 'مکتی باہنی' کو ٹریننگ اور مدد دی جا رہی تھی، اس وقت پاکستانیوں کو کتنی اذیت پہنچی تھی۔ جب شملہ معاہدہ کی خلاف ورزی کر کے ہندوستانی افواج سیاچین میں داخل ہو گئی تھی۔ ★

★ سیاچین معاملہ پر مشرف بے ایمانی کر رہے تھے۔ شملہ معاہدہ کے مطابق '17 ردسمبر 1971 کی جنگ بندی کے نتیجے میں جموں و کشمیر میں دونوں ممالک کے ذریعہ بغیر کسی غلطی کے مقرر کنٹرول لائن کا احترام کیا جائے گا۔ آپسی اختلافات اور قانونی تشریحات کے باوجود کوئی بھی ملک اسے یکطرفہ طور سے بدلنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ ساتھ ہی کوئی بھی فریق اس کنٹرول لائن کی خلاف ورزی کرنے کے لئے دھمکی یا طاقت کے استعمال کا سہارا نہیں لے گا، لیکن کنٹرول لائن سیاچین تک ہے ہی نہیں۔

لیکن ٹی وی پر ٹیلی کاسٹ کی گئی پریس کانفرنس دیکھتے ہندوستانیوں کو سب سے زیادہ دھکا سرحد پار دہشت گردی پر مشرف کے دعوؤں سے ہوا۔ 'ہم کشمیر میں تشدد کو کوئی بڑھاوا نہیں دے رہے ہیں۔' انھوں نے دعویٰ کیا 'وہاں جو کچھ ہو رہا ہے وہ اسی دھرتی کی جنگ آزادی کی تحریک ہے۔ ہم پاکستانی اسے جنگ آزادی کی تحریک کہتے ہیں۔ جب تنازع حل ہی نہیں ہوا ہے تو اس تشدد کے تھمنے کی امید کوئی کیسے کر سکتا ہے؟'

پاکستانی صدر کے ذریعہ اٹھائے گئے اس میڈیا طوفان کو دیکھ کر میں سوچنے پر مجبور ہو گیا— 'اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں کہ جنرل مشرف مسودہ قرار میں سرحد پار دہشت گردی کا ذکر نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ہندوستانیوں کے اس تشویشناک فکر پر ان کے غیر اطمینان بخش رویے سے آگرہ اعلامیہ کی امیدیں تار تار ہو گئیں۔ اپنے ملک روانہ ہونے سے قبل مشرف اپنی اہلیہ کے ساتھ غریب نواز حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ (تیرہویں صدی کے مشہور صوفی) کی درگاہ (اجمیر شریف) جانے والے تھے، لیکن واجپئی کے ساتھ اپنی آخری بات چیت کے بعد انھوں نے اجمیر شریف کا اپنا دورہ رد کر دیا اور 16 رجولائی کو دیر رات آگرہ سے اسلام آباد کے لیے روانہ ہو گئے۔

سربراہ کانفرنس کے اختتام پر منعقد پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے جسونت سنگھ سے ایک صحافی نے پوچھا 'کیا حکومت ہند نے مشرف فیملی کو اجمیر جانے سے روکنے کی کوشش کی تھی؟ جواب نہایت ہی برمحل اور عقل مندی سے پُر تھا— 'میری کیا اوقات ہے کہ میں انھیں غریب نوازؒ کے پاس جانے سے روکوں۔ کہتے ہیں کہ جب تک غریب نوازؒ کا حکم نہیں ہوتا کوئی وہاں نہیں جا سکتا۔'

سچ کہوں تو آگرہ سربراہ کانفرنس جس طرح اختتام پذیر ہوئی وہ ہندوستانی وفد کے سبھی اراکین کے لئے افسوسناک تھی۔ سب سے زیادہ افسوس وزیر اعظم واجپئی کو ہوا تھی۔ لاہور بس دورہ سے پیدا ہونے والے امکانات کے انتہائی افسوسناک انجام کے بعد وہ آگرہ سربراہ کانفرنس سے کسی مثبت نتائج کی امیدیں لگائے بیٹھے تھے، لیکن ایک تجربہ کار لیڈر ہونے کے ناطے انہیں معلوم تھا کہ یہ سب کیوں ہوا؟ جیسا 24 رجولائی 2001 کو پارلیمنٹ میں دیئے گئے اپنے بیان میں انہوں نے خود کہا تھا کہ 'صدر مشرف کی بات تقریباً پوری طرح سے جموں وکشمیر مسئلہ پر ہی مرتکز تھی۔ آپسی اختلافات کے باوجود ہم مشترکہ اعلامیہ کے مسودہ میں ان اختلافات کو دور کرنے کی سمت میں آگے بڑھ رہے تھے۔ ہم وسیع پیمانہ پر گفت وشنید میں جموں وکشمیر سمیت سبھی معاملوں کو شامل کرنا چاہتے تھے، لیکن پاکستان کا رویہ ضدی تھا کہ آپسی تعلقات بحال کرنے کے لئے جموں وکشمیر مسئلہ کا حل پہلی شرط ہونی چاہئے۔ اس وجہ سے ہمیں مشترکہ اعلامیہ کی امید چھوڑنی پڑی۔ پاکستان سرحد پر دہشت گردی کو قبول کرنے اور اس پر بات کرنے کا بھی خواہش مند نہیں تھا۔ میں خود اور وزارت میں دوسرے ساتھی متفق تھے کہ ایک مشترکہ دستاویز کے لئے ہم اپنے بنیادی اصولوں کی قربانی نہیں دے سکتے۔

اٹل جی کی فطری اچھائیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ خود پر بھی ہنس لیتے ہیں اور اس خصوصیت نے ان کی مقناطیسی شخصیت میں چار چاند لگا دیے ہیں۔ بعد میں راجیہ سبھا میں ایک بحث کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے کہا 'مہمان بھی اپنے اعمال کے حساب سے نصیب ہوتا ہے۔ ہمارے اعمال ہی ایسے تھے تو ہم کیا کریں۔' اپنے طور پر میں نے کافی تلخ اور کھری کھری سنائیں۔ میں نے مشرف کو گزشتہ 40 سال سے مسئلہ کشمیر کے تئیں، میرے جو جذبات تھے میں نے واضح کر دئے۔ میں نے ان سے یہ بھی کہا کہ ہم پہلے ہی تین جنگیں لڑ چکے ہیں اور اب چوتھی جنگ نہیں لڑنا چاہتے... میں نے یہ بھی بتا دیا کہ جہاد کے نام پر جو دہشت گردی پھیلائی جا رہی ہے وہ ایک دن ان کے ملک کو بھی مشکل میں ڈال دے گی۔'

مشرف کا الزام: 'آڈوانی نے آگرہ سربراہ کانفرنس ڈبودی'

آگرہ سربراہ کانفرنس کی ناکامی کے لئے کون ذمہ دار تھا؟ یہ سوال ہندوستان اور پاکستان کے سیاست دانوں، دانشوروں اور میڈیا سیکٹر میں مشرف کا الزام موضوع بحث بنا ہوا ہے، پھر بھی آگرہ سے روانہ ہونے سے قبل پاکستانی وفد کے سینئر رکن مجھ پر انگلیاں اٹھانے لگے تھے اور یہ وہی ممبر تھے جو جنرل مشرف کے ساتھ اپنی قربت کے لئے اچھی طرح جانے جاتے تھے۔ آگرہ سربراہ کانفرنس کی ناکامی کے پیچھے میرا ہاتھ ہونا سمجھا جارہا تھا۔ تقریباً ایک ماہ بعد خود مشرف نے بھی میری ہی جانب انگلیاں اٹھائیں۔

پانچ سال بعد اگست 2006 میں مشرف کی خودنوشت 'اِن دی لائن آف فائر' شائع ہوئی جس میں انھوں نے اور بھی افسوسناک طریقہ سے یہ الزام لگایا۔ انھوں نے راست طور پر میرا نام تو نہیں لیا لیکن ان کے الزامات کا مطلب اتنا واضح تھا کہ میڈیا سمیت ہر کوئی آسانی سے میرے نام کا اندازہ لگا سکتا تھا۔ مندرجہ ذیل حوالہ سے پاکستان کے فوجی حکمراں کی شخصیت کی ایک اچھی خاصی جھلک مل جاتی ہے:

> ''ہم اپنے دورہ کے نتائج پر پہنچنے والے تھے، لیکن ہم اس سے ایک دم فرش پر پہنچ گئے جب میرے وزیر خارجہ اور خارجہ سکریٹری نے مجھے اطلاع دی کہ ہندوستان معاہدہ سے پیچھے ہٹ گیا ہے۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں ہورہا تھا 'ایسے کیسے ہوسکتا ہے؟ کیوں؟' میں نے پوچھا۔
>
> 'سر، وزارت نے اسے نامنظور کردیا ہے۔' مجھے بتایا گیا۔
>
> 'کس وزارت کی بات کررہے ہیں آپ لوگ، یہاں آگرہ میں تو کوئی وزارت نہیں ہے۔'
>
> میں حقیقت میں بہت غصہ میں تھا اور فوراً اسلام آباد واپس چلا جانا تھا۔ دونوں سفارت کاروں نے ہی مجھے نرم کیا اور قرارداد کا ایک اور مسودہ بنانے کے لئے کچھ وقت مانگا۔ میں نے اجازت دے دی اور اجمیر شریف کی اپنی شام کا دورہ رد کردیا۔
>
> دوبارہ مسودہ کی تیاری میں الفاظ اور جملوں کے ناپ تول میں دو تین گھنٹہ اور لگ گئے۔ بالآخر کامیابی کا اشارہ دیتے ہوئے میری ٹیم واپس آئی۔ مجھے نیا مسودہ دکھایا گیا جسے میں نے ایڈیٹ کردیا۔ مجھے لگا کہ نئے مسودہ میں کل ملاکر وہی باتیں تھیں جو ہم چاہتے تھے۔ بس، صرف زبان تھوڑی سی تبدیل ہوگئی تھی۔ مسودہ کی صاف نقول تیار کرنے کے لئے وہ دوسرے ہوٹل میں چلے گئے۔ میں نے اپنی اہلیہ کو یقین دلاتے ہوئے کہا کہ 'آگرہ سربراہ کانفرنس کل کے اخبارات کی سرخیاں بنیں گی۔'
>
> لیکن ایسا ہونا نہیں تھا۔ دستخط کی تقریب میں، میں نکلنے والا ہی تھا کہ مجھے معلوم ہوا کہ ہندوستانی پھر کر گئے ہیں۔ یہ رویہ انتہائی دھوکہ دینے کے مترادف تھا۔ میں تو فوراً روانہ ہوجانا چاہتا تھا، لیکن میرے وزیر خارجہ نے کہا کہ جانے سے پہلے ایک بار وزیراعظم واجپئی سے مل لیا جائے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے یہ سفارتی رسم پوری کرنی پڑی....
>
> اس رات تقریباً 11 بجے میں بہت غصہ کی حالت میں وزیراعظم سے ملا۔ میں نے ان سے دوٹوک الفاظ میں کہا کہ ہم دونوں کے اوپر ضرور کوئی ایسا شخص ہے، جس کے پاس ہمارے فیصلہ کو رد کرنے کی طاقت ہے۔ میں نے یہ بھی کہا کہ ہم دونوں کی ہی بے عزتی کی گئی ہے۔ وہ وہیں بیٹھ گئے، ایک دم خاموش۔ انہیں شکریہ ادا کرتے ہوئے میں وہاں سے روانہ ہوگیا۔
>
> ایک جانب آدمی ہوتا ہے اور دوسری جانب وقت، جب دونوں ملتے ہیں تو تاریخ بنتی ہے۔ واجپئی وقت کو نہیں پکڑ سکے اور اس طرح انھوں نے تاریخ میں اپنا موقع گنوادیا۔''

مشرف کے نہایت ہی قابل اعتراض دعویٰ کا، جس میں انھوں نے کہا تھا کہ 'ہم دونوں کے اوپر ضرور کوئی ایسا شخص ہے جس کے پاس ہمارے فیصلہ کو رد کرنے کی طاقت ہے' اور 'ہم دونوں کی ہی بے عزتی کی گئی ہے' خود اٹل جی نے ہی زوردار ڈھنگ سے تردید کی تھی۔ 26 دسمبر 2006 کو جاری ایک پریس ریلیز میں انھوں نے کہا تھا:

'آگرہ سربراہ کانفرنس کی ناکامی پر جنرل مشرف کے مبینہ تبصرہ سے میں حیران ہوں۔ نہ کسی نے جنرل کو بے عزت کیا اور نہ ہی میری کسی نے بے عزتی کی۔ ہماری حکومت میں ہر کوئی ان حقائق سے آگاہ تھا کہ جب تک سرحد پار سے دہشت گردی جو اَب تک ہزاروں بے قصوروں کی جان لے چکی ہے، نہیں روکی جاتی تب تک ہند-پاک تعلقات بحال نہیں ہو سکتے، لیکن بات چیت کے دوران جنرل پرویز مشرف اپنی اس بات پر ضد کرتے رہے کہ جموں وکشمیر میں جو تشدد جاری ہے اسے 'دہشت گردی' نہیں کہا جا سکتا۔ وہ مسلسل یہی کہتے رہے کہ ریاست میں جو خون خرابہ جاری ہے وہ عوام کے ذریعہ لڑی جا رہی ہے، وہ آزادی کی لڑائی کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ جنرل مشرف کا یہ رویہ ہندوستان کے لئے قابل قبول نہیں تھا اور آگرہ سربراہ کانفرنس کی ناکامی کی وجہ بھی یہی تھی۔'

آگرہ کی ناکامی اسلام آباد میں کامیابی کیسے بنی؟

جنوری 2004 میں وزیر اعظم واجپئی کو اپنی زندگی کی سب سے بڑی سفارتی کامیابی حاصل ہوئی۔ سارک کی بارہویں سربراہ کانفرنس میں شرکت کرنے کے لئے وہ اسلام آباد گئے تھے۔ اس دوران انہیں صدر مشرف کے ساتھ تفصیلی گفت وشنید کرنے کا موقع ملا۔ اس تفصیلی بات چیت کے نتائج 6 جنوری کو جاری ایک مشترکہ بیان کی شکل میں سامنے آئے، جو ان حقائق کا پیش خیمہ تھا کہ آگرہ میں ہندوستان کو ملنے والی ناکامی اسلام آباد میں اس کی کامیابی بن گئی۔ مشترکہ بیان کے مطابق—

''دونوں ممالک کے درمیان تعلقات کو بحال کرنے کی سمت میں حال میں اٹھائے گئے اقدام کو دونوں رہنماؤں نے خوش آئند بتایا اور اس امید کا اظہار کیا کہ یقین واعتماد سازی کے طریقوں سے آنے والے مثبت اقدامات میں مضبوطی لائی جائے گی۔ وزیر اعظم واجپئی نے کہا کہ بات چیت کے عمل کو آگے بڑھانے کے لئے تشدد، نفرت اور دہشت گردی کو روکنا ہوگا۔ صدر مشرف نے وزیر اعظم واجپئی کو یقین دلایا کہ وہ پاکستان کے کنٹرول میں کسی بھی زمین کا استعمال دہشت گردی کے لئے کسی بھی طرح سے نہیں ہونے دیں گے۔''

80 کے عشرہ میں ہندوستان کے خلاف پراکسی جنگ چھیڑنے کے بعد پہلی بار پاکستان نے اس مشترکہ بیان کے ذریعہ قبول کیا کہ اس کی زمین سے سرحد پار دہشت گردی ہو رہی ہے اور اس نے ایسا نہ ہونے دینے کے وعدہ کا اظہار بھی کیا۔ مشرف کو آگرہ میں ہم نے یہی کرنے کے لئے کہا تھا جس کے لئے انھوں نے انکار کر دیا تھا۔ اسی لئے 26 دسمبر 2006 کو پریس کو جاری کیے گئے اپنے بیان میں اٹل جی نے مشرف کی خودنوشت میں لگائے گئے الزامات کی تردید کرتے ہوئے کہا 'جنوری 2004 کے مشترکہ بیان میں... پاکستان ہمارے نظریہ سے متفق ہو گیا... اگر جنرل مشرف 2001 میں ہمارے موقف کو قبول کر لیتے، آگرہ سربراہ کانفرنس کامیاب ہو جاتی اور اس کے بعد کے تین سال بحالی امن کو آگے بڑھانے میں معاون ثابت ہوتے۔'

آخر ایسا کیا تھا جس کی وجہ سے مشرف نے 2004 میں اس بات کو قبول کر لیا جسے انھوں نے 2001 میں خود ہی مسترد کر دیا تھا۔ اس بارے میں اختصار سے تین وجوہات کا ذکر کر سکتا ہوں۔ پہلا، 11 ستمبر 2001 کو امریکہ کے ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر ہونے والے دہشت گردانہ حملے

ہونے کے بعد مشرف کے پاس افغانستان — جس نے اسامہ بن لادن اور اس کے ساتھی دہشت گردوں کو محفوظ پناہ دیئے ہوئے تھا — میں طالبان حکومت سے حمایت واپس لینے کے علاوہ کوئی اور متبادل نہیں بچا تھا۔ دوسرا، جیسا کہ میں نے کتاب میں پہلے بھی ذکر کیا ہے، واجپئی حکومت کی سفارتی حکمت عملی کافی حد تک سرحد پار سے دہشت گردی کو پاکستان پر دباؤ بنانے کے لئے مغرب کی طاقتور حکومتوں کو تیار کرنے میں کامیاب رہی۔ تیسری اور آخری وجہ، جیسا اٹل جی نے انہیں آگاہ کیا تھا (اور میں نے بھی کہا تھا کہ جہاد کے نام پر جاری دہشت گردی ایک دن ان کے اپنے ملک کو بھی مشکل میں ڈال دے گی)، 04-2001 کے درمیان پاکستان کو خود بھی دہشت گردی کی مار جھیلنی پڑی، جو بیشتر حکومت کے خلاف تھی، اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس دوران مشرف کو مارنے کی بھی کئی ناکام کوششیں کی گئیں۔

یہ سچ ہے کہ پاکستان نے جنوری 2004 کے مشترکہ بیان میں جو کچھ کہا تھا اُسے پوری طرح سے باضابطہ شکل نہیں دی گئی۔ پاکستان کی زمین پر دہشت گردوں کا ڈھانچہ پہلے جیسا ہی قائم ہے۔ جموں وکشمیر میں دہشت گردوں کی دراندازی پوری طرح رکی نہیں ہے۔ ہندوستان میں تشدد اور خطرناک سرگرمیوں کو انجام دینے کے لئے آئی ایس آئی اب بھی مذہبی شدت پسندوں کو ٹریننگ اور ہتھیار مہیا کرا رہی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ پاکستانی حکمراں ہندوستان کا خون بہانے کے لئے دہشت گردوں کو اپنے ہتھیار اور سرکاری پالیسی کی شکل میں استعمال کرنے کے لالچ سے ابھی تک بدل نہیں پائے ہیں۔ ان حالات میں کیا ہمارا ملک، ہمارے ملک کے رہنے والے اور ہماری حکومت اپنے سیکورٹی انتظامات میں ذرا سی بھی ڈھیل دے سکے گی؟ بالکل نہیں۔

تقسیم (1947)، تین لڑائیاں (1971, 1965, 48-1947)، شملہ سمجھوتہ (1972)، لاہور اعلامیہ (1999)، کارگل جنگ (1999)، ناکام آگرہ سربراہ کانفرنس (2001)، اسلام آباد مشترکہ بیان (2004)، مسلسل جاری سرحد پار دہشت گردی... کیا ہندوستان اور پاکستان کے درمیان دشمنی کو ختم کرکے بقائے امن اہم اور اچھے پڑوسی جیسے تعلقات قائم نہیں ہو سکتے؟ کیا ہمارے آپسی تعلقات ماضی کی طرح تلخ ہی رہیں گے؟ کیا ہم اپنی ہونہار نسل کو بہتر مستقبل نہیں دے سکتے یا پھر کیا یہ ہمارا فرض نہیں ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ہمارا فرض ہے اور ہمیں ایسا ہی کرنا چاہئے۔

ان حالات کو بدلنے کی ابتدائی ذمہ داری پاکستان کی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ہندوستان نے اپنی شناخت کو پاکستان مخالف شکل میں نہیں دی ہے اور نہ ہی ہندوستان اپنی ترقی پاکستان کے زوال میں دیکھتا ہے۔ بدقسمتی ہے کہ پاکستان میں بہت سے لوگ اپنے ملک کی شناخت اور مستقبل کو ہندوستان سے مختلف، بلکہ اس کے خلاف کرکے دیکھتے ہیں۔ ہند مخالف نظریہ وہاں کی فوج اور مذہبی نظام میں بہت اندر تک سمائی ہوئی ہے۔ اس کے ساتھ پاکستان میں ہندوستان کی مبینہ کمزوریوں کے بارے میں ایک مکمل اور غلط روایت بھی گھر کرگئی ہے، جس کی وجہ سے کچھ پاکستانی یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ ہندوستان کو بار بار چوٹ پہنچا کر اور اس کو لہولہان کرکے وہ کشمیر پر قبضہ کر سکتے ہیں لیکن یہ کبھی نہیں ہونے والا ہے۔ ★

اس کے برعکس پاکستان میں مثبت سوچ رکھنے والے دانشور سمجھتے ہیں کہ اس ناسمجھی کی قیمت پاکستان کو ہی چکانی پڑے گی۔ پاکستان کے

★ کشمیر میں پاکستان کی دریدہ دہنی پر واضح تنقید معروف کالم نگار ایاز میر کے مضمون 'کشمیر اینڈ پاور آف الیوژن' میں دیکھا جا سکتا ہے۔ 19 رجنوری 2001 کے 'ڈان' میں امیر نے لکھا ہے — 'تلخ حقیقت یہ ہے کہ جہاد کا کشمیر میں کوئی مستقبل نہیں ہے۔ تشدد اور دہشت گردی سے ہندوستان کا خون ضرور بہہ سکتا ہے، لیکن اس سے ریاست کو آزادی نہیں مل سکتی۔ گزشتہ 53 سال کی تاریخ سے یہ بات واضح ہو جانی چاہئے۔ جو کام پاکستانی فوج آمنے سامنے کی لڑائی میں نہیں کرسکی، اُسے یہ جہادی مار کر بھگانے کی اپنی حکمت عملی کے ذریعہ پوری نہیں کر سکتے۔ یہ سوچنا بھی غلط ہے کہ کشمیر میں جہاد کے ذریعہ ہندوستان کو بات چیت کی میز پر لایا جا سکتا ہے۔'

متعدد لیڈر طویل عرصہ سے یہ رٹ لگاتے ہوئے خود کو تسلی دیتے آ رہے ہیں کہ جموں و کشمیر 'تقسیم کا ایک نامکمل ایجنڈا' ہے اور اس کی بنیاد پر وہ ریاست کے معاملوں میں پاکستان کی مداخلت کو ہمیشہ صحیح قرار دیتے رہے ہیں۔ آگرہ میں مشرف نے پاکستان حمایت یافتہ دہشت گردی کو تحریک آزادی بتا کر اسی غلطی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس بابت پاکستان آج ایک نازک موڑ پر کھڑا ہے۔ ایسی حالت میں اسے ایسا راستہ منتخب کرنا چاہئے جو اس کے اپنے اور تمام جنوبی ایشیا کے وسیع تر مفاد میں ہو۔

میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستان کے ساتھ بحالی امن اور دوستانہ تعلقات کے لئے پاکستان کی معاشرتی سیاست میں سرگرم لوگوں کی تعداد میں گزشتہ کچھ دہائیوں میں کافی اضافہ ہوا ہے۔ ہم ہندوستانیوں کو اپنی پاکستان مخالف روایت کو جو ردعمل کی شکل میں ہمارے ذہنوں میں جاگزیں ہیں — چھوڑ کر اس شعبہ میں سرگرم و فعال طاقتوروں سے مل کر کام کرنا ہوگا، لیکن جیسا کہ میں نے پہلے بھی بتایا کہ ہند- پاک تعلقات میں بنیادی تبدیلی کے لئے سب سے پہلے دہشت گردی کو ختم کرنا ہوگا۔ جسے ایک جانب مذہبی شدت پسندی کے ذریعہ اور دوسری جانب سرکاری حمایت و حوصلہ افزائی کے ذریعہ فروغ مل رہا ہے۔ جب ایسا ہو جائے گا تو دونوں ممالک کے سامنے جموں و کشمیر سمیت سبھی آپسی مسائل کا حل خود بخود نکل آئیں گے۔

10

مستقبل کے لئے آسام اور شمال مشرق کو محفوظ کرنا

جو لوگ تاریخ سے سبق نہیں لیتے، وہ اسے دوہرانے کی سزا بھگتتے ہیں۔
— جارج سنتیانا، امریکی مفکر

1947 میں مذہب کی بنیاد پر ملک کی تقسیم کا میں خود عینی شاہد اور اس کے عذابوں کو جھیلنے والا رہا ہوں، اس لئے میں آسام اور دیگر شمال مشرقی ریاستوں کو ہندوستان کی سالمیت اور قومی سیکورٹی سے جوڑ کر دیکھتا رہا ہوں۔ وزارت داخلہ میں اپنے چھ سال کے مدت کار کے دوران ان ریاستوں کے حالات سے نمٹتے وقت میں اپنا یہی نظریہ لے کر چل رہا تھا، لیکن اپنے سرکاری فرائض کی ادائیگی کے دوران مجھے احساس ہوگیا کہ ایک ملک کی شکل میں ہم شمال مشرق میں اپنی ماضی کی غلطیوں سے کوئی سبق نہیں لے پائے ہیں۔

جب کبھی میں ہندوستان کے نقشہ پر نظر ڈالتا ہوں اور اس نقشہ کا موازنہ اس وقت کے ہندوستان سے کرتا ہوں، جب میں کراچی میں ایک طالب علم ہوا کرتا تھا، تو میں یہی سوچتا ہوں کہ ہندوستان کتنا سمٹ گیا ہے۔ ایک غیر منقسم ہندوستان کی جگہ پر آج تین تین آزاد ملک بن گئے ہیں۔ 1947 میں ہندوستان کی تقسیم کے بعد پاکستان کی پیدائش اور 1971 میں پاکستان کی تقسیم کے بعد بنگلہ دیش کا وجود میں آنا، لیکن آج کے ہندوستان کے نقشہ سے مجھے یہ بھی یاد آتا ہے کہ ہندوستان میں اُس وقت برسر اقتدار لیڈران کس طرح ملک کو جغرافیائی کمزوریوں سے آزاد رکھنے میں ناکام رہے تھے۔ کتاب میں میں ایک جگہ ذکر کر چکا ہوں کہ ہندوستان 1947 میں ریاست سندھ کے ہندو اکثریت والے تھارپارکر ضلع پر اپنا قانونی دعویٰ کر سکتا تھا۔ اس سے ہندوستان کو ریاست سندھ میں ایک جغرافیائی موجودگی مل جاتی۔ میں نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ کس طرح جموں و کشمیر کا مسئلہ آج بھی ہمارے ملک کے لئے ناسور بنا ہوا ہے۔

چہار جانب سے گھرے اور ملک کے باقی حصہ سے کم جڑے ہوئے شمال مشرق میں مجھے فوجی کمزوری کا ایک تیسرا علاقہ بھی نظر آتا ہے۔ 1947 سے قبل اس کا باقی حصہ ہندوستان کے ساتھ جو ریلوے رابطہ تھا وہ آج کے بنگلہ دیش سے ہو کر گزرتا تھا، اب بند پڑا ہوا ہے۔ شمال مشرقی علاقہ ترقی یافتہ جو کبھی ندی ٹرانسپورٹ نظام کے ذریعہ سے اپنی پیداوار عالمی بازاروں تک پہنچایا کرتا تھا، اب سمندری پہنچ سے دور ہوگیا ہے، کیونکہ اس کی اہم ندیاں اب بنگلہ دیش میں بہتی ہیں۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ 1947 اور 1971 میں ہمارے لیڈروں نے چٹگانگ — جو عظیم ہندو اکثریت والا

علاقہ تھا اور تری پورہ کے قریب واقع ہے (محض 40 کلومیٹر کے فاصلہ پر) کے بندرگاہ شہر کو جوڑنے والی سڑک روڈ پر اختیار حاصل کرنے کے لئے زور کیوں نہیں دیا گیا۔ اس سے ہندوستان کے لئے مشرقی کنارہ سے خلیج بنگال ہوتے ہوئے شمال مشرق کی طرف جانا آسان ہو سکتا تھا۔

اس طرح شمال مشرق خطہ جغرافیائی نقطہ نظر سے باقی ہندوستان سے الگ تھلگ پڑ گیا۔ اتنا ہی نہیں مرکز میں وقتاً فوقتاً اقتدار میں آنے والی حکومتیں بھی اس علاقہ میں رہنے والے مختلف فرقوں کو جذباتی طور سے جوڑنے میں ناکام رہیں۔ نااہل ریاستی حکومتیں اور پڑوسی ممالک خصوصاً بنگلہ دیش کے علاقہ میں سرگرم ہند مخالف طاقتوں کی وجہ سے مسئلہ مزید سنگین ہو گیا ہے۔ پاکستان سے الگ ہو کر جب بنگلہ دیش ایک آزاد ملک بنا اس وقت امید کی جا رہی تھی کہ ہندوستان کو مشرق میں تو ایک اچھا پڑوسی دوست مل جائے گا، لیکن بدقسمتی سے حالات اس کے برعکس ہیں۔

داخلی اور خارجہ سیکورٹی کے نظریہ سے جب میں سوچتا ہوں تو آسام اور شمال مشرق کے باقی حصہ پر مجھے بہت تشویش ہوتی ہے۔ گزشتہ کئی دہائیوں سے یہ علاقہ علیحدگی پسند تشدد، فرقہ وارانہ فسادات، دہشت گردانہ کارروائی، بہار اور جھارکھنڈ سے آنے والے غریب ہندی بولنے والوں کا قتل، * اسلحوں اور نشیلی ادویہ کی اسمگلنگ اور بنگلہ دیش سے غیر قابو اور زبردست غیر قانونی دراندازی جیسے سنگین مسئلوں سے دوچار ہے۔ آسام میں بنگلہ دیشی دراندازی کو سپریم کورٹ نے بھی 'باہری حملہ' بتا کر الٹی میٹم کی گھنٹی بجادی ہے۔ میں تو کہوں گا کہ یہ بنگلہ دیش کی جانب سے ہندوستان پر ہونے والی مسلسل اور خاموش آبادی کا حملہ ہے اور اسے وقت پر نہیں روکا گیا تو نتائج انتہائی خطرناک ہوں گے جو برسوں بعد ہی سامنے آئیں گے۔

اس غیر ذمہ داری کے لئے کون اور کیسے عناصر ذمہ دار ہیں؟

1947 میں کس طرح آسام خود کو بچا سکا

سب سے پہلے میں کانگریس اور کمیونسٹ پارٹیوں کی ووٹ بنک کی سیاست سے متعلق اس حقیقت کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جس کی وجہ سے بنگلہ دیش سے ناجائز دراندازی کا مسئلہ 'بیرونی حملہ' کی حد تک پہنچ گیا اور ہندوستان کی سالمیت اور ایکتا کے لئے خطرہ بن گیا۔ افسوس کی بات ہے کہ قومی سطح پر میری پارٹی اور ریاستی سطح پر آسام گن پریشد ** کے علاوہ کسی دیگر تنظیم نے اس خطرہ کے خلاف آواز نہیں اٹھائی ہے۔ اٹل بہاری

---

* الفا دہشت گردوں کے ہاتھوں سیکڑوں 'بہاری غیر مقیم' حالانکہ یہ نام مناسب نہیں ہے، کیونکہ یہ بہاری کئی برسوں سے آسام میں رہ کر کام کر رہے ہیں — مارے جا چکے ہیں۔ الفا کے اہم لیڈروں کو بنگلہ دیش میں پناہ دی جاتی ہے اور اس کے دہشت گردوں کو سرحد پار واقع کیمپوں میں ٹریننگ دی جاتی ہے۔ الفا کی تشکیل 1979 میں بنگلہ دیش میں غیر قانونی دراندازی کے سبب پیدا شدہ مسائل پر ردعمل کے نتیجہ میں ہوا تھا، لیکن آہستہ آہستہ اس نے علیحدگی پسند تنظیم کی شکل لے لی اور 'آزاد آسام' کا مطالبہ کرنے لگی، کیونکہ اس کا دعویٰ ہے کہ آسام کبھی ہندوستان کا حصہ نہیں رہا۔ حکومت ہند کے پاس اس بات کا ثبوت ہے کہ الفا کے تعلقات پاکستان کی آئی ایس آئی سے ہیں، اس لئے اسے دہشت گرد تنظیم بتا کر اس پر پابندی عائد کر دی گئی ہے۔

** آل آسام اسٹوڈنٹس یونین (AASU) اور آل آسام گن پریشد نے 1979 میں غیر قانونی دراندازوں کو شناخت کر کے انہیں ریاست سے باہر بھیجنے کا مطالبہ کرتے ہوئے ایک تحریک چھیڑی تھی، جو چھ سال تک چلی۔ اتفاق سے ووٹر لسٹوں میں دسیوں ہزار بنگلہ دیشیوں کے نام پائے جانے پر یہ تحریک چلائی گئی تھی۔ نتیجتاً 1985 میں آسام سمجھوتہ پر دستخط ہوئے جب راجیو گاندھی ملک کے وزیر اعظم تھے، لیکن یہ سمجھوتہ نہ تو دراندازی کو روک سکا اور نہ ہی ریاست میں امن بحال ہو سکا۔ 1979 سے لے کر اب تک آسام میں 20 ہزار سے بھی زائد لوگ مارے جا چکے ہیں۔ طلبا تحریک کے نتیجے میں 1985 میں ایک سیاسی پارٹی 'آسام گن پریشد' (AGP) کا جنم ہوا۔

واجپئی جو 1957 میں ایک نومنتخب رکن پارلیمنٹ تھے، نے ہی یہ مسئلہ لوک سبھا میں اٹھایا تھا۔ 1980 میں بمبئی میں منعقد بی جے پی کی یوم تاسیس کے اجلاس کے موقع پر اپنے صدارتی خطبہ میں انھوں نے کہا تھا 'میں نے اس وقت متنبہ کردیا تھا کہ اگر اس طرح کی دراندازی کو روکنے کے لئے مثبت اور فعال قدم نہیں اٹھائے گئے تو حالات دھماکہ خیز ہو جائیں گے، لیکن حکومت حالات کی سنجیدگی کو نہیں سمجھ سکی...آسام کے حالات کے لئے وہی سیاست داں ذمہ دار ہیں جنھوں نے اپنی مطلب برآوری کے لئے ایک جانب تو غیر ملکی دراندازی کی جانب سے آنکھیں موندلیں اور دوسری جانب اس کی حوصلہ افزائی بھی کی۔ آسام پر پہلے ہی کئی زخم لگ چکے ہیں، اب باقی ہندوستان کو اپنی لاپروائی اور مرکزی قیادت کی اپنی ناعاقبت اندیشی سے اس کے خاتمہ کی تکمیل کا گناہ نہیں کرنا چاہئے۔'

مئی 1986 میں اٹل جی سے پارٹی کی کمان سنبھالنے کے بعد نئی دہلی میں منعقد بی جے پی کی قومی مجلس عاملہ کی میٹنگ میں اپنے پہلے صدارتی خطاب میں، میں نے کہا تھا 'آسام میں غیر ملکی شہریوں کی موجودگی اور سرحد پار سے بے قابو دراندازی کا مسئلہ ابھی بھی برقرار ہے۔ غیر قانونی غیر مقیموں کی وجہ سے مرکزی حکومت پر دباؤ بنانے کے لئے آسام کے عوام نے ایک طویل جنگ چھیڑی ہے۔ میں نے یہ مطالبہ کیا تھا کہ سرحدی ریاستوں میں رہنے والے سبھی شہریوں کے لئے فوٹو شناختی کارڈ لازمی کیا جائے۔ آسام میں جہاں 1981 میں ملک کی دیگر ریاستوں کے ساتھ مردم شماری نہیں ہو پائی تھی خصوصی مردم شماری کے احکامات جاری کئے جانے چاہئے، اس کے ساتھ ہی ایک 'قومی شہری رجسٹر' بھی تیار کیا جانا چاہئے۔'

مسئلہ آسام کو 1940 میں مسلم لیگ کے ذریعہ ہندوستانی مسلمانوں کے لئے الگ ملک (پاکستان) کے مطالبہ کے ساتھ جوڑ کر دیکھا جاسکتا ہے۔ اس مطالبہ کے وقت ہی آسامیوں کو یہ خطرہ محسوس ہونے لگا تھا کہ انہیں اپنی ہی ریاست میں اقلیت بن کر رہنا پڑے گا، اسی لئے انھوں نے خود کو بقیہ ہندوستان سے الگ کرلیا۔ 1905 میں تقسیم بنگال ★ — جو انگریزوں کی 'پھوٹ ڈالو اور راج کرو' کی پالیسی کا حصہ تھی — اور 1906 میں مسلم لیگ کے قیام کے بعد آسام میں مسلمانوں کی آبادی میں اضافہ کیلئے مشرقی بنگال سے منظم طریقہ سے در اندازی کی کوشش لیگ کے ذریعہ کی گئی۔

اس خطرے کو پہلے سے بھانپ لینے کا سہرا عظیم قوم پرست لیڈر اور جدید آسام کے معمار گوپی ناتھ بوردولوئی کو جاتا ہے جو 1937 میں ریاست میں کانگریس کی قلیل المدت کانگریس اتحاد حکومت کے وزیر اعلیٰ رہے تھے۔ مناسب وقت پر کی گئی ان کی ٹھوس کوششوں کے بغیر آسام ہندوستان کا حصہ نہیں رہ پاتا۔ غیر مسلم اکثریتی ریاست آسام کو ایک مسلم اکثریت ریاست میں تبدیل کرنے اور اس طرح اسے مجوزہ مشرقی پاکستان میں ضم کرنے کی مسلم لیگ کی چال کو انہوں نے سمجھ لیا تھا۔ بدقسمتی سے گاندھی جی کو چھوڑ کر کانگریس کی مرکزی قیادت نے آسام پر اپنا

★ 1905 میں لارڈ کرزن کے ذریعہ تقسیم بنگال کو 2005 میں سو سال پورے ہو گئے۔ مذہبی بنیاد پر بنگال کی تقسیم کے وقت 'وندے ماترم' کا نعرہ لگا کر اس تقسیم کی مخالفت کی گئی اور بعد میں یہی قومی تحریک کا ترانہ بن گئی۔ 1905 کے (تقسیم بنگال کے) بارے میں 'وندے ماترم' میگزین شعلہ جوالہ نوجوان مدیر شری اروند گھوش نے لکھا تھا — '(برٹش) حکومت ایک (علیحدہ) مسلم ریاست بنانا چاہتی تھی جس کی راجدھانی ڈھاکہ ہوتی اور اس کے پس منظر میں واضح مقصد ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت کے بیج بونا تھا، جو پوری تاریخ میں کبھی نہیں ہوا تھا۔' بی جے پی اور دیگر قوم پرستوں نے تقسیم بنگال کی صدی لوگوں کو اس کی تاریخی اہمیت کے بارے میں بیدار کرکے منائی۔ افسوس کی بات ہے کہ کانگریس اور کمیونسٹ پارٹیوں نے اس میں کوئی دلچسپی نہیں دکھائی اور نہ مذہبی مشترکہ ترقی پسند اتحاد حکومت نے دلچسپی لی۔

دعویٰ چھوڑ دینے کا ذہن بنالیا تھا۔ 1946 میں جب آسام کے مشرقی پاکستان میں شامل ہونے کا خطرہ سامنے آیا اس وقت گاندھی جی نے ہی باردولوئی اوران کے کانگریس کے ساتھیوں کی حمایت کی۔ انہوں نے لکھا تھا— 'اگر آسام خاموش بیٹھا رہے گا تو وہ ختم ہو جائے گا۔ آسام کو اپنی روح نہیں کھونی چاہئے۔'* باردولوئی اوران کے حامیوں کو گاندھی جی نے یہاں تک مشورہ دیا کہ اگر آسام کو ہندوستان کا حصہ بنائے رکھنے کے لئے ضرورت پڑے تو وہ کانگریس سے علیحدہ ہو جائیں۔ بالآخر صرف سلہٹ ضلع کو ہی— جہاں مشرقی بنگال سے آئے مسلمانوں کی تعداد پہلے سے ہی زیادہ تھی- استصواب رائے کی بنیاد پر مشرقی پاکستان میں الحاق کر دیا گیا۔

آسام میں بیرون مخالف تحریک کی جڑ

60 کی دہائی کی شروعات میں آسام میں کانگریس کے وزیراعلیٰ بملا پرساد چالیہا نے ریاست میں جنوری 1951 کے بعد یہاں آکر آباد ہونے والوں کے خلاف ایک مہم چلائی تھی لیکن وزیراعظم نہرو اس کے خلاف تھے۔ چالیہا نے جب اس سمت میں آگے قدم بڑھاتے ہوئے پاکستانی دراندازی کی روک تھام کا ایکٹ 1964 پیش کیا تو 20 ارکان اسمبلی نے دھمکی دی کہ اگر وہ بل کے پیش ہونے پر روک نہیں لگاتے تو وہ حکومت کو گرادیں گے۔ چالیہا دباؤ میں آگئے اور اس طرح بل التوا میں رہ گیا۔ ایک دوسرے کانگریس وزیراعلیٰ ہتیشور سیکیا کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی واقعہ ہوا۔ 10 اپریل 1992 کو ریاستی اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا کہ آسام میں 30-20 لاکھ بنگلہ دیشی ہیں۔ اس پر عبد الحبیب مجمدار نے سیکیا کو دھمکی دی کہ 'آسام کے مسلمان اگر ارادہ کرلیں تو محض پانچ منٹ میں ان کی حکومت گرا سکتے ہیں'۔ پھر کیا تھا، وزیراعلیٰ موصوف نے فوراً اعلان کر دیا کہ آسام میں ایک بھی غیر قانونی درانداز نہیں ہے۔

ایک بار جب مقامی لیڈروں کو سمجھ آگئی کہ کانگریس ہائی کمان بنگلہ دیشی دراندزاوں کے مسئلہ پر سنجیدہ نہیں ہے تو انہوں نے بھی اپنا ووٹ بنک تیار کرنے کا ذریعہ بنالیا۔ آسام کانگریس کے سینئر لیڈر دیوکانت بروا (جنہوں نے ایمرجنسی کے دوران بطور قومی صدر کہا تھا کہ 'اندرا ہی انڈیا ہے اور انڈیا ہی اندرا ہے') اپنے سیاسی مخالفین کو چیلنج کیا کرتے تھے- 'جب تک کانگریس کو علی (آسام کے مسلمان)، قلی (چائے کے باغانوں میں کام کرنے والے بہار اور جھارکھنڈ کے مزدور) اور بنگالی (بنگلہ دیشی) کی حمایت حاصل ہے تب تک ہمیں کون شکست دے سکتا ہے'۔

طلبا تحریک کو اپنی حمایت دینے کیلئے اٹل جی، جسونت سنگھ اور میں 80 کے عشرہ میں برابر آسام کا دورہ کیا کرتے تھے۔ اسی دوران میں پرفل کمار مہنت اور تحریک کے دوسرے طلبا لیڈروں کے رابطہ میں آیا۔ ارون شوری- جو ایک مشہور صحافی اور سیاسی مبصر کے طور پر کافی مقبول تھے آسام تحریک کے پکے حامی اور صلاح کار تھے، کے ساتھ میرا رابطہ اور نزدیکیاں بڑھیں۔ شوری بعد میں بھارتیہ جنتا پارٹی میں شامل ہوئے اور پارٹی کے اہم لیڈر بن گئے۔ اس وقت میں راجیہ سبھا کا ممبر تھا اور آسام کے مسئلہ کو ایوان میں اکثر اٹھایا کرتا تھا۔ اس ریاست سے جنتا پارٹی کے

★ پندرہویں صدی کے ویشنوسنت شری شنکر دیو نے آسام کی روح کی انسانی پیش رفت کی ہے۔ انہوں نے آسام میں ایک سماجی ثقافتی انقلاب پیدا کیا تھا۔ وہ ہندوستان کے مختلف حصوں میں بھگتی آندولن سے جڑے سنتوں- شاعروں اور سماجی اصلاح کاروں کے شہاب ثاقب تھے- بنگال میں چیتنیہ دیو، مہاراشٹر میں گیانیشور اور نام دیو، اتر پردیش میں رامانند اور کبیر، مدھیہ پردیش میں ولبھ آچاریہ، کرناٹک میں باسیشور اور دیگر۔ شنکر دیو نے چھوا چھوت، سماجی برائیوں اور دیگر منفی روایات کے خلاف مہم چلائی تھی۔ گرام پنچایتوں کی شروعات کر کے اور تعاون کے نظریئے کو فروغ دے کر انہوں نے جمہوریت کی شجر کاری کی تھی۔ اس عظیم لیڈر کے احترام میں خود گاندھی جی نے ایک بار کہا تھا 'آسام میرے خوابوں سے کہیں آگے ہے۔ یہاں میری خدمات کی ضرورت نہیں ہے۔'

اہم لیڈر گولپ بار بورا کے ذریعہ داخل کی گئی ایک عرضی مجھے یاد ہے۔ عرضی میں کہا گیا تھا کہ 'کوئی بھی خودمختار اور خودکفیل ملک اپنی سرزمین پر غیر ملکیوں کی دراندازی کی اجازت نہیں دے سکتا۔ لیکن ملک کا شمال مشرقی علاقہ خاص طور سے آسام طویل عرصہ سے پڑوسی ملک سے بڑی تعداد میں آنے والے لوگوں کی دراندازی کے مسئلہ سے دوچار ہے۔ اتنا ہی نہیں آزادی کے بعد برسراقتدار سیاسی پارٹی ریاست میں اپنے مفاد کیلئے ان غیر ملکی شہریوں کے نام ریاست کی ووٹر لسٹ میں درج کر کے ان کی چاپلوسی بھی کرتی رہی ہے'۔

آسام کے اتنی طویل اور تشویشناک تاریخ کو بیان کرنے کے پیچھے میرا مقصد صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ غیر ملکی مخالف تحریک کچھ بھٹکے ہوئے طلبا کے ذریعہ پیدا کئے گئے نظم ونسق کا کوئی مسئلہ نہیں تھا، جیسا نئی دہلی میں کانگریسی لیڈر تشہیر کر رہے تھے۔ حقیقت میں یہ تحریک آسام کو متواتر آبادی کے مسئلہ سے بچانے میں نہرو-لیاقت معاہدہ (1950) اور اندرا- مجیب معاہدہ (1971) کی ناکامی کا نتیجہ تھا۔ بدقسمتی کی بات ہے کہ 1985 کا آسام بھی اپنے اس مقصد کو حاصل کرنے میں ناکام رہا۔ اس معاہدہ کی سب سے بڑی ناکامی یہ رہی کہ عدالتی اتھارٹیز کے ذریعہ آئی ایم ڈی ٹی (ناجائز غیر مقیم ایکٹ) جیسے منفی قانون کو نہیں ہٹایا سکا، جسے اندرا گاندھی حکومت نے 1983 میں پارلیمنٹ میں پیش کیا تھا۔ اس ایکٹ کے تحت مسئلہ یہ تھا کہ کسی (غیر ملکی یا غیر قانونی) غیر مقیم شہریوں کے غیر ملکی ہونے کی بات ثابت کرنے کی ذمہ داری استغاثہ فریق (ریاستی حکوت کی اتھارٹیز) کو دی گئی تھی۔ یہ معیار غیر ملکی (شہری) ایکٹ کے التزام کے برعکس تھی، جس میں اپنی ہندستانی شہریت ثابت کرنے کی ذمہ داری مشتبہ یا ملزم شخص کے اوپر تھی۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ 1971 کو 'تاسیسی سال' کے طور پر مانا کر اس سمجھوتہ میں 1957 سے 1971 کے درمیان آنے والوں کو ہندوستانی شہریت کی شکل میں قبول کیا گیا تھا۔

آسام کے عوام چھ سال کی طویل جدوجہد کے بعد تھک چکے تھے جس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے مرکز کی کانگریسی حکومت نے ایک ایسا سمجھوتہ کیا جسے وہ خود نافذ کرنے کی خواہشمند نہیں تھی۔ تحریک کے لیڈروں کو خوش کرنے کیلئے آسام سمجھوتہ کے سیکشن 5.9 میں یہ رولنگ دی گئی کہ (آئی ایم کے ڈی ٹی) 1983 کو نافذ کرنے سے متعلق آل آسام اسٹوڈنٹس یونین اور آل آسام گن سنگرام پریشد کے سامنے لائی جانے والی کچھ ایک دشواریوں کی جانب حکوت ضرور توجہ دے گی۔ لیکن حکومت یہ یقین دہانی بھی پورا نہیں کر پائی۔ نتیجتاً یہ سمجھوتہ اپنے آپ میں ایسا مرض بن کر رہ گیا جس کا کوئی علاج نہیں تھا۔

آسام کے درد کی حقیقت کو نظرانداز کرنا، کانگریس پارٹی کی مرکزی قیادت کی عادت بن گئی ہے۔ 1996 میں انٹلی جنس بیورو کے اس وقت کے ڈائرکٹر اور فی الحال اترپردیش کے گورنر ٹی وی راجیشور نے متنبہ کیا تھا کہ 'آسام اور دیگر سرحدی ریاستوں میں بنگلہ دیش سے ہونے والی غیر قانونی دراندازی کسی دن ہندوستان کی ایک اور تقسیم کی وجہ بن سکتی ہے'۔ کانگریس پارٹی، مرکز اور ریاست میں برسراقتدار کانگریسی حکومتوں نے خاموشی اختیار کرلی۔ اسی طرح آسام کے سابق گورنر، اور ایک جنرل (ریٹائرڈ) ایس کے سنہا نے 2005 میں ایک رپورٹ میں کہا تھا 'یہ (ہند-بنگلہ دیش) سرحد، دنیا کی سب سے غیر محفوظ سرحدوں میں سے ایک ہے یہاں سے یومیہ کام کی تلاش میں آنے والے 6 ہزار بنگلہ دیشیوں کی دراندازی ہوتی ہے۔ اور یہ ملک میں پہلے ہی سے رہ رہے 2 کروڑ دراندازوں میں ضم ہوجاتے ہیں'۔ لیکن وزیراعلیٰ ترون گوگئی نے اسے 'پوری طرح بے بنیاد' قرار دیتے ہوئے خارج کردیا۔

حقیقت سے انکار کرنے والے قصوروار لوگوں میں ڈاکٹر منموہن سنگھ بھی شامل ہیں، جو آسام سے راجیہ سبھا کے رکن ہیں۔ 15 جولائی 2004 کو وزیر مملکت برائے داخلہ شری پرکاش جیسوال نے راجیہ سبھا میں کہا تھا کہ 31 دسمبر 2001 تک ہندوستان کی 17 ریاستوں اور مرکز کے

زیرانتظام خطوں میں کل ایک کروڑ 20 لاکھ 950 غیر قانونی بنگلہ دیشی رہ رہے تھے۔انہوں نے یہ بھی کہا کہ آسام میں 50 لاکھ بنگلہ دیشی رہ رہے ہیں،اگلے روز جب ڈاکٹر منموہن سنگھ گوہاٹی کے دورے پر گئے تو آسام کے پارٹی لیڈروں سے ان کی ملاقات ہوئی۔ان لیڈروں نے تشویش کا اظہار کرتے ہوئے ڈاکٹر سنگھ سے کہا کہ پارلیمنٹ میں آپ کے وزیر کے جواب سے 2006 کے اسمبلی انتخابات میں کانگریس پارٹی کی فتح کے امکانات کو چوٹ پہنچے گی،ان کی مخالفت کا اثر ہوا۔وزیر اعظم نے سر عام کہا کہ جیسوال کے ذریعہ دستیاب کرائے گئے اعداد پر مجھے شبہ ہے۔پھر ایک ہفتہ بعد جیسوال نے خود پارلیمنٹ میں کہا کہ بنگلہ دیشی دراندازوں کے بارے میں ان کی وزارت کے ذریعہ مہیا کرائی گئی تفصیلات مصدقہ نہیں ہے۔اور وہ سنی سنائی باتوں پر تیار کی گئی ہے۔اقتدار پر قابض رہنے کیلئے ایسا رویہ لمحۂ فکریہ ہے۔

آئی ایم ڈی ٹی ایکٹ کے خلاف سپریم کورٹ کا تاریخی فیصلہ

1983 میں جب آئی ایم ڈی ٹی ایکٹ نافذ ہوا تھا اسی وقت بھارتیہ جنتا پارٹی اسے خارج کرنے کیلئے آسام کے عوام کے مطالبہ کی حمایت کررہی تھی۔پارلیمنٹ کے اندر اور باہر ہم نے متعدد احتجاجی مظاہرے کئے تھے۔لوک سبھا اور ریاستی اسمبلی انتخابات میں ہمارے بھی انتخابی منشوروں میں یہ مانگ رکھی گئی۔بدقسمتی سے،راجیہ سبھا میں ضروری حمایت نہ ملنے کی وجہ سے ہم این ڈی اے حکومت کے دور میں اپنا یہ وعدہ پورا نہیں کر سکے۔

اس درمیان عدلیہ آسام میں بنگلہ دیشی دراندازی کی لڑائی کا میدان کارزار بن گیا۔اور اسی میدان میں 14 جولائی 2005 کو ایک بڑی کامیابی ملی،جب سپریم کورٹ نے آئی ایم ڈی ٹی ایکٹ کو غیر آئینی قرار دیتے ہوئے مسترد کردیا۔آسام گن پریشد کے ایک رکن پارلیمنٹ سروآنند سونوال کے ذریعہ دی گئی ایک عرضی پر سماعت کرتے ہوئے چیف جسٹس آرسی لاہوٹی،جسٹس جے پی ماتھر اور جسٹس پی کے بالاسبرامنیم کی ڈویژنل بنچ نے کہا کہ بنگلہ دیش سے غیر قانونی طریقہ سے آسام میں آکر بسنے والے بنگلہ دیشیوں کی وجہ سے شمال مشرقی علاقوں کی سالمیت کیلئے سنگین چیلنج اور اس سے تشویشناک حالات پیدا ہوگئے ہیں،جن سے آسام کے لوگوں کی زندگی پوری طرح سے غیر محفوظ ہوگئی ہے،اور اس طرح علاقہ میں خوف وہراس کا ماحول ہے۔آزاد ہندوستان کی تاریخ میں قومی سیکورٹی کے معاملہ میں سپریم کورٹ کے ذریعہ شاید ہی کسی حکومت کو اتنی سرزنش کی گئی ہوگی۔سپریم کورٹ کے اس فیصلہ کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے میں اسے یہاں قدرے تفصیل سے ذکر کرنا چاہتا ہوں۔

عدالت نے آسام کے اس وقت کے گورنر لیفٹیننٹ جنرل ایس کے سنہا ،جو ہندوستانی فوج کے نائب بھی تھے،کے ذریعہ 8 نومبر 1998 کو مرکز کو سونپی گئی رپورٹ کو سنجیدگی سے لیا تھا۔رپورٹ میں متنبہ کیا گیا تھا کہ 'غیر قانونی دراندازوں کی وجہ سے ریاست آسام کی آبادی کی شکل میں بڑی تبدیلی آگئی ہے اور اس سے آسام کے لوگوں کو اپنی ہی ریاست میں اقلیت بن جانے کا خطرہ لاحق ہوگیا ہے'۔اس میں یہ بھی الٹی میٹم دیا گیا تھا کہ' آسام میں غیر قانونی دراندازوں کو صرف آسام کے عوام کو متاثر کرنے کے علاقائی معاملہ کی شکل میں دیکھنے کی روایت رہی ہے۔اس سے ہماری سیکورٹی کیلئے جو خطرہ پیدا ہورہا ہے،اس جانب توجہ نہیں دی جارہی ہے۔گریٹر ایسٹ پاکستان،بنگلہ دیش کا تصور کرکے آسام کو باقی ہندوستان سے جوڑنے والے ہموار زمینی راستے میں سڑکیں بنانے کا مقصد کامیاب ہوجانے پر شمال مشرق کا مکمل زمینی علاقہ اپنے خوشحال وسائل کے ساتھ بقیہ ہندوستان سے الگ ہوسکتا ہے۔اس کے معاشی اور فوجی نتائج خطرناک ہوں گے'۔

'گورنر کی رپورٹ،حلف ناموں اور دیگر دستاویزوں سے پتہ چلتا ہے کہ لاکھوں بنگلہ دیشی شہریوں نے غیر قانونی طور سے بین الاقوامی

سرحد پار کی ہے۔اس سے، جیسا کہ گورنر کی رپورٹ میں درج ہے، بغاوت کے حالات پیدا ہو گئے ہیں۔ایسی حالت میں بلاشبہ ریاست آسام، بڑے پیمانہ پر غیر قانونی بنگلہ دیشی شہریوں کے ٹھہرنے کی وجہ سے، 'بیرونی حملوں اور اندرونی بدامنی' سے جدو جہد کر رہا ہے۔اسلئے آئین کی دفعہ 355 کے مطابق مرکزی حکومت کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ان بیرونی حملوں اور داخلی بدامنی سے نمٹنے کیلئے ضروری اقدام کرے۔لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ قانون کے باوجود کیا مرکزی حکومت نے کوئی ایسے قدم اٹھائے؟

آئی ایم ڈی ٹی ایکٹ کی ناکامی کے بارے میں سپریم کورٹ نے جو تبصرہ کیا تھا 'اس بارے میں زیادہ وضاحت کرنے کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ ہندوستانی وفاق اور ریاست آسام کے ذریعہ داخل حلف ناموں میں جو اعداد وشمار پیش کیے گئے تھے ان سے سب کچھ واضح ہو جاتا ہے۔اگر چہ آئی ایم ڈی ٹی ایکٹ کے تحت صرف 3 لاکھ 10 ہزار 759 معاملوں کی تحقیق کی گئی تھی، لیکن ان میں سے صرف 10 ہزار 15 لوگوں کو غیر قانونی مقیم کہا گیا، اور بالآخر 30 اپریل 2000 تک کل 1481 غیر قانونی دراندازوں کو ملک سے باہر کیا گیا۔یہ زیر غور معاملوں میں نصف فیصد سے بھی کم تھا۔اس طرح، اس میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا ہے کہ آئی ایم ڈی ٹی ایکٹ پر عملدرآمد اور اس کے تحت بنائے گئے قوانین وضوابط ریاست آسام میں ناجائز بنگلہ دیشیوں کی شناخت کرنے اور انہیں ریاست سے باہر کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے'۔عدالت نے یہ بھی کہا کہ غیر ملکی ایکٹ التزام ہندوستان میں رہ رہے غیر ملکیوں کی شناخت کر کے انہیں ملک سے باہر بھیجنے میں زیادہ کارگر ہے۔اس طرح سپریم کورٹ کا فیصلہ ہر طرح سے بی جے پی اور دیگر قوم پرست طاقتوں کے موقف کی حمایت کرنے والا تھا۔

جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے سپریم کورٹ نے مرکزی حکومت کو حکم دیا تھا کہ وہ 'آئین کی دفعہ 355 کے مطابق ریاست آسام کو بیرونی حملوں سے بچانے کیلئے سبھی ضروری اقدام کرے'۔قابل ذکر ہے کہ کانگریس قیادت والی یو پی اے حکومت نے اس واضح آئینی حکم کو بھی پلٹنے کی کوشش کی۔اپنی غلطیوں سے سبق لے کر ان میں اصلاح کرنے کے بجائے اس نے اکیلے آسام کیلئے غیر ملکی ایکٹ میں بڑے پیمانہ پر ترمیم کی اور اس میں آئی ایم ڈی ٹی ایکٹ کے غلطیوں کو جوڑ کر فارنرز (ٹریونلز فار آسام) آرڈر 2006 بنا دیا۔یہ براہ راست عدالت کی حکم عدولی تھی، بلکہ آئین کی ہی حکم عدولی تھی کیونکہ ایسا کر کے حکومت نے ہندوستان کی سالمیت واتحاد کے سنگین خطرے کو نظر انداز کیا تھا۔

ایک بار پھر دسمبر 2006 میں اپنے حکم میں سپریم کورٹ نے ہی فارنرز (ٹریونلز فار آسام) آرڈر کو 'غیر آئینی' قرار دیکر خارج کر دیا۔جسٹس ایس بی سنہا اور جسٹس پی کے بالا سبرامنیم کی ایک بنچ نے اس معاملہ میں کہا 'ایسا محسوس ہوتا ہے کہ 2006 کا حکم' جو آئی ایم ڈی ٹی ایکٹ کو غیر آئینی بتائے جانے کے بعد جاری کیا گیا 'ان عدالتوں کی ہدایات پر عمل نہ کیے جانے کیلئے ہی جاری کیا گیا ہے'۔بنچ نے مزید کہا '(آئی ایم ڈی ٹی ایکٹ پر) مکمل فیصلہ متعلقہ شواہد کے سلسلہ میں تھی، جن سے یہ پتہ چلتا تھا کہ شمال مشرقی ریاستوں میں اس طرح کی کنٹرول سے باہر دراندازی سے ملک کی سالمیت واتحاد کیلئے خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔اس لئے ضروری یہ ہے کہ اس عدالت کے ذریعہ (پہلے کے فیصلہ میں) دیئے گئے احکامات کو سختی سے نافذ کیا جائے، تا کہ غیر قانونی دراندازوں کی ملک سے واپسی یقینی بنائی جا سکے۔ہمیں افسوس ہے کہ غیر قانونی دراندازوں کو ملک سے باہر بھیجنے کیلئے ہمارے اندر خود اعتمادی کی کمی ہے۔قومی سلامتی کے مفاد میں اور ہندوستان کی آبادی کے توازن کو بنائے رکھنے کیلئے جو احکامات جاری کیے گئے تھے، ان کو ماننے اور آسام میں 1964 کے احکامات کو بہتر طریقے سے نافذ کرنے کے بجائے متعلقہ اتھارٹیز نے 1964 کے احکامات کو آسام میں نافذ نہ کرنے کا فیصلہ کیا'۔اور اب سپریم کورٹ کا تلخ تبصرہ تھا: ''اگر چہ جب ملک کی سلامتی کا معاملہ ہو تو ہم عموماً تبصرہ کرنے سے بچتے ہیں، لیکن ہمیں کہنا پڑے گا کہ ایمانداری کے ساتھ پوری نہیں کی گئی ہے۔''

اس لئے کانگریس صدر سونیا گاندھی اور وزیر اعظم ڈاکٹر منموہن سنگھ پر میرا الزام یہ ہے کہ انہوں نے جان بوجھ کر ووٹ بنک کی سیاست کی وجہ سے ملکی مفاد کو قربان کر دیا۔ خود کو اقلیت نواز سیاست کا غلام بنا کر وہ اس سنگین خطرے کے خلاف ہندوستان کے آئینی اور انتظامی امور کو جان بوجھ کر غیر مسلح کر رہے ہیں۔' میں ان سے پوچھتا ہوں جب کسی غیر قانونی رہائشی کے غیر ملکی ہونے سے متعلق ثبوت کی ذمہ داری خود عدالت کی ہے تو بنگلہ دیش سے متصل ہماری سرحد پر سیکورٹی فورسز کو کیوں تعینات کیا گیا ہے؟ ہر کسی کو سرحد پار کر کے ہندوستان میں بغیر روک ٹوک کی اجازت کیوں نہیں دے دیتے؟'

نجی بات چیت میں کانگریسی اور کمیونسٹ لیڈر قبول کرتے ہیں کہ بنگلہ دیش سے بڑے پیمانہ پر ہونے والی غیر قانونی دراندازی حقیقت میں ایک مسئلہ ہے، لیکن عوامی طور پر وہ ایسا کہنے سے ڈرتے ہیں کیونکہ انہیں اپنا ووٹ بنک کھو دینے کا خوف ہے۔ اسلئے انہوں نے اس بارے میں بی جے پی کا مطالبہ کہ غیر ملکیوں کی شناخت کر کے انہیں ملک سے باہر بھیجنے اور ان کے نام ووٹر لسٹ سے کاٹنے کی مسلسل مخالفت کی ہے۔ ان کی یہ صفائی کہ قانون کا استعمال مقامی مسلمانوں کے خلاف کیا جائے گا۔ اپنے مفاد کیلئے یہ ایک بے بنیاد بہانہ ہے۔ میں اس صفائی کو مسترد کرتے ہوئے بار بار کہتا رہا ہوں کہ اپنے آئینی فرائض کو پورا کرنے کے سلسلہ میں حکومت کی یہ پالیسی ہونی چاہئے کہ 'آسام کے رہنے والے مسلمانوں کا سو فیصد تحفظ، لیکن بنگلہ دیشی مسلمانوں کی صفر فیصد سیکورٹی'۔

شمال مشرق کے بارے میں ایک نیا نظریہ

آسام میں منہ کھولے یہ چیلنج ان بڑے مسائل کی جانب اشارہ ہیں جس کا سامنا ہندوستان کو پورے شمال مشرق میں کرنا پڑ رہا ہے۔ طویل عرصے سے مرکز میں برسر اقتدار حکومتیں ان مسائل کو قانونی نظم و نسق سے جوڑ کر دیکھتی آئی ہیں۔ انھوں نے ان مسئلوں کو علاقہ کی 3.5 کروڑ آبادی والے ان 300 مختلف النوع قبائلی گروپوں کے خصوصی اور انوکھے تاریخ و جغرافیہ کے پس منظر میں دیکھنے پر کم زور دیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر اس علاقے کی بیرونی ہیئت ملک کے مختلف حصوں کی بہ نسبت کہیں زیادہ کھلی ہے۔ بنگلہ دیش، میانمار، بھوٹان اور چین کی بین الاقوامی سرحدوں کی دونوں جانب رہنے والے لوگ صدیوں پرانی لسانی، ثقافتی، مذہبی اور معاشی تعلقات سے جڑے ہوئے ہیں۔ علاقے کی کل آبادی میں تقریباً 40 فیصد قبائلی ہیں جنھوں نے اپنی شناخت اور خود مختاری کے روایتی رسم و رواج کو بچا کر رکھا ہے۔

اس طرح 1947 کے بعد اس علاقہ میں پیدا ہونے والے مختلف حالات کو پوری طرح صرف سلامتی نقطہ نظر سے ہی نہیں دیکھا جاسکتا ہے۔ قومی سلامتی بلاشبہ سب سے اہم ہے لیکن عوام کو ملک کے ساتھ جذباتی طور سے باندھ کر ہی قومی سلامتی یقینی بنائی جاسکتی ہے۔ اس کے لئے عوام کی انفرادی قبائلی یا مذہبی شناخت، عوامی رابطہ سے مزین انتظامیہ، بہتر معیار زندگی یقینی بنانے والی سماجی اور معاشی ترقی اور پورے علاقے کا بقیہ ہندوستان کے ساتھ گہرا تعلق ضروری ہے۔ اس طرح شمال مشرق کے حالات سے نمٹنے کے لئے سیکورٹی، جمہوری اور ترقیات کی منظم کوششوں کی ضرورت ہے۔ لیکن بدقسمتی کی بات ہے کہ نئی دہلی میں اقتدار میں آنے والی حکومتوں اور قومی سیاسی پارٹیوں نے اس جانب مکمل توجہ نہیں دی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ علاقہ کی ترقی اور عوامی بہبود کے لئے پوری رقم دستیاب نہیں کرائی گئی۔ آزادی کے بعد سے مرکز نے شمال مشرقی ریاستوں کو کثیر مقدار میں وسائل مہیا کرائے ہیں۔ دستیاب رقم کو صحیح طریقے سے خرچ نہیں کیا گیا ہے اور اس طرح مختلف ترقیاتی اور فلاحی اسکیموں کا فائدہ لوگوں کو نہیں مل پایا ہے۔ علاقائی پارٹی کمزور قیادت اور اندرونی خلفشار اور جوابدہ سرکار دینے کے کھوکھلے وعدوں کا شکار ہوگئی۔ ان ریاستوں کی سیاست مرکز میں

بیٹھے لیڈروں میں ہی اپنی خودغرضی ڈھونڈتا رہا اور دوسری جانب کانگریس پارٹی اپنی جز وقتی خودغرضی کے لئے اس کو فروغ دیتی رہی۔

حقیقت میں ایسے متعدد معاملے سامنے آئے ہیں جن میں مقامی سیاسی پارٹی کے لیڈر دہشت گرد تنظیموں سے منسلک پائے گئے ہیں اور جن کے لئے رقوم وصول کرنا ایک تجارت بن گیا ہے۔ کئی بار تو سرکاری رقم بھی راست طور سے ان کے پاس پہنچا دی جاتی ہے۔ کچھ ایک کو چھوڑ کر آل انڈیا سول سروسز سے متعلق افسران شمال مشرقی ریاستوں میں کام کرنے کے لئے زیادہ پرجوش نہیں ہوتے۔ ان سبھی وجوہات نے علاقہ کے لوگوں میں علیحدگی کا جذبہ پیدا کرنے میں تعاون دیا ہے جس کا سرحد پار سے ملک مخالف طاقتوں کی جانب سے کام کرنے والے عناصر نے فائدہ اٹھایا ہے۔

اب میں داخلی سلامتی کے بارے میں این ڈی اے حکومت کے ذریعہ کی گئی کچھ اہم کوششوں کے بارے میں مختصراً ذکر کروں گا۔ الفا اس علاقے کی سب سے بڑی اور خطرناک دہشت گرد تنظیم تھی اور اب بھی ہے۔ بھوٹان سے جغرافیائی قربت اور وہاں کی کمزور سیکورٹی نظم ونسق کا فائدہ اٹھاتے ہوئے الفا اور دیگر ممنوعہ دہشت گرد تنظیموں نے ہمالیہ کے علاقے میں اپنے ٹریننگ کیمپ اور پناہ گاہ یعنی خفیہ اڈے بنا لئے تھے۔ 1990 کے عشرے کی شروعات سے ہی الفا کی بیشتر دہشت گردانہ سرگرمیوں کا مرکزی مقام جنوبی بھوٹان ہی رہا تھا۔ حکومت ہند کئی سال سے اس معاملے کو بھوٹانی اتھارٹیز کے سامنے اٹھاتی رہی تھی لیکن اسے کوئی کامیابی نہیں مل رہی تھی۔ این ڈی اے حکومت نے بھوٹان میں الفا-مخالف مہمات کو اعلیٰ ترجیح دینے کا فیصلہ کیا اور ستمبر 2003 میں جب بھوٹان کے شاہ جگمے سنگمے وان چک نئی دہلی آئے تو وزیر اعظم واجپئی نے ان سے درخواست کی کہ وہ بھوٹانی علاقوں سے دہشت گردوں کے صفائے کے لئے فوجی کارروائی کریں۔

دسمبر 2003 میں تین ہفتہ تک چلنے والی ایک مہم میں بھوٹانی فوج نے ہندوستانی سرحد پر ہندوستانی فوجی کی مدد سے جنوب مغربی بھوٹان کے گھنے جنگلی علاقوں میں واقع الفا کے سبھی 30 ٹریننگ کیمپوں پر حملہ کر کے انھیں تباہ کر دیا۔ اس مہم میں سو سے زائد دہشت گرد مارے گئے اور 300 سے زائد دہشت گردوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ بھوٹان اور ہندوستان کی اس مشترکہ مہم سے دہشت گردانہ مسئلوں سے نمٹنے پر مثبت اثر پڑا۔ اس سے دونوں پڑوسی ممالک کے درمیان دہشت گردی کے خطرے سے نمٹنے کے لئے دوطرفہ تعاون کا ایک خاکہ بھی تیار ہوا۔ قابل ذکر ہے کہ ہماری حکومت نے اپنے اس چھوٹے سے پڑوسی ملک بھوٹان، جو تین اطراف سے ہندوستان سے گھرا ہوا ہے اور سیکورٹی وترقیات دونوں معاملوں میں ہندوستان پر منحصر ہے، کے ساتھ کوئی مستحکم فوجی حکمت عملی نہیں اپنائی بلکہ ہم نے وہاں کے شاہ، جن کے ساتھ ہندوستان کے اچھے تعلقات رہے ہیں، کے ساتھ ایک پرامن اور قابل عمل پالیسی کا سہارا لیا۔ بھوٹان کے شاہ چاہتے تھے کہ ان کے علاقوں میں کوئی ہندوستانی فوجی مہم نہ چلائی جائے کیونکہ وہ اپنے ملک کی سالمیت کو لیکر متفکر تھے۔ اس لئے ہندوستانی فوج نے بھوٹانی فوج کے جوانوں کو اس کام کے لئے ٹریننگ دی اور خود اپنی کارروائی سرحد کی اس جانب ہی محدود رکھی۔ 'دی ہندو' نے واجپئی حکومت کی اس پالیسی پر اپنے اداریتی تبصرے میں لکھا تھا- '(اسے) ہندوستان کی ایک نہایت ہی اعلیٰ غیرملکی تعلقات قائم کرنے کا ایک مناسب قدم قرار دیا جانا چاہئے۔' ہندوستان کے صبر وتحمل کا ایک مثبت نتیجہ یہ رہا کہ بھوٹان نے محسوس کیا کہ خطرناک مہمانوں کو میزبان بنانا کتنا نقصاندہ ہوتا ہے۔ الفا کے خلاف بھوٹان کی فوجی کارروائی نے بنگلہ دیش کی نااہلیت کو اجاگر کرنے کا کام کیا۔ بنگلہ دیش کے بار بار انکار کرنے کے باجود اس بات کے ٹھوس شواہد موجود ہیں کہ الفا کی اعلیٰ قیادت بنگلہ دیش کو اپنے اہم اڈے کے طور پر استعمال کر رہی ہے۔ بھوٹان کی بہ نسبت بنگلہ دیش کے ساتھ کام کرنے کا ہندوستان کا تجربہ انتہائی افسوسناک رہا۔ سرحد پار سے غیر قانونی دراندازی کے معاملے نے بھی اور بنگلہ دیش کی سرزمین سے سرگرمیاں چلانے والی ہندوستانی دہشت گرد تنظیموں کے خلاف

کاروائی کے معاملے میں بھی ۔ ان معاملوں کو بنگلہ دیش کے اعلیٰ افسران کے سامنے بھی اٹھایا گیا تھا ۔ میں نے خود بھی بنگلہ دیش کی دو سابق وزرائے اعظم شیخ حسینہ واجد اور بیگم خالدہ ضیاء کے ساتھ ہونے والی میٹنگوں میں یہ معاملہ اٹھایا تھا اور ہندوستان کی بی آر پی ایف اور بنگلہ دیش رائفلز کے درمیان بنگلہ دیشی مندوب کے ڈائرکٹر سطح کی ششماہی کانفرنسوں میں بھی میں نے یہ معاملے اٹھائے تھے ۔ ہند - بنگلہ دیش تعلقات میں اس وقت تلخی مزید بڑھ گئی تھی جب اپریل 2001 میں بنگلہ دیش رائفلز نے آسام - بنگلہ دیش سرحد پر سیکورٹی فورسز کے 15 جوانوں کو اذیتیں دینے کے بعد مار دیا تھا ۔ یہ انتہائی بہیمانہ عمل تھا لیکن اس اشتعال انگیز قدم پر ہماری حکومت نے کوئی کاروائی نہ کرنے کا فیصلہ کیا ۔ اگر چہ ہندوستان کے لوگوں کو ہمارا یہ صبر وتحمل کا رویہ اچھا نہیں لگا ۔

بوڈو ٹائیگرز کے ساتھ بحالیٔ امن

وزارت داخلہ کی کوششوں کو ایک اہم کامیابی اس وقت ملی جب 6 دسمبر 2003 کو بوڈو لبریشن ٹائیگرز (بی ایل ٹی) کے لڑاکوؤں نے ہتھیار ڈال کر اپنے ایک عشرہ پرانی لڑائی کو ختم کر دیا ۔ نتیجتاً اگلے ہی دن بوڈولینڈ ٹیری ٹوریل ڈسٹرکٹ ایریا (بی ٹی ڈی اے) وجود میں آیا اور اس طرح آسام میں برہم پتر ندی کے شمالی علاقہ میں رہنے والے بوڈو قبائل کی خواہشات پوری ہوگئیں ۔ بی ایل ٹی کے لیڈر ہگراما بسوماتاری نے اے کے-47 رائفل آسام کے وزیر اعلیٰ ترون گوگئی کو سونپ کر خود سپردگی کی کاروائی شروع کی ۔ اس سے قبل انھوں نے بی ایل ٹی کا جھنڈا میری وزارت کے وزیر مملکت سوامی چنمیانند کو سونپ دیا اور سفید جھنڈا لہرا کر ایک نئے امن دور کی شروعات کی ۔

جولائی 1999 میں بی ایل ٹی کے ذریعہ یک طرفہ طور سے اپنی مہم کو ختم کرنے پر رضامند ہونے کے بعد اس کے ساتھ مرکزی حکومت کی امن مذاکرات کا یہ آخری دور تھا ۔ مئی 2000 میں بی ایل ٹی کے ذریعہ کارگل لڑائی کے وقت ہندوستان کے ساتھ کھڑے ہونے اور مجھے ان کے ساتھ امن مذاکرات شروع کرنے کے لئے حوصلہ دیا ۔ اپنی زبان، ادب، ثقافت اور روایات کے تحفظ پر ان کی تشویش، جو بوڈو قبائل کے لئے انتہائی جذباتی تھے اور جن کیلئے بوڈو قبائل کے انتہائی قابل احترام اوپیندر ناتھ برہما نے حصول مقصد کے ساتھ جدوجہد کی تھی، کے تئیں میری ہمدردی تھی ۔ ایک بار جب بی ایل ٹی کے لیڈروں نے تشدد کا راستہ چھوڑ کر ہندوستان کے آئین کو قبول کر لیا، ہماری حکومت نے آئین میں ترمیم کر کے حالیہ چھٹے شیڈول کا دائرہ بڑھا کر بوڈو قبائل کو خودمختاری دینے کا وعدہ کیا ۔ ہم نے بوڈو زبان کو ہندوستانی آئین کے آٹھویں شیڈول میں شامل کرنے اور کاربو-آنگ لونگ کے بوڈو کو چارس کو درج فہرست قبائل (پہاڑی علاقہ) کی فہرست میں شامل کرنے کی یقین دہانی کرائی ۔ وزارت خارجہ میں خصوصی سیکرٹری ڈاکٹر پی ڈی شنائے مرکز کے خصوصی مذاکرات کار تھے، جو بوڈولینڈ ٹیری ٹوریل کونسل (بی ٹی سی) کے لیڈروں اور حکومت آسام کے افسران کے ساتھ تقریباً دو درجن دوروں کے مذاکروں میں بی ٹی سی کے موقف سمجھنے میں کامیاب ہو سکے ۔

بوڈو قبائل کے نمائندوں کے ساتھ ہونی والی بات چیت کے تجربہ سے مجھے یقین ہوگیا کہ اگر مرکز اور شمال مشرقی ریاستوں کی حکومتیں پوری ایمانداری، ہمدردی اور حساس جذبوں کے ساتھ اپنا وعدہ پورا کریں تو اس علاقہ میں امن کا قیام ممکن ہے ۔ اس سے میرے اس یقین کو مزید تقویت ملی کہ اپنے مطالبات کو منوانے کیلئے دہشت گردی کا سہارا لینے والی تنظیموں کا ہندوستانی فیڈریشن اور ہندوستانی آئین میں بھروسہ نہیں ہے ۔ اس لئے وہ ملک کے باہر ہند-مخالف طاقتوں کی مدد لیتے ہیں ۔ ایسی تنظیموں سے سختی سے نمٹنا چاہئے ۔

ناگالینڈ میں بغاوت کا خاتمہ

پورے شمال مشرق میں بغاوت کا سب سے طویل دور ناگالینڈ میں رہا ہے۔ میں پورے اطمینان کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ واجپئی حکومت کے دوران ہم نے اس خطرے کو کامیابی کے ساتھ ختم کردیا۔ میرے اور وزیراعظم کے ساتھ ہونے والی میٹنگوں کے بعد ایک ڈرامائی واقعہ میں 11 جنوری 2003 کو ایک اہم باغی تنظیم نیشنل سوشلسٹ کونسل آف ناگالینڈ (اساک-موئیوا) کے لیڈروں، صدر اساک چی سی سو اور جنرل سکریٹری تھوئنگا لانگ موئیوا نے ہندوستانی سیکورٹی فورسز کے خلاف اپنی مہم ختم کرنے کا اعلان کردیا۔ ہم انھیں 35 سالہ طویل خود ساختہ جلاوطنی کو ختم کرنے اور 5 عشروں میں پہلی بار ہندوستانی سرزمین پر امن مذاکرات کیلئے تیار کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس سے قبل حکومت کے مذاکرات کار سابق داخلہ سکریٹری پدمانابھیا اور ناگا لیڈروں کے مابین بنکاک، کوالالمپور، ایمسٹرڈم و پیرس میں دوطرفہ بات چیت ہوئی تھی۔ ہندوستانی وزیراعظم (اندرا گاندھی) اور ناگا لیڈروں کے درمیان آخری میٹنگ 1967 میں ہوئی تھی۔

ناگا لیڈروں کے ہندوستانی پاسپورٹ پر نئی دہلی آنے اور راج گھاٹ جاکر مہاتما گاندھی کی سادھی پر خراجِ عقیدت سے ہی پتہ چل جاتا ہے کہ امن مذاکرات کی راہ پر وہ کتنا آگے بڑھ چکے تھے۔ یہ راستہ بھی ہماری حکومت کے تین اہم فیصلوں کے ذریعہ تیار ہوا تھا-نومبر 2002 میں این ایس سی این (آئی-ایم) پر سے پابندی ہٹانا، 1997 میں ہونے والے جنگ بندی معاہدہ کو پڑوسی ریاستوں کے ناگا علاقوں تک نافذ کرنا اور جموں وکشمیر کی طرح ہی ناگالینڈ میں آزاد اور غیر جانب دارانہ انتخاب کرانے کی ہماری یقین دہانی۔ وزیراعظم واجپئی، وزیر دفاع جارج فرنانڈیز اور میرے ناگا لیڈروں کے درمیان ہونے والی بات چیت کے بارے میں میڈیا نے کچھ اس طرح رپورٹ شائع کی تھی-'اساک سو اور موئیوا نے کہا کہ اب ہندوستانیوں اور ناگائیوں کے درمیان کوئی لڑائی نہیں ہوگی۔ اس امن مذاکرہ کا موازنہ 1967 کے مذاکرہ سے کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اس پہلے کی گفت وشنید سے کچھ خاص حاصل نہیں ہوسکا تھا کیونکہ ان میں ہندوستانی قیادت کے جانب سے 'تجربہ کی کمی' اور 'اس طرح کے حقائق یا مثبت نظریہ' کی کمی رہی لیکن اس بار لیڈر ایمان دار اور تجربہ کار ہیں اور وہ اسے صحیح طور سے حل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں'۔ حکومت ناگائیوں کی تاریخ کو سمجھنے کی کوشش کر رہی ہے اور ناگا ہندوستان کی تاریخ کو سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اگر حکومت ناگالینڈ کے حقوق کا احترام کرے گی تو اس سے دس گنا زیادہ وہ ہندوستان کی سچائی کا احترام کریں گے'۔

این ایس سی این (آئی-ایم) کے ساتھ ہونے والی جنگ بندی معاہدہ کا ناگالینڈ کے آگے تک توسیع دینے کی ہماری حکومت کے 2001 کے فیصلے پر پڑوسی ریاست منی پور میں تشدد آمیز مظاہرے ہوئے۔ منی پور کے عوام کو خوف تھا کہ اس سے 'ناگالم' (وسیع ناگالینڈ) کے قیام کا راستہ ہموار ہو جائے گا کیونکہ ناگاؤں کا ایک اہم مطالبہ تھا کہ منی پور اور آسام کے کچھ مقررہ حصوں سمیت سبھی ناگا علاقوں کو ایک خود مختار ایڈمنسٹریٹو یونٹ کے تحت لایا جائے۔ جب وزیراعظم واجپئی نے یقین دہانی کرائی کہ علاقائی سالمیت کو بنائے رکھا جائے گا تب کہیں جاکر تشدد آمیز واقعات ختم ہوئے۔ اس سے ناگالینڈ اور پڑوسی ریاستوں کے درمیان کشیدگی کو لیکر مرکزی حکومت کی تشویش کم ہوئی۔ اس سلسلے میں حکومت کے سامنے اہم چیلنج تھا کہ کس طرح مستقل بحالیٔ امن یقینی بنانے والا حل نکالا جائے، جو ہندوستانی آئین کے دائرے کے اندر اور ساتھ ہی ناگالینڈ، منی پور اور آسام کے لوگوں کے لئے قابل قبول بھی ہو۔ مجھے یقین ہے کہ سچائی، آپسی اعتماد اور صبر وتحمل اور اس سے اوپر علاقائی خواہشات اور علاقہ میں ہندوستانی قومیت کے جذبات کو ملاکر اس چیلنج سے نمٹا جاسکتا ہے۔

یہاں مجھے ماننا پڑے گا کہ سبھی ناگا ٹرائبل کونسل کی ایک اعلیٰ تنظیم 'ناگا ہوہو' نے سبھی 52 ناگا قبائل میں اتحاد قائم کرنے کے مقصد سے ایک 'سمجھوتہ مہم' چلا کر امن عمل میں مثبت تعاون دیا۔ ناگا باغیوں کی ایک دیگر تنظیم این ایس سی این (کے) جس کے لیڈر ایس ایس کھاپلانگ ہیں اور جو سرحد کے اس پار میانمار کے جنگلوں میں رہتے ہیں، کے ساتھ بھی گفت وشنید کرنے میں ہماری حکومت کا اہم کردار رہا۔ وزارت داخلہ کے افسران کی ٹیم کے ساتھ خفیہ مقامات پر کئی دوروں کی گفت وشنید کے بعد برسوں سے جاری مسلح مہمات کو روکنے کے لئے ایک سمجھوتے پر پہنچا گیا۔ اس سے ناگالینڈ میں مکمل امن قائم کرنے میں بھی مدد ملی۔

ناگاؤں کے دلوں میں جن دو ہندوستانی رہنماؤں کے لئے زیادہ احترام ہے وہ ہیں- مہاتما گاندھی اور جے پرکاش نارائن۔ 1960 کے عشرے میں جے پرکاش نارائن نے ناگالینڈ میں ایک اہم 'امن مشن' کی قیادت کی تھی۔ دونوں کو یقین تھا کہ طاقت کے استعمال سے کسی قبائل یا عوام کے دل میں ہندوستان کیلئے احترام نہیں پیدا کیا جا سکتا ہے بلکہ شمال مشرق میں مختلف النوع قبائل کی مخصوص ثقافت اور تاریخی روایات کے تئیں سچے احترام کی بنیاد پر ہی یہ اعتماد پیدا کیا جا سکتا ہے۔ ناگا اور شمال مشرق کے دیگر فرقوں کے مسائل کے تئیں انھوں نے ہمدردی دکھائی لیکن ساتھ ہی ان پر دباؤ بھی بنایا کہ یہ سب کچھ ایک جمہوری اور خودمختار ہندوستان کے دائرے میں ہی کیا جا سکتا ہے۔ واجپئی حکومت اگر ناگا اور دیگر باغی گروپوں کے لیڈروں کا اعتماد جیت سکی تو اس کی وجہ یہی تھی کہ ہمارا طریقۂ کار ان دو عظیم رہنماؤں مہاتما گاندھی اور جے پرکاش نارائن کی سوچ اور پالیسی سے ہم آہنگ تھا۔

اروناچل پردیش: چین کے دعوے کی تردید

اروناچل پردیش شمال مشرق کا سب سے زیادہ رقبہ والی ہندوستانی ریاست ہے اور سب سے زیادہ یہاں امن وچین بھی ہے۔ 1962 کی ہند-چین لڑائی کے بعد سے ہی جب یہ وسیع تر آسام کا حصہ تھا، اس ریاست کے تئیں میرا خاص جذباتی تعلق رہا ہے۔ غیرملکی دراندازی اور کراس ووٹنگ پر پابندی کی وجہ سے ہی یہ ریاست اپنی مذہبی اور ثقافتی شناخت کا تحفظ کر سکی۔ 1999 اور 2004 کے پارلیمانی انتخابات میں یہاں کے لوگوں نے دونوں پارلیمانی حلقوں سے بی جے پی کے رکن پارلیمنٹ منتخب کئے تھے۔ شمال مشرق کی یہ پہلی ریاست ہے جہاں 2003 میں بی جے پی کی حکومت بنی اور گیگانگ اپانگ ریاست کے وزیراعلیٰ بنے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ یہ حکومت واضح اکثریت کی طاقت پر نہیں بلکہ 37 باغی کانگریسی ارکان اسمبلی کی وجہ سے بن سکی۔ حکومت کی تقریب حلف برداری کے بعد ایٹہ نگر میں منعقد ایک جلسے میں میں نے اپانگ کو ہلکے انداز میں سرزنش کرتے ہوئے کہا کہ کتنا ہی اچھا ہوتا کہ جب اروناچل پردیش میں بھارتیہ جنتا پارٹی اپنے ٹکٹ پر اتنے ارکان اسمبلی کو کامیاب بنا پاتی۔

اروناچل پردیش میں توانگ ضلع پر چین کا دعویٰ ریاست کے عوام کو ہمیشہ سے کھٹکتا رہا ہے۔ دسمبر 2006 میں چین کے صدر ہوجنتاؤ کے ہندوستان دورے سے قبل ہندوستان میں چین کے سفیر نے ایک بیان جاری کیا کہ اروناچل پردیش چین کا حصہ ہے۔ اس معاملے کو میں نے لوک سبھا میں زوردار طریقے سے اٹھایا۔ میں نے مطالبہ کیا کہ چینی سفیر کے تبصرے پر پارلیمنٹ میں ایک مذمتی قرارداد پیش کی جائے۔ وزیرخارجہ پرنب مکھرجی جو میرے اس مطالبے سے ناراض بھی ہوئے تھے، نے ایوان کو اعتماد میں لیتے ہوئے کہا کہ 'یہ معاملہ بحث کرانے کے لائق ہی نہیں ہے۔ اروناچل پردیش ہندوستان کا حصہ ہے۔ گزشتہ سرکاروں اور پارلیمنٹ کا یہی رویہ رہا ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔' اس دن کی

بخت نے اروناچل پردیش سے اپنی پارٹی کے دوممبران تاپر گاؤ اور کرن ریجی جو پر مجھے سچ مچ فخر محسوس ہوا، جنھوں نے کہا تھا کہ 'اروناچل پردیش کی عوام نے ہندوستان کے تئیں محبت اور اعتماد کا ظہار کیا ہے۔ ہماری ریاست میں کوئی علیحدگی پسند تحریک نہیں ہے۔ ہم ہندوستانی ہیں اور ہمیشہ ہندوستانی ہی رہیں گے'۔

تری پورہ میں ایک افسوسناک واقعہ

وزارت داخلہ میں میری چھ سال کی مدت نشیب وفراز، کامیابی وناکامی، ناامیدیوں، نامکمل کاموں اور جزوقتی طور سے حل کچھ مسئلوں اور چیلنجوں سے پُر رہا۔ لیکن دو ناکامیوں نے مجھے سب سے زیادہ غمزدہ کیا۔ ایک ناکامی تھی- 1993 کے ممبئی بم دھماکہ کے کلیدی ملزم داؤد ابراہیم کو ہندوستان لانے میں لاچاری، جس کے بارے میں میں پہلے ذکر کر چکا ہوں اور دوسری ناکامی تھی 2001 میں تری پورہ میں سنگھ کے چار پرچارکوں کا انتہائی بہیمانہ انداز میں قتل کا واقعہ۔

اگست 1999 میں مجھے اطلاع ملی کہ ریاست میں قبائلی فرقہ کی فلاح کے لئے کام کرنے والے شیامل سین گپتا، دنین ڈے، سدھامیہ دت اور شبھنکر چکرورتی کو شمالی تری پورہ ضلع کے چھٹی کرائیہ تھانہ علاقہ میں آنے والے کنچن پارہ سے اغوا کرلیا گیا ہے۔ میں نے فوراً ریاست کے وزیراعلیٰ مانک سرکار سے رابطہ کیا جو 1998 سے اگرتلہ میں سی پی آئی (ایم) حکومت کی قیادت کر رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ ریاستی پولس جانتی ہے کہ یہ علیحدگی پسند تنظیم نیشنل لبریشن فرنٹ آف تریپورہ (این ایل ایف ٹی) کا کام ہے۔ میں نے مرکز اور ریاستی حکومت کے افسران کی میٹنگ طلب کی جس میں مانک سرکار بھی موجود تھے۔ جنھوں نے مجھے بتایا کہ ہماری حکومت کے پاس اس بات کا ثبوت ہے کہ تریپورہ میں بیپٹسٹ چرچ این ایل ایف ٹی کی علیحدگی پسند ملک مخالف سرگرمیوں میں مدد کررہی ہے۔ میٹنگ میں ہم نے فیصلہ لیا کہ بارڈر سیکورٹی فورس اور ریاستی پولس مشترکہ طور سے تفتیشی مہم چلائیں۔ بدقسمتی سے یہ کوشش کامیاب نہیں ہوسکی اور فروری 2001 میں یہ افسوسناک خبر آئی کہ بنگلہ دیش کی چٹاگانگ کی پہاڑیوں میں واقع تھنگ نان میں این ایل ایف ٹی کے اعلیٰ لیڈروں کے حکم پر سنگھ کے چار پرچارکوں کا قتل کر دیا گیا۔ یہ خبر بھی تھی کہ این ایل ایف ٹی کے ایک سابق کمانڈر کے پاس سے جو چٹاگانگ واقع اپنے ٹریننگ کیمپ میں موجود تھے، شرکت کی تھی۔ مجھے بہت دکھ ہوا اور ملک بھر میں سنگھ کے تمام لوگ غم واندوہ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ کچھ لوگوں کو محسوس ہوا کہ تریپورہ کی کمیونسٹ پارٹی (مارکسوادی) حکومت نے تعاون نہیں کیا۔ لیکن یہ سچ نہیں تھا۔ لیکن جہاں تک میں نے دیکھا، مانک سرکار یرغمالوں کو حقیقت میں رہا کرانا چاہتی تھی۔ این ایل ایف ٹی کی وجہ سے پیدا ہونے والے چیلنج اور بیپٹسٹ چرچ کے ساتھ اس کی سازباز کے بارے میں انھوں نے متعدد بار بتایا بھی تھا۔ سنگھ پریوار کے کچھ لوگوں کو محسوس ہوا کہ چاروں پرچارکوں کو بچانے کیلئے میں نے پوری کوشش نہیں کی۔ مجھے خود ایک سنگھ پرچارک ہونے پر فخر تھا اور اس لیے میں اس کام کو ہلکے طور پر نہیں لے سکتا تھا۔ پھر بھی میں کہوں گا کی مغویوں کو سرحد پار کر کے بنگلہ دیش لے جائے جانے کے بعد سرکار کا کام انتہائی مشکل ہوگیا تھا۔ بعد کی خبروں سے پتہ چلا کہ پرچارکوں کو شروع میں تو تری پورہ واقعہ این ایل ایف ٹی کے مختلف اڈوں پر رکھا گیا تھا بعد میں بارڈر سیکورٹی فورسز کے ذریعہ ڈھونڈنے کیلئے اسپیشل کمانڈو مہم شروع کئے جانے کے بعد انھیں چٹگاؤں میں واقعہ کیمپ میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ بنگلہ دیش رائفلز کے ڈائیرکٹر جنرل میجر جنرل اے ایل ایم فضل الرحمٰن کے ساتھ بات چیت میں میں نے یہ معاملہ اٹھایا، جو بوڈر سیکورٹی فورسز اور بنگلہ دیش رائفلز نے افسران کے درمیان ہونے والی ششماہی میٹنگ میں شامل ہونے کیلئے نئی دہلی آئے تھے۔ انھوں نے حقائق کا پتہ لگانے کی یقین دہائی کرائی لیکن

بعد میں ان کا جواب منفی رہا۔

اس واقعہ سے شمال مشرق میں سرگرم کچھ غیر ملکی امداد یافتہ چرچ تنظیموں کی قابل مذمت سرگرمیاں روشنی میں آئیں جو مقامی قبائلی فرقوں کا مذہب تبدیل کرنے میں ملوث ہیں۔ مثال کیلئے تری پورہ میں بیپٹسٹ چرچ جس کا قیام نیوزی لینڈ سے آئے مذہبی پیشوا کے ذریعہ 60 سال قبل کیا گیا تھا اور جسے مغرب کی بیپٹسٹ چرچ تنظیموں خاص کر امریکن بیپٹیسٹ چرچ سے اچھی خاصی مالی مدد مل رہی ہے، فرمان جاری کیا کہ قبائلی فرقہ درگا پوجا اور دیگر روایتی تہواروں کو نہ منائے، اپنے روایتی بھگوانوں کی پوجا نہ کریں، ہندو بھگتی گیت نہ گائیں، اپنی عورتوں کو چوڑیاں اور بندی وغیرہ نہ پہننے کیلئے کہیں۔ ان احکامات کے ذریعہ قبائلی فرقہ پر دباؤ بھی ڈالا گیا ہے کہ وہ ہندو رسم رواج سے متعلق ہر چیز چھوڑ دیں۔ این ایل ایف ٹی کا واضح مقصد ہے- تری پورہ سے بنگالیوں کو ہٹانا اور ریاست کو ایک 'عیسائی ریاست' بنانا۔ ریاست میں کئی ہندوں پجاریوں کے قتل معاملے میں اس کا ہاتھ رہا ہے۔ 13 جنوری 2002 کو مکر سنکرانتی کے موقع پر این ایل ایف ٹی کے دہشت گردوں نے تری پورہ کے سنگھے بازار میں 16 افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

تری پورہ اور دیگر شمال مشرقی ریاستوں (ہندوستان کے دیگر حصوں کے جنگلی علاقوں میں بھی) میں عیسائی تبدیلی مذہب مشن کی سب سے زیادہ مخالفت قبائلی کلیان آشرم کی جانب سے ہوتی ہے، جس کا قیام راشٹریہ سوئم سیوک سنگھ نے کیا۔ اس کے کارکن ان کی ثقافتی و روحانی شناخت کو برقرار رکھتے ہوئے اسکول، اسپتال اور روزگار فراہمی مراکز کھول کر قبائلیوں کو مستحکم کرنے میں مصروف ہیں۔ اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں ہے کہ آر ایس ایس کے چاروں پر چارکوں کا اس وقت اغوا کیا گیا تھا جب وہ اس دن اسی کلیان آشرم کے ذریعہ چلائے جا رہے ایک ششو شکشا مندر کے دورے پر گئے ہوئے تھے۔★

شمال مشرق میں سماجی معاشی ترقی اور روزگار کی فراہمی میں پیش رفت کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے وزیراعظم اور مجھے دونوں کو احساس ہوا کہ اس کیلئے مرکزی حکومت کو خصوصی توجہ دینا ضروری ہے۔ اس کے بعد 2001 میں ایک الگ وزارت (منسٹری آف ڈیولپمنٹ آف نارتھ ایسٹ ریجن)- وزارت برائے ترقیات شمال مشرق- قائم کی گئی۔ ارون شوری کو اس وزارت کا پہلا وزیر اور ڈاکٹر پی ڈی شنائے کو پہلا سکریٹری بنایا گیا۔ وزیراعظم نے دیگر ترقیاتی وزارتوں کو شمال مشرق کیلئے دس فیصد بجٹ رکھنے کے حکم دئے۔ وزارت داخلہ اور مذکورہ وزارت کے درمیان مشترکہ پروگراموں کے ذریعہ ہماری حکومت نے دہشت گردی سے متاثرہ علاقوں میں عوامی رابطہ پر زور دیتے ہوئے علاقہ میں 'ترقی کے ساتھ سیکورٹی' کو مستحکم بنانے کی کوشش کی۔ قومی اتحاد اور سالمیت کو فروغ دینے کیلئے دور درشن اور آکاش وانی مقامی پروگراموں کا ملک گیر ٹیلی کاسٹ/ براڈ کاسٹ کرنے کیلئے احکامات جاری کئے گئے۔

★ آر ایس ایس نے عملی اور مثبت پروگراموں میں سرگرم تنظیموں کا ایک ملک گیر نیٹ ورک تیار کیا ہے۔ ان میں شامل ہیں- ون واسی کلیان آشرم، سیوا بھارتی، ودیا بھارتی، سنسکار بھارتی اور سنسکرت بھارتی جن میں لاکھوں سوئم سیوک سرگرم ہیں۔ اس کا سنگل اسکول پروجیکٹ سب سے زیادہ کامیاب پروجیکٹوں میں سے ایک ہے۔ جو ملک کے پسماندہ اور سہولیات سے فقدان علاقوں میں ابتدائی تعلیم مہیا کراتا ہے۔ سنگھ سے متحرک طالبعلم تنظیم اکھل بھارتیہ ودیارتھی پریشد تین عشروں سے بھی زیادہ عرصہ سے اسٹوڈنٹس ایکسپیرینس ان انٹر- اسٹیٹ لیونگ (ایس ای آئی ایل) پروگرام چلا رہے ہیں۔ اس پروگرام میں شمال مشرق کے کئی ہزار اسٹوڈنٹس کو ہندوستان کے مختلف حصوں میں رکھا جاتا ہے۔ ایس ای آئی ایل کا نعرہ ہے- 'الگ بھاشا الگ دیش، پھر بھی اپنا ایک دیش'۔ اسی طرح راشٹریہ سوئم سیوک سنگھ سے متعلق تنظیموں کے سیکڑوں کارکنان بھی شمال مشرق میں طویل عرصہ سے رہ کر وہاں کی ترقی کیلئے کام کر چکے ہیں۔

ہماری شمال مشرق پالیسی کا ایک دیگر اہم حصہ تھا - وزارت خارجہ کی 'مشرق کی جانب دیکھو' (لک ایسٹ) پالیسی سے جڑنا، جسے واجپئی حکومت کے دور میں وسیع پیمانے پر فروغ ملا۔ وزیر اعظم نے شمال مشرقی ایشیا کے تقریباً سبھی ممالک کا دورہ کیا، جنھیں ہندوستان کا ثقافتی پڑوسی مانا جاتا ہے۔ 2002 سے ہندوستان آسیان (ایسوسی ایشن آف ساؤتھ ایسٹ ایشین نیشنز) کے سالانہ سربراہ کانفرنس میں حصہ لے رہا ہے۔ ہندوستان علاقائی ذیلی تعاون کو فروغ دینے کیلئے بھی کوشاں ہے بمسٹیک-BIMSTEC (بے آف بنگال انیشیٹو فار ملٹی سیکٹرل ٹیکنیکل اینڈ اکنامک کوآپریشن)، اس سمت میں کی گئی اہم پیش رفت ہے۔ میکانگ-گنگا کوآپریشن (پروگرام) کا مقصد ان مختلف ممالک کے درمیان تعلقات کو مستحکم بنانا ہے (ہندوستان، کمبوڈیا، لاؤس، میانمار، تھائی لینڈ اور ویت نام)، جہاں سے ہو کر ایشیا کی ثقافتی ندیاں بہتی ہیں۔ 'مشرق کی جانب دیکھو' پالیسی کی کامیابی سے سب سے زیادہ فائدہ شمال مشرق کو ملے گا۔

شمال مشرق کے مستقبل کے بارے میں جب میں سوچتا ہوں تو لگتا ہے کہ سب کچھ اس بات پر منحصر کرتا ہے کہ ہندوستان اپنے ماضی کی غلطیوں سے کتنا سیکھتا ہے۔ خواہ ہمارے سامنے چیلنجنگ کام ہو مگر جیسا کہ میں نے پہلے زور دیا ہمیں لازمی طور پر بنگلہ دیش سے ہونے والے آبادی کے حملہ کو روکنے کا ایک کارگر حل نکالنا ہوگا۔ بنگلہ دیش سے ہونے والی دراندازی کے خلاف بی جے پی کی مہم ہمیں اس سے نہیں روکتی ہے کہ ہم ہندوستان اور بنگلہ دیش کے درمیان اچھے اور دوستانہ پڑوسی جیسے تعلقات دیکھنا چاہتے ہیں جو حال میں کچھ اختلافات کے مقابلے زیادہ مضبوط ہوں۔ جغرافیہ، تاریخ اور ترقی سے جڑی متعدد اسباب سے ہندوستان اور بنگلہ دیش جیسے دو یکساں اور خود مختار ممالک کے درمیان ہر حال میں دوطرفہ سودمند تعلقات قائم کئے جانے کو مجبور کریں گے۔ بنگلہ دیش تین اطراف سے ہندوستان سے گھرا ہے۔ اس کی ثقافت، روایت اور روحانی تاریخ اسے ہندوستان سے جوڑتی ہے۔ بلاشبہ بنگلہ دیش کا مستقبل عرب ممالک کی بہ نسبت ہندوستان کے مستقبل سے زیادہ جڑا ہے۔ بار بار آنے والے سیلاب جیسی پریشانیوں، جو بنگلہ دیش اور ہندوستان کے شمال و مشرق دونوں کو یکساں طور سے متاثر کرتی ہے، کو مثبت علاقائی اور ذیلی علاقائی تعاون کے ذریعہ ہی حل کیا جاسکتا ہے۔ بنگلہ دیش اور اس سے متصل ہندوستانی ریاستوں سے غریبی دور کرنے اور لاکھوں لوگوں کے معیار زندگی بہتر کرنے کے مسئلوں کو، بازاروں کو آپس میں جوڑ کر قدرتی وسائل کا استعمال کر کے، انفراسٹرکچر کی سہولیات کو جوڑ کر اور انفرادی رابطوں کو توسیع دے کر ہی حل کیا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ سب کچھ آئینی اور غور وفکر سے آپسی سلامتی کو دھیان میں رکھ کر ہی کیا جانا چاہئے۔

مجھے امید ہے کہ بنگلہ دیش حکومت دراندازی روکنے اور ہند-مخالف دہشت گرد تنظیموں کو پناہ دینے کی پالیسی چھوڑنے کیلئے متفق ہو کر اچھے دوستانہ تعلقات کی ہندوستان کی خواہش کا احترام کرے گی۔ اس سے دونوں ممالک کیلئے ایک نئے تابناک مستقبل کا دروازہ کھلے گا اور برصغیر پر بھی اس کا مثبت اثر پڑے گا۔

11

نکسل ازم
دیگر چیلنجز اور پیش رفت

کمیونسٹ نظریہ ایشور کے بغیر انسان ہونے کا نظریہ ہے
— وہیٹکر چیمبرز، امریکی مصنف

ہندوستان کا وزیر داخلہ ہونے کے ناطے میری سب سے بڑی تشویش جغرافیائی سطح پر تھی اور مسلسل پھیل رہی بائیں بازو کی انتہا پسندی تھی جسے نکسل ازم یا نکسلائٹ کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ دس ریاستوں کے 115 اضلاع اس کی زد میں آ گئے ہیں۔ ان میں سے 33 اضلاع بہت زیادہ متاثر ہوئے ہیں۔ مختلف نکسلی گروپوں کی سرگرمیاں اور اثرات خصوصاً بہار، جھارکھنڈ، چھتیس گڑھ، اڑیسہ، مہاراشٹر اور آندھرا پردیش وغیرہ کے قبائلی اور دیگر پسماندہ علاقوں کے بہت بڑے حصوں پر واضح ہیں۔ اس حصے کو 'ریڈ کوری ڈور' یا 'لال کوری ڈور' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اتر پردیش، مدھیہ پردیش، مغربی بنگال، تامل ناڈو، کیرالہ اور کرناٹک سے بھی نکسلی تشدد کی خبریں آتی ہیں۔ نیپال کے ساتھ اس 'ریڈ کوری ڈور' کی قربت کی وجہ اور نیپال کے ماؤ وادی اور ہندوستانی نکسلی گروپوں کے درمیان نظریاتی قربت کی وجہ سے یہ علاقہ پشوپتی (کاٹھمنڈو کا مشہور شیو مندر) سے تروپتی (آندھرا پردیش کا ایک شہر جہاں پہاڑ کی چوٹی پر بھگوان وینکٹیشور کا مندر واقعہ ہے) تک پھیلا ہوا ہے۔

ان علاقوں کے جنگلوں میں بنائے گئے خفیہ ٹھکانوں کا استعمال کرتے ہوئے نکسلی گروپ حقیقت میں ہندوستانی 'ریاست' کے ساتھ پراکسی لڑائی لڑ رہے ہیں، جن کا ہدف پولس سیکورٹی فورسز پر حملہ، دہشت پھیلانے کیلئے معصوم شہریوں کا بہیمانہ قتل، مختلف پارٹیوں کے سیاسی لیڈروں کا قتل، انتظامیہ مشینری کو دھمکانا، ترقیاتی اسکیموں کے عمل درآمد ہونے سے روکنا، جنگلات، زراعت اور معدنی مصنوعات کی آمدورفت پر فیس کی وصولی اور ڈرا دھمکا کر ترقیاتی کاموں کیلئے مختص رقم کو لوٹنا اور عام طور سے اپنے زیر کنٹرول علاقے میں ایک مساوی حکومت چلانا ہے۔ یہ گروپ جمہوری طور سے منتخب حکومت کی خودمختاری کو نہیں مانتے اور ان کے اپنے نظام عدلیہ ہیں جنھیں 'عوامی عدالت' کہا جاتا ہے اور جہاں من مانے ڈھنگ سے یکطرفہ اور انتہائی سخت سزا دی جاتی ہے۔

ناانصافی اور استحصال کے سلسلہ میں احتجاجی مظاہرے کے دیگر طریقوں سے کوسوں دور یہ نکسل ازم ہندوستان کی جمہوریت کو برباد کرنے کی ایک مہم ہے جس کا ہدف مطلق العنان کمیونسٹ حکومت قائم کرنا ہے۔ ان کی نظریاتی تحریک غیر ملکی ہے۔چینی کمیونسٹ پائی کے سرپرست اور چینی انقلاب کے لیڈر ماؤ تسے تنگ۔اس حقائق سے واضح ہوجاتا ہے کہ نکسل ازم ہندوستان میں کمیونسٹ تحریک کی زہریلی ذیلی شاخ ہے جس کے بین الاقوامی بائیں بازو تحریک کے ساتھ گہرے تعلقات ہیں۔1967 میں مغربی بنگال کے گاؤں نکسل باڑی میں اس شاخ کی شروعات ہوئی تھی، اس گاؤں کے نام پر اس تحریک کا نام رکھا گیا۔شاخ کے قیام کے فوراً بعد اس کے لیڈروں نے ملک مخالف نعرہ لگایا۔'چیئر مین ماؤ ہی ہمارا چیئر مین ہے'۔

اگرچہ نکسل گروپوں۔جن میں سب سے اہم پیپلز وار گروپ (پی ڈبلیو جی) اور ماؤوادی کمیونسٹ سینٹر (ایم سی سی) ہے۔کے نشانے پر کئی ہندوستانی سیاستداں ہیں، پھر بھی بی جے پی اور دیگر غیر کانگریسیوں کے تئیں ان کے دلوں میں زیادہ بغض ہے۔2004 میں نکسل وادیوں نے بہار میں گیا کے پاس ایک گاؤں میں بی جے پی کے سابق صدر ایم وینکیا نائیڈو کا ہیلی کاپٹر اڑا دیا تھا۔خوش قسمتی سے نائیڈو بال بال بچ گئے تھے۔چند سال قبل آندھرا پردیش کے اس وقت کے وزیر اعلیٰ این چندرا بابو نائیڈو ترو پتی میں ایک طاقتور بم دھماکے میں ایشور کی مہربانی سے بچ گئے تھے۔حال ہی میں 2007 میں بی جے پی کے ایک سابق نائب صدر اور جھارکھنڈ کے سابق وزیر اعلیٰ بابو لال مرانڈی کے لڑکے کو بائیں بازو کے دہشت گردوں نے قتل کر دیا۔میں یہاں پر راشٹریہ سویم سیوک سنگھ (آر ایس ایس) سے متعلق اور اسٹوڈنٹس کے درمیان کام کرنے والے اکھل بھارتیہ ودیارتھی پریشد کے حوصلہ منداور پرجوش کارکنوں کا خاص طور سے ذکر کرنا چاہوں گا جن کے ودیارتھیوں کو نکسل وادیوں نے اپنی بندوق کا نشانہ بنایا، کیونکہ ان لوگوں نے نکسل ازم کی سفاک سوچ کی پورے جوش کے ساتھ مخالفت کی تھی۔جہاں تک نکسلی تشدد میں مارے گئے عام شہریوں اور سیکورٹی فورسز کا تعلق ہے، تو ان کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی ہے۔★

وزارت داخلہ کے افسران کے ساتھ ابتدائی میٹنگوں میں میں نے واضح کر دیا تھا کہ اپنی سالمیت کی اہمیت سمجھنے والا جمہوری نظم ونسق کا محافظ اور قانون پر عمل درآمد کرنے والا کوئی بھی ملک بائیں بازو دہشت گردی کے ذریعہ دی گئی دھمکی کو نظرانداز نہیں کرسکتا۔ساتھ ہی یکساں طور سے متعدد محاذوں پر اس خطرے کے چیلنج کے خلاف جدوجہد کرنے کی ضرورت ہے۔سب سے پہلے مرکز اور ریاستوں کے درمیان بات چیت کی سطح پر اور متاثرہ ریاستوں کے درمیان بھی تال میل ہونا چاہئے۔واجپئی حکومت کے ذریعے اپنا کام سنبھالنے سے قبل مرکز نکسلی تشدد کو ریاستی حکومت کے ذریعے حل کئے جانے والے مسئلہ کو سمجھتا تھا۔اس مسئلہ پر مکمل توجہ دینے کے لئے میں نے 1999 میں حیدرآباد میں نکسل متاثرہ ریاستوں کے وزرائے اعلیٰ کی میٹنگ بلائی تھی۔اس میٹنگ میں پہلی بار داخلہ سکریٹری کی صدارت میں ریاستی سطح کے معاونوں اور پولیس ڈائریکٹر جنرلوں کے ساتھ تال میل کمیٹی تشکیل دینے کیلئے عام رائے سے فیصلہ لیا گیا۔

★ 2002 سے 2006 کے درمیان پانچ برسوں میں نکسلیوں نے 2861 شہریوں اور سیکورٹی فورسز کو مار ڈالا تھا۔پانچ ریاستوں (آندھرا پردیش، چھتیس گڑھ، جھارکھنڈ، بہار، مہاراشٹر) میں زیادہ تر اور دیگر ریاستوں میں 71 لوگ مارے گئے۔حوالہ:وزارت داخلہ کی سالانہ رپورٹ-2007۔مارٹیرز میموریل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، حیدرآباد کے ذریعہ 'ماؤوسٹ انسرجنسی اے پروسپیکٹو' نامی انتہائی تحقیقی رپورٹ شائع کی گئی جس کو میں نے 25 اپریل 2007 کو جاری کیا۔مارے جانے والوں کے نظریہ سے اس رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ۔'نکسلی تشدد تیزی سے جموں وکشمیر میں مسلسل جاری دھماکہ خیز طریقے سے پھیل رہا ہے۔

اس میٹنگ میں لئے گئے فیصلے کے مطابق حالات کا جائزہ اور ضروری فیصلہ لینے کے لئے ہر تین ماہ میں اس کمیٹی کی میٹنگ ہوتی تھی۔ اس میں ریاستوں کو سہ رخی ورکنگ پالیسی اپنانے کے لئے کہا گیا۔ (ا) تعلیم، صحت، کھیل کود اور ثقافتی روایت کو فروغ دینے وغیرہ سے متعلق فلاحی کام کرنے کے لئے مقامی لوگوں کا اعتماد حاصل کرنا (ب) روزگار کی فراہمی پر مرکزی انفراسٹرکچر کی تعمیر اور ترقیات سے متعلق پروگراموں پر عمل درآمد کرنا، اور (ج) پڑوسی ریاستوں کے ساتھ اطلاعات کی ترسیل اور مشترکہ ایکشن شروع کرنا۔ وزارت داخلہ نے نسلی تشدد سے سب سے زیادہ متاثر 53 اضلاع کی شناخت کی اور انھیں خصوصی تعاون دیا۔ اس میں مرکز کے ذریعے تمام سیکورٹی سے متعلق اخراجات کا 50 فیصد خود برداشت کرنا شامل ہے۔ مجھے یہ جان کر دکھ ہوا کہ اگرچہ ہندوستان کے سامنے درپیش چیلنج کا سامنا فوجی وسائل سے کرنے کی ضرورت ہے لیکن کئی غریب ریاستوں کے نکسل متاثرہ پولس اسٹیشنوں میں سیکورٹی اہلکاروں کے پاس صرف ڈنڈے اور پرانی پڑ چکی بندوقیں ہیں لیکن ان سے یہ امید کی جاتی ہے کہ وہ بارودی سرنگوں، AK-47 اور خودکار لوڈ ہونے والی رائفل SLR (Self Loading Rifles) سے لیس ماؤوادی لڑاکا گروپوں پر ان ہی کے ٹھکانوں پر مقابلہ کریں۔ میں نے ریاستی سرکاروں کو حکم دیا کہ مرکزی حکومت کی پولس کی جدید کاری اسکیم کے تحت ایسے پولس اسٹیشنوں کو ترجیح دیں۔

سیکورٹی کوششوں کے درمیان تال میل قائم کرنے کے علاوہ اس کمیٹی نے بائیں بازو دہشت گردی سے متاثرہ علاقوں میں سماجی معاشی ترقی کو فروغ دینے کے لئے کئی خصوصی پہل شروع کیں جیسے وزیراعظم دیہی سڑک اسکیم★ کے تحت گاؤں کی سڑکوں کو جوڑنے کے کام میں سدھار

★ 25 دسمبر 2000 کو اٹل بہاری واجپئی کے ذریعے وزیراعظم دیہی سڑک اسکیم کی شروعات کی گئی تھی۔ خوش قسمتی سے اسی دن ان کا جنم دن بھی تھا۔ آزاد بھارت میں دیہی علاقے میں بنیادی سہولیات کی ترقی کے لئے اٹھایا جانے والا یہ سب سے بڑا قدم تھا۔ جب 1998 میں ہماری حکومت نے اپنا کام سنبھالا تھا اس وقت ملک کے تقریباً چھ لاکھ گاؤں میں سے 1,86,000 گاؤوں میں یا تو سڑکیں تھیں ہی نہیں یا ان کی حالت نہایت خستہ تھی۔ اس اسکیم میں ساٹھ ہزار کروڑ روپے کی منتقلی سے پہلی بار مکمل طور سے مرکز کی جانب سے دیہی سڑک اسکیم شروع کی گئی۔ جس کا کثیرالمقاصد ہدف تھا 500 سے زائد آبادی والے علاقوں کو 2007 تک اعلیٰ معیار کی سڑکوں سے جوڑنا جہاں پہنچنے کے لئے کوئی راستہ نہیں ہے۔ مجھے یہ بتاتے ہوئے فخر محسوس ہو رہا ہے اس وقت دیہی ترقیات کے وزراء ایم۔ وینکیا نائیڈو اور شانتا کمار کی سربراہی میں وزیراعظم دیہی سڑک اسکیم پورے جوش وخروش کے ساتھ نافذ کی گئی۔ حقیقت میں دیہی علاقوں سے متعلق یہ اسکیم عالمی معیار کے قومی شاہراؤں کے ملک گیر نیٹ ورک کے لئے واجپئی حکومت کے ذریعے تیار کی گئی کثیرالمقاصد قومی شاہراہ ڈیولپمنٹ پروجیکٹ کے مساوی ہے۔ اس پروجیکٹ نے دہلی، ممبئی، چنئی اور کولکاتہ شہروں کو پانچ ہزار آٹھ سو کلومیٹر کے گولڈن کواڈریلیٹرل سے جوڑا ہے۔ اس کے علاوہ شمال جنوب میں کشمیر اور کنیا کماری کو جوڑنے والا ہے اور مغرب ومشرق شاہراہ سے سوراشٹر کو سلچر سے جوڑنے والا 7,300 کلومیٹر طویل قومی شاہراہ بنانے کا فیصلہ لیا۔ شیر شاہ سوری (1545-1486) کے ذریعے پیشاور سے کولکاتہ تک گرانڈ ٹرنک روڈ (جی۔ ٹی روڈ) بنوانے کے بعد سے ہندوستان میں اتنے وسیع پیمانے پر تعمیری پروجیکٹ شروع نہیں کیا گیا۔ میں یہاں اس پروجیکٹ کے شروع کرنے کے بنیادی مقصد کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ جنوری 1999 میں وزیراعظم واجپئی کو این۔ ایچ۔ ڈی۔ پی سے متعلق کام کا افتتاح کرنے کے لئے بنگلور آنا تھا۔ اسی وقت اس شہر میں ہماری پارٹی کی میٹنگ بھی تھی۔ ایک شام اٹل جی اور میں سنگھ کے سہہ کاریہ واہک آنجہانی شوشادری سے ملاقات کے لئے سنگھ کے آفس میں گئے تھے۔ اس تنظیم کے وہ ایک قابل احترام جنرل سکریٹری تھے۔ انھوں نے قومی شاہراہ پروجیکٹ کا افتتاح کرنے کے لئے وزیراعظم کو نیک خواہشات پیش کیا۔ لیکن یہ بھی کہا کہ اس کے ساتھ ساتھ آپ کو ایسے پروجیکٹ بھی شروع کرنے ہیں جس سے ہندوستان کے گاؤوں کو بھی اعلیٰ معیار کی سڑکوں سے جوڑا جا سکے۔ دیہی لوگوں کو شہری لوگوں کے بہ نسبت قومی شاہراہوں کی زیادہ ضرورت ہے۔

لانے کی ضرورتوں پر زور دیا گیا اور اس سلسلے میں قوائد وضوابط تیار کیے گئے۔ یہ اسکیم واجپئی حکومت کی ایک قابل ذکر حصولیابی رہی۔

ہندوستان کی آبادی میں تقریباً آٹھ فیصد لوگ قبائلی ہیں اور بیشتر نکسلی سرگرمیاں انہیں علاقوں میں مرتکز ہیں۔ اس لئے ہماری حکومت نے ان کے مسائل پر توجہ دینے کی ضرورت محسوس کی۔ ماضی میں کانگریس حکومت درج فہرست قبائل کے مسائل کو درج فہرست ذات کے ساتھ رکھتی تھی، جو غلط تھا۔ اس لئے ہم نے آزادی کے بعد پہلی بار مرکز میں علیحدہ درج فہرست ذات وزارت تشکیل دی ساتھ ہی الگ سے نیشنل ٹرائبلز ڈیولپمنٹ کمیشن بھی تشکیل دی۔ تعلیم، رہائش، صحت، بچوں کی پرورش، روزگار اور صنعت کے لئے بجٹ میں کافی اضافہ کیا گیا۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے اسکالرشپ حاصل کرنے والے درج فہرست ذات کے طلبا کی تعداد کئی گنا بڑھا دی گئی۔

پیچھے مڑ کر دیکھنے پر میں پوری ایمانداری کے ساتھ قبول کرتا ہوں کہ بائیں بازو کی دہشت گردی کے مسئلہ کی خوفناک شکل کی مناسبت سے ہماری حکومت کے ذریعے کئے گئے کام مکمل نہیں تھے۔ نکسل ازم کی وجوہات نے ان کے استحصال کے لئے کی گئی منظم کوششوں کو ناکام کر دیا۔ اس سے بھی زیادہ ناامیدی انھیں یہ دیکھ کر ہوئی کہ مئی 2004 میں این ڈی اے حکومت کے ہٹنے کے بعد یو پی اے دور حکومت میں مختلف نکسلی یونٹوں پر پڑنے والا دباؤ بھی کم ہو گیا۔ اس مسئلہ کے حل کے لئے اپنائی جانے والی حکمت عملی میں نہ تو شفافیت ہے اور نہ ہی استقامت۔ ایک جانب وزیر اعظم ڈاکٹر منموہن سنگھ نے اعلان کیا ہے جو صحیح بھی ہے کہ نکسل ازم 'ہندوستان کی داخلی سلامتی کے لئے سب سے بڑا چیلنج ہے'۔ وہیں دوسری جانب آندھرا پردیش میں ان ہی کی پارٹی کی حکومت نے پیپلز وار گروپ پر لگی پابندی ہٹا دی اور بات چیت کے لئے اس کے لیڈروں کو مدعو کیا۔ ایسی مصدقہ اطلاعات ملی ہیں کہ کانگریس پارٹی نے ہمیشہ آندھرا پردیش، جھارکھنڈ اور چھتیس گڑھ میں اپنے سیاسی حریفوں کو شکست دینے کے لئے انتخابات کے وقت نکسلی گروپوں کی مدد کی ہے۔ انتخاب کے دوران جز وقتی فائدہ اٹھانے کے نظریئے سے اس نے آسام میں بھی اُلفا کا استعمال کیا ہے۔

مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ یو پی اے حکومت نیپال کے ماؤوادی باغیوں اور ہندوستان کی نکسلی یونٹوں کے درمیان کھلم کھلا تعلقات کو سمجھنے میں ناکام رہی۔ یہ جڑواں بھائی ہیں جو عالمی سطح پر بائیں بازو دہشت گردی کی پیداوار ہیں۔ نیپال کے ماؤوادیوں کے تئیں نرم گوشہ رکھنا جن کی بغاوت سے ہزاروں لوگوں کی جانیں چلی گئیں اور جن کی سرگرمیوں سے ہمالیہ کا یہ ملک دہل گیا، خطرناک پالیسی ہے۔ ماؤوادیوں کے بڑھتے دائرے ہندوستان اور نیپال دونوں ممالک کیلئے خطرناک ہے۔

بیرون ملک میں ہونے والے واقعات کے تئیں ہندوستان کا رویہ اس ملک کے داخلی معاملوں میں مداخلت نہ کرنے کے اصولوں پر ہونا چاہئے لیکن ایسے حالات شاذ ہیں جب ان کا ہمارے ملکی مفاد پر منفی اثر پڑ رہا ہو۔ حالانکہ نیپال کے ساتھ ہندوستان کے قدیم دور سے اٹوٹ ثقافتی اور روحانی تعلقات رہے ہیں لیکن میری پارٹی کا مسلسل یہی رویہ رہا ہے کہ (ا) نیپال میں طاقتور اور موثر کثیر پارٹی والی جمہوریت ہونی چاہئے (ب) آئینی بادشاہت برقرار رہے کیونکہ یہ نیپال کی شناخت اور سالمیت کا مظہر ہے۔★ ٹھیک اسی طرح جیسا کہ دیگر ملکوں میں ہے (ج) امن، استحکام اور ترقی یافتہ ملک کی شکل میں نیپالی عوام کی خواہشات کو محسوس کر کے ہندوستان کو نیپال کی ہر ممکن مدد کرنی چاہئے۔

میں وزارت داخلہ میں اپنا کام ختم کرنے کے بعد بھی اپنے طریقے سے نکسل ازم کے سنگین خطرے سے آگاہی سے متعلق کوششیں کرتا رہا ہوں۔ پینتیس روزہ ہندوستان سلامتی یاترا کا یہ ایک اہم موضوع تھا۔ میں نے اپریل-مئی 2005 میں بی جے پی صدر راج ناتھ سنگھ کے ساتھ یہ سفر شروع کیا تھا۔ حقیقت میں آندھرا پردیش کے تلنگانہ اور چھتیس گڑھ کے نکسل متاثرہ علاقے اس دورہ کے اہم راستہ رہے۔ جب میں

★ نیپال میں اپریل 2008 میں آئین ساز اسمبلی کے لئے ہونے والے انتخابات کے بعد بادشاہت کو ختم کر دیا گیا۔

نے بائیں بازو دہشت گردی کی عالمی تاریخ کے تناظر میں نکسلی تشدد کے بارے میں اپنے تجربات بتائے تب مجھے لوگوں کی جانب سے مثبت ردعمل ملا۔ چھتیس گڑھ کے بلاسپور میں منعقد ایک پریس کانفرنس میں میں نے تفصیل سے بتایا کہ نکسلیوں کا اصلی ہدف ہندوستان میں جمہوریت کو اکھاڑ پھینکنا ہے اوراس کی جگہ پر ایسے کیمونسٹ سفاک نظام حکومت قائم کرنا ہے جو اسٹالن کے وقت سوویت یونین میں، ماؤ تسے تنگ کے دور میں چین میں اور پال پاٹ کے وقت کمبوڈیا میں قائم تھی۔ لوگوں کو بائیں بازو دہشت گردی کی اس خونی کہانی کے بارے میں بتایا جانا چاہیے جس کی سفاکیت کی وجہ سے 20ویں صدی میں کل اموات کی تقریباً پچاس فیصد اسی کی وجہ سے ہوئیں۔

'جوزف اسٹالن نے سوویت یونین میں 1924 سے 1953 تک انتہائی جابرانہ حکومت کی تھی۔ اس کے دور میں تقریباً 20 لاکھ لوگ مار دیئے گئے جن میں اکثریت کیمونسٹ پارٹی کے رکن تھے۔ چین میں خودساختہ گریٹ پرولیٹورین کلچرل ریولیوشن یعنی 'ثقافتی انقلاب' (1966-76) جس کی قیادت خود ماؤ تسے تنگ نے کی تھی، کے دوران تقریباً 20 لاکھ لوگ 'غیر فطری وجوہات' کی وجہ سے ہلاک کردیئے گئے، 40 لاکھ سے زائد لوگوں کو حراست میں لیکر پوچھ تاچھ کی گئی۔ ثقافتی انقلاب نے سیاسی شدت پسندی، دانشوروں کو بائیں بازو کے افکار ونظریات کو اپنانے کیلئے مجبور کرنے اور نئے چین کی کیمونسٹ حکومت کی پالیسیوں کے نتیجے میں انسانی تاریخ میں بدترین طور پر 30 لاکھ لوگوں کی جانیں چلی گئی تھیں۔ کمبوڈیا میں 80-1975 کے دوران پال پاٹ کے خمیر روژ حکومت میں پورا ملک ایک قتل گاہ میں تبدیل ہوگیا تھا۔ کل 80 لاکھ آبادی والے اس چھوٹے سے ملک میں 20 لاکھ سے زائد لوگوں کو ہلاک کردیا گیا تھا۔ ملک کی تقریباً ایک چوتھائی آبادی کا ایسا قتل عام اور بربادی انسانی تاریخ میں کہیں اور دیکھنے کو نہیں ملتی۔' ★

مجھے یقین ہے کہ ہندوستان نکسل وادیوں کو کبھی یہ اجازت نہیں دے گا کہ وہ ہمارے ملک میں بھی ایسی سفاکانہ وارداتیں انجام دے پائیں۔ پھر بھی ہم مطمئن ہوکر نہیں بیٹھ سکتے۔ بیش قیمت انسانی زندگی بچانے کے لئے اپنے پروقار جمہوری نظام کے تحفظ کے لئے سبھی سیاسی پارٹیوں اور سماج کی سبھی اکائیوں کو مل کر اپنے سیاسی ڈھانچے میں سے کینسر جیسی خطرناک بیماری کو نکال باہر کرنا ہوگا۔

نئی ریاستوں کی تشکیل

1950 میں تیار ہمارے آئین میں کہا گیا ہے کہ ہندوستان ریاستوں کا وفاق ہے۔ اگرچہ لسانی بنیاد پر ریاستوں کی تشکیل نو 1956 تک عمل میں نہیں آئی تھی۔ تیلگو زبان کے لوگوں کے طویل عرصے تک احتجاج کی وجہ سے اس کو تحریک ملی۔ ان کا استعمال ریاست مدراس سے علیحدہ آندھراپردیش بنوانا تھا۔ اس کے بعد لوگوں کے احتجاج کی وجہ سے کئی ریاستیں وجود میں آئیں جیسے گجرات، مہاراشٹر، پنجاب، ہریانہ اور ہماچل پردیش۔

جب واجپئی حکومت نے اپنا کام سنبھالا تب 25 ریاستیں تھیں۔ حالانکہ طویل عرصے سے تین اور ریاستوں کی تشکیل کی مانگیں اٹھ رہی تھیں۔ جھارکھنڈ کو بہار سے، چھتیس گڑھ کو مدھیہ پردیش سے اور اتراکھنڈ کو اترپردیش سے الگ کرنے کا مطالبہ مسلسل کیا جارہا تھا۔ بی جے پی نے طویل عرصے

★ کیمونزم کے افکار اور کام کرنے کے طریقے کے بارے میں میرے غور وفکر کرنے پر وہٹکر چیمبرس (1901-61) کی کتاب 'وٹنیس' کا کافی اثر پڑا۔ یہ امریکی مصنف کبھی کیمونسٹ پارٹی کے رکن تھے جنھوں نے سوویت یونین کے لئے جاسوسی بھی کی تھی لیکن بعد میں یہ کیمونزم کے خلاف ہوگئے۔ اس کتاب میں انتہائی بےخوفی سے ذکر کیا گیا ہے کہ کس طرح کیمونزم انسان کو روحانی نظریئے سے کمزور بنا کر جانور بنا دیتا ہے۔

سے جاری ان مطالبات کی حمایت کی۔ اس بنیاد پر کہ چھوٹی ریاستوں میں بڑی ریاستوں کی بہ نسبت بہتر انتظامی صلاحیت ہوتی ہے، جمہوری خودمختار انتظامیہ میں عوام کے اشتراک کو فروغ ملتا ہے اور سماجی و معاشی ترقی کی رفتار تیز ہوتی ہے۔ ہم نے آندھرا پردیش سے تلنگانہ اور مہاراشٹر سے ودربھ ریاست کی تشکیل کی حمایت کی ہے۔ حقیقت میں ان پانچ ریاستوں کی تشکیل 1998 میں ہماری پارٹی کے انتخابی منشور میں اہم وعدہ تھا۔

وزیر داخلہ کے طور پر پارلیمنٹ میں ضروری آئینی ترمیم کر کے اس وعدے کو حقیقت میں بدلنا میری ذمہ داری تھی۔ ماضی میں اس ایشو سے بھڑ کے تقسیم کے جذبات اور مستقبل میں اٹھنے والے ایسی دیگر مطالبات کے امکانات کو دیکھتے ہوئے میں نے اس معاملے میں آگے بڑھنے کیلئے مستحکم اصول وضع کیا۔ پارلیمنٹ کو کسی نئی ریاست کے قیام کے سلسلے میں خصوصی قرارداد پر غور کرنے کیلئے اصل ریاست کی قانون ساز اسمبلی کو اپنی رضامندی دیتے ہوئے اسے نافذ کرنا ہوگا۔

وزیر اعظم واجپئی اور میں نے مختلف سیاسی پارٹیوں کے لیڈروں کے ساتھ عام اتفاق رائے حاصل کرنے کیلئے مسلسل غیر رسمی بات چیت کی۔ جب مدھیہ پردیش، اتر پردیش، بہار اور اُن کی قانون ساز اسمبلیوں نے رضامندی دی تب ہماری کوششیں بارآور ہوئیں۔ اس سے یکم نومبر 2000 کو چھتیس گڑھ، 9 نومبر 2000 کو اترانچل اور 15 نومبر 2000 کو جھارکھنڈ کے قیام کی راہ ہموار ہوئی۔ ان تین ریاستوں کی تشکیل نو کیلئے آئین کے ایکٹ کے بعد پارلیمنٹ میں ہونے والی بحث کے وقت جواب دیتے ہوئے میں نے کہا 'کسی ایک پارٹی کو ریاستوں کے بنانے کا سہرا نہیں لینا چاہئے۔ میں اس بارے میں ان قوانین کو بہتر ڈھنگ سے نافذ کرنے کیلئے پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں اور سبھی سیاسی پارٹیوں، خاص طور سے سب سے بڑی اپوزیشن پارٹی (کانگریس) اور برسر اقتدار اتحاد (این ڈی اے) کی ستائش کرتا ہوں۔

یہ اس بات کی شاندار مثال ہے کہ کس طرح سے مخالفت کی بجائے عام اتفاق رائے سے بہترین اہداف حاصل کئے جا سکتے ہیں۔

ہم ودربھ کے سلسلے میں اپنا وعدہ پورا نہیں کر سکے کیونکہ مہاراشٹر میں کانگریس کے علاوہ ہماری حلیف پارٹی شیوسینا ریاست کی تقسیم کے حق میں نہیں تھی، اور ابھی بھی نہیں ہے۔ علیحدہ تلنگانہ کے مطالبہ کے سلسلے میں عجیب و غریب حالات پیدا ہو گئے تھے۔ یہ مطالبہ 1956 میں آندھرا پردیش کے قیام کے بعد سے ہی چلا آرہا ہیں۔ بی جے پی بھی اس مانگ کی حمایت کرتی ہے حالانکہ ہم اس سمت میں کچھ نہیں کر پائے، کیونکہ 2004-1998 کے درمیان واجپئی حکومت کی حلیف پارٹی تیلگو دیشم نے اس کی مخالفت کی تھی چونکہ تیلگو دیشم پارٹی اس وقت اقتدار میں تھی اس لئے آندھرا پردیش اسمبلی میں ریاست تلنگانہ کے حق میں بل پیش ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ تیلگو دیشم نے بی جے پی کے ساتھ اپنے تعلقات ختم کر لئے، ہماری پارٹی نے علیحدہ تیلنگانہ کے قیام کے سلسلے میں اپنی حمایت واضح طور سے دوہرائی۔

بھارتیہ جنتا پارٹی کے ذریعہ اصولی طور سے اٹھائے گئے اس قدم کے برعکس کانگریس نے تلنگانہ کے ایشو پر طالع آزمائی کا مظاہرہ کیا جو مئی 20004 کے لوک سبھا اور آندھرا پردیش اسمبلی انتخابات میں ٹی آر ایس (تلنگانہ راشٹریہ سمیتی) کے ساتھ مل گئی اور علیحدہ ریاست کا وعدہ بھی کیا۔ اکلوتے تلنگانہ ایشو پر بنائی گئی ٹی آر ایس کی اس علاقہ میں بڑھتی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے کانگریس کے لیڈروں نے محسوس کیا کہ اس مطالبہ کی حمایت کی جانی چاہئے۔ ٹی آر ایس اتحاد نے آندھرا پردیش کی اسمبلی میں زبردست اکثریت حاصل کی۔ اس ریاست سے انھیں لوک سبھا میں سب سے زیادہ سیٹیں ملی۔ اسی تعداد کے زور پر کانگریس قیادت والے یو پی اے نے مرکز میں حکومت بنائی جس میں ٹی آر ایس بھی تھی چونکہ اب کانگریس حیدرآباد اور نئی دہلی دونوں مقامات پر اقتدار میں ہے، اسلئے تلنگانہ کے لوگوں سے کیا گیا وعدہ پورا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے پھر بھی یہ وعدہ ابھی تک پورا نہیں ہو پایا ہے۔

کانگریس پارٹی دوسری ریاست میں نوتشکیل کمیشن قائم کرنے کے بارے میں بات چیت کرتی آرہی ہے۔لیکن میں نہیں سمجھتا کی یہ کوئی صحیح یا مثبت سوچ ہے کیونکہ اس سے دیگرنئی ریاستوں کی تشکیل کے مطالبات اورمخالفت کا سلسلہ شروع ہوجائے گا۔اس کے علاوہ سیکورٹی و دیگر وجوہات سے کچھ مطالبات پرغورکر کے انھیں پورا کرناممکن ہوگا۔

گجرات زلزلہ: ایک سانحہ جس کا پورے ہندوستان نے متحد ہوکر سامنا کیا

ہرسال کی طرح 26 جنوری کی صبح نئی دہلی میں دھوم دھام سے یوم جمہوریہ کی تقریب منائی جارہی تھی۔راشٹرپتی بھون سے انڈیا گیٹ تک وجے پتھ پرصدر جمہوریہ، وزیراعظم، مہمانان خصوصی، دوسرے ممالک کے سربراہان بڑی تعداد میں دوسرے مہمانوں کی موجودگی میں یوم جمہوریہ کی پریڈنکل رہی تھی لیکن ابھی یوم جمہوریہ 2001 کی پریڈشروع ہوئے زیادہ وقت بھی نہیں ہوا تھا کہ وزیراعظم کواور مجھے ایک انتہائی افسوسناک اطلاع ملی جس نے ہمیں اندرتک ہلا دیا۔خوفناک زلزلہ نے گجرات کے' کچھ' علاقہ کوتہس نہس کردیا تھا اوراس ریاست کے دوسرے حصے بھی اس کے اثر سے بچ نہیں پائے تھے۔

اس کی تفصیلات کا پتہ لگانے پرمعلوم ہوا کے ہندوستان کے ماضی قریب کی تاریخ میں یہ قدرتی آفات سب سے زیادہ بھیانک تھی۔ اس کی زلزلہ کی شدت ریختر پیمانے پر 7.7 تھی۔اس میں 12 ہزار سے زائدلوگ مارے گئے ،تقریبا 55 ہزارلوگ زخمی اور لاکھوں لوگ بے گھر ہوگئے۔' کچھ' کا تقریبا تین یاچوتھائی حصہ برباد ہوگیا تھا۔

میں اسی دن دوپہر میں احمد آباد کیلئے روانہ ہوگیا۔اس تباہ کن زلزلہ میں سینکڑوں عمارتیں منہدم ہوگئیں اور ہزاروں جانوں کا اتلاف ہوا، لیکن' بھج' کے تناسب میں یہ کچھ بھی نہیں تھا۔اس زلزلہ کا مرکز' بھج' تھا۔ یہ تاریخی شہرمٹی کے ڈھیر میں تبدیل ہوگیا۔کچھ دن، ہفتہ اور مہینے گزر گئے، ہندوستان نے اس سمت میں بچاؤ، راحت، بازآبادکاری اورتعمیرنو کی بے انتہا کوششیں ہوتی دیکھیں اوراس بحران سے نمٹنے کیلئے کوششیں بھی کیں۔ اس مصیبت کی گھڑی میں ہندوستان کےلوگوں کے ذریعہ دکھائی گئی ایکتا ناقابل یقین تھی۔عام لوگ پس منظر پرتوجہ دیئے بغیرمصیبت کی اس گھڑی میں ایک دوسرے کی مدد کررہے تھے۔فوج نے خاص طور پراہم کردارادا کیا۔حوصلہ مندانہ اور قابل ستائش کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہزاروں غیرسرکاری تنظیموں نے زلزلہ سے متاثرہ لوگوں تک راحتی سامان پہنچانے میں دن رات ایک کردیئے۔کارپوریٹ ہاؤس اور ہندوستانیوں خاص طور پر بڑی تعداد میں غیرمقیم گجراتی اس مصیبت کی گھڑی میں مدد کے لئے کھڑے ہوگئے۔میں یہاں مختلف مذہبی فرقوں کے ذریعہ دی گئی خدمات کا خاص طور سے ذکر کرنا چاہوں گا۔اس مصیبت کے فوراً بعد میں نے مسلسل مختلف اوقات میں راحت کیمپوں اور متاثرہ مقام پرکئی دن اور راتیں گزاری تھیں۔اس بارے میں 3 فروری 2001 کے انگلش روزنامہ' پائنیر' میں شائع رپورٹ کے کچھ اقتباس پیش کرنا چاہوں گا۔

آڈوانی کے ذریعہ پیش اعلیٰ مثال

دیپک شرما،گاندھی دھام سے

انھوں نے کسی کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں کہا۔لیکن انھوں نے محسوس کیا کہ کیا غلط ہوا ہے اور کیا کیا جانا ہے۔بے انتہا بربادی پرزیادہ بہتر ڈھنگ سے توجہ دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔اگروہ ریاست کو ہلا دینے والے زلزلہ کے بعد پانچ دنوں کے اندر تیسری بار گجرات جاتے ہیں

تو اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں ہے۔ شامیانہ میں دورات گزارتے ہوئے اور جوانوں کو دیا جانے والا کھانا کھاتے ہوئے 73 سالہ مرکزی وزیر داخلہ ایل کے آڈوانی ایک مقام سے دوسرے مقام تک گھومتے رہے تاکہ 'کچھ' کے زلزلہ متاثرہ علاقہ میں انتظامیہ کو مسلسل متحرک رکھا جا سکے۔

نشریات کا انتظام فیل ہو جانے پر مسٹر آڈوانی نے موبائیل فون سے رابطہ بنائے رکھا اور ایک ایک کر کے سرکاری افسران اور وزراء کو فون کرتے رہے۔'اور زیادہ تعداد میں کنٹرول روم قائم کئے جائیں اور تباہ ہو چکے علاقوں کی تحصیلوں میں سینئر افسران فوراً پہنچیں'۔ انھوں نے ایک سینئر افسر کو حکم دیا۔ کانڈلہ پورٹ پر انھوں جہازوں کے اندر جا کر یہ دیکھا کہ بحریہ کے ڈاکٹر کیا کر رہے ہیں۔'ان دو دنوں میں آپ نے کتنی سرجری کی ہے؟ سنگین طور سے زخمی مریضوں کا کیا حال ہے؟' انھوں نے کمانڈر ایس پی بھاسکر سے پوچھا۔ 'بھج' میں وہ اسرائیلی ہیلتھ کیمپ میں گئے۔ انھوں نے اسرائیلی آرمی میڈیکل سروس کی 160 رکنی ٹیم کے لیڈر ڈاکٹر ابط سے کہا' میں یہ دیکھ کر خوش ہوں کہ آپ مسلسل دن رات کام کر رہے ہیں'۔ کچھ منٹوں میں ہی وہ ضلع کلکٹر کمل دیانی سے بات کر رہے تھے۔'ملبہ ہٹانے میں کتنا وقت لگے گا؟ آپ کو کسی طرح کی مدد کی ضرورت ہے؟'

گاندھی دھام میں ایک بار وہ بھیڑ کے ساتھ گھل مل گئے اور کچھ کے لوگوں کے ساتھ انہیں کی زبان میں گفتگو کرنے لگے۔ انھوں نے زندگی سے ناامید ہو چکے لوگوں میں یقین واعتماد جگانے کی کوشش کی، تب انھوں نے ریاستی سطح کے ایک بی جے پی لیڈر کو حکم دیا' آپ ان سبھی کی باتیں سنیں اور یہیں رہیں۔' آدی پور کا منظر مختلف تھا۔ وزیر داخلہ اس وقت جذباتی ہو گئے تھے جب انھوں نے زلزلہ متاثرہ آدی پور کا دورہ کیا تھا۔ یہاں پر ان کے والد چار عشرہ سے بھی زیادہ عرصہ تک رہے تھے۔ تھوڑی دیر تک خاموش رہے کیونکہ ان کے دور کے رشتے دار اور پرانے پڑوسی ان کے اردگرد اکٹھے ہو گئے تھے۔ کراچی سے آڈوانی خاندان آدی پور میں آکر آباد ہو گیا تھا۔ تباہ شدہ مکان میں وہ سیدھے چلے گئے اور وہاں پر بستر پر لیٹے 87 سالہ بزرگ کو گلے سے لگا لیا۔ وہ ان کے والد کے دوست تھے۔'بھروسہ رکھیں ہم' کچھ' کی دوبارہ تعمیر نو کریں گے پہلے سے بھی بہتر' مسٹر آڈوانی نے کہا۔'' بزرگ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔''

لوگوں کی شراکت اور مرکز سے مکمل تعاون ملنے کی وجہ سے گجرات حکومت نے اتنی کم مدت میں برباد ہو چکے مکانوں، اسکولوں، اسپتالوں، سڑکوں اور بازاروں کی تعمیر نو میں قابل ذکر کامیابی حاصل کی اور پوری ریاست کو دوبارہ اپنے پاؤں پر کھڑا کر دیا۔ حقیقت میں یہ گجراتیوں کی طاقت کا ایک نمونہ ہے۔ اقوام متحدہ کی ایجنسیوں نے بھی ان کوششوں کے لئے ریاستی حکومت کی ستائش کی۔ گجرات اس ملک کی ایسی پہلی ریاست ہے جہاں ڈیزاسٹر مینجمنٹ سے متعلق قانون بنا اور اس پر عمل درآمد یقینی بنانے کے لئے ریاستی سطح کا ادارہ قائم کیا گیا۔

اس قسم کے قدرتی آفات کا نہ تو قبل از وقت اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس سے بچا جا سکتا ہے تاہم بہتر حکومت کا یہ امتحان ہے کہ آفات کے بارے میں بہتر ڈھنگ سے تیاری کر کے اس کے وسیع علاقہ اور نتائج کی سنگینی کو کم کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ اس لئے یکساں طور سے اور گجرات میں زلزلہ آنے کے بعد پندرہ دنوں سے بھی کم عرصہ میں واجپئی حکومت نے نیشنل ڈیزاسٹر مینجمنٹ کمیٹی تشکیل کی تاکہ دیگر باتوں کے ساتھ ساتھ مستقبل میں عظیم قدرتی آفات سے نمٹنے کے لئے مثبت اور طویل ورکنگ پالیسی کے لئے ضروری ادارہ جاتی اور قانونی طریقہ کار کے لئے مشورے دیئے جا سکیں۔ قومی اتفاق رائے کو فروغ دینے کی سمت میں کوششیں کرتے وقت پینل کے سامنے اہم سیاسی پارٹیوں کے لیڈروں کو شامل کیا گیا۔ وزیر اعظم نے حزب اختلاف (راشٹروادی کانگریس پارٹی) کے لیڈر شرد پوار کو اس کمیٹی کے سربراہ کے طور پر نامزد کیا جس کی کافی ستائش کی گئی۔ 1997 میں لاتور میں آئے بھیانک اور تباہ کن زلزلے کے وقت مہاراشٹر کے وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے شرد پوار نے راحت دینے، باز آبادکاری اور تعمیر نو کی کوششوں میں شاندار قیادت کی تھی۔ این ڈی اے حکومت نے پوار پینل کی سفارشات قبول کر لیں لیکن اس پر کام کرنے

سے پہلے ہی ہم مئی 2004 میں پارلیمانی انتخابات ہار گئے۔

جب دسمبر 2004 میں 'سنامی' نے ہندوستان (اور اس خطے کے دوسرے ملکوں) پر قہر برپا کیا اور تامل ناڈو، کیرالا اور آندھرا پردیش میں وسیع پیمانے پر تباہی پھیلائی تب میں نے این ڈی اے حکومت سے پوار کمیٹی کی سفارشات نافذ کرنے کے لئے درخواست کی۔ خاص طور پر قومی سطح پر ماہرین کی ایک ڈیزاسٹر مینجمنٹ تشکیل دی جائے۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہے کہ 2005 میں قومی آفات مینجمنٹ اتھارٹی وجود میں آچکا ہے۔

کثیر منصوبہ جاتی قومی شناختی کارڈ

وزارت داخلہ میں میرے لئے سب سے پہلا کام شہریوں کا قومی رجسٹر تیار کرنا اور چودہ سال اور اس سے زیادہ عمر کے تمام شہریوں کو کثیر القاصد قومی شناختی کارڈ جاری کرنا تھا۔ ووٹر لسٹ میں نام درج کرانے، انکم ٹیکس تفصیلات داخل کرنے، پاسپورٹ بنوانے، ڈرائیونگ لائسنس، راشن کارڈ، ہیلتھ، اسکول اور کالج میں داخلہ، سرکاری وغیر سرکاری سیکٹر میں روزگار اور لائف انشورنس کرانے کے لئے اس کارڈ کا استعمال کیا جاسکتا ہے۔ حکومت کارڈ رکھنے، شہری اثاثہ کے ریکارڈ رکھنے، امیگریشن بیورو کے ذریعے غیر ملکی سفر کا ریکارڈ رکھنے، جرائم ریکارڈ وغیرہ رکھنے میں اس کارڈ کا استعمال کرتی ہے۔ ان لوگوں کو دوسرے رنگ کے کارڈ جاری کئے جانے تھے جو ہندوستان کے شہری نہیں ہیں۔

حقیقت میں ایسے کارڈ جاری کرنا ملک کی سیکورٹی کے بارے میں گروپ آف منسٹرز کی ایک اہم سفارش تھی۔ ایسا انھوں نے بے حساب غیر قانونی دراندازی کے واقعات میں اضافے کی وجہ سے کیا تھا۔ اس کے مطابق شروع میں سرحدی ریاستوں میں اور پھر آہستہ آہستہ اندرونی ریاستوں میں کثیر القاصد شناختی کارڈ جاری کرنا تھا۔

حکومت نے یہ سفارش قبول کرلی جس پر عمل درآمد کیلئے شہری ایکٹ 1955 میں ترمیم کرنے کی ضرورت تھی جو دسمبر 2003 میں کردی گئی۔ انفارمیشن ٹکنالوجی کی مستند کمپنیوں کے ساتھ مشورہ کرکے وزارت داخلہ نے آٹومیٹنگ سسٹم کیلئے انتہائی اعلیٰ معیار کا سافٹ ویئر تیار کیا تاکہ فنگر پرنٹ اور بایولوجیکل شناخت سے متعلق تفصیلات سمیت ہر ہندوستانی شہری کو خصوصی قومی شناخت نمبر دیا جائے۔ حقیقت میں اس وقت یہ اسکیم ابتدائی مراحل میں تھی جب ہماری حکومت نے مئی 2004 میں اپنا کام چھوڑا۔ فنڈ دیئے جاچکے تھے اور تفصیلی ورکنگ اسکیم تیار ہوگئی تھی، کچھ سرحدی علاقوں میں پائلٹ پروجیکٹ شروع ہوچکے تھے، اور اپنی تجربات کی بنیاد پر ضروری ترمیم کی جارہی تھیں۔ یہ دیکھ کر مجھے دکھ پہنچا کہ کانگریس قیادت والی یو پی اے حکومت نے جانب دارانہ رویہ کی وجہ سے اس اہم پروجیکٹ کو ٹھنڈے بستے میں ڈال دیا۔

عیسائی فرقے کی کہانی اور تبدیلی مذہب پر بحث وتکرار

کثرت میں وحدت، سبھی مذاہب کے تئیں احترام اور الگ الگ فرقہ کے پیشواؤں کے درمیان آپسی بھائی چارہ وغیرہ کے جذبات کے نظریئے سے ہندوستان دنیا کے سامنے قابل فخر اور قابل عمل مثال پیش کرتا ہے۔ ہمیشہ کچھ مقامی حالات میں، مختلف مذاہب پر مشتمل فرقوں کے درمیان تعلقات میں کشیدگی بھی نظر آتی ہے، جو اکثر تشدد آمیز لڑائی کی آگ میں گھی کا کام کرتا ہے۔ ایک ہی فرقہ کے اندر بھی تعلقات میں کشیدگی کے بارے میں بھی یہ بات صحیح پائی گئی ہے۔ لیکن ایسے سبھی واقعات غیر متنازع طور سے تبدیلیٔ مذہب کی وجہ سے ہوتے ہیں اور یہ ہندوستان کے سماجی حالات کی اصل تصویر نہیں ہے۔ یہ محض استثنیٰ ہے نہ کہ کوئی قانون۔

خواہ یہ استثنیٰ ہیں لیکن کوئی بھی مثبت سوچ والا شخص فرقہ وذات پات کے نام پر تشدد کیلئے نہ تو ان کو معاف کر سکتا ہے نہ ہی ان کی سوچ کو صحیح ٹھہرا سکتا ہے۔ اسلئے مجھے یہ دیکھ کر تکلیف ہوئی کہ ہمارے عیسائی بھائیوں کے تئیں برتی گئی تشدد آمیز کاروائی انتہائی غلط اور قابل مذمت واقعات کو واجپائی حکومت کی اقلیت مخالف شبیہ کے طور پر پیش کیا گیا۔ ملک کے اندر اور بین الاقوامی دونوں سطحوں پر بی جے پی کو بدنام کرنے کیلئے مسلسل اور منظم طریقے سے مہم چلائی گئی۔

اس مہم کا آغاز اڑیسہ کے منوہر پور گاؤں کے دل دہلا دینے والے ایک واقعے سے ہوا تھا، جہاں 22 جنوری 1999 کی صبح آسٹریلیا کے مشنری گراہم اسٹین اور اس کے دو چھوٹے بچوں کو زندہ جلا دیا گیا۔ اس جرم کی سفاکیت نے پورے ملک کو ہلا کر رکھ دیا۔ ہر شہری کا سر شرم سے جھک گیا۔ ہماری حکومت نے فوری کاروائی کی اور ایک ہفتہ سے بھی کم عرصے میں وزارت داخلہ نے سپریم کورٹ کے جج جسٹس ڈی پی بادھوا کی صدارت میں تفتیشی کمیشن تشکیل دیا۔ اس کمیشن نے چھ ماہ سے بھی کم عرصے میں شاندار رپورٹ پیش کر کے ریکارڈ قائم کیا۔ انھوں نے یہ فیصلہ دیا کہ دارا سنگھ نامی شخص اس جرم کا قصوروار ہے۔ وہ اور اس کے ساتھی عمر قید کی سزا بھگت رہے ہیں۔

غیر جانبدارانہ تفتیش کی وجہ سے قصور ثابت ہونے میں تاخیر نہیں ہوئی جس کا سہرا ہندوستان کی سیکولر اور ہماری آزاد عدلیہ، دونوں کو جاتا ہے۔ جب یہ واقعہ پیش آیا تب سیاسی حلقہ کے کچھ لوگوں، دانشوروں نے اس وقت سنگھ اور اس کی معاون تنظیموں کو قصوروار ٹھہرایا اور اس کے ساتھ بی جے پی کو جوڑ کر ہماری حکومت کی شبیہ خراب کرنے کی کوشش کی۔ اسلئے میں پارلیمنٹ میں یہ دعویٰ کرنے کے لئے مجبور ہو گیا' میں ان تنظیموں کو جانتا ہوں، یہ مجرم نہیں ہیں' ہمارے سیاسی حریفوں نے دنیا بھر میں اس بات کی تشہیر کرنے کیلئے کہ میں اسٹینس کے قاتلوں کی حمایت کر رہا ہوں، میرے اس بیان کو استعمال کیا۔ یہاں یہ بتانا مناسب ہوگا کہ جرم کی جانچ کرنے والے بادھوا کمیشن اور مرکزی تفتیشی بیورو دونوں ہی سنگھ اور عدالت کے ذریعے قصوروار پائے گئے مجرموں کے درمیان کوئی تعلق ثابت نہیں کر پائے۔ لوگوں سے میری اپیل ہے کہ وہ منفی تشہیر کے بجائے حقائق پر یقین کریں۔

حالانکہ اسٹینس اور ان کے بچوں کا قتل بلاشبہ غیر انسانی واقعہ تھا، پھر بھی اس سے 'عیسائی فرقہ کی تشہیر کی وجہ سے عیسائی اور غیر عیسائی گاؤں میں کشیدگی بڑھتی جا رہی تھی، اس کشیدگی کی وجہ تھی -(1) گاؤں والوں نے عیسائی مذہب قبول کرنے کے بعد گاؤں کے تہواروں کے انعقاد میں چندہ دینا بند کر دیا تھا (2) یہ لوگ مقامی مذہبی تہواروں اور قبائلی رقص کی تقریبات وغیرہ میں شرکت نہیں کرتے تھے (3) راجہ، مکر سنکرانتی اور دیگر تہواروں کے موقعوں پر قبائلی روایت کے مطابق یہ لوگ زمین جوتنے لگے تھے۔ عیسائیوں کے ان کاموں کی وجہ سے دوسرے فرقہ کے لوگ ناراض ہو گئے۔'

کمیشن نے یہ بھی نوٹ کیا کہ اسٹینس، سناتن مذہب کو محض مورتی اور جانور پوجنے والا فرقہ بتاتے تھے۔ انتہائی غریب لوگوں کے درمیان انسداد کوڑھ سے متعلق کام کرنے کے علاوہ 'اسٹینس اپنے مذہب کے تئیں کافی لگاؤ رکھتے تھے اور اس یقین سے تحریک پا کر مشنری کے کام شامل تھے کہ انھیں اس علاقہ کے لوگوں کے درمیان اپنے مذہب کی تشہیر کرنی چاہیے۔ ان کے مشنری کاموں کے نتیجے میں قبائلی لوگ عیسائی مذہب قبول کرنے لگے۔'

حالانکہ طویل عرصے سے ہندوستان میں عیسائی مشنریوں پر شاذ و نادر حملے ہوتے رہے ہیں، لیکن واجپائی حکومت کے چھ سال کے مدت کار میں ان واقعات کی اندرون اور بیرون ملک میں جتنی سنسنی خیز تشہیر ہوئی اتنی پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ میں ہمیشہ ایسے واقعات کی تردید کرتا رہا ہوں۔ 16 دسمبر 1998 کو عیسائیوں پر ہونے والے مظالم کے معاملہ پر لوک سبھا میں بولتے وقت میں نے کہا' جہاں تک ہماری حکومت کا تعلق

ہے، میرا یقین ہے کہ اس ملک کے ہر ایک شہری کو خواہ وہ اقلیت ہو یا اکثریت یہاں پر غیر محفوظ محسوس نہیں ہونا چاہیے۔' میں نے یہ بھی دعویٰ کیا کہ 'ہندو مذہب میں نفرت کیلئے کوئی جگہ نہیں ہے، میں اس سے بڑھ کر کہوں گا کہ نفرت کی اس ملک کی روایت میں کوئی جگہ نہیں ہے۔'

میں مانتا ہوں کہ ہندو اور عیسائی — حقیقت میں دو الگ الگ مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان بھائی چارگی کے تعلقات کو فروغ دیا جانا چاہیے عیسائی مذہب -تقریباً دو ہزار سال پہلے ہندوستان میں آیا تھا جب دنیا کے متعدد عیسائی ملکوں کا اس سے رابطہ ہوا۔ عیسائیوں کے مختلف النوع شعبے میں اہم تعاون سے ہماری ملکی زندگی کی ترقی ہوئی ہے۔ کراچی کے ایک کیتھولک اسکول میں پڑھنے کے بعد میں تعلیم، صحت اور یتیموں کی دیکھ بھال کے تئیں عیسائی مشنری کی خدمات اور ان کی انسانی خدمات سے متعلق کاموں کے تئیں ان کے خلوص کی ستائش کرتا ہوں۔ پھر بھی سماجی خدمات کی آڑ میں درج فہرست ذات وقبائل اور کمزور طبقہ کے لوگوں کی منظم طریقے سے بڑے پیمانے پر تبدیلی مذہب کو مذہبی آزادی کی بنیاد پر جائز قرار نہیں دیا جاسکتا۔ نہ ہی مذہبی آزادی کے اس غلط استعمال کے تئیں احتجاج کرنے اور فریب سے تبدیلی مذہب سے متعلق قانون بنانے کا مطالبہ کرنے کیلئے ہندو تنظیموں پر الزام عائد کیا جاسکتا ہے۔★ تبدیلیٔ مذہب کے سلسلے میں یہاں گاندھی جی کی سوچ اور افکار پیش کرنا چاہتا ہوں۔

'میں یقین نہیں کرتا کہ ایک شخص دوسرے شخص کا مذہب تبدیل کرے۔ دوسرے مذہب کو حقیر جاننا میری کوشش کبھی نہیں ہونی چاہیے۔ اس کا مطلب ہے سبھی مذاہب کے سچ میں یقین واعتماد، اور ان کی قدر کرنا۔ اس کا مطلب ہے، سچا اعتماد.... میرا ماننا ہے کہ انسانی خدمات کی آڑ میں تبدیلی مذہب بیمار ذہنیت کی غماز ہے۔ یہیں لوگوں کے ذریعے اس کی سب سے زیادہ مخالفت ہوتی ہے۔ آخر مذہب ایک نہایت ہی ذاتی معاملہ ہے۔ یہ دل کو چھوتا ہے..... میں اپنا مذہب اس وجہ سے کیوں تبدیل کروں کہ عیسائی مذہب کی تشہیر کرنے والے اس ڈاکٹر کا مذہب عیسائی ہے جس نے میرا علاج کیا ہے؟ یا ڈاکٹر مجھ سے یہ امید کیوں کرے کہ میں اس سے متاثر ہوکر اپنا مذہب تبدیل کرلوں گا؟' ('ینگ انڈیا' 23 اپریل 1931)

'اگر میرے پاس طاقت ہے اور میں اس کا استعمال کرسکتا ہوں تو مجھے مذہب تبدیل کرنے سے روکنا چاہیے۔ ہندو کنبوں میں مشنری کی آمد کا مطلب پہناوا، رسم ورواج، زبان، طعام وقیام میں تبدیلی کی وجہ کنبہ کا زوال ہے۔' ('ہریجن'، 5 نومبر، 1935)

'آج ہندوستان میں اور کہیں بھی تبدیلی مذہب کے طریقہ کے ساتھ میرے لئے توازن قائم کرنا ناممکن ہے۔ یہ ایسی غلطی ہوگی، جس سے یقیناً امن اور دنیا کی ترقی میں رکاوٹ آئے گی۔ کوئی عیسائی کسی ہندو کو عیسائی مذہب تبدیل کیوں کرانا چاہتا ہے؟ اگر ہندو نیک ہے یا اپنے مذہب پر چلنے والا ہے تو وہ اس سے مطمئن کیوں نہیں ہے؟' ('ہریجن'، 30 جنوری، 1937)

عیسائی تنظیموں اور ان کے لیڈروں سے میری اپیل ہے کہ وہ تبدیلیٔ مذہب سے متعلق ہندوؤں کے خوف کو دور کرنے کیلئے پیش قدمی کریں۔ میں انہیں آرک بشپ ایس۔ ارولپا کی یاد دلانا چاہتا ہوں، جو حیدرآباد میں اہم مذہبی شخصیت کی شکل میں معزز سمجھے جاتے ہیں اور جن کا فروری 2005 میں انتقال ہوگیا تھا۔ ایک بار انھوں نے مجھ سے کہا تھا 'میں ثقافتی قوم پرستی پر آپ کے خیالات کی پوری حمایت کرتا ہوں۔ جنم سے میں ہندوستانی ہوں۔ ثقافت سے ہندو ہوں اور مذہب کے نظریئے سے عیسائی ہوں۔' ہندوستان کی مشترکہ ثقافت کے تئیں یگانگت، بھائی چارہ اور فخر کا جذبہ ہر کسی کیلئے قابل تقلید ہے۔ ساتھ ہی میں ہندو تنظیموں سے بھی اپیل کرتا ہوں کہ وہ عیسائی فرقہ کے ساتھ تعلقات کے دوران شدت پسندی سے بچیں۔ ہمیں گفت وشنید اور میل ملاپ کے تمام دروازے کھول کر الزامات اور نفرت کی سارے دروازے بند کردینے چاہیے۔

★ ارونا چل پردیش، مدھیہ پردیش اور اڑیسہ جیسی ریاستوں میں تبدیلیٔ مذہب قانون نافذ ہے، جو کانگریس سرکار نے نافذ کیا تھا۔ اسی طرح دنیا کے دیگر ملکوں میں بھی ایسا ہی قانون نافذ ہے۔

12

گجرات میں فرقہ وارانہ تشدد
خیالی تشہیر بنام حقائق

دوستانہ جذبہ کے فروغ کے بنسبت نفرت پھیلانے کیلئے تشہیر کی جاتی ہے تب یہ اتنی کامیاب کیوں ہوتی ہے؟

-برٹرینڈ رسل، برطانوی دانشور اور خیرسگالی رکن

میں وزارت داخلہ میں اپنے 6 برسوں کی تفصیلات اس واقعہ کے ساتھ ختم کر رہا ہوں- یہ ایک نہیں بلکہ 2 مختلف واقعات سے منسلک ہیں- جب 6 سال کی مدت میں واجپائی حکومت ہماری پارٹی اور اس کے افکار کی شبیہ خراب کرنے کیلئے قومی اور بین الاقوامی سطح پر پرزور طریقہ سے مسلسل مہم چلائی گئی تھی۔ میں فروری- مارچ 2002 میں گودھرا واقعہ کے بعد دونوں مرحلوں میں گجرات میں پھیلے فرقہ وارانہ فسادات کا ذکر کر رہا ہوں۔ میں نے بارہا کہا کہ دونوں واقعات ایسے تھے جو قابل اعتراض تھے اور 'میری حکومت کے نام پر لگا داغ' تھے۔ میں اس واقعہ سے بہت زیادہ غم زدہ تھا کیونکہ ان واقعات سے واجپائی حکومت کی شبیہ خراب ہوئی تھی جس کا ابھی تک یہ ریکارڈ رہا تھا کہ ان کے دور حکومت میں ملک میں فرقہ وارانہ تشدد کے واقعات کی تعداد میں بہت زیادہ کمی آئی ہے۔

گجرات میں اس واقعہ کے بعد کانگریس اور دیگر سیکولرازم کے ٹھیکیدار 3 جھوٹے ایشوز کی بنیاد پر مسلسل میری پارٹی کے خلاف بڑھ چڑھ کر منفی مہم چلانے لگے۔ ابھی بھی یہ جھوٹ قائم ہے۔ پہلا جھوٹ یہ ہے کہ گودھرا سانحہ کے بعد کا تشدد مسلم مخالف منصوبہ بند ریاستی قتل عام کی سازش ہے۔ دوسرا جھوٹ یہ کہ جب پورا گجرات تشدد کی آگ میں جھلس رہا تھا تب مرکز میں بی جے پی قیادت والی سرکار نے کچھ نہیں کیا۔ اور تیسرا جھوٹ یہ ہے کہ سابرمتی ایکسپریس کے 2 ڈبوں میں لگی آگ کی وجہ سے گودھرا قتل عام ہوا تھا اور اس سے بھی بدتر یہ کہا گیا کہ آگ خود بھڑکی تھی۔ میرا یہ فرض ہے کہ میں ان تینوں جھوٹی باتوں کی سچائی پیش کروں۔

30 اپریل 2002 کو لوک سبھا میں ایک بحث کے دوران کانگریس صدر سونیا گاندھی نے گجرات تشدد کو 'قتل عام' بتایا اور کہا'......لیکن

بالآخر جیت سچ کی ہی ہوگی۔' سرکاری اطلاعات کے مطابق اور ان کی خود کی سرکار کے مطابق سچائی کچھ اور تھی۔ مختلف مذاہب کے مارے گئے لوگوں کی تفصیلات اس طرح تھی- مسلم 790، ہندو 254، اس کے علاوہ 223 لوگ لاپتہ بتائے گئے۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ غیر سرکاری طور سے مرنے والوں کی تعداد اور زیادہ ہوسکتی ہے۔ لیکن کیا اس طرح کے افسوس ناک سانحہ کو مسلمانوں کا 'قتل عام' کہا جاسکتا ہے۔ جس میں مارے گئے ہندوؤں کی تعداد بھی کم نہیں تھی؟ بحث کے دوران وزیر اعظم واجپائی نے سونیا گاندھی کو انتباہ کیا کہ وہ اتنے سخت الفاظ کا استعمال نہ کریں۔ لیکن وہ مسلسل ایسے الفاظ کا استعمال کرتی رہیں جن کی خوب تشہیر کی گئی اور ہمارے ملک کیلئے منفی انداز میں سوچنے والی طاقتیں سرگرم ہوگئیں تاکہ ہماری حکومت کو ہی نہیں بلکہ گجرات اور ہندوستان کو بھی بدنام کیا جاسکے۔

یہاں اس بات پر زور دیا جانا چاہئے کہ احمد آباد، بڑودرہ اور گجرات کے دیگر حصوں میں پولس فائرنگ کے درجنوں واقعات میں 200 سے بھی زائد فسادی مارے گئے۔ پولس کے ذریعہ تقریباً 10 ہزار راؤنڈ گولیاں داغی گئیں۔ ابتدائی دنوں میں پولس نے تقریباً 18 ہزار ہندوؤں اور 3800 مسلمانوں کو احتیاطاً حراست میں لے لیا تھا۔ کیا اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ ایک منظم سازش کے تحت مسلمانوں کے اجتماعی قتل عام کے پیچھے ریاستی حکومت کا ہاتھ تھا اور اس دوران ریاست کے سیکورٹی نظام اور وسائل نااہل رہے؟

کیا مرکز خاموش تماشائی بنا رہا؟

مرکز پر یہ الزام لگایا گیا کہ جب گجرات تشدد کی آگ میں جھلس رہا تھا تب سرکار خاموش تماشائی بنی رہی۔ اس سلسلے میں میں مندرجہ ذیل حقائق واضح کرنا چاہتا ہوں۔ 27 فروری کو گودھرا میں ہونے والے قتل عام کے کچھ گھنٹوں کے اندر گودھرا اور احمد آباد میں ریپڈ ایکشن فورس (آر اے ایف) کی تعیناتی کرنے کے ساتھ ساتھ فوری ریڈ الرٹ کا اعلان کر دیا گیا۔ اگلے ہی دن ریاستی حکومت نے مرکز سے درخواست کی کہ گجرات میں فوج بھیج دی جائے۔ ساتھ ہی پڑوسی ریاستوں سے درخواست کی گئی کہ وہ اپنی مسلح پولس فورسز گجرات بھیجیں۔ اسی رات وزیر اعظم واجپائی نے وزیر دفاع جارج فرنانڈیز کو احمد آباد بھیجا جہاں وزیر موصوف نے وزیر اعلیٰ نریندر مودی کے ساتھ فوج کی تعیناتی کے بارے میں تفصیلی گفتگو کی۔ یکم مارچ کی صبح فوجیوں سے لدے ہوائی جہاز وہاں پہنچ گئے اور دوپہر ہونے سے پہلے ہی انتہائی حساس مقامات پر فوجیوں کی تعیناتی کا کام شروع ہوگیا۔ احمد آباد، راجکوٹ اور بڑودرہ وغیرہ فسادزدہ علاقوں میں بغیر کسی تاخیر کے فوج فلیگ مارچ کرنے لگی۔ جب فساد نہیں رکے تب ریاستی حکومت نے پورے گجرات میں دیکھتے ہی گولی مارنے کا حکم دے دیا۔

گودھرا سے باہر تشدد پھیلنے کے 3 دنوں کے اندر میں نے ریاست کا دورہ کیا جس کے بارے میں میڈیا نے اس طرح رپورٹ پیش کی:

آڈوانی کے ذریعہ گجرات کے حالات کا جائزہ — حکومت کو سختی برتنے کو کہا

مرکزی وزیر داخلہ ایل کے آڈوانی نے اتوار کو کہا 'ہم کسی بھی قسم کی فرقہ وارانہ کشیدگی کی اجازت نہیں دیں گے۔' انہوں نے یہ بھی کہا کہ گودھرا میں بھیڑ کا حملہ اور اس کے بعد تشدد ان کی پارٹی کے 4 سال کے اس ریکارڈ پر لگا بدنما داغ ہے کہ ان کی حکومت 'فرقہ وارانہ کشیدگی سے مستثنیٰ' رہی ہے۔ انہوں نے دعویٰ کیا کہ حکومت فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور بھائی چارہ بحال کرنے کو ترجیح دے گی۔ وزیر داخلہ نے وزیر اعلیٰ نریندر مودی اور سینئر ایڈمنسٹریٹو، پولس اور دیگر فوجی افسران کے ساتھ میٹنگیں منعقد کیں اور سول اسپتال و باپونگر، نرودہ اور میگھنی نگر کے متاثرہ علاقوں کا

دورہ کیا۔ انہوں نے کہا کہ گودھرا سانحہ اور ریاست میں اس کے بعد تشدد کے بارے میں حکومت کی 3 اہم ذمہ داریاں ہیں۔ پہلی، مجرموں کی گرفتاری ہے، دوسری کسی طرح کے تشدد کو دوبارہ ہونے سے روکنا اور تیسری ہر شہری اور فرقہ کیلئے امن وسلامتی کو یقینی بنانا ہے۔ آڈوانی نے اس علاقے کا بھی دورہ کیا جہاں کانگریس کے سابق ممبر پارلیمنٹ احسان جعفری اور ان کے کنبہ کے 19 افراد جل کر راکھ ہوگئے تھے۔ انہوں نے غم زدہ کنبہ کے ممبران کے ساتھ تعزیت کی۔

اس سے پہلے شام کو میں نے نئی دہلی میں اپوزیشن پارٹیوں کے لیڈروں کے ساتھ گجرات کے حالات پر غور وخوض کرنے کیلئے وزیراعظم کے ذریعہ بلائی گئی میٹنگ میں شرکت کی تھی۔ ملک کے دیگر حصوں میں تشدد پھیلنے کے اندیشے سے متفکر اٹل جی اور میں نے محسوس کیا کہ پارٹی کی چھوٹی باتوں سے اوپر اٹھ کر ملک کے تئیں عزم کا مظاہرہ کیا جائے تاکہ فرقہ وارانہ امن اور بھائی چارگی برقرار رہے۔ اس کے بعد وزیراعظم نے یہ یقین دہانی کرائی تھی کہ مرکز گجرات کے حالات سے اچھی طرح نمٹے گا۔ اس یقین دہانی کے بعد ہم نے اپوزیشن پارٹیوں کے لیڈروں سے درخواست کی کہ ہر قیمت پر امن بنائے رکھنے اور اتحاد کو فروغ دینے کیلئے ملک کے لوگوں کے نام اپیل جاری کرنے میں ہمارا ساتھ دیں۔ اس اپیل پر دستخط کرنے والوں میں اٹل جی اور میرے علاوہ سابق وزیراعظم اندر کمار گجرال، سونیا گاندھی، بی جے پی صدر کرشنا مورتی، کمیونسٹ پارٹی (مارکس وادی) کے جنرل سکریٹری ہرکشن سنگھ سرجیت اور سماج وادی پارٹی کے صدر ملائم سنگھ یادو تھے۔

ہمارے مخالفین کی تشہیر کے باوجود پورا گجرات فساد کی زد میں نہیں آیا تھا۔ مرکز اور ریاستی حکومت کی مشترکہ کوششوں سے تشدد کی آگ ریاست کے باقی حصوں میں پھیلنے سے بچ گئی تھی۔ یہ سچائی کم اہمیت کی حامل نہیں ہے کہ مرکز نے اس طرح کے فساد دیگر ریاستوں میں نہ پھیلنے کیلئے مثبت قدم اٹھائے۔

> 4/اپریل 2002 کو وزیراعظم واجپائی نے گجرات کا دورہ کیا۔ احمد آباد میں شاہ عالم راحت کیمپ میں تقریباً 8 ہزار فسادات سے متاثر مسلمان پناہ گزیں تھے۔ وزیراعظم نے بتایا 'مصیبت کی اس گھڑی میں آپ اکیلے نہیں ہیں۔ ہم سبھی آپ کے ساتھ ہیں۔ پورا ملک آپ کے ساتھ ہے۔ اپنے ہی ملک میں مہاجر ہو جانا یہ دل کو ٹکڑا کر دینے والی بات ہے۔ گودھرا میں جو کچھ ہوا وہ قابل مذمت ہے لیکن اس کے بعد ریاست کے دیگر حصوں میں جو کچھ ہوا وہ بھی افسوسناک ہے۔' انہوں نے اظہار افسوس کرتے ہوئے کہا 'گجرات میں تشدد کی وجہ سے دوسرے ملکوں میں ہندوستان کی شبیہ پر بہت برا اثر پڑا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ کس منہ سے اس واقعہ کے بعد بیرون ملک جاؤں گا۔ یہ پاگل پن بند ہونا چاہئے۔'

اپریل کے وسط میں پارلیمانی بحث میں میں نے کہا تھا 'اس بحث میں حصہ لیتے ہوئے میں رنج والم کا اظہار کرتا ہوں۔ گزشتہ 4 سال کی صاف وشفاف اور فسادات سے پاک حکومت کا ہمارا ریکارڈ اس واقعہ سے برباد ہوگیا۔ جب میں مجموعی طور سے گجرات کے واقعات پر نظر ڈالتا ہوں تو یہ کہنے سے خود کو نہیں روک پاتا کہ گودھرا اور گودھرا کے بعد تشدد قابلِ نفرت، قابلِ مذمت اور قابلِ افسوس ناک ہے۔ ایوان کے معزز ممبران کے ذریعہ ایوان میں ذکر کئے گئے گودھرا کے بعد کے واقعات قابل مذمت ہیں- چاہے وہ احمد آباد میں نرودا پٹیا اور گلبرگ سوسائٹی ہو یا بڑودہ بیسٹ بیکری، مہسانہ میں سردا پورہ کا واقعہ ہو یا کوئی اور بھی، سبھی قابلِ مذمت ہیں۔ گودھرا واقعہ واضح کر سکتا ہے کہ اس کے بعد کیا ہوا ہوگا لیکن گودھرا، نرودا پٹیا یا مہسانہ یا کسی دیگر جگہ میں ہونے والی مارکاٹ کو صحیح نہیں کہا جاسکتا۔ میں یہاں تک کہنا چاہوں گا کہ قانون کے ذریعہ سماج میں جب ایک مجرم کا بدلہ بھی بہتر نہیں ہوسکتا تب بےقصور افراد سے انتقام کو صحیح کیسے قرار

دیا جاسکتا ہے؟ متاثرہ شخص ہندو ہو یا مسلم، مہذب سماج میں انتقام کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ اسے غیرانسانی سفاکیت ہی سمجھا جائے گا۔'

میں نے اپنی بات جاری رکھی' میں اعتراف کرتا ہوں کہ کہیں نہ کہیں انتظامیہ میں، پولس کے طریقہ کار وغیرہ میں کوئی کمی رہ گئی، لیکن اگر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ گودھرا کے بعد کے واقعات کے پیچھے خود حکومت کا ہاتھ تھا، جان بوجھ کر کیا گیا قتل عام تھا، ریاستی حکومت کے ذریعہ کی گئی کاروائی تھی اور اس قتل عام کے پیچھے سرکار تھی تو مجھے ڈر ہے کہ ایسے الزامات سے ہندوستان کے دشمنوں کو ہمارے ملک پر حملہ کرنے کے ہتھیار مل جائیں گے۔' اس کے بعد ہماری حکومت کے وزیر اور نیشنل کانفرنس کے لیڈر (تب یہ پارٹی این ڈی اے کی حلیف تھی) عمر عبداللہ کو اعلیٰ اور شاندار تقریر کے لئے مبارک باد دیتے ہوئے، میں نے ان کے ذریعہ کی گئی اپیل کی حمایت کی' ہمیں بحث میں ایک دوسرے سے بازی نہیں مارنی چاہئے بلکہ ہمیں ملک کو ایک سمت دینی چاہئے۔'

گجرات میں فرقہ وارانہ خون خرابہ کے دوران میں نے بے قصوروں کی جانیں بچانے کے لئے کئی بار مداخلت کی۔ میں یہاں ایسے 2 واقعات کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ ایک دن میرے پاس راجیہ سبھا کی اس وقت کی ڈپٹی چیئر پرسن نجمہ ہبیت اللہ کا فون آیا' میرے شوہر اکبر آپ سے احمد آباد کے کچھ مسلم تاجروں کے ایک انتہائی ضروری پیغام کے سلسلہ میں فوراً بات کرنا چاہتے ہیں۔' اکبر نے مجھے بتایا کہ بوہرا بازار کے تاجر میرے پاس آئے ہیں۔ وہ پڑوسی ہندو بستی کے مسلح لوگوں کے حملہ سے بچنے کے لئے حکومت کے کسی ذمہ دار شخص سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں نے فوراً وزیر اعلیٰ نریندر مودی کو فون کیا اور ضرورتمندوں کی حفاظت کیلئے ضروری قدم اٹھانے کے لئے کہا۔ مودی نے اگلے دن مجھے فون پر بتایا کہ کوئی واقعہ نہیں ہوا ہے اور فسادیوں کو گرفتار کرلیا گیا ہے۔ حالات بہتر ہونے کے بعد اکبر کے ساتھ بوہرا بازار کے تاجروں کا وفد مجھ سے ملنے دہلی آیا اور اس نے مرکزی و ریاستی حکومت کے ذریعہ بروقت کئے گئے اقدامات کے لئے شکریہ ادا کیا اور اس کاروائی کی ستائش کی۔

ایسا ہی ایک دوسرا واقعہ ہوا جب ایک دن کمیونسٹ پارٹی (مارکسوادی) کے تجربہ کار لیڈر اور سینئر رکن پارلیمنٹ سومناتھ چٹرجی جو لوک سبھا کے اسپیکر بھی ہیں، کا فون آیا۔' آڈوانی جی میں بہت ہی اہم مسئلہ پر آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔' انہوں نے ایسی آواز میں کہا تھا کہ میں نے فوراً ان کی تشویش اور ضرورت کو بھانپ لیا۔' سی پی آئی (ایم) کی بھاؤنگر یونٹ کے میرے ساتھیوں نے مجھے ابھی ابھی فون پر بتایا ہے کہ ہندوؤں کی بھیڑ نے ان کے قصبہ کے معروف و مشہور مدرسہ کی گھیرابندی کرلی ہے۔ وہ لوگ اسے آگ کے حوالے کرنا چاہتے ہیں۔ اس مدرسہ کے اندر بڑی تعداد میں پڑھنے والے بچے اور مدرس ہیں۔ برائے مہربانی آپ یہ سب روکنے کیلئے کچھ کریں۔' میں نے فوراً احمد آباد میں وزیر اعلیٰ نریندر مودی اور بھاؤنگر میں اپنی پارٹی کے لیڈروں سے بات کی اور انہیں ہدایت دی کہ اس معاملے کو روکنے کے لئے ضروری کاروائی کریں اور حالات پر قابو پایا جائے۔ میں نے یہ جان کر اطمینان کی سانس لی کہ کچھ ناخوشگوار نہیں ہوا۔ بعد میں بھاؤنگر میں دورہ کے وقت مقامی سی پی آئی (ایم) کے کارکنوں اور مولویوں نے مجھ سے بات کی اور شکریہ ادا کیا۔' ہم نے تو صرف اپنا فرض ادا کیا ہے۔' میں نے کہا۔

کچھ ماہ بعد خود سومناتھ چٹرجی نے ایک دن مجھے فون کیا اور کہا' آڈوانی جی میں احمد آباد سے بول رہا ہوں۔ بھاؤنگر میں میرے ساتھی بھی یہاں پر ہیں اور مجھے بتا رہے ہیں کہ'' ہم حقیقت میں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتے ہیں۔ اگر آپ وقت پر مداخلت نہیں کرتے تو مدرسہ کے اندر کئی لوگ جل کر مر جاتے۔'' میں نے انہیں بتایا کہ' میرے تئیں شکریہ کیوں ادا کر رہے ہیں؟ اس کیلئے آڈوانی جی شکریہ کے حقدار ہیں۔'

میں فخریہ انداز میں یہ نہیں بتا رہا ہوں بلکہ انکساری کے ساتھ ان واقعات کا ذکر کر رہا ہوں۔ جب بھی میں بے خیالی میں اپنے فرائض کے بارے میں سوچتا ہوں تو یہ محسوس کر کے مجھے افسوس ہوتا ہے کہ پرامن ہندوستان کے آدرش کے تئیں ہماری حکومت کے وعدوں کے باوجود

سیکڑوں بے قصور لوگوں کی جانیں فرقہ وارانہ تشدد کی بھینٹ چڑھ گئیں۔ اس کا اس بات سے تعلق نہیں ہے کہ وہ ہندو یا مسلمان تھے، وہ سبھی صرف ہندوستانی تھے۔

اس کے برعکس میں غیر جانبدار لوگوں کی توجہ 1984 میں اندرا گاندھی کے قتل کے بعد دہلی اور شمالی ہندوستان کے دیگر مقامات پر بھڑکے سکھ مخالف فسادات کی جانب دلانا چاہتا ہوں تاکہ اوپر دی گئی تفصیلات اور ان واقعات کا موازنہ کیا جاسکے۔ پہلے تین دنوں میں دہلی کی سڑکوں پر کوئی پولس کا سپاہی یا فوجی نظر نہیں آرہا تھا۔ اس دوران لاٹھی چارج کی ایک بھی مثال نہیں ملتی۔ یہی نہیں بلکہ جب صدر جمہوریہ گیانی ذیل سنگھ اسپتال گئے تھے جہاں پر وزیر اعظم کی لاش رکھی تھی تب ان کے قافلے پر خشت باری کی گئی تھی۔ حالانکہ اس وقت کے وزیر داخلہ پی وی نرسمہا راؤ سے خصوصی، ضروری اور ذاتی درخواست کرنے کے باوجود 3 رنومبر کی شام فوج کو تعینات کیا گیا۔ اپنی ماں کے جنم دن پر وزیر اعظم راجیو گاندھی نے کہا 'اندرا گاندھی کے قتل کے بعد ملک میں کچھ فساد ہوئے تھے۔ ہم جانتے ہیں کہ لوگ بہت زیادہ مشتعل تھے اور کچھ دنوں تک ایسا لگ رہا تھا کہ پورا ہندوستان جل گیا ہے۔ لیکن جب کوئی بڑا درخت گرتا ہے تو زمین کا تھوڑا بہت ہلنا فطری ہے۔'★

1984 کے افسوس ناک واقعہ پر اظہار افسوس کرنے میں سونیا گاندھی کو 14 سال لگ گئے۔

میں غیر جانبدار اور جانبدار لوگوں کو بتانا چاہوں گا کہ وہ 2002 میں مرکز اور ریاستی حکومتوں کا رویہ نئی دہلی اور گاندھی نگر میں کانگریس حکومتوں اور گجرات میں فرقہ وارانہ تشدد سے قبل لاتعداد مثالوں سے کریں۔ اس ریاست میں فرقہ وارانہ فسادات کی لمبی تاریخ رہی ہے۔ 1969 میں احمد آباد میں ہونے والے فساد 2002 کے مقابلہ زیادہ دن تک ہوتے رہے، جس میں زیادہ لوگوں کی موت ہوئیں۔ تقریباً 2 ماہ تک اس شہر میں کرفیو لگا رہا۔ 1985 میں 5 ماہ سے بھی زیادہ عرصہ تک ریاست کے متعدد مقامات میں فرقہ وارانہ فسادات ہوتے رہے جبکہ گودھرا میں تقریباً ایک سال تک کرفیو لگا رہا۔

ستمبر 2004 میں یو پی اے حکومت نے، خاص طور سے لالو پرساد یادو کی صدارت میں وزارت ریلوے نے- گودھرا ٹرین آتشزدگی کی جانچ کے لئے یوسی بنرجی کمیٹی تشکیل دی۔ حقیقتاً جیسا کہ بعد میں گجرات ہائی کورٹ نے فیصلہ دیا تھا، اس کمیٹی کی تشکیل غیر آئینی تھی۔ یہ کمیشنز آف انکوائری ایکٹ 1952 کی خلاف ورزی تھی، جس میں عوامی نظریہ سے اہم باتوں کی تفتیش کیلئے ریاستی اور مرکزی حکومت کے ذریعہ علیحدہ کمیشن کی تشکیل پر روک لگائی گئی ہے۔ ریاستی حکومت کے ذریعہ بنائی گئی شاہ- ناناوتی کمیشن پہلے ہی گودھرا اور گودھرا کے بعد کا تشدد، دونوں معاملوں میں تحقیقات کررہی تھی۔ اکتوبر 2005 میں جب راشٹریہ جنتا دل بہار میں اسمبلی انتخابات میں شکست کے دہانے پر پہنچ گئی تب بنرجی کمیٹی نے یہ رپورٹ دی کہ گودھرا واقعہ محض ایک 'غیر فطری' واقعہ تھا۔ بی جے پی کے کچھ ناقدین نے یہاں تک کہا کہ ریل گاڑی میں جھلسے کارسیوک خود ہی اس

★ منوج مٹا اور ایچ ایس پھولکا 'وہین اے ٹری شک دہلی: دی 1984 کارنیج اینڈ اِٹس آفٹر میتھ، لوٹس' 2007- اس کتاب میں مئی 2000 میں جسٹس جی ٹی ناناوتی کمیشن کی تشکیل میں میرے کردار کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کمیشن کی تشکیل کا مقصد 1984 کے دنگوں کی دوبارہ جانچ کرنا تھا۔ فروری 2005 میں اس کمیشن نے رپورٹ پیش کی لیکن یو پی اے حکومت کے ذریعہ تیار کی گئی کاروائی رپورٹ (اے ٹی آر) کی تمام شعبوں میں زبردست مخالفت ہوئی اور اسے 'نہ کی گئی کاروائی رپورٹ' تک کہا گیا۔ اس کتاب میں دوبارہ میرے کام کا ذکر ہے۔ ساتھ ہی دیگر غیر کانگریسی پارٹیوں کے لیڈروں کا بھی جنہوں نے حکومت کو مجبور کیا کہ اے ٹی آر کا جائزہ لیا جائے اور فسادات میں ملوث کم سے کم ایک مرکزی وزیر کو استعفیٰ دینے کے لئے کہا جائے اور وزیر اعظم ڈاکٹر منموہن سنگھ سکھ فرقہ سے معافی مانگیں۔

آگ کے لئے ذمہ دار تھے تاکہ ریاست میں گودھرا کا نام لے کر اس واقعہ سے فائدہ اٹھایا جا سکے۔ اس کے بارے میں یہی کہنا چاہتا ہوں کہ یہ تمام باتیں اس واقعہ کی طرح ہی انتہائی سفاک اور بہیمانہ ہیں۔

نریندر مودی: منصوبہ بند منفی مہم کے شکار

اکثر یہ کہہ کر میری تنقید کی جاتی رہی ہے کہ میں نے مودی کے استعفیٰ کا مطالبہ سختی کے ساتھ مسترد کر دیا۔ گجرات میں فرقہ وارانہ فسادات پھیلنے کے کچھ ہی دنوں میں یہ مطالبہ کیا جانے لگا اور اس کے بعد کئی مہینوں اور سالوں تک یہ مطالبہ جاری رہا۔ این ڈی اے کی کچھ حلیف پارٹیاں بھی چاہتی تھیں کہ مودی استعفیٰ دے دیں۔ وزیر اعظم واجپائی پر بھی مختلف حلقوں سے مسلسل دباؤ پڑ رہا تھا کہ وہ مودی سے استعفیٰ کا مطالبہ کریں۔ میں نے اس مطالبہ کی یہاں تک کہ بہت زیادہ حساس ترین مواقع پر بھی مخالفت کی تھی۔

اس بارے میں میں نے اپنی وضاحت 6 مئی 2002 کو راجیہ سبھا میں تفصیل کے ساتھ پیش کی تھی 'ہمیں اس ریاست کے حالات کو بہتر کرنے کیلئے کوئی صحیح حل ڈھونڈ نکالنا ہے—اور وزیر اعلیٰ مودی کو عہدے سے ہٹانا کوئی حل نہیں ہے۔ ان کے خلاف مسلسل منفی تشہیری مہم چلائی جا رہی ہے جو صحیح نہیں ہے۔ حزب اختلاف کے لیڈر کے ناطے ڈاکٹر منموہن سنگھ کے ذریعہ لگایا گیا یہ الزام مناسب نہیں ہے کہ اعلیٰ سطح پر گجرات پولس فرقہ پرست ہو رہی ہے۔ ہر شخص سے میری درخواست ہے کہ پولس فورس پر ایسے سنگین الزام نہ لگائیں۔ کچھ خامیاں ہیں اور میں ان سے واقف ہوں لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ فساد کے دوران پولس فورس نے بہت بڑی تعداد میں مسلمانوں کی جانیں بچائی ہیں'۔

میں نے پارٹی کے اندر مختلف مواقع پر نریندر مودی کے استعفیٰ کے مطالبہ کی بھی مخالفت کی۔ ہمیں اس بات کی خوشی ہے کہ بعد کے واقعہ نے میرے یقین کو مکمل طور سے صحیح ثابت کیا ہے۔ 07-2002 میں ان کی وزارت کے دوران گجرات میں نہ تو ایک بھی فرقہ وارانہ فساد ہوا نہ ہی دہشت گردی کا کوئی واقعہ اور نہ ہی ان 5 برسوں میں کہیں پر بھی ایک گھنٹہ کیلئے کرفیو لگانا پڑا۔ اس دوران گجرات میں مختلف معاشی اور سماجی شعبوں میں قابل ستائش پیش رفت ہوئی جس کی وجہ سے ملک و بیرون ملک سے یہاں کثیر مقدار میں سرمایہ کاری کی گئی اور گجرات ملک کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ ریاست کی شکل میں جانا جانے لگا۔ لیکن جس بات سے مجھے سب سے زیادہ اطمینان ہوا وہ یہ تھا کہ مودی نے سیاسی اور نوکر شاہی میں پھیلی بدعنوانی پر قابو پانے میں کامیابی حاصل کی، جس سے ان کے حریف بھی ان کی ستائش کئے بغیر نہیں رہتے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ گجرات میں سبھی قبائل اور فرقوں کے لوگوں تک تحفظ، ترقی اور شفاف انتظامیہ کے تئیں وعدے کا فائدہ پہنچا ہے۔

اس کی ایک مثال نئی رائے عامہ ہے، جس کی وجہ سے 2007 میں گجرات اسمبلی انتخابات میں بی جے پی کو زبردست کامیابی حاصل ہوئی۔ کانگریس اور نام نہاد سیکولرازم کے حامی ان انتخابات کو 'فرقہ وارانہ عقائد سیکولرازم' کے سلسلے میں قومی استصواب رائے میں تبدیل کرنا چاہتے تھے۔ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ اپنے ارادوں میں بری طرح ناکام رہے۔ اس سے بھی زیادہ برا یہ ہوا کہ ایمانداری سے احتساب کرنے اور اپنی اس شکست سے کوئی بہتر نتیجہ بھی اخذ نہیں کرنا چاہتے۔

مودی کے دوبارہ منتخب ہونے سے کئی باتیں اجاگر ہوتی ہیں جو صرف گجرات ہی نہیں بلکہ پورے ملک کیلئے اہمیت کی حامل ہیں۔ انہوں نے روایتی سوچ کو غلط ثابت کیا کہ آزادی کو اعلیٰ سیاست کے آئینہ میں نہیں دیکھا جا سکتا۔ انہوں نے اس سوچ کو مسترد کر دیا کہ ترقی کے ایشو پر انتخاب نہیں جیتا جا سکتا۔ گجرات میں بی جے پی نے اس بات کو غلط ثابت کر دیا ہے کہ لوگوں کی ذات اور فرقہ وارانہ جذبات کو کیش کرا کر انتخاب

جیتے جاسکتے ہیں۔ اس کے علاوہ سی پی آئی (ایم) کے دورۂ حکومت میں مغربی بنگال کے برعکس گجرات میں بی جے پی نے یہ دکھا دیا کہ انتخاب میں غلط ہتھکنڈے کا سہارا لئے بغیر بھی نئی عوامی رائے حاصل کی جاسکتی ہے۔

میں ایک دوسری وجہ سے گجرات انتخابات کے نتائج کو اہم مانتا ہوں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ کس طرح سے ایک مخلص، حوصلہ منداور اہل لیڈر لوگوں کی حمایت سے منفی مہم کو شکست دے سکتا ہے۔ میں نے گزشتہ 60 سال کے دوران ہندوستانی سیاست میں ایسا کوئی لیڈر نہیں دیکھا جسے قومی اور بین الاقوامی دونوں سطحوں پر مسلسل نفرت انگیز اور غیر ضروری طریقہ سے بدنام کیا گیا ہو، جتنا مودی کو 2002 سے۔ سونیا گاندھی نے تو تمام اقدار بالائے طاق رکھ کر انہیں 'موت کا سوداگر' تک کہہ دیا۔ مجھے خوشی ہے کہ گجرات کے لوگوں نے ایسی زہریلی سیاست کرنے والوں کو بہتر جواب دیا۔

ہمارے ملک میں مختلف ریاستوں میں اسمبلی انتخابات ہوتے رہتے ہیں لیکن قومی سیاست میں کسی مخصوص ریاست میں عوام کا فیصلہ 'فیصلہ کن نکتہ' بہت کم ہی بنتا ہے۔ مجھے ذرا سا بھی شبہ نہیں ہے کہ گجرات میں ہماری پارٹی کی کامیابی حقیقت میں ایک فیصلہ کن نکتہ بنے گی کیونکہ اس سے اشارہ ملتا ہے کہ آئندہ پارلیمانی انتخاب میں بی جے پی دوبارہ ترقی کرے گی اور اسے کامیابی حاصل ہوگی۔

13

انتخابات میں شکست، پارٹی میں کھلبلی

دکھائی دینے والی سبھی ناکامیوں میں کچھ نہ کچھ بہتر ہوتاہے۔ آپ اسے ابھی نہیں دیکھ سکتے۔ یہ وقت بتائے گا۔ صبر کریں۔ اپنی گزشتہ غلطیوں اور ناکامیوں سے پریشان نہ ہوں، کیونکہ یہ آپ کے دل کو دکھ اور ناامیدیوں سے بھر دیں گی۔ انہیں مستقبل میں نہ دہرائیں۔

– سوامی شوآنند (1887-1963)، ڈوائن لائیو سوسائٹی کے بانی

کب اور کن حالات میں کوئی برسر اقتدار حکومت لوک سبھا تحلیل کرنے کی سفارش کرتے ہوئے ازسر نو انتخاب کرانے کا فیصلہ لیتی ہے؟ 1971 میں اندرا گاندھی قبل از وقت پارلیمانی انتخاب کرانا چاہتی تھیں تاکہ 'غریبی ہٹاؤ' کے نعرے کے بل پر انتخاب میں جیت حاصل کی جاسکے۔ 1984 میں راجیو گاندھی نے کئی مہینے قبل لوک سبھا انتخاب کرائے۔ انہوں نے حساب لگا کر اپنی ماں کے قتل کے بعد لوگوں کے دلوں میں پیدا ہونے والی ہمدردی کا فائدہ حاصل کرنے کیلئے یہ منصوبہ تیار کیا۔ اس کے برعکس 1979، 1991، 1998 اور 1999 میں وسط مدتی انتخابات واضح طور سے سیاسی غیر یقینی کے نتیجے تھے۔ یہ برسر اقتدار لوگوں کی وجہ سے نہیں بلکہ نہ چاہنے کے باوجود ہوئے۔ اس وقت کی حکومت اپنی اکثریت کھو چکی تھی اور اس کی دیگر حکومت متبادل کی جگہ نہیں لے سکتی تھی۔

بی جے پی نے لوک سبھا انتخابات وقت سے پہلے کیوں کرائے؟

صرف اقتدار میں واپسی کا بھروسہ رکھنے والی پارٹی ہی وقت سے قبل انتخاب کرانے کا فیصلہ لیتی ہے، جب اس کے حساب سے حالات بہتر دکھائی دیتے ہیں۔ دسمبر-اکتوبر 2003 میں جب واجپائی حکومت اپنے 5 سال کے آخری سال میں داخل ہوئی تب بی جے پی کو یقینی طور سے حالات انتہائی حوصلہ مند دکھائی دیئے۔ وزیر اعظم کی مقبولیت اس وقت عروج پر تھی۔ معیشت کا گراف عروج پر جا رہا تھا۔ پہلی بار تیزی سے غیر ملکی کرنسی کا ذخیرہ 100 ارب ڈالر پار کر چکا تھا، جب کہ 1990 میں غیر ملکی کرنسی کا ذخیرہ اتنا کم تھا کہ ادائیگی کا توازن بحران سے دوچار

ہونے پر ہندوستان کو اپنا سونا گروی رکھنا پڑا تھا۔ ایک اور قومی حصولیابی ہندوستان کو 2003 کی دوسری سہ ماہی میں جی ڈی پی میں اضافہ 8.4 فیصد درج کیا گیا۔ پارلیمنٹ کے مانسون سیشن میں عدم اعتماد تحریک پیش کرتے وقت اپنی تقریر میں این ڈی اے حکومت کی اکنومک پالیسیوں پر سونیا گاندھی کا طنز غلط ثابت ہوا، جس میں انہوں نے حکومت کے 8 فیصد جی ڈی پی اضافہ کی شرح کو شیخ چلی کے حسین خواب' کہہ کر مذاق اڑایا تھا۔

ماضی میں لئے گئے حوصلہ مندانہ فیصلوں اور پہلے لئے گئے جائزوں مثلاً ملک گیر عالمی سطح کی قومی شاہراہ کی تعمیر کے بہتر نتائج سامنے آنے لگے تھے۔ 1999 میں حوصلہ مندانہ پالیسی میں اصلاح کی وجہ سے انفارمیشن ٹکنالوجی میں انقلاب آیا۔ اس سیکٹر میں شاندار ترقی کی وجہ سے 'سافٹ ویئر سپر پاور' کی شکل میں ہندوستان کا استقبال کیا گیا۔

1999 سے 2003 تک کی مدت میں سب سے بڑی اپوزیشن پارٹی زیادہ پرجوش نظر نہیں آئی۔ حقیقت میں بی جے پی نے ان 3 بڑی ریاستوں میں اکتوبر 2003 کے اسمبلی انتخابات میں شاندار کامیابی حاصل کی تھی جہاں کانگریس کی سرکاریں تھیں۔ مدھیہ پردیش، چھتیس گڑھ اور راجستھان۔ ان ریاستوں میں حاصل ہوئی کامیابی نے ستمبر 2004 میں ہونے والے چودھویں لوک سبھا انتخابات قبل از وقت کرانے کی خود اعتمادی پیدا کی۔ میڈیا کی رپورٹوں اور 'اوپینین پولز' نے اس اعتماد کو مزید تقویت دی کہ اگر 2004 میں انتخاب ہوتے ہیں تو بی جے پی کے زیر قیادت این ڈی اے آسانی سے انتخاب جیت جائے گی۔

اس وقت تک ایک دوسری پریشانی بھی پیدا ہوگئی تھی۔ این چندرا بابو نائیڈو کی قیادت میں آندھرا پردیش میں تیلگو دیشم پارٹی نے 1998 میں این ڈی اے حکومت کو باہر سے حمایت دی تھی۔ 1999 میں آندھرا پردیش سمیت ملک بھر میں واجپائی کی لہر کو دیکھتے ہوئے نائیڈو رسمی طور سے ایک ساتھ ہونے والے لوک سبھا اور اسمبلی انتخابات کیلئے بی جے پی کے ساتھ انتخابی اتحاد میں شامل ہوگئے۔ دوسری بار دورِ حکومت کے آخر میں ان کی حکومت کی مقبولیت کم ہوتی جارہی تھی، اسلئے نائیڈو دوبارہ لوک سبھا اور اسمبلی مدت کے خاتمے سے قبل ایک ساتھ انتخاب کرا کر واجپائی کی مقبولیت کا فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ اس طرح اہم معاون پارٹیوں کی پسند کو دھیان میں رکھ کر بھی این ڈی اے نے ستمبر۔ اکتوبر کی بجائے اپریل۔ مئی 2004 میں یعنی تقریباً 5 ماہ قبل انتخابات کرانے کا فیصلہ لیا۔

جب شمالی ہندوستان کی 3 ریاستوں میں بی جے پی کی کامیابی کے بعد وقت سے قبل لوک سبھا انتخابات کے بارے میں بحث ہوئی تب اٹل جی ان لوگوں میں سے تھے جو شروع میں پرجوش نہیں تھے۔ میں واضح طور سے اس رائے کا حامی تھا اور ایم ونکیا نائیڈو بھی جو اس وقت پارٹی کے صدر تھے اور پارٹی کے دیگر سینئر لیڈر بھی یہاں تک کہ این ڈی اے کی معاون پارٹیوں نے بھی اس بات پر مہر ثبت کی۔ اس طرح جب بیشتر لوگ وقت سے پہلے لوک سبھا انتخابات کرانے کے حق میں دکھائی دیئے تو اٹل جی نے اس بارے میں اپنی رضامندی دے دی۔ پھر بھی میں ہمیشہ محسوس کرتا رہا کہ اٹل جی نے دل سے رضامندی کا اظہار نہیں کیا تھا۔

اس سلسلے میں رسمی فیصلہ 12-11 / جنوری 2004 کو حیدرآباد میں بی جے پی کی قومی مجلس عاملہ کی میٹنگ میں لیا گیا۔ وزیراعظم کی سفارش پر صدر جمہوریہ ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام نے 6 / فروری کو تیرھویں لوک سبھا ختم کردی۔ اس کے بعد الیکشن کمیشن نے 20 / اپریل اور 10 / مئی کے درمیان چودھویں لوک سبھا کیلئے 4 مرحلوں میں ووٹنگ کا اعلان کردیا۔ جہاں تک بی جے پی اور این ڈی اے کا تعلق ہے تو 2 ایشوز کو یقینی بنانے کی ضرورت تھی۔ وہ ایجنڈا جس پر نئی عوامی رائے حاصل کرنی تھی اور انتخابی مہم کی شکل۔ پہلے سوال کا جواب آسانی سے دیا جاسکتا تھا۔

اٹل جی کی مصدقہ قیادت کی طاقت-عوام ان کی تعریف کرتی تھی اور انہیں دور اندیش لیڈر کی شکل میں دیکھتی تھی جنہوں نے نہ صرف ملک کو بہتر قیادت فراہم کی بلکہ ترقی کے شاہراہ پر آگے بڑھایا اور عالمی سطح پر ملک کا وقار بڑھایا۔ اس لئے این ڈی اے ہندوستان کے لئے اٹل جی کی مسلسل قیادت پر عوامی رائے چاہتی تھی۔ یہ بھی فیصلہ لیا گیا کہ این ڈی اے کی تمام حلیف پارٹیوں کا ایک مشترکہ انتخابی منشور جاری ہوگا، پھر بھی بی جے پی اپنا الگ ویژن دستاویز تیار کرے گی تاکہ مختلف ایشوز سے متعلق پارٹی لوگوں کے سامنے اپنا موقف پیش کر سکے۔ ارون جیٹلی اس کمیٹی کے صدر تھے جس نے یہ دستاویز تیار کیا۔ آنجہانی پرمود مہاجن انتخابی انتظامات کے انچارج تھے۔

میری 'انڈیا شائننگ' یاترا

انتخابی مہم سے متعلق دوسرے سوال کے جواب میں اس اہم عنصر کو دھیان میں رکھنا ہوگا-2002 میں اٹل جی کے گھٹنے میں 2 آپریشن ہو چکے تھے، اس لئے وہ بہت کم دورہ کر سکتے تھے۔ اس لئے مہم کی ذمہ داری مجھے اپنے کندھوں پر اٹھانی پڑی۔ میرے ساتھیوں نے مشورہ دیا کہ میری مہم ملک گیر دورہ کی شکل میں سڑک کے راستے سے ہونی چاہئے۔ میں نے یہ مشورہ فوراً قبول کر لیا جو 'بھارت اُدے یاترا' کی شکل میں ہوا۔ اس میں 2 مرحلوں میں 8500 کلومیٹر کا فاصلہ 33 دنوں میں طے کرنا تھا اور 16 ریاستوں میں 121 لوک سبھا انتخابی حلقوں کو کور کرنا تھا۔ 10 ر مارچ کو کنیا کماری سے جھنڈا دکھا کر یہ یاترا شروع ہوئی اور 25 ر مارچ کو ہم امرتسر پہنچ گئے۔ 5 دن بعد راجکوٹ سے یہ دورہ دوبارہ شروع ہوا اور 14 ر اپریل کو ہم جگناتھ پوری پہنچے۔ یہ میرا تیسرا اہم دورہ تھا لیکن واضح طور سے انتخابات سے متعلق پہلا۔ ایک بار مجھے پھر بہت زیادہ طمینان ہوا اور گزشتہ یاتراؤں کے تجربات سے میری سوچ کو طاقت ملی کہ خاص عوامی رابطہ پروگرام میں سیاسی لیڈر کیلئے سڑک یاترا سے بڑھ کر کوئی دوسرا متبادل نہیں ہے۔ میں لوگوں سے بات کر سکا، ان سے ملاقات اور جذباتی تعلقات قائم کر سکا جو جمہوریت کی روح ہے۔

'بھارت ادے یاترا' کے تئیں عوام کا ردعمل تقریباً یکساں طور سے مثبت تھا۔ میں نے سیکڑوں میٹنگوں سے خطاب کیا اور انتخابات سے متعلق مختلف موضوعات پر اپنے خیالات پیش کئے۔ پھر بھی میری سبھی تقریروں کا موضوع ایک ہی تھا-'یہ انتخاب اس بات کیلئے ہے کہ ہندوستان کی قیادت کون کرے اور کس نظریہ سے کرے۔ دونوں سطحوں پر کانگریس کے پاس ملک کو دینے کیلئے کچھ بھی نہیں ہے۔ اس کے برعکس اٹل بہاری واجپائی نے قیادت اور سوچ وفکر دونوں کو ہی ایک سمت دیا ہے۔ انہوں نے یہ ثابت بھی کیا ہے کہ ہندوستان کو مستقل حکومت اور اہل قیادت کیلئے نہرو-گاندھی نسل پر منحصر رہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہماری حکومت نے گزشتہ 6 سال میں متعدد کام کئے ہیں اور ہمارے کام کے نتائج عوام کے سامنے ہے۔ لیکن ابھی بھی نامکمل کاموں کی طویل فہرست ہے۔ انہیں مختصراً ایک ہی نعرے میں سمیٹا جا سکتا ہے-'2020 تک ہندوستان کو ترقی یافتہ ملک بنانا ہے۔' اس نعرے کا مطلب ہے-بہتر حکومت، استحکام اور اٹل جی کی قیادت۔

میڈیا نے این ڈی اے کی کامیابی کی پیشین گوئی کرنا جاری رکھا اور تقریباً ہر انتخاب سے قبل عوامی رائے بھی یہی بتاتی رہی۔ پھر بھی کچھ اہم سیاسی واقعات کا انتخابی نتائج پر اثر پڑا، جنہیں ہم بروقت سمجھ نہیں پائے۔ پہلا این ڈی اے کے کچھ اہم حلیف ساتھ چھوڑنے لگے۔ جنوری 2004 میں کانگریس میں شامل ہونے کیلئے ڈی ایم کے اور تامل ناڈو کی کچھ چھوٹی پارٹیوں نے ہمارا اتحاد چھوڑ دیا۔ اس سے پہلے جموں وکشمیر میں نیشنل کانفرنس کے ساتھ ساتھ لوک جن شکتی پارٹی کے رام ولاس پاسوان نے بھی این ڈی اے کو خیر باد کہہ دیا۔ اس سے یہ سوچ بن گئی کہ این ڈی اے پہلے جیسی مضبوط نہیں رہی۔

دوسری جانب کانگریس نے مہاراشٹر (راشٹروادی کانگریس پارٹی)، آندھرا پردیش (تلنگانہ راشٹریہ سمیتی) اور جھارکھنڈ (جھارکھنڈ مکتی مورچہ) جیسی مختلف ریاستوں میں اہم اور بہتر اتحاد (تامل ناڈو سمیت) بنانے میں ذرا سا بھی وقت نہیں گنوایا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اتحاد میں شامل ہونے کی یہ حکمت عملی کانگریس کے پہلے سے لئے گئے اس فیصلے کے برعکس تھی جب ستمبر 1998 میں پچمڑھی میں ہونے والی میٹنگ میں فیصلہ لیا گیا تھا کہ کانگریس دیگر پارٹیوں سے ہاتھ ملائے بغیر اقتدار میں واپس لوٹنے کی کوشش کرے گی۔

شکست، سکتہ میں این ڈی اے

13 رمئی کو ووٹوں کی گنتی شروع ہوئی تھی۔ پہلے کاغذ کے ووٹ ہونے کی وجہ سے ووٹوں کی گنتی میں کئی گھنٹے لگ جاتے تھے تب کہیں جا کر نتائج کے اعلان ہوتے تھے۔ اس کے برعکس ملک بھر میں الیکٹرانک مشینوں کے استعمال سے یہ ممکن ہوگیا کہ ووٹوں کی گنتی کا عمل شروع ہونے کے کچھ گھنٹوں کے اندر ہی ابتدائی رجحان کا پتہ چل جاتا ہے۔ میں گھر میں ٹی وی دیکھ رہا تھا اور صبح 10 بجے تک یہ واضح ہوگیا تھا کہ سکتہ کردینے والی شکست یقینی ہے۔

عوام نے معلق پارلیمنٹ کے لئے ووٹ دیا جس میں کسی بھی ایک پارٹی یا ووٹنگ سے قبل کے اتحاد کو اکثریت نہیں ملی۔ کانگریس سب سے بڑی پارٹی کی شکل میں ابھری۔ اسے 145 سیٹیں ملیں (انہوں نے 400 سیٹوں پر انتخاب لڑا تھا)۔ بھارتیہ جنتا پارٹی کو صرف 138 سیٹیں ملی (ہم نے 364 سیٹوں پر انتخاب لڑا تھا)۔ بہرحال یہ واضح ہوگیا کہ دونوں پارٹیوں میں بہت کم فرق تھا۔ تاہم بی جے پی کو 1999 میں 182 سیٹیں ملی تھیں۔ این ڈی اے کی کارکردگی میں مزید گراوٹ آئی جہاں 1999 میں این ڈی اے کے پاس 304 سیٹیں تھیں وہیں 2004 میں یہ تعداد گھٹ کر 180 رہ گئی۔ اس کے برعکس کانگریس اور ووٹنگ سے قبل اتحاد کے ممبران پارلیمنٹ کی تعداد 216 تھی۔ اس کے علاوہ کانگریس کو مارکسوادی کمیونسٹ پارٹی اور 3 دیگر بائیں بازو کی پارٹیوں کے 62 ارکان پارلیمنٹ کی حمایت آسانی سے مل سکتی تھی۔ اسلئے یہ یقینی ہوگیا تھا کہ آئندہ سرکار کانگریس کی قیادت والی اتحاد کی ہوگی۔

وزیراعظم واجپائی نے دوپہر میں اپنا استعفیٰ دے دیا۔ شام کو انہوں نے قوم سے خطاب کیا اور تبصرہ کیا کہ 'گرچہ میری پارٹی اور حلیف پارٹیاں ہارگئی ہیں لیکن ہندوستان اور ہندوستانی جمہوریت کی جیت ہوئی ہے۔'

آئندہ کچھ دنوں میں نئی حکومت کا اتحاد وجود میں آیا۔ اس کا نام یو پی اے (یونائیٹڈ پروگریسو الائنس) رکھا گیا۔ لیکن نئے وزیراعظم کے انتخاب پر ڈرامہ ہوا۔ صدر جمہوریہ ڈاکٹر کلام نے کانگریس صدر سونیا گاندھی کو حکومت بنانے کیلئے مدعو کیا کیونکہ لوک سبھا میں وہ سب سے بڑی پارٹی کی صدر تھیں۔ اس کے علاوہ کانگریس نے ان کی قیادت میں انتخاب لڑا تھا۔ اگر پارٹی اپنے حلیفوں کے ساتھ مل کر اکثریت حاصل کر بھی لیتی ہے تو وزارت عظمیٰ کا عہدہ حاصل کرنے کیلئے دور دور تک کسی دوسرے لیڈر کا نام تک پیش نہیں کیا گیا تھا۔ لیکن جب وہ صدر سے ملنے کے بعد باہر آئیں تو انہوں نے میڈیا کو بتایا کہ انہیں حکومت بنانے کیلئے کچھ وقت چاہئے۔ کیا ان کا ذہن بدل گیا تھا؟ اگر ایسا ہے، تو کیوں؟ جب سونیا گاندھی 18 رمئی کو کانگریس پارلیمانی پارٹی کی میٹنگ میں تقریر کررہی تھیں تب انہوں نے خود ان سوالوں کا جواب دیا۔ انہوں نے یہ کہہ کر سبھی کو حیرت میں ڈال دیا کہ اپنے 'ضمیر' کی آواز پر وہ وزیراعظم کے عہدے سے اپنا نام واپس لے رہی ہیں اور اپنی جگہ انہوں نے وزیراعظم عہدہ کیلئے ڈاکٹر منموہن سنگھ کو منتخب کیا ہے۔

'میں نے کبھی بھی وزیر اعظم بننے کی خواہش نہیں کی' سونیا گاندھی نے اپنی تقریر میں یہ دعویٰ کیا جسے سبھی کانگریسی ایک ہی سُر میں سونیا گاندھی کے ذریعہ دی گئی عظیم قربانی★ ثابت کرنے لگے۔

بلاشبہ دو وجوہات سے یہ دعویٰ مشتبہ ہو جاتا ہے۔ پہلا 21/اپریل 1999 کو راشٹر پتی بھون کے لان میں ان کا یہ دعویٰ کہ 'وہ حکومت بنانے جا رہی ہیں اور ایسا کرنے کیلئے ان کے پاس 272 ممبران پارلیمنٹ کی حمایت ہے' سے مکمل تضاد پایا جاتا تھا۔ دوسرے، بعد کے واقعات سے واضح ہوتا ہے کہ اقتدار کی قربانی کے برعکس انہوں نے ڈاکٹر منموہن سنگھ کے ذریعہ اقتدار پر مزید کنٹرول★★ رکھنا شروع کر دیا، کیونکہ سیاست اور حکومت کے اقتدار کا مرکز وزیر اعظم کی سرکاری رہائش گاہ 7 ریس کورس کی جگہ کانگریس صدر کی رہائش گاہ 10 جن پتھ بن گیا۔

سونیا گاندھی نے مئی 2004 میں وزارت کا عہدہ کیوں چھوڑ دیا؟ یہ واضح ہے کہ وہی صحیح اور بہتر وضاحت دے کر شک دور کر سکتی ہیں۔ حالانکہ میں نے اس الزام کا جواب دیا کہ میری پارٹی میں ان کے خلاف 'نسلی اور ان کے غیر ملکی ہونے' کے خلاف مہم چلائی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ میری پارٹی کے کچھ حلیفوں نے ہندوستان کے وزیر اعظم کی شکل میں کسی غیر ملکی کے ذریعہ حلف لینے کے سلسلے میں سختی کے ساتھ ردعمل کا اظہار کیا تھا۔ لیکن میں اس کتاب میں پہلے ہی تفصیل کے ساتھ بتا چکا ہوں کہ بی جے پی کا اس مسئلے پر موقف کسی خاص شخص پر نہیں، بلکہ اصول پر مبنی تھا۔ ہم

★ سونیا گاندھی کی 'ضمیر کی آواز' تقریر کے بعد کانگریس پارٹی میں چاپلوسی عروج پر پہنچ گئی۔ 9/دسمبر 2004 کو 'دی ہندو' نے لکھا 'کل سونیا گاندھی کا جنم دن ہے۔ آج شام ان کی پارٹی کے ممبران نے انہیں مبارک باد دی۔ مئی میں ان کے ذریعہ وزیر اعظم کا عہدہ چھوڑنے کے موقع پر اس دن ''یوم قربانی'' کے طور پر منایا جائے گا۔ اس موقع پر 'سونیا گاندھی: سیاست کی مقدس گنگا' نامی کتاب کا تین مورتی بھون کے کانفرنس ہال میں اجراء ہوا۔' اس رپورٹ کے مطابق وزیر داخلہ شیوراج پاٹل نے ان کا موازنہ بھگوان رام، بھگوان بودھ اور مہاتما گاندھی سے کیا اور کہا 'محترمہ سونیا گاندھی میں ان 3 عظیم شخصیات کی شاندار اور بہترین روح موجود ہے۔ وہ صرف کانگریس پارٹی یا ہندوستان کی ہی نہیں بلکہ پوری انسانیت کی بیش قیمت اثاثہ ہیں۔'

★ جب یو پی اے حکومت نے سونیا گاندھی کو خاص طور سے تشکیل دی گئی قومی صلاح کار کونسل کی صدر نامزد کیا گیا تب اقتدار کی قربانی کے وقار کا خیال آیا اور وہ مزید مشتبہ ہو گئیں۔ گرچہ وہ غیر آئینی منچ سے اقتدار چلا رہی ہیں لیکن وہ پارلیمنٹ کے تئیں ذمہ داری کے دائرے سے باہر ہیں۔ بالآخر 2006 میں 'سود مند عہدہ' پر اٹھنے والے تنازع کی وجہ سے انہیں مذکورہ کونسل کی صدارت کے عہدے سے استعفیٰ دینا پڑا۔ کانگریس پارٹی نے مشہور فلم اداکارہ اور ہندوستانی سنیما کے سپر اسٹار امیتابھ بچن کی اہلیہ اور سماج وادی پارٹی کی رکن پارلیمنٹ جیہ بچن کو راجیہ سبھا کے لئے نااہل قرار دے دیا۔ یہ سب اس وضاحت یا دلیل پر کیا گیا کہ ممبر پارلیمنٹ (نااہل) ایکٹ 1959 کے تحت اتر پردیش نے جیہ بچن کا عہدہ 'سود مند عہدہ' ہے۔ انتقامی یا سزا دینے کی سیاست کا ایسا منفی اثر پڑا کہ بی جے پی اور باقی اپوزیشن پارٹیوں نے لوک سبھا سے سونیا گاندھی کو نااہل قرار دینے کا مطالبہ شروع کر دیا۔ کیونکہ قانون کے نظریہ سے قومی صلاح کار کونسل کے صدر کا عہدہ بھی 'سود مند عہدہ' ہے۔ جب یو پی اے حکومت نے پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کے درمیان نوٹیفکیشن لانے کی اس لئے کوشش کی تا کہ کانگریس صدر کو بچایا جا سکے۔ اس وقت بی جے پی نے سخت تنقید کی کہ اگر ایسا نوٹیفکیشن حقیقت میں پیش کیا جاتا ہے تو 'حکومت کو ہٹنا ہوگا'۔ بالآخر سونیا گاندھی کو لوک سبھا کی رکنیت سے استعفیٰ دینا پڑا اور دوبارہ انتخاب لڑنا پڑا۔ یہاں یہ قابل ذکر ہے کہ صدر ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام نے اس پورے واقعہ میں جو کردار ادا کیا اور اس مسئلے پر بل پارلیمنٹ کو واپس لوٹا دیا اور حکومت کو مجبور کیا کہ اسے یقینی بنانے کے لئے جوائنٹ پارلیمانی کمیٹی تشکیل دی جائے کہ 'سود مند عہدہ' کون سا ہوتا ہے۔ بلاشبہ جب دوسری بار صدر کے عہدے کے لئے ان کا نام شامل کیا گیا تب کانگریس نے سختی سے ان کے نام کی مخالفت کی۔ اس طرح ڈاکٹر کلام کو اپنے اس سخت رویے کی قیمت ادا کرنی پڑی۔

نے ہندوستان میں اعلیٰ آئینی عہدوں پر غیر ملکی نژاد کے ذریعہ قابض ہونے کی مخالف کی تھی اور کرتے رہے ہیں۔ اس اہم ایشو پر ہم نے اپنا نظریہ نہ تو مخفی رکھا اور نہ ہی اسے بدلا۔ اس کے باوجود میں تب حیران رہ گیا جب بین الاقوامی میڈیا کے ایک حصے نے یہ تبصرہ کیا کہ 'سونیا گاندھی کو وزیر اعظم کی شکل میں قبول نہ کرنا حقیقت میں ہندوستانی جمہوریت کی شکست ہے'۔ اس معاملے میں بی جے پی کی حب الوطنی کے نظریہ کو 'نسل ازم' کا نام دینا خود نسل پرست ذہنیت کو دھوکہ دینا ہے، جھٹلانا ہے۔

2004 کے انتخابات میں بی جے پی کی شکست کیوں ہوئی؟

2004 میں ہم پارلیمانی انتخاب کیوں ہارے؟ میں اعتراف کرتا ہوں کہ طویل عرصہ تک یہ سوال میرا اور میرے ساتھیوں کا تعاقب کرتا رہا۔ شرمناک شکست کا ذائقہ میرے لئے نیا نہیں تھا۔ حقیقتاً میری سیاسی زندگی کے بیشتر ابتدائی عشروں میں شکست عام بات تھی اور کامیابی شاذ و نادر۔ عام طور سے کسی کے تئیں ردعمل کا اظہار کرنے کی میری فطرت کی وجہ سے مجھے شکست کے وقت یہ تحریک ملی کہ انتخابات کے نتائج کے تئیں مفکرانہ رویہ اپنایا جانا چاہئے۔ 'فتح و شکست میں یکسانیت، شکست ملنے پر بدحواس نہیں، کامیابی ملنے پر زیادہ پرجوش نہیں'۔

اس کے باوجود ماضی میں کھائے زخم کے مقابلہ 2004 کے انتخابات کے نتائج کا گہرا اثر پڑا۔ اس کی کچھ وجہ غیر جانبدارانہ شکل میں جلد ہی واضح ہوگئی تھی اور 28 رمئی کو بی جے پی ہیڈکوارٹر میں انتخابات کے بعد منعقد پریس کانفرنس میں اس کا ذکر کیا گیا تھا۔ 'بھارتیہ جنتا پارٹی خندہ پیشانی سے عوام کا فیصلہ سر آنکھوں پر رکھتی ہے'۔ میں نے یہ تبصرہ کیا 'ہم پہلے ہی بتا چکے ہیں کہ ہم پارلیمنٹ میں مثبت اور جوابدہ اپوزیشن کا کردار ادا کریں گے۔ ہم نئے وزیر اعظم کو مبارکباد دیتے ہیں اور یہ یقین دہانی کراتے ہیں کہ قومی اور عوامی مفادات کے مطابق ان کی سبھی پالیسیوں اور کاروائیوں میں تعاون دیں گے۔ ساتھ ہی ہم کانگریس کی قیادت والی مخلوط حکومت سے امید کرتے ہیں کہ وہ عوام کے اس مختلف فیصلے کو کسی بھی اتحاد کیلئے فیصلہ کن عوامی رائے نہ مانیں۔ نہ تو کسی ایک پارٹی کیلئے - اور یقینی طور سے کسی شخص کے لئے تو ہرگز نہیں'۔

ہم یہ اعتراف کرتے ہیں کہ انتخابات کے نتائج ہماری امیدوں کے بالکل برعکس نکلے، حقیقتاً ہر شخص کی امید غلط نکلی، اس میں ہمارے مخالفین بھی شامل تھے۔ میں نے انتخابی شکست کے 4 وجوہات بتائے۔

- انتخابی نتائج میں کوئی ایک وجہ ملک گیر موضوع نہیں ہوتا۔ بلکہ مختلف ریاستوں میں مختلف وجوہات کا ووٹنگ پر اثر پڑتا ہے۔ اس لئے یہ قومی سطح پر دیا گیا فیصلہ نہیں ہے لیکن ریاستی گروپ کا فیصلہ ہے۔ 'ترقی اور بہتر حکومت' کے تئیں ہمارا وعدہ اور ہماری پرفارمنس کی بنیاد پر کئے گئے ہمارے وعدے کے بارے میں فیصلہ لینے کیلئے عوام سے ہماری اپیل ایسی ملک گیر جذباتی اپیل نہیں ہے، جس کا مقامی یا خصوصی واقعات سے متعلق وجوہات سے رائے دہندگان پر اثر پڑے۔ کرناٹک میں انہوں نے کام کیا اور بی جے پی نے 28 میں سے 18 سیٹیں جیت لیں۔ تاہم اتر پردیش جیسی اہم ریاست میں ایسا نہیں ہوا۔ ہمیں اس ریاست میں 80 میں سے محض 11 سیٹیں ملیں۔ اس کی وجہ پارٹی کی کمزوری رہی۔ بہار میں ذات وفرقہ کی ساز باز کا اثر رہا۔
- اتحاد کا انتظام یا کنٹرول میں ہماری ناکامی اور خامیاں بھاری پڑیں۔ آندھرا پردیش اور تامل ناڈو جیسی ریاستوں میں ہمیں حلیف پارٹیوں کے ساتھ بہت کچھ بھگتنا پڑا۔ تیلگو دیشم پارٹی کو آندھرا پردیش میں 32 کی جگہ 5 سیٹیں ملیں، تامل ناڈو میں بی جے پی نے عجلت میں فیصلہ لیا اور اے آئی اے ڈی ایم کے کے ساتھ مل کر انتخاب لڑا۔ ووٹر اس سے متاثر نہیں ہوئے۔ ڈی ایم کے اور اس کی

حلیف پارٹیوں نے ریاست میں سبھی 39 سیٹیں جیت لیں۔ جھارکھنڈ، ہریانہ، جموں وکشمیر اور آسام میں ہمیں پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ کیونکہ وہاں ہمارا اتحاد نہیں تھا۔ اس کے برعکس کانگریس پارٹی کو انتخابی کامیابی، خاص طور سے اتحاد کی پالیسی پر منحصر ہے۔

- ہمارے مخالفین کی منفی مہم ہماری مثبت مہم پر حاوی رہی۔ بلاشبہ ہندوستان نے این ڈی اے حکومت کے 6 سال کے اقتدار میں کئی شعبوں میں ترقی کی تھی لیکن پیچھے مڑکر دیکھیں تو صاف ہو جائے گا کہ ترقی کا فائدہ سماج کے سبھی طبقوں تک نہیں پہنچ پایا۔ اگر چہ یکساں ترقی ہمارا وعدہ تھا لیکن ہم غریبوں اور پسماندہ طبقات تک پہنچنے میں ناکام رہے۔ اس وعدے کو پورا کرنے کیلئے 5 سال کی مدت بہت کم تھی۔ دوسری جانب کانگریس اور بائیں بازو کی پارٹیاں منفی مہم چلاتی رہیں۔ وہ جھوٹ بولتے رہے۔ یہ دعویٰ کرتے رہے کہ حقیقت میں ہندوستان این ڈی اے حکومت کی قیادت میں تباہ ہو رہا ہے۔ ان کی اس منفی مہم کا موضوع اور لہجے سے پتہ چلتا تھا کہ کانگریس کے دور اقتدار میں ہندوستان میں غریبی اور بے روزگاری کا مسئلہ تھا ہی نہیں بلکہ یہ مسائل این ڈی اے حکومت کی پیدا کردہ ہیں۔
- 'فیل گڈ فیکٹر اور انڈیا شائننگ' جیسے نعروں سے ہمیں نقصان پہنچا۔ حالانکہ خاص حالات میں یہ اظہار قابلِ اعتراض نہیں ہے لیکن ہماری انتخابی مہم میں یہ صحیح نہیں تھا۔ حقیقت میں گزشتہ ایک سال میں 'فیل گڈ' کا ماحول تھا۔ 2004 کے انتخابات سے قبل ان وجوہات میں کئی باتیں تھیں- معاشی ترقی کی شرح میں اضافہ، مستحکم معاشی نظام، اچھے مانسون کی وجہ سے بہتر اجناس کی پیداوار، انفارمیشن ٹیکنالوجی جیسے سیکٹروں میں شاندار حصولیابی کیلئے ہندوستان کی ستائش، سرحد پار دہشت گردی کے واقعات میں بہت زیادہ گراوٹ، جموں وکشمیر اور شمال مشرق میں امید کے مطابق حالات میں تبدیلی، پاکستان کے ساتھ امن وتعاون کے نئے باب کھلنے کی امید وغیرہ۔ حالانکہ انتخابی مہم میں 'فیل گڈ' اور 'انڈیا شائننگ' جیسی لفظی شبیہ سے ہمارے سیاسی حریفوں کو ہندوستان کے حقیقی حالات دکھانے کا موقع مل گیا- غریبی اور کم ترقی، نوجوان طبقہ کے درمیان بے روزگاری، کسانوں کی پریشانیاں وغیرہ کی بنیاد پر ہمارے دعوے پر سوال کھڑے کئے گئے۔

اسی پریس کانفرنس میں میں نے بھارتیہ جنتا پارٹی کے کارکنوں اور حامیوں سے بھی درخواست کی کہ وہ ناامید نہ ہوں بلکہ ایمانداری سے خود احتساب کریں اور اصلاحی کاروائی کریں۔ 'بلاشبہ بی جے پی کا مستقبل تابناک ہے۔' میں نے کہا 'ہمیں نقصان پہنچا ہے لیکن اس کا اثر جزوقتی ہے۔ انتخاب کی تاریخ میں بی جے پی نے کئی نشیب وفراز دیکھے ہیں۔ سب سے بڑا دھکا 1984 میں پہنچا تھا جب پارٹی نے پورے ملک میں لوک سبھا میں محض 2 سیٹیں جیتی تھیں۔ ہم نے 1984 کے نتائج کو چیلنج کی شکل میں قبول کیا اور اس شکست کو بہتر مواقع میں بدل دیا۔ پورے ملک میں بہی خواہ کارکنوں کا ہمارا نیٹ ورک ہے جو سیاسی شعبہ میں اقتدار کی خاطر طاقت حاصل کرنے کے مقصد سے کام نہیں کر رہے ہیں اور نہ ہی ان کا محنتانہ اقتدار کیلئے دیا جاتا ہے۔ ان کی زندگی مادر وطن کی خدمت کیلئے جاری ہے۔ وہ شکست سے خوفزدہ نہیں ہوتے اور ہر چیلنج کا سامنا کرنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ بی جے پی کے کروڑوں کارکنوں اور حامیوں کی تحریک اور منظم طاقت اس بات کی ضمانت ہے کہ 'ہم واپس لوٹیں گے۔'

میں شکست کی وجوہات کا اور زیادہ تجزیہ کرتا رہا اور جون 2004 میں ممبئی میں منعقد پارٹی کی قومی مجلس عاملہ کی میٹنگ کے بعد میں نے اپنے خیالات پیش کئے۔ ایک افسوسناک وجہ یہ تھی کہ انتخابات کی دوڑ میں بی جے پی کے لیڈروں اور کارکنوں میں بہت زیادہ خوداعتمادی تھی۔ جس کی وجہ سے ہم نے حقائق کی سطح پر توجہ نہیں دی۔ ایک جانب ہم اپنی مقبولیت کے تئیں مطمئن ہو گئے اور دوسری جانب اپنے حریفوں کی حکمت

عملی کونظر انداز کردیا۔

رائے دہندگان، تنظیم اورنظریاتی حامیوں کے رابطے میں ہماری ناکامی

اس کے علاوہ میں نے انتخابات میں خراب نتائج کیلئے دودیگر وجوہات کی نشاندہی کی۔ ہرایک سیاسی پارٹی میں 3 طرح کے عناصر ہوتے ہیں- جغرافیائی (یا انتخابی) حلقہ، تنظیمی اورنظریاتی حلقہ۔ان تینوں کی مکمل طور سے پرورش کرنے کی ضرورت ہے۔ ہرایک منتخب نمائندہ کا جغرافیائی حلقہ انتخاب ہوتا ہے۔اپنے انتخابی حلقہ سے دوبارہ منتخب ہونے کے نظریہ سے کامیاب صرف پارلیمنٹ میں اس کے کام کرنے کے طریقے پرہی منحصر نہیں کرتا بلکہ ہندوستانی پس منظر میں اس بات پر بھی منحصر ہے کہ اس کے اپنے رائے دہندگان کے ساتھ تعلقات کیسے رہے۔ میں اپنی پارٹی اور دیگر پارٹیوں کے ممبران پارلیمنٹ کو جانتا ہوں، جنہوں نے ایک ہی حلقۂ انتخاب سے 4یا5 بار منتخب ہونے میں کامیابی حاصل کی۔ کیونکہ انہوں نے عوام کے ساتھ تال میل بنائے رکھا۔ مثلاً جے پور سے ہمارے ممبر پارلیمنٹ نے ایک شاندار کام کیا۔ جب ان کے حلقۂ انتخاب میں کسی شخص کی موت ہوتی تو وہ خوداور پارٹی کے ساتھی متوفی کی استھیاں مقدس گنگا میں بہانے کیلئے ہری دوار جاتے۔

ان ممبران پارلیمنٹ کے بارے میں اکثر اس شکایات کا سامنا کرنا پڑا ہے جو اس لئے انتخاب ہار گئے کیونکہ انہوں نے اپنے حلقۂ انتخاب کے لئے کوئی کام نہیں کیا یا وہ بدعنوانی میں ملوث تھے، حالانکہ نااہلیت اور بدعنوانی قانونی شکایتیں ہیں لیکن اس سے بھی زیادہ ووٹروں اور پارٹی کے کارکن منتخب نمائندوں کے طریقۂ کار سے ناراض تھے۔لوگوں کی ان تک پہنچ نہ ہونے، غیرحساس، تلخ رویہ اوراقتدار کے گھمنڈ کی وجہ سے بلاشبہ ایم پی یا وزیر کی مقبولیت ختم ہو جاتی ہے۔ اگر ایسے شخص کو دوبارہ انتخاب لڑنے کے لئے ٹکٹ دے دیا جاتا ہے تو اسے ہرانے کے لئے عوام اور پارٹی کے کارکن مل کر کام کرتے ہیں۔کئی بی جے پی کارکنان کے دل میں یہ بات تھی-'اٹل جی دوبارہ وزیراعظم بن ہی جائیں گے لیکن ان ممبران پارلیمنٹ کو سبق سکھانا ہوگا۔' حالیہ برسوں میں اس روایت کوانتخابی حلقہ کی سطح پر ممبران پارلیمنٹ کو دوبارہ امیدوار بنانے کے خلاف 'اینٹی ان کمبیسی' کی شکل میں جانا جاتا ہے۔ 2004 کے انتخابات میں یہ فیکٹر بی جے پی کے لئے بہت مہنگا ثابت ہوا۔حقیقت میں 90 نااہل ممبران پارلیمنٹ دوبارہ منتخب نہیں ہوئے جوان ممبران پارلیمنٹ کا 50 فیصد تھے۔ خود احتسابی کے وقت میں نے محسوس کیا کہ 'بھارت ادے یاترا' کے دوران طویل عرصہ تک دہلی سے میری غیر حاضری اور وہ بھی ایسے وقت پر جب صلاح ومشورہ کے بعد انتخابات سے متعلق متعدد فیصلے لئے جانے تھے، میری پارٹی کو کافی مہنگی پڑی۔ این ڈی اے کی جیت کے بارے میں زیادہ خوداعتمادی کی وجہ سے امیدواروں کے انتخاب میں عجلت میں غلط فیصلے لئے گئے تھے۔

دوسری وجہ پارٹی تنظیم پر ہم نے مکمل توجہ نہیں دی۔ کانگریس اور دیگر شخصی مرکزیت سیاسی پارٹیوں سے الگ پارٹی کارکن بی جے پی کی ریڑھ کی ہڈی ہیں۔ فعال، منظم اور پرجوش سیاسی کارکنان اکثر پارٹی کے حق میں انتخابی مہم کی جنگ میں فوجیوں کی اگلی بٹالین کی طرح ہوتے ہیں۔ ساتھ ہی جہاں پارٹی کارکن روٹھے رہتے ہیں یا پوری طرح سے متحرک نہیں ہوتے وہاں عوام کے سامنے حکومت کی مثبت شبیہ نہیں بن پاتی۔ اپنی مدت کار کے 6 برسوں میں، ہم نے پارٹی اور حکومت کے درمیان تال میل مشترکہ طور پر پائی گئی خامیوں کی وجہ سے کچھ حد تک اپنے کارکنوں کونظرانداز کیا۔ یقینی طور سے پورے ملک میں یہ حالات نہیں تھے لیکن متعدد ریاستوں میں ایسا ہی ہوا تھا۔ مختلف سطحوں پر پارٹی کارکنان یہ محسوس کرتے تھے کہ ہماری شکایتوں کو مکمل طور سے حل نہیں کیا جاتا ہے اور ایم پی اور وزیران سے دور ہو گئے ہیں۔

بی جے پی کی شکست کی دوسری وجہ اقتدار کے دوران اپنے نظریاتی حلقہ کونظر انداز کرنا رہا۔ بی جے پی کسی دوسری سیاسی پارٹی جیسی نہیں ہے بلکہ یہ ہندوستان کے تابناک قومی بیداری کے تئیں پرعزم افکار کا حصہ ہے۔ یہ بیداری لازمی طور سے غیرفرقہ وارانہ ہندوقوانین پر منحصر ہے۔ اس مقصد کی حصولیابی کیلئے سنگھ پریوار کی شکل میں موجوداوردوسری تنظیمیں بھی شامل تھیں یا سنگھ کے ذریعہ متحرک افکار کے جذبات بھی شامل تھے۔ این ڈی اے حکومت کے دوران بی جے پی نے مستقل مخلوط حکومت کا دھرم نبھاتے ہوئے اپنی معاون پارٹیوں کی تشویش پر مکمل توجہ دیتے ہوئے کام کیا۔ حقیقت میں اس سلسلے میں ہماری کامیابی کی وجہ بی جے پی نے اپنے روایتی معاونوں نے بیرونی لوگوں کے اعتماد سے قائم کیا۔ اس کے علاوہ کانگریس پارٹی کا یہ دعویٰ بھی کھوکھلا ثابت ہوا کہ صرف کانگریس پارٹی ہی مرکز میں اپنے دم پر سرکار بناسکتی ہے۔

پائیدار اور مخلوط سرکار چلانے کے ہدف کی حصولیابی کیلئے اپنے سیاسی حلیفوں کے ساتھ کام کرتے وقت ہم سنگھ برادری میں اپنی سوچ و افکار والی معاون تنظیموں کے خیالات اور تشویش پر مناسب دھیان نہیں دے پائے۔ ترقی اور حکومت کے ایشو ہم پر اتنے حاوی رہے کہ ہم ان لوگوں سے مکمل رابطہ نہیں بنا سکے، جو ہمارے افکار کے وجہ سے ہمیں تعاون دیتے ہیں اور ہمارے لئے کام کرتے ہیں۔ یعنی ہم اپنے بنیادی افکار کے بارے میں یہ مان کر چلتے رہے کہ یہ حلقہ ہمارے ساتھ ہی رہے گا۔ افکار ونظریات کے حلقہ میں آنے والے نشیب وفراز کے وقت وہ ہمارے ساتھ رہے۔ ایسا اس لئے ہوا، کیونکہ ایک جانب حکومت کے سینئر بی جے پی لیڈر اور دوسری جانب سنگھ سے متاثر مختلف تنظیموں میں وقار کے ساتھ جینے والے ہمارے حلیفوں کے درمیان کارگر رابطہ کی کمی رہی۔ یہ کمی نچلی سطح پر بھی برقرار رہی۔ ٹھوس اور مسلسل مکالمہ کی کمی سے ہمیں حکومت کی خامیوں کے بارے میں بروقت اور قابل بھروسہ فیڈ بیک نہیں مل پایا۔ اور اسی طرح سے ہم حتمی فیصلہ لینے یا نہ لینے کے پیچھے حکومت کی مجبوریوں کی جانکاری بھی نہیں دے پائے۔

اگرچہ باجپئی حکومت وسیع پیمانہ پر بہتر کام کررہی تھی لیکن ہمارے کٹر حامی محسوس نہیں کررہے تھے کہ انہیں ان حصولیابیوں میں شامل کیا گیا ہے۔ اس طرح متعدد انتخابی حلقوں میں خاص طور سے اتر پردیش میں ہمارے امیدواروں کی کامیابی کے تئیں وہ غمزدہ رہے۔ یقینی طور سے میں یہ مانتا ہوں کہ اس طرح کے آپسی مکالمہ سے ستائش کو تقویت ملتی ہے اور مرکز میں سیاسی برتری کو مستحکم بنانے میں مشترکہ ذمہ داری کے جذبات میں مزید استحکام حاصل ہوتا ہے۔

پارٹی صدارت کی ذمہ داری پھر قبول کرنا

لوک سبھا انتخاب میں شکست کیلئے ہم سبھی اجتماعی طور سے ذمہ دار تھے۔ اس لئے کسی ایک شخص پر الزام لگانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بی جے پی اجتماعی طور سے کام کرنے کی حامی رہی ہے اور پارٹی مسلسل مل کر کام کرتی رہی ہے۔ اس کے باوجود انتخاب میں ملی شکست کی وجہ سے انگلی اٹھانے کا موقع مل گیا۔ یہ مکمل طور سے تنظیم کے کردار کے خلاف ہے۔ جبکہ اس کے برعکس کانگریس نے پہلے پی وی نرسمہاراؤ اور اس کے بعد سیتارام کیسری کو بالترتیب 1998 اور 1999 میں ملنے والی شکست کے بعد انتہائی بےعزتی سے پارٹی کی صدارت چھوڑنے کے لئے مجبور کیا تھا۔

اس کے باوجود نہ تو کسی کو ایسی امید تھی اور نہ ہی ضروری تھا-18 اکتوبر 2004 کو ایم وینکیا نائیڈو نے اچانک بی جے پی کی صدارت سے استعفیٰ دے دیا اور ایسا کرنے کیلئے انہوں نے ذاتی وجوہات بتائے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ حالانکہ اجتماعی جوابدہی بی جے پی کا متفقہ منتر

رہا ہے پھر بھی وہ لوک سبھا کے انتخاب میں بی جے پی کی شکست کیلئے پارٹی صدر ہونے کے ناطے خود کو ذمہ دار سمجھتے ہیں۔ میں جانتا تھا کہ وہ دل ہی دل میں بے چین ہیں اور کچھ پارٹی معاونین کے غیر ذمہ دارانہ رویہ سے یہ بے چینی مزید بڑھ گئی تھی۔ نائیڈو کا متبادل تلاش کرنا ایک دشوار کام تھا۔ میری رائے تھی کہ قیادت کیلئے دوسری قطار سے کسی ساتھی کو پارٹی کی باگ ڈور دینے کا موقع دیا جائے۔ جوان نسل میں اہل لیڈروں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ سشما سوراج، ارون جیٹلی، پرمود مہاجن اور نریندر مودی جیسے کچھ نام لئے جا سکتے ہیں۔ حقیقت میں 80 کے عشرہ میں ہی میں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ ہونہار نوجوان لیڈروں کی نئی قطار تیار کی جائے لیکن ان میں بیشتر یہ محسوس کرتے تھے کہ پارٹی کو اس حالت میں سینئر اور تجربہ کار لیڈروں کی ضرورت ہے۔ یہ بھی درخواست کی گئی کہ میں پارٹی کی صدارت کا کام سنبھالوں۔ واضح طور سے میں دوبارہ پارٹی صدر نہیں بننا چاہتا تھا۔ میں نے انہیں یقین دہانی کرائی کہ کبھی ضرورت پڑے گی تو میں ہمیشہ پارٹی کی رہنمائی کرونگا۔ لیکن جب اٹل جی نے تجویز قبول کرنے کیلئے کہا تو مجھے رضامندی دینی پڑی اور میں بی جے پی کی تاریخ میں پانچویں بار صدر بنا۔

میں صاف طور سے یہ بتانا چاہوں گا کہ میں اپنی پارٹی اور تنظیم کے جوش وخروش میں کمی اور صورتحال پر متفکر تھا۔ مرکز اور متعدد پارٹی یونٹوں میں ٹیم کا جذبہ ختم ہو رہا تھا۔ اس وقت پارٹی کے اندرونی اختلافات پر کھلے عام آواز اٹھانے اور ایسے مسئلہ کو حل کرنے کیلئے میڈیا کے استعمال کی روایت بڑھ رہی تھی۔ ان میں بیشتر اختلاف اصول یا افکار سے جڑے ہوئے نہیں تھے۔ بلکہ ذاتی خواہشات اور حسد سے جڑے تھے۔ اقتدار کی لالچ رنگ چڑھنے لگی تھی۔ اور بدلے میں طبقات اور انفرادی ایمانداری کو فروغ ملنے لگا۔ جدوجہد، قربانی، ڈسپلن اور آئیڈیل ازم کی روایت بھارتیہ جن سنگھ کی شناخت بن گئی تھی۔ لیکن حالیہ دور میں یہ روایت کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ بی جے پی کو 'سب سے مختلف پارٹی' (پارٹی ود اے ڈفرینس) کے روپ میں بتانا شروع کر دیا تھا۔ اس سے مجھے جتنی تکلیف ہوئی اتنی دوسری کسی بات سے نہیں ہوئی۔ میں بی جے پی کے روایتی گڑھ مدھیہ پردیش میں آنے والی غیر یقینی سے ناامید ہو گیا تھا۔ اگرچہ اکتوبر 2003 کے اسمبلی انتخابات میں ہم نے بڑے پیمانہ پر عوامی حمایت حاصل کی تھی لیکن ہمیں ایک نہیں بلکہ دوبار وزراءاعلیٰ بدلنے پڑے۔ میں جانتا تھا کہ پارٹی میں پیدا ہونے والی بغاوت غیر متنازع اور اس کا پوری تنظیم پر اس کا اثر نہیں پڑے گا۔ اس کے باوجود اب مسئلہ کا حل تلاش کرنے اور سامنا کرنے کا وقت تھا۔

نومبر 2004 میں رانچی میں منعقد پارٹی کی قومی عاملہ کی میٹنگ میں، میں نے اپنے بیتاب جذبات اور خیالات کا اظہار کیا۔

''میرا یہ یقین ہے کہ دیوی شکتی نے بی جے پی کو یہ ذمہ داری سونپی ہے اور اس پارٹی کو اپنا وسیلہ منتخب کیا ہے کہ اپنے ملک کو حالیہ پریشانیوں سے نجات دلائے اور شاندار حصولیابیوں کی بلندیوں تک پہنچائے۔ جب تک ہماری پارٹی کے منتخب اہداف کے تئیں بیداری سے راستہ ہموار ہوتا رہے گا ہمیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں تک کہ اگر ہم ناکام ہو جاتے ہیں تب بھی پہلے کے بہ نسبت اور زیادہ مضبوط ہو کر لوٹیں گے۔ اسلئے ہمیں اپنے بنیادی مقاصد کی ترجیحات کو یاد کرنا چاہئے۔ جب ہم جانتے ہیں کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں وہ بہتر ہے۔ کیونکہ اس سے ہمارا ملک زیادہ مضبوط ہوگا اور ہر ایک ہندوستانی کو جینے کیلئے بہتر جگہ ہوگی اور تعلیم سے کئی کمزوریاں دور ہو جائیں گی۔ تو ہمیں اپنی اندر موجود منفی خوبی کو دور کئے بغیر، چھوٹے خیالات سے، شخص یا تنظیم پر کنٹرول نہیں رکھا جا سکتا۔''

میں نے اپنے ساتھیوں کو بتایا:

''ہم خود سے یہ سوال پوچھتے ہیں کہ ہماری قوت تحریک کیا ہے؟ ہم کس سے متاثر ہوتے ہیں؟ ہم سیاست میں کیوں آئے؟ خاص طور پر ہم نے بی جے پی کا انتخاب کیوں کیا؟ اگر ان سوالات کا جواب فرد کی خواہشات سے بالاتر ہے اور ملک کے تئیں خواہشات سے متاثر

ہیں تو ہم ہمیشہ صحیح سمت میں چلیں گے۔ دوستو، قومی مجلس عاملہ ہماری پارٹی کے بنیادی عنصر کی نمائندگی کرتی ہے۔ پارٹی تنظیم یعنی اس عظیم پارٹی کے تقریباً سبھی کارکنان ہماری جانب دیکھ رہے ہیں۔ وہ ہم سے یہ امید کرتے ہیں کہ ان مشکل حالات میں ہم پارٹی کو کیسے چلا رہے ہیں۔ اگر ہم خود کو اعلیٰ سطح تک پہنچا پاتے ہیں تو ہم پوری پارٹی کو صحیح سمت دے پائیں گے۔ اگر ہم خود کی اصلاح کر لیتے ہیں تو پارٹی کی نچلی سطح تک اصلاح ہوگی۔ سینئر لیڈر اعلیٰ معیار قائم کریں گے۔ ذیلی اکائیاں یقینی طور سے ان کی تقلید کریں گی۔''

میں نے پارٹی ساتھیوں کے ساتھ رسمی اور غیر رسمی بات چیت کے دوران تنظیم کے اندر اصلاح کی بات بار بار دوہرائی۔ ساتھ ہی میں یہ بھی جانتا تھا کہ پارٹی کو طویل عرصے تک اور بڑے پیمانے پر لوگوں کو بی جے پی سے امید ہے کہ وہ مرکزی سیاست پر چھا جائے۔ بی جے پی، کانگریس-بائیں باز و اتحاد کے ذریعہ ملک میں پیدا کئے گئے نئے حالات کا مقابلہ کرے گی اور اس کے نظریات و افکار بہتر ڈھنگ سے پھیلیں گے۔

بی جے پی سلور جوبلی کانفرنس: ایک یادگار میل کا پتھر

2005 میں بی جے پی کے قیام کی پچیسویں سالگرہ تھی۔ پارٹی کی قومی کونسل کی 6 اپریل کی خصوصی سلور جوبلی کانفرنس منعقد ہوئی تاکہ ایک سال سے منتظر اس تقریب کا انعقاد کیا جا سکے۔ اگر پچیس سال پہلے بی جے پی کے قیام کی کانفرنس اٹل جی کی صدارت میں تھی تب یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میں سلور جوبلی کانفرنس کی صدارت کر رہا ہوں۔ اپنے صدارتی خطاب میں میں نے یاد دلایا 'آج کے دن اس جگہ پر اور اس موقع پر میرے جیسے پرانے لوگوں کے دل میں خوشگوار یادیں ابھر رہی ہیں۔ ایسی یادیں جنھوں نے ہمیں ناقابل یقین اور یادگار احساسات دیئے۔ پچیس سال پہلے ہماری پارٹی کا آج ہی کے دن اور تقریباً اسی جگہ پر قیام عمل میں آیا تھا۔ بی جے پی کو 'یاتراؤں کی پارٹی' کہا جاتا ہے۔ ہم اسے فخر کے ساتھ قبول کرتے ہیں۔ لیکن سب سے یادگار اور کارآمد یاترا ہماری پارٹی کی گزشتہ پچیس سال کی یاترا ہے۔ کیا خوب رہی یہ یاترا!

میں نے اس موقع پر بی جے پی کی پانچ حصولیابیوں کی فہرست بتائی۔ اس فہرست میں سرفہرست یہ حصولیابی رہی، جس سے ہمارا رویہ دیگر اہم سیاسی پارٹیوں سے الگ رہا، جس پر ہمیں فخر ہے۔ لیکن ہمارے مخالفین حیران ہیں۔ یعنی بی جے پی کبھی تقسیم نہیں ہوئی۔ آل انڈیا کانگریس آزادی کے محض بائیس سال بعد خاص طور سے 1969 میں منقسم ہوگئی۔ اس تقسیم کی وجہ پارٹی کا بنیادی اصولوں کے مطابق نہ ہونا تھا۔ 'اصلی کانگریس' کی شکل میں جانی جانے والی پارٹی 1999 میں پھر تقسیم ہوگئی۔ اس تقسیم کی وجہ اور بھی زیادہ افسوسناک تھی۔ یہ وجہ اس کے صدر غیر ملکی کی نسل کا اِشو تھا۔ اسی طرح آزادی کے انیس سال بعد ہماری اہم مخالف پارٹی-کیمونسٹ پارٹی ٹوٹ گئی مرکز میں اپنے حلیف کے قدموں کی تقلید کرتے ہوئے یہ پارٹی بھی پہلی تقسیم کے پہلے پانچ سال کے اندر دو بار ٹوٹ گئی۔

'اس کے برعکس' میں نے کہا ہم ایک کنبہ کی طرح بندھے رہے۔ ہماری ایکتا اور افکار کی شناخت ہی ہماری طاقت کا اہم ذریعہ رہی۔' میں نے ڈاکٹر شیاما پرساد مکھرجی اور پنڈت دین دیال اپادھیائے کے ذریعہ رکھی گئی مضبوط بنیاد میں پارٹی کی ایکتا کا ذکر کیا۔ 'انھوں نے ہمیں راہ دکھائی۔ ہم اس پر چلے اور آج ہم اتنا فاصلہ طے کر چکے ہیں۔ اگر میں پیچھے چھوڑ چکے راہگذر پر نظر ڈالتا ہوں تو کافی افسوس ہوتا ہے لیکن وہ ہمیں نہیں روک پائے، ہمیں کئی کامیابیاں ملیں لیکن اس سے ہمارے دل میں کبھی بھی گھمنڈ پیدا نہیں ہوا۔ اس سفر کے نشیب و فراز اور ہر ایک ٹھہراؤ پر ہم نے صحیح سبق سیکھنے کی کوشش کی اور فرائض کی راہ پر مسلسل چلتے رہے۔'

دوسرے میں نے 1979 کا تلخ تجربہ یاد دلایا جب بھارتیہ جن سنگھ کے سبھی ممبران جنتا پارٹی سے نکال دیئے گئے تھے کیونکہ انھوں نے

راشٹریہ سویم سیوک سنگھ (آر ایس ایس) سے تعلقات توڑنے سے انکار کر دیا تھا۔ پیچھے مڑ کر دیکھیں تو جنتا پارٹی کے ہمارے دوستوں نے واضح طور سے 'دوہری رُکنیت' کی بنیاد پر اس تنظیم سے ہٹا کر ہم پر احسان ہی کیا۔ ہم نے محسوس کیا کہ اندرا گاندھی کے قتل کے بعد ہمیں ان سے الگ ایسے پانی کا بہاؤ تیار کرنا ہے جس میں شروعات میں خواہ بہت کم مقدار میں پانی کیوں نہ ہو حقیقتاً 1984 کے پارلیمانی انتخابات میں تھوڑی دیر کیلئے ایسا ہوا کہ یہ پانی کا دھارا پوری طرح سے خشک ہو گیا۔ ہمارے کچھ مخالفین ہمارا یہ کہہ کر مذاق اڑاتے تھے کہ 1979 میں 'دوہری رکنیت' پر جمے رہنے کی وجہ سے 1984 میں لوک سبھا میں ہم 'دو ممبران کی پارٹی' بن کر رہ گئے۔

کانگریس اور کمیونسٹ پارٹی والوں نے خوش ہو کر ہمارا سیاسی مرثیہ لکھا تھا۔ لیکن لوک سبھا میں دو سیٹیں لیکر 1989 میں 86 سیٹوں تک، 1991 میں 120 سیٹوں تک، 1996 میں 161 سیٹوں تک، 1998 میں 182 سیٹوں تک اور 1999 میں 182 سیٹوں تک ہم نے ڈرامائی طور پر ترقی کی۔ میں نے تبصرہ کیا 'ہم نے اس وقت ریورسل کا سامنا کیا جب لوک سبھا میں ہمیں 138 سیٹیں ملیں۔ اگرچہ کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ 25 سال کا دورانیہ بی جے پی کی مکمل ترقی میں کوئی کٹر باتی نہیں رہی۔'

ہماری تیسری حصولیابی یہ رہی کہ 1980 تک کانگریس پارٹی کی مخالفت کھل کر سامنے آ گئی۔ ہماری پارٹی کی تمام اکائیاں اور سیاسی واقعات اسی کے ارد گرد گھومتے رہے۔ اس کے برعکس 2004 میں بی جے پی دیگر پارٹیوں کی مخالف بن گئی اور سیاسی واقعات اسی کی جانب گھومتے رہے۔ اب کانگریس کا اُس طرح سے ہندوستانی سیاست پر قبضہ نہیں رہا جیسا بی جے پی کے قیام سے پہلے کئی عشروں تک رہا تھا۔ اس طرح سے بی جے پی کانگریس کی ایک پارٹی کی فوقیت کو ختم کرنے اور ہندوستانی سیاست میں اس کی ایک پارٹی والی سیاست کو تبدیل کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ اس کے علاوہ بی جے پی فکری خصوصیت، منظم طاقت اور جمہوریت کے بنیادی اقدار کے تئیں دو قطبین میں سے زیادہ مضبوط قطب کی شکل میں ابھری۔ گزشتہ لوک سبھا انتخابات میں لگنے والا دھکا اس حقیقت سے انکار نہیں کرتا۔ میں نے قبول کیا 'ہم اس تجربہ سے صحیح سبق سیکھیں گے اور بی جے پی کے ذریعے پیش کئے گئے افکار و نظریات کو اور زیادہ مضبوط بنانے کیلئے آگے بڑھیں گے۔

چوتھی، بی جے پی نے مخالف سوچ کی پالیسی یا حکمت عملی کو شکست دے دی۔ جس کے تحت ہمارا سیاسی اچھوت کی شکل میں بائیکاٹ کیا گیا تھا۔ ہم اپنے رویہ پر قائم رہے، نیک نیتی سے کام کرنے کی وجہ سے ہماری طاقت بڑھی۔ پہلے حریف رہ چکی مخالف پارٹیاں ہمارے حلیف بن گئے۔ ہم نے نئے دوست بنائے۔ کانگریس اور کمیونسٹ پارٹیاں ہماری سیاسی علیحدگی چاہتی تھیں۔ ہم نے اس علیحدگی کی سرحدوں کو توڑ دیا جس کے نتیجے میں 1998 میں شاندار طریقے سے این ڈی اے اتحاد کا اقتدار اعلیٰ پر قبضہ ہوا۔ کانگریس پارٹی کا ہمیں اکھاڑ پھینکنے کا کھیل ختم ہو گیا اور 1999 میں این ڈی اے نے نئی رائے عامہ حاصل کی۔ اٹل جی وزیر اعظم بنے جنھوں نے غیر کانگریسی ملی جلی مستحکم حکومت بنائی۔ یہ حکومت مرکز میں پوری مدت تک برقرار رہی۔

پانچویں، میں فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ایودھیا تحریک نے کس طرح سے سیکولرازم کے حقائق کے معنی میں اور قومیت کے جذبات کی جڑوں پر قومی سوچ و فکر میں تبدیلی پیدا کی۔ کانگریس پارٹی اپنے ووٹ بینک کی گھٹیا سیاست کیلئے ہمیں 'فرقہ پرست' کہہ کر ہماری شبیہ خراب کرتی رہی۔ حالانکہ میں نے نوٹ کیا کہ ہمارے اصول پر قائم رہنے اور وسیع بنیاد پر ملنے والے تعاون نے کانگریس کو مجبور کیا کہ وہ حقائق کو قبول کرے۔ اس سلسلے میں 16 جنوری 1999 کو منعقد کانگریس ورکنگ کمیٹی کے عزائم کی جانب توجہ دلانا چاہتا ہوں جس میں کہا گیا ہے کہ 'ہندو دھرم سیکولرازم کی سب سے زیادہ کارگر ضمانت دیتا ہے۔' میں نے اس نظریہ کی ستائش کی اور تبصرہ کیا 'اگر کانگریس ابھی بھی اس عزم کے تئیں ایماندار ہے تو

خالص سیکولرازم کوفروغ دینے اور ہندوستان کی ثقافت وتہذیب سے متعلق شناخت کے فروغ میں دلچسپی رکھنے والی اس ملک کی دو اہم سیاسی پارٹیوں کے درمیان اس اہم نکتہ پر اتفاق رائے بن سکتی ہے۔'

بی جے پی کے ابتدائی دور سے لے کر اس کی حصولیابیوں کو بتانے کے علاوہ میں نے سلور جوبلی تقریب کے موقع پر پوری پارٹی تنظیم کو چیلنج کا سامنا کرنے کا اعلان کیا۔ ہم ابھی حاصل ہونے والی کامیابیوں سے مطمئن ہوکرنہیں بیٹھ سکتے۔ ہندوستان کے مستقبل سے متعلق طویل دوری تک کام کیا جانا ہے۔ پورے ہندوستان میں مستحکم طور سے جمنے کیلئے ہم اور زیادہ طاقتور کیسے بن سکتے ہیں؟ اگر آزادی کے پچاس سال تک کانگریس ہندوستان کی 'قسمت سنوارنے والی' رہی تو بی جے پی کو ایسی پارٹی کیسے بنائی جاسکتی ہے کہ آنے والے عشروں میں معیار کے نظریے سے بہتر طور سے کردار ادا کر سکے؟

> میں نے پارٹی کے سامنے پانچ اہم کام پیش کیے۔ میں نے دو الفاظ میں پہلا کام بتادیا۔'استحکام اور توسیع۔ جن ریاستوں میں پہلے سے ہی بی جے پی کی حالت مضبوط رہی ہے وہاں اس بنیاد کو اور زیادہ ٹھوس بنانے اور جن ریاستوں میں ہماری حالت کمزور پڑ گئی ہے وہاں دوبارہ بنیاد تیار کرنے کے علاوہ ہمیں ان ریاستوں میں اور زیادہ تعاون کی ضرورت ہے جہاں ہماری موجودگی ابھی نا کے برابر ہے۔ چونکہ پارلیمنٹ میں ان ریاستوں کی بہت زیادہ سیٹیں ہیں۔ اور اس طرح کی ریاستوں میں ہماری پارٹی کی سیٹیں بہت کم ہیں'۔ اگر بی جے پی کے کام کی پالیسی کا ایک پہلو اسے 'وسیع' بنانا تھا تو دوسرا پہلو'سب سے عام' ہوگا۔ میں نے کہا' مسلم اور عیسائی سمیت سبھی مذاہب کے غریب اور پسماندہ طبقات اور درج فہرست ذات وقبائل اور دیگر پسماندہ طبقات تک پہنچنے کیلئے ہمیں ٹھوس اور مسلسل کوششیں کرنی ہے'۔

بی جے پی کے سامنے دوسرا چیلنج ایسی پارٹی کی شکل میں تیار ہونا ہے جس میں مندرجہ ذیل خصوصیات ہوں۔ بہتر حکومت، غریبی، بے روزگاری اور سماجی وعلاقائی برائیوں سے مبرا ملک بننے کیلئے ہندوستان کی کوششوں اور اس کے کام کرنے کے طریقے کے دورانیہ کو کم کرنے میں اہل ہوں۔ اگر ہماری پارٹی کو تاریخی ذمہ داری اٹھانی ہے تو ہمیں ہر نظریہ سے اپنی طاقت کو بڑھانا ہوگا۔ نظریات، تنظیم، سیاسی اور قائد طبقہ کا آئیڈیل ازم اور اہلیت'۔

میں نے ملک اور پارٹی کے سامنے درپیش اہم چیلنجوں، گاؤں غریب، کسان اور مزدور تک فائدہ پہنچانے کیلئے معاشی اصلاح سے متعلق کام کی فہرست کو دوبارہ تیار کرنے کی ضرورت کی شناخت کی۔' مجھے اس بارے میں تشویش ہے'۔ میں نے اعتراف کیا کہ' ہماری پارٹی کی۔ کسان اور ہندوستان کے گاؤں میں رہنے والے، آبادی کے دیگر طبقات جیسے دستکار وغیرہ کے مسائل کیلئے آواز اٹھانے کی صلاحیت، ان کی پریشانیوں کی رفتار میں یکسانیت نہیں ہے۔ مثلاً، اس سے زیادہ تشویشناک اور قابل شرم اور کیا بات ہوسکتی ہے کہ ملک کے دیگر حصوں میں ہمارے سیکڑوں کسان خودکشی کرنے کیلئے مجبور ہوجاتے ہیں؟ اسلئے میرا سبھی قوم پرست ماہرین معاشیات، ترقیات سے متعلق ماہرین اور پالیسی سازوں اور کام مکمل کرانے والوں سے درخواست ہے کہ اصلاح سے متعلق عمل کو صحیح سمت دی جائے۔ بلاشبہ ہماری معیشت کو سائنس اور انفارمیشن ٹیکنالوجی، گلوبلائزیشن کے فائدے کے ہر ایک مواقع کا فائدہ اٹھانا چاہئے۔ لیکن اس کا اہم ہدف ایک ارب ہندوستانیوں کی ناقابل یقین پیداوار کی صلاحیت کو تبدیل کرنا اور سبھی کیلئے معیار زندگی کی بہتر ضمانت ہونی چاہئے'۔

چوتھا، چیلنج میں نے یہ دیکھا کہ ہماری پارٹی کو نوجوان لیڈروں اور تصور کی طاقت کو ابھارنے والے ایشوز کو فروغ دیکر اپنی اپیل کو اور زیادہ اثردار اور مضبوط بنانے کی ضرورت ہے۔' بی جے پی جوان ہندوستان کی آواز اور متبادل'۔ اس کام کی ضرورت خود بخود ثابت ہوجاتی ہے جب ہم

یہ غور کرتے ہیں کہ ہندوستان کی 65 فیصد آبادی کی عمر 35 سے بھی کم ہے تو ساتھ ہی میں نے اس پر زور دیا کہ ہماری پارٹی تجربہ اور جوش سے بھرے نوجوانوں کی طاقت، دونوں کی قدر کرتی ہے۔ اس معنی میں بی جے پی ہمیشہ پھیلنے والے مضبوط شجر کی طرح ہے جس کی جڑیں گہری اور بڑی ہیں اور جس میں ہر موسم میں نئی کونپلیں نکلتی ہیں'۔

آخر میں، میں نے پارٹی کے لوگوں کو بنیادی اصول یاد دلائے جسے اٹل جی نے 1980 میں بی جے پی کے تاسیسی کانفرنس میں صدارتی خطاب میں بتایا تھا- 'مثبت کام کے فائدہ' کو بی جے پی کی سیاست کا حصہ بنانا ہے۔ 'باجپئی نے پارٹی کو تین منتر دیئے ہیں- تنظیم، جدوجہد اور اسٹرکچر۔ اور ہم نے گزشتہ 25 سال میں پہلے دو منتروں کے بارے بہت کچھ کر دکھایا ہے۔ کئی ممبر اور پارٹی کے عہدیدار یا کارکنوں کے کام کرنے کے طریقے قابل تقلید ماڈل ہیں۔ وقت آگیا ہے کہ پارٹی اس تنظیم کو پوری اہمیت دے۔' اس اعلان کیلئے میں نے دو اسباب بتائے ہیں- پہلا، حالیہ عشروں میں ذاتی تنظیموں اور ملکی زندگی کے مختلف شعبوں کی غیر سرکاری تنظیموں کی اہمیت میں بہت زیادہ اضافہ ہوا ہے۔ دوسرے، جہاں کہیں ہمارے کارکنوں نے غیر سرکاری تنظیمیں قائم کی ہیں یا اس کی حوصلہ افزائی کی ہے، جو بہتر کام کر رہے ہیں، وہاں انہیں خود اور پارٹی دونوں کیلئے لوگوں کی حمایت ملی ہے۔ 'اس وجہ سے میں آج اپیل کرنے کیلئے تیار ہوا ہوں۔ پارٹی کی سلور جوبلی کے موقع پر میں پارٹی کے ہر ایک فعال ممبر سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اپنی دلچسپی کے کم سے کم ایک سروس یا پروجیکٹ سے جڑیں۔' میں نے اپنے ممبران پارلیمنٹ، ممبران اسمبلی اور دیگر پارٹی کارکنوں سے درخواست کی کہ وہ اسکولی بچوں کیلئے دوپہر کے کھانے کی پلاننگ، ہندوستان کو سبزہ زار میں بدلنے کیلئے شجر کاری، ہندوستان کو صاف ستھرا بنانے کیلئے عوامی مہم جیسی سرگرمیاں اور چھوا چھوت، عورتوں کے ساتھ ناانصافی وغیرہ مختلف سماجی برائیوں کے خلاف مہم چلانے کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں۔

حالانکہ اس اپیل کا ابھی تک کوئی مثبت نتائج سامنے نہیں آیا ہے پھر بھی میں ملک بھر میں اپنی پارٹی کے لوگوں کے ذریعہ چلائی جارہی ہزاروں قابل ستائش اور مثبت پروجیکٹس کے بارے میں جانتا ہوں۔ میں مثبت کاموں کی بات کرتے وقت سنگھ کے تجربہ کار لیڈر اور بھارتیہ جن سنگھ کے تاسیسی رکن نانا جی دیش مکھ کے ذریعہ پیش کی گئی قابل تقلید مثال کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ 1979 میں جنتا پارٹی کی حکومت گرنے کے بعد انہوں نے سرگرم سیاست سے سنیاس لے لیا اور پورا وقت مختلف دیہی ترقیات پروگراموں کیلئے وقف کر دیا۔ انہوں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ کم سے کم ایک 'مائیکرو کاسم' بنایا جائے۔ مہاتما گاندھی اور پنڈت دین دیال اپادھیائے نے عام طور سے اس خواب کو فروغ دیا تھا۔ حقیقت میں وہ اتر پردیش اور مدھیہ پردیش کی سرحد پر واقع مقدس شہر چترکوٹ کے آس پاس ایسا ماڈل تیار کرنے میں کامیاب رہے۔ اگرچہ ابھی نانا جی 90 سال کے ہو چکے ہیں لیکن ابھی بھی اپنے خیالات ونظریات اور سماجی کاموں میں نوجوان کارکنوں کیلئے قابل تقلید ہیں۔

بی جے پی کی سلور جوبلی کانفرنس کے اختتام کے بعد میں سبھی ساتھیوں کے تعاون سے مسلسل کوشش کرتا رہا، تاکہ ہماری پارٹی کو دوبارہ نئی زندگی مل سکے۔ میں جانتا تھا کہ پارٹی صدر کے طور پر میرا کام خارزار سے پُر ہوگا لیکن مجھے پوری امید اور یقین تھا۔ اسی دوران میری سیاسی زندگی کا سب سے زیادہ تکلیف دہ واقع ہوا۔ یہ واقعہ مئی- جون 2005 میں میرے پاکستان دورہ کے بعد ہوا۔

14

میرا پاکستان دورہ

ہندوستان-پاکستان پڑوسی، ساتھ ساتھ رہنا ہے،
پیار کریں یا وار کریں، دونوں کو ہی سہنا ہے
... جو ہم پر گذری، بچوں کے سنگ نہ ہونے دیں گے،
جنگ نہ ہونے دیں گے
— اٹل بہاری باجپئی

حصہ-1

'مرفیز لا' ایک دوسرے معنی میں

میں کافی عرصہ سے یہ جانتا ہوں کہ تاریخ کی رفتار کا قبل از وقت اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ اس کی رفتار اور گردش سے سبھی انسانی اندازے غلط ثابت ہوجاتے ہیں۔ ایسا شخص گھمنڈی ہوگا، جو یہ سوچتا ہے کہ وہ اپنے حالیہ کاموں کے مثبت نتائج کو صحیح صحیح ڈھنگ سے محسوس کرتا ہے۔

سیاست میں کبھی کبھی میرے کاموں کے مطابق نتائج نکلے اور کبھی نتائج میری امید سے اتنے زیادہ ہٹ کر نکلے کہ میں خود گھبرا جاتا تھا۔ ایسے مواقع پر اپنے اور اپنے کاموں کے بارے میں فیصلہ لینے کے لئے ہمارا اپنا ضمیر بھروسہ مند رہنما ہوتا ہے۔ 'کیا میرے کام کا طریقہ صحیح تھا اور میری امیدیں مناسب تھیں؟' اگر اس سوال کا جواب 'ہاں' ہے تو میرا دل پرسکون ہوجاتا ہے۔ تب میں خود سے کہتا ہوں کہ تاخیر ہی سے سہی سب سے بڑی طاقت کی مہربانی سے بہتر نتائج ضرور سامنے آئیں گے۔

مئی-جون 2005 میں میرا پاکستان دورہ ایسی ہی انسانی کوششوں سے متعلق ہے جس سے مجھے 'مرفیز لا' کی یاد آگئی۔ ان قوانین کے ماننے والوں کا یقین ہے کہ اگر کچھ غلط ہوسکتا ہے تو وہ ہوکر ہی رہے گا۔ برازیل کے مشہور لکھاری اور مصنف پالو کولہو نے اپنی کتاب 'لائف آف دی فلوئنگ ریور' میں ایک دلچسپ کہانی دی ہے۔ اس کہانی کا عنوان 'دپیس آف بیڈ دیٹ فیل رانگز سائڈ اپ' ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے —

ایک شخص خاموشی کے ساتھ ناشتہ کررہا تھا۔ ابھی اس نے بریڈ پر مکھن لگایا ہی تھا کہ اچانک بریڈ کا ٹکڑا نیچے گرگیا۔ اس نے حیران ہوکر

نیچے دیکھا کہ مکھن والی سائڈ اوپر کی جانب ہے۔ (اس) شخص نے سوچا کہ اس نے کوئی معجزہ دیکھا ہے۔خوشی میں وہ دوستوں کو بتانے کے لئے دوڑ پڑا کہ ابھی ابھی کیا واقعہ ہوا تھا۔ یہ سب سنکر لوگ بھی حیران تھے کیونکہ جب بریڈ نیچے گرتی ہے تو تقریباً ہمیشہ مکھن والا حصہ زمین پر گرتا ہے۔اس طرح سب کچھ گڈمڈ ہو جاتا ہے۔

'شاید تم کوئی سنت ہو'۔ایک دوست نے کہا۔'یہ ایشور کا بھیجا ہوا کوئی اشارہ ہے'۔

جلد ہی سارے گاؤں کو پتہ چل گیا۔وہ اس واقعہ پر بات چیت کرنے لگے۔ساری امیدوں کے برعکس، یہ کیسے ہوا کہ (ایک) شخص کا بریڈ کا مکھن والا حصہ اوپر کی جانب تھا؟ کیونکہ کوئی قابل بھروسہ جواب نہیں دے پایا، اس لئے سب لوگ گرو کے پاس چلے گئے۔گرو وہیں قریب ہی رہتے تھے۔تمام لوگوں نے انہیں پوری کہانی سنائی تو گرو نے کہا کہ انہیں دعا کے لئے ایک رات کا وقت دیا جائے تا کہ غور وخوض کر کے دھیان لگا کر انہیں دیوی کی طاقت سے جواب مل سکے۔اگلے دن سبھی (لوگ) پھر ان کے پاس پہنچے۔وہ سبھی جواب سننے کے لئے متجسس تھے۔

'اس سوال کا جواب بہت آسان ہے'۔گرو نے کہا۔'سچائی یہ ہے کہ بریڈ کا ٹکڑا تو ویسے ہی گرا تھا، جیسا گرنا چاہئے، لیکن مکھن غلط سائڈ پر لگایا تھا'۔

میں امن کا سفیر بن کر پاکستان گیا تھا۔حقیقت میں میری خواہش تھی کہ میں طویل عرصہ سے دو ملکوں کے درمیان قائم تلخی کو دور کر کے تعلقات کو بہتر بنانے میں تعاون دوں۔ میں ابھی تک یہ مانتا ہوں کہ میرے اس دورے نے یقینی طور سے اس ہدف کی تکمیل میں تعاون دیا ہے۔حالانکہ مجھے کراچی میں محمد علی جناح کی قبر پر جانا اور 11 اگست 1947 کو پاکستان کے آئین ساز اجلاس میں جناح کے ذریعہ دی گئی تقریر کا ذکر، ہندوستان لوٹنے پر تنازع کا ایک موضوع بن گیا۔میرے بارے میں یہ رائے بنائی گئی کہ میں نے یہ سب کچھ کر کے بہت بڑا جرم کیا ہے۔اس اصولی غلطی کو قبول نہیں کیا جا سکتا۔ یہ 'ہندتوا کے تئیں دھوکہ' ہے۔کچھ لوگوں نے تو مجھے 'غدار' تک کہہ ڈالا۔

جب میں پاکستان سرزمین پر ہی تھا تب ہی یہاں کھلبلی مچ گئی تھی۔دہلی لوٹنے پر مجھے زبردست احتجاج کا سامنا کرنا پڑا۔میں نے دسمبر 2005 میں بی جے پی کی صدارت سے استعفیٰ دے دیا۔ مجھے جب یہ ذمہ داری یہ سونپی گئی تھی، اس کے ایک سال کے اندر یہ واقعہ ہو گیا۔آئندہ ہونے والے واقعات سے پارٹی کے اندر اتحاد پر فرق پڑنے لگا تھا اور اس پارٹی کے لاکھوں حامیوں کے دلوں کو گہری تکلیف پہنچی۔سیاسی زندگی میں اتنی تکلیف دہ اور بے چین لمحات تب بھی نہیں آئے تھے، جب مجھے 1996 میں 'حوالہ اسکینڈل' کے وقت لگائے گئے الزامات کا سامنا کرنا پڑا تھا، اس وقت میرا دل و دماغ پرسکون تھا، کیونکہ میری پارٹی میرے ساتھ تھی۔ان الزامات کا پرزور طریقے سے تردید کی گئی تھی۔اس کے برعکس 2005 میں پاکستان دورہ کے وقت اٹھنے والے تنازع میں میری اپنی پارٹی کے کئی ساتھیوں نے میرا ساتھ نہ دینے کا فیصلہ کیا تھا۔

لیکن میری پارٹی کے اندر اور باہر ایسے کئی لوگ تھے جو محسوس کرتے تھے کہ یہ تنازع بیکار تھا۔میں نے جناح کی اس تقریر کا حوالہ دیا تھا جسے لوگوں نے فراموش کر دیا تا کہ پاکستان کی عوام کو ان کے بانی کے ذریعہ دیئے گئے غیر مذہبی (نان تھیوکریٹک) ریاست کے نظریہ کی یاد دلائی جا سکے۔اس بات کی بھی یکساں طور سے اہمیت ہے کہ حکومت پاکستان کی درخواست پر لاہور سے تقریباً 100 کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع کٹاس راج مندروں کی تعمیر نو کے پروجیکٹ کا رسمی افتتاح کرنے کے بعد میں نے یہ سب کہا تھا (میں کٹاس راج مندروں کی تاریخ کے بارے میں بتانا چاہونگا کہ یہ مندر مہابھارت دور کے قرار دیئے جاتے ہیں) پاکستان بننے کے بعد یہ پہلا ہندو مندر تھا جس کو دوبارہ بنایا گیا۔مجھے تب بہت برا

لگا کہ اس موقع کی اہمیت کو میرے جیسی سوچ رکھنے والے میرے بھائی نہیں سمجھ پائے۔

جب میں نے پاکستان کے وزیر خارجہ خورشید محمود قصوری کی دعوت پر پاکستان دورہ کا فیصلہ لیا تھا، تب مجھے یقین تھا کہ میں باجپئی حکومت کی کاوشوں کو مزید مستحکم کر پاؤنگا اور ہند- پاک تعلقات اور مضبوط ہوں گے۔ لیکن میں نے اس بات کا تصور بھی نہیں کیا تھا کہ یہ دورہ تین دیگر اہم لیکن اس کے علاوہ مقاصد کے نظریہ سے بھی مددگار ہوگا- (الف) 11 اگست پاکستان کے بانی کی تقریر کو دوہرا کر پاکستان کے حکمرانوں کی یاد دلانا کہ وہ اپنے بانی کی باتوں کو دھیان میں رکھ کر یہ یقینی بنائیں کہ پاکستان کے ہندوؤں کو بھی قانون کے مطابق یکساں مذہب اور عبادت کی مکمل آزادی کی ضمانت ہو (ب) قدیم ہندو مندروں کی تعمیر نو کے نظریہ سے حکومت پاکستان کو سنجیدگی کیساتھ سوچنے کے لئے تیار کرنا (مجھے یہاں بلوچستان کی مشہور ہنگ لاج مندر کا ذکر کرنا ہے) (ج) حکومت، سیاسی پارٹیوں، میڈیا، دانشور طبقہ اور عام لوگوں کے ساتھ صرف 6 دنوں کے رابطہ سے میں نے محسوس کیا کہ میں پاکستان میں کئی ایک کو اس بات کے لئے رضامند کر سکتا ہوں کہ میری پارٹی اور میں بھلے ہی ہندو دھرم پر فخر کرتے ہیں لیکن ہم پاکستان مخالف نہیں ہیں۔ اسلام مخالف یا مسلم مخالف تو ہرگز نہیں۔

میں نیک مقاصد لے کر پاکستان گیا تھا لیکن میرے لئے سب کچھ الٹا پلٹا ہوگیا۔ کیا میں بھی 'مرفیز لا' کا شکار ہوگیا؟ حالانکہ میں نے سوچنے پر محسوس کیا کہ مجھ پر 'مرفیز لا' لاگو نہیں ہوا تھا بلکہ میرے دورے کے ذکر کی تفصیلات عقلمند کولہو کے گرد کی کہانی میں مضمر ہے۔ جس شخص کی زمین پر گری بریڈ کی مکھن والی سائڈ اوپر تھی، وہ محسوس کرتا تھا کہ کوئی 'معجزہ' ہوا ہے۔ میرے معاملہ میں بھی اگرچہ پاکستان دورہ میں ملنے والے تجربات معجزہ نہیں تھے بلکہ اس دورہ میں مجھے تصوراتی کامیابی ملی تھی۔

اس دورہ کا شخصی اور سیاسی استعمال

میرا پاکستان دورہ، شخصی اور سیاسی دونوں نظریئے سے اہم ہے۔ کراچی چھوڑنے کے بعد یہ میرا دوسرا دورہ تھا۔ کراچی میری جنم بھومی ہے اور مجھے 57 سال قبل تقسیم ہند کے وقت اسے چھوڑنا پڑا تھا۔ 1979 میں حکومت ہند میں وزیر اطلاعات ونشریات کے طور پر کئے گئے پہلے دورے کے بعد یہ دورہ پورے 26 سال بعد ہوا تھا۔ وہ دوروزہ مختصر دورہ تھا اور صرف کراچی تک ہی محدود تھا۔ اس کے علاوہ میں اکیلا ہی گیا تھا۔ جبکہ میری اہلیہ بھی سندھ کی رہنے والی ہے۔ ان کا پیدائش اور پرورش و پرداخت کراچی میں ہی ہوئی تھی۔ لیکن تقسیم کے بعد وہ وہاں کبھی نہیں گئی۔ ہماری دونوں اولادوں -جیئنت اور پرتبھا اور جیئنت کی اہلیہ گیتیکا کے لئے یہ سندھ کا پہلا سفر تھا۔ اس لئے پاکستان دورہ ہمارے سندھ کی جڑوں سے جڑے ہونے کی وجہ سے پورا کنبہ جذباتی تھا۔

چونکہ میں تقسیم کی وجہ سے خود کو اور دیگر رفیوجیوں کو 'تاریخ کا شکار' مانتا ہوں۔ اس لئے اپنے برصغیر کی تاریخ کو بدلنے کی سوچ کا جذباتی سطح پر اپنی اہمیت رکھتا ہے۔ صرف رفیوجی کنبہ ہی میرے درد کو سمجھ سکتے ہیں جو تقسیم کی وجہ سے اپنی جائے پیدائش چھوڑنے کے لئے مجبور ہوئے تھے۔ تقسیم کے بعد لاکھوں ہندو اور سکھ کنبہ پاکستان میں اپنے آبائی گاؤں اور شہروں کو دوبارہ دیکھ نہیں پائے۔ اسی طرح پاکستان میں جاکر آباد ہونے والے لاکھوں مسلم مہاجر زندگی میں ایک بار اپنی آبائی گاؤں دیکھنے کا خواب دیکھ رہے ہیں، جس کی تعبیر نہیں مل پا رہی ہے۔ ان کے آباؤ اجداد کے گھر اتر پردیش، بہار، دہلی، ممبئی، بھوپال، حیدرآباد اور ہندوستان میں کئی دوسرے مقامات پر ہیں۔

اس لئے سیاسی کارکن کی شکل میں میرے دل میں ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ میں اس حالات کو بدلنے کے لئے کچھ کروں۔ تقسیم کے سانحہ

کے چھ عشرہ بعد بھی میرے دل میں یہ خواہش برقرار رہی۔ اگر برلن کی دیوار گر سکتی ہے اور مغربی و مشرقی جرمنی ایک ہو سکتے ہیں، اگر دو جنگ عظیم لڑنے والے یوروپی ممالک کے شہری ایک دوسرے ملک میں آزادانہ آجا سکتے ہیں اور اگر شمالی اور جنوبی ویت نام کی درمیان کھنچی گئی خط تقسیم مٹ سکتی ہے تو ہندوستان اور پاکستان کشیدگی سے آزاد فضا میں اچھے پڑوسیوں کی طرح کیوں نہیں رہ سکتے؟ طویل عرصہ سے یہ سوال میرے دماغ میں گھومتا رہا۔ میری خواہش رہی ہے کہ اس سمت میں کچھ نہ کچھ کیا جائے۔

ہندوستان اور پاکستان کے مابین عام قائم کرنے کی خواہش میری اس سوچ میں مضمر ہے کہ بھی پارٹیوں میں سے بی جے پی اس کوشش کو پورا کرنے کی حالت میں ہے۔ اس سوچ کو 1990 میں برطانوی سفارتکار کے ساتھ میری یادگار بات چیت سے مزید تقویت ملی۔ 1984 کے انتخابات میں ہمیں محض 2 سیٹیں ملی تھیں، لیکن بی جے پی کی شاندار کارکردگی کی وجہ سے 1989 کے انتخابات میں بی جے پی کو لوک سبھا میں 86 سیٹیں ملیں۔ تب اسلام آباد میں اس وقت کے برطانوی ہائی کمشنر سرنکولس بیرنگٹن نے مجھے فون کیا۔ انہوں نے کہا 'مسٹر آڈوانی پارٹی کی اتنی شاندار پرفارمنس کے لئے آپکو بہت بہت مبارکباد۔ ہندوستانی سیاست کے پس منظر میں میرے جیسے کئی بین الاقوامی مشاہد بھی اب یہ مانتے ہیں کہ بہتر موقع آنے پر بی جے پی مرکز میں اقتدار میں ضرور آئے گی۔ میں نئی دہلی میں ہوں اور آپ سے ملنا چاہتا ہوں'۔

میں نے ان کا شکریہ ادا کر کے ان کو پارٹی ہیڈ کوارٹر میں مدعو کیا۔ سرنکولس نے کہا 'برطانوی وزارت خارجہ آفس میں مجھے جنوبی ایشیا کے ماہر کے طور مانا جاتا ہے۔ طویل عرصہ سے میں ہندوستان اور پاکستان میں حالی امن اور اچھے پڑوسی ہونے کے ناطے خوشگوار تعلقات قائم کرنے کے بارے میں سوچتا رہا ہوں۔ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ تب ہی ممکن ہے جب نئی دہلی میں مضبوط ہندتوا پارٹی اقتدار میں ہو اور اسلام آباد میں مستحکم فوجی حکومت'۔

چونکہ یہ نکتے میرے ذہن میں تجسس پیدا کر رہے تھے اس لئے میں نے ان سے پوچھا 'آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں؟' تب نکولس بیرنگٹن نے جواب دیا 'مجھے ہند-پاک کے درمیان دشمنوں جیسے تعلقات اور ریاستہائے متحدہ امریکہ اور چین کے درمیان پہلے سے موجود تلخ تعلقات کے درمیان یکساں فرق ڈھونڈنا ہوگا۔ 1972 سے قبل چین اور ریاستہائے متحدہ امریکہ دونوں ممالک ایک دوسرے کے کٹر دشمن تھے۔ لیکن جب صدر نکسن نے چین کا دورہ کیا اور چیئرمین ماؤ سے مصافحہ کیا تب یہ 'بانس کی دیوار' گر گئی۔ یہ اس لئے ممکن ہوا کیونکہ واشنگٹن ڈی سی میں مضبوط ریپبلکن صدر عہدے پر فائز تھے اور چین کے تیئں ریپبلکن کی دشمنی کو قربان کیا اور امریکہ کے لوگوں نے یہ محسوس نہیں کیا کہ نکسن غداری کر رہے ہیں۔ اسی طرح چین میں مضبوط کیمونسٹ حکومت تھی۔ ماضی میں امریکی سامراجیت کے خلاف قابل نفرت تقریر مشہور ہے۔ اگر انہوں نے چین اور ریاستہائے متحدہ امریکہ کے درمیان تعلقات کو بہتر بنانے کی سمت میں پیش رفت کی تو انکے ملک کے لوگوں نے یہ سوچ کر شبہ نہیں کیا کہ وہ ملک کو دھوکہ دے رہے ہیں'۔

برطانوی سفارتکار نے یہ بھی کہا کہ 'اگر ہندوستان میں بی جے پی حکومت اور پاکستان میں مضبوط فوجی حکومت طویل عرصہ سے چلے آرہے ایشوز کو حل کرنے اور دونوں ممالک کے درمیان امن قائم کرنے کا فیصلہ کرتے ہیں تو ان پر ملک کے اندر یہ دباؤ نہیں پڑے گا کہ وہ یہ دیکھیں کہ کہیں ان پر غداری کا الزام تو نہیں لگ رہا'۔

میں ان کے اس وضاحت سے بہت متاثر ہوا۔ اس لئے جب بی جے پی نے 1998 میں این ڈی اے کی قیادت کرتے ہوئے ہندوستان کی حکومت چلانے کے لئے عوامی رائے عامہ حاصل کی تھی اور 1999 میں پھر سے عوامی رائے حاصل کی۔ تب میں نے محسوس کیا تھا کہ

ہند-پاک تعلقات میں نیا باب شروع کرنے کے لئے ہماری حکومت کو ہرممکن کوشش کرنی چاہئے۔وزیراعظم باجپئی نے ایسا ہی محسوس کیا تھا-اور اتنا ہی مثبت اور گہرا جتنا میں نے کیا۔اس کے بعد ہم نے پاکستان کے تئیں دو نکاتی حکمت عملی تیار کی-پہلی، بات چیت کے ذریعہ مسئلہ جموں و کشمیر سمیت سبھی ایشوز کو حل کرنے کی کوشش کے ساتھ پاکستان کے ساتھ تعلقات بہتر بنانے کے لئے ایمانداری، مضبوطی اور صبر وتحمل کے ساتھ کوشش کرنا۔دوسرے، پاکستان میں سرکاری اور غیر سرکاری سطح پر تعاون اور سرحد پار دہشت گردی کے تئیں سخت رویہ اپنائے رکھنا اور اس سلسلہ میں کوئی سمجھوتہ نہ کرنا۔

مندرجہ بالا سوچ کی وجہ سے ہی باجپئی نے فروری 1999 میں لاہور کا تاریخی دورہ تھا۔کارگل میں پاکستان کے ذریعہ حملہ کرنے کے باوجود میرا مشورہ قبول کرتے ہوئے اٹل جی نے جولائی 2001 میں آگرہ میں سربراہ کانفرنس کے لئے جنرل مشرف کو مدعو کیا۔آگرہ سربراہ کانفرنس سے کوئی نتیجہ نہیں نکل پایا، کیونکہ ہندوستان نے دہشت گردی کے بارے میں جنرل مشرف کے رویہ کو قبول نہیں کیا۔دوبارہ 13 دسمبر 2001 کو ہندوستان کی پارلیمنٹ پر دہشت گردانہ حملہ جیسے سنگین اور اشتعال انگیز واقعہ کے باوجود ہماری حکومت نے پاکستان کے ساتھ بات چیت کی تجویز پیش کی۔ان کوششوں کا سب سے اطمینان بخش اختتام یہ رہا کہ جنوری 2004 میں اسلام آباد میں سارک سربراہ کانفرنس کے موقع پر باجپئی-مشرف کی بات چیت کے بعد تاریخی مشترکہ بیان جاری ہوا۔اس مشترکہ بیان میں پاکستان نے پہلی بار ہندوستان کے دہشت گردانہ کاموں کے لئے اپنے قبضہ والے کسی بھی زمین کا استعمال کرنے کی اجازت نہ دینے کا خود وعدہ کیا۔میرا ماننا ہے کہ ہندوستان کی سفارتی تاریخ میں یہ سب سے بڑی کامیابی ہے۔میں اٹل جی کی اس سوچ اور آشاوادی ہونے کا مکمل حمایت کرتا ہوں کہ اگر ہم دوبارہ مرکز میں اقتدار سنبھالتے تو ہم ہند-پاک تعلقات میں بہت بڑی کامیابی حاصل کرسکتے تھے۔

افسوس ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔کانگریس کی قیادت میں یو پی اے اتحاد کی ملی جلی حکومت اقتدار میں آئی اور 2004 میں ڈاکٹر منموہن سنگھ کی حکومت نے باجپئی حکومت کی جگہ سنبھالی۔یہ فطری ہے کہ پاکستان میں ہمارے دوست اس فکر میں تھے کہ بی جے پی امن عمل کی کوششوں کی حمایت دیتی رہے گی یا نہیں۔اٹل جی اور میں نے انہیں دوبارہ یقین دہانی کرائی کہ پاکستان کے تئیں ہماری دو نکاتی پالیسی میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔جب صدر مشرف نے اپریل 2005 میں ہندوستان کا دورہ کیا تھا تب میں نے انہیں بتایا 'صدر محترم! آخری بار میں نے آپ سے تب آمنے سامنے گفتگو کی تھی، جب آپ سربراہ کانفرنس کے لئے آگرہ جاتے وقت جولائی 2001 میں نئی دہلی پہنچے تھے۔میں اس وقت سرکار میں تھا۔میں آپ سے دوبارہ مل کر خوش ہوں۔اب میں حکومت میں نہیں ہوں۔حقیقت میں اب ہمارے سیاسی مخالفین کی حکومت ہے۔لیکن ہندوستان میں خارجہ پالیسی ہمیشہ اس طرح تیار کی جاتی ہے کہ ملک کی سیاست میں آنے والی تبدیلیوں کا خارجہ پالیسی پر اثر نہیں پڑتا۔ہم پاکستان کے ساتھ امن کے عمل کی حمایت کرتے ہیں کیونکہ یہ ہماری سوچ کا موضوع ہے۔ہمیں اس بات پر فخر ہے کہ ہماری حکومت نے اس سمت میں شروعات کی۔اس لئے اس سلسلہ میں ہمارا تعاون جاری رہے گا۔بشرطیکہ پاکستان اپنی سرزمین پر دہشت گردوں کے ٹھکانے پوری طرح سے برباد کرکے سرحد پار دہشت گردی کے سلسلہ میں کئے گئے اپنے وعدہ کو ایفا کرے۔

اس دن صدر مشرف کے ساتھ بات چیت کے وقت میں نے 1990 میں ہونے والی ملاقات کے دوران سرکولس ہیرنگٹن کے تبصرہ کا بھی ذکر کیا۔اس کے تھوڑی دیر بعد مجھے وزیر خارجہ خورشید محمود قصوری سے رسمی دعوت نامہ حاصل ہوا۔میں ان سے کئی بار مل چکا تھا۔اور مجھے وہ مہذب، نستعلیق اور ملنسار شخص لگے جو حقیقت میں ہند-پاک کے درمیان بہتر تعلقات قائم کرنا چاہتے تھے۔ایس طرح 30 مئی سے 6 جون تک

میرا پاکستان دورہ مکمل ہوگیا۔ مجھے لاہور، اسلام آباد اور کراچی: ان تین شہروں میں جانا تھا۔

29 مئی کو ایک پریس ریلیز میں، میں نے کہا کہ 'میرے اس دورے کا ہدف ایسی امید افزا فضا تیار کرنا ہے، جس میں دونوں ممالک گذشتہ چھ عشروں کی تلخی اور نفرت کو خیرباد کہہ کر بحالئی امن، دوستانہ اور تعاون سے جڑے نئے مستقبل تعمیر کریں، تاکہ سرحد سے متصل دو پڑوسی خود مختار ممالک کو فائدہ پہنچ سکے۔ ہم ایک مشترکہ تاریخ، ثقافت، مذہب، قبائل، زبان اور تہذیب کی بندشوں سے جڑے ہوئے ہیں۔ امن کی امید کو، مستقل امن کی حقیقت میں تبدیل کرنا بلاشبہ مشکل کام ہے۔ اس مقصد کے لئے صبر وتحمل، استقامت و ایمانداری اور دونوں فریقوں کا آپسی یقین واعتماد ہونا ضروری ہے۔ پاکستان کے دوسرے دورہ کے ابتدا میں سب سے طاقتور ایشور سے پرارتھنا کرتا ہوں کہ وہ دونوں ممالک کو مستقل امن کی شاہراہ پر گامزن کرے۔'

دہلی سے روانہ ہونے کی صبح ★ میرے ساتھیوں نے پارٹی ہیڈ کوارٹر میں میرے لئے روانگی کی تقریب کا اہتمام کیا۔ میں نے ان کے سامنے اپنے دورے کا مقصد بتایا کہ میرا یہ دورہ پاکستان کے تئیں باجپئی حکومت کی دو نکاتی پالیسی کے ذریعہ حصولیابی کا ہی ایک حصہ ہے۔ میری پارٹی کے کارکنوں کا جوش خروش کافی حوصلہ افزا تھا۔

حصہ-2
ہندوستان اور پاکستان: کتنے قریب، پھر بھی کتنے دور

یونانی تہذیب اب نہیں رہی، یہی عمل مصر اور روم کی تہذیب کی بھی رہی لیکن ہندوستان وقت کا دباؤ اور تناؤ جھیلتے ہوئے آگے بڑھتا رہا۔ اس ملک میں ایسا کچھ تو ہے، جو اسے مٹنے نہیں دیتا۔ اس سچائی کے باوجود کہ پوری دنیا اس کے خلاف صدیوں سے سازشیں رچتی رہی ہے۔

— علامہ اقبال (جو بعد میں پاکستان کے قومی شاعر بن گئے)

30 مئی کی شام دہلی کے اندرا گاندھی بین الاقوامی ہوائی اڈا سے پاکستان انٹرنیشنل ایئر لائنس کے طیارہ نے اڑان بھری۔ ایک گھنٹہ سے بھی کم وقت میں ہم لاہور کے علامہ اقبال انٹرنیشنل ایئرپورٹ پر تھے۔ میں یہ سوچ کر حیران تھا کہ اس سفر میں دہلی سے ممبئی یا کولکتہ تک کی اڑان سے بھی کم وقت لگا تھا۔ اگر جغرافیائی نظریہ سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ دونوں شہر کتنے نزدیک ہیں تو تاریخ بھی ہمیں دہلی اور لاہور کے درمیان اور اس طرح ہندوستان اور پاکستان کے درمیان تعلقات کی یاد دلاتی ہے۔ ان تعلقات کی جڑیں رامائن اور مہابھارت کے دور میں موجود تھیں۔ اور اس کے بعد ہر ایک دور میں برقرار رہی۔

★ میرے کنبہ کے علاوہ میرے ساتھ میری پارٹی کے ساتھی سدھیندر کلکرنی بھی تھے، جو بی جے پی کے قومی جنرل سکریٹری تھے۔ ان کے علاوہ میرے پرائیویٹ سکریٹری دیپک چوپڑا بھی اس دورے میں میرے ساتھ گئے۔

دہلی کا پرانا نام ہستناپور تھا۔ یہ راجہ بھرت کی راجدھانی تھی۔ ان کے نام پر اس ملک کا نام 'بھارت' پڑا۔ اسی طرح سے لاہور کا نام بھگوان رام کے بیٹے 'لو' کے نام پر پڑا۔ حقیقت میں ابھی بھی لاہور کے قلعہ میں چھوٹا سا 'لو مندر'★ ہے۔ یہ قلعہ تقریباً 3000 سال پرانا ہے۔ سمجھا جاتا ہے کہ رامائن کے دور میں یہ مندر تعمیر کرائی گئی تھی۔ بادشاہ اکبر نے اسے دوبارہ بنوایا تھا۔ مغل حکومت کی راجدھانی لاہور کی جگہ دہلی کو بنانے پر ان کے پوتے شاہجہاں نے دہلی میں لال قلعہ بنوایا تھا۔ لیکن شاہجہاں نے اپنے باپ جہانگیر کی یاد میں مقبرہ بنوانے کے علاوہ لاہور میں شالیمار باغ بھی بنوایا۔

جہاں لاہور میں مشہور دہلی گیٹ ہے، وہیں دہلی میں لاہوری گیٹ۔ یہ گیٹ تاریخی لال قلعہ کا صدر دروازہ ہے۔ اگر ہم تاریخ کو دور جدید کے ساتھ جوڑیں تو لاہور وہی جگہ ہے، جہاں برطانوی حکومت نے ہندوستان کی جنگ آزادی کے سب سے مشہور انقلابی بھگت سنگھ کو پھانسی دی تھی۔

دہلی اور لاہور کے درمیان دوسرے دلچسپ تعلقات بھی ہیں۔ دہلی میں سرگنگا رام اسپتال کا نام مشہور اسپتالوں میں شمار ہوتا ہے۔ 1954 میں یہ اسپتال بنایا گیا تھا لیکن ابتدا میں 1921 میں لاہور میں اس اسپتال کا قیام معروف سماجی خدمتگار اور سٹی پلانر سرگنگا رام کے ذریعہ کیا گیا تھا۔ انہوں نے شہر میں کئی ایک قابل فخر تاریخی اہمیت کے حامل کام کئے تھے۔ جن میں دنیا کے مشہور بین الاقوامی لاہور میوزیم بھی شامل ہے۔ لاہور کے احسانمند شہریوں نے سرگنگا رام کے احترام میں ان کا مجسمہ بنوایا تھا۔ اس مورتی کا کیا ہوا؟ یہ اب معروف اردو کہانی نگار سعادت حسن منٹو کی مشہور کہانی کا موضوع ہے۔ ایک چھوٹی کہانی میں انہوں نے فرقہ وارانہ فسادات کا ذکر کیا ہے۔ 1947 میں پنجاب کے دونوں حصے میں فساد بھڑک اٹھے تھے۔ منٹو نے بتایا ہے کہ کیسے لاہور میں مذہبی بھیڑ نے پہلے ہندوؤں کے محلوں پر اشتعال انگیزی دکھائی پھر اس ہندو سماجی خدمتگزار کے مجسمہ پر حملہ کرنے پر اتر آئے۔ انہوں نے مجسمہ کا منہ بگاڑ دیا اور پھر اسے پتھر مارے۔ اسکے بعد ایک شخص مجسمہ کے اوپر چڑھ گیا اور سرگنگا رام کے گلے میں پرانے جوتے کا ہار پہنانے لگا۔ اس نے بے عزتی کی ساری حدیں پار کردیں۔ اچانک پولس پہنچی اور فائرنگ شروع ہوگئی۔ زخمیوں میں وہ شخص بھی شامل تھا جس نے اپنے ہاتھوں میں جوتوں کا ہار پکڑ رکھا تھا۔ جیسے ہی وہ گرا، بھیڑ چلانے لگی 'جلدی کرو اسے سرگنگا رام اسپتال میں لے چلو۔'

31 مئی 2005: اسلام آباد
صدر مشرف سے ملاقات

حالانکہ ہم لاہور میں طیارہ سے اترے تھے، لیکن ہم اسی شام اسلام آباد کے لئے روانہ ہوگئے۔ یہاں اگلی صبح صدر مشرف سے ملنا تھا۔ راولپنڈی کے 'آرمی ہاؤس' میں میری ملاقات ہوئی۔ اس شہر کو اسلام آباد کا جڑواں شہر مانا جاتا ہے۔ مشرف نے بڑی گرمجوشی سے ہمارا استقبال کیا۔ پاکستان دورہ کے لئے مجھے اور میری فیملی کو حکومت کی جانب سے مدعو کرنے کے لئے میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ اس سے قبل

★ پاکستان کے سابق وزیراعظم اور پاکستان مسلم لیگ (ق) کے صدر چودھری شجاعت حسین جو لاہور میں میرے میزبان تھے، کی تجویز یہ تھی کہ میں لاہور قلعہ کے اندر واقع 'لو مندر' کا افتتاح کروں۔ پاکستان میں ہندوستان کے ہائی کمشنر شیوشنکر مینن (جو بعد میں ہندوستان کے خارجہ سکریٹری بنے) نے مجھے مشورہ دیا کہ یہ 'پوجا کا مقام' اتنا چھوٹا ہے کہ اسے مکمل مندر نہیں بنایا جاسکے گا جہاں ہمیشہ پوجا پاٹھ ہوسکے۔ اسلئے شجاعت حسین نے خود مشورہ دیا کہ مجھے لاہور کے نزدیک کٹاس راج مندر کیمپس کے تعمیر نو کے پروجیکٹ کا افتتاح کرنا چاہئے۔

ہندوستان میں اپنے دورہ کے دوران انہوں نے سینٹ پیٹرک ہائی اسکول، کراچی کی فوٹو البم پیش کی تھی (جہاں ہم دونوں پڑھے تھے)۔ میں تقسیم سے قبل اور وہ اس کے بعد۔ (ہم اس اسکول کے پرانے طالب علم رہ چکے ہیں)۔ ساتھ میں مجھے پڑھانے والے ٹیچرز اور اسکول سے جڑی دیگر یادوں کی تصویریں تھیں۔ میں نے اس بیش قیمت تحفہ کے لئے ان کا شکریہ ادا کیا۔ انہوں نے باجپئی حکومت کے ذریعہ شروع کی گئی ہند-پاک کے درمیان امن کا عمل اور نئی دہلی میں نئی حکومت کے بن جانے کے بعد بھی میری پارٹی کے ذریعہ اسے حمایت جاری رکھنے کے لئے ستائش کی۔ 'حقیقت میں جب میں اپریل میں ہندوستان گیا تھا تو باجپئی صاحب سے مل کر بہت خوش ہوئی'۔ انہوں نے کہا۔ میں فوراً جواب دیا 'پاکستان آنے سے قبل باجپئی جی نے منالی سے مجھے فون کیا تھا۔ وہ وہاں اس وقت چھٹی منا رہے ہیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ میں آپ تک ان کی نیک خواہات پہنچادوں'۔ پاکستان کے ساتھ امن کے عمل میں سلسلہ میں، میں نے تبصرہ کیا 'ہندوستان میں سب لوگ، برسراقتدار اور اپوزیشن دونوں پارٹیاں ایک ہیں'۔ انہوں نے کہا 'اب دونوں ملکوں کے لوگوں کے درمیان امن کا عمل شروع ہو چکا ہے'۔

ہم دونوں اس بات سے متفق تھے کہ ہمیں امن کی کوششیں جاری ہی نہیں رکھنے بلکہ اسے قائم بھی کرنا ہے۔ ہم اس نکتہ پر متفق تھے کہ کشمیر مسئلہ کا کوئی فوجی حل نہیں ہے۔ مسلسل بات چیت اور آپسی مذاکرات ہی اس سمت میں معاون ہوسکتا ہے۔ میں نے کہا 'ہم طویل عرصہ تک یہ نہیں کہہ سکتے کہ امن ایک صحیح متبادل ہے، بلکہ سچائی یہ ہے کہ امن ہی اکلوتا متبادل ہے'۔ انہوں نے اتفاق کرتے ہوئے کہا 'سولیوشن نکلے، ضرور نکلے گا'۔

تب میں نے مثبت مذاکرات میں رخنہ انداز ہونے والے عناصر کا ذکر کیا۔ 'جنرل، یہ یقینی بنانا ضروری ہے کہ آپسی اعتماد اور تشدد سے آزاد فضا میں بات چیت کا عمل جاری رہے گا۔ اس سلسلے میں آپکو یہ بتانا چاہوں گا کہ حقیقت میں ہند-پاک تعلقات میں کامیابی تب ملی تھی جب وزیراعظم باجپئی اور آپ نے جنوری 2004 میں اسلام آباد میں ہونے والی میٹنگ کے بعد مشترکہ اعلامیہ جاری کیا تھا۔ یہ مشترکہ بیان اس نظریہ سے تاریخی بن گیا کہ اس میں دہشت گردی کے خلاف آپ نے وعدہ کیا تھا۔ اس بیان میں جو کچھ کہا گیا، وہ بہت ہی حوصلہ افزا بات تھی۔ یہ حوصلہ دکھانے اور اس کا خطرہ اٹھانے کے لئے آپ قابل مبارکباد ہیں'۔

مشرف نے جواب دیا 'فوجیوں کو صرف جنگ کرنی ہی نہیں آتی'۔ اس خودستائشی بھرے لہجہ میں بہت کچھ پوشیدہ تھا۔

ایسا اس لئے ہوا کیونکہ آل پارٹیز حریت کانفرنس کے ایک وفد کو اسی ہفتہ پاک مقبوضہ کشمیر کا دورہ کرنا تھا۔ جب مشرف نے یہ ذکر کیا تب میں نے انہیں بتایا کہ واجپئی حکومت بھی جموں وکشمیر کے سبھی طبقوں سے بات چیت کرنے کے لئے پیش قدمی کر چکی ہے۔ اس میں آل پارٹیز حریت کانفرنس کے لیڈر بھی شامل ہیں۔ میری حریت لیڈروں کے ساتھ دو بار مثبت بات چیت ہوئی ہے۔ میں نے کہا تھا کہ 'جموں وکشمیر میں مختلف النوع طبقات ہیں اور اس مسئلہ کا کوئی آخری حل ریاست اور ریاست کے اندر مختلف فرقہ کے لوگوں کو قابل قبول ہونا چاہئے'۔

میں نے دونوں ممالک کے لوگوں کے درمیان رابطہ کو فروغ دینے پر زور دیا۔ خاص طور سے کلچرل، آرٹس، میڈیا اور دانشور طبقہ کے درمیان۔ 'کیا یہ عجیب بات نہیں ہے کہ پاکستان میں ہندی فلموں کی مقبولیت کے باوجود یہاں تھیٹروں میں ہندی فلمیں نہیں دکھائی جاتیں اور مشہور گلوکارہ لتا منگیشکر سمیت ہمارے بہت کم اداکار و اداکارائیں، گلوکار وغیرہ اس ملک کا دورہ کر پاتے ہیں؟ ہماری جانب سے ہندوستان میں آپ کے فنکاروں اور دانشوروں کا استقبال ہے۔ حقیقت میں ہم انہیں تہہ دل سے استقبال کریں گے'۔ مشرف نے اس مشورے پر راست طور پر اظہار خیال نہیں کیا، لیکن اس امید کا اظہار کیا کہ دونوں ممالک کے درمیان بہتر تعلقات کے بعد سیاحت کو کافی فروغ

ملے گا۔ ہندوستان میں کئی لوگ پاکستان میں سیاحت کے لئے آنا چاہیں گےاور اسی طرح سے پاکستان کے لوگ بڑی تعداد میں ہندوستان سیاح طور پر جانا چاہیں گے۔

پاکستان کے صدر نے کہا کہ سری نگر-مظفر آباد کے درمیان بس سروس شروع کرنے کے بعد شمالی علاقہ کے لوگوں نے بھی شمال اور کارگل کے درمیان بس سروس شروع کرنے کی مانگ کی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ انہوں نے ریلوے اتھارٹیز کو حکم دیا ہے کہ کھوکراپار (صوبہ سندھ میں) اور مناباؤ (راجستھان میں) کے درمیان دسمبر تک ریل لنک کی بڑی لائن بچھانے کا کام پورا کردیں۔ انہوں نے میرے اس مشورے پر رضامندی کا اظہار کیا کہ گجرات کے راستے کراچی اور ممبئی کے درمیان سمندری روٹ دوبارہ کھول دینا چاہئے۔ میں نے پاکستانی اتھارٹیز کے ذریعہ سیکڑوں ہندوستانی ملاحوں کو تنگ کرنے اور گرفتار کرنے کا مسئلہ بھی اٹھایا۔ مشرف نے اپنے افسران سے کہا کہ وہ معاملے کی چھان بین کریں اور یہ یقینی بنائیں کہ ہندوستانی ملاحوں کی ضبط کی گئی کشتیاں لوٹادی گئی ہیں یا نہیں۔

مشرف نے مجھے ان مقامات کے بارے میں بتایا کہ جہاں میں پاکستان میں دورہ کروں گا۔ انہوں نے کہا کہ' آپ صرف کراچی ہی کیوں جارہے ہیں؟ آپ کو پوری فیملی کے ساتھ دیگر مقامات پر بھی جانا چاہئے۔ میں اپنے افسران سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ ضروری امور کا انتظام کر دیں۔ میں نے اس تجویز کے لئے ان شکریہ ادا کیا لیکن کہا کہ 'ایشور نے چاہا تو ہم پاکستان دوبارہ آئیں گے۔'

بعد میں اسی دن وزیر اعظم شوکت عزیز اور وزیر خارجہ خورشید محمود قصوری سے میری ملاقات ہوئی۔ میں خاص طور سے ہند-پاک کے درمیان امن اور بہتر حالات بحال کرنے کے معاملے میں قصوری کے ذریعہ اظہار کئے گئے جذبات سے سب سے زیادہ متاثر ہوا' یہ ہمارا اپنے آباواجداد اور اپنی نسل سے وعدہ ہے'، انہوں نے کہا۔ انہوں نے جذباتی انداز میں ذکر کیا کہ ان کے دادا، والد اور چچا غیر منقسم ہندوستان کی جنگ آزادی کے سپاہی تھے۔ کانگریس پارٹی میں ان کا صف اول میں مقام تھا۔ انہوں نے برطانوی حکومت کے خلاف جنگ آزادی کیلئے بہت کچھ قربان کردیا۔

برطانیہ مخالف تحریک میں اپنے گھر والوں کے بارے میں مسٹر قصوری نے جو کچھ بتایا اس سے تحریک پاکر میں نے شام کو عشائیہ میں ایک پریس ریلیز میں مشورہ دیا- حقیقتاً یہ وزیر اعظم واجپائی کے ذریعہ 2004 میں اسلام آباد میں بارہویں سربراہ کانفرنس میں کی گئی تقریر کے حصے کا فلیش بیک تھی۔ میں نے کہا کہ 2007 میں غیر منقسم ہندوستان کی 1857 کی پہلی جنگ آزادی کی 150 ویں سالگرہ منائی جائے گی۔ یہ ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کی مشترکہ تاریخ میں فخر حاصل کرنے والا میل کا پتھر ہے۔ میں نے ذکر کیا کہ اس لڑائی کو ہندو، مسلم اور سکھ شہیدوں اور جنگ آزادی کے فوجیوں نے امر کردیا ہے۔ جزائر انڈمان کی سیلولر جیل میں ان کے درج ناموں سے پشاور سے ڈھاکہ تک پورے ملک کے جنگ آزادی کے فوجیوں کی تاریخ ملتی ہے۔ اس جیل میں دور غلامی کے سیاسی قیدیوں کو رکھا جاتا تھا۔ ان تین ممالک کے عوام کے آباء و اجداد برطانوی حکمرانوں کے خلاف شانہ بشانہ مل کر لڑے۔ اس وقت مذہبی، علاقائی اور لسانی شناخت سے اوپر اٹھ کر لوگوں نے جدوجہد کی تھی۔ اس لئے اپنی مشترکہ تاریخ کو یاد کرنے کا ایک طریقہ ہے اور حال کے اختلافات پر قابو پانے کیلئے یہ ضروری ہے کہ تینوں ممالک 1857 کی جنگ آزادی کی 150 ویں سالگرہ مل کر منائیں۔

اب 2007 گزر چکا ہے لیکن افسوس ہے کہ ڈاکٹر منموہن سنگھ کی حکومت نے اس سوچ کو حقیقت میں بدلنے کی سمت میں کوئی پیش رفت نہیں کی۔

یکم جون 2005: اسلام آباد
تکشلا اور دیگر مقامات کا دورہ

دن کی شروعات اسلام آباد سے 35 کلو میٹر دور تک ڈرائیونگ قدیم ہندوستان کی تاریخ ''تکشلا'' کی مشہور فن تعمیر کے خوبصورت نظارے دیکھنے کیلئے ہوئی۔ نالندہ کے علاوہ یہ قدیم دور میں دنیا کا سب سے بڑا تعلیمی مرکز تھا۔ رامائن میں تذکرہ ہے کہ شری رام کے چھوٹے بھائی بھرت نے اپنے لڑکے تکش کے نام پر اس یونیورسٹی کا نام رکھا۔ مہا بھارت میں بھی اس مقام کا ذکر ملتا ہے کہ یہاں پر راجا جنمے جیہ، ارجن کے پر پوتے نے حکومت کی تھی۔ تکشلا میں جہلم ندی کے کنارے حملہ آور بادشاہ سکندر کو 326 قبل مسیح راجا پورس نے روکا تھا۔ میں نے کھدائی کے دوران متعدد مقامات کا دورہ کیا۔ اس کھدائی کے کام میں ہندو، بودھ اور جین مندروں کے باقیات ملے ہیں۔ ساتھ ہی جدید ترقی یافتہ شہری تہذیب کے آثار بھی ملے ہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ اس مشترکہ تاریخ کے تمام حقائق پاکستان اور ہندوستان کے لوگوں کے لئے باعث افتخار ہیں۔

اگر چہ تکشلا کی عمارتیں کھنڈر ہو چکی ہیں لیکن حکومت پاکستان نے اس مقام کو میوزیم کی شکل میں سنوار کر رکھا ہے۔ یہ مقام چھوڑنے سے قبل میں نے میوزیم میں مہمانوں کیلئے رکھے رجسٹر میں لکھا— 'میں اس عظیم مقام کو دیکھ کر بہت خوش ہوا ہوں۔ تکشلا ایسا نام ہے جس سے ہماری تہذیب کی یادیں اجاگر ہوتی ہیں۔'

اسی دن میں اسلام آباد میں لوک ورسا میوزیم گیا۔ اس میں غیر منقسم ہندوستان کی ابتدائی تاریخ سے لے کر پاکستان کی کلاسیکل اور کلچرل وراثت کو دکھایا گیا ہے۔ ساتھ ہی ان کلاسیکلز میں ایران اور وسط ایشیا کے اثرات کو بھی دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ میں نے دنیا کے مختلف حصوں میں کئی میوزیم کا دورہ کیا ہے، لیکن لوک ورسا حقیقت میں شاندار میوزیم ہے۔ یہ موضوع اور خیالات دونوں ہی نظریوں سے سب سے بہترین ہے۔ اسے دیکھ کر فطری طور سے میرے دماغ میں گہرے ثقافتی تعلقات ابھرے جو برسوں سے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان موجود رہے ہیں اور ہماری مشترکہ ثقافتی وراثت انسانی دنیا کے لئے بیش قیمت تحفہ ہے۔ شام کو میں اسلام آباد کی مشہور شاہ فیصل مسجد گیا۔ پہاڑی پس منظر میں ایک بڑی اور خوبصورت فن تعمیر کو دیکھ کر بہت متاثر ہوا۔

اس دن میری متعدد اہم سیاسی میٹنگیں ہوئیں۔ پہلی میٹنگ جمعیۃ علمائے اسلام کے سربراہ اور پاکستان کی قومی اسمبلی کے حزب اختلاف کے لیڈر فضل الرحمٰن کے ساتھ ہوئی۔ جولائی 2003 میں فضل الرحمٰن کی ہندوستان دورے کی بہت تشہیر کی گئی تھی۔ انہوں نے واجپئی حکومت کے ذریعہ امن کی سمت میں کی گئی کوششوں کی پرزور حمایت کی تھی۔ دیگر اہم واقعات میں یہ بھی تھا کہ وہ بات چیت کے نئے دروازے کھولنے کیلئے نئی دہلی میں سنگھ اور وشو ہندو پریشد کے لیڈروں سے بھی ملے۔ ہم دونوں اس بات پر متفق تھے کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان تعلقات میں بہتری کے لئے ماحول میں کافی تبدیلی آئی ہے۔ 'لوگوں کے درمیان یہ یقین پیدا ہوا ہے کہ حقیقت میں آپسی بات چیت کا راستہ ہی درست راستہ ہے۔' میں نے کہا۔ اس سے قبل کے حالات سے موازنہ کیا جائے تو یہ اعتماد بہت بڑی کامیابی ہے۔ دنیا کے کئی ممالک نے بات چیت کے ذریعہ ایسے متنازع ایشوز کو حل کر لیا ہے جن کی وجہ سے ملک تقسیم ہو گئے تھے۔ مجھے امید ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے جو ایمانداری اور مسلسل گفت وشنید کے ذریعہ حل نہ کیا جا سکتا ہو۔ اس میں وقت لگے گا، لیکن 'بات کرتے کرتے حل دکھائی دیں گے۔ ہم صبر وتحمل کا دامن چھوڑے بغیر بات چیت کرتے رہیں گے تو حل خود بخود نکل آئے گا۔'

فضل الرحمٰن کا جواب بھی مثبت تھا۔'پاکستان میں آپ کے آنے سے امن کے عمل کو فروغ حاصل ہوا ہے' انہوں نے تبصرہ کیا۔'بین الاقوامی حالات بدل رہے ہیں۔اس سے ہندوستان اور پاکستان نزدیک آنے کے لئے مجبور ہیں۔دونوں ممالک کی عوام کے درمیان مذاکرات بڑھانے کی ضرورت ہے۔ہم اس سلسلے میں ہندوستان میں جمعیۃ علمائے ہند کے ساتھ مل کر کام کر رہے ہیں'

میں نے اسلام آباد میں پاکستان کی نیشنل اسمبلی کی عمارت کا دورہ کیا اور اسپیکر امیر حسین سے ملاقات کی۔سینیٹ کے چیئرمین محمد میاں سومرو نے بے حد احترام کے ساتھ مجھے اپنے گھر پر مدعو کیا اور ملک کی پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کے متعدد ممبران سے بات چیت کرنے کا موقع ملا۔میڈیا کے سامنے میں نے کہا'ہندوستان اور دیگر ممالک کے ممبران پارلیمنٹ کے درمیان'پارلیمنٹیرین فرینڈ آرگنائزیشن' کی شکل میں ہندوستان اور پاکستان کے ممبران پارلیمنٹ کے درمیان بھی ایسی ہی تنظیم بنانے کا وقت آ گیا ہے۔'سومرو اور حسین دونوں نے میرے مشورے کی ستائش کی۔

شام کو ہندوستانی ہائی کمشنر مسٹر مینن نے میرے اعزاز میں عشائیہ کا اہتمام کیا اور پاکستان کی راجدھانی کے معزز افراد کو بھی مدعو کیا۔ مہمانان میں وزیر خارجہ خورشید محمود قصوری کے علاوہ قومی اسمبلی میں پی پی پی کے تجربہ کار اور قابل احترام لیڈر مخدوم امین فہیم★ مشہور کرکٹ کھلاڑی اور تحریک انصاف پارٹی کے بانی عمران خان،معروف وکیل اور جمہوریت نواز اور'دا انڈس ساگا: فرام پاٹلی پترٹو پارٹیشن' کے مصنف بیرسٹر اعتزاز احسان اور 1978 میں میرے پہلے پاکستان دورے کے وقت نئی دہلی میں پاکستان کے اس وقت کے ہائی کمشنر عبدالستار شامل تھے،جو بعد میں خارجہ سکریٹری کے عہدہ پر فائز ہوئے اور اس کے بعد وزیر خارجہ۔عشائیہ کے وقت بات چیت جاری تھی۔ایک پاکستانی مہمان نے مجھ سے پوچھا' آڈوانی صاحب،آپ سندھی ہیں،جو تقسیم کے بعد ہندوستان میں جا کر آباد ہو گئے۔جب آپ وہاں گئے تو آپ کو کسی طرح کی تفریق یا بھید بھاؤ کا سامنا نہیں کرنا پڑا؟ آپ ہندوستان کی سب سے بڑی سیاسی پارٹی کے صدر کیسے بن گئے اور آگے چل کر ملک کے نائب وزیر اعظم؟ آپ ایسا کیوں سوچتے ہیں کہ ہندوستان سے پاکستان آنے والے لوگ جنہیں ابھی تک'مہاجر' کہا جاتا ہے پاکستان میں ایسی کامیابی حاصل نہیں کر سکا؟'

یہ ایک انتہائی حساس سوال تھا اور اس کا جواب دیتے وقت مجھے تھوڑی سی ڈپلومیسی اختیار کرنی پڑی۔میں نے جواب دیا' شاید آپ یہ جان کر حیران ہوں گے کہ نہ تو میں نے اور نہ ہی کسی سندھی، پنجابی یا بنگالی نے۔کبھی یہ محسوس کیا کہ ہم ہندوستان میں باہر سے آئے ہیں۔خواہ ہمیں کوئی بھی پروفیشن کیوں نہ منتخب کرنا پڑا ہو۔اس کی وجہ ہندوستانی سماج کی آپسی بھائی چارہ اور میل جول رکھنے کی روایت ہے۔یہ صرف غیر مقیموں کے معاملے میں ہی سچ نہیں ہے بلکہ ہندوستان کے مختلف مذاہب،قبائل،لسانی اور درج فہرست ذات وقبائل کے گروپوں کے بارے میں بھی یہی حقائق کھرے اترتے ہیں۔اس کی جڑیں حکومت کے جمہوری نظام اور ہماری ثقافت میں اندر تک بیٹھی ہوئی ہیں۔

بے نظیر بھٹو: یادوں میں

میں اس دن پاکستان پیپلز پارٹی (پی پی پی) کے 4 سینئر لیڈروں کے ساتھ اپنی یادگار میٹنگ کا ذکر کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔مخدوم امین فہیم کی قیادت میں تشکیل دیئے گئے وفد میں رضا ربانی،سجاد بخاری اور شیری رحمان شامل تھے۔ابتدا میں ہی میرے پاکستان دورے پر فہیم نے اپنی پارٹی کی صدر بے نظیر بھٹو کی جانب سے مجھے نیک خواہشات پیش کیں۔'پی پی پی کے ہم سبھی ممبران خوش ہیں کہ جب محترمہ بے نظیر بھٹو وزیر اعظم

★ فروری 2008 میں منعقد نیشنل اسمبلی کے انتخابات میں مخدوم امین فہیم کی قیادت میں پاکستان پیپلز پارٹی سب سے زیادہ سیٹیں جیتنے میں کامیاب ہوئی۔

تھیں، تب ہمارے لیڈر کے ذریعہ ہندوستان کے ساتھ شروع کی گئی بات چیت کے عمل نے اب رفتار پکڑ لی ہے۔' انہوں نے کہا میں نے ان سے درخواست کی کہ وہ ان کی نیک خواہشات کے لئے محترمہ بھٹو تک میرا شکریہ پہنچا دیں۔ فہیم اور میں دونوں ہی ہند- پاک کے درمیان امن کے عمل کو آگے بڑھانے کی ضرورت پر متفق تھے۔ میں نے تبصرہ کیا 'ہمیں سب سے پہلے آشا وادی ہونا چاہئے۔ ہند- پاک تعلقات کی بابت ہمیں یہ یقین ہونا ضروری ہے کہ ہم امن لا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک دیگر بات کی ضرورت ہے۔ کیونکہ یہ ایشوز طویل عرصہ سے چلے آ رہے ہیں، اس لئے ضروری ہے کہ دونوں ممالک صبر و تحمل سے کام لیں۔'

فہیم اور ان کے ساتھیوں نے بتایا کہ 'پی پی پی کی ہمیشہ یہی خواہش رہی ہے کہ ہندوستان کے ساتھ امن اور دوستانہ تعلقات قائم ہوں۔ ہم قبول کرتے ہیں کہ ایشوز کو حل کرنے میں وقت لگے گا۔ تب تک دونوں ممالک کو کشیدگی اور نفرت سے آزاد پس منظر میں دیگر ایشوز حل کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔'

جب فہیم نے امن کے عمل میں اہم تعاون کے لئے بی جے پی کی ستائش کی تھی تو میں ان کے لہجے میں سچائی دیکھ کر حیرت زدہ تھا۔ انہوں نے کہا 'اگر واجپئی صاحب اور آپ اس پہل کے لئے بذات خود کوشش نہیں کرتے تو اتنی دوری طے نہیں ہو پاتی۔' ان کے اس تبصرہ نے مجھے یہ کہنے کے لئے مجبور کر دیا کہ 'عوامی زندگی میں دونوں پارٹیوں اور لیڈروں کو کبھی کبھی شبیہ کا مسئلہ جھیلنا پڑ سکتا ہے۔ عوامی شبیہ موقع کے حقائق کے برعکس ہوتی ہے۔' پاکستان کے تئیں نظریہ کے سلسلے میں بی جے پی کے معاملے میں بھی برسوں تک یہی رویہ رہا۔ لوگوں کے دل میں یہ سوچ بن گئی کہ بی جے پی پاکستان مخالف ہے۔ عام طور سے لوگ یہاں تک سوچتے تھے کہ اگر کانگریس پارٹی نے پاکستان کے ساتھ تعلقات میں بہتری لانے کے لئے کوششیں کیں تو بی جے پی اس کی مخالفت کرے گی۔ تاہم حال ہی کی تاریخ سے اجاگر ہوتا ہے کہ ہماری پارٹی اور سرکار نے واجپئی کی قیادت میں پاکستان کے ساتھ تعلقات کو بہتر بنانے کے لئے مثبت ڈھنگ سے پیش رفت کی تھی۔ ہم نے اس عمل کی شروعات ہی نہیں کی بلکہ جنوری 2004 میں اس عمل کو اہم مقام تک پہنچا دیا، جب وزیر اعظم واجپئی اور صدر مشرف نے سرحد پار دہشت گردی کے سلسلے میں تاریخی مشترکہ اعلامیہ جاری کیا تھا۔ یہ بتاتے ہوئے پی پی پی لیڈروں کے ساتھ بات چیت ختم ہوگئی۔ 'حقیقت میں دورہ پاکستان سے آپ کے اور آپ کی پارٹی کے بارے میں ہمارے ملک کے لوگوں کی سوچ بدل گئی ہے۔' اس وقت یہ میٹنگ اور بھی زیادہ یادگار ہوگئی جب شام کو لندن سے بے نظیر بھٹو کا فون آیا۔ پہلے اور بعد کی بات چیت میں انہوں نے میرا استقبال کیا اور سندھی میں تھوڑا ہنسی مذاق کرنے کے بعد کہا 'آڈوانی صاحب یہ جان کر مجھے بہت خوشی ہے کہ آپ اپنی فیملی کے ساتھ پاکستان آئے ہیں۔ لیکن مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ آپ کے استقبال کے لئے میں پاکستان میں نہیں ہوں۔ پھر بھی میں نے کراچی میں رہنے والے اپنے خسر سے درخواست کی ہے کہ جب آپ کراچی جائیں تو وہ آپ کو فیملی کے ساتھ لنچ یا ڈنر پر مدعو کریں۔ میں نے ان سے یہ بھی درخواست کی ہے کہ وہ آپ کو ہمارے پشتینی گھر لڑکانہ بھی لے کر جائیں۔ اگر آپ وہاں جائیں اور سندھ کے قرب و جوار کے دیگر مقامات پر گھومیں تو مجھے بہت خوشی ہوگی۔' خوشگوار رویہ کے لئے میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ 'میں یقینی طور سے کراچی میں آپ کے خسر محترم سے ملوں گا۔ جہاں تک لڑکانہ جانے کی بات ہے میں پاکستان میں اور زیادہ وقت تک نہیں ٹھہر سکتا، اس لئے لڑکانہ جانے کے لئے مجھے دوسرے موقع کا انتظار کرنا ہوگا۔'

2008 کے شروع میں بے نظیر بھٹو سے ہونے والے مکالمہ کو یاد کر کے بہت دکھ اور شاک سا لگا۔ میرا دل غم سے بھر جاتا ہے کہ 27 دسمبر 2007 کو راولپنڈی میں ایک بڑے دہشت گردانہ حملے میں انہیں ہلاک کر دیا گیا۔ پاکستان کی تاریخ میں سب سے زیادہ محبوب اور کرشمائی

سیاست داں بے نظیر بھٹو جمہوریت کی حفاظت کے لئے جہادی دہشت گرد تنظیم کی شکار ہوئیں اور شہید ہوگئیں۔ وہ میری فیملی کی دوست تھیں اور پاکستان کی وزیراعظم کی شکل میں اپنے دو دورہ اقتدار (90-1988 اور 96-1993) میں ہندوستان کے خلاف اٹھائے گئے کچھ اقدام کے باوجود انہوں نے دونوں ممالک کے درمیان دوستانہ اور پرامن تعلقات کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ جب میں نے ان کے قتل کی افسوسناک خبر سنی تو اس وقت دبئی میں رہنے والے اور پاکستان جانے کی تیاری کر رہے ان کے شوہر آصف علی زرداری سے بات کی۔ میں نے گہرے رنج وغم کا اظہار کیا۔ انہیں اوران کے تین بچوں سے اظہار تعزیت کی۔

شام کو میڈیا سے بولتے وقت میں نے مضبوطی کے ساتھ دہشت گردانہ حملے کی مذمت کی اور کہا' پاکستان میں قومی انتخابات کے دوران بے نظیر بھٹو کو گولیوں کا نشانہ بنا کر قتل کر دینے کے بارے میں کوئی شبہ نہیں کہ پاکستان میں غیر یقینی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ طالبانائزیشن کا خطرناک عمل بھی جاری ہے۔ جہادی دہشت گردی کے خلاف ہندوستان میں جاری ہماری لڑائی کے لئے اس واقعہ کے سنگین نتائج کے بارے میں زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔'

میں پہلی بار 1990 میں بے نظیر سے ملا تھا جب وہ آنجہانی راجیو گاندھی کے آخری رسوم ادائیگی کے موقع پر دہلی آئی تھیں۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے میرا استقبال کیا اور سب سے پہلے یہ جملہ کہا' آڈوانی صاحب! تاؤ ھسان تا سندھیا میں گال ہایوں نا؟' (آڈوانی جی! ہمیں سندھی میں کیوں نہیں بات کرنی چاہئے؟) میں نے سندھی میں جواب دیا' ہاں ضرور' کچھ منٹ تک بات چیت کے بعد انہوں نے کہا' میں یہ اعتراف کرتی ہوں کہ میں آپ کے سامنے فراٹے دار سندھی نہیں بول سکتی۔' تب سے وہ جب بھی ہندوستان آئیں ہمیشہ لنچ یا ڈنر پر میرے گھر ضرور آئیں۔ وہ میری اہلیہ کملا کے ذریعہ بنائے گئے سندھی کھانے کی درخواست کرتیں اور میرے ساتھ ہند-پاک تعلقات اور دہشت گردی کے مسئلے پر بات چیت کرتیں۔ اس درمیان ہم اپنے دوستوں کے ذریعہ سے ایک دوسرے کو کتابیں بھیجتے۔

2001 کے ایک دلچسپ واقعہ کی یاد آتی ہے جب وہ لنچ پر میرے گھر آئی تھیں۔ مجھے پتہ چلا کہ وہ ملنسار خاتون ہیں اور انہیں لطیفے سننا پسند ہے۔ ان دنوں انٹرنیٹ لطائف کا اہم ذریعہ بن چکا تھا اور ایسے کئی لطیفے تھے جن میں ہندوستان اور پاکستان کے لیڈروں کو مذاق بنایا گیا تھا۔ میں نے اپنی بیٹی پرتبھا کو بتایا - وہ لطیفے سنا کر گھر آنے والے مہمان کو خوش کرنے میں کبھی نہیں چوکتی تھیں - 'تم بے نظیر کو ان کے بارے میں وہ لطیفے کیوں نہیں سناتیں'۔ تب پرتبھا نے سنایا—

> واجپئی سے ملنے نواز شریف دہلی آئے۔ ڈنر کے بعد واجپئی نے شریف سے کہا' تو نواز صاحب میں نہیں جانتا کہ آپ اپنی کابینہ کے ممبران کے بارے میں کیا سوچتے ہیں، لیکن میری کابینہ کے سبھی ممبران باصلاحیت اور سمجھدار ہیں۔' آپ کیسے جانتے ہیں؟' شریف نے پوچھا' اوہ، بڑا آسان طریقہ ہے'۔ واجپئی نے کہا' وزیر بننے سے پہلے انہیں ایک خاص امتحان دینا پڑتا ہے۔ ایک سکنڈ......'۔ انہوں نے آڈوانی کو بلایا اور پوچھا' آڈوانی جی، ذرا بتائیں آپ کے والدین کا ایسا بچہ کون سا ہے، جو آپ کا نہ بھائی ہے، نہ بہن؟'
>
> 'اوہ یہ تو بڑا آسان سوال ہے'۔ آڈوانی نے کہا' یہ تو میں ہوں'۔
>
> 'بہت اچھے آڈوانی جی'۔ واجپئی نے کہا۔

شریف بہت متاثر ہوئے۔ جب وہ اسلام آباد لوٹے تو ہندوستانی کابینہ کے ممبران کی ذہانت پر حیران تھے۔ انہوں

نے اپنے کابینہ سکریٹری کو ہندوستان کے وزیراعظم واجپئی کے یہاں ڈنر پر ہونے والی بات چیت سنائی اور انہیں کسی خاص وزیر کو ذہانت کا امتحان لینے کے لئے کہا۔ کابینہ سکریٹری نے اس وزیر کو بلایا اور کہا 'وزیراعظم نے آپ سے یہ سوال پوچھنے کے لئے کہا ہے کہ آپ کے والدین کا ایسا کون سا بچہ ہیں، جو نہ تو آپ کا بھائی ہے، نہ بہن؟'

وزیر سوچتا رہا، سوچتا رہا، لیکن جواب نہیں دے پایا۔ 'مجھے سوچنے کا موقع دیں۔ مہربانی کر کے وزیراعظم کو بتا دیں کہ میں کل تک جواب دے دوں گا'۔

'بیشک'۔ کابینہ سکریٹری نے کہا۔ 'آپ کو 24 گھنٹے کا وقت دیا جاتا ہے'۔

وزیر چلا گیا، اور جتنا سوچ سکتا تھا، سوچا۔ اس نے اپنے چیف سکریٹریوں کو بلایا، جوائنٹ سکریٹریوں کو طلب کیا، لیکن اس سوال کا کوئی حل نہیں نکل پایا۔ بیس گھنٹے کے بعد وزیر متفکر تھا، کیونکہ اس کے پاس ابھی تک کوئی جواب نہیں تھا اور اب صرف چار گھنٹے بچے تھے۔

بالآخر وزیر نے خود سے کہا 'میں یہ سوال بےنظیر سے پوچھوں گا۔ وہ کافی ہوشیار ہیں۔ وہ اس کا جواب ضرور جانتی ہوں گی۔ انہوں نے بےنظیر کو فون کیا۔ 'محترمہ، مجھے اس سوال کا جواب دیں کہ آپ کے والدین کا ایسا کون سا بچہ ہے جو نہ آپ کا بھائی ہے، نہ بہن؟'

'بڑا آسان سوال ہے'۔ بےنظیر نے کہا۔ 'وہ تو میں ہوں'۔

'بیشک'۔ وزیر خوش ہوگیا۔ اور کابینہ سکریٹری کو فون کیا 'مجھے جواب مل گیا ہے، وہ بےنظیر بھٹو ہیں'۔

'نہیں وزیر صاحب'۔ کابینہ سکریٹری نے کہا 'اگر آپ نے غلط جواب دیا تو آپ کو اپنا عہدہ چھوڑنا پڑے گا۔ صحیح جواب ہے۔ آڈوانی'

بےنظیر یہ لطیفہ سننے کے بعد اپنی ہنسی نہیں روک پائیں۔ انہوں نے کہا 'کیا آپ اس کا پرنٹ آؤٹ دے سکتی ہیں؟ میں اسے اپنے ساتھ لے جاؤں گی'۔

میں نے 18 راکتوبر 2007 کو آخری بار بےنظیر سے بات کی تھی۔ بیرون ملک میں کئی سال گزارنے کے بعد وہ اسی دن پاکستان لوٹی تھیں تاکہ اپنے ملک میں جمہوری نظام کے لئے سنگھرش کر سکیں۔ ان کے دشمنوں۔ جن کی شناخت غیر جانبدارانہ وآزادانہ تفتیش سے ہی ہو سکتی ہے۔ نے اسی دن اپنی منشا ظاہر کر دی تھی، جب ان کی واپسی پر ان کے جلوس پر دہشت گردانہ حملہ ہوا تھا، جس میں 125 سے زائد افراد مارے گئے تھے۔ اس دن میڈیا میں اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے میں نے کہا 'بدقسمتی ہے کہ جب پاکستان کی جمہوریت کے بارے میں اتنے بڑے بڑے دعوے کئے جا رہے ہیں، تب سابق وزیراعظم نواز شریف کو اپنے ملک لوٹنے سے منع کر دیا گیا ہے اور ایک دیگر سابق وزیراعظم بےنظیر بھٹو کا ان کی آمد پر دہشت گردانہ حملے کے ساتھ استقبال کیا گیا۔ میری ہمیشہ سے یہی سوچ رہی ہے کہ ہند۔ پاک تعلقات کو بہتر بنانے کے لئے مذہبی شدت پسندی اور دہشت گردی کے خلاف عزم مصمم کے ساتھ جمہوریت کے قیام سے ہی پاکستان میں استحکام اور ترقی کو یقینی بنایا جا سکتا ہے۔ بلاشبہ کراچی میں ہونے والا نقصان دہ لڑائی اور دہشت گردی کے خلاف جدوجہد، دونوں آپس میں جڑے ہیں۔ میں اپنے ملک کے لوگوں کے ساتھ اس لڑائی میں پاکستان کی عوام سے ہمدردی کا اظہار کرتا ہوں'۔

ٹیلی فون پر بات چیت کرتے وقت میں نے بے نظیر سے کہا تھا ’میں ایشور کا شکر گذار ہوں کہ آپ کی زندگی بال بال بچ گئی۔ ہندوستان کی عوام فوجی حکومت اور دہشت گردی کے تئیں آپ کی اس لڑائی میں آپ کے ساتھ ہے۔‘ اس ہمدردی کے لئے میں آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں‘۔ انہوں نے کہا۔ ’آڈوانی صاحب جب آپ 2005 میں پاکستان آئے تھے، تب میں پاکستان میں نہیں تھی۔ اب میں آگئی ہوں، میں چاہتی ہوں کہ آپ پھر یہاں مہمان بن کر آئیں‘۔

افسوس کی بات ہے کہ جب وہ اپنے وطن لوٹیں، تب موت ان کا انتظار کررہی تھی۔ میں نے ان کے لڑکے بلاول بھٹو اور فیملی کے دیگر ممبران کو اپنی نیک خواہشات بھی پیش کیں۔

2 جون 2005: لاہور

کٹاس راج مندر کیمپس کی تعمیر نو

اسلام آباد سے ہم چکوال ضلع میں کٹاس راج تک بذریعہ ہیلی کاپٹر گئے۔ چودھری شجاعت حسین، ان کی پارٹی کے ممبر اور ساتھی مشاہد حسین اور دیگر افراد ہمیں لے جانے کے لئے آئے تھے۔ اس کے بعد ہونے والے واقعات میرے ذہن و دماغ میں ہمیشہ کے لئے ثبت ہوگئے۔ کار سے ہم چھوٹی سی پہاڑی کے نیچے تک پہنچ گئے۔ جیسے جیسے میں اوپر چڑھ رہا تھا، ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ہم ایسے ہندو تیرتھ دھام کی یاترا کررہے ہوں، جو اب موجود نہیں ہیں۔ سورج میں تپش تھی۔ وہاں کی زمین اونچی نیچی اور ٹوٹی پھوٹی تھی۔ پہاڑی کی چوٹی سے میں متعدد منادر کو عقیدت کے ساتھ دیکھ سکتا تھا، جو ایسی حالت میں بھی گزشتہ زمانہ کے افتخار کی کہانی سنا رہے تھے۔ یہ کوئی معمولی جگہ نہیں تھی۔ پوری دنیا میں ہندوؤں کے لئے اس کی بہت اہمیت ہے۔ بارہ منادر اور مذہبی تعلیم کے لئے 7 گرہوں کے ساتھ غیر منقسم اور متحدہ پنجاب کی یہ سب سے زیادہ ہندوؤں کے تیرتھ کی جگہ تھی۔ اس کا مہابھارت سے بھی تعلق رہا ہے، جس کی پہاڑی کے نیچے کے شانت تالاب★ سے تصدیق ہوتی ہے۔

بارہ سال کے بنواس کے آخر میں پانڈو کٹاس کے جنگلوں میں گھوم رہے تھے۔ ان سبھی کو پیاس لگی تھی۔ سب سے بڑے بھائی یدیشٹھر (جنہیں دھرم راج بھی کہا جاتا تھا) نے نکل سے کہا کہ تھوڑا پانی لے آئیں۔ نکل تھوڑی ہی دور پہنچے تھے کہ انہیں ایک شفاف تالاب دکھائی دیا۔ اس کے چاروں جانب درخت لہرا رہے تھے۔ جیسے ہی انہوں نے ٹھنڈا پانی پینے کی کوشش کی۔ تب ہی ایک گرجدار آواز سنائی دی ’میرے سوالوں کا جواب دیئے بغیر اس پانی کو چھونا مت، نہیں تو اس کا نتیجہ اچھا نہیں ہوگا‘ نکل نے اس انتباہ کو نظر انداز کردیا اور فوراً ان کی موت ہوگئی۔ جب نکل نہیں لوٹے تو یدیشٹھر نے سہدیو کو دیکھنے کے لئے بھیجا کہ آخر کیا ہوا؟ سہدیو تالاب کے قریب پہنچے اور دیکھا کہ نکل سو رہے ہیں۔ انہیں اٹھانے سے پہلے وہ اپنی پیاس بجھانا چاہتے تھے، لیکن پھر وہی آواز سنائی دی۔ انہوں نے بھی اسے نظر انداز کردیا اور ان کی موت واقع ہوگئی۔ ارجن اور بھیم کی بھی یہی قسمت انتظار کررہی تھی۔ بالآخر متفکر یدیشٹھر بھائیوں کی تلاش میں خود نکل پڑے۔ وہاں کا منظر دیکھ کر وہ پریشان ہوگئے۔ انہوں نے سوچا کہ ان کے منہ پر تھوڑا سا پانی چھڑک کر وہ انہیں جگا سکتے ہیں، لیکن انہیں بھی وہی آواز سنائی دی۔ ’میں نے تمہارے بھائیوں کو انتباہ کردیا تھا، لیکن انہوں نے میری بات نہیں مانی، اس لئے زمین پر پڑے ہیں۔ اگر تم نے پہلے میرے سوالوں کا جواب نہیں دیا تو تمہارا بھی یہی حشر ہوگا‘۔

★ کہا جاتا ہے کہ بھگوان شو کٹاس کی آنکھ سے آنسو گرنے پر یہ تالاب بن گیا۔ سنسکرت میں ’کٹاس‘ کا ایک معنی ’بھری ہوئی آنکھیں‘ ہے۔ اس طرح سے ’کٹاس راج‘ نام پڑا۔

اس طرح سے یکش اور یدیشٹھر کے درمیان معروف یکش مکالمہ شروع ہوا۔ اس سے ہمیں اخلاقی تعلیم ملتی ہے۔ اور مفکرانہ دوراندیشی بھی۔ یکش کا آخری سوال تھا 'دنیا کا سب سے بڑا عجوبہ کیا ہے؟' یدیشٹھر کا جواب تھا 'دن بہ دن لاتعداد لوگ مرتے ہیں پھر بھی زندہ لوگ یہ سوچتے ہیں کہ وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ یہی سب سے بڑا عجوبہ ہے'۔

میں نے ایک چھوٹی سی تقریب میں کٹاس راج مندر کیمپس کے تعمیر نو کا افتتاح کرتے ہوئے سنگ بنیاد کی نقاب کشائی کی۔ مجھے بتایا گیا کہ 1947 کے بعد میں پہلا سیاسی فرد ہوں جسے پاکستان میں ہندو مندروں کی تعمیر نو سے متعلق پروجیکٹ کا افتتاح کرنے کے لئے مدعو کیا گیا۔ خاص طور سے شجاعت حسین کی یہ یقین دہانی دل کو چھوگئی 'ہم یہ نہیں چاہتے کہ جن مندروں کی تعمیر نو کی گئی ہے وہ محض سیاحوں کے توجہ کا مرکز بن جائیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ یہ مندر جگمگا اٹھے۔ یہاں روزانہ پوجا پاٹھ کی جائے۔ مستقبل میں ماضی کی طرح بڑی تعداد میں ہندو تیرتھ یاتریوں کو دیکھنا چاہوں گا'۔ حقیقت میں انہوں نے بھگوان شو کے اس چھوٹے سے تیرتھ دھام میں میرے اور میرے کنبہ کے لئے پوجا کا انتظام کیا تھا اور باقاعدہ پوجا پاٹھ کے لئے قریب کے گاؤں سے کسی پجاری کو خاص طور سے بلایا گیا تھا۔

تقریب کے بعد ہمیں قریب کے گاؤں میں کھانے پر لے جایا گیا۔ وہاں کے لوگوں کی محبت اور گرم جوشی دیکھ کر میرا دل باغ باغ ہوگیا۔ وہاں مجھے ایسے دو شخص ملے جنہیں فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ ایک کا نام یوسف صلاح الدین تھا۔ وہ عظیم اردو شاعر علامہ اقبال کے پوتے تھے۔ دوسرے شخص چکوال ضلع میں 'گاہ' گاؤں کے رضا محمد علی تھے۔ یہ گاؤں وزیراعظم ڈاکٹر منموہن سنگھ کی جائے پیدائش ہے۔ رضا محمد علی اس گاؤں کے پرائمری اسکول میں منموہن سنگھ کے ساتھ پڑھتے تھے۔ انہوں نے مجھے وزیراعظم کے لئے کٹاس راج مندروں کا بہت بڑا فوٹوگراف تحفے میں دیا۔ دہلی لوٹنے کے بعد میں نے ڈاکٹر سنگھ کو وہ فوٹوگراف سونپ دیا تھا۔

اس تقریب میں ذاتی طور پر میری عزت افزائی کی گئی تھی، لیکن اہم بات یہ تھی کہ نشانی کے طور پر یہ ہندوستان کے عوام کو دی گئی عزت کی سند ہے۔ جب میں لاہور لوٹنے کے لئے ہیلی کاپٹر میں سوار ہوا تب میں نے محسوس کیا کہ میں شجاعت حسین کا شکرگزار ہوں، احسان مند ہوں اور میں نہیں سمجھتا کہ میں کبھی ان کا قرض ادا کر پاؤں گا۔

بنیاد رکھنے کی تقریب کے بعد حکومت پاکستان نے اس پروجیکٹ کے عمل درآمد میں کافی پیش رفت کی ہے۔ پاکستان کے آرکیٹکٹوں کی ٹیم 2006 میں ہندوستان آئی تھی تاکہ مندروں کے ڈیزائن، اسٹرکچر اور تعمیر نو کے بارے میں جان سکے، یہ ٹیم مجھ سے ملی تھی۔ میں نے ان کے لئے جمنا کے کنارے بنے خوبصورت اکشر دھام مندر کو دیکھنے کا انتظام کرایا ہندوستان میں دور جدید تعمیر کا یہ سب سے شاندار مندر ہے۔ ان لوگوں نے بعد میں بتایا کہ وہ اس کی تعمیر سے بہت متاثر ہوئے ہیں۔

'پاکستان میں ہند مخالف اور ہندوستان میں پاک مخالف سوچ کی کوئی جگہ نہ ہو'

اس دن لاہور میں پہلا پروگرام ساؤتھ ایشین فری میڈیا ایسوسی ایشن (سافما) کے زیراہتمام منعقد کیا گیا تھا۔ پاکستان کے بے خوف اور مشہور صحافی نجم سیٹھی نے یہ پہل کی تھی۔ میں صبح کٹاس راج میں ملنے والے خوشگوار احساسات سے تروتازہ تھا۔ اسلام آباد میں گزارے دو دنوں کی یادیں بھی چھائی ہوئی تھیں۔ اس تقریب میں میری گفت وشنید کی جھلک ملتی ہے۔ 'میں اعتراف کرتا ہوں'۔ میں نے کہا 'میں اس ملے جلے احساسات کے بعد اپنے جذبات اور خیالات کا اظہار کرنے پر مجبور ہوں۔

میں نے سافما کو مبارک باد دی کہ 2000 میں شروع ہونے کے بعد اتنے کم وقت میں سارک ممالک کے صحافیوں کے لئے قابل بھروسہ منچ بن گیا۔ اس سے جنوبی ایشیائی برادری کی مضبوط روایت کو فروغ ملا۔ یہ جنوبی ایشیائی آزاد تجارتی تنظیم (سافٹا)، جنوبی ایشیائی کسٹم یونین، جنوبی ایشیائی کامن کرنسی، جنوبی ایشیائی انرجی گریٹ، جنوبی ایشیائی ڈیولپمنٹ بنک، جنوبی ایشیائی کوآپریٹو سیکورٹی، جنوبی ایشیائی انسانی تحفظ، جنوبی ایشیا حقوق انسانی سمیت جنوبی ایشیائی میڈیا پرسن و میڈیا مصنوعات کی آزادانہ ترسیل کے لئے ساؤتھ ایشین پروٹوکول جیسے حالیہ ایشوز کے وسیع سلسلہ اور مثبت امکانات کے لئے پُرجوش بحث و مباحثہ کا منچ بنا۔ میں نے مضبوطی کے ساتھ سافما کے اس اعلان کی حمایت کی 'امن کے نئے دور کے نتائج سے جنوبی ایشیائی برادری کو فائدہ ملنا چاہئے، تاکہ ہمارے لوگ اپنے بھاگیہ ودھاتا خود بنیں اور ساتھ ہی جغرافیہ، قبائل، قوم، جنس، نسل، رنگ کے بھید بھاؤ سے اوپر اٹھ کر تمام انسانیت کی ترقی میں تعاون دیں۔ یہ تاریخی لمحہ ہے۔ جب جنوبی ایشیا کے لوگوں نے یہ قبول کیا ہے کہ ان کا تحفظ و بہبود ملکوں کی آپسی لڑائی میں نہیں بلکہ ان کے آپسی پرامن بقائے باہم اور تعاون میں مضمر ہے۔ دونوں حکومتوں کو لوگوں کے اس اعلان پر توجہ دینی چاہئے'۔

جنوبی ایشیائی یعنی ہندوستان - پاکستان کے درمیان آپسی لڑائی اور سب سے زیادہ مشکل ایشوز پر تبصرہ کرتے ہوئے میں نے اپنے خیالات اس طرح پیش کئے —

اول: 'میں پاکستان کے عوام کو یہ بتانا چاہوں گا کہ اس معاملے پر نہ تو بی جے پی اور نہ ہی ہندوستان کے سیاسی نظام کا کوئی شعبہ پاکستان کا برا چاہتا ہے۔ پاکستان میں ہند مخالف اور ہندوستان میں پاک مخالف خیالات کے لئے کوئی جگہ نہیں ہونی چاہئے'۔

دوم: 'ہندوستانی و پاکستانی - دونوں کو ہی ایک دوسرے کی خودمختاری، تحفظ، ترقی، اتحاد اور جغرافیائی سالمیت کا احترام کرنا ہوگا۔ اگر دونوں ممالک میں سے کسی بھی ملک کی خودمختاری، سیکورٹی اور جغرافیائی حدود کو نقصان پہنچا ہے تو جموں وکشمیر کے مسئلے سمیت ہندوستان و پاکستان کے درمیان طویل مدت سے چلے آرہے کسی بھی باقی بچے ہوئے مسئلے کا کوئی حل نہیں نکل سکتا'۔

سوم: 'پُرامن راستے کے علاوہ کوئی بھی دوسرا حل دیرپا نہیں ہوسکتا۔ (یہ یقیناً ماننا چاہیے) دہشت گردی پوری انسانیت کی دشمن ہے اور کسی مہذب ملک میں اسے پناہ نہیں دی جاسکتی'۔

چہارم: آپسی قابل قبول حل کے لئے ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں کی اقتدار پر قائم حکومتیں اور اپوزیشن کو اتفاق رائے سے مل جل کر کام کرنا ہوگا'۔

اور اخیر میں، 'ہمیں ایک عرصے سے چلے آرہے تمام مسئلوں پر بلا روک ٹوک آگے بڑھنا چاہیے۔ کسی خاص مسئلے پر سست روی دیگر معاملوں کے تیزی سے حل کرنے کے راستے میں رکاوٹ نہیں ہونی چاہئے۔ صبر وتحمل کا کوئی نعم البدل نہیں ہے۔ ٹھیک اسی طرح سے جیسے آپسی یقین واعتماد اور تشدد سے پاک فضا میں بلا روک ٹوک اور مسلسل ڈائیلاگ یا بات چیت جاری رکھنے کا کوئی متبادل نہیں ہے'۔

میں اس وقت بہت خوش ہوا جب اخبار نویسوں اور دانشوروں کا بہت بڑا گروپ میرے خیالات پر اپنی رائے ظاہر کر رہا تھا اور دیر تک تالیوں کی گڑگڑاہٹ کے بعد چلنے والے آزادانہ سوال وجواب سے بھی متاثر ہوا۔

پنجاب کے وزیر اعلیٰ چودھری پرویز الٰہی کے ذریعے دیئے گئے عشائیہ کے ساتھ ہی وہ دن ختم ہوگیا۔ اس کے بعد ہم لاہور کا قلعہ دیکھنے گئے۔ رات کے وقت وہ قلعہ بہت عظیم الشان نظر آرہا تھا۔

3 جون، 2005: لاہور

گورنر ہاؤس، لاہور میوزیم اور ننکانہ صاحب کا دورہ

لاہور کے گورنر ہاؤس کا ہند- پاک امن عمل میں خاص مقام ہے۔ یہیں وزیر اعظم اٹل بہاری واجپئی نے فروری 1999 میں پاکستان کی تاریخی بس یاترا کے دوران یادگار نظم 'جنگ نہ ہونے دیں گے' سنائی تھی۔ یہاں میرا خیر مقدم کرتے ہوئے پنجاب کے گورنر لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) خالد مقبول نے کہا 'دورۂ پاکستان، آپ کے ذریعے اٹھایا گیا ایک حوصلہ مندانہ قدم ہے اور اس سے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جاری امن عمل کو مضبوطی ملی ہے۔ (پاکستان آنے کے بعد) آپ نے جو کچھ کہا، اس سے امید کی کرن نظر آتی ہے۔' میں نے جواب دیتے ہوئے کہا، 'جی ہاں، دونوں ہی فریقین میں امید جاگی ہے۔ اس امید کو ارادہ یا یقین میں تبدیل کرنے کی ہماری مشترکہ ذمہ داری ہے، تا کہ امن عمل کامیاب ہو سکے۔'

منظم طریقے سے رکھا گیا میوزیم حقیقت میں کسی بھی ملک کی تاریخ کا عکاس ہوتا ہے۔ لاہور کے سینٹرل میوزیم کو دیکھ کر میں بہت زیادہ متاثر ہوا۔ یہ ایشیا کے بہترین میوزیمس میں سے ایک ہے۔ متجسس سیاحوں کے لئے اس میں ہندوستانی تہذیب کے فروغ کے کئی ادوار اور آج کے پاکستان کا بیش قیمتی اثاثہ کے متعدد پرتوں کی جھلک ملتی ہے- وید، جین، بدھ، اسلام، سکھ اور برٹش۔ قدیم، عہد وسطیٰ اور جدید دور کے سکوں کا لاجواب نمونہ کافی دلچسپ تھا۔ میں اس میوزیم کے بیش قیمتی اثاثے کو دیکھ کر حیران تھا۔ یہ مجسمہ دوسری صدی عیسوی کے پجاری گوتم بدھ کی پتھر کی تراشی ہوئی مورتی ہے، لیکن مجھے ہندو دیوی دیوتاؤں کی بے شمار ٹوٹی پھوٹی مورتیاں دیکھ کر افسوس ہوا۔

لاہور قلعے میں گرودوارے میں سجدہ کرنے کے بعد (جہاں میں نے 'لو مندر' اور شیش محل بھی دیکھے) ہم ہیلی کاپٹر سے ننکانہ صاحب کے لئے روانہ ہوئے۔ یہاں پر 1469 میں سکھ مذہب کے بانی گرو نانک دیو کا جنم ہوا تھا۔ گرو نانک دیو کے لڑکپن اور جوانی کی یادوں سے جڑے کئی مقامات (تیرتھ استھل) ہیں۔ مجھے ان میں مہاراجہ رنجیت سنگھ (1839-1780) کا دور حکومت بھی دکھائی دیا۔ انھوں نے لاہور کو اپنی ریاستی راجدھانی بنایا تھا۔ چونکہ سکھ رسم ورواج میرے کنبہ کا اٹوٹ حصہ ہے، اس لئے ننکانہ صاحب کا سفر ہمارے لئے حقیقت میں ایک تیرتھ یاترا تھی اور ہمارا ایک ادھورا خواب بھی پورا ہوا۔

لاہور میں مجھے ایک بات کا افسوس رہا کہ میں سینٹرل جیل نہیں جا سکا، جہاں پر سردار بھگت سنگھ کو اپنے دو ساتھیوں راج گرو اور سکھ دیو کے ساتھ 1931 میں برطانوی حکومت کے ذریعے پھانسی دی گئی تھی۔ میں نے ہندوستانی سفیر مینن سے کہا کہ کیا وہ میرے اس دورہ کا انتظام کر سکتے ہیں؟ انھوں نے مجھے بتایا کہ لاہور شہر کو جدید تر بنانے کے دوران وہ جگہ ہٹا دی گئی ہے۔ یہ جان کر مجھے گہرا صدمہ ہوا کہ پاکستان نے غیر منقسم ہندوستان کی تحریک آزادی کے عظیم مجاہدین کی یادیں ہی ختم کر دیں۔

4 اور 5 جون 2005: کراچی

جب ہم لاہور سے کراچی پہنچے تو نصف شب گزر چکی تھی۔ میرے کنبے میں تمام لوگ بہت خوش تھے کہ آخر کار ہم سندھ میں کراچی میں تھے۔ ایئرپورٹ سے گیسٹ ہاؤس تک کی سڑک سے یہ دیکھنے کی خواہش کم نہیں ہوئی کہ میری جائے پیدائش کیسی دکھائی دیتی ہے۔ لیکن اگلے دو

دنوں میں میں نے آج کا کراچی شہر ہی نہیں دیکھا جہاں عظیم الشان میگا پلیس کی چکا چوند میں اپنا 1947 کا شہر پہچان نہیں پا رہا تھا بلکہ تاریخ کی گلیوں میں بھی کھو گیا، جہاں ہند- پاک کی ماضی کے کچھ فیصلہ کن صفحات دوبارہ کھل رہے تھے اور یادیں جاگ اٹھی تھیں۔

میری فیملی اور میرے لئے کراچی میں تین سب سے اہم واقعات اس طرح تھے- میرے اس گھر کا سفر جہاں میں پیدا ہوا اور جہاں میری پرورش و پرداخت ہوئی اور اسکول جہاں میں نے تعلیم حاصل کی اور میری اہلیہ کملا کے معاملے میں صوفی سنت سائیں نور حسین شاہ کی زیارت اہمیت کی حامل تھی۔ میرے پشتینی مکان کا پتہ بدل گیا تھا- لال کاٹیج، جمشید کوارٹرس- یہاں تک کہ کراچی کے مقامی افسران بھی اس کا پتہ نہ لگا پائے۔ میں نے وہ جگہ ڈھونڈنے سے پہلے اس کی شناخت بتائی اور ہدایت بھی دی۔ جب میں وہاں پر گیا تو میں ان کی پریشانی سمجھ گیا تھا۔ 1978 میں میرے کراچی سفر کے وقت بھی بہت بڑے احاطے میں ایک منزلہ بنگلہ تھا، لیکن اب وہ عمارت موجود ہی نہیں تھی۔ گجرات سے آنے والا ایک مسلم کنبہ 1947 سے وہاں رہ رہا تھا، اس نے اسے توڑ کر ایک بہت بڑا کثیر المنزلہ اپارٹمنٹ کمپلیکس بنوالیا تھا۔ والد کی موت کے بعد وہ املاک بیٹوں میں تقسیم ہوگئی تھی۔

اس کے باوجود ایک بیٹے نے ہمارا کھلے دل سے استقبال کیا اور ہمیں گھر کے اندر لے گیا۔ اس مکان کے اندر ہر چیز میرے لئے انجان تھی لیکن اچانک میں ایک کمرے میں پرانے ڈیزائن کی لکڑی کا پلنگ دیکھ کر خوش ہوگیا۔ یہ میرے بچپن کا پلنگ تھا۔

اسی طرح سینٹ پیٹرک ہائی اسکول کے سفر کے دوران میں ماضی میں کھو گیا۔ اسکول کافی بڑا ہو گیا تھا، لیکن پرانے زمانے کی یادیں، خوبصورتی و دلکشی ابھی بھی موجود تھی۔ پرنسپل نے میرا جذباتی انداز میں استقبال کیا۔ یونیفارم میں اسکولی بچوں کا بینڈ استقبالیہ نغمہ کی دھن پر ہمارا استقبال کررہا تھا۔ 1978 کے اسی اسکول نے میرے لئے خاص طور سے استقبالیہ پروگرام کا انعقاد کیا لیکن اس بار پہلے سے زیادہ بڑے پیانے پر یہ انعقاد کیا گیا تھا۔ میں بچوں اور ٹیچروں کی محبت سے جذباتی ہوگیا۔ ان کی محبت ہندوستان کے تئیں خیر سگالی کا مظہر تھی۔ میں نے شکریہ عرضداشت کے دوران اپنے طالب علمی کے زمانہ کا ذکر کیا۔ اس وقت پرنسپل فادر موڈے اسٹین اور دیگر ٹیچروں کو یاد کیا۔ (ان میں سے کچھ 1978 کے دورے کے وقت حیات سے تھے)۔ میں نے ایک دلچسپ واقعہ سنایا کہ کس طرح 1995 میں اسرائیل میں میرا ایک ساتھی ملا تھا۔ بلاشبہ میں نے اسکول کے ایک ایسے مشہور پرانے طالب علم کا ذکر کیا جو اس وقت پاکستان کے صدر تھے۔

اگر کوئی بچپن کی یادوں میں کھو جاتا ہے تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے صدیوں پرانا خزانہ مل گیا ہو۔ میرے لئے کراچی میں گزارے گئے میرے پہلے 20 سال ہمیشہ زندہ جاوید رہیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ اپنے گھر (یا جو کچھ بھی باقی تھا) اور اپنے اسکول کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوا، جیسے مجھے کوئی بیش بہا خزانہ مل گیا ہے۔ دراصل میں خود کو دوہری قسمت والا سمجھتا ہوں، کیونکہ اس بار میں نے اپنے رشتہ داروں کو بھی دکھایا کہ میں کہاں پیدا ہوا تھا اور کہاں پڑھا تھا۔

ہند- پاک تعلقات کی یہ مجبوری رہی ہے کہ دونوں ممالک کے درمیان نفرت کے باوجود جب ان ممالک کے لوگ ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو دل میں چھپے جذبات کا آتش فشاں پھوٹ پڑتا ہے۔ میرے مطابق امید کی یہ ہلکی سی کرن ہے کہ کسی دن نفرت کے جذبات تاریخ کے اوراق میں چلے جائیں گے اور پرامن واچھے پڑوسی ممالک سے تعلقات قائم ہوں گے۔ میں یہ محسوس کرسکتا ہوں کہ میں نے کراچی میں تاریخی سندھ اسمبلی کی بلڈنگ کا دورہ کیا جہاں پر میں نے پاکستان پیپلز پارٹی کے ارکان اسمبلی سے خطاب کیا۔ حکیم علی زرداری، آصف علی زرداری کے والد اور مرحومہ بے نظیر بھٹو جن کا میں پہلے بھی ذکر کرچکا ہوں کہ خسر نے ہمیں لنچ پر مدعو کیا۔ اگلے دن ہمیں سندھ کے وزیر اعلیٰ ڈاکٹر ارباب

غلام رحیم نے لنچ پر بلایا جو متحدہ قومی موومنٹ (ایم کیو ایم) سے جڑے ہیں۔

میں خاص طور پر متحدہ قومی موومنٹ کے ذریعہ منعقد استقبالیہ تقریب سے متاثر ہوا تھا۔ یہاں پر پرجوش حامیوں کی بھیڑ کے سامنے پارٹی کے بانی اور لندن میں مقیم چیئرمین الطاف حسین کا استقبالیہ پیغام پڑھا گیا۔ تقسیم کے بعد ایم کیو ایم کے حامی اتر پردیش، بہار اور دیگر ہندوستانی ریاستوں سے آئے مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد ہے۔ انہوں نے 'امن کا سفیر' کہہ کر میرا استقبال کیا۔ اس عزت واحترام کا میں قرضدار ہوں۔ میں یہ دیکھ کر بھی خوش ہوا کہ حال ہی کے عشروں میں سندھی اور مہاجر لوگوں کے درمیان میل ملاپ کا عمل تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے۔

میں ہندو پنچایت کے ذریعہ منعقد استقبالیہ تقریب کا ذکر کرنا کبھی نہیں بھول سکتا۔ بلاشبہ کراچی میں ہندو اس شہر کی حالیہ آبادی کا ایک چھوٹا سا حصہ ہیں۔ اس کے باوجود یہ لوگ ترقی یافتہ اور کامیاب ہیں۔ خاص طور سے روایتی طور پر تاجر ہونے کے ناطے۔ کئی منفی حالات کے برعکس انہوں نے مذہبی روایات زندہ رکھے اور کچھ مندروں کو تعاون دیا جو ابھی تک اس شہر میں موجود ہیں۔ (کلفٹن بیچ کے ساتھ ساتھ بذریعہ سڑک چلتے وقت میں سمندر کے سامنے بھگوان شیو کے چھوٹے سے مندر کو دیکھنے کے لئے رک گیا)۔ اس استقبالیہ تقریب کی ایک خصوصیت سندھی لوک گیتوں اور صوفی شاعروں کے کلام کا کنسرٹ تھا۔ روایتی سندھی ٹوپی پہنے میں، کملا، پرتبھا، جینت اور گیتکا کے ساتھ اسٹیج پر ان کے ساتھ شامل ہو گیا اور معروف سندھی سُروں میں سُر ملایا۔ اگرچہ ہندو فرقہ کے ذریعہ اس تقریب کا انعقاد کیا گیا تھا، لیکن میں یہ دیکھ کر خوش تھا کہ بڑی تعداد میں مسلمانوں نے اس میں شرکت کی۔

دراصل کراچی میں میرے دو دنوں نے لاہور اور اسلام آباد میں گزارے گئے چار دنوں کی طرح مجھے جذباتی بنا دیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ بہتر ڈھنگ سے سنجیدگی کے ساتھ میں نے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان تعلقات میں بہتری لانے میں کامیابی حاصل کی ہے، ساتھ ہی دنیا کے سامنے اپنی پارٹی کی حقیقی شبیہ پیش کی ہے۔

لیکن افسوس اور امید کے برعکس کراچی کے ایک واقعہ سے تنازع پیدا ہو گیا۔

حصہ-3
تنازع کا تجزیہ

انسان کی صحیح شناخت سکھ اور سہولیات کے لمحات میں اس کے رویہ سے نہیں، بلکہ چیلنج اور تنازع کے لمحات میں اس کے سلوک سے ہوتی ہے۔

— مارٹن لوتھر کنگ جونیئر (1964-1929)،
امریکہ کے حقوق انسانی جدوجہد کے عظیم مجاہد

تنقید جمہوریت کی روح ہے۔ اسے ہمیشہ صحت مند اور مستحکم حالت میں رہنا چاہئے تاکہ جمہوریت زندہ رہے۔ اگر کوئی سیاست داں تنقید پسند نہیں کرتا تو وہ تاناشاہ ہوتا ہے۔ اگرچہ جمہوریت کی بنیادی طاقت کے معمار تنقید کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کی بنیاد مکمل اور

غیر جانبدارانہ اطلاعات پر مبنی ہو۔ ایسا نہ ہونے پر بیکار کی تردید، بلاوجہ کا تنازع اور کبھی کبھی منفی نتائج کا جنم ہوتا ہے۔ ایسے وقت پر تنازع کا نشانہ بننے والے شخص کی فطرت اور اس کے سوچ کی پرکھ ہوتی ہے۔ یا تو وہ دباؤ میں آجاتا ہے یا وہ اپنے رویہ پر قائم رہتا ہے۔

میرے پاکستان دورے پر مرتکز تنازع اس وقت کھڑا ہوا تھا جب میں کراچی میں تھا اور اس ملک کے بانی اور پہلے گورنر جنرل قائداعظم محمد علی جناح کے مقبرے پر گیا اور میں نے ان کے بارے میں کچھ مثبت تبصرے کئے۔ جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں، چار جون کی صبح ہم کراچی پہنچ گئے تھے۔ یہ تین شہروں کے دورے کی آخری منزل تھی۔ پاکستان سرکار کا مہمان ہونے کے ناطے صبح اس شہر میں پہلا پروگرام اس سفید سنگ مرمر کے خوبصورت میموریل پر جانا تھا جو جناح کی یاد میں بنایا گیا ہے۔ 14 اگست 1947 کو پاکستان بننے کے ایک سال بعد (11 ستمبر 1948 کو) اس رہنما کی موت ہوگئی تھی۔ ہندوستان میں بھی یہ روایت ہے کہ مہمان خاص طور پر ملک کے مہمان، جمنا ندی کے کنارے واقع مہاتما گاندھی کی سمادھی راج گھاٹ پر ضرور آتے ہیں۔ جناح کی قبر پر گلہائے عقیدت پیش کرنے کے بعد میں نے وزیٹر بک میں مندرجہ ذیل پیغام لکھا—

> 'کئی لوگ تاریخ میں نہ مٹنے والے نقوش چھوڑ جاتے ہیں، لیکن بہت کم لوگ حقیقت میں تاریخ بناتے ہیں۔ قائداعظم محمد علی جناح ایسے ہی شخص تھے۔ ہندوستان کی آزادی کی لڑائی کے صف اول کی رہنما سروجنی نائیڈو نے جناح کے ابتدائی برسوں میں انہیں 'ہندو-مسلم ایکتا کا سفیر' کہا تھا۔ 11 راگست 1947 کو پاکستان کی آئین ساز اسمبلی میں جناح نے آئیڈیل سیکولر ریاست کی حمایت میں ایک زوردار تقریر کی تھی، جو شاندار تھی۔ اس تقریر میں انہوں نے کہا تھا کہ ایسی ریاست میں ہر ایک شہری اپنا مذہب ماننے کے لئے آزاد ہوگا، لیکن ریاست کسی شہری کے ساتھ مذہب کی بنیاد پر بھید بھاؤ نہیں کرے گا۔
>
> اس عظیم شخص کے تئیں میں خراج عقیدت پیش کرتا ہوں۔'

جیسے ہی میں دھوپ بھری گرمی کی صبح اس مقبرے سے باہر آیا مجھے ہندوستان اور پاکستان دونوں کے صحافیوں کے سوالوں کے بوچھار کا سامنا کرنا پڑا۔ میں نے کم وبیش وہی باتیں سبھی کو بتائیں جو کچھ لمحہ پہلے رجسٹر میں تحریر کی تھی۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ ہندوستان میں ٹی وی چینلوں پر یہ خبر فلیش کی جارہی تھی۔ اسے سب سے زیادہ سنسنی خیز خبر قرار دیا جارہا تھا۔ 'آڈوانی نے جناح کو سیکولر بتایا' 'آڈوانی نے جناح کو ہندو-مسلم ایکتا کا سفیر کہا۔' خبروں کی تصدیق کے لئے مسلسل مقبرے کے دورے کی ویڈیو فٹیج دکھائی جارہی تھی۔ اس کے بعد انہیں چینلوں نے بی جے پی کے تھنک ٹینک میں سے کچھ لوگوں کے ذریعہ کچھ تلخ تبصرہ کو دکھانا بھی شروع کردیا۔ 'غداری کو بڑھاوا دینے والا بھی ملک کا غدار ہے۔ اگر جناح سیکولر ہیں تو انہیں (آڈوانی کو) پورے کنبہ کے ساتھ سندھ کیوں چھوڑنا پڑا؟ بی جے پی صدر نے اپنا اصلی رنگ دکھا ہی دیا۔' آئندہ کئی دنوں تک یہ خبر اور تلخ آمیز تبصرے سرخیوں میں رہے۔ ہندوستان کے اخباروں اور ٹی وی چینلوں پر اس کا بول بالا رہا۔ جب میں نے اسی شام فون پر پارٹی کے کچھ ساتھیوں سے بات کی، تبھی تبصرہ کی فطری اور تیز تلخی کا احساس ہوگیا تھا۔

واضح طور سے میڈیا کی منفی رپورٹنگ کی وجہ سے میرے تبصرے پر یہ تنازع کھڑا ہوا تھا۔ خاص طور سے ٹی وی چینلوں پر میڈیا کا رویہ سنسنی خیز خبر اور سرخیوں پر فوکس رہا۔ رات دن بار بار اس خبر کو دکھانے سے اس پیغام کو تقویت ملی۔ جانے انجانے انھوں نے تاریخی سیاق و سباق، باریک فرق، مفہوم، دلائل اور خبروں سے جڑے لوگوں اور ایشوز کی پیچیدگیوں پر توجہ نہیں دی۔ دراصل میں نے جناح کو 'سیکولر' نہیں کہا تھا، بلکہ پاکستان کی تاریخ میں اہم موقع پر دی گئی ان کی خاص تقریر کا ذکر کیا تھا اور بتایا تھا کہ اس تقریر میں 'سیکولر اسٹیٹ' کی آدرش روپ میں اور مستحکم طور سے حمایت کی گئی تھی۔ اسی طرح میں نے جناح کو 'ہندو-مسلم ایکتا کے سفیر' نہیں کہا تھا، بلکہ سروجنی نائیڈو (1949-1879) کے ذریعہ ان

کے الفاظ استعمال کئے تھے۔ سروجنی نائیڈو انتہائی معزز جنگ آزادی کی سپاہی اور انڈین نیشنل کانگریس کی پہلی خاتون صدر تھیں۔

اگر میں نے سوچ سمجھ کر کچھ کیا تھا تو اتنا ہی کہ جناح کے مقبرے جیسے مقام پر جناح کے بارے میں تاریخ سے بہت کم واقف ان دو حقائق کو بھی اجاگر کیا تھا کیونکہ میں چاہتا تھا کہ ہندوستان اور پاکستان کے لوگوں کو بتایا جانا چاہئے کہ وہ اپنی مشترکہ تاریخ کے اس پہلو کو بھی جانیں۔ میں پاکستان کے لوگوں کو بتانا چاہتا تھا کہ جناح کا سیکولر اسٹیٹ★ سے متعلق نظریہ اور بعد میں اقلیتوں کو حاشیہ پر رکھنے والے پاکستان کی مذہبی پالیسی (تھیوکریٹک) اس ریاست کے درمیان موجود تضاد کے بارے میں سمجھیں۔

میں اپنے ملک میں ملنے والے منفی رویہ سے اداس تھا، تبھی میں نے جناح کے نظریہ کو اس سلسلے میں واضح کرنا اپنا فرض سمجھا جس پر میں نے خیالات پیش کئے تھے۔ میں نے ہر ممکن وضاحت اور غیر مشتبہ شکل میں دی گئی تقریر میں اپنے خیالات کو اجاگر کیا۔ میں نے کراچی' کاؤنسل آن فارن ریلیشنز، اکنومک افیئر ز اینڈ لا' کے ذریعہ منعقد مستند سیاسی ہستیوں، سفارت کاروں اور دانش ور طبقہ کے سامنے بولتے وقت یہ فرض ادا کیا تھا۔ اب میں یہاں اپنی تقریر کا حصہ پیش کر رہا ہوں۔

'میرے ذہن پر کراچی میں گزارے اپنی زندگی کے ابتدائی 20 سالوں کے کئی گہرے نقوش ہیں۔ ان میں سے ایک واقعہ پیش کر رہا ہوں، کیونکہ یہ یاد اس شخص سے اور اس کی سوچ اور نظریہ سے جڑی ہے، جس سے میں نے کراچی میں بہت کچھ سیکھا تھا اور میری زندگی میں ان کی بڑی عزت اور احترام ہے۔

کراچی میں اپنے آخری تین-چار برسوں میں سوامی رنگناتھ آنند کے رابطے میں آیا تھا جو 1942 سے رام کرشن مٹھ کے سربراہ رہے۔ جب تک 1948 میں اس مٹھ کو بند نہیں کر دیا گیا۔ میں بھگوت گیتا پر ان کے پروچن سننے جاتا تھا۔ بعد کے برسوں میں میں سوامی وویکا نند کے اس عظیم شاگرد کے مسلسل رابطے میں رہا، جو رام کرشن مٹھ اور مشن کے سربراہ بن گئے تھے۔

سوامی رنگناتھ آنند کا اس سال اپریل میں انتقال ہو گیا۔ آخری بار میں گزشتہ سال کولکاتہ میں ان سے ملا تھا۔ اس وقت ان کی عمر 97 سال

★ اعتزاز احسن پاکستان کے معروف جمہوریت نواز لیڈر ہیں۔ انہوں نے اپنی کتاب 'دی انڈس ساگا: فرام پاٹلی پتر ٹو پارٹیشن' (رولی بکس) کے 2005 کی وزیٹنگ بک کی شروعات ان الفاظ کے ساتھ کی تھی — 4/جون 2005 کو لال کرشن آڈوانی پاکستان کے بانی کے کراچی میں واقع مقبرے میں آئے۔ وزیٹنگ بک میں لکھے الفاظ سے ہند-پاک تقسیم کے دونوں ہی فریقوں کے درمیان طوفان کھڑا ہو گیا۔ پاکستان میں یہ احتجاج کیا گیا کہ قائداعظم جناح کی سوچ و فکر کو سیکولر کیوں کہا گیا؟ ہندوستان میں سخت گیری کے حامیوں نے یہ الزام لگایا کہ فرقہ پرست جناح کو سیکولر کیوں کہا گیا؟ دونوں فریق نے بیرسٹر محمد علی جناح کو سیکولر کہنے پر اعتراض کیا۔ لیکن مجبوری ہے کہ دونوں فریق نے ایک لفظ 'سیکولر' کے الگ الگ معنی پہنائے۔ پاکستان کے پس منظر میں سیکولر ہونا بدنما داغ ہے۔ پاکستان کے لوگوں کا بہت بڑا گروہ سیکولر کا معنی 'مذہب' کے خلاف قرار دیتا ہے- ایسی ریاست جو کسی بھی مذہب کے خلاف لڑتی ہے جو مذہب پر چلنے سے روکتی ہے۔ اسلامی ملک پاکستان سیکولر اسٹیٹ کیسے ہوسکتا ہے؟ ہندوستان کے نظریہ سے مذہب کی بنیاد پر 'الگ ملک' کا مطالبہ کرنے والا مسلم سیکولر نہیں ہوسکتا ہے۔ نہ ہی ایسی 'ریاست' کو 'سیکولر' ریاست کہا جاسکتا ہے۔ سیکولر ہونے کے لئے ریاست کو سبھی مذاہب کے تئیں غیر جانبدار ہونا ہوگا اور اسے کسی بھی مذہب کے تئیں جھکاؤ نہیں رکھنا ہے۔

'سرحد کی دونوں جانب جناح کو غلط سمجھا گیا۔ اسی طرح سے آڈوانی کو غلط سمجھا گیا، لیکن ایسا ہونا فطری تھا کیونکہ گزشتہ چھ عشروں میں کسی بھی فریق نے نہ تو ایک دوسرے کو سمجھا ہے، نہ ہی سمجھنے کی کوشش کی ہے۔'

تھی لیکن ان میں چستی اور روح کی روشنی موجود تھی۔ دیگر موضوعات کے ساتھ ساتھ ہماری بات چیت کا رخ ان کے اور میرے کراچی میں گزارے گئے برسوں کی جانب مڑ گیا۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا 'کیا آپ نے 11 راگست 1947 کو پاکستان کی آئین ساز اسمبلی میں محمد علی جناح کے ذریعہ دی گئی تقریر کا مطالعہ کیا ہے؟ یہ سیکولر اسٹیٹ کی ماڈل تعریف ہے جس میں ہر شہری کو اپنا مذہب ماننے کی ضمانت دی گئی ہے لیکن ریاست مذہب کی بنیاد پر شہریوں کے درمیان کوئی بھید بھاؤ نہیں کرے گا۔'

انہوں نے کہا کہ وہ جناح کی تقریر دوبارہ پڑھنا چاہتے ہیں اور مجھے پورا متن بھیجنے کے لئے کہا اور میں نے ویسا ہی کیا۔

آئین ساز اسمبلی میں جناح کی اس تاریخی تقریر کے ذکر کے پیچھے دو وجوہات ہیں۔ پہلا: جیسا کہ میں نے کہا تھا یہ سوامی جی جو ہندوستان میں روحانیت کے بڑے پیشوا تھے، کے ساتھ ہونے والی میری آخری بات چیت سے جڑی تھی۔ دوسرے چار دن قبل چکوال ضلع میں قدیم کٹاس راج مندروں کی میرے دورہ کی وجہ سے یہ یاد تازہ ہوگئی۔ حکومت پاکستان نے ان مندروں کو جو اب کھنڈر ہو چکے ہیں، لیکن ان مندروں سے جڑی کہانیاں مہابھارت کی کہانی سے جڑی ہیں، کہ تعمیر نو کے پروجیکٹ کی بنیاد رکھنے کے لئے مجھے مدعو کیا تھا۔

میں سوچتا ہوں کہ یہ مناسب ہوگا کہ جناح کی تقریر سے لئے گئے اس اقتباس کو پڑھا جائے——

'اب اگر ہم پاکستان 'اسٹیٹ' کو خوش حال اور ترقی یافتہ دیکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں مکمل طور سے عوامی بہبود پر مجتمع ہونا پڑے گا اور خاص طور سے عوام الناس اور غریبوں کی بھلائی پر۔ اگر ہم تعاون کے جذبات سے کام کریں گے اور ماضی کو بھلا کر، تلخی کو ختم کر کے کام کریں گے تو آپ کو یقینی طور سے کامیابی ملے گی۔ اگر آپ اپنے ماضی کو بھول کر اور ہر شخص کو اپنا سمجھ کر کام کریں گے، چاہے وہ کسی بھی فرقہ کا ہو، اس کے ماضی میں آپ کے ساتھ کیسے بھی تعلقات رہے ہوں، اس کا کوئی بھی رنگ ہو، ذات ہو یا نسل ہو، وہ پہلے دوسرے اور آخری شکل میں اس اسٹیٹ کا شہری ہوگا۔ اسٹیٹ میں اس کے یکساں حقوق، خصوصی اختیارات اور ذمے داریاں ہوں گی۔ اگر آپ ایسی راہ پر چل پڑیں گے تو آپ کی کامیابی کی کوئی انتہا نہیں ہوگی۔

میں اس بات کو جتنا زور دے کر کہوں اتنا کم ہے۔ ہم اسی جذبات کے ساتھ کام کریں گے اور وقت کے ساتھ ساتھ اقلیتی و اکثریتی فرقہ یعنی ہندو فرقہ اور مسلم فرقہ جیسے بھید بھاؤ ختم ہو جائیں گے۔ حقیقت میں آپ مجھ سے پوچھیں تو ہندوستان کے سامنے آزادی اور آزادی کے حصول کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی رہی تھی، ورنہ ہم بہت پہلے ہی آزاد ہو چکے ہوتے۔

اس لئے ہمیں اس سے سبق سیکھنا ہوگا۔ آپ آزاد ہیں، آپ اپنے مندروں میں جانے کے لئے آزاد ہیں۔...... آپ مسجد جا سکتے ہیں یا پاکستان اسٹیٹ میں کسی بھی عبادت کی جگہ پر جا سکتے ہیں۔ آپ کسی بھی مذہب یا قبائل یا نسل کے ہو سکتے ہیں، اسٹیٹ کا اس سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہندو ہندو نہیں رہیں گے اور مسلم مسلم نہیں رہیں گے —— مذہبی معنی میں نہیں، کیونکہ مذہب آدمی کا ذاتی معاملہ ہے —— لیکن سیاسی معنی میں اس اسٹیٹ کے شہری کی شکل میں۔'

جناح کی تقریر میں ملک کے سامنے تمام شہریوں کے یکساں اور مذہبی آزادی کا ذکر کیا گیا ہے۔ اسے ہندوستان میں 'سیکولر اسٹیٹ' کہا جاتا ہے۔ ایسے اسٹیٹ میں مذہب کے نام پر بھید بھاؤ نفرت اور جانبداری کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ یقینی طور پر ایسے اسٹیٹ میں مذہبی شدت پسندی اور دہشت گردی کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔

میرا ماننا ہے کہ ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش- غیر منقسم ہندوستان کے حالیہ دور میں تین خود مختار اور علیحدہ حلیفوں کو اس ماڈل کی تقلید کرنی چاہئے۔ تہذیب کے نظریہ سے ان تینوں کی مشترکہ وراثت ہے۔ مجھے امید ہے کہ اس ماڈل کا پورے خلوص اور جوش سے اقتدا کیا جائے گا۔ کٹاس راج مندروں کی تعمیر نو اس سمت میں ایک خوش آئند شروعات ہے۔

کراچی میں میرے محترم دوستوں، لوگ اکثر مجھ سے پوچھتے ہیں 'کیا اس کا مطلب ہے کہ آپ تقسیم کو دور کرنا چاہتے ہیں۔' میرا جواب ہے 'تقسیم کو بدلا نہیں جاسکتا...... اگر چہ اس تقسیم سے جڑی خامیوں کو دور کیا جاسکتا ہے اور انہیں دور کیا جانا چاہئے' میں اس دن کا خواب دیکھتا ہوں جب ٹوٹے ہوئے دل ایک ہوجائیں گے، جب منقسم کنبہ دوبارہ مل جائیں گے، جب ایک ملک کے تیرتھ یاتری- ہندو، مسلم، سکھ- دوسرے کے ملکوں میں واقع مقدس مقامات پر آزادانہ طور پر جاسکیں گے اور جب لوگ! پنے اپنے ملکوں کے مہذب شہری ہوتے ہوئے آزادانہ طور پر دورے اور تجارت کرسکیں گے۔★'

شبیہ بدلنے کی کوشش نہیں

پاکستان دورے کو ہفتہ اور ماہ گزر جانے کے بعد بھی ہندوستانی میڈیا میں جناح کے بارے میں اور ہندوستانی جنگِ آزادی کی تحریک میں ان کے کردار کے بارے میں تنازع موضوع بحث بنا رہا۔ اچانک ہندوستان میں سیاسی بحث و مباحثہ سے حقیقت میں غائب ہوچکی اہم تاریخی ہستی دوبارہ زندہ ہوگئی۔ اس کی وجہ میرا پاکستان دورہ سے پیدا ہونے والا تنازع رہا۔ اس بارے میں وسیع پیمانہ پر شک وشبہ اور منفی خیالات موجود تھے اور قیاس آرائی کی جارہی تھی کہ میں نے ملک کے لوگوں کے ذہنوں میں جناح کو دوبارہ زندہ کرنے کے بارے میں کیوں سوچا؟ کیا میں نے طالع آزمائی کے نظریہ سے ایسا کیا تھا؟ کیا میں نے اپنی 'شبیہ تبدیل' کرنے کے لئے ایسا کیا تھا؟ اور میں حقیقت میں جناح کے بارے میں کیا سوچتا ہوں؟ پاکستان سے واپسی پر میرے بارے میں یہ سوچا جانے لگا کہ جناح نے اپنی زندگی میں جو کچھ کیا یا کہا میں اس کی حمایت کرنے لگا ہوں۔ یہ خیالات بے بنیاد تھے۔ ہندوستانی جنگ آزادی میں جناح کے مکمل کردار کے بارے میں کسی حب الوطن ہندوستانی کے سامنے میرے بھی سنگین اعتراضات رہے ہیں۔

تقسیم کے سانحے کا الزام ہندوستان کی جنگِ آزادی تحریک میں شامل تمام لیڈروں میں سب سے زیادہ جناح پر ہی لگایا جاتا ہے۔ ان کے مذہبی عزائم، ہٹ دھرمی کی شخصیت اور چالاکی وفرقہ واریت سے متحرک علیحدگی پسند ذہنیت کی وجہ سے مسلم لیگ کو ملک کی تقسیم کے مطالبہ کے لئے بڑے پیمانہ پر حمایت حاصل کرنے میں مدد ملی تھی اور پاکستان نامی علیحدہ 'مسلم ملک' کا مطالبہ زور پکڑنے لگا۔ برطانوی حکومت کے خلاف جدوجہد کے آخری دور کے فیصلہ کن حالات میں انہوں نے ایسا خطرناک رویہ اپنایا جس سے مسلم لیگ کے ملک کی تقسیم کے مطالبہ سے تشدد آمیز جذبات بھڑک اٹھے۔ اس کی ایک مثال لیگ کی 'راست کارروائی کا دن' (16 راگست 1946) تھا۔ اسے 'لمبے چاقوؤں کا ہفتہ' کہا جاتا ہے، جس میں کلکتہ میں 6 ہزار سے بھی زائد بے گناہ لوگوں جس میں بیشتر ہندو تھے، کا قتل عام کیا گیا۔

جناح نے ہی مسلم لیگ کے اس دعوے کو صیقل کیا کہ برطانوی حکومت کے ساتھ مستقبل میں بات چیت کرنے کے لئے ہندوستان کے مسلم فرقہ کا اکلوتا ترجمان مسلم لیگ ہوگی۔ 1938 میں پٹنہ میں منعقدہ میٹنگ سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا 'کانگریس ہندو تنظیم کے

★ کراچی میں میری تقریر کا پورا متن پڑھنے کے لئے ضمیمہ-5 دیکھیں

علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ یہی حقیقت ہے اور کانگریس لیڈر بھی اسے خوب جانتے ہیں۔ کچھ گمراہ اور مطلب پرستوں سے جڑے مسلمانوں کی موجودگی سے کانگریس پارٹی ملک کی تنظیم نہیں ہو سکتی۔ میں یہ چیلنج کرتا ہوں کہ کوئی بھی اس بات کی تردید کر کے دکھائے کہ' کانگریس ہندوؤں کی تنظیم نہیں ہے۔' جناح نے ہی یہ کہہ کر مسلم لیگ کے دو قومی نظریہ کو عقلی نظریہ سے درست ٹھہرایا اور اس کی پوری حمایت کی، ہندو اور مسلمانوں میں کچھ بھی یکساں نہیں ہے۔ دونوں کی الگ ثقافت، الگ نسلیں، الگ قوم ہے۔ ان کی الگ تاریخ ہے۔'

اس کے باوجود تقسیم کی تحریک کے پیچھے بنیادی مقصد کی شکل میں سرگرم جناح کے منفی پہلو کی وجہ سے ہمیں ان کی الگ شخصیت کے ایک اور زاویے کو مسترد نہیں کر دینا چاہئے جو 1930 کے عشرہ کے وسط تک ان کی سیاسی شخصیت کی شناخت تھی۔ وہ 1896 میں انڈین نیشنل کانگریس میں شامل ہوئے اور سب سے مقبول رہنما گوپال کرشن گوکھلے (جنہیں گاندھی جی نے اپنا سیاسی استاد کہا تھا) کے اثر میں آئے۔ جناح گوکھلے کو اپنا آئیڈیل قرار دیتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کی خواہش تھی کہ وہ 'مسلم گوکھلے' کہلائیں۔ ممبئی میں نوجوان اور ہونہار وکیل کی شکل میں انہوں نے 1905 میں لوک مانیہ بال گنگا دھر تلک پر چلنے والے مشہور ملک سے بغاوت کیس میں ان کا مقدمہ لڑا تھا۔

جناح 1913 میں آل انڈیا مسلم لیگ میں شامل ہو گئے، تاکہ مسلم فرقہ کے اندر منظم اور قومی خیالات کو فروغ ملے۔ 1916 میں لکھنؤ معاہدے پر انہوں نے کانگریس پارٹی کے نمائندہ لوک مانیہ تلک کے ساتھ مسلم لیگ کے صدر کے طور پر دستخط کئے تھے۔ یہ معاہدہ غلامی کے خلاف ہندوستانی عوام کے اتحاد کی لڑائی کا عروج رہا۔ 1925 میں آئین ساز اسمبلی میں بولتے وقت انہوں نے اعلان کیا 'میں اولاً قوم پرست ہوں، پھر قوم پرست اور آخر میں بھی قوم پرست ہی رہوں گا۔' ڈاکٹر کے ایم منشی نے اپنی کتاب' آئی فالو دی مہاتما' میں لکھا ہے — 'ان دنوں جناح مکمل قوم پرست تھے۔ انہوں نے ملک کے مفاد میں مسلم لیگ اپنائی اور لکھنؤ سمجھوتے کے لئے کام کیا، تب وہ ملک سے پہلے فرقہ سے پیار نہیں کرتے تھے۔

'کیا ہم پہلے ہندوستانی ہیں یا ہندو اور مسلم ہیں؟' ہندوستان کی جنگِ آزادی کے سات سال بعد بھی قوم پرستی پر بڑے پیمانے پر چلنے والی بحث میں یہ سوال برقرار ہے۔ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ کس طرح جناح نے اپنی زندگی کے ابتدائی قوم پرستی کے دور میں اس سوال کو حل کیا۔ راجہ محمود آباد نے 1926 میں لکھنؤ میں جناح سے ہونے والی ملاقات کا دلچسپ تذکرہ کیا ہے۔ اس وقت راجا کی عمر 12 سال تھی۔ 'میں ابھی اسکول سے لوٹا ہی تھا کہ میرے والد مجھے ان سے ملاقات کرنے کے لئے لے گئے۔ وہ چھت پر باتیں کر رہے تھے۔ انہوں نے مجھے اپنے پاس بلایا اور میری تعلیم کے بارے میں پوچھا۔ تب انہوں نے مجھ سے پوچھا 'تم پہلے مسلمان ہو یا ہندوستانی؟' حالانکہ میں اتنی عمر میں اس سوال کا مطلب نہیں سمجھ پایا تھا پھر بھی میں نے جواب دیا کہ میں پہلے مسلمان ہوں پھر ہندوستانی۔' اس پر جناح اونچی آواز میں بولے 'نہیں میرے بچے، تم پہلے ہندوستانی ہو پھر مسلم۔'

ان دنوں اس موضوع پر بحث چھڑی ہوئی تھی کہ مذہب کی بنیاد پر مسلم طبقہ کو ریزرویشن دیا جانا چاہئے یا نہیں؟ آج کی کانگریس پارٹی اس تقسیم کرنے والے مطالبہ کی حمایت کر رہی ہے۔ یہ دہرانا مناسب ہوگا کہ اس موضوع پر جناح کیا سوچتے تھے۔ 1905 میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے تاریخی کلکتہ سیمینار میں بولتے ہوئے (جس میں انہوں نے لارڈ کرزن کے ذریعہ بنگال تقسیم کی یہ کہہ کر مخالفت کی تھی کہ اس کا ہدف ہندو مسلم اتحاد میں پھوٹ ڈالنا ہے) کہا 'میں آپ کی توجہ ان حقائق کی جانب مرکوز کرنا چاہتا ہوں کہ مسلم فرقہ کے ساتھ ہندو فرقہ کی طرح ہی رویہ اختیار کیا جانا چاہئے۔ انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد اسی پر ہے کہ کسی فرقہ کے لئے کوئی ریزرویشن نہ ہو۔'

سیاسی ایشوز کے تئیں جناح کی سیکولر نظریہ کی وجہ سے خلافت تحریک (1919-24) کی مخالفت کی۔ یہ برطانوی حکومت پر دباؤ ڈالنے

اور پہلی جنگ عظیم کے بعد سلطنت عثمانیہ کے ذریعہ چلائی گئی ایک سیاسی مہم تھی۔ 1923 میں مسلم لیگ کے لاہور سمینار میں بولتے وقت جناح نے کہا تھا' میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جس دن ہندو اور مسلمان ایک ہو جائیں گے اسی دن ہندوستان میں ڈومینئن رسپونسیبل گورنمنٹ (ہندوستانیوں کا خودمختار ملک) بن جائے گا۔ ہندو-مسلم اتحاد کا ایک دوسرا معنی ہے آزادی۔

جناح جیسے کٹر قوم پرست اچانک فرقہ پرست اور علیحدگی پسند کیسے بن گئے؟ اس کا سب سے زیادہ صحیح جواب مشہور ماہر قانون، سفارتکار اور اندرا گاندھی کی وزارت میں وزیر رہ چکے محمد کریم چھاگلا نے دیا جو 1980 میں ممبئی میں منعقد بی جے پی کے قیام کے کانفرنس میں مہمان خصوصی تھے۔ اس کتاب کے شروعات میں ان کے بارے میں تفصیل سے ذکر ہے۔ نوجوان وکیل کی شکل میں چھاگلا کے جناح کے ساتھ نزدیکی تعلقات رہے ہیں، کیونکہ انہوں نے ممبئی ہائی کورٹ میں ان کے جونیئر کے طور پر کام کیا تھا۔ ان کی دلچسپ خودنوشت 'روزیز ان دسمبر' میں جناح اور چھاگلا کی شخصیت پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ پہلے چھاگلا بھی مسلم لیگ کے رکن رہ چکے تھے۔ انہوں نے لکھا ہے---

'ان دنوں مسلم لیگ ہندو-مسلم اتحاد میں یقین رکھتی تھی۔ یہ مکمل سیکولر تنظیم تھی۔ جناح اور نذرالحق جیسے لوگ مذہبی مقلد مسلمانوں کی حمایت نہیں کرتے تھے، جب کہ خلافت تحریک میں شدت پسندی کا اظہار کیا جا رہا تھا۔ میں نے ہمیشہ محسوس کیا کہ گاندھی جی نے خلافت کے مقصد کی حمایت کر کے ہندو-مسلم اتحاد قائم کرنے میں غلطی کی تھی۔ ایسا اتحاد ریت کے ڈھیر پر ہوتا ہے۔ جب تک مذہبی مفاد پورے ہوتے رہے ایکتا قائم رہی، لیکن جب یہ بات ختم ہوگئی یہ اتحاد بھی کمزور نظر آنے لگا۔ کانگریس کی جانب متوجہ کرنے کے لئے خلافت والوں نے اپنا اصلی رنگ دکھانا شروع کیا۔ یعنی وہ ملک کے بجائے مذہب کے تئیں متوجہ تھے۔ مسلم لیگ اس عنصر سے لڑنا چاہتی تھی اور سیکولر کانگریس کے ساتھ مل کر مشترکہ مقصد طے کرنا چاہتی تھی۔

جب تک جناح قوم پرست رہے مسلم لیگ کی پرانی پالیسی جاری رہی۔ میں بھی جناح کی حمایت کرتا رہا اور لیگ کا بھی، لیکن جیسے ہی جناح پر فرقہ وارانہ خیالات کا اثر پڑا اور انہوں نے دو قومی نظریہ کی تشہیر کی، میں ان سے اور لیگ سے الگ ہوگیا۔ جناح کے ایک قوم پرست سے فرقہ پرست رہنما کی شکل میں بدلنے سے متعلق راز، راز ہی رہا ہے۔ مجھے اس بات پر یقین کرنا مشکل ہے کہ جناح ایک دن پاکستان کے معمار بنیں گے۔ ان کے قوم پرستانہ جذبات خالص تھے۔ اتنی سہل اور اتنی آسانی سے ان کے بارے میں یہ امید کرنا کہ وہ ایک جھٹکے سے ایک سمت سے دوسری سمت میں چلے جائیں گے، میرے خیال میں انسانی عادت کے بارے میں یہ ممکن نہیں ہے۔

جناح کیوں بدلے؟ اس سوال کے کئی جواب ہو سکتے۔ جناح کا سب سے بڑا دشمن ان کا اِگو تھا۔ خواہ ان کا ہدف کچھ بھی رہا ہو، انہوں نے اس کے لئے یا تو لیڈر کی حیثیت سے کام کیا یا اہم تحریک پسند کی شکل میں۔ ہندوستانی سیاست میں گاندھی جی کی عادت سے جناح نے محسوس کیا کہ ان کی اہمیت آہستہ آہستہ کم ہو رہی ہے۔ جناح اور گاندھی جی مختلف خیالات کے مالک تھے۔ جہاں گاندھی مذہب اور اخلاقی اقدار میں، عدم تشدد میں یقین رکھتے تھے وہیں جناح صرف پروفیشنل سیاست میں یقین رکھتے تھے...... بدقسمتی سے جناح جواہر لال نہرو کو بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ دونوں کبھی بھی ایک ساتھ نہیں چل پائے۔'

پاکستان سے لوٹنے کے کچھ ماہ بعد ایک دن دہلی یونیورسٹی کی ماہر سیاسیات ڈاکٹر اجیت جاوید نے مجھے ایک کتاب دی۔ ان کی عرق ریز

تحقیق اور فکر وخیالات سے بھرپور کتاب کا عنوان 'جناح: سیکولر اینڈ نیشنلسٹ' ★ تھی۔' میں جناح کے بارے میں آپ کے تبصرے کی قدر کرتی ہوں۔ انہوں نے کہا 'حقیقت میں میں نے اپنی کتاب میں اس کا ذکر کیا ہے۔' اس کتاب میں یہ پڑھ کر حیران تھا کہ پاکستان کی تعمیر کے بعد جناح کو اپنے پرانے گھر کی - ہندوستان کی - یاد ستاتی رہی۔

'پاکستان میں جناح کی 'اداسی' کی ایک وجہ ممبئی ★★ میں چھوڑے گئے گھر کی یاد بھی تھی۔ پاکستان میں ہندوستان کے پہلے ہائی کمشنر شری پرکاش لکھتے ہیں۔' جناح کا دل کراچی میں ان کے گورنمنٹ ہاؤس میں نہیں تھا، بلکہ ممبئی کے مالا بار ہلز میں بسا تھا۔' جب شری پرکاش نے انہیں بتایا کہ حکومت ہندوستان ان کے مکان کو ایکوائر کر رہی ہے تو انہیں دھچکا لگا اور تقریباً اذیت ناک لہجہ میں انہوں نے کہا 'شری پرکاش میرا دل مت توڑو۔ جواہر لال نہرو سے کہہ دو اس طرح میرا دل نہ توڑیں۔ میں نے بڑی محبت سے ایک ایک اینٹ جوڑ کر وہ مکان بنایا ہے۔ تم نہیں جانتے کہ مجھے ممبئی سے کتنا پیار ہے۔ میں ابھی بھی وہاں لوٹنا چاہتا ہوں۔' پھر شری پرکاش نے جناح سے پوچھا 'کیا میں وزیر اعظم سے کہہ دوں کہ آپ لوٹنا چاہتے ہیں؟' بانیٔ پاکستان کا جواب تھا 'ہاں ایسا کہہ سکتے ہو۔' ★★★

ڈاکٹر جاوید نے اپنی کتاب میں لکھا ہے۔ 'وہ (جناح) اداس اور بیمار تھے۔ وہ بے چین ہو کر چلا اٹھے 'میں نے پاکستان بنا کر سب سے بڑی غلطی کی۔ میں دہلی جانا چاہتا ہوں اور نہرو کو بتانا چاہتا ہوں کہ کیوں نہ ماضی کی بیوقوفیوں کو بھلا کر دوبارہ ہم اچھے دوست بن جائیں۔'

میں نے جناح کے ان دو پہلوؤں کا تفصیلی ذکر کیا ہے تاکہ قارئین کو بتایا جا سکے کہ ہم تاریخ اور تاریخی لوگوں کے تئیں صحیح اور غیر جانبدار رائے بنائیں۔ جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں، ہندوستان کی تقسیم میں یقینی طور سے کردار ادا کرنے کے قصوروار جناح ہیں اور وہ لوگ انہیں اسی شکل میں یاد رکھیں گے جن کے خیال میں ہندوستان کی تقسیم ایسا سانحہ ہے جس کے مضر اثرات ابھی تک ختم نہیں ہوئے ہیں۔

★ انتہائی مقبول ڈاکٹر اجیت جاوید کی اس کتاب میں یہ معلومات دی گئی ہیں کہ 'مولوی اور مولانا جناح کی پاکستان کی سوچ کے ایک دم خلاف تھے۔ جب پاکستان کے بارے میں اتفاق ہو گیا تو 14 رجولائی 1947 کو نئی دہلی میں ایک پریس کانفرنس میں جناح سے پوچھا گیا کہ کیا پاکستان شدت پسند مذہبی (تھیوکریٹک) ملک ہوگا؟ جناح نے فوراً ردعمل ظاہر کیا - آپ مجھ سے بے تکا سوال پوچھ رہے ہیں۔ میں مذہبی (تھیوکریٹک) اسٹیٹ کا معنی ہی نہیں جانتا۔' (Faizebooks.com,2005 صفحہ 356-57)

★★ تاریخ کی لاچاری رہی ہے کہ جناح کے نواسے نسلی واڈیا ممبئی کے مشہور ہندوستانی تاجر ہیں۔ وہ بھارتیہ جن سنگھ کے کٹر حامی بن گئے اور بعد میں بی جے پی کے بھی۔ راشٹریہ سویم سیوک سنگھ اور جن سنگھ کے تجربہ کار اور قومی لیڈر ناناجی دیشمکھ کے ذریعہ سے وہ اٹل جی اور میرے رابطے میں آئے اور برسوں سے ہمارے تعلقات قائم ہیں۔ جناح نے ممبئی کے سب سے امیر پارسی تاجر سر ڈنشا پیٹٹ کی اکلوتی لڑکی رتن بائی (رتی) سے شادی کی تھی۔ نسلی کی والدہ اور جناح کی بیٹی دینا نے نیولے واڈیا سے جناح کی خواہش کے خلاف شادی کی تھی۔ انہوں نے مسلمان سے شادی نہ کرنے کی وجہ سے اپنی بیٹی کو چھوڑ دیا تھا۔ مالا بار ہلز، ممبئی میں واقع جناح کے شاندار بنگلے (جناح ہاؤس) پر اب نسلی واڈیا کا دعویٰ ہے۔ میں یہاں اس دلچسپ حقائق کا ذکر کرنا چاہتا ہوں کہ جب میں نے 1990 میں رام رتھ یاترا کی شروعات کی تھی تاکہ اجودھیا میں رام مندر بنوانے کے لئے حمایت حاصل کی جا سکے تو میرے کچھ حریفوں نے یہ کہہ کر میرا مذاق اڑانے کی کوشش کی تھی 'مسٹر آڈوانی کیسے رام بھگت ہیں ان کا قریبی دوست پاکستان کے بانی کا نواسہ ہے۔'

★★★ پاکستان میں ہندوستانی ہائی کمشنر شری پرکاش نے یہ بھی لکھا ہے کہ جناح پاکستان کو 'سیکولر اسٹیٹ' بنانا چاہتے تھے۔ ('پاکستان: برتھ اینڈ ارلی ایئرس، میناکشی پبلشر، 1965، صفحہ 84-83)

15

مجھے کوئی افسوس نہیں

جب آپ نے فیصلہ کر لیا ہے کہ آپ کیا چاہتے ہیں، جب آپ نے محسوس کیا
ہے کہ اسے کر ہی دینا چاہئے، تو تنہا کھڑے ہونے کا اور
اس کی ذمہ داری لینے کا حوصلہ کیجئے۔
— ایلینار روزویلٹ (1962-1884)، امریکی صدر فرینکلن روزویلٹ
کی اہلیہ اور مشہور سماجی خدمت گار

جب مجھے پہلی بار پتہ چلا کہ میرے اس دورے کے دوران جناح کے مقبرے پر کئے گئے تبصرے سے طوفان کھڑا ہو گیا ہے تب میں کراچی میں ہی تھا۔ میں نے اپنے اسٹاف سے کہا کہ پاکستان کی آئین ساز اسمبلی میں دی گئی جناح کی تقریر کا پورا متن دہلی میں میری پارٹی کے ساتھیوں کو بھیجیں، جس میں جناح کی سیکولر سوچ و خیالات کا اظہار ہوتا ہے۔ میرے پاس اگلے دن 5/جون 2005 کو کراچی کاؤنسل آن فارن رلیشنز، اکنامک افیئرس اینڈ لاء' میں دی جانے والی تقریر کی اصل کاپی تھی جس میں میں نے جناح کی تقریر کے بارے میں تفصیل سے بتایا تھا۔ اس تقریر کی یہ کاپی بھی پارٹی ہیڈ کوارٹر کو بھیج دی گئی۔

حقیقت میں ایسا پہلی بار نہیں ہوا تھا کہ عوامی اسٹیج پر میں نے جناح کے سیکولر پاکستان کے بارے میں خیالات و نظریے کا ذکر کیا ہو۔ 28/فروری 2004 کو میرے ساتھی دینا ناتھ مشر کے ذریعہ قائم کی گئی انڈیا فرسٹ فاؤنڈیشن میں مجھے پروفیسر ایس جی کا شکر کی تصنیف 'ڈائیلاگ ود پاکستان' کتاب کے اجراء کے لئے مدعو کیا تھا۔ معروف ہندی صحافی دینا ناتھ مشر کا سنگھ کی قیادت کے ساتھ طویل عرصہ تک نزدیکی تعلق رہا ہے۔ میری رہائش گاہ پر منعقد اس تقریب میں پارٹی اور سنگھ پریوار کی مختلف تنظیموں کے متعدد سینئر لوگ موجود تھے۔ میڈیا نے بھی اسے کافی کوریج دیا۔ حقیقتاً میں نے اس موقع پر ایک تفصیلی خطبہ★ دیا۔ میں نے اس کی شرعات میں کچھ مہینے قبل کلکتہ میں سوامی رنگا ناتھ آنند سے ہونے والی آخری ملاقات کا ذکر کیا اور پاکستان کی آئین ساز اسمبلی میں جناح کے ذریعہ کی گئی تقریر کے بارے میں بحث کا ذکر کیا۔ سیکولرزم اور ہند-پاک تعلقات کو

★ 28/فروری 2004 کو 'انڈیا فرسٹ فاؤنڈیشن' کے ذریعہ منعقد تقریب میں دی گئی تقریر کا پورا متن پاکستان میں کٹاس راج کے ہندو مندروں کی تعمیر نو پر 2005 میں بی جے پی کے ذریعہ شائع باتصویر کتابچہ میں دستیاب ہے۔

بہتر بنانے کے سلسلے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے وقت میں نے ان کی تقریر کا تفصیلی انداز میں ذکر کیا۔ اس لئے کم سے کم میرے سیاسی فکرو خیالات کے پریوار والے ہی اس بارے میں واقف نہیں تھے، جس کے تحت میں نے جناح کی ستائش کی تھی۔

ٹی وی بلیٹن یا اخباروں میں سرخیاں' آڈوانی نے جناح کو سیکولر کہا' دیکھ اور پڑھ کر عام لوگوں کا حیران، کچھ حد تک افسردہ ہونا بھی میں اچھی طرح سمجھ سکتا تھا، لیکن حقیقت میں مجھے جس بات سے سب سے زیادہ تکلیف ہوئی تھی یہ تھی کہ کچھ لوگوں نے سارے حقائق اور پس منظر جانے بغیر یہ سوچ لیا کہ میں نے نظریاتی گناہ کیا ہے، اس لئے 6 رجون کی صبح پاکستان انٹرنیشنل ایئر لائنس کی فلائٹ میں دہلی آنے کے لئے سوار ہونے سے قبل ہی میں نے بے چین دل سے یہ فیصلہ لے لیا تھا کہ میں بی جے پی کے عہدۂ صدارت سے استعفیٰ دے دوں گا۔ ★★

7 رجون کو میں نے استعفیٰ دے دیا۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو بتایا کہ اگر ان کا مجھ پر اعتماد اور یقین نہیں ہے تو میں پارٹی صدر کے طور پر کام نہیں کرنا چاہوں گا۔ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ میں اس وقت کافی غم زدہ تھا تو بھی بی جے پی کے پارلیمانی بورڈ اور مرکزی عہدیداران نے میرا استعفیٰ قبول نہیں کیا۔ 8 رجون کو منعقد ایک میٹنگ میں انہوں نے اتفاق رائے سے قرارداد پاس کر کے مجھے پارٹی کی قیادت کرنے کی درخواست کی، 'جیسا کہ میں نے ماضی میں انتہائی شاندار طریقے سے قیادت کی ذمہ دار سنبھال رکھی تھی' اس میں یہ بھی بتایا تھا کہ 'مسٹر آڈوانی عوامی زندگی میں شاندار اقدار کی نمائندگی کرتے ہیں۔ گزشتہ کچھ عشروں میں قوم پرستی پر جاری بحث پر صحیح اور منطقی انداز سے اپنے نظریوں کے ساتھ انہوں نے اپنا موقف رکھا۔ انہوں نے ہماری سوچ وفکر کو بیش بہا تعاون دیا ہے۔ پارٹی کو ان کی قیادت سے بہت فائدہ ہوا ہے اور مستقبل میں بھی ان کی قیادت کی ضرورت ہے۔ پارٹی مسٹر آڈوانی کے بارے میں وشو ہندو پریشد کے کچھ لیڈروں کے ذریعہ استعمال کئے گئے انتہائی نازیبا، قابلِ اعتراض زبان مسترد کرتی ہے۔ ان خیالات سے عوامی گفت وشنید کا معیار گرا ہے۔ ایسی تلخ اور قابلِ اعتراض زبان کا ملک میں قوم پرست تحریک

★ میں یہاں خاص طور سے یہ ذکر کرنا چاہوں گا کہ اٹل جی اور جسونت سنگھ سمیت متعدد پارٹی کے ساتھیوں نے میرے اس تبصرہ پر اٹھنے والے تنازع میں میرا ساتھ دیا۔ 7 رجون 2005 کے 'ٹریبیون' میں خبر شائع ہوئی 'بمعنز ہوائی اڈے پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے وقت مسٹر واجپئی (جو منالی میں چھٹیاں ختم کر کے دہلی لوٹ رہے تھے) نے پاکستان میں مسٹر آڈوانی کے ذریعہ پیش کئے گئے خیالات کی حمایت کی۔ سابق وزیراعظم نے کہا 'جناح کے بارے میں ان کے ذریعہ دیئے گئے تبصرہ کو غلط جامہ پہنایا گیا ہے۔' 9 رجون 2005 کو rediff.com نے لکھا 'اسرائیل کے دورے پر گئے سابق وزیر خارجہ جسونت سنگھ نے آڈوانی کو پیغام بھیجا کہ وہ جناح کے بارے میں ان کے خیالات سے پوری طرح متفق ہیں کہ "جناح سیکولر تھے، یہ تاریخی سچائی ہے۔"'

ان کے علاوہ پیجاور مٹھ، اڈوپی کرناٹک کے انتہائی محترم شری وشویش تیرتھ سوامی جی نے بھی میرا ساتھ دیا تھا۔ 16 رجون 2005 کو ایک پریس ریلیز میں انہوں نے کہا 'وشو ہندو پریشد کی مرکزی قیادت کی ہری دوار میں ہونے والی دو روزہ میٹنگ (15-14 رجون) میں شرکت کرنے کے بعد میں نئی دہلی آیا ہوں۔ میں نے حال ہی میں پاکستان دورے کے وقت مسٹر آڈوانی کے بارے میں وشو ہندو پریشد کی تجویز کی مخالفت کی ہے۔' اس قرارداد میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ بی جے پی صدر کو اپنا عہدہ چھوڑ کر 'سیاست سے سنیاس' لے لینا چاہئے۔ وشو ہندو پریشد کا بانی ممبر ہونے کے ناطے میں نے اس تجویز کے حقائق اور زبان، دونوں کی مخالفت اپنا فرض سمجھا...... مسٹر آڈوانی جنہوں نے طویل عرصہ تک ملک اور ہندوؤں کے مفادات کے لئے کام کیا ہے، جیسے قابلِ ستائش لیڈر کی مذمت کرنے کے لئے ایسی زبان کے استعمال نے ہندو سماج کو حیرت میں ڈال دیا ہے۔ میری وشو ہندو پریشد کے اپنے ساتھیوں سے درخواست ہے کہ وہ ایسے اشتعال انگیز رویہ کو چھوڑ دیں، جو ہندو ثقافت اور ان کی روایات کے خلاف ہے۔ اس سے بین الاقوامی برادری کی نظر میں ہندو آندولن کی غلط اور منفی شبیہ پیش ہوتی ہے۔'

کی طاقت پر منفی اثر پڑے گا۔ ایسے خیالات ہندو دھرم کی روایت کے خلاف ہیں۔'

10 رجون کو اس بورڈ کی دوبارہ میٹنگ ہوئی جس میں بی جے پی ریاستوں کے وزرائے اعلیٰ بھی شامل تھے۔ اس میں مندرجہ ذیل قرارداد جاری کیے گئے —

'بھارتیہ جنتا پارٹی اپنے صدر مسٹر ایل کے آڈوانی کی لکیر سے ہٹ کر پاکستانی دورے کی ستائش کرتی ہے۔ ہفتہ بھر کے اس دورے سے ہند-پاک کے لوگ اور زیادہ قریب آئے جس سے ان کے درمیان موجود بے شمار غلط فہمیوں کے دور ہونے میں مدد ملی اور بہتر تعلقات کی جانب عوام کا جوش و امنگ اونچائی تک پہنچا ہے۔ یہ سب مسٹر اٹل بہاری واجپئی کی زیر قیادت حکومت کے ذریعہ اپنائی گئی دوستانہ پالیسی کی وجہ سے ممکن ہوا ہے۔ مسٹر آڈوانی کے دورہ کے تئیں پاکستان کے افسران اور عوام الناس کے ذریعہ دکھائے گئے جوش اور مثبت ردعمل سے ثابت ہوتا ہے کہ دونوں ممالک کے درمیان اچھے پڑوسی کے سے تعلقات قائم کرنے کے لئے این ڈی اے کی یہ پالیسی صحیح ہے۔

یہ جان کر پارٹی خوش ہے کہ مسٹر آڈوانی نے پاکستان کے صدر کے ساتھ سرحد پار دہشت گردی کا ایشو اٹھایا، ساتھ ہی دہشت گردی کے ٹھکانے فوراً ختم کرنے اور سرحد پار دہشت گردی کے بارے میں مثبت بات چیت کی۔ مسٹر آڈوانی نے اس پر زور دیا کہ جنوبی ایشیا میں مکمل امن تبھی ممکن ہوگا جب ہندوستان اور پاکستان ایسے مسائل کو اطمینان بخش طریقہ سے حل کرلیں گے۔

بی جے پی پاکستان سرکار کے ذریعہ پانڈووں کی آرام گاہ کے طور پر مشہور برصغیر کے مقدس کٹاس راج مندروں کی تعمیر نو کے پروجیکٹ کو شروع کرنے کے لئے مسٹر آڈوانی کو مدعو کرنے کے قدم کا استقبال کرتی ہے۔ ان کا کٹاس راج دورے کے تئیں انتہائی پر جوش ردعمل دونوں ممالک کی عوام کے درمیان طویل عرصہ سے چلی آ رہی غلط فہمیوں اور قیاس آرائیوں کو دور کرنے میں فیصلہ کن کردار ادا کرسکتا ہے۔ بی جے پی کو امید ہے کہ پاکستان اس سمت میں مزید ترقی کرے گا اور یہ یقینی بنائے گا کہ ہندوؤں اور دیگر مذہبی اقلیتیوں کے حقوق مکمل طور سے محفوظ ہوں اور مستقبل میں دیگر مندروں اور گرودواروں کی تعمیر و ترقی کی سمت میں حکومتی سطح پر ایسی پیش رفت کی جاتی رہے گی۔

مسٹر آڈوانی نے کٹاس راج کے اس واقعہ کا خیر مقدم کرتے ہوئے اسے مبارک آغاز کہا ہے۔ اس سلسلے میں جناح کو سیکولر نہ بتاتے ہوئے انہوں نے پاکستان کے لوگوں کو اس ملک کی آئین ساز اسمبلی میں بانئ پاکستان کے ذریعہ کی گئی تقریر کو یاد کرایا جس میں جناح نے سبھی شہریوں کو مذہبی آزادی اور مذہب کی بنیاد پر شہریوں سے کسی طرح کا بھید بھاؤ نہ کرنے پر زور دیا تھا۔

بی جے پی یہ دہراتی ہے کہ خواہ جناح کی پاکستان کے بارے میں کوئی بھی سوچ رہی ہو لیکن ان کے ذریعہ قائم اسٹیٹ مذہبی اور غیر سیکولر ہے۔ ہندو اور مسلمانوں کے لئے دوقومی نظریہ بی جے پی کے اصولوں کے خلاف ہے۔ بی جے پی نے فرقہ کی بنیاد پر ہندوستان کی تقسیم کی ہمیشہ مذمت کی ہے اور کرتی رہے گی اور جناح کے ذریعہ پہلے کی برٹش حکومتوں کے ذریعہ دی گئی دوملکی نظریہ کو مضبوطی سے مسترد کرتی رہے گی۔ ان حقائق کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ جناح نے پاکستان بنانے کا

ہدف حاصل کرنے کے لئے فرقہ وارانہ تحریک کی قیادت کی جس کی زد میں آکر ہزاروں بےقصور لوگ مارے گئے اور لاکھوں لوگ بےگھر و بےروزگار ہوگئے۔'

اس مدت کے دوران مجھے ریاستی سطح کے اپنی ساتھیوں اور ملک بھر کے کارکنوں کے پیغام بھی ملے۔ سبھی یہ اپیل کر رہے تھے کہ میں اپنا استعفیٰ واپس لےلوں۔ اپنے ساتھیوں کی اجتماعی خواہش کا احترام کرتے ہوئے اور پارٹی کے مفاد کو دھیان میں رکھتے ہوئے میں نے ان کی بات مان لی اور استعفیٰ واپس لےلیا۔

پاکستان کے کئی لوگ جو اس دورے کے دوران مجھ سے ملے تھے وہ ہندوستان میں پھیلے تنازع کو جان کر ششدر رہ گئے۔ یہاں معروف پاکستانی صحافی حامد میر کے تبصرے نقل کئے جا رہے ہیں جنہوں نے 'جیو ٹی وی' پر انٹرویو کے وقت یہ الفاظ کہے تھے★ —

'پاکستان ایل کے آڈوانی کے قول سے دوبار سکتے میں رہ گیا۔ پہلا: جب انہوں نے انٹرویو کے وقت دعویٰ کیا کہ وہ پاکستان سے نفرت نہیں کرتے اور محمد علی جناح کا احترام کرتے ہیں۔ جب ان کا انٹرویو جیو ٹی وی پر نشر کیا گیا تب کئی پاکستانیوں نے سوچا کہ وہ جھوٹ بول رہے ہیں اور ہندوستان جاکر وہ اپنا بیان بدل دیں گے۔ آڈوانی نے جناح کے بارے میں پاکستان میں اپنا بیان بار بار دہرایا۔ دوسری بار لوگ تب ششدر رہ گئے جب انہوں نے دہلی لوٹنے کے بعد بی جے پی کے صدر کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔ جو لوگ یہ سوچتے تھے کہ وہ اپنا خیال یا بیان بدل دیں گے، وہ سبھی حیران تھے۔ ان کا نام ابھی بھی اخباروں کے کالم اور پاکستان کے اداریہ میں موضوع بحث بنا ہوا ہے۔ میں نے تقریباً اسی وقت دورے پر آئے ہندوستانی وزارت کے وزیر منی شنکر ایّر سے کہا کہ وہ آڈوانی کے استعفیٰ پر اپنے ردعمل کا اظہار کریں۔ تب مسٹر ایّر نے مسکراتے ہوئے کہا 'مجھے ان کی فکر نہیں ہے۔ ان کی سیاسی زندگی ختم ہوگئی ہے۔' جب ٹی وی پر ایّر کا ردعمل ٹیلی کاسٹ کیا گیا، کئی ناظرین نے مجھے فون کیا اور مشورہ دیا کہ آڈوانی کے استعفیٰ پر بحث ہونی چاہئے۔ میں نے جیو ٹی وی پر 'کیپٹل ٹاک' میں میر واعظ عمر فاروق- پاکستان دورے پر آنے والے علیحدگی پسند کشمیری لیڈر- اور شیخ رشید احمد- وزیر اطلاعات، پاکستان- کو مدعو کیا۔ ہم نے 40 منٹ تک آڈوانی کے بارے میں بحث کی۔ میں اس وقت حیران تھا جب دونوں نے آڈوانی کی حمایت کی اور امید کا اظہار کیا کہ مسٹر آڈوانی اصولوں کو ماننے والے ہیں اور جلد ہی وہ اس سیاسی بحران سے باہر آجائیں گے۔ کشمیر کے علیحدگی پسند لیڈر نے کہا کہ حقیقت میں مسٹر آڈوانی نے 2 سال قبل حریت سے بات چیت شروع کردی تھی۔ اس وقت وہ حکومت میں تھے۔ فاروق نے کہا کہ پاکستانی عوام نے حال ہی میں ان کا ایک پہلو دیکھا ہے لیکن کشمیر کے عوام تو دوسال پہلے ہی ان کا ایسا رویہ دیکھ چکی ہے۔'

★ حامد نے مجھ سے ایک سوال یہ بھی پوچھا کہ 'گزشتہ اور آج کے آڈوانی میں کیا فرق ہے؟' میں نے جواب دیا 'میں دعویٰ کرسکتا ہوں کہ جو میں آج ہوں وہی کل تھا، میں نہیں بدلا۔ پاکستان میں مجھے غلط سمجھا گیا۔ میں سوچتا ہوں کہ جدید اور خوشحال پاکستان میں ہی ہندوستان کا مفاد مضمر ہے۔ میں پاکستان سے نفرت نہیں کرتا۔

("I do not hate Pakistan", Rediff.com, 6 June, 2005)'

'ہمیں اپنی سوچ پر قائم رہنا چاہئے'

بدقسمتی سے اس سے بحران کا خاتمہ نہیں ہوا۔ ایک دن 2005 کے وسط میں مجھ سے کہا گیا کہ پارٹی میں جاری سلور جوبلی سال کے آخر تک مجھے بی جے پی کی صدارت سے ہٹ جانا چاہئے۔

اس سے مجھے کافی تکلیف ہوئی۔ میں گومگو کی حالت میں تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے؟ مجھے اس حالت میں کیا ردعمل ظاہر کرنا چاہئے؟ میری سیاسی زندگی میں ایسے حالات کبھی پیدا نہیں ہوئے جب میں کسی عہدے سے یا اس سے ملے پر اثر طاقت کے تئیں راغب ہوا۔ میں نے دوبارہ پارٹی صدر بننے کی خواہش ظاہر نہیں کی تھی۔ اس کے برعکس میں نے سبھی لوگوں سے یہ کہا تھا کہ اکتوبر 2004 میں وینکیا نائیڈو کے ذریعہ عہدہ سے ہٹنے کے بعد پارٹی کے کسی نوجوان لیڈر کو یہ ذمہ داری سونپی جائے۔ اپنے ساتھیوں کی درخواست پر ہی میں تنظیم کی ذمہ داری سنبھالنے کے لئے راضی ہوگیا تھا۔ اپنی اس حالت پر میں یہ سوچ کر حیران تھا کہ کیا میرا چین وسکون کے ساتھ خانگی زندگی جینے کا وقت نہیں تھا، جس سے میں طویل عرصہ تک محروم رہا؟ میری ذہنی حالت میدان جنگ میں غیر یقینی کی حالت میں گھرے ارجن سے مختلف نہیں تھی۔

ہر بار جب میرے دل میں فراریت کی سوچ امنڈتی تھی، میں بھگوت گیتا میں بھگوان شری کرشن کے ذریعہ ارجن کو دی گئی نصیحت کو یاد کرتا تھا۔ 15 رجون 2005 کو میری رہائش گاہ پر منعقد تقریب میں لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) سریندر کوچر کی کتاب 'بھگوت گیتا: ٹائم لیس پارٹینٹ) کا اجراء کرتے وقت میں نے تقریر میں اپنے خیالات پیش کئے تھے۔

'اس کتاب میں ایک حصے نے میری توجہ کھینچ لی' میں نے کہا' میں یہ اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے حال ہی میں پاکستان دورہ سے لوٹنے کے بعد خود کو جس حالت میں پایا اس حالت میں اسے پڑھ کر مجھے طاقت ملی ہے۔ 'دور جدید میں کیا بھگوت گیتا پڑھنے کی ضرورت ہے؟' مصنف نے پوچھا ہے اور ساتھ ہی جواب دیا ہے' بھگوت گیتا میں ارجن کے کردار میں انسان کے نفسیاتی انتشار کو انتہائی شاندار ڈھنگ سے پیش کیا گیا ہے۔ پانڈو راجکمار اس دنیا کا گمراہ کن انسان ہے۔ ہر دور کا دگ بھرمت نوجوان۔ ارجن کی داستان کو گیتا کے ابتدائی باب میں سائنسی اصلیت اور انتہائی ہوشیاری سے ریکارڈ کیا گیا ہے۔ ارجن ایسے پرجوش سپاہی کی نمائندگی کرتا ہے جو بے چینی کی جڑ تک پہنچ گیا ہے۔ ایسی بے چینی کی حالت میں متحرک شخص خود میں ایسے خیالات کو ڈھونڈ پاتا ہے جو اس کے ذہن ودماغ سے میل کھاتے ہیں اور جن سے وہ خود کو یہ منوا لیتا ہے کہ اسے میدان عمل اور راست عمل سے فراریت اختیار کرلینی چاہئے۔ فراریت کا یہ جذبہ کسی بھی عظیم حصولیابی کے لئے نقصان دہ ہوتا ہے۔ شری کرشن کے ذریعہ ارجن کو دی گئی نصیحت جو کہ گیتا کا گیان بھی ہے ہر چیلنج میں یہ تحریک دیتا ہے،' ہمیں اپنے نظریہ پر قائم رہنا چاہئے۔'

18-19 ستمبر 2005 کو چنئی میں بی جے پی کی قومی مجلس عاملہ کی ایک اہم میٹنگ ہوئی تھی جس میں اپنی تقریر ختم کرنے سے قبل میں نے بیان★ دیا۔ میرے خیال میں اپنی سیاسی زندگی میں یہ میرے سب سے اہم بیانات میں سے ایک ہے۔ میں نے کہا' میں اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ جہاں 1980 میں بی جے پی کی پہلی کانفرنس کی صدارت اٹل جی نے کی تھی وہیں مجھے سلور جوبلی کانفرنس کی صدارت کرنے کا موقع ملا ہے جو دسمبر 2005 میں ممبئی میں ہونی ہے۔ میں نے اکتوبر 2004 میں پارٹی صدر کی شکل میں ذمہ داری سنبھالی، کیونکہ وینکیا جی کی اپنی کچھ ذاتی پریشانیاں تھیں۔ تاہم اب میں نے یہ فیصلہ بھی لیا ہے کہ ممبئی کانفرنس کے بعد میں یہ عہدہ چھوڑ دوں گا اور پارٹی کی باگ ڈور کسی دوسرے ساتھی

★ اس بیان کا پورا متن ضمیمہ میں دیا گیا ہے۔

کے ہاتھوں میں دی جانی چاہئے۔'

سلور جوبلی سال کے موقع پر 30-28 دسمبر 2005 کو ممبئی میں بی جے پی کے ذریعہ قومی کونسل کی خصوصی کانفرنس منعقد کی گئی۔ یہ میری صدارت میں منعقد آخری کانفرنس تھی۔ مجھے نہ کوئی پچھتاوا تھا نہ ہی ناامیدی۔ مجھے اس بات کا اطمینان تھا کہ میں نے پورے اخلاص اور نیک نیتی سے پارٹی کی خدمت کی ہے اور مستقبل میں بھی اسی طرح خدمت کرتے رہنے کا عزم کیا ہے۔ ممبئی کانفرنس میں میں نے بی جے پی کی باگ ڈور مسٹر راجناتھ سنگھ کو سونپ دی۔

'انڈیا ٹوڈے' کی نظر میں 2005 میں سب سے زیر بحث شخصیت

میں سیاسی زندگی کے نشیب وفراز سے ناواقف نہیں ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ 2005 جس نے میرے لئے سب سے زیادہ پریشانی کے حالات پیدا کئے تھے، میں صبر وتحمل اور بے چینی سے مبرّا رہا۔ کئی بی جے پی کے بہی خواہ یہ امید لگائے بیٹھے تھے کہ میں بے چین ہوکر اپنا بیان واپس لے لوں گا۔ انہوں نے دیکھا کہ میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ کئی کانگریسی لیڈر میرے پاس آئے اور کہا' آڈوانی جی ماضی میں ہمارے اور آپ کے ساتھ اختلافات رہے ہوں گے۔ تب ہم آپ کی ستائش کرتے تھے۔ اب ہم آپ کی عزت کرتے ہیں۔ ہم اپنی پارٹی میں ایسی بحث کا تصور نہیں کرسکتے اور تب بھی پارٹی متحد رہے۔'

میرے پاکستان دورے پر تنازع کی وجہ سے مشہور میگزین 'انڈیا ٹوڈے' نے مجھے 'سال 2005 کی زیر بحث شخصیت' قرار دیا۔ اس کے 16 رجنوری 2006 کے شمارہ میں اس واقعہ کو لے کر کور اسٹوری شائع ہوئی تھی۔ اس میگزین کے چیف ایڈیٹر ارون پوری نے تبصرہ کیا۔ 'ونسٹن چرچل نے ایسے شخص کو مذہبی یا شدت پسند شخص کے طور پر متعارف کیا ہے جو اپنا خیال نہیں بدلتا ہے اور اپنا موضوع بھی نہیں بدل سکتا ہے۔ بی جے پی کے لیڈر ایل کے آڈوانی ہندتوا آندولن کے رہنما، پر بھی ہمیشہ کٹر ہندو کا لیبل چسپاں کیا گیا ہے۔ اس کٹر شخص نے اپنے خیالات اور پارٹی کے مینی فیسٹو گزشتہ سال پاکستان دورے کے دوران بدلنے کا فیصلہ لیا۔ آڈوانی نے محمد علی جناح کے مقبرے پر اعلان کیا'' 11 راگست 1947 کو آئین ساز اسمبلی میں کی گئی ان کی (جناح کی) تقریر حقیقت میں اعلیٰ معیار کی تقریر تھی۔ انہوں نے پوری استقامت کے ساتھ سیکولر ریاست کی حمایت کی تھی......''

پوری نے لکھا' یہ واقعہ ہندوستان میں مسلسل سرخیوں میں رہا۔ تمام سیاسی شعبہ سکتہ میں آگیا تھا۔ یہ ان کی پارٹی کے لئے ایشور کی مذمت کے برابر تھی اور ان کے لئے تو اور بھی زیادہ جو سیاسی نظریہ سے ان کی پیدائشی تنظیم تھی۔ یعنی راشٹریہ سویم سیوک سنگھ کے لئے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے پوپ نے اسلام مذہب قبول کرلیا ہو۔ آڈوانی کو موقع پرست کہا گیا اور ان پر الزام لگایا گیا کہ وہ شخصی سیاست کو فروغ دیتے ہیں۔

اس شمارے کے لئے خاص انٹرویو میں پوری اور ان کے سینئر ساتھی پربھو چاؤلہ نے مجھ سے پوچھا—

سوال: آپ کے لئے 2000ء شبھ نہیں رہا۔ کیا آپ کو کوئی پچھتاوا یا افسوس ہے؟

جواب: نہیں، اگر میں تھوڑا الگ ہٹ کر ان سب سے اوپر اٹھ کر سوچتا ہوں تو میں محسوس کرتا ہوں کہ یہ میرا سب سے شاندار سال رہا۔ جب میں نے اس پر غور کیا تو اپنے سیاسی کیریئر میں دو اہم واقعات کو پہچانا- پہلا: سوم ناتھ سے اجودھیا تک رتھ یاترا، دوسرے: پاکستان میں چھ روزہ دورہ۔ میں آپ کو بتا سکتا ہوں کہ رتھ یاترا اور 6 رجون کا پاک دورہ دونوں کے وقت

میں نے محسوس کیا کہ میں تاریخ رقم کر رہا ہوں۔ رتھ یاترا سے میری پارٹی کو فوری فائدہ حاصل ہوا۔ جہاں تک پاکستان دورے کا تعلق ہے کچھ سال بعد لوگ سوچیں گے کہ جو آڈوانی نے اس وقت کہا تھا اس سے ان کا اور ان کی پارٹی کا مقصد مضبوط ہوا اور لوگوں کے نظر میں ان کی عزت بھی بڑھی۔'

میں مسلسل اسی خیالات پر قائم رہا ہوں جو 'انڈیا ٹوڈے' کے انٹرویو میں اظہار ہوا تھا۔

میں ان سبھی کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے میرے پاکستان دورے کو خوش آئند کہا اور ان تمام لوگوں کی ستائش کرتا ہوں جنہوں نے ہندوستان کی جنگِ آزادی کی تحریک کی تاریخ میں فیصلہ کن مدت کے سلسلے میں اس تنازع کو سب سے سبق آموز اور عام بحث میں تبدیل کر دیا۔ میرے خیال میں یہ بحث ماضی کے بارے میں نہیں ہے۔ یہ بحث ماضی سے سبق لینے کے نظریہ سے مستقبل کے بارے میں اور جنوبی ایشیا خطہ کے ممالک کے درمیان تعاون کے نئے فکری نظریہ سے ہند-پاک تعلقات پر کرنی چاہئے۔' آیئے ہم بھائی چارے کے نظریے سے ایک نئی ذہنیت کو فروغ دیں- ملک کے اندر اور ملکوں کے درمیان، لیکن اپنے اصولوں کے بارے میں کوئی سمجھوتہ کئے بغیر۔ ہمیں ماضی کا قیدی نہیں بنے رہنا ہے بلکہ اس کی بجائے ہمیں حال کے مسائل کو حل کرنا ہے، تاکہ جنوبی ایشیا میں آباد کل آبادی کے پانچویں حصے کے مستقبل سے جڑے لاتعداد امکانات سے فائدہ اٹھایا جا سکے۔

16

اٹل بہاری واجپئی

ایک شاعردل سیاست داں

اٹل بہاری واجپئی کے تئیں عظیم عقیدت

ٹوٹے ہوئے سپنے کی سنے کون سِسکی؟
انتر کو چیر ویتھا پلکوں پر ٹھٹھکی
ہار نہیں مانوں گا، رار نہیں ٹھانوں گا
کال کے کپال پر لکھتا مٹاتا ہوں۔ گیت نیا گاتا ہوں

— اٹل بہاری واجپئی

اگر مجھے کسی ایسے شخص کا نام لینا ہو جو ابتداء سے اب تک میری سیاسی زندگی کا حصہ رہے، جو تقریباً 50 سال تک اس پارٹی میں میرے ساتھی رہے اور جن کی قیادت میں نے ہمیشہ بغیر کسی اختلافات کے قبول کیا تو وہ نام 'اٹل بہاری واجپئی' کا ہوگا۔ متعدد سیاسی مشاہد یہ مانتے ہیں کہ ایسے شاذ ہیں کہ آزاد ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں، سیاسی حلقہ میں دوقد آور شخصیات کے درمیان اتنے قریبی اور دوستانہ تعلقات کی مثال ملتی ہو جنہوں نے ایک ہی تنظیم میں اتنے طویل عرصہ تک شراکت کی اور باہمی جذبہ کے ساتھ مل کر کام کیا ہو۔ اس کتاب کے شروع میں 1952 میں راجستھان میں لیا گیا اٹل جی، بھیروں سنگھ شیخاوت اور میرا فوٹوگراف دیا گیا ہے، ساتھ ہی ہندی کے اخبار 'دینک جاگرن' میں 2003 میں ہم تینوں کا لیا گیا فوٹوگراف بھی دیا گیا ہے اور نیچے کیپشن ہے۔ 'نصف صدی سے زیادہ عرصہ تک شانہ بشانہ کام کرتے ہوئے۔' میں اٹل جی کے ساتھ اس دوستی کو اپنی زندگی کا حاصل افتخار سمجھتا ہوں۔

پہلا اثر: دائمی اثر

میں پہلی بار 1952 میں اٹل جی سے ملا تھا۔ بھارتیہ جن سنگھ کے نوجوان اور سرگرم کارکن کی شکل میں وہ راجستھان میں کوٹہ سے گزر رہے

تھے۔ وہاں پر میں سنگھ کا پرچارک تھا۔ ریل میں وہ ڈاکٹر شیاما پرساد مکھر جی کے ساتھ تھے جو نئی پارٹی کو مقبول عام بنانے کے لئے ریل یاترا پر نکلے تھے۔ ان دنوں اٹل جی ڈاکٹر مکھر جی کے سیاسی سکریٹری تھے۔ ماضی کی جانب دیکھتا ہوں تو میرے دل میں ان کی سب سے زیادہ زندہ تصویر نوجوان سیاسی کارکن کی شکل میں ابھرتی ہے جو اس وقت میرے جیسے نوجوان تھے لیکن میں زیادہ دبلا دکھائی دیتا تھا کیونکہ میں زیادہ لمبا تھا۔ میں آسانی سے یہ بتا سکتا ہوں کہ ان میں آئیڈیل ازم کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا اور ان کے چاروں جانب ایک شاعر کا تصور تھا جسے فطرت نے سیاست کی جانب موڑ دیا۔ ان کے اندر کچھ سلگ رہا تھا اور اس آگ کی روشنی ان کے چہرے پر چھائی ہوئی تھی۔ اس وقت ان کی عمر 28-27 سال رہی ہوگی۔ اس پہلی یاترا کے آخر میں میں نے خود سے کہا کہ وہ غیر معمولی نوجوان ہیں اور مجھے ان کے بارے میں جاننا چاہئے۔

1948 میں اٹل جی قوم پرست ہفت روزہ 'پانچجنیہ' کے بانی ایڈیٹر بنے۔ اس کے مستقل قاری کی شکل میں میں ان کے نام سے پہلے ہی متعارف تھا۔ حقیقتاً میں ان کے شاندار اداریہ اور وقتاً فوقتاً اس اخبار میں شائع نظموں سے بہت زیادہ متاثر ہوا۔ اس خط کے ذریعہ سے مجھے پنڈت دین دیال اپادھیائے کے افکار و خیالات کی جانکاری ملی جنہوں نے قوم پرست ادب کے مشہور پبلشر 'راشٹریہ دھرم پرکاشن' کے تحت یہ میگزین شائع کیا تھا۔ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ اٹل جی کے ساتھ اس ہفت روزہ اخبار کی اشاعت میں مختلف زاویوں سے اپنا کردار ادا کرتے تھے۔ وہ پروف ریڈر، کمپوزیٹر، بائنڈر اور منیجر کی ذمے داری ادا کرتے ہوئے اخبار میں مسلسل دوسرے ناموں سے لکھا بھی کرتے تھے۔ میرے جیسے کسی شخص کے لئے جس نے ابھی حال ہی میں ہندی سیکھی تھی 'پانچجنیہ' زبان کی خوبصورتی سے روشناس کرانے کا ایک ذریعہ رہا۔ اس کے علاوہ اس اخبار میں حب الوطنی کی تحریک دینے کی شاندار اہلیت تھی۔

کچھ عرصہ بعد اٹل جی اکیلے راجستھان کے سیاسی دورے پر آئے۔ پورے دورے کے وقت میں ان کے ساتھ رہا۔ اس یاترا کے دوران میں انہیں بہتر ڈھنگ سے جان پایا۔ دوسری بار ان کے بارے میں جاننے کی خواہش بڑھ گئی۔ ان کی انوکھی شخصیت، غیر معمولی انداز تخاطب، ان کا ہندی زبان پر اختیار اور جملوں کو شاندار ڈھنگ سے استعمال کر کے گمبھیر سیاسی ایشوز کو بہتر طریقے سے پیش کرنے کی صلاحیت ان سبھی باتوں کا مجھ پر گہرا اثر پڑا۔ دوسرے دورے کے اختتام پر میں نے محسوس کیا کہ وہ ایسے لیڈر ہیں، جنہیں ایک دن ہندوستان کی قیادت کرنی چاہئے۔

طویل سیاسی سفر کے ہم سفر

ڈاکٹر شیاما پرساد مکھر جی کے بعد اس وقت جن سنگھ میں سب سے زیادہ اہم شخصیت پنڈت دین دیال اپادھیائے تھے۔ اٹل جی کے تئیں ان کے بھی اعلیٰ خیالات تھے اور مئی 1953 میں ڈاکٹر مکھر جی کی افسوسناک موت کے بعد انہوں نے اٹل جی کو پارٹی اور پارلیمنٹ کی اہم ذمے داری سونپی۔ تھوڑے ہی عرصہ میں اٹل جی نے خود کو پارٹی کے سب سے زیادہ کرشمائی لیڈر کی شکل میں ثابت کر دیا۔ حالانکہ کانگریس جیسے عظیم الشان درخت کے سامنے جن سنگھ ایک چھوٹا سا پودا تھا، لیکن ایسے مقامات پر بھی لوگوں کی بھیڑ اٹل جی کی تقریر سننے کے لئے ٹوٹ پڑتی تھی جہاں پر پارٹی کی جڑیں جمی بھی نہیں تھیں۔ تقریر کرنے کے انداز کے علاوہ عوام الناس ان سے اس وجہ سے بھی متاثر تھی کہ وہ ملکی ایشوز پر کانگریس اور کمیونسٹ پارٹی سے مختلف متبادل پیش کرتے تھے۔ اس طرح نوجوانی میں ہی ان میں ملک گیر اپیل کے ساتھ ہونہار عوامی رہنما کی شکل میں ابھرنے کے سبھی اشارے ملنے لگے تھے۔

1957 میں پارلیمنٹ میں اٹل جی کے منتخب ہونے کے بعد دین دیال اپادھیائے نے ایک دوسرا قدم اٹھایا، جس کا تعلق مجھ سے تھا۔ دین دیال جی نے مجھ سے کہا کہ راجستھان سے دہلی جائیں اور پارلیمانی امور میں اٹل جی کی مدد کریں۔ تب سے اٹل جی اور میں نے جن سنگھ کی توسیع اور بعد میں بی جے پی کی ترقی کے لئے ہر سطح پر شانہ بشانہ کام کیا۔ لوک سبھا میں داخل ہونے کے تھوڑی دیر بعد ہی اٹل جی پارلیمنٹ میں پارٹی کی آواز بن گئے۔ تعداد میں کم ہوتے ہوئے بھی انہوں نے سبھی پر اپنا اثر قائم کیا۔ ایک عشرہ بعد فروری 1968 میں دین دیال جی کی دلخراش موت کے بعد انہیں پارٹی کی صدارت کی ذمے داری بھی سنبھالنی پڑی۔ پارٹی کی تاریخ میں یہ انتہائی پریشان کن دور تھا لیکن اٹل جی جلد ہی ایسے قابل لیڈر کے طور پر ابھرے جنہوں نے جن سنگھ کو اس گہرے دلدل سے باہر نکال لیا۔ اس وقت یہ نعرہ ہماری پارٹی کے کارکنوں اور حامیوں کے درمیان کافی مقبول ہوا- 'اندھیرے میں ایک چنگاری، اٹل بہاری اٹل بہاری'۔

5 سال بعد 1973 میں انہوں نے پارٹی کی تنظیم سے متعلق ذمے داری مجھے سونپی۔ پارٹی کو مستحکم بنانے کے کام میں اٹل جی، نانا جی دیشکھ، کشا بھاؤ ٹھاکرے، سندر سنگھ بھنڈاری اور دیگر کے ساتھ قریبی دوستی میری سیاسی زندگی کا حصہ رہی۔ جب اندرا گاندھی نے جون 1975 میں ایمرجنسی کا اعلان کیا تب جن سنگھ پہلے ہی مضبوط اور سب سے منظم اپوزیشن پارٹی کی شکل میں قائم ہو چکا تھا۔ اس میں کوئی حیرت انگیز بات نہیں تھی جب اس پارٹی نے جے پرکاش نارائن کا اعتماد جیت لیا اور یہ مشترکہ منچ پر حاصل کئے گئے جمہوریت نوازوں کا سب سے پرجوش قافلہ بن گیا۔ دوبارہ اٹل جی اور میں نے مل کر جدوجہد کی اور جیل گئے اور ایمرجنسی ہٹنے کے بعد جنتا پارٹی کی تشکیل کے لئے مل کر کام کیا۔ حقیقت میں اس کے بعد جے پرکاش نارائن کی صحت بگڑنے کے بعد (8 اکتوبر 1979 کو وہ چل بسے) جنتا پارٹی کا اتحاد اور اس کی حکومت کی مضبوطی کے لئے اٹل جی اور میں نے جتنی محنت اور عزم کے ساتھ کام کیا اتنا اور کسی نے نہیں کیا۔

لیکن بدقسمتی یہ رہی کہ جنتا پارٹی کے اتحاد کو بنائے رکھنے کے لئے ہماری کوششوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ 'دوہری رکنیت کے ایشو' کے بہانے ہمیں اس پارٹی سے نکال دیا گیا۔ 1980 میں اٹل جی اور میں نے دوبارہ دوسرے ساتھیوں کے ساتھ بھارتیہ جنتا پارٹی قائم کی۔ یہ صحیح ہے کہ لوک سبھا کے 1984 کے انتخابات میں ہماری پارٹی کو مایوسی ہاتھ لگی۔ ہم نے صرف دو سیٹیں جیتیں۔ یہاں تک کہ گوالیار سے اٹل جی انتخاب ہار گئے۔ اگر چہ اس ہار کی اہم وجہ اندرا گاندھی کے قتل کے بعد ملک میں پیدا ہونے والی 'ہمدردی کی لہر' رہی۔ یہ حقیقت میں لوک سبھا انتخاب نہیں بلکہ 'شوک سبھا' انتخاب تھا جہاں تمام ہمدردیاں راجیو گاندھی کے ساتھ رہنی فطری تھیں۔

اس کے بعد بی جے پی کی اچانک ترقی کا ذریعہ 'اجودھیا آندولن' رہا۔ اس وقت اٹل جی نے پہلے کی بہ نسبت کم فعال رہنے کا فیصلہ لیا۔ اگر چہ مجھے اس بارے میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ 1996 میں مرکز میں مضبوط سرکار بنانے کی ناکامی سے لے کر (1996 میں اٹل جی محض 13 دن تک وزیر اعظم رہے) 1998 میں دوبارہ ملنے والی کامیابی تک کی پارٹی کے دورے کا سہرا خاص طور سے اٹل جی کی شخصیت اور مقبولیت کو جاتا ہے۔ اس سے پارٹی کی مقبولیت مزید بڑھ گئی۔ دوبارہ ہم دونوں نے این ڈی اے کی تشکیل کے لئے مل کر کام کیا۔ ایسا کرتے وقت ہم نے 'سیاسی چھوا چھوت' کی بیڑیاں توڑ دیں جن سے کانگریس اور کمیونسٹ پارٹی نے ہمیں باندھنے کی کوشش کی تھی۔

1990 میں اجودھیا آندولن کے لئے حمایت حاصل کرنے کے واسطے میرے ذریعہ رام رتھ یاترا کی شروعات کئے جانے کے بعد میڈیا نے اٹل جی اور مجھے الگ الگ ڈھنگ سے پیش کرنا شروع کر دیا۔ اٹل جی کو کشادہ ذہن والا بتایا وہیں مجھے 'کٹر ہندو'۔ ابتداء میں اس سے مجھے بہت تکلیف پہنچی، کیونکہ میں جانتا تھا کہ حقیقتاً یہ شبیہ کے بالکل برعکس ہے۔ مجھے میڈیا میں دوستوں تک اپنے جذبات پہنچانے تک کی پریشانی

ہو رہی تھی اور تب میری پارٹی کے کچھ ساتھیوں نے جو اپنی شبیہ کے تئیں میری حساسیت سے واقف تھے، مجھے صلاح دی کہ اس مسئلے کے بارے میں فکر نہ کریں۔ انہوں نے کہا 'آڈوانی جی حقیقت میں اس سے بی جے پی کو دونوں طرح کے لیڈروں کی شبیہ سے فائدہ ہوگا، جس میں ایک کھلے ذہن کا ہے اور دوسرا کٹر ہندو۔'

'حوالہ اسکینڈل' میں لگائے گئے الزام کی وجہ سے میں نے اعلان کیا کہ جب تک عدالت میرے اوپر لگائے گئے الزامات سے مجھے بری نہیں کر دیتی تب تک میں دوبارہ لوک سبھا میں نہیں جاؤں گا۔ اس لئے میں نے 1996 میں پارلیمانی انتخابات میں امیدوار بننے کی تجویز کو ٹھکرا دیا۔ اٹل جی نے اپنے روایتی حلقہ لکھنؤ کے ساتھ ساتھ گجرات میں گاندھی نگر سے بھی الیکشن لڑا۔ میں اپنے تئیں عوامی طور پر دکھائے گئے ان کے یقین اور محبت سے جذباتی ہو گیا۔ امید کے مطابق اٹل جی کثیر ووٹوں سے دونوں انتخابی حلقوں سے جیت گئے۔ بعد میں انہوں نے لکھنؤ سے اپنی رکنیت برقرار رکھتے ہوئے گاندھی نگر کی سیٹ سے استعفیٰ دے دیا تھا، لیکن ان کے رویہ سے پارٹی میں توانائی کے فروغ کا دور شروع ہوا اور بڑے پیمانے پر عوام تک صحیح صحیح یہ پیغام پہنچا کہ بی جے پی کی قوت اعلیٰ قیادت کا اتحاد ہے۔ یہی پیغام 1995 میں ممبئی میں پارٹی کانفرنس سے بھی نکلا جب پارٹی صدر کے ناطے میں نے آنے والے سال میں پارلیمانی انتخابات میں بی جے پی کے عہدے کے امیدوار کے طور پر اٹل جی کے نام کا اعلان کیا تھا۔

میں نے یہ اعلان کیوں کیا؟ اس وقت بیکار کے اندازے لگائے جا رہے تھے۔ کچھ اندازے آج بھی لگائے جاتے ہیں جو تکلیف پہنچاتے ہیں۔ پارٹی اور سنگھ کے کچھ لوگوں نے تب میرے اس اعلان کے لئے میری سرزنش کی۔ انہوں نے کہا 'ہمارے اندازے سے اگر پارٹی عوامی رائے عامہ حاصل کرتی ہے تو حکومت چلانے کے لئے آپ ہی بہتر ہوں گے۔' میں نے ایمانداری اور عزم کے ساتھ جواب دیا کہ میں ان کے خیالات سے متفق نہیں ہوں۔ عوام کی نظر میں میں عوامی رہنما کی بہ نسبت فلاسفر زیادہ ہوں۔ یہ صحیح ہے کہ ہندوستانی سیاست میں اجودھیا آندولن میں میری شبیہ بدل گئی تھی لیکن اٹل جی ہمارے لیڈر ہیں، نائک ہیں۔ عوام میں ان کا مقام بہت اونچا ہے اور لیڈر کی شکل میں عام لوگ انہیں زیادہ قبول کرتے ہیں۔ ان کی شخصیت میں اتنی کشش اور اثر ہے کہ انہوں نے بی جے پی کی روایتی سوچ کی سرحدوں کو پار کیا ہے۔ انہیں نہ صرف بی جے پی کی معاون پارٹیاں ہی قبول کرتی ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ صحیح یہ ہے کہ ہندوستان کے عوام انہیں قبول کرتی ہے۔' ان میں سے کچھ کی درخواست تھی کہ میں نے یہ اعلان کر کے عظیم قربانی دی ہے۔ اگر چہ میں اپنی بات پر قائم تھا 'میں نے کوئی قربانی نہیں دی ہے۔ یہ پارٹی اور ملک کے مفاد میں سب سے بہترین تجزیے کا نتیجہ ہے۔'

اپنے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ ہم دونوں نے 1998 میں بی جے پی کو اقتدار میں لانے کے لئے مل کر کام کیا۔ میں نے حکومت میں ان کے معاون کی شکل میں کام کیا۔ جب 29 / جون 2002 ★ کو مجھے نائب وزیر اعظم نامزد کیا گیا تھا تب اس سلسلے کو رسمی شکل ملی۔ میں نے اس دن میڈیا سے کہا تھا 'یہ میرے لئے عزت کی بات ہے اور میں وزیر اعظم اور این ڈی اے کے اپنے سبھی ساتھیوں کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔' میں نے یہ بھی کہا 'لیکن اس سے میرے کام میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ وزیر اعظم پہلے ہی میرے ساتھ مشورہ کرتے تھے اور میں پہلے بھی ایسے ہی کام کرتا تھا۔ ہاں عوام کی نظر میں اور میرے کابینہ کے ساتھیوں کی نظر میں میری ذمے داریاں بڑھ گئی ہیں۔ میں نے ایسے اندازوں کو مسترد

★ میں ہندوستان کا ساتواں نائب وزیر اعظم بنا۔ اس سے پہلے سردار ولبھ بھائی پٹیل، مرار جی ڈیسائی، چرن سنگھ، جگ جیون رام، وائی بی چوہان اور دیوی لال نائب وزیر اعظم بنے تھے۔

کیا جو میڈیا اور سیاسی حلقوں میں کچھ مخالفین نے پھیلائے تھے۔ جن کے مطابق نائب وزیر اعظم کے طور پر میری رسمی ترقی سے ایک یکساں اقتدار پیدا ہوگا۔

2002 کا صدارتی انتخاب

2002 کے ابتدا میں بی جے پی اور این ڈی اے کے درمیان اس بابت غور وخوض شروع ہو گیا کہ ہندوستان کے نئے صدر جمہوریہ کے لئے ہمارا امیدوار کون ہو، کیونکہ جولائی کے آخر میں ڈاکٹر کے آر نارائنن کی مدت ختم ہونے جا رہی تھی۔ ہمارے اندرونی غور وخوض کے دو معیار تھے۔ پہلا، نیا صدر جمہوریہ وسیع القلب ہونا چاہئے۔ اور وہ ہر زاویہ سے اس عظیم اور قابل افتخار عہدے کے لئے مناسب ہو۔ دوسرے ہم بی جے پی کے علاوہ ہر شخص کو ترجیح دے رہے تھے، کیونکہ ہماری سب سے بڑی خواہش تھی کہ ملک میں ہمارا یہ پیغام پہنچے کہ ہماری پارٹی سبھی کو ساتھ لے کر چلنے میں یقین رکھتی ہے۔

حیرت ہے کہ اس تلاش میں ایسے شخص کا نام نکلا، جس کا ہماری پارٹی سے کوئی واسطہ نہیں تھا، بلکہ دو سابق وزرائے اعظم — اندرا گاندھی اور راجیو گاندھی — سے متعلق رہے۔ یہ دونوں وزرائے اعظم کانگریس پارٹی کے تھے۔ یہ امیدوار مہاراشٹر کے گورنر ڈاکٹر پی سی الیگزینڈر تھے۔ سب سے پہلے میں نے وزیر اعظم اٹل بہاری واجپئی اور این ڈی اے کے دیگر اہم لیڈروں کو ڈاکٹر الیگزینڈر کے نام کا مشورہ دیا۔ گورنر کے طور پر کام کرنے کے نظریہ سے میں ان سے بہت زیادہ متاثر تھا اور اٹل جی بھی ان سے متاثر تھے۔ میرا مشورہ فوراً مان لیا گیا۔ این ڈی اے کی مختلف پارٹیوں کے دیگر لیڈروں نے بڑے جوش سے ان کا نام قبول کر لیا، لیکن ڈاکٹر الیگزینڈر کے امیدوار کے طور سے کھڑے ہونے پر کانگریس کی جانب سے ہوئے احتجاج کی وجہ سے این ڈی اے نے دیگر مستند امیدوار ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام کو ڈاکٹر نارائنن کے وارث کے طور پر منتخب کر لیا گیا۔

میں یہاں پر اس وقت کے ایک دلچسپ واقعہ کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ ایک دن مجھے سنگھ کے سابق سرسنگھ چالک پروفیسر راجندر سنگھ (رجو بھیا) کا فون آیا۔ انہوں نے کہا کہ وہ مجھ سے ایک اہم موضوع پر بات کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے انہیں اگلی صبح گھر آنے کی دعوت دی۔ ناشتہ پر انہوں نے گزشتہ شام اٹل جی کے ساتھ ہونے والی میٹنگ کی تفصیلات بتائی، 'میں صدر جمہوریہ کے ایشو پر غور وخوض کرنے کے لئے وزیر اعظم کے پاس گیا تھا۔ میں نے انہیں مشورہ دیا' آپ ہی کیوں نہیں صدر جمہوریہ بنتے؟ میں نے اس مشورہ کے پیچھے چھپی وجہ بتائی۔ خاص طور سے گھٹنوں کی پریشانی سے★ راشٹر پتی بھون کی ذمہ داری اٹھانے میں انہیں زیادہ بھاگ دوڑ نہیں کرنی پڑے گی۔ اس کے علاوہ لوگ شخصیت اور تجربہ کے نظریہ سے انہیں آدرش کے روپ میں قبول کریں گے۔

میں نے ان سے پوچھا کہ اٹل جی نے کیا جواب دیا۔ رجو بھیا نے کہا کہ 'اٹل جی خاموش رہے۔ انہوں نے 'ہاں' یا 'نا' میں کچھ نہیں کہا۔ اس لئے میں سوچتا ہوں کہ انہوں نے میرا مشورہ قبول نہیں کیا'۔ تب میں نے رجو بھیا کو بتایا صدر جمہوریہ کے انتخاب کے موضوع پر بحث کرنے کے لئے میٹنگ ہوئی تھی اور بالاتفاق رائے این ڈی اے لیڈروں کی تین دن قبل اس میٹنگ میں وزیر اعظم کو مناسب، ملکی سطح پر قابل قبول امیدوار کے نام کو حتمی شکل دینے کے لئے مقرر کیا گیا ہے۔ آخر میں، اس سلسلہ میں ہر ایک فرد نے اتفاق رائے سے اٹل جی کے فیصلہ کو قبول کر لیا۔

★ وزیر اعظم اٹل بہاری واجپئی کا 2000 اور 2001 میں بریچ کینڈی اسپتال ممبئی میں گھٹنوں کا دو مرتبہ آپریشن ہوا تھا۔

آپسی یقین واعتماد اور احترام میں بنتے رشتے

مجھے تجربات نے سکھایا ہے کہ سیاست میں مستحکم اور معنی خیز رشتے تب ہی ممکن ہیں جب آپس میں یقین و اعتماد، عزت و احترام اور صبر و تحمل کے لئے عزم ہو۔ سیاست اقتدار کے کھیل سے تحریک پا کر مسابقت اور نفرت آمیز ہوتی ہے، لیکن مشترکہ افکار و خیالات سے انسپائرڈ آدرشوں اور ثقافت سے پرورش پانے والی سیاست اس سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ جب کسی بہتر کام کے لئے لوگ ایک دھاگے میں بندھتے ہیں تو یہ لوگ چھوٹے مسئلوں اور شخصیات سے متعلق ایشوز کو نظر انداز کرنا سیکھ جاتے ہیں۔ کئی لوگوں نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کے اور اٹل جی کے درمیان پچاس سال سے زائد عرصہ تک شراکت داری کیسے چلی؟ ان کے ساتھ آپ کا کوئی اختلاف یا کوئی مسئلہ پیدا کیوں نہیں ہوا؟

میں اس سوال میں پوشیدہ الجھن کو اچھی طرح سے سمجھ سکتا ہوں۔ لیکن کچھ لوگوں کے ایسے خیالات کے برعکس، میں پوری ایمانداری سے کہنا چاہوں گا کہ دہائیوں سے میرے اور اٹل جی کے درمیان تعلقات میں کبھی مقابلہ کا جذبہ نہیں رہا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہمارا کبھی اختلاف نہیں رہا۔ ہاں کبھی کبھی ہم دونوں کے خیالات مختلف رہے۔ ہماری شخصیت الگ ہے اور فطری ہے کہ الگ الگ واقعات اور ایشوز پر کئی بار ہمارے خیالات الگ الگ رہے۔ داخلی جمہوریت کو اہمیت دینے والی کسی تنظیم میں یہ فطری ہے۔ اگر چہ ہماری اس گہری دوستی کی بنیاد میں تین عناصر کارفرما ہیں۔ ہم دونوں مضبوطی کے ساتھ جن سنگھ اور بی جے پی کے افکار، آدرش اور روایات سے بندھے ہوئے تھے جس سے سبھی ممبران پہلے مقام پر ملک، اس کے بعد پارٹی اور آخر میں خود کو ترجیح دیتے ہیں۔ ہم نے کبھی ایسے اختلافات کو بڑھاوا نہیں دیا جس سے آپسی یقین واعتماد اور عزت واحترام کم ہو جائے، لیکن تیسرا اور سب سے اہم عنصر یہ ہے کہ میں نے واضح طور سے اور غیر متنازع شکل میں اٹل جی کو اپنا سینئر اور اپنا لیڈر قبول کیا تھا۔

ابتدائی دور میں ہی میں نے تنظیمی اور سیاسی معاملوں میں اٹل جی کے فیصلہ کو انتہائی خلوص سے قبول کیا ہے۔ میں اپنے خیالات پیش کرتا تھا، لیکن جب محسوس کرتا تھا کہ اٹل جی کیا چاہتے ہیں تو بغیر کسی اختلاف کے ان کے نظریہ کا، ان کی سوچ کی حمایت کرتا تھا یا انہیں ترجیح دیتا تھا۔ میرے ردِعمل کا ایسے اندازہ لگایا جاتا تھا کہ کبھی کبھی پارٹی میں میرے ساتھی یا سنگھ کے لیڈران پر اپنی ناراضگی کا اظہار کرنے لگتے تھے، کیونکہ ان کے خیال میں مجھے اٹل جی کے فیصلوں پر اختلاف ظاہر کرنے کی صلاحیت نہیں تھی، میں اس کا اظہار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اگر چہ میرے اس رویہ پر ایسی سوچ کا کوئی اثر نہیں پڑتا تھا کہ پارٹی سے اور بعد میں سرکار سے متعلق سبھی معاملوں پر اٹل جی کا جملہ آخری ہونا چاہئے۔ دوہری یا اجتماعی قیادت کبھی بھی 'ایک لیڈر کی کمان' سے بہتر نہیں ہو سکتی۔ میں اپنے ساتھیوں کو بتاتا تھا 'لیڈر کے بغیر کوئی کنبہ کھڑا نہیں رہ سکتا۔ سبھی ممبران کو اس کے احکامات ماننے چاہئیں۔ دین دیال جی کے بعد اٹل جی ہمارے کنبہ کے لیڈر ہیں'۔

یہاں مجھے یہ بھی کہنا ہے کہ اٹل جی کی سوچ میرے تئیں بہت وسیع رہی۔ اگر وہ جان جاتے تھے کہ کسی خاص مسئلہ پر میرا کیا خیال ہے، اور اگر ان کا اس سلسلہ میں گمبھیر اختلاف نہیں ہوتا تھا تو وہ فوراً کہتے 'جو آڈوانی جی کہتے ہیں وہ ٹھیک ہے'۔ اس کے بعد زیر غور موضوع پر فوراً فیصلہ ہو جاتا تھا۔

این ڈی اے حکومت کی چھ برسوں کی مدت کے دوران میڈیا اور کچھ سیاسی حلقوں میں 'اٹل-آڈوانی تنازع' نہ ہوتے ہوئے بھی اس بارے میں اندازے لگانا وقت گزاری کا دلچسپ موضوع تھا۔ اٹل جی نے متعدد مواقع پر، پارلیمنٹ کے اندر اور باہر، ان باتوں کی تردید کی۔ 'انڈیا

ٹوڈے' میں دیے گئے ایک انٹرویو میں ان سے پوچھا گیا 'ایل کے آڈوانی کے ساتھ آپ کے کیسے تعلقات ہیں؟ کیا بی جے پی الگ الگ سمتوں میں جارہی ہے؟' انہوں نے برجستہ جواب دیا' میں روز آڈوانی جی سے بات کرتا ہوں۔ ہم روزانہ آپس میں صلاح ومشورہ کرتے ہیں۔ پھر بھی آپ لوگ ایسے اندازے قائم کرتے ہیں۔ ایک بات اور میں کہنا چاہتا ہوں کہ ہمارے درمیان ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ جب ہوگا میں آپ کو بتادوں گا'۔

کچھ اختلافات

میں یہاں پر دو مثالیں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ جب اٹل جی اور میرے درمیان اختلافات پیدا ہوئے تھے۔ اجودھیا آندولن کے ساتھ بی جے پی کے راست طور پر جڑنے کے بارے میں انہیں اعتراض تھا لیکن سوچ اور عادت سے جمہوریت نواز ہونے کے ناطے اور ہمیشہ ساتھیوں کے درمیان بالاتفاق رائے لانے کے خواہش مند اٹل جی نے پارٹی کا اجتماعی فیصلہ قبول کیا۔

دوسری مثال اس وقت کی ہے جب فروری 2002 میں گودھرا میں کارسیوکوں کے بڑے پیمانے پر قتل عام کے بعد گجرات میں فرقہ وارانہ تشدد بھڑک اٹھا تھا۔ اس بہیمانہ واقعہ کے بعد پڑنے والے اثرات کی وجہ سے حکومت گجرات خاص طور سے وزیراعلیٰ نریندر مودی کی بڑے پیمانے پر مخالفت کی گئی۔ اپوزیشن پارٹیوں نے مودی سے استعفیٰ کا مطالبہ کیا۔ یہاں تک کہ بی جے پی اور برسراقتدار این ڈی اے اتحاد حکومت میں کچھ لوگ سوچنے لگے کہ مودی کو اپنا عہدہ چھوڑ دینا چاہئے۔ پھر بھی اس بارے میں میرا خیال بالکل مختلف تھا۔ گجرات میں سماج کے مختلف طبقہ کے لوگوں سے بات چیت کرنے کے بعد میں متفق ہوگیا کہ مودی کو نشانہ بنانا ٹھیک نہیں ہے۔ میری رائے میں مودی مجرم نہیں تھے، بلکہ خود سیاست کا شکار ہوگئے تھے۔

اس لئے میں نے محسوس کیا کہ ایک سال سے بھی کم عرصہ میں ریاست کے وزیراعلیٰ بننے والے نریندر مودی کو فرقہ واریت کا شکار بنانا ناانصافی ہوگی۔ ایسا کرکے میں نے واضح کردیا کہ مستقبل میں اس کا گجرات کے سماجی تانے بانے پر منفی اثر پڑے گا۔ میں جانتا تھا کہ اٹل جی کو گجرات کے واقعہ سے گہرا صدمہ پہنچا ہے۔ اس بات پر ہمیں فخر تھا کہ مارچ 1998 میں ہماری حکومت کی تشکیل کے وقت سے ہمیں ملک میں فرقہ وارانہ تشدد کے واقعات میں ڈرامائی انداز سے کمی لانے میں کامیابی ملی۔ 2002 سے قبل ہمارا کام کرنے کا طریقہ اپوزیشن پارٹیوں کے الزامات کے برعکس رہا۔ جن میں کہا گیا تھا کہ مرکز میں بی جے پی کے اقتدار میں آنے کے بعد مسلمانوں اور عیسائیوں پر بڑے پیمانے پر فرقہ وارانہ حملے ہوں گے۔ حقیقت میں اٹل جی کی حکومت نے نہ صرف ہندوستان میں مسلمانوں کی ہی بلکہ دنیا بھر کے مسلم ممالک کا اعتماد جیتا۔ اچانک گجرات میں فرقہ وارانہ فسادات ہونے سے مرکز میں پارٹی اور حکومت کے فطری مخالفین کے ذریعہ کی گئی مذمت سے نقصان پہنچا۔

ان حالات کا اٹل جی کے دل پر کافی اثر تھا۔ وہ محسوس کرنے لگے کہ کچھ ٹھوس اقدامات کرنے کی ضرورت ہے، کچھ مثبت کام کرنا ہے۔ اسی دوران مودی سے استعفیٰ مانگنے کے لئے ان پر دباؤ ڈالا جانے لگا۔ اگرچہ اٹل جی نے اس موضوع پر واضح طور سے اپنے خیالات پیش نہیں کئے لیکن میں جانتا تھا کہ وہ مودی کے استعفیٰ کا فیصلہ کریں گے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ میں اس کے حق میں نہیں ہوں۔

اپریل 2002 کے دوسرے ہفتہ میں بی جے پی کی قومی مجلس عاملہ کی گوا میں میٹنگ تھی۔ میڈیا اور سیاسی ذرائع اس بات پر توجہ دے رہے تھے کہ پارٹی گجرات کے بارے میں کس طرح غوروفکر کرے گی اور مودی کی قسمت کے بارے میں کیا فیصلہ لیا جائے گا۔ اٹل جی نے کہا کہ

میں نئی دہلی سے گوا تک کے سفر کے دوران ان کے ساتھ رہوں۔ خصوصی طیارے میں وزیراعظم کے لئے مقررہ جگہ پر ہمارے ساتھ وزیر خارجہ جسونت سنگھ اور انفارمیشن ٹیکنالوجی کے وزیر ارون شوری بھی تھے۔ 2 گھنٹے کے سفر کے دوران شروع میں ہماری بات چیت گجرات پر ہی مرتکز رہی۔ اٹل جی سوچ و فکر میں غلطاں تھے۔ تھوڑی دیر کے لئے خاموشی چھائی رہی۔ تب ہی جسونت سنگھ کے سوال پوچھنے کے ساتھ ہی یہ خاموشی ٹوٹی۔ 'اٹل جی آپ کیا سوچ رہے ہیں؟' اٹل جی نے جواب دیا 'کم سے کم استعفیٰ کا آفر تو کرتے۔' تب میں نے کہا 'اگر نریندر کے عہدہ چھوڑنے سے گجرات کے حالات میں بہتری آتی ہے تو میں چاہوں گا کہ انہیں استعفیٰ کے لئے کہا جائے، لیکن میں نہیں مانتا کہ اس سے کوئی مدد مل پائے گی۔ مجھے یقین نہیں ہے کہ پارٹی کی قومی کونسل یا عاملہ اس تجویز کو قبول کرے گی۔'

جیسے ہی ہم گوا پہنچے میں نے نریندر مودی سے بات کی کہ انہیں استعفیٰ دینے کا آفر رکھنا چاہئے۔ وہ فوراً میرا مشورہ مان گئے۔ جب قومی مجلس عاملہ میں غور و خوض کا دور شروع ہوا تب متعدد ممبران اپنے اپنے خیالات پیش کرنے لگے۔ ان سبھی کے خیالات سننے کے بعد مودی بولنے کے لئے اٹھے اور گودھرا اور گودھرا کے بعد کے واقعات کی تفصیلات پیش کی۔ انہوں نے گجرات میں فرقہ وارانہ کشیدگی کی تاریخی پس منظر کی اطلاع دی اور واضح کیا کہ کس طرح سے گزشتہ عشروں میں بار بار فسادات ہوتے رہے ہیں۔ انہوں نے یہ کہہ کر اپنی تقریر ختم کی 'پھر بھی حکومت کا لیڈر ہونے کے ناطے میں اپنی ریاست میں ہونے والے اس واقعہ کی ذمہ داری لیتا ہوں۔ میں استعفیٰ دینے کے لئے تیار ہوں۔'

جس لمحہ مودی نے یہ کہا پارٹی کی اعلیٰ قیادت، فیصلہ لینے والے سیکڑوں ممبران اور خاص طور سے مدعوعین کے تبصرے کی آواز سے ہال گونج اٹھا۔ سب لوگ کہہ رہے تھے 'استعفیٰ مت دو، استعفیٰ مت دو' تب میں نے الگ سے اس بارے میں پارٹی کے سینئر لیڈروں کے خیالات کا پتہ لگایا۔ بنا کسی اختلافات کے ہم میں سے ہر ایک نے کہا نہیں 'انہیں استعفیٰ نہیں دینا چاہئے۔' پرمود مہاجن جیسے کچھ لیڈوں نے کہا 'سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'

اس طرح سے ہندوستانی سماج اور ریاست میں اختلافات پیدا کرنے والے اس مسئلے پر پارٹی کے اندر بحث کا خاتمہ ہو گیا۔ حالانکہ گوا میں لئے گئے پارٹی کے فیصلہ سے ملک کے کئی لوگ خوش نہیں تھے۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اپنے سماج کے بہت بڑے حصے کی خواہش کے مطابق ہم نے یہ فیصلہ لیا تھا۔ خود گجرات میں لاتعداد لوگوں نے اس فیصلے پر مہر ثبت کردی۔

اکثر سیاست پریشانیوں سے عبارت ہے۔ یہ ایسے ایشوز اور حالات میں بھی پنہاں ہوتے ہیں، جن کا ہمیں سامنا کرنا ہوتا ہے۔ مشکل متبادل کبھی کبھی غیر دلچسپ یا ناخوشگوار ہوتی ہے، لیکن میرا یقین ہے کہ جب کوئی کسی فیصلے کو صحیح مانتا ہے تب اس فیصلے پر قائم رہنے میں تردد نہیں کرنا چاہئے۔ حقیقت میں تاریخ نے پارٹی کے اس فیصلے کو صحیح ٹھہرایا ہے کہ اس نے اس وقت مودی سے استعفیٰ نہیں مانگا۔

پھر صبح ہوگی

آسکر وائلڈ نے کہا ہے 'یادیں ایک ایسی ڈائری ہے جسے ہم سب ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتے ہیں' جب میں نے اٹل جی کے تبصرہ کے سلسلے میں اس 'ڈائری' کے اوراق پلٹے تو پایا کہ ہم دونوں نے مل کر جو کیا اس سے مجھے ناکامی کے بہ نسبت اطمینان نصیب ہوا۔ یہاں تک کہ جب ہمیں کامیابی نہیں ملی تب بھی ناامیدی کو حاوی نہیں ہونے دیا۔ میرا ماننا ہے کہ زندگی ہمیشہ انسان کی ان یادوں کی پرورش کرتی ہے جب ناامیدی پر امید، اندھیرے پر اجالے کی کامیابی ہوتی ہے۔ تکلیف دہ شب کے بعد نئی صبح آتی ہی ہے۔ اٹل جی امید کی کرن رہے اور انہوں نے پارٹی کی

طویل مسافت میں ایسے موڑوں پر ایک سمت فراہم کیا۔

جن لوگوں نے اٹل جی کے ساتھ مل کر کام کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ وہ ملنسار اور حساس لیڈر ہیں، جن کی روح نظم کی خوبصورتی جیسی ہے۔ ان کی سیاسی شخصیت کو نظم کی خوبصورتی کے بغیر سمجھا نہیں جاسکتا۔ ان کے سبھی مداحوں میں میں بھی ان کی نظموں سے، خاص طور پر پارٹی کانفرنس اور دیگر عوامی تقریبات میں، خود ان کے ذریعہ پڑھی گئی نظموں سے بہت زیادہ متاثر ہوا۔ مثلاً انہوں نے ایمرجنسی کے دور میں ایسی نظم لکھی تھی جسے دینا ناتھ مشر نے انڈر گراؤنڈ اخبار 'جن وانی' میں شائع کیا تھا۔ اس نظم میں ملک کی نفسیات کو ہی نہیں پرو دیا گیا بلکہ اس سے ہمیشہ جمہوریت نوازوں کو تحریک ملتی رہے گی—

ستیہ کا سنگھرش ستا سے، نیائے لڑتا نرنکشتا سے
اندھیرے نے دی چنوتی ہے، کرن انتم اَست ہوتی ہے،
داؤ پر سب کچھ لگا ہے، رک نہیں سکتے،
ٹوٹ سکتے ہیں، مگر ہم جھک نہیں سکتے

اسی طرح سے اٹل جی نے ایک دوسری نظم لکھی۔ یہ نظم چھوٹی عمر میں ان کی قوم پرست سوچ کی آئینہ دار ہے۔ آج تک میں نے اتنی زیادہ مضبوط اور قوم پرستی سے لبریز نظم نہیں دیکھی، جس میں ہندتوا افتخار کو دکھایا گیا ہے—

ہوکر سوتنتر میں نے کب چاہا ہے کرلوں جگ کو غلام
میں نے تو سدا دکھایا ہے کرنا اپنے من کو غلام
گوپال-رام کے ناموں پر کب میں نے اتیا چار کئے؟
کب دنیا کو ہندو کرنے گھر گھر میں نرسنہار کئے؟
کوئی بتلائے کابل میں جا کر کتنی مسجد میں نے توڑیں؟
بھو بھاگ نہیں شت شت مانو کے ہر دیہ جیتنے کا نشچے،
ہندو تن من، ہندو جیون، رگ رگ ہندو میرا پریچیہ

جب میں ماضی کی جانب دیکھتا ہوں تب کئی حالات میں اٹل جی کے ساتھ گزارے گئے وقت کو یاد کرتا ہوں۔ ان کے تئیں عزت و احترام کا اظہار کرنے کے سب سے بہتر طریقے پر غور کرتا ہوں تو مجھے سب سے زیادہ اس لمحے کی خوشگوار یاد آتی ہے جب ہم نے 1959 میں مل کر فلم دیکھی تھی۔ ہم دونوں کو ہندی فلم بنی پسند تھی۔ 1970 کی دہائی کے وسط تک ہم ہمیشہ 'ریگل' اور دہلی کے دیگر تھیٹروں میں بڑے شوق سے سنیما دیکھنے جاتے تھے۔ دہلی میونسپل کارپوریشن کے ضمنی انتخابات میں اٹل جی اور میں نے جن سنگھ کے سیکڑوں کارکنوں کے ساتھ سخت محنت کی تھی۔ ہماری بہترین کوششوں کے باوجود ہماری پارٹی کو جیت نہیں مل پائی۔ نتیجتاً ہم ناامید تھے۔ تب اٹل جی نے مجھ سے کہا 'چلو کوئی سنیما دیکھنے چلتے ہیں۔' ہم دونوں انوکھے اداکار اور فلم ساز راج کپور کی فلم 'پھر صبح ہوگی' دیکھنے کے لئے پہاڑ گنج کے 'امپیریل' تھیٹر میں چلے گئے۔

یہ فلم فیودور دوستووسکی کے مشہور ناول 'کرائم اینڈ پنشمنٹ' کے موضوع سے متاثر تھی۔ اس فلم کی کہانی ہندوستان کی آزادی کے بعد کے

دور سے متعلق ہے۔ اس میں نہرو دور کے وعدوں کے مکمل نہ ہونے کی وجہ سے لوگوں کی خوش فہمی کا خاتمہ اور غریبوں کے ساتھ ہونے والی ناانصافی کو پردہ پر اُتارا گیا ہے۔ اگر چہ اس میں عوام کو صبر وتحمل اور امید کا دامن نہ چھوڑنے کا پیغام دیا گیا ہے۔ اس کا امید افزا پیغام جو فلم کے ٹائٹل میں مضمر تھا - اٹل جی اور میرے - ہم دونوں کے ٹوٹے دل کے لئے مناسب تھا۔

بعد کے برسوں میں کئی مواقع پر خاص طور پر انتخابی شکست کے بعد میں نے یہ بات بتانے کے لئے اس واقعہ کا ذکر کیا ہے جو میری زندگی کا بنیادی عنصر اور یقین بن گیا ہے۔ 'یہ مشکل دور بھی گزر جائے گا'۔ 2004 میں لوک سبھا کے انتخابات میں ہماری پارٹی کی امید کے برعکس شکست بھی ایسا ہی موقع تھی۔ مجھے شبہ نہیں کہ شکست کا یہ دور سیاہ آئندہ پارلیمانی انتخابات میں ہماری پارٹی کی جیت کی نئی صبح لے کر آئے گا۔ ایسی جیت جسے ہم ہندوستان کی ایکتا، سیکورٹی، جمہوریت اور ترقی کو عظیم کامیابی میں بدل دیں گے۔

17

کچھ ملکی ایشوز پر غور وفکر

ہندوستان کی سالمیت مذہب میں مضمر ہے اور جب تک ہندوفرقہ اپنے مورثوں کی عظیم روایت کو نہیں بھلاتا تب تک کرۂ ارض پر کوئی طاقت اسے تباہ نہیں کر سکتی۔ آج کل ہر کوئی ان پر الزام لگاتا ہے، جو مسلسل اپنے ماضی کو دیکھتے ہیں۔ ایسا کہا جاتا ہے، اتنا پیچھے مڑکر دیکھنا ہی ہندوستان کی تمام تکلیفوں کا باعث ہے۔ میری سوچ اس کے برعکس ہے۔ جب وہ اپنے ماضی کو بھول گئے تو ہندوراشٹر جذبات سے عاری سکتہ کی حالت میں رہا اور جیسے ہی وہ ماضی کی جانب دیکھنا شروع کرتے ہیں، ہر طرف نئی زندگی دوڑ جاتی ہے۔ ماضی سے ہی مستقبل کی تعمیر ہوتی ہے، ماضی ہی مستقبل بنتا ہے۔

— سوامی وویکانند

جب میں نے 2008 کے ابتدا میں اس کتاب کا آخری باب لکھنا شروع کیا، مجھے گزشتہ دو سال کے واقعات تحریر کرنے میں زیادہ پریشانی ہوئی، کیونکہ کسی بھی شخص کے لئے اپنے موجودہ حالات کے واقعات کا فوری تجزیہ کرنا آسان نہیں ہوتا۔ برطانوی مؤرخ ولیم ڈکسن نے صحیح کہا ہے— 'حال کے حقائق کا تصویر کشی کے لئے مطمئن ہوکرنہیں بیٹھتے، وہ مسلسل متحرک رہتے ہیں۔ ہلچل اور متحرک'۔

اس لئے میں اس باب میں کچھ ایسے ایشوز اور سروکاروں پر لکھوں گا جو آنے والے دور میں ملکی سطح کی بحث کے نکتے ہوں گے۔ ان کے بارے میں میں نے اپنی زندگی میں مختلف مواقع پر اظہار خیال کیا ہے۔

کیوں میں مذہب پر مبنی ریزرویشن کے خلاف ہوں؟

ہندوستان کی آزادی کے دوران مذہب کی بنیاد پر ریزرویشن کا مسئلہ بہت تیزی سے سامنے آیا۔ یہ ایشو پھوٹ ڈالنے والا تھا۔ مہاتما گاندھی نے برطانوی حکومت کے 'کمیونل ایوارڈ' 1932 کی مخالفت کی تھی جس کے تحت کچھ مذہبی طبقات کے لئے آئین ساز اسمبلی میں سیٹوں کے

ریزرویشن کا التزام کیا گیا تھا۔ آزادی کے بعد جب جنگ آزادی کے قد آور لیڈر ہندوستان کے نئی جمہوریت کی آئین ساز کا مسودہ تیار کرنے میں معروف تھے ــــ جب جلد ہی یہ ایشو زور پکڑنے لگا تب بالآخر یہ معاملہ حتمی طور سے حل کر لیا گیا: فرقہ وارانہ ریزرویشن کے بارے میں مضبوطی سے 'نہ' کہا گیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے دھمکی دی تھی - 'یہ طریقہ انتہائی احمقانہ ہی نہیں بلکہ اس میں تباہی پوشیدہ ہے۔'★

اس لئے جب نہرو کے نواسے کی اہلیہ سونیا گاندھی کی صدارت میں کانگریس نے مذہب کی بنیاد پر ریزرویشن کا مطالبہ کیا اور اس کی حمایت کی تب مجھے سخت مایوسی ہوئی۔ 11 رجولائی 2004 کو آندھرا پردیش کی نومنتخب کانگریس حکومت نے سرکاری نوکریوں اور تعلیمی اداروں میں مسلمانوں کے لئے 5 فیصد ریزرویشن کے فیصلے کا اعلان کیا۔ میں مانتا ہوں کہ اگر چہ اقلیتی ووٹ بنک پر قبضہ بنائے رکھنے کے لئے چاپلوس نواز کانگریسی پالیسیوں کا میں عادی ہو چکا ہوں، پھر بھی کانگریس کے اس فیصلے سے میں گھبرا گیا۔ سب سے پہلے میرے دماغ میں یہ سوال پیدا ہوا- کیا یہ وہ کانگریس پارٹی ہے جس کی کبھی مہاتما گاندھی اور جواہر لال نہرو نے قیادت کی تھی؟ کیا کانگریس جو کچھ کر رہی ہے اس کے نتائج سے واقف ہے؟ کیا خاص طور سے ہندوستانی جنگ آزادی سے جڑی یہ پارٹی اصولی نظریہ سے مکمل طور پر 'صفر' ہو گئی ہے اور سیاسی نظریہ سے اپنے راستے سے بھٹک گئی ہے کہ اپنی سوچ اور سیاسی مفادات کی خاطر ملک کی ایکتا اور سالمیت کو گروی رکھنا چاہتی ہے؟

بی جے پی کے علاوہ جن لیڈروں نے آندھرا پردیش حکومت کے اس فیصلے کی مخالفت کی ان میں تامل ناڈو کی سابق وزیر اعلیٰ ڈاکٹر جے للتا بھی شامل ہیں۔ انہوں نے کہا 'اس ملک میں مسلم ہی اقلیت نہیں ہے۔ عیسائی اور دیگر اقلیت بھی ہیں۔ اگر وہ بھی مذہب کی بنیاد پر ریزرویشن کا مطالبہ کرتے ہیں تو ہم کہاں جائیں گے؟' یہ فکر بلا وجہ نہیں ہے۔ بعد میں کچھ آوازیں اٹھی۔ مین اسٹریم سے نہیں بلکہ حاشیہ پر چلے گئے جین فرقہ کو بھی 'اقلیت' کا درجہ دینے کا مطالبہ اٹھا۔ جب کانگریس اور کچھ دیگر پارٹیوں نے اقلیتوں کے لئے مذہب کی بنیاد پر ریزرویشن کا اعلان کیا تب کچھ جین بھی یہ سوچنے لگے کہ 'اقلیت' کارڈ سے وہ بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اگر یہ سوچ جاری رہتی ہے تو اس مانگ کے بڑھتے رہنے کا خطرہ ہے کیوں کہ ہندو سماج میں زیادہ سے زیادہ طبقے خود کو 'اقلیت' کہلانا چاہیں گے۔ کیونکہ اکثریتی فرقہ میں رہنے کا مطلب ہوگا بھید بھاؤ اور پریشانیاں جھیلنا۔ ان غیر معمولی حالات میں جس میں وسیع ہندو سماج کے متعدد حصے 'اکثریت' کا حصہ ہونا کا بوجھ سمجھیں، جب کہ اکثریت اقلیتوں کو حاصل حقوق کی آئینی منصوبہ میں خود کو محروم محسوس کریں- یہ ہمارے آئین سازوں کی سوچ کے برعکس ہے۔ میں آچاریہ مہاپریاگ، جنہیں میں دنیا کے عظیم زندہ سنتوں میں ایک مانتا ہوں، سے کئی بار مل چکا ہوں۔ انہوں نے واضح طور سے کہا کہ وہ جینوں کو اقلیت کہے جانے کے خلاف ہیں۔ ایسا کر کے یہ طبقہ وسیع ہندو پریوار سے الگ ہو جائے گا۔

2005 میں مرکز میں کانگریس کی قیادت والی حکومت ایک قدم اور آگے بڑھ گئی۔ اس نے ریٹائرڈ جسٹس راجندر سچر کی صدارت میں 'ہندوستان کے مسلم فرقہ کی سماجی، معاشی اور تعلیمی حالت' کا مطالعہ کرنے کے لئے ایک کمیٹی تشکیل دی۔ اس کمیٹی نے حیرت انگیز طور پر بغیر سوچے سمجھے اور مکمل طور سے غلط تجاویز رکھی- مسلح افواج میں مسلمانوں کی تعداد۔ اس طرح یہ حکومت ملک کے محافظوں کے سیکولر اور غیر جانبدارانہ کردار پر بھی کیچڑ اچھالنے لگی۔ ہندوستان میں پیدا ہونے والے امریکی شہری عمر خالدی کی کتاب 'خاکی اینڈ اتھنک وائلنس ان انڈیا' سے بری، بحری اور فضائیہ میں مسلمانوں کی مردم شماری سے ترغیب ملی تھی۔ اس کتاب کے عنوان سے ہی پتہ چل جاتا ہے کہ اس مصنف نے مسلح افواج،

★ 14 راگست 2004 کو رام بھاؤ مہانگی پر بودھنی ممبئی کے ذریعہ مذہب کی بنیاد پر ریزرویشن کے خلاف منعقد جلسہ میں اس موضوع پر میں نے تفصیلی تقریر کی تھی۔

سیکورٹی فورسیز اور ریاستی پولس پر انگلی اٹھائی ہے۔ غیر ملکوں میں لگاتار یہ مہم چلائی جاتی ہے کہ ان 'خا کی دھاریوں' کے ذریعہ ہندوستان کا مسلم طبقہ باقاعدہ تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔

سیکورٹی فورسیز کے سربراہوں نے ہی نہیں بلکہ تمام شعبوں سے اس کی مخالفت کرتے ہوئے حکومت کو مجبور کیا گیا کہ اس غلط اور قابل مذمت سوچ کو چھوڑ دے۔ اسی طرح سے آندھرا پردیش ہائی کورٹ نے مفاد عامہ معاملے میں مذہب کی بنیاد پر ریزرویشن پر سرکاری احکامات کو نامنظور کر دیا۔ تب بھی اقلیت نواز ذہنیت کانگریس پارٹی کی اعلیٰ سطح پر اور سرکار میں بہت زیادہ سرگرم ہیں۔ یہ اس وقت اور بھی واضح ہو گیا جب وزیر اعظم ڈاکٹر منموہن سنگھ نے 9/دسمبر 2006 کو قومی ترقیاتی کونسل میں اپنی تقریر میں یہ اعلان کیا کہ مسلمانوں کا ملک کے وسائل پر سب سے پہلا دعویٰ ہونا چاہئے۔

مجھے اندیشہ ہے کہ آنے والے برسوں میں کسی نہ کسی شکل میں مذہب کی بنیاد پر ریزرویشن کے مطالبہ کو لے کر دوبارہ آواز اٹھائی جائے گی۔ ایسی بھی تنظیمیں ہیں جو وقتاً فوقتاً پارلیمنٹ اور قانون ساز اسمبلیوں میں ریزرویشن کا مطالبہ کرتی رہتی ہیں۔ سبھی قوم پرستوں اور خاص طور سے سیکولر نوازوں کا فرض ہے کہ اگر کارگر ڈھنگ سے سامنا نہیں کر سکتے اور اس مطالبہ کو ٹھنڈا نہیں کر سکتے یا روک نہیں سکتے تو ایسی سوچ سے محتاط رہیں۔ ان سے مستقبل میں ہندوستان کی ایکتا اور سالمیت کو خطرہ ہو سکتا ہے۔ مجبوراً میں سوچتا ہوں کہ اس موضوع پر آئین ساز اسمبلی میں ہونے والی بہت زیادہ بحث کی یاد دلانا میرا فرض ہے کہ کس طرح سے اور کیوں مذہب کی بنیاد پر ریزرویشن کو مسترد کیا گیا تھا۔

اگست 1947 میں آئین ساز اسمبلی کے ابتدائی غور و خوض نے اقلیتوں کے تحفظ کی اتنی اہمیت تھی کہ اس اجلاس کی تعداد کی بنیاد پر مرکزی اور ریاستی آئین ساز اسمبلیوں میں مسلمانوں، عیسائیوں اور سکھوں کے لئے سیٹوں کے ریزرویشن پر غور و خوض کرنا پڑا لیکن بعد میں سردار ولبھ بھائی پٹیل کی صدارت میں آئین ساز اسمبلی کی 'بنیادی حقوق اور اقلیت و قبائلی اور چھوڑے گئے علاقوں پر صلاح کار کمیٹی' نے اس تجویز پر ٹھیک ڈھنگ سے غور کیا۔ آزادی کی تحریک کے عظیم لیڈر اس کمیٹی کے رکن تھے۔ ان میں ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر، ڈاکٹر شیاما پرساد مکھرجی، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر کے ایم منشی، پرشوتم داس ٹنڈن، پنڈت گووند بلبھ پنتھ اور گوپی ناتھ بوردولوئی کے نام شامل تھے۔ اس کمیٹی کی میٹنگ میں پنڈت نہرو کو مہمان خصوصی کے طور پر بلایا گیا تھا۔ اس کمیٹی نے بالآخر غور و فکر کرنے کے بعد یہ ظاہر کیا کہ 'یہ کمیٹی اس سے مطمئن ہے کہ اقلیت خود محسوس کرتی ہیں کہ ملک کے مفاد میں مذہبی اقلیتوں کے لئے سیٹوں کا قانونی ریزرویشن ہٹایا جانا چاہئے۔ 27/فروری 1947 کو آئین ساز اسمبلی میں اس کمیٹی کی رپورٹ پیش کرتے وقت سردار پٹیل نے کہا تھا——

> 'حال ہی میں آپ نے اس سوال کے سلسلہ میں برطانوی پارلیمنٹ میں ہونے والی بحث سنی ہوگی۔ برطانوی حکومت کی جانب سے یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ اقلیتوں کا تحفظ ان کی خاص ذمہ داری ہے- خاص مجبوری ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ ہم سے زیادہ وہ اس بارے میں دلچسپی لیتے ہیں۔ ہمیں یہ ثابت کرنا ہے کہ ان کا دعویٰ کھوکھلا ہے۔ ہندوستان میں اقلیتوں کے تحفظ میں ہم سے زیادہ کوئی دوسرا دلچسپی لے ہی نہیں سکتا۔ ہمارا مشن ہر ایک کے مفاد اور ملک کے اندر تمام اقلیتوں کے مفادات کو اطمینان بخش طریقہ سے تحفظ فراہم کرنا ہے۔ آگے چل کر ہمارا مفاد اسی میں ہے کہ ہم یہ بھول جائیں کہ اس ملک میں اقلیتی یا اکثریتی جیسی کوئی سوچ ہے اور قبول کریں کہ ہندوستان میں ہم سب کا صرف ایک ہی فرقہ ہے۔'

'فریمنگ آف دی انڈین کانسٹی ٹیوشن' نامی 5 جلدوں میں درج اپنی عظیم کتاب میں بی شیوراؤ نے لکھا ہے- 'صلاح کار کمیٹی کی ان

تجاویز پر کافی عرصہ تک غور وخوض ہوا۔ بیشتر مقرروں نے مذہب کی بنیاد پر ریزرویشن ختم کرنے کی تجویز کی حمایت کی۔ ان میں مسلم، عیسائی، اینگلو انڈین، درج فہرست ذات وقبائل اور ہندو سبھی شامل تھے۔ جواہر لال نہرو نے اس تجویز کو 'فطرت کا تاریخی موڑ' کہا نہرو نے مزید کہا 'ایسی حالت میں اس طرح تحفظ کی اہمیت ہے جہاں پرتانا شاہ یا غیر ملکی حکمراں ہوں۔ اس طرح سے بادشاہت کو ایک فرقہ کو دیگر فرقہ کے خلاف لڑنے میں مدد ملے گی۔ لیکن مکمل جمہوریت میں اگر آپ اقلیت کے لئے سیکورٹی کا انتظام کرتے ہیں جو تھوڑا اکثریتی طبقہ ہے تو آپ اس طبقہ کو مین اسٹریم سے الگ کر دیتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ آپ کسی حد تک انہیں تحفظ مہیا کرتے ہوں لیکن کس قیمت پر؟ انہیں الگ کر کے اور مین اسٹریم سے الگ رکھ کر ــــ میں سیاسی بنیاد کی بات کر رہا ہوں ــــ اور اکثریتی طبقہ کی اندرونی ہمدردی اور سب کے ساتھ مل کر چلنے کی بنیاد کھونے کی قیمت پر۔'

اس آئین ساز اسمبلی میں درج فہرست ذات وقبائل کے لئے ریزرویشن کی تجویز کی ہی حمایت کی گئی تھی۔ اس کے بعد قانون کے دفعہ 341 میں اس سلسلے میں دھیان رکھا گیا۔ اس پر توجہ دینا مناسب ہوگا کہ اس تجویز کے عمل درآمد میں کانگریس حکومت نے خاص طور سے ہندو درج فہرست ذاتوں اور سکھوں میں 4 شیڈول برادریاں (کبیر پنتھی، رام داسی، سکلی گر اور مذہبی) کو فائدہ مندوں کی شکل میں منتخب کیا گیا تھا۔ نہرو حکومت نے مسلمانوں اور عیسائیوں کو تعلیمی اور سرکاری نوکریوں میں شیڈولڈ کاسٹ کے ریزرویشن کے دائرہ اختیار سے باہر رکھا تھا۔ آئین کی دفعہ 341 میں ترمیم کر کے صدر جمہوریہ کے حکم سے اس سلسلے میں ترمیم کی گئی۔ اس کے تحت ہندوستان کے صدر جمہوریہ کو یہ حق دیا گیا کہ وہ درج فہرست ذات کی شکل میں کسی مخصوص قبائل کو شیڈولڈ کاسٹ کا درجہ دے سکتا ہے۔ ترمیم شدہ قانون کے مطابق صرف وہی دلت جو ہندو ہیں، شیڈولڈ کاسٹ کے رکن مانے جائیں گے اور اس طرح سے ریزرویشن کا فائدہ حاصل کرنے کے حق دار ہوں گے۔ 1956 میں اس میں سکھ مذہب ماننے والی تمام ذات وقبائل کو بھی شامل کیا۔ 1990 میں بودھ دھرم اپنانے والے دلتوں کو بھی اس فہرست میں شامل کیا گیا۔

طویل عرصہ تک نام نہاد 'دلت عیسائی' طبقہ اور 'دلت مسلمانوں' کے لئے ریزرویشن کا مطالبہ کیا جاتا رہا ہے۔ اگرچہ پہلے کی سرکاروں نے ان مطالبات پر دھیان نہیں دیا۔ کیوں؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہندوستانی آئین ساز اس بارے میں واضح تھے کہ ہندو سماج ذات پر مبنی ہے۔ اگر کچھ نچلی ذات کے ہندوؤں نے ماضی میں اسلام یا عیسائی مذہب اپنایا تو اس کی وجہ یہ دعویٰ رہا کہ ان کے یہاں ذات کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے، اس لئے تبدیلیٔ مذہب بنام اصل مسلمانوں اور عیسائیوں کا یکساں مقام ہے۔ یہاں یہ کہنا بھی مناسب ہوگا کہ پنڈت نہرو کے دور اقتدار میں وزارت داخلہ کے ذریعہ یہ اہم ریلیز (حکومت ہندوستان/نمبر 19/4/58-SCT IV بتاریخ 23 رجولائی 1959) جاری کیا گیا تھا۔

موضوع: عیسائی بننے والے درج فہرست ذاتوں کے دوبارہ ہندو دھرم میں واپس لوٹنے پر ان کا درجہ۔

'حکومت کو حال ہی میں اس سوال پر غور کرنے کا موقع ملا ہے کہ اگر درج فہرست ذات کا کوئی شخص مذہب تبدیل کر کے ہندو دھرم چھوڑ دیتا ہے اور دوبارہ ہندو دھرم قبول کر لیتا ہے تو اسے حقیقی درج فہرست ذات کا ممبر مانا جائے گا یا نہیں۔ انتہائی توجہ کے ساتھ غور وفکر کرنے کے لئے حکومت کو یہ صلاح دی گئی کہ ایسے شخص کو دوبارہ مذہب کو تبدیل کر کے صحیح ذات میں مانا جائے گا اور وہ درج فہرست ذات وقبائل کے خصوصی مراعات اور مدد کا مستحق ہوگا۔ جس طرح درج فہرست ذات سے متعلق قانون بنا ہوا تھا۔ اطلاعات اور رہنمائی کے لئے یہ فیصلہ ریاستی حکومت رمرکز سے الحاق شدہ حکومتوں کو جانکاری میں لایا جاتا ہے۔'

اس نوٹیفکیشن میں ذات سے متعلق ایشو پر نہرو حکومت کی واضح سوچ کو ہندو سماجی زمرہ کے طور پر قبول کیا گیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں

نہرو سے لے کر نرسمہاراؤ تک مرکز میں کانگریس حکومت نام نہاد 'دلت مسلمانوں' اور 'دلت عیسائیوں' کو ریزرویشن کے فائدہ پہنچانے کے حق میں رہی، اس لئے انہیں درج فہرست ذات کے زمرہ میں نہیں لایا جا سکا ہے۔

یہ حقائق قابل غور ہے کہ مذہبی بنیاد پر درج فہرست ذات وقبائل کے ریزرویشن کا فائدہ اٹھانے کے سلسلے میں کوئی پابندی نہیں ہے۔ درج فہرست ذات کو نشان زد کرنے کے لئے مذہب کوئی معیار نہیں ہے۔ اگر درج فہرست ذات کے لوگ اسلام یا عیسائی مذہب اپناتے ہیں تو انہیں درج فہرست ذات وقبائل کا درجہ ملتا رہے گا۔ اس سے پھر واضح ہوتا ہے کہ آئین سازوں کے ذریعہ ذات کو ہندو سماج کے سلسلے میں خصوصی زمرہ میں ماننے کے کیا وجہ تھے۔

کانگریس کی حالیہ قیادت ہندوستان کی تاریخ کو نہ تو جانتی ہے اور نہ ہی اس کی پرواہ کرتی ہے۔ پھر بھی کوئی بھی یہ امید کرتا ہے کہ لیڈروں کو کم سے کم اپنی پارٹی کی تاریخ کی جانکاری ضرور ہونی چاہئے اور ریزرویشن کے موضوع پر اسی کے مطابق سوچ وفکر کرنی چاہئے۔ دوسرے الفاظ میں کانگریس پارٹی کے آج کے لیڈروں کو پنڈت جواہر لال نہرو اور راجیو گاندھی کے خیالات کو یاد کرنا چاہئے۔ 27/ جون 1961 کو بھی وزرائے اعلیٰ کو لکھے مکتوب میں نہرو جی نے کہا تھا-

'میں نے کام کی اہلیت اور پرانی روایات سے ابھرنے کے بارے میں لکھا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ریزرویشن کی پرانی عادت اور کسی ذات یا گروپ کو دئے جا رہے خصوصی اختیارات کو چھوڑ دیا جانا چاہئے۔ میں کسی بھی طرح کے ریزرویشن خاص طور پر نوکریوں میں ریزرویشن پسند نہیں کرتا۔ میں مضبوطی کے ساتھ ایسی کسی بھی بات کے بارے میں ردعمل ظاہر کرتا ہوں، مخالفت کرتا ہوں جس کی وجہ سے نظم ونسق میں نااہلیت اور گھٹیا سطح جیسے معیار در آئیں۔ اگر ہم مذہب یا ذات کی بنیاد پر ریزرویشن کی حمایت کرتے ہیں تو اہل اور صلاحیت مند لوگ غرق ہو جائیں گے، دلدل میں دھنس جائیں گے اور ہمارا ملک دوسرے اور تیسرے کلاس کا ہو کر رہ جائے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ میرا ملک ہر نظریہ سے اول ہو۔ جس وقت ہم نے دوسرے درجے کی حوصلہ افزائی کرنی شروع کی ہمیں اپنی شکست کو قبول کرنا پڑے گا۔ مجھے یہ جان کر دکھ ہوا ہے کہ کس طرح مذہبی بنیاد پر ریزرویشن کا کام چل رہا ہے۔ یہ راستہ بے وقوفیوں یا غلطیوں سے ہی بھرا نہیں ہے بلکہ یہ تباہی کی جانب لے جاتا ہے۔'

نہرو کے خیالات کو میں نے ان کی حمایت کرنے کے لئے ذکر نہیں کیا ہے بلکہ حالیہ کانگریس قیادت کی توجہ متوجہ کرنے کے لئے کیا ہے۔ بی جے پی مانتی ہے کہ ریزرویشن حقیقت میں درج فہرست ذات وقبائل اور پسماندہ طبقات کے لئے ضروری ہے، مدد کی ضرورت ہے تاکہ سماجی اور معاشی پسماندگی پر کامیابی حاصل کرنے میں مدد مل سکے۔ میں یہاں بتانا چاہتا ہوں کہ اس تصویر کے دو رخ ہیں۔ نہرو جی سماجی اور معاشی طور سے پسماندہ لوگوں کی سماجی، معاشی ترقی کے لئے محض ایک ذریعہ کی شکل میں ریزریشن کی حد سے آمادہ تھے۔ دوسرا رخ ہمارے حالیہ دور سے بہت بڑا ہے۔ وہ مکمل طور سے مذہبی بنیاد پر ریزرویشن کے خلاف تھے۔

میں نے اس سے پہلے باب میں ذکر کیا ہے کہ راجیو گاندھی کو اس وقت ریزرویشن کے بارے میں بولنا پڑا تھا جب جانبدارانہ سیاست اور انتخابی فائدہ کے نظریہ سے ریزرویشن پر غور کیا جا رہا تھا۔ منڈل کمیشن کی سفارشوں پر ہونے والی بحث میں ستمبر 1990 کی لمبی چوڑی تقریروں میں اس اپوزیشن لیڈر نے اس وقت کے وزیر اعظم وی پی سنگھ پر الزام لگایا کہ 'اس طرح کے ریزرویشن سے ہندوستان کی ایکتا اور سالمیت کو خطرہ ہے۔ آپ نے پورے ملک میں ذات پات کی آگ بھڑکا دی ہے۔' راجیو گاندھی اس وقت گرج کر بولے تھے۔ خاص طور پر انہوں نے سماج کے

ہے۔آپ نے پورے ملک میں ذات پات کی آگ بھڑکا دی ہے۔' راجیو گاندھی اس وقت گرج کر بولے تھے۔خاص طور پر انہوں نے سماج کے خصوصی اختیارات حاصل کرنے والے طبقات، نام نہاد ترقی یافتہ طبقہ کو ریزرویشن کا فائدہ دینے کی بات پر سوال کھڑا کیا تھا۔

جن لوگوں کو منڈل کمیشن کی بحث یاد ہے وہ جانتے ہیں کہ ریزرویشن کے فائدہ حاصل کرنے والوں میں سے ترقی 'یافتہ طبقہ' (کریمی لیئر) کو نکالنے کے سوال پر بی جے پی کیونسٹ پارٹیوں اور کانگریس میں اتفاق رائے تھا، یہاں تک کہ سپریم کورٹ نے منڈل کمیشن کی سفارشوں کے عمل درآمد کے سلسلے میں اپنا فیصلہ دیتے وقت ریزرویشن میں 'کریمی لیئر' کو شامل نہ کرنے پر اپنی رائے دی تھی۔اس سلسلے میں میں نے 'کریمی لیئر' کے اصول کا ذکر یہ بتانے کے لئے کیا ہے کہ مجموعی طور سے مسلم فرقہ کے لئے ریزرویشن کی تجویز رکھتے وقت کانگریس نے اس اصول پر راجیو گاندھی کی تشویش یا خیال پر غور نہیں کیا۔اس سلسلے میں میں یہ حوالہ دینا چاہتا ہوں کہ پہلے پسماندہ طبقہ کمیشن کے چیئرمین گاندھی وادی کاکا کالیلکر نے اپنی رپورٹ پیش کرتے وقت حکومت کو لکھے مکتوب میں کہا تھا - پسماندہ طبقہ کمیشن یہ قبول نہیں کرتا کہ سبھی عیسائی اور ہندوستانی مسلمان پچھڑے ہوئے ہیں۔اس نکتہ کو قبول کیا جائے تو یہ بھی قبول کرنا پڑے گا کہ سبھی ہندو یکساں طور سے پچھڑے ہوئے ہیں'

میں مذہبی ریزرویشن کے تئیں کانگریس پارٹی کے اتفاق کو نام نہاد سیکولر ذہنیت اور اقلیت نواز پالیسی میں پنہاں سمجھوتوں اور دباؤ کے تئیں مکمل خود سپردگی کا نتیجہ سمجھتا ہوں۔اس سے یہ دکھائی دیتا ہے کہ ملک کے دوررس مفاد کو چھوڑنے، یہاں تک کہ اقلیتوں کے ووٹ بینک پر قبضہ جمانے کے مقصد سے کانگریس پارٹی قومی تحریک کے وقت کئے گئے اپنے وعدے کو بھی چھوڑنے کی خواہش مند ہے۔

میں یہاں درگا داس باسو کی انتہائی اہم کتاب 'انٹروڈکشن ٹو دی کانسٹی ٹیوشن آف انڈیا' کے ایک حصے کا حوالہ دینا چاہتا ہوں۔آئینی معاملوں کے ماہر باسو نے ان تکلیف دہ عادتوں کے بارے میں لکھا ہے 'جو مذہبی اقلیتوں کے شدید مطالبات کے سلسلے میں 1980 کے عام انتخابات سے ظاہر ہوتے آرہے ہیں۔یہ عادتیں اور ایسے مطالبات آئین کی بنیادی روح اور جڑ کے خلاف ہیں۔اس میں اس ملک کے سپریم کورٹ کے اعلانات کے اصل پیغام کو نہیں سمجھا گیا۔ان مطالبات کی بنیاد یہ نہیں ہے کہ یہ اعلانات آئین کے التزامات کے مطابق نہیں ہے بلکہ یہ کہ مذہبی اقلیتوں کی علیحدگی پسند خواہشات کے مطابق نہیں ہے۔آزادی کے بعد کے دور کے اس واقعہ کی سب سے زیادہ تکلیف دہ بات یہ ہے کہ اقلیتوں نے اپنے ووٹ کو لالچ کے شکل میں مانا ہے اور مختلف پارٹیوں سے متعلق اکثریتی فرقہ کے سیاسی لیڈروں نے بغیر سوچے سمجھے اندھا دھند اپنے انتخابی منشوروں اور اتحادیوں میں اس لالچ کو نگل لیا ہے۔ہندوستان کی جنگ آزادی کی تحریک کے وقت اپنائی گئی سوچ پر کوئی توجہ نہیں دی جب کہ یہ سوچ ہمارے آئین کی بنیاد ہے۔اس پس منظر میں غیر جانبدار ماہرین کا فرض ہے کہ وہ ہر ایک قوم پرست ہندوستانی (ہر ایک ہندوستانی شہری کے بارے میں یہ سوچ نہیں بنائی جاسکتی کہ اس کے سیاسی مفادات ہیں) کو بتائیں کہ اقلیتوں کے ملک مخالف مطالبہ قبول کرنے سے ہندوستان ٹکڑوں میں بکھر جائے گا۔

> مثبت سوچ رکھنے والے اس ملک کے لوگوں، ان میں غور وفکر کرنے والے کانگریس بھی شامل ہیں سے میری درخواست ہے کہ اقلیت نوازی کی سیاست کے خلاف آواز اٹھائیں۔چونکہ ہندوستان مذہبی اسٹیٹ نہیں ہے، اس لئے مختلف عقیدوں پر منحصر فرقوں کی پہچان اور مذہبی حقوق، جس سے وسیع ہندوستانی کنبہ بنتا ہے، کو ضرور محفوظ کیا جانا چاہئے۔لیکن 'اکثریت اور اقلیت' کی روایات کا ہمارے ملک کی سیاست اور انتظامیہ میں کوئی مقام نہیں ہونا چاہئے۔ان روایات کا غلط استعمال ووٹ بینک کی سیاست کے لئے نہیں ہونا چاہئے۔یہ تقسیم کرنے والی ذہنیت ہندوستان کی مشترکہ ایکتا اور بھائی چارے کو خطرے میں ڈالتی ہے۔برطانوی حکمرانوں کے برابر' کانگریس

پارٹی اپنے مفادات کی خاطر 'اقلیتوں کے تحفظ کے نام پر ملک کو مسلسل تقسیم کی جانب لے رہی ہے۔

میں یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ میری پارٹی اقلیتوں-مسلم یا دیگر- کے خلاف نہیں ہے، نہ ہی ہندوستان میں کسی اقلیتی فرقہ کے خلاف ہے۔ ہم اسلام سمیت سبھی مذاہب کی عزت کرتے ہیں۔ ہندوستان ہم سب کا ہے-خواہ ہمارا مذہب یا ذات کچھ بھی ہو، ہماری قوم پرستی کی سوچ سب کو ساتھ لے کر چلنے کی ہے۔ میری مسلم فرقہ سے اپیل ہے کہ وہ اس سوال پر خود احتساب کریں، کیا میری پارٹی کے تئیں آپ کے حالیہ منفی نظریے سے آپ کے فرقہ کا یا وسیع پیمانہ پر ملک کا کوئی بھلا ہوتا ہے؟ آزادی کے 60 سال بعد آپ کے فرقہ کو غریب اور پسماندہ رکھنے اور بار بار دھوکہ دینے کے باوجود کیا کانگریس پارٹی آپ کی حمایت کی حقدار ہے؟ ہندوستان کے مختلف النوع سماج کے سبھی حصوں، طبقوں کی ترقی، بہبود اور تحفظ کے آپسی تعلقات ہیں اور قائم ہیں۔ اس لئے آیئے اقلیت کی ذہنیت کی جال سے باہر نکل کر یکساں حقوق اور ذمہ داری کے جذبہ کے ساتھ ملک کے مین اسٹریم میں شامل ہو جایئے۔ تاکہ مضبوط ترقی یافتہ اور انصاف پسند ہندوستان کی تعمیر میں سبھی کی یکساں ذمہ داریاں ہوں اور اس کا ثمر سب کو یکساں طور پر ملے۔

نام نہاد سیکولرازم کا اثر

اقلیت نوازی کی سیاست کا تعلق نام نہاد سیکولرازم سے ہے۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ نام نہاد سیکولرازم ہی اقلیت نوازی قائم کرتا ہے۔ اس کی تشریح اس طرح سے کی جا رہی ہے اور اس طرح سے عمل میں لایا جا رہا کہ ہندوستان کی ثقافت اور تہذیب کے نظریہ سے قائم شناخت کو مسترد کیا جا رہا ہے۔ میں نے اجودھیا آندولن کے بارے میں تفصیل سے اس ایشو پر غور کیا ہے، یہاں تک سیکولرازم کے نام پر بھگوان رام اور بابر کو یکساں سطح پر لا کر کھڑا کر دیا گیا اور رام جنم بھومی سے جڑے کروڑوں ہندوؤں کے جذبات کو نظرانداز کیا گیا۔ 'کیا آپ یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ رام ٹھیک اسی مقام پر پیدا ہوئے؟' کمیونسٹ دانشوروں نے قابل اعتراض لہجے میں پوچھا، جبکہ ہندو کے علاوہ دیگر فرقہ سے متعلق تنازع کے معاملہ میں وہ ایسا کبھی نہیں کر سکتے۔

1987 میں ہندی میگزین 'داما' میں انٹرویو دیتے وقت میں نے کہا تھا کہ اگر بابر کے ساتھ ہندوستانی مسلمانوں کا کوئی طبقہ جذباتی رشتہ قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ ٹھیک ویسے ہی ہوگا جیسے دہلی کے عیسائی اس بنیاد پر مہاتما گاندھی کے مجسمہ کی جگہ جارج پنجم کے مجسمہ قائم کرنے کیلئے جھگڑا کریں کہ جارج پنجم عیسائی تھا۔ اب گاندھی جی مذہبی نظریہ سے ہندو ہو سکتے ہیں لیکن وہ پورے ملک سے جڑے تھے، جبکہ جارج پنجم نہیں تھا۔ اسی طرح رام اس ملک کے ہیں، چاہیں انہیں پورانک نائک کہیں یا تاریخی کردار۔ یہاں تک کہ تاریخ اور ثقافت کے ایشو پر میں اس ملک کے مسلم لیڈروں سے یہ درخواست کرنا چاہوں گا کہ اگر انڈونیشیا کے مسلمان رام اور 'رامائن' پر فخر کر سکتے ہیں تو ہندوستانی مسلمان کیوں نہیں؟

اسی نام نہاد سیکولرازم کی وجہ سے حال ہی میں ستمبر 2007 میں 'رام سیتو'★ کے معاملہ میں ہندو جذبات کو ٹھیس پہنچائی گئی۔ تامل ناڈو کے

★ ہندو کا عقیدہ ہے کہ رام سیتو بھگوان رام کے انتہائی عقیدتمند ہنومان جی نے اور ان کی 'وانر سینا' نے بنایا تھا، تاکہ ہندوستان کے جنوبی سرے رامیشورم کو بحر ہند کے پاس سری لنکا جزیرہ سے جوڑا جا سکے۔ رام سیتو کے ساتھ کام کرنے کی روایت دلچسپ کہانی سے جڑی ہے۔ جب ہنومان اور ان کی فوج یہ سیتو بنا رہے تھے تب ایک گلہری نے فیصلہ کیا کہ وہ بھی وانروں کی ذریعہ لائی گئی چٹانوں کے درمیان خالی مقامات کو بھرنے کیلئے ریت لا کر تعاون دے گی۔ جب وانر سینا نے پوچھا کہ وہ کیا کر رہی ہے تب گلہری نے جواب دیا 'میں بھگوان رام کی تھوڑی بہت خدمت کر رہی ہوں تاکہ لنکا جا کر ....(جاری)

نزدیک سیتو سمندرم شپ کینال پروجیکٹ میں 'رام سیتو' پر تنازع کھڑا ہو گیا اور متحدہ ترقی پسند اتحاد (یو پی اے) اتحاد حکومت نے سپریم کورٹ کے سامنے پیش حلف نامہ میں دعویٰ کیا کہ بھگوان رام کا کوئی وجود ہی نہیں تھا اور 'رامائن' کی کوئی تاریخی بنیاد نہیں ہے۔

اس پر مزید نمک پاشی کرتے ہوئے برسراقتدار اتحاد کی پارٹی کے ایک لیڈر نے بھگوان رام کے بارے میں اور زیادہ قابل اعتراض تبصرہ کیا۔ ملک کے سپریم کورٹ میں ہندوؤں کو ٹھیس پہنچانے والا حلف نامہ پیش کر کے کانگریس پارٹی اور یو پی اے اتحاد حکومت نے دنیا بھر کے کروڑوں ہندوؤں کے مذہبی جذبات کو ٹھیس پہنچائی ہے۔ سیکولرزام کا دعویٰ کرنے والی حکومت کا ہندوؤں کے جذبات کے ساتھ کھلواڑ کرنا، انہیں گھٹیا اور کوڑا کرکٹ سمجھنا انتہائی شرمناک، غیر ضروری کوشش، غیر حساسیت اور مکاری ہے۔ قانونی دائرے میں حکومت نے وہ سب مسترد کر دیا جسے ہندو اپنے دھرم میں مقدس اور پاک سمجھتے آرہے ہیں'۔

میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا' میں یہ بتانا چاہوں گا کہ مہابھارت کے ساتھ رامائن کو ہندوستانی جنگ آزادی کے سبھی عظیم رہنماؤں مہاتما گاندھی سے لے کر لوک مانیہ تلک اور جواہر لال نہرو سے لے کر سردار پٹیل تک - نے ہندوستان کی قومی ثقافت اور وقار قرار دیا ہے۔ اسے محض پورانک اور محض تصوراتی بتا کر حکومت نے ہندوستان کے بارے میں قائم روایت کو توڑا ہے اور ہمارے قدیم قوم کی تہذیب کے نظریہ سے شناخت کے بارے میں نئے سرے سے سکھانے کی کوشش کی ہے۔

اگرچہ حکومت نے انتہائی عجلت سے اس قابل مذمت حلف نامہ کو واپس لے لیا تھا پھر بھی اس نے ہندو تنظیموں اور مذہبی لیڈروں کے اس مطالبہ کو قبول نہیں کیا ہے کہ اس پروجیکٹ کو چھوڑ دے، جس میں رام سیتو کو توڑنے پر غور کیا جا رہا ہے۔

مجھے اپنی سیاسی زندگی میں ایسے کئی تجربات ہوئے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ سیکولرازم کے خود ساختہ محافظوں نے کس طرح سے مذہب مخالف تعریف کی ہے۔ بلاشبہ ان کا سیکولرازم ہمیشہ سے ہندو مخالف رہا ہے۔ یہ لوگ کسی دوسرے مذہب کے خلاف نہیں رہے۔ میں 1970 کی مثال پیش کرتا ہوں، جب راجیہ سبھا کے رکن کے طور پر میں پہلی بار منتخب ہوا تھا۔ حکومت ہند کی ہر ایک وزارت کی صلاح کار کمیٹی ہوتی ہے، جس میں دونوں ایوان کے ممبر ہوتے ہیں۔ یہ کمیٹیاں اپنی وزارت سے متعلق موضوعات پر غور وفکر کرتی ہیں، سفارشات پیش کرتی ہیں، لیکن کوئی فیصلہ نہیں لیتی۔

اس کمیٹی میں نئے ممبر پارلیمنٹ کو اپنی پسند کی کمیٹی میں کام کرنے کا موقع دیا جاتا ہے۔ پروفیشن سے صحافی ہونے کے ناطے میں نے وزارت اطلاعات ونشریات کو منتخب کیا۔ اس کمیٹی کی پہلی میٹنگ میں ہی مجھے غور وخوض کے لئے شرکت کرنی پڑی۔ میرے خیال میں یہ میٹنگ عجوبہ تھی۔ ایک کانگریس ممبر نے روز صبح آل انڈیا ریڈیو پر نشر کی جانے والے 'بھکتی سنگیت' پر اعتراض کیا، جس میں بھکتی گیت سنائے جاتے ہیں۔ انہوں نے نکتہ پیش کیا کہ ایسے پروگراموں سے ہندو جذبات کو فروغ ملتا ہے اور ہمارا سیکولر اسٹیٹ اس کی اجازت نہیں دیتا۔

(گزشتہ سے پیوستہ) سیتا جی کو راون کی قید سے آزاد کرا سکیں'۔ وانروں نے یہ کہہ کر ان کا مذاق اڑایا 'تمہاری مدد کی کوئی اہمیت نہیں ہے'۔ یہ دیکھ کر بھگوان رام نے ان سب سے یہ کہا 'اپنی سیوا پر گھمنڈ مت کرو اور دوں کی عزت کرو، خواہ وہ کتنا ہی چھوٹا ہو۔ یہ چھوٹی سی گلہری ہر ممکن کوشش کر رہی ہے۔ آپ میں جو سب سے بڑا ہے، گرو ہے اس کا تعاون بھی اس کے لئے عظیم ہے، کیونکہ حقیقت میں پیار اور بھکتی کی اہمیت ہوتی ہے'۔ اس کے ساتھ ہی بھگوان رام نے گلہری پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔ عام روایت ہے کہ آج بھی گلہری کی پیٹھ پر شری رام کے انگلیوں کے نشان ہیں۔ گلہری کی خدمت کی کہانی پورے ہندوستان میں مقبول ہے اور لوگوں کو تحریک دیتی ہے کہ خواہ کتنا ہی عظیم مقصد ہو انہیں ہر ممکن اپنا تعاون دینا چاہئے۔

اس ممبر کی باتوں کا کمیٹی پر کوئی اثر نہیں پڑا۔اس فورم میں وہ اس موضوع کو زیادہ عرصہ تک جاری نہیں رکھ سکے۔بعد میں مجھے یاد آیا کہ کچھ عرصہ قبل یہ ممبر پارلیمنٹ راشٹر پتی بھون میں ایک وفد لیکر آئے تھے،تاکہ اس وقت صدر جمہوریہ ڈاکٹر ایس رادھا کرشنن سے اس مسئلہ پر بات کی جائے۔ان کی باتوں کو صبر وتحمل سے سننے کے بعد صدر جمہوریہ نے تبصرہ کیا'خواتین وحضرات!میں آپکو بتادوں کہ میں عام طور پر صبح کے کچھ گھنٹے چھوڑ کر آل انڈیا ریڈیو نہیں سنتا۔میں بھکتی موسیقی کا پروگرام سننا ہی پسند کرتا ہوں'۔

متعدد دستاویزوں اور تقریروں میں ڈاکٹر رادھا کرشنن نے اس بات پر سختی سے زور دیا کہ'سیکولر اسٹیٹ کا سیدھا سادہ مطلب ایسی اسٹیٹ سے ہے جس میں سبھی مذاہب کے خیالات کو یکساں طور سے احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور کسی طرح کا بھید بھاؤ کئے بغیر سبھی شہریوں کے ساتھ یکساں رویہ اختیار کیا جاتا ہے'۔لیکن انہوں نے اس بات پر بھی زور دیا کہ سیکولر اسٹیٹ کا مطلب لامذہبیت بالکل نہیں ہے۔جب گاندھی جی رام راجیہ کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں یا گرودیو رویندر ناتھ ٹیگور'ایکا دھرم راجیہ ہیلے اے بھارتے'(ہندوستان میں دھرم راجیہ ہو انصاف پسند اور بہترین انتظام ہو) دعا کرتے ہیں۔تب یہ دونوں رہنما کیا مذہبی یا سیکولر مخالف ریاست کی حمایت کرتے ہیں؟

گاندھی جی اور ٹیگور کا اس سے مطلب تھا کہ مذہب کی اہمیت کو کم سمجھ کر یعنی روحانی اور اخلاقی رہنمائی کے بغیر ہندوستانی ریاست اور سماج اپنے ہدف حاصل نہیں کرسکتا۔

میں لوک سبھا اسپیکر روی رائے کی صدارت میں ممبران پارلیمنٹ کے وفد کے ساتھ 1990 میں لندن دورے کی یاد دلانا چاہتا ہوں۔ ہاؤس آف کامنس کے اسپیکر نے اپنی رہائش گاہ پر عشائیہ کے لئے اس وفد کو مدعو کیا۔ہم سبھی وقت پر پہنچ گئے۔ ہمارے میزبان اور دارالعوام کے کچھ منتخب ممبران بھی وہاں موجود تھے۔میز پر ہم لوگوں کے بیٹھ جانے کے بعد بھی کھانا شروع نہیں کیا گیا تھا۔'کیا کسی کا انتظار کیا جارہا ہے؟'میں نے قریب ہی بیٹھے لیبر پارٹی کے ممبر سے پوچھا۔ان کا نام گریول جینر تھا۔انہوں نے کہا'جی ہاں ہاؤس کے چیپلین کو ابھی آنا ہے۔ان کے آنے پر اور دعا کے بعد ہی عشائیہ شروع ہوگا'۔میں دوسری جانب بیٹھے اپنے ہندوستانی ساتھی کی جانب مڑا۔وہ سینئر مارکس وادی لیڈر تھے۔میں نے پوچھا'اگر ایسا ہی کچھ ہندوستان میں ہونے لگا تو آپ کیا کریں گے۔واک آؤٹ؟'

خوش قسمتی سے جب ہاؤس آف کامنس کے چیپلین پہنچے اور دعا کرنے لگے تو جینر نے میری جانب دیکھ کر دبی زبان میں کہا'مسٹر آڈوانی! آپ ہندو ہیں اور میں یہودی،امید ہے کہ وہ ہمیں بھی دعا میں شامل کریں گے'۔اس عشائیہ سے جینر اور میں گہرے دوست بن گئے۔وہ اکثر ہندوستان کا دورہ کرتے ہیں اور ایسا کبھی نہیں ہوا کہ یہاں آئیں اور مجھ سے نہ ملے ہوں۔میں جب بھی لندن جاتا ہوں ان سے ضرور ملتا ہے۔ وہ برطانیہ میں اور باہر دونوں میں مختلف مذاہب کے درمیان اچھے تعلقات کو فروغ دینے کی کوشش کررہے ہیں۔

جب راجیو گاندھی وزیراعظم بنے،انہوں نے مجھے بی جے پی صدر کے ناطے قومی ایکتا کونسل کے صدر کے طور پر مدعو کیا تھا۔ستمبر 1986 میں منعقد میٹنگ میں ہندوستان میں سیکولرازم کے معنی پر کافی غور وخوض ہوا۔میں نے اپنے ساتھی ممبران سے پوچھا'اگر نئے ہندوستانی جہاز کے پانی میں اترنے پر اس کے نوتل میں ناریل پھوڑا جاتا ہے تو کیا یہ سیکولرازم کے خلاف ہوگا؟یا پھر اس موقع پر شمپین کی بوتل کھولی جانی چاہئے؟کسی انتہائی اہم شخص'وی آئی پی'کو کسی نمائش کا افتتاح کیسے کرنا چاہئے۔شمع روشن کرکے یا قینچی سے فیتہ کاٹ کر؟'کئی ممبروں نے میرے اس خیال سے اتفاق کیا کہ ناریل پھوڑنے یا شمع روشن کرنے میں کچھ بھی غلط نہیں ہے۔تاہم مشہور سی پی آئی لیڈر سی راجیشور راؤ نے میرے خیالات پر فوری ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے کہا'کوئی ناریل نہیں،کوئی شمع نہیں،ہمارا سیکولر اسٹیٹ ہے۔'میں اس موضوع پر خود کو روک نہیں پایا۔مارکس وادی

افکار میں مذہب عام لوگوں کے لئے افیم ہے، اس لئے اس نظریہ کے ماننے والوں کو ایسی روایات اور رسم و رواج سے نفرت ہے، جن کا مذہب سے دور تک بھی تعلق ہو، لیکن میں نے محسوس کیا کہ ہندوستانی آئین سازوں کے دماغ میں سیکولرازم کے تصور کا، اس مارکس وادی نظریے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ مارکس وادیوں کے نظریے کو سیکولرازم نہیں بلکہ سوڈو سیکولرازم کہا جا سکتا ہے۔ میں نے اس پر زور دیا کہ اگر بائیں بازو میں ذاتی زندگی سے بھی مذہب ہٹا دیا جاتا ہے، ہندوستانی سیکولرزم کی جگہ مذہب میں ہے۔ اس ہندو سوچنے کے سبھی راستے اس ایشور کی جانب جاتے ہیں۔ جیسا کہ ویدوں میں کہا گیا ہے۔ 'ایک سد وپرا بہودا ودنتی'۔ میں نے راؤ اور میٹنگ میں موجود دیگر ممبران کو یاد دلایا کہ گاندھی جی نے کہا تھا کہ مذہب سے مستثنٰی سیاست آلودہ ہوتی ہے۔ اس کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا جانا چاہئے'۔

ڈونالڈ یوزن اسمتھ نے اپنی کتاب 'انڈیا: از اے سیکولر اسٹیٹ' میں ہندوستانی سیکولرازم کا خاص طور سے مطالعہ کیا ہے۔ اس میں سیکولرازم کے موضوع پر گاندھی اور نہرو کے درمیان اختلافات اجاگر کئے ہیں اور یہ ذکر کیا ہے کہ آزادی کے ابتدائی برسوں میں ایسے اختلافات کی وجہ سے حکومت کے سامنے مسائل کھڑے ہوئے تھے۔ سردار پٹیل، ڈاکٹر راجندر پرساد، سی راج گوپال آچاری اور ڈاکٹر کے ایم منشی جو گاندھی کے افکار کو ماننے والے تھے، اس کے بارے میں میں نے تفصیلی معلومات گجرات میں سومناتھ مندر کی تعمیر نو کے بارے میں ذکر کیا ہے۔ یہ دیکھ کر سب سے زیادہ افسوس ہوتا ہے کہ حالیہ قیادت میں نہرو یا اندرا گاندھی دور کے بہ نسبت اس وقت کانگریس قوم پرستی کے تئیں زیادہ غیر حساس ہوگئی ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ کس طرح سے کانگریس پارٹی نے مارکس وادیوں کے ذریعہ 'وندے ماترم' کے خلاف چلائی گئی مہم کی حمایت کی تھی۔ انہوں نے الزام لگایا کہ ہندوستان کا قومی ترانہ فرقہ واریت کے جذبہ سے متاثر ہے۔

کسی قدیم ملک کی ثقافت کا مشترکہ ہونا فطری ہے، لیکن ہمارے ملک میں عام طور سے ہندوستانی ثقافت کی مشترکہ روایت پر زور دیتے وقت لازمی طور پر ہندو روایت کو مسترد کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اگرچہ غیر ملکی ڈونالڈ یوزن اسمتھ نے بھی اس بات پر بھی دھیان دیا ہے اور غور کیا ہے کہ ہندوستان کی کثیر جہتی تہذیب ہونے کے باوجود ہندو دھرم ثقافت کا سب سے مضبوط عنصر رہا ہے۔ جو لوگ بار بار ہندوستانی ثقافت پر زور دیتے ہیں، وہ اس بنیادی حقائق کو کم سے کم نمبر دیتے ہیں۔ ہندو دھرم حقیقتاً ہندوستانی ثقافت کی لازمی شناخت، بنیادی روایت ہے۔

رامائن اور مہابھارت ہندوؤں میں طہارت اور مذہبی عزت و وقار پیدا کرتے ہیں، لیکن کیا یہ صرف ہندوؤں سے متعلق ہے؟ ہندوستانی ثقافتی وراثت کے بیش بہا بھنڈار میں کیا ہر ایک ہندوستانی - ہندو مسلم یا عیسائی - کو اس افتخار کو محسوس نہیں کرنا چاہئے؟ ناریل پھوڑنا یا شمع روشن کرنا ہندوؤں کا رسم و رواج ہو سکتا ہے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ یہ خاص اور قابلِ احترام ہندوستانی رسم و رواج بن گئے ہیں۔ وہی شخص ان روایات پر اعتراض کر سکتا ہے، جسے دھرم کے نام سے نفرت ہے۔ ہندوستان کو ایسا سیکولرازم قابلِ قبول نہیں ہے جس میں کسی طرح کے ہندو شناخت کے تئیں نفرت ہو۔ حقیقت میں ہماری قومی ثقافت میں سیکولرازم کا ہندوستانی تصور اس طرح سے پنہاں ہے کہ ہندوستانی آئین سازوں نے بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ انہیں خاص طور سے پیش لفظ میں اس کا ذکر کرنا چاہئے۔ اندرا گاندھی کے ذریعہ لگائی گئی جمہوریت مخالف ایمرجنسی (1975-77) کے دوران ہی سیکولرازم کو ترمیم کے ذریعہ آئین میں جگہ دی گئی - اور وہ بھی پارلیمنٹ میں غور و خوض کئے بغیر۔ جب اپوزیشن لیڈر جیل میں ہوں اور پریس کی آزادی چھین لی گئی ہو تب اس موضوع پر بحث بھی کیسے ہو سکتی تھی؟

ہندتوا: 'ہم کون ہیں' سوال کے لئے ہندوستان کا جواب

'ہندتوا' کے تصور کی تعریف کے بغیر مائنارٹی ازم اور سیوڈو سیکولرازم پر بحث مکمل کارگر نہیں ہوسکتی۔ یہ کسی خاص سیاسی پارٹی کی سوچ نہیں ہے، کیونکہ بی جے پی ایسی اکلوتی قومی پارٹی ہے جو کبھی بھی اس کی حمایت میں پیچھے نہیں ہٹی اس لئے 'ہندتوا' کو صرف بی جے پی کی سوچ کے طور پر دیکھنا صحیح نہیں ہے۔

میں نے اپنی پوری سیاسی زندگی میں اس پر زور دیا ہے کہ 'ہندتوا' کا مطلب ثقافتی قوم پرستی ہے۔ اس سے مذہب یا اس کی بنیاد پر انحصار نہیں ہوتا۔ 'ہندتوا' میں 'ہندو' لفظ ثقافتی معنی سے جڑا ہے نہ کہ مذہب سے یہ منفی طور سے صرف ہندوؤں کے لئے ہندوستانی قومیت کی روایت نہیں ہے۔ اس کی جڑیں ثقافتی ایکتا سے بھی متاثر ہوئی ہیں۔ ہم میں سے کچھ اس قوم پرستی کو 'ہندتوا' کہتے ہیں۔ پنڈت دین دیال اپادھیائے اسے 'بھارتیتا' کہتے تھے۔ کچھ دوسرے لوگ اسے 'انڈینس' کہتے ہیں۔ میں ان تین الفاظ میں کوئی فرق نہیں دیکھتا۔ یہ مختلف مقامات پر استعمال کئے جا سکتے ہیں، اس لئے اس وقت مجھے تکلیف پہنچی، جب 'ہندتوا' کی غلط ڈھنگ سے تعریف کی گئی اور سب سے زیادہ مارکس وادیوں نے تبصرہ کیا کہ خود کو ہندو کہلوانے میں انہیں شرم آتی ہے۔ تاہم جب سپریم کورٹ نے 11 دسمبر 1995 کو اپنے فیصلے میں مندرجہ ذیل تبصرہ کیا تب اس لفظ کے بارے میں پھیلی غلط فہمی دور ہوگئی۔

> '...... ہندو، ہندتوا اور ہندو مذہب کا صحیح اور یقینی معنی نہیں بتایا جاسکتا۔ ہندوستانی ثقافت اور وراثت کے حصے کو چھوڑ کر غیر تصوراتی معنی کو مذہب کی سرحدوں میں قید نہیں کیا جاسکتا۔ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ 'ہندتوا' لفظ اس برصغیر کے لوگوں کی زندگی جینے کے طریقے سے زیادہ جڑا ہے۔ یہ بتانا مشکل ہے کہ ان فیصلوں (سپریم کورٹ کے پہلے فیصلوں) کے باوجود 'ہندو دھرم' یا 'ہندتوا' الفاظ کو ماوراتی شکل میں محدود ہندو کٹروا د کے معنی میں قبول کیا جائے یا اس کے برابر رکھا جائے'۔

میں نے 2004 میں مشہور امریکی دانشور سیموئل ہنٹنگٹن کی نئی کتاب 'ہو آر وی؟' پڑھی جس میں امریکہ میں بڑے پیمانے پر غیر مقیموں کے پس منظر کے سلسلے میں ریاستہائے متحدہ امریکہ کی قومی شناخت کے اہم موضوع پر غور کیا گیا ہے۔ اس کتاب کا بنیادی سوال یہ ہے کہ چھوٹی ہوتی ہوئی دنیا میں، گلوبلائزیشن کے دور میں جہاں بین الاقوامی سرحدوں کا تصور کم سے کم ہوتا جارہا ہے، امریکہ کی شناخت کیا ہے۔ انہوں نے اس سوال کا جواب دیا ہے کہ اس ملک کی شناخت مضبوط 'قومی بیداری' ہی ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ امریکہ کی کامیابی یا ناکامی میں اس بیداری کی بہت اہمیت ہے۔ حقیقتاً مستقبل میں ایک ملک میں بنے رہنے کے نظریے سے بھی اس بیداری کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔ ہینگٹنٹن کی درخواست ہے، کیونکہ پوری دنیا کے لوگ یہاں آرہے ہیں۔ امریکہ کی یونیورسل ازم اس کی خصوصی قومی شناخت کو بھلانے کا بہانا نہ ہو۔ ان کے مطابق امریکہ کی خصوصیت، اس کی 'ثقافت' پر منحصر ہے جسے 'انہوں نے امریکی مذہب'؛ 'انگلوسنٹرک، پروٹسٹنٹ سے متاثر افکار' کی شکل میں تعریف کی گئی ہے۔ یہ ثقافتی آزادی، فرقوں کے جذبات، فرد کی عزت، صنعت، کام سے متعلق ضابطہ اور کامیابی کے پیغام (گوسپیل) جیسے امریکہ کے بنیادی اقدار کی حفاظت کرتی ہیں، اس لئے ہینگٹنٹن کے مطابق یہ امید کرنا صحیح بھی ہے۔ حال ہی میں یہاں آباد ہونے والے لوگ اپنی اپنی شناخت کو برقرار رکھتے ہوئے 'امریکہ کے افکار میں ضم ہوجائے اور 'امریکنیز' ہوجائے۔

میں نے ریاستہائے متحدہ امریکہ کی شناخت کے بارے میں ہنگٹنن کی حمایت نہیں کی ہے۔اس کتاب کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ کبھی ہندوستانیوں کو خود سے یہ سوال کرنا چاہئے'ہم کون ہیں؟' امریکہ کے برعکس ہمارا ملک کافی قدیم ہے۔اس کی تاریخ انسانی تہذیب کے ابتدائے آفرینش سے ہی شروع ہوتی ہے۔پھر امریکہ سے الگ ہماری آبادی کی اکثریت صدیوں سے ہندوستان میں ہی رہتی آئی ہے۔آبادی کے کسی طبقہ کی مذہبی شناخت بدلنے سے قوم کی شناخت نہیں بدل سکتی۔ ہندوستان کی تاریخ میں کبھی یہاں کے کسی طبقے کا اجتماعی قتل عام نہیں کیا گیا۔ جیسا امریکہ میں وہاں کے اصل آبادیوں کے ساتھ ہوا۔اس لئے اگر 400 برسوں میں امریکہ کا جذبہ وہاں کے لوگوں کو ایک دھاگے میں باندھ سکتا ہے تو یقینی طور سے زیادہ متوازن، مضبوط اور انسان دوستی'ہندوستانیت کا جذبہ بھی ہزاروں سال سے رہ رہے مختلف مذہبی، قبائلی، لسانی اور نسلی گروپوں کو ایکتا کے دھاگے میں باندھ سکتا ہے۔ چونکہ' انڈین' لفظ حال ہی کی نئی سوچ پر مبنی ہے، اس لئے اتحاد کا بنیادی اصول' ہندتوا' ہی ہے۔ اعلیٰ خیالات، بھائی چارہ، اکثریت میں اور وسیع ہندوستانی روایت کا یہی نام ہے۔اگر ہندوستان کو غیر ہندو کیا گیا تو ہندوستان کا کوئی وجود نہیں رہے گا۔

رویندر ناتھ ٹیگور کے مضمون' نیشنلزم' (قوم پرستی) میں ہندوستان کی مختلف النوع ایکتا کی تعریف دیکھنے کو ملی۔انہوں نے لکھا ہے۔' میں آپ کا دھیان ہندوستان کی پریشانیوں اور ان پر قابو پانے میں اس کی جدوجہد کی جانب دلانا چاہتا ہوں۔ اس کا مسئلہ مختصراً پوری دنیا کا مسئلہ ہے۔ ہندوستان بہت بڑا علاقہ ہے اور یہاں متعدد قومیں ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ایک ہی جغرافیائی نقشہ میں کئی ممالک سمائے ہوئے ہیں۔ یہ یوروپ سے بالکل مختلف ہے جہاں ایک ہی ملک سے دوسرے ممالک بنے ہیں۔ اس طرح کی ثقافت اور اضافت کے نظریہ سے یوروپ میں 'کئی' کی طاقت ہے، ساتھ ہی'ایک' کی طاقت بھی۔ اس کے برعکس ہندوستان ہمیشہ اپنی' کثرت' کی کاہلی سے اور' ایکتا' کی کمزوری سے متاثر رہا ہے۔ سچی ایکتا گول گلوب کی طرح ہوتی ہے۔ یہ گلوب گھومتا ہے، لیکن اپنا وزن آسانی سے سنبھال کر رکھتا ہے، اس کے برعکس' کثرت' میں کئی کونے ہوتے ہیں جنہیں کھینچنا پڑتا ہے اور پوری طاقت سے دھکیلنا پڑتا ہے، لیکن ہندوستان کی حمایت میں یہ کہنا ضروری ہے کہ اس کی کثیر الجہت ثقافت، اس کی خود بنائی ہوئی تھی۔ تاریخ کے ابتدا سے ہی اسے مشترکہ ثقافت کو قبول کرنا پڑا۔ امریکہ اور آسٹریلیا میں یوروپ نے وہاں کے اصلی باشندوں کو ختم کر کے اپنا مسئلہ حل کر لیا، لیکن ہندوستان نے پہلے سے ہی مختلف قبائل/نسلوں کے تئیں بھائی چارہ برتی اور تمام تاریخ میں اسی جذبے کے ساتھ کام کیا۔ ہندوستان سماجی ایکتا کی ترقی میں ہمیشہ سے ایسا ہی عمل کرتا رہا ہے جس کے اندر الگ الگ لوگ ایک ہوکر رہیں، ساتھ ہی الگ شناخت بنائے رکھنے کی آزادی کا بھی استعمال کریں۔ یہ بندھن ممکنہ طور پر ڈھیلی رہتی ہے، لیکن حالات کے مطابق مضبوط بھی۔ اس بندھن نے یہاں کی سوشل کنفیڈریشن کے طور سے یونائیٹیڈ اسٹیٹ (یونائیٹیڈ اسٹیٹ آف ایسوشیل فیڈریشن) کو جنم دیا جس کا نام ہے ہندتوا یا ہندوازم۔

جن سنگھ کے تئیں منفی سوچ کے باوجود پنڈت جواہر لال نہرو بھی اپنی زندگی کے آخری دور میں' ثقافتی قوم پرستی' کی بنیادی خصوصیات کی حمایت کرنے لگے تھے۔ مدورے میں اکتوبر 1961 میں منعقد آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے کانفرنس میں انہوں نے انوکھی تقریر کی تھی۔ انہوں نے صدیوں سے ہندوستان کو ایکتا کے دھاگے میں باندھنے والے اہم عنصر کی شناخت کی۔ ان کے الفاظ میں ہندوستان مختلف ادوار سے تیرتھ یاتراؤں، تیرتھ استھانوں کا ملک رہا۔ پورے ملک میں آپ کو قدیم مقامات ملیں گے۔ ہمالیہ کی برف سے ڈھکی چوٹیوں پر بدری ناتھ، کیدار ناتھ اور امرناتھ سے جنوب میں کنیا کماری تک آپ کو تیرتھ استھل مل جائیں گے۔ جنوب سے شمال تک اور شمال سے جنوب تک کون سی تحریک دینے والی طاقت لوگوں کو ان عظیم مقدس مقامات کی جانب متوجہ کرتی آرہی ہے؟ یہ ہمارے ملک کی ثقافت کا جذبہ ہے اور اس جذبہ سے ہم آپس میں

بندھے ہوئے ہیں۔ ہمارے قدیم گرنتھوں میں کہا گیا ہے کہ ہندوستان شمال میں ہمالیہ سے لے کر جنوب میں سمندر تک پھیلا ہے۔ صدیوں سے ہندوستان میں یہ تصور رہا ہے کہ اس نے ہمیں آپس میں باندھے رکھا ہے۔ اس عظیم روایت سے متاثر ہوکر لوگوں نے اسے 'مقدس زمین' قرار دیا ہے، جب کہ ہمارے یہاں کئی سلطنتیں وجود میں آئی ہیں اور یہاں کئی زبانیں بولی جاتی رہی ہیں۔ وہ نازک بندھن ہی ہمیں کئی طریقوں سے آپس میں باندھے رکھتا ہے۔'

نہرو نے 'ہندو' لفظ کا استعمال نہیں کیا تھا لیکن مدورے تقریر میں انہوں نے ہندوستان کی قدیم اور خود کو جدید کرنے والی ثقافت کو 'کومل بندھن' کی شکل میں بتایا ہے جس نے مختلف النوع کو بھی 'ایک قوم' اور 'ایک ثقافت' کی شکل میں باندھ دیا ہے۔ میں حقیقت میں یہ جان کر حیران ہوں کہ الگ الگ سیاسی افکار کے باوجود ملک کے بیشتر قوم پرست مفکروں نے ثقافتی قوم پرستی پر ایک جیسے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ یہاں میں ایک دوسرے تبصرہ کا حوالہ دینا چاہوں گا۔ ہندوستان کے اہم آئین ساز ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر نے ثقافتی قوم پرستی کے تصور کی حمایت میں یہ تبصرہ کیا تھا۔ 1956 میں بڑی تعداد میں اپنے حامیوں کے ساتھ انہوں نے بودھ مذہب قبول کرلیا تھا۔ انہوں نے کچھ برائیوں کے خلاف، سب سے زیادہ ہندو سماج میں پھیلی چھوا چھوت کے خلاف، بودھ مذہب اختیار کیا۔ اس وقت انہیں کئی لوگوں نے اسلام یا عیسائی مذہب قبول کرنے کی پیشکش کی تھی، لیکن انہوں نے ایسا کرنے سے صرف منع ہی نہیں کیا بلکہ بودھ مذہب اپنانے کے سلسلے میں وضاحت بھی کی۔ 'اسلام یا عیسائی مذہب اپنانے کا مطلب تھا ہندوستانی کی ثقافتی مٹی سے دور ہونا۔ میں ایسا ہرگز نہیں چاہتا۔'

مندرجہ بالا حوالہ سے ہندوستان میں اسلام اور عیسائی مذہب کے مقام کے بارے میں غلط معنی بھی نکل سکتا ہے۔ میں یہاں دہرانا چاہوں گا کہ میں اس حقیقت کو مانتا ہوں اور اس پر فخر محسوس کرتا ہوں کہ ہندوستان بین مذہبی ملک ہے، جس میں ہمارا آئین اور صدیوں پرانی ثقافت مذہب کی بنیاد پر بھید بھاؤ نہیں کرتی۔ مسلمانوں اور عیسائیوں کو دوسرے لوگوں کی طرح یکساں حقوق، ذمہ داری اور مواقع ہیں۔ میں قومی زندگی کے مختلف نکات مضبوط بنانے میں ان کے تعاون کی ستائش کرتا ہوں۔ میں تمام مذاہب کا احترام کرتا ہوں۔ میں یہاں ایک مثال دینا چاہوں گا۔ میں 2006 میں ہندوستان سیکورٹی یاترا کے دوران راجستھان، اجمیر گیا تھا۔ میری پارٹی کے ساتھیوں نے صلاح دی کہ مجھے مقدس پشکر کی زیارت ضرور کرنی چاہئے۔ اس کے بارے میں سمجھا جاتا ہے کہ پشکر میں خود برہما جی نے جھیل بنائی تھی، میں نے فوراً ہاں کہہ دی، لیکن میں نے انہیں کہا کہ میں اجمیر میں قابلِ احترام صوفی سنت حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی درگاہ شریف★ پر بھی جاؤں گا۔ اگرچہ ان میں سے کچھ کی بھوئیں چڑھ گئی تھیں لیکن میں دونوں مقامات پر گیا۔

★ 2000 میں اجمیر درگاہ پر میری حاضری کے بارے میں رپورٹ دی گئی ہے۔ 'وزیر داخلہ ایل کے آڈوانی نے اتوار کو حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی درگاہ پر دعا کی۔ مقامی مسلمان اتنے جذباتی تھے کہ انہیں دیکھنے کے لئے بہت بڑی بھیڑ درگاہ میں جمع ہوگئی۔ بھیڑ نے بار بار درخواست کی تھی کہ کچھ کہیں۔ آڈوانی مان گئے اور انہوں نے کہا 'ہندوستان ایک کثیر المذاہب ملک ہے اور مذاہب کے لوگ اچھے انسان بننے کی کوشش کرتے ہیں، اس لئے ہر ایک فرقہ اس درگاہ پر آتا ہے۔ پہلے ہم نیک انسان بنیں۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ان کا معبود ایشور ہے یا اللہ۔' انہوں نے کہا کہ حالانکہ بیسویں صدی مغربی دنیا کی رہی لیکن اگر تمام فرقہ متحد ہوکر کام کریں گے تو یقینی طور سے اکیسویں صدی ہندوستان کی ہوگی۔' اس پر بھیڑ نے جواب دیا 'آمین' (حیرت انگیز! آڈوانی اجمیر درگاہ پر دعا کی، دی ٹائمس آف انڈیا، 4 ردسمبر 2000۔' بعد میں جب ایک صحافی نے مجھ سے پوچھا کہ کیا درگاہ میں میری حاضری اپنی شبیہ کو بدلنے کی کوشش ہے، تو میں نے جواب دیا 'میرا نظریہ ہمیشہ سے واضح رہا ہے۔ میں نے 25 سال پہلے جو کہا تھا، آج بھی، اب بھی میں وہی سب کہہ رہا ہوں۔'

سماجی انصاف، برابری اور ہندو سماج میں اصلاح

ہندوستان کی ترقی اور ملک کی تعمیر نو کے لئے سب سے اہم موضوع ہندو سماج کی اصلاح اور خود احتسابی ہے۔ ہندو دھرم انسانی ترقی اور ایشور کے حصول کی تعلیم کا وسیلہ ہے۔ اس کا فلسفہ آسان ہے اور اس کے اصولوں کے موضوعات انتہائی سہل۔ اس کی خصوصیت کٹر مذہبی اصول کے برعکس ہے۔ کسی ایک پر آخری سچائی کی مہر لگائے بغیر سبھی اشکال میں سچ کو قبول کرنے اور پاک زندگی گزار کر انسانی ترقی کے اعلیٰ معیار تک پہنچانے کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔ اس میں دانشوروں اور فلسفیانہ موضوعات کے معاملوں میں اور اظہار رائے کی آزادی ہے، یہاں تک کہ ایشور کے وجود کو نہ ماننے والے چاوراک کو بھی 'رشی' کی شکل میں عزت دی جاتی ہے، کیونکہ ان کے پاس بھی علم تھا۔ چونکہ ہندو دھرم میں تمام بنیادی سوچ میں ایشور کو دیکھنے کی نصیحت دی جاتی ہے اس لئے ہندو مذہب کی سوچ میں انسانوں کی برابری کی روایت ہے۔ بھگوت گیتا میں اس سوچ پر زور دیا گیا ہے کہ فرد کی عظمت اس کے کام سے ہے نہ کہ جنم سے۔

اس کے باوجود متعدد تاریخی اسباب سے ہندو سماج میں کچھ منفی مضحکہ خیز عناصر اور ایسی برائیاں آ گئی ہیں جن کی حمایت نہیں کی جا سکتی اور ان خامیوں پر ابھی پوری طرح قابو نہیں پایا جا سکا ہے۔ ذات پات، اونچ نیچ کی روایت، خاص طور سے کچھ قبائل کو اچھوت سمجھنے کی عادت سب سے بڑی برائی ہے۔ متعدد شکلوں میں ناانصافی جو ہمیشہ عورتوں کے تئیں کی جاتی ہے، دیگر کی ہے اسے برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ یہ کسی بھی بنیاد پر صحیح قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس سے ہندوستان کے آئین سے آدرشوں کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔ یہ کئی صدیوں سے ہندو دھرم کی زندگی کی رہنمائی کرنے والے روحانی اصولوں کے بھی خلاف ہے۔ جب تک اپنے اندر موجود برائیوں سے جدوجہد نہیں کی جاتی تب تک ہندو سماج دوبارہ توانائی حاصل نہیں کر سکتا، یا مکمل طور سے ترقی نہیں کر سکتا۔

یہاں دو نکات پر زور دینے کی ضرورت ہے۔ پہلا: ہندو سماج میں اپنے بنیادی اصولوں کا دوبارہ پتہ لگا کر اور انسانیت کے دیگر پہلوؤں سے سبق لے کر وقتاً فوقتاً خود اصلاح کی خواہش اور صلاحیت دکھائی ہے۔ دوسری جنگ آزادی کی تحریک کے وقت اور بعد کی دہائیوں میں اس سمت میں ترقی ہوئی ہے! اس کا سہرا جدید دور کے سنتوں اور سماجی اصلاح پسندوں کو جاتا ہے جیسے—سوامی وویکانند، سوامی دیانند، راجا رام موہن رائے، مہاتما جیوتبہ پھلے اور ان کی اہلیہ ساوتری بائی پھلے، نارائن گرو اور مہاتما گاندھی و ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر۔ میں اس سلسلے میں خاص طور سے راشٹریہ سویم سیوک سنگھ اور ان کی ذیلی تنظیموں کی ستائش کرتا ہوں۔ ان سبھی نے ہندو ایکتا اور ہندو سماج کی تحریک نو کے لئے اپنے مقصد میں سماجی برابری پر زور دیا۔ سنگھ کے تیسرے سر سنگھ چالک بالا صاحب دیورس اکثر کہتے تھے 'اگر چھوا چھوت گناہ نہیں ہے تو اس دنیا میں دوسرا کوئی گناہ ہو ہی نہیں سکتا۔'

سماجی برابری کی سمت میں اس ترقی کو مزید فروغ ملنا چاہئے۔ ریزرویشن کی پالیسی کے ساتھ سبھی سطحوں پر اقتدار میں نمائندگی کو فروغ دینے والی انتخابی سیاسی پالیسی میں ہمارے سماج کے مختلف طبقات کے سماجی، معاشی اور سیاسی طاقت کو مزید فروغ ملا ہے۔ یہ خاموش سماجی انقلاب ہے اور ہمارا جمہوری نظام اس کا ہراول۔ اسے اور مضبوط بنانے کی ضرورت ہے۔ چونکہ آج کی دنیا میں انتہائی معیاری تعلیم، سماجی اور معاشی ترقی کی کنجی بن گئی ہے، اس لئے آنے والے برسوں میں ہندوستان میں درج فہرست ذات و قبائل اور پسماندہ طبقات و سماج کے دیگر کمزور طبقوں کے اور زیادہ تعلیمی اور معاشی قوت کو فوقیت دی جائے۔ ذاتیں سماجی شناخت کی علامت بھلے ہی ہوں، لیکن ذات پات کو ہندوستان

کی جڑوں سے ہی مٹا دینا چاہئے۔ اس سلسلے میں آنے والے دور میں اس نعرے کو مقبول بنانے کی ضرورت ہے۔ 'سب ذات مہان سب ذات سمان' خواتین کی ترقی اور ان کی صلاحیت کی قوت اور منصفانہ عمل سماج کی تعمیر کا لازمی اور اندرونی حصہ ہے۔ ریزرویشن کی پالیسی کے ذریعہ سے عورتوں کی سیاسی مضبوطی کی مزید ضرورت ہے۔ بی جے پی پہلی پارٹی ہے جس نے 1994 میں پارلیمنٹ اور ریاستی اسمبلیوں میں عورتوں کے لئے 33 فیصد سیٹوں کے ریزرویشن سے متعلق بل کو پیش کیا تھا۔ ہماری سب سے پہلی اور اکلوتی پارٹی ہے جس نے سب سے پہلے اپنی تنظیم کے اندر سبھی سطحوں پر عورتوں کے لئے 33 فیصد ریزرویشن دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ میری ساتھی اور انتہائی غیر معمولی مقرر اور صلاحیت مند ممبر پارلیمنٹ ششما سوراج نے دونوں تجاویز کو پیش کرنے کے لئے پارٹی کو متفق کرنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ عورتوں کے لئے ریزرویشن کا سیدھا سادا مطلب یہ ہے کہ پبلک سیکٹر میں سرگرم طور سے حصہ لینے میں انہیں کئی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایک مرد کے بہ نسبت انہیں دوگنی پریشانیاں جھیلنی پڑتی ہیں، یہاں تک کہ ایسی عورتوں کو بھی جو مردوں کے بہ نسبت دوگنی صلاحیت رکھتی ہیں۔ پارلیمنٹ، ریاستی قانون ساز اور وزارت میں عورتوں کی کم نمائندگی مجھے بے چین کر دیتی ہے، یہ اس لئے بھی ہے کہ 1992 میں 73 ویں اور 74 ویں آئینی ترمیم کے بعد عورتوں نے پنچایتوں اور مقامی بلدیات میں عورتوں کے لئے مختص سیٹوں پر شاندار کام کیا ہے۔ اس انقلابی تدبیر کے نتیجہ میں ہندوستان میں مختلف پنچایتی راج اداروں میں آج لاکھوں خواتین ممبر ہیں۔ اس کے علاوہ بڑی تعداد میں کوآپریٹو سیکٹر اور پرائیویٹ گروپوں میں عورتیں منتخب ہوئی ہیں۔ یہ ہندوستان کے لئے فخر کی بات ہے کہ بنیادی سطح پر جمہوری تنظیموں میں بھی سب سے بڑی تعداد میں عورتیں منتخب ہوئی ہیں، اس لئے یہ قابل افسوس ہے کہ پارلیمنٹ کے اندر اور باہر برسوں تک بحث چلنے کے بعد بھی پارلیمنٹ اور ریاستی اسمبلیوں میں عورتوں کے لئے 33 فیصد سیٹیں مختص کرنے کے لئے قانون بنانے میں سیاسی اتفاق رائے کی کمی رہی ہے۔ جب یہ انقلابی قانون حقیقت کی شکل اختیار کرے گا — وہ ہندوستان کے لئے فخر اور خوشی کا دن ہوگا۔

حالانکہ خواتین کو مضبوط بنانے کے دیگر ذرائع بھی ہیں۔ ان کی تعلیم، صحت، نگہداشت اور روزگار میں آنے والی پریشانیوں کو دور کرنا لازمی ہے۔ ان کے ساتھ گھر اور پبلک سیکٹر میں عزت اور قابلِ احترام رویہ اختیار کیا جانا چاہئے۔ عورتوں پر ہونے والے مظالم کی خبروں سے دل غم زدہ ہو جاتا ہے، لہٰذا تحفظ سے متعلق ایسے حالات پر غور کیا جانا چاہئے جس میں ہماری ماں بہنیں بغیر کسی خوف یا اندیشے کے کبھی بھی اور کہیں بھی آنے جانے کے لئے محفوظ تصور کر سکیں۔ یقینی طور سے تحفظ کا بنیادی پیمانہ زندگی جینے کا حق ہے۔ کسی مہذب معاشرہ میں بچے کا قتل یا جنین کشی اور لڑکیوں کے بہ نسبت لڑکوں کو ترجیح دینے جیسی ثقافتی برائیوں کی کوئی جگہ نہیں ہوسکتی۔ حالانکہ صرف قانون اور سرکاری احکامات سے ہی ان سماجی خامیوں کو دور نہیں کیا جاسکتا۔ ہمیں مکمل تعلیم کے ذریعہ حمایت حاصل کر کے مستحکم اور مسلسل سماجی سطح پر کارروائی کرنے کی ضرورت ہے۔

غریبی کی لعنت سے ہندوستان کی آزادی

آج جب ہندوستان معاشی حصولیابی میں اعلیٰ عالمی رینکنگ حاصل کرنے کے لئے تیار کھڑا ہے۔ غریبی ہٹانا اور کروڑوں شہریوں کو بہترین اور معیاری سطح تک پہنچانا اس کے لئے سب سے بڑا چیلنج ثابت ہو رہا ہے۔ بلاشبہ اس سچائی کی شناخت کرتے ہوئے اور اسے قبول کرتے ہوئے اس سچ کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ حال ہی کی دہائیوں میں بڑی تعداد میں لوگوں کو خط افلاس سے اوپر اٹھانے میں کامیابی ملی ہے۔ 21 ویں صدی کے ابتدا میں ہندوستان کی سماجی اور معاشی حقائق کی مایوس کن تصویر پیش کرنا مناسب نہیں ہے۔ دراصل معاشی اصلاح سے مختلف

سیکٹروں میں زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ ہندوستان کی ترقی ہوئی ہے اور ہندوستان اس جانب مسلسل گامزن ہے۔

ساتھ ہی ساتھ ہمیں حالیہ ہندوستانی حالات کے منفی پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔ ہماری آبادی کا ایک بہت بڑا حصہ ابھی بھی غریبی کا شکار ہے۔ یکساں طور سے امیر اور غریب کے درمیان، شہروں اور گاؤں کے درمیان تیزی سے بڑھتی خلیج لمحۂ فکریہ ہے۔ اس کی وجہ سے گاؤں کو چھوڑ کر لوگ شہروں کی جانب بھاگ رہے ہیں۔ یہ عمل 1990 کے عشرے میں معاشی اصلاح کے بعد مزید تیز ہوا ہے۔ ترقی کے عمل میں علاقائی مسائل مزید ابتر ہو گئے ہیں جہاں شمالی اور مشرقی ریاست جنوبی اور مشرق کی ریاستوں سے کافی پیچھے رہ گئے ہیں۔

انسانی وسائل ہندوستان کی بہت بڑی پونجی ہے۔ اگر چہ انسانی وسائل تبھی مثبت ہو سکتے ہیں جب روٹی، کپڑا، مکان، صحت، تعلیم، روزگار اور اعلیٰ قدرتی اور سماجی پس منظر جیسی بنیادی ضرورتیں سب کے لئے پوری ہوں۔ اگر ملک میں انسانی وسائل کا بہت بڑا حصہ غریب ہے تو کوئی بھی ملک ترقی نہیں کر سکتا۔ مجھے ہمیشہ اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ اگر ہندوستان اپنی ایک تہائی بہتر طریقہ سے گزر بسر کرنے والی آبادی کے زور پر اتنی کامرانیاں حاصل کر سکتا ہے تو جب بھی انسانی وسائل کا پوری طرح سے استعمال ہوگا تب یہ ملک کہاں پہنچ جائے گا؟ کتنی بلندیوں کو چھو لے گا؟ اسی لئے زمانہ حال میں میں ایک نکتہ کا بار بار ذکر کر رہا ہوں --- میرے لئے 'بھارت ادے' کا مطلب ہے کہ ہر ایک ہندوستانی کا اُدے۔ میرے لئے ترقی یافتہ ملک کی شکل میں بھارت اُدے کا مطلب ہے ہر ایک ہندوستانی کی شاندار ترقی۔

کیا یہ ممکن ہے؟ ہاں ایسا ہو سکتا ہے، کیا ہم ہندوستان میں غریبی کی تاریخ کو مٹا سکتے ہیں؟ ہاں ہم ایسا کر سکتے ہیں۔ میرے خیال میں اس کوشش میں کامیابی کی کلید محض تیار کی گئی پالیسیاں اور پروگرام نہیں ہیں اچھی اور منصفانہ انتظامیہ ہے۔ پالیسیوں وغیرہ کی اہمیت ضرور ہے۔ ہمیں چاہئے صنعت کو فروغ دینے والی بہتر پالیسی۔ ہمیں چاہئے اعلیٰ معیار کا سماجی بنیادی انفرااسٹرکچر۔ ہمیں چاہئے خاص طور پر اپنی زرعی اور دیہی معیشت میں نئی جان ڈالنے کے لئے ضروری تدابیر۔ زراعت کے بعد سب سے زیادہ تعداد میں لوگوں کو روزگار دینے والے غیر منظم اور غیر رسمی سیکٹر میں مکمل وسائل لانا ضروری ہو گیا ہے۔ ہمیں سبھی سطحوں پر معیاری تعلیم یقینی بنانی ہوگی۔ ہمیں مکمل سائنسی اور ٹیکنالوجی وسائل کا استعمال کر کے ایجوکیشن اور پروفیشن کے سیکٹروں میں ملکی صلاحیت کو فروغ دینا ہوگا۔ ہمیں اپنے ماحولیات میں پیدا ہونے والی آلودگی کو روکنا ہے جس کے تئیں ہماری قدیم ثقافت ہمیں عزت دینے کے لئے متحرک کرتی ہے۔ ہمیں ایسے مواقع کا پورا فائدہ اٹھانا چاہئے جو تیزی سے بدلتی دنیا میں پیدا ہو رہے ہیں اور ایسا کرتے وقت ہمیں گلوبلائزیشن کے منفی اثرات سے خود کو بچانا ہے۔

یہ بھی صحیح ہے کہ ہمیں مکمل ترقی ہی نہیں کرنی بلکہ تمام تر سیکورٹی کو بھی یقینی بنانا ہے۔ ہماری سیکورٹی کے پس منظر میں ہندوستان کی خارجی اور اندرونی سیکورٹی – یعنی ملک کی سیکورٹی اور عام آدمی کی سیکورٹی – دونوں شامل ہونا چاہئے۔ قابلِ اعتماد اور بہتر سیکورٹی کے بغیر ترقی ہی نہیں بلکہ ملک کی شکل میں ہمارے وسائل کو بھی خطرہ ہوگا۔

اگر چہ اس ہدف کے حصول میں ہمیں سب سے پہلے بہتر اور اعلیٰ انتظامیہ یا حکومت قائم کرنی ہوگی۔ مجھے پورا یقین ہے کہ سبھی سطحوں پر سرکار یا انتظامیہ میں کام کرنے والے لوگوں کے درمیان ایمانداری، شفافیت، خلوص و نیک نیتی، ذمہ داری، صلاحیت اور فرائض کے تئیں خلوص سے ہی ملک کی ترقی میں نتائج خیز تبدیلی لائی جا سکتی ہے۔ ان خصوصیات کے بغیر ترقی اور سیکورٹی کے شعبہ میں یا تو ہمیں نامکمل کامیابی ملے گی یا حالات اور بھی خراب ہو جائیں گے۔ اسی لئے گزشتہ کچھ عشروں کے دوران مرکز اور ریاستوں میں مختلف حکومتوں کے تجربے کا تجزیہ کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ہندوستان کے حالیہ چیلنجوں کا سامنا 3 لازمی بنیاد پر کیا جا سکتا ہے۔ بہتر حکومت ترقی اور سیکورٹی۔

انتہائی خاکساری سے میں نے اپنی پارٹی کے اندر اور وسیع پیمانے پر لوگوں کے درمیان ریاستی نظم ونسق کو نئے سرے سے کام کرنے کو مقبول بنانے کی کوشش کی۔ مثلاً 8 یا 9 فیصد جی ڈی پی (گراس ڈومسٹک پروڈکس) اضافہ جیسے الفاظ اہم ہیں لیکن ان کا مجھ پر زیادہ اثر نہیں پڑتا، نہ ہی لاکھوں عام ہندوستانیوں کے لئے یہ لفظ معنی رکھتے ہیں۔ اگر کوئی مجھ سے پوچھے 'آپ کس طرح کی جی ڈی پی ترقی چاہتے ہیں؟' تو میرا جواب ہوگا - اس طرح کی جی ڈی پی جہاں 'جی' کا معنی سبھی سطحوں پر ملکی سے مقامی سطح تک 'گڈ گورننس' (بہتر حکومت) 'ڈی' کا معنی سبھی شعبوں کا سبھی ہندوستانیوں کا 'ڈیولپمنٹ' (ترقی) اور 'پی' کا مطلب ہر شہری کو 'پروٹیکشن' (سیکورٹی) ہے۔

میں نے سیاسی بحث ومباحثہ میں ایک نکتہ بھی اٹھایا 'ہم سب کو فخر ہے کہ 1947 کے بعد ہندوستان طاقت ور اور توانائی سے بھرپور جمہوریت کی شکل میں ابھرا ہے۔ گزشتہ 60 برسوں سے ہندوستان کی جمہوریت کی ترقی کے مشاہد اور شراکت دار کے طور پر میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ یہاں ایک اہم کمی بھی آگئی ہے۔ بیشتر سیاسی پارٹیاں یہ ماننے لگی ہیں کہ انتخاب جیتنے اور اقتدار حاصل کرنے کا بہتر طریقہ ووٹ بینک کی سیاست ہے۔ ان کے دل میں مشتبہ نظریہ بھی پیدا ہوگیا ہے کہ بہتر انتظامیہ، جمہوریت، سیکورٹی اور سچائی کے بل بوتے پر انتخاب نہیں جیتا جاسکتا، لیکن یہ سوچ صحیح نہیں ہے۔ اس کے برعکس نریندر مودی کی قیادت میں گجرات کے 2007 کے اسمبلی انتخابات میں نئی رائے عامہ حاصل کرنے میں بی جے پی کی کامیابی کا سب سے اہم پہلو سامنے آیا ہے - ووٹ بینک کی سیاست پر بہتر نظم ونسق، ترقی اور سیکورٹی کی سیاست کامیابی حاصل کرسکتی ہے۔' آنے والے برسوں میں اس پہلو کو ہمیں مزید مستحکم کرنا ہوگا۔

عام اتفاق رائے کی سیاست کی ضرورت

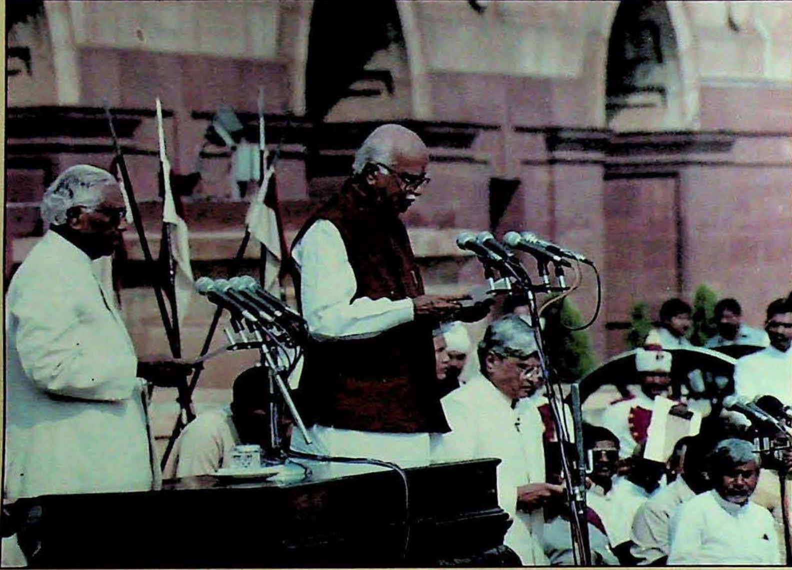
ہماری پھلتی پھولتی کثیر جماعتی جمہوریت ہے۔ ہمارے سیاسی سسٹم کے تنوع میں طاقت اور زندگی کا وسیلہ مضمر ہے۔ چونکہ جغرافیائی نقطہ نظر سے کانگریس پارٹی کی ملک بھر سے اقتدار کا دور تقریباً ختم ہو چکا ہے، اس لئے ہندوستان کی حالیہ سیاست کی قیادت دو طاقتوں پر مرکوز ہوگئی ہے — قومی سطح پر بی جے پی اور کانگریس پارٹی دو اہم اور مستقل مرکز بن گئے ہیں۔ ان دو خاص قومی پارٹیوں کے علاوہ خاص علاقائی یا سماجی امیدوں کے لئے پہچانی جانی والی دیگر متعدد پارٹیاں بھی ہیں۔ مرکز اور متعدد ریاستوں میں مخلوط حکومت کی تشکیل وقت کی ضرورت بن گئی ہے۔ کچھ شراکت دار وقتاً فوقتاً اپنا اتحاد بدلتے بھی رہتے ہیں۔

گزشتہ دو عشروں میں اس ترقی کی وجہ سے ریاستی نظام کے سامنے اہم چیلنج کھڑے ہوگئے ہیں۔ یہ کس طرح سے یقینی بنایا جائے کہ کثیر جماعتی نظام میں اس کی اچھائیوں اور برائیوں کے باوجود اصل ایکتا مسلسل قائم رہ سکتی ہے۔ یہ فطری ہے کہ اس سلسلے میں علاقائی پارٹیوں کے بہ نسبت قومی پارٹیاں زیادہ جواب دہ ہیں، اس لئے تمام پارٹیوں نے بنیادی سطح پر بالا تفاق اور لازماً دو اہم قومی پارٹیوں کے درمیان اتفاق کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ یہ فطری ہے کہ بی جے پی اور کانگریس کے درمیان اختلافات (دیگر پارٹیوں کے درمیان بھی) برقرار رہیں گے۔ کیونکہ یہ الگ نظریات وخیالات کی تشہیر کرتے ہیں اور ترقی کے الگ الگ راستوں کی تقلید کرتے ہیں۔ اس کے باوجود دونوں کے لئے ممکن ہے اور ضروری بھی ہے کہ وسیع قومی ایشوز پر تعاون کے امکانات کا پتہ لگایا جائے اور ایسے شعبوں کو مزید فروغ دیا جائے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ سبھی پارٹیوں میں آپسی کشیدگی کی جگہ تعاون کے جذبات بھی پیدا ہوں اور بنیادی سطح تک آپسی بات چیت برقرار رہے جس کا انتخابی سیاست کی محدود سوچوں کے نظریے سے قربان نہیں کیا جاسکتا۔

چونکہ بی جے پی اور کانگریس کی ذمہ داری زیادہ ہے، یہ ضروری ہے کہ فیصلہ کن اور اہم ایشوز پر ہمیں اتفاق رائے کا رویہ اپنانا چاہئے۔ اس لئے دونوں کے لئے ضروری ہے کہ ہم ایک دوسرے کو دشمن کی نظر سے نہ دیکھیں۔ جہاں تک بی جے پی کا سوال ہے ہم کانگریس کو اپنی حریف پارٹی مانتے ہیں نہ کہ 'دشمن'۔ حقیقت میں جمہوریت میں 'دشمن' کی سوچ منفی سوچ ہے۔ بدقسمتی سے کانگریس پارٹی کا بی جے پی کے تئیں صحت مند نظریہ نہیں رہا ہے۔ کانگریس کے لیڈر بی جے پی کو بُرا سمجھتے ہیں۔ میری کانگریس کے لیڈروں سے اپیل ہے کہ وہ ایسے نظریہ کو چھوڑ دیں۔

مجھے راہل گاندھی کے ساتھ اس موضوع پر بات چیت کرنے کا ایک موقع ملا۔ میں دسمبر 2007 میں دہلی ایئر پورٹ پر لاؤنج میں کانگریس کے اس نوجوان جنرل سکریٹری سے اتفاق سے ملا تھا۔ وہ اتر پردیش میں اپنے پارلیمانی حلقہ میں جا رہے تھے اور میں گجرات۔ میں انتخابی ریلی میں تقریر کرنے جا رہا تھا۔ وہ میرے پاس آئے، استقبال کیا اور کہا ' آڈوانی جی آپ سے مل کر مجھے خوشی ہوئی۔ مجھے رسمی طور سے اپنا تعارف کرانے کا کبھی موقع نہیں ملا۔' ان میں بڑوں کے تئیں ملنساری اور احترام بالکل اپنے والد آنجہانی راجیو گاندھی کی طرح ہے۔ انہوں نے بھی وزیر اعظم بننے کے بعد ایسے ہی میرا استقبال کیا تھا۔ راہل نے قومی سیاست پر میرے خیالات پوچھے، میں نے کہا ' مجھے اس بات کی فکر ہے کہ ہماری ان دو اہم قومی پارٹیوں کا سیاسی حلقہ سمٹتا جا رہا ہے، جب کہ علاقائی پارٹیاں پھیل رہی ہیں۔ انہیں سیاسی حمایت بھی مل رہی ہے۔ اگر یہ روایت جاری رہی تو مستقبل میں ہندوستان کے لئے سنگین مسائل سامنے آئیں گے۔' تب میں نے راہل سے پوچھا کہ ان کی پارٹی بھی اس بارے میں یکساں طور سے فکر مند ہے یا نہیں؟ انہوں نے مثبت جواب دیا۔ اس سے میں یہ کہنے کے لئے مجبور ہوں کہ 'بی جے پی اور کانگریس- دونوں کے لئے ایک حل یہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کو اپنا سیاسی مخالف یا حریف سمجھیں نہ کہ دشمن، اس کے لئے دونوں پارٹیوں کے لیڈروں کو اہم قومی ایشوز پر آپسی بات چیت کا دروازہ کھلا رکھنا چاہئے۔

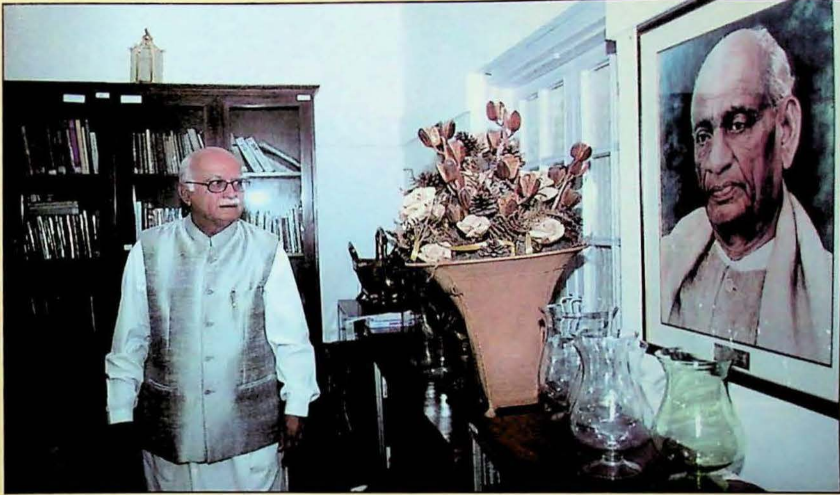
وزارت داخلہ میں



19/مارچ 1998 کو صدر جمہوریہ کے آر نارائنن اٹل جی کی سرکار میں آڈوانی جی کو کابینی وزیر کی حیثیت سے حلف دلاتے ہوئے



راشٹر پتی بھون کے صحن میں صدر جمہوریہ کے آر نارائنن، نائب صدر جمہوریہ کرشن کانت، وزیر اعظم اٹل بہاری واجپئی اپنی کابینہ کے ارکان کے ساتھ



▲ مردِ آہن کے لقب سے مشہور ہندوستان کے اولین، وزیر داخلہ سردار پٹیل آڈوانی کے لیے نمونۂ عمل رہے ہیں۔

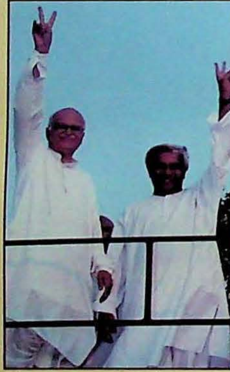


◄ لیہہ لداخ میں سالانہ سندھو درشن تقاریب کے افتتاحی موقع پر دریائے سندھ کے کنارے آڈوانی۔ ساتھ ہیں، جموں و کشمیر کے وزیر اعلیٰ فاروق عبداللہ این ڈی اے سرکار کے معاون وزیر جگموہن، اننت کمار، آئی ڈی سوامی اور بجویا چکرورتی۔



▲ 2005ء میں سیاست میں جرائم کے اثرات کی مخالفت میں این ڈی اے کے ممبران پارلیمنٹ کے ساتھ صدر جمہوریہ کو میمورینڈم پیش کرنے کے لیے جاتے ہوئے آڈوانی، بہار کے وزیراعلیٰ نتیش کمار اور نائب وزیراعلیٰ سشیل کمار مودی۔





(بائیں) پنجاب کے وزیراعلیٰ، شرومنی اکالی دل کے مقتدر رہنما پرکاش سنگھ بادل کے ساتھ

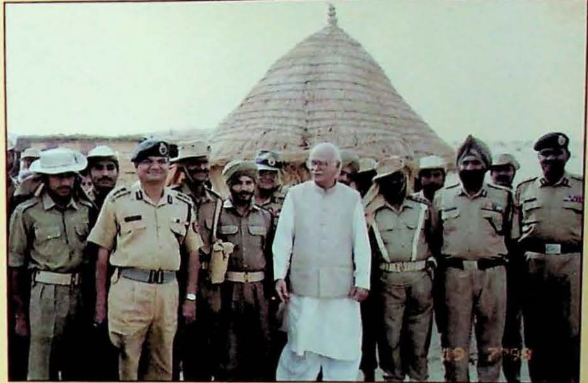
(دائیں) بیجو جنتا دل کے صدر واڑیسہ کے وزیراعلیٰ نوین پٹنائک کے ساتھ۔



▲ رانچی میں منعقد بی جے پی کی ایک ریلی میں (بائیں سے) یشونت سنہا، راج ناتھ سنگھ، نریندر مودی، آڈوانی، اٹل جی، ارجن منڈا اور بابولال مرانڈی۔



ممبئی میں بحریہ کے بیڑے کا معائنہ کرتے ہوئے









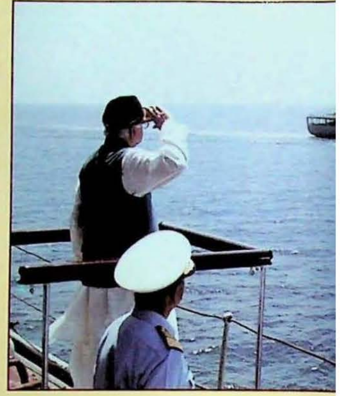
(اوپر دائیں) راجستھان میں بی. ایس. ایف. افسران و جوان کے ساتھ آڈوانی۔

(درمیان میں) 2002ء میں نیویارک میں گراؤنڈ زیرو 9/11 سانحے میں ہلاک ہونے والوں کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے آڈوانی۔

(درمیان میں دائیں) جنوری 2004 میں حریت کانفرنس سے ہوئے مزاکرات میں مولوی عباس انصاری، میر واعظ عمر فارق، بلال غنی لون، عبدالغنی بٹ اور فضل الحق قریشی کے ساتھ۔

◄ 1999 میں کارگل جنگ میں پاکستان کے خلاف فتح کا جشن مناتے ہندوستانی فوجی۔





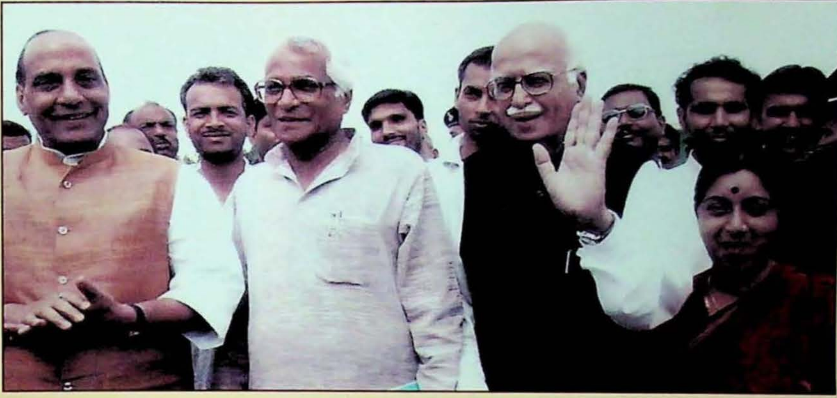
(اوپر بائیں) 11رمئی 1998 کو ہندوستان نے
پوکھرن میں ایٹمی تجربہ کیا۔ تصویر میں وزیراعظم اٹل
بہاری واجپئی، وزیر دفاع جارج فرنانڈیز، نامور
سائنسداں ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام
(جو بعد میں صدر جمہوریہ بنے) اور ٹی آر چدمبرم۔



▲ نیم فوجی دستوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے آڈوانی۔



▲ لڑکیوں کی تعلیم اور صحت سالہا سال سے آڈوانی کی اوّلین ترجیحات میں شامل ہے۔ تصویر میں جھارکھنڈ سرکار کی جانب سے ریاست کی آدی واسی لڑکیوں کو سائیکل تقسیم کرنے کے منصوبے کا آغاز کرتے ہوئے آڈوانی، ساتھ میں جھارکھنڈ کے سابق وزیر اعلیٰ بابولال مرانڈی۔



▲ این ڈی اے کے ایک پروگرام میں موجودہ بی جے پی صدر راج ناتھ سنگھ، این ڈی اے کے کنونیز جارج فرنانڈیس اور سشما سوراج کے ہمراہ آڈوانی





▲ راجستھان کی وزیر اعلیٰ وسندھرا راجے سندھیا کے ہمراہ۔

(درمیان میں دائیں) تیلگو دیشم کے صدر اور آندھرا پردیش کے سابق وزیر اعلیٰ چندرا بابو نائیڈو کے ساتھ۔



◀ اے آئی اے ڈی ایم کے کی جنرل سکریٹری اور تمل ناڈو کی سابق وزیر اعلیٰ جے للتا کے ساتھ خوشگوار موڈ میں۔



▲ جون 2005 میں لاہور کے نواح میں کٹاس راج کے قدیم ہندو مندر کی تعمیر نو کا افتتاح کرتے ہوئے ایل کے آڈوانی، ان کے ساتھ ہیں پاکستان کے سابق وزیر اعظم چودھری شجاعت حسین اور پاکستان مسلم لیگ (کیو) کے لیڈر مشاہد حسین اور بیٹی پرتبھا آڈوانی۔



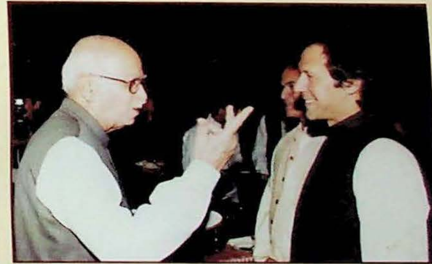
◄ راولپنڈی کے آرمی ہاؤس میں صدر پاکستان جنرل پرویز مشرف، اہلیہ کملا، بیٹی پرتیبھا، پاکستان میں ہندوستان کے سابق سفیر شیو شنکر مینن اور سدھیندر کلکرنی کے ساتھ آڈوانی۔



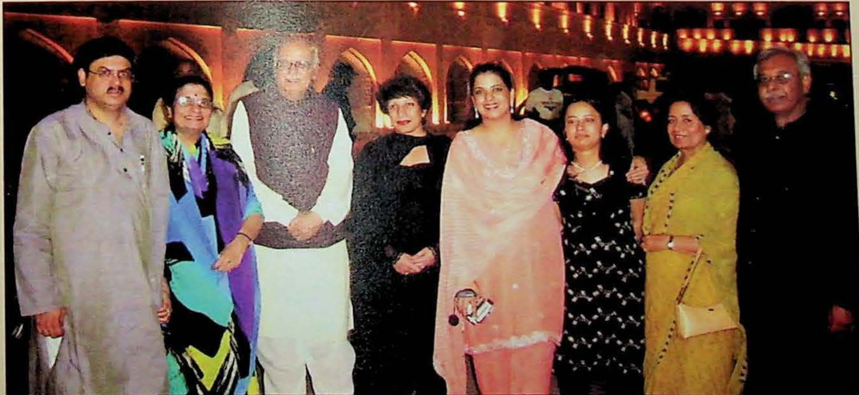
► 4/جون 2005 کو کراچی میں پاکستان کے بانی محمد علی جناح کے مزار پر۔



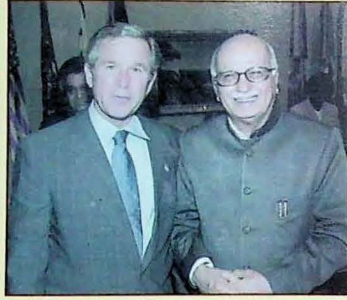
▲ اسلام آباد میں دعوتِ طعام کے دوران تبادلہُ خیال کرتے ہوئے (بائیں سے دائیں) آڈوانی، پاکستان کے اس وقت کے وزیر خارجہ خورشید محمود قصوری، پاکستان کے جمہوریت پسند ادیب اعتزاز احسان، پی پی پی کے لیڈر مخدوم امین فہیم اور شجاعت حسین۔



◄ پاکستان کے عظیم کرکٹ کھلاڑی اور تحریک انصاف پارٹی کے صدر عمران خان کے ساتھ دوستانہ گفتگو کرتے ہوئے۔



▲ لاہور کے شاندار قلعے کے باہر اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ۔ (بالکل دائیں) دیپک چوپڑا اور ان کی اہلیہ وینا۔



▲ آڈوانی کے ساتھ سابق امریکی صدر جارج بش۔



اپنی ذاتی اور خاندانی دوست اور سابق وزیراعظم پاکستان محترمہ بےنظیر بھٹو کے ▲
ساتھ آڈوانی اور ان کی اہلیہ کملا، دہلی میں اپنی رہائش گاہ پر۔



◄ اسرائیل کے سابق وزیراعظم اسحاق رابن کے ساتھ۔

▼ جاپان کے سابق وزیراعظم یوشیورو موری کے ساتھ آڈوانی
(دائیں) فلسطین کے محاذِ آزادی کے لیڈر یاسر عرفات کے ساتھ۔







▲ روس کے وزیراعظم اور سابق صدر ولادیمیر پوتن کے ساتھ آڈوانی۔



▲ چین کے سابق وزیراعظم لی پینگ کے ساتھ آڈوانی۔



▲ بنگلہ دیش کی سابق وزیراعظم شیخ حسینہ واجد کے ساتھ آڈوانی۔



▲ نیپال کے شاہ وریندر وکرم کے ساتھ آڈوانی۔



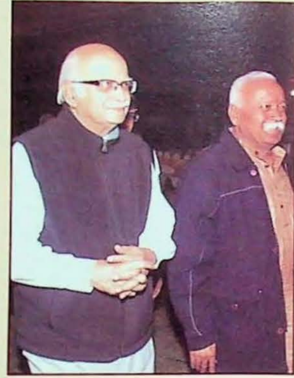
◀ سابق امریکی صدر بل کلنٹن کے ساتھ آڈوانی۔



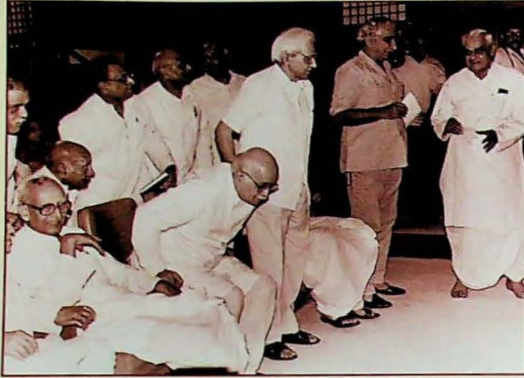
▲ برطانیہ کے سابق وزیراعظم ٹونی بلیئر کے ساتھ۔



▲ برطانیہ کی ملکہ الیزبیتھ کے ساتھ آڈوانی۔



▲ آر.ایس.ایس. کے سہہ کاریہ واہ موہن راؤ بھاگوت کے ساتھ آڈوانی۔



▲ راشٹریہ سوئم سیوک کے سربراہ کے سی سدرشن (بائیں بیٹھے ہوئے)



▲ ملک کے عظیم صنعت کار جے آر ڈی ٹاٹا کے ساتھ آڈوانی ان کے بائیں جانب ہیں درباری سیٹھ

▼ آڈوانی اور اُن کے بیٹے جینت دونوں ہی کرکٹ کے بیحد شوقین ہیں، تصویر میں دونوں نامور کھلاڑی سچن تندولکر کے ساتھ بات چیت کرتے ہوئے ان کے ساتھ میں سابق کرکٹ کھلاڑی جواگل سری ناتھ اور کیرتی آزاد۔



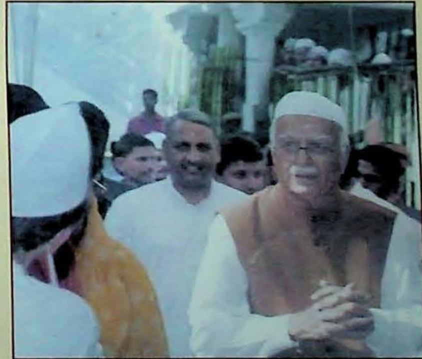


▲ 2006ء میں گرونانک جینتی کے موقع پر آڈوانی کی رہائش گاہ پر اکھنڈ پاٹھ میں وزیراعظم من موہن سنگھ نے بھی شرکت کی۔

روحانیت کی تلاش



▲ امرتسر کے سورن مندر میں ماتھا ٹیکتے ہوئے آڈوانی۔



▲ اجمیر شریف میں خواجہ معین الدین چشتیؒ کی درگاہ میں حاضری۔



◄ کولکاتہ میں مدر ٹریسا کے ساتھ۔



▲ شری شری روی شنکر کے ساتھ۔



▲ سوامی نارائن سماج کے سربراہ سوامی جی مہاراج کے ساتھ آڈوانی۔



▲ پرمارتھ نکیتن رشی کیش کے سوامی چدانند سرسوتی کے ایک گوروکل میں، رشی کماروں کی ضیافت کرتے ہوئے آڈوانی۔

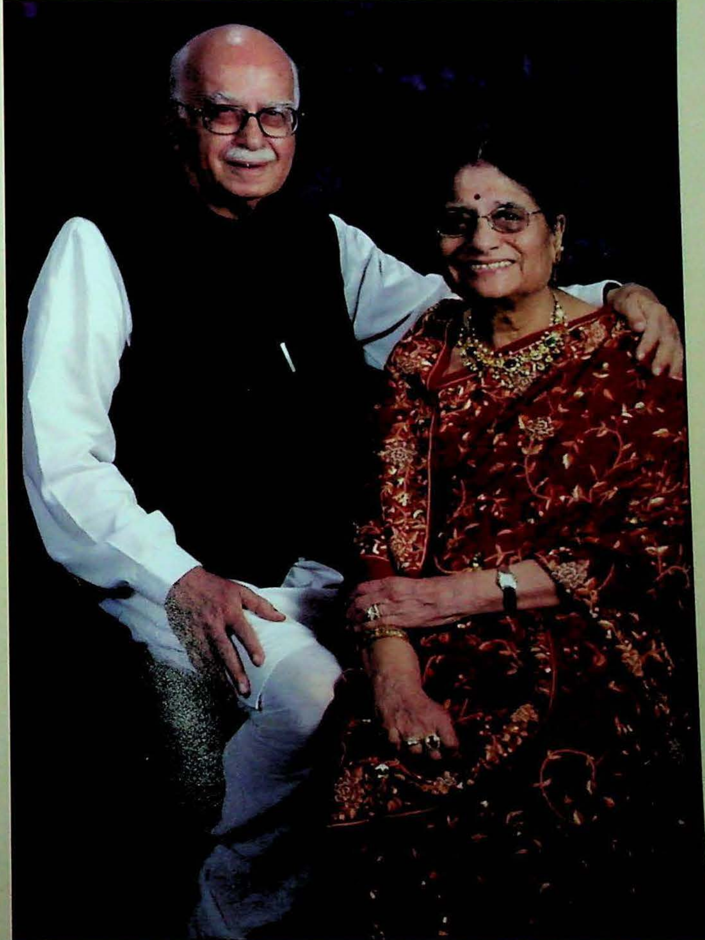


▲ برہم کماری مسلک کی دادی پرکاش منی کے ساتھ۔

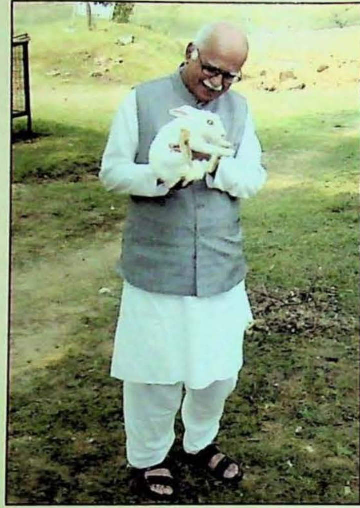


▲ پرمارتھ نکیتن میں گنگا کے کنارے مہا آرتی میں اہل خانہ کے ساتھ حصہ لیتے ہوئے۔

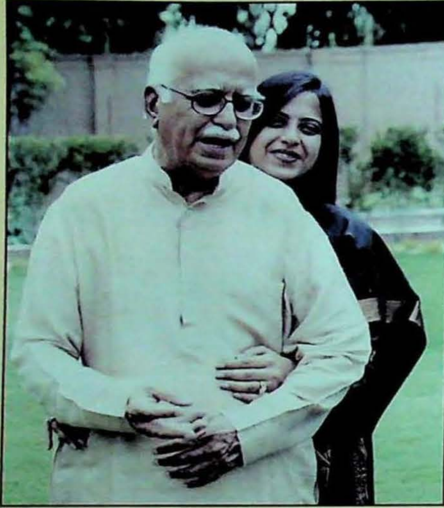
کنبہ



▲ خوشگوار ازدواجی زندگی کے 43 سال۔



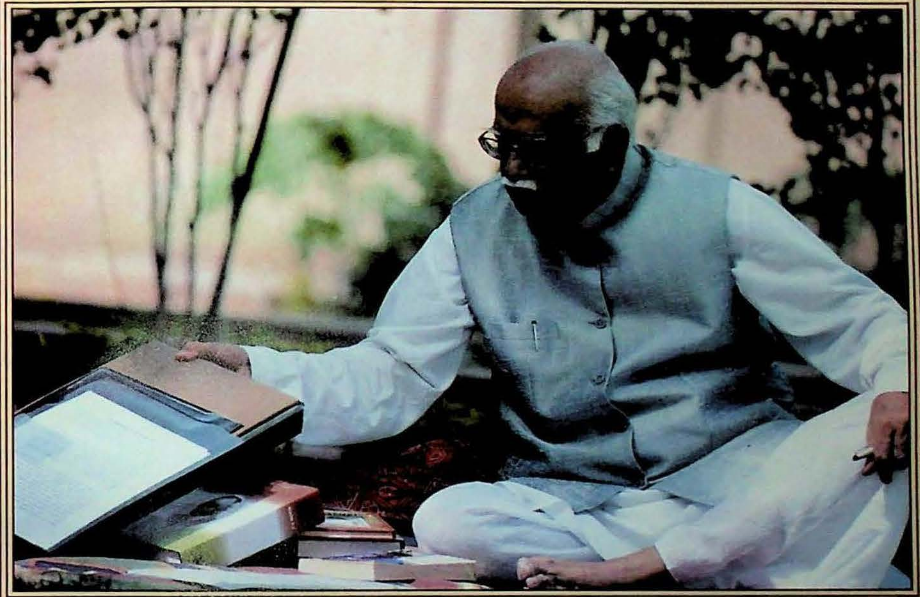
▲ ایک محبت بھرا لمحہ۔



▲ بیٹی پرتیبھا کے ساتھ — سچ مچ ایک جذباتی بندھن۔



▲ قابل تعظیم دادا جے پی واسوانی کے ساتھ آڈوانی کنبہ



قدرت ہم سب کے سامنے مسرت اور حق وصداقت کا متبادل رکھتی ہے کہ ہم دونوں میں سے ایک کو چن لیں، میری خوش قسمتی رہی ہے کہ مجھے دونوں ہی بھرپور مقدار میں حاصل ہوئے ہیں۔حق پسندی میری زندگی کے مقصد سے اور مسرت اپنے کنبہ اور احباب سے۔

18

زندگی میں مقصد اور خوشی کی تلاش

خوب ہنسنا اور خوب محبت کرنا، عقل مندوں کی عزت اور بچوں کا پیار پانا، ایماندار نقادوں کی سند حاصل کرنا، خوبصورتی محسوس کرنا، خود کا سب کچھ عوامی بہبود کے لئے نچھاور کردینا، دنیا کو کچھ بہتر شکل میں چھوڑ کر جانا- چاہے وہ ایک صحت مند بچے کی شکل میں ہو، ایک باغیچہ کی مرمت کرکے ہو یا ایک اصلاح کئے گئے سماجی حالات کی شکل میں ہو-جوش کے ساتھ کھیلنا اور ہنسنا اور جوش سے گانا، یہ جاننا کہ میرے جینے سے کسی ایک شخص نے بھی راحت کی سانس لی ہے- یہی کامیابی ہے۔

— رالف والڈو ایمرسن (1882-1803) امریکی دانشور

میں نے حال ہی میں ایک دلچسپ جاسوسی ناول کا مطالعہ کیا جس کی کافی لوگوں نے تعریف کی ہے۔ مجھے اپنی عقل کو متحرک رکھنے کے لئے کبھی کبھی اس طرز کی کتابیں پڑھنے میں لطف آتا ہے۔ امریکہ کی ییل یونیورسٹی کے قانون کے پروفیسر جیڈ روبین فیلڈ کی کتاب 'دی انٹر پریٹیشن آف مرڈر' میں قتل کے راز کے بارے میں کم اور زندگی کے راز کے بارے میں زیادہ تحقیق کی گئی ہے۔ مصنف جو شیکسپیئر اور سگمنڈ فرائڈ کا طالب علم ہے، نے اپنے پہلے ہی ناول میں انسانی وجود کے بارے میں دو بنیادی سوالوں 'خوشی اور بامعنی زندگی کا نفسیاتی مطالعہ کیا ہے:

سکھ کا کوئی راز نہیں ہے۔

سبھی غم زدہ افراد ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔

بہت عرصہ پہلے دل میں کوئی چوٹ لگی ہو، کوئی خواہش پوری نہ ہوئی ہو، ایگو کو ٹھیس پہنچی ہو، محبت کا پہلا احساس جس کا مذاق اڑایا گیا ہو—یا اس سے بھی بدتر ان کے تئیں اداسی کا اظہار کیا گیا ہو—یہ ان غم زدہ افراد سے چپکے رہتے ہیں، یا وہ ان سے چپکا رہتا ہے۔ اور اس طرح غم زدہ فرد ہر دن گزرے زمانے کی یادوں میں گزارتا ہے، لیکن خوشحال شخص کبھی بھی پیچھے مڑکر نہیں دیکھتا اور نہ ہی وہ آگے کی سوچتا ہے۔ وہ تو صرف حال میں ہی جیتا ہے۔

لیکن اسی میں تو رکاوٹ ہے۔ حال کبھی بھی ایک چیز نہیں دے سکتا: بامعنی زندگی، خوشی اور معنویت دونوں کا ایک راستہ نہیں ہوتا۔ سکھ حاصل کرنے کے لئے انسان کو صرف حال میں رہنا ہوتا ہے: اسے صرف اس لمحے کے لئے جینا ہوتا ہے، لیکن اگر وہ بامعنی مقصد چاہتا ہے- اپنے خوابوں کی، اپنے رازوں کی، اپنی زندگی کی، تو انسان کو اپنے ماضی میں خود کو دوبارہ داخل کرنا ہوگا، خواہ وہ کتنا بھی تاریک کیوں نہ رہا ہو اور اسے مستقبل کے لئے جینا ہوگا خواہ کتنا ہی غیر یقینی کیوں نہ ہو۔ اس طرح فطرت ہم سب کے سامنے خوشی اور مقصد کا متبادل کھلا رکھتی ہے۔ اس درخواست کے ساتھ کہ ہم دونوں میں سے کسی ایک کو منتخب کرلیں۔ جہاں تک میرا سوال ہے میں نے بامعنی مقاصد کو منتخب کیا ہے۔

اس ناول میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ انسان کو زندگی میں یا تو خوشی حاصل ہوگی یا مقصد، لیکن میری یہ خوش قسمتی ہے کہ مجھے دونوں بھرپور مقدار میں ملے ہیں۔

بامعنی مقصد عمل سے حاصل ہوتا ہے، مشن کے جذبات سے آتی ہے، زندگی میں ہم کچھ بھی کام کیوں نہ کریں۔ اس میں اس سوال، کا جواب پوشیدہ ہے 'ہمیں کیوں جینا چاہئے؟' اس کا جواب ہمیں اپنے ماضی- انفرادی یا اجتماعی- کی جانب لے جاتا ہے اور ساتھ ہی مستقبل کے بارے میں ہمارے خوابوں اور اہداف کے جانب بھی- ہمیں یہ احساس کراتا ہے کہ ہماری زندگی کا مقصد کسی فرض کے ادا کرنے میں ہے اور حال ہمیں کام کرنے کا میدان اور موقع دونوں فراہم کرتا ہے، تاکہ ہم اپنی صلاحیتوں کے مطابق شاندار ڈھنگ سے ان فرائض کو پورا کرسکیں۔

جب میں اپنی زندگی کی 8 دہائیوں کی جانب جھانکتا ہوں تو مجھے یاد آتا ہے کہ میں نے اپنی زندگی کا مقصد تب پایا جب سندھ کے حیدرآباد میں ٹینس کورٹ پر پہلی بار راشٹریہ سویم سیوک سنگھ کا نام سنا اور 1942 میں سنگھ کا سویم سیوک بن گیا۔ مجھے اس بات کا تجربہ تب ہوا جب میں نے اتوار کی شام کراچی میں سوامی رنگاناتھ آنند کے بھگوت گیتا کا پروچن سننے شروع کئے۔ مجھے اس بات کا پتہ تب چلا جب میں نے پہلے کراچی میں اور ملک کی تقسیم کے بعد راجستھان میں راشٹریہ سویم سیوک سنگھ کے پرچارک کے طور پر کام کرنے کے لئے اپنا گھربار چھوڑ دیا۔ یہ مقصد اس وقت اور زیادہ بڑھ گیا جب میں نے 55 سال پہلے بھارتیہ جن سنگھ اور بھارتیہ جنتا پارٹی کے کارکن کی شکل میں اپنا سیاسی سفر شروع کیا۔ یہ سفر مسلسل جاری ہے۔ ساڑھے چودہ سال کی عمر سے آج تک ایک ہی ذمہ داری نے میری زندگی کے صرف ایک مقصد کو معنی کا جامہ پہنایا: بھارت ماتا کی خدمت کرنا۔

اس فرض کی ادائیگی کے دوران متعدد بار مقصد اور آدرشوں کے تئیں میرے خلوص، ایمانداری اور ذمہ داری کا امتحان ہوا ہے۔ خاص طور پر جب مجھے اپنی زندگی میں کسی بحران کا سامنا کرنا پڑا۔ میں انتہائی انکساری اور اطمینان کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ کبھی بھی اپنے ضمیر کی کسوٹی پر میں نے خود کو قصوروار نہیں پایا۔ میں نے کئی بار غلط فیصلے بھی لئے۔ مجھ سے اپنے کام کے کرنے میں کچھ غلطیاں بھی ہوئیں لیکن میں نے کبھی بھی اپنی ترقی کے لئے کوئی سازباز یا طالع آزمائی کا سہارا نہیں لیا۔ نہ ہی میں نے کبھی ذاتی فائدہ یا لالچ کے لئے اپنے بنیادی اصولوں سے کوئی سمجھوتہ کیا۔ عزت و وقار کے لئے میں اپنے اصول پر قائم رہا، میں نے ملک کے مفاد کو ہی ترجیح دی جب کہ ایسا کرنے میں کبھی کبھی خطرے بھی تھے۔ چاہے مجھے ایمرجنسی کے دور میں طویل عرصہ تک جیل میں رہنا پڑا ہو یا حوالہ اسکینڈل میں غلط الزام کا سامنا کرنا پڑا ہو یا اجودھیا آندولن میں مجھ پر 'کٹر ہندو' ہونے کا لیبل چسپاں کیا گیا ہو یا پاکستان دورے کے بعد میرے بارے میں فکری خیالات سے ہٹنے کا غلط معنی پہنایا گیا ہو، میں نے ہمیشہ

اپنی ضمیر کی آواز سنی اور اپنے اصولوں پر مضبوطی سے قائم رہا ہوں۔ اعتماد کو طاقت دینے کے علاوہ اس نے میری زندگی کو سکھ دیا اور مقصد بھی۔

جیسا کہ اس کتاب میں ذکر کیا گیا ہے کہ میں اس سچائی سے بخوبی واقف ہوں اور مجھے اس کا درد بھی ہوتا ہے کہ میں نے تاعمر ایسے شعبہ میں کام کرنے کا راستہ منتخب کیا ہے جس کے تئیں آزادی کے بعد عوام کے دل و دماغ میں عزت و وقار کم ہوا ہے۔ تحریک آزادی کے دوران سیاست ایک مشن تھی۔ آزادی کے فوراً بعد بھی سیاست میں مشینری جذبات سے کام کرنے والے کئی لوگ تھے۔ متعدد جمہوری ممالک میں سیاست ایسی تجارت ہے جس میں کسی بھی دوسری تجارت کے برابر، تجارتی خوبیوں کا کم سے کم حصہ ہونا ضروری ہے۔ حالانکہ میں یہ قطعی نہیں چاہوں گا کہ ہندوستان میں مشن اور پروفیشن کا کلچر بالکل ختم ہو گئے، پھر بھی مجھے یہ دیکھ کر افسوس اور تشویش ہوتی ہے کہ سیاست میں تیزی سے گراوٹ آتی جا رہی ہے۔ سیاست آج تجارت بنتی جا رہی ہے اور اس میں ذاتی، گروہ بندی، دھوکہ وفریب، اقربا پروری اور مختلف اشکال میں جرائم جیسی متعدد بیماریاں پھیل رہی ہیں۔ آلودہ ہوتی جا رہی ایسے فضا میں 'بھدّی ہندوستانی سیاست' کی شبیہ پھیل رہی ہے۔ پھر بھی میں نے ایک مشن کے طور پر اور خلوص دل سے سیاست میں کام کرنے کی کوشش کی ہے، اس سے بھی مجھے اطمینان ملا ہے۔

کبھی کبھار میں نے اپنے ساتھیوں اور شناساؤں سے یہ تبصرہ سنا ہے کہ میں کبھی ضدّی نہیں رہا۔ شاید یہ صحیح ہے لیکن مجھے اس بات کا کوئی پچھتاوا نہیں۔ گرچہ میں بغیر کسی تردد کے اپنی پارٹی اور اپنے ملک کے لئے ضدی اور خواہش مند رہا ہوں، جیسا کہ اس کتاب سے ثابت ہوتا ہے، میں نے اپنی پارٹی کے ذریعہ خود کے لئے اور ملک کے لئے مقرر کچھ بڑے مقاصد کو حاصل کرنے میں اپنا تعاون دیا ہے۔ مجھے ایمرجنسی کے دوران کی گئی جدوجہد اور مرارجی ڈیسائی کی حکومت میں اطلاعات ونشریات کی وزارت میں جمہوریت کے استحکام میں دیئے گئے اپنے تعاون پر فخر ہے۔ مجھے ہندوستان کی چہار رخی ترقی اور خاص طور پر اٹل جی کی حکومت میں وزارت داخلہ اور نائب وزیراعظم کے طور پر اندرونی سیکورٹی نظام کو مضبوط بنانے کی سمت میں دیئے گئے اپنے تعاون پر فخر ہے۔

ماضی اور حال کے معاون اور دوست

میری پارٹی یا ان سرکاروں میں جن میں میں نے کام کیا ہے، کی حصولیابی اجتماعی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ مجھے اپنی پارٹی اور وقتاً فوقتاً ہمارے ساتھ اتحاد کرنے والی پارٹیوں کے سیکڑوں بہترین ساتھیوں کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ اس کے علاوہ ایسی دو حکومتوں میں کام کرنے کا موقع ملا جن میں مجھے وزیر کی سطح پر ذمہ داری سونپی گئی۔ مشترکہ قومی مقاصد کے لئے ان کے ساتھ کام کر کے مجھے بہت زیادہ خوشی ملی ہے۔

مرارجی ڈیسائی کی حکومت میں رہنے والے ایچ ایم پٹیل، شانتی بھوشن، مدھو دنڈوتے، رویندر ورما اور جارج فرنانڈیز جنہوں نے این ڈی اے کی تشکیل میں فیصلہ کن کردار ادا کیا اور اس کے کنوینر بھی ہیں۔ ان کی صلاحیت واہلیت کی میں قدر کرتا رہا ہوں۔

میں نے بعد کے برسوں میں ہندوستان کی ترقی میں بیش قیمت تعاون دینے والے اور جمہوریت نواز دیگر سیاسی پارٹیوں کے لیڈروں کے ساتھ کام کیا- وی پی سنگھ، دیوی لال، این ٹی راما راؤ، بیجو پٹنائک، پرکاش سنگھ بادل، گرچرن سنگھ ٹوہرا، اندر کمار گجرال، بال ٹھاکرے، رام کرشن ہیگڑے، ایچ ڈی دیوگوڑا، شرد پوار، ڈاکٹر فاروق عبداللہ، این چندرا بابو نائیڈو، ڈاکٹر جے للتا، نوین پٹنائک، نتیش کمار، شرد یادو، دنیش گوسوامی، پرفل کمار مہنت، ممتا بنرجی، اوم پرکاش چوٹالہ، کانشی رام، مایاوتی، پی اے سنگما، ڈاکٹر ایم کروناندھی اور موراسولی مارن۔

مجھے اپنی ہی پارٹی میں کئی نسلوں کے انتہائی صلاحیت مند ساتھیوں کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا ہے۔ میں یہاں پر ناناجی دیشمکھ،

جگدیش پرساد ماتھر*، سندر سنگھ بھنڈاری*، کرشن لال شرما*، بھیروں سنگھ شیخاوت، کشا بھاؤ ٹھاکرے*، سکندر بخت*، جنا کرشنا مورتی*، کے آر ملکانی*، کیدار ناتھ ساہنی، کیلاش پتی مشر، مرلی منوہر جوشی، جسونت سنگھ، وید پرکاش گوئل، پروفیسر وشنو کانت شاستری*، کیشو بھائی پٹیل، مدن لال کھورانہ، وجے کمار ملہوترا، سندر لال پٹوا، کیلاش جوشی، شانتا کمار، اوراجگو پال، ایل گنیشن، سورج بھان*، بنگارو لکشمن اور اپا گھناٹے جیسے تجربہ کار لیڈروں کے نام لینا چاہوں گا۔ اس کے بعد لیڈروں کی نئی نسل سامنے آئی۔ ان میں پرمود مہاجن*، کلیان سنگھ، ونکیا نائیڈو، سشما سوراج، راج ناتھ سنگھ، کے این گووندآچاریہ، ارون جیٹلی، نریندر مودی، کلراج مشر، اوما بھارتی، پریم کمار دھومل، صاحب سنگھ ورما* اور بی ایس یدیورپا، بنڈارو دتا تریہ کا نام قابلِ ذکر ہے۔ اب لیڈروں کی دوسری نسل پارٹی کو توسیع دینے میں معاون کردار نبھار ہے ہیں۔ ان میں گوپی ناتھ منڈے، نتن گڈکری، وسندھرا راجے، ڈاکٹر رمن سنگھ، اننت کمار، سشیل کمار مودی، شیوراج سنگھ چوہان، روی شنکر پرساد، منوہر پاریکر، شاہنواز حسین، دھرمیندر پردھان، بلبیر پنج اور ایسے دیگر کئی لیڈروں کے نام لئے جاسکتے ہیں۔ بی جے پی کی سیاست اور بی جے پی کے پس منظر سے الگ کچھ غیر معمولی افراد کو شامل کرکے نئی طاقت ملی ہے۔ جیسے- جگموہن کے سی پنت، ارون شوری، یشونت سنہا اور نجمہ ہبت اللہ۔ ہرین پانڈیا، ودیا ساگر راؤ، آئی ڈی سوامی اور سوامی چنمے آنند نے وزارت داخلہ میں میرے معاون کے طور پر کام کیا۔ میں جانتا ہوں کہ میرے کئی سابق اور اس وقت کے ساتھیوں کے نام اس کتاب میں نہیں دیئے گئے ہیں، لیکن جب میں ان کے بارے میں سوچتا ہوں تو میری آنکھیں نم ہو جاتی ہیں اور تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

مجھے اپنی پارٹی کے نوجوانوں کی طاقت پر پورا بھروسہ ہے۔ اس لئے 'واجپئی کے بعد کون؟' یا 'آڈوانی کے بعد کون؟' یہ سوال ہی نہیں اٹھتا۔ بی جے پی کانگریس پارٹی کی طرح نہیں ہے جس میں اعلیٰ لیڈر کا عہدہ ہمیشہ نسل کی بنیاد پر مختص رکھا گیا ہے۔ بی جے پی میں ایک عام کارکن کو بھی اعلیٰ مقام پر پہنچنے کا موقع ملتا ہے۔ وہ اپنی صلاحیت اور خدمات کے بل پر قیادت کی ذمہ داریاں اٹھا سکتا ہے۔ یہ اور ایسے کئی اسباب ہیں جس سے مجھے بی جے پی سے وابستہ ہونے پر فخر ہے اور مجھے اس سے انتہائی خوشی محسوس ہو رہی ہے۔

میڈیا اور تجارتی دنیا کے لیڈروں کے ساتھ غور وخوض

جمہوریت میں سیاست اور میڈیا دونوں آپس میں انحصار کرتے ہیں۔ سیاست دانوں کو میڈیا کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ عوام تک ان کی رسائی ہو اور بدلے میں میڈیا کا فرض ہوتا ہے کہ سیاست کے بارے میں خبروں اور خیالات وملکی زندگی کے دیگر پہلوؤں کے مطابق معلومات آزاد، غیر جانبدار اور قابلِ اعتماد طریقے سے لوگوں تک پہنچائیں۔ ساتھ ہی ذمہ دار مبصر اور بیدار چوکیدار کی شکل میں کام کرے۔ اپنی سیاسی زندگی کی شروعات سے ہی میں ہندوستانی میڈیا کے طریقۂ کار میں دلچسپی لیتا رہا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کبھی میں بھی صحافی تھا اور ایمرجنسی کے بعد جنتا پارٹی حکومت میں وزیر اطلاعات ونشریات کے طور پر مجھے ہندوستان میں جمہوریت کی دوبارہ بحالی کے نہ ٹوٹنے والے حصے کے طور پر پریس کی آزادی کو قائم کرنے کی اہم ذمہ داری سونپی گئی۔

مجھے گزرے ہوئے کل اور آج کے میڈیا کی کئی مستند شخصیتوں سے قربت حاصل رہی ہے۔ میں یہاں پر ان میں سے کچھ لوگوں کے ناموں کا ذکر کرنا چاہوں گا- رام ناتھ گوئنکا، گری لال جین، خشونت سنگھ، نکھل چکرورتی، آر کے کرنجیا، بی جی ورگیز، ودیا نواس مشر، دھرم ویر

* اب یہ پارٹی معاونین اس دنیا میں نہیں ہیں۔

بھارتی، ایم وی کامت، وجے چوپڑا، ایم جے اکبر، ارون پوری، پربھو چاؤلہ، اویک سرکار، این رام، چوراما سوامی، وی کے نرسمہن، شیکھر گپتا، منوج سنتھالیہ، راموجی راؤ، دیویندر سوروپ، نریندر موہن، وید پرتاپ ویدک، پربھات جوشی، چندن مترا، ترون وجے، کرن تھاپر، سوپن داس گپتا، ویر سنگھوی، ورون سین گپتا، چیتا آنند مشر، رام بہادر رائے، راہل دیو، سرمارک ٹلی، رجت شرما، تولین سنگھ اور سعید نقوی۔ ان میں سے کئی لوگوں کے ساتھ میں نے اپنی پارٹی یا کسی نکتہ پر میری تنقید کرنے کے باوجود ہمیشہ باہمی عزت واحترام کے تعلقات قائم کر رہے ہیں۔ یہ فطری ہے، کیونکہ اظہار خیال کی آزادی صحافیوں اور میڈیا دنیا کی ایک خصوصی شناخت ہے۔ میں ان سب کا احترام کرتا ہوں جن میں یہ عنصر موجود ہے اور جو مضبوطی کے ساتھ اپنے خیالات پیش کرنے کا حوصلہ بھی رکھتے ہیں۔

میں نے ہمیشہ ہندوستان کی تجارتی دنیا کو ملک کی ترقی کا اہم سفیر مانا ہے۔ میں نے اس فکری نظریہ کی حمایت نہیں کی ہے کہ تاجر استحصالی طبقہ ہے۔ میری پارٹی ایسی پالیسی کی حمایت کرتی رہی ہے جس سے صنعت کو فروغ ملے۔ میں نے ہمیشہ حوصلہ مند طریقہ سے ان کی حصولیابی کی ستائش کی ہے کیونکہ حقیقت میں یہ حصولیابی ملک کے اثاثے ہیں جس سے ہماری معیشت کو فائدہ پہنچتا ہے، روزگار کے زیادہ مواقع ملتے ہیں، لوگوں کے معیار زندگی میں ترقی ہوتی ہے اور جیسا کہ حال ہی میں ہونے والی ترقی سے واضح ہے۔ اس سے بین الاقوامی سطح پر ہندوستان کے وقار میں اضافہ ہوتا ہے۔ حال ہی میں ہندوستانی معیشت میں اطمینان بخش تبدیلی آئی ہے کہ 'ہونہاروں کی مہاجرت' کا واقعہ رک گیا ہے۔ غیر ممالک میں آباد ہونہار اور تعلیم یافتہ ہندوستانی ہی ملک نہیں لوٹ رہے ہیں بلکہ ان کے غیر ملکی پروفیشنل روزگار کے لئے ہندوستانی کمپنیوں کی جانب دیکھ رہے ہیں۔ تاریخ کا پہیہ اس طرح سے گھوم رہا ہے کہ دنیا کے سب سے زیادہ لوگ ہندوستان کو ابھرتی ہوئی عظیم معاشی طاقت کی شکل میں پہچاننے لگے ہیں۔ ان میں سے کچھ لوگوں کو یہ یقین ہی نہیں تھا کہ ہندوستان یہ سب حاصل کرنے کا اہل تھا۔ ہندوستان کے پاس جو کچھ ہے وہ اس حصولیابی کا حصہ ہے۔

میں ہندوستان کے تجارتی گھرانوں میں سب سے زیادہ ستائش ٹاٹا کی کرتا ہوں۔ میں نے آنجہانی جے آر ڈی ٹاٹا اور ان کے ہونہار وارث رتن ٹاٹا★ کے ساتھ اپنے تعلقات کو سنوار کر رکھا ہے۔ جب رتن ٹاٹا نے حال ہی میں نینو★★ کار لانچ کی تب میں نے انہیں مبارک باد

★ ٹاٹا گروپ کی دو باتیں مجھے خاص طور سے پیاری لگیں۔ پہلی تجارتی دنیا سے کوسوں دور سوامی وویکانند ان لوگوں میں سے ایک تھے جنھوں نے جمشید جی ٹاٹا کو ہندوستان کا پہلا ملکی اسٹیل پلانٹ لگانے کی تحریک دی تھی۔ دوسرے جب جمشید جی ٹاٹا نے پلانٹ قائم کرنے کے منصوبہ کو حتمی شکل دی (جو بعد میں جھارکھنڈ میں جمشید پور کے نام سے معروف ہوا) اور ریلوے کے لئے فولاد کی سپلائی کی اسکیم تیار کی، تب 'گریٹ انڈین پینسلر ریلوے' (برطانوی حکومت کی ہندوستانی ریلوے انسٹی ٹیوٹ) کے سر فریڈرک اَپ کارٹ نے ان کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا تھا 'ناممکن!۔ وہ ایسا نہیں کر پائیں گے اور اگر وہ ایسا ملکی پلانٹ قائم کر پائے تو میرا وعدہ ہے کہ میں ٹاٹا کی بنائی اسٹیل کا ایک ایک پاؤنڈ کھا جاؤں گا۔' میں نے 2007 میں انڈین انڈسٹریل اینڈ کامرس کنفیڈریشن (فکی) کی سالانہ جنرل میٹنگ میں خطاب کرتے وقت اس واقعہ کا ذکر کیا تھا۔ میں نے یہ بھی کہا 'تاریخ میں یہ ریکارڈ نہیں رکھا گیا کہ 1912 میں ٹاٹا اسٹیل پلانٹ میں اسٹیل بنانے کا کام شروع ہونے کے بعد اس گھمنڈی برٹش حضرت نے کتنے پاؤنڈ ہندوستانی اسٹیل کھایا، لیکن یقیناً یہ حضرت حال کے میڈیا کی اس رپورٹ پر اپنی قبر میں کچھ لمحہ کے لئے زندہ ہوگئے ہوں گے کہ رتن ٹاٹا نے مشہور برطانوی اسٹیل کمپنی 'کورس' خریدنے کے لئے بولی لگائی ہے۔' (یہ بولی کامیاب ہوئی)۔

★★ نینو کا مطلب بے حد چھوٹا کار۔

دیتے ہوئے خط لکھا — ایسے نام کے باوجود یہ ہندوستانی صنعت کی نینو اسکیل (انتہائی چھوٹی) حصولیابی بالکل نہیں ہے۔ اپنے ماضی کی دوسری سبھی کامیابیوں کی طرح یہ ٹاٹا گروپ کی ایک اور دھماکہ خیز کامیابی ہے۔ اس حصولیابی پر ہندوستان کو فخر ہے۔ ایسی ہی ترقی کی شاہراہ پر وہ ہمیشہ گامزن رہیں۔ ہندوستان کو اس گروپ سے اور بھی زیادہ امیدیں ہیں۔ ہمیشہ ان امیدوں کو پورا کرتے رہیں۔'

ہندوستان کی ترقی کے امکانات کے تئیں مسلسل متحرک سوچ کی وجہ سے میں آنجہانی دھیرو بھائی امبانی اور ان کے دونوں بیٹوں مکیش اور انل سے کافی متاثر ہوا ہوں، جنہوں نے اس سوچ کو تصویر دے دی ہے۔ پہلی نسل کے ایک دیگر مشہور تاجر سنیل متل کی کامیابیاں شاندار رہی ہیں۔ لکشمی متل پر ہندوستان کو فخر ہے جو دنیا کی سب سے بڑی اسٹیل بنانے والی کمپنی کے مالک بن گئے ہیں۔ میں دوراندیشی کے نظریہ سے برلا گھرانے میں آنجہانی آدتیہ وکرم برلا کا مداح تھا۔ ان کے ہونہار لڑکے کمار منگلم کو صلاحیت ورثے میں ملی ہے۔ وینوشری نواسن میرے پرانے شناسا ہیں، جن کے معیاری اور بہترین تجارتی اصولوں کی میں قدر کرتا ہوں۔ اس وقت راجیہ سبھا کے آزاد ممبر راجیو چندر شیکھر کی میں ستائش کرتا ہوں جو معاشی ترقی کے بارے میں مجھے بیش قیمت مشورہ دیتے رہتے ہیں۔

عالمی تناظر میں ہندوستان کو انفارمیشن ٹیکنالوجی میں اعلیٰ مقام دیا جاتا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ بی جے پی ایسی پہلی ہندوستانی سیاسی پارٹی ہے جس نے 1998 کے انتخابی اعلامیہ میں انفارمیشن ٹیکنالوجی کے ایک پورے حصے کو وقف کیا تھا۔ انفارمیشن ٹیکنالوجی کے تئیں میری دلچسپی بہت پہلے ہی پیدا ہوگئی تھی۔ جب 1990 میں امریکہ کے دورے کے دوران میں نے سیئٹل کے پاس مائیکروسافٹ کا ہیڈ کوارٹر دیکھنے گیا تھا، تب سے ہندوستان نے آئی ٹی سیکٹر میں کافی ترقی کی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ واجپئی حکومت میں تیز رفتاری سے ہندوستان کو ٹیلی کام اور آئی ٹی سروسز کی توسیع کرنے اور جدید بنانے کے لئے کئی حوصلہ مندانہ قدم اٹھائے گئے۔ میں نوجوان نسل کے ساتھ بات چیت کے ذریعہ آئی ٹی کمپنیوں کے مقامات کا دورہ کر کے اس سیکٹر میں انقلابی ترقی کی معلومات حاصل کرنے کی مسلسل کوشش کرتا ہوں۔ مثلاً کچھ عرصہ قبل میں بنگلور میں انفوسس کیمپس دیکھنے گیا تھا جس سے میں بہت متاثر ہوا۔ انفوسس کے بانی این آر نارائن مورتی اور ان کی اہلیہ سدھا مورتی ایسے زن و شوہر ہیں جن کی تجارت اور انسانی خدمات کے تئیں ان کے نظریہ کی میں قدر کرتا ہوں۔

ہندوستان کے تجارتی گھرانوں کی حصولیابی کی ستائش کرتے وقت میں یہ مانتا ہوں کہ یہاں بھی اخلاقی کردار سے متعلق خامیاں اجاگر ہوتی رہتی ہیں جو بدقسمتی سے سیاست سمیت قومی زندگی کے دوسروں شعبوں کی شناخت بنتی جارہی ہیں۔ بالآخر اگر سیاست میں بہتر انتظامیہ کا ماڈل ہے جس کے لئے ہمارا ملک کوشش کر رہا ہے تو اعلیٰ کارپوریٹ انتظامیہ بھی صنعت کاروں کے لئے آدرش ہونا چاہئے۔ اگر عام ہندوستانیوں سے اچھے شہری بننے کی امید کی جاتی ہے تو صنعتی دنیا کی ہستیوں سے بھی 'اچھے کارپوریٹ شہری' ہونے کی امید بھی کی جائے گی۔ میں نے کئی تجارتی منچ پر اس بابت اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ مثلاً 2001 میں فکی میں منعقد ایک تقریب میں عام زندگی میں شفافیت پر تقریر کرتے ہوئے کہا تھا 'مجھے اقتدار کی گلیوں میں پھیلی بدعنوانی کے خلاف جدوجہد کے بارے میں صنعت کاروں کی ذمہ داری کے بارے میں بھی سخت الفاظ کا استعمال کرنا ہے۔ اپنی تجارت میں قلیل مدتی فائدہ حاصل کرنے کے لئے قانون اور پالیسیوں کی خلاف ورزی نہ کریں۔ کارپوریٹ گھرانہ مسابقت کے لئے غیر صحت منداور غیر اخلاقی قدم نہ اٹھائیں۔ ایسا کر کے آپ تمام ہندوستانی تجارت کے مفادات کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ تجارت کے اعلیٰ اصول صحت مند فضا تیار کرنے میں معاون ہوں گی اور ساتھ ہی ملک کی ترقی کے وسائل کے لئے ضروری سماجی پونجی کی تعمیر میں مدد کریں گی۔'

کتابیں، ڈرامے، فلمیں، موسیقی

میری زندگی میں کتابیں، تھیٹر اور سنیما خوشیاں اور راحت حاصل کرنے کا ذریعہ رہے ہیں۔ جیسا کہ میں اپنی اس خودنوشت میں بتا چکا ہوں۔ کتابوں کے تئیں میری محبت تب بیدار ہوئی جب میں نوجوان تھا۔ راجستھان آنے کے بعد میں نے ہندی سیکھی اور کے ایم منشی کی 'جے سومناتھ' نامی کتاب پڑھی۔ حقیقتاً میں نے ان کے ذریعہ لکھی ہر ایک کتاب پڑھی۔ زندگی کے ابتدائی دور میں اس عادت نے مجھے مصروف سیاسی زندگی میں بھی کتاب سے تعلق بنائے رکھا- خواہ میں انتخابی مہم میں مصروف ہوں، دورے پر ہوں یا میٹنگوں کے درمیان تنہائی میں غرق ہوں۔ کتابیں مجھے ایسی دنیا میں لے جاتی ہیں جو محدود خیالی دنیا سے دور علم، نظریہ، جذبات، حیرت انگیز کاموں، تصورات اور خوابوں کی دنیا ہے۔ کتابوں نے مجھے چونکا دینے والے کرداروں کی جانکاری دی۔ ہر ایک کردار میں انسانی فطرت ظاہر ہوتی ہے، ہر ایک کردار منفی و مثبت اثرات کا سنگم ہے۔ ہر ایک کردار اپنے طریقہ سے زندگی کے چیلینجوں کا سامنا کرتا ہے، جس میں کئی کامیاب ہو جاتے ہیں اور کچھ ناکام۔

مجھے مختلف طرح کی کتابیں پسند ہیں لیکن میں سیاسی، روحانی، تاریخ اور علم نجوم سے جڑی کتابیں زیادہ پسند کرتا ہوں۔ سی راج گوپالا چاری کی 'رامائن' اور 'مہابھارت' میری بہترین کتابیں ہیں۔ ڈاکٹر سروپلی رادھا کرشنن کی ہندو مذہب پر لکھی کتابوں کا مجھ پر گہرا اثر پڑا۔ مجھے ایلون ٹافلر کی کتاب 'فیوچر شاک، دی برتھ ویو اور پاور شفٹ' پڑھ کر بے حد مزہ آیا۔ انہوں نے کہیں پڑھا ہوگا کہ میں ان کی کتابوں کا دلدادہ ہوں تو 2002 میں ہندوستان دورے کے وقت وہ مجھ سے ملاقات کرنے میری رہائش گاہ پر آئے۔ میں برصغیر کی تاریخ اور سیاست پر لکھی ایسٹنلی وال پرٹ کی کتابوں کا بڑا مداح ہوں۔ اسٹیفن کووے کی کتاب 'داسیون ہیبٹس آف ہائیلی افیکٹیو پیپل' اور پاؤلو کوایلہو کی متعدد کتابوں نے مجھے تحریک دی۔ کووے میں اہم خاصیت یہ ہے کہ خود کی ترقی یا رعب دار بننے کے لئے فرد کو صرف میٹھی باتیں ہی نہیں کرنی چاہئے یا لوگوں کو جنم دن ہی یاد نہیں رکھنے چاہئے۔ یہ رسمی باتیں ہیں، لیکن آدمی کی ایمانداری اور فرائض سب سے اہم ہیں۔ یہی کتنا صحیح ہے۔

اگر چہ میں پارٹی معاون کے طور پر ارون شوری کے رابطہ میں رہا ہوں لیکن میں آزادانہ طور سے ایک بہتر مصنف کی شکل میں ان کی ستائش کرتا ہوں۔ اگر مجھے آئینی موضوعات پر کسی ایک مصنف کا نام لینا پڑے جس نے مجھے متاثر ہی نہیں کیا بلکہ جس کی کتابیں سیاسی اور پارلیمانی امور کے بارے میں مسلسل ذرائع رہی ہیں تو میں درگا داس باسو کا نام لوں گا۔ ان کی کتاب انٹروڈکشن ٹو دی کانسٹی ٹیوشن آف انڈیا اور 8 جلدوں میں تحریر کتاب کمنٹری آن دی کانسٹی ٹیوشن آف انڈیا غیر معمولی تصانیف ہیں۔

میں کتابوں کے بارے میں ہندوستانی پبلشنگ دنیا کے ہیرو دینا ناتھ ملہوترا اور ہندی پبلشنگ ہاؤس پربھات پرکاشن کے بانی شیام سندر اور ان کے دولڑکوں پربھات کمار اور پیوش کمار کے ساتھ اپنے طویل تعلقات کے لئے ستائش کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔ پربھات پرکاشن نے ایمرجنسی کے دور پر لکھی میری کتاب اے پرزنرس اسکریپ بک کا ہندی ترجمہ (نظر بند جمہوریت) شائع کیا تھا۔ 2002 میں اس کا انگریزی مجموعہ ایمرجنسی ہٹانے کے 25 سال پورے ہونے کے موقع پر دوبارہ شائع کیا تھا۔ اس کے اصل پبلشر آرنالڈ ایسوسیئیٹس کے آنجہانی گلاب وزیرانی تھے جو کراچی میں راشٹریہ سویم سیوک سنگھ میں میرے ساتھ تھے۔ انہوں نے کراچی میں گزرے برسوں کی اپنی یادوں میں ایک کتابچہ تحریر کیا تھا۔ میں نے 1980 میں جنتا پارٹی کی حکومت اور ان کے زوال پر دی پیپلز بیٹریڈ نامی کتاب لکھی تھی۔ 1995 میں ممبئی کے ماہر سیاسیات آتما رام کلکرنی نے 'دی ایڈونٹ آف آڈوانی' نامی میری سوانح لکھی، حالانکہ اس میں حقائق سے متعلق کچھ غلطیاں تھیں، لیکن مصنف نے میرے

ساتھیوں اور میری سیاست سے ساتھیوں سے الگ بات چیت کر کے قابل ستائش تحقیقی کام کیا تھا۔

مجھے فلم اور ڈراما دیکھنا بھی اچھا لگتا ہے۔ پھر بھی مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ مجھے آج کل اس شوق کو پورا کرنے کے لئے وقت نہیں مل پاتا۔ تھیٹر میں مجھے شیکھر سین ون ایکٹ (مونو ایکٹ) موسیقی ریز ڈراما 'کبیر' اور 'سوامی وویکا نند' بہت پسند ہیں۔ ستیہ جیت رے کی فلموں نے میرے دل کو چھولیا اور ایسے ہی گرودت کے فلموں نے بھی۔ مجھے راجکپور کی شروعاتی دنوں کی فلمیں اور منوج کمار کے ذریعہ بنائی گئی قوم پرستی کے جذبات سے بھری ہوئی فلمیں بہت پسند ہیں۔ میں آنجہانی سنیل دت کی ایک اداکار اور ایک اچھا انسان دونوں طور سے ستائش کرتا تھا۔ انہوں نے دہشت گردی کی زد میں آئے پنجاب میں ہندو سکھ اتحاد قائم کرنے کے لئے پدیاترا کر کے قابلِ ذکر کردار ادا کیا تھا۔ میں نے حال ہی میں اپنی فیملی اور دوستوں کے ساتھ کچھ شاندار فلمیں دیکھیں جن میں عامر خان کی 'تارے زمیں پر'، فیروز خان کی 'گاندھی مائی فادر'، شاہ رخ خان کی 'چک دے انڈیا' اور دھو ونود چوپڑا اور راجو ہرانی کی 'لگے رہو منا بھائی' دیکھیں۔ غیر ملکی فلموں میں مجھے سب سے زیادہ 'دی برج آن دی ریور کوائی'، 'مائی فیئر لیڈی' اور 'دی ساؤنڈ آف میوزک' پسند ہیں۔

مجھے یہاں خاص طور سے امیتابھ بچن کا ذکر کرنا ہے۔ ان کی کثیر جہتی اداکارانہ صلاحیت مجھے ہمیشہ حیرت میں ڈالتی رہی ہے۔ ان کے والد عظیم ہندی شاعر ڈاکٹر ہری ونش رائے بچن اور والدہ تیجی بچن کو میں اچھی طرح جانتا تھا۔ دراصل جب امیتابھ بچن کی پہلی فلم 'سات ہندوستانی' 1969 میں آئی تھی جس کے کہانی کار اور ڈائریکٹر خواجہ احمد عباس تھے، تب تیجی بچن نے میرے لئے اس فلم کی خصوصی اسکریننگ کا انتظام کیا تھا۔ اس لئے ایک طرح سے میری یادوں کا سفر تھا، جب میری بیٹی پرتبھا نے زی ٹی وی پر اپنے ہفتہ واری پروگرام 'نمستے سنیما' کی 100 ویں قسط کے موقع پر 5 حصوں میں امیت جی کا ایک تفصیلی انٹرویو کیا تھا۔ ہندوستانی سنیما کے عظیم ہیرو ہوتے ہوئے بھی وہ نوجوان نسل کو تحریک دیتے ہیں۔ پروگرام کے ٹیلی کاسٹ کے بعد امیت جی نے پرتبھا کو پیغام بھیجا— 'شکریہ! آپ سے بات کر کے بہت اچھا لگا۔ انٹرویو کا معیار اس شخص سے طے نہیں کیا جاتا جس کا انٹرویو لیا جاتا ہے، بلکہ اس شخص سے کیا جاتا ہے جس نے انٹرویو لیا۔ آپ نے حیرت انگیز ڈھنگ سے میرا انٹرویو لیا ہے۔'

ماضی میں فلم تجزیہ نگار اور زندگی بھر فلموں کا شوقین ہونے کے سبب میں نے ہندی سنیما کی ترقی کو دھیان سے دیکھا ہے۔ چونکہ ایک وقت میں ڈراموں کو بھی بہت پسند کرتا تھا۔ اس لئے میں نے اکثر سنیما اور تھیٹر کو آرٹس کے دو روپوں میں موازنہ کیا ہے۔ تھیٹر کے ذریعہ فنکاروں اور ناظرین کے درمیان فنکارانہ رشتہ قائم ہوتا ہے۔ یہ خود میں انوکھا ہے، لیکن سنیما اور ٹی وی کی طرح یہ عام لوگوں تک نہیں پہنچ پاتا۔ ان دونوں ذرائع کے مثبت مناظر، موسیقی ریز حقائق اور ناظرین کو خوابوں کی نگری میں لے جانے کی صلاحیت سے ان کا اثر کئی گنا بڑھ جاتا ہے۔ جب سے میں دیکھ رہا ہوں ہندی فلمیں شروع سے ہی قومی ایکتا کو فروغ دینے میں تعاون کرتی آئی ہیں★ حال کے عشروں میں یہ دونوں آرٹس پوری دنیا میں ہندوستان کے مستحکم ثقافتی سفیر کے طور پر ابھرے ہیں۔ جب میں ہندوستانی سنیما کے چہار رخی کرداروں کے بارے میں غور کرتا ہوں (اور میں اس بارے میں ہندی کے علاوہ دیگر فلموں کے کردار کو بھی قبول کرتا ہوں) تو میرے دل میں سبھی عظیم فنکاروں، گلوکاروں، سنگیت کاروں، ڈائریکٹروں، ہدایت کاروں اور فلم صنعت سے جڑے دیگر سبھی لوگوں کے تئیں عزت بڑھ جاتی ہے۔ میں خاص طور سے ہندوستانی سنیما کے نوجوان فنکاروں سے متاثر ہوں اور ان سے امید کرتا ہوں کہ وہ ہندوستانی ادب آرٹس، سماجی اصلاح، قوم پرستی کے جذبات اور روحانیت سے

★ اس سلسلے میں میں فلم ساز بھارت بالا اور ان کی اہلیہ کنیکا کے مشہور میوزک ڈائریکٹر اے آر رحمٰن کے ساتھ مل کر کی گئی کوششوں کی ستائش کرتا ہوں۔ انہوں نے نہایت شاندار طریقہ سے قومی گیت 'جن گن من' اور 'وندے ماترم' پیش کیا۔

متعلق بیش بہا وراثت پر زیادہ توجہ دیں۔

میرے لئے موسیقی ہمیشہ سے خوشی اور ذہنی سکون کا ذریعہ رہی ہے۔ میں جب چھوٹا تھا تو اکثر بانسری بجاتا تھا۔ کراچی میں راشٹریہ سویم سیوک سنگھ کے بینڈ میں میں مسلسل بانسری نواز تھا۔ مجھے نئے پرانے سبھی فلموں کے گیت پسند ہیں۔ خاص طور سے دھیمی اور خوش کن سنگیت والے نغمے۔ میرے آئی-پاڈ اور ایم پی-تھری موبائل میں تقریباً 300 گانے ہیں۔ جب بھی میرے پاس وقت بچتا ہے، میں یہ گانے سنتا ہوں۔ ہندوستان کی لتا منگیشکر ہمیشہ سے میری محبوب پلے بیک سنگر رہی ہیں۔ میں کبھی بھی ان کے نغمے خاص طور پر 'جیوتی کلش چھلکے' جیسے بھکتی سنگیت سننے سے نہیں تھکتا۔ میں لتا جی کا شکر گزار ہوں کیونکہ انہوں نے کئی بار ایسی عوامی تقریبات میں میری درخواست پر یہ گیت گایا جہاں اسٹیج پر ہم دونوں ساتھ ہوتے تھے۔ انوپ جلوٹا کے بھجن سن کر مجھے بہت زیادہ سکون ملتا ہے۔ جگجیت سنگھ، مہدی حسن اور ملکہ پکھراج کی غزلوں کو سن کر سکون ملتا رہا ہے۔ کلاسیکل رقاصاؤں میں میں سونل مان سنگھ اور راجا رادھا ریڈی کا مداح ہوں جو میری خاندانی دوست بھی ہیں۔ میرے خاندانی دوستوں میں فلم اور ٹی وی دنیا کی چار مستند ہستیاں ہیں جو بی جے پی کے رکن بھی ہیں-شترو گھن سنہا، ونود کھنہ، ہیما مالنی اور اسمرتی ایرانی۔

1991 میں ممبئی سے شائع ہونے والے 'آفٹرنون ڈسپیچ اینڈ کوریئر' نامی اخبار میں '20 سوالات' نامی عنوان کے تحت میرا انٹرویو شائع ہوا تھا جو میری غیر سیاسی زندگی سے متعلق تھا۔

سوال: آپ کی سب سے بڑی کمزوری کیا ہے؟

جواب: کتابیں اور عام طور پر چاکلیٹ،

سوال: آپ کا سب سے انمول خزانہ کیا ہے؟

جواب: میری کتابیں اور میری اہلیہ کے ذریعہ جمع کی گئی گنپتی کی مورتیاں۔

سوال: آپ ذہنی تکان کیسے دور کرتے ہیں؟

جواب: جب ممکن ہوا تو ڈراما دیکھنے تھیٹر چلا جاتا ہوں یا کتابوں یا ٹی وی میں مصروف ہو جاتا ہوں۔

سوال: اگر آپ اپنے اندر کوئی ایک چیز تبدیل کر سکتے ہیں تو آپ کیا بدلیں گے؟

جواب: میں سوچتا ہوں کہ میری عادت میں حاضر جوابی اور مزاح کا حصہ زیادہ ہونا چاہئے (جس کی ابھی مجھ میں کمی ہے) اور چھوٹی موٹی بات چیت میں مشاق ہونے کی صلاحیت ہونی چاہئے۔

سوال: آپ خود کو کیسے درج کریں گے؟

جواب: ایک سیاسی کارکن کے طور پر، جس نے دل سے بی جے پی کو ایسا ذریعہ بنانے کی کوشش کی جس سے آج بدعنوانی اور طالع آزمائی میں دھنسی 'بھدی ہندوستانی سیاست' کی شبیہ تبدیل کی جا سکے۔

سوال: آپ کی سب سے بڑی حصولیابی کون سی ہے؟

جواب: رام رتھ یاترا کے ذریعہ میں ہندوستانی قوم پرستی اور سیکولرازم کی صحیح تشریح پر ایک زوردار قومی بحث چھیڑنے میں کامیاب ہو سکا۔

سوال: اگر آپ کو دوبارہ جنم لینا ہو تو آپ کس شکل میں اس دنیا میں جنم لے کر جینا چاہیں گے؟

جواب: جیسا میں ہوں تا کہ اپنے نامکمل کاموں کو پورا کرسکوں۔

سوال: اگر آپ کو بتایا جاتا ہے کہ آپ کو 24 گھنٹے مزید جینا ہے تو آپ یہ وقت کیسے گزاریں گے؟

جواب: یہ بھول کر کہ میری زندگی کا محض ایک دن باقی ہے۔اس دن کو عام طور سے ویسے ہی گزاروں گا جیسے اکثر گزارتا ہوں۔

سوال: آپ کا سب سے محبوب شخص کون ہے؟

جواب: میری بیٹی، پرتھا۔

سوال: آپ کا من پسند شہر؟

جواب: کراچی۔

سوال: آپ اپنے آپ کو کس شکل میں یاد کروانا چاہیں گے؟

جواب: ایک ایسے شخص کے طور پر جو ایمانداری اور خلوص کے ساتھ اپنے نظریات کے مطابق جینے کی کوشش کرتا رہا۔

اسی سال کلکتہ کے ایک اخبار 'دی ٹیلی گراف' نے مجھ سے اسی طرح کے ہی کچھ سوال پوچھے تھے۔

سوال: مکمل خوشی کے بارے میں آپ کے کیا خیال ہیں؟

جواب: مکمل بیداری کے ساتھ مکمل پرسکون حالت۔

سوال: آپ کو دوسرے لوگوں میں کون سی بات پسند نہیں ہیں؟

جواب: چھوٹا دل اور غیر اخلاق پسندانہ رویہ۔

سوال: آپ سب سے زیادہ پریشان کب ہوتے ہیں؟

جواب: ایک وقت تھا جب اپنے خیالات پر نکتہ چینی پر مجھے تکلیف ہوتی تھی، لیکن اب میں اس کی پروا نہیں کرتا۔ پھر بھی میرے خلوص پر جب کوئی چھینٹا کشی کرتا ہے تو مجھے کافی تکلیف ہوتی ہے۔

سوال: آپ کے محبوب لفظ کون سے ہیں؟

جواب: قابلِ بھروسہ۔ حال ہی کے برسوں میں مختلف پارٹیوں اور سیاست دانوں کو پرکھنے کے لئے اعتماد ایک اہم تقاضہ بن گیا ہے۔

سوال: آپ جھوٹ کب بولتے ہیں؟

جواب: ایسے موقع آئے ہیں جب سچ بولنے سے میرا کوئی محبوب شخص غم زدہ ہو جائے، ایسی حالت میں میں جھوٹ بولنے کی کوشش کرتا ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ میں ایسا کامیابی کے ساتھ کرسکتا ہوں یا نہیں۔

سوال: آپ کو سب سے زیادہ کس بات کا افسوس ہے؟

جواب: سنسکرت سے بے انتہا محبت ہونے کے باوجود میں اسے نہیں پڑھ پایا۔

سوال: کس بات پر آپ کی آنکھیں نم ہو جاتی ہیں؟

جواب: خوشی ہو یا غم، آنسوؤں سے میری آنکھیں فوراً نم ہو جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ کسی فلم میں جذباتی مکالمہ سے یا کسی باہری شخص کے ذریعہ بی جے پی کی بھرپور ستائش کرنے یا کسی محبوب شخص کے ذریعہ کسی غیر معمولی کامیابی کی خبر ملنے پر میں جذباتی ہو جاتا ہوں۔

سوال: آپ کیسی موت چاہیں گے؟

جواب: میں چاہوں گا کہ موت اچانک ہی، بغیر بتائے، چاہے مجھے یا کسی دوسرے شخص کو آجائے۔

میرا کنبہ، میری دنیا

اگر انٹرویو میں کوئی آج مجھ سے یہ سوال پوچھتا 'آپ کی ذاتی زندگی میں سب سے بڑا سکھ یا خوشی کا ذریعہ کیا ہے؟' بلاشبہ میرا جواب ہوتا 'میرا کنبہ' اسی طرح سے اگر مجھ سے یہ پوچھتا 'آپ کی سیاسی زندگی میں حقائق کی کیا اہمیت ہے؟' تو میں کہتا 'مذہب اور روحانیت'۔

کنبہ ہر ایک شخص کی زندگی میں طاقت، خوشی اور استقامت کی بنیاد ہے لیکن ان لوگوں کے معاملے میں کنبہ خاص اہمیت رکھتا ہے جو عوامی زندگی کا راستہ منتخب کرتے ہیں۔ کنبہ ایسی جگہ ہے جہاں مجھے بہت زیادہ لطف وسکون حاصل ہوتا ہے۔ یہیں پر میں نے سیاست میں آنے والے نشیب وفراز کے وقت بذات خود یہ محسوس کیا کہ زندگی میں کنبہ نے مجھے کتنا پیار دیا۔ کتنا تحفظ دیا اور میرا دھیان رکھا۔ اس سے بھی زیادہ جب میں کسی میٹنگ یا کسی دورے سے لوٹ کر گھر آتا تھا تو محسوس کرتا تھا جیسے میں اپنی دنیا میں آگیا ہوں۔ جہاں مجھے نہ کوئی فکر ہے نہ کوئی شکایت، صرف اطمینان ہی اطمینان ہے۔ حال ہی میں میری بیٹی پرتھا ہم سبھی کو - مجھے، میری اہلیہ کملا، لڑکا جینت اور بہو گیتیکا کو - دہلی کے ایک ریسٹورنٹ پر عشائیہ پر لے گئیں۔ ہم سبھی نے مختلف ممالک کی اپنی اپنی پسند کے ڈشوں کا آرڈر دیا۔ جب کھانا شروع ہوا تب ہمارے کنبہ میں سب سے چالاک پرتھا نے کہا 'آہا! دراصل یہ گلوبل دعوت ہے۔ ہم واقعی 'وسودیوکٹم بکم' میں یقین رکھتے ہیں۔ تھوڑی دیر رک کر میں نے کہا 'وسودیوکٹم بکم تو ٹھیک ہے لیکن میرے لئے تو میرا کٹم ہی میری دنیا ہے۔'

ہمارا کنبہ ایک سایۂ شجردار ہے۔ کملا شروع سے ہی گھر کے تمام کام، پیسہ سے لے کر کھانے تک سنبھالتی ہیں۔ این ڈی اے حکومت کے دوران میں اپنے دوستوں کو مذاق میں کہتا تھا' میں ہندوستان کا وزیر داخلہ ہوسکتا ہوں لیکن ہمارے کنبہ میں کملا وزیر داخلہ ہیں۔' مجھے کبھی بھی گھر کی کسی ضرورت کے لئے فکر نہیں کرنی پڑی۔ اکثر میری ضد اور الگ تھلگ رہنے کی عادت نے مجھے اپنے گھر میں مزاحیہ کردار بنا دیا ہے۔ میری اہلیہ مجھ پر اس وجہ سے طنز کرتی ہیں کہ مجھے اپنے بینک کے اکاؤنٹ کا نمبر تک نہیں معلوم اور نہ ہی میں کبھی اپنے نئے مکان میں گیا ہوں جو انہوں نے تقریباً بیس سال پہلے دہلی میں خریدا تھا۔ (ہمارا اپنا پارلیمانی حلقہ گاندھی نگر میں بھی ایک مکان ہے)۔ جینت اور پرتھا اپنی پروفیشنل زندگی جی رہے ہیں۔ جینت عادت سے خوش اخلاق اور سوچ وفکر کرنے والے انسان ہیں، جبکہ پرتھا متحرک، فعال، ملنسار اور سماجی کارکن ہیں۔ کملا اور میں نے انہیں تہذیب تو دی لیکن اس کے علاوہ ان میں میری دو دلچسپیاں بھی پیدا ہوئی ہیں — کرکٹ اور سنیما، دہلی میں اپنا چھوٹا سا کاروبار چلا رہا جینت کرکٹ کا بہت زیادہ شوقین ہے۔ ہندوستان کے ٹسٹ کے سابق اور حالیہ کھلاڑیوں دونوں میں سے کئی اس کے دوست ہیں۔ پرتھا ٹی وی پروگرام کی اینکرنگ کرتی ہیں لیکن وہ فلموں کی بے حد شوقین ہیں۔ اس نے ٹی وی چینلوں پر ہندی سنیما پر ڈاکومنٹری پیش کی ہیں۔ ان میں ہندی سنیما میں رام، کرشن، شیو، گنیش، ہنومان اور ہولی، دیوالی جیسے تہواروں کے فیچر شامل ہیں۔ پرتھا نے ہندی سنیما میں 'وندے ماترم' پر بھی فلم بنائی تھی۔ ان پروگراموں کی بڑے پیمانے پر ستائش ہوئی کہ ان میں مثبت ثقافتی اور حب الوطنی کے اقدار ہیں۔ پرتھا کی پیشکش میں میری گولڈن جوبلی رتھ یاترا اور بھارت سرکشا یاترا پر فلمیں بھی شامل ہیں۔

مجھے اپنے بچوں کے ذریعہ اپنائے گئے کیریئر پر فخر ہے۔ دونوں ہی سیاست سے الگ ہیں۔ پرتھا طویل عرصہ تک 'آڈوانی' استعمال نہیں

کر رہی تھی، کیونکہ وہ اپنی الگ ہی شناخت بنانا چاہتی تھی۔ اسے ایک بار دلچسپ تجربہ ہوا جب وہ مشہور فلم ساز ودھو ونود چوپڑا کا انٹرویو لینے گئیں تو اس نے پوچھا 'کیا آپ فلم صنعت کو فروغ دینے کے لئے حکومت کے ذریعہ اٹھائے گئے قدم سے خوش ہیں؟' انہوں نے جواب دیا 'نہیں، حقیقت میں نہیں' ہماری صنعت کے سامنے سب سے بڑا چیلنج 'پائیریسی' کا ہے لیکن میں نہیں سوچتا کہ وزیر داخلہ اس کے بارے میں کچھ جانتے ہوں گے۔' انٹرویو کے بعد کسی نے چوپڑا کو بتایا 'کیا آپ جانتے ہیں کہ آپ کس سے بات کر رہے تھے؟ وہ وزیر داخلہ کی بیٹی ہیں۔' چوپڑا پرتبھا کے پاس آئے اور کہا 'اوہ! میں نہیں جانتا تھا......۔' اس کے بعد وہ میری فیملی کے اچھے دوست بن گئے۔ اگر پرتبھا کا میری سیاسی زندگی سے کوئی تعلق ہے تو یہی کہ میری یہ دلچسپی رہی ہے کہ میں گھر پر چنندہ ناظرین کو پرتبھا کے ذریعہ بنائی گئی فلمیں دکھانا چاہتا ہوں اور وہ میرے لئے اچھی فلموں کی خاص اسکریننگ کا انتظام کرتی ہے۔ عام طور پر مہادیو روڈ پر فلم ڈویژن کے کانفرنس حال میں۔

'پرتبھا' اپنے نام کے معنی کو ثابت کرتی ہے، یہاں تک کہ جب وہ بچی تھی وہ بہت جلد سیکھ لیتی تھی، چاہے پڑھائی لکھائی ہو یا کوئی تخلیقی موضوع۔ جب وہ صرف 10 سال کی تھی تب ہی میرے مزاحیہ خاکے بنا لیتی تھی جس میں ایک خاکہ اس کتاب میں شامل ہے۔ فیملی میں اس کی سوچ کافی کچھ مجھ سے ملتی ہے۔ اس میں میری دلچسپیاں، غیر دلچسپیاں، اقدار اور روایات ہیں۔ میرا اس کے ساتھ ایک خاص جذباتی رشتہ ہے، کیونکہ حقیقت میں وہ میری طاقت کا ذریعہ ہے۔ وہ میری چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کا دھیان رکھتی ہے۔ میں نے ایک بار اسے 'ڈونٹ سویٹ دی اسمال اسٹف' (چھوٹی چھوٹی باتوں میں زیادہ طاقت مت لگاؤ) نامی کتاب پڑھنے کے لئے دی لیکن وہ ہمیشہ چھوٹی چھوٹی باتوں کا بھی پورا خیال رکھتی ہے۔

روحانی پیشواؤں کے سایۂ عافیت میں

میں روایتی یا دوسرے معنوں میں مذہبی نہیں ہوں۔ میں روز پوجا نہیں کرتا اور نہ ہی مندر جاتا ہوں۔ پھر بھی مذہب اور روحانیت کا میری ذاتی اور سیاسی زندگی پر گہرا اثر پڑا ہے۔ سیاست میں چال باز، ضدی اور بدعنوان ہونا آسان ہے۔ اگر میں ان برائیوں سے دور رہنے میں کامیاب رہا ہوں تو اس کی وجہ میری مذہبی اور روحانیت کے نظریے سے پرورش و پرداخت ہے۔ اگر یہ محسوس کیا جائے کہ ایسی کوئی سب سے بڑی طاقت موجود ہے جس کے سامنے سبھی دوسری طاقتیں چھوٹی ہیں اور ہم سب اپنے ہر چھوٹے بڑے کاموں کے لئے اس طاقت کے آگے ذمہ دار ہیں تو اس سے ہماری زندگی میں انکساری آتی ہے اور اس کی اہمیت بھی ہوتی ہے۔

میری خوش قسمتی ہے کہ میں کئی قابلِ تعظیم روحانی پیشواؤں کے رابطے میں رہا۔ جیسے - دادا جے پی واسوانی، ستیہ سائیں بابا، دلائی لامہ، آنجہانی پانڈورنگ شاستری اٹھاؤلے، پرجاپتا برہم کماریوں کے سربراہ آنجہانی دادی پرکاش منی، کانچی مٹھ کے شری جیندر سرسوتی سوامی جی، سوامی نارائن فرقہ کے سربراہ سوامی مہاراج، آچاریہ مہا پرگیہ، آنجہانی آچاریہ تلسی، آنجہانی آچاریہ سشیل منی جی، پیجاور مٹھ (اُڈوپی) کے سوامی وشویشتیرتھ، اجودھیا کے آنجہانی رام چندر پرمہنس جی، ماتا امریتا نندمئی، شری شری روی شنکر، سنت مراری باپو، سدھ گنگا مٹھ تمکور کے شیو کمار سوامی جی، سنت آسا رام باپو، رمیش بھائی اوجھا، سوامی رام دیو، بابا گریندر سنگھ ڈھلوں (بیاس شری گرو جی) مہاراج راجندر سنگھ جی، سوامی چیدانند سرسوتی وغیرہ۔ اس سلسلے میں مدر ٹریسا اور مولانا وحید الدین خاں کا خاص طور سے ذکر کرنا چاہوں گا۔ میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا اور ان دونوں کا مجھ پر آشیرواد بنا رہا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دن بہ دن مجھ پر مذہب وروحانیت کا اور زیادہ اثر پڑتا رہا۔ (اپنے صحیح معنوں میں مذہب اور روحانیت دونوں کا تعلق مختلف ہے) اور اب میں سمجھتا ہوں کہ سیاست حقیقتاً پوری زندگی کی حقائق، مذہب اور روحانیت سے ہی یقینی ہوتی ہے۔ یہاں مذہب کو محدود معنوں میں نہ لیا جائے بلکہ مذہب دنیاوی سطح پر اخلاقی نظام ہے جو صحیح سمت کی جانب انسانی زندگی کی رہنمائی کرتی ہے اور انسان کو صحیح راہ پر لے جاتی ہے۔ اس معنی میں میں ان لوگوں سے متفق نہیں ہوں جو کہتے ہیں کہ سیاست مذہب سے الگ ہونا چاہئے۔ میں سیکولرازم کے صحیح معنی پر بحث ومباحثہ میں ہمیشہ اس موضوع پر مہاتما گاندھی کی مندرجہ ذیل باتوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں—

'میرے لئے مذہب کے بغیر سیاست کوڑا کرکٹ ہے اسے چھوڑ دیا جانا چاہئے۔ سیاست ملک سے متعلق ہے جس میں ایسے شخص کو ملک کی فلاح پر مرتکز ہونا چاہئے جو مذہب سے تعلق رکھتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ایسے ایشور اور سچ کا ماننے والا ہونا چاہئے۔ میرے لئے ایشور اور سچائی ایک سکہ کے دو پہلو ہیں، اس لئے سیاست میں بھی ہمیں 'سورگ کے جیسا سامراجیہ' قائم کرنا ہے۔ میرے کئی سیاسی دوست میری اس بات سے ناامید ہیں، کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ میری سیاست مذہب سے پیدا ہوئی ہے۔ اور وہ بالکل صحیح کہتے ہیں۔ میری سیاست اور میرے کاموں کی شروعات مذہب سے ہوئی۔ حقیقت میں مذہب ہمارے ہر ایک کام پر چھایا ہوا ہے۔ یہاں مذہب کا معنی محدود نہیں ہے۔ اس کا معنی ہے — دنیا میں اخلاقی حکومت کے نظام میں یقین رکھنا۔ یہ اقتدار اس لئے کم حقیقی نہیں ہے، کیونکہ اسے دیکھا نہیں جا سکتا۔ ایسا مذہب ہندو، اسلام، عیسائی وغیرہ کی سرحدوں سے اوپر ہوتا ہے۔ یہ تمام مذاہب اس میں سمائے ہوتے ہیں۔ مذہب ان مذہبی مختلف خیالات کو مسترد کرکے خود کو قائم نہیں کرتا، لیکن وہ ان سبھی افکار میں تال میل قائم کرکے انہیں حتمی بناتا ہے۔'

یقینی طور سے ہندوستان میں سیاست مذہب سے نہیں چل رہی ہے۔ اس کی حکومت 'دھرم راجیہ' کے آدرشوں سے کوسوں دور ہے جن کی مہاتما گاندھی اور پنڈت دین دیال اپادھیائے دونوں نے حمایت اور تشہیر کی۔ اگرچہ حقیقت اور آدرش کے درمیان موجود فرق کو ایمانداری سے قبول کرنے پر ہی ہم اس خلا کو بھرنے کی سمت میں آگے بڑھ سکتے ہیں۔ سیاست اور ذاتی زندگی میں اس سمت میں کچھ قدم اٹھانے کی میں نے ایماندارانہ کوشش کی۔ میں کہیں غلط بھی ہوسکتا ہوں لیکن میں نے کوشش جاری رکھی ہے۔ یہ بھی میری زندگی میں زیادہ خوشی وسکھ اور حقائق کا ایک ذریعہ رہی ہے۔

خلاصہ

میں یہ سطور پر مارتھ نکیتن رشی کیش میں لکھ رہا ہوں جو مقدس گنگا کے ساحل پر واقع ایک آدرش آشرم ہے اور جس کے عقب میں عظیم ہمالیہ پہاڑ ایک فصیل کی طرح کھڑا ہے۔ اسے قابلِ تعظیم سوامی چیدانند سرسوتی چلا رہے ہیں جن کے ذریعہ ہندو دھرم کی نو بیداری اور اصلاح کے لئے کئے گئے کاموں کی میں بے حد ستائش کرتا ہوں۔ میں اس مقام پر ایک سال پہلے 2007 میں آیا تھا۔ میں ایک بار پھر اپنی فیملی کے ساتھ اس روحانی مقام پر کچھ دن گزارنے آیا ہوں۔ ہوا خالص ہے اور فضا انتہائی خوشگوار۔ لیکن مجھے جس چیز نے سب سے زیادہ متوجہ کیا ہے وہ ہے سوامی جی کے ذریعہ قائم گروکل۔ اس میں یتیم اور چھوڑے گئے بچوں کو رشی کمار بننے کی تربیت دی جاتی ہے۔ وہ روایتی اور جدید دونوں طرح کی تعلیم حاصل کرتے ہیں جس سے ہر بچے کو اپنی فطری اور ذہنی تخلیق کو توسیع دینے میں مدد ملتی ہے۔ شام کو سوامی جی اور ان ننھے فرشتوں کے ساتھ آرتی میں شرکت کرتے ہوئے جب میرے سامنے مقدس گنگا رواں دواں ہے اور آسمان پر پوس پورنیا کا چاند چمک رہا ہے تو اس کا میرے دل پر بہت اثر پڑ رہا ہے۔

سوامی جی نے میرے ساتھ اپنے آشرم میں جاری کئی پروجیکٹوں پر بات چیت کی۔ ان میں گنگا کو صاف کرنا، اتراکھنڈ۔ جسے 'دیو بھومی' کہا جاتا ہے کو پلاسٹک اور دیگر کوڑا کرکٹ سے آزاد کرنا اور ریاست کے تیرتھ مقامات کو خوبصورت کرنا اور سنوارنا شامل ہے۔ اس خیال نے مجھے بہت متاثر کیا کیونکہ ہری دوار، رشی کیش، متھرا، وارانسی اور ہندوستان کے کئی دیگر مقامات کی حالت کافی خستہ ہے، جہاں ہر سال پورے ہندوستان سے لاکھوں عقیدت مند آتے ہیں۔ یہ مجھے ہمیشہ غم زدہ کر دیتے ہیں۔ خوش قسمتی سے اتراکھنڈ کے وزیر اعلیٰ میجر جنرل (ریٹائرڈ) بی سی کھنڈوری نے بھی ہمارے ساتھ اس بحث میں حصہ لیا اور یہ فیصلہ لیا کہ حکومت کی سماجی تنظیمی اور مذہبی ادارے ایک ساتھ مل کر اس پروجیکٹ پر عمل درآمد کے لئے ایک بڑی اور مقررہ مہم چلائے گی۔ اسے سب سے پہلے گنگا کے گنگوتری سے شروع کیا جائے گا۔ اس کے بعد جمنوتری، کیدارناتھ، بدری ناتھ، اترکاشی، ہیم کنت، رشی کیش اور ہری دوار میں عمل میں لایا جائے گا۔

میں اس پروجیکٹ کے شروع ہونے کے تئیں دو وجوہات سے پُر اعتماد تھا۔ پہلا یہ کہ کھنڈوری ایماندار شخص ہیں اور واجپئی حکومت میں ٹرانسپورٹ وزیر کے طور پر انہیں کثیر المقاصد قومی شاہراہ ڈیولپمنٹ پروجیکٹ کو نافذ کرنے کے لئے ملک گیر مقبولیت ملی۔ دوسرے پورے ہندوستان میں ایسے کئی مذہبی لیڈر ہیں ج ل گنگا' کے خواب کو حقیقت میں بدلنے کے لئے تعاون دینے کی خواہش رکھتے ہیں۔

یہ میرا خواب ہے کہ گنگا کو آلودگی سے آزاد دیکھ سکوں۔ گنگوتری سے گنگا ساگر تک، مغربی بنگال کا وہ مقام جہاں وہ سمندر میں ملتی ہے۔۔۔ سے سابق وزیر اعظم راجیو گاندھی نے 1980 کے عشرہ میں اسی مقصد کے تحت 'گنگا ایکشن پلان' کے نام سے ایک قابلِ ستائش پروجیکٹ شروع کیا تھا۔ بدقسمتی سے اس کے مطلوبہ نتائج برآمد نہیں ہو سکے، کیونکہ اسے نوکر شاہی کے طریقہ سے نافذ کیا گیا تھا اور اس میں ان لوگوں کا جوش و

خروش نہیں تھا جسے میں گنگا پریوار- گنگا کے دونوں جانب رہنے والے لوگ اور ملک کے مختلف مقامات سے آنے والے تیرتھ یاتری اور سب سے اہم گنگا کے ساتھ ساتھ قائم سیکڑوں مذہبی مقامات - کہتا ہوں۔ مجھے کوئی شبہ نہیں ہے کہ اگر سماج اور ریاست کے ذریعہ مشترکہ طور سے عزم مصمم کے ساتھ کوشش کی جائے تو مقدس گنگا کو اس کی قدیم پاکیزگی دی جاسکتی ہے۔ حالانکہ اس ہدف کو پوری طرح سے حاصل کرنے میں برسوں لگ سکتے ہیں لیکن یہ مہایگیہ کرنا مناسب ہوگا۔ حقیقت میں ہمارا طویل مدتی ہدف ہونا چاہئے کہ ہندوستان کی تمام ندیوں، جھیلوں اور پانی کی جگہوں کو آلودگی سے پاک رکھنا، کیونکہ وہ صرف ہمارے ملک کی ترقی کی لائف لائن بھی نہیں ہے بلکہ ہندوستان کی قدیم اور قابلِ افتخار تہذیب کی علمبردار بھی ہیں۔

یہ پروجیکٹ اس بات سے گہرائی سے جڑا ہے کہ کس طرح مذہب، سیاست کو اور زیادہ بامعنی اور متحرک بنا سکتا ہے، جس کا ذکر میں نے گزشتہ باب میں کیا ہے۔ گنگا کو صاف کرنے کے خیال نے مجھے اس بات پر غور کرنے پر مجبور کردیا کہ کیسے ہماری سیاسی، سرکاری اور ہندوستان میں عوامی زندگی بھی آلودہ ہوئی ہے اور کیسے ایک روحانیت سے متاثر اعلیٰ آئیڈیل پر عمل کر کے ہم اس آلودگی سے آزادی حاصل کر سکتے ہیں۔ اس خیال کو تقویت تب ملی جب گنگا آرتی کے اختتام کے بعد سوامی جی نے مجھے عقیدت مندوں کو خطاب کرنے کے لئے کہا۔ ندی کے کنارے اس خوبصورت گھاٹ جس کی تعمیر سوامی جی نے ہی کرائی ہے، پر جمع ہونے والے عقیدت مندوں کے سامنے میں نے مندرجہ ذیل باتیں کہیں ——

'میں خود کو عقیدت مندوں کے جلسے سے خطاب کرنے کا اہل نہیں مانتا کیونکہ میں بھی آپ لوگوں کی طرح ایک عقیدت مند اور حصول علم کا طلب گار ہوں۔ یہاں میں کچھ تعلیم حاصل کرنے اور تحریک لینے آیا ہوں نہ کہ دینے آیا ہوں۔ پھر بھی اگر ایسی بات ہے کہ میں سیاست اور ملک کی تعمیری سرگرمیوں میں روحانی رہنمائی کی اہمیت پر کچھ خیالات کا اظہار کروں تو میرے پاس اس موضوع پر کہنے کے لئے کچھ ہے۔

جب میں عوامی زندگی میں گزارے 6 دہائیوں کے پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں، اور یہ مدت ہندوستان کی آزادی کے 60 برسوں کے بالکل ساتھ ساتھ چلی ہے، تو اس میں تین اہم حصولیابی کو دیکھ سکتا ہوں، جنہوں نے ہمارے ملک کی طاقت کو بڑھا کر عالمی منچ پر اس کے قد کو اونچا کیا ہے۔ پہلا: ہندوستان نے نہ صرف حکومت کے جمہوری نظام کو اپنایا بلکہ جوش کے ساتھ اسے محفوظ بھی رکھا۔ اس نے کچھ غیر ملکیوں کی اس ناامید پیشین گوئی کو جھٹلا دیا ہے کہ ایک ایسا ملک جس کی کافی بڑی تعداد ناخواندہ ہے اور متعدد مختلف النوع اقسام کے رسم ورواج میں جکڑا ہوا ہے، وہ نہ تو جمہوری رہ سکتا ہے اور نہ ہی متحد۔ ہندوستان خاص طور سے اپنی ہندو روایتوں کی وجہ سے ہی جمہوری رہ سکا جس طرح سے یہ ہندو روایات کی وجہ سے ہی سیکولر بنا ہوا ہے۔

ہماری دوسری سب سے بڑی کامیابی ہے کہ ہندوستان اب ایک نیوکلیائی ملک بن گیا ہے۔ مئی 1998 میں اس وقت کے وزیر اعظم اٹل بہاری واجپئی کے ذریعہ لئے گئے حوصلہ مند فیصلہ کی وجہ سے ہی یہ ممکن ہو پایا۔ بدقسمتی ہے کہ کچھ ممالک جن کے پاس ہم سے زیادہ خطرناک نیوکلیائی اسلحے ہیں، نے اس فیصلہ کے لئے ہماری حکومت کی تنقید کی۔ پھر بھی اس نے تمام ہندوستانیوں کا سر اونچا کیا اور اس نے یقین دہانی کرائی کہ مستقبل میں کوئی بھی طاقت ہم پر حملہ کرنے اور فوجی نظریہ سے ہندوستان کو اپنا غلام بنانے کی ہمت نہیں کر سکے گی۔ جیسا کہ گزشتہ ایک ہزار برسوں میں ہوتا رہا ہے۔ ہماری تیسری سب سے بڑی حصولیابی ہے—— حال ہی میں معاشی ترقی کے شعبہ میں ہونے والی غیر معمولی پیش رفت۔ آج ساری دنیا ہندوستان کو کل

کے معاشی سپر پاور کے طور پر دیکھ رہی ہے۔ نتیجتاً ہندوستان اور ہندوستانیوں کو بین الاقوامی برادری میں وہ عزت واحترام اور اہمیت حاصل ہو رہی ہے جو دو یا تین دہائی پہلے نہیں تھی۔

ایک ہندوستانی اور ایک سیاسی کارکن کے طور پر یہ تین حصولیابی مجھے انتہائی خوشی اور فخر کا احساس کراتی ہے، خاص طور پر اس لئے کہ ان میں سے تمام میں میری پارٹی کا تعاون رہا ہے۔ یہ سچ ہے کہ سماجی، معاشی ترقی کے شعبہ میں ہمارے سامنے کئی نامکمل کام اور نامکمل خواہشات ہیں۔ غریبی اور پسماندگی کو پوری طرح سے دور کیا جانا چاہئے۔ تمام شہریوں کو سیکورٹی حاصل ہونی چاہئے اور تعلیم، صحت، روزگار، رہائش، بنیادی سہولیات اور تفریحات کے لئے مقررہ التزام ہونا چاہئے جس سے کہ ان کی زندگی بہتر ہو سکے اور وہ ایک انسان کے طور پر اپنی پوری صلاحیتوں کو بروئے کار لاسکیں۔ جب میں مستقبل کی جانب دیکھتا ہوں مجھے کوئی شبہ نہیں رہتا کہ دیر بہ دیر ہندوستان کی ترقی کے یہ سبھی کام پورے ہوں گے۔ اگرچہ ہم چاہتے ہیں کہ ایسا جلد سے جلد ہو، لیکن کیا ترقی ہی تنہا مقصد ہے جس کی خواہش ہندوستان کو کرنی چاہئے۔ یقیناً ہندوستان کو اس سے کہیں زیادہ اونچے آدرشوں کے لئے کوشش کرنی چاہئے۔ یہ اونچے آدرش کیا ہیں؟ انہیں کیسے سمجھا جا سکتا ہے؟ انہیں حاصل کرنے کے لئے ہمیں کون رہنمائی کر سکتا ہے؟

میں عام طور پر اپنی سیاسی ریلیوں میں اس کے بارے میں بات نہیں کرتا ہوں، لیکن میں مقدس گنگا کے سامنے ہوں اور یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ یہ آدرش ہے ہندوستان کی روحانی ترقی کا جو ان سبھی پریشانیوں کو حل کر سکتی ہے، جن کا سامنا ہمارا اپنا ملک اور وسیع پیمانے پر انسانیت کر رہی ہے۔ اس خیال کا ہندوستان کے سبھی عظیم سنتوں اور رشیوں نے بھی اظہار کیا ہے، لیکن میں یہاں 15 راگست 1947 کو شری اروند کے ذریعہ دیئے گئے سب سے شاندار اور تحریک دینے والی تقریر کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ جنہیں آکاشوانی نے ہندوستان کی آزادی پر خاص پیغام دینے کی درخواست کی تھی۔ 15 راگست کو ان کی سالگرہ بھی ہوتی ہے۔ میرا ماننا ہے کہ ان کا یہ عجوبہ اور چھوٹا سا پیغام جس میں ہمارے ملک کے لئے کئی حوصلہ مندانہ حقائق تھے اور جو ہمیشہ رہیں گے، عوامی زندگی منتخب کرنے والے ہر ہندوستانی کے ساتھ رہنا چاہئے۔

شری اروند نے کہا کہ '15 راگست 1947 آزاد ہندوستان کا جنم دن ہے۔ یہ ہندوستان کے لئے پرانے دور کا خاتمہ اور نئے دور کی شروعات کی علامت ہے۔' لیکن کیا اس کی اہمیت ہمارے لئے ہی ہے؟ نہیں، یہ عظیم یوگی کہتے ہیں۔ اس کی اہمیت ہمارے لئے ہی نہیں بلکہ ایشیا اور پوری دنیا کے لئے بھی ہے، کیونکہ یہ سبھی ملکوں کی برابری میں ایک نئی طاقت کی نشاندہی کرتا ہے، جس میں غیر معمولی امکانات ہیں اور جسے انسانی برادری کی سیاسی، سماجی، ثقافتی اور روحانی مستقبل کے تعین میں ایک بڑا کردار ادا کرنا ہے۔ دنیا میں ہندوستان کی روحانیت کا دور شروع ہو چکا ہے۔ ہندوستان کی روحانیت یوروپ اور امریکہ میں مسلسل بڑھتی ہوئی مقدار میں داخل ہو رہی ہے۔ یہ تحریک بڑھے گی۔ حالیہ دور کے بحران کے درمیان بہت زیادہ لوگوں کی آنکھیں امید کے ساتھ ہندوستان کی جانب دیکھ رہی ہیں اور نہ صرف اس کے علم کا بلکہ اندرونی و بیرونی اور روحانی سادھناؤں کی بھی بہت زیادہ سہارا لیا جا رہا ہے۔

پھر بھی یوگی کی داخلی نظر نے ہندوستان کو ایک آزاد ملک کے طور پر بہت زیادہ باصلاحیت دیکھا۔ ایک دور اندیش کے

طور پر، جو مانتے تھے کہ انسان کے ذہن کی پرداخت کو آخر کار ایک عظیم ترین دل (سپر مینڈ) بننا ہی ہے، جس میں غیر محدود نئے امکانات ہیں، جو حالیہ انسان کے کم ترقی کے مرحلے کے ساتھ پوری نہیں ہوسکتی۔ انہوں نے 15 اگست کا ذکر 'ترقی کا ایک مرحلہ' کے طور پر کیا جو ترقی کے سلسلے میں ایک نیا قدم اٹھائے گا، جو بیداری کو اعلیٰ سطح پر اٹھا کر زندگی کی ان متعدد پریشانیوں کو حل کرنا شروع کردے گا، جنہوں نے انسان کو تبھی سے حیران و پریشان کر رکھا ہے جب سے انسانوں نے ذاتی عرفان اور مکمل سماج کے بارے میں سوچنا اور خواب دیکھنا شروع کیا تھا۔ یہ ابھی انفرادی امید ہے، ایک فکر اور ایک آدرش ہے جس نے ہندوستان اور مغرب میں دونوں جگہ دوراندیش دانشوروں کو اپنے بس میں کرنا شروع کردیا ہے۔

شری اروند نے ان حقائق کا ذکر کیا کہ 15 اگست ان کی بھی سالگرہ ہے۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے انہوں نے کہا میں اپنی سالگرہ کو ہندوستانی یوم آزادی کے ساتھ اس طرح ایک ہوجانے کو کوئی دیوی یا اچانک ہوجانا نہیں مانتا، بلکہ یہ مانتا ہوں کہ جس کام کو لے کر میں نے اپنی زندگی شروع کی تھی اسے میری رہنمائی کرنے والی الہامی قوت نے اپنی اجازت دے دی ہے اور اس پر اپنی مہر بھی ثبت کردی ہے۔ بلاشبہ آج کے دن میں ہمیشہ ان سبھی تحریکوں کو جنہیں میں نے اپنی زندگی میں ہی کامیاب ہوتے دیکھنے کی امید کی تھی لیکن جو اس وقت ناممکن اور خواب جیسی تھیں، کامیابی کے نزدیک پہنچتے دیکھ سکتا ہوں یا پھر ان کی شروعات ہوگئی ہے اور وہ اپنی کامیابی کی جانب بڑھ رہی ہیں۔ انہیں اس تحریک دینے والے پیغام دینے کا اختتام آشاواد سے کیا۔ یہ ہیں وہ جذبے جنہیں میں ہندوستانی آزادی کی اس تاریخ کے ساتھ جوڑتا ہوں۔ کیا یہ سلسلہ وار واقعات پورے ہوں گے یا کہاں تک، یا کتنی جلد پوری ہوں گے۔ یہ بات اس نئے اور آزاد ہندوستان پر منحصر کرتی ہے۔★

میں نے شری اروند کے پیغام کا ذکر اس لئے کیا، کیونکہ سیاسی اور عوامی زندگی سے جڑے ہم میں سے ہر ایک کو ہندوستان کے منیشیوں کے ذریعہ ملک کے سامنے پیش کر کے ان عظیم اہداف اور بڑھتی امیدوں کو پورا کرنے کے لئے کوشش کرنی چاہئے۔ ہمیں اپنی سرگرمیوں، خواہشات اور زندگی کے اہداف کے بہ نسبت ملک کی تعمیر کے اعلیٰ معیار کو ہدف بنانا چاہئے۔ کیا ہم اپنے مفاد کے لئے خود کو نیچے گرا رہے ہیں یا ہم اپنے عمومی ذاتی تعاون کے ذریعہ اپنے روحانی گروؤں کے ذریعہ دکھائی گئی راہ پر ہندوستان کی مشعل کو جلائے رکھ کر اپنے وقار کو بڑھا رہے ہیں؟

سوامی جی نے گنگا کو آلودگی سے پاک کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ میں ان کے درد کو سمجھ سکتا ہوں ہم کیسے کہہ سکتے ہیں کہ ہم گنگا ماں کی پوجا کرتے ہیں، جب ہم اس کی فضا اور پانی کو آلودہ کرتے ہیں؟ مجھے خود کل رشی کیش آتے ہوئے کافی افسوس ہوا، جب میں نے سڑک کے کنارے پلاسٹک اور کوڑے کے ٹیلے دیکھے۔ یہ منظر بدلنا چاہئے، لیکن صرف بیرونی ہی نہیں بلکہ ہماری اپنی زندگی کی اندرونی حالت بھی صاف ستھری ہونی چاہئے۔ اس کے بغیر ہم ملک کی تعمیر کے بڑے اور چیلنج والے کاموں کو پورا نہیں کر پائیں گے اور نہ ہی ہماری کامیابی پائیدار ہوگی۔

میرا ہمیشہ یہ ماننا رہا ہے کہ ہندوستان میں ترقی کے بے شمار امکانات ہیں۔ ہمارے پاس انسانی اور قدرتی دونوں وسائل کافی مقدار میں دستیاب ہیں۔ اس کے علاوہ ہمارے پاس رہنمائی کے لئے بیش قیمت روحانی طاقت اور روایتی اقدار کی

★ ہندوستان کی آزادی کے موقع پر شری اروند کا آکاشوانی سے نشر کیا جانے والا پیغام کا مکمل متن ضمیمہ-1 میں ملاحظہ فرمائیں۔

وراثت ہے۔ میں نے سوامی جی سے بات چیت کی کہ ہم اپنی جدید سائنس اور ٹکنالوجی کی طاقت کے استعمال، وسائل کا مکمل استعمال اور اپنی وراثت کی رہنمائی سے کس طرح ایک صاف و شفاف ہندوستان، صحت مند ہندوستان، تعلیم یافتہ ہندستان، طاقت ور ہندوستان، ترقی یافتہ ہندوستان کی تعمیر کر سکتے ہیں۔

حقیقت میں ملک کی تعمیر کے لئے مکمل خود سپردگی اور ایمانداری کے جذبہ کو دکھانے کی ضرورت ہے، جو ہمارے آباء و اجداد نے ہندوستان کو آزاد کرانے میں کی تھی۔ یہاں مجھے سوامی وویکا نند کے الفاظ یاد آتے ہیں جو انہوں نے 1897 میں یوروپ اور امریکہ کے کامیاب دوروں کے بعد ہندوستان واپسی پر کہے تھے۔ اس دورے کے دوران انہوں نے 1893 میں شکاگو میں منعقد عالمی مذہب کانفرنس میں تاریخی تقریر کی تھی۔ سوامی جی مدراس آئے جہاں ان کا پرزور استقبال کیا گیا۔ اپنے پیغام میں انہوں نے کچھ مستقبل کے الفاظ کہے—

'آئندہ 50 سالوں کے لئے'... ہمارے دل سے سبھی ناکام دیوتاؤں کو نکل جانے دیں، صرف ایک ہی دیوتا 'ہندوستان' ہماری اپنی نسل میں موجود ہے۔ دیگر سبھی دیوتا سو رہے ہیں۔ ہم اپنے آس پاس دکھائی دینے والے 'عظیم' کو چھوڑ کر دیگر ناکام دیوتاؤں کے پیچھے کیوں بھاگیں؟... کیا ہم اس دیوتا کی پوجا نہ کریں جو ہمارے چاروں جانب ہے۔ عظیم ہے۔ سب سے پہلے ہمیں عظیم جو ہمارے چاروں جانب ہے، کی پوجا کرنی چاہئے۔ انسان اور جانور – یہ سبھی ہمارے دیوتا ہیں اور سب سے پہلے ہمیں جن دیوتاؤں کی پوجا کرنی چاہئے، وہ ہیں ہمارے اپنے ملک کے لوگ۔'

یہ جاننا دلچسپ ہوگا کہ سوامی وویکا نند نے یہ پیغام 1897 میں آئندہ 50 سال کے لئے دیا تھا۔ ٹھیک 50 سال کے بعد ہندوستان نے غلامی کی حکومت سے آزادی حاصل کر لی۔ کیا ہمیں اب بھی ان کے پیغام پر دھیان نہیں دینا چاہئے؟ فرق صرف اتنا ہو کہ اب اپنے یقین کے مطابق اپنے دیوتاؤں کی پوجا کرنے کے ساتھ ساتھ ہم سبھی کو اس عظیم ہندوستان کی بھی پوجا کرنی چاہئے۔ کیا اس عظمت میں ہمیں اس کے سبھی لوگوں، جانوروں، ندیوں، سمندروں، فضا میں بھگوان کی شکل نہیں دکھائی دیتے؟ کیا ہمیں ان کے افتخار اور عظمت کے لئے کام نہیں کرنا چاہئے؟ کیا ہمیں شری اروند، سوامی وویکا نند اور دیگر عظیم رہنماؤں کی تعلیم کے مطابق مستقبل کے ہندوستان کی تعمیر کے اپنے کام کو آگے نہیں بڑھانا چاہئے؟ میں اس پر یقین کرتا ہوں کہ یہ یقین تب اور بھی پکا ہو جاتا ہے جب میں رشی کیش جیسے مقدس تیرتھ پر آتا ہوں۔'

جب میں رشی کیش آیا اسی دن این ڈی اے نے مجھ پر یقین واعتماد کے ساتھ نئی ذمہ داری سونپی — آئندہ لوک سبھا انتخابات میں اتحاد کی قیادت کرنے کی ذمہ داری۔ میری پارٹی کے پارلیمانی بورڈ میں اسی طرح کا فیصلہ ایک ماہ قبل لیا گیا تھا۔ حقیقت میں یہ چیلنجوں سے بھری ذمہ داری ہے اور میں اسے کامیابی کے ساتھ ادا کرنے کی ہر ممکن کوشش کروں گا اور اس کے لئے میں اپنے سبھی ساتھیوں اور ملک کے لوگوں کی حمایت اور تعاون چاہوں گا، اور سب سے پہلے سب سے طاقت ور ایشور کی مہربانی، طاقت اور آشیرواد حاصل کرنا چاہوں گا۔ میری ہمیشہ کوشش ہوگی کہ این ڈی اے کی انتخابی مہم کی بنیاد ہیں، بہتر حکومت، ملک اور اس کے شہریوں، دونوں کے لئے ترقی اور تحفظ، اور اگر ہمیں عوامی رائے ملی تو یہی ہماری حکومت کے اہم مقاصد ہوں گے۔

میرا یقین ہے کہ ہندوستان بڑی امید کے ساتھ حکومت میں ایمانداری اور مستحکم قیادت کی تلاش کر رہا ہے، جو کوئی سمجھوتہ کئے بغیر ملک کی سالمیت، اکتا، سیکورٹی اور ترقی کے لئے سرگرم ہو۔ ہمارے ملک کے لوگ نئی دہلی میں اقتدار کے مراکز پر یعنی حکومت کی 'گنگوتری' سے آلودگی کا خاتمہ چاہتے ہیں تاکہ قومی زندگی کی باقی گنگا صاف اور زندگی دینے والی بن سکے۔ 'آلودگی' سے میرا مطلب صرف مالی بدعنوانی اور سیاسی انتظامیہ کے غلط استعمال سے نہیں ہے۔ بلاشبہ بدعنوانی، قومی سیکورٹی اور قومی ترقی کے ساتھ فریب کرنا ہے اور ہمارے ملک کے لوگ جو ہر سطح پر اس سے متاثر ہوتے ہیں اس کا خاتمہ چاہتے ہیں، لیکن یہ 'آلودگی' کئی دیگر خطرناک اشکال میں بھی موجود ہے — سیوڈو سیکولرازم میں، مائناریٹی ازم، ووٹ بینک کی سیاست، جرائم پیشہ سرگرمیاں، اداروں کی کمزوری اور ہماری قوم پرستی دیگر مقدس نشانیوں کی بے عزتی، اور یہ سب ہندوستان کو کمزور بناتا ہے۔

یہ سچائی بھی کم تشویشناک نہیں ہے کہ آزادی کے 60 سال بعد بھی ہماری آبادی کے اکثر حصے کو معاشی ترقی کا فائدہ نہیں مل پا رہا ہے، جب کہ دولت مند اور خصوصی مراعات یافتہ ایک چھوٹا طبقہ اس کا پورا پورا فائدہ اٹھا رہا ہے۔ دولت مند اور زیادہ دولت مند بنتے جا رہے ہیں اور غریب مزید غریب ہوتے جا رہے ہیں۔ لوگ ایسی حکومت چاہتے ہیں جو مختلف النوع سماج میں سب کا یکساں طور سے دھیان رکھے، خاص طور سے غریب اور پسماندہ طبقہ کا۔ وہ ایک ایسی قیادت چاہتے ہیں جو حقیقت میں جمہوریت کی عزت کرے اور مطلب پرست خیالات سے متاثر حملوں سے اس کے اداروں کو تحفظ دینے کے لئے تیار رہے۔

ان میں ہر امید جائز ہے اور ضروری بھی — یہ میرا یقین ہے کہ ہندوستان کے اسی سیاسی طبقہ کا مستقبل تابناک ہوگا جو بہتر حکومت، ترقی اور سیکورٹی کے لئے ذمہ دار بن کر لوگوں کے مطالبات کو پورا کرے گا۔

میری طویل سیاسی زندگی میں مجھے وقتاً فوقتاً جو بھی چھوٹی یا بڑی ذمہ داری سونپی گئی ہے اسے میں نے پوری ایمانداری اور فرض کے ساتھ ادا کیا ہے۔ عوامی زندگی میں حاصل ہونے والا اعتماد اسی کا نتیجہ ہے۔ مستقبل میں بھی قدرت مجھے جو بھی کام سونپے گی اسے میں انتہائی نیک نیتی سے کروں گا تاکہ ہندوستان زیادہ منظم، زیادہ مضبوط اور زیادہ عظیم بن سکے اور اس کا مستقبل آج سے بھی زیادہ تابناک ہو۔

—— لال کرشن آڈوانی

ضمیمہ-1

آزاد ہندوستان کا دنیا کو پیغام

مہا رشی اروند کا خطاب جسے 15/ اگست 1947 کو ہندوستان
کی یوم آزادی کے موقع پر، جو ان کی سالگرہ بھی ہے،
پر آکاشوانی کے ذریعہ نشر کیا گیا۔

15 راگست آزاد ہندوستان کی سالگرہ ہے۔ یہ دن ہندوستان کے لئے پرانے دور کا خاتمہ اور نئے دور کی شروعات کی نشاندہی کرتا ہے، لیکن اس کی اہمیت ہمارے لئے ہی نہیں بلکہ ایشیا پوری دنیا کے لئے بھی ہے، کیونکہ یہ ملکوں کی برادری میں ایک نئی طاقت کے داخل ہونے کی علامت ہے، جس میں غیر معمولی امکانات ہیں اور جسے انسانوں کے سیاسی، سماجی، ثقافتی اور روحانی مستقبل کے تعین میں ایک بڑا کردار ادا کرنا ہے۔ ذاتی طور سے میرے لئے خوشی کی بات ہے کہ اس دن نے، جو صرف میرے لئے ہی اہم تھا، کیونکہ یہ میری سالگرہ بھی ہے جسے زندگی سے متعلق میری تعلیمات کو ماننے والے لوگ ہر سال مناتے ہیں، اس نے وسیع معنی اور اہمیت حاصل کر لی ہے۔ میں اپنے جنم دن کو ہندوستانی یوم آزادی کے ساتھ اس طرح مدغم ہو جانے کو کوئی بھگوان یا اچانک ہو جانے والی بات نہیں مانتا بلکہ یہ مانتا ہوں کہ جس کام کو لے کر میں نے اپنی زندگی شروع کی تھی اسے میری رہنمائی کرنے والے بھگوان کی طاقت نے اپنی اجازت دے دی ہے اور اس پر مہر ثبت کر دی ہے۔ بلاشبہ آج کے دن میں ہمیشہ ان سبھی تحریکوں کا جنہیں میں نے اپنی زندگی میں ہی کامیاب ہوتے دیکھنے کی امید کی تھی لیکن جو اس وقت ناممکن خواب جیسے ہی دکھائی دیتے تھے، کامیابی کے قریب پہنچتے دیکھ سکتا ہوں یا پھر ان کی شروعات ہو گئی ہے اور وہ اپنی کامیابی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

اس عظیم موقع پر مجھ سے پیغام دینے کی درخواست کی گئی ہے۔ لیکن شاید میں پیغام دینے کی حالت میں نہیں ہوں۔ میں صرف اتنا کر سکتا ہوں کہ ان اہداف اور آئیڈیلزم کا ذاتی طور پر اعلان کر دوں جنہیں میں اپنے بچپن اور نوجوانی سے کرتا آیا ہوں اور جن کی کامیابی اب شروع ہوتے دیکھ رہا ہوں کیونکہ وہ ہندوستان کی آزادی سے متعلق ہے اور اس کام کے حصہ ہیں جسے میں ہندوستان کا کام مانتا ہوں اور جس میں وہ اہم مقام لئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ حقیقتاً میرا ہمیشہ سے یہ بھروسہ رہا ہے، اور میں نے ہمیشہ یہ کہا بھی ہے کہ ہندوستان صرف اپنے مفادات کی ترقی، توسیع، عظمت، طاقت حاصل کرنے کے لئے نہیں اٹھ رہا ہے، اگر چہ اس کی بھی امید نہیں کرنی چاہئے اور یقینی طور پر وہ دوسروں کی طرف دیگر

ملکوں پر قبضہ کرنے کے لئے بھی نہیں اٹھ رہا ہے، بلکہ وہ اٹھ رہا ہے ساری انسانیت کے معاون اور لیڈر کی شکل میں، پرمیشور اور دنیا کے مفاد کے لئے۔ وہ ہدف اور آدرش اپنے فطری سلسلے میں یہ تھے: ایک انقلاب جو ہندوستان کو آزادی اور اتحاد میں پروئے، ایشیا کی تعمیر نو اور آزادی واس کے عظیم کردار کو پھر سے حاصل کرنا، جو اس نے انسانی تہذیب کی ترقی میں ادا کی تھی، انسانیت کے لئے ایک نئے، زیادہ عظیم، تابناک اور اعلیٰ زندگی کا طلوع، جو اپنے مکمل کردار کے لئے بیرونی طور پر ملکوں کے علیحدہ اقتدار کی بین الاقوامی اکائی کے طور پر ہوگا، ان کی ملکی زندگی کو محفوظ اور مستحکم کرے گا، لیکن انہیں ایک دوسرے کے قریب لاکر سب کو حیرت زدہ کرنے والی ایکتا کی شکل دے دے گا۔ ہندوستان کے ذریعہ اپنی روحانی تعلیم کا اور زندگی کو روحانی بنانے کے وسائل کا ساری انسانیت کو ہدیہ دے گا اور آخر میں ترقی میں ایک نیا قدم اٹھائے گا جو بیداری کے اعلیٰ معیار پر اٹھا کر زندگی کی ان متعدد مشکلات کا حل کرنا شروع کردے گا، جنہوں نے انسان کو تب ہی سے حیران و پریشان کررکھا ہے جب سے انسانوں نے انفرادی تکمیل اور مکمل سماج کے موضوع پر سوچنا اور خواب دیکھنا شروع کیا تھا۔

ہندوستان آزاد ہوگیا ہے لیکن اس نے ایکتا حاصل نہیں کی۔ اس نے صرف ٹوٹی پھوٹی آزادی حاصل کی ہے۔ کبھی وقت تھا کہ ایسا دکھائی دیتا تھا کہ جیسے وہ شاید پھر سے الگ الگ ریاستوں کی اس غیر منظم حالت میں جاگرے گا جو برطانوی سامراج سے پہلے موجود تھی۔ خوش قسمتی سے اب ایسے امکانات پیدا ہوگئے ہیں کہ اس طرح کے بحرانی حالت کو ٹال دیا جائے گا۔ آئین ساز کمیٹی کی دانشورانہ جارح پالیسی نے اس بات کو ممکن بنا دیا ہے کہ دلت طبقات کا مسئلہ بغیر کسی پریشانی کے حل ہوجائے گا، لیکن ہندوؤں اور مسلمانوں کا پرانا فرقہ وارانہ مسئلہ ملک کی کل وقتی سیاسی تقسیم کی شکل میں مضبوط ہوتا نظر آرہا ہے۔ یہ امید کرنی چاہئے کہ کانگریس اور ملک طے کی گئی اس تقسیم کو ہمیشہ کے لئے فیصلہ کن نہیں مان لیں گے، وہ اسے ایک کام چلاؤ جز وقتی تدبر سے زیادہ کچھ نہ سمجھیں گے۔ کیونکہ اگر یہ برقرار رہا تو ہندوستان بھیانک شکل میں کمزور اور لاچار تک ہو سکتا ہے، خانگی مناقشہ کا ہونا سوا ہی بنا رہ سکتا ہے، نئے حملے اور غیر ملکی ریاست کا ہو جانا تک ممکن ہو سکتا ہے۔ ملک کی تقسیم کو مٹانا ہی ہوگا، ہم امید کریں کہ کشیدگی کم ہونے سے امن اور میل ملاپ کی ضرورت کو آہستہ آہستہ زیادہ سمجھ جانے سے اور مشترکہ کام اور یہاں تک کہ اس کے استعمال کے لئے کسی وسائل کی بھی مسلسل ضرورت محسوس کرنے سے یہ تقسیم دور ہو جائے گی۔ اس طرح ایکتا چاہے کسی بھی شکل میں آسکتی ہے اس کے ٹھیک طور سے بھلے ہی رسمی اہمیت کا حامل ہو، کوئی بنیادی اہمیت نہیں ہے لیکن چاہے کسی بھی تدبیر سے ہو تقسیم کو مٹانا ہی ہوگا اور وہ مٹ کر رہے گی۔ کیونکہ ایسا کئے بغیر ہندوستان کا مستقبل بھیانک طور سے سطحی، یہاں تک کہ ناکام بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن ایسا بالکل نہیں ہوگا۔

ایشیا بیدار ہوگیا ہے اور اس کے بڑے بڑے حصے آزاد ہوگئے ہیں یا اس وقت آزاد ہو رہے ہیں، اس کے دوسرے حصے جو ابھی غلامی کی حالت میں ہیں، کیسے بھی جدوجہد میں کیوں نہ ہوں آزادی کی جانب بڑھ رہے ہیں۔ صرف تھوڑا ہی کرنا باقی ہے اور وہ آج نہ صحیح کل پورا ہو جائے گا۔ اس میں ہندوستان کو اپنا کردار ادا کرنا ہے اور اس نے بہتر صلاحیت کے ساتھ کرنا شرع کر دیا ہے جو ابھی سے اس کے امکانات کی مقدار اور اس کے مقام کی نشاندہی کرتا ہے، جس سے وہ قوموں کے جلسے میں جذب کر سکتا ہے۔

انسانیت کی اکائی ترقی کی راہ پر ہے، چاہے ابھی نامکمل شروعات کی شکل میں ہی وہ منظم کی جا چکی ہے لیکن وہ بڑی زبردست پریشانیوں کے خلاف جدوجہد کر رہا ہے۔ لیکن اس میں طاقت ہے اور اگر تاریخ کے تجربہ کو رہنمائی مانا جا سکے تو وہ یقینی طور سے بڑھتا چلا جائے گا اور آخر میں کامیاب ہوگا۔ اس کام میں بھی ہندوستان نے خاص طور سے شرکت کرنا شروع کر دیا ہے اور اگر وہ اس عظیم سیاست کو توسیع دے سکے جو حالیہ واقعات اور فوری امکانات تک ہی محدود نہیں ہوتی بلکہ مستقبل میں جھانک کر اسے دیکھ لیتا ہے اور نزدیک لے آتا ہے، تو اس علاقہ میں ہندوستان

کی موجودگی یہ دکھا سکتی ہے کہ تھوڑی ترقی اور تیز وحوصلہ مندانہ ترقی میں کتنا زیادہ فرق ہے۔ جو کام کیا جارہا ہے اس میں عظیم آفات آسکتی ہیں اور وہ اس میں رخنہ یا اسے برباد کرسکتی ہیں، لیکن پھر بھی آخری نتائج یقینی ہیں، کیونکہ جا ہے جو ہو اتحاد کی ترقی کے سلسلے میں ایک ضروری عمل ہے، لازمی رفتار ہے اور اس کی کامیابی کی محفوظ طریقہ سے پیشین گوئی کی جاسکتی ہے۔ ملکوں کے لئے بھی اس کی ضرورت واضح ہے، کیونکہ اس کے بغیر چھوٹے چھوٹے ملکوں کی آزادی مستقبل میں کبھی بھی محفوظ نہیں رہ سکتی اور بڑے طاقت ور ملک بھی حقیقت میں محفوظ اور مطمئن نہیں رہ سکتے۔ خود ہندوستان بھی اگر منقسم رہا تو اپنی سیکورٹی کے بارے میں یقینی طور سے مطمئن نہیں رہے گا، اس لئے اتحاد ثابت کرنا سب کے مفاد کی بات ہے۔ صرف انسانی خود غرضی، بیوقوفی ہی اسے روک سکتی ہے۔ اس کے خلاف تو کہا گیا ہے کہ دیوتاؤں کی کوشش بھی بیکار ہو جاتی ہے لیکن یہ بھی فطرت کی ضرورت اور بھگوان کی خواہش کے خلاف ہمیشہ نہیں ٹھہر سکتی۔ اتحاد ہو جانے پر قوم پرستی مکمل طور سے ثابت ہو جائے گی، تب عالمی جذبات اور نظریہ بھی یقینی طور سے فروغ پائے گی اور بین الاقوامی اصول اور ادارے بھی۔ یہاں تک کہ یہ بھی ممکن ہے کہ تبدیلی کے عمل میں ایسی ترقی بھی دکھائی دے، جیسے کہ دو یا کئی ممالک کا ایک ساتھ شہری ہونا، ثقافتوں کا خود بخود گھل مل جانا وغیرہ اور قومیت کے جذبات اپنی جنگی عادت چھوڑ کر ان چیزوں کو اپنے نظریے کی سالمیت کے ساتھ مکمل ساتھ محسوس کرے۔ ایکتا کا ایک نیا جذبہ انسانیت کو اپنے اختیار میں کرلے گا۔

دنیا کو ہندوستان کا روحانی ہدیہ دینے کا دور شروع ہو چکا ہے۔ ہندوستان کی روحانیت یوروپ اور امریکہ میں مسلسل بڑی تعداد میں داخل ہورہی ہے۔ یہ تحریک بڑھے گی۔ حال کے دور کی آفات کے درمیان لوگوں کی آنکھیں امید کے ساتھ ہندوستان کی جانب دیکھ رہی ہے اور نہ صرف اس کی تعلیم کا بلکہ اس کی اندرونی اور روحانی عمل کا بھی زیادہ سے زیادہ سہارا لیا جارہا ہے۔

باقی تو ابھی ایک ذاتی امید ہے، ایک نظریہ اور آدرش ہے، جس نے ہندوستان اور مغرب میں دونوں جگہ دور اندیش دانشوروں کو اپنے بس میں کرنا شروع کردیا ہے۔ اس راہ کی پریشانیاں کوشش کے کسی بھی دوسرے شعبہ کے بہ نسبت بہت زبردست ہیں، لیکن پریشانیاں جیتی جانے کے لئے ہی آتی تھیں اور اگر 'سب سے طاقت ور خواہش' کا وجود ہے تو وہ ضرور ہی ناکام ہوں گی۔ یہاں بھی اگر اس ترقی کو ہونا ہے تو یہ داخلی بیداری میں اضافہ کے ساتھ ہی ہوگی اور اس کی شروعات ہندوستان ہی کرسکتا ہے اور اگر چہ اس کا علاقہ عالم گیر ہوگا، پھر بھی مرکزی تحریک ہندوستان ہی کرسکتا ہے۔

یہ ہیں وہ جذبات جنہیں میں ہندوستانی آزادی کی اس تاریخ کے ساتھ جوڑتا ہوں۔ کیا یہ واقعات مکمل ہوں گے یا کہاں تک، یا کتنی جلد۔ یہ بات اس نئے اور آزاد ہندوستان پر منحصر کرتی ہے۔

ضمیمہ-2

سوامی وویکانند اور ہندوستان کا مستقبل

سوامی رنگ ناتھ آنند★

15 راگست 1947 کا جہاں تک ہندوستان سے تعلق ہے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایک دور کا خاتمہ اور دوسرے کی شروعات کی نشان دہی کرتا ہے۔ 1757 میں پلاسی سے شروع ہوئی غیر ملکی بالادستی پورے 190 سال کے بعد آج ختم ہوئی ہے۔ ہندوستان کی سیاسی غلامی کا یہ دور ہندوستان کی طویل تاریخ کے پس منظر میں ایک چھوٹا سا وقفہ تھا۔ ہماری تاریخ میں اس وقفے کی حقیقی اہمیت کا تجزیہ تبھی کیا جا سکتا ہے جب ہم اس سے کچھ وقت دور ہوں۔ تمام واقعات پر مختصراً غور کیا جانا ممکن ہے۔ یہ کسی کے لئے بھی مشکل ہے، لیکن اس میں عظیم مفکر رہتے ہوئے بھی واقعات کو غیر جانبدارانہ طریقہ سے دیکھا گیا، اس لئے ایسے کسی واقعہ کو بھی ان مفکروں کے لئے ایک عام شخص کے بہ نسبت الگ معنی دیا گیا ہے۔

سیاسی آزادی بنام سیاسی غلامی

ایک عام آدمی کے لئے سیاسی غلامی کا کوئی مطلب نہیں ہے۔ اگر وہ اس کی یومیہ زندگی کے چھوٹے سے حصے کو متاثر نہیں کرتی ہے، لیکن یہ اس وقت زخم بن جاتا ہے جب وہی شخص سیاسی نظریہ سے محتاط ہو جاتا ہے جب اس کی پابندی نئی حاصل کی گئی آزادی اور وقار کے اصولوں میں دخل اندازی کرتے ہیں۔ ان اصولوں کے عروج میں وہ ایک سیاسی اکائی بن جاتا ہے، ایک ایسا جاندار جو محض مادی و جسمانی تحفظ سے زیادہ آزادی کو اہمیت دیتا ہے، اس سے ایک شخص کی زندگی میں روحانی اور اخلاقی اقدار طلوع ہوتی ہیں اور ایک جزوقتی، اخلاقی اور روحانی شخصیت نمودار ہوتی ہے۔ اسی جزوقتی ترقی سے بعد کی زندگی میں سیاسی تعلیم کے توسط سے اور آزادی کے سفر کے ذریعہ سے ایک سماجی شہری تیار ہوتا ہے۔ اس شہری کی ترقی کے ساتھ سیاست کا خاتمہ ہوتا ہے، کیونکہ یہ اعلیٰ سماجی اقدار بھی ہے۔

★ جب 2005 میں 97 سال کی عمر میں سوامی رنگ ناتھ آنند جی کا انتقال ہوا تب وہ رام کرشن مٹھ اور مشن کے چیئرمین تھے۔ وہ کراچی میں 6 سال (1942-48) تک رام کرشن مشن کے سربراہ رہے۔ یہی وہ وقت تھا جب نوجوان آڈوانی ان کی قربت میں آئے۔ اس کے بعد تقسیم کے دوران ہونے والے فسادات کی وجہ سے انہیں مٹھ بند کرنا پڑا۔ یہ مضمون سوامی جی نے 15 راگست 1947 کو کراچی میں لکھا تھا۔

جدید چیلنجوں کے سامنے ہندوستان کا طلوع

19 ویں صدی کے پرامن دور کے بعد سیاسی پیچیدگیوں کو اس ملک کے ہندو اور مسلمانوں نے عام طور پر اپنا لیا تھا۔ اس کے سامنے جسمانی اور مادی تحفظ کا سوال تھا۔ غلامی، صدیوں کی غیر استقامت سے بچنے کا ایک ذریعہ بن گئی، لیکن یہ پہلا مرحلہ تھا صرف مختصر سا۔ سیاسی غلامی اس وقت چیلنج بن جاتی ہے جب ثقافتی وراثت کو برباد کرنے اور ایک شخص کے کام کرنے پر قدغن لگائے جانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جس سماج کے پاس اس چیلنج کا سامنا کرنے کی اہلیت ہوتی ہے وہ سماج ترقی کرتا ہے اور جس کے پاس یہ اہلیت نہیں ہے وہ معدوم ہو جاتا ہے اور گم ہو کر رہ جاتا ہے۔ بھلے ہی اس کے ممبران نئے جسم اور نئی روح میں جینا شروع کریں۔ دنیا کی تاریخ اس طرح سے گم ہونے والے سماجوں کی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ ہندوستان کو ثقافت کے ساتھ ساتھ سیاسی اور سماجی دونوں مورچوں پر چیلنج کا سامنا ہوا۔ ہندوستان نے پہلے ثقافتی، سیاسی و سماجی چیلنجوں کا سامنا کیا۔ وسیع تر پیمانے پر کہا جائے تو 19 ویں صدی کے دوسرے نصف میں پہلے چیلنج کا، جب کہ آج تک کی 20 ویں صدی میں دوسرے چیلنج کا سامنا کرنا پڑا۔ اس طرح ہندوستان کے لوگوں نے دونوں کا سامنا کرتے ہوئے زبردست اہلیت دکھائی۔ اس دوہرے عمل کی دلچسپ داستان میں اور اس کے ذریعہ حیرت انگیز کامیابی کو اس نے تھوڑے عرصہ میں حاصل کر لینے میں حال کی ہندوستانی تاریخ کی رومانیت اور وسیع تر پیمانے پر دنیا کے لئے اس کی اہمیت مضمر ہے۔

ہندوستان کو مغرب سے سے ثقافتی چیلنج کا سامنا کرنے میں ایک اہم پہلو پر دھیان دینا ضروری ہے، کیونکہ اس میں کئی متحرک احساسات کا معیار شامل ہے، جس نے دوسرے چیلنج - سیاسی آزادی کی لڑائی کا سامنا کرنے میں ہندوستان کو تقویت بخشی اور اسی خوبی کو ہندوستان اپنے داخلی اور خارجی تعلقات میں بھی مفید استعمال کر سکتا ہے۔ ہندوستان کی ایسی خصوصیت برقرار رہے—— آزادی کی بیداری اور حس کا معیار—— سب کو شامل کرنا اور کسی کا بائیکاٹ نہ کرنا۔ ابتدائی مرحلوں میں ہندوستان کا ردعمل غیر ملکی عادتوں کے بارے میں منفی بھلے ہی رہا ہو گا، لیکن بعد میں وہ مثبت بن گیا۔ خود اعتمادی اور یقین میں بتدریج اضافہ ہوتا گیا۔ جیسے جیسے ہندوستان سبھی انسانی خیالات اور اقدار کو، خواہ وہ مشرق کے ہوں یا مغرب کے۔ خواہ سائنسی ہوں یا مذہبی، سیاسی ہوں یا سماجی، خود میں ضم کرتا گیا۔

سوامی وویکانند اور جدید ہندوستانی نو بیداری

سوامی وویکانند ہماری ثقافتی تحریک کے اس دور کے سب سے اثر دار نمائندہ کی شکل میں سامنے آئے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے انگریزی رابطہ کو ایک اہم آلہ کار بنایا جو ہمارے غیر متحرک سماج اور تہذیب کو توسیع دے سکتا تھا۔ ان کی شخصیت میں ماضی اور مستقبل، قدیم دانشوری اور جدید علم موجود تھے۔ وہ ہمارے فخریہ ماضی کو بخوبی جانتے تھے، ساتھ ہی ساتھ وہ ہمارے حال کو گہرائی سے محسوس کر رہے تھے۔ وہ ایک صاف ستھرے ہندو تھے، لیکن وہ دیگر مذاہب کا بھی احترام کرتے تھے۔ وہ اسلام اور عیسائیت کے سماجی اور روحانی اصولوں کے عاشق تھے اور ہندوستانی زندگی و خیالات میں ان اصولوں کی اہمیت کو اچھی طرح محسوس کرتے تھے۔ ان سب کے برعکس وہ سائنسی، سیاسی اور سماجی شعبوں میں جدید خیالات کی مدد سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ آخر میں وہ جدید دور میں انسانی تعلقات کے بین الاقوامی تصور کے بارے میں پوری طرح بیدار تھے۔ ان کا کردار ردعمل ظاہر کرنے والی قوم پرستی نہیں تھی جو اپنے ملک کے دوسرے لوگوں کے رابطہ کے اثر سے دور لے جانا چاہتی ہے یا جو

اپنی قومیت کے رتھ کو دیگر ملکوں کی آزادی کے اوپر چلانا چاہتا ہے۔ وہ ہندوستان سے محبت کرتے تھے لیکن وہ انسانیت سے بھی اتنا ہی پیار کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے ایک مکتوب میں اس بات کا ذکر کیا ہے کہ وہ انسانی افتخار کی اتنی زیادہ عزت کرتے تھے کہ اسے محدود داخلی دیواروں کے اندر تقسیم نہ کیا جا سکے۔ (کمپلیٹ ورکس، جلد 8، شمارہ 3، صفحہ 349)

'ہمارے لئے ہندوستان یا انگلینڈ یا امریکہ کیا ہے؟ ہم اس ایشور کے خدمت گزار ہیں جنہیں لاعلم انسان کہتے ہیں۔ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ جو ان سے زیادہ لاعلم ہیں وہ اس انسانی شکل کے ایشور کو ہندو، مسلم، عیسائی، روسی، امریکی وغیرہ کہتے ہیں۔'

جواہر لال نہرو نے سوامی وویکانند کی شخصیت کے اس پہلو کی ستائش کی ہے۔ (دی ڈسکوری آف انڈیا، صفحہ 400)—

'ہندوستان کے ماضی سے جڑے اور ہندوستان کی وراثت پر بری طرح سے فخر کرنے والے وویکانند کی زندگی کے مسائل کو حل کرنے کی خصلت جدید تھی۔ وہ حقیقت میں ہندوستان کے ماضی و حال کے درمیان ایک پل کی طرح تھے۔'

نہرو جو خود ایک بین الاقوامی شخصیت تھے، نے سوامی وویکانند کے ذریعہ 1897 میں کی گئی تقریر پر قائم رہتے ہوئے ان کے تئیں گہری عقیدت کا اظہار کیا، جس میں انسانیت کے اتحاد کی گونج ہے۔ (دی ڈسکوری آف انڈیا، صفحہ 402-401)—

'سیاسی اور سماجی سائنس میں بھی جو مصائب 20 سال قبل صرف ملکی تھے انہیں آج صرف ملکی سطح پر حل نہیں کیا جا سکتا۔ اس نے بھیانک شکل اختیار کر لی ہے۔ انہیں صرف تب ہی حل کیا جا سکتا ہے جب انہیں بین الاقوامی بنیاد پر اونچے نظریہ سے دیکھا جائے۔ ایسا نظریہ جو عالمی اتحاد کی شناخت دے سکے۔ بین الاقوامی تنظیم، بین الاقوامی گروپ، بین الاقوامی قانون آج کے وقت کی مانگ ہے۔ دنیا کو ساتھ لئے بغیر ترقی نہیں کی جا سکتی اور یہ آئندہ اور بھی واضح ہوتا جا رہا ہے کہ کسی بھی مسئلے کا حل نسلی یا قومی یا منفی بنیاد پر نہیں ہو سکتا۔ ہر سوچ کو اس حد تک لے جانا ہوگا جب تک وہ پوری دنیا کو قبول نہ کر لے۔ اس خواہش کو تب تک بڑھانا ہوگا جب تک یہ پوری انسانیت کو نہیں، پوری زندگی کو خود میں شامل نہ کر لے۔'

ہندوستان کے ماضی قریب پر اس پیمانہ کو نافذ کرتے ہوئے اور اپنے ملک کے لوگوں، ہندو اور مسلم دونوں کو انتباہ دیتے ہوئے سوامی وویکانند نے کہا (دی ڈسکوری آف انڈیا، صفحہ 402)—

'میں اس بات سے پوری طرح متفق ہوں کہ کوئی بھی شخص یا ملک دوسرے فرقہ سے خود کو الگ رکھ کر زندہ نہیں رہ سکتا اور جب کبھی بھی اس طرح کی کوشش انسانیت، حکمت عملی یا تقدس کے جھوٹے نظریہ کے ساتھ کی گئی ہے، اس کا نتیجہ ہمیشہ منفی رہا ہے۔ ہماری دنیا کے دیگر ممالک سے الگ رہنے کی یہی وجہ ہے اور اس کا علاج ہے- دنیا کے دھارے میں دوبارہ لوٹنا۔ رفتار زندگی کی شناخت ہے۔'

مندرجہ بالا خیالات 50 سال پہلے کے ہیں۔ اس میں آج بھی تازگی اور جوش ہے۔ سوامی وویکانند کے وقت میں ہندوستان عالمی معاملوں میں فعال عنصر نہیں تھا۔ اس کا فخریہ ماضی کچھ مغربی مفکروں کے لئے ہمدردی کے جذبات اور مطالعہ کا موضوع تھا، لیکن عام طور پر دنیا کو اس کی بربادی پر ترس آتا تھا۔ اس کے اپنے بچوں کو بھی اور بوڑھی ماں کی وجہ سے افسوس ہونے لگا تھا۔

لیکن یہ سب بہت تیزی سے بدل گیا۔ تاہم اس وقت شکست کا غم اور غلامی کی شرم ایک ایسا چیلنج تھا جس نے ان کے اندر کی آگ کو بجھانے کی جگہ پر، جیسے کئی دیگر ممالک کے معاملے میں ہوا اور جیسے اس کے کچھ اپنوں نے بھی اندازہ لگایا تھا، مزید بھڑکایا۔ اس نے خیالوں اور سرگرمیوں میں نئی سوچ کو جنم دیا جو ملک کو سنوارنے کی شروعات بن گئی۔ یہ بیداری ایک ردعمل تھا، پہلے خود احتسابی کی اس کے بعد اظہار رائے کی۔

کہا جاسکتا ہے کہ خود کو تلاشنے کا یہ عمل ہندوستان میں آج - 15 راگست 1947 کو-مکمل سیاسی آزادی کے حصول کے ساتھ کی ہے، شروع ہوگیا۔اس سے پیدا ہوئی توانائی اب مزید بہتر طریقہ سے خود اعتمادی کے عمل کو آگے بڑھائے گی۔

وویکانند کی 'گھریلو پالیسی'

وویکانند انفرادی طور پر ہندوستان کو دنیا کی ثقافت کی دھارا میں لے گئے۔اب وویکانند کے خیال کی شکل میں ہندوستان کو ایک منظم سماج بنانے کے بعد ملک عالمی برادری میں رہنمائی فراہم کرسکتا ہے۔وویکانند کے تصور میں ہندوستان میں وہ ضروریات تاریخی حیثیت سے حاصل تھی جو اسے عالمی گروپ کے ایک اخلاقی لیڈر کی شکل میں متحرک عمل دخل کا دیتی ہیں۔دنیا کے نئے پس منظر میں بھی ملکوں کی توانائی کو ہدایت دینے کے لئے ایک مضبوط اخلاقی رہنمائی کی ضرورت ہے،لیکن وویکانند اس خیال کے تھے کہ ہندوستان خود میں کچھ خصوصی تبدیلی کئے بغیر یہ کردار ادا کرسکتا ہے اور پوری صلاحیت سے اپنا فرض ادا کرسکتا ہے۔یہیں پر اس بات کی ضرورت پڑی جسے انہوں نے 'گھریلو پالیسی' کا نام دیا اور اس کے صحیح عمل درآمد سے ہی ہندوستان اپنی 'خارجہ پالیسی' کی شکل میں دنیا میں اخلاقی قیادت کی ذمہ داری ادا کرسکتا ہے۔

سیاسی آزادی، معاشی ترقی اور سماجی ایکتا - عالمی تناظر میں ہندوستان کے تعاون کی تین شرائط ہیں۔آج پہلی شرط کے پورا ہونے کے بعد دوسری اور تیسری شرطوں کو حل کرنا باقی ہے۔وویکانند پہلے شخص تھے جنہوں نے بتایا کہ ہمارے لوگوں کی معاشی پسماندگی اور سماجی تقسیم نے روحانی اور اخلاقی شخصیت کو کتنا نقصان پہنچایا ہے۔غریبی ان کے لئے غیر روحانی اور غیر اخلاقی تھی۔ان کے مطابق مذہب بھوکے پیٹ کے لئے نہیں ہے۔سماجی غیر یکسانیت اور چھوا چھوت کا نظریہ ہندوستانی سماج کی برائیاں ہیں۔پورے ہندوستان کے دورے کے دوران وہ ہندوستان کے دبلے جسم و جان اور کمزور دل کے ساتھ قریبی رابطے میں آئے، اتنے ہی قریب جتنے وہ اپنے گروشری رام کرشن کے رابطے کے ذریعہ سے ہندوستان کی انمٹ روح کے رابطے میں آئے تھے اور ادب و تاریخ کے مطالعہ سے انہوں نے پایا کہ آدرش اور حقائق میں بہت زیادہ فرق ہے۔انہوں نے حقائق کو تقریباً آدرش بنانے میں اپنی پوری طاقت لگادی۔انہوں نے جدید ہندوستان کے مسائل کی نشاندہی کرنے اور انہیں دور کرنے کے لئے بہت زیادہ افسوس و ناراضگی سے روبرو ہوتے ہوئے محنت کی۔اپنے ملک کے لوگوں کو اپنا جوش و اپنی مضبوطی دیتے ہوئے وہ خود زندگی کے عروج پر پہنچ گئے۔آج ہندوستان پر یقینی طور سے وویکانند کے ذہن دل اور استقامت کی چھاپ ہے۔بھگنی نویدِتا جو مغرب کے شاگردوں میں سے سب سے بہترین تھی، کے مطابق (داماسٹر ایج آئی سا ہم، صفحہ 50-49)—

> 'سوامی جی کی فطرت میں ایک چیز گہرائی سے جڑی ہوئی تھی کہ اس پر وہ کبھی بھی سمجھوتہ نہیں کرتے تھے۔یہ تھا ان کا اپنے ملک کے لئے پیار اور اس کے درد کے تئیں ناراضگی۔ان سبھی برسوں کے دوران جس میں میں نے انہیں تقریباً روز دیکھا، ہندوستان کا خیال ان کے لئے سانس لینے والی ہوا کے برابر تھا۔یہ سچ ہے کہ وہ ہمیشہ عالمی نظریہ سے کام کرتے تھے۔انہوں نے کبھی محدود معنی میں 'قومیت' لفظ کا استعمال نہیں کیا اور نہ ہی 'قوم کی تعمیر' کے دور کا دعویٰ کیا۔انہوں نے کہا 'انسانی تعمیر' میرا کام ہے، لیکن وہ ایک پیدائشی عاشق تھے اور ان کا مادر وطن ہی ان کی محبت - ماں بھارتی کے لئے تھا۔ایک نازک گھنٹی کے برابر جس پر پڑنے والی ہر چوٹ سے ترنگ اور کپکپی پیدا ہوتی ہے۔ان کا دل ہمیشہ مادر وطن کے لئے دھڑکتا تھا۔ہندوستان کی دھرتی پر ایسا کسی کا دل نہیں تھا جس کی وجہ سے ان کے دل سے کبھی بھی سسکی کی آواز نہیں اٹھتی تھی۔ہندوستان میں کوئی بھی خوف سے چلاتا ہو، کمزوری سے ٹوٹتا ہو یا خود سے ناراض ہو تو اس کی

گونج سوامی جی میں ہوتی تھی۔ وہ ان کے گناہوں کے تئیں سخت تھے۔ دنیا کی ذکاوت کی کمی کو انہوں نے کبھی معاف نہیں کیا لیکن صرف اس لئے کیونکہ انہیں لگتا تھا کہ یہ خامیاں ان کی اپنے لئے ہیں اور اس کے برعکس ہندوستان کی عظمت میں ان کا یقین بھی بے مثال تھا۔

آزاد ہندوستان میں جمہوریت

آج جب ہمارا ملک اپنے غیر ملکی حکمرانوں سے آزادی کے دن کی تقریب منا رہا ہے تب ہمیں سوامی وویکانند اور ہمارے ملک کے مستقبل کے بارے میں ان کی سوچ کو یاد کرنا چاہئے۔ ان کا ماننا تھا کہ ہماری ذکاوت انتہائی ترقی یافتہ ہے۔ اس میں ہندو، مسلم اور دیگر عناصر شامل ہیں۔ وہ یہ بھی مانتے تھے کہ ہندو اور مسلمانوں میں کچھ ایسی چیزیں ہیں جو انہیں ایک دوسرے سے سیکھنی چاہئے۔ یہ نہ صرف انہیں بہتر ہندو یا بہتر مسلمان بنائے گا بلکہ انہیں بہتر انسان بھی بنائے گا۔ چونکہ انسان کی تعمیر ان کا مذہب تھا۔ انہوں نے اپنے ملک کے لوگوں کو پیغام دیا کہ وہ محدود محبت و نفرت کو چھوڑ کر مکمل طور سے ترقی حاصل کریں جو کہ کردار کی علامت ہے۔ اسی طرح سے انہوں نے ہندوؤں کو پیغام دیا کہ وہ اپنے رسم و رواج کو چھوڑ کر اسے ترقی دیں جو انسان میں دیوی کی شکل میں موجود ہے۔ انہوں نے جمہوریت کے جدید اصول کو جس میں آزادی، برابری اور اظہار رائے کا تقدس شامل ہے، کو اس لئے حمایت دی کیونکہ انہیں لگتا تھا کہ انسانی تعمیر کے مذہب میں جمہوریت بہت مددگار ہوگی۔

جمہوریت میں تقسیم کا سانحہ

جمہوریت کی طاقت اس کے شہریوں میں مضمر ہے۔ ہندوستان میں جمہوریت ہندو، مسلمانوں، عیسائیوں، سکھوں، پارسیوں اور دیگر کو ایسے شہریوں میں بدلنا چاہتی ہے جو کچھ بنیادی اقدار کے تئیں ایمانداری برتیں، جو عالمی انسانی فعل ہیں۔ یہ عظیم عمل دنیا کے عظیم مذاہب سے کافی مقدار میں تحریک حاصل کرنے والا ہے۔ حقیقت میں سیاسی جمہوریت اور معاشی جمہوریت مذہب سے حاصل ہونے والی تحریک اور رہنمائی کے بغیر زیادہ دور نہیں چل سکتے - اور وہ غلط راہ پر ہی جا سکتے ہیں۔ لیکن یہ تحریک مذہب کی ہٹ دھرمیوں اور اصول سے نہ لے کر مختلف فرقہ کی اندرونی سچائیوں سے لینی چاہئے۔ جمہوریت کو اونچا اٹھا کر اسے اخلاقی اور روحانی اقدار دینے کا آزاد ہندوستان شدت سے انتظار کر رہا ہے۔

اس وقت کے ہندوستان کے بارے میں مندرجہ بالا تبصرہ تھوڑا عجیب، زیادہ بے باک لگ سکتا ہے۔ ہماری آزادی ہمیں غم کے ساتھ نصیب ہوئی۔ آج جو آواز ہماری آزادی کا اعلان کرے گا۔ وہی آواز ہماری دو سیاسی یونٹوں کے تقسیم کا بھی اعلان کرے گا۔ تقسیم جتنا زیادہ غم ناک ہے اسے ہمیں یہ مان کر اور زیادہ غم ناک نہیں بنانا چاہئے کہ یہ سیاسی وانتظامی تقسیم کے لئے بھی کچھ ہے۔ دنیاوی نظریے سے تقسیم ثقافتی و مذہبی کی گئی گنتی ہے، لیکن اگر قریب سے دیکھیں تو یہ محض سیاسی تقسیم نظر آتی ہے، جو محض سیاسی افکار پر منحصر ہے، لیکن جسے ثقافت اور مذہب کا تمغہ لگا کر کی گئی ہے، اس نے یقینی طور سے مذہبی اور فرقہ وارانہ جذبات بھڑکائے۔ اس نے اپنے پیچھے انسانی بربادی اور املاک کی تباہی کے نشان چھوڑے ہیں۔

ایک دن سماجی طاقتیں اس تقسیم کو مٹائیں گی

لیکن ان سب سے یہ ثابت نہیں ہوا کہ اسلامی ثقافت اور مذہب کو ایک الگ خود مختار ریاست میں ہندو دھرم اور ثقافت کے رابطۂ ترقی سے محفوظ رکھا جانا چاہئے، بلکہ اس سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ مسلم دانشور طبقہ نے یہ سوچنا شروع کیا کہ انہیں اپنے سیاسی اور معاشی وجود کا اظہار کرنے کے لئے ایک الگ ریاست کی ضرورت ہے۔ جب تقسیم اس خواہش کی تکمیل کرے گی تب یہ یقینی ہے کہ بنیادی خواہش کے سامنے وہ خود ختم ہو جائے گی۔ یہاں کے لوگ ایک ہیں، خواہ وہ ایک خود مختاری کے ماتحت ہیں یا دو کے، اس لئے ہمیشہ ایک وسیع ہندوستان رہے گا جو ہندوستان اور پاکستان کی ریاستوں سے بالا ہوگا۔ یہ یقینی ہے کہ منقسم ہندوستان کے دو حصوں کے سماجی آئین اور سیاسی ریاست پر اثر ڈالے گا۔

ہندوستانی آبادی کی سماجی تشکیل یقینی طور سے اس کے آئین اور سیاسی ریاست پر اثر ڈالے گی، اس لئے خواہ جو بھی ہو بنیادی جذبہ ایکتا کا ہوگا۔ سماجی طاقت صرف اسی سمت میں آگے بڑھ سکتی ہے۔ اقلیتوں کے مسائل دونوں ممالک میں ایک طاقت ور عنصر ہیں، لیکن یہ مخالف دکھائی دینے کے باوجود آہستہ آہستہ ایکتا کی جانب ہی بڑھے گی۔ یہ ایکتا زیادہ اونچی ہوئی۔ اس سیاسی مطلب اور چالاکی کی بہ نسبت جو گزشتہ کچھ عشروں میں سمجھوتوں اور اتحاد کے ذریعہ کی جا رہی ہے۔

سیاسی دباؤ نے ہمیں منقسم کر دیا ہے، لیکن سماجیات کا دباؤ ہمیں ایک کرے گا۔ سماجی اور معاشی طاقتوں کے ذریعہ طاقت ور بنائی گئی ثقافت اور دنیا کے حالات کی حقیقت اس عمل میں اور تیزی لائے گی۔ ایک ایسا عمل جو ایک سماج میں ہمیشہ جاری رہتا ہے جو ہمیشہ بڑھتے اتحاد کا خیال پیدا کرتا ہے۔ اسے ہندوستان کے معاملے میں ایک ناقابلِ شمار تیسرے عنصر کا سامنا کرنا پڑا جو ایک غیر ملکی طاقت کی شکل میں موجود مسلسل ایسی پالیسی اپناتی رہی جو اپنے مفادات کے لئے صحت مند قومی طاقت کو پیچھے دھکیل رہی تھی۔ اب اس تیسرے عنصر کے ہٹ جانے سے سماجی طاقتوں کو چلانے کے لئے راستہ ہموار ہو گیا ہے۔ یہ وہ یقین ہے کہ جوان لوگوں میں بنا ہوا ہے جنہوں نے تقسیم کے درد کو محسوس کیا لیکن اس سے ناامید یا بے چین نہیں ہوئے۔ اب اس طبقہ کی تعداد کافی زیادہ ہے جس میں اثر دار سیاسی پارٹیاں اور مسلمانوں و ہندوؤں کے غیر سیاسی گروپ اور افراد شامل ہیں۔ جب حالات کی نابرابری اور نفرت ختم ہو جائے گی تب ہندوستانی آسمان صاف ہو جائے گا اور تب ملک مندرجہ بالا یقین اور نظریے کو فروغ دے گا۔ آج کے کچھ لوگوں کا یقین ان لوگوں میں مزید جوش بھر دے گا جس سے الگ حصوں میں دوبارہ ملنے اور ایک ہونے کا موقع ملے گا اور ایک مستند حقائق کو عوام کی خواہش کی مدد سے دوبارہ قائم کیا جائے گا۔

سیاست: سماجی- معاشی طاقتوں کا ایک آلہ

اس قابلِ افتخار موقع کی جانب امن اور طاقت سے بڑھنے کا فرض آج ملک کے سامنے ہے۔ ہمیں یہ محسوس کرنا ہوگا کہ سیاست سماجی دباؤ کا آلہ ہے۔ سوشل سائنس سیاست کے بہ نسبت زیادہ بنیادی ہے۔ سماجی دباؤ کی اس صحت مند ایکتا کی جانب موڑنے میں ملک کو سوامی وویکانند کی شخصیت اور پیغام سے تحریک پا کر رہنمائی حاصل کرنی ہوگی۔

مسلمانوں اور درج فہرست قبائل کی معاشی اور سماجی ترقی ملک میں سماجی دباؤ کا توازن قائم کرے گی۔ ہندو سماج پر جمہوریت کے اثر سے نابرابری کا خاتمہ ہوگا اور اسی بنیاد پر ترقی پائے گا۔ ثقافتی اور معاشی ترقی سے اوسطاً مسلمان فرقہ واریت اور کٹر تشہیر سے کم متاثر ہوتا جائے گا

اور اس سے وہ اپنے مذہب کے ان پہلوؤں کو اچھی طرح قبول کرے گا جو سب سے اعلیٰ اور انسانی ہیں۔ صبر وتحمل پر مبنی اسلام کی تعلیم اور سبق کا کام کل کے ہندوستانی مسلمان کا فرض ہے۔ حال ہی میں دکھائی دینے والے اس کی خطرناک محدود شکل کو اسلام کے اعلیٰ معیار اور میل جول والے رویے سے قائم کرنا ہوگا۔ مختصراً اسلامی جمہوریت کو انسانی جمہوریت کی شکل میں ترقی کرنی ہوگی۔ اس جمہوریت کا ہندو سماج پر اور دنیا پر ایک اچھا اثر پڑے گا۔ وویکا نند کا خیال تھا کہ ہندو مذہب کی خوبصورتی کو اس کی سماجی نابرابری نے بگاڑ دیا ہے۔ اس درد کا اظہار کرتے ہوئے انہوں نے امریکہ سے ہندوستان میں اپنے ایک کارکن کو خط لکھا (کمپلیٹ ورکس جلد 5 ،صفحہ 15)—

'زمین پر کوئی بھی مذہب انسانیت کی عزت و وقار میں اتنے وسیع پیمانے پر تعلیم نہیں دیتا جتنا کہ ہندو مذہب۔ لیکن زمین پر ایسا بھی کوئی دھرم نہیں ہے جو غریبوں اور نچلے طبقہ کے لوگوں کو اتنا نظرانداز کرتا ہے۔ بھگوان نے مجھے دکھایا ہے کہ مذہب غلط نہیں ہے بلکہ ہندوازم کے پاکھنڈی اور ڈھونگی لوگ ہیں جنہوں نے مل کر غلط روایات تلاش کر کے ظلم کی انتہا کی ہے۔ مذہب غلط نہیں ہے۔ دوسری جانب آپ کا مذہب آپ کو تعلیم دیتا ہے کہ ہر جاندار آپ کی اپنی تشکیل ہے، لیکن اس کے لئے اخلاقیات کا درد، ہمدردی کی خواہش اور دل کی خواہش ضروری ہے۔'

ہندو مذہب اور اسلام کا آپسی رویہ: ماضی اور مستقبل

ہندوستان کی تاریخ اور ہندوستانی مسلمان و ہندو فرقوں کا کردار مختلف ہوتا، اگر اسلام ہندوستان میں ایک دوست کی شکل میں پرامن طریقے سے آتا۔ اس نے تب ہندو مذہب کے سماجی اسٹرکچر کو خالص کرنے میں اپنی یکسانیت اولیٰ اصول سے تعاون دیا ہوتا اور ہندو مذہب نے بھی اس سے خوش دلی سے سبق سیکھا ہوتا اور ساتھ ہی اپنی برادری مذہب کو صبر وتحمل کا نظریہ سکھایا ہوتا، لیکن سچائی یہ ہے کہ اسلام اپنی سب سے زیادہ پراثر فوجی طاقت کے ذریعہ سے ہندوستان میں آیا۔ انہوں نے اسلام کا نام تو لیا لیکن اپنی قومی بربریت سے کام کیا۔ ہندوستان کو تباہ کیا اور ہندو دھرم کا 'چیر ہرن' کردیا، جس سے اسلام ہندوؤں کی آنکھوں کی کرکری بن گیا۔ یہ فرق مذہبی اور ثقافتی رابطوں کے ان افسوس ناک باب میں سے ایک ہے جس نے تلخ نتائج دیئے لیکن جو ایک مختلف شکل میں انسانی مذہب اور ثقافت کے لئے سودمند نتائج لا سکتا تھا۔

پھر بھی سماجی قوت انسانی سنکی پن اور پاگل پن سے طاقت ور ہوتی ہے اور ایک بار جب اس زمین پر اسلام قائم ہو گیا تب تجزیہ اور مطالعہ کی شروعات ہوئی اور شمالی ہندوستان کے وسطی دور کے ہندو اور مسلمان عظیم سنتوں کی زندگی اور کاموں نے ہماری تاریخ میں ایک شاندار باب کا اضافہ کیا۔ وسیع طور پر کہیں تو ان کے کام پر خیالات اور مذہب کے شعبہ میں ہندو مذہب کی چھاپ تھی اور سماجی زندگی کے شعبہ میں اسلام کی۔ تاریخ کی عمومی اسٹرکچر میں کبیر، نانک، دادو، چیتنیہ، سورداس اور کئی دیگر سماج کے خلاف دکھائی دیتے ہوں گے لیکن ان میں ایک ذمہ داری تھی جو اس دور میں بھی ہمارے لئے محرک بنی ہوئی ہے۔ اگر انتہائی مشکل وقت پر کچھ لوگ اتنے شاندار نتیجے لا سکتے ہیں تو آج کے دور میں روحانیت کے قیام اور سماجی ایکتا کے شعبہ میں کتنے عظیم نتائج لائے جا سکتے ہیں اور وہ عظیم ہدف حاصل کیا جا سکتا ہے جسے وویکا نند نے انسانی تعمیر کہا ہے۔ اگر دونوں مذاہب کی طاقت کو منفی تشکیلی اور تعمیری شکل میں خودفکری اور بیدار کوششوں کے ذریعہ سے ملا دیا جائے۔ جدید جمہوریت کے اصول اور رویہ کی مدد سے دعالمی فورسیز کی مدد سے روحانیت کی بنیاد پر قائم اور انسانی فلاح و بہبود کی اخلاقی ذمہ داری سے ہندوستانی سیاست کی ترقی ضرور ہو سکتی ہے۔

مسابقت کے سماجی پہلو کی آزادی

کیا یہی سبھی مذاہب کا ہدف نہیں ہے؟ کیا یہ وہی نہیں ہے جو دنیا کے عظیم مذاہب کے پیغمبروں، بانیوں وغیرہ کے دل کو خوش کرے گا؟ کیا یہ جدید عالمی طاقتوں کی فطری پیداوار نہیں ہے جب اسے انسانی مقاصد کی جانب ہدایت دی جاتی ہے۔ کیا یہ معیار ہندوستان کو ترقی یافتہ اور طاقت ور اور ملکوں کا اخلاقی لیڈر نہیں بنائے گا؟ کیا ہندو مذہب کی طرح ہندوستانی اسلام اور ہندوستانی عیسائیت، دنیا کے لوگوں کے سامنے ایک خاص شناخت کی شکل میں پیش نہیں ہو سکتے، جس میں انفرادی کردار ہو اور دنیا کے لئے پیغام ہو؟ مذہب کی ہندوستانی زمین پر سب سے بہتر طریقہ سے نشوونما ہوئی ہے۔ ہندوستانی چاہے ہندو، عیسائی یا مسلم ہو- مذہبی ہوتا ہے۔ محدود سیاسی جذبات کے رابطہ سے اس مذہبی یقین نے سب سے خطرناک پہلو دکھایا ہے۔ لیکن جب یہ مذہبی یقین روحانیت اور انسانی خدمات کے جذبات کے رابطے میں آیا تو سب سے بہترین پہلو کا بھی مظاہرہ کیا ہے۔ لیکن ہندوؤں، مسلمانوں اور عیسائیوں کو دیکھنا ہے کہ ان کا مذہبی یقین دوسرے پہلو کو بھی دکھائے۔ ایک اوسطاً مسلمان کو سمجھنا چاہئے کہ فوجی فتح اور شدت پسندی کی تحریک انسانی غلطی ہے اور غیر فطری ہے جو اسلام کا نام اپنی 'رکت پپاسا' اور ایگو کو پانے کے لئے کرتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ انہیں فوجی ہیرو قرار دیا جا سکتا ہے نہ کہ مذہبی رہنما۔ مسلمانوں کو اپنے مذہب کے ان سنتوں کی کہانیوں پر زیادہ توجہ دے کر سیکھنا چاہئے جنہوں نے ان انسانوں میں امید و جوش کا ولولہ پیدا کیا۔ یہ بدلے میں ہندوستانی مسلمانوں کو دیگر مذاہب اور ان کے ٹیچروں اور سنتوں کے تئیں زیادہ پروقار رویہ پیدا کرنے میں مدد کرے گا۔ اسلام کے پیغمبر انسان کو خبردار کرنے والے کی شکل میں آئے نہ کہ ابھیشاک کی شکل میں۔ میمنے کی طرح کومل اور ایک شیر کی طرح حوصلہ مند و مضبوط، انہوں نے اپنی توانائی کو لوگوں کی اخلاقی اور روحانی ترقی میں لگایا۔ اپنے کاموں اور سرگرمیوں کے ذریعہ سے انہوں نے اعلیٰ معیار کا ایک پیٹرن تیار کیا جو ان لوگوں کے لئے تحریک کا ذریعہ بنا، وہی جو ان کے ماننے والے بننا چاہتے ہیں۔

باہمی عزت و احترام یکسانیت کو فروغ دیتا ہے۔ ہم نے طویل عرصہ تک اس سوشل سائنس عنصر کو روکا ہے جس نے ہمارے ازم اور ہمارے کردار کو بگاڑ دیا ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ ہمیں سماجی ترقی کے لازمی عنصر کو کھلا چھوڑ دینا چاہئے۔ یہی ہماری ترقی کی سمت ہے۔ یہ مبارک تجربہ ہے کہ ہندوستانی عیسائیت اپنے مفاد سے باہر نکل چکی ہے- وہ لالچ جو سماجی مقاصد کے ذریعہ ابھارا جاتا تھا- نے اب اس عظیم سچائی کو پہچان لیا ہے اور اب اسے کرنے میں وہ لگا ہوا ہے۔ ہندوستانی عیسائیت کا تابناک مستقبل یقینی ہو گیا ہے۔ ہندوستانی اسلام اپنی بنیادی شکل میں کب آئے گا؟ ہندوستانی مسلمان اس عظیم راستہ کو کب اپنی ذکاوت دیں گے اور صوفیوں کی ایک فصل تیار کریں گے جو بھی انسانوں کی عزت حاصل کر سکے گا؟ زندہ مذہب کا امتحان اس کے ذریعہ ان کے صوفیوں کے ذریعہ کیا جا سکتا ہے جو خدا کے سفیر ہوتے ہیں اور انسان میں رہنما۔ سیاست سے نزدیکی تعلق مذہب کی روح کو برباد کر سکتا ہے۔

سماج آج اپنے لیڈروں سے یہی رہنمائی چاہتا ہے۔ سماج اس نقصان اور نفرت سے پیدا ہونے والے تناؤ اور تنازع کو زیادہ طویل عرصہ تک برداشت نہیں کر سکتا۔ آزاد ہندوستان جو اب دو خود مختار ریاستوں میں تقسیم ہو چکا ہے اب اعلان کرتا ہے کہ ہم دشمنی کو چھوڑ کر امن قائم کریں۔ یہ چہار جانب محبت کی فضا قائم کرنے کا مطالبہ کرتا ہے۔

ہندو مسلم رابطہ کے لئے وویکانند کا نظریہ

سوامی وویکانند ہندوستان کی قابلِ افتخار قسمت میں یقین رکھتے تھے۔ انہوں نے اس کے لئے بے انتہا کوششیں کیں۔ وہ اسے ہمارے لئے وراثت کی شکل میں چھوڑ گئے ہیں۔ وہ جانتے تھے کہ ہندوستانی سرزمین پر مذاہب کے سمجھوتہ کی جگہ کا کس طرح کا آشیرواد برستا ہے۔ اس طرح کی اہم کوششیں جسے اس وقت 'سمندر سنگم' کہا جاتا تھا، 17 ویں صدی میں کچھ دور اندیش لوگوں کے ذریعہ کیا گیا تھا۔ آج ہندوستان میں اس کے کامیاب عمل درآمد کے لئے حالات بہتر ہو چکے ہیں۔ ہندو مذہب اور اسلام کے آپسی عمل کا ذکر کرتے ہوئے وویکانند نے جو خط اپنے مسلم دوست محمد سرفراز حسین کو لکھا اسے جواہر لال نہرو نے 'انوکھا خط' کہا۔ (دی ڈسکوری آف انڈیا، صفحہ 403، فٹ نوٹ)۔ یہ 10 رجون 1898 کو لکھا گیا۔ میں اس خط کو تفصیلی طور پر ذکر کرنا بہتر سمجھتا ہوں۔

'میرے پیارے دوست- میں تمہارے خط کی بہت ستائش کرتا ہوں اور مجھے یہ جان کر زیادہ خوشی ہو رہی ہے کہ بھگوان خاموشی کے ساتھ ہمارے مادرِ وطن کے لئے حیرت انگیز چیزوں کو تیار کر رہا ہے۔ ہم اسے چاہے کوئی ویدانت واد یا کوئی واد کہیں، سچائی یہ ہے کہ ادیتیہ واد مذہب اور نظریہ کا آخری لفظ ہے اور صرف یہی وہ ایسی حالت ہے جس سے انسان سبھی مذاہب اور فرقوں کو محبت سے دیکھ سکتا ہے۔ ہمارا ماننا ہے کہ یہی مستقبل کی بیدار انسانیت کا مذہب ہے۔ ہندو اس کے پاس دیگر قبائل سے پہلے پہنچنے کا سہرا لے سکتے ہیں کیونکہ وہ کسی بھی دیگر قبائل خواہ وہ ہبروں ہوں یا عربی، سے پرانے ہیں لیکن یہ بھی سچ ہے کہ موجودہ ادیتیہ واد جس میں پوری انسانیت کو ایک نظر سے دیکھا جا سکتا ہے اور ان کے ساتھ برابری کا تعلق قائم کیا جاتا ہے اسے اب بھی ہندوؤں کے درمیان فروغ حاصل کرنا ہے۔

دوسری جانب ہمارا مشاہدہ ہے کہ اگر کبھی کسی مذہب کے ماننے والے اپنی یومیہ زندگی کے رویہ پر قابلِ ستائش طریقہ سے ادیتیہ واد کی یکسانیت کے لئے کام کرتے ہیں تو ممکن ہے کہ وہ اسلام اور صرف اسلام میں ہے، ہندوؤں کے لئے آسان ہے۔

اس لئے ہم یہ مانتے ہیں کہ اسلام کی مدد کے بغیر ویدانت واد کے اصول چاہے وہ کتنے بھی حیرت انگیز اور اعلیٰ کیوں نہ ہوں انسانیت کے لئے پوری طرح اقدار سے خالی رہیں گے۔ ہم انسانیت کو اس مقام تک لے جانا چاہتے ہیں جہاں کوئی وید، بائبل اور قرآن نہ ہو لیکن پھر بھی ایسا ویدوں، بائبل اور قرآن کو آپس میں یکجا کر کے ہی کیا جا سکتا ہے۔ انسانیت کو یہ سکھایا جائے کہ مختلف مذہبی کتابیں اور کچھ نہ ہو کر 'مذہب' کی تاریخ ہے جو ایک ہے تاکہ ہر ایک شخص اپنے لئے وہ راستہ منتخب کر سکے جو اس کے لئے سب سے بہتر ہے۔

ہمارے مادرِ وطن کے لئے دو عظیم مذاہب ہندو اور اسلام- ویدانت ذہن اور اسلامی جسم کا ملاپ ہی اکیلی امید ہے۔

میں اپنے دل کی آنکھوں میں تابناک ہندوستان کا مستقبل دیکھتا ہوں جو اس بدنظمی اور نفرت سے اوپر اٹھ کر ویدانت دل اور اسلامی جسم کے ساتھ قابلِ افتخار اور ناقابلِ شکست بن کر ابھرے گا۔

ایشور آپ کو انسانیت کی خدمت- خاص طور سے غریب، ہماری مادرِ وطن کی خدمت- کا ایک عظیم ذریعہ بنائیں،

مسلسل اس دعا کے ساتھ، محبت کے ساتھ۔

خلاصہ

روحانیت کے نظریہ سے اتحاد، معاشی مضبوطی، سماجی مضبوطی اور اخلاقی اقدار سے مکمل ہندوستان عالمی معاملوں میں ایک انوکھی طاقت ہوگا۔ سوامی وویکا نند کا ہمارے ملک کے مستقبل کا یہی خواب تھا۔ دنیا ہندوستان سے بہت امید رکھتی ہے۔ تہذیب کی طاقت، طاقت ور، عالمی طاقتوں کو ایک اخلاقی اور روحانی سمت دینے پر منحصر کرتی ہے۔ دنیا اعلان کرتی ہے۔ کیا ہندوستان سنے گا اور رد عمل ظاہر کرے گا۔ وویکا نند کا یقین تھا کہ وہ سنے گا اور رد عمل ظاہر کرے گا۔ آزاد ہندوستان اس یقین اور نظریہ کو لے کر آگے بڑھے۔ 'اٹھو، جاگو! اور تب تک نہ رکو جب تک ہدف حاصل نہ ہو جائے۔

ضمیمہ-3

(ایمرجنسی کے دوران جون 1975 سے جنوری 1977 کے درمیان بنگلور سینٹرل جیل میں قید رہتے ہوئے لال کرشن آڈوانی نے 5 خطوط لکھے جن میں سے ایک خط یہاں شائع کیا جا رہا ہے۔ یہ کسی طرح سے جیل سے باہر لے جایا گیا اور اسے انڈر گراؤنڈ کارکنوں نے اندرا گاندھی حکومت کے ذریعہ لگائی گئی ایمرجنسی کے خلاف ملک گیر مہم میں استعمال کیا)۔

روداد دو ایمرجنسیوں کی

ایک قیدی
(اکتوبر 1975)

’تمام یک نفری حکومتیں اقتدار میں در اندازی کرنے کے بعد عوام کی بھلائی کے نام پر اقتدار میں بنے رہنے کی جانب گامزن ہوتی ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ آئینی تانا شاہی مکمل مطلق العنان تاناشاہی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔‘

— کے سبا راؤ
سابق چیف جسٹس
(16-15 مارچ 1975، نئی دہلی میں منعقد ایک سیمنار میں)

نازی تاریخ کے بارے میں ولیم شیئرر کی ’دی رائز اینڈ فال آف تھرڈ رائک‘ نامی کتاب مستند تصنیف مانی جاتی ہے۔ حال ہی میں جب میں اسے دوبارہ پڑھ رہا تھا۔ تو یہ جان کر حیرت زدہ تھا کہ نازی جرمنی میں ہٹلر کے ہیرو بننے کے لئے اپنائے گئے طریقوں اور محترمہ اندرا گاندھی کے ذریعہ ہندوستانی جمہوریت کو برباد کرنے کے لئے اپنائے گئے عمل میں بہت زیادہ یکسانیت ہے۔

جب 1919 میں جرمنی کا ویمیئر آئین بنا تھا تو اسے 20 ویں صدی کا سب سے کشادہ اور جمہوری دستاویز کہا گیا تھا۔ شیئرر نے اس کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ آئینی نظریے سے مکمل، جمہوریت کی خامیوں سے مبرا کئی قابلِ ذکر طریقوں سے مزین، گارنٹی شدہ آئین تھا۔

لیکن ہندوستان کے آئین کی طرح جرمنی کے آئین میں بھی ایمرجنسی کا التزام تھا۔ 30 رجنوری 1933 کے دن ہٹلر جرمنی کا چانسلر (وزیر اعظم) بنا۔ اس نے ریاست اور عوام کی سیکورٹی کے لئے 28 رفروری کو صدر ہنڈن برگ کے ذریعہ ایمرجنسی کا اعلان کرادیا۔ یہ دفعہ 48 کے (ایمرجنسی اختیارات) کے تحت کیا گیا۔ دیگر باتوں کے علاوہ اس اعلان میں یہ باتیں کہی گئیں۔

'انفرادی آزادی، آزادیٔ اظہار رائے اور پریس کی آزادی پر مجلس اور تنظیم کے اختیارات پر پابندی، ٹیلی فون پر بات چیت، ٹیلی گرافک مکالمہ اور پرائیویٹ خطوط کی راز داری کی خلاف ورزی، گھروں کی تلاشی کے وارنٹ، اثاثہ کی ضبطگی اور اس پر کنٹرول وغیرہ قانون کے دائرے کے باہر کے اقدامات تھے۔'

اس اعلان سے پارلیمنٹ کو، فیڈریشن کو ریاستوں کے اختیارات منتقل کرنے کا حق بھی دیا گیا۔ اس کے ذریعہ کئی جرائم کے لئے بھیانہ سزا کا التزام بھی کیا گیا۔ ان جرائم میں 'امن کے لئے سنگین خطرہ پیدا کرنا' بھی تھا۔

جرمنی میں پارلیمنٹ میں 27 رفروری کی آتشزدگی کو ایمرجنسی نافذ کرنے کا بہانا بنایا گیا۔ اس کے ایک دن بعد ہی ایمرجنسی کا اعلان کردیا گیا۔ ہندوستان میں بھی 25 رجون کو ایمرجنسی، 24 رجون کو حزب اختلاف کے ذریعہ پاس کئے گئے بل کے اشتہار کے بہانے لگایا گیا۔ ان دونوں معاملوں میں فیصلہ پہلے کرلیا گیا تھا۔ ویسے کوئی بھی بہانہ کام آسکتا تھا۔

پارلیمنٹ کی آتشزدگی کے بعد ہٹلر کی حکومت نے پریس ریلیز جاری کرکے کہا کہ انہوں نے کیمونسٹوں کی جانکاری حاصل کی ہے۔ کیمونسٹوں نے سرکاری عمارتوں، میوزیم اور ضروری پلانٹوں کو جلا ڈالنے کا پروگرام بنایا تھا۔

پارلیمنٹ میں آتشزدگی، خونی انقلاب اور خانہ جنگی شروع کرنے کے اشارے تھے۔ 13 سال بعد نورین برگ مقدمہ میں یہ ثابت ہوگیا کہ پارلیمنٹ بلڈنگ میں لگائی گئی آگ خود نازیوں کی کارستانی تھی۔ بنیادی طور پر گوئے بلز نے اس خیال کو جنم دیا اور گورنگ کے احکامات پر اس پر عمل درآمد ہوا۔

محترمہ اندرا گاندھی اور ان کے ساتھی بار بار یہ دوہراتے رہے کہ جو کچھ کیا گیا ہے آئین کے دائرے میں رہ کر کیا گیا ہے۔ اس لئے ان کا کہنا ہے کہ حزب اختلاف اور مغربی پریس کے ذریعہ یہ کہا جانا کہ جمہوریت کو تباہ کردیا گیا ہے، بالکل بے بنیاد ہے۔ نازی تاریخ اس بات کا پکا ثبوت ہے کہ صرف آئین کے مطابق کام کرنا اپنے آپ میں جمہوری رویہ اختیار کرنے کی گارنٹی نہیں ہے۔ ہٹلر ہمیشہ ڈینگیں مارتا تھا جو کچھ وہ کررہا ہے 'اس میں کچھ بھی غیر قانونی یا غیر آئینی نہیں ہے۔' سچ تو یہ ہے کہ اس نے ایک جمہوری آئین کو ہی تاناشاہی قائم کرنے کا آلہ کار بنایا۔ شیئرر نے کہا—

'حالانکہ ویمیئر جمہوریت برباد کردی گئی لیکن ویمیئر آئین کو ہٹلر کے ذریعہ رسمی طور سے کبھی ختم نہیں کیا گیا۔ سچائی اور بدقسمتی تو یہ ہے کہ ہٹلر نے اپنے اقتدار کی آئینی حیثیت جمہوری آئین کی مسخ کی گئی شکل پر ہی کی تھی'

مضبوط اپوزیشن، آزاد پریس اور غیر جانبدار و آزاد عدلیہ۔ جمہوریت کے یہ تین ستون ہیں۔ انہی اداروں پر کنٹرول کرکے کوئی بھی ملک نہ صرف انتظامیہ کو تاناشاہی حرکتوں سے ہیرو بننے سے روک سکتا ہے بلکہ مقننہ کو بھی من مانی کرنے والے اکثریت کی کٹھ پتلی بننے سے بچاتا ہے۔

ایک غلط فہمی ان دنوں بڑی کوشش اور محنت سے پیدا کی جارہی ہے کہ پارلیمنٹ کی منظوری سے سب کچھ منصفانہ ہوجاتا ہے۔ پاپ بھی پنیہ ہوجاتا ہے۔ جرمنی کے تجربہ کو دھیان میں رکھتے ہوئے امریکہ کے ایک مشہور کالم نگار والٹر لپمین نے خاص طور سے کہا ہے—

'جہاں لوگوں کی اکثریتی رائے کو سب سے مقدم سمجھا جاتا ہے اور جہاں اکثریت کسی قانون سے واقف نہیں ہوتی کیونکہ وہی قانون بناتا ہے، جہاں کیا صحیح یا کیا غلط ہے، اس کے بارے میں وہی آخری جج ہے، جس کے بعد کوئی اپیل نہیں ہوتی، وہاں اس اصول کو چلنے کا آخری فیصلہ 'سروستا وادی ریاست میں ہوتی ہے۔ نئی طرح کی یہ تاناشاہی نسلی یا فوجی کامیابی کی بنیاد پر نہیں ہوتی بلکہ براہ راست عوام میں سے نکلتی ہے۔ یہ روایتی سمجھ کے بالکل برعکس ہے۔ اس طرح کی تاناشاہی جمہوریت کی طرح پھلتی پھولتی ہے۔'

ہٹلر کے لئے اپوزیشن کی کوئی اہمیت نہیں تھی اور نہ ہی اندرا گاندھی کے لئے۔ وہ اپوزیشن کی یہ کہہ کر مذمت کرتے نہیں تھکتی تھیں کہ اقلیت اکثریت کی خواہشات کو دباتی رہی ہے۔ محترمہ اندرا گاندھی یہ بھول جاتی ہیں کہ جب 1971 میں ان کی پارٹی مقبولیت کے بام عروج پر تھی تب بھی ان کی پارٹی کو محض 43 فیصد رائے دہندگان کا ووٹ ملا تھا۔ موازنہ خوشنما نہیں لیکن یہ دلچسپ سچائی ہے کہ ہٹلر کی نازی پارٹی کو بھی اپنی بہترین مقبولیت کے دور میں یعنی 1933 میں صرف 44 فیصد ووٹ ہی ملے تھے۔

لیکن ایمرجنسی کے ٹھیک پہلے محترمہ اندرا گاندھی کی غیر مقبولیت نشیب میں جا رہی تھی۔ مئی میں شائع ایک عوامی سروے میں یہ حقیقت پوری طرح سے ثابت ہو گئی تھی کہ لیڈر کی شکل میں ان کی مقبولیت گھٹ رہی تھی پھر 12 رجون کو الہ آباد ہائی کورٹ کے فیصلے سے وزیراعظم کے طور پر ان کی حیثیت بھی ختم کر دی گئی تھی۔

دوسری جانب اپوزیشن نے اپنی دوریاں قائم کر لی تھیں۔ جے پرکاش نارائن کی قیادت میں حزب اختلاف ایک ٹھوس متبادل سیاسی طاقت کی شکل میں سامنے آیا تھا۔ ایمرجنسی کی پیدا کی گئی دلیل اسی میں مضمر ہے۔ اندرونی نقص امن پیدا کرنے کی سازش تو جرمن پارلیمنٹ کی آتشزدگی سے بھی زیادہ مضحکہ خیز ہے۔

جرمنی میں 1933 کے انتخاب کے بعد ہٹلر نے آئین میں اس طرح کی آئینی ترمیم کرنے کا فیصلہ کیا جس سے اس کی 44 فیصدی حمایت 100 فیصد میں تبدیل ہو جائے۔ اس نے انیبلنگ ایکٹ لانے کی تجویز پیش کی۔ اس کے مطابق 4 سال کے لئے تمام آئینی اختیارات ہٹلر کی وزارت کو سپرد کر دینے کو کہا گیا تھا۔

اس تجویز کو پاس کرنے کے لئے پارلیمنٹ کے دوتہائی ممبران کی حمایت کی ضرورت تھی۔ قوم پرست نازیوں کی حمایت کر رہے تھے۔ دونوں کو ملا کر پارلیمنٹ میں ان کی 16 کی اکثریت تھی۔ یہ دوتہائی سے کہیں کم تھا۔

اس لئے 15 رمارچ 1933 کو ہٹلر کی وزارت کی پہلی میٹنگ کا سب سے اہم ایشو یہ تھا کہ دوتہائی اکثریت کیسے حاصل کی جائے۔ ایک اسکیم تیار کی گئی اور اس پر عمل ہوا۔ 'کیتھولک سینٹر' جیسے کچھ فریق کی حمایت کا انتظام کر لیا گیا۔ سوشل ڈیموکریٹس اور کمیونسٹوں کو جوڑ کر پالتو بنا لیا گیا۔ متعدد سماجوادیوں اور 91 کمیونسٹ ممبران پارلیمنٹ کو قید کر لیا گیا۔ اسے دفاعی نظر بندی کہا گیا۔

25 رمارچ کو پارلیمنٹ کی میٹنگ ہوئی اور ہٹلر کو 'انیبلنگ ایکٹ' پاس کرانے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ اس کے حق میں 441 ووٹ پڑے اور مخالفت میں 84۔ ہٹلر نے فخریہ لہجہ میں کہا کہ ملک کے نمائندہ ایوان نے کثیر اکثریت سے ان پر اعتماد کیا ہے۔ شیئرر نے اس کے بارے میں لکھا ہے ـــــ

'اس طرح جرمنی میں پارلیمانی جمہوریت کو سرحدوں میں رہنا سکھا دیا گیا۔ کمیونسٹوں اور کچھ سوشل ڈیموکریٹ لیڈروں کی گرفتاری وغیرہ، جو کچھ کیا گیا قانون کے اندر کیا گیا۔ حالانکہ تشدد کا استعمال کیا گیا۔ پارلیمنٹ نے اپنے آئینی اختیار ہٹلر کو سونپ کر خودکشی کر لی۔

حالانکہ پارلیمنٹ برقرار رہی لیکن وہ ہٹلر کی باتوں کا ایک منچ بنا رہا۔'

محترمہ اندرا گاندھی کے ذریعہ ایمرجنسی کے اعلان کے لئے پارلیمانی رائے حاصل کرنے، آئینی ترمیم کی طویل فہرست کو پاس کرانے اور خود کو قانون کے دائرے سے الگ کرنے کی اپنائی گئی حکمت عملی اور ہٹلر کی حکمت عملی میں حیرت انگیز یکسانیت ہے۔ لیکن کچھ اس کے برعکس بھی ہیں۔

بنیادی طور سے دونوں کی حکمت عملی ایک ہے۔ کچھ پارٹیوں کی حمایت کا انتظام کرو باقیوں کو ڈراؤ۔ پارلیمنٹ کی منظوری حاصل کرنے کے لئے ہٹلر کو اپوزیشن ممبران کو ہی قید کرنا پڑا تھا لیکن اس نے نازیوں کو قید نہیں کیا تھا۔

یہاں محترمہ اندرا گاندھی کو کثیر تعداد میں اپوزیشن ممبران کے ساتھ ساتھ اپنی پارٹی کی مرکزی ورکنگ کمیٹی کے دو ممبران کو بھی قید کرنا پڑا۔ ان میں سے ایک رامدھن تو گزشتہ مئی میں ہی کانگریس پارلیمانی پارٹی کے سکریٹری منتخب کئے گئے تھے۔

ہٹلر نے پارلیمانی کارروائی کی اشاعت پر کوئی روک نہیں لگائی تھی۔ یہاں حزب اختلاف نے ایمرجنسی کی مخالفت کی اور اس کے خلاف سیشن کے بقیہ حصہ کے لئے ایوان کا بائیکاٹ کیا۔ یہ خبر تک دبا دی گئی۔ دونوں ایوانوں کے اسپیکروں کے رویہ پر یہ تبصرہ کرنا افسوسناک ہے کہ انہوں نے ایوان کی اشاعت کے بارے میں انتہائی حیرت انگیز سینسر شپ کو اتنے دتو پن سے قبول کرلیا۔ ہندوستانی پارلیمنٹ نے آنجہانی وٹھل بھائی پٹیل جیسا اسپیکر دیکھا ہے جنہوں نے برٹش وائسرائے تک کو یہ قبول کرنے پر مجبور کردیا کہ پارلیمنٹ کی چہار دیواری میں صرف ایک حکومت چل سکتی ہے اور وہ ہے اسپیکر۔ آج کے اسپیکروں سے ان کا موازنہ کرنا ہی غیر مناسب ہے۔ ان جیسے رویہ اختیار کرنے والوں سے امید کرنا دور کی بات ہے۔

جس دن جرمن پارلیمنٹ نے 'انیبلنگ ایکٹ' پاس کیا اس دن گوئبلز نے اپنی ڈائری میں لکھا- 'جرمن انقلاب شروع ہوگیا ہے۔' ہندوستان نے ایمرجنسی کے اعلان کے کچھ ہی دنوں بعد واشنگٹن میں ہندوستانی سفیر نے امریکی صحافیوں کو بتایا کہ ہندوستان جس دور سے گزر رہا ہے وہ تقریباً انقلابی دور ہے۔

پارلیمنٹ کو معذور بنا دینے اور اپوزیشن کو دبا دینے کے بعد ہٹلر کے 'انقلابی نظریہ' نے اپنی توجہ پریس اور عدلیہ کی جانب لگائی۔ یہ دو رکاوٹیں تاناشاہی کے راستے میں باقی تھیں۔ سینسر شپ نافذ کردیا گیا تھا۔ گوئبلز کو وزیر تشہیر بنایا گیا۔ 4/اکتوبر 1933 کو پریس قانون پاس کرکے پریس کی غلامی کو رسمی شکل دے دی گئی۔ صحافت کو عوامی سروس کہا گیا۔ مذکورہ قانون کی دفعہ 14 کے تحت ایڈیٹروں سے کہہ دیا گیا کہ ایسے سبھی مواد جو ملک کو کمزور اور عوام کی عام خواہشات کو کمزور کرتی ہوں اس سے خبردار و دور رہیں۔

اگر کوئی ایمرجنسی کے بعد محترمہ اندرا گاندھی کی پریس سے متعلق تقریروں کو جمع کرے تو ان کے مطابق ہندوستانی پریس کا ایک ہی 'جرم' سامنے آئے گا، وہ جس پر ہٹلر نے قانون بنا کر پابندی عائد کردی تھی- یعنی ایسے مواد شائع کرنا جس سے عوام کا حوصلہ ٹوٹتا ہے اور جو ملک کو کمزور بناتا ہے۔

کیا ملک کی طاقت یا عوام کے حوصلہ کی تنقید یا ناکامیوں کے پردہ فاش ہونے سے یا بڑے لوگوں کی مذمت سے گر ہے؟ ادھینائنک وادی (ہیرو ازم) اقتدار کا بغیر کسی جھجھک کے جواب ہوگا- 'ہاں' اور جمہوریت نواز زور سے کہے گا- 'نہیں'

چوتھے عشرے کے آخر میں ونسٹن چرچل نے پارلیمنٹ میں اور اس کے باہر اپنی ہی پارٹی کے لیڈر چمبرلینڈ کے میونخ خیمہ کے خلاف

لڑائی چھیڑی تھی، تب کسی نے ان پر یہ الزام نہیں لگایا تھا کہ وہ وزیر اعظم کے عہدے کو گھٹا رہے ہیں۔

جب برطانوی وزیر اعظم اینتھونی ایڈن نے منظم طریقہ سے سوئز نہر پر حملہ کیا تھا اور جب بی بی سی نے حزب اختلاف کے لیڈر گیٹسکل کو اس کے خلاف منچ دیا تھا اور انہوں نے ٹوری حکومت پر تنقید کی تھی تب کسی نے بی بی سی پر ملک سے غداری کا الزام نہیں لگایا تھا، حالانکہ وہ برطانیہ کی جنگی کوششوں کے لئے پریشان کن رویہ تھا۔

جانسن کی ویتنام پالیسی کے خلاف حال میں برسوں کے سب سے بڑے عوامی مظاہرے ہوئے۔ نوجوان اور سیاہ فام تنظیموں نے اس کے خلاف بڑے پیمانے پر اور تلخ مہم چلائی۔ جانسن کی پالیسیوں کو احمقانہ اور بدنما کہا اور ان پر الزام لگایا کہ ایک بیکار کی لڑائی میں امریکی نوجوانوں کو قربان کیا جارہا ہے۔ لیکن ان پر کسی نے فوج میں بغاوت پھیلانے کا الزام نہیں لگایا۔

ابھی حال میں 'واشنگٹن پوسٹ' اور دوسرے اخبارات نے واٹر گیٹ مجرموں کے سلسلے میں اس وقت کے صدر نکسن کے خلاف زوردار مہم چلائی۔ بالآخر نکسن پر مقدمہ چلانے کا مطالبہ بن گیا اور آخر کار اس کا نتیجہ نکسن کو اقتدار سے بے دخل ہونا پڑا۔ لیکن نکسن اور ان کے کچھ معاونین کو چھوڑ کر کسی نے امریکی پریس کو ملک کا غدار نہیں کہا۔

حالیہ کی تاریخ کے ان واقعات کے جائزہ سے ایسا لگتا ہے کہ اگر ونسٹن چرچل، بی بی سی، امریکی نوجوانی اور سیاہ فام تنظیموں اور امریکی پریس نے مناسب رویہ اختیار نہ کیا ہوتا تو فرض ادا نہ کرکے بڑا جرم کیا ہوتا۔ یہ دونوں ممالک حکومت مخالف سرگرمیوں سے زیادہ مضبوط ہو کر نکلے ہیں۔

اپوزیشن کی مخالفت یا تنقید سے سماج کمزور ہوتا ہے یا مضبوط۔ یہ پھر بھی ایک گہرا سوال ہے۔ جواب اس پر منحصر کرتا ہے کہ کون کس اقدار کو مانتا ہے۔

جب برژنیف نے ہندوستان کی اپوزیشن پارٹی کے ایک لیڈر مدھو لمیئے سے نئی دہلی میں ہونے والی ملاقات کے وقت پوچھا کہ 'اپوزیشن پارٹی کی ضرورت کیا ہے؟'، تب یہ تبصرہ حیرت انگیز نہیں لگا تھا کیونکہ یہ ایک کمیونسٹ لیڈر کا تبصرہ تھا۔

لیکن جب ہندوستان کی وزیر اعظم محترمہ اندرا گاندھی پریس سینسر شپ کو اس بنیاد پر صحیح قرار دیتی ہیں کہ ان کی تحریر سے ملک کا حوصلہ ٹوٹ رہا تھا تو دنیا کے جمہوریت نواز حیران ہوئے۔ صدر فورڈ، بی بی سی یا مغربی پریس کے لوگوں کے ذریعہ محترمہ اندرا گاندھی پر لگائے گئے ادھینا ئک واد کی تنقید کے جواب میں جب مسز گاندھی یہ شکایت کرتی ہیں کہ یہ لوگ ماؤ کی تنقید تو نہیں کرتے تو ان کی یہ شکایت غیر مناسب ہے۔ کم سے کم تب تک غیر مناسب ہے جب تک ہندوستان اپنے پارلیمانی جمہوریت پر فخر کرتا رہے گا۔

جون میں ایمرجنسی کے اعلان کے بعد محترمہ گاندھی کے بہت ہی قریبی اخبار 'نیشنل ہیرالڈ' نے اداریہ میں افریقی یک پارٹی نظام نافذ کرنے کی وکالت کی۔ لیکن 15 راگست کو بنگلہ دیش میں ہونے والے خونی انقلاب کے بعد یک پارٹی نظام کا جوش ٹھنڈا پڑا ہے۔ 25 راگست کے اداریہ میں اسی اخبار نے اپنے پرانے موقف کی حمایت کرتے ہوئے لکھا کہ یک پارٹی نظام ٹھیک تو ہے لیکن اسے زور وز بردستی سے نہیں لادنا چاہئے۔ ترقی کے اصول کے دور میں اس کو ابھرنے دینا چاہئے، خواہ اس کا مطلب کچھ بھی ہو۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ 'نیشنل ہیرالڈ' کس حد تک سرکاری ذہن کو متاثر کر رہا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ منظم طریقہ سے تحریک کیا گیا ہو اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تجرباتی غبارے کی طرح پھینکا گیا ہو۔ کچھ بھی ہو مسز گاندھی نے یہ واضح طور سے کہا ہے کہ آئین کی کثیر جماعتی جمہوری تصویر کو بدلنے کا ان کا

کوئی ارادہ نہیں ہے۔ لیکن اسی سانس میں وہ یہ بھی کہتی ہیں کہ ایمرجنسی سے قبل کی خود پسندی اور غیر جواب دہی کے حالات میں لوٹنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اس خود پسندی اور غیر ذمہ داری کا الزام ایک طرف جے پرکاش نارائن اور اپوزیشن پارٹیوں پر اور دوسری جانب پریس پر لگایا جاتا ہے۔ جے پی اور اپوزیشن پر سرکار الزام عائد کرسکتی ہے یا کم سے کم عوام میں یہ کہہ کر غلط فہمی تو پیدا کر ہی سکتی ہے کہ یہ لوگ سازش کر کے حکومت کو اکھاڑ رہے تھے اور حکومت کے پاس اس کے ثبوت ہیں۔ لیکن عوامی مفاد میں اسے بتانا مناسب نہیں ہے۔ ہٹلر نے پارلیمنٹ کی آتشزدگی کے سوال پر یہی کہا تھا۔

لیکن پریس کے معاملے میں اس طرح کی مصنوعی چال نہیں چلی جاسکتی۔ کیونکہ اخبارات ایک کھلی کتاب کی طرح ہوتے ہیں۔

دنیا بھر کے صحافی ہندوستانی پریس کو انتہائی صابر وشاکر قرار دیتے ہیں بلکہ صحافتی حلقوں کا موقف تو یہ ہے کہ ہندوستانی پریس زیادہ سرد مزاج ہے، اتنا کہ ڈرپوک اور حکم آوری کی حد تک تو چھوتا ہے۔ اس لئے یہ کہنا کہ جیسا کہ کچھ وزیر کہتے ہیں ہندوستانی پریس سنسنی خیز ہے، اپنے آپ میں حقائق کے ساتھ مذاق ہے۔ مسز اندرا گاندھی کا یہ کہنا کہ ہندوستانی پریس حکومت کے خلاف اپوزیشن کی حمایت کرتا ہے، پوری طرح غلط ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ زیادہ تر اخبارات اپنی بقا کے لئے اشتہارات پر انحصار کرتے ہیں۔ اس لئے اگر وہ چاہے تو بھی سرکار کے خلاف ہونا ان کے بس سے باہر کی بات ہے۔ گزشتہ 18 مہینوں سے سیاسی بحث جے پی تحریک کے اردگرد گھومتی رہی ہے۔

سبھی اخبار ان کی تنقید کرتے رہے ہیں۔ حالانکہ کیمونسٹ اخبارات کو چھوڑ کر عموماً سبھی روزنامہ اخبار انفرادی طور پر ان کی کافی عزت کرتے ہیں۔

پریس نے اپوزیشن پارٹیوں کو تقسیم کرر کھا ہے۔ اگر وہ ایک ساتھ جمع ہوتے ہیں تو وہ ان کے لئے پچمیل کھچڑی بن جاتی ہے اور اگر وہ اپنی اپنی حالت میں جمے رہتے ہیں تو منقسم اور کمزور اپوزیشن پارٹی ہوتے ہیں۔ اس لئے حیرت ہوتی ہے کہ سرکار مخالف اخباروں اور ان کے رویے کا حوالہ دیتے ہوئے مسز گاندھی کس اخبار کی جانب اشارہ کرتی ہیں۔ ایک تقریر میں تو وہ یہاں تک کہہ گئیں کہ پریس گزشتہ 9 برسوں سے، جب سے وہ وزیراعظم بنی ہیں ایسا ہی رویہ رکھ رہا ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے یہ مان لیا جائے کہ یہ سچ ہے تو کیا یہ جرم ہے؟ ایک ادھینا ئک کے لئے یہ جرم ہوسکتا ہے، لیکن مسز گاندھی کی یہ منطق کسی بھی جمہوریت نواز کے گلے سے نہیں اترے گی۔ برطانوی اپنے یہاں جمہوریت چلاتے رہے لیکن دوسرے ممالک پر حکومت کرنے میں سب سے غلط طریقے سے ایک ہی نظم چلاتے رہے۔ لیکن برطانوی حکومت میں بھی ہندوستانی پریس پر ایسی درندگی صفت سنسر شپ سے کبھی واسطہ نہیں پڑا جیسا اندرا گاندھی نے کیا تھا۔

جب گاندھی جی 1942 سے ستیہ گرہ سے قبل گرفتار کئے گئے تو میرا بین نے کہا 'رات گئے وہ چوروں کی طرح آئے اور انہیں چرا کر لے گئے۔'

25-26 / جون کے درمیانی شب کو آج کے مہاتما گاندھی جے پرکاش نارائن کو بھی اسی طرح لے جایا گیا جیسا گاندھی جی کو لے جایا گیا تھا لیکن ایک فرق تھا۔

برطانوی حکومت نے عوام سے یہ خبر چھپانے کی کوشش نہیں کی کہ ان کے محبوب لیڈر قیدی بنا لئے گئے ہیں اور نہ ہی یہ کہ بھگت سنگھ کو پھانسی لگادی گئی ہے۔ ملک بھر کے اخبارات میں مہاتما گاندھی کی گرفتاری کی خبر پہلے صفحہ پر 8 کالمی عنوان کے ساتھ شائع کی گئی تھی۔

لیکن مسز گاندھی کے راج میں 26/جون سے جے پرکاش نارائن، مرار جی ڈیسائی، چرن سنگھ اور واجپئی کا کوئی وجود نہیں رہا۔ جے پی جیل میں ہیں حکومت کا سب سے بڑا خفیہ راز ہے۔ اگر کوئی اسے شائع کردے تو سخت سزا کا مستحق ہوگا۔ صرف ہٹلر یا اسٹالن کے راج میں ہی ایسا احمقانہ تصور کارفرما تھا۔ ادھینا ئک وادی ریاستوں میں اخبار کے وسائل کا اس کے علاوہ کوئی کردار نہیں ہوتا کہ وہ برسر اقتدار لوگوں کے اہداف کے تئیں سرگرم رہیں۔ اخبارات سمیت سبھی اطلاعاتی ذرائع سرکاری حصہ ہوتے ہیں لیکن جمہوریت میں اخبارات کا کردار دوسرا ہوتا ہے۔

ایک بار امریکی صدر کے ایک پریس سکریٹری بل موئرس نے کہا تھا۔

'سرکار اور پریس دوست نہیں ہوتے، وہ آپسی دشمن ہوتے ہیں۔ ایک کے پاس حکومت کو چلانے کا عوامی فیصلہ ہوتا ہے۔ دوسرے کی ذمہ داری ہے کہ جتنا بھی پتہ لگا سکے، لگائے کہ آخر کیا ہو رہا ہے۔ یہ جمہوریت کا طریقہ ہے کہ اس جدوجہد میں نشو ونما پاتا ہے۔ اس میں وہ ختم نہیں ہوتا۔'

جیسا کہ پہلے ہی کہا گیا ہے کہ ہندوستانی پریس حکومت کی دشمن نہیں ہے، یہ تو دوست ہے۔ پوچھا جا سکتا ہے کہ پھر بھی یہ اس طرح کی سزا کا حقدار کیوں ہوا؟ سچ یہ ہے کہ ہندوستانی پریس کے خلاف مسز گاندھی کی زبردست ناراضگی ہے۔

یہ ہر ایک تانا شاہ کا کردار ہوتا ہے کہ خواہ وہ حکومت کی کچھ تنقید برداشت کرلے لیکن ذاتی طور سے کی گئی تنقید کو وہ ہرگز برداشت نہیں کر سکتا۔ اخبارات کے خلاف مسز گاندھی کے غصہ کی بنیادی وجہ ہے کہ الٰہ آباد ہائی کورٹ کے فیصلے کے بعد پریس نے تقریباً اتفاق رائے سے یہ خیال ظاہر کیا کہ جب تک سپریم کورٹ اپنا فیصلہ نہ دے تب تک کے لئے مسز گاندھی وزیراعظم کے عہدے سے استعفیٰ دے دیں۔ اس کے لئے مسز گاندھی انہیں معاف کرنے کے لئے تیار نہیں۔

فطری طور سے سنسرشپ کی وجہ سے اخبارات بے مزہ اور پھیکے ہوگئے ہیں۔ وہ سرکاری اشتہاری پرفارموں کی طرح ہوگئے ہیں۔

سنسرشپ لگانے کے بعد ایسا نازی جرمنی میں بھی ہوا۔ ایک بار خود گوئبلز نے مدیروں کو زیادہ بزدل نہ ہونے کی صلاح دی اور ان سے اپنے اخبارات کو بدمزہ نہ ہونے کی درخواست بھی کی۔

برلن کے ایک ایڈیٹر ویلکے نے گوئبلز کے خیالات کو سنجیدگی سے لیا۔ دوسرے ہی شمارہ میں اس نے اخبار میں وزارت اشتہارات کی تنقید کرتے ہوئے لکھا کہ کیسے یہ وزارت دباتا ہے اور اس سے اخبار کس طرح بدمزہ ہوگئے ہیں۔ اس اشاعت کے کچھ ہی دن بعد اخبار بند کردیا گیا اور مدیر محترم جیل پہنچادیئے گئے۔

وزیراعظم کے ذریعہ بار بار یہ اعلان کئے جانے پر کہ سینسرشپ ڈھیلی کردی گئی ہے، کچھ صحافیوں نے خاص کر غیر ملکی صحافیوں نے محکمہ اطلاعات کے بدمزہ پریس ریلزوں کے علاوہ بھی کچھ بھیجنا شروع کردیا لیکن اس سے وہ پریشانی میں پڑ گئے۔ گزشتہ کچھ ہفتوں میں 2 بین الاقوامی نیوز ایجنسیوں رائٹر اور یو این آئی کے ٹیلی پرنٹر اور ٹیلی فون کاٹ دیئے گئے ہیں۔ کہا گیا کہ انہوں نے سینسرشپ قوانین کی خلاف ورزی کی ہے۔

اگر کوئی جمہوریت کے ایک ہی معیار کو مانے تو وہ پریس کی آزادی ہوسکتی ہے۔ میڈیسن نے بڑے واضح الفاظ میں کہا ہے۔

'بغیر مقبول خبروں یا اسے جمع کرنے کے وسائلوں کے کوئی بھی حکومت مقبول نہیں کہلا سکتی۔ اگر ایسا نہیں ہے تو وہ ڈھکوسلہ یا آفت ہے اور شاید دونوں ہی ہیں۔ علم لاعلموں پر ہمیشہ حکومت کرے گا اور جو عوام خود اپنی حکومت چلانا چاہتی ہے اسے علم کی طاقت حاصل کرنی چاہئے۔'

حکومت حاصل کرنے کے بعد ہٹلر نے نازی لیڈر زوچم ریبنٹروف نے عدالتی نظام کی ضروریات کو محسوس کیا۔ زوچم بعد میں ہٹلر کے وزیر خارجہ بنے۔

زوچم نے کہا کہ پرانے عدالتی نظام کو بدلنا اس لئے ضروری ہے کہ کیونکہ آج تو ہٹلر پر بھی انہیں سزا کے قوانین سے مقدمہ چل سکتا ہے جن قوانین سے ایک عام آدمی پر چل سکتا ہے۔

وکلاء کے ایک کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے پارلیمنٹ میں قانون سے متعلق لیڈر اور انصاف کمشنر ڈاکٹر ہینس فرینک نے کہا 'آج جرمنی میں صرف ایک حکومت ہے اور وہ حکومت ہے ہٹلر کی'

ڈاکٹر فرینک اور زوچم جیسے ہٹلر کے پجاریوں اور 'انڈیا از اندرا اینڈ اندرا از انڈیا' کا نعرہ لگانے والے دیوکانت بروا میں کیا کوئی فرق ہے۔ جب کہ دونوں کا انجام ایک ہی طرح سے نکلے؟ آئین اور قوانین کی ایسی ترمیم کی گئی کہ قانون کی حکومت کی روایت بدل جائے اور انتظامیہ کے سربراہ کو قانونی دائرے سے اوپر کر دیا جائے۔ اسی عمل کے تحت عدالتی تجزیہ کے اختیارات کے پر کو کاٹ دیا گیا۔

نازی جرمنی میں ججوں کی حالت کے بارے میں شیئرر نے لکھا ہے۔

'ویمیئر قانون کے تحت قانونی دائرے میں جج آزاد تھے۔ من مانے عہدے کی آزادی سے انہیں تحفظ حاصل تھی اور دفعہ 109 کے تحت کم سے کم اصولی طور سے قانونی یکسانیت کے حق دار تھے۔ ان میں سے لاتعداد نازی ازم کے تئیں ہمدردی بھی رکھتے تھے لیکن ٹھیک اس کے بعد ان کے ساتھ جو برتاؤ کیا گیا اس کے لئے قطعی تیار نہیں تھے'

سرکاری خدمات سے متعلق شہری خدمات قانون میں جرمن ریاست کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ ان سب کو برخاست کر سکتا تھا جو نیشنل سوشلسٹ اسٹیٹ (نازی ازم) کو قبول نہ کرنے کا کسی بھی طرح اشارہ دیتا ہو۔ اس قانون کا استعمال یہودیوں کو خدمات سے برخاست کرنے کے لئے پہلے سے ہی کیا جا رہا تھا۔ 7راپریل 1933 کو یہ قانون ججوں پر بھی نافذ کر دیا گیا۔

1935 میں ہٹلر کی خفیہ پولس نظام گستاپو کی کاروائی کو عدالتی تفتیش سے مستثنیٰ قرار دے دیا گیا۔ 10رفروری 1936 کو گستاپو قانون جاری کر کے خفیہ پولس تنظیم کو قانونی دائرے سے باہر کر دیا گیا۔ عدالتوں کو ان کی سرگرمیوں میں مداخلت کرنا قانونی طور پر روک دیا گیا۔

میسا (MISA) قیدیوں کے ساتھ مسز گاندھی کا رویہ ایمرجنسی میں ٹھیک ویسا ہی ہو گیا ہے۔

1937 میں جرمنی حکومت نے نئے سرکاری خدمات قوانین بنائے جس میں ججوں سمیت کسی بھی سرکاری ملازم کو سیاسی غیر یقینی کی بنیاد پر خدمات سے ہٹایا جا سکتا تھا۔

جولائی و اگست 1975 میں پارلیمنٹ کے ایمرجنسی سیشن میں جو کاروائی ہوئی اس پر سرکاری طور پر نگاہ ڈالنے سے کوئی بھی سمجھ سکتا ہے کہ قوانین بنانے سے متعلق جو بھی سرگرمیاں ہوئیں ان کا اہم نشانہ عدلیہ ہی تھا۔

صدر جمہوریہ نے بنیادی حقوق کی دفعہ 21، 14 اور 22 سے متعلق ذیلی دفعات کو پہلے ہی معطل کر دیا ہے۔ اس میں بالترتیب قانون کی نظر میں برابری، زندگی اور شہری آزادی کا تحفظ اور نظر بندی کے خلاف سیکورٹی کا التزام بنیادی حقوق کے شکل میں ہے۔

جیسے یہ کافی نہ ہوں، کئی آئینی اور قانونی تبدیلی کی گئیں۔ ان میں سے کچھ کی تفصیل اس طرح ہے—

1- عدالتوں کو ایمرجنسی کے حالات کا اعلان، گورنر راج اور نوٹیفکیشن کے بارے میں فیصلہ دینے سے محروم کر دیا گیا۔

-2 داخلی سیکورٹی قانون (میسا) میں ترمیم کر کے عدالتوں کے فطری یا عام قوانین کے تحت نظر بندوں کو راحت دینے کے اختیار ختم کر دیئے گئے۔

-3 انتخابی قوانین میں ترمیم کر کے سرکاری ملازمین کی نامزدگی، استعفیٰ یا برخاستگی یا معطلی سے متعلق تاریخوں کے بارے میں فیصلہ کرنے کے اختیار عدالتوں سے چھین لئے گئے۔

-4 ایک آئینی قانون ترمیم کے ذریعہ الٰہ آباد ہائی کورٹ کے فیصلہ کو معطل کر دیا گیا۔

-5 صدر جمہوریہ، نائب صدر جمہوریہ، لوک سبھا اسپیکر اور وزیر اعظم کے انتخابات کی ویلیڈیٹی کے بارے میں فیصلہ کرنے کے عدالتوں کے اختیارات ختم کر دیئے گئے۔

-6 عوامی نمائندہ قانون اور میسا کو 9ویں شیڈول میں ڈال دیا گیا اور اس طرح عدالتی جائزہ سے اسے مستثنیٰ کر دیا گیا۔

-7 میسا کی ترمیم اس طرح کی گئی کہ نظر بند لوگوں کو گرفتاری کی وجہ بتانا ضروری نہ ہو۔ وہ جیل میں غیر معینہ مدت تک قید رہیں اور انہیں ذرا سا بھی معلوم نہ ہو کہ انہیں آخر کیوں قید کیا گیا ہے؟

کچھ عدالت عالیہ کا فیصلہ تھا کہ وجہ نہ بتانے کی بات صرف نظر بند شخص اور حکومت کے درمیان ہے۔ عدالتوں کو ان کی گرفتاری کی وجہ بتانے اور اس کا مقصد جاننے سے یہ گرفتاری من مانی ہے یا نہیں یہ جاننے سے روکا نہیں جا سکتا۔ ایسا عدالت نے صحافی کلدیپ نیر کے معاملے میں کہا اور گرفتاری کو غیر قانونی قرار دیا۔

اس تجزیئے کو دھیان میں رکھ کر حکومت نے 17/اکتوبر کو نوٹیفکیشن کے ذریعہ ایمرجنسی نافذ کرنے کے بعد تیسری بار نظر بندی قانون میں ترمیم کی۔ اس نوٹیفکیشن میں یہ کہا گیا کہ نظر بندی کی وجہ خفیہ سمجھے جائیں گی اور عدالتوں تک کے لئے یہ دستیاب نہیں ہوں گی۔

یہ سب قانون مل کر کیا بن جاتے ہیں؟ پہلی بات تو یہ کہ انتظامیہ اور عدلیہ حکومت میں زبردست اعتماد ظاہر کرتے ہیں، دوسرے حکومت کی جانب سے عدالتی جائزہ کی حدود کو بری طرح محدود کر دیتے ہیں۔ یہ وہ اسباب ہیں جنہیں سپریم کورٹ نے آئین کی بنیادی خصوصیت بتائی تھی۔

جون 1975 میں نافذ کی گئی ایمرجنسی ایک معنی میں وہ ترشول ہے جس کے ذریعہ مسز اندرا گاندھی نے جمہوریت کے تینوں اہم ستونوں کو ایک ساتھ منہدم کرنا شروع کیا ہے۔ یہی ان کے مکمل اقتدار حاصل کرنے کی راہ میں رکاوٹ ہے۔

اپوزیشن کے دسیوں ہزار سرگرم کارکنوں کو نظر بند کر کے اپوزیشن کو دبانے کی کوشش کی گئی۔ پریس سینسر شپ نافذ کر کے کلدیپ نیر اور کے آر ملکانی جیسے صحافیوں کو گرفتار کر کے اور کمیونسٹ ممالک کو چھوڑ کر غیر ملکی صحافیوں کو نکالنے کے قدم سے پریس کو دبایا گیا۔ حال کے آئینی ترمیم اور صدر جمہوریہ کے ذریعہ دفعہ 359 کے تحت جاری کئے گئے احکامات عدالت کے خلاف اٹھائے گئے قدم ہیں۔

کانگریس کے لوگ شاید یہ جان کر کچھ شرم محسوس کریں کہ اگر مسز گاندھی کو 20 نکاتی پروگرام کا فخر حاصل ہے تو ہٹلر کو اپنے 25/نکاتی پروگراموں پر ناز تھا اور وہ انہیں ناقابلِ منتقلی کہا کرتا تھا۔ پہلے یہ ذاتی خیال تھا، بعد میں نازی پارٹی کا سرکاری پروگرام بن گیا۔

ہٹلر کی ریاست میں بھی 25 نکاتی پروگرام کی حمایت میں روزانہ نمائش ہوتی تھی۔ اس میں شرکت کرنے والے عام لوگ ہی نہیں زندگی کے مختلف شعبوں کے رہنما بھی ہوتے تھے۔ 1933 میں مشہور سائنسدانوں اور ماہرین تعلیم سمیت برلن یونیورسٹی کے 960 لکچراروں نے ہٹلر

کے تئیں اپنی عقیدت ایک مظاہرہ کے ذریعہ ظاہر کی۔

ایک سینئر لیکچرار ریپوک نے بعد میں لکھا کہ اس جسم فروشی کی روایت نے جرمن تاریخ کو بدنما کر دیا۔ ایک دوسرے لکچرار جولیس ایبنگ نے 1945 میں لکھا-

'جرمن یونیورسٹی ناکام ہوگئی۔ جب عوامی طور سے اپنی پوری طاقت سے احتجاج کرنے کا موقع تھا تب بھی جرمن جمہوریت کو برباد کرنے کے سلسلہ کو انہوں نے نہیں روکا۔ دہشت کی سیاہ رات میں آزادی اور حقوق کے مشعل کو جلائے رکھنے میں یہ ناکام ثابت ہوگئے۔'

ہندوستان بھی دہشت کی کالی رات سے گزر رہا ہے۔ ڈسپلن کی اچھی اچھی باتیں کسی کو دھوکہ نہیں دے سکتیں۔ آج جو ہم دیکھ رہے ہیں وہ ڈسپلن نہیں ہے۔ یہ بزدل اتفاق رائے اور غلامانہ جی حضوری ہے۔ یہ سب مسز گاندھی کے خوف کی وجہ ہے۔ فرض شناسی یا ایمانداری کی وجہ نہیں۔ آج وہ عزت نہیں پاتیں، آج ان کی دہشت ہے۔

ہٹلر نے اس سے بھی زیادہ دہشت پیدا کی تھی اور اپنے قوانین پر عمل درآمد کرانے میں اس سے کہیں زیادہ کامیابی حاصل کی تھی۔ اس نے یہ قانون بنایا تھا بغیر اطمینان بخش اسباب کے جو کام کرنے والا کام پر حاضر نہیں ہوگا اسے گرفتار کیا جاسکتا ہے۔ سرکاری دفتر آج ایمرجنسی کی دہشت کے سائے میں ہیں۔ من مانی کاروائی کے خلاف سبھی سیکورٹی انتظامات کو معطل کر دیا گیا ہے۔ آج کوئی یہ پتہ لگانے کی حالت میں نہیں ہے کہ سینئر افسران کے خلاف کی گئی کاروائی کتنی صحیح ہے۔ کتنے ہی اچھے مقاصد افسران کی رسہ کشی کی وجہ سے وہ پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ پائے ہیں۔ اس کے باوجود کامیابی حاصل ہوئی وہ صرف اتنی بتائی جاتی ہے کہ چپراسی اور کلرک ٹھیک وقت پر دفتر پہنچ رہے ہیں۔ ایک بار اطالوی تاناشاہ نے دعویٰ کیا تھا کہ اس کے فاشزم کی وجہ سے گاڑیاں ٹھیک وقت پر چلنی شروع ہوگئی ہیں۔ اگر وقت کی پابندی کی بنیاد جمہوریت ہے (جب کہ جاپان اور انگلینڈ کی مثال یہ بتاتی ہے کہ ایسا نہیں ہے) تو یہ ملک جمہوریت چھوڑنے کے بجائے وقت کی پابندی کی کمی کو برداشت کرنا زیادہ بہتر سمجھے گا۔

اس کے بارے میں دو رائے نہیں ہوسکتی کہ ملک میں سوچ سمجھ کر ڈسپلن پیدا کرنے کی ضرورت ہے لیکن کیا یہ مجبوری نہیں ہے کہ مسز گاندھی جو اعلیٰ سیاسی حالات پر سنجیدہ اور بغیر کسی تنازع کے ڈسپلن شکنی کی وجہ بنی ہوئی ہیں۔ وہ جے پرکاش نارائن کو جو گاندھی وادی ڈسپلن کی اعلیٰ روایت میں پلے بڑھے ہیں- ڈسپلن کا ڈنڈا دکھا رہی ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ ڈسپلن شکنی اور غیر جواب دہ رویہ کی جو فضا آج سرکاری دفاتر اور صنعتوں سے لے کر عوامی زندگی کے ہر شعبہ میں ہو رہا ہے اس کی جڑیں بلاواسطہ مسز گاندھی کے اس نعرے سے نکلی ہوئی ہیں جسے 1969 میں شروع کیا گیا تھا۔

تنظیمی طور پر قومی زندگی میں اگر کسی تنظیم نے اخلاق اور ڈسپلن کی تعمیر میں کا سب سے زیادہ تعاون دیا ہے تو وہ ہے راشٹریہ سویم سیوک سنگھ۔

لاکھوں لوگوں نے حب الوطنی، ڈسپلن اور ایمانداری کی تعلیم اس تنظیم سے حاصل کی ہے۔ لیکن پھر سے راشٹریہ سویم سیوک سنگھ پر پابندی لگادی گئی۔ کیوں؟ اندازاً شاید اس لئے کہ اس کے لیڈر نے جے پی کی قیادت اور آئیڈیل ازم کی ستائش کی اور کہا کہ سنگھ کے سویم سیوک ان کی تحریک میں شرکت کر سکتے ہیں۔

ڈسپلن پیدا کرنے والے سب سے اہم غیر سرکاری شعبہ کو دبانے والی حکومت اگر ڈسپلن کی بات کرتی ہے تو یہ سرکار کی ڈسپلن شکنی ہی اجاگر کر دیتی ہے۔ مسز گاندھی نے مزدور تنظیموں اور اجتماعی سودا بازی کے ذریعہ مزدوروں کے اختیارات کے بارے میں جو رخ اپنایا ہے وہ بھی

ہٹلر کے رویہ سے کافی مناسبت رکھتا ہے۔

مزدور تنظیموں کو زیادہ جواب دہ بنانے اور ان میں پیداوار سے متعلق بیداری پیدا کرنے کی کوئی بھی ستائش نہیں کرے گا لیکن آج پیداوار بڑھانے سے متعلق بیداری کے نام پر ایمرجنسی حالت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے صنعتکاروں کے مالکان کو کھلی چھوٹ دے دی گئی ہے اور وہ مزدوروں کی اجتماعی سودے بازی کے اختیارات کو کچل رہے ہیں۔

ہٹلر نے ہڑتال پر پابندی عائد کر دی، اس کے مزدور تنظیموں کو ختم کر دیا گیا، ان کی جگہ کے ذریعہ قائم کمیٹیاں نامزد کر دی گئی تھیں۔ نازی جرمنی کا مورخ شیئرر تبصرہ کرتا ہے۔

'جرمنی میں ہٹلر سے لے کر نیچے تک کے ترجمان سرمایہ داری برژوا ڈھنگ کے ڈھانچے کی مذمت کرتے تھے اور مزدوروں کے ساتھ اپنی ایکتا بتاتے تھے۔ لیکن معاشی تجزیہ سے یہ واضح ہے کہ نازی پالیسیوں سے سرمایہ دار کافی فائدہ میں رہے نہ کہ مزدور۔'

ایمرجنسی سے کمیونسٹ پارٹی سب سے زیادہ ننگی ہوئی۔ انہوں نے سرکار کے تمام مزدور مخالف اقدامات کو انتہائی بزدلی سے قبول کر لیا۔ اگر اب بھی اسے ثابت کرنے کی ضرررت ہے کہ کمیونسٹ پارٹی مزدوروں کا بھلا کرنے کے کام میں لگی ہے تو حکومت کے تئیں ان کی بزدلانہ حمایت سے یہ ثابت ہو جاتا ہے۔ جب تک نئی دہلی اور ماسکو سے تعلقات اچھے رہتے ہیں تب تک کمیونسٹ پارٹی کا کردار کانگریس کی حاشیہ برداری کے علاوہ کچھ نہیں ہو سکتا۔ تاریخی پس منظر کے اس مضمون کے بارے میں نازی جرمنی میں کمیونسٹوں کے کردار کے بارے میں شرر کا قابلِ ذکر بیان ہے۔

'کمیونسٹ ماسکو کے کہنے پر پہلے سوشل ڈیموکریٹ پارٹی، سوشلسٹ ٹریڈ یونین اور بچے ہوئے مڈل کلاس طبقہ جمہوری اداروں کو ختم کرنے کی بے وقوفی کے خیالات سے متاثر رہے۔ غلط فہمی یہ بھی تھی کہ اس سے شروع میں نازی اقتدار کو طاقت ملے گی لیکن یہ ناپائیدار ہوگی، اس سے سرمایہ داری ختم ہو جائے گی، اس کے بعد کمیونسٹ اقتدار پر قائم ہوں گے۔'

روزانہ ہم ریڈیو اور اخبارات کے ذریعہ جانتے ہیں کہ فلاں فلاں جگہ نااہلیت اور بدعنوانی کی وجہ سے اتنے افسران معطل کر دیئے گئے یا لازمی طور سے انہیں چھٹی پر بھیج دیا گیا۔ آکاشوانی سے رات دن اس طرح کے اعلانات جاری ہوتے ہیں کہ انکم ٹیکس افسران نے فلاں صنعتکار یا تاجر کے یہاں چھاپہ مارا۔ اس سے یہ سوچ پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ سرکاری انتظامیہ، صنعت و تجارت سے بدعنوانی کو ختم کرنے کے لئے بڑے پیمانے پر مہم چلا رہی ہے۔

ان 4 مہینوں میں ہم نے ایک بھی ایسی مثال نہیں سنی کہ فلاں کانگریس کے وزیر، ممبر پارلیمنٹ یا ممبر اسمبلی کے خلاف بدعنوانی یا ٹیکس چوری یا دیگر کسی وجہ سے کوئی کارروائی کی گئی ہو۔

یہ انتہائی حیرت انگیز لیکن اہم ہے۔ یہ بغیر کسی تنازع کے سچ ہے کہ انتظامیہ، صنعت اور تجارتی دنیا کی بدعنوانی کی جڑیں سیاسی بدعنوانی میں ہیں۔ سنفانم کمیٹی اور انتظامیہ میں اصلاح کی کمیٹی نے اس مسئلہ پر گہرائی میں جا کر سیاسی بدعنوانی کو ختم کرنے کے لئے ٹھوس مشورہ دیئے تھے۔ جے پی تحریک کا اہم نشانہ بدعنوانی ہی تھی لیکن حکومت اس مسئلے پر آنکھ کان بند کر کے چادر تان کر سوئی ہوئی ہے۔ پارٹی کے ساتھوں کی بدعنوانی نے مسز گاندھی کو کبھی متفکر نہیں کیا۔ ہٹلر بھی اس کے بارے میں پوری طرح آنکھ بند کئے ہوئے تھا۔ شیئرر نے طنز کرتے ہوئے لکھا ہے۔

'ہٹلر فطری طور پر بہت بد اخلاق تھا لیکن ایک انسانی حالت یعنی فرد کی ذمہ داری کے بارے میں حیرت انگیز طور سے بہت بہتر تھا۔ نازی

پارٹی کو چھوڑ کر کوئی بھی دوسری پارٹی مشتبہ کردار کے اشخاص کو اتنی بڑی تعداد میں متوجہ نہیں کر پائی۔ ہٹلر ان کی تب تک کوئی فکر نہیں کرتا تھا جب تک وہ اس کے لئے سودمند ہوتے تھے۔'

اس سے یہ بھی نتیجہ نکلتا ہے کہ نوکر شاہی، صنعت اور تجارتی سیکٹر کے خلاف جو سخت قدم اٹھائے گئے ان کا مقصد کیچڑ کا صاف کرنا نہیں تھا، یہ تو ملک کے حالات پر پارٹی کی پکڑ بڑھانے کی سیاست کا ایک حصہ تھا۔ یہ ایک ادھینا تک وادی اسکیم کا ہی ایک پروگرام تھا۔

ایمرجنسی کے ابتدائی کچھ ہفتوں میں اشیاء کی قیمتوں کے گھٹنے کی کافی چرچا ہوئی۔ کچھ عرصہ بعد یہ دب گئی۔ اب یہ قبول کیا جانے لگا کہ قیمتیں پھر بڑھ رہی ہیں۔

اعداد کی بات الگ ہے مگر عام آدمی جانتا ہے کہ جہاں تک معاشی بدانتظامی کا سوال ہے ایمرجنسی کی حالت نے ذرہ برابر بھی اثر نہیں ڈالا ہے۔ عام طور سے سبھی اپوزیشن پارٹیاں مانتی ہیں کہ جب تک معاشی پالیسیوں میں بنیادی تبدیلی کر کے گاندھی وادی ڈھانچہ قائم کر کے معاشیت کا راستہ نہیں اپنایا جاتا تب تک عام آدمی کی حالت بہتر نہیں ہوسکتی۔ صرف بیان بازی سے کام نہیں چلے گا۔

ایمرجنسی کے ذریعہ پیدا کیا گیا سوال یہ نہیں ہے کہ ملک کے لئے کون سی معاشی پالیسی بہتر ہوسکتی ہے۔ بہتر وقت پر مسابقتی سیاسی موقف اس پر غور کر سکتے ہیں۔

آج کے حالات میں پیدا ہونے والے سوال سیاسی مقابلہ سے الگ اور کہیں بڑا سوال ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہم سیاسی اور سماجی، معاشی نظریے اور اسے ظاہر کرنے کی آزادی، مواقع اور قانون کی نگاہ میں برابری کے حقوق کے آئینی وعدوں کو مسز گاندھی پر نچھاور کر سکتے ہیں جو خود کو ملک کے لئے لازمی سمجھنے کی مریضہ ہیں؟

شخصیت کی بالادستی کی روایت اور جمہوریت ایک ساتھ نہیں چل سکتے۔

گزشتہ دو سال سے جے پرکاش نارائن اور ان کے ساتھی ملک کو یہ انتباہ دیتے رہے ہیں کہ ہندوستانی جمہوریت کو بھیانک خطرہ ہے اور صرف عوامی طاقت کی بیداری ہی اسے بچا سکتی ہے۔ ان کی مہم کا یہ مطلب تھا کہ یہ حکومت اس وقت کسی بھی حد تک جا سکتی ہے جب اسے اپنی حکومت پر سنگین خطرہ آتا نظر آئے گا۔

12 رجون کو دو اہم واقعات ہوئے۔ الٰہ آباد ہائی کورٹ کے فیصلے سے مسز گاندھی کا انتخاب غیر قانونی قرار دیا گیا اور انہیں 6 سال کے لئے انتخاب لڑنے کا نااہل قرار دیا گیا۔ اسی دن گجرات کے عوام نے کانگریس سے اقتدار چھین لیا اور جے پی تحریک کی حامی پارٹیوں سے بنی جنتا مورچہ کو اقتدار میں کھڑا کر دیا۔

عدالت اور عوام کے فیصلے نے وزیراعظم کے طور پر مسز گاندھی کے لئے سنگین خطرہ پیدا کر دیا۔ ملک کی اندرونی بدانتظامی سیکورٹی کی سازش اور خطرے کی وجہ سے نہیں بلکہ اس سیاسی خطرے کی وجہ سے ایمرجنسی نافذ کی گئی۔

واٹر گیٹ اسکینڈل کا سب سے شاندار تجزیہ کرتے ہوئے اپنی کتاب 'دی فال آف رچرڈ نکسن' میں تھیوڈور ایچ وہائٹ کا یہ تبصرہ اہم ہے—

'رچرڈ نکسن کا حقیقی جرم یہ ہے کہ اس نے ایک اعتماد کو توڑا جو امریکہ کو متحد کئے ہوئے ہے۔ اسی لئے اسے اقتدار سے ہٹا دیا گیا۔ منتشر اعتماد اہم ہے۔ یہ کہ امریکی زندگی میں کم سے کم ایک ایسا شخص ہے جو قانون کا محافظ ہے۔ اسے یہ یقین ہے کہ قانون کے سامنے

سبھی برابر ہیں اور وہ کم سے کم ایک شخص کے ذریعہ محفوظ ہیں۔ خواہ اس اعتماد کا دوسرے عام دنوں میں کتنی ہی تردید ہوتی لیکن ایک نکتہ پر یعنی صدر کے سامنے انصاف کے معاملے میں کوئی غلط فہمی نہیں ہو سکتی۔'

مسز گاندھی نے ایمرجنسی کا ذکر ایک شاک ٹریٹمنٹ کے طور پر کیا ہے۔ ہمارے آئین سازوں نے ایمرجنسی حالات کا التزام کرتے ہوئے اس کا تصور بھی نہیں کیا ہوگا۔ یقیناً دھچکا تو لگا، اس نے انہیں بھی 'شاک' لگایا ہے جنہیں جے پی کے مستقبل کے تجزیہ میں شبہ تھا۔ زیادہ افسوس یہ ہے کہ اس جھٹکے نے کئی ایک کو ہندوستان میں جمہوریت کے مستقبل کے بارے میں شبہ میں مبتلا کر دیا ہے۔

اس یقین کو دوبارہ قائم کرنے کے بارے میں سوچنے سمجھنے والے ہر ہندوستان کو خود غور کرنا چاہئے۔ یہ کیسے کیا جائے، اس کے بارے میں ہر شخص کو اپنی اپنی سطح پر فیصلہ کرنا ہے لیکن ایک بات ہم سب کے لئے کرنے کے لائق ہے کہ خوف سے آزاد ہوں اور سچائی کو ہم جیسا بھی دیکھتے ہیں ظاہر کریں۔ یہ اپنے کام میں جمہوریت کے لئے چھوٹا سا تعاون نہیں ہوگا۔

ضمیمہ-4

بی جے پی کی اجودھیا پر پالم پور تجویز

بھارتیہ جنتا پارٹی کی 1989 میں پالم پور، ہماچل پردیش میں ہونے والی قومی عاملہ مجلس کی میٹنگ میں مندرجہ ذیل تاریخی قرار داد پاس کی گئی۔

بھارتیہ جنتا پارٹی کی قومی مجلس عاملہ کا یہ فیصلہ ہے کہ رام جنم بھومی کے سوال پر ہونے والی بحث اس بات کی مثال ہے کہ عام طور سے سبھی سیاسی پارٹیاں خاص کر کانگریس ملک کے اکثریتی سماج یعنی ہندوؤں کے جذبات کو کس طرح نظر انداز کر سکتی ہے۔

اگر چہ اس بات کے لئے کوشش ہوتی رہی کہ مسلمانوں کو ہندوؤں کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے اس مقام پر اپنے دعوے کو چھوڑنے کے لئے منا لیا جائے۔ تاہم یہ مقام بہت دنوں سے مقدمے بازی کا مسئلہ رہا ہے۔

حال میں کانگریس حکومت نے بھارتیہ جنتا پارٹی اور وشو ہندو پریشد کے خلاف ایک زہریلی مہم شروع کر دی ہے۔ اس میں یہ الزام لگایا گیا ہے کہ دونوں پارٹیاں حکومت کے ساتھ بات چیت میں ہندوؤں کی نمائندگی کرتے رہے ہیں، لیکن جب دوسرے کچھ طبقوں نے اس تنازع کو الہ آباد ہائی کورٹ کو سونپنے کی بات مان لی تب بی جے پی اور وشو ہندو پریشد اس معاملے میں عدالتی فیصلے کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ یہ مہم صرف بدنام کرنے کے مقصد سے حقائق کو غلط ڈھنگ سے پیش کر رہی ہے۔

بھارتیہ جنتا پارٹی کا یہ خیال ہے کہ اس تنازع کی شکل ایسی ہے کہ اسے کسی عدالت کے ذریعہ حل نہیں کیا جا سکتا۔ کوئی بھی عدالت مالکانہ، ناجائز قبضہ وغیرہ کے بارے میں تو فیصلہ دے سکتی ہے لیکن اس بارے میں کوئی عدالت فیصلہ نہیں دے سکتی کہ کیا حقیقت میں بابر نے اجودھیا پر حملہ کیا تھا اور وہاں ایک مندر کو منہدم کر کے اس جگہ پر ایک مسجد بنوائی تھی۔ اگر کسی معاملے میں کوئی عدالت ایسے حقائق کے بارے میں کوئی فیصلہ دیتی ہے تو بھی وہ ماضی میں کی گئی انہدامی کارروائی کی تعمیر نو کے لئے کوئی تدبیر نہیں دے سکتی۔ بہت پہلے (1885 میں) ایک جج کرنل ایف ای اے شیمیئر نے اس جگہ کے بارے میں ایک دیوانی اپیل کا فیصلہ دیتے ہوئے بالکل ناامیدی کے ساتھ مندرجہ ذیل باتیں کہی تھیں۔

'یہ انتہائی بدقسمتی کی بات ہے کہ ایسی جگہ پر کوئی مسجد بنائی گئی جسے ہندو بہت زیادہ مقدس مانتے ہیں لیکن چونکہ یہ واقعہ 356 سال پہلے رونما ہوا تھا، اس لئے بہت دیر ہو جانے کی وجہ سے اس شکایت کو دور نہیں کیا جا سکتا......'

(ضلع کچہری، فیض آباد میں 1885 دیوانی اپیل نمبر 27، مورخہ 18 / مارچ 1886)

اس سلسلے میں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ حالیہ بدامنی 1951 اور 1956 کے دو عدالتی فیصلوں سے پیدا ہوئی ہے۔ 3 / مارچ 1951 کو گوپال سنگھ وشارد بنام ظہور احمد اور دیگر کے معاملے میں سول جج فیض آباد نے دیگر باتوں کے ساتھ ساتھ مندرجہ ذیل تبصرہ بھی کیا تھا—

'......کم سے کم 1936 کے بعد مسلمانوں نے نہ تو اس جگہ کا استعمال کسی مسجد کی شکل میں کیا ہے اور نہ ہی یہاں پر نماز ادا کی ہے، جب کہ ہندو اس متنازع مقام پر پوجا پاٹ کرتے رہے ہیں۔'

اس کے بعد یکم فروری 1986 کو فیض آباد کے ضلع جج نے 1951 کے اسی حکم کا ذکر کرتے ہوئے یہ ہدایت دی تھی کہ چونکہ 'گزشتہ 35 برسوں سے ہندوؤں کو بغیر کسی روک ٹوک کے پوجا پاٹ کرنے کا اختیار حاصل ہے، اس لئے 1951 میں نسق ونسق کی بنیاد پر اس مقام پر دونوں دروازوں پر لگائے گئے تالے ہٹا دیئے جائیں۔ (1986 کی سول اپیل نمبر 6)

1951 کے حکم پر کوئی ردعمل نہیں ہوا تھا، اس وقت تک سیکولر ہندوؤں کو چڑانے کے لئے یہ بہانہ نہیں بنا تھا جیسا کہ آج کل ہو رہا ہے۔ یہ بات دھیان دینے کے لائق ہے کہ تقریباً اسی وقت پنڈت نہرو اور سردار پٹیل کی قیادت میں اور گاندھی جی کے آشیرواد سے خود حکومت ہند نے اسی قسم کی ایک دوسری انہدامی کی تعمیر نو کے ذریعہ پربھاش پاٹن (گجرات) عظیم سومناتھ مندر کو دوبارہ قابلِ فخر شکل دینے کا فیصلہ کیا تھا۔

جب سومناتھ مندر میں باقاعدہ جیوتی لنگ قائم کی گئی تھی تو ہمارے صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرساد نے بھی اس تقریب میں شرکت کی تھی۔

1986 میں عدالت کے دوسرے حکم کے وقت تک تو سیکولر ازم ہندوؤں سے نفرت اور اقلیت نوازی کی علامت بن چکی تھی۔ ملک میں مسلم لیگ حامیوں نے نئے سرے سے دہشت گردی اور حملہ آور انہ رویہ اپنا لیا تھا۔ 1986 میں شاہ بانو کے معاملوں میں ہائی کورٹ کے فیصلے کے خلاف ان لیگ حامیوں نے ایک تحریک چلائی تھی اور اس کا بھرپور فائدہ انہیں ملا تھا۔ خوف زدہ حکومت نے آئین میں ترمیم کرکے قانون بنا کر ہائی کورٹ کے فیصلے کو رد کر دیا تھا۔ اس طرح مسلم لیگ حامیوں کے منہ میں خون لگ گیا۔ نتیجتاً انہوں نے فیض آباد کورٹ کے فیصلے کے خلاف 'بابری مسجد ایکشن کمیٹی' بنا کر ایک زہریلا حملہ شروع کر دیا اور ان احکامات کا بائیکاٹ کرنے تک کا اعلان کر دیا۔ پارلیمنٹ ہاؤس کے سامنے ان لوگوں نے جو ریلی کی تھی اس میں یہ دھمکی بھی دی گئی کہ اگر ان احکامات کو بدلا نہیں گیا تو ملک میں تشدد پھیل جائے گا۔ یہ خاص طور سے قابلِ ذکر ہے کہ بابری مسجد ایکشن کمیٹی کے زیادہ تر ممبران کانگریسی تھے۔

اس پس منظر میں اس سوال کو ہائی کورٹ کو سونپا جانا۔ ان سارے مسئلے کو تھوڑی دیر کے لئے آنکھوں سے اوجھل کر دینے کا ایک طریقہ ہے۔ یہ مسلم لیگ کے حامیوں کو مطمئن کرتا ہے، اس لئے انتخابی نظریہ سے بھی سودمند ہے لیکن اس سے اس مسئلے کے حل میں حکومت کی نیک نیتی بالکل ظاہر نہیں ہوتی۔

بھارتیہ جنتا پارٹی کا یہ یقین ہے کہ مذہبی ریاست ہماری تاریخ اور روایات کے موافق ہے۔ اسی وجہ سے 1947 میں ملک کی تقسیم مذہبی بنیاد پر ہونے کے باوجود اور پاکستان کے ذریعہ خود کو اسلامی اسٹیٹ کے اعلان کرنے کے باوجود ہندوستان نے اپنے لئے حالیہ آئین کو ہی قبول کیا اور سبھی شہریوں کو برابری کی گارنٹی دی، خواہ ان کا دھرم کچھ بھی ہو۔

ہمارے آئین سازوں کے مطابق 'سیکولرازم' کا مطلب 'سرو پنتھ سمبھاؤ' تھا۔ اس کا مطلب بغیر مذہب والی ریاست نہیں تھا۔ اس کا

مطلب اپنی تاریخ اور ثقافتی وراثت کو ٹھکرا دینا بھی قطعی نہیں تھا۔

قومی مجلس عاملہ ان شیعہ لیڈروں کی کوششوں کی تعریف کرتی ہے جنہوں نے اپنے ہم مذہبوں سے یہ منوانے کی کوشش کی کہ کسی دوسرے مذہب کے ماننے والوں کی عبادت کی جگہ پر کوئی مسجد بنانا اسلام کے اصولوں کے خلاف ہے، اس لئے اس متنازع مقام کو ہندوؤں کو سونپ دینا چاہئے اور کسی دوسری مناسب جگہ پر مسجد بنا لینی چاہئے۔ بی جے پی نے راجیو حکومت سے کہا کہ اجودھیا کے سلسلے میں وہی مثبت رخ اپنائیں جیسا کہ نہرو حکومت نے سومناتھ کے بارے میں اپنایا تھا۔ لوگوں کے جذبات کا احترام کیا جائے اور رام جنم بھومی کو ہندوؤں کو سونپ دیا جائے، اگر ممکن ہو تو بات چیت کے ذریعہ سمجھوتہ کیا جائے یا قانونی کاروائی کے ذریعہ۔ یقینی طور سے قانونی کاروائی کوئی حل نہیں ہے۔

ضمیمہ-5

دی کراچی کونسل آن فارن ریلیشنز، اکنامک افیئرز اینڈ لاء کے ذریعہ منعقد تقریب میں لال کرشن آڈوانی کی تقریر

کراچی، 5 جون 2005

غیر ممالک جانے پر ہمیں وہاں پر دانشور طبقہ سے بات کرنے کا اگر موقع ملتا ہے تو بہت پُر لطف ہوتا ہے، لیکن جس ملک کا دورہ کر رہے ہوں، وہ پاکستان ہو اور جہاں اس کی جائے پیدائش بھی ہو، دانشوروں سے بات کرنے کا موقع ملے تو وہ احساسات کیسے بتائیں؟ وہ تو ظاہر ہوتا ہے 'خوشی'! 'بہت خوشی'! 'جوش وخروش'!

لیکن سچ کہوں تو مجھے اس موقع کے لئے الفاظ بھی بڑے عام لگتے ہیں۔ سچائی تو یہ ہے کہ کراچی کی میٹنگ میں ان احساسات کو بیان کرنے کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہے۔ یہ موقع مجھے 6 دہائی قبل کراچی چھوڑنے کے بعد دوسری بار ملا ہے۔

کراچی اتنا بدل گیا ہے کہ پہچاننا مشکل ہے — نہ صرف اس وقت کے مقابلہ میں جب میں نے 1947 میں اسے چھوڑا تھا بلکہ اس کے بعد جب میں 1978 میں یہاں آخری بار آیا تھا تب کے بہ نسبت یہاں کافی تبدیلی آگئی ہے۔ اس شہر کی آبادی بہت زیادہ ہوگئی ہے۔ 1947 میں اس کی آبادی محض 4 لاکھ تھی۔ مجھے بتایا گیا کہ آج یہ تقریباً 1.4 کروڑ ہے۔ ساتھ ہی کراچی بہت زیادہ ترقی اور خوشحال بھی ہوگیا ہے۔

میں اس حصولیابی کے لئے کراچی کے لوگوں کو مبارک باد دوں گا اور امید کروں گا کہ نہ صرف کراچی بلکہ پورا پاکستان چہار رخی ترقی اور خوشحالی کی شاہراہ پر مسلسل آگے بڑھتا رہے۔

اپنی بنیاد کی جانب

دوستو! شام میں عشائیہ کے علاوہ یہ تقریب میرے ہفتہ بھر کے پاکستان دورے کا آخری پڑاؤ ہے۔ میرے دورے کے 3 حصے رہے۔ پہلے مرحلہ میں اسلام آباد میں دو دن خاص طور سے سیاسی تھے۔ دوسرے مرحلہ میں، جس کا مطلب ہے لاہور میں 2 دن، وہ نصف سیاسی اور نصف مذہبی وثقافتی تھے۔ کیونکہ اس میں قدیم کٹاس راج مندر اور ننکانا صاحب گرودوارہ کا دورہ شامل تھا۔

لیکن آخری حصہ میں کراچی میں دو دن پوری طرح سے جذباتی ہیں۔ پاکستان آنے سے قبل میں نے کہا تھا کہ میرے دورے کا اہم مقصد ہے — پاکستان قیادت کے ساتھ میٹنگیں کر کے اور اس ملک کی مختلف سیاسی پارٹیوں اور سماجی تنظیموں کے نمائندوں سے ملاقات کر کے پاکستان اور ہندوستان کے درمیان جاری امن عمل کی رفتار کو بڑھانے میں اپنا تعاون دینا، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی کہا تھا کہ یہ ایک طرح سے میرے لئے اور میرے گھر والوں کے لئے جو پہلی بار پاکستان آئے ہیں، اپنی جڑ کے جانب لوٹنے کے برابر ہے۔

وہ اسکول جہاں میں نے پڑھائی کی تھی، اور وہ گھر جہاں میں رہا کرتا تھا (اگرچہ وہ اب اپنی اصل شکل میں نہیں ہے) سندھ کی جڑ اسمبلی ہاؤس جہاں میں پاکستان پیپلز پارٹی کے لیڈروں سے ملا، ہندو پنچایت کے ذریعہ دعوت اور ثقافتی پروگرام اور سندھ کے وزیر اعلیٰ کے ذریعہ ظہرانہ، یہ سبھی میری یادوں میں نقش رہیں گے۔

11 / اگست 1947: جناح کی تقریر

کراچی میں زندگی کے پہلے 20 سال میرے ذہن پر نقش ہیں۔ یہاں میں ان میں سے صرف ایک کا ذکر کر رہا ہوں۔ کیونکہ جس شخص کے ساتھ میری یادیں وابستہ ہیں اور کراچی میں ان کے درشن سے میں نے جو سیکھا اس کا میری زندگی میں بہت عقیدت اور اونچا مقام ہے۔

میں کراچی میں اپنی زندگی کے آخری 4-3 برسوں میں سوامی رنگ ناتھ آنند کے رابطہ میں آیا جو 1942 سے 1948 میں بند ہونے تک رام کرشن مٹھ کے سربراہ تھے۔ میں بھگوت گیتا پر ان کی تقریر سننے جایا کرتا تھا۔ بعد کے برسوں میں سوامی وویکا نند کے اس عظیم شاعر کے ساتھ میرا مسلسل رابطہ رہا جو بعد میں ہندوستان میں رام کرشن مٹھ اور مشن کے سربراہ بن گئے۔

سوامی رنگ ناتھ آنند کا انتقال اس سال اپریل میں ہوا۔ میں ان سے آخری بار گزشتہ سال کلکتہ میں ملا تھا۔ وہ 96 سال کے تھے، لیکن جسمانی طور سے چاق و چوبند اور پھرتیلے۔ ہماری بات چیت دوسری باتوں کے علاوہ کراچی میں میرے اور ان کے گزرے ہوئے برسوں کی جانب مڑ گئی۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا 'کیا تم نے محمد علی جناح کے ذریعہ 11 / اگست 1947 کو پاکستان آئین ساز اسمبلی میں دی گئی تقریر کو پڑھا ہے؟ یہ ایک سیکولر اسٹیٹ کی اعلیٰ تعریف ہے، ایک ایسا اسٹیٹ جو ہر شہری کو اپنا مذہب ماننے کی آزادی دیتا ہے، لیکن ریاست کسی ایک شہری سے دوسرے شہری میں مذہب کی بنیاد پر بھید بھاؤ نہیں کرتی'

انہوں نے مجھے اس تقریر کا پورا متن بھیجنے کے لئے کہا جو میں نے بھیج دیا۔

میرے ذریعہ آئین ساز اسمبلی میں جناح کی تاریخی تقریر کا ذکر کرنے کے پس پشت دو وجوہات کارفرما ہیں۔ پہلی، جیسا کہ میں نے کہا، یہ سوامی جی جو ہندوستان کی ایک عظیم روحانی ہستی تھے، سے میری آخری بات چیت سے جڑی ہوئی تھیں۔ دوسری، 4 دن قبل چکوال ضلع کے قدیم کٹاس راج مندروں کے دورہ نے میری یادوں کو تازہ کر دیا۔ حکومت پاکستان نے دریا دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھے ان مندروں کی تعمیر نو کے پروجیکٹ کا افتتاح کرنے کے لئے مدعو کیا، جواب صرف یادیں ہیں لیکن جن کی کہانیاں مہابھارت میں مذکور ہیں۔

مجھے لگتا ہے کہ یہاں جناح کی تقریر کے حصے کا ذکر کرنا مناسب ہوگا —

'اب اگر ہم پاکستان 'اسٹیٹ' کو خوشحال اور ترقی یافتہ دیکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں مکمل طور سے عوامی بہبود پر اپنی توجہ مرتکز کرنی پڑے گی اور خاص طور سے عام لوگوں اور غریبوں کی بھلائی پر۔ اگر ہم اسے تعاون کے جذبے سے کام کریں گے اور ماضی کو بھلا کر، تلخی کو ختم کر کے کام

کریں گے تو آپ کو یقیناً کامیابی ملے گی۔ اگر آپ اپنے ماضی کو فراموش کر کے اور ہر شخص کو اپنا سمجھ کر کام کریں گے، خواہ وہ کسی بھی فرقہ سے ہو، اس کے ماضی میں آپ کے ساتھ کیسا بھی تعلق رہا ہو، اس کا کوئی بھی رنگ ہو، ذات ہو یا نسل ہو۔ پہلی، دوسری اور آخری شکل میں اس اسٹیٹ کا شہری ہوگا، اسٹیٹ میں اس کے یکساں حقوق، خصوصی اختیارات اور ذمہ داریاں ہوں گی۔ اگر آپ ایسی راہ پر چلیں گے تو آپ کی کامیابی کی کوئی انتہا نہیں ہوگی۔

میں اس بات کو جتنا زور دے کر کہوں اتنا کم ہے۔ ہم اسی جذبہ کے ساتھ کام کریں گے اور وقت کے ساتھ ساتھ اقلیتی و اکثریتی فرقہ یعنی ہندو اور مسلم فرقہ جیسے بھید بھاؤ ختم ہو جائیں گے۔ حقیقت میں آپ مجھ سے پوچھیں تو ہندوستان کے سامنے آزادی اور آزادی کے حصول کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی رہی تھی، ورنہ ہم بہت پہلے ہی آزاد ہو چکے ہوتے۔

اس لئے ہمیں اس سے سبق سیکھنا ہوگا۔ آپ آزاد ہیں، آپ اپنے مندروں میں جانے کے لئے آزاد ہیں۔...... آپ مسجد جا سکتے ہیں یا پاکستان 'اسٹیٹ' میں کسی بھی عبادت گاہ میں جا سکتے ہیں، آپ کسی بھی مذہب، ذات یا نسل کے ہو سکتے ہیں۔ ریاست کا اس سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہندو ہندو نہیں رہیں گے اور مسلم مسلم نہیں رہیں گے۔— مذہبی معنوں میں نہیں، کیونکہ مذہب فرد کا ذاتی معاملہ ہے— لیکن سیاسی معاملوں میں اسٹیٹ کے شہری کے شکل میں۔'

اس تقریر میں جو کہا گیا— خاص طور سے اسٹیٹ کے نظریہ میں سبھی شہریوں کو یکساں اور سبھی شہریوں کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کی آزادی— ہندوستان میں ہم اسے ہی سیکولرازم یا ایک غیر مذہبی ملک کہتے ہیں۔ اس طرح کے ملک میں مذہب کے نام پر شدت، نفرت، بھید بھاؤ کے لئے کوئی جگہ نہیں ہوتی۔ یقینی طور سے ایسے اسٹیٹ میں مذہبی شدت پسندوں اور دہشت گردوں کو اسٹیٹ کا کوئی تحفظ حاصل نہیں ہوتا۔

میرا ماننا ہے کہ اس طرح کے آدرش پر عمل آوری ماضی میں غیر منقسم ہندوستان کے حصہ رہنے والے 3 خودمختار اور آزاد ممالک— ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش— کو کرنا چاہئے، جن کی ایک مشترکہ وراثت ہے۔ میرا یقین ہے کہ اس پر انتہائی جوش و خروش کے ساتھ عمل کیا جائے گا اور کٹاس راج مندروں کی تعمیر نو اس کی اچھی شروعات ہے۔

تقسیم کی غلطیوں کی اصلاح کرنے کا وقت

کراچی کے میرے محترم دوستو! لوگ مجھ سے اکثر پوچھتے ہیں' کیا اس کا مطلب ہے کہ آپ تقسیم کو ختم کرنا چاہتے ہیں؟'

میرا جواب ہے— 'تقسیم کو ختم نہیں کیا جا سکتا کیونکہ جیسا کہ میں نے لاہور میں سافما (SAFMA) کی تقریب میں کہا تھا، ہندوستان اور پاکستان دو الگ اور خودمختار ملکوں کے طور پر تعمیر تاریخ کی کبھی نہ بدلنے والی حقیقت ہے۔ پھر بھی تقسیم کی کچھ غلطیوں کی اصلاح کی جا سکتی ہے اور ایسا کرنا بھی چاہئے۔'

میں اس دن کا خواب دیکھتا ہوں جس دن منقسم دن مل سکیں گے، جب بچھڑے ہوئے کنبوں کی دوبارہ ملاقات ہوگی، جب ایک ملک کے تیرتھ یاتری— ہندو، مسلم، سکھ— دوسرے ملک میں واقع مقدس مقامات پر آزادی سے آ جا سکیں گے، اور جب لوگ آزادی سے سفر اور تجارت کر سکیں گے، لیکن پھر بھی ان میں اپنے اصل ملک کے تئیں ایمانداری اور فخر کا جذبہ برقرار رہے گا۔

دوستو! اپنے دورہ کے آخر میں اگر کوئی مجھے حال میں ہند- پاک تعلقات کے حالات کو اختصار میں پیش کرنے کو کہے تو 30 مئی کی شام کو

پاکستان آمد سے لے کر اب تک میں نے جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا اس کی بنیاد پر میں واضح طور سے کہہ سکتا ہوں — 'فضا ضرور بدلی ہوئی ہے، بہت بدلی ہوئی ہے۔'

ہاں یہ سچ ہے کہ سرحد پر امن ہے جو اپنے آپ میں کوئی چھوٹی کامیابی نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ لوگوں میں بہتر انفرادی رابطہ قائم ہو رہا ہے جو پیش رفت کرنے کی سمت میں ایک اہم قدم ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں کے عوام نے امن عمل کو قبول کیا ہے۔

لیکن جو امن و امان قائم ہے وہ غیر مستقل ہے۔ یہ اس معاملے میں ثبوت ہے کہ جموں و کشمیر میں دہشت گردانہ سرگرمیوں کا خاتمہ نہیں ہوا ہے۔ گزشتہ مہینے ہی سری نگر میں دہشت گردوں نے معصوم اسکولی بچوں کو نشانہ بنا کر حملہ کیا۔

ہم اس جز وقتی امن کو کل وقتی امن کس طرح بنا سکتے ہیں؟ ہم کس طرح سے ہندوستان اور پاکستان کو دو طرفہ تعلقات کے معاملے میں سبھی طرح کے غیر منطقی نابرابریوں کو مٹا کر آپسی فائدہ کے اصول کی بنیاد پر آگے بڑھا سکتے ہیں؟

میں یہ سوال اس لئے پوچھ رہا ہوں کیونکہ ان پر ہمارے دونوں ممالک میں گہرائی اور کھلے دماغ سے بحث ہونی چاہئے۔ جیسا کہ میں نے اپنے دورے کے دوران متعدد مواقع پر دہرایا ہے کہ ہمیں اس تاریخی لمحہ جس میں امید پوشیدہ ہے، کو مضبوطی سے پکڑ لینا چاہئے۔ ہمیں اس امید کو یقین و اعتماد میں بدلنا چاہئے اور یہ عزم کرنا چاہئے کہ یقینی طور سے ان سبھی مسائل کا حل ڈھونڈ نکالیں گے جنہوں نے دو بھائی ملکوں کے درمیان دوری پیدا کی ہے۔

ہمیں کبھی بھی اس بات کو فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ہر معاملے کا حل گفت و شنید سے کیا جا سکتا ہے جس میں جموں و کشمیر کا مسئلہ بھی شامل ہے۔ امن کو کبھی غیر امن وسائل کی مدد سے حاصل نہیں کیا جا سکتا. یہ بات واضح طور سے سمجھ لینی چاہئے۔

امن کے لئے بڑی مہم

انگریزی میں ایک کہاوت ہے جو ہمیشہ تجسس پیدا کرتی ہے، وہ ہے — 'وینجنگ پیس'۔ اسے آپ امن کی مہم یا جنگی سطح پر امن کی کوشش کہہ سکتے ہیں۔ عام طور پر 'وینجنگ وار' کہاوت سننے میں آتی ہے۔ مجھے اکثر حیرت ہوتی ہے کہ امن کے بارے میں اس لفظ کا استعمال کیوں ہوتا ہے۔ شاید ایسا اس لئے ہے کہ اگر کسی جنگ میں جیت ہدف ہے تو امن قائم کرنے کے لئے بھی جیت کی یہی عزم مصمم کی ضرورت ہے۔

اگرچہ اس میں کافی اہم فرق ہے۔ جنگ میں پالیسی ساز جلدی سے جیت حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، وہ اپنا ہدف حاصل کرنے کے لئے بے چین رہتے ہیں، لیکن امن قائم کرنے میں آپ ایسا نہیں کر سکتے۔ ہمیں صبر رکھنا چاہئے، ہمیں یہ محسوس کرنا ہوگا کہ فاصلوں کو کم کرنے اور ایک قابلِ قبول حل ڈھونڈنے کے لئے، خاص طور سے پرانے مسئلوں کے لئے، وقت چاہئے۔

اس میں وقت لگتا ہے — اور میں ان سبھی سے درخواست کرتا ہوں جو ہندوستان اور پاکستان کے درمیان اس اہم سچائی کو قائم کرنا چاہتے ہیں — نہ صرف اس لئے کہ جس دردناک طریقہ سے 1947 میں تقسیم ہوئی، بلکہ اس کے بعد ہونے والی لڑائیوں نے پاکستان اور ہندوستان دونوں جگہ کے لوگوں کے دلوں میں جذبات کو سرد اور تلخ بنا دیا۔

آخر کار تقسیم کا نتیجہ تشدد میں تبدیل ہوا، بلکہ انسانیت کی تاریخ میں سرحد کے آر پار سب سے بڑی مہاجرت بھی ہوئی۔ غیر منقسم ہندوستان

سمیت راجاؤں اور ان کی آل اولادوں کو بکھرنا پڑا، اقتدار کی تبدیلی پرامن یا پرتشدد طریقے سے ہوئی لیکن حال کی صدیوں میں اس طرح کے واقعات نے سماج کو بہت زیادہ غیر مستحکم نہیں کیا۔

اس کے برعکس 1947 میں جب انگریز گئے تب نہ صرف اقتدار بدلا بلکہ بڑے پیمانے پر انسانوں کی مہاجرت بھی ہوئی۔ یہ اپنے پیچھے درد کی ایک کہانی چھوڑ گیا۔ دہشت گردانہ تشدد کی طویل مدت اور دیگر واقعات نے ہندوستان اور پاکستان دونوں کے سماج کے کچھ طبقوں میں سخت رویہ اپنانے میں تعاون دیا۔

یہی وجہ ہے کہ اکثر مثبت منشا سے امن کے قیام کے لئے کی جانے والی کوششوں کو بھی شبہ کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور دونوں فریقوں کے ذریعہ اسے نامنظور کر دیا جاتا ہے۔

اس لئے میں ان سبھی لوگوں سے جو ہند-پاک عمل سے جڑے ہوئے ہیں — جو حکومت میں ہیں جو مختلف سماجی تنظیموں سے جڑے ہیں، کہنا چاہوں گا کہ ان تجزیاتی نظریات کو بھی اہمیت دینی چاہئے۔ ان تجزیاتی نظریات کو مسترد کر کے کچھ بھی حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

ایسا اس لئے کیونکہ امن کے عمل کو ہندوستان میں اور یہاں جو لوگ شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں ان کی تعداد بہت زیادہ نہیں ہے، دوسرے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان مستقل امن قائم کرنے کے مقصد سے کی جا رہی کوششوں سے یہ ثابت ہے کہ ہمیں دونوں ممالک کے لوگوں اور سماج کے سبھی طبقوں کے خیالات کو ساتھ لے کر چلنا چاہئے۔

سبھی مسائل پر ساتھ ساتھ چلیں

میں اپنی بات ختم کرنے سے قبل خاص پوائنٹ کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ ہمارے لئے امن اور بہتر تعلقات کی سمت میں بڑھنے کے لئے سبھی ایشوز پر بات چیت کا عمل شروع کرنا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دونوں اسے مشترکہ مذاکرات عمل کہتے ہیں۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ پاکستان کے کئی لوگوں کا یہ بھی ماننا ہے کہ ہمیں سبھی ایشوز پر ساتھ ساتھ آگے بڑھنا چاہئے۔ جیسا کہ میں نے لاہور میں کہا تھا کہ یہ امن کے عمل کے مفاد میں نہیں ہوگا کہ کچھ ایشوز پر دھیمی رفتار اور دیگر ایشوز پر تیز رفتاری میں رکاوٹ بن جائے۔

یہاں میں صرف ان کچھ ایشوز کو بتانا چاہوں گا کہ کیسے ہندوستان اور پاکستان کئی مسئلوں سے جھیلتے رہے ہیں۔ مثال کے لئے میں جب سے یہاں آیا ہوں کوئی بھی ہندوستانی نیوز چینل نہیں دیکھ سکا ہوں کہ ہندوستان میں کیا ہو رہا ہے اور میرے پاکستان دورے کو کیسا کوریج دیا جا رہا ہے۔ بدقسمتی ہے کہ پاکستان میں کوئی شخص سی این این، بی بی سی، سی سی ٹی وی دیکھ سکتا ہے، لیکن کوئی ہندوستانی نیوز چینل نہیں۔

کئی دوسرے شعبوں میں بھی نابرابری واضح دکھائی دیتی ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان سرکاری تجارت تقریباً 25 کروڑ ڈالر کا ہوتا ہے جو آج کے گلوبلائزیشن کے دور میں بہت کم ہے، لیکن سرکاری طور سے، لیکن غیر سرکاری طور سے تجارت اس سے کم سے کم 5 گنا زیادہ ہے۔ کیا یہ بدقسمتی نہیں ہے کہ ہم اپنی آپسی مانگ کی پیداواروں کی خرید و فروخت دبئی اور سنگاپور کے ذریعہ کرتے ہیں اور اس طرح ان ممالک کو خوشحال بناتے ہیں لیکن اپنی سرحدوں سے تجارت نہیں کرتے جس سے ہمارے لوگوں کے لئے زیادہ روزگار اور تجارت کا موقع مل سکے۔ ایک دوسری مثال دیکھئے، پاکستان کی معیشت کو کسی دوسرے ملک کی آج کی معیشت کی طرح بڑے پیمانے پر انفارمیشن ٹکنالوجی کے وسائل کی ضرورت ہے اور مجھے بتایا گیا ہے کہ آپ اپنی مقامی آئی ٹی انڈسٹریز کی مانگ کو پورا کرنے کے لئے کئی مغربی ممالک سے مہنگے آئی ٹی سولیوشن خریدتے ہیں،

لیکن سرحد کے اس پار ہندوستان میں ہمارے پاس ترقی یافتہ آئی ٹی صنعت ہے جو پاکستان کے ساتھ تعاون کرنے اور سستے سولیوشن مہیا کرانے کے لئے تیار ہے۔ بدقسمتی ہے کہ وہ آئی ٹی سولیوشن جو مغربی ممالک کی کمپنیاں پوری دنیا میں فروخت کرتی ہیں ان کی پیداوار بنگلور، حیدرآباد، گڑگاؤں اور پنے میں ہوتی ہے۔

میں اس کا ذکر اس لئے کر رہا ہوں کیونکہ کراچی پاکستان کی تجارتی راجدھانی ہے۔ میں یہ بھی بتانا چاہوں گا کہ تاریخی نظریہ سے سندھ عالمی تجارت میں ہراول رہا ہے۔ قدیم دور میں ہمارے آباء واجداد تجارت کے لئے دور دراز ملکوں میں جاتے تھے۔ جیسے جدید دور میں سندھی تاجر نہایت کامیابی کے ساتھ اس کا مظاہرہ ہانگ کانگ، سنگاپور، لندن اور نیویارک میں کر رہے ہیں۔

گلوبلائزیشن کے دور میں تجارت اور کاروبار کا تعلق صرف دولت اور فائدہ سے نہیں ہے۔ یہ ایک دوسری طرح کا فائدہ بھی مہیا کرتے ہیں—— دونوں ممالک کے درمیان امن و آپسی تعاون کے تعلقات کو اور مضبوط بناتے ہیں۔

یہ خوشی کی بات ہے کہ جلد ہی منا باؤ اور کھوکراپار کے درمیان براڈ گیج ریل ٹریک قائم ہوگا۔ میں نے صدر مشرف سے کہا ہے کہ ہمیں کراچی اور ممبئی کے درمیان سمندری راستے کو دوبارہ شروع کرنا چاہئے۔ انہوں نے اس مشورے کو قبول کر لیا ہے۔ کراچی اور ممبئی میں ہمارے کامرس سفارتخانہ دوبارہ کھولنے کی بات جاری ہے۔

یہ بھی مبارک اشارے ہیں، لیکن اور بھی بہت کچھ کیا جا سکتا ہے۔ ہمیں آپسی اعتماد و یقین ہونا چاہئے کہ سبھی کاموں کو کرنا چاہئے وہ بھی جلد سے جلد۔

ان الفاظ کے ساتھ میں اپنی تقریر ختم کرتا ہوں۔ مجھے آپ لوگوں سے بات چیت کرنے کا موقع دینے کے لئے میں کراچی کونسل آن فارن ریلیشنز، اکنامک افیئرز اینڈ لاء کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ شکریہ!

ضمیمہ-6

بھارتیہ جنتا پارٹی: ماضی اور مستقبل

لال کرشن آڈوانی کے ذریعہ 19-18/ ستمبر 2005کو بی جے پی کی قومی عاملہ کی میٹنگ جو چنئی میں ہوئی کا خطاب۔ یہاں انہوں نے گزشتہ سال پاکستان دورے کے دوران پیدا ہونے والے تنازع کی وجہ سے پارٹی صدر کا عہدہ چھوڑنے کے فیصلے کا اعلان کیا۔

2005 بھارتیہ جنتا پارٹی کی سلور جوبلی سال کی شکل میں منایا جارہا ہے۔ 1980 میں اپنے قیام کے بعد بی جے پی ان کروڑوں ہندوؤں کے لئے روشن چراغ تھی جو ثقافتی قوم پرستی، قومی سیکورٹی، جمہوریت اور ترقیات کے آدرشوں کو سنوارے رکھنا چاہتی ہے۔ ہندوستان کے لوگ جانتے ہیں کہ مرکز میں 1998 اور 2004 کے درمیان حکومت کے 6 برسوں میں ہم نے اپنے ملک کو ان آدرشوں پر آگے بڑھانے کے لئے پورے جذبے سے کوشش کی۔ ہم اس کوشش میں کافی کامیاب بھی رہے۔ این ڈی اے حکومت نے ہندوستان کو دنیا کے اہم زمینی سیاسی اقتدار کی شکل میں قائم کرنے اور منظوری دلانے کی بنیاد ڈالی اور اسے ایک سمت دی۔ سیاسی مورچے پر ہماری سب سے بڑی کامیابی تھی کہ گزشتہ 25 برسوں میں ہندوستان کی سیاست دو اہم قطبوں میں سے ایک بن کر ابھری۔ ہم نے یہ بھی ثابت کر دیا کہ بی جے پی ایک غیر کانگریسی اتحاد حکومت مضبوطی کے ساتھ چلانے میں اہل ہے جو نہ صرف ہندوستان کی چہار رخی ترقی کو تیزی دے سکتی ہے بلکہ ماضی کے کئی مسائل کو حل بھی کر سکتی ہے۔

ذاتی طور سے مجھے اس بات کا فخر ہے کہ ہماری پہلی کانفرنس کی صدارت اٹل جی نے کی تھی اور اس دسمبر میں ممبئی میں منعقد ہونے والی پارٹی کی سلور جوبلی کانفرنس کی صدارت میرے ذریعہ کی جائے گی۔ میں نے اکتوبر 2004 میں پارٹی صدر کے طور پر یہ ذمہ داری اس لئے قبول کی کیونکہ وینکیا جی کی کچھ گھریلو پریشانیاں تھیں۔ اگرچہ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ ممبئی کانفرنس کے بعد میں یہ عہدہ چھوڑ دوں گا اور پارٹی کی کمان کسی دوسرے ساتھی کے ذریعہ سنبھال لی جائے گی۔

بھارتیہ جنتا پارٹی۔ راشٹریہ سویم سیوک سنگھ تعلقات

وقتاً فوقتاً اور سامنے آنے والے ایشوز کی بنیاد پر بی جے پی کی قیادت کو سنگھ کے عہدیداران سے صلاح ومشورہ لینے میں کوئی جھجھک نہیں ہوتی ہے۔ اس طرح کے صلاح ومشورہ کے بعد پارٹی اپنا آزادانہ فیصلہ لیتی ہے۔ ان میں سے کچھ فیصلے الگ ہو سکتے ہیں اور کچھ فیصلے راشٹریہ سویم

سیوک سنگھ اور 'سنگھ پریوار' کی دوسری تنظیموں کے ذریعہ بتائے گئے حالات سے بھی مختلف ہوئے ہیں۔

لیکن حال ہی میں یہ سوچ گھر کر گئی ہے کہ کوئی بھی سیاسی یا تنظیمی فیصلہ راشٹریہ سویم سیوک سنگھ کی مرضی کے بغیر نہیں لیا جاتا۔ ہماری ایسی سوچ سے نہ تو پارٹی کو فائدہ ہوگا اور نہ ہی سنگھ کو۔ راشٹریہ سویم سیوک سنگھ بھی ایسا مانتا ہے کہ اس طرح کی سوچ اس کی شخصی تعمیر اور ملکی تعمیر کے عظیم مقاصد کو بونا کر دے گا۔ سنگھ اور بی جے پی دونوں کو ہی اس سوچ کو دور کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

ہمیں لگتا ہے کہ سنگھ کو ماضی کی طرح ہی بی جے پی کے کارکنوں اور عہدیداران کو مضبوط اخلاقی اور آدرش وادی رسم و رواج دینے کے اپنے کردار کو جاری رکھنا چاہئے۔ یہ ملک کے مفاد میں ہوگا۔

بھارتیہ جنتا پارٹی راشٹریہ سویم سیوک سنگھ اور اس کی دوسری تنظیموں کے ساتھ مسلسل رابطہ اور بات چیت کی بہت زیادہ ستائش کرتی ہے۔ ان کے خیالات ہمارے تعمیری کاموں میں بیش قیمت معلومات حاصل کرتے ہیں لیکن بی جے پی ایک سیاسی پارٹی کے طور پر عوام کو جواب دہ ہے اور اس کی کارکردگی کی تفتیش انتخابات کے وقت ہوتی ہے، اس لئے ایک جمہوری اور کثیر جماعتی سیاست میں بی جے پی جیسی اصول پرست پارٹی کو کس طریقے سے کام کرنا ہوگا کہ یہ اپنے بنیادی اصولوں پر قائم رہتے ہوئے خود کو توسیع دے، سبھی نظریات کے لوگوں کے ایک بڑے طبقہ تک پہنچے۔

بی جے پی کی اصولی شبیہ کو محفوظ کرنے اور مثبت ڈھنگ سے لوگوں کو سمجھانے کی سمت میں بہت زیادہ دھیان دینے کی ضرورت ہے۔ بی جے پی میں ہمارے لئے پنڈت دین دیال اپادھیائے ایک آدرش ہیں۔ ہم نے انہیں پارٹی کے اصولوں کی تعریف کرتے ہوئے دیکھا ہے مثلاً 'اکھنڈ بھارت' کے بارے میں ان کی پالیسی واضح اور مستحکم ہے۔ اس میں لچیلا پن اور اخلاص ہے۔

راشٹریہ سویم سیوک سنگھ ایک قوم پرست تنظیم ہے جس کا کروڑوں لوگوں کا کردار تعمیر کرنے اور ان میں حب الوطنی، آدرش واد اور مادر وطن کی بے لوث خدمت کرنے کا جذبہ پیدا کرنے میں معاون رہا ہے۔ یہ وہ تنظیم ہے جس نے عوامی خدمات کے لئے لاکھوں لوگوں کو سیاست کے ذریعہ ملک کی خدمت کرنے کی تحریک دی ہے۔ جو لوگ سیاسی شعبہ میں کام کر رہے ہیں اور جو دیگر شعبوں میں سماج کی خدمت کر رہے ہیں انہیں ایک کنبہ کی طرح ایکتا اور یقین و اعتماد کے ساتھ کام کرنا ہوگا تاکہ ہمارا ملک ترقی اور خوشحال ملکوں کے درمیان اپنا بہتر مقام حاصل کر سکے۔

اشاریہ

پہلا باب

آزادی کا جشن، تقسیم کا المیہ

1- ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر، پاکستان آر دی پارٹیشن آف انڈیا، رائٹنگز اینڈ اسپیچیز ،جلد-8،حکومت مہاراشٹر کے ذریعہ شائع 1990 (1946)،صفحہ 347-348
2- لتا جگتیانی، سندھی رفلیکشنز، جھرنا بکس، 2006، صفحہ 214

سندھ اور ہندوستان: ایک اٹوٹ بندھن

1- جواہر لال نہرو، دی ڈسکوری آف انڈیا، پینگوئن وائکنگ، 2004، صفحہ 70
2- کنہیالال تلریجہ، پرلز آف ویداز: پوئٹک ٹرانسلیشن ان ہندی، انگلش اینڈ اردو، راشٹریہ چیتنا سنگھٹن، 2006، صفحہ 48
3- ڈاکٹر رفیق زکریا کی کتاب انڈین مسلمز: ویئر ہیو دے گان رانگز؟ میں ایم جے اکبر کے ذریعہ لکھے گئے مقدمہ میں شاہ عبداللطیف کی رام کلی کا ذکر ہے، بھارتیہ ودیا بھون، 2004، صفحہ XI
4- 13-15 جولائی، 2001 کو منعقد بین الاقوامی سندھی کانفرنس، لاس اینجلس کیلیفورنیا میں بھگوان ایس گڈوانی کی تقریر
5- بین الاقوامی سندھی کانفرنس، ٹورنٹو میں بھگوان ایس گڈوانی کی ایک اہم تقریر سے، جولائی 1997

سندھ میں، میرے پہلے بیس سال

1- ڈینس کنکیڈ، دی گرینڈ ربیل: این امپریشن آف شیواجی، فاؤنڈر آف دی مراٹھا امپائر، کالنز لندن، 1937، صفحہ 51-52
2- ڈیل کارنیگی، ہاؤ ٹو ون فرینڈز اینڈ انفلوئنس پیوپل، پاکٹ بکس، سائمن اور شوسٹر کا ایک ڈویژن، 1982، صفحہ 115-117
3- ایضاً، صفحہ 3-17
4- رفیق زکریا، پرائس آف پارٹیشن، بھارتی ودیا بھون، 1998، صفحہ 174
5- ڈاکٹر اجیت جاوید، جناح: سیکولر اینڈ نیشنلسٹ، faizbook.com، 2005، صفحہ 174

6- ایم ایس این شرما، پیپس ان ٹو پاکستان، پستک بھنڈار، 1954، صفحہ 135
7- شری پرکاش، پاکستان برتھ اینڈ ارلی ایرز، میناکشی پرکاش، 1965، صفحہ 37، ڈاکٹر اجیت جاوید کی جناح: سیکولر اینڈ نیشنلسٹ، faizbooks.com، 2005، صفحہ 370

دوسرا باب

مہاتما گاندھی کا المناک قتل

1- سردار پٹیل کو جواہر لال نہرو کے خط، سردار پٹیل کارسپانڈنس، جلد-IV، 1973، مدیر، درگا داس، احمد آباد، صفحہ 32-31، بلکھن لال کی سیکولر پالکس کیپٹل ایجنڈا میں حوالہ، پرگن پبلیکیشن، 2008، صفحہ 132، بلکھن لال کی کتاب کا میں نے 31 جنوری 2008 کو نئی دہلی میں اجرا کیا تھا۔ اس میں کانگریس اور کیمونسٹ پارٹیوں کی نام نہاد سیکولرازم کی سیاست سے متعلق تحقیقی مطالعہ کا مواد جمع کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر مکھرجی اور بھارتیہ جن سنگھ کا قیام

1- بلراج مدھوک، شیاما پرساد مکھرجی، 1954، صفحہ 39-38

تیسرا باب

پنڈت دین دیال اپادھیائے: بہترین دانشور، منتظم اور لیڈر

1- مہیش چندر شرما کی کتاب دین دیال اپادھیائے: کرتو اویوم دچار سے حوالہ، وسدھا پرکاشن، 1994، صفحہ 106، ڈاکٹر شرما بی جے پی کے سابق ممبر پارلیمنٹ ہیں۔
2- پنڈت دین دیال اپادھیائے: دیکتی درشن، دین دیال اپادھیائے شودھ سنستھان، نئی دہلی، صفحہ 61-60
3- پنڈت دین دیال اپادھیائے، انٹیگرل ہیومنزم سے حوالہ، بی جے پی کے ذریعہ شائع۔

پارلیمانی زندگی کی شروعات

1- لیفٹیننٹ جنرل جے ایف آر جیکب، سرینڈر ایٹ ڈھاکہ: برتھ آف اے نیشن، لانسر پبلشرز، 1997

کانپور سے کانپور کا سفر

1- ایم جی دیوسہائم، جے پی ان جیل: این ان سینسرڈ اکاؤنٹ، لوٹس رولی، 2006، صفحہ 302، یہ ایک حساس اور ایماندار افسر کے ذریعہ لکھی گئی ایک بہترین کتاب ہے۔ جب جے پی یکم جولائی سے 14 نومبر 1975 تک چنڈی گڑھ کے پوسٹ گریجویٹ میڈیکل سائنس میں قید تھے، تو یہ ڈپٹی کمشنر اور چنڈی گڑھ میں جیل انسپکٹر جنرل تھے اور جے پی کی نگہداشت کیلئے ذمہ دار تھے۔ اگرچہ وہ ایک سرکاری افسر تھے پھر بھی ان کے دل میں جے پی کیلئے بڑی عزت تھی۔ انہوں نے جے پی کی زندگی کی سب سے تکلیف دہ دور میں ان کے خیالات اور جذبات انتہائی ایمانداری سے رقم کی ہے۔

چوتھا باب

ہندوستانی تاریخ کے سب سے تاریک دور کا خاتمہ

1- پادٹینی: کے پی کرشنن اُنی، رپورٹنگ میموئرز، کوزی کوڈ، اولیو پبلیکیشنز۔

عوام کے ساتھ اعتماد شکنی: جنتا پارٹی حکومت کا زوال، اندرا گاندھی کی واپسی

1- ایل کے آڈوانی، دی پیوپل بی ٹریڈ، ویژن بکس، 1980، صفحہ 59
2- ایم جی دیوسہائم، جے پی ان جیل: این ان سینسرڈ اکاؤنٹ، لوٹس رولی، 2006، صفحہ 302
3- ایل کے آڈوانی،، دی پیوپل بی ٹریڈ، ویژن بکس، 1980، صفحہ 97
4- ایضاً صفحہ 98-97
5- ایضاً صفحہ 101

1980 کی دہائی: بی جے پی کی امر پرندے جیسی پرواز

1- دی ٹرانس فارمیشن آف این آئیڈیولوجیکل مومنٹ انٹو این اگریکلو پارٹی: اے کیس اسٹڈی آف دی بھارتیہ جن سنگھ، یونیورسٹی آف کیلیفورنیا، لاس اینجلس کے امریکی دانشور ہیمپٹن تھامسن ڈاوے جونیئر کی پی ایچ ڈی تھیسس، 1969، یو ایم آئی، ڈیزرٹیشن سروسز، صفحہ X اور XI
2- این رام، نو یور بوفورس، فرنٹ لائن 26-13 نومبر 1999
3- بی ایم اوجھا، بوفورس: دی ایمبیسڈرز ایویڈنس، ساؤتھ ایشیا بکس، 1997

اجودھیا تحریک: جب ہندوستان کی روح بول پڑی

1- رمیش مینن، شوا: شوا پران ری ٹولڈ، روپا اینڈ کمپنی، 2006، صفحہ XI

2- ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر، پاکستان آر دی پارٹیشن آف انڈیا، جلد-8، رائٹنگز اینڈ اسپیچز، حکومت مہاراشٹر کے ذریعہ شائع، 1990، صفحہ 56
3- سوامی وویکانند، دی فیوچر آف انڈیا، دی کمپلیٹ ورکس آف سوامی وویکانند کے حوالہ سے، 2003، صفحہ 280
4- کے ایم منشی، سومناتھ: دشرائن ایٹرنل، بھارتیہ ودیا بھون، 1965 (1951)، صفحہ 161
5- ایضاً، صفحہ 167
6- مکھن لال، سیکولر پالیٹکس کمیونل ایجنڈا: اے ہسٹری آف پالیٹکس ان انڈیا فرام 1860 ٹو 1953 پرگن پبلیکیشن، 2008، صفحہ 150-154
7- دی شرائن ایٹرنل، صفحہ 175-177
8- کے ایم منشی، پلگریمیج ٹو فریڈم، بھارتیہ ودیا بھون، 1967، صفحہ 312
9- ایضاً، صفحہ 288
10- ڈاکٹر رفیق زکریا، اقبال: دی پوئٹ اینڈ دی پالیٹیشین سے حوالہ، پینگوئن، 1993
11- وہائٹ پیپر آن ایودھیا اینڈ دی رام ٹیمپل موومنٹ، 1993 میں بی جے پی کے ذریعہ شائع

پنجاب کا درد اور فتح

1- ساؤتھ ایشیا ٹیریرزم - پورٹل www.satp.org
2- ستیہ پال ڈانگ، ٹیریرزم ان پنجاب، گیان 2000، صفحہ 151-152
3- شیکھر گپتا، 'درّہ آدم خیل: آرمز فار دآسکنگ'، انڈیا ٹوڈے، 31 جولائی 1989
4- سنیل کمار، 'سکھ - ایتھنک اپرائزنگ ان انڈیا اینڈ انوالمنٹ آف فارین پاورز'، ساؤتھ ایشیا - ٹیریرزم پورٹل www.satp.org
5- خشونت سنگھ، اے ہسٹری آف دی سکھ- 1988-1839، جلد 2، نئی دہلی، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، 1999، صفحہ 303-370
6- کے پی ایس گل، نائٹس آف فالزہڈ، ہر- آنند پبلیکیشنز، 1997، صفحہ 5

پی وی نرسمہا راؤ حکومت کے پانچ سال

1- پی وی نرسمہا راؤ، اجودھیا: 6 دسمبر 1992، پینگوئن وائکنگ، 2006، صفحہ 1
2- ایضاً، صفحہ 188
3- سدھیندر کلکرنی، 'آڈوانی ان حوالہ اسکیم: فنالے آف اے فریم-اپ'، دی پائنیر، 15 اپریل 1997
4- کنچن گپتا، 'وہین آڈوانی ڈکلیئرڈ اٹل پی ایم 1995'، دی پائنیر 11 دسمبر 2007
5- ویرسنگھوی، 'ٹو پارٹیز، ٹو فیسیز؟' سمینار 2001

دوسال میں تین وزرائے اعظم

1- فرنٹ لائن، 30-17 مارچ، 2001

پانچواں باب

ایک نئے عہد کی شروعات

1- سنڈے انڈین ایکسپریس 21 / اکتوبر 2007

2- 'وینکٹ رمن اسپیکس آف این ابارٹیڈ این ٹسٹ'، پی ٹی آئی رپورٹ، انڈین ایکسپریس، 27 / مئی 1998

3- منوج جوشی، 'نیوکلیئر شاک ویو'، انڈیا ٹوڈے 25 / مئی 1998

4- ایضاً

5- پرفل بدوائی اور اچن ونائک، ساؤتھ ایشیا آن اے شارٹ فیوز: نیوکلیئر پالیٹکس اینڈ دی فیوچر آف گلوبل ڈز آرمنٹ، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس 2000

6- دی ٹائمس آف انڈیا 6 / مئی 1999

کارگل جنگ: ہندوستان کی ایک فیصلہ کن فتح

1- نواز شریف کے ساتھ انٹرویو، انڈیا ٹوڈے، 30-15 جولائی 2004

2- جسونت سنگھ، اے کال ٹو آنر: ان سروس آف ایمرجنٹ انڈیا، روپا اینڈ کمپنی، 2006، صفحہ 212۔

3- اسٹراب ٹال بوٹ، انگیجنگ انڈیا: ڈپلومیسی، ڈیموکریسی اینڈ دی بامب، بروکنگز انسٹی ٹیوشن پریس، 2004، صفحہ 160

4- دا ایشین ایج، 5 / اگست 1999

5- ڈاکٹر منموہن سنگھ نائیجیریا اور جنوبی افریقہ سے لوٹنے کے بعد صحافیوں سے بات کرتے ہوئے، دی ہندو، 19 / اکتوبر 2007

6- ہریندر بویجا اور راج چین گپتا، 'دی وار آف ورلڈس'، انڈیا ٹوڈے، 9 / اگست 1999

این ڈی اے کی اقتدار میں واپسی

1- دی اکنامک ٹائمس، 11 / مئی 1999

ہندوستانی آئین کے کام کاج کا جائزہ

1- پی سی الیگزینڈر، تھرو دی کاریڈورس آف پاور: این انسائڈرز اسٹوری، ہارپر کالنس، 2004، صفحہ 17
2- ایضاً، صفحہ نمبر 28-27

وزارت داخلہ کی کمان

1- ششر گپتا 'ٹیرر کریک ڈاؤن سلیکنڈ ان 2005' دی انڈین ایکسپریس 27 رجنوری 2006
2- آر کے راگھون، 'اے ریورس فار پولس رفارمز'، فرنٹ لائن 7 سے 20 مئی 2005

سرحد پار سے دہشت گردی پاکستان کا جہادی چیلنج اور ہمارا جواب

1- 'انڈیا وِل ہیو ٹو فائٹ اِٹس آن بیٹل' آؤٹ لُک میں میرا انٹرویو 22 راکتوبر 2001
2- جسونت سنگھ، اے کال ٹو آنر، روپا اینڈ کمپنی 2006، صفحہ 245
3- نشد ہزاری، 'فال آؤٹ فرام فلائٹ 814'، ٹائمس ویکلی، 17 رجنوری 2000
4- ریڈف آن دی نیٹ، 30 ردسمبر 1999
5- زاہد حسین کی کتاب فرنٹ لائن پاکستان: دی اسٹرگل وِتھ ملیٹینٹ اسلام، پینگوئن وائکنگ، 2007 صفحہ 63-61 میں طیارہ آئی سی 814 کے اغوا میں پاکستان کے راست شامل ہونے کی تفصیل دی گئی ہے۔ تجربہ کار مصنف اور مشہور پاکستانی صحافی نے لکھا ہے '1999 میں ہندوستانی طیارے کے اغوا کے واقعہ کے وقت طالبان رآئی ایس آئی اور جہادیوں کی ساز باز دکھائی دیتی تھی، جس کا میں گواہ تھا۔'
6- برطانوی صحافی ایڈرین لیوی اور کیتھرین اسکاٹ کلارک نے اپنی کتاب 'ڈیسپشن: پاکستان، دی یونائٹیڈ اسٹیٹ اینڈ دی گلوبل نیوکلیئر ویپنز کان سپریسی میں ممکنہ تباہ کاری کی اطلاع' کے بارے میں لکھا جو یہ بتاتا ہے کہ 9/11 کے پیچھے پاکستان کی آئی ایس آئی اور دہشت گردوں کے درمیان تعلقات ہے۔ (اٹلانٹک بکس، 2007، صفحہ 317)۔ اس خبر سے واجپئی حکومت کے ذریعہ مسلسل کہی گئی بات کی تصدیق ہوئی، یعنی پاکستان سے پیدا ہونے والی دہشت گردی نہ صرف ہندوستان کے لئے بلکہ پوری دنیا کے لئے خطرہ ہے۔
7- دی ہندو 21 رمارچ 2000
8- پورنیما ترپاٹھی 'ٹیرر اِن پارلیمنٹ ہاؤس'، فرنٹ لائن، 22 ردسمبر 2001 سے 4 رجنوری 2002
9- کراچی کے 'ڈان' اخبار میں احتشام الحق کی رپورٹ، 15 ردسمبر 2001
10- انڈو-ایشین نیوز سروس کے ذریعہ جاری ممبئی میں میرے خیالات، 5 راکتوبر 2006

11- 'لائف بڈ آن آڈوانی فائلڈ'— تہلکہ، 11 / اکتوبر 2001، پی ٹی آئی کی رپورٹ تھی کہ: 'ممبئی پولس نے 6 آئی ایس آئی کے ایجنٹوں اور چھوٹا شکیل کے ساتھیوں کو گرفتار کیا ہے جنہوں نے وزیر داخلہ ایل کے آڈوانی اور کچھ اہم شخصیتوں کو مارنے اور کئی بڑی وارداتیں کرنے کی اسکیم بنائی تھی، آج پولس کمشنر ایم این سنگھ نے بتایا۔ گزشتہ ہفتہ ممبئی، چنئی اور بنگلور میں گرفتاریاں ہوئیں۔ انہوں نے صحافیوں کو بتایا کہ پوری سازش آئی ایس آئی کے کہنے پر ہندوستان سے باہر سرگرم طاقتوں کے ذریعہ تیار کی گئی تھی۔'

12- انڈیا ٹوڈے میں انٹرویو، 11 / اکتوبر 2001

13- دی پاینیر 19 / نومبر 2001

14- پروین سوامی 'لشکر طیبہ، ان تھیوری اینڈ پریکٹس'، دی ہندو 3 / نومبر 2005

پاکستان کی پراکسی وار: ہندوستان نے کیسے امریکہ اور دنیا کو اپنے ساتھ لیا

1- غلام حسنین 'پورٹریٹ آف اے ڈان' نیوز لائن، کراچی سے شائع ماہنامہ میگزین، ستمبر 2001

2- امریکہ کے محکمہ ٹریژری کے ذریعہ 16 / اکتوبر 2003 کو جاری پریس ریلیز: 'امریکہ نشاندہی کرتا ہے کہ داؤد ابراہیم دہشت گردی کا حامی ہے۔ ہندوستانی جرم کی دنیا کے اس سرغنہ نے ہندوستان میں القاعدہ کی مدد کی ہے اور دیگر دہشت گردوں کو تعاون دیا ہے'
http://www.treasury.gov/press/releases/js909.htm

3- 'ہندوستان کے موقف کو درست ٹھہرایا گیا'، آڈوانی نے کہا، 17 / اکتوبر 2003 کو rediff.com پر پی ٹی آئی کی نیوز رپورٹ۔

4- ہریش کھرے، 'دی ڈان' ہیز بین گراؤنڈیڈ' دا ہندو، 17 / اکتوبر 2003۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے: 'وزیر داخلہ کے طور پر مسٹر آڈوانی نے آگرہ میں جنرل پرویز مشرف کے سامنے یہ فہرست اچانک پیش کی۔ تب سے وہ اس معاملے کے پیچھے پڑے ہیں۔ اس اندیشے کا اظہار کرتے ہوئے ان کے بارے میں یہ غلط فہمی پیدا ہوسکتی ہے کہ وہ کسی ذاتی ایجنڈے کے تحت ایسا کر رہے ہیں۔' حقیقت میں میرا کوئی 'ذاتی ایجنڈا' نہیں ہے نہ ہی ایسا ہوسکتا تھا۔ افسوس کی بات ہے کہ نوکر شاہی اور میڈیا کی دنیا میں ایسے کچھ عناصر ہیں جنہوں نے جان بوجھ کر یہ غلط فہمی پیدا کی کہ میرا کوئی ایجنڈا تھا۔

5- راجیو شرما، 'پاک ٹو ہینڈا ور داؤد: پاویل، دی ٹریبیون 20 / جنوری 2001

6- سمن گوہا مجمدار، آڈوانی نے لاس اینجلس کے ساتھ نئے سرے سے تعلقات قائم کئے'، rediff.com، 12 / جون 2003۔ اس پورٹ میں بتایا گیا ہے: 'جنوبی کیلیفورنیا کے ہندوستان امریکی برادری نے نائب وزیر اعظم کا لاس اینجلس میں شاندار استقبال کیا۔ ایکتا کے ایسے شو میں 72 سے بھی زائد ہندوستانی امریکی تنظیموں نے سفیر للت مان سنگھ کے کہنے پر استقبال کی تیاریاں شروع کی گئیں۔ یہاں تک آڈوانی بھی ان کی ستائش کرنا نہیں بھولے۔ انہوں نے کہا ''میرے لئے اہم اس تقریب میں لوگوں کی تعداد نہیں بلکہ یہ سچائی اہم ہے کہ اس انعقاد کے لئے اتنے سارے گروپ ایک ہوگئے۔ یہ بات قابلِ ستائش ہے۔''

7- شیام بھاٹیہ، 'آڈوانی یو کے یاترا ایک راجنیک سفلتا'، لندن، rediff.com، 17 / جون 2003، اس رپورٹ میں کہا گیا ہے: 'ایل اے آڈوانی کا انگلینڈ دورہ ہندوستان کے ایک سفارتی کامیابی کے طور پر سامنے آرہا ہے۔ پیر کو نائب وزیر اعظم کا

10 ڈاؤننگ اسٹریٹ میں ویسا استقبال ہوا جیسا عام طور سے ملک کے سربراہان کا ہوتا ہے۔ سیاسی الفاظ میں یہ واشنگٹن میں آڈوانی کو ہونے والے تجربے کو دوبارہ دہرایا گیا تھا جہاں وہ صدر بش اور ان کے اہم سیاسی ساتھیوں سے ملے تھے۔'

مسئلہ کشمیر مستحکم اور وایمانداررانہ کوششوں سے پیش رفت ہوئی

1- جسونت سنگھ نے اپنی کتاب اے کال ٹو آنر، روپا اینڈ کمپنی، 2006، صفحہ 181-153 میں 1962 کی لڑائی کے وقت نہرو جی کے رویہ سے متعلق واقعات کی تفصیلات دی ہے۔

2- چین اور یوروپی فیڈریشن میں ہندوستان کے سابق سفیر اور دانشور چندر شیکھر داس گپتا کی تحقیقی کتاب وار اینڈ ڈپلومیسی ان کشمیر 48-1947 (سیج پبلیکیشن 2002) میں یہ سوال اٹھائے گئے ہیں اور سمجھداری سے ان کے جواب بھی دیئے گئے ہیں۔ اس کتاب میں انہوں نے ہندوستان کے مفادات کے خلاف اس لڑائی کو بڑھاوادینے میں انگریزوں خاص طور پر ماؤنٹ بیٹن کے کردار کو واضح کیا ہے۔ داس گپتا نے لکھا ہے' ہندوستان اور پاکستان کے درمیان 1947 میں چھڑی جنگ جدید دور لڑائی کی تاریخ میں حیرت انگیز تھی۔ یہ ایسی لڑائی تھی جس میں دونوں افواج کی قیادت برطانوی جنرلوں کے ہاتھوں میں تھی۔ اس کے علاوہ ہندوستانی کابینہ کی دفاعی کمیٹی کے صدر لارڈ ماؤنٹ بیٹن تھے، نہ کہ وزیر اعظم نہرو.... (صفحہ-9)' انگریز افسران کی ایمانداری اپنے بادشاہ کے تئیں ہونا فطری اور مناسب ہی تھی.... کچھ معنوں میں ماؤنٹ بیٹن ہندوستان کے دوست تھے لیکن وہ پاکستان کے دشمن بھی نہیں تھے۔ گورنر جنرل کی سندوستان کے تئیں محبت کبھی بھی برطانوی مفاد کے آڑے نہیں آئی۔ انہوں ہندوستانی حکومت کو پاکستان کے ساتھ متصل جموں وکشمیر سرحد تک فوجیوں کو پھیلانے سے روکنے یا اسے ناکام کرنے میں میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ یہاں تک کہ انہوں نے طیارہ کے ذریعہ کارروائی کر کے سرحد کی گھیرا بندی سرکار کے منصوبے ناکام کرنے کی کوشش تک کی گئی۔ انہوں نے یہ معاملہ اقوام متحدہ میں لیجانے کیلئے دباؤ ڈالا۔ اس کے بعد برطانوی فریق نے دعویٰ کیا کہ کشمیر' متنازع حصہ' تھا' صفحہ 205-200

3- تارا شنکر سہائے ایک سیپٹینس آف پری 1953 اسٹیٹ فار جے اینڈ کے ووڈ ہیو سیٹ اے ڈینجرس پریسیڈنٹ، آڈوانی'، rediff.com، 4 جولائی 2000

4- وی شنکر، مائی ریمینیسنز آف سردار پٹیل، میکملن، 1974

5- احمد رشید' ای یو کنڈمس' فلاڈ' پاکستان الیکشن'، اسلام آباد، ٹیلیگراف، یوکے، 14 اکتوبر 2002، فوج کے کنٹرول میں ووٹنگ پر تبصرہ کرتے ہوئے پاکستان کی ملک بدر وزیر اعظم بے نظیر بھٹو نے کہا' جو الیکشن جنرل کروائے، وہ کیا الیکشن ہے؟' فرنٹ لائن، 26 اکتوبر 2002

6- شیکھر گپتا،' کانگریس، نیو دہلی، تھینک یو، سری نگر' (بدھائی، نئی دہلی، دھنیہ واد، سری نگر)، دی انڈین ایکسپریس، 11 اکتوبر 2002

7- ' ٹاکس بٹوین کشمیری سیپریٹسٹس، نیو دہلی' مائل اسٹون' آن روڈ ٹو پیس'، ایجنس فرانس پریس، 28 مارچ 2004

8- ' میر واعظ پریز آڈوانی فور ہز سنسریٹی'، ڈیلی ٹائمز، 29 جنوری 2004

9- حریت کانفرنس کے صدر مولوی عباس انصاری سے اونکار سنگھ کے ذریعہ لیا گیا انٹرویو، rediff.com، 23 جنوری 2004

10- پوئس آف مہجور، ساہتیہ اکاڈمی شت وارشک پرکاشن، ٹی این کول کے ذریعہ کشمیری سے انگریزی میں ترجمہ، 1988، صفحہ 129-124

آگرہ میں واجپئی-مشرف سربراہ مذاکرات، اس کی ناکامی ہندوستان کیلئے بالآخر کامیابی رہی

1- اٹل نریندر، 'ڈرائیونگ ہوم اے پوائنٹ' دی پائنیر، 26 جولائی 2001

2- 'نوسی بی ایم' اسٹل کشمیراز سولوڈ، مشرف' 16، جولائی 2001 کو آئی اے این ایس کے ذریعہ شائع پریس کانفرنس کے حوالہ جات

3- جسونت سنگھ، اے کال ٹو آنر، روپا اینڈ کمپنی، 2006، صفحہ 260 اور rediff.com، 17 جولائی 2001

4- دی انڈین ایکسپریس، 17 اگست 2001

5- کسی حل کے بغیر آگرہ سربراہ مذاکرات کے اختتام کے بعد ہی پاکستان کے ترجمان میجر جنرل رشید قریشی، جن کی جنرل مشرف کے ساتھ قربت ظاہر تھی، نے کہا کہ مجوزہ مشترکہ بیان 'ایک خفیہ ہاتھ' کی وجہ سے ناکام ہو گیا۔ دی ٹریبیون، 19 جولائی 2001

6- 31 اگست 2001 کو 'ہندو' میں اسلام آباد سے بی مرلی دھر ریڈی نے رپورٹ دی 'مشرف بلیم اٹ آن آڈوانی'، رپورٹ میں کہا گیا: 'آگرہ سربراہ مذاکرات کے ڈیڑھ ماہ بعد پاکستان کے فوجی حکمران اور صدر جنرل مشرف نے حقیقت میں پہلی بار وزیر داخلہ مسٹر ایل کے آڈوانی پر الزام لگایا کہ ان کی وجہ سے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان مشترکہ اعلامیہ جاری نہیں ہو سکا۔ آج صبح اوئی لوئیل میں ناردن ایریا لیجسلیٹو کونسل میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے دعوی کیا کہ وزیراعظم اٹل بہاری باجپئی، مشترکہ اعلامیہ پر دستخط کر دیتے، لیکن ان کی حکومت کے شدت پسندوں نے ایسا نہیں ہونے دیا۔ انہوں نے کہا کہ 16 جولائی کو دوروزہ سربراہ کانفرنس کے آخری دن مسٹر واجپئی ڈیڑھ بجے دوپہر میں مشترکہ اعلامیہ سے متفق تھے اور اس پر دستخط کرنے کیلئے تیار تھے لیکن شدت پسند، ہندوستانی وزیراعظم پر بہت زیادہ حاوی رہے۔'

7- پرویز مشرف، ان دی لائن آف فائر: اے میمائر، فری پریس، 2006، صفحہ 301-300

8- جسونت سنگھ نے اپنی کتاب اے کال ٹو آنر میں مشرف کے اس دعوے کی تردید کی ہے کہ آگرہ سربراہ کانفرنس 2001 کے ناکام ہونے سے پہلے ہندوستان اور پاکستان کے افسران حتمی اور آپسی قابل قبول اعلامیہ کے مسودہ تیار کر چکے تھے، صفحہ 260-256

9- اپنی ان یادوں میں واجپئی کے ذریعہ ان کے دعووں کی تردید کئے جانے کے جواب میں مشرف نے کہا، 'میں نے اس کتاب میں جو کچھ بھی کہا ہے وہ قول فیصل ہے اور میں اس پر قائم ہوں'، 'واجپئی کے منع کرنے پر مشرف بری طرح ناراض' نروپما سبرامنیم، اسلام آباد، دی ہندو 13 اکتوبر 2006

مستقبل کیلئے آسام اور شمال مشرق کو محفوظ رکھنا

1- سنجے ہزاریکا، رائٹس آف پیسیز، پینگوئن بکس، 2000، صفحہ 60 'وزیراعظم جواہر لال نہرو چاہتے تھے کہ آسام کے وزیر اعلیٰ بملا پرساد چالیہا ناجائز دراندازوں کو واپس بھیجنے پرست روی سے کاروائی کریں۔ یہاں تک کہ اسے روک ہی دیں۔ اس سلسلہ میں سختی کے ساتھ کاروائی نہ کریں، لیکن ست روی سے اسے روک ہی دیں۔ چالیہا نے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ یہ مسئلہ اتنا مشکل اور سنگین ہے

کہ آسام کی آبادی وثقافت مستقل طور سے بدل جائے گی'۔

یہاں اس بات کا ذکر کرنا بھی مناسب ہوگا کہ گیت کار، گائک اور آسام کے عظیم تہذیب کے سفیر بھوپین ہزاریکا نے 1968 میں اپنے تخلیق کردہ گیت میں اپنے جذبات کو بیان کیا' آج آسام کے لوگوں کو اپنی حفاظت خود کرنی ہوگی ورنہ وہ اپنی ہی زمین پر رفیوجی ہوجائیں گے۔ یہ گیت اسٹوڈنٹس کے درمیان غیر ملکی مخالف تحریک کے وقت بہت زیادہ مقبول ہوا تھا۔

2- کمیٹی آف پٹیشنز کی 73 ویں رپورٹ، راجیہ سبھا، 22 مارچ 1982

3- سنجے ہزاریکا، رائٹس آف پیسیز، پینگوئن بکس، 2000، صفحہ 70، 6 مئی 1977 — سابق وزیر داخلہ اندرجیت گپت نے پارلیمنٹ میں بتایا تھا کہ ہندوستان میں ایک کروڑ غیر ملکی غیر قانونی طور سے قیام کررہے ہیں۔ وزارت داخلہ اور انفارمیشن بیورو کے ذرائع کا حوالہ دیتے ہوئے 'انڈیا ٹوڈے' نے 10 اگست 1998 کے شمارہ میں ریاست گیر پیمانے پر موجود غیر ملکیوں (آبادی لاکھ میں) کی تفصیلات دی۔ مغربی بنگال (54)، آسام (40)، تری پورہ (8)، بہار (5)، مہاراشٹر (5)، راجستھان (5) اور دہلی (3) کل تقریباً سوا کروڑ۔ 2001 میں وزراء کے گروپ، جس کا میں چیئر مین تھا، نے اپنی رپورٹ پیش کی کہ گذشتہ پانچ عشروں میں ہندوستان میں بنگلہ دیش سے تقریباً ڈیڑھ کروڑ غیر قانونی درانداز آئے ہیں۔ اس سے آسام، میگھالیہ، مغربی بنگال، تری پورہ اور بہار کے بڑے حصوں میں آبادی میں تبدیلی ہورہی ہے' 1983 سے 2000 کے درمیان مختلف اضلاع کے 16 ٹربیونل نے تقریباً 10 ہزار غیر ملکیوں کا پتہ لگایا ہے جن میں سے محض 1400 کو ملک سے باہر بھیجا گیا ہے

4- ٹی وی راجیشور، 'مائیگریشن اور انویژن؟'، دی ہندوستان ٹائمز، 7 فروری 1996

5- 'فلشنگ آؤٹ الفا'، دی ہندو، 18 دسمبر 2003

6- کلیان چودھری، 'پرامس آف پیس'، فرنٹ لائن، 18 جنوری 2003

7- سبیر بھومک، 'چرچ بیکنگ تری پورہ ریبلز' کلکتہ، بی بی سی نیوز، 18 اپریل 2000 کی رپورٹ میں کہا گیا: ہندوستانی شمال مشرق ریاست تری پورہ کی حکومت نے کہا ہے کہ اس کے پاس مصدقہ اطلاعات ہیں کہ ریاست کا بیپٹسٹ چرچ علیحدگی پسندوں کی حمایت کررہا ہے۔ تریپورہ کے وزیر اعلیٰ مانک سرکار نے کہا ہے کہ ریاستی پولس نے تری پورہ میں ناؤ پاڑہ بیپٹسٹ چرچ کے سکریٹری ناگمن لال بلم سے پوچھ گچھ کرنے کے بعد مبینہ تفصیلات کی اطلاعات فراہم کی ہے جسے پیر کی شام میں کثیر مقدار میں دھماکہ خیز مادے کے ساتھ گرفتار کیا گیا ہے۔ مسٹر سرکار نے کہا کافی عرصہ سے سیاسی پارٹیوں اور پولس کے ذریعہ ریاست کے بیپٹسٹ چرچ اور علیحدگی پسند نیشنل لبریشن فرنٹ آف تری پورہ (این ایل ایف ٹی) کے مابین نزدیکی تعلقات کے الزامات لگائے جاتے رہے ہیں'۔ این ایل ایف ٹی پر اپنے کنٹرول والے علاقوں میں تری پورہ کی مقامی قبائل کو عیسائی مذہب اپنانے اور ہندو مذہب، پوجا پاٹھ کو چھوڑنے کیلئے مجبور کرنے کا الزام عائد کیا گیا ہے۔ گذشتہ سال انہوں نے ہندو تہواروں درگا پوجا اور سرسوتی پوجا کے انعقاد پر پابندی لگادی تھی۔ این ایل ایف ٹی کے منشور میں کہا گیا ہے وہ تری پورہ میں مبینہ ایشور اور عیسائیت کو فروغ دینا چاہتے ہیں۔

گجرات میں فرقہ وارانہ تشدد: تصوراتی مہم بنام حقائق

1- 'گجرات رائٹ ڈیتھ ٹول ریویلڈ'، بی بی سی نیوز، 11 مئی 2005، راجیہ سبھا میں پوچھے گئے ایک سوال کے جواب میں یو پی اے حکومت میں داخلہ امور کے وزیر مملکت شری پرکاش جیسوال نے یہ اطلاع دی تھی۔

2- rediff.com، 3 مارچ 2002

انتخابات میں شکست، پارٹی میں کھلبلی

1- مونگیری لال شمالی ہندوستان کا ایک تصوراتی کردار ہے، جو دن میں خواب دیکھتا ہے۔

2- این ڈی اے کے دور حکومت میں ملک کی معاشی حصولیابیوں کو اجاگر کرنے کیلئے وزارت خزانہ نے 2003 میں 'انڈیا شائننگ' (بھارت ادے) عنوان پر بڑے پیمانہ پر میڈیا کے ذریعہ تشہیر کی۔ بعد میں، ہم نے محسوس کیا کہ ایک پرائیویٹ اشتہاری کمپنی کے ذریعہ جزوقتی یہ تشہیری مہم ہمیں کافی مہنگی ثابت ہوئی۔ کیونکہ ہمارے سیاسی حریفوں نے یہ تشہیر کی کہ بی جے پی تڑک-بھڑک والی مہم کے ذریعہ غریبی او سماجی ناکامی، جو ہمیں ماضی کی وراثت کی شکل میں ملے تھے، پردہ ڈالنے کی کوشش کررہی ہے۔

2- 'سونیا گاندھی بوز ٹو انڈیا جینوفوبس'، دی ایج، آسٹریلیا، 22 مئی 2004، http://www.theage.com.au/articls/2004-2005

میرا پاکستان دورہ

1- محمود آباد کے راجہ، 'سم میموریز'، سی ایچ فلپس کے ذریعہ ایڈیٹ 'دی پارٹیشن آف انڈیا' میں، صفحہ 385

2- محمد کریم چھاگلا، روز یز ان دسمبر: این آٹو بایوگرافی، بھارتیہ ودیا بھون، 2000 (1973)، صفحہ 79-78

مجھے کوئی افسوس نہیں

1- لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ)، سریندر کوچر، بھگوت گیتا: ٹائم لیسلی پارٹیٹ، ہمالین بکس، 2005، صفحہ XXXV

اٹل بہاری واجپئی: ایک شاعر دل سیاستداں

1- 'نو پیرلل سینٹرز آف پاور، سیز آڈوانی'، دی ٹریبیون، 30 جون 2002

2- اٹل-آڈوانی تنازع، پربھو چاؤلہ کے ساتھ انٹرویو، انڈیا ٹوڈے، 22 مارچ 1999

کچھ قومی ایشوز پر غور وفکر

1- سی این این، آئی بی این، 9 دسمبر 2006، ڈاکٹر سنگھ کا بیان یہ تھا: 'ہمیں ایسی نئی اسکیمیں تیار کرنی ہوں گی، تاکہ یہ یقینی بنایا جاسکے کہ اقلیت، خاص طور سے مسلم اقلیت، ترقیات کے فائدوں میں یکساں طور پر شراکت دار بننے کیلئے کھڑی ہوسکیں۔ وسائل پر ان کا

پہلا حق ہونا چاہئے'۔
2- درگا داس بسو،انٹرو ڈکشن ٹو دی کنسٹی ٹیوشن آف انڈیا،13ویں اشاعت،پرنٹس-ہال آف انڈیا پرائیویٹ لمیٹیڈ،990 صفحہ 388-389
3- 13 ستمبر 2007 کو منعقد پریس کانفرنس
4- ڈونالڈ یوگن اسمتھ ،انڈیا:ازاے سیکولر اسٹیٹ، پرنسٹن یونیورسٹی پریس 1963
5- سیموئل پی ہنٹنگٹن، ہو آر وی؟' دی چیلنج ٹو امریکاز نیشنل آئڈنٹیٹی، سائمن اور شوسٹر 2004
6- رویندر ناتھ ٹیگور، نیشنلزم، روپا اینڈ کمپنی 2002،صفحہ 125-126
7- 1997 میں میری سورن جینتی رتھ یاترا کے موقع پر بھارتیہ جنتا پارٹی کے ذریعہ دستاویز سے
8- دھننجے کیر، ڈاکٹر امبیڈکر، لائف اینڈ مشن، پاپولر پرکاشن 1962
9- 21 جنوری 2008 کو نئی دہلی میں بی جے پی کی قومی عاملہ کی میٹنگ میں میری تقریر
10- 15 مارچ 2005 کو این ڈی ٹی وی کے 24x7 چینل کیلئے ہفتہ واری پروگرام 'واک دی ٹاک' میں انڈین ایکسپریس چیف ایڈیٹر شیکھر کے ذریعہ مجھ سے لئے گئے انٹرویو کے ایک حصہ میں بی جے پی-کانگریس تعلقات بھی شامل تھے۔' کیا آپ کانگریس کو ایک برائی کی شکل میں نہیں دیکھتے؟' گپتا نے پوچھا، 'نہیں، ایسا نہیں'۔ میں نے جواب دیا۔انہوں نے زور دیکر کہا، 'کیا آپ گاندھی فیملی کو ایک برائی کی شکل میں نہیں دیکھتے؟' میں نے کہا' میں نہیں مانتا کہ گاندھی پریوار میں کوئی برائی ہے۔لیکن یہ سوچ کہ صرف گاندھی ہی اس ملک پر حکومت چلانے کے لائق ہیں، بنیادی طور پر غیر جمہوری ہے۔ یہ جمہوریت میں یقین رکھنے والے کسی بھی شخص کیلئے پوری طرح ناقابل قبول ہے۔میں حیران ہوں کہ کانگریس نے کتنی آسانی سے یہ تصور قائم کرلیا'۔

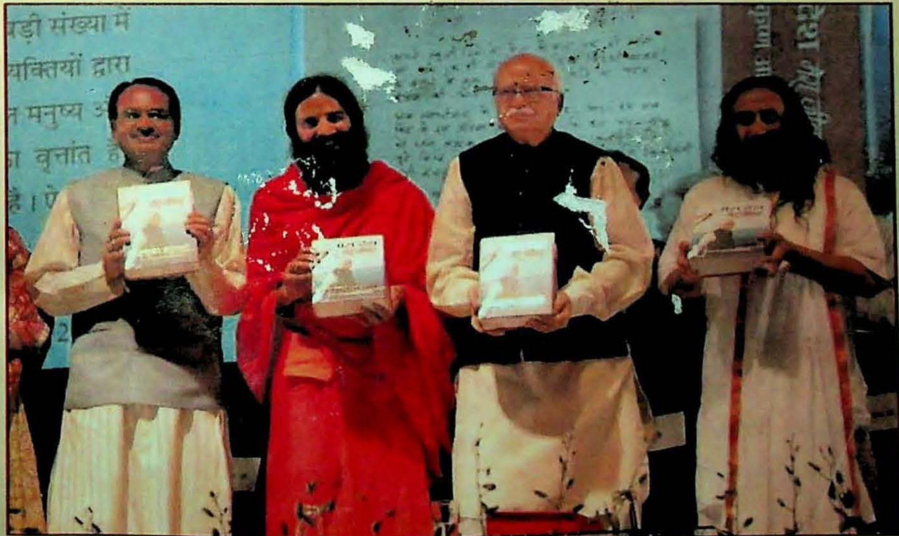
زندگی کا بامعنی مقصد اور خوشی کی تلاش

1- زیڈ روبین فیلڈ، دی انٹرپریٹیشن آف مرڈر، ہیڈ لائن ریویو، 2006،صفحہ 5
2- گلاب وزیرانی، لال آڈوانی، دی مین اینڈ ہز مشن، آرنلڈ پبلیشن 1991
3- لال کرشن آڈوانی، دی پیپل بی ٹریڈ، ویژن بکس، 1980
4- ڈاکٹر آتمارام کلکرنی، دی ایڈوونٹ آف آڈوانی، آدتیہ پرکاشن 1995
5- ینگ انڈیا، 18 جون 1925
6- ہریجن 2 مارچ 1934
7- ہریجن 10 فروری 1940

☆☆☆



کنڑ ایڈیشن کے رسم رونمائی کے دوران آڈوا ... لمار اور وائی ایس یدی یورپا۔



ہندی ایڈیشن کے رسم اجراء کے موقع پر لال کرشن آڈوانی کے ہمراہ شری شری روی شنکر جی، شری بابا رام دیو جی اور شری شوراج سنگھ چوہان۔

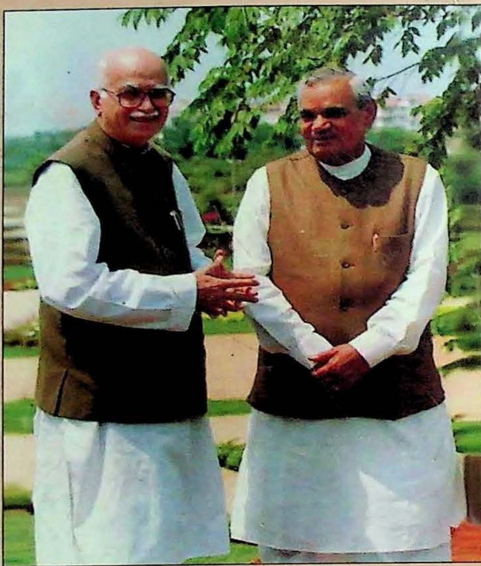
ہندوستان کے سابق نائب وزیراعظم لال کرشن آڈوانی 1970 کی دہائی سے ملک کے سب سے فعال قومی سیاسی رہنماؤں میں سے ایک ہیں۔ پچاس برسوں سے زیادہ عرصہ سے اپنے دائمی رفیق، سابق وزیراعظم اٹل بہاری واجپئی کے ساتھ انہوں نے ملک کے سیاسی پس منظر میں نہایت اہم اور فیصلہ کن تبدیلی لانے میں مثبت کردار ادا کیا۔ 1980 میں بھارتیہ جنتا پارٹی کے قیام سے لے کر اب تک اس کی ترقی میں ان کا گرانقدر اشتراک رہا ہے۔

آڈوانی 8/نومبر 1927 کو کراچی میں پیدا ہوئے، جہاں انہوں نے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ تقسیم کے بعد ان کے کنبہ کو سندھ چھوڑ کر منقسم ہندوستان آنا پڑا۔ 14 سال کی عمر میں بھارتیہ راشٹرواد اور کردار سازی کے لیے وقف سماجی تنظیم راشٹریہ سویم سیوک سنگھ (آر ایس ایس) سے وابستہ ہوئے آڈوانی 1951 میں ڈاکٹر شیاما پرساد مکھرجی کے ذریعہ جن سنگھ کے قیام کے بعد سرگرم سیاست میں آئے۔ جن سنگھ کے اہم ستون اور مفکر پنڈت دین دیال اپادھیائے کا ان کی زندگی پر گہرا اثر پڑا۔ آڈوانی 1973 میں جن سنگھ کے صدر منتخب ہوئے اور مسلسل تین سال کی مدت کار تک اس عہدے پر رہے۔ وہ 1975 میں ایمرجنسی کے دوران 19 ماہ کے لیے نظر بند رہے۔

مرتبہ راجیہ سبھا اور پانچ مرتبہ لوک سبھا کے لیے منتخب ہوئے ہیں۔ بی جے پی نے ...ن کانگریس کو پٹخنی دی جب وہ این ڈی اے کی مخلوط سرکار قائم کرنے میں کامیاب رہی۔ این ڈی اے کے قیام اور اس کی فتحیابی میں آڈوانی کا کردار بیحد اہم رہا۔

این ڈی اے کی سرکار (2004-1998) میں وہ ہندوستان کے وزیر داخلہ اور نائب وزیراعظم رہے۔ 1999 میں آڈوانی کو بہترین پارلیمنٹرین کے اعزاز سے نوازا گیا۔ موجودہ دور میں وہ لوک سبھا میں حزب اختلاف کے لیڈر رہیں۔ اپنی سیاسی سوجھ بوجھ اور سب کو ساتھ لے کر چلنے کی پالیسی کی وجہ سے وہ اپنے حامیوں اور مخالفین تمام حلقوں میں ہردلعزیز ہیں۔ پرکشش مقرر اور بر... پارلیمنٹرین آڈوانی ملک کی تعمیر و ترقی کے لیے بہتر نظام کے زبردست مبلغ رہے ہیں۔ سرگرم سیاست میں آنے سے قبل صحافی رہ چکے آڈوانی کتابوں، تھیٹر اور سنیما کی اچھی پرکھ رکھتے ہیں۔ فی الوقت وہ اپنی اہلیہ کملا، بیٹے جینت، بہو گیتکا اور بیٹی پرتیبھا کے ساتھ دہلی میں سکونت پذیر ہیں۔





''آڈوانی جی پچاس برسوں سے زائد عرصہ سے میرے دوست اور معتمد و معاون
ہے ہیں۔ انہوں نے کبھی بھی قوم پرستی میں اپنے اٹوٹ اعتماد کے ساتھ سمجھوتہ نہیں
یا، پھر بھی حالات کے مطابق ضروری لچیلا پن کا ثبوت دیا ہے۔ وہ کشادہ دلی سے
تلف مسائل سے نئے نئے افکار کا اظہار کرتے رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ''میرا
ن میری زندگی'' کو بڑی تعداد میں اور گہری دلچسپی کے ساتھ مختلف پس منظر والے
گوں کے درمیان پذیرائی حاصل ہوگی۔ اس کتاب میں دراصل ایک حساس طبع
سان اور بہترین آئیڈیل کی وضاحتی سوانح حیات درج ہے جن کی بہترین کامرانیاں
ی سامنے آنی باقی ہیں۔ ایسی مجھے امید ہے اور ایشور سے میری پرارتھنا ہے۔''

اٹل بہاری واجپئی

بق وزیر اعظم ہند (1998-2004)

اپنے طالب علمی کے زمانہ میں میرا ایک ہی خواب تھا، اور ایک
ہی التجا: میرا ملک غیر ملکی حکومت سے آزاد ہو اور نیز
اختیاری سے "عالمی وقار" کی جانب گامزن ہو۔
اب آزادی کے ساٹھ برس بعد، آئیے ہم سب پھر سے اس
عہد کو دہرائیں کہ ہم اپنے ملک اتنا مضبوط، خوشحال اور ترقی
یافتہ بنائیں گے کہ پوری دنیا کو اس بات کا احساس ہو
کہ اکیسویں صدی حقیقتاً ہندوستان کی صدی بن رہی ہے
وندے ماترم۔